عہد نبوی میں

تنظیم ریاست و حکومت

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

قاضی
QAZI
PUBLISHERS &
DISTRIBUTORS

عہدِ نبویؐ میں

تنظیمِ ریاست و حکومت

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

س۔م ———— ۱ء

طبع اوّل ———— ۱۹۸۸ء

تعداد ———— ۱۰۰۰ ہزار

PRICE RS: 150/-

مطبوعہ: فرنٹیر آفسٹ پٹودی ہاؤس، نئی دہلی ۲

عہدِ نبویؐ میں

تنظیمِ ریاست و حکومت

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقیؔ

قاضی QAZI
پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
PUBILSHERS & DISTRIBUTORS
Vareg Bilding Nizamuddin West
New Delhi-110013

انتساب

نقوش

کے

عظیم مدیر جناب محمد طفیل مرحوم و مغفور

کی

عظمت و خلوص اور مہر و محبّت کے نام

مختصر تعارف

۲۶ر دسمبر ۱۹۴۴ء کو ضلع لکھیم پور کھیری (یوپی) کے قصبہ گولا گوکرن ناتھ میں پیدائش ہوئی۔ قصبہ کے مدرسہ حیاتیہ اسلامیہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے درجہ دوم عربی میں ۱۹۵۳ء میں داخلہ لیا۔ جہاں سے ۱۹۵۹ء میں عالم کی سند درجہ اول میں حاصل کی اور پھر فاضل ادب کی سند درجہ دوم میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۶۰ء میں حاصل کی۔ اسی سال جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں ہائر سکنڈری کلاس میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۲ء میں ہائر سکنڈری، ۱۹۶۵ء میں بی اے اور ۱۹۶۶ء میں بی ایڈ کیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے ۱۹۶۸ء میں تاریخ میں ایم اے، ۱۹۶۹ء میں ایم فل اور ۱۹۷۵ء میں پی ایچ ڈی کیا۔ ہندوستان کے ازمنہ وسطیٰ اور اسلامی تاریخ پر ملکی اور بین الاقوامی رسائل وجرائد میں ساٹھ سے اوپر تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں اور متعدد تصانیف بھی ان کے قلم سے نکلی ہیں۔ ان میں سے ایک "عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت" گرانقدر نقوش ایوارڈ سے ۱۹۸۳ء میں سرفراز ہوئی۔ ابھی حال ہی میں ان کی انگریزی کتاب ORGANISATION OF GOVERNMENT UNDER THE PROPHET ادارہ ادبیات دلی نے شائع کی ہے۔ ان کے علاوہ متعدد کتابیں اور مقالے ہندو پاکستان اور سعودی عرب سے شائع ہوئے ہیں۔ کئی کتابیں اور تحقیقی مقالے زیر طبع اور زیر تصنیف ہیں۔ مصنف کا خصوصی مطالعہ اور تحقیق تاریخ اسلام کا میدان ہے۔ اس کے علاوہ وہ "اسلامیات" سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

تاریخی اعتبار سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی ریاست وحکومت ایک بے مثال واقعہ اور سیاسی معجزہ تھا جس کی تشریح وتعبیر سے ابھی تک مورخین اور علماء سیاسیات پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکے اور یہ حقیقت ہے بھی بڑی حیرت انگیز کہ ایک فرد واحد جو اپنے وطن مالوف سے گویا جلاوطن کر دیا گیا تھا اور مخلصوں کی ایک منتشر وغیر منظم جماعت کے سوا جس کا کوئی حامی وناصر نہ تھا آٹھ برس کی قلیل مدت میں ایک لشکر جرار جمع کر کے جزیرہ نمائے عرب کی سب سے بڑی سیاسی، فوجی اور مذہبی طاقت کو پاش پاش کر دیتا ہے اور فاتحانہ شان وشوکت کے ساتھ اسی شہر مغرور میں داخل ہوتا ہے جس سے وہ بہ عالم کسمپرسی ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ دس سال کی مختصر مدت میں وہ مغرور اجتماعیت گریزاں عربوں کو اپنی سیادت وریاست تسلیم کرنے کے لئے سر خم کرنے اور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس شخص واحد نے عدم کے پردے سے ایک حکومت وریاست کو نکال کر وجود بخشا تھا تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا۔ تاریخ کی کتنی حیرت زا حقیقت ہے کہ مدینہ منورہ کی شہری ریاست جس کے اقتدار اعلیٰ کی حدود حرم مدینہ سے بھی چھوٹی تھیں رفتہ رفتہ ایک ملک گیر ریاست بنی جس نے پورے جزیرہ نمائے عرب کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور ایک چوتھائی صدی کے سیاسی، فوجی اور معاشرتی نشیب وفراز سے گذرنے کے بعد وہ ایک عالمی سلطنت اور آفاقی تہذیب کی صورت میں تشکیل پذیر ہوئی جس نے وقت کی دو عظیم ترین سیاسی طاقتوں سے ایک۔ ساسانی۔ سلطنت کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دیا اور دوسری رومی سلطنت کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ خلفاء اسلام کے دوسرے دور میں وہ تین براعظموں کے بہترین حصوں پر قابض ہو چکی تھی اور ان کو اسلام کے فیوض وبرکات سے مستفیض کر رہی تھی۔ یہ ایک ایسا سیاسی معجزہ اور معاشرتی عجوبہ ہے جس نے مورخین اور علماء سیاسیات وسماجیات کو ابھی تک حیران وششدر کر رکھا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ علماء مورخین نے اس کی تشریح وتعبیر اور تجزیہ کی کوئی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے متعدد سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور فوجی اسباب وعوامل کی کارفرمائی کی نشاندہی کی ہے مگر ان کی حیرانی اور آشفتگی تاحال دور نہیں ہوئی کیونکہ انھوں نے ثانوی عوامل اور عناصر کی کارفرمائی پر تو ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور اصلی وفعال عامل کی اثر انگیزی سے عمداً گریز کیا ہے۔ جدید مورخین بالخصوص مستشرقین نے اپنے مذہبی اور علاقائی تعصب، مادہ پرستانہ انداز فکر ونظر اور اسلام دشمن نقطۂ نگاہ کے سبب اسلامی ریاست وتہذیب کی تشکیل کے بنیادی عنصر۔ مذہب۔ کی کارفرمائی کو مدت مدید تک نظر انداز

کیا نتیجہ یہ ہوا کہ مذکورہ بالا اسباب و عوامل نے اس کی جزوی تشریح و تعبیر تو کر دی مگر وہ "کل" کی تشریح و تجزیہ سے قاصر رہے۔ لیکن اب تاخیر سے سہی مستشرقین بھی بقول فرانسسکو جبریلی FRANCISCO GABRIELI مذہبی عامل و محرک کی تاثیر و کارفرمائی سے آگاہ ہوتے جا رہے ہیں اور جنہوں نے اس کی روشنی میں اسلامی ریاست کے سیاسی معجزہ کی تشریح و تاویل کی ہے وہ "کل" کی حقیقت کو پا گئے ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ ابھی تک اس اصلی محرک اور بنیادی عامل کی کارفرمائی کا صحیح تجزیہ نہیں کیا گیا ہے۔

اسلامی ریاست کے ارتقا اور کمال کو صحیح نور سے سمجھنے اور پھر اس کا صحیح تجزیہ کرنے میں عموماً دو رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں جو دو مختلف نقطہ ہائے نظر کی ترجمانی کرتی ہیں: اول یہ کہ مسلم مورخین اور علماء بالخصوص اسلام کے سیاسی اور سماجی مضمرات کو سمجھنے اور سمجھانے میں دانستہ یا نادانستہ تقصیر کرتے ہیں حالانکہ مکی عہد نبوی کی اولین تبلیغ کے آغاز ہی میں دوربین نگاہوں نے ان دور رس مضمرات کو بخوبی پہچان لیا تھا۔ دوئم یہ نقطہ نظر سد راہ بنتا ہے کہ اسلامی ریاست عہد جاہلی کے قبائلی سیاسی نظام کا شاخسانہ تھی حالانکہ ان دونوں میں بعض قبائلی مظاہر کی ناگزیر موجودگی کے باوجود زمین آسمان کا فرق ہے۔ ذہن نبوی اور اکابر صحابہ کرام پر تو یہ مضمرات روشن تھے ہی تجربہ کار اور دوربین قریشی شیوخ و اکابر نے روز اول ہی سے ان کو بخوبی جان لیا تھا اور وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ توحید و رسالت اور معاد کے سیدھے سادے عقیدے نہ صرف ان کے مذہبی نظام کے لئے خطرہ ہیں بلکہ ان کے سماجی اور سیاسی نظام کے لئے بھی حرب موت ثابت ہوں گے۔ ان مضمرات نے واضح کر دیا تھا کہ اسلامی نظام کے قیام کی صورت میں اقتدار اعلیٰ کی ترکیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں محدود و محصور ہوگی اور باقی دنیا کو کامل اطاعت و فرماں برداری کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ اسی سبب سے مکی اشرافیہ اور قریشی شیوخ و اکابر نے اسلام پیغمبر اسلام کی شدید مخالفت کی تھی۔

دوسری طرف مکی سماج کے منصف مزاج ذہنوں اور صالح روحوں نے پیغام نبوی میں سعادت دارین کا سامان دیکھا تھا اسی لئے اگرچہ مکہ مکرمہ میں سابقین اولین اور ان کے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشراف و اکابر قریش کی سخت عداوت کے سبب کوئی نیا سماجی اور سیاسی نظام نہیں قائم کر سکے تاہم وہ اسلامی تعلیمات میں ایک سماجی اور سیاسی نصب العین (آئیڈیالوجی) عطا کرنے میں ضرور کامیاب ہوئے تھے جس کے محور پر ایک عظیم نظام قائم کیا جا سکتا تھا۔ مکہ مکرمہ میں تبلیغ و اشاعت کے آغاز کے ساتھ ہی ایک معاشرتی انقلاب کی داغ بیل پڑی جس نے قبائلی، علاقائی، مذہبی غرض کہ ہر طرح کے تعصبات و وفاداریوں کے بندھنوں کو کاٹ کر ایک نئی اخوت و اجتماعیت کو جنم دیا۔ امت اسلامی کی تشکیل شروع ہوئی اور مکی عہد کے تیرہ برسوں میں اس کے معتد بہ

افرادِ مکہ مکرمہ کے علاوہ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف مقامات پر پرجوش علمبردار اور مبلغ بن کر ابھرے اور انہوں نے تحریک کو اور وسیع کیا۔ اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ یثرب مدینۃ النبی بن گیا اور ہجرت کے بعد وہاں کی غالب اکثریت حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئی۔ امت اسلامی کی بنیاد خون، زبان، وطن، رنگ اور نسل وغیرہ کے ثانوی رشتوں کے بجائے مذہب اسلام کے فطری رشتہ پر رکھی گئی جو آفاقی بھی تھا اور بنیادی بھی۔

مکہ مکرمہ میں شیوخ و رؤسا کی شدید مخالفت اور دوسرے مراکز میں قلت تعداد کے سبب اسلامی امت کی شیرازہ بندی ممکن نہ تھی جو ہجرت کے بعد مدینہ میں نہ صرف ممکن ہوئی بلکہ روبہ عمل بھی آگئی۔

یہی اسلامی امت تھی جو پہلے شہری ریاست بن کر ابھری، بعد میں تبلیغ و ارشاد، سیاسی عہود و وفود، باہمی امداد و تعاون کے معاہدوں، اور فوجی غزوات و سرایا جیسے عوامل کی کارفرمائی کے نتیجہ میں عرب گیر ریاست کی شکل میں ارتقا پذیر ہوئی اور جب انہیں اسباب و عوامل کے نتیجہ میں وہ جزیرہ نمائے عرب کے ریگزاروں اور نخلستانوں سے باہر نکلی تو معلوم دنیا کے بہترین اور بیشتر خطوں پر ابر رحمت بن کر چھاگئی۔

امت اسلامی کی شیرازہ بندی، ارتقا پذیری اور تکمیل کا لازمی ثمرہ یہ تھا کہ عہد نبوی میں ایک مرکزی اور اجتماعیت پسند حکومت قائم ہوئی جو عہد جاہلی کے صدیوں پرانے قبائلی نظام کی ضد تھی۔ پرانے وقتوں میں عرب قبائل میں ہر ایک اپنی جگہ ایک الگ خود مختار و آزاد سیاسی اکائی تھا کیوں کہ ان کا دارومدار خون کے رشتوں پر تھا جو قلب سے نکل کر شریانوں میں پہونچتے پہونچتے الگ الگ خانوں میں بٹ گیا تھا۔ وہاں مضر و ربیعہ اور عدنان و قحطان کے جھگڑے تھے اور اس قبائلی تقسیم نے ان کو اپنی اپنی جگہ اتنا خود مختار و مطلق العنان بنا دیا تھا کہ وہ سب عرب ہونے کے باوجود ایک مرکزی سیاسی لڑی کے دانے نہیں بن سکتے تھے۔ وہ اپنی خود مختاری اور آزادی کے اتنے خوگر ہوچکے تھے کہ وہ اجتماعیت و مرکزیت کے دشمن اور اتحاد و یگانگت کے مخالف تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے ان صدیوں کے دشمنوں کو جانی دوست اور جاں نثار بھائی بنا دیا۔ اور وہ سب اپنے تعصبات، تحفظات اور تعلقات بھول کر امت اسلامی کے رکن بن گئے۔ اور جنھوں نے اسلامی امت کا رکن بننا گوارا نہ کیا ان کو بھی آپ کی سیاسی بالادستی اور مدینہ منورہ کی مقتدرانہ حیثیت کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑے اور اپنی فرماں برداری اور اطاعت کی نشانی کے طور پر ہدایات و احکام نبوی کی تعمیل اور مدینہ منورہ کو خراج و باج ادا کرنا پڑا۔ جزیرہ نمائے عرب میں ریگزاروں کی مانند کثیر و منتشر قبیلوں اور علاقوں پر اسلامی ریاست کے اقتدار و حکومت کو موثر و کارگر طور سے نافذ کرنے کے لیے مرکزی حکومت نے اپنے

گوناگوں عمال وحکام مقرر کیے جن کی اطاعت وفرماں برداری لازمی تھی۔ مدینہ منورہ اسلامی ریاست کا صدر مقام اور بقیہ تمام علاقے اور قبیلے اس کے ماتحت تھے اور مدینہ منورہ کی ماتحتی اور فرماں برداری اسلام کی علامت اور ایمان کی نشانی تھی۔ ماتحتوں کی یہ فرماں برداری اور اطاعت اخوت اسلامی پر مبنی تھی جو امت اسلامی کی اساس تھی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی کارنامہ تھا کہ آپ نے مرکز دشمن عربوں کو اجتماعیت کا خوگر بنا دیا تھا۔ فلپ ہٹی اور دوسرے ہم خیال مستشرقین ومورخین نے عربوں میں **اتحاد** ، یگانگت، اجتماعیت ومرکزیت اور حکومت وسلطنت کے قیام کا شرف خلافت راشدہ کے دور میں وقوع پذیر ہونے والی عالمی وآفاقی سلطنت اور تہذیب وتمدن کو عطا کیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اصلاً وہ عطیۂ نبوی تھا جس کی بنیاد پر اگلی تعمیر وتوسیع ممکن ہوئی تھی۔ معجزۂ نبوی سے ان کے انکار وگریز کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کی فعالیت کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے اور ثانوی اسباب پر زور دے کر قارئین کو حقیقت شناسی سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود بھی جانتے ہیں کہ عہد نبوی میں تعمیرات وتشکیل ریاست کے بغیر بعد کے دور کی توسیع وترقی ہرگز ممکن نہ تھی۔

بعض طبقات بالخصوص مستشرقین نے اسلامی ریاست کے صدر اول کے سماجی اور سیاسی اداروں کے بارے میں اکثر وبیشتر شبہات کا اظہار کیا ہے کہ ان اداروں کے آغاز وارتقاء کے متعلق روایات واحادیث مشتبہ اور غیر معتبر ہیں کیونکہ وہ جن مآخذ ومصادر میں پائی جاتی ہیں وہ اموی اور عباسی ادوار میں مروی اور منظم ہوئے تھے۔ حد سے زیادہ محتاط اور وہمی مصنفین کا خیال ہے کہ ان روایات ومعلومات کے راویوں اور ناقلوں میں بعد کے اداروں کو عہد نبوی یا خلافت راشدہ کی جانب منسوب کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے معاصر مصطلحات اور اداروں کو صدر اول کی جانب اس لئے منسوب کر دیتے ہیں کہ ان کو شرعی اور دستوری توثیق وتصدیق حاصل ہو جائے۔ بلاشبہ تنقید روایات واحادیث کا یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے کہ موجودہ ذخیرۂ معلومات میں کس قدر حصہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی احادیث آپ کے قول وفعل وتقریر اور عہد نبوی سے متعلق ہیں اور کس قدر حصہ بعد کے اضافے اور الحاقات ہیں۔ اس مسئلہ نے علماء تاریخ وحدیث کو دو واضح گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے: ایک طبقہ قدامت پسندوں کا ہے جو ہر روایت وحدیث کو بلا تنقید قبول کر لیتا ہے جب کہ دوسرے طبقہ نے حدیثی اور تاریخی اور سیرتی ادب کے بارے میں ناقدانہ رویہ اپنایا ہے۔ مستشرقین اور جدید مورخین کا طبقہ تیسرا ہے جو وہم وشبہ کا شکار ہے کہ وہ اپنے مرغوبات اور خود ساختہ اصول تحقیق کی کورانہ پیروی کرتا ہے۔

اس علمی اختلاف انداز تحقیق کی دوئی کا سبب یہ ہے کہ روایت وقدامت پرست مورخوں

اور مستشرقین و ناقد مصنفین کے نقطۂ نظر، علمی پس منظر اور طرز استدلال میں فرق پایا جاتا ہے۔ جدید مورخین اور مستشرقین جو تحریری مواد، کتاب و قلم اور خط و روشنائی کے اسیر ہیں صدرِ اسلام کی زبانی نقل روایات واحادیث کی صحت و صداقت کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں حالانکہ علم اصلی وہی ہوتا ہے جو ذہن کے پردوں پر مرتسم اور قلب کی کتاب میں تحریر ہو نہ کہ جو کتاب و کتاب خانے میں محفوظ و محصور رہو۔ حقیقت یہ ہے کہ صدرِ اسلام میں تحریری مواد کو مدتوں مشتبہ سمجھا جاتا رہا کیونکہ اس میں الحاق واضافہ وغیرہ کا خدشہ و خطرہ زیادہ تھا جب کہ زبانی ترسیلِ روایات واحادیث نسبتاً زیادہ قابل اعتماد تھی بشرطیکہ راویوں کا کردار و شخصیت کمزوری اور جرح سے بالاتر ہو۔

زبانی ترسیلِ روایات میں صحت و صداقت کی ضمانت فراہم کرنے کی غرض سے وقت کے ساتھ ساتھ دو اصولِ تنقید ارتقا پذیر ہوئے، اول اصولِ اسناد و روایت جس کی بنیاد پر کسی روایت کو اس آخری راوی تک لوٹایا جا سکتا ہے جس نے اسے اپنے چشم دید مشاہدہ یا ذاتی تجربہ کی بنا پر اول اول روایت کیا تھا۔ دوئم اصولِ درایت ہے جس کے ذریعہ متنِ روایت کو تنقیدی کسوٹی پر رکھ کر پرکھا اور جانچا جا سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان دونوں اصولوں کی ایجاد و استعمال کے باوجود ذخیرۂ حدیث و تاریخ میں الحاقات و اضافات دراندازی کر کے داخل ہو گئے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلامی ناقدین حدیث و روایت نے نہ صرف صحیح اور غلط روایات واحادیث میں واضح اور روشن فرق بتایا بلکہ ان کی صحت و صداقت کے اعتبار سے درجہ بندی کی اور متواتر، صحیح، حسن، غریب اور موضوع وغیرہ میں ان کو منقسم کر کے صحیح اور غلط کو ممتاز کر دیا۔ فنِ حدیث میں ناقدین رجال و روایات نے جتنا کام کیا ہے اور جس طرح تنقیح کی ہے ابھی تک تاریخ و سیرت کے فن میں اتنا اور اس قدر عمدہ کام نہیں ہوا ہے تاریخی مصادر و مآخذ کے اصولِ تنقید و تنقیح بھی ابھی مرتب ہونے باقی ہیں اور اسی طرح روایات و رُواۃ کا صحیح اسلامی نقد ہونا بھی مسلم مورخین پر فرض باقی ہے۔ لیکن عہد نبوی کی سماجی اور سیاسی زندگی کے بارے میں جو معلومات ہمارے مآخذ میں پائی جاتی ہیں ان کی تنقید و تنقیح کا کام اتنا باقی نہیں ہے کیونکہ ہمارے مورخین اور ناقدین نے اس موضوع پر قابلِ تعریف حد تک اپنے فریضہ کی ادائیگی کر دی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پہلی صدی ہجری کے خاتمہ تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ بالخصوص آپ کے قائم کردہ اداروں کے بارے میں تمام معلومات جمع کی جا چکی تھیں اور جہاں تک موادِ سیرت کی تحصیل و تنظیم کا تعلق ہے بعد کی صدیوں میں اس پر کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ تدوین و تنقیح کا مرحلہ بعد میں آیا۔ لیکن یہاں اہم ترنکتہ یہ ہے کہ ہمارے تمام مصادر و مآخذ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور بعد کے خلفاء اسلام کے طریقہ میں ہمیشہ خط فاصل کھینچتے ہیں اور سنت نبوی سے معمولی سے انحراف کی بھی نشاندہی کر دیتے ہیں پھر سیرت و تاریخ کے ابتدائی ماخذ کے تقابلی مطالعہ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ سیرتِ نبوی کی اہم ترین تفصیلات بالخصوص عہد نبوی کے اداروں سے متعلق معلومات پر ایک دوسرے سے قطعی اتفاق رکھتے ہیں۔ بنیادی اداروں پر ان کا اتفاق ان کی فراہم کردہ معلومات کی صحت و صداقت کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ماخذ و مصادر میں یہ حقیقت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے کہ صدرِ اسلام کے تمام مذہبی، سیاسی، اور انتظامی اداروں میں بتدریج ارتقا ہوا تھا جو بعد کی صدیوں میں مکمل ہوا۔ یہ بھی ان کی صحت کی سندِ مزید ہے۔ اس لئے نبوی اداروں کے بارے میں فراہم کردہ معلومات و روایات پر تنقید و تنقیح کے بعد پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی سیاست کے اصولوں پر نظریاتی طور سے اب تک کافی لکھا جا چکا ہے اگرچہ اب بھی اس اہم موضوع پر ایک معیاری کام کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ عہد نبوی کے اداروں اور بالخصوص اسلامی ریاست و حکومت کی تنظیم و تشکیل اور ارتقاء و تکمیل پر ابھی تک کوئی تنقیدی اور مفصل کام پیش نہیں کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے ارتقاء کی تاریخ اس کے صحیح تناظر میں اور ٹھوس تاریخی معلومات کی بنیاد پر پیش کی جائے اور عہد نبوی کی حکومت کی کارکردگی و کارفرمائی کو اجاگر کیا جائے اس مطالعہ میں نظریاتی مباحث سے ممکن حد تک دانستہ گریز کیا گیا ہے کہ وہ مورخ کے دائرۂ کار سے خارج ہے۔ مورخ ٹھوس تاریخی واقعات سے بحث کرتا ہے اس لئے اس کتاب کی بنیاد انھیں پر رکھی گئی ہے۔ بنیادی مواد تو تاریخ کا فراہم کردہ ہے البتہ تعبیر و تشریح اور تنقید و تنقیح میرے خطا کار قلم کی ہے جس سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تاریخ کے اعلیٰ مطالعہ کے مرکز اور شعبۂ تاریخ سے میری وابستگی تقریباً بیس سال تک رہی اور تقریباً دس سال تک اسلامی تاریخ کو مختلف سطحوں پر پڑھانے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ اس طویل وابستگی نے اسلامی تاریخ پر مفصل کام کرنے کے لئے برانگیختہ کیا تاکہ اس کو صحیح تاریخی تناظر میں پیش کیا جائے۔ سیرت نبوی اور تاریخ اسلامی سے مجھے ابتدا سے شیفتگی تھی اور اس کا پورا اور تمام و کمال شرف میرے عظیم والد بزرگوار کو جاتا ہے جو سیرت نبوی سے والہانہ عشق رکھتے تھے۔ انھیں کی تحریک اور حوصلہ افزائی پر پہلے پہلی راقم سطور نے عہد نبوی کے انتظامیہ پر ایک مضمون ایک سیمنار کے لئے لکھنے کا ارادہ کیا۔ مواد کی تحصیل ہی مرحلۂ شوق کے لئے تازیانہ ثابت ہوئی اور اتنا مواد جمع ہو گیا جو کسی مضمون کی بجائے ایک کتاب مفصل کا متقاضی تھا۔ پایانِ کار بابا جان

گرامی کی مستقل حوصلہ افزائی اور تحریک پر وہ مواد کتاب کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ بھی عجیب تقدیر الٰہی تھی کہ کتاب کا اولین مسودہ انگریزی میں مئی جون ۱۹۷۷ء میں بلرام پور اسپتال لکھنؤ کے پرائیویٹ وارڈ کے ایک کمرے میں تیار ہوا جہاں قبلہ گاہی فالج کے ایک سخت حملہ کے بعد علاج کے لئے داخل تھے اور خادم کو ان کی تیمارداری اور خدمت کی سعادت میسر تھی۔ اس عالم کسمپرسی میں بھی وہ کتاب سے غافل نہیں رہے۔ یہ انھیں کی جوتیوں کی برکت تھی کہ مجھے کام کی تکمیل کی سعادت و نعمت ملی۔ بالآخر انگریزی مسودہ ۱۹۸۲ء میں پریس بھیج دیا گیا اور کتاب طباعت کے مراحل سے بتدریج گذرنے لگی۔ جب بھی اس کے پروف آتے قبلہ گاہی اس کے اردو روپ کا تقاضا شدید کر دیتے۔ میرے عظیم کرم فرما حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم و مغفور بھی کتاب کے اردو متن کے لئے اصرار فرماتے رہے تا آنکہ نقوش لاہور (پاکستان) کے بےمثال و عظیم مدیر مرحوم محمد طفیل صاحب نے اپنی روایتی دلنوازی اور مصنف پرستی سے راقم سطور سے اس کام کی تکمیل کروا ہی لی۔ کچھ وقت کی کمی اور ادارت کی مشکلات اور کچھ مدیر نقوش کی محبت و دلنوازی کے سبب یہ کتاب نقوش کے رسول نمبر کی پانچویں اور بارہویں جلدوں میں دو جگہ چھپی اور ۱۹۸۳ء میں سیرت کے گرانقدر نقوش ایوارڈ کے لئے منتخب ہوئی۔ راقم سطور کو مسرت ہے کہ اس کے مذکورہ بالا تینوں بزرگوں کی حیات مستعار میں وہ زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی تھی اگرچہ الگ کتابی شکل میں ہنوز نہیں آسکی۔ دسمبر ۱۹۸۶ء میں انگریزی کتاب ادارہ ادبیات دلی سے چھپ کر بازار میں آگئی ہے اور اب اس کا اردو روپ پیش خدمت ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا مواد اگرچہ یکساں ہے تاہم دونوں مستقل کتابیں ہیں اور اردو میں بہت سے اضافے ہیں بالخصوص پہلے دو ابواب اور حواشی و تعلیقات میں۔ بابا جان گرامی مولوی الحاج انعام علی مرحوم و مغفور کے احسانات و انعامات کا شکریہ ادا کرنے سے الفاظ قاصر ہیں۔ آج جو بھی خدمت مجھ سے بن پڑی ہے اور آج میری جو حیثیت و شخصیت ہے اس کے بنیادی معمار قبلہ گاہی ہی تھے۔ راقم سطور کو اندوہناک حسرت و ملال کا بے پایاں احساس ہے کہ اس کے محسن و مربی انگریزی اور اردو کتابوں کی تکمیل سے قبل ہی ۷ ارجولائی ۱۹۸۵ء کو مالک حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور اس کتاب کو ان کے صدقات جاریہ میں شمار فرمائے کہ وہی اس کے محرک اصلی تھے۔ حضرت مولانا اکبرآبادی اور جناب محمد طفیل مرحوم کا بے انتہا ممنون ہوں اور تازندگی ممنون رہوں گا جنہوں نے ذرہ نوازی کی اسلامی روایات نباہیں اور ہر قدم اور ہر مرحلے پر دستگیری فرمائی۔ مرحوم طفیل صاحب کی محبت و دلنوازی اور علم پرستی کے نقوش تازندگی دل پر مرتسم رہیں گے۔

ان کے علاوہ راقم سطور اپنی چار مادر درسگاہوں کے اساتذہ کرام کا **صمیم قلب** سے ممنون ہے جنہوں نے اپنی محبت و شفقت سے ہمیشہ نوازا اور قدم قدم پر رہنمائی و دستگیری فرمائی۔ مدرسہ حیاتہ اسلامیہ

گولا کے اساتذۂ شفیق نے میری ابتدائی تعلیم و تربیت کی یہ خاکسار ان سب کا بالعموم اور حضرت مولوی سعید احمد خیر آبادی اور مولانا علام محمد قاسمی رحمہما اللہ کا بالخصوص مرہون منت ہے۔ اول الذکر نے نہ صرف میرے والد ماجد کی تعلیم و تربیت فرمائی بلکہ میری تدریس و تہذیب کی لمحہ آخر تک اولاد سے زیادہ فکر رکھی۔ الفاظ ان کی شفقت و عنایتِ بیکراں کی تصویر کشی کرنے سے قاصر ہیں۔ مولانا احمد رفیع نگرامی ندوی کی دلسوزی سے بھرپور تعلیم و تربیت کے لئے شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اول اول عربی علوم سے آگاہی بخشی۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے تمام استادان بزرگوار کا مرہون منت ہوں کہ انھوں نے کتاب و قلم پکڑنا سکھایا اور اسلامی تاریخ، قرآن کریم اور حدیث نبوی کا صحیح ذوق پیدا کیا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی حفظہ اللہ کے عربی مضامین و کتب کے مسودات نقل کرنے کی جو سعادت اس فقیر کو وہاں ملی اس نے علم و ادب کی برکات سے بہرہ ور کیا۔ مولانائے موصوف کے دوسرے علمی اور ثقافتی احسانات اس کے علاوہ ہیں۔ حضرت مولانا کے قلم و زبان نے جس طرح میری علمی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی اس کے لئے میں ان کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔ صدر شعبۂ ادب مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی ندوہ میں میرے بنیادی محسن و معلم و مربی رہے اور خوش نصیب ہوں کہ آج بھی ان کی عنایات کریمانہ کا سزاوار ہوں مولانا مفتی محمد اسحاق صدیقی ندوی سندیلوی دامت برکاتہ کی نوازشوں اور عنایتوں کا شکریہ کیونکر ادا کروں کہ انہوں نے اپنی حکیمانہ تربیت و تعلیم سے تاریخ اسلامی اور حدیث نبوی کے صحیح مطالعہ کا ذوق بخشا اور آج بھی سرحد پار سے ان کے کرم و عنایت کا سلسلہ جاری ہے۔ مولانا عبد الحفیظ بلیاوی مرحوم اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ نے اپنی توجہات عالیہ سے ہمیشہ نوازا اور لکھنے کی سدا ترغیب و تحریک دی۔ دوسرے اساتذہ کرام میں حضرت مولانا محمد اسباط مرحوم اور ان کے عزیز شاگرد مولانا حبیب الرحمٰن، مفتی محمد ظہور ندوی، مولانا ابو العرفان ندوی اور مولانا عبد الماجد ندوی مرحوم کا ممنون ہوں جنہوں نے میری تعلیم و تربیت میں خصوصی دلچسپی لی۔ ندوہ کے سابق و عظیم مہتمم حضرت مولانا محمد عمران خاں ندوی رحمہ اللہ کی شفقت و محبت اور مہر و عنایت کا جو نقش قلب پر مرتسم ہے اس کا تا زندگی رہین رہوں گا۔ ناسپاسی ہوگی اگر مولانا شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمہما اللہ کے احسانات عظیم کا اعتراف نہ کروں کہ ان کی تحریروں نے اس وابستۂ دامانِ دولت کی تہی مائیگی کو کم مائیگی میں بدلا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی مہر آمیز چار دیواری اور اس کے محبت آشنا اور خلوص پیشہ اساتذہ و کارکنان کا شکر گذار ہوں جنہوں نے اس ناتراشیدۂ علم و ادب کو جدید علوم و فنون سے روشناس کیا۔ ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی نے جس دلسوزی خلوص، محبت اور وارفتگی سے اپنے عزیز طالب علم کی تعلیم و تربیت فرمائی وہ عہد اسلامی کی عظمتِ استاد کی علامت تھی۔ بہ حیثیت استاد وہ میرے آدرش تھے اور ہیں اور

آج بھی ہزاروں میل کے فاصلہ سے ان کی عنایات کا غیر محسوس سلسلہ جاری ہے۔ حضرت مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم و مغفور کا بے انتہا مرہون منت ہوں کہ انھوں نے پڑھانے کے ساتھ لکھنا سکھایا اور ہر لمحہ اور ہر آن لکھنے کی ترغیب دیتے رہے پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کے احسانات سے گراں بار ہوں کہ انھوں نے جدید علوم کا در وا کیا اور اپنی ذرہ نوازی کا مصداق سمجھا۔ جناب عابد ملک اور مرحوم ابوالکاظم قیصر زیدی کی توجہات خصوصی کا بھی ممنون ہوں کہ ان کے سبب انگریزی اور اردو زبان سے شدید پیدا ہوئی۔

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے شعبہ تاریخ کے عظیم اساتذہ میں سب سے زیادہ پروفیسر سید نورالحسن صاحب کا ممنون کرم ہوں جن کی شفقت و نوازش، مہر و محبت اور عنایت خاص کا ہمیشہ مصداق رہا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی عنایات خصوصی کے علاوہ انگریزی کتاب کی طباعت کا والہانہ انتظام کیا اور مختلف مرحلوں پر اپنے نالائق شاگرد کی رہنمائی اور دستگیری فرمائی۔ میں ان کا جتنا شکریہ ادا کروں کم ہے۔ پروفیسر عرفان حبیب کی علم نوازی اور شاگرد پروری کا ہمیشہ ممنون رہوں گا جنہوں نے شعبہ تاریخ میں میرے استقلال و ترقی کے علاوہ جدید تحقیق اور طرز نگارش کے نکات سے نہ صرف آگاہی بخشی بلکہ ہر قدم پر علمی رہنمائی فرمائی اور خوش بخت ہوں کہ آج بھی ان کی توجہات سے محروم نہیں۔ پروفیسر عبدالوحید قریشی نے دوران و بعد تعلیم اپنی محبت و شفقت سے جس طرح نوازا اس کی لذت و حلاوت آج بھی دل میں تازہ ہے۔ دوسرے اساتذہ میں پروفیسر ضمیرالدین صدیقی اور پروفیسر اقتدار حسین صدیقی کے کرم مسلسل کا شکر گذار ہوں۔ شعبہ تاریخ کے احباب و رفقاء میں ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی، ڈاکٹر شیخ عبداللطیف، ڈاکٹر جمال محمد صدیقی، ڈاکٹر محمد ذکی، ڈاکٹر اقبال حسین، ڈاکٹر افضال حسین اور ڈاکٹر سوم پرکاش ورما کی مہر و محبت اور الفت و رفاقت کا ہمیشہ معترف رہوں گا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے سابق وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب مدظلہ العالی کا ہمیشہ ممنون کرم رہوں گا کہ انھوں نے اپنی مادر درسگاہ کی بے بہا خدمات انجام دینے کے علاوہ جوہر شناسی، علم پروری اور خورد نوازی کی روایت از سر نو تازہ کی اور اس خاکسار کو اپنی توجہات عالیہ سے سرفراز فرمایا۔ انھوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی، مطالعہ و تحریر کی برابر ترغیب دی اور ہر طرح سے اور ہر قدم پر دستگیری کی اور آج بھی ان کے کرم بیکراں سے مستفید ہوں۔ ان کا خصوصی شکریہ راقم سطور پر یوں بھی واجب ہے کہ موصوف نے بڑی توجہ اور عنایت سے میری انگریزی کتاب کا پیش لفظ تحریر فرمایا اور کتاب کی قدر و قیمت میں اپنی جاندار تحریر سے اضافہ فرمایا۔

اپنے موجودہ شعبہ علوم اسلامیہ کے رفقاء کار اور احباب میں جن کی توجہ و محبت اور الفت و خلوص

کا سزاوار ہوں ان میں ڈاکٹر کبیر احمد جائسی، ڈاکٹر ظفر الاسلام، ڈاکٹر محمد اعظم قاسمی، ڈاکٹر محمد سالم قدوائی اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی سرفہرست ہیں۔ پروفیسر ان۔ اکمل ایوبی صدر شعبہ علوم اسلامیہ نے مجھ پر جو احسان عظیم فرمایا ہے اس کا حساب واجر مالک حقیقی کے سوا اور کوئی نہیں ادا کر سکتا۔ دوسرے احباب میں شعبہ عربی کے ڈاکٹر حامد علی خاں، ڈاکٹر محمد راشد ندوی، ڈاکٹر عبد الباری اور ڈاکٹر کفیل احمد قاسمی کا شکر گذار ہوں جنھوں نے مختلف انداز سے میری مدد کی۔ میرے عزیز دوست و حبیب صدیق پروفیسر مسعود الرحمٰن خان ندوی سابق صدر مرکز دراسات الیشیائے عربی کی محبت و نوازش کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ سچ یہ ہے کہ علی گڑھ میں ان کی محبت و رفاقت انعام الٰہی سے کم نہیں۔ ڈاکٹر صلاح الدین عمری استاذ شعبہ عربی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اردو کتاب کی کتابیات تیار کی اور ہر آن دست تعاون بڑھائے رکھا۔

مضامین و کتابوں کی محبت آمیز فراہمی اور تلاش مواد میں خلوص آگئیں تعاون کے لیے میں مولانا آزاد لائبریری، شعبہ تاریخ اور ادارہ علوم اسلامیہ کے کتب خانوں کے تمام کارکنوں کا بالعموم اور جناب کبیر احمد خاں اور ان کے رفقاء کار کا بالخصوص ممنون ہوں۔

اردو کتاب کی ہندوستانی طباعت کے لئے میں ادارہ معروضی مطالعہ نئی دہلی کے ـــــ چیرمین ڈاکٹر منظور عالم کا بے انتہا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے خوبصورت انداز سے اس کتاب کو شائع کیا اور اپنی محبت اور خلوص سے راقم سطور کو بندۂ بے دام بنا لیا۔ میں ان کے ادارہ کے دوسرے رفقار بالخصوص ڈاکٹر محمد مقیم الدین استاذ شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی کا بھی ممنون کرم ہوں۔

آخر میں ان عزیزوں اور دل کے مہمانوں کے لئے سراپا سپاس ہونے کا اعتراف کر لوں جنکی محبت و رفاقت سے زندگی عبارت ہے۔ خوش نصیب ہوں کہ والدہ ماجدہ کی مہر و شفقت سے ابھی سرفراز ہوں۔ پروردگار عالم سے دعا ہے کہ ان کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے تاکہ دونوں جہانوں میں جنت کی نعمت سے متمتع ہو سکوں۔ رفیق حیات یاسمین کی دلسوز محبت و رفاقت کے لئے رواں رواں ممنون ہے کہ اگر وہ میرے گھر میں امن و سکون، الفت و محبت کی فضا قائم نہ رکھتی تو اس کتاب کے علاوہ دوسرے علمی اور غیر علمی کاموں کا وقوع پذیر ہونا ممکن نہ ہوتا۔ میں اپنی دونوں بیٹیوں زینت، رخسانہ اور فرزندوں احمد مبین، احمد معین اور خالد اسمٰعیل کی محبت و اطاعت کے لئے بھی سراپا سپاس ہوں کہ وہ اطمینان دل اور سکون قلب کا سامان ہیں۔

مذکورہ بالا بزرگوں، عزیزوں اور قریبوں میں سے جن کی محبت و تعاون سے میں سدا سرفراز ہوتا رہا۔ بہر حال کوئی ایک شخص بھی ان غلطیوں کے لئے ذمہ دار نہیں ہے جو اس کتاب میں باقی رہ گئی ہیں۔ مجھ سے

زیادہ ان سے اور کوئی واقف بھی نہیں۔ میں ان تمام غلطیوں اور خامیوں کے لئے قارئین کرام سے پیشگی معذرت خواہ ہوں اور ملتمس ہوں کہ مجھے براہ راست ان سے آگاہ فرمائیں تاکہ اگلی طباعت میں ان کا ازالہ کیا جاسکے اس کرم فرمائی کے لئے میں ان کا بھی شکر گذار ہوں گا۔

انتہائی احسان فراموشی ہوگی اگر میں اپنے خالق و مالک اور مربی کے بے پایاں انعامات و احسانات کے لئے سجدۂ شکر نہ بجالاؤں دراصل یہ اسی ذات بے ہمتا صفات اور مربی کل کا احسان ہے کہ اس نے علمی کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور قدم قدم پر اپنے اس کمزور و عاجز بندہ کی دستگیری و پرورش فرمائی۔ بعد عجز و نیاز دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنی نوازش بیکراں سے دونوں جہانوں میں نوازے اور میری حقیر خدمات کو ازراہ بندہ پروری قبول فرمائیے۔

الامین ۴۴ - ۶ - احمد نگر - علی گڈھ - ۲۶/دسمبر ۱۹۸۶ء

محمد یٰسین مظہر صدیقی

فہرست مضامین

عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت

باب اوّل

اسلامی ریاست کا ارتقاء

اسلامی ریاست : منہاج و مقصد

عہدِ نبوی میں اسلامی ریاست کا قیام نہ صرف مدینہ منورہ یا جزیرہ نمائے عرب میں بلکہ تمام انسانی دنیا کے لئے ایک نیا سیاسی تجربہ تھا۔ سلطنتوں اور حکومتوں کا خمیر محض مادی ضروریات کی تکمیل اور آسائشوں کی فراہمی کے لئے حیوانی اور بہیمی فطرت کی مٹی سے اٹھایا جاتا ہے۔ ان کا مقصد جہانگیری و جہانبانی ہوتا ہے، محکوموں کی اقتصادی دولت سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ غریب و بے بس رعایا کی سیاسی غلامی اور سماجی تحقیر سے حکامِ وقت کے جذباتِ حکمرانی و فرمانروائی کی تسکین مقصود ہوتی ہے۔ حکمرانوں کو نہ معاشرتی اصلاح کی فکر ہوتی ہے اور نہ سیاسی بہبود کی، نہ ان کو اقتصادی حالات کو سدھارنے کا غم ستاتا ہے نہ عوام کے اخلاق بلند کرنے کا۔ سلاطین، فرمانرواؤں اور طبقاتِ حکمراں کو محض اپنے مادی فوائد عام طور سے عزیز ہوتے ہیں۔ مدینہ منورہ میں ۱۲ ربیع الاول ۱ھ / ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء کو جس اسلامی ریاست کی داغ بیل پڑی تھی وہ دوسری دنیاوی سلطنتوں اور حکومتوں اور ریاستوں کی مانند ایک اور دنیاوی ریاست یا حکومت نہ تھی، بلکہ وہ ایک ایسی مثالی ریاست اور قابلِ تقلید حکومت تھی جس کی بنیادیں خدائے قادر و مطلق کی حاکمیتِ اعلیٰ، پیغمبرِ خدا کی نیابتِ خداوندی، اُمتِ مسلمہ کی اخوت و مساوات اور احترام و محبتِ بنی آدم کے عظیم اصولوں اور عملی نمونوں پر قائم کی گئی تھیں۔ یہی وہ بنیادی خصوصیات ہیں جو اسلامی ریاست و حکومت کو اپنی تمام پیشرو اور جانشین دنیاوی حکومتوں اور ریاستوں سے ممتاز کرتی ہیں۔(۱)

دوسری طرف جزیرہ نمائے عرب کے قبائلی نظام میں ریاست کا کوئی تصور نہ تھا اور نہ منظم حکومت کا کوئی نظریہ و خیال۔ سیاسی تصورات دھندلے تھے اور سیاسی نظام خام۔ بدوی عربوں (اھل البداوۃ) میں سیاسی نظام کی جگہ سیاسی انارکی تھی۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ آزاد و خود مختار تھا، مرکزیت و اجتماعیت مفقود تھی۔ نتیجہ یہ کہ بدوی قبیلوں کی زندگی باہمی اختلافات، چپقلش، نزاع اور تصادم و تحارب کی تفسیر تھی، جو اپنی آزادی اور خود مختاری کے اظہار و اقرار کے لئے دوسروں کی زندگی، مال اور آزادی سے کھیلتے رہتے تھے۔ ان کا نظریۂ حیات و سیاست معاصر ریاستوں اور اقوام کے نظریاتِ زندگی سے کچھ مختلف نہ تھا۔ مادی آسائشیں، دنیاوی راحتیں اور اقتصادی سہولتیں ان کا بھی مطمحِ نظر تھیں۔ اگرچہ ایرانی ساسانی سلطنت، رومی بازنطینی سلطنت اور ان دونوں کی ماتحت و باجگذار بادشاہتیں —— لخمی، غسانی، کندی اور حبشی وغیرہ —— ایک منظم و مرتب سیاسی ڈھانچہ رکھتی تھیں اور ان کے مقابلے میں عرب کی بدو قبائلی آبادیاں خاص کر اور شہری بستیاں

(اھل الحضارۃ) عام طور سے منظم نظام سیاست سے عاری اور تہی تھیں[۲]، تاہم دونوں کے نظریہ ہائے حیات اور سیاسی نظاموں کے اثرات یکساں تھے۔ دونوں کا بس ایک مقصد تھا: اپنی فلاح دوسروں کی قیمت پر۔

ان کے برعکس اسلامی ریاست کا مقصود صرف اپنی فلاح یا محض امتِ مسلمہ کی بہبودی نہ تھا۔ اس کا مطمحِ نظر پوری انسانیت، تمام کائناتِ انسانی کی فلاح و بہبود تھا۔ اس عظیم و بے مثل مقصود کے ساتھ یہ ریاست وجود میں آئی تھی۔ عملی طور پر اس کا ارتقاء ہجرتِ نبوی کے معاً بعد شروع ہوگیا اور حیاتِ نبوی کے آخری دنوں میں وہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا جب پورے جزیرہ نمائے عرب نے مدینہ کے حاکم و رسول کی حکمرانی تسلیم کر لی تھی لیکن اس اسلامی ریاست کا نظریاتی ارتقاء اس سے بہت پہلے شروع ہوا تھا۔ اس کی پہلی اینٹ تیرہ برس قبل غارِ حرا میں اُترنے والی پہلی وحی نے جبرئیل امین کے ہاتھوں قلب نبوی میں رکھی تھی اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ ایک کے بعد دوسری اینٹ رکھی جاتی رہی اور نظریاتی ارتقاء کا عمل جاری رہا تا آنکہ اس کا دھارا عملی ارتقاء کے دھارے میں مل گیا۔ اور پھر دونوں کی تکمیل ساتھ ساتھ ہوئی۔ لیکن نقطۂ کمال تک پہنچنے کے لئے ریاستِ اسلامی کو مختلف تشریعی و تکوینی منزلوں، سیاسی نشیب و فراز اور معاشرتی شکست و ریخت کے تعمیری عمل سے گزرنا پڑا۔

تاریخی و نظریاتی پس منظر

عہدِ نبوی کی اسلامی ریاست کا بنیادی پتھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سماجی تحفظ کا نظام تھا جو بذاتِ خود "اُمۃ" کے تصور و نظریہ پر مبنی تھا۔ اُمتِ مسلمہ کا کلیدی تصور و نظریہ بنیادی طور سے مکی دورِ حیات میں ابھرا اور نشو پذیر ہوا تھا جو ساتویں صدی عیسوی کے عربوں کے سیاسی نظریے سے یکسر مختلف تھا۔ غیر مسلم عربوں کا مرکزی خیال قبیلہ تھا جو بنیادی طور پر خون کے رشتہ[۳] کی اساس پر ایک انسانی گروہ ہوتا تھا۔ اگرچہ قبیلے حِلف، وِلاء اور جوار کے مصنوعی رشتوں[۴] کی بناء پر اپنے ارکان کی عددی قوت اور اس کے نتیجے میں عسکری طاقت بڑھاتے رہتے تھے تاہم ان کی سماجی بنیاد خون کا رشتہ ہی فراہم کرتا تھا۔ مصنوعی رشتوں کے ذریعہ نئے سیاسی و سماجی اتحاد و معاہدے تو قائم کئے جا سکتے تھے مگر وہ انسانی محبت، بھائی چارے، قربانی اور دوسروں کی خاطر کچھ کرنے کا جذبہ عام طور سے نہیں پیدا کرتے تھے۔ پھر یہ مصنوعی رشتے اپنے دائرۂ کار اور افادیت کے اعتبار سے محدود ہوتے تھے۔ عموماً ان کا مقصد دشمن قبائل کے خلاف سیاسی اور عسکری اتحاد قائم کرنا ہوتا تھا۔ مصنوعی رشتوں کی بناء پر خون کے رشتہ کی اہمیت میں ذرا بھی کمی نہ آئی تھی اور نہ ہی قبیلہ کی سیاسی اہمیت میں۔ چنانچہ عرب کے قبائلی نظام میں سماجی تحفظ کا سرچشمہ قبیلہ کی اجتماعی طاقت تھی۔ قبیلہ افراد کو جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دیتا تھا تو معاوضہ میں اپنے لئے غیر مشروط و غیر متزلزل وفاداری کا طالب تھا۔ یہی قبائلی فطرت تھی جس نے ہر اہم اور بڑے قبیلہ کو ایک آزاد و خود مختار سیاسی و معاشرتی وحدت کا درجہ عطا کر دیا تھا۔ اگرچہ عربوں کو، چاہے وہ بدو ہوں یا شہری، منظم و باقاعدہ سیاسی نظاموں خاص کر اپنی سرحدوں پر واقع اس وقت کی دو عظیم ترین سلطنتوں —— بازنطینی اور ساسانی —— اور ان کی ماتحت متعدد دوسری بادشاہتوں اور ریاستوں کا بخوبی علم و تجربہ تھا تاہم ان کو

اپنی قبائلی زندگی اور اس کی عطا کردہ آزادی و خود مختاری اتنی عزیز تھی کہ وہ مرکزیت و تنظیم کے خیال سے لرزاں اور ریاست کے تصور سے بے بہرہ تھے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب کبھی ان کو ریاستی تنظیم کا خیال آتا تھا جو عموماً ایک یا دو قبیلوں یا شہروں اور علاقوں تک محدود ہوتا تھا تو صرف بادشاہت (ملوکیۃ)[۵] ہی کو اپنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کی وجہ شاید جزیرہ نمائے عرب میں قائم بعض قدیم و معاصر بادشاہتوں کا اور سرحدوں پر رومی اور ایرانی سلطنتوں کا اثر تھا۔

امت اسلامی کا جو تصور مکہ میں پیدا اور ترقی پذیر ہوا اس کی بنیاد خون کے رشتے پر نہیں بلکہ مذہب ——— اسلام ——— پر رکھی گئی تھی۔ یہ ایک انقلاب آفریں تصور تھا۔ اپنی ماہیت و حقیقت کے اعتبار سے ہی یہ نظریہ ان تمام سماجی تفریقوں، سیاسی و سماجی اونچ نیچ اور اقتصادی ناہمواری کی کاٹ کرتا تھا جس کی بنیاد خون کے رشتہ پر قائم سماج اور ریاست میں ہوتی ہے۔ چنانچہ رنگ، نسل، وطن، علاقے اور قوم کے تمام تفرقے مٹ گئے تھے اور اُمتِ اسلامی میں وہ تمام لوگ شامل اور اس کے رکن بن گئے جو اسلام کو مانتے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ یہ خیال کہ اُمتِ اسلامی کا یہ تصور و نظریہ واضح طور سے قرآن و حدیث اور سنت نبوی میں بیان نہیں ہوا ہے بلکہ ہر جگہ مضمر و محذوف ہے[۶] صحیح نہیں ہے۔ قرآن کی متعدد آیات، بے شمار احادیث نبوی اور مختلف سنن رسول میں اس نظریہ کو واضح اور واشگاف انداز میں بیان کیا گیا ہے[۷]۔ پھر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدائے واحد و مطلق کا پیغمبر تسلیم کرنا ہی یہ ثابت و لازم کر دیتا ہے کہ رسول کا ایک فرضِ منصبی تو یہ ہے کہ وہ پیغامِ خداوندی کو قبول کر کے اسے انسانوں تک پہنچائے اور پھر اس کو عملی جامہ پہنا کر ان کے لئے ایک اُسوۂ عمل قائم کرے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبرِ خدا کی مرضی اور اس کے قوانین و احکام کو انسانوں تک پہنچاتا اور پھر ان پر عمل کراتا ہے۔ اس اعتبار سے پیغمبر خدا کا نائب اور جانشین ارضی ہوتا ہے اور اصل کارساز و مقتدر خداوند تعالیٰ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے خدا خود امتِ اسلامی کا حاکمِ اعلیٰ ہوتا ہے۔ گویا کہ اسلامی معاشرہ اور اُمت کا سرچشمہ حکمرانی اور فرمانروائی جس کو موجودہ سیاسی اصطلاح میں اقتدارِ اعلیٰ یا حاکمیت مطلقہ تامہ کہتے ہیں۔ خدا کی ذات اقدس ہوتی ہے کیونکہ وہ تمام کائنات کا خالق و مالک ہے۔ مگر اس خدائی اقتدارِ اعلیٰ کو نافذ و جاری پیغمبر کی ذات کرتی ہے اور اس کے بعد یہ ذمہ داری اس کے سیاسی خلفاء پر انفرادی طور سے اور امتِ مُسلمہ پر اجتماعی طور سے عائد ہوتی ہے۔ عہد جدید کے بعض عظیم مسلم مفکرین نے قرآن مجید کی وہ سیاسی تعلیمات ایک جگہ جمع کر دی ہیں جو اسلام کے تصورِ کائنات، حاکمیتِ الٰہیہ، اللہ کی قانونی حاکمیت، رسول کی حیثیت، قانون کی بالاتری، خلافتِ الٰہی اور اس کی اجتماعی اہمیت، اسلامی ریاست کی اطاعت کے حدود، اس کے مقصد، رعایا یا باشندوں اور شہریوں کے حقوق، حکمرانوں کی صفات و خصائص اور سیاسی اصولوں سے متعلق ہیں[۸]۔ ان سے اسلام کے سیاسی اصولوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور اس کے اصولِ حکمرانی مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔

مکہ میں چونکہ قریشی اشرافیہ کی بالادستی ہر میدان حیات میں قائم و دائم تھی اس لئے وہاں اسلام اُمت کے تصور کو ایک اخلاقی و نظریاتی بنیاد تو فراہم کر سکا لیکن اس کو مکمل طور سے کوئی عملی شکل نہ دے سکا۔ تاہم جب اسلام مکہ میں ایک سماجی اور سیاسی نظریہ کی شکل میں اُبھرا تو اسلامی اُمت کے ایک مخصوص و ممتاز نظریہ کا اولین اظہار مواخاۃ (بھائی چارے) کی شکل میں ہوا۔ ابن اسحاق اور دوسرے ابتدائی سیرت نگاروں اور اسلامی مورخین کا بیان ہے کہ جب مکہ میں مسلمانوں کی ایک معتدبہ تعداد ہو گئی

اور ایک جماعت وجود میں آگئی تو آپ نے مسلمانوں کے درمیان مواخاۃ قائم کردیا۔ یعنی دو مکی مسلمانوں کو ایک دوسرے کا اصلی بھائی بنادیا جاتا تھا جو عملی و نظری دونوں اعتبار سے خون کے رشتہ سے زیادہ پکا اور مستحکم رشتہ بن جاتا تھا۔ اس طرح حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی اور حضرت زبیر بن عوام اسدی بھائی بھائی بن گئے تھے تو دوسری طرف جناب رسالتمآب نے حضرت علی کو اپنا اسلامی بھائی قرار دیا تھا۔[9] ظاہر ہے کہ اسی طرح دوسرے تمام مسلمانانِ مکہ ایک دوسرے کے بھائی بنے تھے۔ اس نئے رشتۂ اخوت نے ایک طرف تو اسلام یا مذہب کی افادیت، اہمیت اور فعالیت بڑھا دی اور مسلمانوں کے ذہن نشین کردی تھی تو دوسری طرف دو مسلمانوں کے درمیان جذبۂ اخوت کو مضبوط تر کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو اپنے خاندان اور رشتہ داروں سے کٹ جانے کے غم کو ہلکا کر دیا تھا اور جینے کا ایک عزم جزوم، ایک جوش و ولولہ اور ایک نیا رنگ و آہنگ ان کو عطا کر دیا تھا۔ مکی دور کا یہ رشتۂ اخوت و مواخات اُمتِ اسلامی کے قیام کا پہلا بنیادی پتھر تھا۔ مگر مکی عہد میں متعدد اور گوناگوں سماجی، سیاسی اور اقتصادی دشواریوں اور رکاوٹوں کے سبب اس پتھر پر امتِ اسلامی کی مکمل عمارت تعمیر نہیں کی جاسکی۔ تقدیرِ الٰہی نے یہ اہم ترین کام مدنی مسلمانوں کی نصرت و حمایت کے سایہ میں لینا چاہا تھا اس لئے ہجرتِ مدینہ تک ملت و امتِ اسلامی کو اپنے مکمل و منظم وجود و ارتقاء کے لئے انتظارِ ساغر کھینچنا تھا۔

(۱) پہلا مرحلہ: ہجرت

یثرب میں اسلام کا تعارف کافی پہلے ہوچکا تھا۔ روایت ہے کہ شہر انصار کا ایک سربر آوردہ و سرکردہ سردار سوید بن صامت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں بعثت کے صدرِ اوّل ہی میں مکہ جاکر حاضر ہوا تھا اور اسلام کی حقانیت کا قائل بھی ہوگیا تھا لیکن شرفِ اسلام سے محروم رہا اور جنگِ بعاث (۶۱۵ء) میں اظہار و اقبالِ اسلام سے قبل مارا گیا۔[10] اسی طرح اسی زمانہ کے قریب اوس کے ایک اہم سردار ایاس بن معاذ بھی اسلام سے مکہ میں متعارف ہوئے تھے اور وہ بھی اسلام کے اعلان و اجہار سے پہلے جنگِ بعاث میں مارے گئے۔[11] محض یہی دو واقعات تنہا نہیں تھے متعدد ایسے واقعات رہے ہوں گے اور اسلام سے یثرب والے ابتدا ہی میں روشناس ہو گئے ہوں گے کیونکہ ان کے مکہ والوں سے تجارتی، معاشرتی اور مذہبی تعلقات تھے اور دونوں شہروں کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ برابر لگا رہتا تھا۔ اسلام کے اس ابتدائی تعارف نے یثرب میں اس کے قبول کرنے کے لئے زمین ہموار اور ذہن تیار کر دئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۰ نبوی / ۶۲۰ء میں آپ نے خزرج کے چھ صالح و سرکردہ جوانوں کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے بلا کسی پس و پیش کے اسے قبول کرلیا۔[12] بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ تھا کیونکہ مسلمان ہونے والے یثربیوں کی تعداد بہت حقیر تھی تاہم یہی سرزمین یثرب میں اسلام کا پہلا پودا تھا اور اسی نے اسلامی اُمت کا پہلا بیج بویا تھا۔ ان نومسلم خزرجیوں نے اسلام کی اشاعت کا فریضہ اپنے ذمے لے لیا اور اس تندہی اور جوش سے کام کیا کہ یثرب میں مسلمانوں کی تعداد معتدبہ ہوگئی[13] اور ان میں سے بارہ مسلمان نمائندوں نے دوسرے برس ۱۱ نبوی / ۶۲۱ء میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ جاکر ملاقات کی اور پہلی بیعت عقبہ کی۔ یہ معاہدہ یا بیعت اپنی

شرائط کے اعتبار سے سیاسی لحاظ سے زیادہ اہم نہ تھی کہ ان کے مطابق مسلمانانِ یثرب نے چند اخلاقی ضوابط کی بجا آوری کا وعدہ
کیا تھا۔ اسی بنا پر اس بیعت کو ہمارے مستند مورخین عموماً بیعت النساء (عورتوں کی بیعت) کے نام سے یاد کرتے ہیں کہ اسی قسم کے
وعدے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان خواتین سے قبولِ اسلام کے وقت لیتے تھے[۱۴]۔ سیاسی اہمیت نہ ہو، مگر ان شرائط نے
مسلم سماج کے اخلاقی اصول وضع کئے تھے اور اُمتِ اسلامیہ کو ایک پاکیزہ، قائم و دائم روایات فراہم کی تھیں جنہوں نے بعد میں
اسلامی معاشرہ کی اساسی تشکیل کی تھی۔ اس بیعت کی دوسری سماجی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں یثرب کے دونوں متحارب و متصادم قبیلوں
— اوس و خزرج — کے نمائندے شامل تھے۔ یہ حقیقت اور یثرب میں اسلام کی اشاعت اور اس کے سماجی پس منظر کے
واقعات ثابت کرتے ہیں کہ اسلام کو یثرب میں روزِ اوّل سے ایک معاشرہ ساز سماجی اصلاحی تحریک کے طور پر قبول کیا گیا تھا کیونکہ اسلام
نے مدتوں سے باہم دست بگریباں رہنے والے یثربیوں کو ایک دوسرے کا بھائی، ہمدم اور دوست بنا دیا تھا۔ شہر کے دونوں
حریف و متقابل سماجی طبقات نے اسلام کی اس شیرازہ بندی کی صلاحیت اور سماجی فعالیت کو بخوبی سمجھ لیا تھا[۱۵]۔ یہی وجہ ہے کہ یثرب
میں اسلام کی اشاعت قبائلی خطوط پر نہیں ہوئی تھی کہ ایک قبیلہ یا چند خاندانوں میں وہ محدود رہتی بلکہ وہ طبقاتی حد بندی کو پار کر کے
آفاقی بنی تھی اور اس طرح اسلام نے قبائلی عصبیت کو دبایا تھا اور ایسا نہیں ہونے دیا تھا کہ ایک قبیلہ کی دشمنی یا تعصب میں دوسرے
مخالف قبیلہ نے اسے ماننے سے انکار کر دیا ہو۔ بہرحال جس طرح سے بیعت عقبۂ اولیٰ میں چھ خزرجی اور تین اوسی مسلمانوں نے
دستِ مبارک رسول پر بیعت کی تھی اور ایک مشترک مقصد کے حصول کی خاطر ایک دوسرے سے جس طرح تعاون کا اظہار کیا تھا وہ
در اصل یثرب میں امتِ مسلمہ کے قیام کا پیش خیمہ تھا۔

ظاہر ہے کہ اسلام کی اشاعت پر امتِ مسلمہ کا اور اس پر اسلامی ریاست کے قیام کا انحصار تھا۔ مدینہ منورہ میں اشاعتِ اسلام
کا کام یثربی — اوسی اور خزرجی — مسلمان جس تندہی، جوش اور ولولے سے کر رہے تھے اور اس میں جتنی ان کو کامیابی
مل رہی تھی اس کے لئے کسی خارجی مدد کی ضرورت نہ تھی[۱۶]۔ تاہم مسلمانانِ شہر نو کی مذہبی و تعلیمی تربیت اور اس سے زیادہ معاشرتی
تنظیم کے لئے ایک ایسے صحابیٔ رسول کی ضرورت تھی جو کہ اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکے اور مقامی قبائلی تعصبات سے بلند تر ہو تاکہ
دونوں طبقات اس پر یکساں اعتماد و یقین کر سکیں۔ اسی لئے انہوں نے بیعتِ عقبۂ اولیٰ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے
ایک معلم کی درخواست کی تھی جو ان کو قرآن اور اسلام کی تعلیم دے سکے۔ آپ کی نگاہِ انتخاب قریش کے خاندان عبد الدار کے
ایک نوجوان مسلمان حضرت مصعب بن عمیر پر پڑی جنہوں نے راہِ حق میں خاندانی وجاہت و ثروت اور دنیاوی عیش و عشرت کو
تج دیا تھا۔ مدینہ پہنچ کر حضرت مصعب عبدری نے اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے کی شیرازہ بندی کا بھی کام کیا۔
وہ مسلمان آبادی کے معلم، امام اور ایک معنی میں خلیفہ و نائبِ رسول تھے[۱۷]۔

یثربی مسلمانوں اور حضرت مصعب عبدری کی کوششیں رنگ لائیں اور یثرب میں اسلام اتنی تیزی اور ہمہ گیری سے پھیلا
کہ اوس و خزرج کا کوئی خاندان خاص مدینہ میں ایسا نہ تھا جس کے گھر میں خدا اور رسول کا نام نہ گونجتا ہو۔ مورخین کا بیان ہے
کہ اوس مناۃ کے صرف چار گھرانے بنو خطمہ، بنو وائل اور بنو واقف اور بنو امیہ بن زید دائرہ اسلام کے باہر رہ گئے تھے[۱۸]۔ یثرب

کی سرزمین پر اسلام کی کامیابی کا اظہار اور پیغمبر اسلام کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے ۱۲ سنہ نبوی / ۶۲۲ سنہ میں امتِ مسلمہ کے تقریباً بہتر اشخاص وافراد مکہ میں بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ (۱۹) یہ بیعتِ عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے۔ اور اس کو بیعتِ حرب (جنگ کی بیعت یا معاہدہ) بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس موقعہ پر خزرج واوس کے مسلمان نمائندوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وطن میں آبسنے کی دعوت دی اور جب آپ نے اسے قبول کر لیا تو انھوں نے نہ صرف خدا اور اس کے رسول کی غیر مشروط و غیر متزلزل وفاداری کا دم بھرا تھا بلکہ آپ کے جان و مال کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔ دراصل یہ معاہدہ دفاعی اور جارحانہ جنگ دونوں کا معاہدہ تھا۔ (۲۰) یہ وہ بنیادی اور کلیدی پتھر تھا جس پر ہجرت کے بعد یثرب میں اُمتِ اسلامی کی بنیاد رکھی جانی تھی۔

یثرب میں ہجرتِ نبوی تک امتِ مسلمہ کی تشکیل وشیرازہ بندی کے لئے آپ نے بارہ اشخاص پر مشتمل سربرآوردانِ یثرب کی ایک جماعت مقرر کی۔ ان میں سے ہر ایک نقیب تھا اور ان سب پر ایک نقیب النقباء تھا۔ نو نمائندے خزرج کے مختلف قبیلوں سے اور تین اوس کے مختلف گھرانوں سے منتخب کئے گئے تھے۔ یہ نکتہ اہم ہے کہ نقیبوں کے ناموں کا انتخاب خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے نمائندگانِ یثرب نے کیا تھا۔ اس جماعتِ نقباء کی سرکردگی اور سیادت وریاست کی فضیلت کا سہرا حضرت اسعد بن زرارہ کے سر بندھا تھا جو خاندان بنی نجار / خزرج کے ایک معزز اور بااثر سردار تھے اور جنہوں نے وطنِ مالوف میں اسلام کی اشاعت اور اُمتِ مسلمہ کی شیرازہ بندی کا کام بڑی لیاقت اور خوبی سے کیا تھا۔ اور اس طرح اپنی قائدانہ صلاحیت، معاملہ فہمی، حُسنِ تدبیر اور مقبولیت وسیادت کا ثبوت دے چکے تھے۔ (۲۱)

بیعتِ عقبہ ثانیہ دراصل ہجرتِ یثرب کا دیباچہ تھی۔ اس نے مکہ کے ستم رسیدہ اور منتشر مسلمانوں کے لئے ایک جائے پناہ فراہم کر دی تھی، جہاں نہ صرف مسلمانانِ مکہ بلکہ مسلمانانِ عرب آزادی سے اپنے مذہب وعقیدہ کے مطابق زندگی بسر کر سکتے تھے بلکہ امتِ مسلمہ کی تشکیل کر سکتے تھے جو ہجرت کا اصل مقصد تھا۔ اس ضمن میں یہ نکتہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ محض ہجرت مقصود نہ تھی اور نہ ہی اس کی برکت میں ملنے والی آزادیٔ فکر وعقیدہ وعمل۔ اگر یہی مطلوب رہا ہوتا تو ۵ سنہ نبوی / ۶۱۵ سنہ میں ہجرتِ حبشہ کافی ہوتی کیونکہ مسلمانانِ مکہ کو نجاشی کے حبش میں مکمل مذہبی وسماجی تحفظ حاصل تھا۔ حبشہ کو بے سروسامان مکی مسلمانوں نے اس لئے ہجرت کی تھی کہ مکہ کے مخالفان ودشمنانِ اسلام نے نہ صرف ان کی آزادیٔ فکر وعمل پر قدغن لگا دی تھی بلکہ ان پر عرصۂ حیات بھی تنگ کر دیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی تعذیب وظلم وجبر سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے ان کو ہجرت کی اجازت دے دی تھی مگر تاریخِ اسلامی میں کسی روایت سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کی ہجرت کے بارے میں سوچا بھی ہو۔ اذنِ خداوندی ملنے کے بعد آپ نے جب ہجرت کے بارے میں سوچنا اور مختلف مقامات کے انتخاب کے بارے میں غور کرنا شروع کیا تھا تو بھی آپ کی نگہِ فکر اور نظرِ انتخاب جزیرہ نمائے عرب کے کسی مرکزی مقام ہی پر پڑتی تھی۔ (۲۲) وطنِ ثانی بلکہ معہدِ اسلام کے لئے مدینہ کا انتخاب سیاسی، سماجی، اقتصادی، فوجی بلکہ ہر اعتبار سے مناسب ترین تھا جسے بعد کے تاریخی واقعات نے صحیح ثابت کر دیا۔ تاریخی دھارے بھی اسی سمت میں بہہ رہے تھے اور ہجرت سے دو سال پہلے کے تاریخی واقعات اور عناصر نے مدینہ کے انتخاب پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی۔ (۲۳)

بیعتِ عقبہ ثانیہ نے مسلمانانِ مکّہ کی ہجرتِ مدینہ کو ایک طرح سے ناگزیر بنا دیا تھا۔ چنانچہ اجازتِ الٰہی اور اذنِ نبوی ملتے ہی صحابہ کرام نے مدینہ کا رُخ کیا۔[۲۴] یہ صحیح خیال نہیں ہے کہ مسلمانانِ مکہ میں سے اکثر نے چھُپ کر اور عالمِ بے سروسامانی میں ہجرت کی تھی دراصل مہاجرینِ مدینہ کے تین طبقات کئے جاسکتے ہیں: اول وہ مالدار، بااثر اور سیاسی و سماجی اعتبار سے سربرآوردہ مکی مسلمان تھے جنہوں نے علانیہ باجماعت اور اپنی تمام منقولہ جائدادوں، اثاثوں اور مال و دولت سمیت ہجرت کی تھی۔ دوسرا طبقہ ان مہاجرینِ مکہ پر مشتمل تھا جو قریش اور دوسرے عرب قبائل کے مختلف خاندانوں کے نوجوان، سماجی و سیاسی طور سے خاصے معزز افراد تھے مگر اقتصادی اعتبار سے اپنے خاندان یا قبیلے پر منحصر تھے اس لئے بوقتِ ہجرت وُہ اپنے ساتھ زیادہ مال و دولت بھی نہ لے جاسکے تھے اور عموماً چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں عازمِ سفر ہُوئے تھے۔ ان میں سے کچھ قریشی روک ٹوک کی بنا پر یا اس سے زیادہ اپنے خاندان اور قبیلہ والوں کے خوف سے چھُپ کر ہجرت کے سفر پر نکلے تھے۔ اور تیسرا طبقہ ان نادار، بے آسرا اور سماجی و اقتصادی طور پر مجبور مسلمانوں پر مشتمل تھا جن کو مکہ میں کسی کی پناہ و حمایت حاصل نہ تھی چنانچہ وُہ موقع پاتے ہی نکل کھڑے ہوتے تھے۔ اور ایسا عموماً خفیہ طور سے ہی ممکن تھا۔[۲۵] مکّہ میں رہ جانے والے مسلمانوں میں صرف غلام، موالی، مفلسی سے مجبور لوگ ہی نہیں رہ گئے تھے بلکہ دُوسرے طبقے کے کافی افراد ایسے تھے جو اپنے خاندان اور قبیلہ والوں کی چیرہ دستی اور جبر کی بنا پر ہجرت نہیں کر سکے تھے بلکہ ان میں سے بعضوں کو تو ہزار ہا بہانوں اور مکر و فریب سے مدینہ سے واپس لاکر قید کر دیا گیا تھا۔ متعدد جاں نثارانِ رسول جیسے حضرات ابوبکر، علی، طلحہ بن عبید اللہ تیمی، عبد الرحمٰن بن عوف، زبیر بن عوام اور دُوسرے کئی عظیم و اکابر صحابہ ایسے تھے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کی راہ دیکھ رہے تھے۔ بعض مورخین کا یہ خیال کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ مکرمہ میں اکابر صحابہ میں سے صرف اول الذکر دو بزرگ یا محض گنتی کے چند مسلمان رہ گئے تھے صحیح نہیں ہے۔[۲۶] جاں نثاروں کی کافی بڑی جماعت ہم رکابی کا شرف حاصل کرنے کی منتظر تھی یا ذاتِ نبوی کو نرغۂ اعدا میں تنہا چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہ تھی۔ جو بزرگ و نوجوان صحابہ کرام پہلے ہجرت کر گئے تھے ان پر کوئی نکیر نہ تھی کہ وہ اذنِ نبوی سے گئے تھے اور وہاں ایک عظیم تعمیری کام میں دل و جان سے لگ گئے تھے یعنی نئے مرکزِ اسلامی میں تنظیمِ معاشرہ اور تشکیلِ اُمت میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ بالآخر وُہ ساعتِ مسعود آ پہنچی کہ حکمِ الٰہی نے نبیٔ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رخصت و اجازتِ ہجرت دی اور آپ اپنے رفیقِ غار، صدیقِ دیرینہ، جاں نثارِ قدیم حضرت ابوبکر تیمی کی معیت میں پنجشنبہ یکم ربیع الاول ۱ھ/ ۲۴ اگست ۶۲۲ء کو ہجرتِ مدینہ کے سفر پر نکلے اور ۱۲ ربیع الاول ۱ھ/ ۴ ستمبر ۶۲۲ء کو قبا پہنچے۔[۲۷]

قبا میں حضورِ پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد ہی ریاستِ اسلامی اور اُمتِ مُسلمہ کی تشکیل و تنظیم کا پہلا دن ہے۔ کیونکہ روایات شاہد ہیں کہ قبا میں آپ نے جو پہلا کام کیا وہ پہلی مسجد نبوی کی تعمیر تھی۔[۲۸] اگرچہ ورودِ مسعود سے قبل قبا اور مدینہ کے مسلمان نمازیں ادا کرتے تھے لیکن ان کی کوئی باقاعدہ اور مرکزی مسجد نہ تھی۔ اسلام میں مسجد کو جو مرکزی اہمیت حاصل ہے اور صدرِ اول میں جو اس کی سیاسی اور سماجی حیثیت تھی اس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں کہ وہ معروف و مشہور حقیقت ہے۔ بہرحال مسجدِ قبا کی پہلی اینٹ دراصل مدنی اسلامی معاشرہ کی کلیدی اینٹ تھی۔ دو ہفتے یا چودہ راتیں قبا میں قیام کے بعد آپ مدینہ منورہ پہنچے جبکہ تاریخ ۲۶ ربیع الاول ۱ھ/ ۱۸ ستمبر ۶۲۲ء تھی۔[۲۹]

(۲) دُوسرا مرحلہ : اُمّت کی تشکیل

مقبول عام اور مشہور خیال ہے کہ چونکہ مہاجرینِ مکہ بالکل خالی ہاتھ ، تہی دست اور بے سرو سامان آئے تھے اس لئے وہ مدینہ کے مسلمانانِ اوس وخزرج کی فیاضی ، وسیع القلبی اور مہمان نوازی پر اپنی معیشت و معاش کے لئے منحصر تھے مدنی مسلمانوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کی جس محبت ، حوصلہ مندی ، دل سوزی اور خلوص سے مہمانی کی تھی وہ تاریخ اسلام کا ایک روشن باب' اسلامی تعلیمات اخوت ومساوات کا بے نظیر نمونہ اور مذہبی تعلق و بھائی چارے کا عظیم ترین اُسوہ ہے جس نے وسیع قلب وفیاض و مخلص مدنیوں کو تاقیامت انصار اللہ و الرسول کے عظیم وقابلِ فخر لقب سے ممتاز ومشہور کر دیا ۔ انصارِ مدینہ کی مدد اور تعاون' مہمان نوازی اور محبت ، پُرخلوص تعلقِ خاطر اور دل سوزی سے کسی دیانت دار مورخ کو انکار نہیں ہوسکتا تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام مہاجرین مکہ بالکل ہی بے سروسامان و تہی دست نہ تھے اور وہ محض فیاضی وسخاوتِ انصار پر منحصر نہ تھے اور نہ ہی وہ مدنی معیشت پر بوجھ بنے تھے جیسا کہ عام خیال ہے ۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے مدینہ کے معاشی استحکام میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا تھا اور مسلم معیشت کو نئی جہتیں عطا کی تھیں جن کا جائزہ کہیں اور لیا جا چکا ہے [۳۰] اور جس سے سرِدست ہمیں بحث نہیں ہے ۔ لیکن مہاجرینِ مکہ کی ناداری اور مفلسی کے مفروضے نے اس غلط تصور کو شہرت دی ہے کہ مہاجرینِ مکہ اور انصارِ مدینہ کے درمیان رشتۂ محبت و اخوت —— مواخاۃ —— اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ بے گھر در مسلمانوں کو اقتصادی بنیاد فراہم کی جائے ۔ یہ صحیح ہے کہ انصارِ مدینہ نے مدتوں مہاجرینِ مکہ کی مہمان نوازی کی تھی اور ان کو اپنے گھروں میں رکھا اور کھلایا پلایا تھا حتیٰ کہ اپنی دُور افتادہ زمینیں ان کو بخش دی تھیں اور کسی حد تک ان کو اپنی جائدادوں بالخصوص باغوں اور کھیتوں میں شریک بھی کر لیا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانانِ مکہ نے اپنے مالی اور اقتصادی وسائل خود تلاش کر لئے تھے اور وہ کسی کے دستِ نگر محض نہ تھے ۔ [۳۱]

مواخاۃ دراصل مسلم معاشرہ —— امۃ —— کی تشکیل کا دوسرا مرحلہ تھا جس کا مقصد ایک نووارد شہر کو ایک قدیم باشندے کے ساتھ رشتۂ اخوت ومحبت میں منسلک کر دینا تھا تاکہ خارجی واندرونی ، ملکی وغیر ملکی ، اپنے پرائے اور فرزندان زمین و تازہ واردان بساط اور سب سے بڑھ کر مکی اور مدنی کا فرق مٹ جائے اور مدینہ کی مسلم آبادی ایک مذہبی وحدت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سماجی اور معاشی وحدت بھی ہو جائے ۔ جس طرح اسلام اور پیغمبر اسلام نے مذہبی نظریۂ اخوت کے ذریعہ اوس و خزرج کی قبائلی تفریق اور قبائلی عداوت کو مٹایا اور ان کو ایک مسلم اکائی بنایا تھا بالکل اسی طرح وہ مدینہ والوں اور مکہ والوں یا انصار و مہاجرین کی سماجی تفریق مٹا کر مدینہ میں صرف ایک سماجی وحدت —— مسلم معاشرہ —— کے تصور کو فروغ بلکہ عملی شکل دینا چاہتے تھے ۔

چنانچہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی تعمیر قریب قریب مکمل کر لی تو روایات کے مطابق مواخاۃ کا پہلا عملی قدم اٹھایا گیا ۔ ابتدائی مرحلے میں ابن اسحاق کے مطابق تقریباً ۴۵ مہاجرین اتنے ہی انصاریوں کے بھائی بنائے گئے [۳۲] ۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مکہ مکرمہ میں آپ نے دو مکی مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا تھا اور مدینہ منو

میں ایک مہاجر اور ایک انصاری کے درمیان یہ رشتۂ مودت قائم کیا تھا۔ شیرازہ بندی کے اس حکیمانہ معاملے اور طریق نے پہلے مکہ کے قبائلی تفرقوں کو مٹایا تھا، نفرتوں کو ختم کیا تھا اور عصبیت کو نابود کیا تھا اور اب اس کو وسعت دے کر دو شہروں کے سماجی و قبائلی تعصبات کا خاتمہ کر کے دو مختلف سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تہذیبی پس منظر کے طبقوں میں ہم آہنگی پیدا کی تھی۔ یہ دراصل اس سماجی عمل شیر و شکر کا آغاز تھا جس نے روزِ اول سے اخوت اسلامی کا اعلان و دعویٰ کیا تھا اور حجۃ الوداع کے عظیم موقعہ پر عالمی اسلامی برادری اور آفاقی اخوتِ اسلامی کے عظیم نظریہ پر منتج ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں کالے، گورے، سرخ و سیاہ، رنگدار و سفید، عربی عجمی غرض کہ نسل، وطن و علاقہ اور رنگ وغیرہ پر مبنی تمام امتیازات کو مٹا دیا گیا تھا اور ایک ایسے آفاقی اور عالمی معاشرہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا جس میں تمام مسلمانانِ عالم بلاکسی امتیاز و تفریق کے ایک دوسرے کے بھائی اور مذہبی اور سماجی طور پر ہم پلہ، ہم سر اور مساوی تھے۔

عملی اعتبار سے مواخاۃ کا رشتہ خون کے حقیقی رشتوں سے کہیں زیادہ بڑھ گیا تھا۔ عہد نبوی میں مواخاۃ نے جن دو مہاجر اور انصاری مسلمانوں یا دو خاندانوں اور گھرانوں کو رشتۂ مودت و الفت میں باندھا تھا۔ وہ اتنا پائیدار اور مستحکم نکلا کہ اکثر و بیشتر صحابۂ کرام نے اپنے مذہبی یا مواخاۃ کے بھائیوں کو اپنے خون کے رشتہ داروں پر ہر لحاظ سے ترجیح دی اور تا عمر وہ اس عظیم رشتۂ اخوت کو سرمایۂ حیات سمجھتے اور نبھاتے رہے۔[۳۳] ہماری تفسیری، اخباری، سیرت اور حدیث کی روایات یہاں تک اعلان کرتی ہیں کہ ایک مذہبی بھائی کے انتقال پر اس کا ترکہ دوسرے مذہبی بھائی کو ملتا تھا اور خون کے حقیقی رشتے دار اس سے محروم رہتے تھے۔[۳۴] لیکن اس دعوے کی تصدیق یا ثبوت میں ہمیں کوئی تاریخی واقعہ نہیں ملتا جس کے مطابق متوفی کی جائداد کا وارث کوئی مسلم بھائی ہوا ہو۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورہ انفال کی آیت ۷۲ میں مذکور الفاظ خداوندی بعضھم اولیاء بعض (وہ لوگ باہم بھائی بھائی ہیں) کی تفسیر میں مسلم بھائی کے لئے اپنے متوفی بھائی کی جائداد و ترکہ میں جس حق کا دعویٰ کیا گیا ہے وہ اس نظریہ و خیال کا منطقی نتیجہ ہے جس کے تحت مواخاۃ کے رشتہ کے قیام کا سبب مہاجرین کی اقتصادی ناداری کو بتایا گیا ہے۔ اسی بنا پر بعض مغربی مورخین کا خیال ہے کہ ترکہ و وراثت میں مشکلات ہونے کے سبب غزوۂ بدر کے معاً بعد یا کچھ مدت کے بعد رشتۂ مواخات ہی کو ختم کر دیا گیا۔[۳۵] ہمارے مسلم مورخین میں بعض اس کے قائل ہیں کہ آیات متعلقہ بہ وراثت کے نزول کے بعد صرف میراث کا حق مسلم یا دینی بھائی سے حقیقی اور خون کے رشتہ داروں کو منتقل کر دیا گیا تھا اور بقیہ سماجی اور مذہبی اخوت قائم رہی تھی۔[۳۶] مگر بعض دوسرے مسلمان علماء و مورخین نے پوری طرح مغربی فکر کا تتبع کیا ہے۔[۳۷] غالباً یہ دونوں ہی نقطۂ نظر غیر تاریخی ہیں۔ مواخاۃ کا مقصد نہ تو ایک مسلمان بھائی کی موت پر دوسرے کو جائداد دلانا تھا اور نہ دورانِ حیات فریقین اقتصادی طور پر نادار بھائی کا مالدار بھائی کے مال میں حصہ لگانا تھا۔ ان دونوں نقطہ ہائے نظر کی تردید مواخاۃ کی اول تاریخ سے بھی ہوتی ہے اور بعد کی کچھ اور مثالوں سے۔ روایات کے مطابق مواخاۃ کی مدینہ میں پہلی مثال ہجرت نبوی کے تقریباً سات ماہ بعد ___ اواخر رمضان یا اوائل شوال ۱ھ / مارچ۔ اپریل ۶۲۳ء ___ میں قائم ہوئی تھی۔[۳۸] منطقی اعتبار سے نادار و مفلس مہاجرین کو اقتصادی مدد اور ترکۂ مسلم میں حق کی ضرورت مدنی دور کی ابتدا میں زیادہ تھی نہ کہ کچھ مدت کے بعد۔ اسی طرح تاریخی واقعات سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ تمام یا اکثر مہاجرین اس زمانے میں آتنے

مالدار ہوگئے تھے کہ ان کو نزکہ کی دولت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کے علاوہ ہماری روایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مواخاۃ کی ایک ہی مثال نہ تھی، بلکہ کئی مثالیں تھیں جو بدر سے پہلے شروع ہوئی تھیں اور غالباً فتح مکہ تک چلتی رہی تھیں۔[۳۹] دراصل ان کا انحصار مہاجرین کی انفرادی یا اجتماعی آمد پر تھا جو فرد یا گروہ تازہ وارد ہوتا وہ مواخاۃ کے موثر و فعال ذریعہ کے سبب مدنی مسلم سماج کا جزو بنا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ مواخاۃ کی ایسی متعدد مثالیں مذکور ہیں جن میں ان مہاجر صحابہ کو انصار کا بھائی قرار دیا گیا ہے جو بدر کے کافی بعد بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد یا غزوۂ خیبر کے بعد مدینہ میں وارد و مقیم ہوئے تھے۔[۴۰] ان شواہد کی بنیاد پر یہ بلا خوف کہا جا سکتا ہے کہ مواخاۃ کا عمل عہدِ نبوی کے اواخر تک جاری رہا تھا۔

اسی طرح مواخاۃ کے بارے میں پیش کردہ نظریہ کہ اس کا اساسی محرک و سبب میدانِ جنگ میں دو مسلمانوں کے درمیان فوجی ہم آہنگی اور عسکری مطابقت پیدا کرنا تھا[۴۱] تاریخی حقائق کی کسوٹی پر کھرا نہیں اُترتا۔ مواخاۃ کا پہلا مظاہرہ مکی عہدِ نبوی میں ہوا تھا جب جنگ و جدال تو درکنار اس کے بارے میں مسلمانانِ مکہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب مسلم نقطۂ نظر سے قتال و جدال کے لئے اذنِ الٰہی نہیں ملا تھا[۴۲] اور مغربی نقطۂ نظر سے مسلمان اس فوجی و عسکری صلاحیت اور تنظیم کے مالک نہ تھے کہ دشمنوں سے مسلح یا غیر مسلح ٹکرلے سکتے۔ اس کے علاوہ تاریخی واقعات اور ٹھوس حقائق بھی اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ مکی دور میں مواخاۃ کا مقصد عسکری تنظیم و ہم آہنگی رہی ہوگی۔ مدنی عہد میں مواخاۃ کی نوعیت اور حقیقت کو سمجھنے کے لئے اس کی توقیت ضروری ہے۔ اس کی پہلی مثال ہجرت کے بعد سات ماہ کے عرصے کے اندر قائم کی گئی تھی جو جنگِ بدر سے کافی پہلے تھی۔[۴۳] یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مواخاۃ ابتدائی مہموں میں فوجی تنظیم قائم کرنے کے لئے کی گئی تھی کیونکہ اول تو یہ مہمیں فوجی تھیں ہی نہیں، دوم ان میں سے اکثر میں انصار شامل نہ تھے اور اگر تھے تو مہاجر اور انصار کے سپاہیوں کی تعداد میں کافی فرق رہا ہے۔ غزوۂ بدر کے موقعہ پر یہ فرق بہت ہی واضح طور پر ابھرتا ہے کہ اس جنگ میں مہاجرین کی کل تعداد صرف ۸۳ تھی اور انصار کی ۲۳۱ یعنی دونوں میں ایک اور تین کا تفاوت تھا۔[۴۴] سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انصار کے بقیہ سپاہیوں کا میدانِ جنگ میں ساتھ دینے کے لئے کون تھا، پھر مواخاۃ کے متعدد جوڑوں میں سے ایک یا دوسرا فریق غزوۂ بدر میں شامل نہیں ہوا تھا۔[۴۵] اس کے علاوہ مواخاۃ کی دوسری مثالیں صلح حدیبیہ کے بعد تک ملتی ہیں جس زمانے عسکری تنظیم و رفاقت قائم کی چنداں ضرورت نہ رہی تھی۔[۴۶] ان حقائق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مواخاۃ کا اصل مقصد کچھ اور تھا کم از کم جنگ کے دوران یا میدانِ جنگ میں مسلم سپاہیوں کے دو طبقوں میں فوجی ہم آہنگی پیدا کرنا نہیں تھا۔ وہ اصل مقصد تھا نو مسلم عربوں کا سماجی اور معاشرتی شعور و احساس میں تبدیلی پیدا کرنا کہ وہ عرب کے متعدد اور محدود قبیلوں کے دائرہ میں محصور نہیں ہیں بلکہ مسلم یا اسلامی معاشرہ کی وسیع دنیا کے باشندے اور شہری ہیں جن کی حد بندی یا درجہ بندی علاقہ، زبان، نسل، رنگ یا وطن نہیں کرتے۔ بلکہ وہ ایک عالمی اور آفاقی برادری کے افراد ہیں جن کو دین خداوندی کا مضبوط رشتہ ایک قوم، ایک ملت اور ایک امت بناتا ہے۔ یہ محض نظریہ یا خیال یا تصور ہی نہ تھا بلکہ مواخاۃ نے حقیقتاً بے شمار اور مختلف قبائلی اور محدود نظر و تنگ خیال لوگوں کو جو ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہتے تھے ایک مضبوط و مستحکم اور متحدہ اُمت میں تبدیل کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ یہی وہ اسلامی جذبۂ اخوت تھا جس نے مالدار مسلمانوں میں اپنے غلام دینی بھائیوں کو خرید کر

آزاد کرانے کا جذبہ پیدا کیا تھا۔ اسی نے مسلمانوں میں تعاون اور امداد کے ایک غیر معمولی احساس اور عمل کو تحریک دی تھی۔ اسی نے ان کو ایک امت سے وابستہ ہونے کا طاقتور شعور بخشا تھا اور یہی جذبہ ان کو بحرانوں اور مصائب و آلام کے زمانے میں نہ صرف زندہ اور متحرک و فعال رکھتا تھا بلکہ ان کے ملی شعور یگانگت و وابستگی کو اور مضبوط تر و پائیدار بناتا تھا۔ بہرحال مواخاۃ کا مقصد مختلف پس منظر اور طبقات کے مسلمانوں کو ایک منظم اور متحد اُمت میں تبدیل و تشکیل کرنا تھا اور اس میں اس کو سو فیصد کامیابی ملی تھی۔ اس مستقل اخوتِ اسلامی اور جزیرہ نمائے عرب کے مسلمانوں کے نئے تاریخی و سماجی شعور کا بہترین مظاہرہ حضرت سلمان فارسی کا وہ جواب تھا جو اُنھوں نے اپنے نسب کے بارے میں پوچھنے والے ایک شخص کو دیا تھا:

"انا سلمان بن اسلام" (۴۷) (میں سلمان ہوں، اسلام کا ایک فرزند)

(۳) تیسرا مرحلہ: دستورِ نبوی

اُمتِ اسلامی اور ریاستِ اسلامی کی تشکیل کا تیسرا مرحلہ کتابِ نبوی کا اجرا و نفاذ تھا جس کو ہمارے ماخذ میں صحیفہ، کتاب، عہد، میثاق وغیرہ مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے اور جس کو آج کل زیادہ تر مورخین "دستورِ مدینہ" یا "اسلام کے پہلے دستور" کے نام سے یاد کرتے ہیں (۴۸) اور دورِ جدید میں یہی زیادہ صحیح مفہوم عطا کرتا ہے۔ صحیفہ یا کتاب (۴۹) نبوی یا دستور مدینہ کے اجرا و نفاذ کی تاریخ کے بارے میں جدید مورخین میں اختلاف ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کا متن نقل کرنے والے اولین سیرت نگار ابنِ اسحاق نے اس کی تاریخِ نفاذ کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔ انہوں نے اپنی سیرت رسول اللہ میں ہجرت کے بیان کے بعد حتیٰ کہ مواخاۃ وغیرہ کے ذکر سے پہلے ہی اس کو نقل کر دیا ہے۔ مآخذ کے سکوت نے جدید مورخین کو تاریخِ نفاذ و اجرا کے بارے میں اپنے اپنے نظریات پیش کرنے کا موقع دیا ہے۔ ولہاوزن (WELLHAUSEN) کا خیال ہے کہ وہ غزوۂ بدر سے قبل جاری کیا گیا تھا (۵۰) جبکہ ہیوبرٹ گریم (HUBERT GRIMME) اس کو بدر کے بعد کا صحیفہ مانتے ہیں (۵۱) اور دونوں اپنے اپنے نظریے کی تائید میں دلیلیں دیتے ہیں۔ مونٹگمری واٹ (MONTGOMERY WATT) کا خیال ہے کہ اصل دستورِ مدینہ تو بدر سے پہلے نافذ ہوا تھا مگر اس میں وقتاً فوقتاً ضرورت کے تحت تبدیلی کی جاتی رہی اور بعض دفعات گھٹائی اور بڑھائی جاتی رہیں اور موجودہ متن مختلف زمانوں میں نافذ ہونے والی دفعات کا مجموعہ ہے۔ (۵۲) برکات احمد نے بھی اسی نظریے سے اتفاق کیا ہے اگرچہ دونوں کی بعض دلیلیں الگ الگ ہیں تاہم اکثر پر ان دونوں کا اتفاق ہے۔ (۵۳) ان دونوں مورخین کے خیال میں یہ دستور یا صحیفہ نبوی ایک اکائی نہیں ہے بلکہ مختلف اکائیوں کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو ایک اکائی اور متحدہ متن مانتے ہیں جو ہجرت کے بعد مرتب و نافذ کیا گیا تھا۔ (۵۴) بہرحال واٹ اور برکات احمد کے نظریہ میں خاصی جان ہے اور ان کی بعض دلیلیں بڑی وزنی ہیں تاہم ان کے تمام دلائل اور مزعومات سے اتفاق کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ بقیہ اہم مورخین میں آر، بی سرجنٹ (R.B. SERJEANT) (۵۵)، ریوبن لیوی (RUBEN LEVY) (۵۶)، موشے گل (MOSHE GIL) (۵۷) وغیرہ اس کی تاریخ ماقبل بدر کے قائل نظر آتے ہیں۔ ابنِ اسحاق اور ان کے متبعین سیرت نگار و مورخین کے علاوہ احادیث کے مختلف

مجموعوں سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ دستورِ مدینہ کا اصل مسودہ بدر سے پہلے ترتیب و نفاذ پا چکا تھا چاہے بعد میں اس میں کمی بیشی ہوتی رہی ہو۔

تاریخِ دستورِ مدینہ سے کہیں زیادہ اہم اس کا متن ہے۔ ابن اسحاق کے فراہم کردہ متن کو دوسرے عربی ماخذ نے تو جزئاً نقل نہیں کیا ہے مگر اس پر بحث کرنے والے مترجموں اور مورخوں نے اس کو الگ الگ ڈھنگ سے پیش کیا ہے جس کے سبب صحیح نتائج اخذ کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ بعض علما نے اس کی مختلف دفعات کو اپنی فہم اور زاویۂ نظر کے مطابق الگ الگ حصوں یا خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ بہرحال سب سے اچھی ترتیب دفعات وینسنک (WENSINCK) نے کی ہے جس کو منٹگمری واٹ نے معمولی رد و بدل کے ساتھ قبول کیا ہے اور یہی میرے خیال میں بہترین ترتیب ہے[۵۰]۔ اگرچہ واٹ کا بعض جگہ ترجمہ مبہم اور اضافے (توضیحیں) غیر ضروری بلکہ گمراہ کن ہیں۔ بہرحال متنِ دستورِ مدینہ کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے لیکن یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صحیفۂ نبوی سے قبل سیرت نگار ابن اسحاق کا ایک تعارفی دیباچہ ہے جو متنِ دستور کا جزو نہیں ہے۔ دیباچہ میں ابن اسحاق کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان ایک تحریر (کتاب) لکھی جس میں آپ نے یہودیوں سے ایک معاہدۂ صلح کیا۔ ان کو ان کے مذہب اور ان کے مقبوضات کے حقوق دئے اور ان کو ان میں بدستور قابض رہنے دیا اور ان کے کچھ فرائض اور حقوق مقرر کئے۔ وہ کتاب یہ تھی :

متنِ دستورِ نبوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

یہ محمد رسول اللہ کی کتاب (معاہدہ) ہے جو قریش کے مسلمانوں اور یثرب کے مومنوں اور ان دونوں کے ان لواحقین (ومن تبعھم) کے درمیان کیا گیا ہے جو ان کے ساتھ آملیں، اتحاد کریں اور جو ان کے ساتھ مل کر جہاد کریں (جاھدوا معھم)

۱ - وہ [یعنی مسلمان مہاجرین و انصار کے دو طبقات اور ان کے نسلی لواحقین و تبعین] ایک امت واحدہ ہیں جو دوسرے لوگوں سے الگ و ممتاز ہے (من دون الناس)[۵۱]۔

۲ - قریشی مہاجرین اپنے پرانے دستور کے مطابق اپنے قیدیوں کا زرفدیہ اجتماعی طور سے ادا کریں گے اور مسلمانوں کے معاملہ میں انصاف و راستی کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔

۳ - بنو عوف اپنے سابق دستور کے مطابق اجتماعی طور سے اپنی پرانی دیت ادا کریں گے اور ہر گروہ (طائفہ) اپنے قیدیوں کا زرفدیہ ادا کرے گا اور اس ضمن میں مسلمانوں کے درمیان انصاف و راستی کا خیال رکھے گا۔

۴ - بنو الحارث اپنے سابق دستور کی مانند دیت ادا کریں گے (دفعہ ۳ کی مانند)

۵ - بنو ساعدہ ..... (دفعہ ۳ کی مانند)

۶ - بنو جشم ..... (   )

۷ - بنو نجار ..... (   )

۸ - بنو عمرو بن عوف .... (دفعہ ۳ کی مانند)

۹ - بنو نبیت ..... (" ")

۱۰ - بنو اوس ..... (" ")

۱۱ - مسلمان اپنے کسی مقروض کو نظر انداز نہ کریں گے بلکہ انصاف کے ساتھ اس کے زرِ فدیہ یا دیت کی ادائیگی میں اس کی مدد کریں گے۔

۱۲ - ایک مسلم کسی دوسرے مسلم کے "مولیٰ" کو اس کے آقا و سرپرست کی اجازت کے بغیر اپنے "حلیف" کے طور پر قبول نہیں کرے گا۔

۱۳ - خدا ترس مسلمان ہر اس شخص کے خلاف ہیں جو غلط کام کرے یا جو غیر منصفانہ یا غدارانہ، مخالفانہ یا بدعنوان کام کرنے کا ارادہ مسلمانوں کے بیچ کرے۔ ان کے ہاتھ اس شخص کے خلاف متحدہ طور سے اٹھیں گے خواہ وہ ان ہی میں سے کسی فرزند کیوں نہ ہو۔

۱۴ - ایک مسلم کسی دوسرے مسلم کو کسی غیر مسلم کے لئے نہ تو قتل کرے گا اور نہ ہی ایک مسلم کے خلاف کسی غیر مسلم کی مدد کرے گا۔

۱۵ - خدا کا تحفظ (ذمہ) ایک ہے: ان میں سے (مسلمانوں میں سے) کسی ادنیٰ کی بھی ضمانت (جوار) ان سب پر واجب العمل ہے۔ تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی اور دوست (موالی) ہیں دوسرے تمام لوگوں کے سوا (من دون الناس)۔

۱۶ - یہود میں سے جو بھی ہماری اتباع کرے گا اس کے لئے یکساں مدد اور تعاون (نصر، اسوۃ) ہے جب تک کہ وہ مخالفانہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرتا اور ان کے (مسلمانوں کے) خلاف دوسروں کی مدد نہیں کرتا۔

۱۷ - مسلمانوں کی امان (سِلم) بھی ایک ہے: ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے الگ صلح نہیں کرے گا، جبکہ اللہ کے راستہ میں جہاد ہو رہا ہو، سوائے اس کے کہ وہ مساوات و انصاف کے ساتھ کی جائے۔

۱۸ - ہماری ہر مہم میں ہر گروہ باری باری سے کام کرے گا۔ (۶۰)

۱۹ - ایک مسلم کی راہِ خدا میں شہادت کی صورت میں تمام مسلمان اس کا قصاص لیں گے۔ خدا ترس مسلمانوں کو بہترین اور صحیح ترین رہنمائی حاصل ہے۔

۲۰ - کوئی شخص مشرک قریش کے کسی شخص یا سامان کو پناہ (جوار) نہیں دے گا اور نہ اس کی حمایت میں کسی مسلم کے خلاف مداخلت کرے گا۔

۲۱ - جب کوئی کسی مسلمان کو ناحق قتل کر دے اور اس کی شہادت واضح ہو تو اس کو قصاص میں قتل کیا جائے گا سوائے اس کے کہ مقتول کے ورثہ مطمئن و راضی ہو جائیں۔ تمام مسلمان قاتل کے خلاف ہوں گے۔ اس کی مخالفت کے سوا

ان کے لئے اور کچھ بھی جائز نہ ہوگا۔

۲۲ - ہر اس مسلم کے لئے جو خدا و آخرت پر ایمان اور اس معاہدہ (صحیفہ) میں یقین رکھتا ہے یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ کسی غلط کار و بدعنوان شخص کی مدد کرے یا اسے پناہ دے۔

۲۳ - ہر وہ شخص جس کے بارے میں تمہارا (مسلمانوں کا) اختلاف ہو اس کو خدا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کرنا ہوگا۔

۲۴ - یہود اور مسلمان (دونوں) مشترکہ طور پر جنگ کے اخراجات اس وقت تک اٹھائیں گے جب تک کہ وہ جاری رہے۔

۲۵ - بنو عوف کے یہود مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ایک اُمت ہیں۔ یہودیوں کے لئے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین۔ یہی (ضمانت) ان کے موالی اور ان کے اپنے لئے ہے۔ مگر اس شخص کے سوا جو کوئی غلط کام کرے یا غداری کا کام کرے۔ وہ صرف اپنے لئے مصیبت پیدا کرتا ہے اور اپنے خاندان کے لئے۔

۲۶ - بنو نجار کے یہودیوں کے لئے بھی وہی (احکام و مراعات) ہیں جو یہودانِ بنی عوف کے لئے۔

۲۷ - بنو الحارث کے یہود کے لئے وہی . . . . . .

۲۸ - بنو ساعدہ کے یہود کے لئے وہی . . . . . .

۲۹ - بنو جُشم کے یہود کے لئے وہی . . . . . .

۳۰ - بنو اوس کے یہود کے لئے وہی . . . . . .

۳۱ - بنو ثعلبہ کے یہود کے لئے وہی ہے جو بنو عوف کے یہود کے لئے۔ سوائے اس شخص کے جو غلط کام یا غداری کا مرتکب ہو۔ وُہ صرف اپنے لئے اور اپنے خاندان کے لئے باعثِ مصیبت ہوگا۔

۳۲ - ثعلبہ کا ایک خاندان (بطن) جفنہ بھی انہیں کی مانند ہے۔

۳۳ - بنو شطیبہ کے لئے بھی وہی ہے جو بنو عوف کے یہود کے لئے۔ آبرومندانہ سلوک غداری نہ ہونے کی صورت میں ہوگا۔

۳۴ - ثعلبہ کے موالی اُنہیں کی مانند ہیں۔

۳۵ - بطانہ[۶۱] یہود بھی انہیں کی مانند ہیں۔

۳۶ - ان میں سے کوئی بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر جنگ کے لئے نہیں نکلے گا لیکن اس کو تکلیف و زخموں کا انتقام لینے پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ جو بھی بے سمجھے بوجھے اقدام کرتا ہے (فتک) وُہ صرف اپنے آپ اور اپنے خاندان کو معرضِ خطر میں ڈالتا ہے۔ سوائے اس کے کہ اس پر ظلم ہوا ہو۔ خدا اس صحیفہ کا سب سے سچا شاہد ہے۔[۶۲]

۳۷ - یہودیوں کا ذمہ ہے کہ وُہ اپنے اخراجات برداشت کریں اور مسلمانوں پر اپنے اخراجات اُٹھانے کی ذمہ داری ہے ان کے درمیان باہمی مدد (نصر) کا معاہدہ ہے ہر اس شخص کے خلاف جو اس صحیفہ کے لوگوں کے خلاف جنگ کرے ان کے درمیان پُرخلوص دوستی اور قابلِ اعتماد صلح و خیر خواہی ہے اور آبرومندانہ رشتہ ہے، غداری نہیں ہے۔

ایک شخص اپنے کسی حلیف کی بنا پر غداری کا مجرم نہ ہوگا۔ ہر مظلوم کے لئے مدد و اعانت ہوگی۔

۳۸۔ یہود مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ جاری رہنے تک اخراجات مساوی طور پر برداشت کریں گے۔

۳۹۔ وادی یثرب اس صحیفہ والوں کے لئے مقدس حرم ہے۔

۴۰۔ ہر "جار" (محفوظ شخص) اسی وقت تک (محفوظ) رہے گا جب تک کہ وہ نقصان نہیں پہنچاتا اور غداری نہیں کرتا۔

۴۱۔ کسی عورت کو اس کے لوگوں کی اجازت کے بغیر پناہ نہیں دی جائے گی (لا تجارُ)۔

۴۲۔ جب بھی اس صحیفہ والوں کے درمیان کوئی حادثہ یا جھگڑا اٹھ کھڑا ہو جس سے فساد خلق کا خوف ہو، اس کو خدا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کرنا ضروری ہے۔ خدا ہی سب سے زیادہ اس صحیفہ کی شرائط کو نافذ و جاری کرنے والا ہے۔

۴۳۔ قریش کو اور جو ان کی مدد کریں پناہ نہیں دی جائے گی (لا تجار)۔

۴۴۔ ان کے (اہل صحیفہ کے) درمیان باہمی تعاون ہوگا ہر اس شخص کے خلاف جو یثرب پر حملہ کرے۔

۴۵۔ جب بھی ان کو صلح یا معاہدہ کرنے یا قبول کرنے کا حکم دیا جائے وہ اس کو کریں گے اور قبول کریں گے۔ جب وہ اسی طرح کے کسی معاہدہ یا صلح کے لئے بلائیں تو یہ مسلمانوں کے لئے بھی ضروری ہوگا سوائے اس صورت کے کہ جب کوئی مذہب کے سبب جنگ کرے کیونکہ ہر شخص کی وفاداری اس کے اپنے گروہ سے متعلق ہوتی ہے۔[۶۳]

۴۶۔ الاوس کے یہودی۔ ان کے حلیف اور وہ خود بھی انھیں (حقوق و مراعات) کے حقدار ہیں جو اس صحیفہ والوں کے لئے ہیں جب تک کہ ان کا طرز عمل اس صحیفہ کے لوگوں سے مکمل طور سے آبرومندانہ اور اچھا ہے۔ کیونکہ غداری سے پہلے حُسنِ سلوک کا درجہ ہے۔

۴۷۔ ایک مجرم صرف اپنے لئے ذمہ دار ہوگا۔ خدا ہی اس صحیفہ کو سب سے زیادہ نافذ و جاری کرنے والا ہے۔ یہ معاہدہ کسی غلط کار و ظالم اور غدار کی پشت پناہی نہیں کرے گا۔ جو بھی مدینہ میں رہے یا باہر جائے محفوظ رہے گا سوائے اس شخص کے جو غلط کام یا غداری کا ارتکاب کرے۔ خدا ہر شخص کا حامی و پناہ گاہ (جار) ہے جو اس سے ڈرتا ہے اور حسن سلوک کرتا ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

دستورِ مدینہ کا تجزیہ:

موجودہ متن دستور سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں کل ۴۷ دفعات ہیں۔ اور دستور کے تعارفی کلمات سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاہدہ اساسی اور بنیادی طور پر قریش مکہ اور انصار مدینہ کے مسلمانوں اور مومنوں کے درمیان ہوا تھا اور ان دونوں طبقات مسلمین کے لواحقین و تبعین ان کے طفیل میں شریک و سہیم معاہدہ بن گئے تھے۔ اس صحیفہ کی پہلی دفعہ میں جن لوگوں کو "اُمت واحدہ ممتاز از اقوام دیگر" کہا گیا ہے وہ بنیادی طور سے صرف مہاجرین و انصار کے دو طبقات تھے

اُنھیں کو اُمۃ اللہ کہا گیا ہے جس کا حاکم مطلق خدائے واحد تھا اور اس زمین پر خلیفۃ اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ چونکہ یہ نئی "اُمۃ اللہ" ایک نیا مذہب ـــ اسلام ـــ ماننے کے سبب وجود میں آئی تھی اور وہی اس کی اساس حقیقی بھی تھی، اس لئے صرف اور صرف مسلمان ہی اس اُمت کے ارکان تھے یا بن سکتے تھے۔ یہی بات بڑی صراحت کے ساتھ دستورِ مدینہ کی دفعات نمبر ۱، ۱۵ اور ۲۵ سے بھی معلوم ہوتی ہے۔

"امۃ" اساسی طور سے ایک مخصوص قرآنی اصطلاح ہے اور محمد فواد عبد الباقی کے مطابق وہ قرآن کریم میں کل اکیاون مواقع پر بیان ہوئی ہے اور اس کی جمع ـــ اُمم ـــ تیرہ مقامات پر۔ ان میں ۹ نو بار مکی سورتوں میں اور محض پندرہ بار مدنی سورتوں میں۔[٦٣] بقول مونٹگمری واٹ "یہ ان لوگوں پر مشتمل اُمت تھی جنھوں نے پیغمبرِ اسلام اور ان کے پیغام کو قبول کیا تھا۔"[٦٤] انھیں معانی میں اصطلاح "امۃ" کم و بیش ۳۰۲ احادیثِ نبوی میں استعمال ہوئی ہے۔[٦٥] تمام مغربی اور بعض مشرقی مورخین و علماء کا یہ خیال کہ غیر مسلم طبقاتِ مدینہ ـــ یہودی، عیسائی اور غیر مسلم عرب ـــ بھی اس "امت اللہ" کے دائرہ سے خارج نہ تھے،[٦٦] نہ صرف اس دستورِ مدینہ کی روح کے منافی ہے بلکہ بجائے خود مذہب اسلام پر مبنی امت کے نظریہ کی کاٹ کرتا ہے۔ جیسا کہ پہلے حوالہ گزر چکا دستور کی دفعہ اول صرف مسلم مہاجرین و انصار کو تمام دوسرے لوگوں سے الگ ایک امۃ واحدہ قرار دیتی ہے۔ یہی روح دستور کی دفعہ ۱۵ میں کارفرما ہے جو یہ اعلان کرتی ہے کہ مومنین اور مسلمین[٦٧] ہی ایک دوسرے کے موالی (بھائی بند اور دوست) ہیں اور ان کے ساتھ دوسرے لوگ شریک نہیں۔ اسی طرح دفعہ ۲۵ مسلمانوں کو ایک الگ اُمت اور بنو عوف کے یہود کو ایک الگ امت قرار دیتی ہے اور ان کے دینوں کو بھی الگ الگ سمجھتی اور قرار دیتی ہے۔[٦٨] تمام حقائق و شواہد کو مدِ نظر رکھنے سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ مدینہ کی شہری ریاست کے مسلمان اور صرف مسلمان ہی اس اُمت کے ارکان تھے یا بن سکتے تھے۔ شہر کے تمام غیر مسلم طبقات کو، چاہے وُہ یہود ہوں یا عیسائی، یا غیر مسلم عرب، زیادہ سے زیادہ حلیف کا، ورنہ ذمیوں کا مقام دیا گیا تھا اگرچہ اس حیثیت کا واضح اعلان نہیں ملتا لیکن تمام دفعاتِ دستور میں مضمر و محذوف یہی ہے۔ خاص کر ان دفعات میں جن کا تعلق یہودیوں اور مسلمانوں کے مابین یا اسلامی ریاست سے روابط سے ہے۔ مثال کے طور پر دفعہ ۱۶ یہود کو امداد و تعاون کی ضمانت اسی صورت میں دیتی ہے جبکہ وہ مسلمانوں کی اتباع کریں اور ان کے دشمنوں کی امداد و اعانت نہ کریں۔ اسی طرح دفعہ ۲۵ ان کو مذہبی آزادی کی ضمانت بھی اس شرط پر دیتی ہے اور دفعات ۲۴، ۳۷ اور ۳۸ ان پر مسلمانوں کی مدد و نصرت کو تمام معاملات میں لازمی قرار دیتی ہیں۔ امتِ اسلامی اور یہودی یا غیر مسلم طبقات کے درمیان جو بھی تعلقات یا روابط قائم ہوئے وُہ محض اس بنا پر کہ وُہ مدینہ میں بستے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کو اُمت اسلامی کا رکن نہیں بنایا جا سکتا تھا کیونکہ پھر اس کی مذہبی خصوصیت جو اس کی اساسی و امتیازی چیز تھی کیا رہ جاتی۔ لیکن دوسری طرف ان کو لاتعلق بھی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ مدینہ کے معاشرہ میں ان کو کسی نہ کسی طرح کھپانا اور قبول کرنا تھا۔ اور ان کی قبولیت و شمولیت کا بہترین طریقہ وہی تھا جس کو عرب حلف کے نام سے جانتے تھے اور جو در اصل اسلام سے پہلے یہودی قبائل اور اوس و خزرج کے قبائل کے درمیان قائم بھی رہا تھا۔ اس بنا پر دستورِ مدینہ یہودی طبقات پر بھی مسلمانوں کی طرح یکساں فرائض عائد کرتا ہے۔ اور یہ فرائض تھے اپنے قبائلی دستور و

روایات کے مطابق دیت (معقلہ) ادا کرنا، شہر کے تمام باسیوں کے ساتھ امن و امان کے ساتھ رہنا، غیر ملکی یا خارجی حملے یا جارحیت کی صورت میں شہری ریاست کا دفاع کرنا اور اس پر آنے اخراجات و مصارف کو برابر برابر برداشت کرنا اور سب سے بڑھ کر اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل فرمانبرداری و اطاعت کرنا۔

امۃ کا جو نظریہ ولہاؤزن نے ایجاد کیا اور واٹ اور ان کے دوسرے مغربی و مشرقی خوشہ چینوں نے قبول و شائع کیا مسلم ارکانِ اُمت اور یہودی اور دوسرے غیر مسلم باشندگانِ شہر کے حقوق کے فرق کے پس منظر میں بھی نہیں ٹھہرتا ہے۔ منطق کا تقاضا ہے کہ ایک اُمت کے تمام ارکان کو یکساں اور برابر کے حقوق حاصل ہوں۔ دستورِ مدینہ بہرحال یہ مساوی اور یکساں حقوق مسلمانوں کو عطا کرتا ہے کہ وہ امتِ واحدہ کے افراد تھے مگر یہود یا دُوسرے غیر مسلم طبقات کو برابر کے حقوق نہیں دیتا ہے۔ ولہاؤزن کو تو اس کا تھوڑا سا اعتراف بھی ہے کہ "یہود ان شہر کو اُمت سے وہ قریبی تعلق و ربط حاصل نہ تھا جو انصار و مہاجرین کو تھا اور نہ ہی ان کو برابر کے حقوق و فرائض حاصل تھے"۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ واٹ نے اس نکتہ کی طرف ذرا بھی اشارہ نہیں کیا ہے۔ بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ دستورِ مدینہ یہودیوں اور دوسرے غیر مسلم طبقات کو مدینہ کے سماجی نظام اور اسلامی شہری ریاست میں دوسرے درجہ کا مقام دیتا ہے جو کہ حلیف کے درجہ سے یا بعد کے ذمیوں کے مقام سے بڑی حد تک مشابہ و مماثل تھا۔ اس حقیقت بدیہی پر نہ تو شرمانے کی ضرورت ہے، نہ معذرت کرنے یا معذرت خواہانہ لہجہ اپنانے کی۔ اور تاویل کرنے کی تو کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وہ تاریخی دیانت کے خلاف اور اسلامی اصولوں کی تحریف کے مرادف ہوگی۔

بہرحال دستورِ مدینہ کی کل اہم دفعات کے ایک ناقدانہ تجزیے اور مبصرانہ تحلیل سے ایک طرف تو خود دستورِ مدینہ کی نوعیت و ماہیت اجاگر ہوگی اور دُوسری طرف مدینہ منورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قسم کا سماجی معاشرہ اور سیاسی ڈھانچہ کھڑا کیا تھا اس پر بھی روشنی پڑے گی۔ ایک اہم نکتہ جو عام طور سے علمائے تاریخ و سماجیات کی نگاہ سے اوجھل رہ گیا یہ ہے کہ دستورِ مدینہ کے دُو دیباچے ہیں؛

ایک سیرت نگار ابنِ اسحاق کا دیباچہ یا تعارفی نوٹ۔

اور دُوسرا قلم نبوی کا دیباچہ جو متنِ دستور کی ابتدائی سطروں پر مشتمل ہے۔

ان دونوں میں ایک بڑا فرق ہے: ابنِ اسحاق نے مہاجرینِ قریش اور انصارِ مدینہ کے درمیان ہونے والے معاہدہ یا صحیفۂ اولین میں یہودیوں کو بھی ایک فریق کی مانند شامل کر دیا ہے جس سے یہ تصور ہوتا ہے کہ وُہ دو مسلم طبقات کے ہم پلّہ و ہم سر فریق تھے جب کہ دیباچۂ دستورِ نبوی میں صرف مہاجرین و انصار اور ان کے متبعین و لواحقین کو دو فریقوں کا درجہ یا شرکاءِ معاہدہ قرار دیا گیا ہے اور اس طور سے یہی دونوں مسلم طبقات اصل اہلِ صحیفہ تھے۔ ان میں یہود کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ بعد میں یہودیوں کو بھی حلیف، یا جس کو موجودہ اصطلاح میں مشابہ رکن کہتے ہیں' کا درجہ دیا گیا تھا۔ غالباً مورخین و علماءِ سیرت کے امت اسلامی کے بارے میں غلط نظریہ کا ایک یہ بھی سبب رہا ہے۔ بہرحال یہ امر واضح رہنا چاہئے کہ دستورِ مدینہ کی اوّلین دفعہ میں جن لوگوں کو ضمیر جمع غائب (وہ لوگ = هُم) کہا گیا ہے ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا ذکر دیباچۂ نبوی میں ہے نہ کہ دیباچۂ ابن اسحاق میں۔

دفعات ۲ تا ۱۱ عربوں کی ایک سماجی روایت و دستور — زرفدیہ[1] اور دیت[2] — سے متعلق ہیں جو بدوی اور قبائلی عربوں کے سماجی تحفظ کے نظام کی عظیم ترین ضمانتیں تھیں"[3]۔ شہر رسول کے ہر قبیلہ/ سماجی اکائی۔ کو بشمول مہاجرین مکہ جن کو بھی عملی اعتبار سے ایک متحدہ قبیلہ یا ایک سماجی وحدت گردانا گیا تھا"[4] ان دونوں سماجی روایات کی پاسداری مسلمہ قبائلی اصولوں کے مطابق کرنی تھی اور اس میں ایک اہم بات یہ تھی کہ دیت اور زرفدیہ کی ادائیگی کو ہر قبیلہ کی اجتماعی ذمہ داری قرار دیا گیا تھا۔"[5] ظاہر ہے کہ انفرادی ذمہ داری کی صورت میں مجرم یا خطاکار راہِ فرار اختیار کرسکتا تھا اور اس وقت کے عرب سماج میں کوئی ایسی فعال وکارگر قوت نہ تھی کہ وہ اس سے زور و زبردستی سے وصولیابی کرسکتی۔ اس کے مقابلہ میں پورا قبیلہ نہ بھاگ سکتا تھا اور نہ ہی ذمہ داری کو کسی اور طریقہ سے قانوناً نظر انداز کرسکتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سماجی تحفظ کا نظام قائم کیا تھا اس کے یہ دو اہم پتھر تھے: جان و مال کا تحفظ۔ اور ان دونوں کا تحفظ اسی صورت کیا جاسکتا تھا کہ شہری ریاست کے کسی فرد کو نہ کسی کی جان سے کھیلنے کا موقعہ دیا جائے اور نہ مال سے۔ اور اگر کوئی جان و مال کو کسی طرح کا نقصان پہنچائے تو اس کو اس کی سزا یا جرمانے کا خوف لاحق رہے۔ جان کی ضیاع کی صورت میں وہ قصاص کے قبائلی اصول کے تحت اپنی جان سے ہاتھ دھوسکتا تھا یا مقتول کے وارثین کی رضامندی کی صورت میں مال دے کر جان تو بچا سکتا تھا لیکن اپنی دولت کے خاصے بڑے حصے سے محروم ہوجاتا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی مذموم حرکت سے اپنے پورے قبیلہ کا نام اور عزت و آبرو کو کلنک لگاتا جو عربوں کے نزدیک موت سے زیادہ بُری شے تھی۔ چنانچہ جان و مال کے مزید تحفظ کی ضمانت دستور کی دفعات ۱۲ تا ۱۹ دیتی ہیں۔

دفعہ ۱۲ مدنی سماج میں حلیف و مولیٰ کے رشتوں کو بلا اجازت و مرضیٔ فریقین بدلنے کی اجازت نہیں دیتی کیونکہ بصورت دیگر سماج کے مختلف افراد میں تعلقات کشیدہ ہوتے اور ان کے نتیجے میں تفرقے اور انتشار کی راہیں کھل جاتیں۔ جبکہ دفعہ ۱۳ غلط کار، مجرم اور انتشار پھیلانے والے اشخاص کے مذموم اثرات سے معاشرہ کو بچانے کی تدبیر کرتی ہے۔ وہ مجرم کو جرم کرنے کا موقعہ نہیں دیتی ہے اور ارتکاب جرم کرنے کی صورت میں اس کی پناہ کی تمام راہیں مسدود کردیتی ہے۔ یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ مجرم کو پورے سماج کا دشمن سمجھا گیا ہے اور تمام مسلمانوں کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ خواہ مجرم کوئی ہو سب کے سب اس کے دشمن ہوں گے اور اسے کسی قسم کی پناہ یا اعانت نہ دیں گے۔ دفعات ۱۴، ۱۵ اور ۱۹ مسلمان طبقات کو غیر مسلم طبقات پر سماجی فوقیت عطا کرتی ہیں جو سماجی اعتبار سے کافی اہم ہے۔ قبائلی روایات کے مطابق قتل کا قصاص قتل یا خون کا بدلہ خون تھا۔ لیکن اسلامی معاشرہ میں یہ اہم اور انقلاب آفریں تبدیلی کی گئی تھی کہ کسی کافر کے قتل کے بدلے میں یا کسی کافر کے سبب کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا جاسکتا تھا اور نہ ہی کسی مسلمان کے خلاف کسی کافر کی مدد و اعانت کی جاسکتی تھی۔ اس دفعہ نے قبائلی عصبیت پر کاری ضرب لگائی تھی اور عربوں کے سماجی شعور کو قبائلی روایات کے گورکھ دھندے سے نکال کر اسلامی اخوت پر مبنی وسیع تر نگاہ عطا کی تھی۔ بقیہ دونوں دفعات مسلمانوں کے تمام طبقات کو صلح و امن اور ضمانت کے برابر حقوق کی ضمانت دیتی ہیں کہ اگر ادنیٰ ترین مسلمان نے بھی کسی کو پناہ دے دی، امن و صلح کرلی یا ضمانت کی حامی بھرلی تو وہ تمام افرادِ اُمت پر لازم و مانا ہوگی۔ یہ اخوت و یگانگت کے مضبوط بندھن اور "مسلمان ایک جماعت" کے تصور کا مظاہرہ و اعلان تھا۔ ان تینوں

دفعات سے یہ اہم نکتہ بھی اُبھرتا ہے کہ مسلمانوں کو مدینہ کے سماجی نظام میں یک گونہ برتری حاصل تھی۔ اور اس سے اہم بات یہ ہے کہ اس سماجی برتری کو غیر مسلم طبقات نے خواہ مرضی سے یا خواہ بادلِ نخواستہ قبول و تسلیم بھی کیا تھا۔ دراصل مسلمانوں کی یہ معاشرتی حیثیت اور سماجی برتری ان تاریخی واقعات اور عناصر و رجحانات کا لازمی اور منطقی نتیجہ تھا جو ہجرت کے بعد مدینہ میں رونما ہو رہے تھے۔(۶) اور ظاہر ہے کہ مدینہ کے مسلمانوں کا پلّہ اپنی سیاسی و سماجی برتری اور تنظیم کے سبب بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ شہر کے غیر مسلم طبقات خاص کر یہودی قبائل جو اسلام سے قبل مدنی سماج اور سیاست میں سرداری کا یا کم از کم پاسنگ کا درجہ رکھتے تھے اب ماتحت و زیر نگیں طبقات بن کر رہ گئے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین مکہ کے طفیل مسلم طبقات کی طرف سیادت و سرداری پوری طرح سے منتقل ہو گئی تھی۔ اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے یک گونہ بہتر و برتر سماجی حقوق ایک لازمی اور منطقی امر تھے۔ یہ بات یہاں ذہن نشین رہنی چاہئے کہ مسلمانوں کی یہ سماجی برتری کسی ناانصافی یا سماجی بے دیانتی پر مبنی نہیں تھی۔ مساوات و اخوت کا اسلامی تصور و نظریہ اور اس کا عملی مظاہرہ افرادِ اُمت کے لئے ہو سکتا تھا اور تھا جو خدا اور رسول اور ان کے احکام و تعلیمات پر ایمان رکھتے تھے۔ جو اس سیاسی اور سماجی نظریۂ حیات نصب العین یا آئیڈیالوجی کو نہیں تسلیم کرتے تھے ان سے سماجی اخوت و مساوات نہیں برتی جا سکتی تھی۔ مگر ان سے تعلقات احترام آدمیت اور انسانیت کے ناطے اور سماجی انصاف کے اصول و بنیاد پر قائم کئے اور نبھائے جاتے تھے۔

اسی لئے جہاں تک انسانی جان و مال کے تحفظات کا تعلق ہے وہ بلا کسی تفریق و امتیاز کے شہری ریاست کے تمام باشندوں کو عطا کئے گئے تھے چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ جیسا کہ دفعات ۱۶، ۱۷، ۲۱، ۲۲، ۴۰، ۴۱ اور ۴۷ سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام افراد اور سماجی طبقے اپنے کاموں کے لئے ذمہ دار اور جواب دہ تھے اور کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ کسی مجرم یا سماج دشمن شخص یا اشخاص کو پناہ و امداد دے۔ یہ دفعات قتل و قصاص کے معاملات، مجرم کے ساتھ معاشرہ کے بحیثیت مجموعی برتاؤ، جار یا محفوظ اشخاص بالخصوص عورتوں کو جوار دینے کے مسائل و معاملات وغیرہ سے بحث کرتی ہیں جن کا لب لباب یہ ہے کہ سماج سے جرم اور مجرم اور ان کے بُرے اثرات کو ختم کیا جائے اور قبائلی عصبیت کے سبب ان کی پشت پناہی نہ کی جائے جیسا کہ ماقبل اسلام عرب کے قبائلی نظام میں دستور و طریقہ تھا۔ اب اسلامی معاشرہ اور شریعت افراد و قبائل کے کاموں کو ان کے قبائلی خطوط و بنیادوں کے بجائے ان کی اچھائی یا برائی سے تولا جاتا تھا۔ گویا کہ ایک ایسا معاشرہ وجود میں لایا جا رہا تھا جس میں سماجی انصاف سب افراد کو برابر سے مل سکے اور ان کے جان و مال کو مکمل طور سے تحفظ دیا جا سکے اور جس میں سماجی حیثیت و رتبہ کی بنیاد عمل تھا نہ کہ خاندان، قبیلہ یا پیدائشی نجابت و شرافت کا جھوٹا تصور۔

دفعات ۲۴ تا ۳۵ کا تعلق مدینہ منورہ کے مختلف یہودی قبائل سے ہے جو ان کو مذہبی آزادی اور سماجی خود مختاری عطا کرتی ہیں۔ یہ نکتہ اہم ہے کہ ان یہودیوں کو یہ مذہبی اور سماجی تحفظات غیر مشروط طور پر نہیں حاصل تھے ان کو یہ حقوق و مراعات امن و امان قائم رکھنے، وفاداری و استواری کا مظاہرہ کرنے اور سماج میں انتشار نہ پیدا کرنے اور غداری سے مکمل پرہیز

رکھنے کی شرائط پر عطا کئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ دفعات ۳۶، ۳۷، ۳۸ اور ۴۶ یہودی قبائل کے مسلمان طبقات اور مسلم ریاست سے تعلق پر بحث کرتی ہیں۔ ان کے مطابق دونوں مذہبی گروہوں کو ایک دوسرے کے ساتھ دوستی و آشتی، صلح و مفاہمت، امداد و تعاون اور خیر و نصیحت کے سایہ میں رہنا ضروری تھا۔ مزید برآں دونوں طبقات کے لئے ضروری قرار دیا گیا تھا کہ وہ اپنے قبائلی یا قومی اخراجات خود اٹھائیں گے مگر مدینہ کے دفاع کے ضمن میں جو اخراجات و مصارف ہوں گے ان میں شراکت کا اصول چلے گا۔ یہ فریضہ یا ذمہ داری اور واضح انداز میں دفعات ۱۸، ۲۴، ۳۸ اور ۴۵ سے مزید معلوم ہوتی ہے۔ کسی بیرونی جارحیت سے مدینہ کے دفاع کی ذمہ داری مساوی طور سے مدینہ کے تمام طبقات پر ڈالی گئی تھی جیسا کہ دفعات ۳۹ اور ۴۴ سے معلوم ہوتا ہے۔ دفعہ ۳۶ بصراحت بتاتی ہے کہ دستورِ مدینہ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شہر کا سب سے بڑا سردار و حکمران بنا دیا تھا اور آپ کی اس حیثیت کو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں نے بھی تسلیم کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ یہودیوں میں سے بیشتر نے آپ کی نبوت و رسالت سے انکار کر دیا تھا[۷۷] تاہم انھوں نے آپ کو شہری ریاست کے سیاسی سربراہ اور مسلمانوں کے علاوہ اپنے بھی سیاسی رہنما اور سردار کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔

چونکہ مدینہ کی نوزائیدہ اسلامی ریاست کو سب سے اہم اور خطرناک ترین خدشات و خطرات مکہ کی طاقتور اشرافیہ سے لاحق تھے اور اب تک وہی سب سے بڑے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے دشمن ثابت ہوئے تھے اس لئے دستورِ مدینہ کی بعض دفعات مثلاً ۲۰ اور ۴۳ نے یہ واضح کر دیا تھا کہ قریش کے کسی شخص یا ان کے مال یعنی کاروانوں کی حفاظت کی ذمہ داری اور ضمانت کوئی بھی فریقِ معاہدہ نہیں لے گا۔ اور نہ ہی ان کے کسی شخص کو کسی قسم کی مدد و تعاون دے گا۔ خاص کر کسی مسلمان کے خلاف کسی بھی قریشی کی مدد نہیں کی جائے گی۔ دستورِ مدینہ کی یہ دونوں شقیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور ان کی اہمیت مسلمان قریشیوں اور مدینہ کے بعض یہودی اور عربی قبیلوں اور خاندانوں اور افراد کے قریشِ مکہ سے سیاسی، سماجی اور تجارتی تعلقات کے پس منظر میں اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ فطری بات تھی کہ قریشی مسلمان کسی وقتی جوش و وفاداری و محبت قبیلہ میں کوئی ایسا کام کر سکتے تھے کہ جو مسلمان قوم یا معاشرہ کے مفادات کے خلاف ہوتا جیسا کہ بعض مواقع پر ہوا[۷۸]۔ اسی طرح سے یہودی قبائل میں بنو نضیر کے بعض سرداروں کے تعلقات دوستانہ مکہ کے رؤساء سے تھے[۷۹]۔ حتیٰ کہ اوس قبیلہ کے سردار حضرت سعد بن معاذ کے تعلقات بنو جمح کے ایک اہم سردار امیہ بن خلف سے تھے[۸۰]۔ اسی قسم کے اور بہت سے تعلقات تھے۔ ان دفعات نے در اصل ان خطرات و نقصانات کا سدباب کیا تھا جو ان قدیم تعلقات کے سبب مسلم معاشرہ اور مسلم ریاست کو پہنچ سکتے تھے۔

مقامِ رسولِ کریمؐ

ایک اہم ترین مسئلہ یہ تھا کہ اس مدنی معاشرہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقام تھا[۸۱]؟ مغربی مورخین و علماءِ سیرت نے اس مسئلہ پر بڑی طول طویل بحثیں کی ہیں اور اپنے علم و تحقیق، تاویل و تفسیر، بیان و زبان اور دلائل و نظائر کے ترکش کے سارے تیر خرچ کر ڈالے اور ساری قوت لگا دی ہے خاص کر یہ ثابت کرنے میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائی

پانچ برسوں میں محض مہاجرین کے قبیلہ کے ایک جماعتی سردار کا مقام حاصل تھا اور آپ مدینہ کے دوسرے مسلم اور غیر مسلم سرداروں میں سے محض ایک تھے۔ آپ کو کوئی خاص یا بلند وارفع مقام اور وسیع تر اختیارات نہیں حاصل تھے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ مہاجرین کو مدینہ کے دوسرے قبائل اور خاندانوں کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی محض ایک سردار ہی تھے۔ اور چونکہ مہاجرین کو پہلے دستورِ مدینہ میں ذکر کیا گیا ہے اس لئے آپ کو زیادہ سے زیادہ تمام سرداروں میں صرف سبقت کا اعزاز و افتخار حاصل تھا۔ بلکہ ان مورخین کے نزدیک ابتدائی تعمیری سالوں میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں زیادہ با اثر اور طاقتور سردار مدینہ میں موجود تھے۔ چنانچہ آپ کے مقام کی نظریاتی کمزوری متعدد واقعات سے ثابت کی جاتی ہے۔ ان میں واقعۂ افک میں عبداللہ بن اُبی بن سلول کے ملوث ہونے کے باوجود اس کے خلاف آپ کا کوئی اقدام نہ کرنا اور بنو قریظہ کے خلاف سزا کا اعلان خود کرنے کے بجائے حضرت سعد بن معاذ سے کرانا آپ کی کمزور سیاسی حیثیت اور مدینہ میں آپ سے زیادہ طاقت ور افراد و قبائلی سرداروں کی موجودگی کی دلیلیں بتایا گیا ہے۔ اور ثابت یہ کیا گیا ہے کہ مدینہ کے بیشتر قبائل اور ان کے سرداروں کی طاقت و شوکت برقرار رہی تھی اس لئے انہوں نے آپ کی قوت و حشمت اور اقتدار و اختیار کو محدود کر کے آپ کو محض ایک قبائلی سردار کا درجہ دے دیا تھا۔(۴۲)

حیرت کی بات ہے کہ مغربی مورخین نے دانستہ طور سے بڑی جرأت اور بے باکی سے دستورِ مدینہ کی ان دفعات کی اُلٹی سیدھی تاویل و تفسیر کی ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کے معاشرہ و سماج میں روزِ اوّل سے اہم ترین مقام سیادت اور اعلیٰ ترین اختیارات و اقتدار عطا کرتی ہیں۔ کم از کم تین دفعات مثلاً ۲۳، ۳۶ اور ۴۲ آپ کے مقام اور اختیارات کو واضح طور سے بیان کرتی ہیں۔ پہلی دفعہ کے مطابق صرف اور صرف رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اختلافات اور مقدمات میں فیصلہ کرنے کا حق حاصل تھا۔ اور نہ صرف یہ حق حاصل تھا بلکہ تمام فریقوں کے لئے آپ کا فیصلہ ماننا ضروری تھا۔ واٹ نے عجیب وغریب تاویل یہ کی ہے کہ اس اختیار کا تعلق مذہبی معاملات اور امور سے تھا اور اس لئے وہ محض مسلمانوں تک محدود تھا کیونکہ ان کے خیال میں اختلافات کو آپ کے حوالے کرنے کے سلسلہ میں فقرہ "خدا اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کرنے کا" آیا ہے اور اس ضمن میں مورخ موصوف نے قرآن کریم کی بعض آیات سے استشہاد کیا ہے کہ یہ حق و اختیار محض مذہبی تھا اور صرف مسلمانوں سے متعلق۔(۴۳) مگر دستورِ مدینہ کی عبارت سے یہ نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس یا اس سے وسیع تر مفہوم قطعی طور پر یہ نکلتا ہے کہ تمام اختلافات و جھگڑے جن سے کسی قسم کا خدشۂ فساد ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے لئے پیش کرنا ضروری تھا اور اس میں مذہبی یا غیر مذہبی، سماجی یا معاشی، سیاسی یا تہذیبی پالیسی کے معاملات یا معمولی جھگڑے کی کوئی قید یا شرط نہ تھی۔ قرآن کریم کی وہ تمام آیات جو مختلف فیہ اور متنازعہ امور کو فیصلہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کرنے کا حکم دیتی ہیں دراصل اسی سماجی و سیاسی اقتدار کی تشریح و تعبیر ہیں۔ بحیثیت رسول خدا آپ کو مدینہ والوں نے بیعت عقبہ ثانیہ میں تسلیم کیا تھا اور اسی کے ساتھ تسلیم کیا تھا آپ کی غیر مشروط فرمانبرداری کے حق کو۔ اس کے علاوہ تاریخی واقعات بھی آپ کے اس حق و اقتدار کے شروع سے قائم اور واجب التعمیل ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔

پہلے ابتدائی پانچ برسوں میں جب آپ کی کمزور سیاسی حیثیت اور محدود اختیارات ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے۔ آپ کے فیصلے ایک یہودی چور عورت اور ایک یہودی زناکار کے مقدمات میں کسی اور نے نہیں خود یہودیوں نے نافذ کئے تھے[۸۴]۔ غزوۂ بنو قینقاع اور بنو نضیر میں آپ نے بذاتِ خود اور بہ نفسِ نفیس اقدامات کئے اور فیصلے نافذ کئے تھے جن کی تعمیل کی گئی تھی۔ یہ دونوں فیصلے غزوہ بنو قریظہ اور بنو مصطلق سے پہلے نافذ کئے گئے تھے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہ ہوگی کہ ایک سال یا دو سال قبل تو آپ صاحبِ اختیار تھے لیکن بعد میں آپ کی پوزیشن کمزور ہوگئی تھی۔ واقعۂ افک اور غزوۂ بنو قریظہ کے ضمن میں آپ نے جو پالیسی اپنائی تھی اس کا تعلق مصلحت و حکمتِ عملی سے تھا کسی سیاسی کمزوری اور اختیارات کے محدود یا زیرِ قدغن ہونے سے نہ تھا۔ عبداللہ بن ابی بن سلول کے ساتھ آپ کا طرزِ عمل دراصل آپ کی منافقین کے بارے میں اصل پالیسی اور حکمت سے تھا۔ آپ نے منافقین میں سے کسی ایک کے خلاف بھی کوئی سخت قدم نہیں اٹھایا تھا اور نہ ان میں سے کسی کو سزا دی تھی[۸۵]۔ حتیٰ کہ غزوۂ تبوک کے زمانے میں جب آپ نے منافق سازشیوں کی مسجد ضرار کو آگ لگوائی تھی تاہم ان میں سے کسی بھی شخص کو سزا نہیں دی گئی تھی[۸۶]۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپ کے تمام اختیارات کے اعلیٰ و ارفع ہونے کے مغربی مورخین بھی قائل ہیں۔

مونٹگمری واٹ نے اسی طرح سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فوجی پوزیشن کو ہلکا دکھانے کی کوشش کی ہے اور اس کو مبہم و غیر واضح قرار دیا ہے اور یہ دلیل دی ہے کہ "بیعۃ الحرب" کی شرائط نے صرف دفاعی اقدام کی بات کہی تھی اور اس میں بھی یہ واضح نہیں کیا تھا کہ قیادت کی زمام کس کے ہاتھ میں رہے گی[۸۷]۔ بڑی حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ مورخ موصوف نے اس ضمن میں دستورِ مدینہ کی دفعہ ۳۶ کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے جو بلا کسی شک و شبہ کے جنگ کے لئے مدینہ سے باہر نکلنے کی اجازت دینے کے اختیار کو جن میں دفاعی اور جارحانہ دونوں طرح کے اقدامات شامل تھے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار بلا شرکتِ غیرے قرار دیتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مورخ مذکور نے تاریخی ٹھوس اور ناقابلِ انکار تردید واقعات کو بھی اپنی عجیب و غریب تاویل کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بیعۃ الحرب میں قیادت کا مسئلہ طے نہیں کیا گیا تھا لیکن یہ بھی اتنا ہی صحیح ہے کہ جب آپ کو قائد یا امام تسلیم کیا گیا تھا اور آپ کی غیر مشروط اطاعت کا دم بھرا گیا تھا تب ہی قیادت کا اختیار آپ کو منتقل ہوگیا تھا اور باقی رہی سہی کسر دستورِ مدینہ کی اس دفعہ نے پوری کر دی۔ پھر دفاعی اور جارحانہ اقدامات دونوں دفاع کے لئے ہوتے ہیں یہ بات فوجی تاریخ و اصول کے کسی طالب علم سے پوشیدہ نہیں اس لئے دفاعی اور جارحانہ اقدامات کی تفریق کا سوال اٹھانا مضحکہ خیز ہے۔ اس کے علاوہ عہدِ مدینہ کی دہ سالہ تاریخ بلاشک و شبہ یہ ثابت کرتی ہے کہ قیادت عسکری کا منبع و سرچشمہ صرف آپ کی ذات تھی اور آپ ہی مدینہ کے اصل مستقل اور عظیم ترین قائد تھے۔ اس پر مفصل بحث تو اپنے مقام پر آئے گی یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ واقدی کے شمار غزوات و سرایا کے مطابق پہلی مہم سے آخری مہم تک تقریباً ۷۴ مہموں میں یہ اختیار آپ کو حاصل رہا اور نہ صرف حاصل رہا بلکہ آپ نے اس کو پوری طرح سے استعمال فرمایا اور آپ کے ماننے والوں نے اسے مانا اور تسلیم بھی کیا بہرحال یہاں آپ کے مقامِ سیادت و قیادت و اختیار سے مکمل بحث نہیں کرنی ہے۔ دستورِ مدینہ کی بعض دفعات کی روشنی میں آپ کے مقام کو متعین کرنا مقصود تھا اور ان سے یہ واضح و صریح طور سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کو تمام معاملات میں، خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی، اقتصادی ہوں یا شہری، فوجی ہوں یا مذہبی، مکمل اور ارفع و اعلیٰ اختیارات حاصل تھے اور آپ کی یہ سیادت و قیادت اعلیٰ ہجرت کے بعد خاص کر دستورِ مدینہ کے نفاذ کے بعد سب کو تسلیم اور ماننی پڑی تھی۔ مسلمانوں کو اس لئے کہ آپ اللہ کے نبی اور رسول تھے اور اس اعتبار سے آپ کے تمام احکام کی بجا آوری سب کے لئے ضروری اور واجب التعمیل تھی۔ اور غیر مسلموں کے لئے اس بنا پر کہ انھوں نے آپ کو دستورِ مدینہ اور دوسرے مختلف انفرادی معاہدوں کے تحت مدینہ کا سردار اعلیٰ اور قائد اعظم تسلیم کیا تھا اور وہ آپ کو سیاسی رہ نما مانتے تھے اور اس کی بنا پر آپ کی اطاعت و فرمانبرداری کے پابند تھے۔

دستورِ مدینہ کی مختلف دفعات کے تجزیے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ ہجرت کے بعد مدینہ میں ایک سیاسی نظام کی داغ بیل ڈالی گئی تھی جس میں شہر کے مختلف سماجی طبقات کو ایک سیاسی وحدت میں مدغم کیا گیا تھا۔ اصولی طور پر اسی سیاسی وحدت میں دو قسم کے مذہبی اور سماجی طبقات شامل تھے: ایک مسلم جو مہاجرین و انصار پر مشتمل تھا اور دوسرا غیر مسلم جو یہودی قبائل، غیر مسلم عربوں اور اکا دکا نصرانیوں پر مشتمل تھا۔ مسلم طبقہ کے ذیلی گروہ ہی امۃ اللہ یا امت مسلمہ کے ارکان و افراد تھے کیونکہ اس کی بنیاد مذہب ـــــ اسلام ـــــ تھا، جو ایک نیا سیاسی نصب العین بن کر ابھرا تھا۔ اس کے مطابق امۃ اللہ کا حاکم مطلق و مقتدر اعلیٰ خدائے واحد و قدس کی ذات تھی اور اس کے نائب اور رسول کی حیثیت سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تنفیذِ مرضی و احکامِ الٰہی کا حق اوّلین تھا جس نے آپ کو سیاسی، سماجی، مذہبی، فوجی اختیارات کا مرکز و محور بنایا تھا۔ اور اس بنیاد پر مسلم طبقات آپ کی بلا مشروط و غیر متزلزل فرمانبرداری کے پابند تھے۔ اگرچہ غیر مسلم طبقات آپ کو رسولِ خدا اور مذہبی رہ نما نہیں تسلیم کرتے تھے مگر چونکہ مدینہ کے علاقہ میں بستے تھے اور حکمراں یا سیاسی و سماجی اعتبار سے برتر مسلمان طبقات کے ساتھ رہتے تھے اس لئے وہ آپ کی بالادستی ـــــ سیاسی بالادستی ـــــ کو قبول و تسلیم کرنے پر مجبور تھے اور دوسری طرف مسلمان بھی ان کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھنے پر مجبور تھے اس لئے ان کو اسلام کے سیاسی نظام میں بطور حلیف یا شریک و مشاہد رکن کر لیا گیا تھا اور ان کے کچھ فرائض و حقوق مقرر کئے گئے تھے جو بنیادی طور پر شہر کے غالب و حکمراں مسلم طبقات کے حقوق سے فروتر تھے۔ وہ اسلامی امت کے افراد و ارکان نہیں تھے اور نہ اصولی اور عملی طور سے ہو سکتے تھے کیونکہ اللہ کی حاکمیت اعلیٰ اور رسولِ اکرم کی رسالت اور قرآن کریم کے احکام الٰہی پر ایمان نہیں رکھتے تھے یا دوسرے الفاظ میں ان کا مذہب اسلام نہیں تھا اور وہ اسلام کی سیاسی آئیڈیالوجی کو نہیں مانتے تھے۔ اس طرح یہ تاریخی ارتقا ثابت کرتا ہے کہ دستورِ مدینہ نے ایک طرف تو امت مسلمہ کو وسعت و استحکام دیا تھا تو مدینہ کی اسلامی ریاست کو دوسری طرف وجود بخشا تھا۔ اور یوں مواخاۃ کے بعد دستورِ مدینہ کا نفاذ و اجرا اسلامی ریاست کے ارتقا کا تیسرا مرحلہ عظیم تھا۔

(۴) چوتھا مرحلہ: ابتدائی مہمیں

عہدِ نبوی کی ابتدائی مہمیں اور ان کے نتیجے میں ہونے والے قبائل عرب سے معاہدے اور صلح نامے اسلامی ریاست کے

ارتقا کا چوتھا مرحلہ تھا۔ ہمارے مستند مورخین کے بیانات کے مطابق ہجرت کے چھ ماہ کے اندر اندر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مہم ترتیب دی تھی اور اس کو شہر مدینہ کے مغرب کے ایک قبیلہ کے علاقے میں بھیجا گیا تھا۔ اور اس کے بعد ہجرت کے اٹھارہ ماہ کے اندر واقدی کے بقول جناب رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید سات مہیں ترتیب دی تھیں[۸۸] جن میں سے ایک کے سوا سب کی سب قرب وجوار کے علاقے میں گئی تھیں۔ ایک کم معروف مورخ کے مطابق بدر سے پہلے دو اور مہیں بھیجی گئی تھیں اور ان کے بھی منازل مدینہ کے قریبی قبائل تھے۔[۸۹] اس طرح سے غزوۂ بدر سے پہلے ترتیب دی جانے والی مہیں دس ہو جاتی ہیں۔ ان مہموں کی نوعیت اور حقیقت کو عموماً بہت ہی غلط انداز میں سمجھا، سمجھایا اور پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے مغربی علمائے تاریخ نے تو غلط فہمی، غلط تفسیر اور غلط تشریح کی ایک بے نظیر مثال پیش کی ہے۔ اس میں کچھ تو بقول مولانا شبلی نعمانی ہماری روسیاہی کے لئے سیاہی ہمارے ہی اولین مورخین وسیرت نگاروں نے فراہم کی ہے، اور کچھ مہماتِ نبوی کی اقتصادی اہمیت سے ان کی غیر معمولی اور اکثر حالات میں غیر حقیقی اور مبالغہ آمیز دلچسپی کو دخل ہے۔ بعض ابتدائی مورخینِ مغرب نے تو اس سلسلہ میں صریح بددیانتی اور افترا پردازی سے کام لیا ہے مگر بعد کے جدید مورخین پر بددیانتی کا اتنا شبہ نہیں کیا جا سکتا جتنا کہ اپنے پیشرووں کے نظریات سے متاثر ہو کر اپنے طرزِ خیال اور طرزِ فکر کو ڈھالنے کا احساس ملتا ہے۔ چونکہ یہ خیال اتنا یقینی اور پختہ ہو گیا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مہاجر اصحاب خالی ہاتھ اور بے سروسامان مدینہ آئے تھے[۹۰] لہٰذا ان کو معاشی ضروریات کی فراہمی کا کوئی ذریعہ درکار تھا۔ مدینہ میں انصار کی پہلے سے خراب معیشت نے ان کی کوئی مستقل مدد نہیں کی اور ان کی فیاضی وسخاوت اور سیر چشمی بس ایک حد تک کفایت کر سکتی تھی اس لئے جلد ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے تہی دست ونادار اصحاب کے لئے ایک ذریعہ آمدنی تلاش کرنا پڑا اور آپ کے سامنے عربوں کے پرانے لوٹ مار — رزیہ — کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا جس کو اخلاقی طور سے برا نہیں سمجھا جاتا تھا اور عرب قبائلی سماج میں جسے سندِ قبولیت حاصل تھی چنانچہ آپ نے یہ سلسلہ شروع کیا اور اسی مقصد کے لئے دس ابتدائی مہیں ترتیب دی گئیں جو بالآخر غزوۂ بدر پر منتج ہوئیں اور پھر اس کے نتیجے میں مکہ والوں سے باقی فوجی آویزش ہوئی۔

ہمارے سیرت کے ابتدائی مؤلفین نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقدامات کو قریشی عداوت وخطرے کے پس منظر میں سمجھا، دیکھا اور پھر ہمیں دکھایا ہے۔ چونکہ مدینہ منورہ شام سے مکہ والوں کی تجارت کی بین الاقوامی شاہراہ پر پڑتا تھا اس لئے ان مؤلفینِ سیرت نے آپ کی ان ابتدائی مہموں کو قریشی کاروانوں کی روک ٹوک اور چھیڑ چھاڑ قرار دے دیا۔[۹۱] اس سے جدید مغربی مورخین اور ان کے خوشہ چیں مشرقی اور مسلم سیرت نگاروں اور مورخوں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور یہ نتیجہ نکالا کہ قریشی مال ودولت سے لدے کاروانوں نے مسلمانوں میں طمع، حرص وہوس اور آسانی سے مل جانے والی دولت کی آگ بھڑکا دی اور وہ اپنی اقتصادی مجبوریوں سے تنگ آکر لوٹ مار کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور یہ ابتدائی مہیں انہیں کا دوسرا اور عملی روپ تھیں۔[۹۲] دوسری طرف بعض مسلم مورخین نے تھوڑی سی یہ تاویل کی کہ ان مہموں کا مقصد دولت یا کارواں لوٹنا نہیں تھا بلکہ مکہ کی اقتصادی ناکہ بندی تھی جس کے ذریعہ مکہ کی اشرافیہ کو مدینہ کی اسلامی ریاست سے کسی قسم کی مفاہمت پیدا کرنا تھا۔[۹۳] بہرحال ان دونوں صورتوں میں ان ابتدائی مہموں کا مقصد ومحرک اور مسائل ومعاملات اقتصادی ومعاشی تھے۔ لیکن ان ابتدائی مہموں کا ایک

تنقیدی اور تحلیلی تجزیہ ان کے مقاصد محرکات اور مسائل کے بارے میں بالکل دوسرے نتائج نکالنے پر مجبور کرتا ہے جو دراصل صحیح اور واقعی تھے۔

اگر واقدی کی روایت تسلیم کر لی جائے تو سریہ حضرت حمزہ بن عبد المطلب اسلام کی پہلی مہم تھی جو رمضان ۱ھ/ مارچ ۶۲۳ء میں بحر قلزم کے ساحل پر واقع ایک مقام العیص کی طرف بھیجی گئی تھی۔(۹۴) طبری اور ابن اثیر کا بیان ہے کہ اس مہم کا مقام مقصود قبیلہ جہینہ کا علاقہ تھا۔(۹۵) یہ حقیقت دلچسپ ہے کہ جہینہ والے مدینہ کے قبیلہ خزرج کے حلیف و معاہد تھے اور اس کے تحت جنگ بعاث میں جو ۶۱۶ء کے ابتدائی زمانے میں ہوئی تھی خزرج کی طرف سے شریک جنگ ہوئے تھے۔ دوسرا فریق مدینہ کا اوس اور ان کا اتحادی حلیف قبیلہ مزینہ تھا جو مدینہ کے نواح مغرب میں آباد تھا اور وہ اپنے حلیف قبیلہ کی طرف سے جنگ میں شریک ہوا تھا۔ قبائل جہینہ اور مزینہ کے اپنے اپنے حلفاء مدینہ خزرج اور اوس کے ساتھ بالترتیب قریبی اور دوستانہ تعلقات قائم اور بعد ہجرت نبوی بدستور قدیم قائم تھے۔ چنانچہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر میں معاشرۂ امت اور اسلامی ریاست کا سنگِ بنیاد رکھا تو فطری طور سے ان حلیف و قریب و دوست قبائل سے تعلقات کا مسئلہ زیر بحث آیا اور لازمی طور سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان قبائل سے بھی وہی حلف و معاونت باہمی کے رشتے استوار رکھے جائیں جس طرح مدینہ کے یہودی حلیف قبیلوں سے قائم رکھے گئے تھے کیونکہ یہ قبائل مدینہ کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی دائرہ کار میں رہتے تھے اور جغرافیائی سیاسیات کے اصول کے ماتحت ان سے تعلقات قائم رکھنا لازمی و ناگزیر تھا۔(۹۶) جدید مغربی مورخین اور علماء سیرت کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ مدینہ کے اردگرد بسے ہوئے قبائل امت اسلامی کے حلقہ میں سب سے پہلے داخل ہوئے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مہاجرین و انصار کے بعد سب سے بڑے جاں نثار و وفادار تھے۔(۹۷) اس امر کی صریح و صاف تصدیق ان معاہدوں سے ہوتی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مغربی قبائل سے خصوصاً اور مشرق مدینہ کے باسی قبائل سے عموماً کئے تھے۔ اگرچہ ان تمام معاہدوں کی تاریخ اور وقت کے بارے میں ماٰخذ کے بیانات صاف نہیں ہیں تاہم خوش قسمتی سے بعض معاہدوں کے وقت اور حالات کا ذکر صریح طور پر ملتا ہے، جن سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ یا تو یہ معاہدات حلف و باہمی تعاون انھیں ابتدائی مہموں کے زمانے اور دوران میں ہوئے تھے یا ان کے نتیجے میں طے پائے تھے۔ حضرت حمزہ کی مہم العیص کا مقصد قبیلہ جہینہ کی دوستی و تعاون حاصل کرنا تھا نہ کہ قریشی کارواں پر چھاپہ مارنا۔ اس ضمن میں جہینہ کے سردار مجدی بن عمرو کا کردار بہت اہم ہے۔ اتفاق سے جب مسلم جماعت ان کے علاقہ میں پہنچی تو اس کا سامنا شام سے لوٹنے والے ایک کارواں سے ہو گیا۔ قریب تھا کہ جھڑپ ہو جاتی مگر مجدی بن عمرو نے بیچ بچاؤ کیا۔ ہمارے ماٰخذ بصراحت کہتے ہیں کہ قبیلہ جہینہ کے مسلمانوں اور مکہ والوں دونوں سے دوستانہ تعلقات تھے اسی لئے ان کے سردار نے ثالث، حکم یا صلح کے علمبردار کا کردار ادا کیا تھا۔(۹۸)

دوسری مہم رابغ کی وادی کی طرف حضرت عبیدہ بن الحارث کی زیر قیادت شوال ۱ھ/ اپریل ۶۲۳ء میں بھیجی گئی تھی۔ اس کا مقصد بھی اس علاقے کے بدوؤں یا بدوی قبیلوں سے دوستی کے روابط قائم کرنا تھا۔ اس مہم میں بھی اسلامی دستے کا سامنا ایک اور قریشی کارواں سے ہوا تھا مگر دونوں میں جنگ و جدال کی نوبت نہیں آئی۔(۹۹) ان دو مہموں کے علاوہ تیسری مہم

حضرت سعد بن ابی وقاص کے زیرِ کمان ایک ماہ بعد خرّار کے علاقے میں بھیجی گئی تھی۔ ہمارے مورخین اس مہم کی منزل کے باسیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتے اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ اس کا مقصد بھی ایک قریشی کارواں تھا مگر وہ مسلم جماعت کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی نکل گیا تھا۔ مسلمانوں کی کسی دشمن سے ملاقات نہیں ہوئی اور وہ بسلامت مدینہ منورہ واپس آ گئے۔[100]

اس کے بعد پے بہ پے چار غزوات ہوئے:

اوّل غزوہ ابواء یا ودّان صفر ۲ھ / اگست ۶۲۳ء میں،

دوم غزوہ بواط ربیع الاول ۲ھ / ستمبر ۶۲۳ء میں،

سوم غزوہ سفوان اسی ماہ میں، اور

چہارم غزوہ ذوالعشیرہ جمادی الاولیٰ ۲ھ / دسمبر ۶۲۳ء میں۔

ان غزوات پر تمام مورخین و سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ بدر سے پہلے صرف چار مہموں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت فرمائی تھی۔[101] مگر محمد بن حبیب بغدادی ان کے بعد دو اور غزووں کا ہونا بتاتا ہے اور بظاہر تمام قرائن کہتے ہیں کہ اس کا اضافہ غلط نہیں ہے۔ اس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعرات ۲ شعبان ۲ھ / ۲۹ جنوری ۶۲۴ء اور پھر منگل ۱۴ شعبان ۲ھ / ۱۲ فروری ۶۲۴ء کو بالترتیب ینبع اور سفوان کا سفر کیا تھا۔ پہلی مہم کے محرک و مقصد کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہتا البتہ دوسرے سفر کا نتیجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ آپ نے پہلے غفار سے اور پھر اسلم سے دوستی و باہمی تعاون کے معاہدے کئے تھے۔[102] پہلے چار غزوات کے بارے میں عمومی تاثر یہ ہے کہ وہ قریشی کاروانوں کی روک تھام کے لئے واقع ہوئے تھے اور یہ تاثر ہمارے ابتدائی سیرت نگاروں نے فراہم کیا ہے اگرچہ وہ یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی میں بھی دشمن سے سامنا نہیں ہوا تھا۔[103] بہرحال ان کے بیانات کا تنقیدی تجزیہ کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جو محرکات و مقاصد ان مہموں کے ابتدائی مولفین سیرت نے مقرر کئے ہیں وہ دراصل ان کے اپنے تاثرات کا نتیجہ ہیں نہ کہ واقعات اور حقائق کا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ان غزوات کے بارے میں انہیں مورخین و سیرت نگاروں کے بیانات سے ان کے تاثرات کی تردید ہو جاتی ہے۔

مثال کے طور پر ابنِ اسحاق پہلی دو مہمات نبوی کے بارے میں یہ قطعی نہیں بیان کرتے کہ وہ کن لوگوں کے خلاف بھیجی گئی تھیں۔ ان کا بیان بس اس حد تک ہے کہ وہ غزوات اپنے علاقوں کی طرف گئے جہاں ان کی ملاقات اتفاقاً قریشی کاروانوں سے ہو گئی دراصل یہ ملاقات ایک اتفاقی حادثہ تھا نہ کہ سوچا سمجھا منصوبہ۔[104] ابنِ اسحاق کے ان بیانات کی کم و بیش یکساں پیروی ابنِ ہشام، واقدی، ابنِ سعد اور ابنِ اثیر کے یہاں ملتی ہے۔[105] طبری واحد مورخ ہیں جو یہ حتمی بیان دیتے ہیں کہ یہ دونوں مہمات قریشی کاروانوں پر چھاپہ مارنے کے لئے وجود پذیر ہوئی تھیں۔[106] اگرچہ اوّل چار غزواتِ نبوی کے بارے میں ہمارے اکثر سیرت نگار اپنے بیانات کا آغاز اس ٹیپ کے بند سے کرتے ہیں کہ "آپ قریش کے ارادے سے نکلے"، مگر بعد میں غزوات کے اصل بیانات میں حیرت کی بات ہے کہ وہ قریش یا قریشی کاروانوں کا حوالہ نہیں دیتے ہیں۔[107] غزوہ ودّان یا ابواء کے بیان میں سارا زور قبیلہ کنانہ کے ایک خاندان بنو ضمرہ سے معاہدہ صلح و تعاون پر مرکوز رہتا ہے جو آپ نے ان کے سردار

خشی بن عمرو ضمری کے ذریعہ کیا تھا۔[108] ابن اسحاق اور واقدی نے اگرچہ غزوۂ بواط کے بارے میں صرف یہی کہا ہے کہ وہ قریشی کارواں پر چھاپہ مارنے کی غرض سے ہوا تھا مگر چونکہ شکار ہاتھ سے نکل گیا اس لئے آپ ناکام واپس آ گئے۔[109] ابن سعد نے اگرچہ اکثر نکات پر اپنے استاد سے اتفاق کیا ہے تاہم وہ ایک اہم اور نیا حوالہ یہ دیتا ہے کہ بُواط کا علاقہ قبیلہ جہینہ کا تھا جہاں مسلم جماعت تقریباً ایک ماہ مقیم رہی۔[110] اسی طرح اگرچہ غزوۂ ذو العشیرہ کے بارے میں مورخینِ صدر اول کا تاثر یہی ہے کہ وہ قریشی کارواں کے لئے ہوا تھا لیکن ان کا سارا بیان سفر نبوی کی منازل اور راستوں سے متعلق ہے اور آخر میں یہ حتمی بیان ہے کہ آپ نے بنو مدلج اور ان کے حلیف بنو ضمرہ سے معاہدۂ صلح و اعانت باہمی کیا تھا۔[111] باقی دو مزید غزوات نبوی کے بارے میں محمد بن حبیب بغدادی کے بیان میں کہیں بھی قریش یا قریشی کارواں کا ذکر نہیں بلکہ قبیلۂ غفار اور قبیلۂ اسلم سے معاہدات نبوی کا واضح بیان ملتا ہے۔[112] جہاں تک سریہ نخلہ کا تعلق ہے وہ حضرت عبد اللہ بن جحش کی زیرِ قیادت مکہ اور طائف کے درمیان واقع مقام نخلہ کو بھیجی گئی تھی اور اس کا مقصد قریش مکہ کے بارے میں معلومات فراہم کرنا تھا۔ اس پر بحث کہیں اور کی جا چکی ہے۔[113] لہٰذا تفصیلات سے گریز کیا جاتا ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہو گا کہ مہم نخلہ دراصل ایک طلیعہ تھا جس کا کام صرف معلومات فراہم کرنا تھا۔ اور یہی حال ان میں سے بیشتر سرایا کا تھا جہاں تک اولین غزواتِ نبوی کا تعلق ہے وہ فوجی مہمیں ہرگز نہ تھیں بلکہ سیاسی مہمیں یا مشن تھے جن کا مقصد پڑوسی قبائل سے جو مدینہ کے زیر اثر علاقے میں آباد تھے دوستانہ اور باہمی تعاون و نصرت کے تعلقات قائم کرنا تھے۔ اور اس طرح مدینہ کی اسلامی ریاست کے زیر اثر علاقے اور باہمی تعاون و نصرت کے تعلقات قائم کرنا تھے۔ اور اس طرح مدینہ کی اسلامی ریاست کے زیر اثر علاقے یا سیاسی حلقۂ اثر کو وسیع تر کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ قبائل بنو مدلج، بنو ضمرہ، غفار، اسلم، مزینہ، جہینہ اور متعدد دوسرے قبائل سے معاہدے اسی زمانے کی یادگار ہیں اور وہ بالواسطہ طور پر ان ابتدائی مہمات نبوی کی نوعیت و حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں۔[114]

ان مہموں کے بارے میں ابتدائی مولفینِ سیرت اور جدید مسلم و مغربی مورخین کے اس نظریہ کی کہ وہ قریشی کارروانوں پر چھاپہ مارنے کے لئے منظم کی گئی تھیں متعدد دوسرے دلائل اور شواہد سے قطعی اور حتمی تردید ہوتی ہے۔ اوّل یہ کہ نظریاتی طور سے مسلمانوں کو اقدام جنگ کی اجازت نہ تھی۔[115] اس کے علاوہ مسلم ریاست اس وقت اس فوجی صلاحیت اور سیاسی طاقت کی مالک نہ تھی کہ وہ جزیرہ نمائے عرب کے سب سے بڑی سیاسی اور فوجی طاقت سے ٹکر لے سکتی۔ چنانچہ مسلمان نہ تو قریشی کارروانوں پر سامنے سے بالمشافہ حملہ کرنے کا خطرہ مول لے سکتے تھے اور نہ ہی ان پر چھپ کر چھاپہ مار سکتے، گھات لگا کر حملہ کر سکتے یا شبخون مار سکتے تھے۔[116] اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ قریشی کارروانوں کے ساتھ محافظین کی تعداد کافی ہوتی تھی اور عددی لحاظ سے مسلم مہموں کی طاقت بہت کم تھی جیسا کہ چاروں سرایا کی عددی طاقت سے خاص طور پر معلوم ہوتا ہے اور چھ غزواتِ نبوی میں سے محض تین میں مسلم دستوں کی عددی طاقت تنو اور دو سو مسلمانوں پر مشتمل تھی جبکہ ان کے مقابلے میں قریشی کارروانوں کی عددی قوت خاص کر ان کی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں سے سامنا ہوا تھا کئی گنا زیادہ تھی۔[117]

ایک دوسرا اور کہیں زیادہ اہم معاملہ تھا مغربی شاہراہ تجارت پر بسے ہوئے قبائل عرب کے رویے اور طرز عمل کا۔ تمام آثار و شواہد اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام اور استحکام سے پہلے

تمام قبائل عرب جو اس علاقے میں بستے تھے قریشی تاجران مکہ سے حلف و دوستی کے تعلقات رکھتے تھے۔ یہ زمانہ جاہلیت کے قبائلی اور سماجی اور اقتصادی تعلقات کی دین تھے۔ عموماً تاجر قبیلے شاہراہ تجارت کے اردگرد بسے ہوئے قبائل سے دوستی کے معاہدے کر لیتے تھے۔ یہ معاہدے باہمی تعاون کے ہوتے تھے۔ تاجر قبائل ان بدوی یا ساکن قبیلوں کو چند مراعات یا ایک خاص قسم کا ٹیکس دیتے تھے جو عموماً بدو قبائل کی مادی ضروریات مثلاً کھجور، کپڑے، ہتھیار وغیرہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ اور اس کے بدلے میں یہ بدو قبیلے تجارتی کاروانوں کی اپنے علاقے میں حفاظت کرتے تھے بلکہ ان کو دوسرے علاقوں تک حفاظت سے پہنچانے کا اہتمام کرتے تھے قریش نے اسی قسم کے معاہدے تمام قبیلوں سے کر رکھے تھے[۱۱۸] جیسا کہ جہینہ کے سردار مجدی بن عمرو جہنی کے رویہ اور حملہ سے ہوتا ہے اور دوسرے متعدد ثبوت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان علاقوں میں مسلم دستے آسانی سے کامیاب نہیں ہو سکتے تھے اگر وہ تجارتی قافلوں پر حملہ کرتے۔ اس صورت میں وہ نہ صرف قریش مکہ سے جنگ کا خطرہ مول لیتے بلکہ پڑوس کے بدوی قبائل کو بھی اپنا دشمن بنا لیتے اور اس طرح نہ صرف مسلم دستوں کی بہ حفاظت واپسی مشکل ہو جاتی بلکہ خود نوزائیدہ اسلامی ریاست کی زندگی اور وجود معرض خطر میں پڑ جاتا۔

شاہراہ تجارت پر بسے ہوئے قبائل عرب کے رویے اور طرزِ عمل سے زیادہ حیرت انگیز رویہ خود قریشی کاروانوں کا نظر آنے گا اگر مسلم مہموں کو چھاپہ مار کارروائی مان لیا جائے۔ اگر بالفرض پہلی مہم میں جہنی سردار کی کوششوں کے سبب تصادم کی نوبت نہیں آئی تھی اور مسلم دستہ صاف بچ گیا تھا تو دوسری مہم رابغ میں برتر قریشی کاروان نے فروتر مسلم دستہ کو تہس نہس کر کے اس خطرہ کا سدِ باب ہمیشہ کے لئے کیوں نہیں کر دیا؟ لیکن اگر یہ دلیل بھی تسلیم کر لی جائے کہ قریشی کاروان بلا وجہ کوئی جھگڑا مول لینا نہیں چاہتے تھے اور اپنی تجارت کی آئندہ سلامتی کی خاطر جنگ و جدال سے پہلو تہی کرنے کی حکمت عملی پر عمل پیرا تھے[۱۱۹] تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی تجارت پر مسلسل منڈلاتے ہوئے اس خطرہ کا مستقل سدِ باب کیوں نہیں کیا تھا، کیا وہ اپنی تجارت کے بارے میں اتنے ہی لاپرواہ تھے؟ اور کیا تھا تو کیا اور کیوں کر کیا تھا؟ کیا انھوں نے اپنے کاروانوں میں محافظ دستہ کی فوجی طاقت میں اضافہ کیا تھا یا عرب قبائل سے مزید امداد مانگی تھی؟ بظاہر دوسری صورت تو پیش نہیں آئی تھی کیونکہ واقعات و حقائق اس کی نفی کرتے ہیں۔ رہی پہلی صورت تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بجائے محافظین کی تعداد میں اضافہ کے ان میں مسلسل کمی آتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ بدر سے ذرا پہلے جو عظیم اور مالا مال قریشی کاروان شام گیا تھا اس میں محافظین کی تعداد بہت ہی کم تھی۔[۱۲۰] یہ حقیقت اس بات کی غماز ہے کہ ہمارے جدید مغربی مورخین اور ان کے خوشہ چین مسلم مولفین سیرت اور مورخین کو قریشی تجارت پر ان ابتدائی مہموں کی صورت میں جو خطرہ منڈلاتا نظر آ رہا ہے وہ کم از کم اس وقت کے تاجرانِ مکہ کو غالباً بالکل نظر نہیں آیا یا محسوس ہوا تھا۔ ورنہ وہ یوں اپنے کاروانوں کے محافظین کی تعداد میں مسلسل کمی کرتے نہ رہتے اور اس طرح خود اپنی تجارت کے ہلاکت کے درپے نہ ہوتے۔ حالات و واقعات اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد قریشِ مکہ کو یقیناً اپنی تجارت اور تجارتی کاروانوں کے لئے خدشہ پیدا ہوا ہوگا اور اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی کاروانوں میں افرادی طاقت مقابلتاً کہیں زیادہ تھی لیکن جوں جوں

وقت گزرتا گیا ان کو مدینہ کی طرف سے لاحق خدشات ۔ اگر کوئی تھے بھی تو وہ مٹتے گئے اور وہ رفتہ رفتہ اپنے کاروانوں کی حفاظت کے بارے میں مطمئن ہوتے گئے ۔ پھر قریش مکہ اچھی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور فکر و عمل سے واقف تھے ۔ وہ جانتے تھے کہ محمد کا الامین مدینہ میں اپنی فطرت و طبیعت کے خلاف اپنی روایات امانت و دیانت سے یوں گریز نہ کرے گا کہ کسبِ معاش کے لئے لوٹ مار کی راہ اختیار کرے ۔ مآخذ سیرت و حدیث کی بعض روایات سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ بدر سے پہلے تک مکہ والوں کو اپنی تجارت کے لئے مدینہ والوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا ، جیسا کہ حضرت سعد بن معاذ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے ۔[۱۲۱]

ابتدائی مہموں کے ذیل میں ایک اہم نکتہ ان کی منزلوں کا بھی ہے ۔ ان دسوں مہموں میں مہماتِ نبوی کی منزلیں ایک دوسرے سے قطعی مختلف اور فاصلہ کے لحاظ سے الگ الگ تھیں ۔ سفوان اور نخلہ مکہ کے قرب میں اور کافی جنوب مشرق میں واقع تھے جبکہ بقیہ منازل کا مدینہ منورہ سے فاصلہ بیس اور سو میلوں کے درمیان تھا ۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام منازل مغربی شاہراہ تجارت پر واقع نہ تھیں ۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ تمام منازل اس شاہراہ پر ہی واقع تھیں تو مورخین کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ کئی مہمات نبوی کی منزل مقصود شاہراہ تجارت سے ہٹ کر بدوی قبیلوں کے علاقے میں تھی ۔[۱۲۲]

اس کے علاوہ ایک اہم ترین نکتہ جو ان مہموں کے چھاپہ مار ہونے کے الزامِ خام کی قطعی تردید کرتا ہے وہ ان مہموں میں لگنے والی مدت خاص کر مسلم دستوں کے اپنی منازلِ مقصود پر قیام سے متعلق ہے ۔ مورخین ان مہمات نبوی خاص کر غزوات کے بارے میں صراحت سے بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بدوی علاقوں میں کتنی مدت تک قیام کیا ۔ مثلاً غزوہ ودان کے دوران آپ نے منزل پر تقریباً دو ہفتے تک قیام کیا تھا جبکہ بواط اور ذو العشیرہ میں آپ کا قیام دونوں مقامات پر ایک ماہ کے لگ بھگ رہا تھا ۔ اگرچہ محمد بن حبیب بغدادی اپنی بیان کردہ دونئی مہموں کے دوران منازلِ مہمات پر قیام نبوی کی مدت کا کوئی حوالہ نہیں دیتے تاہم یہ واضح ہے کہ وہ خاصی طویل رہی ہوگی ۔ یہ بات عجیب نظر آتی ہے کہ آپ نے یا آپ کے امراء سرایا نے ظاہری طور پر کاروانانِ قریش کے ہاتھ سے نکل جانے کے باوجود اتنی مدت تک ان علاقوں میں قیام رکھا تھا ۔ یہ سوچنا غلط ہے کہ آپ یا آپ کے امرا تجارتی کاروانوں کی واپسی کے منتظر تھے یا دوسرے کاروانوں کی تاک میں تھے ۔ پہلی صورت میں قریشی کاروان شام سے اتنی جلد واپس نہیں آسکتے تھے کیونکہ آمد و رفت میں کم از کم تین ماہ یا اس کے لگ بھگ مدت لگتی تھی ۔ پھر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ جب کاروانوں کی واپسی کا وقت قیاساً قریب آیا تو آپ مدینہ لوٹ آئے ۔ جہاں تک دوسرے کاروانوں پر حملہ کا سوال ہے تو ہمارے تمام ماخذ اس پر متفق ہیں کہ ایسا کوئی واقعہ نہیں پیش آیا ۔[۱۲۳]

پھر ایک بڑا سوال قریشی کاروانوں کی آمد و رفت کی تیز رفتاری اور سرعت اور اسی کے ضمن میں مکی تجارت کے معیار کے بارے میں پیدا ہوتا ہے ۔ اگر مغربی مورخین کا یہ نظریہ مان لیا جائے کہ کرز بن جابر فہری کے خلاف کئے گئے غزوۂ سفوان کے علاوہ بقیہ تمام مہموں کا مقصد چھاپہ مار کارروائی تھی تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مکی تجارت کتنی بڑی اور عظیم تھی کہ ہجرت کے بعد دس ماہ کی قلیل مدت میں تاجرانِ مکہ نے لگ بھگ نو کاروان شام کو بھیجے تھے اور وہ بھی ابو جہل ، ابو سفیان ، امیہ بن خلف

جیسے بڑے بڑے سردارانِ قریش کے زیرِ کمان۔ جبکہ بعد کے زمانے میں پورے چار برسوں کی مدت میں — بدر اور حدیبیہ کے دوران — بھی تاجرانِ مکہ صرف دو کاروان شام کو بھیج سکے تھے۔ اور دونوں ہی کارواں اسلامی ریاست کی حدود سے بچ کر نہیں نکل سکے تھے اور مسلم فوجی دستوں کے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ یہ نکتہ ہمیں اس بحث کی طرف بھی لے جاتا ہے کہ کیا مسلم امراء و قائدینِ مدینہ اتنے بے تدبیر، فوجی حکمتِ عملی سے عاری، سیاسی بصیرت سے محروم اور عمل کے کورے تھے کہ انھوں نے کم و بیش نو بار گھات لگائی اور سوائے ایک موقعہ کے ہر بار ناکام رہے۔ بعد کی فوجی کارروائیوں بلکہ کارناموں سے اسی غلط تاثر و نتیجہ کی نہ صرف تردید ہوتی ہے بلکہ یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ جب جب مسلمانوں نے تلوار اٹھائی وہ کاری ضرب لگائے بغیر نیام میں نہ گئی۔ انھوں نے جب یہ فیصلہ کر لیا کہ قریشی کاروانوں کو اپنے علاقے سے یا کسی بھی تجارتی شاہراہ سے خواہ وہ مشرقی ہو یا مغربی نہیں گزرنے دینا ہے تو کوئی کارواں بچ کر نہیں نکل سکا، حتیٰ کہ صلح حدیبیہ کے بعد جب مکہ کے بے بس و لاچار مسلمانوں نے عیص میں پناہ لی تھی تو انھوں نے اپنی فوجی بے سروسامانی کے باوجود قریشی کاروانوں کو بچ کر نہیں نکلنے دیا تھا۔ یہ حقیقت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں نے چھاپہ مار کارروائی کا منصوبہ ہی نہیں بنایا تھا۔ اور نہ ہی قریشِ مکہ کو اپنی تجارت یا تجارتی قافلوں کے لئے کوئی خطرہ تھا یا ان مہماتِ نبوی سے محسوس ہوا تھا۔(۱۲۴)

ان ابتدائی مہموں کا اولین و آخرین مقصد در اصل مدینہ کے ارد گرد بسے ہوئے قبائل سے دوستی و باہمی تعاون کے تعلقات کو فروغ دینا اور مدینہ کی اسلامی ریاست کو ایک محفوظ و مامون علاقہ فراہم کرنا تھا۔ ان کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ مدینہ کے مغربی نواح میں بسے ہوئے تقریباً تمام بدوی قبائل جیسے خزاعہ اور ان کی ایک اہم شاخ اسلم اور کنانہ کی متعدد شاخوں جیسے ضمرہ، غفار، لیث، دیل اور مدلج، قبائل جہینہ اور مزینہ اور ازدِ شنوءہ کے بعض خاندانوں سے مسلم ریاست کے باہمی تعاون اور دوستی کے تعلقات قائم ہو گئے۔(۱۲۵) یہ دفاعی معاہدے تھے جو ان سے اس زمانے میں کئے گئے تھے۔ چونکہ ان قبائل کے انصارِ مدینہ سے دوستی کے دیرینہ تعلقات تھے اس لئے اسلامی ریاست کو ان سے تعلقات قائم کرنے میں مدد بھی ملی اور مدینہ کے مسلمانوں کی سیاسی اور فوجی طاقت میں بھی اضافہ ہوا۔ مغربی قبیلوں کے علاوہ بعض مشرقی قبائل سے بھی جن میں اسد بن خزیمہ اور سُلیم کے بعض خاندان شامل تھے اسی زمانے میں تعلقاتِ حلف استوار ہوئے تھے۔ ان مہموں کے نتیجے میں اسلامی ریاست کے حدود میں خاصی توسیع ہوئی تھی۔ اور یہ توسیع دو طرح کی تھی:

اوّل تو مدینہ منورہ کے قریب ترین علاقے تھے جن میں جہینہ اور مزینہ کے قبیلوں کے بعض اہم خاندان آباد تھے۔ یہ قبائل/خاندان نہ صرف اسلامی ریاست کے حلیف رکن بنے تھے بلکہ اسلامی معاشرہ — امت — کے رکن بھی بن گئے تھے اس لئے مدنی ریاست کی سیاسی حدود محض شہرِ رسولؐ تک محدود نہیں رہی تھیں بلکہ شہری ریاست کے مرکز کے ارد گرد کے علاقوں تک وسیع ہو گئی تھیں۔

دوم یہ کہ وسعت کے لحاظ سے مدینہ کی اسلامی ریاست کا حلقۂ اثر و نفوذ اس عملی دائرے سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔ اور غزوۂ بدر تک ایک طرف تو مغربی شاہراہ تجارت کی پوری ساحلی پٹی جو شمال میں العیص اور ینبوع اور جنوب میں رابغ کے

درمیان تھی مدینہ کی اسلامی ریاست کے سیاسی اور مذہبی اثر میں آ گئی تھی اور اس سے زیادہ مدینہ اور ان تینوں مقامات کے درمیانی علاقہ کے قبائل اور ان کے خطوں کا معاملہ تھا۔[۱۲۶] ان کے علاوہ یہ بھی قوی امکان ہے کہ مدینہ کے عین مشرق اور مشرق شمال اور مشرق جنوب کا علاقہ بھی اسلامی ریاست کے اثرات محسوس کرنے لگا ہو۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ مدینہ شہر کے چاروں سمت میں اردگرد کا خاصا وسیع علاقہ یا تو مدنی ریاست کا جزو بن گیا تھا یا اس کے حلقۂ اثر کا علاقہ۔ اور یہ ابتدائی مہمات کا اصل کارنامہ تھا جو انھوں نے اسلامی ریاست کے ارتقا کے ایک اہم مرحلہ کے بطور انجام دیا تھا۔

(۵) پانچواں مرحلہ: عظیم جدّوجہد کا زمانہ

رمضان ۲ھ / مارچ ۶۲۴ء میں غزوۂ بدر[۱۲۷] مدینہ منورہ کے سیاسی حلقۂ اثر کی توسیع اور اس کے نتیجے میں نئی امت اسلامی کے دائرے کے پھیلاؤ میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوا۔ بے سروسامان، غیر منظم اور عددی اعتبار سے کہیں زیادہ فروتر اسلامی فوج کی طاقتور و مالدار ملی اشرافیہ کی کیل کانٹے سے لیس، تجربہ کار سپاہ پر مشتمل اور وقت کے بہترین قائدین کی زیرکمان برتر فوج پر عظیم الشان فتح نے تقریباً پورے جزیرہ نمائے عرب کو انگشت بدنداں بلکہ شل کر دیا تھا۔[۱۲۸] ماضی قریب میں قریش مکہ نے اتنی بڑی شکست کا منہ نہیں دیکھا تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اس سے پہلے پے در پے فتوحات سے ہم کنار ہوتے رہے تھے اور اپنی ان عسکری فتوحات اور قبیلہ کنانہ وغیرہ سے اتحاد کے سبب ایک عظیم ترین فوجی طاقت بن کر ابھرے تھے۔ ان کی اس حیثیت میں ان کے کثیر مال و دولت اور مذہبی برتری نے بھی اپنا حصہ ادا کیا تھا۔ اپنی فطری صلاحیتوں اور قائدانہ لیاقتوں کے سبب وہ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں عرب کی سب سے بڑی سیاسی، فوجی، مذہبی اور اقتصادی وحدت تھے۔ بدر کے میدان میں ان کی یہ ذلت آمیز شکست ان کے سیاسی و سماجی وقار و مذہبی چودھراہٹ، اقتصادی بالادستی اور فوجی برتری کا جنازہ نکال سکتی تھی۔ خود قریشِ مکہ کو اس شکست کے دوررس اثرات کا اندازہ تھا[۱۲۹] ورنہ شاید وہ اپنی شامی تجارت کو بچانے کے لئے مدینہ والوں سے بھی دوسرے قبائل عرب کی مانند صلح یا دوستی کرنے کی کوشش کرتے اور بدر کے زخموں کو اپنی حکمتِ عملی کے مرہم سے بھرنے کا مداوا پسند کرتے۔ لیکن اپنے زخم خوردہ سیاسی و سماجی وقار کی بحالی اور فوجی بالادستی کے غیر متزلزل ہونے کا یقین خود ان کو اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ مدینہ کی ابھرتی فوجی اور سیاسی طاقت کو ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے نابود نہ کر دیتے یا اس کو اس حد تک کچل نہ دیتے کہ وہ پھر سر نہ اٹھا سکتی۔

دوسری طرف بدر کی فتحِ عظیم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقار میں زبردست اضافہ کیا اور مسلمانوں کی دھاک بٹھا دی۔ مدینہ کے عرب قبائل خاص کر اور دوسرے نواحی بدو قبیلے عام طور سے مسلمانوں کی جیت سے یقیناً متاثر ہوئے تھے۔ ان کو اس حقیقت کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اسلامی ریاست ایک سیاسی اور فوجی طاقت بن چکی ہے جس سے بہ آسانی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ قریش جیسی عظیم طاقت کی شکست نے ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدے کرنے کی تحریک دی ہوگی اور اس کا بھی قوی امکان ہے کہ اس فتح مبین کے نتیجے میں بعض قبائل اور جماعتوں اور افراد نے اسلام کے بارے میں

اپنی رائے تبدیل کی ہو اور غور و فکر کے بعد اسلامی اُمت کا ایک رُکن بننے کی صدقِ دل سے کوشش کی ہو۔ بہرحال یہ یقینی بات ہے کہ اس وقت تک یا اس زمانے میں کم از کم دو مغربی قبیلے جُہینہ اور مُزینہ اسلام کے دائرہ میں تقریباً مکمل طور سے داخل ہو چکے تھے اور بعض دوسرے قبیلوں نے اسلامی ریاست کی سیاسی دوستی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ خزاعہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے زمانہ عبد المطلب سے حلف کے تعلقات رکھتے تھے[130] اور قریب آ گئے تھے اور ان جیسے قدیم دوست اور حلیف قبائل نے مکمل طور سے یکسو ہو کر مدنی ریاست سے اپنی سیاسی وفاداری وابستہ کر لی تھی۔[131] خاص طور سے اسلم اور غفار کے قبیلوں نے، کیونکہ وہ بوقت ہجرت نبوی تقریباً پورے کے پورے مسلمان ہو چکے تھے اور ان میں جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی وہ اس فتح کے بعد یقیناً پوری ہو گئی تھی۔[132] ان جیسے اور نہ جانے کتنے قبائل ہوں گے جنھوں نے اپنا رُخ اب مکہ کے بجائے مدینہ کی طرف کر لیا تھا۔ اگرچہ اس جنگ کے بعد بظاہر ہمارے مآخذ سے جزیرہ نمائے عرب کی سیاست میں کوئی واضح انقلاب نظر نہیں آتا تاہم یہ یقینی ہے کہ بدر کی فتح نے طاقت کا توازن کم از کم پڑوسی قبائل اور علاقوں کی حد تک اسلامی ریاست کے حق میں کافی جھکا دیا تھا۔

اس حقیقت کا اندازہ اس بین الاقوامی ردِ عمل سے بھی ہوتا ہے جو بدر کی فتح نے کم از کم ایک غیر ملک حبشہ میں پیدا کیا تھا۔ مآخذ کا بیان ہے کہ جب شاہ نجاشی کو مسلمانوں کی اس فتح کی خبر پہنچی تو اس نے حبشہ میں موجود مسلم مہاجرین کے سامنے زبردست خوشی کا اظہار کیا۔ غالباً قریشِ مکہ کو بھی اس بین الاقوامی ردِ عمل کا جو ان کے حق میں قطعی نہیں تھا خدشہ یا علم تھا چنانچہ اُنھوں نے اسی زمانے میں حبشہ کے دربار میں دو سفارتیں اس غرض سے بھیجی تھیں کہ مسلمانوں کو وہاں سے نکلوایا جائے لیکن یہ دونوں کوششیں ناکام رہیں کچھ تو اس سبب سے کہ شاہِ حبش مسلمانوں کا حامی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیرو تھا اور کچھ اس سیاسی حکمت عملی کی بنا پر جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشی چالوں کے توڑ کے لئے اپنائی تھی۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشی ارادوں کی سن گن پا کر اپنے ایک نمائندے حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو دربارِ حبش میں سفیر بنا کر بھیجا تھا تاکہ ان کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے اور ظاہر ہے کہ ان کا مشن پوری طرح کامیاب رہا تھا۔[133] اسلامی ریاست کو اس فتح مبین کے نتیجے میں محض کامیابیاں اور کامرانیاں ہی نہیں ملی تھیں بلکہ ان کے ساتھ ساتھ زیادہ صبر آزما مراحل اور تکلیف دہ زمانے سے گزرنا پڑا تھا۔ خطرات بڑھے تھے، مصائب میں اضافہ ہوا تھا، یلغار و نرغہ کی سرحدوں میں توسیع ہوئی تھی اور پہلے سے کہیں زیادہ مشکلات و آزمائشوں کا سامنا تھا۔

جہاں تک قریش کا تعلق تھا بدر کی شکست بجائے خود ان کے لئے ایک زبردست اشتعال کا سبب تھی۔ مسلمان بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ قریش کا احساسِ شکست غرور ان کو نچلا نہ بیٹھنے دے گا اور وہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک کہ وہ اس کا بدلہ نہ لے لیں۔ دُوسری طرف مسلمانوں کو ہر ممکن تدبیر اور ہر قابلِ حصول طاقت کا استعمال کرنا تھا تاکہ وہ اپنی ریاست اپنے معاشرے اور اپنے مذہب کی حفاظت کر سکیں۔[134] چنانچہ ۲ھ / ۶۲۴ء اور ۸ھ / ۶۳۰ء کے درمیان مکہ اور مدینہ کے درمیان جتنی آویزشیں، تصادم اور محاربات ہُوئے وہ دونوں فریقوں کے انھیں مقاصد کے پس منظر میں تھے۔ اگرچہ ۳ھ / ۶۲۵ء میں غزوہ اُحد کا نتیجہ مسلمانوں کے خلاف قطعی طور پر رہا تھا لیکن انھوں نے اپنی اس ہزیمت پر جلد ہی قابو پا لیا اور اس سے

بڑھ کر یہ کہ انھوں نے طاقت کا توازن جو مکیوں کے حق میں جھک سکتا تھا اپنی حکمت عملی سے نہ جھکنے دیا اور اقدام اپنے ہی ہاتھوں میں رکھا۔[۱۳۵] مکہ والوں کو اس خوں ریز تصادم اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی عارضی کامیابی سے قطعی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ان کا منصوبہ تو یہ تھا کہ مدینہ کی اسلامی ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے مگر وہ مدینہ میں داخل تک نہ ہو سکے۔ حضرت عمرو بن العاص سہمی جو اس معرکہ میں قریشی افواج کے ایک شہسوار دستے کے سالار تھے اور اپنی جنگی لیاقت کے لئے اس وقت بھی شہرت رکھتے تھے بعد میں بیان کیا کرتے تھے کہ جنگ کے ابتدائی مرحلے میں جب مسلمان سپاہی حاوی تھے تو انھوں نے تاک تاک کر تیروں سے تمام قریشی فوج کے گھوڑوں کو بیکار کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جلد ہی افراتفری پر قابو پا لیا گیا تھا اور اسی جنگی حکمت عملی کا نتیجہ تھا کہ قریشی فوج نہ صرف یہ کہ مدینہ میں داخل نہیں ہو سکی تھی بلکہ پسپا ہونے پر مجبور ہو گئی تھی۔[۱۳۶] قریش کو جو کچھ فوجی اور سیاسی فائدہ عارضی طور سے ہوا تھا وہ بھی دوسری صبح ختم ہو گیا کہ جب زخمی رسول اللہ اور شکستہ دل مگر جواں عزم مسلمان سپاہ نے پسپا ہوتی قریشی فوج کا حمراء الاسد تک پیچھا کیا تھا۔[۱۳۷] اس جرأت مندانہ اقدام کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف مسلمان فوجیوں کے حوصلے بلند، عزم پختہ اور ہمت بالا ہو گئی تھی بلکہ مخالفوں کی صفوں میں مایوسی اور زیاں کا احساس پیدا ہوا تھا۔ اور اس سے بڑھ کر مسلمانوں کے بارے میں ان کے پڑوسی قبائل میں خاص کر اور دور دراز کے قبائل میں عام طور سے یہ تاثر پیدا ہوا تھا کہ مسلمانوں کی فوجی طاقت اگر بڑھی نہیں تو کسی طرح سے کم بھی نہیں ہوئی اور وہ اب بھی اس قابل تھے کہ طاقتور اور کسی حد تک فاتح دشمن کو پسپائی پر مجبور کر سکتے تھے۔ قریشی اتحاد کے بارے میں ان کا تاثر یقیناً یہی رہا ہوگا جو حقیقتی بھی تھا اور جس کی طرف حوالہ خزاعہ کے ایک سردار کے تبصرے اور ابو سفیان سے اس کے ایک مکالمے کے دوران بھی ملتا ہے کہ ظلم طاقت میں اضافہ اور اسلامی ریاست کے حلقۂ اثر و نفوذ میں روز افزوں توسیع ہو رہی تھی[۱۳۸] مسلمانوں کی اس بالادستی اور اپنی روز افزوں دگرگوں حیثیت کا احساس خود مکیوں کو بھی تھا چنانچہ غزوۂ احد سے پہلے اور اس کے بعد جنگ خندق تک کسی بھی موقعہ پر (جیسے سویق، قردہ، بدر الموعد وغیرہ میں) وہ کوئی موثر اقدام نہیں کر سکے تھے بلکہ ان تمام مواقع پر ان کی فوجی طاقت کے کھوکھلے پن اور سیاسی ساکھ کے انحطاط کا کچھ زیادہ اظہار ہوا تھا۔[۱۳۹]

غزوۂ احد کے دو سال بعد جنگ خندق (۵ھ/۶۲۷ء) کے موقعہ پر قریش مکہ نے اپنی پوری فوجی طاقت جھونک دی تھی۔ اس بار وہ اپنی عسکری طاقت کے علاوہ اپنے اتحادیوں غطفان، سلیم و اسد وغیرہ کا احزاب عظیم لے کر آئے تھے جو دس ہزار مسلح اور کیل کانٹے سے لیس سپاہیوں پر مشتمل تھا۔[۱۴۰] دوسری طرف مسلمانوں کی جو حالت تھی یا جو ان کی فوجی و عسکری طاقت تھی اس کا بہترین نقشہ قرآن کریم نے کھینچا ہے کہ "زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی تھی اور زبردست کپکپی (زلزال) طاری تھی اور دل حلق میں آکر اٹک گئے تھے"۔ یہ خوف و ہیبت فطری تھی تاہم اس نے ان پر مایوسی اور بے دلی یا بزدلی نہیں طاری ہونے دی تھی بلکہ ان کے دلوں میں ایک عزم مصمم، ایک جذبۂ بیکراں، ایک قوت لامحدود اور ایک ایمان عظیم پیدا کر دیا تھا جو ان کو یقین دلاتا تھا کہ فتح ان کی ہو گی۔[۱۴۱] ایک ماہ کے شدید، طویل و صبر آزما محاصرے کی آزمائش کے بعد وہ امتحان میں سرخرو ہوئے تھے اور ان کی سیاسی اور فوجی حکمت عملی پوری طرح کامیاب رہی تھی جبکہ ان کے حریفوں کی فوجی و سیاسی طاقت کے تابوت میں یہ ناکامی کی آخری کیل تھی۔ یہ واضح تھا کہ مکہ اپنی سیاسی برتری اور فوجی بالادستی کو نہ صرف کھو رہا تھا بلکہ ان کے پیروں کے نیچے سے زمین آہستہ آہستہ

سرک رہی تھی۔[۱۴۲] قریشِ مکہ اور مدینہ کی اسلامی ریاست کے درمیان سیاسی و فوجی توازن کے تقابلی مطالعہ کی بہترین مثال اس حدیث نبوی میں ملتی ہے جس کے مطابق مدبّر و سیاستدان پیغمبرِ اعظمؐ نے فرمایا تھا کہ "قریش اپنی ساری طاقت آزما چکے اور جنگ خندق ان کے فوجی ترکش کا آخری تیر تھا۔ اب وہ آئندہ کبھی مدینہ پر حملہ آور نہ ہو سکیں گے بلکہ اب ہم ان کے خلاف فوج کشی کریں گے۔"[۱۴۳] یہ محض ایک نبی کی پیشگوئی نہ تھی بلکہ ایک سیاسی قائد اور فوجی سالار اور ایک عظیم مدبر اور دُور بین سیاستدان کا اس وقت کے حالات کا تجزیہ تھا جو حقیقت پر مبنی تھا اور جو بعد کے دو تین برسوں میں حرف بہ حرف سچا ثابت ہوا۔ اس مرحلے میں اسلامی ریاست اتنی طاقتور اور با اثر ہو چکی تھی کہ اس کا صحیح معنوں میں کوئی حریف و مقابل نہیں رہا تھا جیسا کہ ہم ابھی کچھ دیر بعد دیکھیں گے۔

(۶) چھٹا مرحلہ : اندرونی مخالفت

اپنی ارتقاء کے پانچویں مرحلے میں اسلامی ریاست کا اگرچہ سارا زور قریشِ مکہ اور ان کی ریشہ دوانیوں، سازشوں اور فوجی اقدامات پر مرکوز رہا تھا تاہم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی بصیرت سے دُوسرے علاقوں اور قبائل کے معاملات پوشیدہ نہیں تھے اور نہ ہی آپ اپنے گھر کے بھیدیوں اور دشمنوں کی مکارانہ چالوں اور دشمنانہ تدبیروں سے غافل تھے اگرچہ نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیران بدر کے ساتھ خاص کر اور دُوسرے جھکے ہوئے دشمنوں کے ساتھ عام طور سے رحمت و رافت کا سلوک کیا تھا جس نے نہ صرف کئی قیدیوں اور قبیلہ والوں کے دل جیت لئے تھے اور ان کو آپ کا ہم نوا بنا دیا تھا بلکہ آپ کے دشمنوں کو یہ احساس بھی بخوبی دلا دیا تھا کہ رحمتِ عالم کو اپنے دشمنوں کی تباہی اور بربادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ تو صرف ان کی دشمنی اور عداوت کو ختم کر کے ان کو اسلامی ریاست کا رکن یا اسلامی اُمت کا فرد بنانا چاہتے تھے، تاہم یہ بھی حقیقت تھی کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے معاہد قبائل اور حلیف دوستوں کی غداری اور باغیانہ حرکتوں کو برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ بعض یہودی سازشیوں اور غدار حلیفوں کا قتل دراصل ان کی ان باغیانہ حرکتوں کا سبب ہوا تھا جو وہ اسلامی ریاست کو تباہ کرنے یا اسلامی ریاست میں تفرقہ اندازی پیدا کرنے کے لئے کر رہے تھے۔ وہ اس سماجی معاشرہ اور سیاسی نظام کے درپے ہو گئے تھے جس کو قائم و دائم رکھنے کے لئے انھوں نے حلف اٹھایا تھا اور جس کے وہ خود رکن تھے۔[۱۴۵] بعض مورخین کا یہ خیال غلط ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان افراد کو اس لئے قتل کرا دیا تھا کہ آپ اپنی تنقید یا مخالفت نہیں برداشت کر سکتے تھے۔[۱۴۶] آپ اپنی ذاتی تنقید بلکہ بہتان تراشی تک کو کھلے دل سے برداشت کر لیتے تھے اور دشمنوں کے زبان و قلم سے تو آپ نے اسلام، اسلامی اُمت اور اسلامی ریاست تک پر تنقید و نکتہ چینی برداشت کی تھی۔ اس کی متعدد مثالیں ہیں جن میں سے سہیل بن عمرو عامری،[۱۴۷] ابو سفیان بن حارث ہاشمی،[۱۴۸] عکرمہ بن ابی جہل مخزومی،[۱۴۹] ابو سفیان بن حرب اموی[۱۵۰] اور نہ جانے کتنے دوسروں کی مثالیں بہت ہی واضح اور بیّن ہیں۔ لیکن اگر اسلامی ریاست کا ایک رکن یا حلیف دشمنوں سے ساز باز کرے، ان کو اخلاقی یا مادی امداد دے یا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی ریاست پر تنقید و نکتہ چینی کرے تو اس کی حرکت غداری کے مترادف ہو گی جو کسی بھی حال میں قابلِ برداشت نہیں ہو سکتی تھی، اور نہ ہوئی۔ چنانچہ آپ کا سخت ردِّ عمل اور طرزِ معاملہ اسلامی ریاست کے

گھر کے بھیدیوں کے ساتھ صحیح تھا اور اس نے نہ صرف ان کو ان اعمال و افعال کے سنگین نتائج کا احساس دلا دیا بلکہ ان میں سے جو لوگ ابھی تک حیص بیص اور گومگو کے عالم میں تھے ان کو اسلامی امت کے دائرہ اثر میں داخل ہونے کی حکمت اور افادیت کا قائل کر دیا جیسا کہ بنو خطمہ کے یہودیوں کے معاملہ سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

انھیں اسباب و علل سے اور تقریباً انھیں حالات میں آپ نے مدینہ منورہ کے تین یہودی قبیلوں — بنو قینقاع[151]، بنو نضیر[152] اور بنو قریظہ[153] — اور محمد بن حبیب بغدادی کے مطابق ایک چوتھے قبیلہ — بنو قطیون — کے خلاف فوجی اقدامات کئے تھے۔ موخر الذکر کے بارے میں ہمیں تاریخ واقعہ اور اس کے اسباب و محرکات وغیرہ کے بارے میں تفصیلات کا علم نہیں ہے مگر بغدادی کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا یہودی قبیلہ تھا جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے ان کی باغیانہ اور مغرورانہ حرکتوں کے سبب نکالا تھا۔ بنو قطیون غالباً بنو قریظہ کا ایک اہم حلیف و معاہد بنو ہدل کی ایک ذیلی شاخ بنو ثعلبہ کا حصہ تھا جو اپنے مشہور بدکار رئیس کے نام سے مشہور ہو گیا تھا جیسا کہ سمہودی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔[154] بنو قینقاع کے بارے میں عام روایت یہ ہے کہ وہ مدینہ کے زرگر، مالدار مہاجن اور تاجر پیشہ یہودی تھے جن کو غزوہ بدر کے فوراً بعد ذی قعدہ ۲ھ / اپریل ۶۲۴ء میں معاہدہ صلح توڑنے، سازشیں کرنے اور اسلامی ریاست کے خلاف بغاوت اور مسلح جنگ کرنے کے جرم میں مدینہ سے نکالا گیا تھا اور ان کے مکانات، قلعوں (آطام) اور دکانوں اور بازار پر قبضہ کر لیا گیا تھا۔ لیکن عہد جدید کے دو مسلمان مورخوں محمد حمید اللہ اور برکات احمد کا خیال ہے[155] کہ بنو قینقاع کے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دینے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو معاف کر دیا تھا اور مدینہ میں رہنے کی حسب دستور سابق اجازت دے دی تھی موخر الذکر نے اپنے نظریہ کے ثبوت میں خاصے وقیع، وزنی اور دل کو چھو لینے والے دلائل دیے ہیں۔[156] ربیع الاول ۴ھ / اگست ۶۲۵ء میں غداری و بغاوت کے جرم میں بنو نضیر کی خیبر کو جلاوطنی پر تمام قدیم و جدید مورخین کا اتفاق ہے۔ مگر مدینہ کے ایک چوتھے یہودی قبیلہ بنو قریظہ کے بارے میں اب تک مشہور اور مقبول روایت یہی رہی ہے کہ ذی قعدہ۔ ذی الحجہ ۵ھ / مئی ۶۲۷ء میں بغاوت، سازش، غداری، دشمنوں کے ساتھ سازباز کے جرم میں ان کے تمام مردوں کو قتل کر دیا گیا تھا اور ان کے بچوں اور عورتوں کو مدینہ، نجد اور شام وغیرہ کے بازاروں میں غلام بنا کر بیچ دیا گیا تھا۔ لیکن دور جدید کے مورخوں برکات احمد[157] اور ڈبلو۔ این۔ عرفات[158] نے اپنی شاندار تحقیقات سے ثابت کیا ہے کہ بنو قریظہ کے قتل عام کی کہانی غلط اور تراشیدہ دشمنان اسلام ہے۔ صرف چند مجرم سرداروں یا افراد کو قتل کیا گیا تھا بقیہ کو معاف کر کے مدینہ میں رہنے کی اجازت بھی دے دی گئی تھی۔

بہرحال ان تمام یہودی افراد و قبائل کے ساتھ اسلامی ریاست نے سختی کا سلوک کیا تھا کیونکہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح و تعاون کے معاہدے کر رکھے تھے مگر پھر اپنی طاقت کے زعم، اسلام دشمنی، قومی عصبیت، یہودی مزاج غدر و مکر و فریب کی بنا پر اسی ریاست اسلامی کی جڑیں کاٹنے لگے جس کی حفاظت و حمایت کی انھوں نے قسم کھائی اور حلف اٹھایا تھا۔ ۵ھ کے اواخر تک مدینہ منورہ کو ان یہودی سازشیوں سے پاک کیا جا چکا تھا اگرچہ اب بھی مدینہ منورہ میں یہودی آبادی بشمول افراد و قبائل کے خاصی بڑی تھی لیکن چونکہ انھوں نے معاہدہ صلح و تعاون کی پرخلوص پابندی کی تھی اس لئے ان سے

کوئی تعرض نہیں کیا گیا اور ان کو مسلمانوں اور ان کی ریاست کے ایک حلیف دوست اور بعد میں ذمی کی حیثیت سے تمام حقوق و مراعات حاصل رہے۔

مدینہ منورہ میں ایک اور اسلام دشمن یا رسالتمآب کا مخالف عنصر منافقین پر مشتمل تھا۔ مآخذ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طبقہ یہودیوں اور عربوں دونوں پر مشتمل تھا[۱۶۱] جو بظاہر مسلمان اور اسلامی ریاست کے رکن تھے لیکن دل سے دشمن اور اہل میں مارِ آستین تھے۔ ان کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول تھا جو قبیلۂ خزرج کے ایک طاقتور اور با اثر خاندان کا رئیس تھا[۱۶۲]۔ سیاسی طور پر کچھ دوسرے خاندان بھی اس کے زیر اثر تھے۔ چونکہ ہجرتِ نبویؐ سے قبل بلکہ مدینہ میں اشاعتِ اسلام سے پہلے سردارِ منافق کو سیاسی بالادستی اور تفوق حاصل تھا جو اسے ہجرتِ نبویؐ کے بعد حاصل نہ رہا اس لئے اسے اور اس کے ہمنواؤں کو اسلام و رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کد پیدا ہو گئی تھی اور جوں جوں اسلام کو عروج، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کامیابی اور ریاست اسلامی کو توسیع و استحکام حاصل ہوتا جاتا تھا توں توں منافقین کی آتشِ حسد بھڑکتی جاتی تھی اور وہ اسلام و ریاست مدینہ کی بیخ کنی کی تدبیریں کرتے جاتے تھے۔ چونکہ وہ تنہا خود کچھ نہ کر سکتے تھے اس لئے انھوں نے بعض یہودی قبیلوں[۱۶۳] اور مکہ کے قریش کے علاوہ کچھ بدوی قبائل سے بھی ساز باز کر رکھی تھی مگر جغرافیائی سیاسیات کے دباؤ میں وہ بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے۔ بدر کے بعد بنو قینقاع کو بھڑکانے میں انھیں کا ہاتھ تھا اسی طرح بنو نضیر کی سرکشی و تمرد کو بھی ان کی اسلام دشمنی نے طول دیا تھا[۱۶۶]۔ اس سے پہلے غزوۂ اُحد میں اُنھوں نے اپنا دستہ عین وقت پر مسلم فوج سے الگ کر کے جاں نثارانِ اسلام کی ہمت شکنی کی کوشش کی تھی[۱۶۷] مگر وہ ایک طرح سے مسلمانوں اور ریاست اسلامی کے حق میں امدادِ غیبی اور رحمتِ خداوندی بن گئی[۱۶۸]۔ غزوۂ خندق کے زمانۂ محاصرہ میں اُنھوں نے جو کچھ کیا اس کو قرآن کریم نے خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے[۱۶۹]۔ حیرت کی بات ہے کہ منافقین کا کسی بھی کردار کا، منفی یا مثبت، کوئی ذکر احزاب کے بارے میں نہیں ملتا ہے[۱۷۰] حالانکہ اسی زمانے سے متصل انھوں نے غزوۂ مریسیع میں سفرِ مراجعت میں مہاجرین و انصار کے درمیان قبائلی عصبیت بھڑکانے کی کوشش کی تھی جو ناکام رہی[۱۷۱]۔ اسی طرح اُنھوں نے واقعۂ افک میں کلیدی کردار ادا کیا تھا تاکہ مسلم معاشرے کو پراگندگی کا شکار بنایا جائے مگر وہاں بھی زک اٹھائی[۱۷۲]۔ اگرچہ ان کی سازشوں کا سلسلہ تبوک کے غزوہ کے زمانے تک مسجدِ ضرار وغیرہ[۱۷۳] کی صورت میں جاری رہا تاہم یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ ۵ھ / ۶۲۷ء میں احزاب کی شکستِ فاش سے پہلے ہی ان کے زہر کا کانٹا ٹوٹ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ افک میں ان کا حصہ اور اس سے کچھ پہلے مریسیع کی مہم کے دوران ان کی فتنہ انگیزی ان کے ترکش کا آخری تیر یا ان کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ اتفاق کی بات ہے کہ منافقین اور یہودی[۱۷۴] سازشیوں کی طاقت ایک ہی زمانے میں ٹوٹی۔ بہرحال مدینہ منورہ کے ان دونوں گھر کے بھیدیوں کے خاتمے کے ساتھ ہی مسلمانوں کو اپنے عقب کی حفاظت کی ضمانت فراہم ہو گئی۔ اسلامی ریاست کو اب کسی اندرونی سازش، بغاوت یا غداری کا خطرہ نہ رہا کہ وہ اس کے وجود یا استحکام کے لئے کوئی غلط یا خطرناک صورت پیدا کر سکتا۔ اس اندرونی استحکام نے ہی اسلامی ریاست کو اس قابل بنایا تھا کہ وہ اپنے بیرونی دشمنوں کے خلاف مؤثر اور مستقل اقدام کر سکے۔

(۷) ساتواں مرحلہ : قبائلِ عرب کی عداوت

اسلامی ریاست کو اپنے اندرونی دشمنوں، غدار یہودیوں اور سازشی منافقوں کے علاوہ متعدد بیرونی دشمنوں کی عداوت کا بھی مسلسل سامنا رہا۔ قریشِ مکہ کے علاوہ بعض سرکش قبائل بھی مدینہ کی ریاست کو پنپنے دینا نہیں چاہتے تھے کیونکہ ان کو اس صورت میں اپنی امن دشمن حرکات جاری رکھنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ کچھ ان کی اسلام دشمنی اور قبائلی عصبیت بھی اس کی ذمہ دار و محرک تھی اور غالباً اس سے زیادہ اسلام کی سیاسی اور سماجی و مذہبی برتری میں وہ اپنی آزادی اور خودمختاری کی موت دیکھتے تھے اس لئے وہ مسلسل مدینہ کے خلاف اقدامات کرتے یا ان کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دوربین نگاہیں مدینہ کے قرب وجوار یا دور دراز کے ان خطرات کو بخوبی اور بروقت دیکھ لیتی تھیں اور آپ ان کے موثر تدارک کی صحیح وقت پر تدبیر کر لیتے تھے۔ بدر تک اسلامی ریاست کو قبائل عرب کی ایسی کسی دشمنی کا سابقہ نہیں پڑا تھا کیونکہ غالباً ان بدوی قبائل کو ان کی سیاسی مصالح نے ابھی تک اپنے مفادات کے لئے کوئی بڑا خطرہ نہیں دکھایا تھا لیکن قریش مکہ کی طاقتور فوج کے خلاف مسلمانوں کی فتح نے کچھ بدوی قبائل کی آتشِ حسد و نفرت بھڑکا دی اور ان کو یہ احساس دلا دیا کہ مدینہ کی اسلامی ریاست ان کے لئے بھی کسی وقت خطرہ کا سبب بن سکتی ہے۔ چنانچہ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ بدر کی فتح عظیم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کو بیک وقت آسان بھی بنا دیا تھا اور مشکل بھی۔ اگر اس کامیابی نے بعض قبائل عرب کو مدینہ کی سیاسی بالادستی ماننے پر مجبور کر دیا تھا تو دوسری جانب اس نے نبرد آزمائی اور تصادم کے دائرے کو وسیع تر بنا دیا تھا۔ اب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سے زیادہ محاذوں پر بیک وقت متعدد دشمنوں سے لڑنا پڑ رہا تھا۔ سب سے پہلے سنہ ۲ھ / سنہ ۶۲۴ء کے وسط میں آپ کو مشرقی علاقے کے ایک قبیلہ بنو سلیم کی طرف توجہ دینا پڑی جس نے اپنی عددی طاقت کے زعم میں مدینہ کی ریاست کے خلاف سرکشی و تمرد کی راہ اپنائی تھی اور مسلمانوں کی حکومت کے خلاف درپے تھا۔ چنانچہ صفر سنہ ۳ھ / جولائی سنہ ۶۲۵ء اور ربیع الثانی سنہ ۶ھ / ستمبر سنہ ۶۲۶ء کے درمیان آپ کو اس قبیلہ کے مختلف خاندانوں کے خلاف اقدام کرنا اور ان کی ناپاک سازشوں کو کچلنا پڑا۔ پہلی دو مہموں کی قیادت آپ نے بنفسِ نفیس فرمائی اور ان کے علاقوں پر اچانک چھاپے مارے۔ ہمارے مآخذ کے مطابق آپ مقام کدر تک پہنچے اور وہاں آپ نے پندرہ دنوں تک قیام فرمایا اور مدینہ کو بغیر کسی لڑائی اور تصادم کے لوٹ آئے۔[۱۰۶] دوسری مہم کے دوران جو جمادی الاولیٰ سنہ ۳ھ / اکتوبر، نومبر سنہ ۶۲۴ء میں واقع ہوئی۔ مسلمان سپاہ بحران نامی مقام تک گئی جو فرع کے علاقے میں حجاز کی ایک مشہور کان تھی۔ اس مہم میں بھی آپ نے منزل مہم پر تقریباً دو ماہ تک قیام فرمایا اور بغیر کسی جنگ وجدال کے مدینہ منورہ لوٹ آئے۔[۱۰۷] اگرچہ ہمارے مآخذ کا بیان ہے کہ پہلی مہم میں مسلمانوں کو کچھ معمولی سی غنیمت بھی ہاتھ آئی تھی اور دوسری مہم میں کوئی مال و منال نہیں ملا تھا تاہم یہ معاملہ خاصا اہم ہے کہ آپ نے ان دونوں مہموں کے دوران کافی طویل مدت تک قیام ان قبیلوں کے علاقوں میں کیا تھا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مدینہ کے خلاف سازشوں اور منصوبوں میں ملوث تھے۔ ہماری روایات کا یہ اصرار کہ آپ نے یہ اقدامات ان علاقوں کے قبیلوں کی شرارت اور دشمنی کی سن گن پا کر کئے تھے بالکل صحیح بھی ہو سکتا ہے

اور آپ کا بر وقت اقدام کرنا حکمت عملی کی دلیل بھی تھی تاہم اس سے بڑی دلیل حکمت آپ کے ان طویل قیاموں میں پوشیدہ ہے جو آپ نے ان علاقوں میں رکھے تھے آخر اتنا طویل قیام آپ نے کیوں کیا تھا جب کہ کوئی جنگ و جدال بھی نہیں ہوئی تھی؟ اس کا جواب اگرچہ واضح انداز میں ہمارے مآخذ سے نہیں ملتا تاہم یہ نتیجہ نکالنا قطعی صحیح اور حقیقت کے مطابق ہوگا کہ آپ نے ان دونوں مہموں کے دوران متعلقہ قبائل سے دوستی اور تعاون کے معاہدے کئے ہوں گے اور ان میں اسلام کی تبلیغ کی ہوگی۔ اس نتیجہ کی مزید تائید دوسری مہم میں پیش آنے والے ایک واقعہ سے ہوتی ہے جس میں غطفان کی ایک شاخ بنو محارب کے سردار حضرت دعثور بن حارث نے بڑے ڈرامائی طریقہ سے اسلام قبول کرلیا تھا۔[۹۸] ہمارے سیرت نگاروں نے یہ واقعہ جس انداز میں بیان کیا ہے اس سے یہ غلط تاثر ابھرتا ہے کہ حضرت دعثور کا اسلام محض ایک انفرادی اور شخصی واقعہ تھا جس کا حالات حاضرہ و واقعہ سے نہ کوئی تعلق تھا نہ اس کا کوئی اثر۔ حالانکہ یہ بالکل صحیح نہیں ہے۔ واقعات کی ترتیب اور نہج کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو بخوبی واضح ہوتا ہے کہ حضرت دعثور کا اسلام لانا دراصل پورے قبیلہ/خاندان کا مشرف بہ اسلام ہونا تھا چاہے یہ فوراً ہوا ہو یا اس میں کچھ مدت لگی ہو۔[۹۹] یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ سردار قبیلہ کا اسلام دراصل اس کے قبیلہ والوں کے لئے ایک حکم و مثال کا درجہ رکھتا تھا۔ پھر دوسری روایات سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت دعثور نے اپنے قبیلہ کو اسلام سے روشناس اور اس کا پیرو بنا دیا تھا۔

ان واقعات و دلائل کی روشنی میں یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دونوں مہمیں دراصل سیاسی اور مذہبی دورے تھے نہ کہ فوجی مہمیں۔ اور ان کے نتیجے میں سلیم، غطفان اور اس کے خاندان بنو محارب میں اسلام پھیلا تھا اور کدر، ذو امر اور ارحضیہ کے علاقوں تک اسلامی ریاست کی سرحد وسیع ہوئی تھی یا حلقۂ اثر بڑھا تھا۔

صفر ۴ھ / جولائی ۶۲۵ء میں بئر معونہ کا حادثۂ فاجعہ پیش آیا جس میں تقریباً ستر مسلمان مبلغین نے اپنے خون سے کلمۂ حق سرزمین معونہ پر لکھ دیا تھا اور اسلامی ریاست کی لکیر بنا دی تھی۔ اس قتل عظیم میں کلیدی کردار قبیلۂ غطفان کے خاندان بنو مالک کے سردار عامر بن طفیل نے ادا کیا تھا اور اپنے اس گھناؤنے جرم میں عُصیہ، رعل اور ذکوان نامی تین خاندانِ بنی سُلیم سے مدد لی تھی۔ یہ دلچسپ حقیقت یاد رکھنے کی ہے کہ پہلے عامر بن طفیل نے اپنے خاندان بنو عامر بن صعصعہ سے مدد چاہی تھی مگر انھوں نے اپنے سردار ابو براء مالک بن عامر کے اس عہدِ ضمانت و تحفظ کو توڑنے سے انکار کر دیا تھا جس کے سایہ میں مسلمان مبلغین نے سفر کیا تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کا بڑا قیمتی جانی نقصان ہوا تھا مگر اس واقعہ سے دو اہم فائدے مسلمانوں کو حاصل ہوئے تھے: اوّل یہ کہ غطفان کے بعض خاندانوں مثلاً بنو عامر وغیرہ کی سیاسی حمایت ملی تھی جیسا کہ ابو براء مالک کے بعد کے رویّے سے ثابت ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ اسلام نہ صرف ان حامی قبیلے یا اس کی شاخوں میں پھیلنے لگا تھا بلکہ قاتل/قاتلین کے خاندانوں میں بھی اس نے اپنی راہ بنا لی تھی۔[۱۰۰] اسلام کی یہی تاثیر تھی جس نے مسلمانوں کے دائرۂ اثر و نفوذ کو مسلسل بڑھایا اور وسیع کیا تھا۔[۱۰۱] ستر شہداء بئر معونہ نے اپنے خون سے ان دو بڑے قبیلوں یعنی سُلیم اور غطفان کے علاقوں میں اسلامی انقلاب کی بنیاد رکھی تھی جس نے باقی دشمنانِ اسلام کی سیاسی، مذہبی اور فوجی طاقت کو مسلسل گھٹایا اور مسلمانوں کی طاقت کو برابر بڑھایا تھا۔

اس خونیں واقعہ کے دو برس بعد بنو سلیم کے دشمن خاندانوں اور افراد کے سات سو نمائندوں نے اگرچہ اسلامی ریاست کے خلاف ملکی اتحادِ احزاب عظیم میں حصہ لیا تھا[182] تاہم ان کی طاقت مسلسل گھٹ رہی تھی اور ربیع الثانی ۶ھ / ستمبر ۶۲۷ء میں بنو سلیم کے خلاف حضرت زید بن حارثہ کی تیسری مہم آخری ثابت ہوئی جس نے اس قبیلہ کی دشمنی کا جنازہ نکال دیا۔[183] اس مہم کے بعد مسلمانوں کو ان کے خلاف کوئی اور فوجی کارروائی نہیں کرنی پڑی۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ قبیلہ سلیم کے متعدد سرداروں اور سر برآوردہ افراد کے ساتھ کافی لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا[184] اور صلح حدیبیہ تک یا اس کے معاً بعد پورا قبیلہ اسلام لا چکا تھا اور وہ اسلامی ریاست کا رکن رکین بن چکا تھا[185] فتح مکہ سے قبل ہی بنو سلیم اسلامی امت کا مکمل رکن بن چکے تھے[186] اور اس طرح اسلامی ریاست کی سرحدیں قبیلہ سلیم کے علاقوں تک وسیع ہو گئی تھیں۔[187]

اگرچہ ذوامر کی مہم[188] نے بنو محارب کو اسلامی امت[189] کا رکن بنا دیا تھا تاہم یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسی قبیلہ غطفان کی ایک اور شاخ بنو ثعلبہ نے کچھ مزید مدت تک اسلامی ریاست کی مخالفت جاری رکھی تھی۔ چنانچہ ۶۲۶ء اور ۶۲۹ء کے دوران پانچ اور مہمیں ان کے خلاف بھیجی گئی تھیں۔ ان میں سے اہم ترین مہم غزوہ ذات الرقاع[190] کی تھی جس کی قیادت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفس نفیس فرمائی تھی۔ یہ مہم محرم ۵ھ / جون ۶۲۶ء میں ہوئی تھی اور اس میں مسلمان سپاہ کی تعداد مختلف روایات کے مطابق چار سو اور آٹھ سو نفوس پر مشتمل تھی۔[191] اس مہم کا خاطر خواہ نتیجہ بر آمد ہوا۔ اس کے بعد بنو ثعلبہ کی مخالفت اسلام کی آخری چنگاری بھی بجھ گئی۔ چنانچہ اس کے بعد جو چار مہمیں بھیجی گئیں وہ مہم یا لشکر سے زیادہ تبلیغی یا سیاسی جماعتیں تھیں اور اگر ان کی فوجی نوعیت بھی تھی تو بہت ہی معمولی، کیونکہ یہ مہمیں محض دس[192]، چالیس[193]، پندرہ[194] اور ایک سو تیس[195] افراد پر بالترتیب مشتمل تھیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مہمیں اس قبیلہ کے شر پسند عناصر کے خلاف بھیجی گئی ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ اتنی چھوٹی چھوٹی جماعتیں کسی بڑے قبیلے کے خلاف نہیں بھیجی جا سکتی تھیں۔ اگرچہ ماخذ کا اصرار ہے کہ ان کی نوعیت سیاسی یا فوجی تھی مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تبلیغی جماعتیں تھیں۔ بہر حال یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ۶۲۹ء کے آغاز تک کم از کم ثعلبہ کے خاندان نے اسلام اور اسلامی ریاست کی بالادستی تسلیم کر لی تھی اگرچہ غطفان کی دشمنی کچھ اور مدت تک جاری رہی تھی۔

مشرقی علاقے کے ایک اور قبیلہ اسد نے جو خزیمہ کا سب سے بڑا اور معروف قبیلہ / رکن تھا، اسی زمانے میں غزوہ احد کے بعد سر اٹھایا۔ محرم ۴ھ / جون ۶۲۵ء میں طے اور بنو غطفان کے اس پڑوسی قبیلہ نے مدینہ پر اچانک حملہ کر کے مسلمانوں کی ریاست کو مٹانے کا منصوبہ بنایا[196] مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ دور بیں اس خطرہ کو پہلے ہی بھانپ چکی تھی۔ چنانچہ آپ نے خود اقدام کر کے ان کے منصوبہ کو خاک میں ملا دیا۔ مسلمان لشکر نے تیزی سے پیش قدمی کی اور ان کی آمد کی خبر سن کر دشمن بھاگ کھڑا ہوا اور بغیر کسی تصادم یا خونریزی کے اس خطرہ کا سدِ باب ہو گیا۔[197] اس بروقت اور سخت اقدام کا اتنا اثر ہوا کہ بنو اسد / خزیمہ کے شر پسند عناصر نے کافی مدت تک سر نہیں اٹھایا۔ دو برس کے بعد ربیع الثانی ۶ھ / اگست ستمبر ۶۲۷ء میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے الغمر نامی[198] مقام پر جمع ہونے والے اسد کے کچھ خطر پسند و دشمن عناصر کی شرارت کے منصوبوں کو ایک دوسری چھوٹی سی فوج بھیج کر پھلنے پھولنے سے پہلے ہی کچل دیا۔ اس بار بھی دشمن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر راہِ فرار

اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ بہرحال اس واقعہ کے بعد اسد/خزیمہ کے کسی اسلام دشمن کارروائی میں ملوث ہونے کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ یہ اور ایسی ہی دوسری شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ اسد/خزیمہ نے اسلامی ریاست کے ساتھ کوئی سیاسی یا مذہبی یا دونوں قسم کا سمجھوتہ کر لیا تھا اور اس طرح وہ اسلامی ریاست کے دائرۂ اثر و نفوذ میں آ گئے تھے۔(۱۹۹)

اسی زمانے میں قبیلۂ بنو لحیان کے سردار سفیان بن خالد ہذلی نے مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست پر حملے کا منصوبہ بنایا مگر حضرت عبداللہ بن انیس کی ایک شخصی مہم نے اس کا کام تمام کر دیا۔(۲۰۰) اور اس طرح یہ منصوبہ سر چڑھنے سے پہلے ہی دم توڑ گیا۔ مآخذ میں سے بعض روایات کا بیان ہے کہ اس سیاسی قتل کے نتیجہ میں واقعہ رجیع پیش آیا جس میں سات یا آٹھ یا دس مسلم مبلغین نے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔(۲۰۱) عام طور سے ہمارے مآخذ اس حادثہ پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی شدید فوجی ردِّ عمل کا اظہار نہیں کرتے ہیں تاہم محمد بن حبیب بغدادی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ کدر کی مہم اسی حادثۂ فاجعہ کے ردِّ عمل کے طور پر پیش آئی تھی۔(۲۰۲) بہرحال کوئی بھی صورت رہی ہو یہ حقیقت ابھرتی ہے کہ اس واقعہ کے بعد بنو لحیان یا اس کے دوسرے خاندانوں نے اسلامی ریاست کے ساتھ تصادم کی راہ نہیں اختیار کی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو گا کہ ان قبیلوں نے اسلامی ریاست کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کا سمجھوتہ کر لیا ہو گا۔ واقعہ رجیع کے اثرات اور شہداء کا خون یوں رائیگاں جانے والا نہ تھا۔ اس نے اپنا رنگ دکھایا اور اسلام نے اس قبیلہ میں اپنے قدم جما لئے تھے۔(۲۰۳)

ربیع الثانی ۵ھ/اگست، ستمبر ۶۲۶ء میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے شمال میں واقع دومۃ الجندل(۲۰۴) کی طرف پیش قدمی فرمائی۔ بظاہر اس کا سبب یہ تھا کہ شمال کے بعض قبائل نے سرِ تمرد و عصیان اٹھایا تھا وہ فسادِ خلق کے مرتکب ہو رہے تھے۔ اگرچہ ابنِ اسحاق، ان کے جامع ابنِ ہشام اور ان کے خوشہ چیں طبری کے بیانات اپنے اختصار و ابہام کے سبب تشنہ ہیں تاہم واقدی کے بیانات سے کچھ تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ اس کے مطابق دومۃ الجندل میں ایک بڑا علاقائی بازار تھا جہاں جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں سے خاص کر شمال، شمال مغرب و مشرق کے علاقوں سے تاجر آتے تھے اور تجارت کا بازار گرم کرتے تھے۔ بعض شر پسند شمالی عرب کے قبیلوں نے بدوی قبائل سے ساز باز کر کے بازار دومۃ الجندل میں لوٹ مار مچا دی بلکہ آتے جاتے کاروانوں کے لئے مستقل خطرہ بن گئے۔ ان کا منصوبہ مدینہ کی اسلامی ریاست پر بھی حملہ کرنے کا تھا۔ اگرچہ ہمارے مآخذ ان دونوں معاملات کے درمیان تعلق کا برملا ذکر نہیں کرتے تاہم یہ بات واضح ہے کہ اگر کوئی سیاسی یا فوجی طاقت ان لٹیروں کو کچل سکتی اور ان کی لوٹ مار کا سدِّ باب کر سکتی تھی تو وہ مدینہ کی اسلامی ریاست تھی کیونکہ اس نے روزِ اول سے یہ اپنا فرضِ منصبی قرار دے لیا تھا کہ مظلوموں کی فریاد کو پہنچے اور ان کی ظالم کے ظلم اور شر سے حفاظت کرے۔ اور حقیقتاً ہوا بھی یہی۔ اندازہ ہوتا ہے کہ بازار دومۃ الجندل کے باسیوں یا آنے جانے کاروانوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مداخلت کی درخواست کی۔ اور عین ممکن ہے کہ یہ مدینہ کی اقتصادی ناکہ بندی کی دشمن قبائل کی کوشش ہو اور مسلمانوں کی تجارت کو برباد کرنا اس کا مقصد رہا ہو۔(۲۰۵) چنانچہ آپ ایک ہزار صحابہ پر مشتمل ایک لشکر لے کر روانہ ہوئے اور لٹیروں کی سرکوبی کی۔ مہم کے نتیجہ میں مسلمانوں کو کچھ مالِ غنیمت مویشیوں اور قیدیوں کی شکل میں ملا مگر اس سے زیادہ اہم اور دیرپا نتیجہ اس مہم کا سیاسی اور فوجی اثر تھا۔ آپ نے

دومۃ الجندل میں کچھ مدت قیام کیا اور مختلف علاقوں میں چھوٹے چھوٹے سرایا بھیجے۔ ان کا، ظاہر ہے، قرب وجوار کے علاقے کے قبیلوں پر خاصا اثر پڑا، اور عجب نہیں کہ ان میں کچھ نے اسلامی ریاست سے صلح وامن کے معاہدے کرلئے ہوں۔[۲۰۶] اس کی ایک شہادت طبری کے ایک بیان سے ملتی ہے کہ اس مہم کے دوران رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے ایک طاقتور ترین قبیلۂ غطفان کے ایک اہم خاندان بنوفزارہ کے سردار عُیینہ بن حصن فزاری سے جو اسی نواح میں مشرقی علاقوں میں آباد تھا ایک معاہدۂ امن کیا تھا۔[۲۰۷] اس شہادت سے گمان ہوتا ہے جو کافی حد تک یقینی بن جاتا ہے کہ دُوسرے قبیلوں نے بھی اسی قسم کا معاہدہ آپ سے کیا ہوگا۔ اور اگر نہ بھی کیا ہو تو یہ لازمی تھا کہ ان پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی اور فوجی طاقت کا خاصا رعب قائم ہوا ہوگا۔ غالباً یہی سبب تھا کہ اس کے بعد اس علاقے میں تجارتی کاروانوں کو لوٹنے یا بازار دومۃ الجندل میں لوٹ مار کرنے کے ایسے کسی مزید واقعہ کا ذکر نہیں ملتا ہے۔

سیاسی، اقتصادی اور فوجی لحاظ سے یہ مہم کافی اہم اور نتیجہ خیز تھی مگر مونٹگمری واٹ اس مہم میں صرف چند مویشیوں اور قیدیوں پر مشتمل مالِ غنیمت کو ہی کل حاصل سمجھتے ہیں[۲۰۸] اور اپنی قابلیت اور علمیت کا سارا زور اس پر صرف کردیتے ہیں کہ یہ مہم معمولی اور بے نتیجہ تھی حالانکہ واقعات وماٰخذ کی شہادتیں دوسری ہی کہانی سناتی ہیں۔ دراصل مونٹگمری واٹ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شمالی قبائل کے سلسلے میں اپنائی گئی پالیسی کی اہمیت کو گھٹانے کی مسلسل مگر غیر علمی اور تاریخی کوشش کرتے ہیں جیسا کہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے مگر یہاں صرف چند مزید شہادتوں پر اکتفا کی جاتی ہے جو اس مہم یا شمالی پالیسی کی صحیح نوعیت کو اُجاگر کرتی ہیں۔ ماٰخذ کا بیان ہے کہ اس مہم میں معاہدے کی ایک شق کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیینہ بن حصن فزاری کو تغلمین اور مراض کی وادیوں میں اپنے جانور چرانے کا حق عطا فرمایا تھا۔[۲۰۹] سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ حق آپ کو کس نے دیا تھا اور آپ نے ایک معاہد وحلیف کو کیونکر اور کس بنیاد پر عطا فرمایا تھا؟ جواب اس کا صرف یہی ہوسکتا ہے کہ اس علاقہ غیر کے قبیلوں نے معاہدوں کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی اور اس کے نتیجہ میں ان علاقوں پر اس کے سیاسی اقتدار وقبضہ کو تسلیم کرلیا تھا۔ اسی طرح اس علاقے کے قبائل کے علاوہ مزید شمال کے علاقے یعنی دومۃ الجندل اور شامی سرحد کے بیچ کے خطے کے قبیلوں پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ چنانچہ پورے ایک سال تک مسلمانوں کو ان شمالی قبیلوں سے کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں ہوا تھا۔ بہرحال تمام تاریخی حقائق وشواہد اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ اس غزوہ کے نتیجے میں اسلامی ریاست کا سیاسی اقتدار دومۃ الجندل تک مدینہ کے شمال میں پھیل چکا تھا اور ان علاقوں کے بدوی قبائل میں سے کچھ یقیناً اسلامی ریاست کے زیر اثر آچکے تھے۔

اس شمالی مہم کے تین ماہ کے بعد شعبان ۵ھ / جنوری ۶۲۷ء کے آغاز میں اسلامی ریاست کو مدینہ سے تقریب سو میل جنوب مغرب میں واقع خزاعہ کے ایک خاندان بنو مصطلق کی طرف سے خطرہ پیدا ہوا۔ اگرچہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پرانے حلیف خزاعہ کا ایک حصہ اور نئے حلیف بنو مدلج کے حلیف بھی تھے[۲۱۰] تاہم انھوں نے اسلامی ریاست کے ساتھ ابھی تک کسی قسم کا معاہدہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی ابھی تک کسی قسم کی سرکشی اور تمرد کا اظہار کیا تھا۔ لیکن اس موقعہ پر بنو مصطلق کا حارث بن ابی ضرار کی قیادت میں جارحانہ غلط ارادوں سے ہورہا تھا جس کی مسلسل خبریں جاسوسوں کے ذریعہ آپ کو پہنچ رہی تھیں اور

جن کی آپ نے اپنے ایک فرستادہ کے ذریعہ پکی تصدیق کرلی تھی۔[211] بہرحال آپ نے اقدام کیا[212] اور مریسیع کے چشمہ پر[213] ایک ہلکا سا تصادم بھی ہوا جس میں کچھ لوگ دشمن کے مارے گئے مگر ان کے دو سو خاندان گرفتار کرلئے گئے اور کافی مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔[214] رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ کے دوران ہی مفرور سردار قبیلہ کی صاحبزادی حضرت جویریہ سے جو مشرف بہ اسلام ہوگئی تھیں شادی کرلی۔ اس مبارک و مسعود رشتے کے نتیجے میں تقریباً آدھے قیدی[215] بلا معاوضہ اس خوش آئند و مسرت آگیں موقعہ پر رہا کردئے گئے آپ کے نرم، شرافت و رحمت سے بھرپور اور حکمت و دانائی کے حامل رویے سے نہ صرف سردار قبیلہ بلکہ بیشتر افراد اسلام قبول کرکے امت کا حصہ بن گئے[216] اور اس طرح انھوں نے اسلامی ریاست کی شہریت قبول کرلی۔ یہ مہم ثابت کرتی ہے کہ کس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار مختلف علاقوں میں رفتہ رفتہ مگر پوری قوت و طاقت کے ساتھ پھیل رہا تھا اور کس طرح مکہ کے حلقۂ اثر کے لوگ یا دوسرے سیاسی و سماجی علاقوں کے قبائل اسلامی ریاست کے رکن بنتے یا اس کے حلقۂ اثر کے ماتحت آتے جارہے تھے۔[217] مختلف علاقوں میں اسلام کے سیاسی اور مذہبی اقتدار کے پھیلنے کی یہ دونوں مہمیں — غزوۂ دومۃ الجندل اور غزوۂ مریسیع — بہترین مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی خاص اہم ہے کہ اکثر مورخین کے نزدیک یہ دونوں مہمیں غزوۂ احزاب سے پہلے واقع ہوئی تھیں۔[218] اس پس منظر میں نہ صرف ان دونوں مہموں کی سیاسی اور فوجی اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اس اہم حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ مدینہ کی اسلامی ریاست اس وقت تک اتنی طاقتور ہوچکی تھی کہ کسی ایک قبیلہ یا سیاسی وحدت چاہے وہ طاقتور ترین یا اہم ترین کیوں نہ ہو جیسے مکہ کی قریشی اشرافیہ یا غطفان کا عظیم ترین قبیلہ اس کو تنہا کسی طرح زک نہیں دے سکتی تھی اور یہی احساس قبائل عرب کو تھا جس نے احزاب یا اتحادِ عظیم کی دعوت دی تھی۔

قبیلہ غطفان نے اسلامی ریاست کے خلاف تنہا اور دوسروں سے اتحاد کرکے بھی کئی کوششیں کیں۔ چنانچہ ان کے بعض خاندانوں کی انفرادی کوششوں کے علاوہ، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، غزوۂ احزاب میں ان کا متحدہ لشکر ان کے تین اہم خاندانوں — فزارہ، اشجع اور مرّہ — پر مشتمل تھا، جو خود قبیلوں کی حیثیت و طاقت رکھتے تھے۔ اس قبیلہ نے مجموعی طور سے ایک ہزار آٹھ سو سپاہی فراہم کئے تھے۔[219] لیکن یہ اتحادی حملہ کامیاب نہیں ہوسکا جس کے متعدد اسباب تھے۔[220] یہاں یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ فزارہ کے سردار عیینہ بن حصن نے وہ معاہدہ بظاہر توڑ دیا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دومۃ الجندل کی مہم کے دوران کیا گیا تھا۔ بعد میں عیینہ نے مدنی ریاست کے خلاف اپنی فوجی کارروائی جاری رکھی اور مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کرکے مسلمانوں کے مویشیوں کو پکڑ لیا اور چراگاہ کے نگراں کو مار ڈالا۔[221] اس کے نتیجے میں غزوۂ ذی قرد ہوا[222] جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حملہ آوروں کو سزا بھی دی اور اپنے کچھ مویشی بھی واپس لے لئے مگر سردار قبیلہ اور بیشتر حملہ آور فرار ہوگئے۔[223] دوسرے سال کے آغاز میں غطفان کے ایک قبیلہ نے حضرت زید بن حارثہ کی وادی القریٰ سے مدینہ واپسی کے سفر کے دوران مسلم دستے پر حملہ کیا چنانچہ اس کے جواب میں حضرت زید ہی کی کمان میں ایک مہم انتقام لینے کے لئے بھیجی گئی جو اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہی۔[224] ۶۲۸ء کے آخری ماہ میں بنو مرہ نے، جو بنو غطفان کا ایک اہم ترین خاندان تھا، حضرت بشیر بن سعد خزرجی کے زیر کمان ایک مسلم دستہ کو قتل کر ڈالا۔[225] لیکن ان ظالموں کو اپنے ظلم کی قیمت اپنے خون سے

اور زیادہ گراں چکانی پڑی۔[۲۲۶] اس کے تین ماہ بعد ۶۲۹ء کے دوسرے ماہ میں حضرت بشیر بن سعد نے بنی یُمن اور جناب کے نواح میں جمع ہونے والے غطفانیوں کے ایک قبیلہ کو خاطر خواہ سزا دی۔[۲۲۸] اور اسی مہم کے ساتھ غطفان کی مخالفت کی کمر ٹوٹ گئی۔ بعد میں اگرچہ ایک چھوٹی سی جماعت بنو جُشَم کے کچھ لٹیروں کی سرکوبی کے لئے بھیجی گئی تھی تاہم وہ اتنی چھوٹی تھی کہ اس کا پورے قبیلہ یا غطفان سے کوئی سروکار نہیں تھا۔[۲۲۹] اوپر کی تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ غطفان نے کافی دنوں تک اور جنگ احزاب و صلح حدیبیہ کے کچھ بعد تک اپنی اسلام دشمنی اور ریاست اسلامی کی مخالفت پر مبنی پالیسی جاری رکھی تھی لیکن فتح مکہ سے پہلے ہی ان کی طاقت ٹوٹ چکی تھی اور ان کا سر پُرغرور جھک چکا تھا۔ بہرحال ۸ھ کے خاتمہ تک نہ صرف غطفان بلکہ شرق مدینہ کے بیشتر قبائل اسلامی ریاست کی ماتحتی قبول کر چکے تھے یا اسلامی اُمّت کے رکن بن کر ریاستِ اسلامی کے رکن بن گئے تھے۔

اکتوبر، نومبر ۶۲۷ء اور مئی، جون ۶۲۸ء (جمادی الآخرہ ۶ھ / محرم ۷ھ) کی درمیانی مدت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ خاص طور پر مدینہ کے شمال میں آباد بعض سرکش قبائل پر مرکوز رہی۔ ۶۲۷ء کے وسط یا ۶ھ کے ابتدائی مہینوں تک اسلامی ریاست نے شمال کے ایک اہم قبیلہ جذام کی کم از کم ایک شاخ کے ساتھ مفاہمت حاصل کر لی تھی اور ان کے ساتھ ایک معاہدۂ امن و دوستی کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔[۲۳۰] اسی زمانے کے قریب حضرت زید بن حارثہ کلبی کی زیر قیادت ایک مہم، جو عام طور سے سریۂ حِسمیٰ[۲۳۱] کے نام سے مشہور ہے، جذام کے ایک سرکش اور اسلام دشمن قبیلہ کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ اس کا سبب یہ ہوا تھا کہ اس قبیلہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سفیر حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی کے ساتھ جو اپنی سفارت کی واپسی پر اس علاقہ سے گزر رہے تھے بدسلوکی کی تھی اور ان کا مال و متاع اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو تحائف وہ لا رہے تھے چھین لئے تھے۔ اس مہم نے نہ صرف ان سرکشوں کو ان کے کرتوت کی سزا دی تھی بلکہ قبیلہ کے دوسرے خاندانوں کے ساتھ خصوصاً مدینہ حامی طبقات کے ساتھ تعلقات استوار اور مضبوط کئے تھے۔[۲۳۲] چنانچہ بنو ذبیب کا طرزِ عمل اس کی ایک بڑی شہادت ہے۔ یہ امر بہت اہم ہے کہ حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی پر حملہ کی خبر جونہی اس مسلم قبیلہ کو ملی اس نے مسلم مہم کے مدینہ سے آنے سے پہلے ہی لٹیروں کے خلاف فوجی اقدام کیا تھا اور نہ صرف ان کو سزا دی تھی بلکہ حضرت دحیہ کے تمام سامان کو ان سے واپس لے کر سفیر نبوی کو بحفاظت تمام علاقہ سے گزرنے کا اہتمام کیا تھا۔ ۶۲۸ء کے آغاز تک اس علاقہ میں آباد ایک اور اہم قبیلہ بنو سعد نے اسلامی ریاست کی دوستی قبول کر لی تھی اور حضرت علی کے سریہ فدک نے اس کا آغاز کیا تھا انھوں نے معاہدوں کے ذریعہ اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی تسلیم کر لی تھی۔[۲۳۳] ان مہموں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا تھا کہ وادی القریٰ کا بیشتر علاقہ، جہاں بنو سعد آباد تھے، اسلامی ریاست کے موثر قبضہ میں آ گیا تھا۔ اسی زمانے میں دومۃ الجندل کے علاقے میں آباد ایک اور اہم شمالی قبیلے بنو کلب نے اسلامی ریاست کی رکنیت قبول کی تھی کہ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کے زیر قیادت سات سو مسلم سپاہ پر مشتمل ایک سریہ نے ان کے ساتھ دوستی اور ازدواج کے تعلقات قائم کئے تھے۔ اس سے زیادہ اہم واقعہ یا نتیجہ یہ تھا کہ اس شادی کے[۲۳۴] نتیجہ میں نہ صرف حضرت تماضر زوجۂ صحابی موصوف نے بلکہ ان کے والد ماجد اصبغ بن عمرو کلبی نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ ماخذ کا بیان ہے کہ ان کے اسلام کے نتیجے میں قبیلۂ بنو کلب کی اس شاخ کے کافی بڑے حصے نے اسلام قبول کر لیا تھا اور

جو لوگ اپنے سابق دین پر قائم رہے تھے انھوں نے جزیہ ادا کرنے کا معاہدہ کیا تھا۔[۲۳۵] منٹگمری واٹ نے اپنے متعصبانہ یا غیر علمی نظریہ کے مطابق اس مہم کے اثرات کو گھٹا کر دکھانے کی کوشش کی ہے۔[۲۳۶] ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دومۃ الجندل کا قبیلہ کلب یا تو اسلام کا باقاعدہ رکن بن گیا تھا یا اس نے ریاست اسلامی کی باجگزاری قبول کر لی تھی۔ اس مدت میں اور کئی چھوٹی بڑی مہمیں شمال کو بھیجی گئیں جنھوں نے اپنا مقصود بخوبی حاصل کیا لیکن اس علاقے کو اسلامی ریاست کا حصہ بننے کے لئے اگلے مرحلے کا انتظار رہا۔

(۸) آٹھواں مرحلہ: اقدام کا آغاز

صلح حدیبیہ اسلام کی تاریخ اور اسلامی ریاست کے ارتقاء کا ایک اہم مرحلہ تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کو صلح حدیبیہ کا معاہدہ کرتے وقت اس کی سیاسی اور سماجی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں تھا تاہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معاہدۂ صلح کا دور رس، مسلمانوں کے حق میں مفید اور اشاعت اسلام میں معاون نتائج و اثرات کا بخوبی علم تھا۔ صلح حدیبیہ کے محرکات و عوامل اور ان تاریخی حالات جن میں وہ عمل پذیر ہوئی تھی کا ابھی تک جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ منٹگمری واٹ نے اس کی اہمیت اور تاریخی حالات کا تجزیہ کیا ہے لیکن وہ بعض غیر تاریخی تعبیرات سے بھی بھرا ہوا ہے۔[۲۳۷] دوسرے مورخین نے، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، مآخذ کا روایتی انداز اپنایا ہے جس میں تجزیہ و تحلیل کا فقدان ہے۔ بعض مآخذ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبۃ اللہ کا عمرہ کرنے کا حکم خداوندی خواب میں دیکھا۔ بعض دوسرے اس کو الہام الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔[۲۳۸] شبلی نعمانی نے اس سفر و غزوہ حدیبیہ کے اسباب میں مسلمانوں کے اپنے قدیم وطن سے لگاؤ، عمرہ یا حج کی خواہش، کعبہ کی محبت کو گنایا ہے۔[۲۳۹] واٹ نے بھی مختلف سیاسی اور مذہبی اسباب و محرکات بنائے غزوہ قرار دئے ہیں۔

دراصل غزوہ حدیبیہ کے اسباب و علل اور محرکات کو غزوۂ خندق میں قریش اور ان کے اتحادی احزاب کی ناکامی سے پیدا ہونے والے تاریخی حالات میں تلاش کرنا چاہئے۔ ذکر آچکا ہے کہ مدینہ کے خلاف احزاب کا اجتماع سب سے بڑا فوجی اور سیاسی منصوبہ تھا جو اپنے مقصد یعنی مسلمانوں کی ریاست کو تہس نہس کرنے میں قطعی طور پر ناکام رہا تھا۔ دشمنوں نے اپنی بھرپور طاقت کا استعمال کر کے دیکھ لیا تھا، مگر نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف ناکام رہے بلکہ اقدام ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ان کی ہمتیں پست ہو گئیں، عزائم بکھر گئے اور منصوبے خاک میں مل گئے۔ نہ وہ اپنی سیاسی ساکھ کو بحال کر سکے اور نہ ہی سماجی مقام کو۔ ان کی اقتصادی زندگی جس کا دارومدار بیشتر شامی تجارت پر تھا بے موت مر گئی۔ اس تمام ناکامی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکی سیاست میں اختلافات پھوٹ پڑے جن کا اظہار صلح حدیبیہ کے حالات سے ہوتا ہے۔ ان کی قیادت متحد نہیں رہی تھی اور گروہی عصبیت بڑھ گئی تھی۔ عام لوگوں کا اپنے قائدین پر سے اعتماد اُٹھ گیا تھا اور متعدد قائدین و سرداران مکہ کا بھرم کھل گیا تھا اور ان کی وہ سیاسی اور سماجی حیثیت نہیں رہی تھی جو پہلے کبھی تھی۔ دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس ابتلا و آزمائش سے گزر کر اور کندن بن گئے تھے اور آپ پہلے سے زیادہ طاقت ور، با اثر اور زیادہ محبوب قائد کے طور پر اُبھرے تھے۔ غزوۂ خندق کے دوران حضرت نعیم بن مسعود اشجعی کے ذریعہ آپ نے نہ صرف احزاب کے مختلف عناصر میں پھوٹ ڈال کر ان کی طاقت

توڑ دی تھی، بلکہ عرب بدوی قبائل سے اپنے زیادہ مضبوط روابط کی بنیاد بھی ڈالی تھی۔[۲۴۰] اس کے علاوہ قبائلِ عرب کو اسلام اور اسلامی ریاست سے قریب لانے اور حامی بنانے کی یہی پالیسی تھی جس کے نتیجے میں آپ نے مختلف علاقوں میں غزوات اور سرایا کی مہمیں بھیجی تھیں یا خود لے کر گئے تھے۔ قریش اور ان کے اتحادیوں کی ناکامی نے قبائلِ عرب کو بھی بخوبی احساس دلایا تھا کہ مدینہ کی اسلامی ریاست ایک ایسی سیاسی اور فوجی طاقت بن چکی ہے جس کی مخالفت میں سراسر زیاں ہے اور جس کی دوستی اور محبت میں مکمل اور بھرپور فائدہ ہے اور اس احساس ہی کا نتیجہ تھا کہ متعدد قبائل عرب اسلام یا اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ آچکے تھے اور دُوسرے بہت سے قبائل نے مخالفت کی راہ کم از کم ترک کر دی تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روز افزوں سیاسی طاقت کے ہر لمحہ میں یہ پالیسی عیاں رہی تھی کہ آپ کو اپنے کسی دشمن کی، چاہے وہ بدوی قبائل عرب ہوں یا مغرور قریشِ مکہ یا قبائلِ شمال و جنوب کی منظم حکومتیں، تباہی مقصود نہ تھی۔ آپ ان کو اسلام کے دائرے میں لانا اور اسلامی حکومت اور امت کا رکن بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس پالیسی کا عملی اظہار ہر غزوہ اور ہر سریہ میں ہوا، جب آپ نے گرے ہوئے دشمن پر وار کرنے اور اس کا کام تمام کرنے کے بجائے اس کو گلے سے لگا لینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ قریشِ مکہ کے ساتھ بھی آپ کی یہ پالیسی شروع ہو رہی تھی اور جنگِ بدر اور اس کے قیدیوں، مختلف سرایا میں پکڑے گئے دوسرے قریشی قیدیوں اور بسا اوقات ان کے مالِ غنیمت کے معاملہ میں آپ نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ آپ ان کی تباہی اور بربادی نہیں چاہتے بلکہ ان کو اسلام کا پیرو اور امتِ مسلمہ کا رکن دیکھنا چاہتے تھے۔ قریشِ مکہ بھی آپ کی اس پالیسی سے پوری طرح واقف تھے اور اس کا بخوبی احساس رکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کی تعداد میں برابر قریشیوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن دُوسری طرف ان کو اسلامی ریاست کی روز افزوں طاقت سے یہ بھی خدشہ تھا (جو اگرچہ حقیقی نہ تھا مگر قریش کے لئے صحیح تھا) کہ مسلمان کسی وقت بھی مکہ پر مسلح حملہ کر سکتے ہیں اور مکہ کی سیادت و قیادت کو آنِ واحد میں بالکل ختم کر سکتے ہیں۔ یہ احساس بھی ممکن ہے بعض مکی تاجروں کے لئے قبولِ اسلام کا سبب بن گیا ہو۔

قریشِ مکہ کی دن بہ دن دگرگوں سیاسی اور فوجی طاقت اور اسلامی ریاست کی روز افزوں ترقی و استحکام کا یہی زمانہ تھا[۲۴۱] کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ جا کر عمرہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے سفر پر چودہ سو [۱۴۰۰] یا سولہ سو [۱۶۰۰] مسلمانوں کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں کی اس جماعت زائرین کے پاس صرف مسافروں کے ہتھیار یعنی تلواریں تھیں۔ ان کے احرام بندھے ہوئے تھے اور قربانی کے جانور ساتھ تھے۔ اس پورے اہتمام کا مقصد قریشِ مکہ کو خصوصاً اور قبائل عرب کو عموماً یہ تاثر دینا تھا کہ آپ کا مشن پُرامن اور مذہبی فریضہ ادا کرنا تھا۔[۲۴۲] قبائلِ عرب تو پہلے بھی شاید مکہ والوں کی حمایت میں گوناگوں اسباب سے نہ آتے اور اس اظہارِ مذہب سے تو وُہ اتنے متاثر ہو گئے ہوں گے کہ مداخلت کا اگر کوئی خیال بھی تھا تو جاتا رہا ہو گا۔ اس کا مکہ کے مختلف سماجی اور مذہبی حلقوں پر بھی خاطر خواہ اثر ہوا ہو گا۔ اس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام پڑوسی یا متعلقہ قبائل عرب کو پوری طرح سے، اور مکہ کی آبادی کے خاصے بڑے حصے کو کسی حد تک، کم از کم ایک معاملہ میں اپنا ہمنوا بنا لیا تھا یا کم از کم ان کو غیر جانبدار بنا دیا تھا۔[۲۴۳] اس حکمتِ عملی کے نتیجہ میں خون خرابے یا جنگ کے امکانات کا تو سرے سے خاتمہ ہو گیا تھا۔ جس کا بہترین ثبوت ہم کو

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صلح حدیبیہ کے موقعہ پر بھیجے گئے دو سفیروں حضرات خراش بن امیہ اور عثمان بن عفان کے ساتھ مکہ والوں کے سلوک سے ہوتا ہے کہ ان کی مدافعت، محافظت اور حمایت میں خود مکہ کے لوگ آگے آئے تھے۔[244] اس کے علاوہ مکہ میں عمومی تاثر یہی تھا کہ زائرینِ مکہ کو، خواہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مسلمان رفقا ہی کیوں نہ ہوں، کیونکر روکا جا سکتا ہے؟ یہ خیال بڑی حد تک صحیح ہے کہ خانہ کعبہ کا عمرہ اور مکہ مکرمہ کی مذہبی حیثیت کا اس طرح اظہار کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور قبائل عرب کے تمام مذہبی عناصر میں اپنے لئے ایک نرم گوشہ ضرور بنا لیا تھا۔ چنانچہ مکہ اور اس کے ارد گرد کے علاقوں میں مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے کا خیال جم چکا تھا۔ حضرت خالد بن ولید مخزومی کی کمان میں مکہ کے رؤسائے قبائل نے جو شہسوار دستہ بھیجا تھا، اس کا مقصد مسلمانوں کو یوں بے محابا مکہ میں داخل ہونے سے روکنا تھا نہ کہ ان سے کسی قسم کی معرکہ آرائی کرنا۔[245] رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بھی نبرد آزمائی سے گریز کرنا شروع سے رہا تھا چنانچہ اس کے تمام امکانات کو رد کرنے کی خاطر آپ نے مسلمانوں کو تنگ اور دشوار گزار پہاڑی راستوں سے حدیبیہ کی وادی میں پہنچا دیا جو مکہ کے بالکل قریب تھی اور وہیں مسلمانوں نے پڑاؤ ڈال دیا اور حالات کے رُخ کا انتظار کرنے لگے۔[246]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بخوبی احساس تھا کہ مکہ کے مغرور سرداران کو اور مسلمانوں کو اتنی آسانی سے شہر میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ حدیبیہ میں آپ کا قیام اور متعدد دوسرے قرائن اور شواہد اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسی سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ مذہبی اسباب ومحرکات کے ساتھ اس غزوہ کے کچھ سیاسی مقاصد ومحرکات بھی تھے۔ دو ہی صورتیں ممکن تھیں یا تو مسلمان مکہ میں داخل ہوں گے اور عمرہ کریں گے اور یا مسلمان داخل نہ ہوں گے اور دونوں صورتوں میں کسی قسم کے سمجھوتے کا امکان تھا۔ جس کا ثبوت ہم کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبیلہ خزاعہ کے سردار و نمائندے بدیل بن ورقاء سے گفتگو میں ملتا ہے۔[247] بہر حال قیام حدیبیہ کے فوراً بعد ہی گفت وشنید اور نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہوا اور نقطۂ آغاز بدیل بن ورقاء ہی سے شروع ہوا جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لئے آئے تھے اور واپسی پر پیغام رسول مکہ والوں کے پاس لے گئے۔[248] اس کے بعد مکرز بن حفص عامری کی سفارت آئی۔ وہ بھی ناکام رہی۔[249] پھر قریش نے احابیش کے سردار حلیس بن علقمہ کو بھیجا۔ پھر عروہ بن مسعود ثقفی کی سفارت آئی۔ مگر مکمل گفتگو نہ ہو سکی۔[250] اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خراش بن امیہ کو مکہ والوں کے پاس بھیجا، مگر ان کی سفارت کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر میں حضرت عثمان بن عفان اُموی کو حضرت عمر فاروق کے مشورہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا جنھیں مکہ والوں نے روک لیا اور اس کے سبب ان کے قتل کی افواہ مشہور ہو گئی[251] اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خون کا قصاص لینے کی بیعت و قسم مسلمانوں سے لی۔[252] غالباً اسی عزم مصمم کا اثر تھا کہ مکہ والوں نے صلح کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ان کی وہ موثر سفارت خطیبِ قریش سہیل بن عامر عامری کی قیادت میں آئی جس نے صلح حدیبیہ کا معاہدہ مسلمانوں سے مل کر لکھا۔[253] ممکن ہے کہ درمیان میں کچھ اور سفارتیں بھی آئی گئی ہوں۔ ان متعدد سفارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش کی قیادت و سیادت میں کس قدر رخنہ پڑ گیا تھا اور سیاست میں کس قدر الجھن اور مایوسی پیدا ہو گئی تھی۔ ایک دوسرا اہم نکتہ یہ ابھرتا ہے کہ قریش مکہ کے ان سرداروں کا صلح حدیبیہ میں نہ ذکر ملتا ہے نہ ان کے اس میں حصہ لینے کا کوئی ثبوت جو اب تک مکی سیاست اور

قیادت پر چھائے رہے تھے خاص کر ابو سفیان بن حرب کی غیر موجودگی بہت کھلتی ہے۔[254] اگرچہ ان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ اس موقعہ پر مکہ میں موجود نہ تھے تاہم دوسرے زعماءِ قریش کو کیا ہوا تھا؟ ہم دیکھتے ہیں کہ قریشی اشرافیہ کی جانب سے پہلے ایک خزاعی حلیف نے پھر ایک غیر معروف عامری نے پھر احابیش کے بدوی سردار نے، پھر ایک ثقفی حلیف نے اور آخر میں ایک نسبتاً کم پایہ اور سیاسی طور پر کم رتبہ قریشی خاندان بنو عامر کے نمائندے نے گفت و شنید میں قیادت کی تھی۔ بنو ہاشم، بنو امیہ، بنو مخزوم، بنو سہم وغیرہ کے سردار جو ملکی سیاست کا جوہر تھے اس میں کیوں شامل نہ تھے؟ اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں: اول یہ کہ مکہ کی سیادت کی صفِ اول یا تو ختم ہو چکی تھی جیسا کہ حضرت عمرو بن عاص سہمی کے قبولِ اسلام کے سبب سے ظاہر ہوتا ہے[255] یا از کار رفتہ ہو چکی تھی اور اصل قیادت دوسری صف کے سیاستدانوں کے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ اور دوم یہ کہ سیادت و قیادت میں اختلاف و انتشار تھا جیسا کہ متعدد قریشی سفارتوں کی آمد اور ان کے حالات سے ہوتا ہے۔

مکہ میں زمامِ قیادت کسی کے ہاتھ میں رہی ہو، ان سیاسی حالات نے بہر حال مکہ کے سنجیدہ طبقۂ اشراف کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ اسلامی ریاست سے کسی قسم کا معاہدۂ صلح ہو جائے۔ تاکہ ان کی معاش کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال پر قابو پایا جا سکے اور اس پُرخلوص جذبۂ خیر میں ان کو مکہ کے تمام تاجر طبقات کی خاموش رضا حاصل تھی۔ دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر حال میں صلح کے لئے تیار رہتے۔ چنانچہ تھوڑی سی بحث و تمحیص[256] کے بعد وہ تاریخی معاہدہ لکھا گیا جو تاریخ میں صلحِ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہُوا۔ فریقین نے اس پر اتفاق کیا تھا کہ:

(۱) یہ معاہدۂ صلح دس برس کے لئے ہوگا۔ فریقین اس زمانہ میں جنگ نہ کریں گے۔

(۲) مسلمان اس سال عمرہ نہیں کریں گے اور نہ مکہ میں داخل ہوں گے بلکہ اگلے سال عمرہ کے لئے آئیں گے اور مکہ میں صرف تین دن قیام کریں گے۔

(۳) مکہ کے افراد یا گروہ اگر مدینہ اس دوران اپنے بزرگوں کی اجازت کے بغیر ہجرت کریں گے تو ان کو واپس مکہ بھیجنا مسلمانوں پر لازمی ہوگا لیکن اگر مدینہ کا کوئی شخص یا جماعت مکہ آ جائے تو اس کی واپسی کی شرط مکیوں کے لئے ضروری نہ ہوگی۔

(۴) فریقین میں کسی کے ساتھ دوسرے عرب قبائل حلف و دوستی کے معاہدے کرنے کے لئے آزاد ہوں گے۔[257]

اس صلح کے دُور رس اور بڑے اہم اثرات مرتب ہُوئے اگرچہ ابتدا میں یہ معاہدہ اسلامی ریاست کے مفاد میں نظر نہیں آتا تھا اور اس کی اکثر و بیشتر دفعات کا فائدہ قریش کے حق میں جاتا معلوم ہوتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ قریشِ مکہ کے اس معاہدہ کی وجہ سے بھرم رہ گیا تھا اور ان کی عزت و ساکھ بچ گئی تھی۔ ان کی شامی تجارت کا راستہ کھل گیا تھا جس کی ان کو سب سے زیادہ ضرورت تھی لیکن اس سے اسلامی ریاست کو جو گوناگوں فوائد حاصل ہوئے وہ اگرچہ فوری طور پر نہیں محسوس کئے گئے تھے تاہم ان کا پھل کچھ مدت کے بعد نکلا۔ ایک اہم فائدہ یہ ہُوا کہ قریشِ مکہ نے اسلامی ریاست کو اپنا ہم پلہ تسلیم کر لیا۔ دوسرا یہ کہ قبائلِ عرب کے لئے خاص کر مکہ کے حلقۂ اثر کے قبائل کے لئے راستہ کھل گیا کہ وہ مکہ اور مدینہ میں سے جس کے ساتھ چاہیں حلیف

معاہدے کرلیں۔ چنانچہ صلحِ حدیبیہ کے مکمل ہوتے ہی خزاعہ نے اسلامی ریاست سے اور بنو بکر نے قریش سے معاہدے کر لئے۔[۲۵۸] مآخذ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے معاہدے صرف دو قبائل نے کئے تھے، لیکن اس کا امکان قوی ہے کہ کچھ اور قبائلِ عرب نے بھی مدینہ کی اسلامی ریاست سے صلحِ حدیبیہ کے بعد اس کے روز افزوں سیاسی استحکام اور فوجی طاقت کو دیکھ کر اسی قسم کے باہمی تعاون کے معاہدے کرلئے ہوں گے۔ لیکن سب سے بڑا فائدہ جو اسلامی ریاست کو ہوا وہ اسلام کی تیز رفتاری کے ساتھ تبلیغ ہے ہمارے مآخذ کا بیان ہے کہ اس صلح کے نتیجہ میں فتحِ مکہ تک یعنی تقریباً دو سال کی قلیل مدت میں اتنے لوگ مسلمان ہوئے تھے جتنے کہ اس سے قبل کی پوری مدت یعنی تقریباً بیس سال میں نہیں ہوئے تھے۔[۲۵۹] یہ بیان محض خوش گمانی یا مبالغہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کے تاریخی ثبوت ہیں کہ وہ قطعی طور پر صحیح ہے۔[۲۶۰] اس سے زیادہ اہم یہ فائدہ تھا کہ خود مکہ میں اشاعتِ اسلام کی رفتار تیز ہوگئی اور لوگ تیزی سے مسلمان ہونے اور مدینہ جانے لگے۔[۲۶۱] ابنِ اسحاق، ابنِ سعد اور دوسرے مؤلفینِ سیرت نے ان مسلمانوں یا قریشیوں کی فہرست دی ہے جو اس واقعہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ ان میں اور ممتاز لوگوں کے علاوہ حضرات خالد بن ولید، عمرو بن العاص، یزید بن ابی سفیان اور ان کے بھائی معاویہ وغیرہ شامل تھے۔[۲۶۲] اسلامی ریاست کو ان باصلاحیت اور قابل اصحاب کے قبولِ اسلام سے کافی فائدہ ہوا اور اس نے انتظام و انصرام، فتوحات و غزوات، تنظیم و تشکیلِ معاشرہ میں ان کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کیا۔[۲۶۳] اس کے علاوہ مسلمانوں کو آزادانہ آمد و رفت کے سبب اپنی تجارت کو بھی اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ فروغ دینے کا موقعہ ملا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریشِ مکہ کی مخالفت اور عداوت ختم ہونے سے راحت ملی ہی تھی کہ مدینہ کے شمال میں خیبر کے طاقتور یہودیوں نے بدوی قبائل خصوصاً غطفان کے ساتھ مل کر اسلامی ریاست پر حملہ کرنے کے منصوبے بنائے لیکن قبل اس کے کہ وہ اقدام کرسکیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے انھیں جاں نثاروں کے ساتھ جو حدیبیہ میں پیغامِ امن لے کر گئے تھے۔ خیبر کی طرف جنگ کا پرچم لہراتے ہوئے کوچ کیا اور یہودی آطام یا قلعوں کا محاصرہ کرلیا۔ ایک مختصر سی مدت میں کئی یہودی قلعے مسلمانوں کے قبضے میں آگئے۔ مقابلہ بیکار سمجھ کر یہودیوں نے صلح کی درخواست کی جو بابِ رحمت سے منظور ہوئی۔ یہودیوں نے اپنی زمینوں پر اسلامی ریاست کی ملکیت کا حق تسلیم کرلیا اور اس کے عوض اپنی تمام پیداوار کا نصف بطورِ خراج مسلمانوں کو ادا کرنا منظور کیا۔[۲۶۴] تقریباً انھیں شرائط پر خیبر کی ماتحت دوسری یہودی بستیوں — فدک[۲۶۵]، تیماء[۲۶۶]، وادی القری[۲۶۷] — نے بھی صلح کرلی۔[۲۶۸] اسلامی ریاست کے ارتقاء اور اس کی سیاسی طاقت کی افزونی کا یہ ایک انتہائی اہم مرحلہ تھا۔ خراج کی ادائیگی دراصل اسلامی ریاست سے وفاداری کا عہد اور اس کی سیاسی برتری تسلیم کرنے کا اعلان تھا۔ جزیہ کی ادائیگی کی بعض مثالیں ہم کو اسی سال کے کچھ ابتدائی حصے میں مل چکی ہیں۔ یہاں سے اسلامی ریاست کا رویہ دوسرے قبائلِ عرب کے ساتھ بدلتا ہے آئندہ سے اسلامی حکومت ان سے باہمی نصرت و تعاون کے معاہدے نہیں کرتی بلکہ تمام قبائل اور علاقہ جات عرب کو اسلامی ریاست کی سیاسی برتری تسلیم کرنی ضروری تھی اور اس کے اظہار و اعلان کے لئے زکوٰۃ، جزیہ، خراج جیسے محاصل ادا کرنے اور اپنے علاقوں میں مسلمان حاکموں یا مدینہ کے مقرر کردہ منتظمین و عمّال کی موجودگی کو بخوشی برداشت کرنا لازمی ہوگیا تھا۔[۲۶۹]

بہر حال خیبر اور اس کی ملحقہ بستیوں کے زوال اور ان کے اسلامی ریاست کی بالادستی قبول کرنے کے بعد مسلمانوں کا قبضہ و اقتدار پوری وادی القریٰ پر محیط ہوگیا۔ چنانچہ چھ برس کی مختصر مدت میں اسلامی ریاست شمال میں کافی بڑے خطے پر قابض ہوگئی تھی اور اس کی حدود شامی سرحد کے قریب بسے ہوئے قبائل خصوصاً غسان، جذام، لخم وغیرہ کے حدود کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ یہ صورتِ حال نہ صرف ان عرب قبائل کے لئے بلکہ ان کے سیاسی آقا رومی شہنشاہ کے لئے باعثِ تشویش تھی۔

صلح حدیبیہ کے معاً بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ریاست کے پڑوس میں آباد عرب حکمرانوں اور ان کے سیاسی آقاؤں کو اسلام قبول کرنے اور اس طرح اسلامی اُمت کا رکن بننے اور اسلامی ریاست کے دائرہ اقتدار میں آجانے کی دعوت دی۔ آپ نے جن لوگوں کو یہ دعوتی خطوط تحریر فرمائے تھے ان میں مملکتِ بصریٰ کے غسانی حکمران، مصر کے بازنطینی گورنر اور ان کے سیاسی سرپرست رومی شہنشاہ ہرقل شامل تھے۔ اسی طرح مشرقی پٹی کے حکمرانوں اور ان کے سیاسی آقا شہنشاہِ ایران کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ یمن کے حکمران جو ایرانی گورنر تھے اور دوسرے عرب خود مختار شہزادوں کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ غرض کہ اس وقت کی جتنی اہم حکومتیں خود جزیرہ نمائے عرب میں تھیں یا اس کے بالکل قریب میں تھیں ان کو ریاست اسلامی کا شہری بننے اور اس کی سیاسی بالادستی قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔(۲۷۰) یہ دعوت بنیادی طور پر مذہبی تھی تاہم اس میں سیاسی مضمرات بھی تھے اور اس دعوت کو قبول کرنے کی صورت میں اسلامی ریاست کی سرپرستی اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بالادستی قبول کرنی لازمی تھی۔ بہر حال ان خطوط و فرامینِ نبوی سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ نہ اسلام صرف ایک عربی دین تھا اور نہ ریاستِ اسلامی جزیرہ نمائے عرب کی حدود میں مقید رہنے والی تھی۔ دونوں کا نقطۂ نظر عالمی تھا اور دونوں کی نظر پورے عالمِ انسانی پر تھی۔

(۹) نواں مرحلہ: فتوحاتِ عظیم

صلح حدیبیہ کی بعض شرائط اپنی نوعیت کے اعتبار سے زیادہ مدت تک قائم رہنے والی نہ تھیں کیونکہ وہ تاریخی دھاروں کے خلاف مسلمانوں پر ٹھونسی گئی تھیں۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غالباً پورا احساس و ادراک تھا کہ وہ تمام شقیں جن کو مسلمانوں نے پسند نہیں کیا تھا اور جن کو وہ اپنے لئے ناقابلِ برداشت اور توہین آمیز پاتے تھے جلد یا بدیر از خود ختم ہو جائیں گی۔ چنانچہ اس کا اشارہ حضرت ابو جندل کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کلماتِ تشفی میں ملتا ہے جو آپ نے ان کی غمزدہ و غمناک واپسی پر فرمائے تھے(۲۷۱) اور پھر آخر کار حضرت ابو بصیر ثقفی اور دوسرے گرفتارانِ بلا کی مکی ظالموں کی قید سے رہائی اور ساحلِ بحر پر ینبوع کے علاقہ میں قیام کے نتیجہ میں وہ شق ختم ہوگئی تھی(۲۷۲)۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے خاتمے کی درخواست انھیں ظالموں کی طرف سے آئی تھی جنھوں نے اس کو مسلمانوں پر زبردستی لادا تھا۔ اس زمانے میں بھی شق مسلمان مہاجر عورتوں کے بارے میں پہلے ہی حضرت ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط اموی کی دلیرانہ اور مجاہدانہ مہاجرت سے ختم ہو چکی تھی۔(۲۷۲) دوسری شق مسلمانوں کی سنہ ۶ھ میں حدیبیہ سے واپسی اور سنہ ۷ھ میں کامیاب عمرہ کی ادائیگی سے ختم ہو چکی تھیں۔(۲۷۳) باقی دو شقوں کا ایک دوسرے سے بڑا

قریبی تعلق تھا اور بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ معاہدۂ حدیبیہ فتح مکہ کا دیباچہ بننے والا تھا۔

مکہ کے محاذ پر یہ صورتِ حال پیدا ہو رہی تھی اور مدینہ کے شمال میں خیبر کی مہم کے کچھ بعد حالات نے دُوسری کروٹ لی۔ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی عرصے میں اسلامی ریاست کو مختلف علاقوں میں لگ بھگ سترہ چھوٹی بڑی مہمیں بھیجنی پڑیں۔ ان میں سے کچھ وُہ مہمیں تھیں جو اُن قبائل عرب خصوصاً مشرقی علاقوں کے عربوں کے خلاف بھیجی گئی تھیں جو آہستہ آہستہ اسلامی ریاست کی طرف اپنے مخالفانہ اور معاندانہ رویّے میں لچک پیدا کر رہے تھے اگرچہ ابھی تک انھوں نے مکمل تابعداری اور اطاعت کی راہ نہیں اپنائی تھی۔ یہودی شمالی بستیوں کے زوال کے چھ ماہ بعد ہوازن کے بعض چھوٹے چھوٹے گروہوں نے انتشار برپا کرنے کی کوشش کی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کچلنے کے لئے فوری طور پر اقدام کیا اور دو مہمیں تربہ[۲۷۴] اور نجد[۲۷۵] کے علاقے میں بھیجی گئیں جنھوں نے شرپسندوں کا خاتمہ کردیا۔ جولائی ۶۲۹ء میں ہوازن کا ایک حصہ جو سی کے علاقے میں آباد اور انتشار میں مشغول تھا راہِ راست پر لایا گیا۔[۲۷۶] یہ تمام مہمیں دراصل بہت ہی معمولی تھیں کیونکہ اصل ہوازن کا قبیلہ مکہ کے جنوب مشرق میں مقیم و آباد تھا اور اس کا ان شرپسندوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان معمولی مہموں سے بہرحال اسلامی ریاست کی سیاسی طاقت اور اقتدار و اختیار کی وسیع حدود کا اندازہ ہوتا ہے۔

غطفان اور اس کے دو تین اہم خاندان جیسے مرّہ اور ثعلبہ بھی اس زمانے میں کافی سرگرم رہے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طاقت کو کچلنے میں ذرا دیر نہیں لگائی تھی۔ اگرچہ فدک کا سریہ بشیر بن سعد مسلمانوں کی شہادت کا سبب[۲۷۷] بنا تاہم حضرت غالب بن عبداللہ نے اس کا فوری انتقام لے لیا[۲۷۸] اور کچھ مدّت کے بعد حضرت بشیر بن سعد نے غطفان کے خلاف ایک اور کامیاب مہم کی قیادت کی۔[۲۷۹] اسی طرح سلیم کے خلاف حضرت ابن ابی العوجا سُلمی نے فوج کشی کی تھی۔[۲۸۰] بعض چھوٹی موٹی مہمیں دوسرے شرپسند عناصر کے خلاف بھیجی گئی تھیں جو اکثر و بیشتر کامیاب رہی تھیں۔[۲۸۱] مآخذ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان مہموں میں مسلم سپاہ کی تعداد کافی کم تھی اور غالباً مخالف قبیلوں کے بعض سرکش حصے ہی اس فوج کشی کا سبب بنے تھے۔ بہرحال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست کے خلاف اُٹھنے والی ہر سازش، حرکت اور منصوبے کو فوری طور پر کچلا تھا اور اس طرح ان قبیلوں یا ان کے عناصر پر واضح کردیا تھا کہ ان کا وجود صرف اسلامی ریاست کے ساتھ دوستی، مفاہمت اور وفاداری ہی کی صورت میں برقرار رہ سکتا ہے۔

اسی مدت میں اسلامی ریاست کو بعض شمالی قبائل اور علاقوں کی طرف توجہ دینی پڑی کیونکہ اس کے خلاف سازشیں، حملے کے لئے فوجی جماؤ اور سیاسی و فوجی مخالفت جنم لے رہی تھی۔ اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پرانی پالیسی کے مطابق تبلیغی جماعتیں بھی بھیجتے رہے تھے۔ چنانچہ حضرت کعب بن عمیر غفاری کی قیادت میں جو جماعت ذات اطلاح وادی القریٰ کے علاقے میں واقع ایک مقام تک گئی تھی وہ ایک مذہبی مشن تھا جس کی تکمیل مسلمانوں نے اپنے خُون کی سُرخی سے کی تھی۔[۲۸۲] دوسری مہم اس حادثہ کے دو ماہ بعد جنوبی اردن کے شہر موتہ کے مقام کو حضرت زید بن حارثہ کے زیر کمان سفیر نبوی حضرت حارث بن عمیر ازدی کے بصریٰ کے غسانی حکمراں شرحبیل بن عمرو کے ہاتھوں ظالمانہ قتل کا انتقام لینے کے لئے گئی تھی۔ اگرچہ اس مہم میں

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نامزد کردہ تینوں سالار شہیدِ راہ حق ہُوئے اور غالباً کچھ دوسرے بھی شہید ہوئے تھے تاہم اس کا مقصد پُورا ہوا تھا۔ غسانی حکمراں کو یہ احساس دلا دیا گیا تھا کہ اسلامی حکومت کے خلاف کوئی کارروائی خطرناک نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔[۲۸۳] اس کے دوسرے ماہ حضرت عمرو بن العاص سہمی بنو قضاعہ کے ایک فوجی جماؤ کے خلاف ایک مہم لے کر گئے[۲۸۴] اور بعد میں حضرت ابو عبیدہ بن جراح ان کے لئے امداد لے کر پہنچے۔[۲۸۵] اس مہم کو بڑی کامیابی ملی خاص کر عذرہ، بلی اور بہراء کی کچھ شاخوں میں جنھوں نے نہ صرف اسلامی حکومت اور ریاست کی دوستی کا دم بھرا بلکہ کچھ لوگوں نے اسلام بھی قبول کیا۔[۲۸۶] اس طرح اسلامی حکومت کا حلقۂ اثر شمال میں اور وسیع ہو گیا۔

حالات کا یہی رُخ تھا کہ ملی قائدین کی بے تدبیری اور خراب حکمت عملی نے صورتِ حال کو ان کے لئے بد سے بدتر بنا دیا۔ قبیلہ بنو بکر اور خزاعہ میں مدت سے رقابت چلی آ رہی تھی۔ اسی دوران وُہ اتنی بڑھی کہ بنو بکر نے قریش کی حمایت اور مدد سے خزاعہ پر اچانک شب خُون مارا اور ان کے کئی آدمی مار ڈالے۔ صلح حدیبیہ کی شق ۲ کے مطابق خزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے چنانچہ انھوں نے اس ظلم کے خلاف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فوجی و اخلاقی مدد چاہی جو معاہدہ کے مطابق آپ پر لازمی تھی چنانچہ آپ نے ان کی حمایت کی اور قریشِ مکہ سے دیت ادا کرنے کا مطالبہ کیا اور نہ ادا کرنے کی صورت میں معاہدہ حدیبیہ کو باطل کرنے کا۔ قریشِ مکہ کے عاقبت نا اندیش سرداروں نے نتائج کو سوچے سمجھے بغیر معاہدہ حدیبیہ کو توڑنے کا اعلان کر دیا۔ مگر جب سمجھدار اور دانشمند طبقہ نے اس کے خطرناک نتائج کا احساس کیا تو تجدید معاہدہ کے لئے ابو سفیان بن حرب کو مدینہ بھیجا مگر ساری کوششیں بیکار گئیں کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ دُوسری طرف رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر فوج کشی کی تیاری کی اور ایک لشکرِ جرار لے کر حملہ آور ہوئے۔ مکہ میں اتنا دم خم نہ تھا کہ وُہ مقابلہ کر سکتا۔ اس کے علاوہ غالباً مکہ والوں نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دینا زیادہ مفید سمجھا۔ چنانچہ رمضان ۸ھ / جنوری ۶۳۰ء میں اس مغرور و ظالم شہر نے اس دُرِ یتیم کے سامنے سر جھکا دیا تھا جس کو اس نے آٹھ سال قبل عالم بے سروسامانی میں جلاوطن کر دیا تھا مگر فاتح مکہ کا حال یہ تھا کہ شہر میں داخلہ کے وقت اس کا سر بارگاہِ خداوندی میں خم تھا اور زبان پر سب کے لئے رحمت و رافت، معافی و بخشش اور رحم و کرم کے الفاظ تھے۔ مکہ نے بالآخر اپنی سیاسی خود مختاری اور بالادستی کھو دی[۲۸۷] اور وُہ اسلامی ریاست کا ایک ماتحت شہر بن کر رہ گیا جس پر مدینہ کا مقرر کردہ گورنر حکومت کرتا تھا۔[۲۸۸] مدینہ کی اسلامی ریاست کی حدود مکہ کی وادی تک وسیع ہو چکی تھیں۔

مکہ کی فتح کے لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک لشکر جرار کے ساتھ روانگی نے قریشِ مکہ کے قدیم دوست، حلیف اور پڑوسی ہوازن اور ان کے خاندان ثقیف کو اپنی طاقت جمع کرنے کا موقعہ فراہم کیا تھا۔ پھر فتح مکہ کی خبر نے ان کو اسلامی ریاست کے ساتھ نبرد آزما ہونے پر اکسایا۔ ان کو اپنی کثیر طاقت، فوجی صلاحیت اور تجربہ کار قیادت کا غرور تھا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح مکہ کے بعد ان کے خطرہ کی طرف توجہ دینی پڑی۔ جنگِ حنین میں مسلمانوں کو ابتدائی ہزیمت کے بعد ایک عظیم الشان فتح آخر کار حاصل ہوئی۔[۲۸۹] بے شمار مالِ غنیمت اور ہزارہا قیدی قبضہ میں آئے۔[۲۹۰] اس کے فوراً بعد ہوازن کے شکست خوردہ سپاہ اور قائدین نے طائف کے قلعہ میں پناہ لے لی اور اسلامی لشکر نے ان کا محاصرہ کر لیا۔

کچھ مدت کے بعد جب یہ یقین ہوگیا کہ ثقیف اسلامی ریاست کے لئے کوئی خطرہ نہیں بن سکتے تو آپ نے محاصرہ اٹھا لیا۔ جعرانہ میں قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور بالآخران کی باعزت رہائی نے ہوازن کو اسلام کا پیرو اور اسلامی ریاست کا ہمنوا بنا دیا۔ اگرچہ طائف چند ماہ مزید دائرۂ اسلام سے باہر رہا[۲۹۱] تاہم اسلامی ریاست کی حدود حنین و طائف کے علاقے سے پرے وسیع ہو چکی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب متعدد چھوٹی چھوٹی مہمیں یا جماعتیں جن میں سے کئی ایک یا دو نفری تھیں قرب وجوار کے بتوں اور ان کے معبدوں کو توڑنے کے لئے گئیں تو ان جھوٹے خداؤں کی حمایت میں کوئی انگلی بھی اٹھانے والا نہ تھا۔[۲۹۲] اسلام کی فتح، اسلامی ریاست کی کامیابی سے کہیں زیادہ وسیع، دیرپا اور شاندار تھی۔ فتح مکہ اور فتح حنین اسلامی ریاست کے ارتقا کی ایک اہم ترین بلکہ سب سے زیادہ شاندار منزل تھی۔ ان کے نتیجے میں پورا وسطی و مرکزی جزیرہ نمائے عرب اسلامی ریاست کے دائرۂ اقتدار میں آچکا تھا۔

(۱۰) دسواں مرحلہ: اوجِ تکمیل وکمال

فتح مکہ کے بعد تمام عرب قبائل نے، خواہ وہ بدوی ہوں یا متمدن وشہری، قرب وجوار اور وسطی عرب میں آباد ہوں یا دور دراز کے مقامات پر، یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مدینہ کی اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی کو قبول کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ مآخذ کا بیان ہے کہ سارا عرب مکہ اور مدینہ کے درمیان ہونے والی آویزش کو بڑی دلچسپی، توجہ اور قریب کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور منتظر تھا کہ توازن کا پلڑا کس کے حق میں جھکتا ہے۔ عرب بڑے عملی اور حقیقت پسند لوگ تھے۔ جوں ہی انھوں نے مکہ کے زوال و انحطاط کی خبر سنی ان کے ہر قبیلے نے اپنی بھلائی اور عافیت اسی میں محسوس کی کہ مدینہ کی سیاسی بالادستی اور اسلام کی مذہبی برتری قبول کر لی جائے چنانچہ اعلان وفاداری و محبت کرنے کے لئے مدینہ میں پے بہ پے اور جوق در جوق وفود عرب آنے لگے۔ اور اتنی کثرت سے آنے کہ نواں ہجری سال وفود کا سال (عام الوفود) ہی کہا جانے لگا۔[۲۹۳] عام طور پر ہمارے مورخین اور سیرت نگار یہ سمجھتے اور بیان کرتے ہیں وفود کی آمد کا سلسلہ اسی برس شروع ہوا تھا۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ وفود عرب کی آمد کا سلسلہ ۵ھ / ۶۲۶-۲۷ء میں کسی وقت شروع ہوگیا تھا۔[۲۹۴] دراصل ہجرت کا نواں سال ان وفود کے مدینہ میں حاضر ہونے کا ایک غیر معمولی موقعہ تھا جب جزیرہ نمائے عرب کے ہر کونے اور گوشے سے چھوٹے بڑے، بدوی شہری، متمدن اور نیم متمدن قبائل عرب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں اظہارِ وفاداری کرنے پہنچے تھے۔ ابن سعد نے وفود عرب کی کل تعداد ۷۱ بتائی ہے اور کہا ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر ۹ھ میں مدینہ آئے تھے۔[۲۹۵]

اوپر ذکر گزر چکا ہے کہ فتح مکہ اور غزوۂ حنین کے بعد عرب کے وسطی علاقے اسلامی ریاست میں مدغم ہو چکے تھے۔ اب جزیرہ نما کے دور دراز اور کناروں پر بسے قبائل اور علاقے اس میں شامل ہوگئے۔ ان قبائل نے یا تو اسلامی ریاست کے ساتھ سیاسی تعلقات قائم کئے تھے اور اس کے ذمی یا اہل الذمہ بن گئے تھے جن کے جان و مال کی حفاظت کی اسلامی ریاست ضمانت دیتی تھی اور جس کے عوض یہ قبائل نقد یا جنس یا دونوں میں جزیہ مدینہ کو ادا کرتے تھے جیسا کہ نجران کے عیسائیوں اور بحرین کے زرتشتیوں/مجوسیوں نے کیا تھا یا انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اسلامی امت کے مکمل رکن بن گئے تھے جس کے سبب ان کو مکمل مراعات وحقوق حاصل ہوگئے تھے۔ دونوں صورتوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم افراد، گروہوں اور قبائل کو ایک کتاب (صحیفہ، پروانہ) عطا فرماتے تھے

جس میں ان کے حقوق اور اسلامی ریاست کے تئیں ان کے فرائض و واجبات بصراحت تحریر ہوتے تھے۔[۲۹۶]

یہ حقیقت یہاں غور کرنے کے قابل ہے کہ غزوۂ احزاب کے بعد کسی حد تک اور فتح مکہ کے بعد پوری طرح سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل عرب سے جو معاہدے کئے یا ان کو جو صحیفے اور کتاب عنایت فرمائے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ماقبل فتح کے زمانے کے معاہدوں اور صحیفوں یا کتابوں سے قطعی مختلف ہیں۔ پہلے زمانے کے معاہدوں اور صحیفوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فریق ثانی کے ساتھ باہمی تعاون اور دوستی کے معاہدے کئے ہیں اور جن قبائل عرب سے کسی وجہ سے اس قسم کے دفاعی معاہدے نہیں ہو سکے ان کو غیر جانبدار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی کسی قبیلہ/شہر سے آویزش کے زمانے میں کسی فریق کا ساتھ نہ دیں۔[۲۹۷] لیکن ان معاہدوں اور صحیفوں میں جو فتح مکہ کے بعد جاری کئے گئے اسلامی ریاست کے سیاسی اقتدار اعلیٰ اور بالادستی کو تسلیم کرنے اور مدینہ منورہ کے مقرر کردہ انتظامی افسروں اور عاملوں کی اطاعت و فرمانبرداری کو لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اب عربوں کے سامنے صرف دو متبادل رہ گئے تھے۔ یا تو وہ اسلام قبول کر کے اسلامی امت کے رکن بن جائیں اور حکمرانوں میں شامل ہو جائیں یا اسلامی ریاست میں سماجی اور سیاسی طور پر ایک فروتر درجہ پر قانع رہیں اور اسلامی حکومت کو جزیہ ادا کریں۔ اب اسلامی حکومت کے حلیف بن کر رہنے کا زمانہ ختم ہو گیا۔[۲۹۸] مختصر یہ کہ اسلامی ریاست کی رکنیت ہر ایک کے لئے ناگزیر ہو گئی تھی، کوئی قبیلہ، علاقہ یا فرد مدینہ کے سیاسی دائرہ اقتدار کے پرے نہیں رہ سکتا تھا۔ عرب حالات کے رخ کو بخوبی پہچانتے تھے اور انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ کسی نہ کسی شکل میں اسلامی ریاست کی رکنیت اختیار کئے بغیر چارہ نہیں۔ اسی لئے اتنے بیشمار وفود اتنی تیز رفتاری سے مدینہ پہنچ کر اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار کرنے لگے تھے۔

لیکن ابھی تک کچھ ایسے علاقے اور قبیلے رہ گئے تھے جو اسلامی ریاست کے حلقۂ وفاداری و اطاعت سے باہر تھے۔ یہ انتشار و مزاحمت کے چھوٹے چھوٹے دائرے یا جزیرے تھے جو زیادہ تر جزیرہ نمائے عرب کے شمال بعید میں سرحد شام و عراق کے قریب اور جنوب بعید میں یمن اور حضر موت میں اور جنوب مشرق بعید میں عمان وغیرہ میں تھے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے ہی مرکز دشمن چھوٹے چھوٹے آبادی کے جزیرے جزیرہ نمائے عرب میں جہاں تہاں بکھرے ہوئے تھے۔ اسلامی ریاست کی سب سے زیادہ اور سخت مزاحمت و مخالفت شمالی علاقوں کے قبائل نے کی تھی، خاص طور سے غسان نے کیونکہ ان کو بازنطینی سلطنت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان قبیلوں کے خلاف متعدد مہمیں بھیجنی پڑی تھیں۔ لیکن اس وقت تک شمال کے ان قبیلوں نے اسلامی ریاست کے اقتدار کو نہیں للکارا تھا۔ انھوں نے یا تو حملوں کے منصوبے بنائے تھے یا لوٹ مار کی تھی اور وہ بھی پورے قبیلوں نے نہیں کی تھی بلکہ مجرم تھوڑے سے شرپسند تھے۔ لیکن ۸ھ میں سفیر نبوی کا قتل غسانی حکمران کے ہاتھوں دراصل ایک منظم حکومت کی اسلامی ریاست کو دھمکی اور للکار تھی۔[۲۹۹] اور اگر اسلامی ریاست کو اپنا وجود، اقتدار اور افتخار برقرار رکھنا تھا تو اس قسم کے اقدامات کا مداوا کرنا لازمی تھا۔ موتہ کی جنگ نے اگرچہ غسانی حکمران پر اپنی ناراضگی اور ناپسندیدگی ظاہر کر دی تھی تاہم غسانی بادشاہت کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کو ابھی پست کرنا باقی تھا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے عرب قبائل کے ساتھ مفاہمت اور دوستی بھی اس علاقہ میں کسی مزید کارروائی کے لئے ضروری تھی۔ اس سلسلے میں ضروری

زمین ہموار کرنے کا فریضہ حضرات عمرو بن العاص اور ابو عبیدہ بن جراح کی مہموں نے انجام دیا تھا۔[۳۰۰] ان کے بعد ایک سال سے زیادہ شمالی سرحد یا محاذ پر مکمل سکون رہا۔ لیکن یہ سکون غالباً کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔[۳۰۱] چنانچہ رجب ۹ھ / اکتوبر ۶۳۰ء میں اس محاذ پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے جب بلقاء میں[۳۰۲] رومی افواج اور ان کے عرب باجگذار و مددگار قبائل بالخصوص لخم، جذام، غسان اور عاملہ وغیرہ کے اجتماع کی خبریں مدینہ پہنچنے لگیں۔[۳۰۳] نبطی تاجروں[۳۰۴] نے اور غالباً دوسرے ذرائع نے بھی جن میں مسلمان جاسوس بھی شامل تھے اسلامی ریاست پر رومی حملے کا خدشہ ظاہر کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان پیہم خبروں سے یقین ہو گیا تو آپ نے سرحد ہی پر دشمن کو روکنے کی غرض سے تیس ہزار سپاہ پر مشتمل ایک لشکرِ جرار کے ساتھ پیش قدمی کی اور کوچ پر کوچ کرتے ہوئے تبوک میں خیمہ زن ہوئے۔[۳۰۵] آپ کے اس جرأت مندانہ اور بروقت اقدام سے دشمن کو مقابلے پر آنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ اسی خاموشی کے ساتھ تتر بتر ہو گئے تھے جس احتیاط و خاموشی کے ساتھ وہ جمع ہوئے تھے۔

تبوک میں ڈیڑھ دو ماہ کے قیام کے بعد جب آپ کو یقین ہو گیا کہ دشمن کا خطرہ جاتا رہا ہے تو آپ نے کچھ چھوٹے موٹے اور بعض خاصے بڑے سرایا مختلف علاقوں میں بھیجے۔ اتنے بڑے لشکر کے ساتھ تبوک میں آپ کا یوں تزک و احتشام کے ساتھ قیام قرب وجوار کے قبیلوں اور علاقوں کے حکمرانوں اور آبادیوں دونوں کو مرعوب کرنے کے لئے کافی رہا تھا۔ اور ان پر اسلامی ریاست کی سیاسی اور فوجی طاقت کا بے انتہا اثر پڑا تھا۔ چنانچہ اس کا ایک تو یہ اثر ہوا کہ شمالی علاقے کے بازنطینی حکومت کے وفادار و باجگذار حکمران اور سرحد کے پار ان کے سیاسی آقا اچھی طرح سمجھ گئے کہ اب جزیرہ نمائے عرب کے معاملات میں مداخلت مہنگی پڑے گی۔ دوسرا فوری اثر یہ ہوا کہ شامی سرحد کے اِس پار کے قبائل نے اپنی قسمت کو اسلامی ریاست کے ساتھ وابستہ کرنے میں بہتری سمجھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام قبیلوں، علاقوں اور چھوٹی موٹی ریاستوں نے جن میں بعض یہودی بستیاں اور عیسائی بادشاہتیں شامل تھیں اسلامی ریاست کے ساتھ معاہدے اور صلح نامے کر لئے تھے۔ بازنطینی سلطنت کے قدیم نمک خوار اور باجگذار یا کم از کم ان کے سیاسی ہمدرد جیسے شاہ ایلہ،[۳۰۶] مقنا،[۳۰۷] جرباء اور اذرح[۳۰۸] کے یہودی اور دومۃ الجندل[۳۰۹] کے عیسائی بادشاہ نے جزیہ دینے کا معاہدہ کیا تھا اور اس طرح اسلامی حکومت کے ذمی بن گئے تھے۔ کچھ مدت کے بعد ان علاقوں میں مدینہ کے مرکزی نمائندے بھی مقرر کر دئے گئے تھے[۳۱۰] اور غزوۂ تبوک کے بعد متعدد شمالی قبائل نے یا تو اسلام قبول کرنے کے لئے یا سیاسی وفاداری کے اظہار میں اپنے وفود مدینہ بھیجے تھے۔ ان میں عراق کی سرحد کے قریب آباد بنو بکر بن وائل اور بنو تغلب کے عیسائی قبیلے بھی شامل تھے جنھوں نے زکوٰۃ سے دوگنا جزیہ ادا کرنے کا معاہدہ کیا تھا۔[۳۱۱] اس طرح ۹ھ / ۶۳۰ء کے اختتام تک اسلامی اقتدار کی حدود شامی اور عراقی سرحدوں تک وسیع ہو گئی تھیں۔

شمال بعید کے علاقوں کے برعکس جنوب بعید کے علاقوں اور ان کے قبیلوں کا معاملہ قطعی مختلف تھا۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ مکہ کے جنوب بلکہ جنوب بعید میں اسلامی ریاست کے اقتدار کی ہلکی سی بھی پرچھائیں فتح مکہ تک نہیں پڑی تھی اگرچہ اسلام نے اپنے سایۂ رحمت کو روزِ اول سے جنوبی عرب پر پھیلا دیا تھا۔ بہرحال اسلامی اقتدار کا پہلا ذائقہ جنوبی عربوں نے اس وقت چکھا جب آغاز ۹ھ / وسط ۶۳۰ء میں پہلی مسلمان مہم وہاں پہنچی۔ لیکن یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہئے کہ یہ جماعت یا مہم فوجی

سے زیادہ مذہبی تھی مگر چونکہ گوناگوں اسباب وعوامل کے سبب عددی اعتبار سے یہ خاصی بڑی جماعت تھی اور فوجی لحاظ سے کسی بھی غیر متوقع حالت یا واقعہ کا سامنا بخوبی کر سکتی تھی اس لئے اس کو یا اس کے بعد آنے والی جماعتوں کو مہم کہہ دیا جاتا ہے۔ بہرحال کل پانچ مہمیں حیاتِ نبوی میں صفر ۹ھ/ مئی، جون ۶۳۰ء اور ربیع الاول ۱۰ھ/ جون ۶۳۱ء کے درمیانی عرصے میں جنوبی عرب کے مختلف علاقوں میں بھیجی گئی تھیں۔ ان میں سے پہلی دو مہمیں تو خاصی چھوٹی جماعتیں تھیں جو شروع ۹ھ میں قبیلہ خثعم کے ایک خاندان کے علاقے تبالہ میں اور بنو کلاب کے خلاف بھیجی گئی تھیں۔[۳۱۲] ظاہر ہے وہ پورے قبیلہ کے خلاف کوئی فوجی کارروائی نہیں تھی اگرچہ تیسری مہم کافی بڑی تھی کہ اس میں تین سو مسلم شامل تھے تاہم وہ کسی جنوبی عرب قبیلہ کے خلاف نہ تھی بلکہ اس کا مقصد حبشہ کے بعض لٹیروں کی سرکوبی کرنا تھا جو سمندر پار کر کے لوٹ مار کی غرض سے جنوبی ساحلی علاقے یا جزیرۂ شعیبہ میں آ گئے تھے۔ حضرت علقمہ بن مجزز مدلجی کی قیادت میں مسلمان فوج کا یہ پہلا سمندری فوجی کارنامہ تھا کیونکہ واقدی اور ابن سعد کے مطابق انھوں نے کشتیوں (مراکب) کے ذریعہ جدہ کے ساحل سے غالباً کسی جزیرہ کا جو بحرِ قلزم میں واقع تھا سفر کیا تھا۔ بہرحال ان کی آمد پر حبشی لٹیرے بھاگ گئے تھے[۳۱۳]

کسی جنوبی عرب کے قبیلے یا علاقے میں پہلی اہم مسلم مہم ربیع الاول ۱۰ھ/ جون، جولائی ۶۳۱ء میں گئی تھی جب حضرت خالد بن ولید مخزومی چار سو مسلمانوں کو لے کر بنو الحارث بن کعب یا دوسری روایات کے مطابق نجران کے بنو عبد المدان کے علاقے میں پہنچے تھے۔ طبری کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت خالد کی یہ مہم فوجی ہرگز نہیں تھی بلکہ وہ ایک تبلیغی جماعت تھی جس کا اولین و آخرین مقصد اسلام کی اشاعت و تبلیغ کرنا تھا۔ طبری کے علاوہ دوسرے مآخذ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ قبیلہ مذکورہ و متعلقہ نے دعوت اسلامی قبول کی تھی اور اس میں حضرت خالد بن ولید مخزومی کو مکمل کامیابی حاصل ہوئی تھی۔[۳۱۴] اس کے بعد رمضان ۱۰ھ/ دسمبر ۶۳۱ء میں حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کی مہم جنوبی عرب کے ایک اہم قبیلے مذحج میں پہنچی تھی۔ وہ بھی ایک تبلیغی مشن تھا۔ معمولی سی جھڑپ کے بعد مذحج نے ہتھیار ڈال دئے تھے اور اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے قبول اسلام کے بعد حضرت علی نے ان کا مال اور ان کے قیدی واپس کر دئے تھے اور اس طرح ان کے باقی غیر مسلم طبقات کے بھی دل جیت لئے تھے۔ پھر وہ ان کے صدقات لے کر واپس ہوئے اور مکہ میں اس وقت پہنچے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا آخری حج ادا کر رہے تھے۔[۳۱۵]

اس طرح یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عہد نبوی میں جنوبی عرب کے قبائل میں سے کسی کے خلاف کوئی فوجی اقدام نہیں کیا گیا تھا۔ مآخذ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی قبائل میں سے اکثر و بیشتر بلکہ تقریباً سب نے اسلامی ریاست کے ساتھ اپنا رشتۂ وفاداری یا تو قبول اسلام کے ذریعہ استوار کیا تھا یا سیاسی اتحاد و معاہدہ کے ذریعہ۔ اس کی صریح شہادت بلاذری کے اس بیان میں ملتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور و عروج کی خبر اہل یمن تک پہنچی تو انھوں نے خدمتِ نبوی میں اپنے وفود بھیجنے میں بڑی سرعت کی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کتاب/ صحیفے لکھ کر دئے اور یمنیوں نے اپنے صدقات ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ جب انھوں نے اسلام بھی قبول کر لیا تو جناب رسالتمآبؐ نے ان کے پاس اپنے پیغامبر اور منتظمین بھیجے تاکہ وہ ان کو اسلام کے بنیادی اصولوں اور سنتِ نبویؐ کی تعلیم دیں اور ان کے صدقات وصول کریں۔ آپ نے ان لوگوں پر

جزیہ عائد کیا جو یہودیت، عیسائیت یا مجوسیت پر قائم رہے۔"(۳۱۶) بلاذری کے اس بیان کی تصدیق جنوب عرب سے کثیر تعداد میں آنے والے وفود سے بھی ہوتی ہے۔ ابن سعد کے مطابق عرب کے طول و عرض سے آنے والے اکہتر وفود میں سے تقریباً ایک تہائی صرف جنوبی عرب کے قبیلوں نے بھیجے تھے۔"(۳۱۷) ان تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ امر پوری طرح سے واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام تلوار یا طاقت کے بجائے تبلیغ و تحریض، ایقان و اذعان اور دل کا یقین تھا جس نے یمن اور اس کے ارد گرد کے علاقے کو اسلامی ریاست میں مدغم کیا تھا۔ ایک طرح سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جنوبی عرب کے قبیلوں نے اپنی مرضی و خوشی، ارادہ و قصد اور سوچ سمجھ سے اسلام قبول کر کے اسلامی ریاست کی رکنیت کا شرف حاصل کیا تھا۔

مذکورہ بالا طویل تاریخی بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے مآخذ کا یہ دعوٰی بالکل بجا اور حقیقی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب میدان عرفات میں اپنا عظیم اور تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا تو اس وقت پورا جزیرہ نمائے عرب شمال میں شام و عراق کی سرحدوں سے یمن و حضرموت کے کناروں تک جنوب میں، اور مغرب میں بحر قلزم سے خلیج فارس و ایرانی حدود تک مشرق میں، نہ صرف اسلامی ریاست کے سیاسی اقتدار اعلٰی اور برتری کو تسلیم کر چکا تھا بلکہ وہ اسلامی معاشرہ کا ایک جزو بن چکا تھا وہ اسلامی معاشرہ اور وہ اسلامی ریاست جو اسلام پر یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین پر مبنی تھی۔

باب دوم

قبائلِ عرب اور اسلام

اگرچہ اسلامی ریاست کی تنظیم و تشکیل اور ارتقار کے گوناگوں اسباب و عوامل تھے جن میں سیاسی تنظیم، سماجی ہم آہنگی اور فوجی مہموں میں بظاہر سب سے زیادہ حصہ لیا تھا تاہم سچ یہ ہے کہ ان تمام رنگارنگ کاوشوں اور کاہشوں کی ایک اور صرف ایک اساس تھی ـ یعنی اسلام، خدائے بزرگ و برتر کا نازل کیا ہوا دین، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا آخری اور کامل مذہب۔ یہی اسلام تھا جس نے مکہ کے بت پرستوں کے بیچ خدائے واحد کے ماننے والوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ذاتِ برتر و اعلیٰ کا فرستادہ اور رسول جاننے والوں کو ایک متحدہ و ممتاز امت کا اولین تصور عطا کیا تھا۔ خدا کے نازل کردہ اس دین نے مکہ کے لاچار و بے بس مسلمانوں کو اپنے ہموطنوں اور عزیزوں کے ظلم و ستم سہنے کا حوصلہ عطا کیا تھا۔ پھر اسی مذہب احمدی کے لیے انھوں نے اپنے گھر بار، اپنے عزیز و قریب، اپنے اہل و عیال کو چھوڑ کر دیارِ غیر میں بسنا اور آباد ہونا گوارا کیا تھا۔ اسی کیشِ محمدی کے لیے انھوں نے ظلم و جبر، جور و ستم اور جارحیت کے خلاف تلوار اٹھائی تھی اور اپنوں اور غیروں کے مدِمقابل ڈٹ گئے تھے۔ اسی دین کے لیے انھوں نے سب سے دشمنی مول لی تھی۔ اسی عقیدہ کے لیے انھوں نے اپنی جان و مال کی قربانی دی تھی اور آخر کار اسی مذہب نے مکہ کے منتشر و غیر منظم، بے مایہ و فروتر، بے اساس و بے بنیاد مسلمانوں کو ایک وطن، ایک معاشرہ اور ایک ریاست بخشی تھی۔ یہ ریاست جو شہر مدینہ کی حدود میں محدود تھی رفتہ رفتہ وسیع ہوتی رہی تاآنکہ پورا جزیرہ نمائے عرب اس کے اقتدارِ اعلیٰ اور حاکمیت کے دائرہ میں سمٹ کر آ گیا۔ مکی اور دوسرے مسلمانوں کے خلوص و عقیدت، عزمت و صلابت، قربانی اور جفاکشی نے اپنوں، غیروں سب کو اسلام کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ کردار و بلندیٔ سیرت، حُسن ہدایت و تبلیغ اور اس سے بڑھ کر رحمۃ للعالمین نے ان کو گرویدہ بنایا اور اسلام کی سادگی اور سچائی، صداقت و حقانیت اور جذب و کشش نے سب کو اپنے دائرۂ صدق و صفا میں سمیٹ لیا تھا۔ اسلام ہی دراصل وہ اساسِ اول تھی جس پر پہلے اسلامی معاشرے اور پھر اسلامی ریاست کی بلند و بالا عمارت تعمیر کی گئی تھی۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست مدنی عہدِ نبوی کے دس سال کے قلیل عرصہ میں تشکیل و تنظیم پا گئی تھی مگر یہ حقیقت اولیں و آخریں نگاہوں سے عموماً اوجھل رہ جاتی ہے کہ اس دہ سالہ مدنی دور سے قبل مکہ کی تیرہ برس کی وہ عظیم مدت بھی تھی جس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اولیں پیروؤں ـ قرآن کریم کے الفاظ میں سابقین اولین ـ نے

اپنے خونِ جگر سے اسلام کی آبیاری کی تھی۔ وہ ابتلا و آزمائش اور امتحان کی سخت گذرگاہوں سے گزرے تھے تب یہاں تک پہونچے تھے۔ مکی دورِ حیات کے ان سخت تیرہ برسوں میں خدائے واحد کے ایک اور تنہا برگزیدہ بندے نے ایک ایک گھر ایک ایک در کو کھٹکھٹایا تھا۔ ایک ایک کرکے سب کو بلایا اور اکٹھا کیا تھا تب چند ماننے والے بنے تھے۔ ان گنتی کے ماننے والوں نے جب اپنا خونِ جگر اپنے محبوب و محترم رسول کے خونِ جگر میں شامل کر دیا تھا تب ایک جماعت، ایک چھوٹی سی جماعت بنی تھی۔ اس چھوٹی سی جماعت کے سر سے جب جوئے خون گزر گئی، ان میں سے بعض کے سینے تلواروں اور نیزوں سے چھلنی ہو گئے، آنکھیں لوہے کی انیوں سے بے نور ہو گئیں، پشت دہکتے انگاروں سے داغ داغ ہو گئی، جسم تپتے پتھروں اور جھلستی ریت سے آبلہ آگیں بن گئے۔ پتھروں کی مار سے چوٹی کا خون پاؤں کی جوتی میں بھر بھر گیا تب مکہ کی سنگلاخ و سنگین سرزمین میں اسلام کی کونپل پھوٹی اور خدا کے دین کا پودا پھلا پھولا تھا۔ پھر جیتے جاگتے خون سے سینچے گئے اس پودے کی نشو و نما قابلِ دید تھی۔ صرف مکہ کی تپتی اور پیاسی چٹانیں صدیوں کے بعد ٹھنڈے سائے سے لطف اندوز نہیں ہوئی تھیں بلکہ اس کی شاخیں اتنی وسیع ہوئیں کہ جزیرہ نمائے عرب کے گوشے گوشے اور چپے چپے پر ان کا سایۂ رحمت و رافت پھیل گیا اور عرب کے تمام تپیدہ باشندوں نے اس کے تلے چین و سکون کا سانس لیا تھا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام پہلے پہل مکہ کے باسیوں خاص کر قریش کے مختلف خاندانوں میں پھیلا تھا ہمارے بعض جدید مؤرخین اور سیرت نگاروں نے یہ غلط فہمی پیدا کر دی ہے کہ قریش کے بعض قبائل یا خاندانوں نے اسلام کی مخالفت سب سے زیادہ کی تھی۔ عہدِ جدید میں برِ صغیر پاک و ہند کے عظیم ترین سیرت نگار و مورخِ اسلام مولانا شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ " آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو خاندان بنو امیہ اپنے رقیب (بنو ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔ بدر کے سوا باقی تمام لڑائیاں ابو سفیان ہی نے برپا کیں اور وہی ان لڑائیوں میں رئیسِ لشکر رہا۔"(۱) یہ اور اسی قسم کے دوسرے بیانات تاریخ کی کسوٹی پر کھرے نہیں اترتے۔ نہ بنو امیہ اور بنو ہاشم میں اس وقت تک کوئی رقابت تھی، نہ خاندانِ بنو امیہ رسالتِ محمدی کو اپنے مفروضہ رقیب بنو ہاشم کی فتح خیال کرتا تھا اور نہ بنو امیہ نے اسلام کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی اور نہ ہی ابو سفیان بن حرب اموی نے کسی قبائلی عصبیت یا خاندانی رقابت یا ذاتی عداوت کے سبب اسلام کے خلاف جنگیں برپا کی تھیں۔(۲) یہ عموماً حقیقت نگاہوں سے اوجھل رہ جاتی ہے کہ اسلام کی مخالفت یا محبت دونوں ہی قبائلی خطوط پر نہیں ہوئی تھیں اور نہ ہی اس کی مخالفت اور حمایت میں قبائلی یا خاندانی تعصب کو دخل رہا۔ اسلام کی جس نے بھی مخالفت کی تھی اس نے خدا اور رسول کی دشمنی میں کی تھی اور جس نے بھی اسے قبول و منظور کیا تھا اس نے خدا اور رسول کی محبت میں کیا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ مخالفین نے اپنی انفرادی حیثیت میں گروہی یا جماعتی یا قبائلی عصبیت سے بھی کام لیا ہو بالکل اسی طرح جس طرح کہ بعض عرب قبائل نے گروہی تعصب، قبائلی عصبیت اور جاہلی حمیت کی بنا پر اسلامی ریاست کی مخالفت کی تھی لیکن اسلام کی محبت اور دشمنی میں قبائلِ عرب عام طور سے اور قبائلِ قریش خاص طور سے بجائے خود

منقسم تھے۔ چونکہ اسلام کا آغاز قریش مکہ کے درمیان ہوا تھا اور وہی اسلام کے علمبرداروں (اور مخالفوں میں بھی) سر فہرست تھے۔[۳] رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمنواؤں میں سابقین اولین اور اسلامی ریاست کے بانیوں میں ممتاز و نمایاں ترین تھے اس لیے اسلام کی قبائل عرب کے درمیان اشاعت کا مطالعہ انہی سے شروع کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اور یہی تاریخی ترتیب واقعات یا توقیت کا بھی تقاضا ہے۔

قریش مکہ

اولین مسلم یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہاشمی کے بعد جن چار مکیوں نے اسلام قبول کیا ان میں حضرت خدیجہ بنت خویلد کا تعلق قریش کے خاندان بنی اسد سے، حضرت ابو بکر عبداللہ بن ابی قحافہ عثمان کا بنو تیم سے، حضرت علی ابن ابی طالب کا بنو ہاشم سے اور حضرت زید بن حارثہ کا نسلاً بنو کلب سے مگر عملاً بنو ہاشم سے تھا۔[۴] یہ وہ سابقین اولین تھے جو اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سب سے پہلے بے بہا اور گرانقدر جواہر تھے اور بلا کسی کد و کاوش کے پہلے اسلام کے پیرو اور پھر اس کے اولین داعی بنے تھے۔ ان کے سوا قریش کے تمام افراد، خاندانوں اور قبیلوں نے اسلام کی دعوت کو قبول کرنے میں پس و پیش کیا تھا یا اس کو قبول کرنے سے سرے سے انکار کر دیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو پہلے پہل بنو عبدالمطلب بن ہاشم نے اس طرح ٹھکرا دیا تھا جس طرح کوہ صفا پر آپ کے اعلان حق کو دوسرے قبائل قریش نے۔[۶] اگر کوئی قبائلی یا خاندانی عصبیت تھی جس نے اسلام کی مخالفت کی تھی تو وہ ان تمام قبائل قریش مکہ کی یکساں مخالفت و عداوت تھی۔ اس میں کسی کو کسی پر نہ امتیاز حاصل تھا اور نہ ہی ان کے بیچ کوئی تفریق تھی۔ گروہوں، خاندانوں اور قبیلوں نے بحیثیت مجموعی مختلف اسباب و عوامل سے دعوت اسلامی مسترد ضرور کر دی مگر انہی کے افراد اسلام کے سحر حلال کے اثر سے نہ بچ سکے اور رفتہ رفتہ اس کے حلقہ بگوش بنتے گئے۔

مکہ کے اولین مسلمانوں کے درمیان قبول اسلام میں سبقت کے لحاظ سے کس کو شرف عظمت و افتخار دیا جانا چاہئے اس مسئلے پر ہمارے قدیم و جدید دونوں مورخین اور اہل سیر کا اختلاف ہے۔ ہماری قدیم روایات میں سے بعض یہ شرف حضرت خدیجہ کو، بعض حضرت ابو بکر کو، بعض حضرت زید بن حارثہ کو اور بعض حضرت علی بن ابی طالب کو دیتی ہیں۔[۷] قدیم و جدید دونوں مورخین نے اپنے اپنے مذہبی رجحانات اور شخصی میلانات کے سبب ان میں سے بعض کو دوسرے پر ترجیح دی ہے جبکہ بعض صلح جو اور تطبیق پسند طبقوں نے بیچ کی راہ نکالی ہے کہ ان چاروں سابقین اولین کو اپنے اپنے طبقہ کا پہلا مسلمان تسلیم کر لیا ہے۔[۸] مستشرقین نے بھی اس پر اکثر کلام کیا ہے اور عہد جدید کے نامور مورخ مونٹگمری واٹ نے ان میں سے حضرت خدیجہ کو بلاشک و شبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلا مسلم گردانا ہے اور ان کے بعد حضرت زید بن حارثہ کو۔ اگرچہ وہ حضرات علی اور ابو بکر کے اسلام کو بھی ایک لحاظ سے قدیم ترین اعلان حق تسلیم کرنے کو تیار ہیں تاہم وہ اول الذکر کے اسلام کو اہمیت کے ان کی صغر سنی کے سبب قائل نہیں ہیں اور موخر الذکر کے بارے میں ان کا

خیال ہے کہ بعد کے زمانے میں ان کی عظمت کا پرتو ان کے ابتدائی عہد پر پڑا ہے اور ان کی اولیت اسلام کی دعویدار روایات اسی کی مظہر ہیں۔ بہرحال وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اپنے سماجی اعتبارات اور تبلیغی اثرات کے لحاظ سے حضرت ابوبکر کا اسلام اہم ترین اور دوررس نتائج کا حامل تھا۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے اور اس کا اعتراف کرنا چاہیے۔[9]

جہاں تک سبقتِ اسلام میں عددی ترتیب یا حساب و ریاضی کے اصولِ ترتیب کا تعلق ہے اس کا سرِدست ہمارے اس مباحثے سے تعلق نہیں ہے کہ وہ سیرت نگارِ رسول کا کام ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ تاریخی لحاظ سے حضرت ابوبکر کے اسلام کو جو اہمیت حاصل تھی وہ مذکورہ بالا بزرگوں میں سے کسی کو حاصل نہیں تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر اسلام کے سب سے بڑے، سب سے زیادہ پرجوش اور عظیم ترین داعی تھے۔ ان کے سماجی اور سیاسی مرتبے، وسیع تجارتی تعلقات اور ہمہ گیر تہذیبی اور معاشرتی اثرات نے مکہ میں اسلام پھیلانے اور قریش کے نوجوانوں کو مسلمان بنانے میں سب سے بڑا کردار ادا کیا تھا۔[10] اس لیے مآخذ کے اس بیان میں کہ حضرت ابوبکر کی دعوت پر حضرات عثمان بن عفان اموی، زبیر بن عوام اسدی، عبدالرحمٰن بن عوف زہری، سعد بن ابی وقاص زہری اور طلحہ بن عبیداللہ تیمی ایمان لائے تھے اور پہلے آٹھ مسلمانوں میں تھے،[11] کذب و افترا کا ذرا سا بھی عنصر نہیں ہے۔ ان مسلمانوں کی سبقتِ اسلام کو محض اس لیے نہیں مسترد کیا جا سکتا یا مشتبہ سمجھا جا سکتا کہ وہ بعد کے زمانے میں امت کے عظیم ترین افراد اور شہادت عمر کے وقت ریاستِ اسلامی کے عظیم ترین قائدین میں تھے۔[12] ممکن ہے کہ ان میں سب کو یا بعض کو ترتیبِ ریاضی کے لحاظ سے دوسرے سابقین پر سبقت کی فضیلت نہ حاصل رہی ہو جیسا کہ حضرات عثمان بن مظعون جمحی، خالد بن سعید اموی، ابوذر غفاری اور عمرو بن عبسہ ازدی وغیرہ کے دعوائے اولیت اور ترتیبِ سبقت سے معلوم ہوتا ہے لیکن محض ان متاخر الذکر بزرگوں یا ان کی جانب سے مورخین کے دعووں کی بنا پر مذکورہ بالا آٹھ سابقین اولین کی سبقتِ اسلام سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مثال کافی ہوگی حضرت ابوذر غفاری کے بارے میں مآخذ کا اتفاق ہے کہ وہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور و بعثت اور اسلام کا شہرہ سن کر اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے اور پھر اپنے بھائی کے ذریعہ اس کی تصدیق کی تھی اور جب ان کی روداد سے مطمئن نہیں ہوئے تو خود مکہ آئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم دارِ ارقم میں قیام فرما چکے تھے اور مکہ میں مسلمانوں پر قریش کی مخالفت کی دہشت سوار تھی۔[13] مآخذ کے مطابق دارِ ارقم میں قیامِ نبوی کا آغاز ۴ نبوی / ۶۱۴ء سے ہوا تھا جو غالباً اسلام عمر کے زمانے ۶ نبوی / ۶۱۶ء تک جاری رہا تھا۔ اس وقت تک متعدد مکی مسلمان ہو چکے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری اسی مدت کے دوران کسی وقت اسلام لائے تھے لہٰذا ان کو وہ سبقتِ اسلام حاصل نہ تھی جیسا کہ ان کی جانب سے مورخین کا دعویٰ ملتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اسلام میں سبقتِ اسلام کی اہمیت ضرور ہے لیکن محض اس کی بنا پر طبقۂ اشراف (NOBILITY) میں شمولیت نہیں حاصل ہو جاتی۔ اس کی درخشاں مثال حضرت عمر بن خطاب کا اسلام ہے۔ حسابی ترتیب کے مطابق صحابی موصوف کا پچاس مسلمانوں کے بعد نمبر آتا ہے[14] لیکن تاریخ اسلام کا کوئی دیانتدار طالب علم ان کی فضیلت و اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ بہرحال اصولِ ریاضی کی ترتیبِ حسابی کی مورخین کے

نزدیک یا مآخذ تاریخ اسلامی میں اہمیت ہو نہ ہو اس کی تاریخ اسلام یا مذہب اسلام میں جہاں تک مکی عہد کے مسلمانوں کی ترتیب کا تعلق ہے زیادہ اہمیت نہیں ہے کیوں کہ قرآن کریم سابقین اولین کے مقابلے میں اس کی کوئی رو رعایت نہیں کرتا اور نہ ان کے درمیان کوئی خط تفریق کھینچتا ہے[۱۵]۔ عملی لحاظ سے دار ارقم میں قیام نبوی سے ماقبل اور مابعد زمانے کی بھی کوئی خاص تخصیص نہیں ہے۔ ثواب و اجرِ اخروی کی بات اور ہے لیکن اس دنیا میں اس کی تفریق نہ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روا رکھی تھی اور نہ اسلام کے صدرِ اول میں اس کی کوئی زیادہ اہمیت گردانی گئی۔

بہرحال تمام مکی مسلمانوں کی بلا لحاظِ ترتیب حسابی یکساں اہمیت تھی اور ان میں سے ہر ایک کو ایک سا شرفِ سبقت اور شرفِ صحبت حاصل تھا کیوں کہ قرآن کریم ہجرت مدینہ کو خطِ تفریق و امتیاز قرار دیتا ہے[۱۶]۔ ابن اسحاق اور ابن سعد نے جن مکی مسلمانوں کو قدیم الاسلام کہا اور اولین مسلموں میں شمار کیا ہے وہ بلا ریب صحیح ہے اور ان میں حسابی ترتیب تلاش کرنا بے سود ہے۔ ابن اسحاق نے مذکورہ بالا آٹھ نر سابقین اولین کے ذکر کے بعد مزید چھیالیس[۴۶] قدیم مسلمانوں کی فہرست دی ہے ان کا تعلق قریش کے مختلف خاندانوں سے تھا۔ ان میں قریشی بھی تھے اور ان کے قبائل عرب کے متعدد حلفاء اور موالی بھی ان سابقین اولین کے ایک تحلیلی مطالعہ سے یہ بات پایۂ ثبوت و اعتبار کو پہنچتی ہے کہ اسلام کی اشاعت قبائلی یا خاندانی خطوط پر نہیں ہوئی تھی اور نہ اس میں قبائلی رقابت اور خاندانی عصبیت نے کوئی حصہ لیا تھا یا رکاوٹ ڈالی تھی۔ یہ دلچسپ کی بات ہے کہ اس مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے متعدد سربرآوردہ خاندانوں کے افراد کس طرح اسلام کے حلقہ بگوش بنے تھے۔ ذیل میں ابن اسحاق کی ترتیب کے مطابق[۱۷]، جو کوئی تاریخی یا حسابی ترتیب نہیں ہے۔ ان سابقین اولین کے قبولِ اسلام کا مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے

۱۔ بنو حارث بن فہر سے : حضرت ابو عبیدہ بن جراح

۲۔ بنو مخزوم سے : حضرات ابو سلمہ بن ابو الاسد، ارقم بن ابی ارقم، عیاش بن ابی ربیعہ اور ان کی زوجہ، محترمہ سلامہ تمیمی اور اس خاندان کے مذحجی حلیف عمار بن یاسر عنسی

۳۔ بنو جمح سے : حضرات عثمان بن مظعون، ان کے دو بھائی قدامہ اور عبد اللہ اور ایک فرزند سائب بن عثمان و حاطب بن حارث اور ان کی اہلیہ فاطمہ بنت مجلل، حطاب بن حارث اور ان کی اہلیہ فکیہہ بن یسار اور حاطب و خطاب کے تیسرے بھائی معمر بن حارث۔

۴۔ بنو المطلب سے : حضرت عبیدہ بن حارث

۵۔ بنو عدی سے : حضرات سعید بن زید اور ان کی اہلیہ فاطمہ بنت خطاب، نعیم بن عبد اللہ النحام اور خاندان بنو عدی کے حلفاء، عامر بن ربیعہ عنزی، واقد بن عبد اللہ تمیمی اور بنو بکیر/ بنو بکر بن عبد مناۃ / کنانہ کے خالد، عامر عاقل اور ایاس۔

۶۔ بنو تیم سے : حضرات اسماء بنت ابی بکر اور ان کی بہن عائشہ، خاندان صدیقی کے مولی عامر بن فہیرہ اور ان کے

حلیف صہیب بن سنان (بنو نمر بن قاسط)

۷۔ بنو زہرہ سے: حضرات عمیر بن ابی وقاص، مطلب بن ازہر اور ان کی اہلیہ رطہ بنت عوف، اور بنو زہرہ کے حلفاء عبداللہ بن مسعود ہذلی، مسعود القاری اور موخر الذکر مولیٰ حضرت خباب بن ارت تمیمی۔

۸۔ بنو عامر بن لوی سے: حضرات سلیط بن عمرو بن عبد شمس اور ان کے برادر حاطب بن عمرو۔

۹۔ بنو سہم سے: حضرت خنیس بن حذافہ

۱۰۔ بنو امیہ سے: حضرات خالد بن سعید بن عاص اور ان کی اہلیہ امینہ بنت خلف خزاعی، ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ اور بنو امیہ کے حلفاء عبداللہ بن جحش اور ان کے بھائی ابو احمد (اسد/خزیمہ)

۱۱۔ بنو ہاشم سے: حضرات جعفر بن ابی طالب اور ان کی بیوی اسماء بنت عمیس خثعمی

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اس زمانے میں مکہ کے لوگوں کی خاصی بڑی تعداد نے جن میں مرد و عورت دونوں شامل تھے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا اور شہر خدا میں اسلام کی اتنی شہرت ہو گئی تھی کہ ہر خاص و عام کی زبان پر اس کا ذکر ہونے لگا تھا[۱۸] مکی مسلمانوں کی یہ تعداد اسلام کی خفیہ تبلیغ کے زمانے کی تھی جو بعثت نبوی کے پہلے تین برسوں کی مدت تھی۔ گویا ۶۱۰ء اور ۶۱۳ء کے دوران لگ بھگ سو مکی مسلمان ہو چکے تھے۔ اس کے بعد اسلام کی علانیہ تبلیغ کا زمانہ شروع ہوا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ابن اسحاق نے ان ضعفاء المسلمین (کمزور مسلمانوں) کے زمانۂ قبول اسلام کا کسی زمانے میں ذکر نہیں کیا ہے جن کے بارے میں عام شہرت یہ ہے کہ وہی اسلام کے اولین پیرو تھے بلکہ اکثر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مذہب کو پہلے ماننے والے ہمیشہ کمزور لوگ ہوتے ہیں۔[۱۹] بہرحال اگرچہ ابن اسحاق کی فہرست مسلمین قدیم میں حضرات خباب بن ارت تمیمی، عبداللہ بن مسعود ہذلی اور عمار بن یاسر مذحجی کا ذکر آ گیا ہے تاہم ثانی الذکر کے بھائی عتبہ اور موخر الذکر کے والدین یاسر اور سمیہ کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح موذن رسول حضرت بلال حبشی کے زمانۂ اسلام کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے ضعفاء مسلمین جیسے حضرات ابو فکیہہ، لبینہ، زنیرہ، نہدیہ اور ام عبیس وغیرہ کے قدیم الاسلام ہونے کا تو ذکر عموماً ماخذ میں ملتا ہے لیکن ان کے قبول اسلام کے زمانے کی تعیین نہیں ملتی۔[۲۰] تمام حقائق اور شواہد بہرحال اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا تمام کمزور مسلمانوں نے بھی اسلام کی خفیہ تبلیغ کے زمانے میں ہی اسلام قبول کیا تھا۔ عام طور سے ان کمزور مسلمانوں کے قدیم الاسلام ہونے کا ذکر قریش مکہ کے ہاتھوں مسلمانوں کی تعذیب کے بیان میں ملتا ہے[۲۱] جو ۶۱۳ء اور ۶۱۵ء کی درمیانی مدت میں اپنے عروج پر تھی۔ یہ مسلمانوں کی آزمائش و ابتلا کا سخت ترین دور تھا مگر ساتھ ہی مسلمانوں کے تپ کر کندن بننے کا بھی۔

حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی اور حضرت عمر بن خطاب عدوی کا زمانہ قبول اسلام عموماً ۶ نبوی/۶۱۶ء بتایا جاتا ہے جو خفیہ اور علانیہ تبلیغ کے زمانے کا ایک طرح سے سنگم ہے۔ حضرت حمزہ کے بارے میں عموماً وضاحت نہیں ملتی کہ وہ کتنے مسلمانوں کے بعد اسلام لائے تھے۔ البتہ یہ بیان ملتا ہے کہ انھوں نے دار ارقم میں قیام نبوی کے زمانے میں ۶ نبوی میں اسلام قبول کیا تھا۔[۲۲] غالباً اس وقت تک مکی مسلمانوں کی تعداد تیس چالیس سے اوپر ہو چکی تھی۔ ان کے قبول اسلام کے وقت

مسلمانوں کی یہی تعداد کا صریح ذکر نہیں ملتا لیکن حضرت عمر کے بارے میں روایات شاہد ہیں کہ وہ چالیس مردوں اور دس عورتوں کے بعد اسلام لاتے تھے (۲۳) اور ان کا زمانہ قبولِ اسلام غالباً دار ارقم میں قیامِ نبوی کا آخری دن تھا۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیں داعیوں نے علانیہ تبلیغ شروع کر دی تھی۔ مذکورہ بالا قدیم مسلمانوں کی اگر اتنی ہی تعداد تھی جتنی کہ ابنِ اسحاق نے بتائی ہے تو حضرت عمر کے اسلام کی ترتیب حسابی سے متصادم نظر آتی ہے۔ بہرحال ماخذ کا یہ بیان صحیح معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ہجرتِ حبشہ کے بعد حضرت عمر نے اسلام قبول کیا تھا۔ ممکن ہے ان کا نمبر پچاسواں یا اکیاون واں نہ رہا ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے اسلام کے بعد مکی مسلمانوں کو ایک احساسِ توقیر و تحفظ ہوا تھا اور اسلام کو ان کے سبب قوت و شوکت نصیب ہوئی تھی۔ اسلام کی تاریخ اشاعت و تبلیغ میں یہ ایک اہم سنگِ میل تھا جب مسلمانانِ مکہ نے خوف و ہراس کی بجائے پہلی بار ایک مضبوط و مستحکم امت کا احساس کیا تھا۔

ماخذ کے مطابق پہلی ہجرتِ حبشہ ۵ نبوی / ۶۱۵ء میں مکہ کے گیارہ مسلمان مردوں اور چار عورتوں نے پہلی بار خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا تھا اور وہ با جماعت حبشہ گئے تھے۔ (۲۴) اس کے ایک سال بعد ۶ نبوی / ۶۱۶ء میں حبشہ کو دوسری ہجرت ہوئی جس میں ۸۳ یا ۸۶ مکی مسلمانوں نے ہجرت کی تھی۔ ابنِ اسحاق کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری ہجرتِ حبشہ نہ تو پہلی ہجرت کے مکمل ایک سال بعد ہوئی تھی اور نہ ہی با جماعت بلکہ پہلی ہجرت کے بعد سے مسلسل اکا دکا کر کے مکی مسلمان جاتے رہے تا آنکہ ان کی تعداد دیارِ ہجرت میں ۸۳ یا ۸۶ ہو گئی۔ ابنِ اسحاق نے اس ضمن میں ایک اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ مذکورہ بالا تعداد مہاجرینِ مکہ کے بالغ مردوں اور عورتوں کی تھی اور ان میں چھوٹی عمر کے بچے شامل نہیں تھے جو اپنے والدین یا دوسرے بزرگوں کے ساتھ گئے تھے۔ (۲۵) اس طرح سے یہ تعدادِ مہاجرین مجموعی طور سے کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ ایک موٹے سے اندازے کے مطابق دو تین سو مسلمانوں نے ۶۱۶ء تک حبشہ میں پناہ لے لی تھی۔

ماخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ مہاجرینِ حبشہ کے ترکِ وطن کے بعد بھی مکہ میں مسلمانوں کی معتد بہ تعداد موجود تھی جو گوناگوں اسباب سے ہجرت نہیں کر سکے تھے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مکہ میں وہی مسلمان باقی رہ گئے تھے جن کو اپنے خاندانوں کا یا کسی اور طرح کا قبائلی تحفظ (جوار) حاصل تھا اور ہجرتِ حبشہ پر وہ لوگ مجبور ہوئے تھے جو اس قبائلی تحفظ سے محروم ہو گئے تھے اور ان کے اپنے خاندانوں نے ان کو چھوڑ دیا تھا۔ (۲۶) بہرحال ہجرتِ حبشہ ثانیہ کے بعد مکہ میں باقی رہ جانے والوں میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہلِ بیتِ اطہر کے علاوہ متعدد قریشی سربرآوردہ خاندانوں کے افراد جیسے حضرات ابو بکر، عمر، علی، عبد اللہ النحام وغیرہ بھی تھے (۲۷) اور حضرات بلال، زنیرہ، نہدیہ اور ام عبیس جیسے ضعفا مسلمین بھی۔ یہ کمزور مسلمان اپنی ذاتی مجبوریوں کے سبب ترکِ وطن بھی نہیں کر سکتے تھے۔ (۲۸)

مکی دورِ حیاتِ نبوی کے نصفِ اول کے خاتمہ پر مسلمانانِ مکہ کی کتنی تعداد تھی؟ اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں ہے خصوصاً اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ ہمارے پاس اس زمانے کے مکہ کی آبادی کے اعداد و شمار نہیں ہیں تاہم ایک موٹے سے تخمینہ کی بنیاد پر ان کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر ۶۱۶ء کے اواخر میں بالغ مکی مسلمانوں

کی تعداد بشمول مہاجرین حبشہ دو سو بھی فرض کر لی جائے جو اس زمانے میں یقینی طور پر تھی اور ہر بالغ کے ماتحت ارکانِ خاندان یعنی بیوی، بچوں، غلام و نوکر اور دوسرے ماتحت افراد کی تعداد فی کس ۵ یا ۶ بھی مان لی جائے تو مکہ کے مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔ بالغ مسلمانانِ مکہ میں سے کچھ کو اگر تنہا بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ تعداد کسی طرح سات آٹھ سو سے کم نہیں معلوم ہوتی اس خیال کے ثبوت میں چند مثالوں کی ضرورت ہے

ہم پہلی مثال خود خاندانِ رسالت مآب سے لیتے ہیں۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعثت تک کئی بچوں اور بچیوں کے والد ماجد بن چکے تھے۔ اگرچہ آپ کی اولادِ نرینہ زیادہ دنوں تک بقید حیات نہیں رہی تاہم آپ کی دخترانِ گرامی چار تھیں جو ہجرت کے بعد تک زندہ رہیں[29]۔ اس طرح مکی عہد میں ۹ نبوی / ۶۱۹ء تک آپ کا مقدس گھرانہ بشمول آپ کے کم از کم چھ افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں آپ کے موالی، غلام یا گھریلو یا تجارت کے نوکر شامل نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی مآخذ میں مذکور ہیں۔ حضرت زید بن حارثہ جو آپ کے آزاد کردہ غلام اور متبنیٰ تھے آپ کے گھرانے کے ہی ایک فرد تھے[30]۔ حضرت زید کا اپنا گھرانہ تھا۔ ان کی اہلیہ حضرت ام ایمن تھیں[31] اور ان کے کم از کم ایک فرزند حضرت اسامہ مکہ میں پیدا ہو چکے تھے اور بوقتِ ہجرت لگ بھگ دس برس کے تھے[32] ان کے علاوہ حضرت خدیجہ کے بعض غلاموں اور تجارت میں شامل نوکروں کا ذکر ملتا ہے ان میں حضرت میسرہ کا نام کافی نمایاں ہے[33]۔ بعض دوسرے غلامانِ رسول جیسے حضرات ابو رافع[34]، صالح شقران[35]، رافع[36]، ابو کبشہ[37]، انسہ[38] وغیرہ کا بھی ذکر ملتا ہے جو مکی عہد میں خاندانِ رسول سے وابستہ تھے اور ہجرت کر کے مدینہ گئے تھے۔ اس طرح محض خاندانِ رسول کے مسلمانوں کی تعداد کم از کم پندرہ تھی۔

دوسری مثال حضرت ابو بکر صدیق کی ہے۔ عام طور سے ان کے خاندان کے مسلمانوں میں ان کی دو صاحبزادیوں حضرات اسماء[39] اور عائشہ[40] اور ان کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ گویا کہ خاندانِ صدیقی میں محض چار افراد ہی مسلمان تھے حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ مورخین نے کم از کم چار مزید ارکانِ خاندانِ صدیقی یعنی حضرت ابو بکر کی والدہ ماجدہ ام الخیر[41] زوجہ محترمہ حضرت ام رومان[42]، ایک نوجوان صاحبزادے حضرت عبداللہ[43] اور موخر الذکر کی اہلیہ حضرت عاتکہ بنت زید تیمی[44] کو مسلمانانِ مکہ میں شامل نہیں کیا ہے۔ ہمارے جدید عہد کے مستشرقین جو اپنی وسعتِ نظر، خوبیٔ نظر، خوبیٔ تحقیق اور ہمہ گیر نظر کے لیے شہرتِ عام رکھتے ہیں۔ ان ناموں کو یا اسی طرح اور مکی مسلمانوں کے ناموں کو اپنی فہرستوں میں نہیں شامل کر سکے ہیں[45]۔ بہرحال ان آٹھ ارکان کے علاوہ یہ یقینی بات ہے کہ خاندانِ صدیقی میں کچھ اور رکن بھی مسلمان تھے یا کم از کم ان کے موالی اور حلیف اور غلام اسلام قبول کر چکے تھے۔ ایک موٹے سے اندازے کے مطابق خاندانِ صدیقی کے کل مکی مسلمانوں کی تعداد دس بارہ سے کسی طور کم نہیں تھی۔

حضرت عمر[46] فاروق کے خاندان کے مکی مسلمانوں میں صرف ان کا اور ان کے نابالغ فرزند حضرت عبداللہ بن عمر کا ذکر کیا جاتا ہے حالانکہ یہ حقیقت بھی جانتے ہیں کہ ان کی ایک صاحبزادی حضرت حفصہ بھی مکی مسلمان تھیں[47]۔ ان دونوں فاروقی اولادوں کے علاوہ جو کافی مشہور

ہی حضرت عمر کے ایک اور صاحبزادے عبدالرحمٰن اکبر بھی تھے جو ان دونوں مذکرہ بالا کے حقیقی بھائی تھے اور ابتدائی مسلم تھے۔ ان کی والدہ ماجدہ جو حضرت عثمان بن مظعون جمحی کی بہن تھیں بھی ایک قدیم مکی مسلم تھیں۔ حضرت عمر کی کم از کم ایک بہن حضرت فاطمہ بنت خطاب اور ایک بھائی حضرت زید بن خطاب تر قدیم تر مسلم تھے۔[۴۹] ان دونوں بھائی بہنوں کے اپنے اپنے خاندان تھے۔ حضرت فاطمہ کے شوہر سعید بن زید مسلمان تھے اور ان دونوں کی کئی اولادیں مکہ میں پیدا ہو چکی تھیں۔[۵۰] حضرت زید بن خطاب کی اہلیہ اور ان کے کم از کم دو لڑکے لڑکی بھی مسلم تھے۔[۵۱] ان کے علاوہ حضرت عمر کی ایک اور بیوی بھی اسی مکی عہد میں مسلمان ہو گئی تھیں۔[۵۲] ان کے ایک غلام حضرت مہجع اولین مسلمانوں میں شامل تھے اور بعد میں وہ بدر میں شہید ہوئے۔[۵۳] اس طرح صرف خاندان فاروقی سات آٹھ نفوس پر مشتمل تھا اور اس کا قوی امکان ہے کہ ان کے بعض دوسرے فرزندوں اور دختروں کے علاوہ ان کے بعض غلام اور موالی بھی مسلمان رہے ہوں۔ ان کے بعض مسلمان حلیفوں اور ان کے خاندانوں کے بارے میں بھی تفصیلات ملتی ہیں جن سے ان کے مکی عہد کے مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان تین اہم گھرانوں کے علاوہ مختصراً بعض دوسرے قریشی گھرانوں کے مسلمانوں کی تعداد کا بھی حوالہ دیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ تفصیلات ذرا دیر بعد قریش مکہ کے مختلف بطون کے مسلمانوں کے مطالعہ کے ضمن میں دیکھیں گے۔ بنو مطلب کے حضرت عبیدہ بن حارث کا اپنا گھرانہ کم از کم بارہ افراد پر مشتمل تھا۔[۵۴] حضرت عثمان بن مظعون جمحی کا گھرانہ بھی اسی طرح دس بارہ مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ اسی طرح حارث بن قیس سہمی کے فرزندوں میں سے تقریباً دس ابتدائی مسلمان تھے۔[۵۵] ظاہر ہے کہ ان فرزندوں کی ازواج و اولاد بھی تھی اور وہ تقریباً سب مسلمان تھی۔ اس طرح ان کے مسلمانوں کی تعداد کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

قریشی خاندان کے اصل اراکین کے علاوہ ان کے خاص حلیفوں کے خاندانوں کے مطالعہ سے ہمارے خیال کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ بنو غنم بن دودان جو قریشی خاندان کے حلیف تھے سب کے سب مکی عہد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ ابن اسحاق نے ان کے بلیس مردوں اور آٹھ/ نو عورتوں کے نام اپنی فہرست مہاجرین مدینہ میں گنائے ہیں اور ان کو مکی عہد کا قدیم مسلم قرار دیا ہے۔ ابن سعد اور ابن حزم اندلسی کی روایت سے نہ صرف اس کی تائید ہوتی ہے بلکہ یہ مزید معلوم ہوتا ہے کہ صرف ان کے بالغ مردوں اور عورتوں کی تعداد چالیس تھی۔ ان کے مردوں[۵۶] میں سے چند کو چھوڑ کر سب نے جنگ بدر اور احد میں حصہ لیا تھا۔ بہرحال قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کے بچوں اور غلاموں اور موالی کی تعداد کیا رہی ہوگی؟ ایک تخمینے کے مطابق یہ تعداد کم از کم دو سو افراد صغیر و کبیر پر مشتمل معلوم ہوتی ہے۔ مونٹگمری واٹ اور ان کے پیش رو لیون کیتانی نے ان کے صرف انیس مردوں کے نام اپنی اپنی فہرستوں میں گنائے ہیں۔[۵۷] حیرت اور عبرت کا مقام ہے کہ ہمارے روشن فکر اور روشن خیال مستشرقین نے تمام مسلمان عورتوں کو اپنی فہرستوں سے خارج کر دیا ہے۔ اور اس طرح بڑی ہوشیاری، سمجھداری بلکہ عیاری سے مکی مسلمانوں کی تعداد کو کم کر کے دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح سعد بن لیث / کنانہ کے ایک قریشی حلیف خاندان بنو بکیر کے کل مرد و عورت مسلمانوں کی تعداد خاصی تھی جب کہ ان کے محض چار پانچ مردوں کو عام طور سے شمار کیا جاتا ہے۔[۵۸] اس سے زیادہ حیرت انگیز معاملہ بنو غنی کے ساتھ ہوا ہے جو بنو ہاشم خاص کر حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی کے حلیف تھے۔ عام طور سے ان کے باپ بیٹوں کا مکی مسلمانوں میں ذکر کیا جاتا ہے۔[۵۹] جبکہ یہ ثابت ہے کہ بنو غنی میں صرف یہی حضرات مکی مسلمانوں میں نہیں شامل تھے۔ ان کے افراد کا کوئی حتمی یا ظنی تعین کے

بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے خاندان کے مسلمانوں کی تعداد بلا ریب اس سے کہیں زیادہ تھی جتنی کہ بتائی جاتی ہے۔[۶۰]

ان متعدد حتمی مثالوں سے یہ دعویٰ دلیل کو پہنچتا ہے کہ فی بالغ مرد کم از کم چھ سات اس کے ماتحت اراکین کو بھی مکی مسلمانوں میں شمار کرنا چاہیے۔ یہ نتیجہ ایک عام اوسط کی بنا پر نکلتا ہے۔ آبادی کے اعداد و شمار کی غیر موجودگی میں یہ اوسط حقیقت اور قیاس کے قرین ہے اور ابتدائی عہد کے مسلمانوں کی کوئی فہرست بھی بناتے وقت اس کا لحاظ رکھنا لازمی ہے۔

عام تاثر یہ ہے کہ مکی عہد کے نصف آخر میں ہجرت حبشہ یا اسلام عمرؓ کے بعد مکہ میں اسلام کی اشاعت رک گئی تھی اور ۶۱۶ء اور ۶۲۲ء کے درمیان شہرِ خدا نہ صرف بنجر ہو گیا تھا بلکہ اس میں قبولِ اسلام کی صلاحیت ہی نہیں رہ گئی تھی۔[۶۱] ماخذ سے بھی یہی تاثر ملتا ہے اور اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ ہمارے قدیم مؤرخین و مستند سیرت نگاروں کی توجہ اس موضوع سے ہٹ گئی اور وہ دوسرے اہم موضوعات جیسے قریشِ مکہ کے ہاتھوں ابتدائی مسلمانوں خاص کر ضعفا المسلمین کی تعذیب، خاندان بنی ہاشم کے سماجی مقاطعے حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات کے المناک حادثوں، طائف کے غمناک و حسرت ناک سفرِ نبوی، قبائل عرب کے سامنے تبلیغِ اسلام کی کوششوں اور پھر مدینہ منورہ کے اوس و خزرج میں اشاعتِ اسلام اور ہجرت مدینہ کے موضوعات میں ایسے الجھے کہ اس موضوع پر ان کی نگاہ نہیں رہی تاہم ماخذ میں گنتی کی سہی چند ایسی روایتیں ملتی ہیں جو اس زمانے میں مکہ میں اسلام کی نشر و اشاعت کی طرف واضح اشارہ کرتی ہیں۔

بلاذری کا بیان ہے کہ حضرات عمرؓ و ابو عبیدہ بن جراح اور حمزہ وغیرہ مکہ کے لوگوں میں علانیہ تبلیغ کرتے تھے جبکہ حضرات ابو بکرؓ، عثمانؓ اور سعید بن زید وغیرہ لوگوں کو خفیہ طریقے سے دعوت دیتے تھے۔[۶۲] اگرچہ بلاذری ان پرجوش مبلغوں کی سرگرمیوں کے نتائج کی طرف واضح اشارہ نہیں کرتے تاہم یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہو گا کہ ان کی کوششیں خاصی کامیاب رہی تھیں۔ جدید مؤرخین میں سے بعض کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ بنو عدی، بنو سہم، بنو امیہ اور بنو تیم وغیرہ کے موالی اور حلفاء میں سے بہت سے حضرات اسی زمانے میں اسلام لائے تھے۔[۶۳] اس کے علاوہ متعدد قریشی خاندانوں کے بہت سے مکی مسلمانوں کے زمانۂ قبولِ اسلام کا تعلق بھی اسی مکی حیاتِ نبوی کے دورِ آخر سے تھا جیسے کہ ابن سعد کے مکی مسلمانوں کے سوانحی خاکوں سے علم ہوتا ہے۔[۶۴] اس ضمن میں اس روایت کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا جس کے مطابق حضرت ابو بکرؓ قریش مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر حبشہ ہجرت کر جانے کے لیے وطن سے نکلے تھے ہی کہ راستے سے ان کو قبیلۂ قارہ کا سردار ابن الدغنہ اپنی حفاظت و امان میں مکہ واپس لایا۔ امان کی شرط کے مطابق حضرت ابو بکرؓ نے کچھ دنوں تک تو نمازوں میں قرآن کریم کی تلاوت آہستہ آہستہ کی مگر طبیعت کی روانی پر وہ قابو نہیں پا سکے اور زور زور سے تلاوت کرنے لگے۔ رقیق القلب آدمی تھے، خود روتے اور اپنے سننے والوں کو رلاتے۔ پڑوسی کافروں نے ابن الدغنہ سے حضرت ابو بکرؓ کی شکایت کی کہ ان کی تلاوت و گریہ زاری سے ان کے اہلِ خانہ پر اثر پڑتا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے امان واپس کر دی مگر زور سے تلاوت کرنے سے باز نہیں آئے۔ اس روایت میں اگرچہ صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کی مسحور کن تلاوت کلامِ ربانی کا اثر پڑوسی غیر مسلم قریشیوں کے بیوی بچوں پر پڑتا تھا[۶۵] تاہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کفارِ قریش کو شکایت ان کی تلاوت کے سبب ان کے اہلِ خانہ میں تبلیغِ اسلام کے سبب زیادہ تھی۔ بہرحال یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ

مکہ میں اسلام کی اشاعت ہجرت مدینہ تک برابر جاری رہی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کی رفتار خاصی سست اور پہلے زمانے کے مقابلے میں کافی کم رہی ہو۔ مکی حیات نبوی کے نصف ثانی کے دوران مکہ میں اشاعت اسلام کی مثالیں ہم کو قریش کے مختلف بطون (خاندانوں) پر بحث میں ملیں گی۔

مکہ مکرمہ میں تبلیغ اسلام کا تیسرا دور ہجرت نبوی اور صلح حدیبیہ کا درمیانی زمانہ یعنی ۶۲۲ء اور ۶۲۸ء کا چھ سالہ درمیانی عرصہ ہے۔ ہمارا عموماً تاثر اس زمانے کے بارے میں بھی اس سے مختلف نہیں ہے جو مکی دور حیات کے نصف آخر کے بارے میں ہے۔ یہ تاثر صریح تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ ہجرت نبوی کے بعد نہ مکہ مسلمانوں سے تہی ہو گیا تھا اور نہ ہی قبول اسلام کی صلاحیت سے عاری۔ مسلمانان مکہ کی غالب اکثریت ضرور ہجرت کر گئی تھی لیکن اسلام نے مکہ سے ہجرت نہیں کی تھی۔ جدید مورخین نے ایک غلط فہمی یہ بھی عام کر دی ہے کہ ہجرت نبوی سے کچھ پہلے مکہ سے چند مسلمانوں کے سوا اور باقی سب مدینہ چلے گئے تھے۔(۶۶) حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج و اولاد مکہ ہی میں رہ گئی تھی۔(۶۷) اسی طرح خاندان صدیقی کے تمام مسلم اراکین نے ہجرت نبوی کے بعد مدینہ کے لیے رخت سفر باندھا تھا(۶۸) حضرات طلحہ و زبیر نے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہجرت کی تھی۔(۶۹) اس کے علاوہ متعدد اکابر صحابہ نے بعد میں مدینہ کو ہجرت کی تھی۔(۷۰) یہ تو مہاجرین مکہ کا معاملہ تھا۔ مکہ میں باقی ماندہ ابتدائی مسلمانوں میں حضرت نعیم بن عبداللہ النحام تیمی کا پورا گھرانہ تھا جو تقریباً چالیس افراد پر مشتمل تھا اور انھوں نے کافی مدت کے بعد مدینہ کے لیے رخت سفر باندھا تھا۔(۷۱) ان کے علاوہ مکہ میں اور بھی متعدد اور سربرآوردہ قریشی خاندانوں کے مسلمان ہجرت کے بعد مقیم رہے تھے اور ان کو اپنے خاندان والوں کا تحفظ حاصل تھا۔(۷۲) بہر حال کمزور مسلمانوں کی ثابت قدمی، تعذیب و ایذا پر صبر اور قید و حبس کے اندھیروں میں بھی عزیمت و صلابت نے اگر ایک طرف مکہ میں اسلام کی شمع روشن رکھی تھی تو دوسری طرف مذہب خداوندی کی اپنی تاثیر تھی۔ اس کی یہ تاثیر اور دلوں میں گھر کر جانے والی صلاحیت تو ایک تھی مگر اس کو قبول کرنے والوں کے طبائع مختلف تھے۔ قرآن کریم کے الفاظ و تشبیہ میں بارش کا پانی تو ایک اور اس کی قوت نشوونما یکساں ہوتی ہے مگر اس کو قبول کرنے والی مٹی کی طبیعت مختلف ہوتی ہے۔ نرم مٹی پانی فوراً جذب کر لیتی ہے۔ سخت مٹی قبول و جذب میں نسبتاً دیر لگاتی ہے اور چٹانیں اور پتھر اسے قبول کرنے سے یکسر انکار کر دیتے ہیں لیکن ان میں سے بھی بعض ایسے ہوتے ہیں جو اگر پانی روک لیں تو آہستہ آہستہ نم ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی اس کے مستقل اثر سے پھٹ بھی جاتے ہیں۔ اسلام کی بھی تاثیر یہی تھی جس نے مکہ کے سخت اور پتھر دلوں میں بھی دراڑیں پیدا کر دی تھیں۔ اس دور میں ایک اور عنصر بھی لوگوں کے قبول اسلام کا سبب بنا ہوگا اور وہ تھا قریش مکہ اور مسلمانان مدینہ کا مسلح تصادم اور مسلسل آویزش۔ مکہ کے بہت سے سمجھدار لوگوں نے اسلام و کفر کی اس آویزش میں بھی اسلام کی صداقت دیکھی تھی۔ ان میں سے جن لوگوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت عام کا تجربہ کیا تھا وہ بلاتکلف اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے تھے۔ وہب بن عمیر بن امیہ بن خلف جمحی اور(۷۳) ولید بن ولید بن مغیرہ مخزومی(۷۴) کا قبول اسلام اس زمانہ کی دو درخشاں مثالیں ہیں۔

صلح حدیبیہ قریش مکہ کے مکمل قبولِ اسلام کا دیباچہ تھی۔ ابنِ اسحاق وغیرہ قدیم ماخذ[۷۵] نے اس کو تبلیغ اسلام کا اہم ترین زمانہ قرار دیا ہے جب لوگ جوق در جوق اور شوق در شوق اسلام کی طرف از خود پروانہ وار آتے رہے تھے۔ ماخذ کے اس بیان کو عام جزیرہ نمائے عرب کے قبائل کے پس منظر میں تو دیکھنا ہی چاہئے مگر خاص طور سے اسے قریش کے پس منظر میں بھی دیکھنا ضروری ہے کہ ان کا اصل زور بطونِ قریش کے قبولِ اسلام پر ہے۔ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان دو برس ۶۲۸ء تا ۶۳۰ء کا مختصر وقفہ مکہ میں اشاعت اسلام کا چوتھا اور اہم مرحلہ تھا جب وہاں کا ہر سوچنے سمجھنے والا اور حق کو ماننے والا طبقہ اور فرد اسلام کے دائرے میں داخل ہو چکا تھا۔ ہمارے ماخذ عموماً بعض انتہائی اہم حضرات کے قبولِ اسلام کا ذکر اس زمانے میں کرتے ہیں۔ ابن سعد نے حضرات خالد بن ولید مخزومی، عمرو بن عاص سہمی اور عثمان بن طلحہ عبدری کے ایک ساتھ قبولِ اسلام کا ذکر کیا ہے۔[۷۶] مگر دوسرے ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات یزید و معاویہ فرزندان ابی سفیان بن حرب اموی[۷۷] اور نہ جانے کتنے دوسرے قریشی زعماء اور قائدین نے اسی زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ انفرادی اور اجتماعی قبولِ اسلام کی مثالیں ہم کو مختلف بطونِ قریش میں اشاعت اسلام کی بحث میں ملیں گی۔

فتح مکہ ۶۳۰ء جنوری، مکہ میں اسلام کی قبولیت کا نقطۂ عروج و کمال تھا۔ اسلامی ریاست کی دنیاوی جاہ و حشمت کے سائے میں مکہ کے قریشی اسلام کے دائرہ میں داخل ہو چکے تھے اور جو کچھ کسر رہ گئی تھی وہ رحمت نبوی، رافت احمدی اور عفو محمدی نے اپنے بے پایاں و بیکراں اظہارِ عنایت سے پوری کر دی تھی۔ مکہ۔ وہی مغرور و ظالم و ستمگر مکہ جس نے اللہ کا نام لینے کے جرم میں اللہ کے رسول اور مسلمانوں پر جینا حرام کر دیا تھا اور بالآخر ان کو جلا وطن کر کے چھوڑا تھا۔ اسی اللہ کا ماننے والا اور اس کے رسول کا چاہنے والا بن چکا تھا۔ اور قریش کے وہی زعماء اور قائدین جو اسلام کا چراغ بجھانے کی ہر ممکن کوشش کر چکے اور ناکام رہ چکے تھے اب اسی دین کی خاطر خدا کے گھر کو بتوں سے پاک کر رہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ عرب کے چپے چپے پر قائم کفر کے مرکزوں اور خدا ناترسی اور ناشناسی کے اداروں کو اپنے ہی ہاتھوں خاک میں ملا رہے تھے۔ وہ سالاران قریش جنہوں نے بدر، احد، خندق اور دوسری متعدد جنگوں اور آویزشوں میں اسلام سے ٹکر لی تھی اب وہی اس کی حفاظت و اشاعت کے لیے کبھی حنین و طائف کے معرکوں میں سرگرم کارزار تھے اور کبھی تبوک اور دومہ کے صحراؤں میں اسلام کے علمبردار تھے۔ قریش کے وہی سردار و شیوخ جو اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں اب تک رکاوٹیں پیدا کرتے رہے تھے اب خود اس کے مبلغ اور داعی بن چکے تھے اور سب کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔[۷۸]

مکہ میں اشاعت اسلام کے اس عمومی جائزے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے مختلف خاندانوں (بطون) کے قبولِ اسلام کا الگ الگ تجزیہ کیا جائے۔ اس سے ایک طرف تو یہ حقیقت عیاں ہوگی کہ مکہ میں اسلام کی اشاعت قبائلی خطوط پر نہیں ہوئی تھی اور اس میں قبائلی خاندانی رقابت و عصبیت کو دخل نہیں تھا اور دوسری طرف قریش کے ہر بطن (خاندان) کا اسلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رویہ و سلوک بھی اجاگر ہوگا۔ یہ ایک بین سماجی حقیقت ہے کہ افراد کا اپنے اپنے خاندانوں میں خاص کر اور اپنے علاقے کے سماج میں عام طور سے ایک مقام اور

اثر ہوتا ہے اور سربرآوردہ اور اہم افراد ہی عموماً کسی سماجی اور تہذیبی تحریک کی داغ بیل ڈالتے ہیں اور اس کو پروان چڑھاتے ہیں۔ اس لیے بھی یہ تجزیہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس تجزیے سے مکہ میں اسلام کی اشاعت کی تاریخی توقیت بھی متعین کرنے میں مدد ملے گی اور ان سب سے بڑھ کر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی کارنامے کا خاص کر اور مدنی عہد میں مکہ پر اپنے اثرات کا عام طور سے صحیح جائزہ لینے اور اس کی اصل قدر و قیمت متعین کرنے کا تاریخی فریضہ بھی پورا کیا جا سکے گا۔

اس جائزے سے پہلے بعض اہم نکات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ اول یہ کہ کہنے کو قریش ایک قبیلہ تھا اور اس کے متعدد خاندان تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ بطون یا خاندان بجائے خود قبیلے بن چکے تھے اور ان خاندانوں کی اپنی ذیلی شاخیں اور گھرانے تھے چنانچہ اس جائزے میں ان بطون کی مختلف شاخوں اور گھرانوں کو مدِنظر رکھ کر بحث کی گئی ہے تاکہ قبائلی اور خاندانی عصبیت یا حمایتِ اسلام کا بھی لگے ہاتھوں تجزیہ ہوتا رہے، دوم یہ کہ اس جائزے میں مختلف بطونِ قریش کی ترتیب عہدِ نبوی کے مکی دور میں ان کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی و تہذیبی اہمیت کے مطابق کی گئی ہے۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعثتِ نبوی کے زمانے (٩) میں اور اس کے بعد فتح مکہ تک قریش کا سب سے بڑا اور ہر لحاظ سے اہم ترین بطن " بنو عبد مناف " کا تھا جو چار اہم بطون / خاندانوں ۔ بنو امیہ / بنو عبد شمس، بنو ہاشم، بنو مطلب اور بنو نوفل ۔ پر مشتمل تھا۔ اگرچہ ان چاروں " برادر " خاندانوں میں اپنے اندرونی اختلافات تھے لیکن یہ اختلافات ان کے اتحادات سے کہیں کم تھے۔ وہ تمام اجتماعی معاملات میں اور قریشِ مکہ کے دوسرے بطون یا قبائلِ عرب سے تعلقات کے ضمن میں بطور ایک سماجی اکائی کے کام کرتے تھے۔ بنو عبد مناف میں ہر لحاظ سے بنو عبد شمس کو اہمیت اور فوقیت حاصل تھی اور ان میں بھی خاص کر ان کے ذیلی گھرانے بنو امیہ کو۔ اسی بنا پر بنو امیہ سے دراصل تمام بنو عبد شمس مراد لیے جاتے تھے۔ بنو ہاشم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک خاص کر ۵۷۸ء میں عبد المطلب بن ہاشم کی وفات کے بعد سماجی، اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے پسماندہ ہو گئے تھے جبکہ باقی اور دو خاندان یا تو اپنا سماجی مقام کھو رہے تھے یا کھو چکے تھے اور زیادہ اہم نہیں رہ گئے تھے لیکن آغازِ بحث ہم بنو ہاشم ہی سے کر رہے ہیں کہ یہی رسولِ کریم محمد بن عبداللہ ہاشمی صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان تھا اور بنو ہاشم کو آپ کی نسبت ولادت سے جو شرف حاصل تھا وہ اوروں کو حاصل نہیں تھا۔

(١) بنو عبد مناف

(الف) بنو ہاشم

بلاریب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف خاندان بنی ہاشم کے بلکہ سارے جزیرہ نمائے عرب کے اولین

مسلم تھے۔ آپ کے بعد یہ سعادت آپ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ بنت خویلد کے حصہ میں آئی تھی جو اگرچہ قبیلہ و خاندان کے لحاظ سے بنو اسد کی فرد تھیں تاہم شادی کے بعد عملی طور سے بنو ہاشم کی رکن بن چکی تھیں۔ عربوں کی قبائلی روایات کے مطابق عموماً اور اصولاً بیویاں اپنے خاوندوں کے خاندان کی رکن سمجھی جاتی تھیں۔ اسی طرح موالی اور حلیف بھی اپنے سرپرستوں یا آقاؤں کے خاندان ہی کے افراد شمار ہوتے تھے چنانچہ حضرت زید بن حارثہ کلبی کے علاوہ حضرات ابو رافع، صالح شقران، ابو کبشہ اور انسہ اور غالباً کچھ اور موالی بھی بنو ہاشم اور اہل بیت رسول کے مکی مسلمان تھے۔ حضرت زید تو تیسرے یا چوتھے مسلم تھے جبکہ باقی حضرات کے بارے میں حتمی بیان نہیں ملتا تاہم یہ بات یقینی ہے کہ وہ سابقین اولین میں شمار ہوتے تھے۔ اہل بیت کرام میں آپ کی چار بنات اطہر۔ حضرت زینب، حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم، حضرت فاطمہ۔ بھی ابتدائی مکی دور کی مسلم تھیں۔ آپ کی کوئی اولاد نرینہ مکہ میں زیادہ دنوں زندہ نہیں رہی ورنہ ان کا بھی شمار ان مسلمانوں میں ہوتا۔ خاندانِ رسول کے موالی میں حضرت زید بن حارثہ کلبی کی زوجہ محترمہ حضرت ام ایمن بھی قدیم ترین اسلام لانے والوں میں تھیں۔ ان دونوں کے فرزند حضرت اسامہ بن زید کلبی پیدائشی مسلم تھے۔ امکان یہ ہے کہ خاندانِ رسول میں ان کے علاوہ بھی کچھ اور حضرات و خواتین مکی مسلم تھے۔ بہرحال موجودہ معلومات کے مطابق کم از کم پندرہ مسلمان خاندان رسالت مآب کے ایسے تھے جو مکی دورِ حیات کے آغاز ہی میں اسلام سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔(۸۰)

خاندانِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یعنی اہلِ بیت کرام کے علاوہ بنو ہاشم میں آپ کے چچاؤں کے گھرانے تھے ان میں ابو طالب بن عبد المطلب ہاشمی کا گھرانہ سب سے نمایاں تھا اور مدتوں تک وہ اپنے بانی خاندان کی نسبت سے طالبی خاندان یا طالبیین کہلاتا رہا۔(۸۱) سربراہ خاندان کے اسلام کے بارے میں روایات کے باوجود قدیم و جدید مورخین کا اتفاق ہے کہ وہ شرف اسلام سے محروم رہے تھے۔ اگرچہ انھوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی و نجی محبت میں پورے قریش مکہ سے لوہا منوا لیا تھا۔(۸۲) جس شرف سے محروم رہے اس سے ان کے خاندان کے دو افراد اولاً بہرہ یاب ہوئے۔ یہ حضرات علی بن ابی طالب(۸۳) اور جعفر بن ابی طالب تھے۔(۸۴) موخر الذکر کی زوجہ محترمہ حضرت اسماء بنت عمیس خثعمی بھی قدیم مکی مسلمان تھیں۔ انھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کی تھی۔(۸۵) جب کہ حضرت علی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ مکہ میں مقیم رہے تھے۔ دوسرے فرزندانِ ابی طالب میں فرزندِ اکبر طالب کی موت کفر ہی میں ہوئی تھی(۸۶) جبکہ تیسرے فرزند عقیل بن ابی طالب نے صلح حدیبیہ کے بعد کسی وقت یا فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کر لیا تھا۔(۸۷) یہ دلچسپ بات ہے کہ ابی طالب کی زوجہ مقدسہ حضرت فاطمہ بنت اسد بن ہاشم نے مکہ ہی میں کسی وقت غالباً ابو طالب کی وفات کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا اور بعد میں مدینہ کو ہجرت بھی کی تھی۔(۸۸) ان کے فرزند عقیل کی اہلیہ فاطمہ بنت عتبہ بن ربیعہ اموی / عبد شمسی نے بھی غالباً اپنے شوہر کے ساتھ اسلام کا شرف حاصل کیا تھا۔(۸۹) ابو طالب کی بعض دختروں کے قبولِ اسلام کے بارے میں بھی روایات ملتی ہیں۔ ان میں سے ام ہانی نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا۔(۹۰)

ابو لہب بن عبد المطلب ہاشمی نے اسلام کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی اور اس نے اسلام کبھی قبول نہیں کیا

اس دشمنِ اسلام اور رسول کے دو فرزندوں حضرات عتبہ اور عتیبہ نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کر لیا تھا اور غالباً ان کی تمام اولاد و اخلاف نے بھی[۹۱]

بنو ہاشم کا تیسرا گھرانہ عباسی تھا جس کے سربراہ حضرت عباس بن عبد المطلب نے غالباً فتح مکہ سے کچھ قبل یا صلح حدیبیہ کے کچھ بعد اسلام قبول کیا تھا۔ اگرچہ بعض روایات ان کو مکی عہد کا قدیم مسلم ثابت کرتی ہیں لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ وہ غزوۂ بدر تک مسلمان نہیں ہوتے تھے۔[۹۲] ان کے صحیح زمانۂ قبول کا ہم کو حتمی علم نہیں ہے کیونکہ ماخذ اس سلسلے میں کسی متعین تاریخ کا ذکر نہیں کرتے ہیں حضرت عباس کے فرزندانِ گرامی مکی عہد میں کمسن تھے اور غالباً وہ بھی اسلام کے دائرے میں اپنے والد نامدار کے ساتھ داخل ہوئے تھے ان میں حضرات فضل، قثم، عبداللہ، عبیداللہ اور معبد وغیرہ شامل تھے۔ اسی طرح حضرت عباس ہاشمی کی دختروں میں ام حبیب حضرت آمنہ اور حضرت صفیہ بھی غالباً بعد کے زمانے کی مسلمان تھیں۔[۹۳] یہ ہاشمی گھرانہ مکی دورِ حیات میں اسلام سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ اور ان کا زمانۂ قبولِ اسلام بدر اور فتحِ مکہ کے درمیان متعین کیا جا سکتا ہے جبکہ زیادہ تر حقائق آخری زمانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

لیکن بنو ہاشم کا چوتھا گھرانہ ابتدائی عہد کا مسلم تھا۔ یہ تھا حضرت حمزہ بن عبد المطلب ہاشمی کا خاندان، حضرت حمزہ نے دارِ ارقم میں قیامِ نبوی کے زمانے میں سنہ ۶ نبوی میں اسلام قبول کیا تھا۔[۹۴] ان کے خاندان کے دوسرے افراد کے اسلام کے بارے میں ہمارے ماخذ خاموش ہیں۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ حضرت حمزہ کی اہلیہ غالباً اسلام نہیں لائی تھیں یا لائی تھیں اور ہجرت سے قبل وفات پا چکی تھیں کیوں کہ ان کی ایک صاحبزادی حضرت امامہ بنتِ حمزہ فتح مکہ کے دن بھی کافی کم عمر تھیں اور غالباً ہجرت سے کچھ قبل مکہ ہی میں پیدا ہوئیں اور وہیں رہ گئی تھیں۔ وہ غزوۂ عمرۃ القضاء (۶۲۹ء) میں حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمی کی تولیت میں دی گئی تھیں کیونکہ ان کی ماں سلمیٰ بنتِ عمیس خثعمی حضرت جعفر کی اہلیہ حضرت اسماء کی حقیقی بہن اور حضرت امامہ کی خالہ تھیں۔[۹۵] حضرت حمزہ بن عبد المطلب کی کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ البتہ ان کے موالی بنو غنی ابتدائی مکی مسلم تھے۔ عموماً ان میں سے صرف دو باپ بیٹوں ابو مرثد اور مرثد غنوی کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن ابن اثیر نے ابو مرثد غنوی کے دو مزید قدیم الاسلام فرزندوں حضرات انس اور انیس کا بھی ذکر کیا ہے۔[۹۶] یہ یقینی ہے کہ ان کے علاوہ بھی اس خاندان کے کچھ اور افراد بھی ابتدائی مسلمینِ مکہ میں شامل تھے۔

بنو حارث بن عبد المطلب ہاشمی کا گھرانا بنو ہاشم کا پانچواں اہم گھرانا تھا۔ اس کے سربراہ کی وفات غالباً بعثتِ نبوی سے قبل ہی ہو چکی تھی۔[۹۷] ابنِ سعد کا بیان ہے کہ ان کے ایک فرزند نوفل بن حارث نے بدر کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا مگر مدینہ کو ہجرت غزوۂ خندق کے بعد حضرت عباس بن عبد المطلب ہاشمی کے ساتھ کی تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندانِ بنی ہاشم کے ان دونوں چچا بھتیجے کے درمیان مواخاۃ قائم کر دی تھی۔[۹۸] لیکن یہ بیان بھی دوسرے تاریخی بیانات سے متصادم ہے اور صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ وہ ابتدائی مسلم رہے ہوں لیکن زیادہ امکان اس کا ہے کہ انھوں نے صلح حدیبیہ کے بعد یا فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ ان کے باقی تین بھائیوں ربیعہ، عبداللہ اور ابو سفیان فرزندانِ حارث بن عبد المطلب کے بارے میں ماخذ صراحت کرتے ہیں کہ انھوں نے فتح مکہ کے دن حلقہ بگوشِ اسلام بننا پسند کیا تھا۔[۹۹] حضرت ابو سفیان حارثی ہاشمی کے بارے میں روایات کا اتفاق ہے کہ وہ اپنے وقت کے اچھے شاعر تھے مگر اسلام کے دشمن۔ وہ بیس برس تک اسلام اور اس

کے پیغمبرِ عظیم کی ہجو کرتے رہے تھے لیکن فتح مکہ میں ایسے پکے جان نثارِ رسول بنے کہ غزوہ حنین کے اولیں دہلہ شکست میں جب اوروں کے پیر اکھڑ گئے تھے تو وہ ناقۂ رسول کی مہار تھامے دلیرانہ جمے رہے تھے۔ اس خاندان کے تین اور افراد حضرات جعفر بن ابی سفیان بن حارث، حارث بن نوفل بن حارث اور عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا۔[100] اس خاندان کی تمام کتخدا اور ناکتخدا صاحبزادیوں نے غالباً اپنے بزرگوں کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا۔ ان میں سے بعض پیدائشی مسلمان بھی تھیں۔[101] اولین مکی مسلمانوں میں حضرت ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب کی زوجہ محترمہ حضرت جمانہ جو ابوطالب کی دختر اور حضرت علی کی بہن تھیں اپنے شوہر سے قبل اسلام لاکر شامل ہوچکی تھیں اور ہجرت کرکے مدینہ آگئی تھیں۔ انہوں نے خیبر کی غنیمت کے خمس سے طعمۂ نبوی پایا تھا۔[102]

بنوہاشم کے بعض اور چھوٹے چھوٹے گھرانے تھے جو عبدالمطلب کے سوا ہاشم کے دوسرے بیٹوں کی نسل میں چلے تھے لیکن یہ گھرانے یا تو بعثتِ نبوی تک نابود ہوچکے تھے یا اتنے غیراہم کہ ان کی خاندانی حیثیت جاتی رہی تھی اور ان کے صرف افراد رہ گئے تھے۔[103]

بنوہاشم کی متعدد خواتین نے مکہ مکرمہ میں ہی اسلام قبول کرلیا تھا۔ ان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی پھوپھیاں تھیں جن میں حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب، حضرت امیمہ بنت عبدالمطلب نمایاں تھیں۔[104] باقی خواتین میں سے کافی نے ہجرت کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ جبکہ ام ہانی بنت ابی طالب جیسی خواتین بنی ہاشم نے فتح مکہ کے دن اسلام کے دائرے میں داخل ہونا پسند کیا تھا۔ خواتین کے سلسلے میں ذکر آچکا ہے کہ ان میں سے کتخداکو اصولاً ان کے خاوندوں کے خاندانوں میں شمار کیا جانا چاہئے جیسا کہ ہم بعض اوروں کے ضمن میں آگے چل کر دیکھیں گے۔

طبری کی روایت ہے کہ جب قرآن کریم کی آیت وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ (اور آپ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو دعوتِ حق دیں)، نازل ہوئی تو حکمِ الٰہی کی تعمیل میں آپ نے بنوعبدالمطلب کی ضیافت کا اہتمام کیا اور ان کو اسلام کی دعوت دی۔ اس مجلس میں بنوعبدالمطلب کے چالیس یا پینتالیس آزاد اور خودمختار، عاقل و بالغ، تجربہ کار و سن رسیدہ مرد اکٹھے ہوئے تھے۔[105] اس روایت سے خاندان بنی عبدالمطلب کی عددی طاقت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے مفروضہ کے مطابق صرف اسی خاندان کے کل افراد کی تعداد ۲۴۰ اور ۲۸۰ یا ۲۷۰ اور ۳۱۵ کے درمیان رہی ہوگی ایک موٹے سے اندازے کے مطابق بنوہاشم کی کل عددی قوت اس زمانے میں بشمول ان کے حلفاء اور موالی کے ۴۰۰ کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اگرچہ اس دعوت اولین میں صرف ایک کم عمر بچے نے جو کہ میزبان تھا اور مہمانوں یا مدعوئین میں سے نہ تھا اسلام قبول کرنے کا جراتمندانہ اعلان کیا تھا۔[106] مگر باقی نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا تھا بہرحال رفتہ رفتہ ایک ایک دو دو کرکے یا چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں ہاشمی قبولِ اسلام کرتے چلے گئے اور فتح مکہ کے بعد سب ہی اسلامی ریاست کے رکن اور اسلام کے پیرو تھے۔

اس تجزیے سے یہ حقیقت واشگاف طور پر عیاں ہوتی ہے کہ خاندان کی محبت میں کسی ہاشمی نے اسلام قبول نہیں

کیا تھا۔ ایک ہاشمی فرد کی حیثیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابو طالب اور ان کے خاندان والوں کی حمایت وحفاظت دراصل عربوں کے قبائلی نظام تحفظ کا اظہار تھا نہ کہ اسلام کی حمایت و دفاع۔ بنو ہاشم نے اسلام کی شدید ترین مخالفت بھی کی تھی اور حمایت بھی۔

(ب) بنو عبد شمس / بنو امیہ

دنیاوی جاہ وحشمت کے اعتبار سے بنو عبد مناف کا سب سے زیادہ طاقت ور، مالدار اور با اثر و عددی لحاظ سے اہم و اکبر قبیلہ، خاندان یا بطن بنو عبد شمس کا تھا۔ اس کی ایک اہم ترین شاخ بنو امیہ اتنی اہمیت اختیار کر گئی تھی کہ بنو عبد شمس عملاً بنو امیہ ہی سمجھے جانے لگے تھے۔[۱۰۷] عام خیال یہ ہے کہ بنو امیہ / بنو عبد شمس کو یہ سماجی، سیاسی اور اقتصادی بلند مقام ہاشم اور ان کے فرزند عبد المطلب کی وفات کے بعد حاصل ہوا تھا اور مکہ کی زمام سیادت کلی طور پر بنو امیہ کے ہاتھ ابو طالب ہاشمی کی وفات (۶۱۹ء) کے بعد آگئی تھی۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ بنو امیہ اور بنو ہاشم ایک دوسرے کے رقیب و حریف تھے۔[۱۰۸] یہ دونوں خیال خام اور ان پر تعمیر کردہ نتائج کی دنیا محض مفروضہ باطل ہے۔ اس موضوع پر مفصل بحث کہیں اور کی جا چکی ہے۔[۱۰۹] مختصراً یہ کہ دینا یہاں کافی ہوگا کہ عبد شمس کو ہاشم کی مانند اپنے باپ عبد مناف کی زندگی میں ہی برابر ہی کا مقام حاصل تھا اور باپ کے انتقال کے بعد اگر ہاشم کو سقایہ اور رفادہ کے عہدے ملے تھے تو عبد شمس کو قیادہ کا عظیم منصب ملا تھا اور اس طرح دونوں فرزندان عبد مناف مکی اشرافیہ کے برابر کے رکن اور مکی سماج میں یکساں عزت و توقیر کے حقدار بن گئے تھے۔ ہاشم کی نوعمری میں وفات اور ان کے بیشتر بچوں کے بچپن میں انتقال وغیرہ کے سبب ان کی نسل صرف بنو عبد المطلب میں جاری رہی۔ بقیہ فرزندوں کی نسل جلد ہی منقطع ہو گئی جب کہ عبد شمس کے متعدد فرزندوں سے ان کی نسل خوب خوب چلی اور اس کے نتیجے میں بعثت نبوی تک بنو عبد شمس کے اپنے متعدد بطون وجود میں آچکے تھے۔ کثرت تعداد نے جو قبیلوں کی اس زمانے میں امتیازی خصوصیت تھی بنو عبد شمس کو سیاسی اور سماجی عظمت و توقیر بخشی۔ اس کے علاوہ ان کی اقتصادی صلاحیتوں نے ان کو مکی اقتصادیات میں نمایاں ترین گروہ بنا دیا۔ ان اسباب سے بنو عبد شمس کو مکی سماج میں یہ سیادت و قیادت عہد قدیم سے حاصل تھی اور عہد نبوی میں برابر حاصل رہی۔ اس قیادت کو قائم رکھنے میں بنو عبد شمس کی اپنی صلاحیتوں اور لیاقتوں کے علاوہ کل خاندان بنو عبد مناف کی تائید و تصدیق اور اتحاد کی دولت حاصل تھی۔ گویا کہ بنو عبد شمس کی عظمت و ریاست بنو ہاشم کی عظمت و ریاست تھی۔ یہ دونوں بلکہ چاروں خاندان ایک دوسرے کے دوست، حلیف اور بھائی تھے نہ کہ رقیب، حریف اور مدمقابل۔[۱۱۰]

بعثت نبوی تک بنو عبد شمس کے متعدد خاندان، بطون یا گھرانے بجائے خود ایک سماجی اکائی بن چکے تھے۔ ان میں سب سے بڑا اور اہم ترین گھرانا بنو امیہ اکبر بن عبد شمس کا تھا جو بجائے خود متعدد گھرانوں پر مشتمل تھا۔ اس کی اہم شاخیں حسب ذیل تھیں۔

(۱) بنو ابی العاص بن امیہ اکبر — جس کی مزید دو ذیلی شاخیں تھیں (۱) بنو عفان (حضرت عثمان کا خاندان)، (ب) بنو

حکم (حضرت مروان بن حکم کا خاندان)

(۲) بنو حرب بن امیہ اکبر۔ اس کی تین اہم ترین شاخیں تھیں (ا) بنو ابو سفیان بن حرب (ب) بنو عتبہ بن ابی سفیان اور (ج) بنو عتیبہ بن ابی سفیان۔ ان کے علاوہ بھی بعض گھرانے اس میں شامل تھے۔

(۳) بنو ابی العیص ــ حضرت عتاب بن اسید کا گھرانہ۔

(۴) بنو ابی عمرو بن امیہ اکبر ــ دشمنِ رسول عقبہ بن ابی معیط وغیرہ کا خاندان۔

(۵) بنو عاص بن امیہ اکبر ــ ابو احیحہ سعید بن عاص کا گھرانا۔

ان کے علاوہ بنو امیہ اصغر کا گھرانا تھا جو پہلے کے مقابلہ میں یقیناً کافی چھوٹا تھا لیکن وہ اپنی جگہ خاصا بڑا گھرانا تھا ان دو اہم "اموی" خاندانوں کے بعد عبد شمس کے متعدد بیٹوں کے خاندان تھے جیسے بنو حبیب بن عبد شمس، بنو عبد امیہ بن عبد شمس، بنو نوفل بن عبد شمس، بنو ربیعہ بن عبد شمس اور بنو عبد العزیٰ بن عبد شمس۔ اول الذکر کے تین گھرانے ہو چکے تھے۔ بنو سمرہ بن حبیب، بنو ربیعہ بن حبیب اور بنو کریز بن حبیب، بنو ربیعہ بن عبد شمس کے دو افراد عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ مکی اشرافیہ کے بعثتِ نبوی کے اہم ترین ستون تھے جبکہ موخر الذکر، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے داماد حضرت ابو العاص بن ربیع کا گھرانا تھا (۱۱۱)

خاندان بنو عبد شمس کی اس صبر آزما تفصیل کے بعد یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے بارے میں ان کا رویہ بنو ہاشم یا کسی دوسرے خاندانِ مکہ اور بطنِ قریش کے رویہ سے مختلف نہ تھا۔ ان میں سے بعض نے اسلام کی بھرپور مخالفت کی تھی تو ان کے ہی افراد نے بھرپور حمایت بھی کی تھی۔ مکی عہد میں ان میں سے بعض خاندان اسلام سے بہرہ یاب نہیں ہوئے تھے جس طرح سے بنو ہاشم کے بعض گھرانے محروم رہے تھے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بنو ہاشم کے بعض گھرانوں کی مانند بعض اموی/ عبد شمسی گھرانوں نے بھی سبقت اسلام کی دولت پائی تھی۔ ان گھرانوں میں امیہ اکبر کے خاندان بنو ابی العاص اور بنو عاص تھے جب کہ عبد شمس کے دوسرے فرزندوں کے خاندانوں میں یہ سعادت بنو ربیعہ بن عبد شمس کے حصہ میں آئی تھی۔

خاندانِ بنی عاص بن امیہ اکبر میں ابو احیحہ سعید بن عاص کا گھرانا اپنی دولت و ثروت، شرافت و نجابت اور سیادت و ریاست کے لیے مکہ بھر میں ممتاز ترین سمجھا جاتا تھا اور اس کے سربراہ خاندان کو انتہائی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔[۱۱۲] اسی "خاندان سعیدی" کے ایک فرد حضرت خالد بن سعید اموی غالباً اولین اموی مسلم تھے اور روایات کے مطابق ان کا سلسلہ صحابہ سابقین اولین میں تیسرا یا چوتھا نمبر تھا۔[۱۱۳] یہ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور بعض جدید مؤرخین اسی کے حق میں ہیں۔ بہر حال یہ حتمی و یقینی امر ہے کہ وہ پہلے دس مکی مسلمانوں میں شامل تھے۔ ان میں سے ایک بھائی عمرو بن سعید نے غالباً ان کے اثر سے مکی عہد کے نصف اول کے آغاز ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔[۱۱۴] یہ دونوں بھائی اپنے والد اور دوسرے بھائیوں اور خاندان والوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے تھے اور ابن اسحاق کے بقول اپنی دونوں بیویوں

بالترتیب امینہ بنت خلف خزاعی اور فاطمہ بنت صفوان مدلجی کنانی کے ہمراہ حبشہ ہجرت کر گئے تھے۔ حضرت خالد بن سعید کی کم از کم دو اولادیں حضرت سعید اور حضرت امہ حبشہ میں پیدا ہوئی تھیں۔[115] غالباً حضرت عمرو بن سعید کی اولادیں بھی مکہ، حبشہ یا مدینہ میں پیدا ہوئی تھیں سربراہ خاندان ابو احیحہ سعید بن عاص کا بدر کے بعد کسی وقت بحالتِ کفر انتقال ہوا تھا جب کہ ان کے دو فرزندوں ابان بن سعید اور حکم (عبداللہ) بن سعید نے صلح حدیبیہ کے بعد یا فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ حسنِ اتفاق سے یہ چاروں بھائی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے اس لیے انھوں نے اسلامی ریاست کے چار مختلف ولایتوں پر بطورِ والی (گورنر) حکمرانی عہدِ نبوی ہی میں کی تھی۔ اگرچہ ہمارے متداول مآخذ اس خاندان کے متعدد دوسرے اراکین خاص کر ان کی عورتوں کے قبولِ اسلام کا ذکر نہیں کرتے تاہم انساب و سوانح کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندانِ سعیدی میں اور بھی متعدد ابتدائی مکی عہد کے اور بعد کے زمانے کے تھے۔ ان میں ابو احیحہ سعید کے ایک فرزند سعید غزوۂ طائف میں شہید ہوئے تھے۔[116] اس خاندان کی دختروں میں ایک فاختہ بنت سعید تھیں جو بعد میں رسول اکرم کے بڑے داماد حضرت ابو العاص بن ربیع کی بیوی بنیں اور انہی سے ان کی نسل چلی۔[117]

خاندانِ بنی ابی العاص کے قدیم ترین مسلمان حضرت عثمان بن عفان اموی تھے جو دار ارقم میں قیامِ نبوی سے قبل اسلام لائے تھے اور بقولِ ابن اسحاق پہلے آٹھ مسلمانوں میں سے تھے۔ وہ اپنے حقیقی چچا حکم بن ابی العاص اموی کے ہاتھوں ستائے گئے تھے اور تنگ آکر اپنی اہلیہ حضرت رقیہ بنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۵ھ نبوی میں ہجرت حبشہ کے لیے وطن سے نکل گئے مگر پھر کچھ مدت کے بعد مکہ والوں کے قبول اسلام کی خبر سن کر واپس مکہ آگئے تھے جہاں ہجرت مدینہ تک وہ دونوں مقیم رہے۔[118] حضرت عثمان کے دوسرے بھائی بہنوں کے قبولِ اسلام کے بارے میں مآخذ خاموش نظر آتے ہیں۔[119] البتہ ان کی والدہ ماجدہ حضرت اروی بنت کریز ابتدائی مکی مسلم تھیں۔[120] اور ان کی ایک اموی اہلیہ حضرت رملہ بنت شیبہ بن ربیعہ ابتدائی مکی مسلمان، مہاجرہ مدینہ تھیں۔[121] ان کے چچا حکم بن ابی العاص کے خاندان نے فتح مکہ میں اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت حکم کے علاوہ ان کے فرزند حضرت مروان بن حکم صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ عموماً اس خاندان کے انہی دو کے قبولِ اسلام کا ذکر ملتا ہے۔[122] لیکن یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں میں مزید مرد اور عورت افراد تھے جو فتح مکہ کے زمانے میں داخلِ اسلام ہوئے تھے۔[123] البتہ ان کے ایک مولیٰ حضرت صبیح ابتدائی مکی مسلمان تھے جن کا تعلق حضرت خالد بن سعید اموی کے خاندان سے تھا۔[124]

بنو ربیعہ بن عبد شمس کی قسمت میں سبقتِ اسلام کا شرف لانے والے حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ تھے۔ وہ تیسرے اہم اموی مکی مسلمان تھے جو نہ صرف آغازِ اسلام میں مسلمان ہوئے تھے بلکہ مکہ میں اپنوں ہی کے ہاتھوں ستائے جانے کے سبب اپنی زوجہ محترمہ حضرت سہلہ بنت سہیل عامری کے ساتھ حبشہ ہجرت کر گئے تھے مگر کچھ دنوں بعد مکہ واپس آئے تھے اور پھر مدینہ ہجرت کی تھی وہ بدری صحابی تھے۔[125] ان کے خاندان میں ان کی ایک عم زاد بہن کے علاوہ اور کسی کے فتح مکہ سے قبل قبولِ اسلام کا ذکر نہیں ملتا البتہ ان کے ایک مولیٰ حضرت سالم تھے جو بالکل آغاز میں مسلمان ہوئے تھے اور قدیم مہاجر تھے اور بدری تھے۔[126] غالباً موخر الذکر کا اپنا خاندان بھی تھا جو آغاز ہی میں مسلمان ہو گیا تھا۔

مآخذ کا اصرار ہے کہ بنو حرب بن امیہ کا کسی فرد نے مکی عہد میں اسلام قبول نہیں کیا تھا تاہم ان کو اعتراف ہے کہ اس

خاندان سفیانی کی ایک خاتون حضرت ام حبیبہ جو ابو سفیان بن حرب کی دختر تھیں ابتدائی مسلمان تھیں اور اپنے شوہر عبیداللہ بن جحش / بنو غنم بن دودان کے ساتھ حبشہ کو ۶ نبوی میں ہجرت کر گئی تھیں۔ حبشہ میں جب ان کے شوہر عیسائی ہو گئے تو وہ اسلام پر ثابت قدم رہیں اور بالآخر غالباً اسی ثبات قدمی کے سبب وہ ۷ھ / ۶۲۹ء میں ام المومنین بن کر مدینہ واپس آئیں۔[۱۲۷] عام عقیدہ یہ ہے کہ اس خاندان کے مردوں نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا مگر یہ صحیح نہیں ہے بعض قوی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابو سفیان بن حرب کے دو فرزندوں حضرات یزید اور معاویہ صلح حدیبیہ کے بعد غالباً عمرۃ القضیہ کے موقع پر مسلمان ہو گئے تھے[۱۲۸] اور ان کے ساتھ غالباً ان کے اہل خانہ بھی حضرت ابو سفیان بن حرب اپنی زوجہ حضرت ہند بنت عتبہ بن ربیعہ اور دوسرے فرزندوں عتبہ اور عتیبہ وغیرہ کے ساتھ فتح مکہ کے زمانے میں اسلام لائے تھے۔[۱۲۹]

یہ حیرت کی بات ہے کہ ابو سفیان بن حرب اور ان کے خاندان کے تمام ارکان مکی عہد میں دائرۂ اسلام سے خارج رہے مگر ان کے بنو غنم بن دودان کے تمام حلیف جن کی تعداد چالیس بالغوں پر مشتمل تھی ابتداء کار ہی میں مسلمان ہو گئے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ ان کے قبول اسلام کا زمانہ مکی حیات نبوی کا دور آخر ہے۔ بہر حال کوئی زمانہ رہا ہو وہ سابقین اولین میں تھے اور ان میں بعض مہاجرین حبشہ میں بھی شریک تھے اور بقیہ مہاجرین مدینہ اور بدری صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ابن اسحاق[۱۳۰] اور ابن سعد[۱۳۱] نے ان کے تیئیس مردوں کے نام گنوائے ہیں جو یہ ہیں:

(۱) عبداللہ بن جحش (۲) ان کے بھائی ابو احمد (۳) عبداللہ کے فرزند محمد (۴) عکاشہ بن محصن (۵) شجاع بن وہب (۶) ان کے بھائی عقبہ (۷) اربد بن حمیرہ (۸) منقذ بن نباتہ (۹) سعید بن رقیش (۱۰) یزید بن رقیش (۱۱) عبدالرحمن بن رقیش (۱۲) محرز بن نضلہ (۱۳) قیس بن جابر (۱۴) عمرو بن محصن (۱۵) مالک بن عمرو (۱۶) صفوان بن عمرو (۱۷) ثقف بن عمرو (۱۸) ربیعہ بن اکثم (۱۹) زبیر بن عبید (۲۰) تمام بن عبیدہ (۲۱) سنجرہ بن عبیدہ (۲۲) ابو سنان بن محصن (۲۳) سنان بن ابی سنان۔

ابن اسحاق نے ان کی خواتین کے صرف آٹھ نام گنائے ہیں جو یہ ہیں: (۱) زینب بنت جحش (۲) ان کی بہن ام حبیب (۳) جذامہ بنت جندل (۴) ام قیس بنت محصن (۵) ام حبیب بنت ثمامہ (۶) آمنہ بنت رقیش (۷) سخبرہ بنت تمیم اور (۸) حمنہ بنت جحش۔[۱۳۲] اس طرح بنو حرب بن امیہ کے حلفاء بنی غنم بن دودان کے کل ابتدائی مسلمانوں کی تعداد ۴۱ ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ بجائے خود اہم تعداد ہے تاہم ماخذ کے مطابق اس میں مزید نو بالغوں کے نام شامل ہونے چاہئیں۔ ان کے بچوں میں سے کسی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحش وغیرہ کی والدہ ماجدہ حضرت امیمہ بنت عبدالمطلب ہاشمی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ابتدائی مکی عہد کی مسلم پھوپھی تھیں۔[۱۳۳] اندازہ یہ ہے کہ حلفاء بنی حرب بن امیہ کے ابتدائی مسلمانوں کی تعداد ڈھائی تین سو کے درمیان تھی۔ اسی طرح بنو امیہ کے ایک اور حلیف حضرت معیقیب بن ابی فاطمہ دوسی تھے جو بعض روایات کے مطابق مکہ کے قدیم مسلم تھے اور ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے اور بعض دوسری روایات کے مطابق وہ مکہ سے واپس اپنے قبیلہ دوس چلے گئے تھے۔ اور وہاں تبلیغ اسلام کرتے رہے تھے[۱۳۴]

خانوادۂ بنی ابی عمرو بن امیہ اکبر کے مکی سردار عقبہ بن ابی معیط اموی نے نہ صرف اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ وہ ابولہب ہاشمی اور ابوجہل مخزومی کی مانند اسلام اور پیغمبرِ اسلام کا تیسرا سب سے بڑا دشمن تھا۔ وہ اپنے جنگی جرائم کے سبب غزوۂ بدر میں قتل کر دیا گیا تھا۔[۱۳۵] اسی دشمنِ اسلام کی جراٗت مند اور دلیر دختر حضرت ام کلثوم بنت عقبہ اموی نے بعد ہجرت کسی وقت اسلام قبول کر لیا تھا اور صلح حدیبیہ کے معاہدے کے فوراً بعد دلیرانہ ہجرت کر کے مدینہ پہنچی تھیں۔ عقبہ اموی کے تین صاحبزادوں حضرت ولید، خالد اور عمارہ نے عام روایات کے مطابق فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا لیکن اس امکان سے یکسر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اپنی بہن کی متابعت میں کچھ پہلے اسلام قبول کر لیا ہو۔[۱۳۶] یہ اس خاندان کے اہم ترین افراد کے قبولِ اسلام کا ذکر تھا۔ امکان قوی ہے کہ اور دوسروں نے بھی اسلام قبول کیا ہو۔[۱۳۷] بہر حال یہ تاریخی حقیقت ہے کہ عقبہ اموی کا گھرانا ہجرت کر کے مدینہ جا بسا تھا۔

بنو عبد العزیٰ بن عبد شمس کے ایک اہم رکن حضرت ابو العاص بن ربیع تھے۔ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد اور دخترِ رسول حضرت زینب کے شوہر ہونے کے علاوہ حضرت خدیجہ کی بہن کے فرزند بھی تھے۔ روایات کے مطابق انھوں نے سنہ ۶ھ / ۶۲۸ء میں صلح حدیبیہ سے قبل اسلام قبول کر کے مدینہ کو ہجرت کی تھی۔ ان کی ایک صاحبزادی حضرت امامہ بنت ابی العاص اموی مکی عہد کی پیدائشی مسلمان تھیں۔[۱۳۸] ان کے سوا باقی گھرانا فتح مکہ کے زمانے میں اسلام لایا تھا۔

بنو ابی العیص میں حضرت عتاب بن اسید اموی ممتاز مسلمان تھے جو فتح مکہ کے دن اپنے خاندان والوں کے ساتھ اسلام لائے تھے۔ وہ قبولِ اسلام کے چند دنوں کے بعد ہی اسلامی ریاست کی طرف سے مکہ کے گورنر مقرر ہوئے تھے۔ اگرچہ وہ نوجوان اور متاخر مسلمان تھے۔[۱۳۹] زبیری نے ان کے ایک بھائی خالد بن اسید کا ذکر کیا ہے جن کا کافی بڑا گھرانا تھا۔[۱۴۰]

بنو عبد شمس اور بنو امیہ کے باقی گھرانے اور افراد زیادہ تر فتح مکہ کے زمانے میں اسلام میں داخل ہوئے تھے۔[۱۴۱] امکان ہے کہ ان میں سے کچھ حضرات و خواتین کچھ پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے ہوں لیکن اس کا ثبوت تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ پھر بھی ان میں سے حضرات ابوکیسہ حارث بن کریز، عامر بن کریز، عبد اللہ بن عامر اور عبد الرحمٰن بن سمرہ وغیرہ عظیم صحابہ کا ذکر مل ہی جاتا ہے۔

اگر خاندانِ بنی ہاشم اور خاندانِ بنی امیہ کے قبولِ اسلام کا ایک تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس میں بڑی حیرت انگیز مماثلت نظر آئے گی اور واضح ہو گا کہ "خاندانِ بنو عبد مناف" کے ان دو برادر گھرانوں اور ان کے افراد نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے ساتھ یکساں رویہ اپنایا تھا۔ اگر چند ہاشمیوں نے سبقتِ اسلام اور حمایتِ رسول کا شرف حاصل کیا تھا تو بعینہٖ یہی شرف چند امویوں نے بھی حاصل کیا تھا۔ اگر کچھ ہاشمیوں نے مکہ میں راہِ خدا میں تکلیفیں اٹھائی تھیں اور حبشہ ہجرت کی تھی تو امویوں نے بھی یہی قربانیاں دی تھیں۔ اگر ابوسفیان بن حرب اموی اور عقبہ بن ابی معیط اموی نے اسلام کی مخالفت کی تھی تو عنادِ اسلام و مخالفتِ رسول میں ابولہب ہاشمی اور ابوسفیان بن حارث ہاشمی کسی سے پیچھے نہیں

رہے تھے۔ دونوں خاندانوں کے کچھ افراد نے مکہ میں سبقتِ اسلام کا شرف حاصل کیا پھر ہجرتِ مدینہ کے بعد ان کے افراد اسلام قبول کرتے رہے تا آنکہ فتح مکہ کے دن وہ سب کے سب اسلام کے علمبردار بن گئے۔ اگرچہ ہمارے پاس آبادی کے اعداد و شمار نہیں ہیں تاہم ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وفاتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پچاس سال بعد صرف مدینہ میں امویوں کی تعداد ایک ہزار سے متجاوز تھی۔[١٤٢] اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فتح مکہ کے دن خاندانِ بنو عبد شمس / بنو امیہ کے کل افراد کی تعداد ایک ہزار دو ہزار افراد کے درمیان یقیناً تھی۔

(ج) بنو المطلب

بنو عبد مناف میں ہاشم اور عبد شمس کے بعد قریشی سرداروں میں جن کو ممتاز مقام حاصل تھا۔ ان میں مطلب بھی تھے اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاشم کی موت کے بعد بنو ہاشم اور بنو مطلب کی مشترکہ قیادت موخر الذکر کے سربراہ خاندان کے ہاتھ میں رہی تھی کیونکہ ہاشم کے تمام فرزند بہت خورد سال تھے[١٤٣]۔ اسی طرح مطلب کی وفات کے بعد ان کے خاندان میں کوئی ایسی شخصیت نہیں ابھری جو خاندانی قیادت کی ذمہ داری سنبھال سکتی چنانچہ اس بار عبد المطلب ہاشمی نے اپنے خاندان کے علاوہ اپنے عزیز و مشفق چچا کے خاندان کی کفالت و قیادت کی ذمہ داری انجام دی[١٤٤]۔ یہی تاریخی عوامل تھے جنہوں نے ان دونوں خاندانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر بلکہ ایک دوسرے کا حلیف، دوست اور برادر بنا دیا تھا اور بنو عبد مناف میں بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب دوسروں کی بہ نسبت زیادہ باہمی الفت و یگانگت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ بنو مطلب اقتصادی لحاظ سے بنو ہاشم اور بنو عبد مناف کے دوسرے گھرانوں کے دست نگر بھی تھے[١٤٥]۔ عددی قوت کے لحاظ سے بنو مطلب کا گھرانا بنو ہاشم سے بھی کافی چھوٹا تھا[١٤٦]۔ اور اس کے فروتر سماجی مقام کا ایک سبب یہ بھی تھا۔

بہر حال مکی سماج و اقتصادیات میں بنو مطلب کو امتیاز و تفوق حاصل رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن قبولِ اسلام میں ان کو شرفِ اولیت اور عظمتِ سبقت ضرور حاصل تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک پورا گھرانا بنو حارث بن مطلب آغازِ عہدِ مکہ ہی میں مسلمان ہو گیا تھا چنانچہ اس کے تین اہم ارکان حضرات عبیدہ بن حارث بن مطلب اور ان کے دو بھائیوں طفیل اور حصین کا شمار قدیم ترین مکی مسلمانوں میں ہوتا ہے[١٤٧]۔ حضرت عبیدہ ان معدودے چند قدیم مسلمانوں میں سے ایک تھے جن کی عمر قبولِ اسلام کے وقت پچاس سے متجاوز تھی۔[١٤٨] مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دس اولادیں تھیں جن میں سے چھ بیٹے تھے اور وہ سب کے سب مسلمان تھے۔[١٤٩] ہمارے بعض مورخین کا خیال ہے کہ ان کی تمام اولادیں کم عمر اور نابالغ تھیں مگر یہ صحیح نہیں ہے۔[١٥٠] پچاس سال کی پختہ عمر کے عرب کی اولادیں خاص کر پہلی اولادیں جوان اور بالغ ہوتی تھیں۔ ان کے دونوں بھائیوں کی اولادیں بھی تھیں اور وہ سب بھی مسلمان تھیں۔ مآخذ سے اگرچہ اس کی مکمل تصریح نہیں ملتی ہے[١٥١]۔ یہ تینوں بھائی مہاجرین مدینہ میں اولیت رکھتے تھے اور بدری صحابہ ہونے کا شرف بھی۔ قیاس کہتا ہے کہ ان کا پورا خاندان ابتدائی مکی مسلم تھا اور ان کے سب مرد، عورتیں اور بچے ہجرت کرکے مدینہ جا بسے تھے۔[١٥٢]

اس خاندان کا ایک ذیلی گھرانا عباد بن مطلب کا تھا۔ اس کے اولین مسلم حضرت مسطح بن اثاثہ بن عباد تھے جو زمانۂ مکہ میں اسلام لائے تھے۔ وہ ایک طرف تو حضرت عبیدہ بن حارث مطلبی کے بھتیجے تھے تو دوسری جانب حضرت ابوبکر صدیق تیمی کے خالہ زاد بھائی بھی۔ ان کی معاشی حالت خاصی خراب تھی چنانچہ ان کی کفالت کا بار ان کے خالہ زاد بھائی حضرت ابوبکر صدیق نے اٹھا رکھا تھا اور وہ مدنی عہد میں بھی ان کی کفالت کرتے رہے تھے۔(۱۵۳) ان کی والدہ ماجدہ حضرت اُمّ مسطح بھی ابتدائی مکی عہد کی مسلم تھیں اور اپنے فرزند کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آبسی تھیں۔(۱۵۴) خیال یہ ہے کہ حضرت مسطح نے حضرت ابوبکر کے زیر اثر اسلام قبول کیا تھا۔(۱۵۵) ممکن ہے کہ ان پر ان کے چچا کے خاندان کا بھی اثر پڑا ہو۔ ان کے گھرانے کے بارے میں مزید تفصیلات نہیں ملتی ہیں۔

بنو مطلب میں بنو مخرمہ بن مطلب کا گھرانا بھی شروع ہی سے اسلام سے متعارف ہُوا تھا۔ ان کے دو فرزند قیس بن مخرمہ اور صلت بن مخرمہ کے علاوہ موخر الذکر کے فرزند جہیم بن صلت اور دو پوتے حکیم بن جہیم اور عمرو بن جہیم ابتدائی مسلم تھے اور مدینہ ہجرت کر کے جا بسے تھے جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خیبر کی پیداوار کے خمس سے طعمہ (رزق / روزینہ) عطا فرمایا تھا۔(۱۵۶)

ایک اور گھرانا ہاشم بن مطلب کا تھا۔ اس کے مکی عہد کے مسلمانوں میں عبد یزید، رکانہ اور عجیر کے نام ملتے ہیں۔ امکان یہ ہے کہ انھوں نے مکی دور کے نصف آخر میں اسلام قبول کیا تھا۔(۱۵۷)

علقمہ بن مطلب کے گھرانے کے تین بزرگوں ابو نبقہ عبداللہ، ندیم اور جنادہ کا شمار صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔(۱۵۸) یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کا زمانۂ قبول اسلام کیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ مکی دور کے مسلم ہوں اور اس کا بھی امکان ہے کہ انھوں نے بعد میں اسلام قبول کیا ہو۔

امکان ہی نہیں بلکہ تقریباً یقینی ہے کہ بنو مطلب میں اور بھی متعدد مکی اور مدنی عہد کے مسلمان تھے جن کا ذکر ماخذ میں آنے سے رہ گیا ہے۔ لیکن ان کی تعداد کیا تھی یہ کہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے البتہ اندازہ یہ ہے کہ کل تعداد ڈیڑھ سو افراد پر مشتمل رہی ہوگی۔

(د) بنو نوفل

ہمارے ماخذ عموماً بنو ہاشم اور بنو مطلب کو ایک طبقہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور بنو عبد شمس / بنو امیہ اور بنو نوفل کو دوسرا طبقہ۔(۱۵۹) اور عموماً ان دونوں طبقوں کو زمانۂ جاہلیت سے ایک دوسرے کا حریف اور مدِ مقابل بنا کر بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جن اسباب و عوامل کے سبب بنو ہاشم اور بنو مطلب ایک دوسرے کے قریب تر تھے انہی کے سبب بنو امیہ اور بنو نوفل کے درمیان زیادہ ہم آہنگی تھی لیکن ان دونوں مفروضہ یا مبینہ طبقوں کے درمیان کوئی سیاسی یا سماجی رقابت یا عداوت نہیں تھی۔ ان خاندانوں کے درمیان منافرت و مسابقت کے جو بعض واقعات ملتے ہیں وہ عموماً بعد کے گھڑے ہوئے

معلوم ہوتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ان کو عم زادوں کی چشمک کہا جا سکتا ہے، حریفوں یا دشمنوں کی رقابت نہیں۔[۱۶۰] اس باہمی چپقلش و چشمک کے باوجود مکہ کے دوسرے قریشی خاندانوں یا دوسرے قبائل عرب کے مقابلہ میں یہ چاروں خاندان ایک متحدہ لطن قریش — بنو عبد مناف — کی مانند تھے اور وہ بطور ایک سماجی اور سیاسی اکائی کے کام کرتے تھے۔

لیکن اسلام کے مقابلہ میں ہر قبیلہ اور خاندان نے قبائلی روش سے ہٹ کر الگ وطیرہ اپنایا تھا چنانچہ اس پر ذرا بھی حیرت نہیں ہونی چاہیئے کہ بنو عبد مناف کے اس گھرانے نے اپنے تینوں برادر خاندانوں کی اسلام کے سلسلہ میں ذرا بھی پیروی نہیں کی تھی۔[۱۶۱] ابن اسحاق اور ابن سعد[۱۶۲] نے اس گھرانے کے کسی ابتدائی مکی عہد کے مسلم کا ذکر نہیں کیا ہے اور اگر کوئی ایسا رکن بنی نوفل ہے تو ان کے ایک حلیف حضرت عتبہ بن غزوان مازنی اور ان کے مولیٰ حضرت خباب یہ دونوں ابتدائی مسلمانوں میں شامل ہونے کے علاوہ مہاجر حبشہ بھی تھے۔ اور بدری صحابہ بھی۔[۱۶۳] بعض روایات ان کے مولیٰ کو دونوں طبقات میں شمار نہیں کرتیں۔

یہ صحیح ہے کہ بعثت نبوی کے زمانے میں بنو نوفل کو وہ مقام مکی سماج میں حاصل نہیں تھا جو بڑے لطون قریش کو تھا اس کا سب سے بڑا سبب ان کی عددی طاقت کی کمزوری تھی۔ سماجی اور اقتصادی کمزوری اور صلاحیتوں کا فقدان دوسرے اسباب تھے تاہم وہ بالکل ہی فروتر اور بے مایہ نہ تھا کیونکہ اسی زمانے کے لگ بھگ یہ خاندان مکی اشرافیہ کے ایک اہم منصب رفادہ کا حقدار رہا تھا اور غالباً یہ بنو ہاشم سے عہدہ اسے ملا تھا۔[۱۶۴] یہ بھی قابل ذکر حقیقت ہے کہ سفر طائف کے بعد جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھرانے بنو ہاشم کی حمایت و حفاظت سے محروم ہو گئے تھے تو یہی بنو نوفل اور ان کے سردار معطم بن عدی بن نوفل تھے جنہوں نے رسول کریم علی اللہ علیہ وسلم کو جوار (پناہ) دی تھی اور غالباً ہجرت مدینہ تک آپ اسی جوار کے سائے میں مکہ میں رہے تھے۔ اس حسن سلوک اور احسان کو آپ نے ہمیشہ یاد رکھا تھا۔[۱۶۵]

بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو نوفل کا گھرانا فتح مکہ کے زمانے میں اسلام لایا تھا۔ ممکن ہے کہ ان کے کچھ افراد صلح حدیبیہ یا اس کے معاً بعد کے زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئے ہوں لیکن ماخذ میں ان کے بارے میں سکوت پایا جاتا ہے۔ اس خاندان کے نمائندہ صحابی حضرت جبیر بن مطعم بن عدی تھے اور غالباً وہ فتح مکہ یا اس کے آس پاس کے زمانے میں اسلام لائے تھے۔[۱۶۶] بہرحال انساب کی کتابوں کے مطابق نوفل بن عبد مناف کے پانچ فرزند تھے عدی، عمرو، ابو عمرو، عبد عمرو اور عامر تھے اور ان میں سے ہر ایک کی متعدد اولادیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ فتح مکہ میں اس خاندان کے تمام باقی افراد نے اسلام قبول کر لیا تھا۔[۱۶۷]

(۲) بنو مخزوم

اگر بنو عبد مناف کا کوئی مد مقابل، حریف اور برابری کا دعویٰ رکھنے والا گروہ تھا تو وہ تھا خاندان بنی مخزوم عام طور سے ہمارے ماخذ بھی اور جدید مورخین بھی بنو مخزوم کو بنو ہاشم کا حریف اور مد مقابل اور بنو امیہ کا حلیف د

دوست بناکر پیش کرتے ہیں۔[168] یہ صحیح نہیں ہے۔ بنو مخزوم دراصل بنو عبد مناف کے حریف تھے[169] لیکن اسلام کے معاملہ میں ان کی رقابت و عصبیت قبائلی سے زیادہ انفرادی اور مذہبی تھی۔ ابو جہل مخزومی اسلام کے بدترین دشمنوں میں سرفہرست تھا تاہم اس کی عداوت کلیتاً قبائلی حمیت کے سبب نہ تھی۔ اس میں اس کے ذاتی عناد کو بھی کافی دخل تھا۔[170] عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ابو جہل مخزومی بعثتِ نبوی کے زمانے سے غزوۂ بدر تک سردارانِ قریش میں عظیم و بلند ترین مقام کا مالک تھا۔[171] یہ صحیح نہیں ہے۔ وہ شیوخ و ساداتِ قریش کی دوسری صف کے قائدین میں شمار ہوتا تھا۔[172] یہ بات بھی اہم ہے کہ اس کو مکی اشرافیہ میں سے کوئی منصب حاصل نہیں تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا اور اسی لیے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے یا حضرت عمر کے قبولِ اسلام کے لیے دعا مانگی تھی تاکہ اس کی ہمت و دلیری، دبنگ فطرت، معاملہ فہمی اور قیادت کی لیاقت سے فائدہ اٹھایا جا سکے مگر دعائے رسول حضرت عمر کے حق میں قبول ہو گئی اور وہ سعادت سے محروم اور شقاوت و بدبختی کا پیکر بن کر رہ گیا۔[173]

ابو جہل عمرو بن ہشام مخزومی کی دشمنیٔ اسلام اور مخالفتِ رسول کے پس منظر میں دیکھیے تو یہ حقیقت کتنی حیرت ناک و عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اسلام نے اسی کے گھر میں سب سے پہلے قدم جمائے تھے۔ بنو مخزوم کے ابتدائی مکی مسلمانوں میں حضرات ابو سلمہ بن عبد الاسد، ان کی اہلیہ محترمہ حضرت اُم سلمہ اور ان کے فرزند سلمہ،[174] عیاش بن ابی ربیعہ[175] اور ارقم بن ابی ارقم[176] ابو جہل کے قریبی عزیز تھے۔ حضرت عیاش تو اس دشمنِ اسلام کے ماں جائے بھائی تھے جب کہ حضرت ابو سلمہ اور ارقم اس کے دادا مغیرہ کے بھائیوں کی اولاد ہونے کے ناطے اس کے عم زاد بھائی تھے۔ طرفہ ستم یہ کہ ابو جہل کے حقیقی بھائی حضرت سلمہ بن ہشام بھی ان رشتہ داروں کے ساتھ ہی یا ان کے مابعد مگر ہجرتِ حبشہ سے قبل مسلمان ہو گئے تھے۔ ابو جہل کے ظلم و ستم سے جن مخزومیوں نے تنگ آ کر حبشہ کو ہجرت کی تھی ان میں حضرت سلمہ بھی شامل تھے۔ ایک سال بعد حبشہ سے واپسی پر وہ ابو جہل کی قیدِ بلا میں گرفتار ہو گئے اور اس ظالمِ مکہ اور فرعونِ امت کی غزوۂ بدر میں عبرت ناک موت کے بعد بھی وہ خندق کے زمانے تک محبوس و مقید رہے تھے۔[177] اسی طرح ابو جہل حضرت عیاش کو بھی مکر و فریب سے کام لے کر ہجرتِ مدینہ کے بعد قبا سے بلا کر لایا تھا اور قید کر دیا تھا حضرت ابو سلمہ کو اپنے خاندان سمیت حبشہ ہجرت کرنا پڑی تھی۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ارقم بن ارقم مخزومی کا معاملہ نہ صرف مختلف تھا بلکہ وہ ابو جہل کے ہم پلہ بلکہ بعض لحاظ سے بہتر مقابل تھے۔ عام طور سے ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ارقم مخزومی قبولِ اسلام کے وقت بہت کم عمر تھے[178] لیکن یہ بیان ناقابلِ فہم بن جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنا گھر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف قیامِ نبوی کے لیے پیش کیا تھا بلکہ اس کو اسلامی دعوت و تبلیغ کا اولین مرکز بھی بنایا تھا۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ بنو مخزوم کے ایک فرد نے ابو جہل مخزومی اور اس کے حامی اراکینِ خاندان کی اس طرح کھلم کھلا مخالفت کی تھی اور ان کے اقتدار کو للکارا تھا۔ ماخذ کی کسی روایت سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ حضرت ارقم کے اس طرح اسلام قبول کرنے اور اس کی حمایت و

نصرت کرنے کے سلسلہ میں ابوجہل نے ان کے خلاف انگلی بھی اٹھانے کی جرأت کی ہو۔ اس صورت میں یہ نتیجہ نکالنا بعید از حقیقت نہ ہو گا کہ حضرت ارقم بذاتِ خود اتنے طاقتور تھے کہ نوعمری کے باوجود ابوجہل جیسے بااثر شخص کی مخالفت مول لے کر زندہ و توانا رہ سکیں یا ان کو بنو مخزوم کے کسی اہم اور طاقت ور طبقہ کی حمایت و پشت پناہی حاصل تھی جس کی بنا پر ابوجہل ان کے یا ان کے مکان میں جوار لینے والے انسانِ کامل اور پیغمبر اسلام کے خلاف کچھ کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔

ابوجہل مخزومی کی عداوتِ اسلام جتنی بڑھتی جاتی تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خاندان اور حلفاء اور موالی میں اسلام اتنی ہی تیز رفتاری سے پھیلتا جا رہا تھا۔ کم از کم چھ حلفاء بنی مخزوم کے ابتدائی مکی عہد میں قبولِ اسلام کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں ایک خاندان تو حضرت عمار بن یاسر عنسی مذحجی کا تھا جو ان کے والد یاسر اور والدہ سمیہ پر مشتمل تھا۔ مآخذ عموماً حضرت عمار کے دوسرے بھائی بہنوں کا ذکر اس ضمن میں نہیں کرتے ہیں لیکن دوسرے مقامات پر ان کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کم از کم ایک بھائی بھی ابتدائی مسلمان تھے۔[۱۷۹] حضرت معتب بن عوف خزاعی بھی بنو مخزوم کے حلیف اور ابتدائی مسلمان تھے اور ان کے علاوہ دو اور حلیف بھی اسی دورِ اول کے مسلم تھے۔[۱۸۰] تقریباً یہ یقینی ہے کہ بنو مخزوم کے مزید حلفاء اور موالی نے مکی دور میں اسلام قبول کیا تھا۔

خود خاندانِ بنو مخزوم کے متعدد گھرانوں میں اسلام اسی تیز رفتاری یا مستعدی کے ساتھ پھیل رہا تھا۔ چنانچہ مکی دورِ اول کے مسلمانوں میں ہم کو مختلف گھرانوں کے افراد کے نام ملتے ہیں ان میں حضرات شماس (عثمان) بن عثمان بن شرید[۱۸۱] ہبار بن سفیان بن عبدالاسد اور ان کے برادرِ حقیقی عبداللہ[۱۸۲] اور ہشام بن ابی حذیفہ بن مغیرہ[۱۸۳] کے علاوہ عمر بن سفیان اور عبداللہ بن سفیان[۱۸۴] اور ان دونوں کے متعدد بھائیوں اور رشتہ داروں اور عزیزوں کے اسمائے گرامی ملتے ہیں۔ مذکورہ بالا مسلمان نہ صرف قدیم الاسلام تھے بلکہ ہجرتِ حبشہ کی سعادت بھی رکھتے تھے جب کہ ان میں سے بعض نے بعد کے زمانے میں کارنامے انجام دیئے تھے اور غزوۂ موتہ یا جنگِ یرموک میں شہید ہوئے تھے۔ ہجرتِ حبشہ ظاہر ہے مسلمانوں کی سماجی اور اجتماعی کمزوری اور قریش کے ظالموں کے ظلم و ستم کے سامنے عدمِ دفاع کے سبب ہوئی تھی مگر ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ جب مہاجرینِ حبشہ میں کچھ حضرات ایک سال بعد مکہ واپس آ گئے تو بنو مخزوم کے بعض افراد کو ان کے ننھالی رشتہ داروں نے اپنی جوار میں لے لیا۔ چنانچہ یہ کتنی حیرت انگیز حقیقت ہے کہ حضرت ابو سلمہ بن عبدالاسد مخزومی کی حفاظت و حمایت کسی اور نے نہیں بلکہ دشمنِ اسلام ابولہب ہاشمی نے کی تھی کیوں کہ صحابی موصوف اس کی بہن کے فرزند تھے[۱۸۵] جب کہ اسی ظالم نے اپنے حقیقی بھتیجے محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک طوفانِ بلا کھڑا کر دیا تھا۔ اسی طرح مآخذ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شماس بن عثمان مخزومی کو بنو عبد شمس کے ایک اہم ترین سردار اور مکہ کے عظیم ترین قائد عتبہ بن ربیعہ کی حمایت و نصرت و محبت حاصل تھی کیوں کہ وہ بھی اس کے چہیتے بھانجے تھے۔[۱۸۶] بہر حال بنو مخزوم کے متعدد خاندانوں / گھرانوں میں اور بھی کئی مسلمان تھے جن کا ذکر صراحتاً سیرت نبوی کے مآخذ میں نہیں ملتا لیکن دوسرے مآخذ میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ اندازہ ہے کہ مکی عہد کے دونوں ادوار میں بنو مخزوم کے مسلمانوں کی کافی معتد بہ تعداد تھی جو بعد میں مدینہ ہجرت کر گئی۔[۱۸۷]

ہجرت نبوی کے بعد بھی بنو مخزوم میں اسلام کی اشاعت جاری رہی۔ ان کے ایک مولیٰ حضرت حکم بن کیسان نے سریہ نخلہ میں اپنی گرفتاری کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا اور مدینہ ہی میں بس گئے تھے۔[۱۸۸] قبول و تاثیرِ اسلام کی ایک درخشاں مثال حضرت ولید بن ولید مخزومی کی ہے۔ وہ حضرت خالد بن ولید مخزومی کے حقیقی بھائی تھے۔ غزوہ بدر میں کی فوج کی جانب سے مسلمانوں سے لڑے مگر گرفتار ہو کر مدینہ آ گئے جہاں سے کچھ مدت کے بعد ان کے بھائی فدیہ دے کر انھیں چھڑا لے گئے۔ راستے سے بھائیوں کو جھکمہ دے کر مدینہ پہونچے اور اسلام قبول کر لیا۔ ان کے بھائیوں نے مکر و فریب سے ان کو مکہ لے جا کر محبوس و مقید کر دیا۔[۱۸۹] خیال یہ ہے کہ بدر اور صلح حدیبیہ کے درمیانی عرصہ میں بھی بنو مخزوم میں اسلام کی اشاعت جاری رہی تھی۔

صلح حدیبیہ کے بعد جب اسلام نے مکہ کے گھر گھر میں ڈیرہ ڈالا تو بنو مخزوم بھی اس کے فیضانِ عام سے نہ بچ سکے۔ اس عہد میں حضرت خالد بن ولید مخزومی کا قبولِ اسلام تاریخ اسلام کا ایک اہم واقعہ ہے۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اسلام قبول کرنے کی تحریک ان کے مسلم و مہاجر بھائی حضرت ولید بن ولید کی جانب سے ہوئی تھی جو اس وقت مدینہ پہنچ چکے تھے۔ اور انھوں نے حضرت خالد تک رحمتِ نبوی کی خوشخبری پہنچائی تھی۔[۱۹۰] قرائن کہتے ہیں کہ اسی زمانے میں متعدد مخزومیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔

فتح مکہ اسلام کے ہمہ گیر فیضانِ عام کا دیباچہ تھا چنانچہ اس عظیم دن یا اس کے معاً بعد تمام دوسرے قریشی خاندانوں کی مانند بنو مخزوم نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ ان میں ابوجہل کے فرزندِ دل بند حضرت عکرمہ بن ابی جہل بھی شامل تھے جو اپنی مخزومی مسلم اہلیہ حضرت ام حکیم بنت حارث کی تحریک و تبلیغ پر ایمان لائے تھے۔[۱۹۱] ان کے علاوہ ابوجہل کی والدہ ماجدہ حضرت اسماء بنت مخربہ دارمی بھی اسی موقع پر اسلام لائی تھیں۔[۱۹۲] حضرات حارث بن ہشام[۱۹۳] اور سعید بن یربوع[۱۹۴] دو اہم مخزومی سردار تھے جن کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خمس ہوازن میں سے اپنے گراں قدر عطیات سے نوازا تھا۔ ابوجہل کے خاندان کے ایک اور فرد حضرت جویریہ کے قبول اسلام کا بھی ذکر ملتا ہے۔[۱۹۵] ام المومنین حضرت ام سلمہ کے دو بھائی حضرات عبد اللہ بن ابی امیہ مخزومی اور ان کے مشہور بھائی مہاجر بھی فتح مکہ کے مسلمانوں میں شامل تھے۔[۱۹۶] ان کے علاوہ حضرات عبد اللہ بن ابی ربیعہ مخزومی[۱۹۷]، ولید بن عبد شمس بن مغیرہ مخزومی[۱۹۸]، ابو عمرو بن حفص مخزومی[۱۹۹]، عمرو بن عثمان مخزومی[۲۰۰] اور ان کے دو فرزند حریث اور عمرو[۲۰۱] اور ایک پوتے سعید بن حریث[۲۰۲]، عبد اللہ بن ابی سائب مخزومی اور ان کے بھائی عبد الرحمٰن و البعہ بن خالد مخزومی اور سہل بن وہب مخزومی فتح مکہ کے مسلمانوں میں نمایاں ترین تھے۔[۲۰۳]

بہر حال کچھ ایسے بھی بد قسمت تھے جو اسلام کی رحمتِ عام سے محروم اس موقع پر بھی رہے۔ ان میں حضرت ام ہانی بنت ابی طالب ہاشمی کا مخزومی شوہر، ہبیرہ بن ابی وہب تھا جو مکہ سے فرار ہوا اور بحالت کفر نجران میں مر گیا۔ مگر یہ بات اس کے لیے کتنی اذیت ناک تھی کہ اس کی اپنی بیوی اور اولادیں عمر، ہانی، یوسف اور جعدہ۔ اسی اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے تھے۔[۲۰۴] اسی گھرانے کے بلکہ ہبیرہ کے حقیقی بھائی حضرت سہل بن ابی وہب بن حزن، مخزومی اور ان کے پانچ فرزند۔ حکیم بن حزن، مسیب، عبد الرحمٰن، سائب اور ابو سعید۔ بھی فتح مکہ کے مسلمانوں میں شامل تھے۔[۲۰۵] عدی

لحاظ سے بنو مخزوم بنو امیہ/بنو عبد شمس کے قریب قریب ہم پلہ تھے لہٰذا ان کے کل مسلمانوں کی تعداد دو تین ہزار سے کسی طرح سے کم نہیں تھی (۲۰۶)

(۳) بنو عدی

مکی سماج میں بنو عدی کے خاندان کو عزت وافتخار بھی حاصل تھا اور مکی اشرافیہ میں سفارہ منافرہ کا اہم منصب بھی چھٹی صدی میں اس منصب عظیم پر فائز ہونے والوں میں نفیل بن عدی اور خطاب بن نفیل تھے اور بعثت نبوی کے قریب خطاب کے فرزند حضرت عمر فاروق تھے (۲۰۷)۔ اس خانوادہ کو مکی سماج میں جو مقام حاصل تھا وہ بنو مخزوم کے ہم پلہ تھا چنانچہ بعثت نبوی کے وقت بنو عدی کے عمر بن خطاب اور بنو مخزوم کے ابوجہل کو تقریباً ان کی اپنی صلاحیتوں کے سبب برابر کا مقام حاصل تھا اگرچہ بنو عدی استنے عددی اعتبار سے طاقتور نہیں تھے جتنے کہ بنو مخزوم لیکن ان کی سماجی منزلت، مذہبی وقار، تہذیبی افتخار اور اقتصادی ثروت کے سبب ان کا مقام بنو مخزوم کے ساتھ یا کچھ بعد میں آتا ہے۔ اس کا ایک ثبوت ان کے حلفاء اور موالی کی کثرتِ تعداد سے ہوتا ہے۔ بعثت نبوی سے قبل نفیل کے ایک فرزند زید نے بت پرستی اور مکہ کے قدیم جاہلی مذہب کو ترک کر کے اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے احناف کا افتخار بھی حاصل کر لیا تھا (۲۰۸)۔

غالباً یہی مذہبیت تھی یا تلاشِ حق کی لگن جس نے زید بن نفیل کے فرزند حضرت سعید عدوی کو اسلام قبول کر لینے پر آمادہ کر لیا تھا۔ وہ قدیم ترین مکی مسلمان تھے۔ وہ حضرت عمر بن خطاب کے چچازاد بھائی اور بہنوئی بھی تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت فاطمہ بنتِ خطاب نے بھی مکی دورِ اول کے آغاز میں ہی اپنے شوہر کے ساتھ اسلام قبول کر لیا تھا (۲۰۹)۔ حضرت سعید بن زید عدوی کی ایک بہن حضرت عاتکہ بنت زید بھی قدیم مکی مسلمان تھیں اور حضرت ابوبکر تیمی کے مسلمان صاحبزادے حضرت عبداللہ تیمی کو بیاہی تھیں۔ ان دونوں میاں بیوی نے ایک ساتھ ہجرت مدینہ کی سعادت حاصل کی تھی (۲۱۰)۔ حضرت سعید بن زید کے دوسرے اہلِ خاندان خاص کر ان کے بھائیوں اور فرزندوں کے بارے میں ہمارے ماخذ زیادہ روشنی نہیں ڈالتے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احناف قدیم کا یہ خاندان پورا مسلمان ہو گیا تھا۔

بنو عدی کے ایک گھرانے کے ایک اولیں مسلم حضرت نعیم بن عبداللہ تھے جو اپنے پیشۂ آہن گری کے سبب النحام کے لقب سے معروف ہیں۔ ہمارے بعض مورخین جدید نے ان کو ان کے پیشے کے سبب ایک کمتر مسلمان سمجھ لیا ہے اور ان کے کئی برس تک مدینہ ہجرت نہ کرنے کے سبب ان کے اسلام کو ضعیف محمول کیا ہے۔ یہ دونوں خیال غلط ہیں وہ پکے مسلمان ہیں (۲۱۱) خاصے مالدار بلکہ بنو عدی کے مالدار ترین افراد میں سے ایک اور اپنے قبیلے اور قریش مکہ کے با اثر سرداروں میں سے تھے۔ اس کا ثبوت اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال اور لواحقین کے علاوہ بنو عدی کے یتیموں، بیواؤں، بے کسوں کی کفالت کرتے تھے اور اپنی اسی فیاضی، سخاوت اور دریا دلی کے لیے اتنے مقبول و با اثر تھے کہ ان کو خود ان کے خاندان والوں نے ہجرت نہیں کرنے دی تھی اور مکہ میں ان کے اسلام پر عامل ہونے کے

باوجود ان کو بصد عزت و احترام رکھا تھا اور قریش مکہ کے ظالموں کو بھی جرأت نہ ہوئی تھی کہ کوئی ان کی طرف انگلی بھی اٹھا سکتا۔ ابن سعد کے مطابق وہ گیارھویں مسلمان تھے اور صلح حدیبیہ کے زمانے میں جب انھوں نے مدینہ ہجرت کی تھی تو ان کے ساتھ ان کے خاندان (اہل) کے چھوٹے بڑے چالیس افراد تھے۔ قیاس یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مکی عہد کے دورِ آخر اور مدنی عہد کے آغاز میں مسلمان ہوئے تھے اور کافی لوگ قدیم مکی عہد کے مسلمان بھی تھے۔ اسی سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ہجرت نبوی کے بعد بھی صلح حدیبیہ تک بنو عدی کے اس خاندان میں کم از کم اسلام کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ حضرت نعیم بن عبداللہ النحام کے خاندان میں ان کے ایک فرزند حضرت ابراہیم، ان کی زوجہ محترمہ حضرت زینب بنت حنظلہ اور موخر الذکر کی ایک پھوپھی حضرت جبار بنت مسامہ اور ایک دختر امت بنت نعیم وغیرہ کا مکی عہد کے مسلمانوں میں شمار کیا گیا ہے۔[212]

بنو عدی کی ایک قدیم عہد مکہ کی مسلمان تھیں حضرت شفا بنت عبداللہ بن عبد شمس اور دوسرے تھے ان کے صاحبزادے حضرت سلیمان بن ابی خیثمہ عدوی، ابوخیثمہ کا مکی عہد میں انتقال ہوگیا تھا اور ان کے فرزند و زوجہ نے ہجرت نبوی سے کچھ قبل مدینہ ہجرت کی تھی۔[213]

مکی عہد قدیم کے ابتدائی مسلمانوں میں اس خاندان بنو عدی کے مختلف گھرانوں کے متعدد افراد شامل تھے جن میں حضرات معمر بن عبداللہ،[214] عدی بن نضلہ اور ان کے فرزند نعمان بن عدی،[215] عروہ بن ابی اثاثہ،[216] مسعود بن سوید،[217] عبداللہ بن سراقہ اور ان کے بھائی عمرو[218] اور حضرت خارجہ بن حذافہ[219] کے علاوہ متعدد مرد اور خواتین جیسے حضرت ارنب بنت عفیف وغیرہ نمایاں ترین تھے۔[220]

اگرچہ حضرت عمر بن خطاب عدوی مکی دورِ تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے نصف ثانی کے آغاز یعنی ۶ نبوی/۶۱۶ء کے لگ بھگ اسلام لائے تھے لیکن ان کے خاندان کے دوسرے افراد ان سے قبل مسلمان ہو چکے تھے۔ ان کی بہن حضرت فاطمہ بنت خطاب کے علاوہ ان کے حقیقی بھائی حضرت زید بن خطاب جن سے حضرت عمر کو بے انتہا محبت تھی کافی پہلے غالباً اپنی بہن کے ساتھ اسلام کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے۔[221] بہرحال حضرت عمر کا قبول اسلام دراصل مکہ میں تاریخ اسلام میں مسلمانوں کی قوت و شوکت و حشمت کی تابناک ترین مثال ہے اور کاروانِ اسلام کی ایک اہم ترین منزل۔ مسلمانوں کو پہلی بار اسلام کا باجماعت علانیہ اظہار کرنے کا موقع ملا تھا۔[222] دعائے رسول سے حضرت عمر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن اسی ضمن میں یہ بھی بیان کر دیا جائے کہ حضرت عمر کے اسلام کی خبر جیسے ہی مکہ میں پھیلی تو بنو سہم کے ایک عظیم ترین سردار اور شیوخ مکہ میں سے اہم ترین فرد عاص بن وائل سہمی نے ان کے بنا طلب کئے ان کو اپنی جوار میں لینے کا اعلان کر دیا تھا۔[223] اس کے علاوہ ماخذ میں ایک بھی روایت ایسی نہیں ملتی جس سے یہ معلوم ہو کہ قریش مکہ کے سخت ترین دشمنوں میں سے بھی کسی نے ان کے منہ آنے کی جسارت کی ہو۔[224] بہرحال حضرت عمر کے ساتھ ان کا پورا گھرانا مسلمان ہو گیا تھا بلکہ بعض افراد تو پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے۔ ان میں حضرت عمر کے فرزند اکبر حضرت عبداللہ[225] اور دختر حضرت حفصہ[226]

اور ان دونوں کی والدہ ماجدہ جو بنو جمح کے ایک عظیم و قدیم مسلم حضرت عثمان بن مظعون کی حقیقی بہن تھیں اور جن کا نام حضرت زینب بنت مظعون تھا، شامل تھے۔ حضرت عمر کے دوسرے فرزندان گرامی حضرات عبدالرحمٰن اکبر، زید، عاصم عبیداللہ وغیرہ بھی صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔[۲۲۷] اسی طرح حضرت زید بن خطاب کی اہلیہ اور فرزند بھی قدیم مکی مسلمان تھے[۲۲۸] ممکن ہے کہ ان دونوں گھرانوں کے اور بھی افراد قدیم مسلمانوں میں شامل رہے ہوں۔

ماخذ سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمر کو قبولِ اسلام پر آمادہ کرنے والے عوامل و اسباب میں ان کے بہنوئی اور بہن کا خاصا اثر تھا۔ یہ قیاس بھی صحیح ہے کہ ان کے برادرِ نسبتی حضرت عثمان بن مظعون جمحی کا اثر پڑا ہو۔ کچھ ان کو مائل کرنے میں ان کے چچا زید بن نفیل کی "حنفیت" کا بھی دخل رہا ہو گا۔ کسی حد تک ان کے خلفاء کے اسلام اور ضعفاء مسلمین خاص کر دہ کمزور مسلمان جن کو حضرت عمر بحالت کفر سخت ترین ایذائیں دیتے تھے کی صلابت اور ثابت قدمی نے بھی ان کو مائل بہ اسلام کیا ہوگا لیکن آخری وار یا ضرب کاری خود کلام ربانی نے لگائی تھی جس نے ان کے جسم و جان کے ریشے ریشے کو ہلا دیا تھا۔[۲۲۹] مونٹگمری واٹ کا یہ قیاس بے جا اور گمراہ کن ہی نہیں بلکہ تاریخی حقیقت کے خلاف ہے کہ اقتصادی بدحالی اور معاشی زوال نے ان کے اسلام قبول کرنے میں کوئی حصہ لیا تھا۔[۲۳۰] ابن اسحاق کی واضح روایت ہے کہ ہجرت مدینہ کے وقت حضرت عمر قریش مکہ کے مالدار ترین شخص تھے۔[۲۳۱] روایت میں مبالغہ بھی سمجھ لیا جائے جس کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے تو بھی وہ قریش کے اس وقت کے متمول ترین افراد میں ضرور تھے۔

بنو عدی خاص کر حضرت عمر کے خاندان کے موالی اور حلفاء بھی قدیم دور کے مسلمان تھے۔ ان میں حضرت عمر کے ایک غلام حضرت مہجع بھی شامل تھے۔[۲۳۲] حلفاء میں بنو بکیر کنانہ کا گھرانا تھا جس کے چار افراد حضرات عامر، خالد، عاقل اور ایاس، فرزندان بکیر کے نام عموماً گنائے جاتے ہیں۔[۲۳۳] لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے علاوہ دوسرے متعدد مرد اور عورتیں اور بچے بھی ابتدائی مسلمانوں میں شامل تھے۔ بنو بکیر کے علاوہ دوسرے حلفاء بنی عدی میں قدیم مسلمان تھے۔ حضرات واقد بن عبداللہ تمیمی، خولی بن ابی خولی، ان کے بھائی مالک، عامر بن ربیعہ عنزی اور ان کی اہلیہ گرامی حضرت لیلیٰ بنت ابی حثمہ۔[۲۳۴]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنی عدی کے بعض گھرانے خصوصاً حضرت عمر کا پورا گھرانا اسلام لا چکا تھا اور مدینہ ہجرت کر کے جا چکا تھا۔ امکان ہے کہ ان کے بعض افراد نے ہجرت نبوی کے بعد اسلام قبول کر کے مکہ چھوڑا ہو۔ یہی سبب ہے کہ صلح حدیبیہ سے پہلے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو اپنا سفیر بنا کر قریش مکہ سے گفتگو کرنے کے لیے شہر بھیجنا چاہا تھا تو انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی تھی کہ ان کے گھرانے کا کوئی فرد مکہ میں نہیں بچا ہے[۲۳۵] جو ان کی حفاظت و حمایت میں قریش سے ٹکر لے سکے۔

بہر حال مکہ میں بنو عدی کے بعض گھرانے اب بھی بحالت کفر موجود تھے لیکن یہ دلچسپ و اہم حقیقت ہے کہ وہ اسلام کے زیادہ مخالف نہ تھے چنانچہ غزوہ بدر سے قبل ابو جہل کی دھمکی کے باوجود شام سے لوٹنے والے قریشی کاروان کے محفوظ ہو جانے کی خبر سن کر جنگ میں حصہ لیے بغیر مکہ لوٹ گئے تھے۔[۲۳۶] ظاہر ہے کہ وہ ابو جہل مخزومی اور اس کے حامیوں

کی طاقت سے مرعوب نہ تھے۔ بہرحال بنو عدی کے باقی ماندہ افراد جو بیشتر بنو عویج بن عدی کے گھرانے سے متعلق تھے فتح مکہ میں مسلمان ہو گئے تھے ان میں حضرات ابوجہم بن حذیفہ، ان کے بھائی ابوحثمہ، مطیع (عاصی) بن اسود اور ان کے فرزند عبداللہ بن مطیع وغیرہ شامل تھے (۲۳۷)

(۴) بنو تیم

بنو تیم کا خاندان عددی لحاظ سے کافی چھوٹا ہونے کے باوجود مکی اشرافیہ کا رکن تھا (۲۳۸) اور اس کے بعض صاحب صلاحیت و امتیاز افراد کی موجودگی اور اقتصادی دولت کی فراوانی کے سبب اس کو سماج میں عزت و منزلت حاصل تھی بعثت نبوی سے کچھ پہلے ان کے خاندان کے ایک سربرآوردہ سردار عبداللہ بن جدعان تیمی نے خاندان تیم کو کافی افتخار بخشا تھا اور ۶۰۵ء کے لگ بھگ حلف الفضول کا اہم معاہدہ انہی کے گھر میں عمل میں لایا گیا تھا (۲۳۹)۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر عبداللہ بن ابی قحافہ عثمان تیمی اس خاندان کے اہم ترین فرد تھے۔ وہ دولت مند تاجر، ماہر نسب قریش و عرب، معاملہ فہم سردار و سیدھے سچے آدمی تھے (۲۴۰)۔ ظاہر ہے کہ بنو تیم کو وہ مقام حاصل نہیں تھا جو بنو امیہ، بنو مخزوم یا بنو عدی کو حاصل تھا اور اس کا سب سے بڑا سبب ان کی عددی کمزوری تھی۔

بہرحال مکی سماج میں بنو تیم کو مقام امتیاز حاصل رہا ہو یا نہ رہا ہو سبقت اسلام کے شرف میں قریش مکہ کا کوئی بطن اور خاندان ان کے مساوی نہیں تھا۔ ان کے فرد حضرت ابوبکر صدیق نے نہ صرف سب سے پہلے قبول اسلام کا اظہار کیا تھا بلکہ بلا کسی ریب و تردد، جھجک اور لیس و پیش کے اسلام قبول کیا تھا اور اسی لیے وہ صدیق کے مرتبۂ عظیم پر فائز ہوئے۔ (۲۴۱) ہمارے مآخذ ابتدائی مسلمانوں میں خاندان صدیقی کے دو افراد حضرات اسماء بنت ابی بکر اور ان کی بہن عائشہ کو شمار کرتے ہیں جبکہ حضرت عائشہ بچپن کی مسلمان تھیں کیوں کہ ان کی پیدائش بعثت نبوی کے بعد ہوئی تھی۔ اس خاندان گرامی کے متعدد افراد ابتدائی مسلمانوں میں شامل تھے۔ ان میں حضرت ابوبکر کی اہلیہ حضرت ام رومان، ان کے ایک جوان دبیا ہے فرزند عبداللہ اور بہو عاتکہ بنت زید عدوی، حضرت ابوبکر کی ایک اور کتخدا بہن ام کلثوم جو حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی کی زوجہ تھیں اور ان سب سے بڑھ کر حضرت ابوبکر کی والدہ ماجدہ حضرت ام الخیر بھی شمار کی جاتی ہیں (۲۴۲)۔ یہ دلچسپ اور قابل غور نکتہ ہے کہ ام الخیر نے اپنے شوہر ابو قحافہ کے کفر پر قائم رہنے کے باوجود اسلام قبول کر لیا تھا اور غالباً ان کی خدمت بھی کرتی رہی تھیں۔ روایات میں حضرت ابوبکر کی ایک کم عمر بہن کا ذکر ملتا ہے جو بوڑھے ابو قحافہ کی دلجوئی کے لیے مکہ ہی میں رہ گئی تھیں (۲۴۳)۔ خاندان صدیقی کے ایک اور حلیف حضرت صہیب بن سنان نمری قاسطی اور ایک مولیٰ حضرت عامر بن فہیرہ بھی قدیم الاسلام تھے (۲۴۴)۔

بنو تیم کے ایک اور گھرانے کے ابتدائی اور قدیم مسلمان حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی تھے جو حضرت ابوبکر صدیق کے بہنوئی تھے اور انہی کی دعوت پر اسلام لائے تھے۔ ابن اسحاق نے ان کو پہلے آٹھ مسلمانوں میں شمار کیا ہے۔ وہ ایک

مالدار تاجر ہونے کے علاوہ خاصے وقیع گھرانے کے فرد تھے اور ان کا خاندان متعدد افراد پر مشتمل تھا اور وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے تھے جن میں ان کی والدہ ماجدہ بھی شامل تھیں[۲۴۵]۔

بنو تیم کا ایک اور گھرانا اسی ابتدائی مکی عہد میں مسلمان ہوا تھا۔ اس کے نمایاں افراد حضرت حارث بن خالد تیمی اور ان کی اہلیہ حضرت ریطہ بنت حارثہ کے علاوہ حضرت عمرو بن عثمان بھی تھے۔ یہ سب کے سب مہاجرین حبشہ میں شامل تھے حبشہ میں حضرت حارث تیمی کے ایک فرزند موسیٰ اور تین صاحبزادیاں عائشہ، زینب اور فاطمہ پیدا ہوئی تھیں۔ یہ سب حضرات و خواتین کچھ مدت کے بعد مکہ واپس لوٹ آئے تھے اور پھر وہاں سے مدینہ ہجرت کی تھی[۲۴۶]۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت نبوی کے بعد مکہ میں جو بنو تیم کے غیر مسلم لوگ مقیم تھے ان میں رفتہ رفتہ اسلام پھیلتا رہا تھا اور فتح مکہ تک یہ سلسلہ کسی نہ کسی طرح سے جاری رہا تھا۔ اس کی ایک واضح مثال حضرت ابوبکر صدیق کے فرزند اکبر حضرت عبدالرحمٰن کے قبول اسلام کا واقعہ ہے۔ غزوۂ بدر تک وہ کافر رہے تھے اور اسی حیثیت میں مکی فوج میں شامل ہو کر مسلمانوں اور خاص کر اپنے باپ کے مقابل آئے تھے لیکن انھوں نے صلح حدیبیہ کے بعد کسی وقت اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے اہل و عیال بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ اور وہ سب مدینہ ہجرت کر کے آ بسے تھے[۲۴۷]۔

بنو تیم کے باقی ماندہ افراد فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھے۔ ان میں حضرت ابوبکر صدیق کے والد بزرگوار حضرت ابو قحافہ بھی شامل تھے[۲۴۸]۔ ان کے علاوہ متعدد دوسرے تیمی افراد بھی اسی دن اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ ہمارے مآخذ نے بنو تیم کے حارث بن حارثہ کے فرزند عبداللہ اور پوتے منکدر کو فتح مکہ کے صحابہ میں شمار کیا ہے جبکہ حضرت امیمہ بنت عبد تیمی کو اس دن کی مبایعات (بیعت کرنے والی عورتوں) میں گردانا جاتا ہے[۲۴۹]۔

(۵) بنو سہم

قریشی اشرافیہ میں بنو سہم طاقتور ترین بطون/خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی دو اہم ترین وجہیں تھیں: اول یہ کہ وہ عددی اعتبار سے کافی بڑا تھا[۲۵۰] اور دوم یہ کہ اس میں صاحب صلاحیت و لیاقت افراد کی تعداد زیادہ تھی۔ چھٹی صدی عیسوی کے اختتام پر اور بعثت نبوی کے زمانے میں اس خاندان کے بعض شیوخ جیسے عاص بن وائل سہمی اور حارث بن قیس سہمی، منبہ اور نبیہ فرزندان حجاج سہمی وغیرہ اہم ترین رؤسا قریش میں شمار ہوتے تھے[۲۵۱]۔ دوسرے درجہ کے قائدین اور زعماء کی فہرست میں اس خاندان کے عمرو بن عاص سہمی اور ان کے بھائی ہشام سہمی وغیرہ کا نام بھی شامل تھا۔ اسلام کے معاملے میں دوسرے بطون قریش کی مانند بنو سہم کا بھی رویہ تھا۔ اس کے بعض سرداروں نے جن میں مذکورہ بالا حارث، منبہ اور نبیہ شامل تھے اسلام کی سخت مخالفت کی تھی جبکہ بعض دوسروں کا شمار ہمارے سیرت نگاروں نے دشمنان اسلام کی بجائے مستہزئین (مذاق اڑانے والوں) یا کم درجہ کے مخالفوں میں کیا ہے۔ عاص بن وائل سہمی کا تعلق دوسرے طبقے سے تھا[۲۵۲]۔

بہرحال اسلام کے ناوک نے بنو سہم کے بعض افراد و گھرانوں کو بھی نہیں چھوڑا تھا چنانچہ متعدد گھرانے بالکل آغاز میں

انتہائی نامکمل ہے۔ ان سے کئی گنا زیادہ وہ حضرات صحابہ و صحابیات ہوں گی جو گمنام رہ گئیں یا جن کا ذکر نہیں آسکا۔

(۶) بنو زہرہ

مکہ کے سیاسی اور اقتصادی نظام میں بنو زہرہ کا بطن خاندان بنو سہم کا ہم پلہ تھا۔[۲۶۴] اگرچہ زمانۂ بعثت کے قریب اس میں کوئی بڑا قائد یا شیخ نہیں رہا تھا کم از کم ہمارے مآخذ اس خاندان کے کسی بڑے دشمنِ اسلام کا ذکر نہیں کرتے۔ بعض مورخین نے اس سے یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ وہ مکی سیاست میں اتنا اہم نہیں رہ گیا تھا حالانکہ اس کا اصل سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی جانب اس کا رویہ معتدل تھا اور وہ سوچ سمجھ پر مبنی تھا چنانچہ بنو زہرہ اور بنو عدی نے دوسروں کی طرح اندھا دھند اسلام دشمن رویہ نہیں اپنایا تھا اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ بنو زہرہ بھی میدانِ جنگ سے بلا جنگ و جدال کئے مکہ پلٹ گئے تھے۔[۲۶۵] ایک سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بنو زہرہ نسبتاً بنو عبد مناف کے زیادہ قریب تھے۔ ان کے تجارتی اور ازدواجی تعلقات دوسروں کے مقابلہ میں بنو ہاشم اور بنو امیہ سے زیادہ تھے۔[۲۶۶] مونٹگمری واٹ کا یہ خیال ہے کہ وہ محض بنو امیہ سے زیادہ قریب تھے آدھا سچ ہے بنو زہرہ کے بعض لوگوں کے تجارتی تعلقات بنو تیم سے بھی تھے۔

بہرحال مکی سیاست اور سماج و اقتصاد میں بنو زہرہ کی جو بھی حیثیت رہی ہو۔ اسلام میں ان کے بعض گھرانوں اور افراد کو سبقت کا شرف ضرور حاصل تھا۔ ذکر آچکا ہے کہ بنو زہرہ کے دو گھرانوں بنو عوف بن عبد عوف اور بنو اہیب کے دو اہم افراد حضرات عبد الرحمٰن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص حضرت ابوبکر تیمی کے حلقۂ احباب میں شامل تھے اور انہی کے ایماء و تبلیغ پر بالکل آغازِ عہدِ اسلامی میں مسلمان ہو چکے تھے۔ ابنِ اسحاق کے مطابق وہ پہلے آٹھ مسلمانوں میں سے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے پورے گھرانے ابتدا ہی میں مسلمان ہو گئے تھے چنانچہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کی دونوں بیویاں جو عتبہ بن ربیعہ اور اس کے بھائی شیبہ کی بیٹیاں تھیں مسلمان ہو چکی تھیں۔[۲۶۷] ان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ مکی دورِ حیات ہی میں نا کتخدا تھے اور تجارت میں ان کی عالمگیر شہرت کی چھاپ ابھی نہیں لگی تھی بلکہ وہ بے نوا اور بے کس شخص تھے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ ہجرت کے وقت ان کی عمر ۳۴ سال ہو چکی تھی۔ وہ صرف شادی شدہ بلکہ کم از کم دو بیویوں کے شوہر اور غالباً کئی بچوں کے والد ماجد بھی تھے۔ بنت شیبہ سے ان کے دو اولادیں ایک فرزند محمد اور ایک دختر ام القاسم تھیں جن کا شمار صحابہ میں ہوتا ہے۔[۲۶۸] ان کے علاوہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کی دو بہنوں حضرت عاتکہ اور حضرت شفاء کے بارے میں بھی صراحت ملتی ہے کہ وہ مکی مسلمان تھیں۔ یہ بات اہم ہے کہ ان کی بہن عاتکہ کے شوہر مخرمہ بن نوفل زہری نے مکی عہد میں اسلام قبول نہیں کیا تھا چنانچہ صحابیہ موصوفہ نے اپنے شوہر کو چھوڑ دیا تھا اور اپنے فرزند حضرت مسعود بن مخرمہ کے ساتھ جو مکی مسلمان تھے مدینہ ہجرت کی تھی۔ ان کی دوسری بہن نے بھی مکہ کو چھوڑ مدینہ جا کر گھر بسایا تھا۔[۲۶۹] اس سے زیادہ دلچسپ روایت یہ ہے کہ حضرت عبد الرحمٰن کی بوڑھی والدہ نے بھی شروع ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا اور ہجرت کی تھی۔[۲۷۰]

حضرت عبد الرحمٰن بن عوف زہری کے چچا کا خاندان بنو ازہر بھی غالباً پورا مسلمان ہو گیا تھا۔ مکی عہد قدیم کے

اسلام سے روشناس ہو گئے تھے۔ عہد قدیم کے مکی مسلمانوں میں بنو قیس بن عدی کے تین افراد حضرات خنیس بن حذافہ بن قیس بن عدی اور ان کے دو بھائی عبد اللہ اور قیس ہجرت حبشہ سے پہلے مسلمان ہو گئے تھے۔ حضرت خنیس کی زوجہ محترمہ حضرت حفصہ بنت عمر بن خطاب عدوی بھی مسلمان ہو گئی تھیں۔[253] قیاس ہے کہ ان کے دونوں بھائیوں کے اہل و عیال بھی اسلام سے مشرف ہو چکے تھے بہرحال ان تینوں سہمیوں نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہجرت حبشہ کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔ بنو سہم کے غالباً اہم ترین گھرانے بنو عاص بن وائل سے ایک فرزند حضرت ہشام بن عاص بھی ابتدائی مکی مسلم تھے اور کاروان حبشہ کے ایک رکن رکین[254]

ابن اسحاق نے دوسری ہجرت حبشہ کے مہاجروں میں تیرہ سہمی حضرات اور ان کے ایک زبیدی حلیف حضرت محمیہ بن جزء زبیدی کا نام گنوایا ہے۔ مذکورہ بالا سہمی مہاجرین حبشہ کے علاوہ باقی حضرات تھے: عبد اللہ بن حارث، ابو قیس بن حارث حارث بن حارث، معمر بن حارث، البشر بن حارث اور موخر الذکر کے ایک ماں جائے بھائی جن کا نام تھا سعید بن عمرو، سعید بن حارث، سائب اور عمیر بن رباب اور عمیر بن رباب بن حذافہ بن مخشم۔[255] ابن سعد کے یہاں بعض نئے ناموں کا اضافہ ہے اور وہ ہیں حجاج بن حارث تمیم یا نمیر بن حارث اور معبد بن حارث۔ ابن سعد نے موخر الذکر کو صرف ابتدائی عہد کا قدیم مسلم قرار دیا ہے اور بقیہ تفصیلات نہیں دی ہیں۔[256] خیال ہے کہ وہ بھی مہاجرین حبشہ میں شامل رہے ہوں گے اور نہ بھی رہے ہوں تو یہ تو مسلم امر ہے کہ وہ قدیم مکی مسلم ضرور تھے۔ یہ نکتہ دلچسپ، حیرت انگیز اور اہم ہے کہ بنو سہم کے شدید ترین دشمن اسلام حارث بن قیس سہمی کے آٹھ نو حقیقی اور سوتیلے بیٹوں نے مکی دور کے نصف اول ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس سے یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ حارث سہمی کی عداوت اسلام ذاتی وجوہ سے تھی، کسی نصب العین یا قبائلی عصبیت کے سبب نہ تھی۔ مونٹگمری واٹ نے اپنی فہرست مسلمین مکہ میں ان حارثی فرزندان اسلام میں سے صرف چھ کے نام گنائے ہیں۔[257] اس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ہمارے محقق و حق جو مستشرقین کس طرح مکی مسلمانوں کی تعداد کو کم کر کے پیش کرتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ تبلیغ و اشاعت اسلام کو کمیوں کر دھندلا بنا کر دکھاتے ہیں۔ مزید برآں ہمارے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ مکی عہد میں ہی گھرانے کے گھرانے اسلام قبول کر چکے تھے اور اسلام صرف افراد ہی تک محدود نہیں تھا

ہجرت نبوی کے بعد بھی مکہ کے بنو سہم میں اسلام کی اشاعت جاری رہی تھی اگرچہ اس کی رفتار سست تھی اور مآخذ میں اس کے بارے میں تفصیلات بھی کم ملتی ہیں۔ بہرحال صلح حدیبیہ کے بعد اس خاندان کے غالباً اہم ترین فرد حضرت عمرو بن عاص سہمی کے قبول اسلام کے واقعہ سے ہمارے خیال کو کسی قدر تقویت ملتی ہے۔[258] مزید تائید ابن سعد کی روایت سے ہوتی ہے جس کے مطابق حضرت عمرو بن عاص سہمی کے صاحبزادہ گرامی حضرت عبد اللہ بن عمرو نے اپنے والد سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا۔[259] عین ممکن ہے کہ ان کے قبول اسلام کا تعلق زمانۂ قبل حدیبیہ سے ہو۔

فتح مکہ میں تمام دوسرے بطون قریش کی مانند بنو سہم کے باقی ماندہ افراد بھی اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے تھے۔ ان میں نمایاں ترین حضرات تھے حضرت قیس بن عدی،[260] حضرت عبد اللہ بن زبعری جو اپنے وقت کے مشہور و بلند پایہ شاعر بھی تھے، حضرت ابو وداعہ، حارث بن صبرہ اور کم از کم ان کے تین جواں سال فرزند حضرات مطلب، ابو سفیان اور سائب۔[262] خواتین میں عام طور سے حضرت ریطہ بنت منبہ بن حجاج کا نام لیا جاتا ہے۔[263] ظاہر ہے کہ سہمی مسلمانوں کی یہ فہرست

مسلمانوں میں اس گھرانے کے تین ارکان حضرات مطلب بن ازہر، طلیب بن ازہر اور عبدالرحمٰن بن ازہر کا نام ملتا ہے۔ ان کے ساتھ خواتین میں حضرت مطلب زہری کی زوجہ محترمہ حضرت رملہ بنت ابی عوف سہمی کا نام لیا جاتا ہے۔[۲۷۱، ۲۷۲] یہ سب حضرات و خواتین ہجرت حبشہ سے پہلے کے مسلمان تھے۔ ان کے علاوہ بھی قیاس کہتا ہے کہ مزید مسلمان اس گھرانے میں عہد قدیم کے تھے۔ اگرچہ متداول ماخذ قبول اسلام کے زمانے کے بارے میں صراحت نہیں کرتے مگر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کے ایک ہم نام بھتیجے کا بھی صحابہ کرام میں شمار کیا گیا ہے اور وہ بھی یقیناً ابتدائی عہد کے مسلمان تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص ابا مالک، زہری کا تعلق بنو وہیب سے تھا اور ان کا پورا گھرانا لگتا ہے کہ شروع ہی میں مسلمان ہو گیا تھا۔ اس خاندان میں حضرت سعد کے سوا ان کے دو بھائیوں عامر، زہری اور عمیر زہری کے مکہ میں قبول اسلام کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے ایک اور بھائی عتبہ زہری اسلام سے قبل مدینہ جا بسے تھے جہاں وہ آغاز اسلام ہی میں مسلمان ہو گئے تھے اگرچہ ہمارے ماخذ حضرت سعد، ان کے بھائیوں کے اہل و عیال کے بارے میں کچھ نہیں کہتے مگر یہ یقینی ہے کہ کم از کم حضرت سعد اور ان کے ایک بھائی عامر شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے اور ان کے دوسرے بھائی عتبہ بھی صاحب اولاد تھے اور ان کی تمام اولادیں نابالغ ہونے کے سبب مسلم تھیں۔ ان کے ایک بھائی عمیر کی عمر ہجرت کے وقت بارہ تیرہ یا چودہ سال کی تھی۔[۲۷۳] قیاس یہ ہے کہ حضرات سعد و عامر وغیرہ کے گھرانے کی خواتین بھی مسلمان تھیں اور ان میں سر فہرست ان کی والدہ ماجدہ بھی تھیں

بنو زہرہ کے ایک اور گھرانے بنو شہاب کے دو رکن حضرات عبداللہ بن شہاب زہری اور ان کے چھوٹے بھائی عبداللہ اصغر بھی عہد قدیم کے مسلمان تھے۔ ان میں سے اول الذکر نے ہجرت حبشہ سے قبل مکہ میں انتقال کیا تھا جبکہ موخر الذکر نے حبشہ ہجرت کی تھی اور واپس آکر ایک سال کے عرصہ سے زیادہ گزرا تھا کہ انھوں نے بھی وفات پائی تھی[۲۷۴] اگرچہ ماخذ کا اتفاق ہے کہ بنو زہرہ نے اجتماعی طور سے غزوۂ بدر میں شرکت نہیں کی تھی مگر ابن سعد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے رکن اور دونوں مسلمان صحابہ کے بڑے بھائی عبداللہ اکبر بن شہاب زہری نے مکی فوج کی جانب سے شرکت کی تھی اور جنگ میں مارے گئے تھے۔[۲۷۵] ممکن ہے کہ بنو زہرہ کے اس رکن نے اپنے قبیلہ کو چھوڑ کر اپنی انفرادی حیثیت سے شرکت کی ہو بالکل اسی طرح جس طرح طالب بن ابی طالب ہاشمی نے بنو ہاشم کا ساتھ اس معاملہ میں نہیں دیا تھا اور راستے سے مکہ پلٹ گئے تھے جبکہ ان کے ایک بھائی عقیل اور چچا عباس وغیرہ نے غزوۂ بدر میں بنو ہاشم کی نمائندگی کی تھی۔

بنو زہرہ کے مختلف گھرانوں کے ساتھ ساتھ ان کے متعدد حلفاء اور موالی نے بھی مکی عہد اسلام کے دور اول کے آغاز میں اسلام قبول کیا تھا۔ ان میں بنو ہذیل کا ایک خاندان تھا جس کے دو مردوں اور ایک خاتون نے کم از کم اسلام قبول کیا تھا وہ تھے حضرت عبداللہ بن مسعود ہذلی اور ان کے بھائی عتبہ اور ان کی والدہ ماجدہ۔[۲۷۶] غالباً ان کے والد ماجد کا اس وقت تک انتقال ہو چکا تھا۔ اگرچہ ماخذ ان دونوں ہذلی مسلمانوں کے اہل و عیال کا ذکر نہیں کرتے لیکن یہ حتمی ہے کہ ان کے گھرانے کے افراد جن میں مرد، عورتیں اور بچے شامل تھے اسلام لا چکے تھے کیونکہ ہجرت کے وقت ان

دونوں بھائیوں کی عمریں ۳۵ - ۳۰ سال کے درمیان تھیں۔ ان کے حلفاء میں ایک مختصر سا کندی گھرانا حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی کا تھا۔ وہ اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت حسنہ نہ صرف قدیم مسلمان تھے بلکہ مہاجر حبشہ و مدینہ بھی تھے ان کے اہل و عیال بھی مسلمان ہو چکے تھے۔[۲۷۷] اسی طرح ایک اور حلیف حضرت مقداد بن عمرو بہرانی تھے جو اسود بن عبد یغوث زہری کے حلیف ہی نہیں متبنیٰ بھی تھے۔ ان کا چھوٹا سا کنبہ مکی عہد کا مسلم تھا۔[۲۷۸] ایک خزاعی حلیف حضرت ذوالشمالین بن عمرو خزاعی ابتدائی مکی مسلم اور بدری صحابی تھے۔[۲۷۹] اس خاندان کے ایک مولیٰ حضرت خباب بن ارت تمیمی قدیم ترین مکی مسلمانوں میں شامل تھے جنہوں نے اسلام کی خاطر بے نظیر قربانیاں دی تھیں۔ ایک اور حلیف حضرت مسعود القاری بھی ابتدائی مسلمان تھے[۲۸۰]

غالباً مدنی عہد میں اسلام مکہ کے بنو زہرہ میں پھیلتا رہا تھا مگر ہمارے پاس اس کے ثبوت کم ہیں۔ فتح مکہ میں البتہ وہ سب مسلمان ہو گئے تھے۔ اس دور کے ممتاز مسلمانوں میں حضرات مخرمہ بن نوفل، اسید بن حارث، عبداللہ بن ارقم اور عبدالرحمٰن بن ارقم کے علاوہ ان کے ایک حلیف حضرت علاء بن جاریہ شامل تھے۔[۲۸۱] یہ بات بلا ریب کہی جا سکتی ہے کہ کیا قدیم اور کیا بعد کے زہری مسلمانوں کی تعداد ہماری فہرست سے کہیں زیادہ تھی۔

(۷) بنو اسد

چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں قریش مکہ کا خاندان بنو اسد اگرچہ مکی اشرافیہ کا رکن تھا اور اقتصادی دولت اور تجارتی مہارت کے لیے خاصا ممتاز تھا تاہم عددی اعتبار سے چھوٹا ہونے کے سبب دوسرے درجہ کے قریشی خاندانوں میں گنا جاتا تھا۔[۲۸۲] بعثت نبوی کے قریبی زمانے میں اس کے متعدد افراد جیسے زمعہ بن اسود، ابوالبختری، نوفل بن خویلد کے علاوہ حضرت خدیجہ بنت خویلد اور ان کے بھتیجے حکیم بن حزام ممتاز و متمول تاجران مکہ میں سمجھے جاتے تھے۔ اگر بنو اسد کے ازدواجی تعلقات بنو مخزوم، بنو عبد شمس اور بنو ہاشم سے تھے تو تجارتی تعلقات بنو تیم وغیرہ سے بھی تھے۔[۲۸۳]

بنو خویلد کے حضرت زبیر بن عوام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب کے فرزند تھے۔ ابن اسحاق نے حضرت زبیر کو پہلے آٹھ مسلمانوں میں شمار کیا ہے۔ وہ حضرت ابوبکر کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ اور انہی کی تحریک پر اسلام لائے تھے۔[۲۸۴] حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب بھی قدیم مکی مسلم تھیں اور غالباً وہ اپنے فرزند کے ساتھ یا ان کے قبول اسلام کے معاً بعد مشرف بہ اسلام ہوئی تھیں۔[۲۸۵] اسی زمانے میں ان کے ایک اور فرزند حضرت صائب بن عوام نے اسلام قبول کیا تھا جبکہ ان کے فرزند اکبر عبدالرحمٰن بن عوام نے فتح مکہ میں یہ شرف حاصل کیا تھا۔[۲۸۶] بنو خویلد کے دوسرے ابتدائی مسلمانوں میں حضرت خدیجہ بنت خویلد[۲۸۸] اور ان کے ایک بھتیجے حضرت خالد بن حزام تھے۔[۲۸۹] حضرت خدیجہ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پہلی مسلم تھیں۔ ان کی ایک بہن ہالہ بھی مکی عہد کی مسلم تھیں۔[۲۹۰] وہ رسول کریم کے بڑے داماد کی والدہ ماجدہ تھیں۔ اسی طرح اسود بن نوفل بن خویلد بھی قدیم مکی مسلمان تھے۔[۲۹۱] بنو حارث میں حضرت عمرو بن امیہ اسدی[۲۹۲] اور بنو اسود میں حضرت یزید بن زمعہ اسدی ابتدائی مسلم تھے۔[۲۹۳] یہ نکتہ با حقیقت کافی اہم ہے

کہ یہ تمام ابتدائی مسلمان سردارانِ اسد کے اولاد و احفاد تھے اور کسی طرح سے ان کو بنو اسد کے ذیلی یا غیر اہم خاندانوں کے افراد نہیں سمجھا جا سکتا۔ بنو اسد[۲۹۴] کے بعض حلیف اور موالی بھی ابتدائی مسلم تھے جن میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ لخمی اور ان کے مولی حضرت سعد ممتاز افراد تھے۔ یہ دونوں بزرگ بدری صحابی تھے[۲۹۵]۔

مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو اسد میں ہجرتِ نبوی کے بعد بھی اسلام کی اشاعت جاری رہی۔ اس کی ایک مثال حضرت ہبار بن اسود بنو مطلب / اسد کے قبولِ اسلام کا واقعہ ہے۔ وہ غزوۂ بدر کے بعد اسلام لائے تھے اور ہجرت کر کے مدینے جا بسے تھے۔ امکان ہے[۲۹۶] کہ ایسے اور مسلمان رہے ہوں گے۔

بہر حال فتح مکہ میں یہ پورا گھرانا اسلام کے دائرے میں داخل ہو چکا تھا۔ فتح مکہ کے ممتاز مسلمانوں میں حضرت حکیم بن حزام اور غالباً ان کے فرزند ہشام بن حکیم تھے۔[۲۹۷] یہ یقینی ہے کہ خانوادۂ اسد کے متعدد دوسرے حضرات و خواتین بھی اس روز اسلام لائے تھے[۲۹۸]۔

(۸) بنو جمح

بنو جمح مکی اشرافیہ کے رکن ہونے کے علاوہ مکی سماج میں خاصے طاقتور تھے[۲۹۹] لیکن ان کا بھی شمار دوسرے درجہ کے خاندانوں میں ہوتا تھا۔ ان کا سماجی و اقتصادی مقام بنو سہم یا بنو اسد کے مانند تھا۔ مکی دورِ نبوی میں اسلام کے سخت ترین دشمنوں میں بنو وہب کے دو رکن امیہ بن خلف اور اس کا بھائی ابی بن خلف پیش پیش تھے۔ وہ قریشی سرداروں میں غالباً اسی عداوتِ اسلام و دشمنیٔ رسول کے سبب گنے جاتے تھے۔[۳۰۰] دراصل خاندانِ بنو وہب کی دو شاخیں اسلام و کفر کی آویزش کی دو نمایاں مثالیں تھیں۔ ایک بنو خلف بن وہب کا گھرانا تھا جس کے مذکورہ بالا سردار نمائندے تھے اور دوسرا بنو حبیب بن وہب کا گھرانا تھا جس کے ممتاز ترین نمائندے حضرت عثمان بن مظعون بن حبیب بن وہب تھے۔

حضرت عثمان بن مظعون جمحی قدیم ترین مکی مسلمانوں میں تھے۔ ان کو ابن اسحاق نے پہلے چھیالیس یا چون مسلمانوں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔[۳۰۱] تقریباً یہ یقینی ہے کہ ان کا پورا گھرانا مسلمان ہو گیا تھا کیوں کہ فہرست میں ان کے کم از کم تین بھائیوں حضرات سائب قدامہ اور عبداللہؓ کے علاوہ ان کے ایک فرزند حضرت سائب بن عثمان کو بھی شمار کیا گیا ہے[۳۰۲]۔ ان کی جمحی اہلیہ بھی مسلمان تھیں[۳۰۳] اُفعان کی ایک بہن کے قبولِ اسلام کے بارے میں ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ مآخذ نے اگرچہ اس موقع پر ان کے اور بھائی بہنوں، فرزندوں اور دختروں اور دوسرے اعزہ جیسے والدہ وغیرہ کا ذکر نہیں کیا ہے تاہم یہ یقینی ہے کہ ان کا پورا گھرانا مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا کیونکہ روایات میں ہے کہ جب بنو مظعون نے اپنی تمام عورتوں، مردوں اور بچوں کے ساتھ مدینہ ہجرت کی تو وہ اپنی تمام جائیداد منقولہ و اسباب و دولت اپنے ساتھ مدینہ لے گئے تھے اور مکہ میں اپنے گھروں کو تالا لگا گئے تھے[۳۰۴]۔

بنو جمح کا ایک اور ابتدائی مکی مسلم گھرانا بنو معمر بن حبیب بن جمح کا تھا۔ اس کے کئی افراد کے ناموں کا ذکر ملتا

ہے۔ ان میں حضرات معمر بن حارث، ان کے دو بھائی حطاب بن حارث اور حاطب بن حارث، حاطب کی اہلیہ مکرمہ حضرت فاطمہ بنت مجلل اور ان دونوں میاں بیوی کے دو فرزندان گرامی حضرات محمد اور حارث، حضرت حطاب بن حارث کی زوجہ محترمہ حضرت فکیہہ بنت یسار شامل تھے۔ ممکن ہے کہ کچھ اور افراد بھی مسلمان ہوئے ہوں۔ یہ گھرانا پورا مسلمان ہو گیا تھا۔[305] ان کے علاوہ ان کے چچا بنو معمر بن حبیب کے خاندان میں حضرت سفیان بن معمر، ان کی اہلیہ محترمہ حسنہ اور دونوں کے دو فرزند حضرات جابر اور جنادہ، حضرت سفیان کے ایک حقیقی بھائی حضرت جمیل بن معمر اور ان کے ایک ماں جائے بھائی حضرت شرحبیل بن عبداللہ غوثی نمایاں ترین مسلمان تھے۔[306] یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بنو جمح کا گھرانا بھی پورا اسلام لے آیا تھا۔ اگرچہ اس کی خواتین اور بچوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

بنو وہب کے ایک ذیلی گھرانے بنو احبان بن وہب کے ایک اہم فرد حضرت نبیہہ بن عثمان بن ربیعہ تھے جنہوں نے ہجرت حبشہ سے پہلے نہ صرف اسلام قبول کیا تھا بلکہ اللہ کی راہ میں وطن بھی چھوڑ دیا تھا۔[307] قیاس ہے کہ اس خاندان کے مزید ارکان نے مکی دور اول ہی میں یا دور ثانی میں اسلام قبول کیا تھا۔

ہجرت نبوی کے بعد بھی اسلام کی اشاعت کا سلسلہ بنو جمح کے مختلف گھرانوں میں جاری رہا تھا۔ اس کی دلچسپ مثال عمیر بن وہب جمحی کے صاحبزادے حضرت وہب کی ہے۔ موصوف اسلام کے نہ صرف دشمن تھے بلکہ غزوہ بدر میں کی لشکر کی شکست پر اتنے برافروختہ ہوئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے مدینہ چل پڑے مگر وہاں پہنچ کر جمال روئے انور نبوی اور رحمت عام نبوی سے اس قدر متاثر اور مبہوت ہوئے کہ اسلام لائے بغیر نہ بنی۔ گھر بار چھوڑ چھاڑ کر وہ مدینہ ہی میں جوار نبوی میں بس گئے۔[308] یہ اور ایسی ہی دوسری مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ ہجرت کے بعد بھی مکہ کی سنگلاخ و سنگین زمین میں قبول اسلام کی نمو باقی تھی۔ اس کی تائید مزید حضرت سعید بن عامر بن حذیم جمحی کے قبول اسلام کے واقعہ سے ہوتی ہے جو صلح حدیبیہ کے فوری بعد اسلام لائے تھے، مدینہ ہجرت کر کے پہنچے اور خیبر کے غزوہ میں شریک جہاد ہوئے۔[309] امکان یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہونے والے بنو جمح میں حضرت سعید بن عامر تنہا شخص نہیں تھے۔

فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کرنے والوں میں بنو جمح کے ممتاز افراد میں حضرات صفوان بن امیہ،[310] عمیر بن وہب اول الذکر کے دو فرزند عبدالرحمن اکبر اور عبداللہ منکبر اور ان دونوں کی مائیں بالترتیب حضرت ام حبیب بنت ابی سفیان اور حضرت برزہ بنت مسعود بن عمر،[311] امیہ بن خلف کے فرزند گرامی حضرت احیحہ اور پوتے حضرت اسید بن احیحہ کے علاوہ[312] حضرت ابو محذورہ اوس بن معیر بن لوذان جمحی بھی شامل تھے۔ موخر الذکر صحابی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت خوش گلو موذن کعبہ تھے اور انہی کے خاندان میں یہ شرف ہمیشہ باقی رہا۔[313] بلاریب بنو جمح کے کل مسلمانوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ تھی جن کے اسمائے گرامی ماخذ میں مذکور ہیں یا پردہ گمنامی میں پوشیدہ[314]

۹- بنو عبد الدار

عبد الدار شہر مکہ کے بانی اوّل قصی کے فرزند اکبر اور عبد مناف کے برادر اکبر تھے۔ ہمارے عام مآخذ میں عموماً یہ بیان ملتا ہے کہ قصی نے اپنی زندگی میں اپنے پانچوں مناصب فرزند اکبر کو دے دیئے تھے۔ اور بقیہ فرزندوں کو محروم کر دیا تھا قصی کے بعد یہی بنائے مخاصمت بنی اور عبد مناف اور عبد الدار کے فرزندوں کے درمیان تصادم کی نوبت آ گئی لیکن معاملہ صلح و معاہدہ سے سلجھ گیا اور دونوں خاندانوں میں تقسیم مناصب ہو گئی اور اس کے بعد بنو عبد الدار کی سماجی اور اقتصادی حیثیت وہ نہیں رہی جو تھی۔ یہ بیان یک طرفہ اور غلط ہے۔ ازرقی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قصی نے اپنے چھ مناصب برابر برابر اپنے دونوں فرزندوں عبد الدار اور عبد مناف میں تقسیم کر دیئے تھے۔ جو ان کے گھرانوں میں بالترتیب چلتے رہے[215] بنو عبد الدار کی سماجی اور مذہبی برتری سے کوئی مؤرخ انکار نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اب بھی کعبہ کے متولی اور کلید بردار تھے۔ جو مذہبی لحاظ سے سب سے بڑا عہدہ تھا۔[216] البتہ ان کی عددی طاقت کے کم ہو جانے اور اقتصادی ثروت نہ ہونے کے سبب وہ بنو عبد مناف کے ہم پلہ نہیں رہے تھے۔ اور قریشی بطون کی دوسری صف میں آ گئے تھے۔

بنو عبد الدار کے نسبتاً ایک متمول گھرانے کے دو افراد حضرت مصعب بن عمیر بن ہاشم[217] اور ان کے بھائی حضرت ابوالروم بن عمیر ابتدائی مکی مسلمانوں میں شامل تھے[218]۔ اسلام کی خاطر انہوں نے نہ صرف عیش و عشرت کی زندگی چھوڑی بلکہ قریش کے خاص کر اپنی کافرہ ماں کے ظلم و ستم بھی سہے اور اسی سبب ہی وطن سے ہجرت کر کے حبشہ بھی گئے۔ اس کاروان مجاہدین حبشہ میں بنو عبد الدار کے تین مختلف گھرانوں کے متعدد افراد شامل تھے۔ ابن اسحاق نے حضرت سُوَیبط بن سعد، حضرت جہم بن قیس اور ان کی زوجہ محترمہ حضرت ام حرملہ بنت عبد الاسد خزاعی اور ان دونوں میاں بیوی کے دو فرزندوں حضرات عمرو اور خزیمہ کے علاوہ حضرت فراس بن نضر بن حارث کو بھی گنایا ہے[219]۔ مؤخر الذکر صحابی خاندان عبدری کے ایک اہم سردار کے فرزند جلیل تھے۔ ابن سعد نے اس میں بنو عبد الدار کے ایک مولیٰ حضرت ابو فکیہہ ازدی کا اضافہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ قدیم الاسلام مکی بھی تھے اور مہاجر حبشہ بھی[220]۔ ابن اسحاق کے مطابق حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت سویبط مہاجرین حبشہ کے مکہ لوٹ آنے والے گروہ میں شامل تھے اور بعد میں ان دونوں نے ہجرت نبوی سے ایک سال قبل مدینہ کو ہجرت کی تھی[221]۔ یہ دونوں عبدری صحابی بدری ہونے کی فضیلت بھی رکھتے تھے[222] اسی خاندان کی ایک خاتون حضرت برہ بنت عامر نہ صرف ابتدائی مسلمان تھیں بلکہ مہاجرات مدینہ میں بھی شامل تھیں[223]۔ ایسی خواتین نہ جانے اور کتنی ہوں گی

ہجرت نبوی کے بعد مکہ کے باقی ماندہ عبدریوں میں اسلام کی اشاعت کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ کیونکہ مآخذ عموماً اس موضوع پر صراحت کے ساتھ کچھ نہیں کہتے ہیں۔ البتہ یہ قیاس کرنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ سست روی سے سہی اسلام کی تاثیر و کارکردگی کا سلسلہ جاری ہی رہا ہوگا۔ البتہ یہ یقینی ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد بنو عبد الدار کے عاقل و فہیم اشخاص اسلام میں داخل ہونے لگے تھے۔ اس کی سب سے درخشاں مثال بنو عبد الدار کے ممتاز ترین سردار اور کلید بردار و متولی

کعبۃ اللہ الحرام حضرت عثمان بن طلحہ عبدری کے قبول اسلام کا واقعہ ہے۔ ابن سعد نے قریش مکہ کے جن تین عظیم شخصیتوں کے اسلام قبول کرنے کا اس زمانے میں ذکر کیا ہے۔ حضرت عثمان عبدری ان میں سے ایک تھے[۲۲۴]۔ اگرچہ ابن سعد اور دوسرے سیرت نگاروں نے اس موقعہ پر یہ صراحت نہیں کی ہے کہ ان کے خاندان نے اسلام قبول کیا تھا۔ یا نہیں تاہم دوسرے ذرائع بلکہ انہی ماخذ کے دوسرے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خاندان والے نہ صرف ان کے ساتھ مسلمان ہوئے تھے۔ بلکہ وہ ہجرت کر کے مدینہ بھی جا بسے تھے۔ مزید امکان یہ بھی ہے کہ ان کے علاوہ بھی دوسرے عبدریوں نے اسی زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ خاص کر حضرت عثمان عبدری کے برادروں اور رشتہ داروں نے

بہر حال فتح مکہ کے دن یا اس کے بعد کے متصل زمانے میں بنو عبدالدار کے دوسرے تمام افراد اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے تھے۔ ان میں حضرت نضیر بن حارث عبدری بھی شامل تھے۔ جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے غنائم کے خمس سے خاص عطیہ نبوی اور سرداروں کا حصہ عطا فرمایا تھا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت عثمان بن طلحہ کے ایک فرزند حضرت شیبہ بن عثمان نے فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا[۲۲۵]۔ ظاہر ہے کہ متعدد اور بھی عبدری اس دن مسلمان ہوئے تھے

عبدالدار کے ایک بھائی عبد قصی کی نسل کچھ زیادہ نہیں چلی تھی۔ لہٰذا وہ کبھی ایک گھرانا نہیں بن سکا۔ اس کے بہت کم افراد میں سے حضرت طلیب بن عمیر مکی عہد کے قدیم مسلمان تھے[۲۲۶]۔ ان کے علاوہ دوسروں کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ زبیری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نسل ہی منقطع ہو گئی تھی۔ پھر بھی کچھ مرد عورتیں اور بچے یقینی طور سے عہد نبوی کے مسلم تھے۔

۱۰۔ بنو عامر بن لوی

بنو عامر بن لوی کو مکی اشرافیہ میں کوئی خاص مقام حاصل نہیں تھا، حالانکہ وہ عددی لحاظ سے قریش کے بڑے بطون میں سے ایک تھا۔ اس کا غالباً سبب یہ تھا کہ وہ قریش البطائح کے مقابلے میں قریش الظواہر کے زیادہ قریب تھے[۲۲۷]۔ بعثت نبوی کے بعد اس کے بعض سرداروں خاص کر سہیل بن عمرو کی طاقت میں اضافہ ہوا تھا۔ اور صلح حدیبیہ کے زمانے میں وہ مکہ کے اہم ترین رؤسا و اشراف میں شمار ہوتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے قریش کے نمائندے کی حیثیت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح حدیبیہ کا معاہدہ طے کیا تھا۔ اور متن معاہدہ کے مطابق تو فریق ثانی وہی تھے[۲۲۸]

بہر حال اسلام نے قریش البطائح اور قریش الظواہر تو درکنار اسود و احمر اور نسل و رنگ و وطن و علاقہ و زبان وغیرہ کسی انسانی یا قدرتی حد بندی کی پروا نہیں کی۔ چنانچہ مکی دور تبلیغ کے نصف اول کے آغاز ہی میں اس نے ابن اسحاق اور ابن سعد کے بقول اس قریشی خاندان کے بعض گھرانوں میں قدم جما لئے تھے۔ اس کے ایک گھرانے بنو عبد شمس کے دو افراد حضرات سلیط بن عمرو بن عبد شمس اور ان کے بھائی سکران قدیم ترین مسلمان تھے۔ ان دونوں کی زوجات محترمات بالترتیب حضرت فاطمہ بنت علقمہ اور حضرت سودہ بنت زمعہ بھی مسلمان ہو گئی تھیں۔ ماخذ کے بیان کے مطابق ان دونوں

بھائیوں کے گھرانوں نے حبشہ کو ہجرت کی تھی۔ جہاں حضرت سکران کا انتقال ہوگیا تھا اور باقی عامری مہاجرین ایک سال بعد مکہ پلٹ آئے تھے[۲۲۹]۔ حضرت سکران ہی کی بیوہ حضرت سودہ تھیں۔ جن سے حضرت خدیجہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کرلی تھی[۲۳۰]۔ اگرچہ ماخذ صراحت نہیں کرتے۔ مگر انساب وسیر کی دوسری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے متعلقین خاص کر بچے بھی مسلمان تھے یا ہو گئے تھے۔ بنو عامر کے ایک اور گھرانے کے اہم ترین مکی مسلم تھے۔ حضرت ابن ام مکتوم جن کے اصل نام میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ علماء مدینہ کے نزدیک۔ ان کا نام عبداللہ بن قیس جبکہ علماء عراق و شام عمرو بن قیس بتاتے ہیں۔[۲۳۱]

ابن اسحاق نے[۲۳۲] اپنی فہرست مہاجرین حبشہ میں بنو عامر کے مختلف گھرانوں کے آٹھ حضرات و خواتین کے اسمائے گرامی بیان کئے ہیں۔ ان میں مذکورہ بالا بزرگوں کے علاوہ (حضرت ابن ام مکتوم کو چھوڑ کر) حضرات ابو سبرہ بن ابی رہم[۲۳۳] اور ان کی زوجہ محترمہ حضرت ام کلثوم بنت سہیل بن عمرو[۲۳۴]۔ عبداللہ بن مخرمہ[۲۳۵]۔ عبداللہ بن سہیل بن عمرو[۲۳۶]۔ مالک بن زمعہ بن قیس[۲۳۷] اور ان کی اہلیہ عمرہ بنت سعدی بن وقدان[۲۳۸] اور حاطب بن عمرو بن عبد شمس[۲۳۹] اور ان کے ایک یمنی حلیف سعد بن خولی کو شمار کیا ہے[۲۴۰]۔ بدری صحابہ کی فہرست میں ابن اسحاق نے ایک نئے عامری نام عمیر بن عوف جو دراصل ان کے مولیٰ تھے کا اضافہ کیا ہے۔ اور ان کو مکہ کا قدیم مسلم قرار دیا ہے[۲۴۱]

تاریخی عوامل کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اسلام نے سہیل بن عمرو عامری جو اسلام و رسول اسلام کے سخت مخالفوں میں تھے کے گھر میں یوں قدم جمالئے کہ ان کے اہل خاندان میں سے ہر فرد رفتہ رفتہ ان کا ساتھ چھوڑتا اور اسلام کا پیرو بنتا گیا۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ ان کے ایک فرزند عبداللہ اور ایک صاحبزادی ام کلثوم نہ صرف اسلام لاچکے تھے۔ بلکہ مہاجرین حبشہ میں بھی شامل تھے۔ اسی طرح ان کے دونوں بھائیوں سلیط اور سکران اور دونوں بھاوجیں فاطمہ اور سودہ بھی ابتدائی مسلمان تھے ان کی دوسری کتخدا تمام بیٹیاں بھی مسلمان ہوچکی تھیں۔ ان میں ایک حضرت سہیلہ تھیں جو حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ اموی کی زوجہ محترمہ تھیں۔ اپنے اقتدار و وقار کی خلاف ورزی نے غالباً ان کی مخالفت اسلام میں شدت پیدا کردی تھی اور انہوں نے اپنے مسلم فرزندوں پر پابندیاں عائد کردی تھیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن سہیل کی حبشہ سے واپسی پر ان کو اور اسی زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے یا بعد میں ان کے ایک اور بھائی حضرت ابو جندل کو مکہ میں محبوس و مقید رکھا تھا[۲۴۲]۔ حضرت عبداللہ خوش نصیب تھے کہ بدر کے موقع پر مکی فوج میں شریک ہوکر مدینہ پہنچے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن رحمت میں پناہ گزیں ہوئے مگر ان کے بھائی ابو جندل کو صلح حدیبیہ کے کچھ بعد تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ ان کے علاوہ اس خاندان کے اور بھی قدیم و متاخر مسلمان تھے[۲۴۳]

بنو عامر کے دو اور ابتدائی مسلمان حضرت وہب بن سعد بن ابی سرح اور ان کے بھائی عبداللہ تھے۔ اگرچہ متوخر الذکر کے بارے میں روایات شاہد ہیں۔ کہ وہ مدینہ سے بھاگ کر مرتد ہو گئے تھے۔ تاہم فتح مکہ میں وہ پھر اسلام لے آئے تھے اور مخلص مسلمان بن گئے تھے[۲۴۴]۔ فتح مکہ ہی میں حضرت سہیل بن عمرو عامری بھی مسلمان ہوئے تھے، اور ایسے

پکے اور راسخ العقیدہ گروہ کے زمانے میں جب اوروں کے قدم ڈگمگانے لگے تھے وہ نہ صرف چٹان کی طرح ثابت قدم رہے تھے۔ بلکہ انہوں نے دوسروں کے قدم بھی جما دیئے تھے[۳۴۵]۔ دوسرے مسلمین فتح مکہ میں حضرت حویطب بن عبد العزیٰ[۳۴۶] اور ہشام بن عمرو[۳۴۷] اور حضرت سہیل کے ایک فرزند عتبہ کے علاوہ عبد بن زمعہ اور ان کے بھائی عبد الرحمٰن[۳۴۸] بھی شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے علاوہ متعدد بلکہ کثیر عامری مسلمان صحابہ ایسے تھے جو اس تذکرہ میں نہیں آ سکے ہیں[۳۴۹]۔

۱۱- بنو حارث بن فہر

بنو عامر بن لوی کی مانند یہ خاندان بھی قریش الظواہر میں شمار ہوتا تھا اور کبھی کبھی قریش البطاح میں بھی مگر مکی اشرافیہ میں اس کو کوئی مقام حاصل نہیں تھا[۳۵۰] اور غالباً بعثت نبوی کے زمانے کے قریب یا اس کے بعد عہد اسلامی میں اس "مکہ کے بیرونی خاندان قریش" میں کوئی ایسی عظیم اور طاقتور شخصیت نہیں پیدا ہو سکی جو اسے مکی سماج و سیاست میں کوئی نمایاں مقام دلا سکتی جیسے کہ حضرت سہیل بن عمرو عامری نے اپنی صلاحیتوں کے سبب خاندان بنو عامر بن لوی کو دلایا تھا۔

بہر حال اس طبقاتی اونچ نیچ اور مکی سماج میں اس کے فروتر مقام سے قطع نظر اسلام نے بالکل شروع سے اس خاندان میں بھی اپنا اثر جما لیا تھا۔ ابن اسحاق نے قدیم ترین آٹھ مسلمانوں کی فہرست کے بعد جو چھیالیس مسلمانان مکہ کی فہرست دی ہے۔ اس میں حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہری کو سر فہرست رکھا ہے[۳۵۱]۔ درحقیقت بنو حارث بن فہر میں حضرت ابو عبیدہ کا کوئی کلیدی مقام رہا ہو یا نہ رہا ہو مگر امت اسلامی میں وہ اپنی گوناگوں صلاحیتوں اور قربانیوں کے سبب نمایاں ترین افراد میں شمار کئے جاتے تھے اور عہد نبوی میں ہی وہ حضرات ابو بکر و عمر و عثمان کے پایہ و درجہ کے سمجھے جاتے تھے۔ وہ نہ صرف اسلام کے قدیم ترین ماننے والوں میں تھے۔ بلکہ اس کے کامیاب ترین و پرجوش ترین مبلغوں میں بھی تھے اور ان کے ہاتھ پر متعدد خواتین و حضرات نے اسلام قبول کیا تھا[۳۵۲]۔ ماخذ ان کے اپنے خاندان کے افراد کے قبول اسلام کے بارے میں خاموش ہیں۔ لیکن یہ تقریباً یقینی ہے کہ ان میں سے اکثر عہد مکی قدیم میں ہی مسلمان ہو چکے تھے[۳۵۳]۔

بنو حارث بن فہر کے ایک اور گھرانے کے ایک اور قدیم مسلم تھے۔ حضرت سہل بن بیضا فہری۔ وہ حضرت ابو بکر کے قدیم و قریبی دوست تھے اور ممکن ہے کہ ان کی دعوت پر اسلام لائے ہوں[۳۵۴]۔ ابن اسحاق نے مہاجرین حبشہ کی فہرست میں جن اور فہری مسلمانوں کے نام گنائے ہیں۔ ان میں مذکورہ بالا دونوں صحابہ کے علاوہ حضرات عمرو بن ابی سرح بن ربیعہ، عیاض بن زہیر، عمرو بن حارث، عثمان بن عبد غنم، سعد بن عبد قیس اور حارث بن عبد قیس کے اسمائے گرامی بیان کئے ہیں[۳۵۵]۔ بدری صحابہ کی فہرست میں اس خاندان کے پانچ افراد کا نام شامل کیا ہے۔ جن میں صفوان بن بیضاء کا نام نیا ہے[۳۵۶]۔ ان کے علاوہ دوسرے ابتدائی مسلمانوں میں حضرت حاطب بن عمرو بن ابی سرح اور حضرت عامر بن عبد غنم کو بھی شمار کرنا چاہیے[۳۵۷]۔ ہجرت نبوی کے بعد قریش الظواہر میں اسلام کی اشاعت کی رفتار کے بارے میں ہمارے ماخذ عام طور سے خاموش رہتے ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ دوسرے بطون قریش کی مانند ان میں بھی اسلام پھیلنے کا سلسلہ جاری رہا ہوگا اور فتح مکہ میں وہ بھی

اسلامی امت کے جزو بن چکے تھے[358] ابن اثیر کے اس بیان سے کہ حضرت کرز بن جابر فہری نے بدر کے بعد کسی وقت اسلام قبول کیا تھا۔ اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔[359]

قریش الظواہر

یہ حیرت کی بات ہے کہ ہمارے قدیم مؤلفین سیرت و مؤرخین اسلام عام طور سے اپنی ساری توجہ قریش البطاح کے مختلف بطون اور خاندانوں میں اشاعت و نشر اسلام پر مرکوز رکھتے ہیں اور اس سے زیادہ حیرت ناک و ناقابل فہم رویہ ہمارے جدید مسلم و مستشرق مؤرخین و سیرت نگاروں کا ہے جو تحقیق و تفتیش کے بلند بانگ دعووں کے باوجود قدیم مآخذ کے تتبع میں انہیں خطوط پر چلتے ہیں جن پر ان کے پیشرو چل چکے تھے۔ بہرحال قدیم و جدید دونوں مصنفین نے پوری طرح سے قریش الظواہر اور ان کے گھرانوں میں تبلیغ و اشاعت اسلام کی بحث سے صرف نظر کیا ہے۔ لیون کیتانی اور مونٹگمری واٹ وغیرہ جنہوں نے بڑی کدوکاوش سے مکی مسلمانوں کی فہرستیں تیار کی ہیں۔ قریش الظواہر کے مکی و مدنی مسلمانوں کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے اور ان کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔[360] حالانکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ، دور کے باسی اور مکی سیاست و سماج میں غیر اہم عناصر بھی، قریش الظواہر بھی بہرحال مکہ کے باشندے تھے اور یہ بھی مسلمہ واقعہ ہے کہ وہ بھی مختلف زمانوں اور ادوار میں اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ اسلام کی دعوت صرف قریش کے "اندرون مکہ" کے باشندوں کے لئے ہی نہیں تھی بلکہ اس کے مخاطب و مستحق اور علمبردار اس کے بیرونی باشندے بھی تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی دعوت حق دی تھی اور انہوں نے اسے قبول بھی کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے مآخذ میں ان کے بارے میں معلومات بہت ناقص ہیں پھر بھی ان میں اسلام کی قبولیت و اشاعت کی رفتار و نہج پر مختصر سا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

قریش الظواہر میں عام طور سے فہر کی وہ اولاد اور ان کی نسلیں شمار کی جاتی ہیں۔ جو فہر کے پوتے کعب بن غالب کے علاوہ تھیں۔ اس لحاظ سے بنو عامر بن لوی اور بنو حارث بن فہر بھی قریش الظواہر کے خاندان تھے۔ لیکن ان کو بعض اوقات قریش البطاح کا رکن سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس لئے ان پر بحث انہی کے دوسرے اراکین / بطون کے ساتھ کی جاتی ہے بہرحال ذیل میں قریش الظواہر کے مختلف بطون میں قبول و نشر اسلام کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ان کے چھ مزید گھرانے تھے۔ چار بنو عامر بن لوی کے ذیلی گھرانے .... سامہ بن لوی، خزیمہ بن لوی، سعد بن لوی، اور حارث بن لوی، جبکہ ایک گھرانہ بنو تیم بن غالب کا تھا اور ایک ہی محارب بن فہر کا۔ ان کا مطالعہ انساب کی کتابوں پر بنیادی طور سے مبنی ہے۔[361]

بنو سامہ بن لوی کی اولادوں میں حارث بن سامہ کے فرزند لوی، عبیدہ، سعد، ربیعہ، عبدالبیت، سامہ اور حارث رسول کریم کے معاصر تھے۔ اور غالباً وہ کسی وقت اسلام ضرور لائے تھے۔ اسی طرح بنو ربیعہ بن حارث اور لوی بن حارث وغیرہ کے فرزندوں کے بارے میں گمان ہے کہ وہ عہد نبوی میں کسی دور کے مسلمان تھے۔

بنوخزیمہ بن لوی کو عائذۃ قریش بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں بنو حارث بن مالک بن عبید بن خزیمہ سے متعدد لوگ عہد نبوی کے معاصر مسلمان تھے۔ جبکہ بنو حرب بن خزیمہ کے متعدد افراد مسلمان ہو کر حضرت ابوبکر و عمر کے زمانے میں شام کے علاقے میں جا بسے تھے۔

بنوسعد بن لوی میں عبداللہ بن غانم کی اولاد یں یقینی طور پر عہد نبوی کی مسلمان تھیں۔ ان میں سے ابو الدہماء حضرت عمر کے عہد میں مدینہ آئے تھے اور حضرت عثمان بن عفان نے ان کے لئے شہادت دی تھی۔

بنوالحارث بن لوی میں حصین بن عقیدہ کی اولاد و اخلاف کے اسلام لانے کا گمان ہوتا ہے۔ اگرچہ تفصیلات نہ ہونے کے سبب یقینی طور سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

بنوتیم بن غالب جن کو بنو ادرم بھی کہا جاتا ہے کے بارے میں ہمارے سیرت کے مآخذ بھی روایت کرتے اور شہادت دیتے ہیں کہ اس کے ایک گھرانے بنو کثیر بن تیم الادرم کے ایک فرد عبداللہ بن خطل نے اسلام قبول کر کے مدینہ ہجرت کی تھی، مگر پھر وہ مرتد ہونے کے علاوہ ایک مسلمان کو قتل کر کے مکہ فرار ہو گیا۔ جہاں فتح مکہ کے دن وہ اپنے جرائم کی پاداش میں قتل کیا گیا تھا۔ امکان ہے بلکہ یقینی ہے کہ اس گھرانے میں مخلص مسلمان بھی تھے اور خاصے تھے۔

بنومحارب بن فہر میں مآخذ نے کئی صحابہ کرام کا نام گنایا ہے۔ ان میں حضرت عمرو بن ابی عامر مکی عہد کے قدیم مسلم تھے۔ جبکہ حضرت ضحاک بن قیس فہری عہد نبوی کے اواخر کے صحابی اور مسلمان تھے۔ ان کے علاوہ حضرت حبیب بن مسلمہ فہری کو بھی صحابہ میں شمار کیا گیا ہے۔ اگرچہ واقدی کا خیال ہے کہ ان کو شرف صحبت نبوی حاصل نہیں تھا۔ اسی طرح حضرت ضرار بن خطاب محاربی فہری بھی عہد نبوی کے اواخر کے مسلمان تھے۔ ایک اور مسلم محاربی تھے۔ حضرت رباح بن عمر جو سفر کے اچھے گیت لکھتے تھے۔ لیکن بنو محارب کے سب سے نامور صحابی تھے۔ حضرت کرز بن جابر محاربی فہری جو بدر کے بعد کسی وقت اسلام لائے تھے اور فتح مکہ میں چند مسلمان شہداء میں سے ایک تھے۔ ظاہر ہے کہ ان صحابہ کرام کے دوسرے خاندان والوں میں سے سب نہ سہی مگر کچھ یقیناً ابتدائی مسلمان تھے۔ ورنہ یہ تو قیاس کی کسوٹی پر یقینی ہے۔ کہ ان تمام خاندانوں کے تمام افراد فتح مکہ کے زمانے میں اسلام لا چکے تھے ۳۶۲

انصار مدینہ

ریاست اسلامی کے ارتقاء کے ضمن میں ہم انصار مدینہ کے دونوں قبیلوں اوس و خزرج کے اسلام سے تعارف و تعلقات کا جائزہ لے چکے ہیں۔ دراصل ان کے قبول اسلام کے چار عہد یا زمانے تھے۔ پہلا زمانہ ۱۱ھ نبوی کا ہے جب خزرج کے چھ اشخاص مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر مسلمان ہو گئے اور جب وہ اپنے وطن یثرب واپس لوٹے تو اسلام کے مبلغ و علمبردار بن کر لوٹے اور اپنے اپنے قبیلوں، خاندانوں اور پڑوسیوں میں اسلام پھیلاتے رہے ان کی دعوت و تبلیغ پر خاصی تعداد میں لوگ مسلمان ہو گئے۔ جن میں سے بارہ مسلمان۔ نو خزرج کے مختلف خاندانوں سے اور

تین اوس کے گھرانوں سے دوسرے برس یعنی ۶۲۱ء میں حج کے موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور پہلی بیعت عقبہ کی۔ ۶۲۱ء اور ۶۲۲ء کا درمیانی عرصہ دوسرا عہد تبلیغ اسلام ہے جو مدینہ میں شروع ہوا۔ اس زمانے میں مدینہ میں اسلام کی اشاعت میں تیز رفتاری آئی اور کافی لوگ مسلمان ہوئے۔ اس کا ایک سبب حضرت مصعب بن عمیر عبدری کا بطور مبلغ و معلم و امام بن کر مدینہ پہنچنا تھا۔ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے اور "خلیفہ" کی حیثیت سے تبلیغ و دعوت میں زبردست کوششیں کیں۔ ان کے دست راست اور تبلیغ اسلام کو مدینہ میں منظم کرنے والے حضرت اسعد بن زرارہ نجاری تھے۔ ان دونوں کی کوششوں، حکمت عملی، اور خلوص وجد و جہد سے قبیلہ اوس کے دو بڑے سردار حضرات سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر اسلام لے آئے اور اس کے نتیجہ میں پورا قبیلہ اوس مسلمان ہو گیا۔ یہ دوسرا مرحلہ ۶۲۲ء میں بیعت عقبہ ثانیہ پر ختم ہوا۔ جب مدینہ کے مسلمانوں کے بہتر نمائندے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ آکر ملے اور آپ کو مدینہ آنے کی دعوت دی۔ ۶۲۲ء میں بیعت عقبہ ثانیہ اور ہجرت نبوی کے کچھ بعد تک کا زمانہ مدینہ میں تبلیغ اسلام کا تیسرا مرحلہ تھا جب پورا مدینہ مسلمان ہو گیا تھا۔ سوائے اوس مناۃ کے تین چھوٹے چھوٹے گھرانوں بنو وائل، بنو واقف اور بنو خطمہ کے علاوہ ایک اور گھرانے بنو امیہ بن زید کے۔ یثرب کی غالب اکثریت بلکہ پچانوے فیصد آبادی کل تین ساڑھے تین برس میں مسلمان ہو گئی تھی۔ لیکن یہ پانچ فیصد عرب آبادی نے اپنے قبول اسلام میں لگ بھگ پانچ برس لگا دیئے اور وہ غزوہ خندق کے بعد اسلام لائے۔ ان کے قبول اسلام میں تاخیر کا سبب یہ تھا کہ ان کے سردار حضرت ابو قیس صیفی بن الاسلت نے اسلام نہیں قبول کیا تھا۔ اور ان کی پیروی میں ان کی قوم بھی قبول اسلام سے رکی رہی تھی۔ اس واقعہ سے مزید ثابت ہوتا ہے کہ سرداروں اور شیوخ قبائل کا اثر ان کے قبیلہ والوں پر کس قدر زیادہ دور رس اور ہمہ گیر ہوتا تھا۔ سرداروں کا قبول اسلام دراصل قبیلوں کا قبولِ اسلام ہوتا تھا۔ مکہ اور مدینہ میں اسلام کی تبلیغ و دعوت کے تقابلی مطالعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں قبول و اشاعتِ اسلام میں سب سے بڑی رکاوٹ سرداران قریش کی سرد مہری، مخالفت اور عداوت تھی۔ جبکہ مدینہ کے تمام اہم اوسی اور خزرجی سرداروں نے اسلام قبول کر کے اپنے قبیلوں کے مسلمان ہونے کی راہ ہموار کر دی تھی۔

مدینہ منورہ میں اشاعت اسلام کا سہرا جن حضرات کے سر بندھتا ہے۔ ان میں سر فہرست خزرج کے چھ سابقین اولین ہیں جنہوں نے مکہ میں سب سے پہلے قبول اسلام کیا تھا۔ پھر بیعت عقبہ اولیٰ کے بارہ ارکان کے نام آتے ہیں۔ لیکن اس عظیم کام میں سب سے اہم اور گرانقدر کردار حضرت مصعب بن عمیر عبدری اور ان کے دست راست حضرت ابو امامہ اسعد بن زرارہ نے ادا کیا تھا۔ ان کے بعد باقی کام بارہ نقیبوں نے حضرت مصعب کے ساتھ مل کر انجام دیا تھا۔ لیکن اس موقعہ پر اوسی و خزرج کے سرداروں کو نہیں بھولنا چاہیے کہ ان کے قبیلوں نے دراصل انہی کی تحریک و تقلید پر اسلام قبول کیا تھا۔

انصار مدینہ میں اشاعت اسلام کی بحث میں ان کے اہم خاندانوں اور گھرانوں کا ایک مختصر سا جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جس سے ان کی تعداد کا اندازہ کیا جا سکے گا۔ اوس و خزرج کے اہم خاندان اور قبیلے یہ تھے[۳۶۳]:

۱۔ اوس بن حارثہ بن ثعلبہ بن عمرو مزیقیاء

اوس کا قبیلہ اس کے ایک فرزند مالک کی نسل میں دراصل چلا تھا اور اس کے پانچ اہم خاندان تھے۔ یہ پانچ خاندان اور ان کے ذیلی گھرانے حسب ذیل تھے۔

(ل) بنو عوف بن مالک : (۱) بنو عمرو بن عوف : بنو ضُبَیعہ ، بنو امیہ ، بنو عبید ، بنو جحجبا ، بنو ثعلبہ ، بنو معاویہ
بنو لوذان ، بنو حنش ، بنو حبیب (بنو عمرو بن عوف قبا میں آباد تھے)

(ب) بنو عمرو بن مالک : (یہ النبیت کہلاتے تھے) : بنو عبد الاشہل ، بنو زعوراء بن جشم ، بنو حارثہ بن حارث
بنو مجدعہ بن حارثہ بن حارث ، بنو ظفر (بن خزرج بن عمرو بن مالک)

(ج) بنو مرۃ بن مالک : (یہ جعادرہ کہلاتے تھے) : بنو وائل ، بنو امیہ ، بنو عطیہ (اوس مناۃ کے گھرانے بشمول
بنو واقف)

(د) بنو جشم بن مالک : بنو خطمہ

(س) بنو امرء القیس بن مالک : بنو سلیم ، بنو واقف ، بنو غنم

(۲) خزرج بن حارثہ بن ثعلبہ بن عمرو مزیقیاء

(ا) بنو النجار : بنو جدیلہ ، بنو معاویہ ، بنو غنم بن مالک ، بنو حزم بن زید بن لوذان ، بنو مبذول ، بنو دینار
بنو مازن ، بنو عدی (بنو مغالہ)

(ب) بنو عوف : بنو عمرو بن عوف ، بنو سالم ، الحبلیٰ ، بنو عنز (قواقلہ)

(ج) بنو غنم :

(د) بنو جشم : بنو زریق بن عبد حارثہ ، بنو زریق بن عامر ، بیاضہ ، بنو تزید (ساروہ : بنو سلمہ)

(س) بنو حارث : بنو جشم ، بنو زید ، بنو عوف ، بنو خزرج ، بنو مالک بن ثعلبہ ، بنو عوف بن حارث
بنو جدارہ ، بنو ابجر

(ط) بنو کعب : بنو ساعدہ

انصار کے ان دونوں قبیلوں اور ان کے اہم خاندانوں کی تفصیل سے ایک موٹا سا اندازہ ان کی کل آبادی کا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس ان کی آبادی کے کل اعداد و شمار نہیں ہیں لیکن اندازہ ہے کہ فتح مکہ کے دس ہزار کے لشکر میں ان کی سپاہیوں کی تعداد چار اور پانچ ہزار کے درمیان تھی[۲۱۴]۔ اس پر قیاس کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انصار کی کل آبادی ہجرت نبوی کے وقت بیس پچیس ہزار کے لگ بھگ تھی جو وفات نبوی کے وقت تقریباً تیس پینتیس ہزار ہو گئی تھی۔ اتنی بڑی آبادی

کی غالب اکثریت کا تین ساڑھے تین برس میں مسلمان ہو جانا یقیناً ایک عظیم کارنامہ تھا۔

اسلام اور بدوی قبائل

مکہ کے قریش اور مدینہ کے اوس و خزرج اسلام کے پہلے دو مرکز اور تبلیغ دین خداوندی کے اولین دو محور تھے۔ ہجرت نبوی سے قبل اسلام کی اشاعت محض قریش کے مختلف بطون اور ان کے گھرانوں یا مکہ کی چار دیواری میں محدود نہیں رہی تھی۔ بالکل اسی طرح ہجرت مدینہ کے بعد اسلام صرف انصار کے مختلف قبیلوں اور ان کے خاندانوں کے بیچ محصور نہیں رہا تھا۔ بلکہ مکہ اور مدینہ اپنے اپنے ادوار میں اسلام اور اسلامی تحریک کے وہ دو بنیادی مرکز تھے۔ جہاں سے اسلام کے نور کی شعاعیں جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں بلکہ گوشے گوشے اور چپے چپے کو روشن کر گئی تھیں۔ مکی عہد کے ساتویں برس کے آغاز میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعوری و ارادی طور سے اسلام کو جزیرہ نمائے عرب کے پڑوسی ممالک شام، عراق، فلسطین، مصر اور ایران و حبشہ میں روشناس کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور اس کے اچھے نتائج بھی برآمد ہوئے تھے[265] جبکہ مکی عہد کے پانچویں برس میں غیر شعوری طور پر ہی اسلام کا تعارف بحر قلزم کے پار حبشہ کی عیسائی سلطنت میں ہو چکا تھا، اور مسلم روایات کے مطابق وہاں کا معاصر بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا[266]۔ اگرچہ اس کے طبقہ امرا اور رعایا نے اسلام کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔ پھر بھی اس امکان سے قطعی اور حتمی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حبشی رعایا میں سے گنتی کے چند افراد ہی نے ضرور اسلام قبول کر لیا تھا۔ ٹھوس تاریخی حقائق قرآن کریم کے اس دعوائے ربانی کی تائید کرتے ہیں کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا جو روز اول بلکہ روز ازل سے "تمام لوگوں (كافة للناس) کے لیے اتارا گیا تھا"[267]۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس آفاقی نصب العین اور عالمی فریضے کا اس دن سے بخوبی احساس و شعور تھا[268] جس دن آپ کو خلق خدا کے سامنے دعوت اسلامی کو واشگاف و علانیہ پیش کرنے کا حکم الٰہی ملا تھا[269]۔ ہمارے جدید محققین اور مستشرقین کا یہ نظریہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم محض ایک عرب پیغمبر تھے اور آپ کا لایا ہوا دین محض آپ کی اپنی قوم یا زیادہ سے زیادہ عربوں کے لیے تھا[270] غلط اور گمراہ کن ہی نہیں بلکہ تاریخی حقائق کے بالکل خلاف ہے۔ وہ دراصل ان کے مذہبی اور قومی تعصب کا زائیدہ و پروردہ اور حق کو جان لینے کے باوجود اس کو نہ ماننے کے جہل مرکب کا نتیجہ ہے۔

جہاں تک مکی عہد میں جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے متعارف ہونے کا تعلق ہے۔ یہ ٹھوس تاریخی واقعہ ہے کہ تمام بدوی قبائل پیغمبر اسلام کے ظہور اور اسلام کے بنیادی اصولوں سے واقف ہو چکے تھے۔ مآخذ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف مکہ میں تبلیغ کرتے پھرتے تھے بلکہ ارد گرد کے علاقوں میں لگنے والے بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں بھی آپ اپنے پیغام صداقت اور دعوت حق کو لیکر پہنچ جاتے تھے۔ چنانچہ عکاظ، ذوالمجاز، ذوالمجنہ وغیرہ بازاروں میں آپ کے خطبات عالیہ کے حوالے سیرت کے مآخذ میں ملتے ہیں۔ خود مکہ میں چونکہ سال بھر کعبہ کا عمرہ کرنے والے عرب قبائل کا تانتا لگا رہتا تھا اور حج کے مواقع خاص پر جزیرہ نما کے گوشے گوشے اور قبیلے قبیلے کے لوگ آتے رہتے تھے۔ اس لیے پورا

عرب آپ کے کام سے واقف ہوچکا تھا۔ مورخین نے جن بدوی قبائل سے آپ کی مکہ میں ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں بنو عامر بن صعصعہ، بنو محارب، بنو فزارہ، (غطفان)، غسان، بنو مرہ (غطفان)، بنو حنیفہ، بنو سلیم، بنو عبس بنو نضر، بنو کندہ، بنو کلب، بنو حارث بن کعب، (نجران)، بنو عذرہ، اور حضرموت و یمن کے متعدد قبیلے شامل تھے [21] ہمارے تمام ماخذ عموماً یہ بیان کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے آپ کے پیغام کو قبول نہیں کیا تھا۔ مگر یہ تعمیم صحیح نہیں معلوم ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان قبیلوں نے اجتماعی طور سے دعوت حق مسترد کردی تھی مگر اس امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض افراد نے اس کو نجی طور سے قبول بھی کرلیا ہو۔ بہر حال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کسی نے قبول نہیں کیا تھا تو بھی یہ تو ماننا ہی پڑے گا۔ کہ قبائل عرب سے آپ کی ان ملاقاتوں نے نہ صرف اسلام کو ان سے اور ان کے ذریعہ ان کے علاقے کے لوگوں سے متعارف کرادیا تھا۔ بلکہ ان میں اسلام کے بارے میں جستجو پیدا کردی تھی اور اسلام کی قبولیت واشاعت کی راہیں ہموار کردی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ یمن کے دور دراز کے علاقے میں بسے اشعر قبیلے سے حضرت ابو موسیٰ اشعری، مغربی علاقے کے ابوذر غفاری، ازد کے طفیل بن عمرو دوسی، بحرین کی مشرقی سرحد سے عبد القیس کے اشج اور ازد شنوءہ کے ضماد بن ثعلبہ اور نہ جانے کتنے اور آپ کے بارے میں سن کر پیغام حق کے مشتاق بنے تھے۔ دل کی لگی، حق کی تلاش اور روح کی پیاس ان کو مشتاقانہ و پروانہ وار مکہ لائی تھی۔ اور پھر ان تشنہ کامان عرب نے اپنی پیاس کو تسنیم سلسبیل محمدی کے آب خنک سے بجھائی تھی۔

مدنی دور میں قبائل عرب کی تلاش حق اور جستجوئے صدق میں عشق کی گرمی بھی در آئی تھی۔ اسلامی ریاست اور امت الٰہی کے قیام اور ارتقا نے ان کے لئے تازیانہ شوق کا کام کیا تھا۔ مکہ کی طاقتور ترین اشرافیہ کے خلاف مسلمانوں کی کشمکش اور کامیابی نے ان کے اشتیاق کو اور ہوا دی تھی۔ اور دور دراز کے مقامات سے ان کے افراد و گروہ مدینہ آتے تھے اور شاد کام واپس جاتے تھے۔ ان میں مدینہ کے نواح مغرب کے قبائل خزاعہ، مزینہ، جہینہ، اسلم، غفار ضمرہ، لیث، مدلج، کنانہ اور ازد شنوءہ بھی تھے اور حرمین کے مشرق کے باسی قبیلے جیسے خزیمہ، طے، ہذیل، محارب غطفان، سلیم، ہوازن، اور باہلہ وغیرہ بھی تھے۔ شمالی قبائل سعد ہذیم، جذام، قضاعہ، بلی، بہراء، لخم، کلب اور غسان کے افراد بھی کلام ربانی کے اتنے ہی آرزومند تھے۔ جتنے کہ جنوبی قبائل خثعم، مذحج، بجیلہ، ہمدان، حارث بن کعب، نہد، مراد، کندہ، حمیر، حضرموت اور عک و اشعر کے لوگ تھے۔ اسی طرح جزیرہ نمائے عرب میں جابجا منتشر و آباد قبائل عرب جیسے نمرہ، ازد عمان، عبد القیس، بنو حنیفہ، تمیم، وائل اور تغلب بھی حق و صداقت کے جویا اور پابند تھے۔

اس دہ سالہ عہد تبلیغ میں ایک نئے عنصر کا اضافہ بھی ہوا تھا اور وہ تھا تبلیغی جماعتوں اور مہموں کو منظم کرکے مختلف علاقوں اور قبیلوں میں بھیجنا۔ مکی عہد نبوی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ممکن نہ تھا کہ اس طرح کی تبلیغی تنظیم کرسکتے۔ مگر مدینہ میں وہ نہ صرف ممکن ہوگئی تھی بلکہ ناگزیر بھی بن گئی تھی۔ چنانچہ آپ کی بیشتر مہمیں جن کو غلطی

سے "فوجی" سمجھ لیا گیا ہے۔ مذہبی اور تبلیغی کوششیں تھیں۔ یہ مہمیں کبھی آپ خود لیکر گئے اور کبھی اپنے صحابہ کرام کی ماتحتی سرکردگی میں بھیجیں۔ ان مہموں میں غزوات بئر معونہ اور رجیع اور نہ جانے کتنی اور تھیں جن میں مسلم مبلغوں نے اپنے خون کی سرخی سے اسلامی تحریک کی داغ بیل ڈالی تھی۔ زبان و قلم اور تلوار سے تبلیغ اتنی موثر نہیں ہوتی ہے۔ جتنی کہ بہتے اپنے خون کی لالی سے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپ اور آپ کے جان نثاروں نے خالص عسکری مہموں کے دوران بلکہ تلواروں کی چھاؤں میں اور تختہ دار کی بلندی سے بھی پیغام حق سنانے اور لوگوں کو دعوت دین دینے میں گریز نہیں کیا۔ انہیں قربانیوں، کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ تیئیس برس کی مدت میں پورا جزیرہ نمائے عرب اسلام کے پرچم تلے آ گیا تھا۔

لیکن یہ کارنامہ یہ معجزہ اور یہ کار عظیم کیونکر اور کیسے وجود میں آیا وہ تاریخ اسلام کا ایک انتہائی تابناک باب ہے۔ اور اس کو سمجھنے کے لئے قبائل عرب میں اشاعت اسلام کی تاریخ، نہج اور انداز کا ویسے ہی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ جیسے کہ ہم نے قریش مکہ کے سلسلے میں لیا ہے۔ قبائل عرب کی اس تجزیے میں جو ترتیب رکھی گئی ہے۔ وہ تاریخی نوعیت کے تقاضوں کے مطابق رکھی گئی ہے اور اس میں ہم نے مونٹگمری واٹ کی تقسیم قبائل کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس کے دو سبب ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ آسان جغرافیائی ترتیب ہے اور دوم یہ کہ مستشرق موصوف کی تاریخی غلط بیانیوں کا بھی پردہ چاک کیا جاسکتا ہے اور صحیح صورتحال اجاگر کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ پہلے ہم نے مدینہ منورہ کے مغرب اور نواح مغرب میں آباد بدوی قبائل عرب سے بحث کی ہے۔ پھر حرمین شریفین کے مشرق میں آباد قبائل عرب میں اسلام کی اشاعت کا جائزہ ہے۔ اس کے بعد بالترتیب شمالی سمت اور جنوبی عرب میں بسے ہوئے قبائل کے اسلام کے ساتھ تعلقات کی نوعیت اجاگر کی ہے۔ اور آخر میں جزیرہ نما کے مختلف علاقوں میں بکھرے قبیلوں میں اسلام کی تبلیغ کی رفتار و نہج پر نظر ڈالی ہے۔

(۱) مغربی قبائل عرب

مہاجرین مکہ یا قریش کے ابتدائی مسلمانوں اور انصار مدینہ کے بعد اسلامی امت اور اسلامی ریاست کے قیام، ارتقاء اور تکمیل میں جن قبائل عرب نے سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔ وہ مدینہ منورہ کے مغرب میں آباد قبیلے تھے اسلام اور مرکز اسلام مدینہ سے ان کے خصوصی تعلقات کے قیام میں جغرافیائی سیاست کے عوامل سب سے زیادہ کارفرما تھے۔ چونکہ وہ زیادہ تر مدینہ منورہ کے نواح میں آباد تھے۔ اس لئے عمرانیات کے اصول و اسباب کے سبب ان کو مدینہ سے کسی نہ کسی قسم کے تعلقات و روابط استوار کرنے ناگزیر تھے۔ اس میں بعض بدوی قبائل جیسے جہینہ اور مزینہ وغیرہ کے اوس و خزرج سے زمانۂ جاہلیت سے قائم تعلقات نے کافی مدد کی تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اوس و خزرج کے مختلف گھرانوں اور افراد سے ان کے حلیفانہ تعلقات اور دوستانہ روابط کیونکر کام آئے تھے۔ اور مختلف و متضاد گروہوں کے حلیفوں کے بجائے وہ کیسے پوری امت اسلامی اور ریاست اسلامی کے حلیف اور دوست بن گئے تھے۔ ان ناگزیر اسباب سے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ بدوی قبائل عرب میں اسلام کی نشر و اشاعت کے تجزیئے کو مغربی قبائل سے شروع کیا جائے۔

ذکر آچکا ہے کہ ہر علاقے میں مختلف و متعدد قبائل تھے جو نسل و نسب یا خون کے رشتوں پر استوار ہوئے تھے۔ ان میں چھوٹے بڑے اور متوسط درجہ کے قبیلے تھے۔ عموماً ایک چھوٹا قبیلہ پانچ سو سے ایک ہزار افراد پر مشتمل ہوتا تھا۔ جبکہ متوسط قبیلہ اس کا دوگنا ہوتا تھا۔ بڑے قبیلے دو تین ہزار اور پانچ چھ ہزار افراد پر مشتمل ہوتے تھے اور لبا اوقات بعض قبائل اس سے بھی بڑھ جاتے تھے۔ جیسے کہ قریش، غطفان، اور ہوازن و غسان وغیرہ تھے[۳۶۲]۔ چونکہ ہر قبیلہ چارہ پانی اور کھانے کی کمی اور شاداب جگہ کی قلت کے سبب ایک جگہ نہیں ٹھہر سکتا یا مقیم رہ سکتا تھا۔ اس لئے وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ جاتا تھا۔ جو بطن / حی (خاندان : (CLAN) کہلاتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ بطن اتنے بڑے ہو جاتے تھے وہ بجائے خود قبیلے بن جاتے تھے اور اجتماعی اکائی کے طور پر کام نہ کر سکنے کے سبب وہ پھر تقسیم ہونا شروع ہو جاتے تھے اور شکست و ریخت کا یہ عمل اور اسی پر مبنی تعمیر و تشکیل کا رد عمل جاری ہی رہتا تھا۔ انہی اسباب سے عرب میں بیشمار قبیلے، بطون اور گھرانے نظر آتے ہیں۔ ہم سارے اہم ترین قبائل اور ان کی خاص شاخوں سے اس تجزیے میں بحث کریں گے بہر حال مغربی قبائل اور ان کی ذیلی شاخیں حسب ذیل تھیں :

(ا) کنانہ : بکر بن عبد مناۃ (۱) بنو ضمرہ (۲) بنو غفار (۳) بنو لیث (۴) بنو دئل (۵) بنو مدلج (۶) بنو جذیمہ

(ب) خزاعہ : (۱) بنو اسلم، (۲) بنو کعب بن عمرو (۳) بنو المصطلق

(ج) جہینہ :

(د) مزینہ :

(س) ازد شنوءہ : بنو سعد بن بکر، بنو دوس۔

(۱) بنو ضمرہ

مغربی قبائل میں بنو ضمرہ غالباً سب سے پہلے تھے۔ جنہوں نے اسلامی ریاست سے دوستانہ تعلقات کی بنیاد ڈالی تھی اور پھر اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے تھے[۳۶۳]۔ ہمارے ماخذ اس کنانی شاخ کے کئی ابتدائی مدنی عہد کے مسلمانوں کے ناموں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت جبال بن سراقہ ضمری تھے۔ جو اپنے علاقہ سے ہجرت کر کے مدینہ آبسے تھے اور غزوہ احد میں شریک تھے[۳۶۴] حضرت عمرو بن امیہ ضمری[۳۶۵] اور ان کے والد گرامی حضرت امیہ بن خالد ضمری[۳۶۶] بھی ابتدائی مسلمانوں میں شامل تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ ان کے خاندان کے اور لوگ بھی شروع ہی میں یا کچھ مدت بعد مسلمان ہو کر اسلامی امت کے رکن بن چکے تھے۔ ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد، ابن اثیر، ابن عبد البر، اور ابن حزم اندلسی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد ضمری اسلام کے دائرے میں اول عہد میں داخل ہو چکے تھے[۳۶۷] خیال یہ ہے کہ ۳ھ / ۶۲۵ء کے وسط تک یہ قبیلہ اکثر و بیشتر اسلامی ریاست کی حکمرانی قبول کر کے اس کا رکن بن چکا تھا۔ ابن اثیر نے کئی کے چند ضمری صحابہ کے نام گنائے ہیں اور ان میں حضرت یزید بن سلمہ ضمری کے نام کا اضافہ کیا ہے۔ مگر ان کے زمانہ قبول اسلام کا ذکر نہیں

کیا ہے[۲۷۸]۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ تمام مؤلفین سیر صحابہ نے بنوضمرہ کے دس سے زیادہ مسلمانوں کے نام نہیں گنائے ہیں۔ مگر اس سے یہ نہیں نتیجہ اخذ کر لینا چاہیئے کہ وہ عہد نبوی میں مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے۔ مآخذ کے عمومی بیانات اس پر شاہد ہیں کہ ان میں اسلام پوری طرح سے پھیل چکا تھا۔ اس کے علاوہ بعض تاریخی ثبوت بھی ان کے قبول اسلام کے گواہ ہیں۔ اول یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف کسی قسم کی کوئی مہم نہیں بھیجی۔ دوم یہ کہ اسلامی مہموں اور اسلامی ریاست کے نظم ونسق میں وہ برابر کے شریک تھے۔ اس کے علاوہ مآخذ میں جا بجا بکھرے بیانات سے بھی ان کے قبول اسلام کی تصدیق ہوتی ہے[۲۷۹]۔

(۲) بنو مدلج

بدر سے قبل وہ اسلامی ریاست کے حلیف بن چکے تھے اور ان کے بعض افراد اسلام بھی قبول کر چکے تھے۔ غزوہ بدر اور خندق کے درمیان ان میں اسلام نے اپنے قدم مضبوطی سے جما لئے تھے۔ مؤلفین سیر صحابہ نے بنوضمرہ کے مانند بنو مدلج کے بھی بہت کم صحابہ کرام کے نام گنائے ہیں۔ بہرحال جو گنتی کے چند نام ملتے ہیں ان میں حضرت علقمہ بن مجزز مدلجی بہت نمایاں صحابی تھے وہ اسلامی حکومت وریاست کے ایک نمایاں مدبر و سالار تھے۔ ان کا خاندان ابتداء ہی میں مسلمان ہو گیا تھا[۲۸۰]۔ ان کے علاوہ بنو مدلج کے دوسرے متعدد حضرات نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنی خدمات سے ریاست اسلامی کو فائدہ پہونچایا تھا۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸ھ / ۶۳۰ء میں بنو جذیمہ کے ایک گروہ کے خلاف حضرت خالد بن ولید مخزومی جو لشکر لے کر گئے تھے۔ اس میں بنو مدلج کا ایک خاصا بڑا دستہ شریک تھا[۲۸۱]۔

(۳) بنو غفار

بنو غفار دراصل بنوضمرہ کے ذیلی شاخ یا خاندان تھے۔ تاریخی توقیت کے مطابق بنو غفار اسلام سے غالباً قبائل عرب میں سب سے پہلے متعارف ہوئے تھے۔ اگر اولیت کا شرف ان کو حاصل نہ تھا تو کم از کم سبقت اسلام کے اعتبار سے وہ چند قبائل عرب میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔ وہ مکہ اور مدینہ کے درمیان مغربی بین الاقوامی شاہراہ تجارت کے آس پاس کے علاقوں میں بستے تھے۔ ان میں اسلام کا تعارف مکی عہد تبلیغ کے خفیہ دور میں ہوا تھا اور اس کا سہرا ان کے سب سے عظیم مسلمان حضرت ابوذر غفاری[۲۸۲] اور ان کے بھائی انیس غفاری[۲۸۳] کے سر بندھتا ہے۔ یہ دونوں بھائی تلاش حق میں مکہ میں آئے تھے اور انہوں نے اس وقت اسلام قبول کیا تھا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دار ارقم میں قیام پذیر تھے حضرت ابوذر غفاری نے مکہ کے سرداروں کے مجمع عظیم میں اپنے قبول اسلام کا جس طرح اعلان واظہار کیا تھا۔ وہ ان کی جرأت وہمت اور صلابت ایمانی کی دلیل ہے[۲۸۴]۔ بنو غفار کا یہ پورا خاندان ابتداء ہی میں مسلمان ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہم کو ان کے فرزند اور بہو کے قبول اسلام کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے[۲۸۵]۔ بنو غفار کے اسلام لانے کا سہرا دراصل حضرت ابوذر غفاری ہی کے سر بندھتا ہے جنہوں نے بےمثال جوش و ولولے اور ہمت وجرأت سے اپنے قبیلے میں اسلام پھیلایا تھا۔ یہی نہیں انہوں نے اپنے پڑوسی قبیلہ اسلم کے کم از کم آدھے حصہ کو

مسلمان کر لیا تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ ہجرت نبوی کے زمانے میں پورا قبیلہ بنی غفار مسلمان ہو چکا تھا۔[۲۸۶] گویا کہ اس قبیلے کے اسلام کا زمانہ ۶۱۳ء سے ۶۲۲ء تک کا کل سات برس کا عرصہ تھا۔

بنو غفار کے اولین اور اہم ترین مسلمانوں میں حضرت ابو ذر کے بعد حضرت ابو رہم غفاری کا نام آتا ہے۔ وہ اسلامی حکومت و ریاست کے نظم و نسق کے اہم شخص تھے[۲۸۷]۔ ابن سعد اور ابن اثیر نے متعدد غفاری صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے۔ ان میں حضرت ابو سریحہ حذیفہ بن اسید غفاری تھے جو صلح حدیبیہ میں شریک تھے۔ ان کے علاوہ حضرات ابو بصرہ غفاری، ابو تجلیس غفاری ابو مالک غفاری، ابن مسعود غفاری، رافع بن عمر و غفاری، حکم بن عمرو غفاری، وغیرہ کے نام نامی صحابہ کرام کی فہرست میں ملتے ہیں[۲۸۸] ابن سعد کے بیان کے تائید میں ابن اسحاق وغیرہ کے بیانات بھی ملتے ہیں جو ان کے اجتماعی قبول اسلام کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ غزوہ خیبر میں بنو غفار کے کافی مرد و عورت افراد شامل جہاد تھے[۲۸۹] انہوں نے فتح مکہ کے لیے چار سو غفاری مجاہدین پر مشتمل ایک دستہ بھی اسلامی لشکر کے لئے فراہم کیا تھا۔[۲۹۰] اسی طرح غزوہ تبوک کے عظیم لشکر میں ان کے دستہ کی عددی طاقت خاصی تھی[۲۹۱] اس کے علاوہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعد ہجرت نبوی جو معاہدہ کیا تھا۔ اس سے بھی ان کے مکمل طور پر مسلمان ہونے کی تائید ہوتی ہے[۲۹۲]۔ بنو غفار کے متعدد حضرات نے اسلامی ریاست کے نظم میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ اوپر حضرت ابو رہم غفاری کا ذکر آ چکا ہے۔ ان کے علاوہ حضرات سباع بن عرفطہ غفاری اور کعب بن عمیر غفاری نے عہد نبوی کے نظام حکومت میں خاصے بلند عہدوں پر کام کیا تھا[۲۹۳]۔ چنانچہ مونٹگمری واٹ کا یہ نتیجہ کہ بنو غفار کو اسلامی ریاست و حکومت و امت میں کوئی بلند مقام حاصل نہیں تھا۔ اور یہ کہ وہ ایک غیر اہم قبیلہ تھا بالکل صحیح نہیں ہے۔ یہ نتیجہ موصوف نے صرف اس بنیاد پر اخذ کیا ہے کہ حضرت ابو ذر غفاری کے صاحبزادے اور بہو مدینہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چراگاہ کی دیکھ بھال کرتے تھے[۲۹۴] حالانکہ وہ محض چرواہے نہیں تھے۔ جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے۔

(۴) بنو دئل اور بنو حارث بن عبد مناۃ

اگرچہ ہمارے مآخذ کنانہ کی بعض دوسری شاخوں جیسے بنو دئل اور بنو حارث بن عبد مناۃ کے قبول اسلام کے موضوع پر کچھ زیادہ روشنی نہیں ڈالتے۔ تاہم بعض ایسے قرائن اور شواہد ان میں مل جاتے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ وہ اسلام کے دائرے سے یکسر باہر نہیں تھے۔ مثال کے طور پر ابن سعد کا بیان ہے کہ بنو بکر بن عبد مناۃ کے ایک شخص الجبیب کے دو فرزندان گرامی حضرات عبد اللہ اور عبد الرحمن اس کنانی شاخ کے ابتدائی مسلمان تھے۔ جنہوں نے غزوہ احد میں حصہ لیا تھا اور جام شہادت نوش کیا تھا[۲۹۵]۔ اسی ضمن میں بنو بکر بن عبد مناۃ کے ایک اور گھرانے کا ذکر کرنا چاہیے۔ جس نے نہ صرف اسلام قبول کیا تھا۔ بلکہ اپنا علاقہ چھوڑ کر مکہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ بنو بکیر کا خاندان تھا۔ جس کا ذکر آ چکا ہے کہ ان کے کم از کم چار افراد نے مکی عہد کے آغاز میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ لیکن ابن سعد کے بیان سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خاندان

ہیں صرف یہی چار افراد نہیں تھے جو مسلمان ہوئے تھے۔ بلکہ ان کے تمام افراد معہ ان کے بچوں اور عورتوں کے اسلام کے حلقہ بگوش بنے تھے ۳۹۶۔ ابن ہشام اور ابن اثیر نے بنو دئل کے ایک ابتدائی مسلم حضرت عویف بن الاضبط کا ذکر کیا ہے جو غالباً صلح حدیبیہ سے کافی پہلے مسلمان ہو چکے تھے ۳۹۷۔ اسی طرح بنو دئل کے دو مزید مسلمانوں حضرات ساریہ بن زنیم اور ان کے بھائی انیس بن زنیم کا ذکر ابن حزم نے کیا ہے۔ یہ دونوں بھی ابتدائی مسلمانوں میں شامل تھے ۳۹۸۔ قیاس یہ ہوتا ہے کہ ان کے خاندان کے اور افراد نے بھی اسلام ضرور قبول کیا تھا۔ بعض بنو دئل کے مسلمانوں کے اسلامی لشکروں اور مہموں میں شرکت کا ذکر واقدی کے یہاں ملتا ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق حضرت معجن دئلی نے حسمیٰ کی مہم (۶ھ / ۶۲۸ء) میں حصہ لیا تھا۔ واقدی نے ان کے علاوہ بھی بعض اور مسلمانان بنی دئل کا ذکر کیا ہے ۳۹۹۔

(۵) بنو جذیمہ

کنانہ کی ایک شاخ بنو جذیمہ تھی۔ جو بجائے خود خاصا بڑا قبیلہ بن گیا تھا اور مدینہ سے کچھ فاصلے پر آباد تھا۔ وہ ۸ھ کے وسط اور ۶۳۰ء کے آغاز تک پورے مسلمان ہو چکے تھے۔ جیسے کہ حضرات خالد بن ولید مخزومی اور علی بن ابی طالب ہاشمی کی ان دو مہموں سے معلوم ہوتا ہے جو ان کے علاقوں میں گئی تھیں۔ ماخذ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کو ان کے علاقہ میں ایک لشکر دے کر بھیجا۔ حضرت خالد نے غلطی سے پہنچتے ہی ان پر حملہ کر دیا اور ان کے بعض لوگ مارے گئے اور ان کا مال لوٹ لیا گیا۔ اس میں دراصل حضرت خالد کی غلطی نہیں تھی۔ مسلمان فوج کو بنو جذیمہ کے قبول اسلام کی خبر نہ تھی۔ بہرحال اسی دوران حضرت خالد کے پیچھے پیچھے بنو جذیمہ کے نمائندے مدینہ پہنچے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد کی کہ وہ مسلمان ہیں اور اس کے باوجود ان کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا۔ آپ نے حضرت علی کو مال دے کر بھیجا تاکہ ان کے قبیلے میں پہنچ کر ان کے مقتولوں کا خون بہا ادا کر دیں۔ ماخذ کا بیان ہے کہ حضرت علی نے ان کے کتوں تک کا خون بہا ادا کیا جو مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ بہرحال فتح مکہ تک یہ قبیلہ اسلام کے دائرے میں داخل ہو چکا تھا ۴۰۰۔ لیکن ہم کو اس قبیلہ کے ممتاز مسلمانوں کے نام نہیں معلوم ہو سکے ہیں۔ اور نہ ہی اس میں اسلام کی اشاعت کی رفتار اور انداز کا علم ہوتا ہے۔

(۶) بنو لیث

کنانہ کے خاندان بکر بن عبد مناۃ کا ایک بڑا گھرانا تھا۔ بنو لیث۔ ہمارے ماخذ اس گھرانے کے متعدد مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان میں حضرت غالب بن عبداللہ لیثی ممتاز ترین صحابہ کرام میں تھے۔ انہوں نے اسلامی ریاست اور امت کیلئے شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ وہ کم از کم دو تین مہموں میں سالار / امیر سریہ رہے تھے ۴۰۱۔ دوسرے بزرگ حضرت نمیلہ بن عبداللہ لیثی تھے۔ جن کے بارے میں ابن اسحاق کا خیال ہے کہ وہ ایک یا دو مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت

سے مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے سربراہ بھی رہے تھے۔ اگرچہ واقدی اور دوسرے مورخین ابن اسحاق کی اس روایت سے اتفاق نہیں کرتے ہیں[402] ابن حزم نے بنولیث کے مختلف خاندانوں کے کم از کم چودہ ممتاز صحابہ کرام کے اسمائے گرامی کو بیان کیا ہے۔ یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ بنولیث کے ابتدائی مسلمانوں میں سے بیشتر اپنے علاقوں میں سکونت پذیر رہے تھے اور صرف چند حضرات نے ہجرت کر کے مدینہ میں سکونت اختیار کی تھی[403]۔ یہ بات اس پس منظر میں اور اہم ہو جاتی ہے کہ بنولیث کے قبیلے بنوبکر بن عبد مناۃ نے فتح مکہ تک بحیثیت قبیلہ اسلام کی کافی سخت مخالفت کی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے قریش مکہ سے قریشی حلیفانہ تعلقات تھے۔ جیسے کہ صلح حدیبیہ کے معاہدہ کی آخری شق سے واضح ہوتا ہے۔

بہر حال ان کا پورا قبیلہ ..... بنوبکر بن عبد مناۃ ...... سنہ ۹ھ کے آغاز اور سنہ ۶۳۰ء کے وسط میں اسلام کا حلقہ بگوش بن چکا تھا۔ اس کی تصدیق ان کے وفد کی آمد سے ہوتی ہے۔ جو غزوہ تبوک سے کچھ قبل حضرت واثلہ بن الاسقع لیثی کی زیر قیادت مدینہ منورہ آیا تھا۔ صحابی موصوف کے بارے میں ماخذ صراحت کرتے ہیں کہ انہوں نے غزوہ تبوک میں بھی شرکت کی تھی مگر اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ بنولیث کا خاصا بڑا دستہ اور خاص کر ان کے وفد کے تمام ارکان غزوہ میں مجاہدین کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے[404]۔

بہر حال ان تمام شواہد اور حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا بعید از حقیقت نہ ہوگا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے وقت تک پورا قبیلہ کنانہ مع اپنی تمام شاخوں اور ذیلی گھرانوں کے اسلام کے دائرے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس ضمن میں یہ حقیقت کافی دلچسپ اور اہم معلوم ہوتی ہے کہ ردہ کے پر آشوب زمانے میں کنانہ کے محض ایک معمولی حصہ نے جو بنولیث، بنودئل اور مدلج کے کچھ افراد اور طبقات پر مشتمل تھا۔ مدینہ منورہ کے خلاف بغاوت و سرکشی میں حصہ لیا تھا[405]۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کنانہ کے ان خاندانوں نے ارتداد نہیں اختیار کیا تھا بلکہ وہ صرف زکوٰۃ کی ادائیگی سے استثنا چاہتے تھے۔ اور بقیہ دوسرے اسلامی شعائر جیسے نماز وغیرہ کو قائم رکھنے کا وعدہ کیا تھا[406]۔ اس جگہ یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ اس وقت کی امت اسلامی کی غالب اکثریت نے مانعین زکوٰۃ کو غیر مسلم یا مرتد نہیں سمجھا تھا۔ یہ صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عظیم اور دوربین شخصیت تھی۔ جس نے ایک اور صرف ایک شعار اسلامی کو ترک کرنے کے منصوبے کی حوصلہ شکنی کر کے اسلام کے بنیادی اصولوں کی بنیاد استوار رکھی تھی[407]۔

(ب) بنوخزاعہ

خزاعہ ایک اور بڑا بدوی قبیلہ تھا جو حرمین کے مغرب میں آباد تھا۔ اس کے تین بڑے خاندان تھے جو بجائے خود قبیلے بن گئے تھے۔ ان میں اسلم غفار کے پڑوسی اور دوست تھے۔ جبکہ بنوکعب بن عمرو ان سے ذرا فاصلے پر آباد تھے۔ اور بنومصطلق کے بیشتر گھرانے چشمہ مریسیع کے ارد گرد کے علاقے میں بسے ہوئے تھے۔ یہ دلچسپ امر ہے کہ بنوخزاعہ کے بہت اچھے تعلقات قریش مکہ سے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کچھ گھرانے مکہ اور اس کے نواح میں بھی آباد تھے[408]

(۱) بنو اسلم

بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ خزاعہ عام طور سے اور بنو اسلم خاص طور سے اسلام سے مکی عہد تبلیغ کے آغاز ہی میں غالباً ۶۱۵ء میں روشناس و متعارف ہو گئے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری کے قبول و تبلیغ اسلام کا ذکر آچکا ہے کہ انہوں نے اپنے قبیلہ بنو غفار کے علاوہ بنو اسلم کو بھی نہ صرف اسلام سے روشناس کرایا تھا بلکہ ان کا نصف قبیلہ ہجرت مدینہ سے قبل اسلام لا چکا تھا اور بقیہ نصف ہجرت نبوی کے معاً بعد اسلام کے دائرے میں داخل ہوا تھا[۲۰۹]۔ اس کی تصدیق ابن سعد کی ایک روایت سے ہوتی ہے جو بصراحت کہتی ہے کہ دونوں قبیلوں نے ہجرت نبوی کے فوراً بعد مدینہ حاضر ہو کر اسلام قبول کرنے کا اعلان و اقرار کیا تھا[۲۱۰]۔ ۶۲۲ء کے آخری ربع تک بنو اسلم کا اسلام ایک تاریخی حقیقت بن چکا تھا[۲۱۱]۔ ابن سعد نے اسلم کے ابتدائی مسلمانوں میں سے تقریباً ۲۶ صحابہ کرام کے اسمائے گرامی اپنی طبقات میں بیان کئے ہیں[۲۱۲]۔ اسد الغابہ کے مطابق بنو اسلم کے کئی مسلمان غزوہ احد میں شریک تھے اور انہوں نے بڑی جاں نثاری اور قربانی کے کارنامے انجام دیئے تھے[۲۱۳]۔ ان کے علاوہ ابن سعد، طبری، اور اسد الغابہ بنو اسلم کے بہت سے ایسے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے مختلف مہموں کے دوران امت اسلامی کے لئے گرانقدر خدمات انجام دی تھیں[۲۱۴]۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت سے اسلمی صحابہ کرام نے عہد نبوی کی اسلامی ریاست کی تعمیر و ترقی میں بھی خاصا بڑا حصہ لیا تھا اور اس کے نظم و نسق میں بھی شامل رہے تھے[۲۱۵]۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد جو معاہدے انفرادی اور اجتماعی طور سے بنو اسلم سے کئے تھے، ان میں سے کم از کم تین معاہدوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب اسلام لا چکے تھے ان کی صلابت ایمانی اور غالباً مدینہ سے قربت کے سبب ان کے لئے ہجرت ضروری نہیں سمجھی گئی تھی۔ اور ان کو اپنے گھروں اور علاقوں ہی میں مہاجرین کی عظمت و حیثیت حاصل تھی[۲۱۶]۔ مونٹگمری واٹ نے اسلمی مسلمانوں کی اس مہاجرت کا مفہوم نہ جانے یہ کیونکر نکالا ہے کہ مہاجروں کو امت اسلامی یا ریاست اسلامی میں کسی قسم کے مراعات یا امتیازات حاصل تھے۔ ان کا دوسرا نظریہ کہ یہ معاہدے بعد کے کسی زمانے کے ہیں[۲۱۷]۔ قطعی طور پر غلط ہے اول اس وجہ سے کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت منسوخ ہو گئی تھی۔ یا اس کی اہمیت نہیں رہ گئی تھی، دوم یہ کہ بنو اسلم کے ان معاہدوں میں فریقین کے درمیان باہمی تعاون اور امداد کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ ابتدائی عہد کے معاہدات نبوی کی خصوصیت ہیں جیسا کہ ہم نے اسلامی ریاست کے ارتقاء کے باب میں دیکھا ہے۔ بہر حال فتح مکہ کی مہم میں بنو اسلم کے چار سو مجاہدین شامل تھے[۲۱۸]۔ اس سے ان کے کل مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۲) بنو کعب بن عمرو

بنو اسلم کے علاوہ خزاعہ کے بعض دوسرے گھرانوں میں بھی اسلام مکی عہد میں پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ان میں وہ لوگ خاص طور سے ذکر کے قابل ہیں۔ جو مکہ ہی میں قیام پذیر تھے۔ ابن سعد نے ایسے خزاعی صحابہ کرام کی فہرست اپنی طبقات میں دی

ہے۔ ابن اسحاق نے کم از کم ایسے دو خزاعی مسلمانوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت ایہمہ تھے جو بنو مخزوم کے حلیف تھے۔ جبکہ حضرت ذوالشمالین مہاجر مدینہ اور بدری صحابی تھے۔ مکی خزاعیوں کے ایک اور نمائندے حضرت نافع بن بدیل بن ورقاء خزاعی تھے۔ جو قدیم مسلم، مہاجر مدینہ اور شہید بئر معونہ تھے اسی طرح حضرت معتب بن عوف خزاعی کا ذکر فہرست مہاجرین حبشہ اور مجاہدین بدر کے ذیل میں آتا ہے۔ بلاذری نے قبیلہ خزاعہ کی ایک خاتون حضرت حمینہ بنت خلف کا جو حضرت خالد بن سعید اموی کی اہلیہ محترمہ تھیں۔ ذکر مہاجرین حبشہ میں کیا ہے ایسی متعدد خزاعی مسلمان خواتین کا ذکر ماخذ میں ملتا ہے۔[۲۱۹]

بنو اسلم کے علاوہ خزاعہ کے بعض دوسرے گھرانوں کے افراد نے اسلامی ریاست کے مختلف انتظامی شعبوں میں خدمات انجام دی تھیں[۲۲۰]۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ فتح مکہ سے کچھ قبل خزاعہ کے خاندان بنو کعب بن عمرو سے صدقات وصول کرنے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مصدق (ٹیکس افسر، محصل) بھیجا تھا۔ جو ان کے صدقات وصول کر کے لایا تھا[۲۲۱]۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بیجا نہ ہوگا۔ کہ بنو کعب بن عمرو سب کے سب یا اکثر مسلمان ہو چکے تھے محرم ۹ھ/ اپریل مئی ۶۳۰ء میں بنو اسلم اور غفار سے صدقات وصول کرنے کے لئے ایک مشترک مصدق مقرر کیا گیا تھا[۲۲۲]۔ اس خزاعی گھرانے کے مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کے لئے اسلامی لشکر میں پانچسو مجاہدین کا دستہ فراہم کیا تھا[۲۲۳]۔

(۳) بنو مصطلق

اسلم اور بنو کعب بن عمرو کے برعکس بنو مصطلق نے اسلامی امت میں شمولیت ۵ھ کے وسط اور ۶۲۷ء کے آغاز میں یعنی مدنی عہد نبوی کے نصف اول کے آخر میں کی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ غزوہ مریسیع یا غزوہ بنی مصطلق میں خزاعہ کی اس شاخ نے اسلامی ریاست کی مخالفت و عداوت کس طرح ترک کی تھی۔ ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ مریسیع کے علاقے میں آباد اس قبیلے کے دو سو خاندانوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قید کر لیا تھا۔ مگر آپ کے نرم رویے، حسن سلوک اور قبیلہ سے ازدواجی تعلقات کے سبب یہ سب لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور آزاد کر دیے گئے تھے۔ اجتماعی تبدیلی مذہب کی یہ ایک شاندار مثال تھی۔ غالباً یہی کل آبادی بنو مصطلق کی تھی۔ ہمارے مفروضہ اصول کے مطابق ان کی کل آبادی کا تخمینہ بارہ اور چودہ سو افراد کے درمیان رہا ہوگا۔ ان کے بعض افراد نے ممکن ہے فوراً اسلام قبول نہ کیا ہو جیسے کہ سردار قبیلہ حضرت حارث بن ابی ضرار خزاعی کے بارے میں ماخذ صراحت کرتے ہیں۔ کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد فرار ہو گئے تھے اور کچھ دنوں بعد غالباً اپنی بیٹی حضرت جویریہ کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی اور اپنے پورے قبیلے کے اسلام کی خبر سن کر مدینہ پہنچے تھے اور اسلام قبول کیا تھا۔ بنو مصطلق کے مکمل طور سے اسلام کا حلقہ بگوش ہونے کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے قبول اسلام کے معاً بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ولید بن عقبہ اموی کو ان کا مصدق یا عامل صدقات بنا کر بھیجا تھا[۲۲۴]۔ ہمارے ماخذ اور جدید مورخین دونوں نے اس مسئلہ پر شدید الجھنیں پیدا کر دی ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ عامل صدقات کی یہ تقرری

فتح مکہ کے بعد پیش آئی تھی جبکہ انہیں مآخذ کا بیان ہے کہ بنو مصطلق کے قبول اسلام کے دو سال بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر مصدق مقرر کیا تھا۔ اسی طرح حضرت ولید بن عقبہ اموی کے بارے میں مآخذ نے اور ان سے زیادہ ہمارے جدید مورخین نے بڑی غلط فہمیاں عام کر دی ہیں جن پر کہیں اور بحث کی جا چکی ہے[425]۔ بہرحال حضرت ولید بن عقبہ اموی کے بعد بنو مصطلق کی خود اپنی پسند پر حضرت عباد بن بشر انصاری کو عامل بنا کر بھیجا گیا تھا جو ان سے صدقات وصول کر کے مدینہ لاتے تھے[426]۔

اس پوری بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بنو خزاعہ کے مختلف گھرانوں اور افراد کے بیچ اسلام پھیلنے کا آغاز مکی عہد تبلیغ کے خفیہ دور سے ہوا تھا اور اس کا ایک حصہ بنو اسلم۔ ہجرت تک یعنی ۶۱۵ء اور ۶۲۲ء کے درمیان پورا اسلام لا چکا تھا جبکہ کعب بن عمرو نے مزید پانچ سال اپنے مکمل قبول اسلام میں لئے تھے۔ بہرحال یہ پورا قبیلہ غزوہ خندق کے زمانے میں اسلام کے دائرے میں آ چکا تھا۔ بنو مصطلق کا قبول اسلام فوری تھا۔ اور اس نے زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کی مدت لی تھی۔ یہ وہ خزاعی گھرانے تھے جو مدینہ کے مرکز ثقل کے دائرے میں بستے تھے۔

لیکن ابھی خزاعہ کے کچھ گھرانے ایسے بھی تھے جو مکہ کے سیاسی اثر و اقتدار کے دائرے میں آتے تھے اور مکہ کے قرب و جوار کے علاقے میں بستے تھے۔ ان میں سے بعض افراد نے مکی دور میں کسی وقت یا مدنی دور کے ابتدائی حصے میں اسلام قبول کیا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ لیکن ان کے گھرانے اور خاندان اجتماعی طور سے ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے گو کہ وہ اسلامی ریاست کے وفادار اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے۔ واقدی، ابن سعد اور دوسرے متعدد مآخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ بدر سے فتح مکہ تک وہ مکی خزاعی ہی تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریشی منصوبوں اور ارادوں سے باخبر کرتے رہتے تھے[427]۔ اور صلح حدیبیہ سے ذرا قبل ان کے ایک اہم ترین سردار بدیل بن ورقاء خزاعی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں مسلمانوں کے داخلے کی اجازت نہ دینے کے قریشی فیصلہ اور ضد سے آگاہ کیا تھا[428]۔ اور انہیں کے زیر قیادت خزاعہ نے صلح حدیبیہ کی ایک شق کے مطابق مسلمانوں یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے حلف کے معاہدے کا اعلان تجدید کر دیا تھا[429]۔ اسلامی ریاست اور اسلام سے اتنے بڑے قریبی تعلقات نے بالآخر ان کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا ہی دیا اور واقدی کا انتہائی واضح بیان ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد بنو خزاعہ کا آخری آدمی تک مسلمان ہو چکا تھا[430]۔ فتح مکہ کی مہم میں ان کی کثیر تعداد کے شریک ہونے سے ان کے مکمل قبول اسلام کی ناقابل تردید تصدیق ہوتی ہے۔ اسی طرح غزوہ تبوک میں ان کی خاصی بڑی تعداد شریک جہاد تھی[431]۔

(ج) جہینہ

جہینہ زمانہ جاہلیت سے مدینہ منورہ کے قبیلہ خزرج سے حلف اور دوستی کے تعلقات رکھتا تھا اور بعثت نبوی کے قریب واقع ہونے والی جنگ بعاث میں اس نے خزرج کا ساتھ ان کے مدنی حریف اور مد مقابل قبیلہ اوس اور ان کے یہودی اتحادیوں کے خلاف دیا تھا۔ مآخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے قیام کے بعد بھی جہینہ کے لوگوں نے مدینہ

والوں سے اپنے پرانے روابط قائم رکھے تھے ذکر آچکا ہے کہ اب ان تعلقات کی نوعیت مختلف تھی۔ کیونکہ اب وہ صرف بنوخزرج کے ہی حلیف اور دوست نہیں تھے۔ بلکہ اوس اور مہاجرین مکہ کے بھی تھے۔ گویا کہ وہ اب اسلامی ریاست کے حلیف اور رکن تھے۔ مآخذ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہینہ کے قبیلے میں انفرادی اور باجماعت قبول اسلام کے سلسلہ کا آغاز مدنی عہد کی ابتداء ہی میں ہو چکا تھا۔ کم از کم جہینہ کے ابتدائی مسلمانوں میں سے نو حضرات کا ذکر ان کے ناموں کے ساتھ ملتا ہے۔[432] ابن اسحاق اور ابن سعد نے جہینہ کے پانچ بدری صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی تھے۔ حضرات عدی بن ابی الزغباء، ودیعہ بن عمرو، زیاد بن کعب، ضمرہ بن عمرو، اور بسبس بن عمرو۔ اگر واقدی کی روایت تسلیم کر لی جائے تو ایک اور بدری صحابی تھے حضرت کعب بن جماز[433] ابن سعد نے ان صحابہ کرام میں جنہوں نے فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا۔ کم و بیش جہینہ کے بیس مسلمانوں کے نام گنائے ہیں[434]۔ اس کے علاوہ ابن سعد کا یہ بھی بیان ہے کہ جہینہ والوں نے اتنی کثرت سے مدینہ ہجرت کی تھی کہ شہر رسول میں ان کا ایک پورا محلہ آباد ہو گیا تھا۔ جہاں انہوں نے اپنی ایک الگ مسجد بھی بنا رکھی تھی[435] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہینہ میں اسلام باجماعت قبول کیا گیا تھا اور ہجرت کے معاً بعد قبول اسلام اور مدینہ ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا

لیکن جہینہ کے تمام لوگوں یا مسلمانوں نے مدینہ ہجرت نہیں کی تھی اور غالباً ان کے بیشتر لوگ اپنے علاقوں میں مغربی ساحل کے قریب شاہراہ تجارت کے ارد گرد مقیم رہے تھے اور تعلیم و تربیت، جہاد و غزوات اور ملاقات رسول کیلئے مدینہ آتے رہتے تھے۔ چنانچہ جہینہ کا وفد بھی کسی وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں مدینہ حاضر ہوا تھا۔[436]

بہر حال یہ مؤرخین کے نزدیک حتمی ہے کہ ہجرت کے دو تین برسوں میں پورا قبیلہ جہینہ مسلمان ہو گیا تھا۔ اور ان کے بہت سے لوگوں نے بدر، احد اور خندق وغیرہ کی جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ فتح مکہ کے موقعہ پر اسلامی لشکر میں جہینی مجاہدین کی تعداد آٹھ سو تھی جن میں سے پچاس شہسوار تھے[437]۔ واقدی نے غزوہ تبوک کے موقعہ پر ان کے خاصے بڑے دستے کی شرکت کا حوالہ دیا ہے[439] ان حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ بلا کسی خوف تردید کے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ فتح مکہ سے کافی پہلے جہینہ کا پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا تھا۔ اس کے ثبوت میں مزید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ریاست سے ان کا کوئی اختلاف نہیں ہوا تھا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف کوئی مہم کبھی نہیں بھیجی تھی۔ بہر حال جہینہ کے لوگ اسلامی امت اور اسلامی ریاست کے رکن اس کے قیام کے ابتدائی زمانے میں بن چکے تھے۔

(د) مزینہ

مزینہ بھی قبیلہ جہینہ کی مانند مدینہ کے قبیلوں سے قدیم اور قریب کے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ اگر جہینہ کے لوگ خزرج کے حلیف تھے تو مزینہ کا قبیلہ اوس کی دوستی اور حلف کا دم بھرتا تھا۔ اور ان کے حلیف کی حیثیت سے جنگ بعاث میں اپنے پڑوسی بدوی قبیلہ کے خلاف میدان جنگ میں اترا تھا۔ جہینہ اور مزینہ دونوں کے مدینہ والوں سے حلف اور دوستی کے تعلقات کے علاوہ ازدواجی تعلقات بھی تھے۔ زمانہ جاہلیت کے ان تعلقات نے قبیلۂ مزینہ

کو اسلام سے روشناس اور اسلامی ریاست کے قریب کیا تھا۔ مآخذ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مزینہ کے لوگوں میں بھی اسلام شروع ہی سے پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور ان کے افراد اور گروہوں میں ہجرت کے بعد سے ہی اسلام قبول کرنے کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ مزینہ کے قدیم مسلمانوں میں کم از کم پانچ حضرات کے نام مختلف مآخذ میں ملتے ہیں[439]۔ ابن سعد نے دو مزید مزنی قدیم مسلمانوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے غزوہ احد میں جہاد میں شرکت کی تھی، اور جام شہادت نوش کیا تھا[440]۔ ابن درید ازدی نے مزینہ کے حضرات نعمان بن مقرن، عبداللہ بن مغفل، معقل بن یسار، قرہ بن ایاس، بلال بن حارث اور کعب بن زہیر کو قدیم مسلمان بتایا ہے[441]۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ حضرت نعمان بن مقرن مزنی نے اپنے لوگوں کو مسلمان بنایا تھا۔ جبکہ ابن سعد کے مطابق حضرت عمرو بن مرہ مزنی نے اپنی قوم کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا تھا[442]۔ ابن سعد کا مزید بیان ہے کہ سنہ ۵ھ / سنہ ۶۲۷ء میں مدینہ آنے والا پہلا وفد عرب قبیلہ مزینہ کا تھا جو چار سو مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قبیلہ مزینہ ہجرت کے بعد کے زمانے میں یعنی مدنی عہد کے نصف اول میں مسلمان ہو چکا تھا[443]۔ اس کے علاوہ اسلامی لشکروں میں ان کے دستوں کی عددی طاقت بھی ان کے اجتماعی طور سے قبول اسلام کی ناقابل تردید شہادت دیتی ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کے دس ہزار کے عظیم لشکر میں صرف قبیلہ مزینہ کا حصہ دسواں تھا یعنی ان کے ایک ہزار تین مجاہدین جن میں سے سو شہسوار بھی تھے شریک جہاد تھے[444]۔ ابن اسحاق کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ حنین میں قبیلہ مزینہ کے دو غیر معروف خاندان بنو اوس اور بنو عثمان کے مجاہدین اسلامی لشکر کے مقدمہ میں دوسرے مجاہدین کے ساتھ شامل تھے[445]۔ غزوہ تبوک میں اس قبیلہ کا اور بڑا دستہ اسلامی لشکر میں شامل تھا[446]۔ بہرحال مآخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ قبیلہ مزینہ دوسرے مغربی قبائل کی مانند اسلامی امت کا رکن مدنی عہد کے آغاز میں بن چکا تھا۔

(س) ازد شنوءہ

حرمین شریفین کے مغربی علاقے میں آباد بدوی قبائل میں ازد شنوءہ ایک اہم قبیلہ تھا جو اسلامی تحریک سے اس کے آغاز کار ہی میں روشناس ہو گیا تھا۔ غالباً سنہ ۱۳ ق ھ / ۶۱۳ء اور سنہ ۵ ق ھ / ۶۱۵ء کے درمیان کوئی زمانہ تھا۔ جب اس قبیلہ کے ایک اہم رکن اور اپنی قوم بنو سعد بن بکر کے سردار حضرت ضماد بن ثعلبہ نے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوانی کے زمانے کے دوست اور تجارت کے شریک رہے تھے، عمرہ کے لئے مکہ پہنچے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی اور آپ کا پیغام سنا ہی تھا کہ مسلمان ہو گئے[447]۔ ارشاد نبوی کے مطابق وہ اپنے لوگوں میں واپس گئے اور وہاں اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ صحیح مسلم کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ضماد بن ثعلبہ نے بڑی لگن اور جوش سے لوگوں میں تبلیغ کی اور خاصے کامیاب بھی ہوئے[448]۔ چنانچہ سنہ ۵ھ / سنہ ۶۲۶ء میں وہ ابن سعد کے بقول اپنے قبیلہ کے مسلمانوں کی جانب سے ایک وفد لیکر مدینہ پہنچے تھے[449]۔ ابن سعد ہی کے بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سنہ ۹ھ / سنہ ۶۳۰ء کے اواخر تک ازد شنوءہ کی غالب اکثریت اسلامی امت اور اسلام کے دائرے میں شامل ہو چکی تھی[450]۔

(۱) دوس

ازدشنوءہ کا ایک اہم خاندان دوس تھا جس کا مشہور ترین مسلمان صحابی حضرت ابوہریرہ دوسی ہیں۔ اس ازدی خاندان کا اسلام سے تعارف مکی عہد کی خفیہ تبلیغ کے زمانے میں ہوا تھا۔ جب اس کے تین افراد مسلمان ہوئے تھے۔ ان ابتدائی مسلمانوں میں ایک حضرت معیقیب بن ابی فاطمہ دوسی تھے جو قریش مکہ کے خاندان بنو امیہ کے حلیف تھے اور مہاجرین حبشہ میں شمار ہوتے تھے مگر ایک روایت ہم ایسی بھی دیکھ چکے ہیں جس کے مطابق حضرت معیقیب دوسی اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے علاقے کو لوٹ گئے تھے۔ اور وہاں اسلام کی تبلیغ کرتے رہے تھے۔ وہاں سے وہ ۷ھ / ۶۲۸ء میں اپنے مسلمانوں کے ساتھ مدینہ پہنچے تھے[251] باقی دو ابتدائی مسلمان تھے۔ حضرت طفیل بن عمرو اور ان کے فرزند حضرت عمرو بن طفیل دوسی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے وطن واپس آکر ایک نو مسلم کے جوش و خروش اور ولولے کے ساتھ اسلام کی تبلیغ اپنی قوم میں کی اور ۷ھ / ۶۲۸ء تک ان کا پورا قبیلہ دوس اسلام قبول کر چکا تھا[252]۔ مختلف روایات کے مطابق حضرت طفیل بن عمرو دوسی اپنے قبیلہ کے شاعر تھے۔ اور عربوں کے سماج میں شعراء کی نہ صرف عزت ہوتی تھی، بلکہ ان کا کافی سماجی اور تہذیبی اثر بھی ہوتا تھا قبیلہ دوس کے قبول اسلام کا سہرا در اصل انہیں کے سر ہے[253]۔ بہرحال خیبر سے قبل دوس کے اسی افراد۔ دوس پر مشتمل ایک وفد نے نہ صرف خدمت نبوی میں حاضری دی تھی، بلکہ غزوہ خیبر میں شریک جہاد بھی رہا تھا[254]

ابن سعد نے ان صحابہ کرام میں جنہوں نے فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا۔ دوس کے تین مسلمانوں کے نام بھی گنائے ہیں۔ یہ تھے حضرات ابوہریرہ دوسی، ابوالروی دوسی۔ اور سعد بن ابی ذباب۔ موخر الذکر صحابی نے اسلامی ریاست و حکومت کی شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ اور وہ اس کے نظم و نسق میں بھی شریک رہے تھے[255] ابن سعد اور ابن اثیر کا بیان ہے کہ حضرت سعد بن ابی ذباب کو قبیلہ دوس سے صدقات وصول کرنے کا افسر مقرر کیا گیا تھا[256]۔ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دوس کی اکثریت بلکہ غالب اکثریت اسلام لا چکی تھی بہرحال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہجرت کے ساتویں برس قبیلہ دوس اسلامی امت و ریاست کا ایک اہم رکن بن چکا تھا۔

ابن سعد نے ان کے علاوہ تین مزید ابتدائی مسلمانوں کا ذکر کیا ہے۔ جن کا تعلق ازد سے تھا۔ ان میں ایک حضرت عبد اللہ بن بُحَینہ تھے۔ جو ہجرت نبوی سے قبل مکی عہد کے مسلمان تھے[257] ان کے بھائی حضرت جبیر بن مالک بھی مکی عہد کے ایک قدیم مسلم تھے[258] تیسرے ازدی مسلمان تھے حضرت حارث بن عمیر جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر گرامی تھے اور جو آپ کا پیغام امن و اسلام لیکر شاہ بصریٰ کے پاس گئے تھے۔ ان کو واپسی کے سفر کے دوران شرحبیل بن عمرو غسانی نے شہید کر دیا تھا[259] تمام واقعات و حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ازدشنوءہ میں اسلام مکی عہد کے آغاز سے پھیلنا شروع ہوا۔ اور اس کے مختلف خاندانوں اور گھرانوں میں افراد اور گروہ رفتہ رفتہ مسلمان ہوئے۔ تقریباً بیس برس کی انتھک کوشش کے بعد یہ پورا قبیلہ اسلامی حکومت کا ماتحت، اسلامی ریاست کا شہری اور اسلامی امت کا رکن بن سکا تھا۔

مغربی قبائل میں تبلیغ و اشاعت اسلام کے اس جائزے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ کے بعد حرمین شریفین کے مغربی علاقوں میں آباد بدوی قبائل تیسرے اہم ترین عنصر تھے جنہوں نے اسلامی امت اور اسلامی ریاست کے قیام اور ارتقاء میں گرانقدر ترین خدمات انجام دی تھیں۔ مونٹگمری واٹ کا یہ تجزیہ صحیح ہے کہ بنیادی طور سے یہی تینوں اسلامی عناصر اسلامی امت اور اسلامی ریاست کی ریڑھ کی ہڈی تھے۔[۴۹] اسلام میں ان کا ناقابل شکست ایمان اور غیر متزلزل عقیدہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کامل بھروسہ اور آپ کی ذات والا صفات سے بے انداز محبت و عقیدت اور اسلامی امت کے تحفظ، بقا اور ترقی کے لئے عظیم قربانیاں اور اسلامی ریاست کے لئے ان کی شاندار خدمات ہی ان کے وہ اوصاف حمیدہ اور صفات ستودہ تھے جنہوں نے ان کو اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب میں ایک نمایاں و درخشندہ مقام عطا کیا ہے۔

(۲) مشرقی قبائل عرب

تاریخی توقیت کے اعتبار سے اسلامی امت کے تین اہم علاقائی عناصر ... مہاجرین مکہ، انصار مدینہ اور مغربی قبائل عرب ... کے بعد اسلامی ریاست اور اسلامی تحریک کے تعلقات حرمین شریفین کے مشرقی علاقوں میں واقع اور آباد مشرقی قبائل عرب سے اوروں کے بہ نسبت زیادہ قریبی، قدیم اور مضبوط تھے۔ اگرچہ بعض طاقتور قبائل عرب مشرق نے اسلامی ریاست کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی۔ لیکن اس سیاسی مخالفت کے باوجود وہ اپنے بعض گھرانوں میں اسلام کی نشر و اشاعت کے مصنوعی اور انسانی و قدرتی حدبندیوں کو توڑ کر سب کو سیراب و فیضیاب کرنے والے فیضان اسلام کو نہیں روک سکے تھے۔

مشرقی علاقوں میں خاص کر نجد و حجاز اور یمامہ کے مرکزی خطوں میں متعدد قبیلے آباد تھے اور غالباً اپنی عددی طاقت کے اعتبار سے وہ دوسرے علاقوں کے قبائل سے زیادہ بڑے اور طاقتور تھے۔ ان میں بعض قبیلوں کی متعدد شاخیں اور بطون بجائے خود قبیلے بن گئے تھے اور اس طرح مشرقی قبائل کی تعداد بھی نسبتاً زیادہ تھی۔ اس علاقہ میں کثرت آبادی کا سبب زیادہ تر جغرافیائی تھا۔ کیونکہ مدینہ و مکہ کے مشرق میں بحرین و عراق کی سرحدوں تک سینکڑوں بلکہ ہزاروں مربع میل کا علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ جہاں قبائیلیوں ... آباد و خانہ بدوش ... دونوں کی اقتصادی ضروریات کی فراہمی کے اسباب موجود تھے مشرقی علاقے میں اہم ترین قبیلے اور ان کے بنیادی خاندان حسب ذیل تھے:

(ا) بنو خزیمہ بن مدرکہ: (۱) اسد بن خزیمہ (۲) بنو غنم بن دودان / اسد بن خزیمہ (۳) بنو ثعلبہ بن دودان / اسد بن خزیمہ (۴) بنو ہون بن خزیمہ (۵) بنو عضل (۶) اور بنو قارہ

(ب) بنو سلیم: (۱) بنو عصیہ (۲) بنو رعل (۳) بنو ذکوان (۴) بنو فالج (۵) بنو شیبان

(ج) بنو غطفان: (۱) اشجع (۲) فزارہ (۳) مرہ (۴) عبس و ذبیان (۵) ثعلبہ (۶) انمار

(د) بنو محارب بن خصفہ

(س) بنو ہوازن: (۱) بنو عامر بن صعصعہ (۲) بنو ہلال (۳) بنو ربیعہ (۴) بنو البکاء (۵) بنو کلاب (۶) بنو القرطاء (۷) بنو عریبہ

(۸) بنو جشم (۹) بنو نصر (۱۰) بنو سعد بن بکر (۱۱) بنو ثمالہ
(ط) ثقیف : (۱) بنو مالک (۲) الاحلاف (۳) بنو غنی
(ع) باہلہ۔

(ف) بنو ہذیل : (۱) بنو معاویہ بن ہذیل (۲) بنو طابخہ (۳) بنو لحیان
(ک) بنو طے : (۱) بنو معاویہ (۲) بنو خویلد (۳) بنو معن (۴) بنو اجا (۵) بنو نبہان [۴۶۱]

مشرقی قبائل عرب کی اسلامی ریاست کی مخالفت و عداوت ۶۲۲ء میں ہجرت نبوی کے کچھ بعد شروع ہوئی تھی۔ جب اسلام ایک سیاسی طاقت اور مرکزیت کے عناصر لیکر ابھرا تھا۔ اور کم از کم وسطی عرب میں فتح کے زمانے یعنی ۶۳۰ء کے ابتدائی دنوں تک جاری رہی تھی۔ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام چھوٹے بڑے غزوات و سرایا کا تجزیہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ تقریباً ۹۰ مہموں میں سے ۲۸ مہموں کی منزل مقصود مدینہ کے مشرقی علاقوں اور قبیلوں میں تھی [۴۶۲] گویا کہ ایک تہائی مہمیں ان کے خلاف بھیجی گئی تھیں۔ لیکن غالباً یہ قدرت کا قانون ہے کہ بند جتنا مضبوط و مستحکم ہوتا ہے سیلاب اور دریا کی موجیں اتنی ہی تند و تیز ہوتی ہیں۔ تاریخ مذاہب عالم کی یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مخالفت و عداوت کی ساری انسانی حدبندیاں اور دیواریں مذہب کے جوش و خروش کے سیلاب کے آگے ٹوٹ گئیں۔ خدا کا آخری دین۔۔ اسلام۔۔۔۔ جس کی تکمیل مقدر ہو چکی تھی۔ کیونکر ان مصنوعی دیواروں اور رکاوٹوں سے روکا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مشرقی قبائل کی مخالفت و عداوت کے باوجود وہ ان کے افراد اور جماعتوں کو اپنا حلقہ بگوش بناتا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شیفتہ و شیدا بناتا رہا۔ جیسے کہ ہم ابھی مشرقی قبائل کے تفصیلی جائزے میں دیکھیں گے۔

(۱) بنو اسد بن خزیمہ

مآخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ اسد / خزیمہ کے اسلام سے قریبی اور گہرے روابط ابتدائے کار سے ہی قائم ہو گئے تھے [۴۶۳]۔ اس قبیلہ میں متعدد قدیم مسلمان تھے اور غالباً اسلام سے اس ابتدائی تعارف کا ایک سبب وہ قدیم سماجی، اقتصادی اور ازدواجی تعلقات تھے۔ جو قریش کے مختلف بطون سے قائم تھے۔ ابن اسحاق ان کے بیس مردوں اور آٹھ عورتوں کے نام ابتدائی مکی مسلمانوں کی فہرست میں شامل کرتے ہیں اور ان میں سے متعدد کو مہاجرین حبشہ میں بھی شمار کرتے ہیں [۴۶۴] اوپر ذکر آچکا ہے کہ ان کی تعداد چالیس مردوں اور عورتوں کے علاوہ کافی بڑی تعداد میں بچوں پر بھی مشتمل تھی۔ جن کا ذکر مآخذ نہیں کرتے ہیں بہر حال بنو غنم بن دودان کا یہ اسدی خاندان مکہ میں ابتدائے اسلام میں ہی بیس مسلمان ہو گیا تھا۔ عام خیال یہ ہے کہ مکہ کے باسی ان اسدیوں کے قبول اسلام کا اثر ان کے اصل قبیلے پر (جو قبیلہ غطفان کے شمال اور مشرق میں آباد تھا اور قبیلہ طے کا پڑوسی تھا) نہیں پڑا تھا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ مکہ میں بس جانے والے ان اسدیوں نے اپنے مادر قبیلہ سے تعلقات پوری طرح سے ختم نہیں کئے تھے۔

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ مآخذ عام طور سے اسد بن خزیمہ کے اصل قبیلے کے قبول اسلام پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتے ہیں خاص کر مکہ کی فتح کے قبل کے زمانے میں، لیکن شواہد و قرائن بتاتے ہیں کہ ان میں اسلام کی تخم ریزی فتح مکہ سے کافی پہلے ہو چکی تھی۔ کیونکہ ابن اسحاق کے بیان کے مطابق غزوہ حنین میں اسد عبس اور ذبیان کے مجاہدین کے ساتھ ان کی کافی بڑی تعداد اسلامی لشکر میں موجود تھی۔ اور اس موقعہ پر انہوں نے زبردست فوجی کارنامے انجام دیئے تھے [465]۔ چند ماہ بعد ۹ھ کے ابتدائی دنوں اور ۱۰ھ کے وسط میں اسد بن خزیمہ کا ایک وفد خدمت نبوی میں پہنچا جو دس خاندانوں (رھط) پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں نے اپنے مسلمان ہونے کے علاوہ اپنے قبیلہ کے اسلام لانے کا اظہار بھی کیا تھا [466]۔ طبری نے اپنی تفسیر میں سورہ حجرات کی آیت نمبر ۱۷ میں روایت بیان کی ہے کہ بعض یا کل ارکان وفد نے فخریہ یہ بات کہی تھی کہ وہ اپنے آپ اسلام لائے تھے اور کسی نے انہیں اس پر آمادہ نہیں کیا تھا [467]۔ ان کے مسلمان ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ غالباً اس کے فوراً بعد ان کے قبیلہ میں ایک عامل صدقات بھیجا گیا تھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ مرکزی عامل صدقات ان کے پڑوسی قبیلہ بنو طے کے صدقات وصول کرنے کے لئے بھی مشترک طور پر بھیجا گیا تھا [468]۔

مستشرقین نے طلیحہ بن خویلد اسدی کی مثال کو پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنو اسد عہد نبوی میں اسلام کے دائرے میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے۔ جبکہ مآخذ کا اصرار ہے کہ وہ حیات نبوی میں نہ صرف مسلمان ہو چکے تھے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں اپنی وفاداری بھی ثابت کر چکے تھے۔ بہر حال ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ طلیحہ بن خویلد اسدی کی اصل طاقت اور قوت کا سرچشمہ اس کا اپنا خاندان یا قبیلہ نہیں تھا۔ بلکہ بنو طے اسد اور غطفان خاص کر مؤخر الذکر کے خاندان بنو فزارہ کا قبائلی اتحاد تھا۔ جس نے وفات نبوی کے بعد طلیحہ کی بغاوت اور ارتداد بلکہ جھوٹے دعوائے نبوت میں امداد کی تھی [469]۔ اگرچہ سر دست ہمارے موضوع سے طلیحہ کے ارتداد اور بنو اسد کی سرکشی کا تعلق نہیں ہے۔ تاہم یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بنو اسد یا طلیحہ کا ارتداد بھی بالواسطہ سہی ان کے "قبول اسلام" کا ثبوت تھا۔ اس کے علاوہ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عدی بن حاتم طائی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم صحابی، پکے مسلمان اور بنو طے کے سب سے بڑے سردار تھے نہ صرف اپنے قبیلہ کو طلیحہ کے دام تزویر سے نکال لانے میں کامیاب رہے تھے بلکہ بنو اسد اور غطفان کے مختلف خاندانوں کو ردہ جنگ سے پہلے مرکز اسلام کا مطیع بنانے میں بھی کامیاب رہے تھے یہ دلچسپ بات ہے کہ طلیحہ کے سب سے عظیم اتحادی حضرت عیینہ بن حصن فزاری نے طلیحہ کے فرار ہونے کے بعد دوبارہ اسلام قبول کرتے وقت کہا تھا کہ "ہم اس مذہب خداوندی میں پھر سے داخل ہو رہے ہیں۔ جس سے ہم نکل گئے تھے"۔ اس ضمن میں یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ طلیحہ اسدی کی اصل طاقت فزارہ کی عصبیت سے بھرپور حمایت تھی کیونکہ وہ اس کے قدیم حلیف تھے۔ لیکن جوں ہی حضرت عیینہ فزاری پر طلیحہ کے کذب و افتراء کی قلعی کھلی۔ انہوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا [470] اور اسی اعتراف حق کے سبب حضرت ابوبکر صدیق اور ان کے سپہ سالار حضرت خالد بن ولید مخزومی نے ان کو معاف بھی کر دیا تھا۔ بہر حال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حیات نبوی میں ہی بنو اسد بن خزیمہ کے اکثر لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور ان میں سے بہت سول

نے طلیحہ کا ساتھ اس کی بغاوت میں نہیں دیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو قبیلہ اسد کو اسلام کی طرف اتنی آسانی سے دوبارہ واپسی نہیں ہو سکتی تھی۔

ابن حزم اندلسی کے مطابق بنو اسد عام طور سے اور بنو اسد کی ایک ذیلی شاخ بنو غنم بن دودان خاص طور سے مادر قبیلے خزیمہ کی اصل شاخ تھی [۱۰۱]۔ ان کے علاوہ بنو ثعلبہ بن دودان بھی ایک اہم شاخ تھی۔ اور اس میں بھی متعدد مسلمانوں کے نام ملتے ہیں، جیسے حضرات عبید بن ثعلبہ، مالک بن حضرمی، بن عامر، ضرار بن الازور اور وابصہ بن مسعود وغیرہ [۱۰۲]۔ بنو اسد کے علاوہ بہر حال خزیمہ کی دو اہم شاخیں اور بھی تھیں۔ بنو عضل اور بنو قارہ جن کا تعلق بنو ہون بن خزیمہ سے تھا۔ یعنی جو بنو اسد کا عم زاد خاندان تھا۔ اور اس میں بھی اسلام نے اپنے ماننے والے بنا لئے تھے۔ بنو قارہ کے ایک عظیم ترین صحابی حضرت مسعود بن ربیع تھے۔ جو بدری صحابی ہونے کا شرف رکھتے تھے اور انہوں نے مکہ میں اسلام قبول کیا تھا۔ اور وہاں سے ہجرت کی تھی [۱۰۳]۔ ان کے علاوہ اسد الغابہ کے مطابق ایک اور قاری صحابی تھے۔ حضرت مسعود بن عمرو، جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ حنین کے بعد ہوازن سے حاصل شدہ اموال غنیمت کو جعرانہ کے مقام پر اکٹھا کرنے کے لئے بھیجا تھا [۱۰۴]۔ مجموعۃ الوثائق میں منقول ایک نامۂ نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو ہون بن خزیمہ کے دو خاندانوں بنو قارہ اور بنو حکم کے لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ کنانہ اور مزینہ کے کچھ لوگ بھی اسلام لائے تھے [۱۰۵]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خزیمہ کے ان خاندانوں نے مدنی عہد کے دور اول میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کی تائید مزید عضل اور قارہ کے اس وفد سے بھی ہوتی ہے جو ۳ھ میں خدمت نبوی میں یہ درخواست لیکر آیا تھا کہ ان کے قبیلے کے مسلمانوں کو اسلام کی تعلیم دینے کے لئے کچھ معلمین کو مدینہ سے بھیج دیا جائے۔ درخواست قبول کر لی گئی مگر مسلم جماعت قراء و معلمین کو واقعہ رجیع میں بنو لحیان نے عضل و قارہ کے مشرک و دشمن عناصر کی مدد سے قتل کر دیا تھا [۱۰۶]۔ مآخذ اور ہمارے جدید مؤرخین عموماً بنو عضل و قارہ کی درخواست کو مسلمانوں سے انتقام لینے کا بہانہ بتاتے ہیں۔ لیکن بہر حال یہ امکان پھر بھی رہ جاتا ہے کہ ان قبیلوں میں یقیناً کچھ نہ کچھ مسلمان رہے ہوں گے۔ خزیمہ کی دوسری شاخوں میں توسیع و اشاعت اسلام کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ لیکن قرائن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ فتح مکہ تک خزیمہ کے تمام خاندان اور شاخیں اسلام کے سایہ میں آگئی تھیں۔

(ب) بنو سُلَیم

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے مشرقی علاقے میں آباد بنو سلیم کا قبیلہ بڑا اہم اور طاقتور قبیلہ تھا۔ اسلام سے اس کا تعارف مکی عہد میں ہوا تھا۔ جب اس کے بعض افراد نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بنو سلیم کے ابتدائی مسلمانوں میں ایک تھے حضرت عمرو بن عبسہ جنہوں نے ابن سعد کی ایک روایت کے مطابق حضرات ابوبکر و بلال کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ اور چوتھے یا پانچویں مسلمان تھے [۱۰۷]۔ قبول اسلام کے بعد وہ حکم نبوی کے مطابق اپنے علاقے میں واپس چلے گئے تھے اور صفنہ اور حرۃ کے مقامات پر متبادل طریقے سے سکونت پذیر رہے۔ یہ بنو سلیم کا روایتی علاقہ تھا۔ جہاں وہ مدتوں سے آباد تھے اور بالآخر حضرت

عمرو نے ہجرت نبوی کے بعد مدینہ میں سکونت اختیار کر لی۔[۴۷۸] ابن حزم کے بیان میں یہ اضافہ ہے۔ جس کی تائید دوسرے مآخذ سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عمرو بن عبسہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی دوست تھے اور ان کے تعلقات ایام جاہلیت سے قائم تھے۔[۴۷۹] مآخذ سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے قبول اسلام اور ہجرت مدینہ کے درمیانی عرصے میں کیا کیا تھا؟ لیکن غالباً یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا۔ خاص کر حضرات ابوذر غفاری، طفیل بن عمرو دوسی وغیرہ کی مثالوں کے بعد کہ انہوں نے بھی اپنے علاقے میں اسلام کی اشاعت کی کوشش کی ہوگی۔ اس میں ان کو کتنی کامیابی ملی۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ دوسرے ابتدائی مسلمان حضرت عتبہ بن غزوان مازنی تھے اور ان کے ایک مولی حضرت خباب نے بھی ان کی اقتدار کی تھی مگر یہ دونوں صحابی مکی تھے۔ کیونکہ وہ مکہ ہی میں سکونت پذیر رہے اور بنو نوفل / قریش کے حلیف بھی تھے۔ ان دونوں صحابیوں نے مہاجرت حبشہ و مدینہ کی سعادت کے علاوہ بدری ہونے کی فضیلت بھی پائی تھی[۴۸۰]

بنو سلیم کے ایک اور ابتدائی مسلم تھے حضرت عروہ بن الصلت جو غزوہ احد میں یا بئر معونہ کے المیہ میں (بہ اختلاف روایت) شہید ہوئے تھے۔ بہر حال صورت حال جو کچھ بھی رہی ہو ابن اسحاق کے مطابق وہ بہترین مسلمانوں میں سے ایک تھے۔ اگر بئر معونہ میں ان کی شہادت کی روایت قبول کر لی جائے تو یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے بنو سلیم کے ایک ساتھی ہم قبیلہ کی امان یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دی تھی کہ "وہ اسلام لانے کے بعد کسی کافر کی امان (پناہ) نہیں قبول کر سکتے اور ان کو بس خدا کی امان کافی ہے" اور ہنستے مسکراتے راہ خدا میں جان دے دی تھی (۴۸۱) اس سے اہم اور عبرتناک یہ واقعہ ہے کہ بئر معونہ کے المیہ نے بنو سلیم کے مختلف گھرانوں میں کم از کم افراد کی حد تک اسلام کی نشر و اشاعت کی راہ ہموار کر دی۔ حضرت جبار بن سلمی کا بیان ہے کہ "میں نے جب حضرت عامر بن فہیرہ کو قتل کیا اور میرا نیزہ ان کے سینے کے پار ہو گیا تو وہ گرے اور ان کی زبان پر بےساختہ کلمہ آیا۔ رب کعبہ کی قسم! میں تو کامیاب ہو گیا۔" میں حیران ہوا کہ ایک شخص جس کی زندگی اس المناک طریقے سے ختم ہوئی وہ کیونکر کامیاب ہوا؟ یہ خلش میرے دل میں پیدا ہوئی اور میں نے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور بالآخر مسلمان ہو گیا[۴۸۲] حضرات عروہ بن صلت اور عامر بن فہیرہ کے خون شہادت ہی نے اسلام کے پودے کی اس طرح آبیاری نہیں کی تھی اور نہ جانے کتنے شہیدوں کا لہو رنگ لایا ہوگا۔ اور وہ نہ جانے کتنے دلوں میں اسلام کا بیج بو گیا ہوگا۔ غالباً اسی زمانے سے حضرت صفوان بن معطل کا قبول اسلام بھی تعلق رکھتا ہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عظیم صحابی تھے جن کا تعلق بنو سلیم کے گھرانے بنو ذکوان سے تھا۔ تقریباً تمام مآخذ کا اتفاق ہے کہ وہ غزوہ بنی المصطلق میں شریک اور ساقہ لشکر اسلامی کے افسر تھے[۴۸۳]

اگرچہ غزوہ احزاب میں مکی اتحاد قبائل میں بنو سلیم کا ایک خاصا بڑا دستہ جو سات سو جنگجوؤں پر مشتمل تھا مسلمانوں کے خلاف لڑنے آیا تھا[۴۸۴] لیکن اس غزوہ کے دوران ہی ان کو اسلام کی مخالفت و عداوت کی بے مائگی اور بے فائدہ ہونے کا احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ اسی سبب سے وہ آہستہ آہستہ اسلامی امت بننے لگے تھے۔ بلکہ اجتماعی طور سے اسلام کے قریب آ رہے تھے[۴۸۵]۔ اس کی تصدیق ابن سعد کے اس بیان سے ہوتی ہے۔ جس کے مطابق بنو سلیم کے کافی لوگوں نے صلح حدیبیہ

اور فتح مکہ کے درمیانی عرصے میں اسلام قبول کیا تھا۔ اور ان میں سے بارہ اہم حضرات کے نام بھی گنائے ہیں جو یہ ہیں۔ حضرات: (۱) الحجاج بن علاط سلمی (۲) عباس بن مرداس (۳) ان کے صاحبزادے جہینہ بن عباس (۴) یزید بن اخنس (۵) ضحاک بن سفیان بن حارث (۶) عُتبہ بن فرقد (۷) خفاف بن عمیر بن حارث (۸) ابن ابی العوجاء (۹) العورد بن خالد بن خدلیفہ (۱۰) ہوذہ بن حارث (۱۱) عرباض بن ساریہ اور (۱۲) ابو حصین[۴۸۶] ان کے علاوہ متعدد سلمی صحابہ کے اسمائے گرامی سیرت و تاریخ کی مختلف کتابوں میں ملتے ہیں[۴۸۷] اور اگر سب کا استقصا کیا جائے تو بنو سلیم کے صحابہ کرام کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہو گی۔

اس کے علاوہ اس حقیقت سے کہ بنو سلیم نے غزوہ خندق کے بعد اسلامی ریاست کے خلاف کسی مخالفانہ سرگرمی میں حصہ نہیں لیا تھا اور نہ ہی اسلامی حکومت نے ان کے خلاف کوئی فوج کشی یا فوجی کارروائی کی تھی۔ ان کے قبول اسلام یا کم از کم ترکِ عداوت اسلام کے خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ حضرت عباس بن مرداس سلمی کی شاعری سے جو سیرت ابن اسحاق میں محفوظ ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنو سلیم کے بیشتر لوگ فتح مکہ سے قبل اسلام لا چکے تھے[۴۸۸]۔ مآخذ عام طور سے اور ابن سعد خاص طور سے صراحت کرتے ہیں کہ بنو سلیم کے سرداروں اور سر برآوردہ حضرات جیسے عباس بن مرداس، جبار بن حکم، حجاج بن علاط اور عرباض بن ساریہ وغیرہ نے بنو سلیم میں اسلام کی نشر و اشاعت میں کلیدی کردار ادا کیا تھا اور ان کو اسلامی امت کا رکن بنا دیا تھا[۴۸۹] بہر حال یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ فتح مکہ سے قبل بنو سلیم اسلام کے مکمل طور سے حلقہ بگوش بن چکے تھے

بنو سلیم کے قبول اسلام کی ایک ناقابل تردید شہادت ان کے دستوں کی اسلامی لشکر میں مختلف غزوات کے مواقع پر شمولیت ہے۔ اس سے ان کی عددی طاقت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مآخذ کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے لئے اسلامی لشکر میں بنو سلیم کے دستہ میں ایک ہزار مسلح و کیل کانٹے سے لیس مجاہدین شامل تھے[۴۹۰] یہ امر قابل ذکر ہے کہ بنو سلیم کا دستہ بدوی مسلم قبائل کے فراہم کردہ سب سے بڑے دستوں میں سے ایک تھا اور فوجی لحاظ سے طاقت ور ترین تھا۔ بنو سلیم کے اس دستے نے جنگ حنین اور محاصرہ طائف میں بھی حصہ لیا تھا۔ یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ ان تمام مواقع پر بنو سلیم کا دستہ اسلامی لشکر کے مقدمہ کا ایک حصہ تھا جو بعض دوسرے دستوں کے ساتھ حضرت خالد بن ولید مخزومی کے کمان میں رکھا گیا تھا[۴۹۱] بنو سلیم کے حسنِ اسلام کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بنو سعد بن بکر کی دردمندانہ درخواستوں پر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے قیدیوں کی رہائی کے احکامات صادر کئے تھے۔ تو اپنے شیخ قبیلہ کے ذہنی تحفظات اور گرانی خاطر کے باوجود بنو سلیم کے تمام لوگوں نے اپنے اپنے حصے کے قیدی فوراً رہا کر دیئے تھے۔[۴۹۲] حضرت خالد بن ولید مخزومی کی کمان میں جو فوج اس کے بعد بنو جذیمہ کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ اس میں مہاجرین اور انصار کے علاوہ بنو سلیم ہی کے مجاہدین کافی بڑی تعداد میں شامل تھے[۴۹۳] اسی طرح انہوں نے غزوہ تبوک کے موقعہ پر اسلامی لشکر کے لئے ایک خاصا بڑا اور طاقت ور دستہ فراہم کیا تھا[۴۹۴]۔ چنانچہ یہ واضح ہوتا ہے کہ غزوہ خیبر کے بعد بنو سلیم کے مخلص اور ثابت قدم مسلمان اسلامی ریاست کی مختلف حیثیتوں میں شاندار خدمات انجام دے رہے تھے اور اسلام کے سچے وفادار اور مخلص ماننے والے

بن گئے تھے۔

ابن سعد کا مزید بیان ہے کہ فتح مکہ کے سال ہی بنو سلیم کا ایک وفد عظیم جو نوسو یا ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ اپنے ایک خاص سردار حضرت قیس بن نُسیبہ کی تحریک پر مدینہ میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا تھا۔ اور اس نے اپنی وفاداری اور صلابت ایمانی کا بےمثال مظاہرہ کیا تھا[495] اس زیارت کے دوران بنو سلیم کے متعدد حضرات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قطائع (قطیعہ: زمین کا ٹکڑا) عطا فرمائے تھے۔ طبقات، اسد الغابہ اور مجموعۃ الوثائق کے متعدد بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم بنو سلیم کے بارہ حضرات کو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف مقامات پر قطائع ملے تھے[496] ۹ھ کے آغاز اور ۱۰ھ کے پہلے ربع میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو سلیم سے صدقات وصول کرنے کیلئے ایک مرکزی عامل صدقات مقرر کیا تھا اور یہ بنو سلیم کے شرف کی بات ہے کہ پورے قبیلہ نے بلا کسی ردوکد کے اپنے واجب الادا صدقات فوراً ادا کر دیئے تھے[497]۔ یہاں یہ بھی ذکر کر دیا جائے کہ عامل صدقات کے پورے گھرانے اور خاندان نے ردہ کے زمانے میں بھی اپنے صدقات پوری دیانت داری سے ادا کئے تھے[498]۔ بنو سلیم کے صرف ایک طبقہ نے ردہ میں حصہ لیا تھا اور بیشتر لوگ اسلام اور مرکز اسلام کے وفادار رہے تھے۔ بہرحال یہ ناقابل انکار و تردید حقیقت ہے کہ عہد نبوی میں بنو سلیم کا پورا قبیلہ نہ صرف مسلمان ہو گیا تھا بلکہ مخلص مسلمان تھا۔ جو بعد کے پر آشوب زمانے میں بھی زیادہ تر ثابت قدم رہا تھا[499]

(ج) بنو غطفان

بنو غطفان غالباً قریش مکہ کے بعد سب سے زیادہ طاقت ور اور عددی اعتبار سے بڑا بدوی قبیلہ تھا۔ نسب کے لحاظ سے وہ بنو سلیم کے بہت قریب تھا بلکہ کہنا چاہیئے کہ دونوں ایک دوسرے کے عزیز اور رشتہ دار تھے کیونکہ دونوں مُضَر کے ایک عظیم خاندان یا قبیلے قیس عیلان کی شاخیں تھیں[500]۔ سماجی، سیاسی اور نسبی اعتبارات سے قریش مکہ اور قیس عیلان وسطی عرب کے دو سب سے بڑے قبائلی گروہ تھے جو لوجوہ معلوم ایک دوسرے کے حریف اور متقابل تھے۔ اگرچہ اقتصادی اور تجارتی اسباب کے سبب قیس عیلان کے بعض گھرانوں کے ساتھ قریش مکہ کے دوستانہ تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے جن میں ازدواجی روابط بھی شامل تھے۔ بہرحال غطفان بعثت نبوی کے زمانے تک بجائے خود قبائل کا ایک مجموعہ بن گیا تھا جس کے اپنے گھرانے اور ان کے ذیلی خاندان تھے اور جو اپنی اپنی جگہ قبیلے بن چکے تھے۔ ان میں سے سب سے زیادہ طاقت ور اور عددی کثرت والے تین اہم ترین بطون تھے: بنو اشجع، بنو فزارہ اور بنو مرہ ان کے علاوہ عبس اور ذبیان کے دو اہم گھرانے تھے جو ولادت نبوی یا اس سے بھی قبل کے زمانے میں بہت اہم تھے۔ لیکن بعثت نبوی کے زمانے میں وہ اپنی سابقہ حیثیت اور مقام کھو چکے تھے اور اتنے اہم نہیں رہ گئے تھے۔ دو اور اہم شاخیں تھیں جو بنو محارب اور بنو ثعلبہ کہلاتی تھیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور ذیلی شاخیں بھی تھیں جن میں سے بنو انمار اور بنو عبد العزیٰ خاصی اہم تھیں۔ یہ تمام اہم اور ذیلی خاندان اور بطون ایک دوسرے سے قریبی و اتحادی تعلقات رکھتے تھے اور ان کا سیاسی اور

فوجی اتحاد ہی ان کے طاقت ور ہونے اور قبائلی نظام عرب میں ممتاز ہونے کا سب سے بڑا سبب تھا۔ ان کے نسبی شجرہ پر ایک نظر ان کے قریبی تعلقات کی نوعیت کو واضح کر دے گی[۵۰۱]

جہاں تک اسلام اور اسلامی ریاست سے بنو غطفان کے تعلقات کا معاملہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے مدتوں تک اجتماعی طور سے دونوں کی مخالفت کی تھی۔ لیکن اسلام نے ان کے بعض افراد کو اپنا حلقہ بگوش آغاز عہد اسلامی ہی میں بنا لیا تھا۔ ذیل میں بنو غطفان کے مختلف قبیلوں اور بطون کے افراد کے انفرادی اور ان کے اجتماعی رویے کا جائزہ لیں گے۔ جس سے بنو غطفان میں اسلام کی اشاعت کا نہج اور رفتار اور طریقہ تاثیر و تسخیر معلوم ہو گا۔

(۱) بنو اشجع

جس طرح قریش مکہ کے بعض خاندانوں نے اسلام کی مخالفت کی تھی، یا اس کی دعوت سے اجتماعی طور سے گریز کیا تھا مگر اس کے تقریباً سب ہی گھرانوں کے افراد اسلام قبول کرتے رہے تھے۔ بالکل اسی طرح بنو غطفان بھی مدتوں تک اسلام کا مخالف رہا لیکن اس کے مختلف گھرانوں میں اسلام روشناس ہوتا رہا۔ ان میں سب سے پہلے اور غالباً دوسروں کی بہ نسبت ذرا ابتدائی زمانے میں ان کا گھرانا بنو اشجع اسلام سے متعارف ہوا تھا اور اس کے بعض افراد و ارکان نے اسلام مکی عہد ہی میں قبول کر لیا تھا۔ ابن سعد اور ابن حزم کی روایات کے مطابق حضرت جاریہ بن جمیل ان کے قدیم ترین مسلمانوں میں شامل تھے وہ بدری صحابی بھی تھے[۵۰۲] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو غطفان کے مختلف گھرانوں میں اسلام کی باقاعدہ اشاعت جنگ احزاب کے بعد شروع ہوئی تھی اور صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے دوران وہ تقریباً سب مسلمان ہو چکے تھے۔ ابن سعد نے فتح مکہ سے قبل مسلمان ہونے والے صحابہ کرام کی فہرست میں کم از کم دس بنو اشجع کے مسلمانوں کو شمار کیا ہے[۵۰۳] ان میں سے نصف دوسرے مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵ھ/۶۲۶ء سے پہلے کے مسلمان تھے اور بعض اہم حضرات تو جنگ خندق (۵ھ/۶۲۷ء) سے قبل اسلام لا چکے تھے۔ ان میں سب سے اہم حضرت نعیم بن مسعود اشجعی تھے۔ جو احزاب سے کچھ پہلے اسلام لا چکے تھے۔ اور ان کے اسلام کو ان کے قبیلہ والے اور اتحادی نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے جس مہارت، ہوشیاری اور سیاسی حکمت عملی سے احزاب کے اتحاد کو توڑا تھا وہ ان کے حسن و صلابت اسلام کا بھی ایک بہترین نمونہ تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہی بنو قریظہ کو عملی طور سے جنگ احزاب کے دوران اتحادیوں سے ملنے سے روک دیا تھا[۵۰۴] ان کے خاندان بنو اشجع کے دوسرے اہم اور سربرآوردہ مسلمان تھے: حضرات عبد اللہ بن نعیم جو غزوہ خیبر میں شریک جہاد تھے[۵۰۵] عوف بن مالک، غزوہ خیبر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دلیل (راہ بر)[۵۰۶] حسیل بن خارجہ، جو خیبر کے بعد غالباً اسلام لائے تھے[۵۰۷] اور معقل بن سنان جنہوں نے متعدد مواقع پر اسلامی ریاست کی خدمات انجام دی تھیں[۵۰۸]

ان اہم اور با اثر حضرات کے قبول اسلام کا لازمی طور سے ان کے قبیلے کے دوسرے افراد پر بھی اثر پڑا تھا، لیکن سب سے زیادہ ترویج اسلام میں حصہ لیا تھا۔ حضرت مسعود بن رُخَیلہ اشجعی کے قبول اسلام نے۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ انہوں

نے جنگ احزاب کے فوراً یا کچھ مدت کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔[509] ان کے قبول اسلام کی تاثیر کا اندازہ اس پس منظر میں ہوتا ہے کہ انہوں نے جنگ احزاب کے دوران اپنے قبیلہ اشجع کے دستے کی قیادت میدان جنگ میں کی تھی اور وہی قبیلہ کے سب سے بڑے اور مسلّم سردار تھے۔ چونکہ وہ اپنے قبیلے کے سب سے زیادہ بااثر آدمی تھے۔ اس لئے ان کے قبول اسلام کا اثر ان کے قبیلہ والوں پر عام طور سے اور ان کے اپنے اہل خاندان پر خاص طور سے پڑنا لازمی تھا۔

افراد و شیوخ قبائل کا انفرادی اسلام ہی توسیع و اشاعت اسلام کا واحد سبب نہیں تھا۔ اس سے کہیں زیادہ اہم سبب یا عنصر تھا ان نو مسلموں کا پورے جوش و ولولے کے ساتھ اپنے قبیلوں میں اسلام کی تبلیغ کرنا۔ چنانچہ ابن اسحاق کے بیان سے بصراحت معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت نعیم بن مسعود اشجعی نے اپنے قبیلہ کے قبول اسلام میں کافی اہم کردار ادا کیا تھا۔[510] کسی حد تک بنو اشجع کے قبول اسلام کی تصدیق ابن سعد کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ بنو اشجع کا وفد سو افراد پر مشتمل تھا، لیکن دوسری روایت سے جو زیادہ قرین قیاس ہے معلوم ہوتا ہے کہ وفد کے ارکان کی تعداد سات سو تھی[511]۔ یہ دلچسپ اور اہم تاریخی حقیقت ہے کہ بنو اشجع کے اس وفد نے جنگ احزاب میں اتحادیوں کی ناکام پسپائی کے فوراً بعد بارگاہ نبوی میں حاضری دی تھی[512] بہر حال فتح مکہ تک یہ پورا قبیلہ اسلامی امت کا ایک مخلص و تابعدار رکن بن چکا تھا۔ کیونکہ فتح مکہ کے اسلامی لشکر کے لئے بنو اشجع نے تین سو مسلح مجاہدین فراہم کئے تھے[513] اسی طرح اس نے غزوہ تبوک کے لئے بھی خاصا بڑا دستہ فراہم کیا تھا۔ اس ضمن میں یہ حقیقت قابل ذکر ہے کہ ان دونوں مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت نعیم بن مسعود کو بنو اشجع کے مجاہدین کو اکٹھا کرنے کے لئے بھیجا تھا۔[514] ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غالباً حضرت نعیم بن مسعود اشجعی یا تو بنو اشجع کے سردار بن گئے تھے اور حضرت مسعود بن رُخیلہ انتقال فرما چکے تھے۔ یا میدان سیاست سے ہٹ گئے تھے یا وہ اس وقت تک اشجع کے سب سے زیادہ اہم اور بااثر شخص بن چکے تھے۔

(۲) بنو فزارہ

بنو غطفان کے دوسرے اہم خاندان خاص طور سے فزارہ اور مرہ مجموعی لحاظ سے اسلام کے دائرے سے کافی عرصے تک باہر رہے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ خیبر کے بعد تو یقیناً اور غزوہ احزاب کے بعد غالباً ان کی اسلام اور اسلامی ریاست سے مخالفت کم ہونے لگی تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں دونوں طرف سے ہم کسی جارحانہ اقدام کے بارے میں نہیں سنتے۔ یہ حتمی امر ہے کہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی عرصے میں وہ تقریباً سب کے سب مسلمان ہو گئے تھے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کا ایک خاصا بڑا فوجی دستہ اسلامی لشکر کا حصہ تھا۔ جس نے مکہ فتح کیا تھا[515]۔ واقدی کے یہاں متعدد حوالے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو فزارہ عام طور سے اور ان کے سردار خاص طور سے ان سیاسی و فوجی تبدیلیوں سے خوش نہیں تھے۔ جو غزوہ احزاب کے بعد پیش آرہی تھیں۔ اور آہستہ آہستہ ان میں اسلامی ریاست سے کوئی سمجھوتہ یا مفاہمت کرنے کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو فزارہ اور ان کے سردار عیینہ بن حصن فزاری کو اسلام کا ہمنوا بنانے

میں ان کے حلیف و عزیز بنو مرہ کے سردار حضرت حارث بن عوف مری نے اہم کردار ادا کیا تھا[۵۱۶] صلح حدیبیہ یا غزوۃ القضیہ کے زمانے (۶ھ / ۶۲۸-۲۹ء) تک وہ عجیب کشمکش اور حیص بیص کے عالم میں تھے۔ لیکن مکہ کی گرتی ہوئی ساکھ اور اسلامی ریاست کی روز افزوں طاقت نے ایک طرف تو ان کو اسلامی ریاست کا وفادار بنادیا اور دوسری طرف اسلام کا پیرو بھی فتح مکہ سے پہلے وہ اسلامی امت کے باقاعدہ رکن بن چکے تھے اور ان میں سے اکثر مخلص مسلمان تھے۔ یہی سبب تھا کہ فتح مکہ کے موقعہ پر اسلامی لشکر میں دوسرے مشرقی قبائل کے دستوں کے علاوہ بنو فزارہ کے لوگ بھی موجود تھے اور انہوں نے فتح مکہ، غزوات حنین و طائف میں شاندار فوجی خدمات انجام دی تھیں۔ اسی طرح ابن اسحاق کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو عبس کا ایک اہم دستہ اس موقعہ پر موجود تھا اور یہی فزارہ اور مرہ کا دستہ تھا۔ یہ اسلامی لشکر کے میمنہ دائیں بازو / RIGHT - WING میں شامل تھا اور ان کے علاوہ بنو عبس اور قبیلہ بنو اسد / خزیمہ کے دستے بھی تھے[۵۱۷] بنو فزارہ کے قبول اسلام کا یہ ایک ناقابل تردید ثبوت ہے

بلاریب بنو فزارہ کی سب سے اہم مسلم شخصیت حضرت عیینہ بن حصن فزاری کی تھی جنہوں نے غالباً فتح مکہ سے کچھ قبل اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ دوسرے بدوی قبائل جیسے بنو سلیم، تمیم اور ہوازن وغیرہ کے سرداروں کے ساتھ ان نومسلموں میں شامل تھے جن کو عام طور سے المؤلفۃ قلوبہم (وہ لوگ جن کی تالیف و تسکین قلب کی گئی تھی) کہا جاتا ہے اور جن کے اطمینان قلب و تسکین انا اور اعزاز و اکرام کے اظہار کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے خمس میں عطایائے خاص عنایت فرمائے تھے۔ حضرت عیینہ بن فزاری کو ایک سردار کا حصہ ملا تھا جو سو اونٹوں پر مشتمل تھا۔ یہ عطیہ نبوی تھا[۵۱۸] اس کے فوراً بعد ہی ہم ان کو اسلامی ریاست کی جانب سے بنو تمیم کے ایک سرکش خاندان کے خلاف فوجی کارروائی کے قائد کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ یہ واقعہ محرم ۹ھ / اپریل ۶۳۰ء کا ہے[۵۱۹] اس سے اہم یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس زمانے میں وہ بنو تمیم کے لئے بطور مرکزی عامل صدقات مقرر کئے گئے[۵۲۰] غالباً یہ عارضی انتظام تھا۔ کیونکہ اس کے بعد ہی ان کو اپنے قبیلہ بنو فزارہ کا محصل یا عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا، جیسا کہ بلاذری کا بیان ہے[۵۲۱] ان حقائق سے بنو فزارہ یا ان کے سردار کے قبول اسلام کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا ہے۔ مزید تائید ان کے وفد کے مدینہ میں ۹ھ کے آخری زمانے اور ۶۳۱ء کے آغاز میں آنے سے ہوتی ہے۔ ان کا یہ وفد غزوہ تبوک کے بعد حاضر بارگاہ نبوی ہوا تھا ابن حزم نے بنو فزارہ کے متعدد صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے جن میں سے اہم ترین تھے۔ حضرات کثیر بن زیاد اور سمرہ بن جندب جن کا تعلق فزارہ کے ایک گھرانے بنو شمخ سے تھا[۵۲۲]

ان حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہے کہ بنو فزارہ اور ان کے سردار بلاشک وشبہ حیات نبوی میں اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے تھے۔ وہ سب یا ان میں سے اکثر یا بعض عہد نبوی کے بعد مرتد ہو گئے تھے اور طلیحہ اسدی کے جال میں پھنس گئے تھے۔ الگ بات ہے اور ان کا ارتداد بھی ان کے پہلے قبول اسلام کا ثبوت ہے۔ بہرحال جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ وہ حضرت خالد بن ولید مخزومی کے ہاتھوں ۱۱ھ / ۶۳۲ء میں طلیحہ اسدی کی شکست کے بعد پھر مسلمان ہو گئے تھے طبری کے بیان کے مطابق انہوں نے کہا تھا "ہم اس دین میں پھر داخل ہو رہے ہیں جس سے نکل گئے تھے۔ ہم خدا اور اس کے رسول"

کے سامنے سرِ اطاعت خم کرتے ہیں اور اپنے اموال اور اپنی جانوں کے بارے میں احکام الٰہی کی تعمیل کرتے ہیں"[۵۲۴]

(۴) بنو مرہ

بنو غطفان کے تیسرے سب سے اہم بطن بنو مرہ کا بنو فزارہ سے قریبی تعلق تھا وہ دونوں نہ صرف ایک دوسرے کے عم زاد خاندان تھے بلکہ ایک دوسرے کے حلیف بھی تھے[۵۲۵] ذکر آچکا ہے کہ ان دونوں خاندانوں میں غزوہ احزاب کے بعد گذشتہ حالات یا دوسرے اسباب میں اسلامی ریاست اور اسلام کے بارے میں اپنے تعلقات اور حکمت عملی کے لئے تغیر یا بے اطمینانی پیدا ہوگئی تھی۔ اتحاد احزاب کے ناکام ہونے کے بعد بنو مرہ کے سردار حارث بن عوف نے اسلامی ریاست سے مفاہمت کرنے اور دوستی کے تعلقات استوار کرنے کا برملا اظہار بنو فزارہ کے سردار سے کیا تھا۔ اور ان کو بھی یہی مشورہ دیا تھا[۵۲۶] بنو فزارہ کے حیص بیص اور پس وپیش کے سبب بنو مرہ بھی اسلام اور اسلامی ریاست کے قریب نہیں آسکے کیونکہ وہ بنو فزارہ سے اپنے قدیم برادرانہ اور حلیفانہ تعلقات کے بندھنوں سے مجبور تھے۔ پھر غزوہ خیبر کے موقعہ پر بھی بنو مرہ کے سردار نے انہی جذبات کا اظہار کیا تھا۔[۵۲۷] اس ضمن میں یہ نکتہ خاصا اہم اور قابل ذکر معلوم ہوتا ہے کہ خیبر کے یہودیوں نے بنو غطفان کو اپنی پیداوار کا نصف حصہ دیکر اسلامی ریاست کے خلاف اور ایک اتحاد بنانا چاہا تھا۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دوربین پالیسی اور عظیم حکمت عملی کے سبب یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ قوی امکان ہے کہ بنو مرہ اور ان کے ہم خیال اتحادیوں نے بھی اسلامی ریاست کے خلاف کسی نئے اتحاد یا گٹھ جوڑ میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور بنو غطفان کا یہ باہمی سیاسی اختلاف بھی خیبر کے یہودیوں کے منصوبے کی ناکامی کا ایک اہم عنصر یا عامل رہا تھا۔ بہرحال عمرۃ القضیہ کے زمانے تک بنو مرہ اور ان کے سردار قبول اسلام کی دہلیز پر کھڑے تھے اور اسی زمانے یا اس کے معاً بعد وہ باب رحمت سے قلعہ اسلامی میں داخل ہوگئے[۵۲۸] غالباً اسد الغابہ کی اس روایت کا اسی زمانہ سے تعلق ہے۔ جس کے مطابق بنو قیس کے ایک صحابی حضرت ساریہ بن اوفی کو جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو مرہ کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے بھیجا تھا۔ اور انہوں نے تھوڑی سی مزاحمت کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا[۵۲۹]۔ اس سے پہلے مختلف غزوات نبوی میں بنو مرہ کے دستوں کی موجودگی کا ذکر آچکا ہے جو ان کے قبول اسلام کے علاوہ اسلامی ریاست کے نظم ونسق میں ان کی فعال اور باقاعدہ شرکت کا بھی ثبوت ہے[۵۳۰]

بلاذری کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارث بن عوف کو اپنے قبیلہ بنو مرہ کے صدقات وصول کرنے اور مدینہ کے بیت المال میں پہنچانے کا افسر مقرر کیا تھا[۵۳۱] اور یہ انتظام غالباً سنہ ۹ھ کے آغاز یا سنہ ۶۳۰ء کے وسط میں کیا گیا تھا، جب بہت سے مرکزی اور مقامی عاملین وتحصیلین صدقات تمام چھوٹے بڑے مسلمان قبیلوں کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ اپنے حلیف اور برادر بنو فزارہ کی مانند بنو مرہ نے بھی اس برس کے آخری زمانے میں یا سنہ ۶۳۱ء کے اوائل میں بارگاہِ نبوی میں نذرانہ عقیدت ووفاداری پیش کرنے کے لئے اپنا بھی وفد مدینہ بھیجا تھا جو تیرہ اشخاص پر مشتمل تھا[۵۳۲] بنو مرہ کے عہد نبوی میں قبولِ اسلام اور ریاست اسلامی سے وفاداری کا ایک مزید ثبوت یہ بھی ہے کہ وفات نبوی کے بعد ردہ کے زمانے

ہیں پورے قبیلہ بنو مرہ نے یا اس کے کسی ایک حصہ نے بھی اسلام ترک نہیں کیا تھا۔ انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا اور اس کے لئے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق سے جنگ بھی مول لی تھی[523] مگر انہوں نے نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد طلیحہ اسدی یا اس کے سب سے بڑے حلیف بنو فزارہ کا ساتھ دیا تھا۔ جس طرح انہوں نے قبیلہ طے کے خلاف بنو اسد اور بنو فزارہ کے جاہلی اتحاد میں شمولیت سے انکار کر دیا تھا۔[524]

(۱۴) بنو عبس

بنو عبس بنو ذبیان کے برعکس غطفان کا وہ گھرانا تھا۔ جو اسلامی عہد کے قریب سیاسی پس منظر میں چلا گیا تھا۔ لیکن وہ عرب دنیا کے معاملات میں اتنے غیر اہم نہیں ہو گئے تھے۔ جتنا کہ وہ اپنی گذشتہ تاریخ سے معلوم ہوتے ہیں اور نہ ہی یہ خیال صحیح ہے کہ عہد نبوی کے واقعات میں ان کا حصہ معمولی تھا۔[525] وہ اس زمانے میں بھی ایک خاصے اہم قبائلی گروہ کی حیثیت رکھتے تھے اور اسلام کی نشر و اشاعت کی تاریخ میں ان کا حصہ کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ ابن حزم نے بنو عبس کے جن متعدد صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے ان میں سے حضرات قرّہ بن حصین، شریح بن اوفیٰ اور ابی بن عمارہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم و ممتاز صحابہ میں سے تھے۔ اور انہوں نے اسلام اور اسلامی ریاست کے لئے اہم خدمات انجام دی تھیں[526]

یہ نکتہ خاصا اہم ہے کہ اسلامی ریاست سے ان کا کوئی تصادم عہد نبوی میں نہیں ہوا تھا۔ اور نہ ہی اسلامی ریاست نے ان کے خلاف کسی قسم کی تادیبی یا فوجی کارروائی کی تھی جبکہ وفات نبوی کے فوراً بعد ان کے مرکز اسلام اور خلیفہ اول سے زکوٰۃ کی ادائیگی پر اختلاف و تصادم ہوا تھا۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں کم از کم ان کو اسلامی ریاست سے کوئی اختلاف یا نزاع نہیں تھا اور غالباً وہ اسلام کے حلقہ بگوش صلح حدیبیہ کے بعد بن گئے تھے۔ اس کی تصدیق اسلامی لشکر میں ان کے دستے کی موجودگی سے ہوتی ہے جو فتح مکہ، حنین اور طائف کے غزوات میں برسر کار رہا تھا۔[527] اس کے علاوہ ابن سعد کا بیان ہے کہ ان کا ایک وفد جو ان کے نو خاندانوں (رھط) پر مشتمل تھا، کسی وقت مدینہ میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا تھا۔ تاکہ اپنے اور اپنے قبیلہ کے قبول اسلام کا اظہار اور اسلامی ریاست سے وفاداری کا اقرار کرے۔ ابن سعد نے ان کے وفد کے آنے کی تاریخ نہیں بیان کی ہے۔ مگر طبری نے واقدی کی ایک روایت کی بنیاد پر اس کی آمد کی تعیین ۹ھ / ۶۳۱-۳۲ء میں کی ہے۔[528]

ان کے قبولِ اسلام اور ریاستِ اسلامی کی شہریت کا مزید ثبوت بلاذری کے اس بیان سے ملتا ہے۔ جس کے مطابق حضرت نُعَیم بن مسعود اشجعی بنو غطفان کے تین اہم گھرانوں ..... اشجع، انمار بن بغیض اور بنو عبس بن بغیض ..... کے لئے مرکزی عامل صدقات مقرر کئے گئے تھے۔[529] بظاہر مآخذ کے کسی بیان سے نہیں معلوم ہوتا کہ بنو عبس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کیا ہو بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے تمام صدقات خوشدلی اور بروقت مدینہ کو ادا کئے تھے۔ لیکن وفاتِ نبوی کے بعد ان کے ایک گروہ نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے

کہ انہوں نے دوسرے تمام شعائر اسلام کو ادا کرتے رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ بات اہم ہے کہ خود مدینہ کے صحابہ کرام کی غالب اکثریت نے محض زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کو ارتداد نہیں سمجھا تھا۔ اور اسی وجہ سے ہمارے تمام ماخذ نے ایسے لوگوں کو مانعین زکوٰۃ (زکوٰۃ روکنے والے) طبقہ میں رکھا ہے۔ بہر حال طبری کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں پورے بنو عبس مسلمان ہو گئے تھے ۵۴۰۔ بعد میں انہوں نے اسلامی حکومت کے خلاف کسی ایک معاملہ پر بغاوت کی تھی وہ دوسری بات تھی۔

(ہ) بنو ثعلبہ

مادر قبیلہ غطفان کے دو ذیلی گھرانے بنو ثعلبہ اور انمار تھے، اور وہ دونوں اسلامی ریاست کے کم از کم ۸ھ/ ۶۲۹ء تک مخالف رہے تھے۔ چنانچہ ۳ھ/ ۶۲۴ء سے ان کے خلاف کئی چھوٹی بڑی مہمیں مدینہ منورہ سے بھیجی گئی تھیں اس کے باوجود اسلام نے ان گھرانوں میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لئے تھے اور طرفہ ستم یہ کہ ان فوجی مہموں کے دوران ہی ان کے بعض اہم افراد اور سردار اسلام کی حقانیت کے قائل اور اسلامی ریاست کے وفادار بنے تھے۔ بنو ثعلبہ کے خلاف بھیجی گئی پہلی مہم ہی کے دوران ان کا ایک شخص مسلمان ہو گیا تھا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حضرت بلال حبشی کے دامن تربیت میں دیدیا تھا کہ وہ ان سے دین میں صلابت و ثابت قدمی کا درس لیں ۵۴۱۔ یہاں یہ بات قابل ذکر معلوم ہوتی ہے کہ بنو ثعلبہ، انمار اور بنو محارب ایک ہی علاقے میں بستے تھے اور اس طرح خون کے رشتوں کے علاوہ ان میں دوستی اور سیاسی ہم آہنگی کے روابط بھی تھے۔ وہ دوسرے قبائل یا جماعتوں کے مقابلے میں عموماً بطور ایک اکائی اور وحدت کے طرز عمل اپناتے تھے۔ اسلام اور اسلامی ریاست کے معاملے میں بھی ان کا یہی وطیرہ تھا۔ چنانچہ ان تینوں قبیلوں نے ساتھ ساتھ اسلام کی مخالفت کی اور اس کے سبب کئی مہمیں جیسے غزوہ ذوامر (ربیع الاول ۳ھ/ ستمبر ۶۲۴ء) ذات الرقاع (محرم ۵ھ/ جون ۶۲۶ء) ذوالقصہ (ربیع الثانی ۶ھ/ اگست ستمبر ۶۲۷ء) الطرف (جمادی الآخرہ ۶ھ/ اکتوبر۔ نومبر ۶۲۷ء) اور میفعہ (رمضان ۷ھ/ جنوری ۶۲۹ء) بھیجی گئی تھیں ۵۴۲۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے بعد ان کے خلاف کوئی مہم نہیں بھیجی گئی اور وہ غالباً اسلام سے مفاہمت کی راہ پر لگ گئے تھے۔ بہر حال ۸ھ/ ۶۳۰ء میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جعرانہ سے واپسی پر بنو ثعلبہ نے چار آدمیوں پر مشتمل اپنا وفد بھیجا اور اسلامی ریاست سے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ جس پر وہ آخر تک قائم رہے ۵۴۳۔ چونکہ محارب انہی مذکورہ بالا مہموں میں سے کسی میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ اس لئے یہ امکان قوی ہے کہ ان کے اسلام کا اثر ان کے پڑوسیوں خصوصاً بنو ثعلبہ پر پڑا تھا۔ اس کے علاوہ ہم ان کے قبیلہ پر عامل صدقات کے مقرر کئے جانے کی شہادت پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ چنانچہ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ بنو ثعلبہ ہی نہیں بلکہ پورا قبیلہ غطفان عہد نبوی میں اسلام لا چکا تھا۔

(د) بنو محارب بن خصفہ

بنو محارب بن خصفہ قیس عیلان کا ایک طاقت ور اور اہم قبیلہ تھا اور وہ اپنے دو ہمنام مگر سیاسی لحاظ سے گمنام و بے مایہ

قبیلوں سے بالکل الگ اور ممتاز تھا[۴۴]۔ واقدی اور ابن سعد کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو محارب بن خصفہ میں اسلام کی نشر و اشاعت کافی ابتدائی زمانے میں شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس کے مطابق ۳ھ / ۶۲۴ء کی ایک مہم کے دوران اس قبیلہ کے عظیم ترین سردار حضرت دعثور بن حارث بڑے ڈرامائی طریقے سے مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ اپنے قبول اسلام کے بعد انہوں نے اپنے قبیلہ میں دین خداوندی اور کیش احمدی کی نشر و اشاعت بڑی کامیابی سے کی تھی اور مختصر سی مدت میں ان کے قبیلہ والوں نے ان کی مثال کی تقلید کی تھی اور مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے[۴۵]۔ بہرحال ۱۰ھ / ۶۳۲ء میں بنو محارب کا دس آدمیوں پر مشتمل ایک وفد مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا تھا۔ جہاں آپ اپنے آخری حج کے لئے تشریف لے گئے تھے[۴۶]۔ یہ نکتہ اہم ہے کہ بنو محارب نہ صرف عہد نبوی میں بلکہ اس کے بعد بھی اسلام پر عامل رہے تھے۔ جبکہ ان کے بعض خون کے عزیز قبیلے ارتداد کا شکار ہو گئے تھے۔ بنو محارب کے ردہ میں شریک ہونے کی کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ ابن سعد اور ابن اثیر نے متعدد محاربی صحابہ کے نام اپنی اپنی تالیفات میں دیئے ہیں۔ ان کے سوانحی خاکوں سے بھی ان کے قبول و حسن اسلام کی تائید مزید ہوتی ہے۔

(س) ہوازن

قریش مکہ اور بنو غطفان کے بعد شاید ہوازن ہی سب سے بڑا قبیلہ تھا اور غالباً جزیرہ نمائے عرب میں سیادت و قیادت کا دعویدار بھی۔ نسبی لحاظ سے وہ بھی قیس عیلان کی شاخ تھا، لیکن ایسی شاخ جو بجائے خود ایک تناور درخت بن گئی تھی اور جس کی اپنی متعدد شاخیں تھیں۔ وہ اوروں کے بہ نسبت بنو سلیم سے زیادہ قریب تھے۔ کیونکہ دونوں ہی بنو منصور بن عکرمہ بن خصفہ بن قیس عیلان کی نسل میں تھے[۴۷]۔ بعثت نبوی تک ان کی شاخیں قبیلے بن چکی تھیں۔ اور ان شاخوں کی بھی مزید شاخیں پھوٹی تھیں۔ اسی لئے وہ اپنی عددی طاقت پر نازاں تھے۔ غزوہ حنین کے موقع پر ان کے جنگجوؤں کی طاقت دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی جو میدان جنگ میں اترے تھے۔ جبکہ ان کے متعدد گھرانے اور خاندان جنگ سے الگ اپنے علاقوں میں محدود رہے تھے[۴۸]۔ عامر بن صعصعہ ہوازن کا ایک اہم ترین گھرانا تھا جس کی متعدد شاخیں تھیں۔ جیسے بنو ہلال، بنو کلاب، بنو ربیعہ، بنو بکار، اور قرطاء، اور عریبہ وغیرہ بھی انہی کے ساتھ وابستہ تھے۔ ہوازن کے دوسرے اہم خاندان تھے بنو نصر بنو جشم، بنو سعد بن بکر، بنو ثمالہ جبکہ ثقیف بجائے خود ایک ممتاز اور علیحدہ قبیلہ بن گئے تھے۔ جو دوسروں سے نسبتاً فاصلے پر قلعوں میں رہتے تھے[۴۹]۔ اپنی عددی طاقت پر ان کا ناز کچھ بیجا نہیں تھا۔ اس کے سبب وہ جزیرہ نمائے عرب کے طاقتور ترین قبیلوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور اسی طاقت کے زعم میں انہوں نے اسلامی ریاست سے ٹکر مول لی تھی خاص طور پر اس وقت جبکہ دوسرے نام جابرہ عرب مثلاً قریش اور غطفان کا کس بل نکل گیا تھا۔ ان کی عسکری اور تنظیمی طاقت کا ایک سرچشمہ ان کی عظیم قائدانہ صلاحیتیں تھیں اور ان کے سرداروں نے ان کے اعتماد اور ایقان میں مزید اضافہ کیا تھا۔ ان کے قائدین اور زعماء تجربہ کار منتظم، ماہرین عسکری امور اور عمدہ قائد تھے[۵۰]۔ ان میں دُرید بن الصمۃ سب سے بڑا اور تجربہ کار سردار تھا

جو ابن اسحاق اور واقدی کے بقول ایک سو ساٹھ سال کی عمر عظیم کو پہنچ جانے کے باوجود اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتوں سے اسی طرح بہرہ ور تھا، اگرچہ اس کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے[151]۔ لیکن بعثت نبوی بلکہ ہجرت نبوی کے بعد سب سے زیادہ فعال اور با اثر سردار نسبتاً ایک جواں شخص تھا جو قبیلہ بنو نصر کا سردار تھا[152] چونکہ عوف بن مالک نصری نے ہوازن کے مختلف بطون اور خاندانوں میں سماجی اور فوجی ہم آہنگی اور اتحاد پیدا کر دیا تھا، جس کا بے مثال مظاہرہ میدان حنین میں ہوا تھا اس لئے اس کو قبیلہ والوں کی ہر دلعزیزی کے علاوہ ہوازن کے قومی ہیرو کا مقام مل گیا تھا[153] اور اسی غیر متزلزل قبائلی وفاداری کا نتیجہ تھا کہ غزوہ احزاب کے بعد جس میں متعدد قبیلوں کا اتحاد شامل تھا، سب سے بڑے لشکر کا سامنا اسلامی ریاست کے لشکر کو کرنا پڑا تھا۔ بہرحال ثقیف کے دو بڑے خاندان تھے: الاحلاف اور بنو مالک۔ اول الذکر بھی چھوٹے چھوٹے گروہوں کا مجموعہ تھا، جبکہ یہی حال بنو مالک کا بھی تھا۔ احلاف ثقیف کے سردار تھے، حضرت قریب بن اسود، اور بنو مالک کے سردار تھے، سُبیع بن حارث اور ان کے بھائی احمد۔ یہ دونوں بلکہ تینوں سردار بعثت نبوی کے بعد کے زمانے میں ابھرے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر تھے۔

اسلام اور ہوازن کے تعلقات کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ جنگ حنین تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس قبیلہ کے درمیان کوئی تعلق نہیں قائم ہو سکا تھا[154]۔ جہاں تک سیاسی تعلقات اور فوجی و دفاعی معاہدوں کا تعلق ہے یہ خیال صحیح بھی ہو سکتا ہے لیکن اسلام سے ان کے تعلقات کے بارے میں یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ مکی عہد کے آخری ربع میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے قبیلہ ثقیف کو اسلام کی دعوت دی تھی اور انہوں نے اسے بھی مسترد کر دیا تھا۔ لیکن بعد کے زمانے میں یہ صورتحال برقرار نہیں رہی تھی۔ انفرادی طور سے متعدد گھرانوں کے کافی افراد نے اسلام قبول کر لیا تھا اور وہ اسلامی ریاست کے نظم و نسق میں شریک بھی تھے۔ ذیل کے انفرادی قبائلی تجزیے سے یہ بات زیادہ واضح اور مدلل ہوگی۔

(۱) بنو عامر بن صَعصَعَہ

ہوازن کا یہ معتبر قبیلہ اسلام سے کافی پہلے متعارف ہوا تھا۔ اس کے ذیلی گھرانوں کے متعدد افراد ابتدائی مسلمانوں میں شامل تھے، خاص کر وہ حضرات و خواتین جن کا تعلق کسی نہ کسی لحاظ سے مکہ سے تھا۔ مثال کے طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو زوجات محترمات حضرت زینب بنت خزیمہ اور حضرت میمونہ بنت حارث ابتدائی مسلمان تھیں اور ان کا نسبی تعلق بنو عامر بن صعصعہ کے خاندان بنو ہلال سے تھا[155]۔ ان کے علاوہ[156] دو اور خواتین بھی کافی پہلے زمانے کی مسلمان تھیں۔ ان کے اسمائے گرامی ہیں: حضرت لبابہ صغریٰ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبد المطلب کی اہلیہ محترمہ اور ان کے فرزند حضرت عبد اللہ بن عباس کی والدہ ماجدہ تھیں اور حضرت لبابہ کبریٰ جو حضرت خالد بن ولید مخزومی کی والدہ تھیں۔ یہ دونوں فتح مکہ کے پہلے زمانے کی مسلمان تھیں[157]۔

ان خواتین کے علاوہ بنو ہلال / عامر بن صعصعہ کے خاندان کے تین مسلمان حضرات قبیصہ بن مخارق، نزّال بن سابرہ اور حمید بن ثور الارقط کا ذکر ابن حزم نے کیا ہے[556] بنو عامر کے ایک گمنام اور غیر معروف قبیلہ / خاندان بنو سُواءہ کے دو مسلمانوں حضرات ابو جحیفہ اور جابر بن سمرہ کا ذکر ملتا ہے[557] اوّل الذکر اگرچہ گمنام ہیں۔ لیکن موخر الذکر مشہور صحابی ہونے کے علاوہ احادیث نبوی کے مشہور راوی ہیں۔ اسی طرح ایک اور غیر معروف اور چھوٹے گھرانے بنو نمیر کے دو مسلمانوں حضرات قیس بن عاصم اور قرہ بن دعمص کا ذکر ملتا ہے۔ اول الذکر اپنے گھرانے کے وفد کے ساتھ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے تھے۔ جبکہ موخر الذکر غیر معروف صحابی ہیں۔ بنو البکّاء کے گھرانے میں کم از کم چار خاصے اہم مسلمانوں کے نام ملتے ہیں۔ حضرت معاویہ بن ثور اور ان کے فرزند بشر جو اپنے وفد کے ساتھ مدینہ حاضر ہوتے تھے، مُجیع بن عبد اللہ جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک کتاب (نامہ مبارک) پایا تھا اور ماعز بن بجالہ۔ اتنے ہی مسلمانوں کا ذکر ایک اور ذیلی گھرانے بنو الضباب سے بھی ملتا ہے۔ اس کے سوانحی خاکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب بعد کے زمانے کے مسلمان نہیں تھے[559]

بنو کلاب کے کم از کم سات ابتدائی مسلمانوں کا ذکر ماخذ میں مل چکا ہے۔ ان کا تعلق اس خاندان کے مختلف ذیلی گھرانوں سے تھا۔ ان میں سے تین کا تعلق بنو کلاب بن ربیعہ سے تھا۔ جن میں سے حضرت ضحاک بن سفیان کلابی عظیم ترین اور مشہور ترین صحابہ میں شمار ہوتے ہیں اور بلا ریب عامر بن صعصعہ کے رجال عظیم میں سے ایک تھے[560]۔ ان کے بارے میں ماخذ کا اتفاق ہے کہ انہوں نے اپنے قبول اسلام کے بعد اپنے گھرانے اور قبیلے میں اسلام کی اشاعت کی کوششیں کی تھیں اور مختصر سی مدت میں پورے قبیلہ کو مسلمان بنا لیا تھا[561]۔ ۹ھ / ۶۳۰ء میں جب مختلف قبائل عرب کے لئے عاملین صدقات مقرر کئے گئے تھے تو حضرت ضحاک بن سفیان کو ان کے قبیلے بنو کلاب کا افسر صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ اور انہوں نے ایک روایت کے مطابق جو کافی اہم ہے۔ فتح مکہ سے قبل ہی صدقات جمع کر کے مدینہ کو ادا کئے تھے[562] انہوں نے اسلامی لشکروں میں سے بعض کی قیادت بھی کی تھی[563]۔ بنو کلاب کی مزید ذیلی شاخوں میں سے تین اور مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے حضرت عمرو بن بجیر کا تعلق بنو رباب بن کلاب سے تھا۔ جبکہ سولی اور قدامہ بن عبد اللہ کا بنو الضباب بن کلاب سے[564]

بنو ہلال اور بنو کلاب کی مختلف شاخوں کی طرح سے بنو ربیعہ کی بھی شاخیں در شاخیں تھیں اور ہر شاخ میں کچھ نہ کچھ مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے۔ بنو کعب بن ربیعہ کے گھرانے میں دو مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے حضرات مُطَرِّف بن عبد اللہ اور ان کے والد ماجد عبد اللہ بن الشخیر اور بنو جعدہ بن کعب بن ربیعہ کے ایک مسلم کا ذکر کیا گیا ہے۔ بنو قُشیر بن کعب بن ربیعہ کے گھرانے کے دو اہم مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت قرہ بن ہُبیرہ خاصے اہم شخص معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے قبیلے کے عامل صدقات مقرر ہوئے تھے۔ ربیعہ کے آخری اہم گھرانے بنو عُقیل بن کعب میں کم از کم تین مسلمانوں کے نام بصراحت مذکور ہیں[565] مذکورہ بالا نسبتاً کافی مفصل بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو عامر بن ربیعہ کا قبیلہ بحیثیت مجموعی اسلام کا حلقہ بگوش بن چکا تھا اس خیال کی مزید تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے متعدد گھرانے اسلامی ریاست کو صدقات و محاصل ادا کرتے تھے[566]۔ لہٰذا یہ کہنا کسی طرح سے صحیح نہیں ہو گا کہ بنو عامر بن صعصعہ آخری عہد نبوی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور جو

ہوئے بھی تھے۔ ان کی تعداد بہت مختصر تھی۔[۴۹۷] یہ تبصرہ روشن حقیقت اور تاریخی حقائق سے دیدہ و دانستہ صرف نظر کرنے کے مترادف ہے۔

بنو عامر بن صعصعہ کے مکمل قبول اسلام کا مزید ثبوت اس کے مختلف خاندانوں / گھرانوں کے مدینہ منورہ آنے والے وفود سے بھی ہوتا ہے۔ ابن سعد نے بنو عامر اور اس کے ذیلی گھرانوں کے کم و بیش آٹھ وفدوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں چھ وفود بنو کلاب اور اس کے گھرانوں بنو رواس بن کلاب، بنو عقیل بن کعب، بنو جعدہ بن کعب، بنو قشیر بن کعب اور بنو البکاء سے آئے تھے اور انہوں نے ۹ھ / ۶۳۱ء کے برس مختلف زمانوں میں حاضری دی تھی۔[۴۹۸] اگرچہ ابن سعد نے بنو عامر بن صعصعہ اور اس کے گھرانے بنو ہلال کے وفود کی آمد کی تاریخ کا ذکر نہیں کیا ہے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ۱۰ھ / ۶۳۱-۳۲ء میں کسی وقت بارگاہ نبوی میں حاضری دی تھی۔ کیونکہ طبری نے اول الذکر کے وفد کی آمد کو ۱۰ھ کے برس کے واقعات میں شمار کیا ہے[۴۹۹] طبری ہی کے ایک اور بیان سے واضح ہوتا ہے کہ بنو عامر بن صعصعہ کا تقریباً پورا قبیلہ عہد نبوی میں مسلمان ہو گیا تھا۔[۵۰۰] ممکن ہے کہ چند مستثنیات ہوں، لیکن یہ امکان خاصا مدھم ہے۔ اس بحث کے آخر میں ہوازن کے ایک اور خاندان عرینہ کے ایک اہم مسلمان صحابی حضرت عبد اللہ بن عوسجہ عرنی کا ذکر کر دیا جائے جو فتح مکہ کے قریب اسلام لا چکے تھے اور جن کو ۹ھ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو حارثہ بن عمرو بن قریط میں تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا تھا۔ اس خاندان کے ایک اور مسلمان حضرت رباح المشمعلی کے سوا اور اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جان سکے ہیں۔[۵۰۱]

ہوازن کی دوسری اہم اور غیر اہم شاخوں میں بھی متعدد مسلمان ایسے تھے جو غزوہ حنین میں نبرد آزمائی سے قبل اسلام لا چکے تھے۔[۵۰۲] واقدی نے حضرت شجاع بن وہب کے سریہ سی (ربیع الاول ۸ھ / جولائی ۶۲۹ء) کے اپنے بیان میں ہوازن کے مسلمانوں کے ایک وفد کا حوالہ دیا ہے جو غالباً سب کے سب مسلمان تھے۔[۵۰۳] اس حوالہ کی اہمیت اس پس منظر میں بڑھ جاتی ہے یہ غالباً اسلامی ریاست سے ان کی وفاداری کا ایک اہم اظہار تھا۔ ہوازن کے ایک ابتدائی مسلمان حضرت اوس بن حدثان تھے جنہوں نے صلح حدیبیہ سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔[۵۰۴] اسی طرح ہوازن کے ایک ذیلی گھرانے بنو ثمالہ کے ایک فرد حضرت عمرو ثمالی ابتدائی دور کے مسلم تھے۔[۵۰۵] یہ حقیقت ہے کہ بطور ایک قبیلہ ہوازن اسلام کے دائرے سے کافی مدت تک باہر رہے تھے اور صرف غزوہ حنین کے بعد ہی اجتماعی طور سے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ غزوہ حنین کے موقعہ پر جو ہوازن کا اتحاد عظیم مسلمانوں کے خلاف قائم ہوا تھا۔ اس میں متعدد خاندان شامل نہیں ہوئے تھے۔ اور وہ اسلامی ریاست سے تصادم مول لینے کے حق میں نہیں تھے صرف چار بڑے خاندان مکمل طور سے شامل تھے اور یہ تھے بنو نصر، بنو جشم، بنو سعد بن بکر اور بنو ثقیف اور کچھ لوگ اور گروہ بنو ہلال / عامر بن صعصعہ کے بھی شامل ہو گئے تھے۔[۵۰۶] اس اتحاد عظیم میں شامل نہ ہونے والوں میں کعب اور کلاب کے اہم گھرانے تھے اور جنگی غیر موجودگی کو ہوازن کے دوربین اور تجربہ کار قائدین نے میدان جنگ میں محسوس کیا تھا۔[۵۰۷] بہر حال شکست کے بعد یہ پورا عظیم گروہ اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا تھا۔ ماخذ کا صریح بیان ہے کہ قبیلہ بنو سعد بن بکر (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہ کا گھرانا)

قبول اسلام میں پیش پیش تھا۔ ان کا ایک وفد جو قبیلہ کے تمام مسلمانوں پر مشتمل تھا[578] ہوازن کے چھ ہزار قیدیوں کی رہائی کیلئے گفتگو کرنے کی غرض سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں جعرانہ میں حاضر ہوا تھا۔ ان کی دردمند درخواستوں نے تمام قیدیوں کی رہائی حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ رحمت نبوی کے اس عظیم الشان مظاہرے کا فطری تقاضا اور اثر تھا کہ بنو سعد بن بکر اسلام کے دائرے کے باہر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کے معاً بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے قومی ہیرو اور سردار اعظم حضرت مالک بن عوف نصری کو اسلامی دعوت کے ساتھ بڑی فیاضانہ اور معقول شرطیں پیش کی تھیں، نتیجہ ظاہر تھا۔ حضرت مالک بن عوف نہ صرف خود مسلمان ہوئے بلکہ ان کے زیر اثر تمام قبیلے خاص کر ثمالہ، سلمہ اور فہم بھی اسی آن اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے اور وہ ان قبیلوں کے مسلمانوں کے سردار مقرر کر دیئے گئے[579] کچھ مدت کے بعد ہوازن کا پورا قبیلہ اسلامی امت کا رکن رکین بن چکا تھا۔

۸ھ کے اواخر اور ۶۳۱ء/۹ھ کے وسط تک ہوازن کے مختلف خاندانوں کے مکمل قبول اسلام کی کچھ دوسری شہادتوں سے بھی تائید ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے بہترین مثال بنو سعد بن بکر کے ایک نفری وفد کی ہے۔ ابن اسحاق کے مطابق حضرت ضمام بن ثعلبہ بارگاہ نبوی میں مدینہ حاضر ہوئے اور اسلام کے بارے میں چند سوالات پوچھے۔ آپ کے جوابات سے اتنے مطمئن ہوئے کہ فوراً اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ اپنے لوگوں میں واپس پہنچے اور اس زور و شور سے تبلیغ کی کہ "رات ختم ہونے سے قبل قبیلہ میں کوئی ایسا مرد یا عورت نہ تھی جو مسلمان نہ ہو گئی ہو"[580] بنو عامر بن صعصعہ کے مختلف وفود کے علاوہ ابن سعد نے ثمالہ اور حدان کے ایک مشترکہ وفد کا بھی ذکر کیا ہے جس نے فتح مکہ کے بعد بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر اسلام سے وفاداری کا اقرار و اظہار کیا تھا[581] یہ نکتہ قابل ذکر اور قابل غور ہے کہ اس وفد کی شہادت کی بنا پر ہوازن کے ایک طبقہ کے غزوہ حنین سے قبل قبول اسلام کا ثبوت ملتا ہے۔

ہوازن کے مکمل طور پر قبول اسلام کا ایک اور پکا ثبوت ہے ان کا مدینہ منورہ کی مرکزی حکومت کو پابندی اور خلوص کے ساتھ صدقات و محاصل ادا کرنا۔ ذکر آ چکا ہے کہ بنو عامر بن صعصعہ کے مختلف خاندانوں کے لئے عاملین صدقات مقرر کئے گئے تھے۔ اس طرح ہوازن سے بھی صدقات کی وصولیابی کے لئے متعدد افسروں کو بھیجا گیا تھا۔ بلاذری کے بقول حضرت مالک بن عوف نصری کو عجز ہوازن یعنی ترقیمہ قبیلہ ...... بنو جشم، بنو نصر، اور بنو سعد بن بکر ...... کا افسر محاصل مقرر کیا گیا تھا[582] جبکہ دوسرے ماخذ کا بیان ہے کہ حضرت عکرمہ بن ابی جہل مخزومی کو پورے ہوازن کا مرکزی عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا یہ تقرری ۹ھ/۶۳۰ء کے آغاز اور ۱۰ھ/۶۳۱ء کے وسط میں ہوئی تھی[583] بلاذری اور ابن اثیر کا یہ بیان خاصا اہم ہے۔ وہ ہوازن کے مجموعی طور سے اسلام کے دائرے میں داخلہ کو پوری طرح سے ثابت کرتا ہے۔

(ط) ثقیف

ہوازن کے عظیم گھرانے کا آخری رکن ثقیف تھا جو اپنی سماجی اور سیاسی برتری کے سبب قدر کی نگاہ سے پورے

عرب میں دیکھا جاتا تھا اور قریش مکہ سے ان کے بہت قریبی سماجی، ازدواجی اور اقتصادی تعلقات تھے۔ اسلام سے تعارف تو اس قبیلہ کا مکی عہد ہی میں ہو گیا مگر قبول اسلام کا سلسلہ ان کے بطور اجتماعی اکائی کے انکار کے باوجود شروع ہو گیا تھا اور انفرادی طور سے اس کے افراد نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ ابن حزم کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹ھ نبوی میں ثقیف کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیرحمانہ برتاؤ کے باوجود آپ ان سے قطعی مایوس نہیں ہوئے تھے۔ اور اس کے کچھ دنوں بعد ہی آپ نے حضرت معتب بن مالک ثقفی کو ان میں تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا تھا۔ حضرت معتب نے ارشاد نبوی کی تعمیل اور تبلیغ اسلام کی راہ میں اپنی جان قربان کر دی اور اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں شہید ہوئے [584] خون شہید کی سرخی رنگ لائی اور ثقیف کے ایک فرد حضرت ابو الملیح نے قبیلہ کے قبول اسلام سے کافی پہلے اسلام قبول کر لیا [585] ممکن ہے کہ ان کی شہادت سے متاثر ہو کر اور لوگوں نے بھی اسلام قبول کر لیا ہو۔ مگر تاریخی ماخذ ان کے نام محفوظ رکھنے سے قاصر رہے ہیں۔ ثقیف کے ایک اور ابتدائی مسلمان حضرت معتب شہید کے اپنے بھتیجے حضرت مغیرہ بن شعبہ تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجل اصحاب میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے صلح حدیبیہ سے قبل کسی وقت اسلام قبول کر لیا تھا غالباً جنگ احزاب کے فوراً بعد [586] قارب بن الاسود جو حضرت عروہ بن مسعود کے ایک بھتیجے تھے ایک اور ابتدائی مسلمان تھے جنہوں نے حضرت ابو الملیح کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا۔ لیکن ثقیف کے سب سے پہلے مسلمان غالباً حضرت عامر بن غیطان اور ان کے والد ماجد تھے اور دونوں مدینہ منورہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ یہ بھی اہم بات ہے کہ یہ دونوں مسلمان باپ بیٹے ثقیف کے ابتدائی مسلمان اور مبلغ حضرت معتب شہید کے فرزند ارجمند اور پوتے تھے۔ بعد کے زمانے کے دوسرے مسلمانوں میں حضرات عروہ بن مسعود، عمرو بن امیہ، ان کے عم زاد حکم بن عمرو، ابو عبید بن مسعود اور ان کے بھائی سعد اور آخری حضرت ابو محجن ثقفی تھے جو اپنے وقت کے ایک صف اول کے ثقفی شاعر تھے [587] ابن سعد اور طبری کے بیانات کے مطابق غالباً رمضان ۹ھ / دسمبر ۶۳۰ء میں ثقیف کے ایک وفد نے جو دس اشخاص سے کچھ زیادہ پر مشتمل تھا۔ مدینہ پہنچ کر اسلام قبول کر لیا تھا [588] اس کے فوراً بعد پورا قبیلہ ثقیف مسلمان ہو گیا تھا [589]

ان کے اسلام قبول کرنے کی مزید شہادت ثقیف کے لئے مختلف افسران وعمال صدقات کی تقرری سے فراہم ہوتی ہے۔ بلاذری کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثالف بن عثمان بن معتب ثقفی کو طائف اور الاحلاف کے صدقات وصول کرنے کے لئے متعین فرمایا تھا۔ ان تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں ثقیف مکمل طور سے اسلامی امت کے رکن، ریاست اسلامی کے شہری اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار بن چکے تھے۔ یہ بھی قابل ذکر و فخر بات ہے کہ ہوازن اور ثقیف دونوں وفات نبوی کے بعد ردہ کے پرآشوب زمانے میں بھی اسلام کے وفادار رہے تھے اور کسی نے بھی مرکز کے خلاف قبائل عرب کی بغاوت میں حصہ نہیں لیا تھا [590]

قیس عیلان کے اہم خاندانوں / بطون میں اشاعت ونشر اسلام پر کافی مفصل بحث کے خاتمے پر ایک دو لفظ ان کے ایک خاندان بنو غنی کے بارے میں بھی کہنا ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کے قبول اسلام کے سلسلے میں بحث قریشی قبائل کے

ضمن میں آچکی ہے۔ تاہم یہاں بھی اس کا ایک حوالہ ضروری ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو مرثد کناز غنوی اور ان کے تین، چار فرزندوں حضرات مرثد، انس وانیس وغیرہ جو حضرت حمزہ بن عبد المطلب ہاشمی کے حلیف اور دوست تھے۔ مکی عہد کے ابتدائی دور کے مسلمان تھے۔ امکان قوی یہی ہے کہ اس گھرانے کے اور بھی مسلمان تھے جن کا ذکر ہمارے مآخذ میں نہیں آسکا ہے خاص کر ان کے دوسرے مردوں، عورتوں اور بچوں کے نام نہیں مذکور ہوئے ہیں۔ بعد میں حضرت مرداس بن خویلد ایک وفد میں بارگاہ نبوی میں مدینہ پہنچے تھے[591] یہ ناقابل یقین نہیں ہے کہ دوسروں نے بھی اسی زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔

اس پوری بحث سے بلا شک وشبہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہوازن کے مختلف قبیلے، خاندان اور گھرانے سب کے سب عہد نبوی میں مخلص، ثابت قدم اور کھرے مسلمان بن چکے تھے۔ اتنے ثابت قدم کہ ارتداد کے سیلاب میں جب اوروں کے پیر اکھڑ گئے تھے تو وہ اسلام کا پرچم بلند کئے ہوئے تھے۔

(ع) باہلہ

بنو باہلہ کا بھی تعلق مضر کے عظیم خاندان قیس عیلان سے تھا اور وہ بنو غنی سے زیادہ قریبی تعلقات رکھتے تھے[592]۔ اس کے مسلمانوں میں اہل سیر اور نسب نے جن لوگوں کو گنایا ہے ان میں حضرات اسمع اور ان کے والد ماجد مُزہر[593]، ابو امامہ بن الصُداع بن عجلان اور حرماس بن زیاد شامل ہیں[594] یہ سب غالباً بعد کے زمانے کے مسلمان تھے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ بنو باہلہ کے دو گروہ حضرت مُطَرِّف بن کاہن باہلی اور نَہشَل بن مالک باہلی کی قیادت میں فتح مکہ کے بعد کسی وقت اپنے وفد میں آئے تھے تاکہ اپنے اسلام کا اظہار و اعلان اور ریاستِ اسلامی سے اپنی وفاداری کا اقرار کریں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نامہ مبارک بتاتا ہے کہ بنو باہلہ عہد نبوی میں مسلمان ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے قبائلی عامل صدقات کے ذریعہ جس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے مقرر فرمایا تھا۔ مرکزی حکومت کو اپنے تمام صدقات ادا کئے تھے[595]

(ف) بنو ہُذَیل

بنو ہذیل بھی مکہ مکرمہ کے مشرق میں آباد بدوی قبائل میں سے ایک تھے[596] وہ قریش کے پڑوسی ہونے کے سبب ان کے ساتھ گہرے سماجی اور سیاسی تعلقات رکھتے تھے اور انہی اسباب کی بنا پر وہ اسلام سے مکی عہد قدیم ہی میں متعارف ہو گئے تھے۔ بنو ہذیل کے سب سے قدیم اور عظیم اور مشہور صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعود ہذلی تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دار ارقم میں قیام سے قبل ۴ / ۶۱۳ء میں کسی وقت مسلمان ہوئے تھے[597] یہ یقینی امر اور تاریخی حقیقت ہے کہ ان کا پورا گھرانا مسلمان ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان کے دو بھائیوں حضرت عتبہ و عُمیس، والدہ ماجدہ ام عبد اور ان کے ایک بھتیجے عمرو بن عمیس کو ابن حزم نے ابتدائی مکی مسلمانوں میں شمار کیا ہے۔ غالباً ان کے دو اور بھتیجے حضرات عبد اللہ اور عون، فرزندان عتبہ بھی ابتدائی زمانے کے مسلمان تھے۔ ان سب کا تعلق ہذیل کے خاندان بنو معاویہ سے تھا[598] یہ حیرت کی بات ہے،

کہ اہلِ سیر نے خود حضرت عبداللہ بن مسعود کے اہل و عیال کے قبولِ اسلام کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے حالانکہ تقریباً یہ یقینی ہے کہ ان کی آل و اولاد بھی ابتدائی دور کی مسلمان تھی۔ یہ حقیقت بھی یہاں بیان کرنا ضروری معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کا گھرانا مکہ میں قریش کے ایک خاندان کے حلیف کی حیثیت سے مقیم تھا اور بظاہر ان کا اپنے اصل قبیلہ سے تعلق قائم و استوار نہیں تھا۔ اس لیے ان کے قبولِ اسلام کا زیادہ اثر ان کے قبیلہ والوں پر شاید نہیں پڑا تھا۔

بہرحال مکہ اور قریش مکہ سے قربت کے سبب ان کے اسلام سے متعارف ہونے کے امکانات تھے اور قیاس کہتا ہے کہ مکی عہد میں بھی کچھ مسلمان بنو ہذیل کے اصل قبیلے اور ان کے بطون میں ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ بنو ہذیل کے ایک ذیلی گھرانے بنو طابخہ کے ایک ابتدائی مسلمان حضرت اسامہ بن عمیر کے ذکر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے[599] مزید واقدی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو ملیح ہذلی کے والد ماجد صلح حدیبیہ کے موقعہ پر موجود اور شریکِ جہاد تھے"[600] ان تمام ابتدائی شہادتوں کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ بنو ہذیل کے ایک بڑے طبقے نے خاص کر خالد بن سفیان ہذلی کے زیرِ اثر گروہ نے اسلامی ریاست کی مخالفت جاری رکھی تھی، اور وہ فتح مکہ کے بعد اسلامی امت کے دائرے میں شامل ہوئے تھے"[601]، کیونکہ ہم ان کو طائف کے محاصرہ کے دوران اسلامی لشکر میں موجود پاتے ہیں۔ امکان اور غالب امکان یہ ہے کہ وہ فتح مکہ سے قبل مسلمان ہو گئے تھے۔ اور غزوات فتح مکہ، حنین اور طائف میں ہمرکاب نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم تھے"[602]

(ک) بنو طے

نسبی اعتبار سے بنو طے کا تعلق بنو کہلان بن سبا سے تھا[603] اور وہ اسد/ خزیمہ کے پڑوس میں اجاء اور صعنا کے پہاڑوں کے نواحی علاقوں میں آباد تھے، جو مدینہ سے خاصی بڑی مسافت پر واقع تھے"[604] واقدی کے ایک جملہ سے معلوم ہوتا ہے۔ بنو طے کے تمام بطون اور خاندان ایک دوسرے کے قریب قریب آباد تھے[605] لیکن اس مسافت اور دوری کے باوجود بنو طے نے حرمین شریفین کے لوگوں سے سماجی، سیاسی اور اقتصادی روابط استوار کر رکھے تھے۔ اور ان کے کچھ لوگ مکہ مدینہ میں آباد بھی ہو گئے تھے۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو طے کے دو شخصوں نے جو قریشی قبیلہ بنو مخزوم کے حلیف تھے مکی فوج میں شریک ہو کر مسلمانوں کے خلاف غزوہ بدر میں شریک ہونا بھی پسند کیا تھا[606] جبکہ حضرت سوید بن مخشی طائی نے، جو مکی طائیوں میں مسلمان اور بنو عبد شمس/ بنو امیہ کے حلیف تھے۔ مسلمانوں کی جانب سے شرکت کر کے بدری صحابہ ہونے کا فیض و انعام پایا تھا"[607]

بنو طے کے لوگوں نے قریش مکہ اور انصار مدینہ سے ازدواجی تعلقات بھی استوار کر رکھے تھے۔ حضرت طلیب بن عمیر بنو عبد بن قصی/ قریش کی اہلیہ ایک طائی عورت تھی جو غالباً حضرت ولید بن زہیر طائی کی صاحبزادی تھیں۔ مؤخر الذکر طائی صحابی نے محرم ۴ھ/ جون ۶۲۵ء میں قطن کے سریہ میں حضرت ابو سلمیٰ مخزومی امیر سریہ کی رہنمائی کے فرائض انجام دیئے تھے"[608] اسی طرح کعب بن اشرف، مشہور یہودی شاعر، کا باپ قبیلہ طے کا تھا[609] جبکہ حضرت عبداللہ بن ربیع کی اہلیہ طائی تھیں، اور

ایک ابتدائی مسلمان بھی[610]

ان اور ان جیسی دوسری متعدد مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو طے کے مختلف افراد کا اسلام سے تعارف بکی عہد قدیم سے ہوچکا تھا۔ اصل قبیلہ کے ایک ابتدائی مسلمان تھے۔ حضرت رافع بن ابی رافع طائی جنہوں نے بعد میں حضرت عمرو بن عاص کے زیر کمان سریہ ذات السلاسل میں حصہ لیا تھا[611] یہ بات اہم ہے کہ ۸ھ / ۶۳۰ء میں حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کی قیادت میں بنو طے کے قومی بت کو توڑنے کے لئے جو مہم الفلس گئی تھی۔ وہ ان کے خلاف واحد فوجی کارروائی تھی[612] اس کے بعد ہی ان میں اسلام سرعت سے پھیلنے لگا تھا۔ اور ان کے کچھ مدت بعد ان کے قومی سردار حضرت عدی بن حاتم طائی کے قبول اسلام نے پورے قبیلے طے کو اسلامی امت کا مخلص و سرگرم و پائیدار رکن بنا دیا تھا[613] ان میں سے معدودے چند لوگ اپنے پرانے مذہب عیسائیت پر بھی قائم رہے تھے۔ اور ان کو جزیہ کی ادائیگی کے بعد اسلامی ریاست کی جانب سے جان و مال کے مکمل تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی۔ ابن حزم نے بنو طے کے ہر گھرانے کے سربرآوردہ مسلمانوں کے نام بیان کئے ہیں[614] ۹ھ / ۶۳۰-۳۱ء میں کسی وقت قبیلہ طے کا ایک وفد بھی مدینہ پہنچا تھا۔ جس میں پندرہ افراد شامل تھے۔ اس وفد کے سردار و قائد حضرت زید بن مہلہل تھے جو اپنے باقی غیر مسلم طائیوں کو اسلام کے دائرے میں لانے کے سبب زید الخیر کے نام سے زیادہ معروف ہیں[615] ان کے علاوہ مجموعۃ الوثائق میں محفوظ متعدد نامہ ہائے نبوی سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ بنو معاویہ، بنو جوین، بنو معن، بنو اجاء کے علاوہ متعدد دوسرے گھرانے بھی ۱۰ھ کے خاتمے سے قبل مسلمان ہوکر اسلامی امت کا جزو بن چکے تھے[616]

بنو طے کے مکمل قبول اسلام کا ایک اور یقینی ثبوت ہے ان کے مختلف گھرانوں اور خاندانوں کے لئے صدقات کے افسروں کی تقرری۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عدی بن حاتم طائی کو پورے قبیلہ طے کا افسر اعلیٰ اور مصدق اعلیٰ مقرر فرمایا تھا اور وہی تمام قبیلوں اور گھرانوں سے صدقات وصول کر کے مدینہ پہونچاتے تھے[617] یہ حضرت عدی بن حاتم طائی کی سوجھ بوجھ، لیاقت اور معاملہ فہمی اور صلابت ایمانی تھی جس نے بنو طے کے بعض مذبذب و شک و شبہ میں مبتلا طبقوں کو رو کی تھی[618] چنانچہ ان شواہد کی روشنی میں یہ یقینی طور سے کہا جاسکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں قبیلہ طے پورا مسلمان ہوچکا تھا اور اس کے بعض غیر مسلم افراد بھی ریاست اسلامی کے کلی طور پر وفادار تھے اور یہی نہیں بلکہ وہ ردہ کے پرآشوب و پرفتن زمانے میں بھی وفادار رہے تھے۔[619]

مذکورہ بالا بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حرمین شریفین کے مشرق میں واقع و آباد قبائل عرب میں اسلام کی اشاعت، مکمل، ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی۔ کوئی دیانت دار مؤرخ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسلام کی تاثیر صرف اوپری سطح تک محدود رہی تھی اور دلوں کی گہرائیوں میں اس کا اثر نہیں قائم ہوا تھا۔ مآخذ کا صاف و صریح بیان ہے اور جس کی تائید و شواہد و حقائق سے ہوتی ہے کہ ان مشرقی قبائل نے پورے خلوص، ایمانداری، اور صلابت کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا، اور

پھر اسلامی ریاست کے لیے شاندار خدمات انجام دی تھیں ۔ ان کے پختہ ایمان اور پکے عمل کا ایک اہم ثبوت ارتداد کے زمانے میں اسلام پر مضبوطی سے ان کا قائم رہنا ہے ۔ یہ بڑی اہم تاریخی حقیقت ہے کہ بعض مشرقی قبائل جو نسبتاً بعد کے زمانے میں اسلام لائے تھے ، ردہ کے زمانے میں ان بعض قبائل کے مقابلے میں زیادہ پختہ ایمان والے ثابت ہوئے تھے جو نسبتاً کچھ پہلے اسلام لا چکے تھے ۔ مشرقی قبائل میں اشاعتِ اسلام کی تاریخی توقیت بڑی مختصر ہے ۔ مکی عہد میں ان کے بعض افراد نے اسلام قبول کیا تھا ۔ اور مدنی عہد میں جب مسلمانوں کے تعلقات ان سے قائم ہوئے تو ان کے گھرانے اور بطون مسلمان ہونے لگے ۔ ان کے قبولِ اسلام میں ان کے اپنے دلوں کی خواہش کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی تبلیغی کوششیں بھی کارفرما رہی تھیں ۔ بہرحال مہاجرین وانصار اور مغربی قبائل کے بعد مشرقی قبائل ہی چوتھے اہم عنصر تھے جنہوں نے اسلامی ریاست کے ارتقا، تنظیم اور ترقی میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا ۔

(۳) شمالی قبائل

شمالی قبائلِ عرب یا مدینہ منورہ کے شمال میں خاص کر وادی القریٰ اور شامی سرحد کے درمیان واقع علاقوں کے قبائل سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلقات اور ان کے بارے میں اسلام کی پالیسی اور اسلامی ریاست کا رویہ بعینہٖ وہی تھا جو مغربی قبائل یا مشرقی قبائل سے تھا ۔ یا جو پالیسی آپ نے قریشی قبائل کے سلسلے میں اپنائی تھی ۔ ماخذ سے بیشمار ثبوت اس بات کے ملتے ہیں کہ آپ کی حکمتِ عملی کی واحد بنیاد اسلام کی اشاعت تھی اور تمام قبائل کو مسلمان بنانا تھا اور اگر قبائلِ عرب میں سے کوئی گروہ ، جماعت یا فرد اسلام قبول کرنا نہیں پسند کرتا تھا تو اس کو اسلامی ریاست کی بالادستی سیاسی بالادستی ..... قبول کرنا اور اس کا ذمی بن کر رہنا ضروری تھا ، اور اس اعترافِ بالادستی میں مدینہ کو جزیہ ادا کرنا تھا ۔ اس کے معاوضے میں اسلامی ریاست ان کو اللہ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذمہ (ذمہ داری ، محافظت ، ضمانت) عطا کرتی تھی اور ان کے تمام اندرونی سماجی اور مذہبی معاملات میں ان کو خود مختاری اور آزادی فراہم کرتی تھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پالیسی تمام قبائل عرب سے آپ کے تعلقات ، معاہدات اور مہموں سے واضح ہوتی ہے شمالی قبائل میں اسلام کی نشر واشاعت کی تاریخ ، نہج اور رفتار سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شمالی قبائل کے بارے میں پالیسی بھی معلوم ہوتی ہے اور شمالی قبائل کا اسلام اور اسلامی ریاست کے ساتھ رویہ اور سلوک بھی ۔ ذیل میں شمالی قبائل کا بھی اسی طرح الگ الگ تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے ۔ جس طرح کہ دوسرے علاقوں کے قبیلوں کے بارے میں پیش کیا گیا ہے

یہ اب کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ شمالی قبائل بھی متعدد اور مختلف تھے جو خاصے بڑے وسیع علاقے میں آباد تھے اور ان کے بطون اور خاندانوں کے علاوہ ان کی بھی مزید ذیلی شاخیں تھیں ۔ البتہ شمالی قبائل خاص کر شامی سرحدوں پر آباد قبیلوں کے بارے میں یہ جان لینا مفید ہوگا کہ وہ رومی سلطنت یا بازنطینی حکومت کے زیر اثر تھے

اور ان کے بعض قبائل تو ان کے سیاسی وفادار و محکوم اور باجگذار بھی تھے۔ غسان وغیرہ کی حکومتیں ان کی ماتحت (Vassal) حکومتیں تھیں۔ اگرچہ وہ نسلی اور نسبی اعتبار سے عرب تھے، مگر تمدن و تہذیب کے لحاظ سے بازنطینی رنگ میں رنگ گئے تھے۔ ان کا سیاسی نقطۂ نظر رومی سلطنت کی پالیسیوں کا آئینہ دار تھا۔ اگرچہ وہ اپنے رومی آقاؤں سے بعض معاملات میں رنجیدہ و ناراض بھی تھے۔ مدتوں تک رومی سلطنت سے وابستہ رہنے کے سبب ان کے بعض قبائل پورے کے پورے عیسائی بن گئے تھے اور بعض دوسروں میں بھی عیسائیت نے خاصے مضبوط اثرات قائم کر لئے تھے۔ کچھ عرب قبیلے اور گروہ اپنے پرانے آبائی مذہب پر بھی قائم تھے۔ تیسرا اہم مذہبی عنصر یہودی قبیلوں کا تھا جو عددی اعتبار سے کافی چھوٹے اور سیاسی لحاظ سے غیر اہم تھے۔ سیاسی لحاظ سے ایک اور اہم عنصر یہ تھا کہ شمالی قبائل عموماً متحد و منظم حکومتوں کے باشندے تھے۔ ان میں بصریٰ کی غسانی سلطنت اور دومۃ الجندل اور ایلہ کی بالترتیب کندی اور یہودی حکومتیں خاصی منظم تھیں۔ اول الذکر سیاسی اعتبار سے ایک قوت تھی اور اس کو رومی سلطنت خاص کر شام کی صوبائی حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ شمالی قبائل میں اسلام کی تاریخ اشاعت کے مطالعہ میں ان امور کا مدنظر رکھنا ناگزیر ہے۔

شمالی قبائل میں سے اہم ترین قبائلی وحدتیں اور ان کے ذیلی بطون یہ تھے۔

(ل) بنو قضاعہ : (۱) بہراء (۲) بلی (۳) سعد ہذیم اور موخر الذکر کی شاخیں جیسے عُذرہ، ضنّہ، حارث، نہد، خشین اور کلب، سلامان (جہینہ اور مہرہ بھی انہی کی دوسری اہم شاخیں تھیں جو بالترتیب مدینہ کے مغرب اور جنوب میں جا کر آباد ہو گئی تھیں) وغیرہ

(ب) بنو جذام : (۱) بنو ضبیب

(ج) بنو لخم : (۱) بنو حدس (۲) بنو دار

(د) بنو غسان (۱) بنو ثعلبہ ٦٢٠

اسلامی ریاست کے ارتقاء کے باب میں ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی اور فوجی حکمت کا جائزہ لے چکے ہیں اور اس سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ ان قبائل شمال سے اسلامی ریاست کے سیاسی تعلقات کس قسم کے تھے، کب سے شروع ہوئے اور کیونکر وہ اسلامی ریاست کے رکن بنے؟ اب ہم اسلام کی ان میں اشاعت کا جائزہ لے رہے ہیں۔

(ل) بنو قضاعہ

قضاعہ اصل میں ایک قبیلہ کے بجائے متعدد قبائل کے مجموعہ کا نام تھا۔ اس میں ابن حزم کے بقول جو قبیلے شامل تھے وہ یہ ہیں: بلی، بہراء، سعد ہذیم اور موخر الذکر کی متعدد ذیلی شاخیں جیسے عُذرہ، ضنّہ، حارث، نہد، خشین اور سلامان ان کے علاوہ کلب جو خاصا اہم اور طاقتور قبیلہ تھا۔ نسبی لحاظ سے سعد ہذیم ہی کا ایک بطن تھا۔ مدینہ کے مغرب اور جنوب مشرق میں دو قبیلے بالترتیب جہینہ اور مہرہ آباد تھے۔ ان کا بھی تعلق سعد ہذیم سے تھا۔ ان کے علاوہ بھی متعدد چھوٹے چھوٹے

گھرانے تھے جو نسبتاً غیر معروف ہیں[٦٢١]۔ بہر حال قضاعہ اتنا بڑا قبیلہ ہو گیا تھا کہ وہ اقتصادی و سیاسی ضروریات کے سبب ایک مقام پر سما نہیں سکتا تھا اور نہ ہی بطور ایک سماجی اور سیاسی وحدت کے کام کر سکتا تھا اس لئے وہ مختلف بطون اور ان کی متعدد شاخوں میں منقسم ہو گیا تھا اور ان کے بڑے بطون بجائے خود قبیلے بن گئے تھے۔ ان میں بعض دوسرے علاقوں میں ضرور منتقل ہو گئے تھے۔ تاہم اصل قبیلہ اپنے روایاتی علاقے میں آباد و مقیم رہا تھا۔ ان قبیلوں میں اشاعت اسلام کی تاریخ کے ضمن میں یہ کہنا شروع ہی میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شمالی قبائل خاص کر وہ جو مغربی بین الاقوامی شاہراہ تجارت کے قریب آباد تھے اسلام سے بہت ہی ابتدائی زمانے میں متعارف ہو گئے تھے۔ کیونکہ شام آنے جانے والے تجارتی کاروان اور مکہ کے معبد خانۂ کعبہ کو آنے والے حجاج بھی اس زمانہ میں خبروں کی اشاعت کا کام کرتے رہتے تھے[٦٢٢]۔

١١۔ بنو بلی

قضاعہ کے اس عظیم بطن کا بہت ہی قریبی سماجی اور ازدواجی تعلق قریش مکہ اور انصار مدینہ سے قدیم زمانے سے قائم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قریش مکہ کے زیادہ تر تعلقات ازدواجی نوعیت کے تھے جبکہ انصار مدینہ ... اوس و خزرج نے حلف اور دوستی کے تعلقات زیادہ استوار کئے تھے۔ چنانچہ ماخذ سے اس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ مکی صحابہ کرام میں سے متعدد حضرات کی مائیں اور بیویاں بنو بلی سے تھیں۔ جبکہ انصار کے بلوی حلیف اسلام اور اسلامی ریاست کے حلیف بن گئے تھے[٦٢٣]۔ ایک مطالعہ سے مدینہ کے دونوں انصاری قبیلوں کے کم از کم اٹھارہ بلوی حلفاء کے نام معلوم ہوتے ہیں[٦٢٤]۔ ظاہر ہے کہ یہ بلوی حلیف انصاری قبیلوں کے متعدد و مختلف گھرانوں سے متعلق تھے۔

چنانچہ یہ فطری امر تھا کہ انصاری افراد کے ساتھ ساتھ ان کے بعض بلکہ اکثر حلیف بھی ان کے ساتھ اسلام کے حلقہ بگوش تھے۔ ان میں سے بعض حلیف یقیناً اپنے علاقوں کو چھوڑ کر مدینہ آ بسے تھے۔ مگر ان کی اکثریت اپنے روائتی علاقوں میں آباد و مقیم رہی جو اکثر و بیشتر مدینہ آتی رہتی تھی جیسا کہ ماخذ سے معلوم ہوتا ہے۔ ذی قعدہ ٤ھ / اپریل ٦٢٦ء میں بدر الموعد کے موقع پر حضرت نعیم بن مسعود اشجعی نے قریشی سالار افواج ابو سفیان بن حرب اموی کو اطلاع دی تھی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف بدوی قبائل .... جہینہ اور بلی .... وغیرہ کے سپاہی آپ کی دعوت پر مدینہ پہنچ چکے ہیں اور وہ آپ کے ہمرکاب بدر کی جانب کوچ کرنے والے ہیں۔ اس اطلاع پر قریشی لشکر بڑی سرعت سے پسپا ہو گیا تھا[٦٢٥]۔ اس واقعہ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اسلام نے بنو بلی میں اپنے ماننے والوں کی خاصی بڑی آبادی بنا لی تھی۔ مذکورہ بالا بلوی مسلمانوں کے علاوہ ابن حزم نے اس قبیلہ کے بعض اور مسلمانوں کے نام گنائے ہیں۔ ان میں حضرات کعب بن عجرہ، عبد اللہ بن اسلم، سہل بن رافع، ان کے عم زاد طلحہ بن براء، عبد اللہ بن زیاد، عبدہ بن مغتب اور ان کے فرزند شریک اور عبد الرحمن بن عدیس شامل ہیں[٦٢٦]۔ ظاہر ہے کہ ان مسلمانوں کے لواحقین اور متبعین بھی اسلام لائے تھے۔ اس طرح یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں ہو گا کہ بنو بلی کا معتد بہ حصہ ٦ھ / ٦٢٨ء تک یا اس کے اواخر تک اسلام لا چکا تھا۔

اگرچہ بعد کے زمانے میں بلی کے قبیلہ کے بارے میں مآخذ کا یہ تبصرہ بھی ہم پاتے ہیں کہ وہ اسلامی ریاست کے دشمنوں کی صفوں میں شامل تھا تاہم یہ یقینی ہے کہ پورے قبیلے نے نہیں بلکہ اس کے ایک حصے نے اسلامی ریاست کی مخالفت کی تھی۔ ایک دلچسپ حقیقت غزوہ موتہ کے ضمن میں سامنے آتی ہے۔ اگرچہ مخالف فوج کی کمان بلی کے ایک شخص مالک کے ہاتھوں میں تھی۔ مگر قبیلہ کے مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار ہونے کا مآخذ ذکر نہیں کرتے ہیں[627] اس کے علاوہ مآخذ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غزوہ موتہ کے صرف ایک ماہ بعد غزوہ ذات السلاسل میں مسلمانوں کو قبیلہ بلی وغیرہ سے فوجی اور سیاسی امداد کی توقع تھی جو بہرحال پوری ہوئی تھی[628] اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بلی کا کم از کم ایک طبقہ مسلمانوں کے ساتھ اور اسلامی ریاست کا حامی تھا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ اسلامی ریاست کو شمالی علاقوں کے متعدد قبائل کے خلاف فوجی کارروائی کرنی پڑی تھی۔ مگر قبیلہ بلی کے خلاف ایک بھی مہم مدینہ سے نہیں بھیجی گئی تھی۔ واقدی کا بیان ہے کہ غزوہ تبوک کے دوران بلی کی ایک نیک دل اور غالباً مسلمان خاتون نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پانی فراہم کیا تھا[629] بہرحال یہ بھی ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بلی کا ایک حصہ شمالی عرب کے اس قبائلی اتحاد میں بھی شریک تھا۔ جس نے غزوہ تبوک کے لئے محرک فراہم کیا تھا[630]

سیاسی تعلقات کی نوعیت یہ تھی اور اسلام کی اشاعت کا انداز جداگانہ تھا۔ وہ رفتہ رفتہ بنو بلی میں بھی پھیل رہا تھا اور ان کی صفوں میں خدا اور رسول کے ماننے والے بنا رہا تھا۔ ابن سعد نے بلی کے کم از کم چار مسلمانوں کو اپنی اس فہرست میں شامل کیا ہے۔ جو فتح مکہ سے قبل اسلام لا چکے تھے۔ ان کے اسمائے گرامی تھے۔ حضرت رُوَیفع بن ثابت جو کبھی کبھی آکر جناب میں مقیم ہوتے تھے۔ انہوں نے اسلام قبول کرلیا اور پھر صحبت نبوی سے محروم ہونا پسند نہیں کیا۔ وہ حدیث کے مشہور راوی بھی تھے (۲) حضرت ابوالشموس جو اکثر و بیشتر جحق نامی مقام پر سکونت رکھتے تھے (۳) حضرت ابوامامہ بن ثعلبہ جو حضرت ابوبردہ بن نیار مشہور صحابی رسول کے عم زاد تھے۔ (۴) حضرت عبداللہ بن صیفی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ حدیبیہ میں شریک رہے تھے[631] ظاہر ہے کہ ان کے علاوہ اور نہ جانے کتنے مسلمان اس عہد کے تھے۔ جن کے نام مآخذ میں آنے سے رہ گئے اس خیال کی تصدیق حضرت ابوبردہ بن نیار کے ضمنی ذکر سے بھی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ غزوہ تبوک کے کوئی تین ماہ پہلے بلی کا ایک وفد حضرت ابوالضباب کی قیادت میں مدینہ پہنچا تھا جس میں قبیلہ کے تقریباً تمام سربرآوردہ مسلمان شامل تھے[632] یہ تمام شواہد غزوہ تبوک سے قبل بلی کے خاصے بڑے حصے کے قبول اسلام کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ان کے قبولِ اسلام کی ایک اور حتمی شہادت اسلامی ریاست کو ان کی صدقات کی ادائیگی ہے۔ مآخذ کے مطابق سنہ ۹ھ / ۶۳۰ء میں مدینہ سے جو عاملین صدقات بھیجے گئے تھے۔ ان میں بلی کے لیے بھی افسر صدقات شامل تھے بلاذری کے مطابق خود قبیلہ بلی کے نمائندے حضرت الاعجم بن سفیان کو ان کا افسر صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ صحابی موصوف نہ صرف اپنے قبیلہ والوں سے بلکہ دوسری روایات کے مطابق عذرہ اور سلامان اور بنو کلب کے قبیلوں سے بھی صدقات وصول کرکے مدینہ پہنچاتے تھے[633] مآخذ میں ایک نامہ نبوی کا متن محفوظ ہے۔ جس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی

کے ایک خاندان بنی جُعیل کو نہ صرف بعض محاصل کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ بلکہ ان کو بنو نصر، بنو سعد بن بکر، بنو ثُمالہ اور ہذیل کے سعایہ (محاصل) سے بھی ایک حصہ کا مستحق قرار دیا تھا[۶۳۴] اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ بنو جعیل کے اس مختصر سے گھرانے کے افراد نے ان مذکورہ بالا ہوازنی قبائل سے صدقات کی وصولیابی میں مدد کی تھی۔ اس معاہدہ یا نامہ نبوی پر بنو جعیل کے نمائندہ کی حیثیت سے چار مسلمانوں نے بطور گواہ دستخط کئے تھے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم یہ حقیقت ہے کہ مذکورہ بالا قبیلہ / خاندان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندان عبد مناف / قریش کے ایک گھرانے (رھط) کا مرتبہ عطا فرمایا تھا[۶۳۵] غالباً اس کے دو سبب تھے اول یہ کہ انہوں نے ریاست اسلامی کی بے انتہا خلوص سے مدد کی تھی۔ اور دوم یہ کہ وہ خاندان نبوی / بنو عبد مناف کے قریبی حلیف اور دوست بھی تھے جس طرح کہ خزاعہ تھے۔ بہر حال کچھ بھی صورت حال رہی ہو۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ اسلام نے عہد نبوی میں بنو بلی کے مختلف خاندانوں پر اپنی انمٹ چھاپ چھوڑی تھی۔ جو ان کے مکمل قبول اسلام کا سبب اور محرک بنی تھی۔

(۲) بنو بہراء

بنو بہرا بھی بلی کی مانند قریش مکہ اور انصار مدینہ سے قریبی سماجی اور ازدواجی روابط رکھتے تھے[۶۳۶] اگر حضرت مِقداد بن عَمرو بہرائی قریش کے قبیلہ بنو زہرہ کے حلیف تھے۔ تو حضرت عتبہ بن ربیعہ انصار کے قبیلہ بنو نجار کے خاندان بنو لوذان سے اسی قسم کے تعلقات رکھتے تھے[۶۳۷] ظاہر ہے کہ دونوں اپنے اپنے زمانے کے ابتدائی مسلمان تھے۔ وہ دونوں بدری صحابی تھے۔ انتہائی اہم اور مستحکم قرائن ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف وہ دونوں ابتدائی مسلمان تھے بلکہ ان کے قبول اسلام کا اثر ان کے قبیلہ والوں پر بھی پڑا تھا[۶۳۸] ان کے اثرات کے علاوہ اسلام نے اپنی سادگی اور تعلیمات سے بھی بہراء کے متعدد لوگوں کو ۶ھ / ۶۲۷-۲۸ء تک حلقہ بگوش بنا لیا تھا۔ اس برس حسمیٰ کو جانے والی مہم کے امیر حضرت زید بن حارثہ کے بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافی پہلے مسلمان ہو گئے تھے[۶۳۹] اس کی مزید تصدیق ان کے وفد سے ہوتی ہے جو تیرہ سربرآوردہ اشخاص پر مشتمل تھا اور ۹ھ کے آغاز میں مدینہ پہنچا تھا۔ تمام اراکین وفد نے نہ صرف اپنے اسلام کا اعتراف و اظہار کیا تھا۔ بلکہ اپنے قبیلہ والوں کی بھی نمائندگی کی تھی[۶۴۰] اگرچہ بہراء کے قبول اسلام کی مکمل تفصیلات حاصل نہیں ہیں تاہم غزوہ تبوک میں مخالف اتحاد میں ان کی عدم موجودگی سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ پورے کے پورے اسلامی امت میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ان کے خلاف کوئی خاص فوجی کارروائی نہیں کی گئی تھی

۳۔ سعد ہذیم

قضاعہ کے عظیم قبیلے کا یہ اہم ترین بطن / خاندان خود کئی قبیلوں کا مجموعہ بن چکا تھا جن میں عذرہ اور سلامان کے بڑے خاندانوں کے علاوہ دو چھوٹے گھرانے بنو ضنہ اور بنو حارث بھی شامل تھے[۶۴۱] مؤخر الذکر دونوں بنو عذرہ کے حلیف اور دوست تھے۔ سعد ہذیم کے ان خاندانوں پر الگ الگ بحث دلچسپ بھی ہو گی اور مناسب بھی۔

بنو عذرہ ابن حزم کے بقول یہ بطن بجائے خود کئی بطون کا مجموعہ تھا ۶۴۲ بنو الحارث اس کے حلیف تھے اور وہ بھی اس کے ساتھ اس طرح زیر بحث آتے ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال عذرہ بھی بلی اور بہراء کی مانند خاندانی سماجی اور ازدواجی تعلقات مکہ اور مدینہ والوں سے رکھتے تھے ۶۴۳ متعدد مکی اور مدنی حضرات کے حلف اور دوستی کے تعلقات زمانہ قدیم سے بنو عذرہ کے لوگوں سے تھے ۶۴۴

ان قدیم تعلقات کے پیش نظر یہ قیاس بالکل بجا معلوم ہوتا ہے کہ بنو عذرہ بھی اسلام اور اسلامی ریاست سے ابتدائی زمانے میں ہی متعارف ہو گئے تھے۔ ابن سعد نے عذرہ کے تین مسلمانوں ..... حضرات خالد بن عرفطہ، حمزہ/حمزہ بن نعمان اور ابو خزامہ ..... کو فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کرنے والے صحابہ کی فہرست میں شامل کیا ہے ۶۴۵ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ عذری مسلمانوں نے اتنی تاخیر سے اور بعد کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت خالد بن عرفطہ مکی باشندے اور قریش کے خاندان بنو زہرہ کے حلیف تھے۔ اس لئے ان کا اسلام فتح مکہ سے کافی پہلے کا واقعہ ہے۔ دوسرے ماخذ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ابن سعد کی فہرست مسلمانان عذرہ میں ابن حزم نے چار مزید مسلمانوں کا نام شامل کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضرات ثعلبہ بن ہوذ، زمیل بن عمرو، ثعلبہ بن سعیر اور موخر الذکر کے صاحبزادے عبداللہ بھی صحابہ کرام میں شامل تھے ۶۴۶ لیکن عذرہ کے سب سے نمایاں اور ممتاز صحابی حضرت قضاعی بن عمرو تھے۔ جنہوں نے مختلف قبائل عرب سے صدقات کی وصولیابی کی خدمت اسلامی ریاست کے لئے انجام دی تھی۔ اور قبیلہ بنو طے اور بنو اسد کے علاقوں پر مرکزی منتظم بھی تھے ۶۴۷ بنو عذرہ کے دوسرے اہم ترین مسلمان حضرت قطبہ بن قتادہ تھے۔ جنہوں نے موتہ کے غزوہ میں مسلمان فوج کے میمنہ (دائیں بازو) کی کمان کی تھی۔ ۶۴۸

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی ریاست سے بنو عذرہ کے تعلقات کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ اسلامی افواج کی رہبری کے لئے جن دلیل (راہبروں) کی خدمات حاصل کی گئی تھیں ان میں سے متعدد حضرات کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔ ایک مسلمان صحابی حضرت مذکور تھے۔ جو ۵ھ / ۶۲۶ء میں غزوہ دومۃ الجندل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے راہبر تھے۔ انہوں نے بطور طلیعہ بھی اسلامی فوج کے لئے خدمات انجام دی تھیں ۶۴۹ اسی طرح دو مزید عذری مسلمانوں کا ذکر واقدی نے کیا ہے۔ جنہوں نے سریہ حسمی اور غزوہ تبوک میں شرکت بھی کی تھی۔ اور راہبری کی سعادت بھی حاصل کی تھی ۶۵۰ دوسری مہم کے دوران واقدی نے ایک عذری بدو کے قبول اسلام کا بھی حوالہ دیا ہے۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے تھے ۶۵۱ ان تمام شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت نبوی کے بعد ہی سے بنو عذرہ کے متعدد لوگ اسلام کی طرف راغب ہونے لگے تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو عذرہ اور سعد ہذیم سے جو معاہدے کئے تھے۔ ان سے بھی ان کے قبول اسلام کی صراحت ہوتی ہے۔ حضرت زمیل بن عمرو عذری کے نام ایک نامہ رسالت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابی موصوف کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو عذرہ کے غیر مسلم طبقات کے لئے مبلغ خاص بنا کر بھیجا تھا۔ اس سے مزید یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنو عذرہ کا ایک معتد بہ حصہ پہلے ہی مسلمان ہو چکا تھا۔ ۶۵۲ دوسرا نامہ نبوی جو جذام اور سعد ہذیم کے قبیلوں کے نام گشتی طور سے بھیجا گیا تھا۔ ان کے قبول اسلام کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے۔ کیونکہ وہ ان کو صدقات سے متعلق فرائض کی تعلیم دیتا ہے۔

اور ان کو صدقہ اور خمس کی دو قاصدان نبوی حضرات ابی بن کعب اور عنبسہ یا ان دونوں کے نمائندوں کو ادائیگی کا حکم دیتا ہے[٦٥٣]

یہ امر کہ بنو عذرہ اور سعد ہذیم یا قضاعہ کے دوسرے خاندانوں / بطون نے حقیقتاً اپنے صدقات مدینہ کو ادا کر دیئے تھے۔ متعدد شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے حضرت الاعجم بن سفیان بلوی عذرہ، سلامان، بلی اور کلب کے مرکزی عامل صدقات تھے جنہوں نے اپنے قبیلوں سے صدقات وصول کر کے بارگاہ نبوی میں پہنچائے تھے[٦٥٤] اس کے علاوہ بنو عذرہ کے ایک سردار حضرت حمزہ کے بارے میں ابن سعد وغیرہ کا بیان ہے کہ وہ حجاز سے پہلے مسلمان تھے۔ جو اپنی قوم کے صدقات لیکر مدینہ منورہ پہنچے تھے[٦٥٥] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شاید انہی خدمات جلیلہ کے عوض وادی القریٰ میں ایک عظیم قطعیہ عطا فرمایا تھا۔ جہاں اپنی زندگی بھر سکونت پذیر رہے تھے۔ مزید براں واقدی کا ایک تبصرہ صاف بتاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبوک سے واپسی کے بعد سعد ہذیم اکثر و بیشتر مسلمان ہو گئے تھے[٦٥٦] مزید تصدیق ان وفود کی آمد سے ہوتی ہے جو بنو عذرہ / سلامان، سعد ہذیم اور دوسرے قضاعی خاندانوں اور گھرانوں سے بارگاہ نبوی میں پہنچے تھے۔ سعد ہذیم کا وفد متعدد افراد (نفر) پر مشتمل تھا جبکہ بنو عذرہ کے وفد میں بارہ حضرات شامل تھے اور یہ دونوں وفود ۹ھ کے آغاز میں مدینہ پہنچے تھے ان میں سلامان کا وفد سب سے آخری تھا۔ جو شوال ۱۰ھ / جنوری ۶۳۲ء میں مدینہ آیا تھا اور جس میں سات حضرات شامل تھے۔ اس وفد کے سربراہ حضرت حبیب سلامانی تھے[٦٥٧] بہرحال ان شواہد کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سعد ہذیم کے بیشتر لوگ ۱۰ھ کے اواخر تک قطعی طور سے اسلامی امت میں داخل ہو چکے تھے۔

اگرچہ قضاعہ کے چھوٹے ذیلی گھرانوں کے بارے میں معلومات کم ملتی ہیں۔ تاہم اتنے قرائن ضرور ملتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اہم اور بڑے بطون کی مانند وہ بھی اسلام کے حلقہ میں داخل ہو چکے تھے۔ واقدی کا بیان ہے کہ قضاعہ کے دوسرے بطون کے علاوہ ایک چھوٹے خاندان بلقین سے بھی مسلم فوج کو ذات السلاسل کے دوران مدد کی توقع تھی اور حقیقتاً وہ ملی بھی تھی[٦٥٨] بہرحال اس قبیلہ کے کسی ابتدائی مسلم کا ذکر عام طور سے نہیں ملتا ہے۔ لیکن ان کے بعد کے زمانے کے کئی مسلمانوں کا تذکرہ مسلمان افواج کے ذیل میں ملتا ہے[٦٥٩] بنو جرم میں کم از کم تین مسلمانوں کا ذکر ابن حزم نے کیا ہے۔ ان میں سے حضرت ہوذہ بن عمرو اور حضرت اسمع بن ربان عاقل و بالغ مرد تھے۔ لیکن حضرت عمرو بن سلمہ سات سالہ نابالغ بچے تھے۔ لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ اپنی کم عمری کے باوجود قرآن مجید کے سب سے بڑے حافظ و عالم تھے۔ اس لئے اپنے قبیلہ کے مسلمانوں کی امامت وہی فرماتے تھے[٦٦٠] اس واقعہ کے ایک ٹکڑے سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ مردوں اور عورتوں کی خاصی بڑی تعداد اس خاندان کی مسلمان ہو چکی تھی۔ ایک اور چھوٹے گھرانے بنو البرک بن وبرہ کے صرف ایک مسلم کا ذکر مل سکا ہے۔ جو انصار کے حلیف تھے اور مدینہ میں سکونت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے سرپرست قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ بیعت عقبہ ثانیہ میں شرکت کی تھی۔ اور اس لحاظ سے وہ مکی عہد کے ابتدائی مسلم تھے[٦٦١] جبکہ بنو خشین کے دو مسلم بھائیوں حضرات ابو ثعلبہ خشنی اور عمرو بن جرہم خشنی کا ذکر ملتا ہے لیکن ان کے زمانہ قبول اسلام کے بارے میں کچھ نہیں مذکور ہوا ہے[٦٦٢] بہرحال ابن سعد کا بیان ہے کہ اس چھوٹے سے قبیلہ / خاندان کا سات آدمیوں پر مشتمل ایک وفد حضرت ابو ثعلبہ خشنی کی قیادت

میں غزوہ خیبر سے کچھ پہلے یا اس کے فوراً بعد بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوا تھا[۶۶۳] اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم یہ سات حضرات صلح حدیبیہ کے بعد کسی وقت مسلمان ہو چکے تھے۔ بنو جرم کا دوسرا وفد فتح مکہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تھا۔[۶۶۴]

اس کے علاوہ اسد الغابہ کا واضح بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری برس تک قضاعہ کا پورا قبیلہ حضرت جرثوم بن نعیب جیسے دعاۃ و مبلغین نبوی کی انتھک کوششوں کے نتیجے میں اسلامی امت کا جزو بن چکا تھا[۶۶۵]

بنو کلب

قضاعہ کا آخری بڑا خاندان کلب تھا جو بجائے خود قبیلہ بن چکا تھا۔ اس کے بعض افراد اسلام کے مکی عہد قدیم میں خدا کے پیغام سے متعارف ہو چکے تھے۔ اس کے سب سے بڑے صحابی مسلم حضرت زید بن حارثہ تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار مولیٰ اور ابتدائی تین چار مسلمانوں میں سے تھے[۶۶۶]۔ ان کے قبول اسلام کے سلسلے میں یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے قبیلہ کے نمائندے نہیں تھے کیونکہ وہ اپنے وطن، علاقہ اور قبیلہ سے دور مکہ کے باسی بن چکے تھے۔ یہ صحیح ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے والد محترم کی مکہ کی ناکام زیارت یا دوسرے زائرین اور تاجروں کی مکہ آمد نے بنو کلب کو اسلام سے آغاز عہد اسلامی ہی میں روشناس کر دیا تھا۔[۶۶۷] بہر حال مقامی کلبی مسلمانوں میں حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی کا نام کافی ممتاز اور اہم نظر آتا ہے اور ابن سعد کے ایک فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکی عہد میں کسی وقت اسلام لا چکے تھے۔ ابن سعد کا ان کو ان صحابہ کرام میں شامل کرنا جو عہد قدیم میں اسلام لا چکے تھے۔ (اسلموا قدیما) اور پھر یہ اصرار کرنا کہ وہ مسلمان تو ہو چکے تھے۔ مگر بدر میں شریک نہیں ہو سکے۔ ان کے قدیم مسلم ہونے کا کافی ثبوت ہے۔ واقدی کے ایک بیان سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے[۶۶۸]۔ بنو کلب کے ایک اور ابتدائی مسلمان حضرت نمیلہ کلبی تھے۔ جن کا اوّل ذکر عام طور سے مآخذ ان مجاہدین کی فہرست میں کرتے ہیں۔ جن کو خیبر کی پیداوار سے عطیہ نبوی ملا تھا[۶۶۹]۔ دوسرے مسلمانوں میں جو غالباً بعد کے زمانے سے تھے۔ حضرت عثمان بن عفان کی اہلیہ حضرت نائلہ بنت فرافصہ اور مؤخر الذکر کے بھائی حضرت ضب تھے۔ ان کے علاوہ قطن بن صغیر بھی بعد کے زمانے کے مسلمان تھے[۶۷۰] بہر حال بنو کلب میں انفرادی قبول اسلام کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ لیکن یہ قیاس کرنے کی خاصی بنیاد موجود ہے کہ اس قبیلہ کے خاصے لوگ اسلامی امت کے رکن عہد نبوی ہی میں بن چکے تھے۔

بنو کلب کے اسلامی امت میں ادغام و شمولیت کا ایک یقینی ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کے سریہ دومۃ الجندل (شعبان ۶ھ / دسمبر ۶۲۷ء) کے دوران اسلام قبول کر لیا تھا اور ان کے سردار حضرت اصبغ بن عمرو کلبی کا اکثر قبیلہ اسلامی امت کا رکن بن گیا تھا۔ جبکہ باقی ماندہ نے جزیہ کی ادائیگی کا وعدہ کر کے ذمی مقام کو قبول و پسند کیا تھا[۶۷۱]۔ اس کے علاوہ ۹ھ / ۶۳۰ء میں بنو کلب کے مسلمانوں نے مرکزی عامل صدقات کو جو عذرہ، بلی، سلامان اور کلب کے لئے مشترکہ طور پر مقرر کیا گیا تھا اپنے اپنے واجب الادا محاصل بھی ادا کئے تھے[۶۷۲]۔ اس

سے پہلے فتح مکہ کے بعد کسی وقت ان کا چار نفری وفد بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں مدینہ حاضر ہوا تھا[662] بلاذری نے بنو کلب سے صدقات کی وصولیابی کے لئے ایک دوسری دلچسپ روایت بھی بیان کی ہے۔ اس کے مطابق بنو کلب کا کوئی مناسب شخص کلب سے صدقات کی وصولی کے لئے نہیں مل سکا تھا۔ اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کو غالباً ان کے بنو کلب سے ازدواجی تعلقات کے پیش نظر ان کا افسر صدقات مقرر کر دیا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن نے یہ فرض بنو کلب کے اس حصہ کے لئے انجام دیا تھا جو دومۃ الجندل کے پاس آباد تھا[663]

آخر میں ان متعدد نامہائے نبوی پر بھی نظر ڈال لی جائے جو مختلف طبقات کلب جیسے باشندگان دومہ اور جناب عمائر کلب اور ان کے حنفاء معاونین اور عام مسلمان پیروؤں کے نام ہیں۔ ان تمام خطوط گرامی میں مکتوب الیہم کو مسلمانوں کی طرح بیان کیا گیا ہے اور ان سے اوقات مقررہ پر نمازیں پڑھنے اور اس کے تمام حقوق کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے اس سے پہلے اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ بنو کلب کی غالب اکثریت نے اپنا پرانا مذہب عیسائیت ترک کر دیا تھا اور مخلص و پکے مسلمان بن گئے تھے[665]۔ بنو کلب کے ضمن میں اس کا احتمال ہے کہ کچھ افراد یا چھوٹے موٹے گروہ اسلام کے دائرے سے عہد نبوی میں باہر رہ گئے ہوں اور بعد میں کسی وقت مسلمان ہوئے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ بنو کلب کا معاملہ اس کے قطعی برعکس معلوم ہوتا ہے جو واٹ نے بڑے جوش و خروش سے ثابت کرنا چاہا ہے[666]

(ب) بنو جذام

ماخذ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جذام کا کم از کم ایک طبقہ ذو المروہ اور حسمی کے ارد گرد آباد تھا[667]۔ یہ دونوں علاقے ابن سعد کے مطابق وادی القریٰ کے پار تھے[668]۔ بقیہ حصہ یا حصے شامی سرحدوں کے قریب آباد تھے اور وہ بنو جذام قضاعہ اور اس کے متعدد بطون خاص کر سعد ہذیم اور عذرہ کے پڑوسی تھے۔ ابن حزم مزید صراحت کرتے ہیں کہ وہ حجاز کے بالائی علاقے ایلہ کے نواح میں رہتے تھے۔ نسبی لحاظ سے ان کا تعلق جنوبی عرب کے ایک قدیم قبیلے بنو اُدَد بن زید سے تھا لیکن وہ زمانہ جاہلیت میں کسی وقت شمال میں جنوب سے آکر بس گئے تھے۔ جیسے کہ قضاعہ بھی جنوبی عرب کے باشندے تھے اور نقل مکانی کرکے شمالی علاقے میں سکونت پذیر ہوئے تھے[669]۔

بنو جذام میں غالباً اسلام کا داخلہ مدنی عہد کے دوسرے حصہ میں ہوا تھا۔ جبکہ ان کا ایک ذیلی گھرانا بنو ضبیب سنہ ۶ھ کے وسط اور سنہ ۶ھ کے اواخر میں اسلام لایا۔ یہ بنی ضبیب ہی تھے۔ جنہوں نے سرکشی اور باغی ھُنید بن عارض اور اس کے فرزند کو سفیر رسول حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی کے سامان کو جن میں قیصر کے دیئے ہوئے تحائف بھی تھے واپس کرنے پر مجبور کیا تھا۔ واقدی کے مطابق اس باغی اور لٹیرے کو سزا دینے والی جماعت میں کم از کم دس آدمی شامل تھے اور ان کے سردار حضرت نعمان بن ابی جعال تھے جو قبیلہ کے ایک عظیم جنگجو اور ماہر تیر انداز تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو ضبیب کی کارروائی کی اطلاع نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ آپ نے حضرت زید بن حارثہ کلبی کی قیادت میں ایک تادیبی جماعت بھیجدی۔

جس نے غلطی سے ان مسلمان طبقوں پر حملہ کر کے ان کو خاصا جانی اور مالی نقصان پہنچایا۔ جو اسلام کے وفادار تھے چنانچہ تلافی مداوا میں ستم رسیدہ مسلمان طبقات کا ایک وفد حضرت زید سے ملا جس میں متعدد حضرات جیسے حبان بن ملہ اور ان کے فرزند، ابوزید بن عمرو، ابوالشماس بن عمرو، سوید بن زید اور ان کے بھائی برزہ، اور ثعلبہ بن عدی شامل تھے۔ تحقیق سے ان کا دعوی ثابت ہو گیا اور ان کا مداوا کیا گیا[۶۸۹]

مجموعۃ الوثائق میں شامل ایک نامہ نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ جذام کا ایک حصہ جو حضرت رفاعہ بن زید کی ماتحتی میں تھا صلح حدیبیہ سے بھی کافی پہلے مسلمان ہو گیا تھا[۶۹۰] ماخذ کا بیان ہے کہ قبیلہ کے ان مسلمانوں نے حضرت دحیہ کا سامان واپس دلانے اور لٹیروں کو پکڑنے کی اپنی سی کوشش کی تھی مگر وہ نکل بھاگے تھے۔ بہرحال دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو ضبیب نے ان سے پورا پورا بدلہ لے لیا تھا۔ اس سے بہر صورت یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو ضبیب کے علاوہ جذام کا ایک اور طبقہ مسلمان ہو چکا تھا۔ مزید تصدیق اس ایک نفری وفد سے بھی ہوتی ہے۔ جو غزوہ خیبر سے کچھ پہلے مدینہ پہنچا تھا[۶۹۱] ذکر آچکا ہے کہ سنہ ۹ھ میں سعد ہذیم اور جذام کے لئے ایک مشترکہ عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نامہ نبوی کے مطابق جذام سے صدقہ کے علاوہ خمس کا بھی مطالبہ کیا گیا تھا[۶۹۲] اس کے علاوہ ایک گرامی نامہ جذام کے ایک غیر معروف گھرانے بنو جعال بن ربیعہ کے نام بھی ہے جس کے مطابق ان کو اپنے علاقہ میں بعض مراعات و حقوق سے نوازا گیا تھا[۶۹۳] دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جذام کے ایک حصے نے رومی سلطنت سے غزوہ تبوک کے موقع پر ساز باز کی تھی[۶۹۴] ظاہر ہے کہ یہ حصہ یا قبیلہ مسلم طبقات سے الگ تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ غزوہ تبوک تک یہ قبیلہ بعض اور شمالی قبائل کی مانند اپنی وفاداریوں کے لحاظ سے منقسم تھا۔ کچھ طبقے مسلمان ہو چکے تھے اور اسلامی ریاست کے وفادار تھے۔ جبکہ اس کے بعض طبقات کی قدیم وفاداری ابھی تک رومی آقاؤں سے استوار و قائم تھی لیکن اس غزوہ کے بعد ان اسلام دشمن طبقات میں بھی اسلام پھیل گیا تھا۔ جیسا کہ مالک بن احمر عوفی کی مثال سے ثابت ہوتا ہے[۶۸۶]

(ح) بنو لخم

بنو لخم نہ صرف خون کے رشتوں کے سبب جذام کے ساتھ قریبی تعلقات رکھتے تھے۔ بلکہ پڑوسی ہونے کے ناطے بھی ان کے دوست تھے[۶۹۶] اصل قبیلہ شامی سرحدوں کے قریب آباد تھا۔ مگر اس کی کچھ شاخیں مصر اور العریش کے درمیان واقعہ علاقہ میں بھی سکونت پذیر تھیں[۶۹۷] ان کے قریبی تعلقات قضاعہ سے بھی تھے۔ دوسرے شمالی قبائل کے مانند لخم کے حلف و دوستی کے تعلقات قریش مکہ سے بھی تھے۔ اور غالباً سب سے پہلے لخمی مسلمان حضرت حاطب بن ابی بلتعہ تھے جو قریشی خاندان بنو اسد کے حلیف اور مکی باشندے تھے۔ ان کو بدری صحابی ہونے کی فضیلت بھی حاصل تھی[۶۹۸] لیکن اصل قبیلے میں انفرادی اور اجتماعی قبول اسلام کی مثالیں غزوہ تبوک تک نہیں ملتی ہیں۔ اسی غزوہ کے دوران حضرت تمیم داری کی قیادت میں ان کے دس آدمیوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تبوک ہی میں ملاقات کی اور اسلام قبول کر کے آپ کے ساتھ مدینہ آکر غالباً آباد ہو گئے

آپ نے ان کو خیبر کی پیداوار سے سو وسق سالانہ کا عطیہ خاص عطا فرمایا تھا۔[۶۹۰] اسلام سے بنو لخم کے مزید تعلقات و روابط کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ ان کے قبیلے کے لئے کسی عامل صدقات کی تقرری کا بھی مآخذ میں حوالہ نہیں ملتا ہے بہر حال بنو لخم کے ایک ذیلی خاندان بنو حدس کے نام ایک گرامی نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایک طبقہ کم از کم مسلمان ہو چکا تھا یہ غالباً تبوک کے بعد کا خط ہے۔[۶۹۱] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو لخم اجتماعی طور سے عہد نبوی میں مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ مدینہ سے خاصی لمبی مسافت پر آباد تھے۔ اور علاوہ ایک شامی قبیلہ تھے جس کو جزیرہ نمائے عرب کے معاملات و امور سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اسلام سے ان کے دور رہنے کا دوسرا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ رومی سلطنت کے پکے وفادار تھے جیسا کہ غزوہ تبوک کے زمانے میں ان کے رویے سے واضح ہوتا ہے۔

(۱۷) بنو غسان

شمال کا آخری اور غالباً سب سے اہم اور طاقتور قبیلہ غسان تھا جو اسلام کا اور اسلامی ریاست کا سب سے شدید مخالف اور دشمن تھا۔[۶۹۲] اس کی اسلام دشمنی کا مظاہرہ متعدد مواقع پر ہو چکا تھا۔ لیکن اس دشمنی اور عداوت کے باوجود اسلام کا اثر بعض صالح طبیعتوں پر پڑا تھا اور ان کے بعض افراد و طبقات اسلام کے ہمنوا بن گئے تھے، چاہے وہ بجائے خود سیاسی و سماجی لحاظ سے غیر اہم ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو گرامی ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت نبوی پر غسانیوں کے ایک حکمران حضرت جبلہ بن ایہم نے اسلام قبول کر لیا تھا۔[۶۹۳] اسی طرح غسان کا ایک گھرانا بنو ثعلبہ بھی اسلام کے دائرے میں داخل ہو گیا تھا۔ دوسرے مکتوب نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صیفی بن عامر کو ان کے قبیلہ (قوم) والوں کا سردار مقرر کیا گیا تھا اور بظاہر انہوں نے زکوٰۃ، خمس، صفی رسول اور نمازوں کو قائم کرنے سے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کو نافذ بھی کیا تھا۔[۶۹۴] مونٹگمری واٹ اور ان کے ہم خیال و ہم فکر مستشرقین کا خیال ہے کہ ان خطوط میں بہت سا مواد مسترد کئے جانے کے قابل ہے۔ لیکن انہوں نے مآخذ کی ان صریح شہادتوں کو رد کرنے کے لئے کوئی خاص دلیل نہیں دی ہے اور جو دلیل دی بھی ہے وہ بے جان ہے اور اس کی بنا پر ان شہادتوں کو مسترد کرنے کا جواز نہیں پیدا ہوتا۔[۶۹۵] حضرت جبلہ بن ایہم کے قبول اسلام کا پس منظر ہی بتاتا ہے۔ کہ مکتوب ناموں کی اطلاعات قابل اعتماد ہیں۔ ان کی کسی حد تک توثیق غسان کے ایک وفد کی آمد سے ہوتی ہے جو رمضان ۱۰ھ / دسمبر ۶۳۱ء میں کسی وقت مدینہ پہنچا تھا اور اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام حق کی توثیق و تصدیق کی تھی۔[۶۹۶]

غسان کے قبول اسلام کے بارے میں ایک دلچسپ اور اہم شہادت ابن اسحاق کے ایک حوالے میں ملتی ہے جو عام طور سے مؤرخین کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہے۔ اس کے مطابق غزوہ حنین میں غسان کا ایک دستہ بنو سلیم کے ساتھ لشکر اسلامی کے ساتھ مقدمہ میں موجود و شریک جہاد رہا تھا۔ جیسا کہ حضرت عباس بن مرداس سلمی کی شاعری کے دو تین ابیات سے معلوم ہوتا ہے۔[۶۹۷] بہر حال یہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور اس کی تردید کے کافی اسباب بھی نہیں ہیں کہ غسان کا ایک حصہ اسلام کا حلقہ بگوش ہو چکا تھا غسان

کے قبول اسلام یا اسلام اور اسلامی ریاست سے تعلقات کے بارے میں مواد کافی ناقص ہے اور اس کا سبب وہی ہے جو لخم کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ غسان نہ صرف مدینہ منورہ سے کافی دور آباد تھا۔ بلکہ اس کو عملی لحاظ سے جزیرہ نمائے عرب کا قبیلہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ حقیقت بھی تھی کہ وہ شامی سرحدوں کے دونوں طرف آباد تھا۔ اور عملاً بازنطینی سلطنت کے ایشیائی صوبے شام اور جزیرہ نمائے عرب کے درمیان ایک فاصل ریاست (BUFFER STATE) قائم کئے ہوئے تھا۔ اس لئے اگر وہ عہد نبوی میں اسلام کے دائرہ اثر و اقتدار سے آزاد تھا، تو کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔

مدینہ منورہ کے شمال میں اسلام کی اشاعت و ترویج کی بحث کے خاتمہ پر یہ تبصرہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ شمالی قبائل کے ضمن میں اسلام کی تبلیغ اتنی وسیع، ہمہ گیر اور کامیاب نہیں تھی جتنی کہ مغربی اور مشرقی قبائل یا جنوبی قبائل کے ضمن میں رہی تھی۔ جوں جوں شمال کی جانب بڑھتے گئے اس کی رفتار ہلکی اور اس کو قبول کرنے کی صلاحیت کمزور ہوتی نظر آتی ہے۔ دین خداوندی کے شمالی علاقے میں اتنی سست روی سے سفر کرنے اور بہت زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکنے کے اسباب نہایت واضح ہیں اس کا پہلا اہم ترین سبب وقت کی کمی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ اور مدینہ کے شمال میں خاص کر اور مشرق و مغرب و جنوب میں عام طور سے تبلیغی کارروائی شعوری طور سے باقاعدہ ہجرت مدینہ کے بعد شروع کی تھی۔ فتح مکہ تک آپ کی توجہ پوری طرح سے مدینہ کے اردگرد بسے قبائل اور قریش مکہ کے معاملات پر مرکوز رہی تھی۔ اس زمانے میں آپ نے اگرچہ شمالی طرف جب بھی موقعہ ملا توجہ دی۔ لیکن وقت کی کمی کے سبب اتنی نہیں عنایت فرما سکے جتنی کہ آپ نے مرکزی علاقہ عرب کے قبائل پر دی تھی۔ فتح مکہ اور وفات نبوی کے درمیان کا ڈھائی سالہ عرصہ اتنے بڑے خطے میں اسلام کی تبلیغ کے لئے ناکافی تھا۔ دوسرے یہ کہ مدینہ سے خاصی طویل مسافت بھی اسلام کی ترقی و تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ تھی۔ تیسرے یہ کہ آپ کی نظر میں اگرچہ اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا تاہم میدان کار جزیرہ نمائے عرب تک محدود تھا اور غیر ممالک میں آپ نے جو سفارتی مہمیں اور تبلیغی جماعتیں روانہ کی تھیں وہ تعداد میں کم تھیں اور ان کا اثر محدود تھا۔ چوتھا بڑا سبب یہ تھا کہ غسان اور دوسرے عرب قبائل بازنطینی حکومت کے ماتحت، وفادار اور باجگذار تھے اور ان کی غیر ملکی آقاؤں سے وفاداری اسلام سے وفاداری کی راہ میں حائل تھی۔ کیونکہ اسلام کی وفاداری کا لازمی نتیجہ تھا اسلامی ریاست اقتدار اعلیٰ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حاکمیت و نیابت خداوندی کو تسلیم کرنا، جو ان کے لئے بر وقت ممکن نہ تھا۔ اور آخری اہم سبب یہ تھا کہ پوری دنیائے انسانیت کے لئے آپ رسول و ہادی ضرور بنا کر بھیجے گئے تھے، مگر یہ آپ کا فرائض منصبی نہیں قرار دیا گیا تھا کہ آپ "پوری دنیا یا کائنات" کو مسلمان بنالیں[198] آپ کا کام پیغام الٰہی کو لوگوں تک پہنچانا تھا۔ جو آپ نے بلا کم و کاست پوری ایمانداری و صداقت اور ممکنہ کوشش و جہد کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ آپ کا دوسرا کام اس ضمن میں مسلمانوں اور مبلغوں کی ایسی جماعت تیار کر دینا تھا جو "اپنے پیچھے والوں کو یا بعد میں آنے والی نسلوں کو تیار کر سکیں"[199]، ان میں تبلیغ کر سکیں اور ان تک پیغام الٰہی پہنچا سکیں۔ اور یہ آپ نے بخوبی بلکہ بہ احسن طریق انجام دیا تھا۔ آپ نے صحابہ کرام کی ایسی جماعت اور مبلغین اسلام کی ایک ایسی امت پیدا کر دی تھی جو اپنے قول و فعل اور کردار سے اسلام کے پیغام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلانے کا سبب اور وسیلہ بن گئی۔

ہمارے تمام مستشرقین اور خصوصاً مونٹگمری واٹ شمالی قبائل میں اشاعت اسلام کے بارے میں تعصب سے کام لیتے ہیں اور غیر علمی رویہ اپناتے ہیں۔ ان کے تعصب کا بنیادی سبب وہ چیز ہے جس کو قرآن کریم نے "حمیۃ جاہلیۃ" کہا ہے۔ یہ جاہلی حمیت اس لئے ہے کہ شمالی قبائل میں اکثر و بیشتر عیسائی تھے اور ان کو شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ گوارا نہیں ہوتا ہے۔ کہ عیسائیوں یا عیسائی طبقات کے مسلمان ہونے کی واقعیت کو تسلیم کر لیں۔ ان کو اس میں اپنے مذہب کی توہین اپنی قومی ذلت اور ذاتی سبکی محسوس ہوتی ہے چنانچہ وہ ماخذ کی صریح شہادتوں کو بلاوجہ مسترد کر دیتے ہیں اور تاویلات کا سہارا لیتے ہیں اور اپنی تحقیق و علمیت کی تمام کاوشوں کو اس نکتہ پر مرکوز کر دیتے ہیں کہ تاریخی واقعات و حقائق میں الجھن اور شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں۔ اس فرض عظیم کی خاطر مونٹگمری واٹ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شمالی پالیسی کو مبہم غیر واضح اور پراسرار بلکہ راز سربستہ تک قرار دیا ہے۔ حالانکہ وہ خود بھی جانتے ہیں اور جیسا کہ مذکورہ بالا بحث سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کی پالیسی میں کوئی ابہام اور پراسراریت نہیں تھی۔ وہ انتہائی روشن، واضح اور معلوم پالیسی تھی۔ یعنی خدا کے پیغام کو دوسروں کی طرح شمالی قبائل کو بھی پہونچانا اور ان کو اسلامی ریاست کے سایہ عاطفت میں لانا۔ ہمارے یہ مستشرقین علمی و تحقیقی انداز کی بھول بھلیوں میں قارئین کو گم کر کے ایک اور ستم یہ کرتے ہیں کہ ان کے ذہنوں پر اسلام کی تاثیر کی کمزوری اور دین خداوندی کی اثر و نفوذ کی عدم صلاحیت کو شعوری طور سے مرتسم کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کا جب تک بت پرستوں سے مقابلہ رہا وہ تیزی سے پھیلتا رہا۔ لیکن جب اس کا واسطہ عیسائیوں یا یہودیوں سے پڑا تو اس کی تاثیر نہ صرف ماند پڑ گئی بلکہ ختم ہو گئی کیونکہ اسلام کے اصول اصلی یا پر اثر نہ تھے۔ یہ صحیح ہے کہ جن اقوام اور قبائل میں اپنے مذہب سے جذباتی لگاؤ یا مذہبی عصبیت ہوتی ہے ان پر دوسرے مذہب کا اثر مشکل سے اور دیر میں پڑتا ہے لیکن اس میں اسلام کی تاثیر کی کمی سبب نہیں ہوتی بلکہ انکی عصبیت اور جذباتی لگاؤ قبول اسلام کو روک دیتا ہے کیونکہ وہ اسلام کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ بہرحال جہاں تک شمالی قبائل کا تعلق ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ان کی غالب اکثریت خلافت راشدہ میں خاص کر عہد صدیقی ہی میں اسلام قبول کر چکی تھی اور اسلامی ریاست اور اسلامی امت کا جزو بن چکی تھی۔ اتنی مختصر سی مدت میں ان میں اسلام کی توسیع و اشاعت محض اس بنا پر ہو سکی تھی۔ کہ زمین پہلے سے ہموار تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ذہن و قلب کو سننے سمجھنے اور ماننے کے لئے تیار کر دیا تھا اور ان کے فکر و نظر اور عقیدے کے تبدیل کرنے کا فریضہ اس "امت خیر" نے انجام دیا جو لوگوں کے لئے ہی پیدا کی گئی ہے۔ اور جو ان کو بھلائی کی تعلیم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں اور اللہ پر ایمان رکھتے ہیں"۔۔۔

(۴) جنوبی قبائل

مکہ اور عدن کے درمیان آباد جنوبی قبائل میں اسلام کا تعارف اور داخلہ اسلامی ریاست کی فوجی طاقت اور ہتھیاروں کے داخلے سے کافی مدت پہلے ہو چکا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جنوبی عرب میں ریاست اسلامی کے فوجی اثرات کا تاثر

ہی نہیں ہوا تھا، جتنا دوسرے قبائل کے سلسلے میں ہوا تھا۔ بہر حال مسلم افواج یا مہمیں اس علاقہ میں فتح مکہ سے پہلے نہیں پہنچ سکی تھیں اور نہ ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منظم کی ہوئی تبلیغی و اشاعتی جماعتیں۔ کیونکہ مدینہ منورہ اور جنوبی عرب کے درمیان خاص طور سے اور جزیرہ نمائے عرب کے مشرقی علاقوں اور ساحلی خطوں میں عام طور سے قریش مکہ کی طاقتور اور ناقابل تسخیر اشرافیہ کی دیوار حائل تھی۔ یہاں تک وہ ۶۳۰ء کے ابتدائی دنوں میں منہدم ہو گئی۔ مکی عہد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی اجتماعی منظم سماجی یا سیاسی قوت نہ تھی جس کے بل بوتے پر تبلیغی وفود اور مذہبی کارواں بھیجے جاتے۔ لیکن اسلام کی ہمہ گیر تاثیر و تسخیر کے غیر معلوم و غیر محسوس اندرونی دھاروں نے ان مصنوعی دیواروں اور السانوں کی عائد کی ہوئی حد بندیوں کی ذرا پروا نہیں کی اور اس نے اپنی اشاعت و تبلیغ کے انوکھے اور شاندار ذرائع حاصل کر لئے۔ جنوب کے بعض تشنگان معرفت الٰہی، حقیقت کے جویا اور زائرین حرم کعبہ مختلف مقاصد سے مکہ آئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام دکام سے آشنا ہوئے اور ان میں سے متعدد نہ صرف اسلام کے علمبردار بن گئے بلکہ جب وہ اپنے اپنے علاقوں کو لوٹے تو اسلام کے مبلغ و داعی بن کر لوٹے۔ جنوب کے قبائل میں اسلام کے تعارف، تبلیغ اور ترویج کے کام میں حضرات ابوموسیٰ اشعری، طفیل بن عمرو دوسی، ضماد بن ثعلبہ ازدی اور متعدد دوسرے حضرات نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے ابن سعد کے بقول مکہ کے عہد قدیم میں اسلام قبول کر لیا تھا اور واپس اپنے وطن لوٹ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے وطن میں اس تندہی اور جانفشانی سے تبلیغ اسلام کی تھی کہ جب ۷ھ میں غزوہ خیبر سے کچھ پہلے وہ اشعریوں کا وفد لیکر پہنچے تو ان کے ساتھیوں کی تعداد پچاس سے متجاوز تھی۔ اور نہ جانے کتنے مسلمان وہ اپنے علاقے میں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔[۱]

مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ کی موجودگی سے اس کو تمام جزیرہ نمائے عرب میں ایک مذہبی اور سماجی مرکزیت حاصل تھی۔ اور اس کے سبب وہ اقتصادی مرکز اور تجارتی منڈی بھی بن گیا تھا۔ اس میں اس جغرافیائی سبب نے بھی خاصا اہم کردار ادا کیا تھا کہ وہ مغربی ساحل کی بین الاقوامی شاہراہ پر جو یمن سے شام کو جاتی تھی واقع تھا۔ ان اسباب سے زائرین اور تاجرین کا سال بھر تانتا لگا رہتا تھا۔ چنانچہ مکہ میں پیش آنے والے واقعات اور امور مختصر سی مدت میں پورے جزیرہ نمائے عرب میں متعارف ہو جاتے تھے۔ اسلام تو مکہ میں ایک انوکھا اور دلچسپ ترین واقعہ اور تجربہ تھا۔ جس کے ماننے والے آگ کے انگاروں پر جلنا اور تپتی ریگ پر جھلسنا اور جسم و جان کے ٹکڑے کئے جانا پسند کر لیتے تھے۔ مگر اس نئے مذہب کو چھوڑنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مسلمانان مکہ کی آزمائش و ابتلاء کے واقعات کے علاوہ اسلام کی سیدھی سادی اور سچی تعلیمات نے بھی مکہ کے زائروں کو متاثر کیا تھا چاہے انہوں نے اسلام نہ بھی قبول کیا ہو۔ یہ غیر مسلم زائرین جب اپنے علاقوں کو واپس ہوتے تھے تو وہ بھی غیر شعوری طور پر اسلام کا بالواسطہ اور غیر جانبدار علمبردار بن کر جاتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنے ہم وطنوں اور ہم قبیلہ والوں سے جا کر سناتے تھے۔ تاریخی روایات شاہد ہیں کہ انہوں نے نہ جانے کتنے ذہنوں کو جگایا اور بیدار کیا تھا۔ کتنے دماغوں میں ہلچل و اضطراب پیدا کیا تھا اور کتنی روحوں میں حق کی تلاش اور جستجو کی آرزو مچل کر لگائی تھی۔ اس کے علاوہ دوسرے علاقوں کے مانند جنوبی عرب کے قبائل کے افراد اور گروہوں کے مکہ والوں سے مستقل سیاسی اور سماجی اور اقتصادی تعلقات بھی قائم

تھے اور انہوں نے بھی اسلام کے تعارف اور روشناسی کا کام انجام دیا تھا۔ مگر سب سے بڑا عنصر اپنی "تاثیر اور تسخیر قلوب کے لحاظ سے ان نومسلموں کا تھا، جو جنوبی عرب کے مختلف خطوں میں چند انفرادی مبلغین اسلام کی کوششوں کے نتیجہ میں اسلام لا چکے تھے۔ یہ نومسلم بجائے خود اسلام کے سب سے بڑے اور مؤثر داعی تھے جنہوں نے اپنے رشتہ داروں، خاندان و قبیلہ والوں اور پڑوسیوں کو متاثر کیا تھا اور بہت سوں کو ہمنوا و ہمخیال بھی بنا لیا تھا۔ اس پورے عمل و نفوذ کا نقطہ عروج وہ تھا جب فتح مکہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوبی عرب کے قبائل میں ترویج اسلام کی شعوری اور منظم کوششیں کیں۔ گویا کہ زمین ہموار ہو چکی تھی۔ بیج بوئے جا چکے تھے۔ پانی دیا جا چکا تھا اور فصل تیار تھی صرف فصل کو کاٹ کر گھر لانے کی دیر تھی۔

اب تک یہ واقعہ اور حقیقت اتنی عیاں ہو چکی ہے۔ کہ زیادہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ جنوبی عرب میں مختلف قبیلے اور ان قبیلوں کے مختلف بطون اور ان بطون کی متعدد ذیلی شاخیں تھیں۔ بہرکیف اہم جنوبی قبائل اور ان کے بطون اور شاخیں حسب ذیل تھیں:

(ا) اشعر:

(ب) بجیلہ: (۱) بنو احمس بن غوث۔ (۲) باشندگان کلاع و ظلیم

(ج) خثعم: (۱) بنو معاویہ (بنو رشد

(د) ہمدان: (۱) بنو الحارث (۲) بنو شاکر (۳) بنو ارحب، (۴) بنو ربیعہ بن مالک (۵-۶) باشندگان رعین و معافر (۷) باشندگان مرآن

(س) حمیر: (۱) اہل یزن (۲) اہل زود (۳) اہل مرآن

ط مذحج: (۱) بنو عنس (۲) بنو مراد (۳) بنو سعد العشیرہ، بنو جعفی، بنو عائذ، مرآن، حریم، کلاب وغیرہ (۴) بنو زبید (۵) بنو اود (۶) بنو رہا (۷) بنو صداء (۸) بنو نخع (۹) بنو الحارث بن کعب (بنو عبد المدان بنو ضبب بنو قنان، بنو عبد لغوث اور بنو زیاد وغیرہ) (۱۰) بنو خولان

(ع) نہد: (۱) بنو قرہ

(ف) ازد یمن: (۱) ازد جرش (۲) نجران (۳) بنو غامد (۴) بنو بارق (۵) بنو غافق۔

(ک) کندہ: (۱) بنو معاویہ (۲) بنو وہب (۳) بنو رُعَیش (۴) بنو اشرس (۵) بنو سکون (بنو غوث) (۶) بنو سکاسک (۷) بنو تجیب

(ل) حضرموت یا حضارمہ: (۱) اقیال حضرموت (۲) بنو صدیف

(م) الابناء: ایرانی نژاد باشندگان یمن[۲]

سونٹگمری واٹ کا خیال ہے کہ "فتح مکہ تک اہل جنوب اور مسلمانوں میں کوئی بھی رابطہ و تعلق نہیں تھا"[۳] اگر یہ کہا جاتا کہ اہل یمن و حضرموت وغیرہ کا تعلق اسلامی ریاست سے نہیں تھا، تو بات صحیح ہوتی لیکن اسلام اور مسلمانوں سے ان کا

تعلق دیرینہ و دیرپا تھا۔ بلکہ خود "مسلمان" ان کے بیچ موجود تھے۔ جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں اور آئندہ بھی مزید اس کا مطالعہ کریں گے۔ جنوبی عرب میں اسلام کی ترویج و اشاعت کے مباحث سے پہلے یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اس کے کسی قبیلے نے اسلام کی مسلح یا فوجی مخالفت نہیں کی تھی اور اسلامی ریاست کے خلاف نہ تلوار اٹھائی تھی۔ اور نہ ہی سیاسی اور فوجی سازشوں میں حصہ لیا تھا۔ غالباً یہ صاف ذہنی بھی ان کے تیز اور جلد قبول اسلام کا سبب بن گئی تھی۔ یہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ قبائلی عصبیت اور رقابت نے اسلام کے قبول و انکار میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ چنانچہ جنوبی و شمالی قبائل کے درمیان موجود قبائلی رقابت بلکہ عداوت اگرچہ پرانی تھی لیکن اس نے اسلام کی ترقی و تبلیغ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی تھی۔ کیونکہ اسلام نہ جنوبی تھا نہ شمالی مشرقی تھا نہ مغربی وہ تو ایک آفاقی مذہب تھا۔ اور آج بھی اس کی وہی خصوصیت باقی ہے۔ حسب معمول جنوبی عرب کے قبائل میں ترویج اسلام کا مطالعہ توقیتی تقاضوں یا تاریخی ترتیب واقعات کے مطابق بنو اشعر سے کیا جا رہا ہے کہ وہی جنوبی عرب میں اسلام کے اولین پیرو اور علمبردار رہے تھے۔

۱ اشعر

حضرت ابو موسیٰ اشعری کے علاوہ ابن سعد نے اشعر کے چھ اور ابتدائی مسلمانوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ تھے: حضرات ابو بردہ، ابو رہم (دونوں حضرت ابو موسیٰ اشعری کے بھائی تھے)، ابو عامر اور ان کے صاحبزادے عامر، ابو مالک اور حارث اشعری[۴]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے قبیلوں کی طرح اشعر کے لوگ بھی گروہوں میں اسلام لائے تھے۔ دوسرے اشعری صحابہ کرام کے سوانحی خاکوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے گھرانے اور مختلف افراد ایک ساتھ اسلام لائے تھے۔ بہر حال اسلام اشعر میں ۶۱۵ء اور ۶۱۹ء کے درمیان روشناس ہوا تھا، اور ۷ھ/۶۲۸ء تک قبیلہ کا ایک معتدبہ اور بڑا طبقہ اسلام لے آیا تھا۔ جن میں سے پچاس سے زیادہ لوگ مدینہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کے ساتھ پہنچے تھے! اور انہوں نے متعدد مہموں میں شرکت بھی کی تھی[۵]۔ یہ یقینی ہے کہ ان مہاجر اشعریوں کے علاوہ کافی بڑی تعداد میں مسلمان اپنے قبیلہ اور علاقے میں قیام پذیر رہے تھے۔ خاص طور سے ان پچاس مسلمانوں کے اہل خانہ و عزیز، ہمارے مفروضہ کے مطابق ان کی تعداد تین ساڑھے تین سو کے درمیان کہیں رہی ہوگی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے۔ کہ بنو اشعر کے مزید قبول اسلام کی نہ تو مثالیں ملتی ہیں! ور نہ ہی کوئی اور حوالہ۔ اس کے علاوہ ماخذ سے یہی تاثر ملتا ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری اور ان کے رفقاء کی کوششوں نے پورے قبیلہ کو حلقہ بگوش اسلام بنا دیا تھا[۶]۔ بہر صورت ۱۰ھ/۶۳۱ء میں جب اشعر کے عاملین صدقات اور مرکزی منتظمین ان کے پاس پہنچے تھے[۷]۔ اس سے پہلے ہی پورا قبیلہ اسلامی امت کا رکن بن چکا تھا، اور مدینہ کی اسلامی ریاست سے ان کے مذہبی روابط اور تعلقات میں استحکام نے ان میں وہ ایمانی صلابت اور ثابت قدمی پیدا کر دی تھی کہ ردہ کے پر آشوب و پر فتن زمانے میں نہ صرف وہ اسلام پر عامل و قائم رہے تھے۔ بلکہ دوسروں کے ایمان و سلامتی کے محافظ بن گئے تھے۔ بخاری کی ایک روایت کے مطابق اشعریوں کے ایمان کی مضبوطی اور عقیدہ کی پختگی کی

خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت دی تھی[8]۔ اور صادق و امین کی شہادت سے بڑھ کر اور کس کی گواہی ہو سکتی ہے!

(ب) بجیلہ

بجیلہ کا قریبی تعلق ایک دوسرے جنوبی قبیلے خثعم سے تھا اور وہ غالباً انہی کے پڑوس میں آباد بھی تھے۔ یہ ایک خاصا بڑا قبیلہ تھا جو بعثت نبوی کے زمانے میں اندرونی اختلافات اور باہمی نزاعات میں مبتلا تھا اور مختلف متحارب و متصادم گروہوں میں منقسم تھا، تاآنکہ اس کو ان کے سب سے بڑے سردار حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی نے متحد و منظم کیا[9]۔ اسکے متعدد خاندانوں میں بنو احمس بن غوث کے بارے میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ غالباً کچھ پہلے مسلمان ہوا تھا۔ جیسا کہ ابن حزم کا دعویٰ ہے کہا جاتا ہے کہ اس قبیلہ/خاندان کے ایک سو پچاس اشخاص حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی کے ساتھ ایک دن میں مسلمان ہوئے تھے بعد میں وہ اپنے وفد کے ساتھ مدینہ پہنچے تھے اور بارگاہ نبوی میں اپنے مسلمان ہونے کی انہوں نے پھر تصدیق کی تھی[11]۔ مدینہ میں اپنی آمد کے فوراً بعد ان نو مسلموں نے جہاد میں شرکت کی تھی۔ جب کہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بجیلہ کے بتکدے کو توڑنے کے لئے بھیجا تھا، جو ذوالخلصہ نامی مقام پر واقع تھا[12]۔ ابن حزم نے اس کے تین اہم مسلمانوں کے نام بھی بیان کئے ہیں جو یہ تھے: حضرات طارق بن شہاب، ابو حازم الفقیہ اور ان کے صاحبزادے قیس، ان کے علاوہ انہوں نے حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی کے ایک عزیز مسلم حضرت عبد اللہ بن ابی عوف کا بھی صحابہ میں شمار کیا ہے[13]۔

کچھ مدت کے بعد رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی کو جنوبی عرب کی دو چھوٹی ریاستوں یا مملکتوں کلاع اور ظلیم کے شہزادوں/حاکموں اور ان کی رعایا میں تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا تھا، جہاں ان کو صد فی صد اور فوری کامیابی ملی تھی[14]۔ لیکن بجیلہ کے قبولِ اسلام کا سب سے بڑا ثبوت ان کا دوسرا وفد تھا جو اس کے بعد حضرت قیس بن عذرہ احمسی کی قیادت میں مدینہ پہنچا تھا۔ اس میں دو سو پچاس مسلمان شریک تھے[15]۔ اس حتمی شہادت سے بجیلہ کے پورے قبیلے کے مسلمان ہونے کے بارے میں کسی قسم کا شبہ یا الجھن باقی نہیں رہ جاتی۔ اس کے علاوہ مزید ثبوت یہ ہے کہ مجموعی طور سے بنو بجیلہ ردہ کے زمانے میں اسلامی ریاست کے وفادار اور اسلام پر قائم رہے تھے اس پرآشوب زمانے میں حضرات جریر بن عبد اللہ بجلی اور قیس بن عذرہ احمسی وغیرہ نے اسلام کی زبردست اور شاندار خدمات انجام دی تھیں اور طوفانِ حوادث اور سیلاب بلا کے بیچ اسلام کا علم بلند رکھا تھا۔

(ج) خثعم

خثعم اور بجیلہ کے درمیان خون کی رشتہ داری کے بہت مضبوط تعلقات تھے اور خیال یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی بھی تھے۔ لیکن اس کا ایک حصہ قحط و قلت آب کی بنا پر اپنے علاقہ کو چھوڑ کر نجد میں تربہ کے مقام پر جا بسا تھا۔ جیسا کہ واقدی کا بیان ہے[16]۔ وہ شاید تبالہ کے علاقے میں بھی بس گئے تھے۔ جو طائف کے نواح میں تھا۔ بہرحال اصل قبیلہ جنوب ہی

میں سکونت پذیر رہا تھا۔ اسلام سے اس کے ابتدائی تعلقات کے بارے میں ہمیں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ غالباً فتح مکہ کے بعد ان میں اسلام کی تبلیغ شروع ہوئی تھی۔ اور سنہ ۱۰ھ / ۶۳۱ء تک ان میں معتد بہ مسلم آبادی ہو گئی تھی ابن سعد کے بیان کے مطابق ان کا ایک وفد جو متعدد اشخاص پر مشتمل تھا۔ سنہ ۱۰ھ کے آغاز اور سنہ ۶۳۱ء کے وسط میں آیا تھا جنہوں نے اسلام کے قبول کرنے کا اظہار کیا تھا"[17] اس قبیلہ کے انفرادی اور گروہوں میں قبول اسلام کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں تاہم متعدد خثعمیوں کے مکہ میں مسلمان ہونے کے واقعات ضرور مذکور ہیں۔ خیال یہ ہے کہ یہ قبیلہ بھی جلد ہی مسلمان ہو گیا تھا کیونکہ اس کے ردہ وارتداد میں شمولیت وشرکت کے بارے میں بھی ماخذ خاموش ہیں اور یہ اس کے مسلمان ہونیکا ایک بالواسطہ ثبوت ہے

(د) ہمدان

ہمدان بھی ماہرین انساب کے مطابق بجیلہ اور خثعم کے خون کے رشتہ دار اور عزیز تھے۔ لیکن ان دونوں سے ان کے تعلقات کشیدہ اور ناشگفتہ تھے"[18] اس کے ایک ابتدائی مسلم حضرت قیس بن مالک بن سعد تھے۔ جنہوں نے ہجرت سے کافی پہلے مکی عہد میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ روایات کی تواتر کے ساتھ شہادت ہے کہ وہ اپنے قبول اسلام کے بعد واپس اپنے علاقے میں چلے گئے تھے اور انہوں نے ہمدان کے لوگوں میں ایک نومسلم کے جوش و ولولے اور لگن سے تبلیغ کی تھی اور بالآخر اس کے کئی گھرانوں کو مسلمان بنالیا تھا"[19] ابن حزم کے مطابق اس کے ایک اور مسلم صحابی حضرت ضمام بن زید تھے جن کا تعلق اس کے ایک گھرانے بنو الحارف سے تھا"[20] ہمدان کا قبیلہ سنہ ۱۰ھ / ۶۳۱ء کے لگ بھگ پورا مسلمان ہو گیا تھا۔ کیونکہ کم از کم اس کی تین شاخوں کے بارے میں یہ روایت ہے کہ ان میں مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی:

بنو الخارف تو تقریباً پورے مسلمان ہو چکے تھے اور حضرت مالک بن نمط کو ان کا مقامی سردار و منتظم مقرر کیا گیا تھا دوسرا گھرانا بنو شاکر کا تھا جس کی ریاست وقیادت حضرت عامر بن شہر کو عطا کی گئی تھی۔ اور تیسری شاخ تھی۔ بنو ارحب کی جس میں کافی مسلمان تھے اور جس کے سردار حضرت قیس بن مالک تھے"[21]

ابن حزم نے ہمدان کے ایک غیر معروف گھرانے بنو ربیعہ بن مالک کے ایک مسلم کا نام شکل بن حمید بتایا ہے اور بنو ارحب کے ایک اور مسلم کا قیس بن نمط جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کتاب (نامۂ مبارک) عطا فرمایا تھا۔[22]

مجموعۃ الوثائق نے ہمدان کے کم از کم پندرہ گھرانوں میں کافی مسلم آبادی کا ذکر کیا ہے"[23] رعین، معافر اور ہمدان کے اقیال (حکمرانوں) کے نام عام طور سے اور رعین کے حکمران کے نام خاص طور سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط ارسال فرمائے تھے۔ ان سے ان قبیلوں میں بڑے پیمانے پر قبول اسلام کا ثبوت ملتا ہے"[24] غالباً سرداروں اور اقیال نے اسلام قبول کرنے میں پہل کی تھی۔ اور ان کی رعایا نے ان کی تقلید کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو مزید خطوط جو مرآن کے سردار حضرت عمیر اور مسلمانان ہمدان کے نام ہیں ثابت کرتے ہیں کہ غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد سنہ ۹ھ کے اواخر میں ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا"[25] طبری کا واضح بیان ہے کہ سنہ ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں حضرت علی کی مہم کے نتیجہ میں ہمدان کے باقی ماندہ لوگوں

نے ایک ہی دن میں اسلام قبول کر لیا تھا۔"[26]

(س) حِمیَر

حمیر کا قبولِ اسلام ہمدان کے لوگوں کے قبولِ اسلام کا ایک طرح سے تتمہ و تکملہ تھا۔ مآخذ کا بیان ہے کہ حمیر کے بادشاہوں (ملوک اور اقیال) حضرت حارث بن عبد کلال، حضرت نعیم بن عبد کلال اور حضرت زرعہ ذو یزن نے متعدد دوسرے اقیال کے علاوہ حضرت مالک بن مُرارہ رُہاوی کو اپنا سفیر بنا کر خدمتِ نبوی میں بھیجا۔ موصوف ایک وفد کے ساتھ رمضان ۹ھ/دسمبر ۶۳۰ء میں مدینہ منورہ پہنچے اور بارگاہِ نبوی میں نہ صرف اقیال اور حکمرانوں بلکہ حمیر کے تمام لوگوں کے قبولِ اسلام کا اقرار و اعلان کیا۔"[27] واقدی کے بیان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ متعدد اقیال حمیر نے اپنے اپنے سفیر دربارِ رسالت میں خود بھیجے تھے اور اپنے لوگوں کے قبولِ اسلام کا دعویٰ پیش کیا تھا۔ ان کی درخواست پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن سعید اموی کو ان کے علاقے کا مرکزی منتظم، مبلغ اور معلم بنا کر بھیجا تھا جنہوں نے صنعا میں رہ کر ان کی تعلیم و تربیت کی تھی"[28] ابن سعد کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کم از کم دو اور قاصد اور سفیر و حاکم بھیجے تھے۔ یہ تھے حضرات عیاش بن ربیعہ اور اقرع بن عبد اللہ حمیری"[29] مؤخر الذکر صحابی غالباً قبیلہ حمیر کے ایک ابتدائی مسلمان تھے اور قیاس کہتا ہے کہ وہ خود اقیال کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دونوں کو زُرعہ اور مرّان کے سرداروں اور حمیر کے عوام کے پاس دو مکتوبوں کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطوط و فرامین میں ان کے غیر مشروط اور پُرخلوص اسلام کی تعریف و توصیف فرمائی تھی اور ان کو اسلام کے بنیادی اصول کی تعلیم بھی دی تھی"[30] یہ حقیقت بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ ہمدان اور حمیر کے لوگ اور ان کے حکمران اپنی مرضی اور آزادی سے اسلام کے حلقہ بگوش بنے تھے اور ان کو مسلمان بنانے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے فرستادہ مبلغین کو کوئی خاص کوشش نہیں کرنی پڑی تھی۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جنوبی عرب میں خود وہاں کے مبلغین اور مسلمان اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے زمین ہموار کر کے ان کو اسلام کی حقانیت و صداقت کا معترف بنا چکے تھے اور ذرا سی کوشش نے ان کو امتِ اسلامی کا مخلص اور ثابت قدم رکن بنا دیا تھا۔ اس بنا پر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ حمیر اور ہمدان کے تمام لوگ ردہ کے زمانے میں اسلام پر ثابت قدم اور اسلامی ریاست کے وفادار رہے تھے۔

(ط) مَذحِج

مذحج جنوبی عرب کا غالباً سب سے بڑا قبیلہ تھا۔ وہ ایک قبیلہ کے بجائے متعدد قبیلوں کا مجموعہ تھا۔ کیونکہ اس کے متعدد و مختلف بطون بجائے خود قبیلے بن گئے تھے۔ ان میں عَنس، مراد، سَعد العشیرہ، جُعفی، زُبید اور اَود وغیرہ شامل تھے پھر سعد العشیرہ کے خاصے اہم بطون/گھرانے تھے۔"[31] ان میں سے کچھ گھرانوں کا اسلام سے تعارف مکی عہد قدیم میں ہی ہو گیا

تھا۔ جبکہ بعض دوسرے فتح مکہ تک منتظر رہے تھے۔ مذحج کے مکہ والوں سے خاصے قریبی تعلقات تھے اور ان کے بہت سے افراد مکہ میں بس گئے تھے۔ ان "مہاجرین" نے اکثر و بیشتر اسلام قبول کر لیا تھا اور وہ بھی آغاز عہد اسلامی ہیں۔۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ممتاز صحابہ کرام جیسے حضرات یاسرؓ، ان کی اہلیہ سمیہؓ، ان کے تین فرزند عمارؓ، حریثؓ اور عبد اللہؓ، اس قبیلہ کے گھرانے بنو عنس کے قدیم ترین مسلمان تھے[32]۔ لیکن چونکہ ان لوگوں نے اپنا قبیلہ اور علاقہ چھوڑ کر مکہ میں گھر بنا لیا تھا۔ لہٰذا ان کے اسلام کا ان کے اصل قبیلہ پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ اسی طرح زبید کے ایک گھرانے کے افراد جن کا تعلق حضرت محمیہ بن جزء زبیدی کے خاندان سے تھا۔ مکی عہد قدیم میں مسلمان ہو گئے تھے[33]، وہ بھی مکہ کے باسی اور قریش کے خاندان بنو جمح کے حلیف تھے۔ جبکہ حضرت عمار بن یاسر عنسی کا گھرانا بنو مخزوم کا حلیف تھا۔

اگر مکہ کے باسی مذحجی باشندوں کے قبول اسلام کا اثر مذحج کے اصل قبیلہ پر نہیں پڑا تھا۔ تو ان کے اپنے نمائندے مکہ سے اسلام کی سوغات لیکر گئے تھے۔ ذکر آچکا ہے کہ قبائل عرب کے زائرین مکہ میں خانہ کعبہ کی زیارت اور طواف کے لئے سال بھر آتے رہتے تھے۔ ایسی ہی کسی زیارت کے دوران سعدہ العشیرہ کے ایک شخص مسلمان ہو گئے اور جب مکہ سے وطن لوٹے تو وہ اسلام کے علمبردار و مبلغ تھے۔ ان کی انتھک اور مسلسل کوششوں سے سعدہ العشیرہ میں اسلام کے قدم جم گئے[34]۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود مذحج اور اس کے اہم بطون کافی طویل مدت تک بطور قبیلہ اسلام کے دائرے کے باہر ہی رہے۔ بہر حال وہ ۱۰ھ میں حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی اور حضرت خالد بن ولید مخزومی جیسے مبلغین اسلام کی دعوت و تبلیغ کے بعد مسلمان ہوئے تھے[35]۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذحج کے قبیلوں اور خاندانوں کے قبول اسلام کا جائزہ الگ الگ خاندانوں کے اعتبار سے لیا جائے۔

(۱) بنو عنس

عنس کے کچھ افراد اگرچہ آغاز کار ہی میں اسلام سے مشرف ہو چکے تھے۔ لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ اصل قبیلہ اسلامی امت کا رکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری برس میں بنا تھا۔ بنو عنس کے انفرادی اور اجتماعی قبولِ اسلام کی مثالیں کمیاب ہیں۔ لیکن یہ امر کہ ان کا ایک وفد حضرت ربیعہ کی قیادت میں بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا تھا اور اپنے اسلام کا اقرار کیا تھا۔ ان کے قبول اسلام کی طرف اشارہ کرتا ہے[36]۔ کچھ مدت کے بعد ایک مرکزی منتظم اور عامل صدقات صنعا بھیجا گیا تھا۔ جہاں بنو عنس آباد تھے[37]۔ یہ ان کے اسلام کا ایک اور ثبوت ہے۔ لیکن بعض جدید مؤرخین عہد نبوی میں عنس اور مذحج کے قبول اسلام کے سرے سے منکر ہیں اور ان کی واحد دلیل یہ ہے کہ اسود عنسی نے حیات نبوی میں ہی نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور مدینہ کی اسلامی ریاست کے خلاف مذحج ہی کے ایک طبقہ کے تعاون اور مدد سے بغاوت کر دی تھی[38]۔ لیکن ان کا یہ نظریہ واقعات و حقائق کی روشنی میں ثابت نہیں ہوتا ہے۔ ان مستشرقین اور جدید مؤرخین کو بھی اعتراف ہے کہ اسود عنسی اور اس کی بغاوت کا خاتمہ حیات نبوی ہی میں خود اسی کے لوگوں نے یمن کے ایرانی

باشندوں کی مدد سے کر دیا تھا اور اسلامی ریاست کی حکمرانی پھر سے قائم کر دی تھی۔ اسود عنسی کا خاتمہ کرنے والے اور مدینہ منورہ کی حکومت کو پھر سے قائم کرنے والے ظاہر ہے کہ مسلمان تھے۔ اس سلسلے میں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ خود اسلامی ریاست و حکومت نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے کوئی فوج نہیں بھیجی تھی۔ مآخذ سے واضح ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد وفادار مسلمانوں کے طبقات اور ان کے سرداروں کو خطوط لکھے تھے اور انکو اسود عنسی کا خاتمہ کرنے اور اس کی مرکز مخالفت تحریک کو کچلنے کا حکم دیا تھا۔ اور انہوں نے اس کی بجان و دل تعمیل کی تھی۔ لہٰذا بلا ریب یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذحج اور عنس میں خاصا طاقتور طبقہ مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ جو عارضی طور سے اسود عنسی کی بغاوت اور اقتدار سے معطل ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کے حامیوں نے یمن کے مسلمان گورنر حضرت شہر بن باذان کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن جونہی مسلم طبقات اس عارضی صدمے سے سنبھلے (اور ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط و فرامین نے بھی سنبھلنے میں خاصی مدد دی تھی) انہوں نے بیک آن و حملہ اسود عنسی اور اس خطرہ کا خاتمہ کر کے اسلام کی حکمرانی کو پھر سے حیات تازہ عطا کر دی۔[۳۹]

(۲) بنو مراد

مراد کے لوگ بھی مذحج کے دوسرے خاندانوں کی مانند کافی بعد کے زمانے میں غالباً حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کی مذکورہ بالا مہم یمن کے بعد ہی اسلام کے ماننے والے بنے تھے۔ طبری کا یہ بیان خاصا اہم ہے کہ ہمدان کے قبول اسلام کے بعد یمن کے باقی خاندانوں اور قبیلوں نے اسلام قبول کرنے میں خاصی تیزی دکھائی تھی۔[۴۰] طبری ہی کا دوسرا بیان ہے کہ مراد کے ایک طاقتور ترین سردار حضرت فروہ بن مُسیک مرادی نے سنہ ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں بارگاہ نبوی میں حاضری دی تھی اور انہوں نے نہ صرف اپنے اسلام کا اعلان و اقرار کیا تھا۔ بلکہ اپنے قبیلہ کی جانب سے بھی ذمہ داری قبول کی تھی یا اس کے قبول اسلام کی یقین دہانی کرائی تھی۔[۴۱] لیکن ہمارے بعض مشکل پسند جدید مستشرقین کا خیال ہے کہ حضرت فروہ بن مسیک مرادی کا قبول اسلام اپنے ابتدائی زمانے میں محض ایک سیاسی مفاہمت تھی اور مدینہ کی اسلامی ریاست سے صرف ایک سیاسی اتحاد کیونکہ ان کے اپنے حلیف کندی بادشاہوں نے مراد اور ہمدان کے درمیان باہمی خانہ جنگی میں ان کے قبیلہ کی مدد نہیں کی تھی اس لیے وہ ہمدان اور اپنے دوسرے حریفوں کے خلاف اسلامی ریاست کی امداد و اعانت اور سیاسی اتحاد کے ذریعہ اپنی طاقت کو مستحکم کرنا چاہتے تھے۔[۴۲] اگر یہی سیاسی صورتحال تھی اور ان کا قبول اسلام محض ایک سیاسی اتحاد تھا تو ان کے حریف و رقیب قبیلہ کو تو مخالف گروہ یا اتحاد میں ہونا چاہیے تھا یا کم از کم وہ خود اپنے دشمن کے سیاسی اتحادیوں سے اتحاد نہ کرتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے حریف ہمدان بھی ریاست اسلامی کے حلیف، اتحادی اور وفادار بن چکے تھے۔ پھر فروہ بن مُسیک مُرادی کو اس اتحاد سیاسی سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟ مستشرقین کی دلیلوں اور دعوؤں کا اندرونی تضاد ان کے خیال خام کی تردید کے علاوہ ثابت کرتا ہے کہ دونوں متحارب گروہوں کو پائیدار

امن کی تلاش تھی جوان کو بالآخر اسلام کے سایۂ عاطفت میں ملا اور وہ دونوں ہی اسلام کے حامی و ہمنوا اور ریاست اسلامی کے وفادار و اتحادی بن گئے۔ اس سے نہ صرف حضرت فروہ بن مسیک کے حسن اسلام کی توثیق ہوتی ہے۔ بلکہ ان کے قبیلے کے قبول و اخلاص اسلام کی بھی۔ دوسرے شواہد کے علاوہ [43] اس حقیقت سے بھی مراد کے حسن و قبول اسلام کی تائید ہوتی ہے کہ ردّہ کے زمانے میں حضرت فروہ اور ان کے قبیلہ والے نہ صرف اسلام پر ثابت قدم رہے تھے بلکہ انہوں نے اسود عنسی کی تحریک بغاوت کو کچلنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا [44] انہی مآخذ کا یہ بھی بیان ہے کہ حضرت فروہ بن مسیک مرادی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قبیلہ مراد کے علاوہ زبید اور پورے مذحج کا مقامی منتظم اور عامل صدقات مقرر کر دیا تھا اور وہ پوری دیانت داری خلوص اور لگن کے ساتھ صدقات مدینہ بھیجتے رہے تھے اور ان پہلے اور پکے مسلمان امراء میں سے تھے جنہوں نے ردّہ کے پرہول زمانے میں بھی اپنے فرائض سے غفلت نہیں برتی تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے ان عہدوں پر خلافت فاروقی کے اواخر تک فائز رہے تھے [45]

(۳) سعد العشیرہ

ذکر آچکا ہے کہ سعد العشیرہ اسلام سے کئی عہد قدیم ہی میں متعارف ہو چکے تھے۔ ابن حزم نے ان میں متعدد صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق ان کے متعدد بطون اور گھرانوں سے تھا۔ حضرت مالک بن مشوف بنو عائذ کے سردار و رئیس تھے۔ ان کے علاوہ حضرت عبید بن حزن وغیرہ کئی مسلمانوں کا ذکر اس گھرانے میں ملتا ہے۔ [46]

جعفی

سعد العشیرہ کا نسبتاً ایک بڑا گھرانا تھا۔ جن میں اسلام ان کے اصل قبیلہ کے ساتھ ہی آیا تھا۔ ابن حزم نے اس خاندان کے متعدد مسلمانوں کا ذکر کیا ہے جو اپنے علاقہ کے ممتاز و سربرآوردہ حضرات تھے۔ ان میں سے متعدد نسبتاً ابتدائی دور کے مسلمان تھے۔ ان میں حضرت قیس بن سلمہ بن شراحبیل جو جعفی وفد کے ایک رکن تھے اور مدینہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کر چکے تھے۔ ابو سبرہ بن زید اور ان کے دو فرزند گرامی سبرہ اور عبدالرحمٰن ممتاز مقام کے حامل تھے [47] یہ ان جعفی مسلمانوں کے علاوہ تھے جو مدینہ ہجرت کر کے جا چکے تھے اور جنہوں نے غزوہ بدر میں شرکت کی سعادت حاصل کی تھی۔ یہ دراصل قریش مکہ کے حلفاء میں سے تھے۔ ان میں حضرت ابو خولی کے تین فرزند گرامی خولی، ہلال اور عبداللہ بدری صحابی تھے۔ ابن سعد نے اگرچہ بدری صحابہ کی فہرست میں صرف حضرت خولی کو شمار کیا ہے۔ تاہم اس کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابو خولی کا پورا گھرانا جو متعدد افراد پر مشتمل تھا ابتداء عہد نبوی ہی میں اسلام لا چکا تھا [48] بہر حال اصل قبیلہ میں فتح مکہ کے بعد سنہ ۹ھ / ۶۳۰ء میں یا اس کے بھی کچھ بعد حضرت قیس بن سلمہ جعفی کو مران، حریم اور کلاب کے قبیلوں اور ان کے موالی (حلیفوں) سے صدقات وصول کرنے کا افسر مقرر کیا گیا تھا [49]۔ ظاہر ہے کہ یہ سب لوگ اسلام لا چکے تھے۔

زبید

زبید کا قبول اسلام مذحج کے دوسرے خاندانوں یا مادر قبیلہ کی مانند حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کی مہم یمن کا نتیجہ تھا۔ جیسا کہ واقدی کا خیال ہے۔ اس کے مطابق زبید کا ایک خاصا بڑا حصہ مسلمان ہو گیا تھا اور انہوں نے اپنے ذمہ واجب الادا صدقات ادا کر دیئے تھے۔ اس سے زیادہ واقدی کا یہ جملہ دلچسپ ہے کہ تقریباً تمام کے تمام زبیدی حضرت علی سے قرآن کریم اور دین کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تھے[۵۰]۔ اپنے قبول اسلام کے بعد انہوں نے ایک وفد جو دس آدمیوں پر مشتمل تھا۔ عمرو بن معدی کرب کی قیادت میں بارگاہ رسالت میں مدینہ بھیجا تھا۔ اس وفد نے اپنے مسلمان ہونے کا اقرار و اعلان کیا تھا اور اسلامی ریاست سے مکمل وفاداری کا حلف اٹھایا تھا۔[۵۱]

زبید کا ایک طبقہ جو قیس بن مکشوح کی قیادت میں تھا۔ بہرحال کافی مدت تک اسلام کے دائرے سے خارج رہا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ عمرو بن معدی کرب کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عہدہ نہیں عطا فرمایا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے قبیلہ کے ایک سردار تھے۔ ذکر آ چکا ہے کہ زبید کے لئے بھی مراد کے ایک شخص کو عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ عمرو بن معدی کرب وطن لوٹ آئے تھے اور وفات نبوی کے بعد نہ صرف مرتد ہو گئے تھے۔ بلکہ انہوں نے ردّہ تحریک میں خاصا مؤثر اور فعال کردار بھی ادا کیا تھا۔[۵۲] ان کے ارتداد کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ پورا قبیلہ اسلام سے پھر گیا تھا۔ جیسا کہ مستشرقین نے نتیجہ نکالا ہے یہ صحیح ہے کہ ان کے زیر اثر لوگوں نے ارتداد میں حصہ لیا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے قبیلہ کے زیادہ لوگوں نے ان کی مخالفت کی تھی اور مدینہ کے نمائندے اور منتظم و عامل صدقات حضرت فروہ بن مسیک مرادی کی مدد کی تھی۔ یہ قابل ذکر بات ہے کہ انہوں نے اپنے ہی بھائی بندوں کے خلاف اسلامی ریاست کی امداد و اعانت کی تھی اور یہ ان کے خلوص اسلام کی ایک عظیم و روشن دلیل تھی اور اس سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ حضرت عمرو بن معدی کرب پھر اسلام لے آئے تھے

رُہاء

رہاء مذحج کا ایک اور اہم قبیلہ تھا اور وہ بھی حیات نبوی کے آخری برس میں اسلام کا حلقہ بگوش بنا تھا۔ انہوں نے اسلام اور اسلامی ریاست سے وفاداری کے اظہار کے لئے متعدد آدمیوں (نفر) پر مشتمل ایک وفد بارگاہ نبوی میں بھیجا تھا[۵۴]۔ ماخذ کے ایک تبصرہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رہاء کے لوگ اشعر کے پڑوسی تھے۔ اور ان کے اسلام کے زیر اثر کچھ رہاوی افراد بھی مسلمان ہو گئے تھے چنانچہ تین رہاوی صحابیوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعریوں کے ساتھ خیبر کی پیداوار سے حصہ عنایت فرمایا تھا[۵۵]۔ عام خیال ہے کہ یہ حصہ ان کو ۷ھ میں مدینہ آنے پر دیا گیا تھا۔ لیکن اشعریوں کے ساتھ ان کو شامل کرنے سے یہ خیال زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تینوں ابتدائی مسلم تھے۔ جو حضرت ابو موسیٰ اشعری کی تبلیغ و دعوت پر اسلام لائے تھے اور پھر انہی کے ساتھ مدینہ ہجرت کر گئے تھے۔ بہرحال اس قبیلہ / خاندان کے سب سے نمایاں صحابی بلاشک و شبہہ

حضرت مالک بن مرارہ رہاوی تھے۔ جن کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ ابن حزم نے دو اور رہاوی مسلمانوں حضرات عمرو بن سُبَیع اور یزید بن شجرہ کے نام بھی صحابہ کرام میں شمار کئے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر اپنے قبیلہ کے وفد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لئے مدینہ گئے تھے۔ جبکہ مؤخر الذکر صحابی کا ذکر حضرت معاویہ کے حامی صحابہ میں کیا گیا ہے۔ جو صفین کی جنگ میں شریک تھے۔[۵۶]

صُداء

مذحج کا ایک بڑا قبیلہ / بطن ضخم صداء تھا۔ اور ابن سعد کے مطابق اس نے بھی اسلام اپنے مادر قبیلہ کے ساتھ قبول کیا تھا، اگرچہ اس کے کسی مسلمان کا نام مؤرخ موصوف نے نہیں بیان کیا ہے۔ بہرحال اسد الغابہ سے کم از کم ایک صحابی حضرت حَبّان بن بُحّ کا ذکر ملتا ہے جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مقامی قبیلہ کا عامل صدقات مقرر کیا تھا۔ لیکن انہوں نے اس کار منصبی کے لئے اپنے کو اہل نہیں سمجھا تھا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معذرت کر لی تھی۔[۵۷]

نَخَع

نخع بھی مذحج کا ایک کافی بڑا بطن / خاندان تھا۔ وہ اسلام کا حلقہ بگوش اپنے مادر قبیلہ کے ساتھ ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں بنا تھا یہ اہم بات ہے کہ مآخذ اس کے وفد کی آمد مدینہ کی بالکل متعین تاریخ بیان کرتے ہیں۔ ان کے مطابق نخعی وفد غالباً سب سے آخری تھا۔ جو مدینہ میں ۱۵ محرم ۱۱ھ / ۱۰ اپریل ۶۳۲ء میں پہنچا تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت ارطاۃ بن شراحیل اس کے قائد تھے۔ مگر طبری کا خیال ہے کہ حضرت زرارہ بن عمرو اس کے سربراہ تھے۔[۵۸] یہ امکان ہے کہ نخع نے دو وفود بارگاہ نبوت میں بھیجے ہوں جیسا کہ بعد کے ایک ماخذ سے محسوس ہوتا ہے۔[۵۹] یہ بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ نخع کے وفد کے ارکان کی تعداد دو سو نفوس سے زیادہ تھی اور یہ ان کے قبولِ اسلام بلکہ مکمل قبول اسلام کا ایک بڑا ثبوت ہے۔ اگرچہ نخعی مسلمانوں کے زیادہ نام مآخذ میں مذکور نہیں۔ تاہم ان کے متعدد مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے حضرات جُمیش بن یزید، ارقم بن کعب، زرارہ بن قیس اور قیس بن عمرو کافی ممتاز لوگ تھے۔[۶۰] مگر مونٹگمری واٹ کو اصرار ہے کہ وہ سب عیسائی تھے۔

بنو الحارث بن کعب

بنو الحارث بن کعب بھی مذحج کے ایک بطن کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور خاصے بڑے قبیلے کے لوگ تھے اور ایک آزاد قبیلہ بن گئے تھے۔ ان کا ایک ذیلی خاندان بنو عبد المدان تھا جو بجائے خود قبیلہ تھا۔ جنوبی عرب میں ان دونوں مذحجی گھرانوں کو ممتاز مقام حاصل تھا۔[۶۱] یہ بات اہم اور دلچسپ بھی ہے کہ بنو مذحج میں بنو الحارث بن کعب عام طور سے اور بنو عبد المدان

خاص طور سے پہلے قبائل یا بطون تھے جنہوں نے اسلام میں سبقت کی تھی۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ان دونوں خاندانوں نے حضرت خالد بن ولید مخزومی کی دعوت و تبلیغ پر اسلام قبول کیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کو حضرت علی بن ابی طالب کی مہم یمن سے کوئی چھ ماہ پہلے بھیجا تھا جو عموماً نجران کی مہم کہلاتی ہے یہ کوئی فوجی مہم نہیں تھی بلکہ مذہبی جماعت تھی جو تبلیغ اسلام کی خاطر بھیجی گئی تھی۔ روایات کا اتفاق ہے کہ پورا قبیلہ بنو الحارث معہ بنو عبد المدان کے حضرت خالد کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ ہدایات نبوی کے مطابق حضرت خالد نے کافی طویل عرصے تک ان کے بیچ قیام کیا تھا اور ان کو دین کی تعلیم دی تھی اور ان کی پاکیزہ تربیت بھی کی تھی۔ پھر مدینہ سے آنے والی نئی ہدایات کے مطابق حضرت خالد بن ولید مخزومی نے ان کے سربرآوردہ لوگوں پر مشتمل ایک وفد بارگاہ نبوی میں بھیجا تھا۔ جہاں انہوں نے اپنے اسلام کا پھر سے اقرار کیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید مخزومی کی پر خلوص، انتھک اور کامیاب کوششوں کی تعریف و تحسین فرمائی تھی [62] ہمارے مسلم مؤرخین اس روایت کو عموماً نظر انداز کر دیتے ہیں اور حضرت خالد بن ولید پر ناکامی کا الزام محض اس لئے تھوپ دیتے ہیں کہ وہ یمن میں اشاعت اسلام کا سارا شرف حضرت علی بن ابی طالب کو دینا چاہتے ہیں [63] بہر حال کچھ مدت بعد وفد کے ایک ممتاز رکن حضرت قیس بن حصین کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ کا مقامی منتظم اور سردار مقرر کیا تھا [64] یہ بطن یا خاندان خاصا بڑا تھا کیونکہ اس کے متعدد ذیلی گھرانوں جیسے بنو الضباب، بنو قنان، بنو عبد یغوث، اور بنو زیاد وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ بہر حال یہ سب گھرانے بھی عہد نبوی ہی میں مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے [65]

خولان

خولان کا اگرچہ مذحج سے نسبی تعلق نہیں تھا۔ لیکن وہ دوسرے سماجی اور معاشی اسباب سے مذحج ہی سے وابستہ تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ خولان کا اصلی قبیلہ اور اس کی تمام ذیلی شاخیں ۱۰ھ پہلے نصف / ۶۳۱ء کے نصف ثانی میں اسلامی امت کی رکن بن گئی تھیں۔ اس سال شعبان میں ان کے دس سربرآوردہ و ممتاز افراد پر مشتمل ایک وفد بارگاہ نبوی میں پہنچا تھا۔ جس نے اپنے اسلام کے اظہار و اقرار کے علاوہ اپنے قبیلہ کی جانب سے بھی دعویٰ کیا تھا [66] یہ بڑی عجیب بات ہے کہ مآخذ اس قبیلہ میں اسلام کی تبلیغ و تدریج کی رفتار، نہج اور انداز وغیرہ سے متعلق تفصیلات کو نہیں بیان کرتے ہیں۔ لیکن ردہ کے زمانے میں ان کے ایمان و عقیدے کی مضبوطی۔ اسلام سے غیر متزلزل وفاداری اور اسلامی حکومت و ریاست کی بیش بہا خدمات کے لئے ان کی بے انتہا تعریف و توصیف کرتے ہیں [67] بہر حال اس سے بالواسطہ اور مضمر انداز میں سہی یہ تو معلوم و ثابت ہو جاتا ہے کہ خولان کے تمام خاندان اور گھرانے عہد نبوی ہی میں اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے تھے۔ ان کے قبول اسلام کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعدد افراد کو خاص کر حضرت معدی کرب بن ابرہہ اور حضرت ابی ملوک بن عبد رضا کو قطائع (اراضی) کے عطیات عطا فرمائے تھے۔ [68]

– – – – – – – – – – –

(ع) نہد

نسبی اعتبار سے بنو نہد کا تعلق قبیلہ قضاعہ سے تھا۔ جو زمانہ جاہلیت میں کسی وقت شمالی عرب میں ہجرت کر گئے تھے اور مدینہ منورہ کے شمال میں جا بسے تھے۔ لیکن بنو نہد کا خاندان جنوبی عرب کے اپنے روایتی علاقے میں مقیم رہا تھا وہ یمن میں نجران کے نواح میں آباد تھے اور اس طرح بنو الحارث بن کعب کے پڑوسی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ نہد خود ایک قبیلہ بن گیا تھا جس کے اپنے متعدد بطون / خاندان تھے[٦٩]۔ نہد کے اصل قبیلے یا اس کے ذیلی خاندانوں کے قبول اسلام کے بارے میں ہمیں براہ راست معلومات نہیں ملتی ہیں۔ مگر جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کے نام بعض خطوط و فرامین سے ان کے قبول اسلام خاص کر ان کے ایک خاندان بنو قرۃ کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کا علم ہوتا ہے۔ ان خطوط میں نہد کے لوگوں کے لئے وہ تمام فرائض و واجبات بیان کئے گئے ہیں جو مسلمانوں پر ہی عائد ہوتے ہیں۔ مثلاً نمازیں قائم کرنا، صدقات بشمول زکوٰۃ ادا کرنا وغیرہ لیکن جو جملہ یا حکم نبوی ان کے مسلمان ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے وہ یہ کہ مشرکوں سے وہ کلی طور پر اجتناب کریں اور ان سے کسی قسم کا اختلاط نہ رکھیں۔ اس کے علاوہ مصنفہ اہم ان کے بعض مسلمانوں کے نام سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ ان کے قبول اسلام کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بعض افراد کو ان کے اپنے علاقے میں بعض قطائع عطا فرمائے تھے[۷۰]۔

(ف) ازد

دراصل ازد ایک بہت بڑے اور عددی لحاظ سے طاقتور قبیلہ کا نام تھا۔ جس کی متعدد شاخیں متعدد مقامات پر مختلف زمانوں میں آباد ہوتی رہی تھیں[۷۱]۔ چنانچہ وہ اپنے علاقوں کی نسبت سے پکاری جاتی تھیں جیسے ازد یمن، ازد جرش، ازد عمان، ازد شنوءہ وغیرہ، ان کی دو تین اہم شاخیں جنوبی عرب میں آباد تھیں۔ ان میں سے ازد جرش نجران کے عیسائیوں کے قریبی پڑوسی تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مؤخر الذکر بھی نسبی لحاظ سے ازد ہی کی ایک شاخ تھے۔ ان کے علاوہ ازد یمن کی دوسری اہم شاخیں اور خاندان تھے۔ بنو غامد، بنو بارق اور بنو غافق وغیرہ

ہمارے ماخذ کا بیان ہے کہ سنہ ۱۰ھ / ۶۳۱ء تک ازد یمن کا اصل قبیلہ معہ اپنی ذیلی شاخوں اور بطون کے اسلام کا حلقہ بگوش ہو گیا تھا[۷۲]۔ ان کے سب سے پہلے مسلمان غالباً حضرت صُرَد بن عبداللہ ازدی تھے۔ جنہوں نے اپنے قبیلے کو مسلمان بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اس کے کچھ مدت بعد وہ اپنے قبیلہ کے اسلام اور اسلامی ریاست سے وفاداری اور شرائط استواری کا اظہار کرنے کے لئے مدینہ منورہ کو ایک وفد لیکر گئے تھے جس میں دس مسلم حضرات شامل تھے۔ انہوں نے صرف اپنے اسلام کا اعلان و اقرار نہیں کیا تھا بلکہ اپنے پورے خاندان کے اسلام کا اعلان و اقرار بھی کیا تھا۔ اسلام کے لئے ان کی شاندار خدمات کے عوض ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ کا سردار مقرر کر دیا تھا۔ اس اعتراف خدمات اور اظہار پسندیدگی رسولؐ نے ان میں

اسلام کی پرجوش تبلیغ کرنے کا ایک نیا ولولہ جوش اور جذبہ پیدا کر دیا تھا اور انہوں نے ازدِ جرش کو مسلمان بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ چنانچہ انہوں نے نہ صرف بقیہ ازدِ جرش کو بلکہ خثعم کے بھی ایک حصہ کو اسلامی امت کا مخلص رکن بنا دیا تھا" کچھ مدت بعد ازدِ جرش کا ایک اور وفد بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا۔ جس نے ان دونوں قبیلوں کے مکمل قبول اسلام کی تصدیق کی تھی۔ بعض اراکین وفد کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قطائع اور اراضی انہی کے علاقوں میں عطا فرمائی تھی۔ مذکورہ بالا تینوں خاندان / بنو غامد، بنو بارق اور بنو غافق...... نے اسلام قبول کر لیا تھا اور مدینہ منورہ کو اپنے وفود بھیجنے میں بڑی تیزی دکھائی تھی۔ ان کے اور بعض دوسرے ازدیوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو گرامی نامے عطا کئے تھے۔ ان کے متون سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سب مسلمان ہو گئے تھے۔ ازد اور خاص کر اس کے خاندان بنو بارق کے بعض سربرآوردہ لوگ تھے حضرات ضماد و جنادہ، ابو ذبیان اور عمرو بن عبد اللہ وغیرہ ۵" ان کے نام خطوط نبوی سے ان کے قبول اسلام کے بارے میں کوئی شک و شبہہ نہیں رہ جاتا ہے۔

ازدِ یمن کے قبول اسلام پر بحث کے ضمن میں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس کے صرف کافر و مشرک طبقات ہی نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ بلکہ نجران کے عیسائیوں اور یمن کے یہودیوں نے بھی یہ شرف حاصل کیا تھا، خواہ ان کی تعداد کتنی ہی مختصر کیوں نہ رہی ہو۔ واقدی کا دعوٰی ہے کہ یہودِ یمن کے عظیم عالم حضرت کعب الاحبار حضرت علی بن ابی طالب کی دوسری مہم کے دوران مسلمان ہو گئے تھے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ حضرت کعب نے پھر دعوت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی تھی۔ اور اپنے متعدد ہم مذہبوں کو مسلمان بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے"" یہ بھی اہم نکتہ ہے کہ جزیرہ نمائے عرب سے جب یہود جلا وطن کئے گئے تھے، تو ان میں یہودِ یمن کا ذکر نہیں ملتا ہے، جبکہ نصاریٰ نجران کا واضح حوالہ موجود ہے۔

(ک) کندہ

ازد کی طرح کندہ کی بھی متعدد شاخیں جزیرہ نمائے عرب کے مختلف مقامات پر آباد تھیں۔ ان میں شمالی عرب کی شاخیں بھی تھیں اور جنوبی عرب کی بھی۔ ہم نے اپنے ایک مباحثے میں دومۃ الجندل کی کندی مملکت کے اسلامی ریاست سے مذہبی اور سیاسی تعلقات کا جائزہ پہلے ہی لے لیا ہے۔ بہر حال اصل قبیلہ معہ اپنی اہم شاخوں اور خاندانوں (بطون) کے جنوب ہی میں آباد تھا جن میں بنو معاویہ، بنو وہب، بنو ربیش، بنو اشرس، بنو سکون اور سکاسک بڑے اور طاقتور خاندان تھے اور وہ یمن اور حضر موت کے متعدد مقامات پر آباد تھے""

جنوبی عرب کے دوسرے مقامات اور قبیلوں کی طرح قبیلہ کندہ میں بھی اسلام کی نشر و اشاعت کا آغاز فتح مکہ کے بعد ہی شروع ہو سکا، اگرچہ اس کے پہلے زمانے میں بعض انفرادی قبول اسلام کی مثالوں کے امکان کو قطعی طور سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے قبول اسلام کا اوّل قرینہ ان کے خاندان بنو سکون کے گھرانے بنو تجیب کے متعدد افراد پر مشتمل ایک وفد کے مدینہ میں آنے سے ملتا ہے۔ جو ۹ھ اول دنوں میں یا ۶۳۰ء کے وسط میں آیا تھا۔ ایک قابل ذکر اور اہم بات ان کے سلسلے

میں یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف زبانی طور سے اپنے قبول اسلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری کا اظہار کیا تھا بلکہ عملاً مظاہرہ یہ کیا تھا کہ اپنی قوم پر واجب صدقات کی رقم اور جانور ساتھ لے کر مدینہ پہنچے تھے۔[۷۸] کچھ مدت کے بعد اصل قبیلہ کا وفد جس میں ساٹھ ستر ارکان تھے۔ اپنے عظیم ترین اور باوقار ترین سربراہ و سردار حضرت اشعث بن قیس کندی کی قیادت میں حاضر ہوا تھا۔[۷۹] ان کے قبول اسلام اور وفاداری کا یقین ہو جانے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قبیلے بنو کندہ اور صدلیف کے لئے ایک مرکزی سردار و منتظم اور عامل صدقات مقرر فرمایا تھا۔ مؤخر الذکر قبیلے نے بھی اسی زمانے میں اسلام قبول کیا تھا اور اپنا وفد مدینہ بھیجا تھا۔ محمد بن حبیب بغدادی کے مطابق ان پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مہاجر بن امیہ کو عامل و امیر مقرر کیا تھا۔ اور موصوف نے ان کے صدقات وصول کر کے مدینہ پہنچائے بھی تھے۔[۸۰]

ابن حزم نے کندہ کے گھرانے بنو معاویہ کے چھ صحابہ کا ذکر کیا ہے: حضرات اشعث بن قیس، ان کے بھائی سیف بن قیس جو اس وفد کی زیارت کے دوران اپنے قبیلہ کے مؤذن بھی مقرر کئے گئے تھے، ابراہیم بن قیس، شُرَحبیل بن حسنہ، حُجر بن عدی اور شُریح بن مُرَّہ۔ بنو وَہب کے صحابہ کرام میں جو بنو معاویہ کی ایک ذیلی شاخ تھی اور حضر موت میں آباد تھی، کم از کم دو حضرات یزید اور ان کے والد اسود بن سلمہ کا ذکر ملتا ہے۔ بنو معاویہ ہی کے ایک اور گھرانے بنو شیطان میں، جن کا نام بعد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو عبد اللہ رکھ دیا تھا۔ کم از کم تین صحابیوں کا ذکر ملتا ہے وہ تھے: حضرات سائب بن یزید، کثیر بن صلت، امرؤ القیس بن عابس۔ موخر الذکر صحابی کی بے انتہا تعریف و توصیف ان کے ان شاندار کاموں کے لئے کی گئی ہے جو انہوں نے ردہ کے زمانے میں اسلام کے لئے انجام دیے تھے۔ خاندان بنو تجیب کے صرف ایک صحابی حضرت معاویہ بن حُدیج کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بنو تجیب ردّہ کے زمانے میں زیادہ تر وفادار مسلمان رہے تھے۔[۸۱]

اگرچہ سکاسک اور سکون کے بعض خاندانوں نے شمال میں نقل وطن کر کے بستیاں بسالی تھیں۔ تاہم ان کے تمام اہم خاندان اور گھرانے جنوب میں مقیم و آباد رہے تھے اور وہ بھی غالباً فتح مکہ کے بعد کسی وقت مسلمان ہوئے تھے۔ ۹ھ / ۶۳۱ء میں ان کے ایک خاندان بنو غوث کے ایک مسلم حضرت عُکاشہ بن ثور کا ذکر ملتا ہے کہ وہ ان پر مقامی منتظم اور عاملِ صدقات مقرر کئے گئے تھے۔[۸۲]

(ل)، حضر موت / حضارِمہ

ماہرین انساب کے مطابق حضر موت یقطان کے ایک بیٹے اور قحطان کے ایک بھائی کا نام تھا۔ بنو حضر موت یمن کے جنوب مشرق میں جزیرہ نمائے عرب کے بالکل آخری گوشے میں بستے تھے۔ جو بعد میں انہی کے نام سے منسوب ہو گیا۔[۸۳] اس قبیلہ / علاقہ کے سب سے پہلے مسلمان حضرت علاء بن حضرمی تھے[۸۴] دوسرے شریح حضرمی تھے۔[۸۵] لیکن وہ اپنے علاقہ کو چھوڑ کر مکہ یا مدینہ میں آباد ہو گئے تھے۔ اس لئے بنیادی طور پر ان کا اسلام ان کے قبیلہ کا نہیں تھا اور

نہ ہی ان کے اسلام کا اثر ان کے قبیلے پر پڑا تھا۔ بہر حال اصل قبیلہ میں اسلام کی اشاعت بعد کے زمانے میں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلامی امت کے رکن قبیلہ کندہ کے ساتھ بنے تھے کیونکہ وہ ان کے پڑوسی تھے۔ ابن حزم کے مطابق حضرت وائل بن حجرؓ اور حضرت ربیعہ بن جیدان حضرموت کے سربرآوردہ ترین لوگوں میں سے تھے جو اسلام سے مشرف ہوئے تھے[86]۔ تین مزید صحابہ۔ حضرات ربیعہ بن ذی المرحب، ربیعہ بن لکشعہ اور مسعود بن وائل ..... کے نام بھی اسی زمانے کے مسلمانوں میں گنائے جاتے ہیں[87]۔ بہر حال حضرت وائل بن حجر حضرموت کے اقیال (حکمرانوں / شہزادوں) میں سے ایک تھے جن کے قبول اسلام کا اثر ان کے لوگوں پر پڑا تھا اور وہ اپنے مسلمان قبیلہ والوں کا ایک وفد بھی لیکر سنہ ۹ھ/۶۳۱ء میں بارگاہِ رسالتمآب میں گئے تھے۔ ابن سعد کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرموت کے لوگوں کا قبول و اقرار اسلام دراصل ان کے حکمرانوں کے قبول اسلام کا نتیجہ تھا۔ بنو صدیف جو حضرموت کے لوگوں ہی کا ایک حصہ تھے۔ اسی زمانے میں ہی مسلمان ہوئے تھے۔ جیسا کہ ان کے وفد کی آمد سے ظاہر ہوتا ہے[88]۔

(م) الأبناء

الابناء کے لفظی معنی فرزندوں / بیٹوں کے آتے ہیں اور یہ لفظ اس ایرانی قوم کے لئے استعمال ہوتا تھا جو یمن میں مدتوں سے آباد تھے اور ایک طرح سے "دھرتی کے لال" تھے۔ حالانکہ وہ عرب قبائلی نظام کا کسی طور حصہ نہ تھے۔ لیکن ان پر بحث کئے بغیر جنوبی عرب میں اسلام کی ترویج و اشاعت کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ بہر حال وہ عہد نبوی کے معاصر (لوگ) تھے اور انہوں نے اسلامی ریاست اور اسلام کے لئے شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ یہ ایرانی طبقات یمن میں اس وقت سے آباد اور بسنا شروع ہوئے تھے جب جنوبی عرب کا یہ سرسبز و شاداب علاقہ ایران کی ساسانی سلطنت کا ایک ماتحت صوبہ بنا تھا۔ جس پر شہنشاہِ ایران ..... کسریٰ ..... اپنا گورنر مقرر کرتا تھا اور ظاہر ہے کہ اس دیار غیر میں اس کی مدد کے لئے ایک ایرانی فوج اور ایرانی عمال و افسروں کی ایک پوری جماعت بھیجی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ بہت سے ایرانی اس علاقے میں اس طرح رچ بس گئے کہ وہ یہیں کے باشندے اور فرزند سمجھے جانے لگے۔ عہد نبوی میں یمن کے ایرانی گورنر کا نام حضرت باذان یا باذام تھا اور وہ ۶۲۸ء میں شہنشاہ خسرو پرویز کے قتل کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر اسلام لے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے فرزند رشید حضرت شہر بن باذان کے علاوہ یقینی طور پر کچھ اور ایرانی بھی اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے تھے۔ اور کچھ مدت کے بعد تمام ایرانی طبقات اسلام کے مخلص پیرو اور اسلامی ریاست کے وفادار سپاہی بن چکے تھے[89]۔ مونٹگمری واٹ نے حضرت باذان یا ایرانی طبقات کے قبول اسلام اور اسلامی ریاست سے وفاداری کو صرف ایک سیاسی اتحاد قرار دیا ہے اور ان کے خلوص اسلام سے انکار کیا ہے[90]۔ لیکن مستشرق موصوف کا نظریہ و خیال غیر تاریخی اور غیر علمی ہے۔ انہوں نے ماخذ کی کثیر شہادتوں کو مسترد کر کے اپنے نظریہ کی بنیاد محض ظن و قیاس بلکہ کسی حد تک علمی و مذہبی تعصب پر رکھی ہے۔ حالانکہ ان کی تمام دلیلوں کی تردید واقعات سے ہوتی ہے۔

بہر حال قبول اسلام کے نتیجہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت باذان کو ان کے عہدہ پر برقرار رکھا اور پورا یمن ان کے زیر حکومت رہا۔ دو برس بعد ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند حضرت شہر کو ان کا جانشین مقرر کیا گیا تاآنکہ مدنی گورنر وہاں پہنچیں۔ سنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یمن میں اسود عنسی کے ہاتھوں حضرت شہر کی شہادت کی خبر ملی جبکہ اس دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادہ یمن کے مختلف علاقوں کے گورنر پہنچ کر اپنا اپنا کام سنبھال چکے تھے۔ لیکن اسود عنسی کی بغاوت اور ردہ نے یمن میں سیاسی ابتری پیدا کر دی۔ بہر حال یہ ایرانی طبقات کے خلوص اسلام اور وفاداری و محبت رسول تھی کہ وہ ردّہ کے زمانے میں اسلام پر قائم اور اسلامی ریاست کے وفادار رہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں الابناء سے عام طور پر اور ان کے سب سے بڑے سردار و قائد حضرت فیروز دیلمی سے خاص طور سے اسود عنسی کی بغاوت کچلنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اور ان ایرانی ابناء کے شرف کی بات ہے کہ انہوں نے ہی بغاوت کو فرو کر کے پھر سے یمن میں اسلام کی فرمانروائی بحال کی تھی۔ یہ ان کے قبول اسلام کی دلیل ہونے کے علاوہ ان کی ایمانی صلابت، رسول کریم سے محبت و عقیدت اور اسلامی ریاست سے وفاداری کی سب سے روشن تابناک اور درخشندہ مثال ہے۔ جسکی مزید تصدیق و توثیق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد خطوط و فرامین سے ہوتی ہے۔[۹۱]

جنوبی عرب میں خواہ وہ عرب قبیلے اور خاندان ہوں یا ایرانی ابناء اور ان کے غیر عرب طبقات ہوں، اسلام کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں ایک انتہائی اہم اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کے دوسرے خطوں اور ان کے قبائل کے مقابلے میں جنوبی عرب میں اسلام کی تبلیغ کی رفتار تیز تھی، اور اس نے بہ آسانی اور کم مدت میں ایک بڑے خطے کے لوگوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا تھا۔ اس کے اسباب و عوامل معلوم و معروف ہیں۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کے دوسرے خطوں اور قبیلوں نے اسلام اور اسلامی ریاست کی کافی مخالفت کی تھی اور اسلامی ریاست کو ان کے خلاف مسلسل فوجی کارروائی بھی کرنی پڑی تھی۔ مگر جنوبی عرب کے قبائل عرب و عجم کے بارے میں فوجی یا سیاسی آویزش کا عنصر نہیں ملتا ہے۔ جنوبی عرب کے سلسلے میں جہاں تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پالیسی کا تعلق ہے وہ مآخذ سے اور اوپر کی طویل بحث سے واضح ہے کہ تمام لوگوں کو اسلام کا پیرو بنانے اور اسلامی ریاست کا شہری بنانے کی پالیسی تھی اور وہ کسی لحاظ و اعتبار سے دوسرے خطوں، قبیلوں، علاقوں کے سلسلے میں اپنائی گئی پالیسی سے مختلف نہیں تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد خطوط و فرامین سے جو مآخذ میں محفوظ ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان کے سامنے دو متبادل رکھے تھے۔ یا تو وہ اسلام قبول کر کے اسلامی امت کے ارکان اور اسلامی ریاست کے مکمل شہری بن جائیں یا اپنے مذاہب پر قائم رہیں۔ تو جزیہ ادا کر کے اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی تسلیم کریں اور ذمی بن جائیں۔ تیسرا کوئی متبادل نہیں تھا۔ ابتدائی عہد نبوی میں جب اسلامی ریاست اتنی طاقتور اور مضبوط نہیں تھی۔ یہ تیسرا متبادل بھی تھا کہ وہ صرف اسلامی ریاست کے سیاسی حلیف بن جاتے تھے اور دونوں میں ایک دوسرے کے لئے باہمی تعاون و امداد کا معاہدہ طے پا جاتا تھا۔ لیکن غزوہ احزاب کے بعد یہ تیسرا متبادل ختم کر دیا گیا تھا اور صرف پہلے دو متبادل بچ رہے تھے۔ اسلامی

تاریخ کے مآخذ میں سے ایک بھی شہادت اور مثال اس تیسرے متبادل کی مدنی عہد کے نصف آخر سے نہیں پیش کی جا سکتی جبکہ باقی دونوں متبادل کی متعدد بلکہ کثیر شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ نصاری، نجران، جنوبی و شمالی عرب کے یہود و سردار ایلہ کی عیسائی مملکتوں، مقنا، اذرح اور جربا کی یہودی بستیوں اور بحرین و عمان اور ہجر وغیرہ کے مجوسی طبقات وغیرہ سے جتنے بھی معاہدات نبوی ہوئے ان سب میں صرف پہلے دو متبادل..... اسلام یا جزیہ..... کا ذکر ملتا ہے۔

ہمارے جدید مؤرخین اور مستشرقین خاص کر مونٹگمری واٹ نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ تیسرا متبادل..... باہمی تعاون و امداد کا معاہدہ بغیر کسی مذہبی سمجھوتے کے..... عہد نبوی میں آخر تک موجود رہا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بقول متعدد غیر مسلم طبقات سے کسی مذہبی سمجھوتے کے بغیر باہمی سیاسی اور فوجی تعاون کے سمجھوتے کئے تھے ان میں بیشتر غیر مسلم طبقات خاص کر عیسائی یہودی اور ایرانی طبقات کے قبول اسلام کو وہ محض "سیاسی اتحاد" قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس سیاسی اتحاد کے لئے، وہ کوئی تاریخی ثبوت نہیں پیش کر سکتے۔ کیونکہ تمام معاصر شہادتوں اور اسلامی تاریخ کی روایتوں کا ان کے برعکس اتفاق ہے۔ وہ محض قیاسات کی بنیاد پر تاریخی شواہد اور مآخذ کی روایتوں کو بڑی دلیری سے مسترد کر دیتے ہیں اور اپنی اس علمی بد دیانتی اور تاریخی تحریف کو علمی کاوش اور تحقیق کا نام دیتے ہیں۔

(۵) قبائل پراگندہ عرب

اس عنوان کے تحت ان قبائل کے اسلام کے تعلقات پر بحث کی جائے گی۔ جن کو ہم کسی سمت کے ساتھ مخصوص نہیں کر سکتے اور جو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف مقامات پر منتشر و آباد تھے۔ ایک لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ قبائل تھے۔ جو جزیرہ نما کے مشرقی خطے بلکہ پٹی پر خلیج فارس سے لیکر عراقی حدود تک بکھرے ہوئے تھے۔ نسبی اعتبار سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ مہرہ اور ازد عمان کو چھوڑ کر باقی تمام قبائل کا تعلق ربیعہ کے عظیم و مادر قبیلہ سے تھا[۹۲]۔ جبکہ اول الذکر دونوں کا علاقائی اور نسبی تعلق جنوبی عرب کے بعض قبیلوں سے تھا۔ ان منتشر و پراگندہ قبیلوں میں حسب ذیل اہم ترین تھے:

(الف) ربیعہ : عبد القیس (۱) بنو عامر بن اعصر

(ب) بنو حنیفہ : (۱) بنو مرہ (۲) بنو عبد اللہ (۳) بنو ذہل (۴) بنو ثعلبہ ..... بنو الدول کے گھرانے (۵) بنو عدی

(ج) ازد عمان : بنو معولہ بن عبد شمس

(د) مہرہ :

(س) تمیم : (۱) بنو اسید بن عمرو (۲) بنو العنبر (۳) بنو مرہ (۴) بنو یربوع (۵) بنو نہشل (۶) بنو مجاشع (۷) بنو عبد اللہ بن دارم (۸) بنو جہم (۹) بنو مالک (۱۰) بنو زید مناۃ (۱۱) بنو منقار (۱۲) بنو عوف وغیرہ

(ط) وائل بن ربیعہ : (۱) بنو غبر (۲) بنو بکر (۳) بنو تغلب (۴) بنو شیبان

ان منتشر و پراگندہ قبائل کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ مختلف علاقوں اور خطوں میں منتشر ہونے کے سبب ان کی کوئی

ایک سیاسی شناخت نہیں تھی اور نہ ہی وہ سب ایک سیاسی دائرہ اثر میں محدود تھے۔ ازد عمان اور مہرہ اگر جنوبی عرب کے قبائل سے متاثر ہوتے تھے۔ تو عبدالقیس اور مجوس بحرین ایرانی دائرہ اثر و نفوذ میں آتے تھے۔ بنو حنیفہ کے کچھ طبقات عیسائی تھے تو باقی عرب دین قدیم پر عامل، جبکہ وائل بن ربیعہ کے متعدد خاندانوں میں مذہبی اور سیاسی اختلافات تھے۔ بہرحال ہم اسلام سے ان قبائل کے تعلقات کا آغاز بحرین کے عبدالقیس سے کر رہے ہیں کہ وہی ان قبائل منتشر و پراگندہ میں سب سے پہلے اسلام کے علمبردار بنے تھے۔

(الف) عبدالقیس

عبدالقیس کا قبیلہ علاقائی اعتبار سے بحرین کا باشندہ تھا۔ اور اس کے کچھ لوگ عمان وغیرہ میں بھی آباد تھے۔ جبکہ نسب کے اعتبار سے وہ ربیعہ کے خاندان عظیم سے تھا۔ ذکر آچکا ہے کہ مکہ مکرمہ کی مرکزی سیاسی، سماجی اور مذہبی حیثیت کے سبب تمام قبائل وہاں کے معاملات سے اپنے زائرین، تاجرین اور کاروانوں کے ذریعہ واقف ہوتے رہتے تھے اور یہ قبائل پراگندہ بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ چنانچہ وہ سب اور خاص کر عبدالقیس کا قبیلہ اسلام سے مکی عہد ہی میں متعارف و روشناس ہوگیا تھا۔ ابن سعد کی روایت ہے۔ جس کی تصدیق ابن قتیبہ سے بھی ہوتی ہے کہ عبدالقیس کے ایک خاندان بنو عامر بن اعصر کے ایک سردار حضرت الاشج کو جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور و دعوت کی اطلاع ملی تو انہوں نے دریافت حال کے لئے اپنے بھانجے (بہن کے لڑکے) عمرو بن عبدالقیس کو مکہ بھیجا۔ چنانچہ وہ ہجرت کے سال یعنی ۶۲۲ء میں مکہ پہنچے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور کلام الٰہی سنتے ہی خود مسلمان ہوگئے۔ کچھ مدت تک قیام کیا اور زبان رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی پہلی سورہ اقراء سیکھی اور واپس بحرین پہنچے جبکہ ان کے راہ بر و دلیل اریقط بن عامر بن حارث مکہ ہی میں رہ گئے۔ الاشج نے بھانجے سے اسلام سے آگاہی حاصل کی اور مسلمان ہوگئے۔ اگرچہ اپنے قبول اسلام کو انہوں نے خفیہ رکھا تھا لیکن چپکے چپکے اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ اور کچھ مدت کے بعد روایات کے بموجب وہ سترہ یا بارہ عبدالقیسی مسلمانوں کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنے اسلام کا اظہار و اقرار کیا۔ یہ بحرین اور خاص کر علاقہ عبدالقیس میں اسلام کا پہلا بیج تھا۔ جو ہجرت نبوی سے قبل لگ چکا تھا اور برگ و بار لانے لگا تھا۔ بحرین واپس آکر ان عبدی نو مسلموں نے اسلام کی تبلیغ اپنے طور سے جاری رکھی اور رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھتی رہی یہاں تک کہ اتنی ہوگئی کہ جواثی کے مقام پر انہوں نے ایک مسجد جمعہ بنائی اور ہجرت نبوی کے معاً بعد انہوں نے بھی جمعہ کی نماز اپنے یہاں قائم کی۔ سرزمین عرب پر مسجد نبوی کے بعد یہ دوسری مسجد تھی جہاں پہلا جمعہ اس علاقے کے مسلمانوں نے باجماعت ادا کیا تھا[۹۳]۔ بہرحال یہ پورا قبیلہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی عرصے میں مسلمان ہوگیا تھا اور ان کے محض چند افراد خارج اسلام رہے۔

بحرین میں قبیلہ عبدالقیس ایک ایرانی مجوسی طبقے کے ساتھ آباد تھا۔ اور ان کا پڑوسی بھی تھا۔ بحرین ایران کی ساسانی سلطنت کا ماتحت و باجگذار صوبہ یا مملکت تھی، جہاں خسروئے ایران کی طرف سے ایک حکمران مقرر ہوتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کا معاصر حکمراں منذر بن ساوی تھا جو نسلاً عرب تھا۔ اور قبیلہ عبد القیس کا فرد تھا۔ ۸ھ / ۶۲۹ء میں جب آپ نے مختلف پڑوسی اور عرب حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دی تو حضرت منذر بن ساوی کو بھی دی۔ غالباً وہ قبیلہ عبد القیس کے مسلمان طبقات سے متعارف بھی تھے اور متاثر بھی۔ بہر حال وہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے دوران کسی وقت مشرف بہ اسلام ہو گئے۔[94]

عام خیال یہ ہے کہ وہ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حضرت علاء بن حضرمی وہاں پہنچے تھے۔ حالانکہ یہ ان کے قبول اسلام کا زمانہ یا واقعہ نہیں تھا بلکہ بحرین کے صوبے کے اسلامی مملکت و ریاست میں ادغام و ماتحت بننے کا معاملہ تھا۔ بہر حال حضرت منذر بن ساوی عبدی نے اپنی مملکت میں اسلام کی ترویج و اشاعت کی اور تمام عرب طبقات مسلمان ہو گئے۔ ممکن ہے کہ بعض مجوسی افراد و طبقات بھی مشرف بہ اسلام ہوئے ہوں لیکن ان کا کوئی حتمی ذکر نہیں ملتا ہے۔ فتح مکہ کے بعد حضرت علاء بن حضرمی بطور مرکزی منتظم اور عامل صدقات بحرین پہنچے اور وہاں حضرت منذر بن ساوی عبدی کے وصول کردہ صدقات اور جزیہ کی رقم لیکر مدینہ واپس آئے۔ بغدادی کے بقول یہ "مال" پہلا تھا۔ جو کسی صوبے سے مرکز پہنچتا تھا۔ اور اس کی مقدار ستر ہزار درہم تھی۔[95] رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ بحرین میں اس کے بعد یا اسی سال دو مسلم افسروں کو مدینہ سے بھیجا گیا تھا۔ ایک صدقات اور عشور وغیرہ کے افسر تھے۔ ان محاصل کو حضرت منذر بن ساوی عبدی نے مسلمانان بحرین سے وصول کیا تھا اور دوسرے افسر صرف جزیہ کے لئے تھے۔ جو غیر مسلم مجوسی طبقات سے وصول کیا گیا تھا۔[96] ان محاصل کے بارے میں مزید تفصیلات ہم اگلے ابواب میں دیکھیں گے۔ بہر حال ان شواہد و حقائق سے یہ بلا ریب ثابت ہوتا ہے کہ بحرین کے بیشتر لوگ جن میں قبیلہ عبد القیس کے افراد و طبقات کے علاوہ دوسرے عرب اور ایرانی طبقات بھی شامل تھے۔ ۸ھ کے اواخر ۶۳۰ء کے اوائل تک اسلام لا چکے تھے اور اسلامی ریاست کے شہری بن چکے تھے۔[97]

قبیلہ عبد القیس کے قبول اسلام کے بارے میں مزید شہادت ان کے اس وفد سے بھی ہوتی ہے جو حضرت جارود بن معلی کی قیادت میں فتح مکہ کے فوراً بعد بارگاہ نبوی میں پہنچا تھا۔[98] تمام ارکین وفد نے اپنے اسلام کا اقرار و اعلان کیا تھا اور ان میں سے کم از کم تین حضرات: شبیب بن قرۃ، صحار بن عباس، اور مشمرج بن خالد سعدی ..... کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اراضی کے عطیات (قطائع) بھی عنایت فرمائے تھے۔[99] ماخذ کا دعوی ہے کہ حضرت جارود بن معلی عبدی نے اپنی قوم / خاندان کو مسلمان کر لیا تھا اور وہ اپنے پورے قبیلے سمیت ردہ کے زمانے میں اسلام پر قائم رہے تھے۔ حضرت منذر بن ساوی عبدی اور حضرت اشج عبدی کے طبقات و خاندان بھی اسلام اور اسلامی حکومت کے وفادار رہے تھے۔ بہر حال کچھ طبقات عبد القیس نے ارتداد کی راہ اختیار کی تھی۔ جن کی سرکوبی خلافت صدیقی کے سالاروں نے کی تھی۔[100]

بحرین میں قبیلہ عبد القیس اور بعض دوسرے طبقات عرب اور مجوسی یا ایرانی آبادی کے علاوہ جو حضرت منذر بن ساوی کی مملکت میں آباد تھے۔ کچھ دوسرے عناصر بھی اس علاقہ میں اسلام لے آئے تھے۔ ان میں ہجر کے مجوس اور تمیم کے عرب طبقات شامل تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو خطوط و فرامین ۔ ایک ہجر کے حکمران / صاحب، اسیبخت بن عبد اللہ کا نام تھا اور دوسرا بحرین و عمان کے عوام کے نام ۔ ثابت کرتے ہیں کہ دونوں طبقات بھی اسلام میں داخل ہو چکے تھے کیونکہ ان

دونوں خطوط نے ان طبقات کے لئے وہ احکام و فرائض بتائے تھے۔ جن کا مطالبہ صرف مسلمانوں سے کیا جا سکتا ہے[201]
ردہ و ارتداد کے سیلاب کی تاریخ اور جس آسانی اور سہولت سے بحرین میں اسے کچلا گیا تھا۔ اور اس میں جو کردار حضرات منذر بن ساوی عبدی، جارود بن معلی اور ان کے ہمنواؤں نے انجام دیا تھا ثابت کرتے ہیں کہ ایرانی سلطنت کی اس ماتحت و باجگذار مملکت میں اسلام نے اپنے قدم مضبوطی سے جما لئے تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ بحرین میں مسلم عناصر اور آبادی کی موجودگی بلکہ اس سے بڑھ کر ان کی سیاسی، مذہبی اور فوجی بالادستی کا اعتراف مونٹگمری واٹ جیسے مستشرقین نے بھی کر لیا ہے[202]
حالانکہ یہ ان کی عادت کے خلاف ہے۔

(ب) بنو حنیفہ

بنو حنیفہ کا قبیلہ عددی لحاظ سے بڑا اور فوجی اعتبار سے طاقتور تھا اور وہ یمامہ کے زرخیز و شاداب خطے میں بنیادی طور سے آباد تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعض خاندان یمامہ کے باہر خاص کر عراقی سمت میں بھی آباد تھے ابن ہشام کی ایک روایت سے جس کی تصدیق بخاری کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنو حنیفہ کا ایک طبقہ یا خاندان کم از کم اسلام کے پیغام سے فتح مکہ سے بہت پہلے متاثر ہوا تھا۔ غالباً صلح حدیبیہ کے فوراً بعد اسلام بنو حنیفہ کے قبیلہ میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اور اس کا آغاز بنو حنیفہ کے ایک ممتاز سردار حضرت ثمامہ بن اثال حنفی کے قبول اسلام سے ہوا تھا۔ حضرت ثمامہ حنفی کے قبول اسلام کا واقعہ بڑا ڈرامائی اور دلچسپ ہے۔ نجد کی ایک مہم کے دوران، جس کی کوئی تاریخ مآخذ میں نہیں ملتی ہے، وہ مسلمانوں کے ایک شہسوار دستے کے ہاتھوں اس وقت گرفتار ہوئے تھے۔ جب وہ عمرہ کے لئے مکہ جا رہے تھے۔ ان کو مدینہ لایا گیا۔ جہاں تین دن تک وہ قید رہے۔ اور اس کے بعد انکو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بلا کسی شرط و وعدہ کے رہا کر دیا گیا۔ رحمت نبوی کے اس بے مثال مظاہرے سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ فوراً انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ مکہ پہنچے۔ عمرہ کیا اور واپس اپنے علاقہ کو روانہ ہو گئے۔ مگر مکہ میں ان پر قریش مکہ کے دشمنان اسلام نے وہ طنز و تعریض کی بارش کی کہ انہوں نے مکہ والوں کو یمامہ سے ملنے والی گیہوں کی فراہمی کو روک دینے کی دھمکی دی اور وہ محض دھمکی ہی نہیں رہی بلکہ وطن پہنچتے ہی انہوں نے اسکو عملی جامہ بھی پہنا دیا اور مکہ والے بھوکوں مرنے لگے۔ حضرت ثمامہ سے جب اہل مکہ کی تمام عرض و معروض بیکار و بے فائدہ رہی تو بالآخر انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کرنے کی درخواست کی جو بالآخر بابِ رحمت نبوی سے قبول و منظور ہوئی اور ان کی گیہوں کی فراہمی پھر سے جاری ہو گئی[203] بہر حال جن حالات میں حضرت ثمامہ حنفی نے اسلام قبول کیا اور جس طرح انہوں نے مکہ والوں کا غلہ روک لیا۔ اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ محرم ۷ھ / مئی، جون ۶۲۸ء یا زیادہ سے زیادہ شعبان ۷ھ / دسمبر ۶۲۸ء میں مسلمان ہوئے ہوں گے[204] اگرچہ یمامہ یا بنو حنیفہ کے قبول اسلام کے بارے میں براہ راست کوئی شہادت نہیں ملتی ہے۔ یہ یقینی ہے کہ انہوں نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کر لیا ہو گا۔ اگر ایسا نہ ہوا

ہوتا تو مکہ کے گیہوں کی فراہمی کو روکنا آسان اور قابل عمل نہیں ہوتا۔

بہرحال مآخذ یہ ضرور بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو حنیفہ کے عوام اور سرداروں کے پاس بھی اپنے سفیر اور مبلغ بھیجے تھے اور ان کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ ابن سعد کی ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر یا اس کے کچھ بعد حضرت ثمامہ بن اثال حنفی اور بنو حنیفہ کے ایک اور بااثر سردار ہوذہ بن علی کو خطوط بھیجے تھے۔ اور ان کو اسلام کی دعوت دی تھی[۸۰۵] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خطوط حضرت ثمامہ کے قبول اسلام سے پہلے لکھے گئے تھے۔ لیکن دوسرے متعدد مآخذ جیسے بلاذری، طبری، ابن خلدون اور محمد بن حبیب بغدادی حضرت ثمامہ حنفی کا نام بنو حنیفہ کے ان سرداروں میں نہیں شامل کرتے جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے فوراً بعد خطوط لکھے تھے ان مآخذ کا اس پر اصرار ہے کہ یہ خطوط ان علاقوں کے عام آدمیوں کے نام دعوت عام تھی[۸۰۶]۔ بہرحال بنو حنیفہ اور یمامہ کے لوگوں نے آپ کی دعوت کو ذرا تاخیر سے قبول کیا اور ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں بقول ابن جریر طبری اپنا وفد بارگاہ نبوی میں بھیجا جو دس پندرہ آدمیوں پر مشتمل تھا اور ان سب لوگوں نے غالباً ایک کے سوا اسلام قبول کرنے کا اعلان و اقرار کیا تھا[۸۰۷]۔ دوسرے مآخذ نے حنفی وفد کی آمد کی تاریخ نہیں بیان کی ہے جبکہ بلاذری کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وفد غالباً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارت اور دعوت کے جواب میں فوراً آیا تھا۔

یہ بات خاصی دلچسپ اور اہم ہے کہ بنو حنیفہ کے اس وفد میں مشہور جھوٹے نبی مسیلمہ کذاب کی بھی شمولیت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ بہرحال اس کی وفد میں شمولیت اور اسلام قبول کرنے کا معاملہ دونوں ہی پردہ خفا میں ہیں[۸۰۹]۔ اسی طرح مآخذ بنو حنیفہ کے دوسرے سردار ہوذہ بن علی کے قبول اسلام کا بھی واضح ذکر نہیں کرتے ہیں۔ وہ حنیفہ کے ایک اہم خاندان بنو مرۃ کا سردار تھا[۸۱۰] لیکن اس کے خاندان ہی کے ایک صحابی حضرت طلق بن علی کے قبول اسلام کا ذکر واضح الفاظ میں ملتا ہے[۸۱۱] اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کے خاندان یا بنو حنیفہ کے قبیلہ میں انفرادی یا اجتماعی قبول اسلام کے امکان کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک مسیلمہ کذاب کا تعلق ہے اس کا خاندان بنو عدی بن حنیفہ بہت معمولی اور غیر اہم تھا۔ اور بقول ابن حزم نہ اس میں دولت تھی نہ ریاست و حکومت اور نہ ہی عددی طاقت[۸۱۲] بنو حنیفہ کا سب سے بااثر اور طاقتور قبیلہ بنو الدول بن حنیفہ تھا۔ جو چار بڑے خاندانوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ اور وہ تھے: بنو مرۃ، بنو عبد اللہ، بنو ذہل اور بنو ثعلبہ، موخر الذکر قبیلہ / خاندان سے حضرت ثمامہ بن اثال کا تعلق تھا جو یمامہ میں اسلامی ریاست کے سب سے بڑے حامی اور وفادار تھے[۸۱۳] تمام واقعات اور حقائق کو مدنظر رکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ثمامہ کا خاندان اکثر و بیشتر مسلمان ہو گیا تھا۔ اور دوسرے خاندانوں میں کچھ افراد و طبقات مسلمان تھے۔ لیکن اکثر بنو حنیفہ کے لوگ عہد نبوی میں اسلام کے دائرے سے باہر رہے تھے۔ اور انہوں نے ہی مسیلمہ کذاب کا ساتھ ارتداد کے زمانے میں دیا تھا۔ جبکہ دوسری طرف حضرت ثمامہ اور دوسرے حنفی مسلمانوں نے اسلامی ریاست کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور اسلام کے لئے شاندار خدمات انجام دی تھیں[۸۱۴]

(ج) ازدِ عمان

ازدِ یمن کی ایک شاخ عمان میں جا بسی تھی جو ازدِ عمان کہلائی۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مدینہ میں دونوں انصاری قبیلوں اوس وخزرج کا نسبی تعلق ازدِ عمان سے تھا۔ عمانی شاخ کی بھی مختلف ذیلی شاخیں تھیں اور عہدِ نبوی میں اس کے ایک اہم خاندان بنو معولہ بن عبد شمس کی عمان پر حکمرانی تھی[۸۱۵]۔ اس کے ایک سردار جلندیٰ کے دو بیٹے جیفر اور عبادؔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر حکمران تھے، جو ملک کے دو علاقوں پر الگ الگ اور آزادی سے حکمرانی کرتے تھے۔ بلاذری اور ابن حزم کا بیان ہے کہ اگرچہ عمان کی غالب اکثریت کا تعلق ازد سے تھا، تاہم وہاں مختلف عرب اور غیر عرب عناصر بھی موجود تھے جو اس پورے علاقے میں پھیلی مختلف وادیوں میں رہتے تھے۔

اسلام سے ان کے روابط کے آغاز کا ذکر فتح مکہ کے بعد ۸ھ / ۶۳۰ء میں عام طور سے ملتا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دو سفیر و نمائندے حضرات ابو زید انصاری اور عمرو بن عاص سہمی کو عمان کے حکمرانوں کے پاس بھیجا۔ اور ان کو قبول اسلام کی دعوت دی[۸۱۶]۔ یہ قابل ذکر بات ہے کہ دونوں حکمران فوراً مسلمان ہو گئے۔ اور ان کی تقلید و تبلیغ سے عربوں اور غیر عربوں کے خاصے بڑے طبقات بھی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے[۸۱۷]۔ اگرچہ ردہ کی تاریخ کا مطالعہ سردست ہمارے پیش نظر نہیں ہے تاہم اس ضمن میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ عمان میں ارتداد کی وبا جب عام طور سے پھیلی تو بھی وہاں وفادار مخلص مسلمانوں کی خاصی بڑی آبادی موجود تھی جو اسلام کی بحالی کے لئے کوشاں تھی[۸۱۸]۔ وہ نہ صرف اپنے دین و مذہب پر ثابت قدم و برقرار رہی بلکہ اس نے مرتدوں کے خلاف خود بھی جنگ کی۔ اور پھر اسلامی لشکر کے پہنچنے پر اس کی بھرپور مدد کی۔ یہ نکتہ بھی خاصا اہم اور قابل ذکر ہے کہ عمان کے دونوں حکمران حضرت جیفر اور حضرت عباد ثابت قدم و مخلص مسلمان اور مدینہ کے وفادار رہے تھے اور انہوں نے ہی دراصل عمان میں اسلام کا پرچم بلند کئے رکھا تھا[۸۱۹]۔

(د) مہرہ

مہرہ کا اصل قبیلہ یمن کے علاقہ شحر میں آباد تھا۔ اور اس کی کچھ شاخیں علاقہ العنبر کے متصل و متقابل ساحلی علاقوں میں آباد تھیں اگرچہ نسبی لحاظ سے ان کا تعلق قبیلہ قضاعہ سے تھا[۸۲۰]۔ ان کی ایک شاخ عمان کے علاقے میں بھی آباد تھی[۸۲۱]۔ ابن سعد کے مطابق مہرہ کا ایک وفد حضرت مہری بن الابیض کی قیادت میں فتح مکہ کے بعد کسی وقت مدینہ پہنچا تھا اور اس نے اپنے قبیلہ کے خاصے بڑے حصے کے قبول اسلام کا اعلان و اقرار کیا تھا[۸۲۲]۔ وفات نبوی کے بعد بیشتر قبیلہ والے مرتد ہو گئے تھے۔ تاہم حضرت عکرمہ بن ابی جہل مخزومی کی قیادت میں جوں ہی اسلامی لشکر ان کے علاقے میں پہنچا، قبیلہ کے تمام مسلمانوں نے اپنے اسلام کی تصدیق کی تھی۔ اور بغیر کسی جنگ و جدال کے صدقات ادا کر دیتے تھے[۸۲۳]۔ ہمارے ماخذ میں مہرہ کے انفرادی و اجتماعی قبول اسلام کی مثالیں مفقود ہیں۔

(س) تمیم

تمیم عددی اعتبار سے جزیرہ نمائے عرب کے بڑے قبائل میں شمار ہوتا تھا۔ اور قبائل پراگندہ میں شاید سب سے طاقتور اور عظیم بھی[۹۲۴] اس کے متعدد بطون بلکہ ان کی ذیلی شاخیں بجائے خود قبیلہ بن گئی تھیں اور خاصی طاقت ور اور آزاد تھیں۔ ان کے متعدد بطون اور ذیلی گھرانے یمامہ، بحرین اور عمان کے درمیان واقع علاقوں میں ایک خاصے بڑے اور وسیع رقبہ پر بسے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ جزیرہ نما کی مشرقی پٹی پر بھی وہ آباد تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بحرین کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاصر سلطنت وملوکیت میں حکمران طبقہ کا تعلق تمیم ہی کی ایک شاخ سے تھا۔ جبکہ عراق کی ایرانی سلطنت کی باجگذار سلطنت حیرہ کا تعلق بنو تمیم سے بہت قریبی تھا۔ دوسری طرف بنو تمیم کے بعض گھرانوں اور افراد نے مکہ و مدینہ کے لوگوں سے حلف و ازدواج کے ذریعہ قریبی سماجی اور سیاسی تعلقات قائم رکھے تھے[۹۲۵]

مکہ اور قریش سے اپنے ان گوناگوں تعلقات کے سبب اسلام بنو تمیم میں کافی شروع میں متعارف ہو گیا تھا اور اس کے بعض افراد نسبتاً ابتدائی دور میں اسلام سے مشرف ہوئے تھے۔ ان میں قریش مکہ کے تمیمی حلیف نمایاں مقام کے حامل تھے جو مکہ میں بس گئے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ معزز و محترم صحابی حضرات خباب بن ارت تمیمی[۹۲۶] اور واقد بن عبداللہ تمیمی تھے[۹۲۷] جو بدری صحابہ ہونے کی فضیلت رکھتے تھے ایک اور ابتدائی مکی تمیمی مسلم حضرت سعید بن عمرو تمیمی تھے جو قریش کے خاندان بنو جمح کے حلیف تھے اور مہاجر حبشہ بھی[۹۲۸] ان کے علاوہ ایک پورا تمیمی گھرانا تھا جو اسلام سے پہلے اپنے علاقہ سے ہجرت کر کے مکہ اور پھر مدینہ جا بسا تھا۔ اور اس نے مکہ ہی میں اسلام قبول کیا تھا۔ یہ بنو اُسید بن عمرو کا گھرانا تھا۔ جس کے نمایاں فرد ابوہالہ ہند بن زرارہ تھے جو حضرت خدیجہ کے پہلے شوہر اور ان کے بطن سے پیدا ہونے والے دو فرزندوں حضرات ھند اور حارث کے والد ماجد تھے۔ اس خاندان کے تین اور اہم ابتدائی مسلمانوں کا ذکر بھی ملتا ہے وہ تھے: حضرات صفوان بن صفوان اور ان کے بھتیجے صفوان بن مالک اور حنظلہ بن ربیع۔ اول الذکر دونوں صحابیوں کے بارے میں مآخذ کا اصرار ہے کہ وہ بہترین مہاجرین میں شمار ہوتے تھے جبکہ موخر الذکر کو کاتبین رسول میں شرکت و شمولیت کی سعادت حاصل تھی[۹۲۹]

اصل قبیلہ تمیم اور اس کی شاخوں میں بہرکیف اسلام کا تعارف فتح مکہ سے پہلے شروع ہو گیا تھا اور بعض انفرادی قبولِ اسلام کی مثالیں ملتی ہیں تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی تبلیغ واشاعت فتح مکہ کے بعد ہی ہوئی شروع ہوئی تھی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اقرع بن حابس تمیمی کی قیادت میں تمیم کے دس اشخاص نے فتح مکہ سے ذرا پہلے اسلام قبول کر لیا تھا اور انہوں نے فتح مکہ کے علاوہ[۹۳۰] غزوات حنین و طائف میں بھی حصہ لیا تھا[۹۳۱] ان مواقع پر ان کی خدمات کے اعتراف میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اقرع بن حابس تمیمی کو بھی ایک سردار کا حصہ یعنی سو اونٹ حنین کے مال غنیمت کے خمس میں سے عطا فرمائے تھے[۹۳۲] ابن اسحاق کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمیم کے خاندان بنو اسید کے کچھ لوگ بھی ان غزوات میں شریک

جہاد تھے[۸۳۳] ۹ھ کے اواخر یعنی ۶۳۱ء کے وسط تک اسلام نے بنو تمیم کے مختلف گھرانوں اور خاندانوں میں کافی مضبوطی سے اپنے قدم جمالئے تھے۔ اس کی ایک تصدیق ان کے قبائلی وفد کی آمد سے ہوتی ہے جو اس برس بارگاہ نبوی میں پہنچا اور جس میں اسی یا نوے مسلمان ارکان شامل تھے[۸۳۴] ابن اسحاق کے بیان سے بصراحت اور دوسرے ماخذ سے مضمرا معلوم ہوتا ہے کہ وفد کے تمام اراکین مسلمان تھے[۸۳۵] اگرچہ واقدی اور ابن سعد نے ان کے مسلمان ہونے کی وضاحت نہیں کی ہے۔ تاہم وہ ان کے پورے بیانات میں ہر جگہ مضمر ہے خاص کر ان اشعار میں جو وفد کے ایک رکن نے اس موقعہ پر برجستہ کہے تھے۔[۸۳۶] طبری نے بھی ابن ہشام و ابن اسحاق کے بیان کی تصدیق کی ہے[۸۳۷] اس طرح تمیم کے قبول اسلام کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں رہ جاتا۔ مزید برآں تمام ماخذ کا متفقہ بیان ہے کہ تمیم کے مختلف گھرانوں اور خاندانوں کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی عاملین صدقات بھی مقرر فرمائے تھے۔ جن میں حضرات قیس بن عاصم، مالک بن نویرہ اور زبرقان بن بدر بہت نمایاں مقام کے حامل تھے۔[۸۳۸]

تمیم کے تمام خاندانوں اور گھرانوں میں مسلمان طبقات اور کثیر افراد کی موجودگی بھی ان کے قبول اسلام کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ابن حزم نے متعدد گھرانوں کے صحابہ کرام کے نام گنائے ہیں۔ اپنی ایک روایت میں انہوں نے تمیم کے مختلف گھرانوں کے ۴۶ صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔ نو بنو العنبر بن عمرو سے، چھ بنو اسید سے، اور تین، تین بنو مرہ، بنو یربوع اور بنو نہشل سے، اور دو دو بنو مجاشع اور بنو عبد اللہ بن دارم سے، اور ایک ایک بنو جشم، بنو مالک، بنو کعب، بنو زید مناۃ، بنو منقار، بنو عوف، بنو قریع، بنو ربیعہ، بنو مالک بن حنظلہ اور بنو حریر بن دارم سے[۸۳۹] یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان سے کئی گنا زیادہ وہ صحابہ کرام تھے۔ جن کے اسمائے گرامی تاریخ کے تنگ ظرف میں سما نہیں سکے۔ اور ان سے کہیں زیادہ وہ مسلمان تھے۔ جن کی ملاقات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہو سکی اور شرف صحبت نبوی سے محروم رہنے کے سبب وہ تاریخ کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئے۔ بہر حال ان ٹھوس ثبوتوں اور ماخذ کی شہادتوں کے بعد یہ کہنا عقلمندی نہیں ہو سکتی کہ "بنو تمیم میں چند ہی لوگ مسلمان ہوئے تھے۔"[۸۴۰] یہ تاریخ کو مسخ کرنے اور بین وظاہر واقعات کو نظر انداز کرنے کی انتہائی غیر علمی، غیر تاریخی اور غیر دیانت دارانہ حرکت ہے۔ واقعات وشواہد بنو تمیم کے قبول اسلام کے ناقابل تردید ثبوت و شہادتیں فراہم کرتے ہیں۔ وفات نبوی کے بعد ردہ کے زمانے میں جو کچھ پیش آیا۔ وہ مختلف معاملہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس پر فتن و پر آشوب زمانے میں بھی تمیم کے متعدد طبقات اسلام پر مضبوطی اور خلوص کے ساتھ قائم رہے تھے۔ ان میں حضرت زبرقان بن بدر تمیمی نمایاں حضرات میں سے ایک تھے۔ جنہوں نے اسلام کی اس زمانے میں شاندار خدمات انجام دی تھیں اور اپنے بہت سے قبیلہ والوں کا رشتہ اللہ اور اس کے رسول سے جوڑے رکھا تھا اور یہی نہیں انہوں نے مسلم طبقات سے صدقات وصول کر کے اس کی خطیر رقم بھی مدینہ اسی زمانہ میں پہنچائی تھی۔[۸۴۱]

(ط) وائل

جزیرہ نمائے عرب کے افرادی طاقت اور فوجی قوت کے لحاظ سے سب سے بڑے قبیلوں میں وائل کا بھی شمار ہوتا تھا

جس کے متعدد بطون تھے ۔ جو بجائے خود قبیلے بن گئے تھے ۔ ان میں سے اہم ترین بطون تھے : بنو بکر ، بنو عنزہ ، بنو ثعلب اور بنو شیبان ۔ پھر ان کی اپنی ذیلی شاخیں تھیں ۔ اس قبیلے کے لوگ یمن میں واقع جند کے علاقے سے عراقی سرحدوں کے قریب حیرہ تک پھیلے ہوئے تھے ۔ اور بہت بڑے علاقے میں آباد تھے ۔ ان کا اصل اور مرکزی علاقہ بحرین اور حیرہ کے درمیان واقع تھا ۔ جہاں ان کا سب سے بڑا قبیلہ آباد تھا ۔ ان کے سیاسی اور سماجی تعلقات حیرہ کی مملکت سے بھی تھے اور دوسری طرف شمال کی غسانی مملکت سے بھی [842] مذہبی لحاظ سے یہ اکثر و بیشتر عیسائی تھے ۔

(۱) بنو عنزہ بن وائل

یمن کے قریب الجند میں یہ گھرانا آباد تھا اور ان کے بعض افراد مکہ ہجرت کر کے جا بسے تھے اور وہاں قریش کے بعض خاندانوں کے حلیف بن گئے تھے ۔ اس بطن کے ابتدائی مسلمانوں میں یہی مہاجر عنزی تھے جو قریش مکہ کے ساتھ اسلام لائے تھے ان کے ایک نمائندے تھے حضرت عامر بن ربیعہ عنزی جو حضرت عمر بن خطاب کے حلیف تھے ۔ بہر حال اصل قبیلہ کے بارے میں خیال ہے کہ ان کے کچھ لوگ فتح مکہ اور وفات نبوی کے درمیانی عرصے میں اسلام لائے تھے اور قبیلہ نے اسلامی ریاست کے ساتھ کوئی مفاہمت ضرور کر لی تھی کیونکہ الجند نہ صرف اسلامی ریاست میں شامل ہو گیا تھا بلکہ جنوبی عرب میں اس کا صدر مقام تھا جہاں اس پورے علاقے کے گورنر حضرت معاذ بن جبل رہتے تھے [843]

اصل قبیلہ میں انفرادی یا اجتماعی قبول اسلام کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں ۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اسلام کے دائرے سے یکسر باہر نہیں تھے ۔ مثال کے طور پر واقدی کا بیان ہے کہ بنو عجل جو بنو بکر بن وائل کی ایک شاخ تھی کے ایک شخص فرات بن حیان عجلی مسلمان ہو گئے تھے اور انہوں نے اسلامی ریاست کے لئے اچھی خدمات انجام دی تھیں [844] اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک گرامی نامہ مآخذ میں بنو بکر بن وائل کے نام ملتا ہے جس میں آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی تھی ۔ آپ کے ایک اور گرامی نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص حضرت عدی بن شرحبیل جن کا تعلق بنو عامر بن ذہل سے تھا ۔ بظاہر مسلمان ہو گئے تھے [845] بعد میں بنو بکر بن وائل نے اپنا ایک وفد بھی بارگاہ نبوی میں بھیجا تھا ۔ جس میں قبیلہ کے سربرآوردہ افراد اور سردار شامل تھے اس وفد نے وفات نبوی سے کچھ پہلے مدینہ کا دورہ کیا تھا ۔ غالباً وہ مسلمان ہو گئے تھے اور اپنے قبیلہ میں اسلام کے داعی بن کر پہنچے تھے جہاں انہوں نے اسلام کی تبلیغ کی تھی [846] بنو بکر بن وائل کے ایک ذیلی مگر اہم خاندان بنو تغلب کے وفد کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے ۔ ابن سعد کا واضح بیان ہے جس پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ بنو تغلب کے وفد میں مسلمان اور عیسائی دونوں طبقات کے سولہ نمائندے تھے جو اپنے اپنے طبقات کی نمائندگی کرنے مدینہ پہنچے تھے [847] بحرین میں ردہ کی تاریخ کے طبری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو بکر بن وائل اور تمیم کے تمام بڑے خاندانوں میں اسلام عہد نبوی میں پھیل چکا تھا اور ان قبیلوں کے مسلمان سخت آزمائشوں کے باوجود اسلام پر ثابت قدم رہے تھے [848] یہ قبائل یا طبقات تھے ۔ حضرات عیینہ بن نحاس ، عامر بن عبد الاسود ، مسمع ، مثنیٰ بن حارثہ شیبانی اور حضفہ تمیمی کے جنہوں نے ردہ

زمانے میں شاندار کارنامے انجام دیئے تھے۔ یہ متعدد قبیلوں کے سردار تھے۔ جن میں حضرت مثنیٰ ابن حارثہ شیبانی عہد صدیقی میں شہرت کے بام پر پہنچے۔ ان کے علاوہ ابن حزم نے بنو شیبان کے کئی مسلمانوں کے نام بھی گنائے ہیں[۸۴۹] اور بلا جھجک یہ کہا جا سکتا ہے کہ صرف یہی لوگ مسلمان نہیں تھے۔ بلکہ ان سے کہیں زیادہ کے نام تاریخ محفوظ نہیں رکھ سکی۔

ان حقائق و شواہد کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو بکر بن وائل اور بنو تغلب وغیرہ کے معتدبہ لوگ اور طبقات عہد نبوی میں اسلام لا چکے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ بیشتر طبقات اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے تھے۔ مگر بعد کے زمانے میں وہ بھی رفتہ رفتہ اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ مگر یہ دعویٰ کرنا کہ عہد نبوی میں وائل کے قبیلے کے کسی اہم طبقہ یا گروہ نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ صحیح نہیں ہے[۸۵]

عرب میں جا بجا منتشر و پراگندہ قبائل کے اسلام کے ساتھ تعلقات کے مذکورہ بالا جائزے میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک قبیلہ اور اس کی اہم شاخ میں اسلام متعارف ہو چکا تھا۔ اور ان کے معتدبہ طبقات اسلامی ریاست کے وفادار بن چکے تھے۔ خاص کر عبد القیس، ازد عمان اور تمیم کے قبیلوں میں اسلام مضبوطی سے جم گیا تھا اور ان کے بیشتر خاندان مسلمان تھے۔ جبکہ دوسرے قبائل جیسے بنو حنیفہ، بہرہ اور وائل وغیرہ کے بیشتر طبقات غیر مسلم تھے۔ لیکن ان میں بھی کچھ طبقات اور گروہ مسلمان ہو چکے تھے اور جو طبقات مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے بہر حال اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی قبول کی تھی۔ چنانچہ اس کی تصدیق بنو تغلب کے عیسائی طبقات کے اس معاہدے سے ہوتی ہے جو انہوں نے اسلامی ریاست کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے مطابق انہوں نے مدینہ کو جزیہ دینا منظور کیا تھا جو ان کی اپنی شرائط و پسند کے مطابق مسلمانوں کی زکوٰۃ کا دوگنا تھا۔ یعنی ۵ فیصد۔ اس طرح وہ اسلامی ریاست کے ذمی بن گئے تھے۔ بہر حال جزیرہ نمائے عرب میں وفات نبوی کے وقت کوئی ایسا طبقہ یا قبیلہ نہیں تھا جس نے اسلامی ریاست کی مذہبی یا سیاسی بالادستی قبول نہ کر لی ہو اور اس کا رکن نہ بن گیا ہو۔

خلاصہ بحث

تاریخ اسلام کا یہ عظیم الشان واقعہ ہے کہ ۶۱۰ء میں مکہ کے ایک فرد واحد نے خدا کا فرستادہ و پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا اور سب لوگوں کو خدا کے دین کی طرف بلایا۔ اشراف و اکابر قریش کے لئے یہ نئی آواز تھی مگر اس میں ایک عجیب سی کشش تھی اور اس کے کلام میں ایک سحر کن صفت وہ کلام انسانی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اور نہ اس کا سنانے والا جھوٹا، کیونکہ وہ چالیس برس سے اس کو صادق اور امین مانتے اور سمجھتے چلے آئے تھے۔ شیوخ و اکابر قریش بڑے ذہین و فطین، تجربہ کار و دور بین عقیل و فہیم تھے وہ کسی بات کو بلا سوچے سمجھے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ مگر نوجوانان قریش جو زیادہ پختہ ذہنی تحفظات نہیں رکھتے تھے اور کسی بھی قابل فہم بات کو قبول کرنے کا زیادہ فطری رجحان رکھتے تھے اس دعوت کی طرف جھکے، غور سے سنا اور جیسے ہی اسے سمجھا وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا اور ان کی رسالت پر ایمان لے آئے۔ مکی عہد میں تبلیغ اسلام کے دو دور تھے: ایک ہجرت حبشہ کے زمانے (۶۱۰ء تا ۶۱۶ء تک)، اور دوسرا ہجرت حبشہ سے لیکر ہجرت مدینہ تک

(۶۱۶ء سے ۶۲۲ء تک) ان دونوں ادوار میں اسلام کی تبلیغ برابر جاری رہی۔ خیال عام یہ ہے کہ دور اول میں اسلام تیزی سے پھیلا۔ مگر دور دوم میں اس کی اشاعت رک گئی۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ مکہ کے دونوں ادوار میں برابر اسلام کی اشاعت جاری رہی تھی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ دوسرے دور میں اس کی رفتار قریش کے اکابر کی مخالفت اور مسلمانوں کی تعذیب کے سبب کچھ سست ضرور ہو گئی تھی۔

اکابر و شیوخ قریش کی مخالفت کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ مکہ کے موجودہ نظام زندگی میں کسی تبدیلی کو خواہ وہ بہتری کے لئے کیوں نہ ہو بدعت تصور کرتے تھے اور اس لئے مردود و مسترد کئے جانے کے قابل۔ کسی حد تک ان کے اپنے بتوں اور خداؤں کی محبت بھی اس کے لئے ذمہ دار تھی۔ پھر اسلام کی تعلیمات کو ماننے کا واضح مطلب تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بالادستی اور حاکمیت کو قبول کرنا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے قدیم اقتدار اور عالمگیر اثر کو یوں ہاتھ سے دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ قبائلی رقابت کا عنصر افراد کی حد تک تو کارفرما نظر آتا ہے مگر قریشی قبیلوں / خاندانوں / گھرانوں نے اسلام کی مخالفت بحیثیت مجموعی نہیں کی تھی۔ قریشی قبائل اور خاندانوں کے اسلام کی جانب رویے سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں سے تقریباً ہر خاندان اور گھرانے کے افراد مسلمان ہو گئے تھے۔ بلکہ بعض حالات میں اکثر گھرانے کے گھرانے اسلام لے آئے تھے۔ دراصل عرب قبائلی نظام کا خاصہ یہ تھا کہ سربراہ خاندان / شیخ قبیلہ کا اثر عموماً اس کے خاندان / قبیلہ والوں پر پڑتا تھا اور بقول حضرت عمرو بن عاص بھی ارکان قبیلہ و خاندان اپنے سربراہ کی اندھا دھند تقلید کرتے تھے۔ لیکن یہ اسلام کا عظیم کارنامہ تھا۔ جس نے نوجوانان قریش کو اکابر قریش کی اندھی تقلید سے آزاد کر کے خود کچھ فیصلے کرنے پر ابھارا تھا۔ ان کو اسلام کی سادگی، سچائی اور گہرائی نے اپنا پیرو بنا لیا تھا۔ اسی بنا پر ایک مصری عالم عبد المتعال صعیدی نے اسلام کی اولین تحریک کو نوجوانوں کی تحریک قرار دیا ہے۔

مشہور مستشرق مونٹگمری واٹ کا خیال ہے کہ مکہ کے اولین مسلمانوں کو تین طبقات میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ اول طبقہ ان نوجوانان قریش پر مشتمل تھا جو بہترین خاندانوں کے لال تھے۔ یہ ان مکی خاندانوں کے افراد تھے جو مکہ کی سیاست و سماج میں سب سے زیادہ با اثر با اقتدار اور با رسوخ تھے اور عموماً یہ ان کے فرزند یا قریبی عزیز و رشتہ دار تھے۔ دوسرا طبقہ ان نوجوانوں پر مشتمل تھا جو قریش کے اہم ترین اور سربرآوردہ ترین خاندانوں سے نہیں تھے اور تیسرا طبقہ ان مسلمانوں پر مشتمل تھا جو مکہ کے قبائلی نظام میں اپنی ذاتی بنیادیں نہیں رکھتے تھے اور دوسرے قریشی قبیلوں یا خاندانوں پر منحصر تھے۔ ان میں دراصل موالی اور حلفاء شامل تھے۔ یہ تقسیم کسی حد تک صحیح ہے۔ مونٹگمری واٹ نے مسلمانان مکہ میں صرف مردوں کو شامل کیا ہے۔ ان میں عورتوں اور بچوں کو بھی شامل کرنا چاہیئے۔ ان کی شمولیت سے مکی عہد میں مسلمان ہونے والے قریشیوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ جتنی کہ مستشرقین کی فہرستوں میں دکھائی گئی ہے۔ یا جتنی عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مستشرقین کی فہرستوں میں مکی مسلمانوں کی کثیر تعداد کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ مونٹگمری واٹ کی فہرست مسلمین مکہ میں کل سو نام ملتے ہیں جبکہ ان کی تعداد کئی گنا زیادہ تھی۔ اگر ہمارا یہ مفروضہ کہ فی بالغ مسلم چھ یا سات اراکین کو شمار کرنا چاہیئے۔ صحیح ہے تو مکی عہد میں بالغ و

نابالغ مرد و عورت اور بچوں سمیت کل مسلم آبادی خاص قریشی خاندانوں کی ڈیڑھ دو ہزار سے کسی طرح کم نہیں رہی ہوگی اس کی تائید ماخذ کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ فتح مکہ کے لشکر اسلامی میں مہاجر مجاہدین کی تعداد سات سو تھی گویا کہ اس وقت تک مدینہ میں کل قریشی مہاجرین کی تعداد چار پانچ ہزار کے درمیان تھی۔

مکی عہد میں تبلیغ اسلام کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام صرف مکہ کی حدود یا قبائل قریش تک محدود نہیں رہا تھا۔ وہ نہ صرف جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں میں روشناس ہوا تھا۔ بلکہ جنوب، مغرب اور مشرق کے بعض علاقوں میں پھیل بھی گیا تھا۔ جنوب میں اشعر، رہا وغیرہ قبیلوں نے مکی عہد میں اسلام قبول کیا تھا۔ مغرب میں غفار، اسلم، ازد شنوءہ اور دوس کے قبیلوں میں مسلمانوں کی تعداد معتد بہ ہوگئی تھی۔ بلکہ اوّل الذکر دونوں قبیلے تو تقریباً پورے ہجرت تک اسلام کے پیرو بن چکے تھے۔ اسی طرح مشرق میں قبیلۂ عبد القیس وغیرہ میں اسلام پھیل گیا تھا۔ پھر سنہ ۶۲۰ء تا سنہ ۶۲۲ء میں مدینہ کی تقریباً پچانوے فیصد آبادی مسلمان ہو چکی تھی۔ جو تقریباً بیس پچیس ہزار اشخاص پر مشتمل تھی۔ مدنی مسلمانوں کو چھوڑ کر مکی مسلمانوں اور دوسرے قبائل میں منتشر مسلمانوں کی تعداد ہجرت نبوی کے وقت کسی طور سے پانچ چھ ہزار سے کم نہ تھی۔ تاریخی تناظر میں دیکھنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تیرہ برس کے عرصے میں ایک پیغمبر خدا نے اپنے ماننے والوں کی اتنی بڑی تعداد بنالی تھی۔ بلاریب وہ ایک عظیم کارنامہ تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اسلام کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے اس کار عظیم میں آپ کے جاں نثاروں کا لہو۔ قربانیاں اور کوششیں بھی شامل تھیں۔ ان میں جن مبلغین کا نام سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ وہ ہیں حضرات ابوذر غفاری۔ ابوموسیٰ اشعری، طفیل بن عمرو دوسی، ضماد بن ثعلبہ ازدی اور اشج عبدی وغیرہ۔ اسی کے ساتھ ساتھ قریشی مسلمانوں میں حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، ابوعبیدہ، زبیر، سعید بن زید، طلحہ وغیرہ کے ناموں کو بھی شمار کرنا چاہیئے۔ ان اور ان کے بہت سے گمنام اور غیر معروف و غیر مذکور صحابہ ہی نے اسلام کی مکی عہد میں نشر و اشاعت کا فریضہ انجام دیا تھا۔

مدنی عہد میں بھی تبلیغ اسلام کے دو دور تھے: اوّل ہجرت نبوی سے غزوہ خندق تک (سنہ ۶۲۲ء تا سنہ ۶۲۵ء) اور دوسرا غزوہ خندق کے بعد سے وفات نبوی تک (سنہ ۶۲۶ء تا سنہ ۶۳۲ء)۔ اور ان دونوں ادوار میں اسلام اور اسلامی ریاست کے رویے میں فرق تھا۔ دور اول میں اسلامی ریاست نے بعض قبائل عرب سے حلف اور دوستی کے معاہدے کئے تھے۔ ان کو اسلامی امت کا رکن بنائے بغیر۔ لیکن دور دوم میں ایسے دفاعی اور دوستانہ معاہدے ختم ہوگئے تھے۔ اب اسلامی ریاست تمام قبائل عرب سے دو مطالبے کرتی تھی: یا تو اسلام قبول کریں اور امت اسلامی کے مکمل رکن بن جائیں یا اسلامی ریاست کی بالادستی قبول کریں اور جزیہ ادا کریں۔ لیکن اسلام کا وہی ایک رویہ تھا۔ سب کو اپنے پرچم تلے جمع کرنا۔

مدنی عہد کے دور اوّل میں سیاسی اور فوجی مصروفیتوں اور مہموں کے سبب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ توجہ تبلیغ اسلام پر صرف کرنے کی فرصت نہ ملی۔ تاہم جب بھی آپ کو موقعہ ملا آپ نے تبلیغی جماعتیں اور انفرادی مبلغین بھیجے اور بنفس نفیس تو آپ نے غالباً کسی موقعہ کو اپنے پیغام کی دعوت دینے کے لئے لحاظ سے ہاتھ سے جانے دیا۔ چنانچہ مہموں اور جنگوں کے دوران آپ نے قبولِ اسلام کے لئے لوگوں کو دعوت دی اور بہت سی مہموں میں لوگ اسلام کے حلقہ بگوش بنے

بھی۔ جہاں تک تبلیغی جماعتوں کا تعلق ہے۔ غزوات بئر معونہ اور رجیع ان کی شاندار مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے بعض مہمیں خاص مذہبی اعتبار سے ترتیب دی تھیں۔ آپ کی بعض ابتدائی مہمیں اسی نوعیت کی تھیں۔

اس دور حیات کے دوسرے عرصے یا نصف میں آپ کی تبلیغی سرگرمیوں میں بہت اضافہ ہوا اور آپ نے متعدد سفارتیں، تبلیغی جماعتیں اور مبلغین کے دستے بھیجے۔ اور صرف عرب کے باشندوں اور حکمرانوں کو دعوت نہیں دی، بلکہ قرب و جوار کے حکمرانوں اور سلاطین کو بھی اسلام کی طرف بلایا۔ غیر ملکی حکمرانوں کی حد تک تو دعوت اسلامی زیادہ کامیاب نہیں ہوئی، تاہم جہاں تک جزیرہ نمائے عرب کا تعلق ہے۔ آپ کی دعوت پوری طرح سے قبول و منظور کی گئی اور اس کے گوشے گوشے میں اسلام پھیل گیا۔

مدنی دور میں قبائل عرب کا اسلام کی جانب رویے کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کے مغرب میں آباد قبائل سب سے پہلے اسلام کی جانب متوجہ ہوئے۔ پہلے انہوں نے اسلامی ریاست سے دفاعی اور دوستانہ معاہدے کئے اور پھر اسلام کے پیرو بنتے گئے۔ تاآنکہ ان میں سے کوئی بھی اسلام کے دائرے سے باہر نہیں رہا۔ مغربی قبائل میں کچھ تو ہجرت نبوی کے مابعد اور زیادہ تر بدر اور غزوہ خندق کے دوران اسلام کے ماننے والے بن چکے تھے۔ مشرقی قبائل نے اسلامی ریاست کی مخالفت زیادہ دنوں تک جاری رکھی اور اس کے سبب اسلام کے ساتھ بھی ان کا رویہ معاندانہ ہی رہا۔ لیکن انفرادی طور سے ان میں اسلام پھیلتا رہا اور ان کے افراد اور بعض بعض حالات میں ان کے گھرانے اور طبقات اسلام قبول کرتے رہے۔ ان قبیلوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے میں اسلامی ریاست کی مادی شوکت و حشمت نے بھی خاصا اہم کردار ادا کیا تھا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کی اشاعت ان کے درمیان تیز تر ہو گئی اور فتح مکہ تک وہ اکثر و بیشتر اسلام کے دامن عاطفت میں آچکے تھے اور باقی ماندہ فتح مکہ کے بعد اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے۔ شمالی قبائل میں جو مدینہ اور وادی القریٰ کے درمیان آباد تھے وہ اسلام کی طرف زیادہ اور سرعت کے ساتھ مائل ہوئے لیکن جوں جوں مدینہ سے مسافت بڑھتی گئی اسلام کی قبولیت کی رفتار سست ہوتی گئی اور شامی سرحد کے آس پاس بسے قبائل میں سے اکثر مسلمان عہد نبوی میں نہیں ہوئے تھے۔ اس کے برخلاف جنوب میں اسلام کی تبلیغ بڑی ہمہ گیر اور تیز رفتار تھی۔ اگرچہ اسلام وہاں مکی عہد میں روشناس ہو چکا تھا۔ اور بعض قبیلے مسلمان ہو چکے تھے تاہم اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام فتح مکہ کے بعد شروع ہوا اور دو ڈھائی برس کے عرصے میں پورا جنوبی عرب کلمہ پڑھ چکا تھا۔ مگر منتشر و پراگندہ قبائل میں اسلام کی اشاعت اتنی ہمہ گیر اور تیز نہیں تھی۔ ان میں سے زیادہ تر قبیلے اسلام اور کفر میں منقسم تھے۔ البتہ ان کے بعض بڑے قبیلے پورے مسلمان ہو چکے تھے۔ اسلام کے دائرے سے اکثر و بیشتر وہی باہر تھے۔ جو بالکل سرحدی علاقوں میں آباد تھے۔ بہر حال جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا آخری حج ادا کیا تو آپ کے جلو میں کم و بیش ایک لاکھ بیس ہزار مسلمان تھے اور نہ جانے کتنے اپنے گھروں میں رہ گئے تھے۔ اور اللہ کا نام لے رہے تھے۔ ایک اندازہ کے مطابق اس وقت تک مسلمانوں کی کل آبادی پانچ دس لاکھ کے لگ بھگ تھی اور کئی لاکھ مربع کلو میٹر علاقہ اسلامی ریاست کے قبضے میں تھا بلاریب یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ربع صدی سے بھی کم مدت میں عظیم ترین و بے مثل کارنامہ تھا۔ اور اسلام کی روحانی تاثیر اور تسخیر قلوب کا بینظیر ثبوت۔

باب سوم

فوجی تنظیم عہدِ رسالت میں

مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے قیام کا لازمی تقاضا تھا کہ اس کی ایک فوجی تنظیم بھی ہو۔ ہجرت کے بعد یثرب میں آباد مسلم امت نہ صرف ہر لحاظ سے کمزور اور فرومایہ تھی بلکہ وہ دشمنوں سے گھری ہوئی بھی تھی گویا کہ امت مسلمہ ایک جزیرہ امن وامان میں آباد تھی اور اس کو مخالفت وعداوت کی طاقتیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین مکہ کو سب سے زیادہ خطرہ مکہ کی طاقت ور اشرافیہ سے محسوس ہوتا تھا اور یہ خوف بلاوجہ نہیں تھا۔ مدینہ میں اسلامی ریاست کے وجود کو اشراف و فرایین قریش اپنی اقتصادی شہ رگ پر چھری تصور کرتے تھے۔ کیونکہ وہ شام جانے والی بین الاقوامی شاہراہ تجارت کے ناکہ پر واقع تھی وہ بخوبی جانتے تھے کہ اگر اس نوزائیدہ اسلامی ریاست اور غیر منظم اسلامی اُمت کو پنپنے اور منظم ہونے کا موقع دیا گیا تو وہ ایک دن ان کے اقتدار و بالادستی کو چراغ دکھائے گی۔ مدینہ کی ریاست کی ترقی دراصل مکی اشرافیہ کی موت تھی۔ سیاسی، سماجی، مذہبی اور اقتصادی غرض کہ ہر طرح کی موت مسلمانوں کو قریشی جذبات وخیالات کا بخوبی احساس وادراک تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نرغۂ اعداء سے یوں بچ نکلنا دراصل جلتی پر تیل کے مترادف تھا۔ لہٰذا قریش مکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے ہوجائیں گے اور اسلامی ریاست کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے اور حقیقتاً یہی ہوا بھی تھا۔ ہجرت نبوی کے مابعد سے انہوں نے بھرپور کوششیں کی تھیں کہ اسلامی ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجادیں۔

اس عظیم ترین بیرونی خطرہ کے علاوہ مدینہ کی جنت میں بھی کچھ سانپ موجود تھے اور اسلامی ریاست کو اپنے گھر کے بھیدیوں کے خطرات، سازشوں اور کینہ توزیوں کا سامنا تھا۔ مدینہ کے یہودی قبیلے جن کی تعداد بیس سے اوپر تھی، اسلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین مخالف تھے۔ اور وہ کسی قیمت پر اسلامی ریاست کو موجود اور ترقی کرتے دیکھنا پسند نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی مخالفت کے مذہبی اور سیاسی نیز اقتصادی اسباب تھے۔ وہ اپنی مذہبی اور اقتصادی بقاء اسلامی ریاست کی بربادی ہی میں دیکھتے تھے اس لئے وہ اس مقصد کے لئے ہر طرح کی ساز باز کر سکتے تھے اور ہر دشمن اسلام کے ساتھ اتحاد و معاہدہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے بھی حقیقتاً یہی کیا اور اسلامی ریاست کے سب سے بڑے دشمن۔ قریش۔ کے ساتھ ساز باز بھی کی اور فوجی وسیاسی اتحاد کی کوشش بھی۔

اندرونی مخالفین اور اعداء کا ایک عنصر ان نام نہاد مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ جو بظاہر مسلمان تھے لیکن بباطن سخت ترین دشمنِ اسلام۔ ان چھپے ہوئے منافقین کی عداوت کہیں زیادہ خطرناک تھی وہ نہ صرف دشمنوں کو اندر کے حالات سے باخبر کرتے تھے، بلکہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرتے تھے اور اس طرح امت اسلامی کے تار و پود کو اندر ہی اندر بکھیر دینا چاہتے تھے۔

ایک چوتھا مخالف عنصر بدوی قبائل عرب کا تھا۔ جو مدینہ کے گرد و نواح میں آباد تھا وہ اپنی بدوی روایات کے پیش نظر

اسلامی ریاست کا ممکن دشمن بن سکتا تھا کیونکہ اسلامی ریاست کا مطلب تھا مرکزیت اور اجتماعیت کا مدنی سیاسیات میں پیدا ہونا، اور یہ مرکزیت ان بدو قبائل کو پسند نہیں آسکتی تھی۔ اس کے علاوہ ان میں سے بعض کے حلیفانہ تعلقات قریش مکہ سے تھے، اور وہ ان کی حمایت میں اسلامی ریاست کے مخالف بن سکتے تھے۔ پھر اسلامی ریاست جن مقاصد اور نصب العین کے لیے وجود میں آئی تھی ان کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ اگر یہ بدوی قبائل دوست نہ بنتے تو ان کا دشمن بننا لازمی تھا۔

ان متعدد خطرات اور مختلف دشمنوں کے پیش نظر اسلامی ریاست کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ وہ اپنی فوج بنائے اور ایک عسکری تنظیم اپنائے، کیونکہ اس کے بغیر اس کا وجود مستقل معرض خطر میں تھا۔ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دور بین نگاہ اور حقیقت شناس نظر تھی جس نے ابتدائے کار ہی سے اس کار عظیم کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔ چونکہ آپ ایک عملی انسان تھے اس لیے آپ نے اسلامی ریاست کے قیام کے مابعد اس کی طرف بھرپور توجہ دی اور ایک فوجی و عسکری تنظیم کی کوششیں شروع کر دیں۔ فوجی صلاحیتوں، قائدانہ لیاقتوں، عسکری ہم آہنگی، اخلاقی اور روحانی بلندی، جسمانی خوبیوں اور کسی حد تک مادی وسائل کی کمی نہیں تھی۔ صرف تنظیم اور ترتیب کی ضرورت تھی اور ان مادی اور روحانی صلاحیتوں کو ایک مستعد و منظم و مرتب فوج میں ڈھالنے کی ضرورت تھی۔

عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں دراصل اس عسکری تنظیم کی سنگ بنیاد تھیں۔ بنیادی طور سے وہ فوجی مہمیں نہیں تھیں لیکن ساتویں صدی کے نصف اول کے عرب میں مذہبی و اقتصادی / تجارتی کارواں بھی تلواروں کی چھاؤں ہی میں سفر کر سکتے تھے وہ دفاعی اور سیاسی جماعتیں ہونے کے باوجود تیر و تفنگ، تلوار و تبر اور نیزوں کی مدد ہی سے اپنا راستہ بنا سکتی تھیں۔ چنانچہ ان مہموں نے نہ صرف عسکری نظام نبوی کی داغ بیل ڈالی۔ بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو فوجی تربیت و تنظیم و ترتیب بھی عطا کی خطرات سے مردانہ وار نپٹنا، دلیرانہ دشمنوں کا سامنا کرنا، اجنبی علاقوں اور لوگوں سے ربط و واقفیت حاصل کرنا اور ان سے بڑھ کر ایک منظم عسکری گروہ کی مانند کام کرنا سیکھا۔ یہی وہ تربیت و تنظیم تھی جس نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کو ایک فوج میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا اور جب اچانک بدر کے میدان میں ان کا سامنا اپنے سے تین گنا بڑے لشکر سے ہوا تو نہ صرف یہ کہ انہوں نے ان کا بھرپور مقابلہ کیا بلکہ اسی تنظیم کی بدولت اس کو شکست فاش دی، یہ یہی عسکری تنظیم تھی جس نے احد، خندق، خیبر اور نہ جانے اور کتنی مہموں میں ان کو دشمنوں کے مقابلے میں سرخرو کیا تھا۔ اسی فوجی قوت کے سامنے عرب کے سب سے بڑے اور سب سے طاقتور شہر مکہ نے گھٹنے ٹیک دیئے تھے اسی سے ہوازن اور غطفان کے طاقتور قبائل نے مات کھائی تھی، اسی کے عظیم الشان مظاہرے کے نتیجے میں وقت کی سب سے بڑی طاقت — رومی سلطنت — اور اس کے باجگذاروں اور حامیوں کو تبوک کے میدان میں مد مقابل ہونے کی جرأت نہیں ہوئی تھی، اسی عسکری طاقت نے جزیرہ نمائے عرب کے کونے کونے اور گوشے گوشے میں اسلامی ریاست کے مادی اقتدار کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ مادی لحاظ سے یہی قوت تھی جس نے تمام قبائل عرب کو اسلامی ریاست کی بالادستی ماننے پر مجبور کر دیا تھا۔ عہد نبوی میں عربوں کی مکمل تسخیر کے بعد اسی فوجی طاقت نے خلافت راشدہ میں عالمگیر فتوحات کا باب کھولا تھا اور اسی کو ایک عالمگیر سلطنت میں بدل دیا تھا۔

تاریخی حقائق اور اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ مدینہ کی اسلامی ریاست کی عسکری تنظیم کو ترقی کرنے میں کافی وقت لگا تھا اور وہ

متعدد مرحلوں سے گذری تھی۔ اس کے علاوہ مدنی حیاتِ طیبہ کے دہ سالہ دور میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد و مختلف فوجی افسروں اور کارکنوں کی تقرری وقت اور ضرورت کے تقاضوں کے مطابق کی تھی اور اس طرح رفتہ رفتہ ایک فوجی سلسلۂ افسران و عسکری عمال وجود میں آیا تھا۔ ان فوجی افسروں میں جو لوگ شامل تھے وہ یہ تھے: (۱) امراءِ سرایا (آزاد مہموں کے قائدینِ لشکر) (۲) فوجِ نبوی میں آپ کے ماتحت افسران (جیسے امراءِ میمنہ، میسرہ، مقدمہ اور ساقہ) یا امراءِ مشاۃ (پیدل فوج) امراءِ رماۃ (تیر اندازوں کے افسر) (۳) علمبرداران افواج (صاحب الالویہ والرایات) (۴) اطلاعی گشتی دستے اور ان کے افسر طلیعہ، طلائع (۵) جاسوس (عیون) (۶) راہ بر (دلیل) اموالِ غنیمت اور قیدیوں کے نگران افسر (صاحب الغنائم والاسریٰ) ہتھیاروں اور جنگی گھوڑوں کے افسر (صاحب السلاح والفرس) اور محافظ دستوں کے افسر (اصحاب الحرس) وغیرہ۔ فوجی تنظیم نبوی کے تاریخی ارتقاء کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کا تاریخی توقیت کے مطابق مطالعہ کریں۔ اس لئے آغازِ کلام امراءِ سرایا سے ہوتا ہے کہ یہی فوجی تنظیم کے بانی و مبانی تھے یا اس کا نقطۂ آغاز۔

۱۔ امراءِ سرایا (فوجی مہموں کے قائدین)

اسلامی ریاست کی عسکری تنظیم میں اعلیٰ اختیارات کس کے ہاتھ میں تھے؟ تاریخ اسلام کا تھوڑا سا بھی مطالعہ جس کسی کا ہوگا وہ بلا کسی پس و پیش کے یہ جواب دے گا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سارے اختیارات حاصل تھے۔ منطق کا بھی یہی تقاضا ہے کہ جس شخصیت کی بالادستی تسلیم کی جا رہی ہے اس کو یہ اختیارات تفویض کئے جائیں۔ مگر مونٹگمری واٹ کی تحقیق یہ ہے کہ بیعتِ عقبۂ ثانیہ میں فوجی قیادت کا مسئلہ طے نہیں کیا گیا تھا اور آپ کے فوجی اختیارات کی نوعیت اجاگر نہیں تھی۔ یہ واضح امر ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدنی ریاست میں جو بھی اختیار و اقتدار حاصل تھا اس کا سرچشمہ آپ کی رسالت تھی یعنی خدائے قادرِ مطلق کے نبی و رسول کی حیثیت سے اس کے احکام و اوامر کو آپ اس اسلامی ریاست میں نافذ کرنے کے مجاز تھے اور ظاہر ہے کہ آپ سے بڑھ کر اور کون خدائی مرضی اور احکام کو سمجھ اور نافذ کر سکتا تھا لیکن قریشِ مکہ کی مانند اگر مستشرق موصوف بھی آپکی رسالت اور اس کے عطا کردہ سرچشمہ اقتدار و اختیار کو نہیں تسلیم کرتے تو تاریخ کی ٹھوس واقعاتی شہادت تو تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ ماخذ کا بیان ہے کہ ہجرت کے چھ ماہ بعد آپ نے پہلی مہم ترتیب دی اور قیادت کا پرچم اپنے ایک صحابی کو عطا کیا۔ پھر اسی ماہ دوسری مہم کی قیادت دوسرے صحابی کو دی اور یہ سلسلہ جاری رہا کبھی خود آپ اپنی قیادت میں مہمیں لیکر گئے اور کبھی اپنے اصحاب کو قیادت کا فریضہ سونپا۔ یہاں تک کہ متعدد جنگوں میں فوجی کمان میدانِ جنگ میں بنفسِ نفیس آپ نے فرمائی۔ آپ کو یہ اختیار کس نے دیا تھا اور اس کو امتِ مسلمہ نے کیونکر قبول و تسلیم کیا تھا؟ لہٰذا نظریاتی اور واقعاتی دونوں طرح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی عسکری تنظیم میں سب سے اعلیٰ و ارفع اختیارات آپ کی ذات کو حاصل تھے"! اس کے علاوہ مزید شہادت دستورِ مدینہ کی دفعہ نمبر ۳۶ سے فراہم ہوتی ہے جس کے مطابق جنگ میں شریک ہونے یا نکلنے کی اجازت اختیارِ نبوی کے دائرہ میں تھی (۲) گویا کہ آپ اسلامی افواج کے سالارِ اعظم اور قائدِ اعظم تھے اور آپ کو نہ صرف بنفسِ نفیس افواج کی قیادت کا حق و اختیار حاصل تھا بلکہ اپنی

جگہ یا اپنے ماتحت افسران فوج کی تقرری کا اختیار بھی حاصل تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ کم از کم عہدِ نبوی میں سربراہ مملکت و ریاست ہی افواج اسلامی کا سربراہ اعظم ہوتا تھا اور وہی یکہ و تنہا مستقل فوجی افسر اور قائد۔ بقیہ امراء سرایا یا قائدین افواج کی تقرری اور حیثیت دونوں عارضی ہوتے تھے، جیسا کہ ہم ابھی امراء سرایا کی بحث میں دیکھیں گے۔

اسلامی تاریخ میں سریہ اس مہم کو کہتے ہیں کہ جس کی قیادت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کسی صحابی کو سونپ دی ہو اور غزوہ اس مہم کو جس میں آپ بنفس نفیس سالار فوج کی حیثیت سے موجود ہوں۔ چنانچہ حالات کے مطابق آپ نے متعدد مہموں کی سربراہی اور قیادت اپنے مختلف اصحاب کو عطا فرمائی۔ واقدی کے بقول پہلی مہم ہجرت کے چھ ماہ بعد رمضان ۱ھ / مارچ ۶۲۳ء میں ترتیب دی گئی اور پہلا قائد حضرت حمزہ بن عبد المطلب کو مقرر کیا گیا اور آخری مہم حیاتِ نبوی کے آخری ایام میں ربیع الاول ۱۱ھ / جون ۶۳۲ء میں ترتیب کی گئی، اور حضرت اسامہ بن زید کلبی کو قائد بنایا گیا[۲]۔ درمیانی عرصے میں اس منصب جلیل پر ۴۷ اور تقرریاں کی گئی تھیں۔ جبکہ قائدین کی تعداد کل ۳۴ تھی تقرریوں اور قائدین کے تناسب میں واضح فرق سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بعض امراء سرایا کو ایک سے زیادہ مرتبہ یہ شرف ملا تھا۔ ان خوش نصیب و معتمد قائدین میں نمایاں حضرات تھے، جناب محمد بن مسلمہ اوسی، علی بن ابی طالب ہاشمی، غالب بن عبداللہ لیثی اور خالد بن ولید مخزومی۔ اوّل الذکر دونوں حضرات نے تین تین مہموں کی قیادت کی تھی۔ جبکہ مؤخر الذکر دو صحابیوں نے چار چار مہموں کی[۳]۔ لیکن عہد نبوی میں امراء سرایا یا قائدین نبوی میں سب سے اہم اور نمایاں شخصیت نہ کسی قریشی کی تھی نہ کسی انصاری کی اور نہ ہی قریش و عرب کے کسی طبقۂ اشراف کے کسی فرد کی۔ بلکہ یہ شرف حاصل ہوا تھا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مولیٰ (آزاد کردہ غلام) حضرت زید بن حارثہ کلبی کو۔ انہوں نے بہ اختلاف روایت و شہادت تیرہ یا گیارہ مہموں کی قیادت کی تھی۔ ان کی پہلی تقرری جمادی الآخر ۳ھ / نومبر ۶۲۴ء میں ہوئی تھی اور آخری تقرری جمادی الاولیٰ ۸ھ / ستمبر ۶۲۹ء پیش[۵]۔ مآخذ کا تقریباً متفقہ بیان ہے کہ اگر کسی مہم میں زید بن حارثہ کلبی موجود و شریک ہوتے تو لازمی طور سے وہ اس کے قائد مقرر کئے جاتے تھے[۶]۔

ان عظیم ترین صف اول کے قائدین افواج کے علاوہ بعض ایسے امراء سرایا تھے۔ جنہوں نے یہ سعادت دوبارہ حاصل کی تھی ان کی تعداد چھ تھی[۷]۔ گویا کہ کل امراء سرایا کی تعداد ۳۹ تھی اور تقرریوں کی تعداد ۷۴ ہے[۸]۔ اتنی زیادہ تقرریوں اور امراء سرایا کی کثرت تعداد سے یہ بات از خود واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں تک عہدہ اور منصب کا تعلق تھا وہ تو مستقل تھا مگر عہدہ دار اور منصب دار مستقل طور سے مقرر نہیں کئے جاتے تھے اور اس کا سبب ظاہر تھا کہ سوائے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی ان کی موجودگی میں مستقل سالارِ لشکر نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں آپ کے اعلیٰ اختیارات محدود ہو جاتے۔ چنانچہ صورتحال یہ تھی کہ ضرورت اور حالات کے تحت امراء سرایا مقرر کئے جاتے تھے اور مہم کے انجام پاتے ہی ان کی تقرری اور ان کا عہدہ ختم ہو جاتا تھا اور پھر دوسرے مواقع پر دوسرے یا انہی میں سے کسی کا تقرر کیا جاتا تھا۔ امیر سریہ کی تقرری کی یہ عارضیت دراصل دو سبب سے تھی: اوّل یہ کہ اسلامی ریاست کی کوئی مستقل اور باقاعدہ فوج نہیں تھی۔ ضرورت کے وقت مسلم آبادی میں سے بالغ مرد ایک فوج بنا لیتے تھے اور ضرورت ختم ہوتے ہی یہ فوج توڑ دی جاتی تھی۔ لہٰذا اس کے ساتھ ہی سالار فوج کا عہدہ اور تقرری بھی ختم ہو جاتی تھی۔ دوم یہ کہ مستقل سالار فوج رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور جب آپ چاہتے تھے عارضی طور سے اپنا اختیار اپنے کسی صحابی کو منتقل کر دیتے تھے جو تھوڑی سی مدت کے لئے امیر سریہ بن جاتا تھا۔

امراء سرایا کے بارے میں ایک اہم حقیقت یہ ہے کہ ان کی تقرریاں مختلف قبائل اور بطون میں اچھی طرح سے منقسم تھیں اور تقریباً ہر قبیلہ کو جو اس وقت تک اسلامی ریاست کا ہمنوا بن چکا تھا اور قائدانہ صلاحیتیں رکھتا تھا۔ قیادتِ افواجِ اسلامی کا موقعہ دیا گیا تھا ذیل میں اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے ایک شجرہ دیا جا رہا ہے۔ جس سے تمام امراء سرایا کی قبیلہ وار تقسیم کا علم ہو سکے گا۔

نمبر شمار	قبیلہ / خاندان	تقرریوں کی تعداد	عہدوں کی تعداد
ا و	قریش	۲۵	۱۸
۱	بنو ہاشم	۵	۳
۲	بنو امیہ	۴	۴
۳	بنو سہم	۳	۲
۴	بنو مخزوم	۵	۲
۵	بنو فہر	۳	۲
۶	بنو زہرہ	۲	۲
۷	بنو مطلب	۱	۱
۸	بنو تیم	۱	۱
۹	بنو عدی	۱	۱
(ب)	خزرج	۱۱	۸
(ج)	اوس	۶	۳
(د)	کلب	۱۰	۲
(س)	بلی	۱	۱
(ص)	سلیم	۱	۱
(ط)	غطفان	۱	۱
(ع)	ہوازن	۲	۲
(ف)	قیس عیلان	۲	۲
(ق)	اسد / خزیمہ	۴	۳
(ک)	کنانہ	۷	۴
ل	ازد	۲	۲

(م) بجیلہ	ا	ا
(ن) غیر معروف	ا	ا
کل میزان	۷۴	۴۹

جیسا کہ شجرہ سے واضح ہوتا ہے کہ بیشتر تقرریاں اس حلقۂ افسران میں قبیلۂ قریش کو ملی تھیں اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ قریش نہ صرف پورے عرب میں عددی لحاظ سے سب سے بڑا قبیلہ اور گروہ تھے بلکہ وہ فوجی صلاحیتوں اور لیاقتوں کے لئے بھی پورے عرب میں ممتاز تھے۔ قریش کے ضمن جو نکتہ قابل ذکر ہے وہ یہ کہ امراء سرایائے نبوی میں بنو امیہ کی تعداد کافی اہم تھی[۹] جہاں تک ان کے افسروں کی تعداد کا تعلق ہے وہ تمام قبائل عرب میں سب سے زیادہ تھے۔ اگرچہ ان کی تقرریوں کی تعداد کم تھی۔ بہرحال ان کی اتنی بڑی تعداد میں شمولیت سے ایک طرف ان کی قائدانہ لیاقتوں اور عسکری صلاحیتوں کا ثبوت ملتا ہے جن کے لئے وہ زمانہ جاہلیت سے شہرت اور نمایاں مقام رکھتے تھے تو دوسری طرف عہد نبوی میں بنو ہاشم اور بنو امیہ کی رقابت کی بالواسطہ تردید بھی ہوتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں بنو امیہ جاں نثاری میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ فتح مکہ تک قریشی اشرافیہ میں قیادہ (فوجی سالاری) کا منصب بنو امیہ ہی کو حاصل تھا اور بعثت نبوی کے زمانے میں ابوسفیان بن حرب اس کے آخری منصبدار تھے[۱۰]

عسکری تنظیم کے اس شعبہ میں دوسرے نمایاں قریشی خاندان یہ تھے۔ بنو سہم، بنو مخزوم، بنو فہر اور بنو زہرہ وغیرہ جو قریشی اشراف مکہ کے ستون تھے[۱۱]۔ اگرچہ بنو مخزوم مکی اشرافیہ میں خاصا بڑا فوجی منصب (قبہ) رکھتے تھے اور اپنی عسکری صلاحیتوں کیلئے ممتاز تھے[۱۲]۔ مگر اسلامی تنظیم میں ان کو دوسرے قریشی سالاروں سے کچھ زیادہ حیثیت حاصل نہیں تھی۔ البتہ یہ امر بدیہی ہے کہ ان کے نمائندے حضرت خالد بن ولید مخزومی نہ صرف عہد نبوی میں بلکہ عہد ماقبل اسلام میں بھی اپنی عسکری قیادت کے لئے ممتاز و نمایاں ترین فرد رہے تھے۔ خلافت راشدہ میں انہوں نے جیسے جوہر دکھائے ان کے سبب آج ان کا شمار دنیا کے عظیم ترین سالاروں اور جنرلوں میں ہوتا ہے۔ عہد نبوی میں بھی ان کی فوجی صلاحیت کے جوہر خوب کھلے تھے۔ اور انہوں نے اپنی تمام جنگوں اور مہموں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے[۱۳]۔ بقیہ دوسرے قریشی سالار ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کن میں فوجی لیاقت اور صلاحیت زیادہ تھی۔ باقی تین امراء قریش کو اس شعبہ میں نمائندگی بہت کم درجہ کی ملی تھی اور انہوں نے عہد نبوی میں اپنی عسکری صلاحیتوں کی کوئی خاص چھاپ نہیں چھوڑی تھی۔ اگرچہ ان کے نمائندے حضرت ابوبکر تیمی[۱۴]، حضرت عمر بن خطاب عدوی[۱۵] اور حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہری[۱۶]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت اسلامی کے سب سے زیادہ محترم و معظم ارکان تھے۔ ان تینوں حضرات کی عسکری سوجھ بوجھ اور قائدانہ لیاقتوں کا اظہار عہد نبوی کے بعد ردہ کی جنگوں اور عراق و شام و مصر کی فتوحات کے معرکوں کے دوران ہوا تھا۔

دوسرے قبائل عرب میں مدینہ کے دونوں قبیلوں اوس اور خزرج کو مجموعی طور پر قریشی امراء کے بعد نمائندگی حاصل تھی ان دونوں کے گیارہ نمائندوں نے سترہ تقرریاں حاصل کی تھیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ خزرج کو اوس پر یک گونہ فضیلت حاصل تھی۔ غالباً اس کا

سبب ان کی عددی طاقت تھی جس کے نتیجہ میں ان میں عسکری صلاحیتیں نسبتاً زیادہ تھیں۔[۱۸] اس کا ثبوت کسی حد تک ماقبل اسلام کی ان جنگوں کے شواہد سے ملتا ہے جو ان دونوں نے آپس میں لڑی تھیں۔ اور جن میں عموماً خزرج کو برتری حاصل رہی تھی۔ جہاں تک قبیلہ کلب کا تعلق ہے تو حضرت زید بن حارثہ کلبی کے بارے میں مزید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ عہد نبوی کے سب سے بڑے قائد اور امیر سریہ تھے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ سب سے زیادہ مہموں کی قیادت کی تھی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بڑے لشکروں کی کمان بھی ان کو سونپی گئی تھی اس طرح ان کے فرزند دلبند حضرت اسامہ بن زید کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ کے آخری دنوں میں سب سے بڑے سریے کی کمان عطا فرمائی تھی۔ ان دونوں کی اس منصب عظیم پر تقرری کی اہمیت اس کے تاریخی تناظر میں دیکھنے سے زیادہ واضح ہوتی ہے۔ حضرت زید بن حارثہ مولیٰ تھے اور ان کے فرزند مولیٰ زادہ اور ظاہر ہے کہ اشراف قریش و انصار کے مقابلے میں وہ سماجی اعتبار سے فروتر تھے۔ اس کے علاوہ حضرت اسامہ تو اٹھارہ برس کے نوجوان تھے اور ان کی ماتحتی میں تمام بڑے بڑے شیوخ و اکابر قریش دے دیئے گئے تھے۔[۱۹] ان دو تقرریوں سے دو اہم نکتے روشنی میں آتے ہیں۔ اول یہ کہ اسلام اور اسلامی ریاست اپنے عہدوں پر تقرری کے لئے صلاحیت اور لیاقت دیکھتی تھی اور اسی کو اصل قرار دیتی تھی۔ چنانچہ ان دونوں بزرگوں نے اپنے کارناموں اور کامیابیوں سے ثابت کر دیا کہ وہ جس عہدے پر مقرر کئے گئے تھے۔ اس کے وہ بخوبی اہل تھے۔ دوم یہ کہ اسلامی ریاست سماجی امتیازات اور معاشرتی اونچ نیچ کے فرق کو عہدے اور تقرری کے ذیل میں قائم رکھنے کے حق میں نہیں تھی۔ کیونکہ اس کی بنیاد اسلام پر تھی جو ان امتیازات کو روا نہیں رکھتا۔ دراصل ایک مولیٰ اور مولیٰ زادہ کا تقرر کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے اکابر کو خاص کر اور اشراف عرب کو عام طور سے یہ سمجھا دینا چاہتے تھے کہ اسلامی ریاست میں عہدہ حاصل کرنے کی بنیاد صلاحیت اور صرف صلاحیت ہے۔ سماجی و قبائلی عزت اور سیادت کے جھوٹے دعوے نہیں۔

بقیہ قبائل عرب میں اسد اور کنانہ کو دوسرے قبیلوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ تقرریاں حاصل ہوئی تھیں اور اسکا سبب یہ تھا کہ ان کے زیادہ افراد اسلام کے حلقۂ بگوش ہو چکے تھے۔ یہاں اس نکتہ پر توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ اسد سے تعلق رکھنے والے تمام امیران سرایا دراصل قریش کے قبیلہ بنو امیہ کے حلیف تھے اور چونکہ حلفا اپنے سرپرست خاندان کے افراد شمار ہوتے تھے اس لئے ایک طرح سے یہ بنو امیہ کی تقرریاں تھیں۔ اس سے اسوقت کے سماج میں بنو امیہ کے مقام و حیثیت کی تعیین کرنے میں مدد ملتی ہیں اور ثابت ہوتا ہے کہ وہ خِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ (زمانۂ جاہلیت میں تمہارے جو لوگ بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں) کی حدیث نبوی کے مطابق مکی اشرافیہ اور اسلامی ریاست دونوں میں ایک نمایاں اور محترم مقام کے حامل تھے۔ اور ان کو مکمل اعتماد نبوی حاصل تھا۔ یہ دراصل ان کے خلوص اسلام اور پکے عقیدے کی دربار رسالت سے سند کے مترادف تھا جس پر عموماً ہمارے جدید مؤرخین شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ وہ قطعی بے بنیاد ہیں اور اس لئے بالکل غیر معتبر

اس ذیل میں ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امراء سرایا کے شعبہ میں اپنے چار قریبی اعزہ کو بھی مقرر فرمایا تھا۔ ان میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب آپ کے حقیقی چچا تھے[۲۰]، حضرت علی[۲۱] اور حضرت جعفر بن ابی طالب[۲۲] آپ کے حقیقی چچازاد بھائی تھے جبکہ حضرت ابو سلمیٰ بن عبدالاسد مخزومی[۲۳] آپ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ان کے علاوہ چھ اور امراء تھے جن

سے آپ کے ازدواجی یا حلف کے تعلقات تھے۔ ان میں حضرات ابوبکر و عمر و ابوسفیان بن حرب آپ کے خسر تھے[۲۴] تو حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت حفصہ کے سابق شوہر کے بھائی تھے[۲۵] جبکہ حضرات زید بن حارثہ اور ان کے فرزند اسامہ آپ کے حلیف تھے۔ اسوۂ نبوی کی ان مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رشتہ داری یا قرابت کا تعلق کسی طور سے عہدوں اور تقرریوں کے لیے مانع نہیں ہے بشرطیکہ وہ صلاحیت و لیاقت کی بنیاد پر کیا گیا ہو اور محض اقرباپروری اور اعزہ نوازی کے لیے نہ کیا گیا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تمام تقرریاں صلاحیت اور تقاضائے وقت و مہم کی بنیاد پر کی تھیں وہ نہ تو قبائلی اور خاندانی یا اقرباپروری کے اعتبار سے کی گئی تھیں اور نہ ہی کسی اور کا حق مار کے۔ بنیادی طور سے یہ عوامل و عناصر نہ تو آپ کو عہدے دینے اور تقرری کرنے پر آمادہ کرتے تھے اور نہ ہی آپ کو ان سے روکتے تھے۔ اور بلا ریب حکومت و ریاست کے معاملات میں اور خاص کر ایسے سماج میں جہاں سماجی امتیازات بہت ہوں یہی بہترین پالیسی ہے کہ تمام عہدے صلاحیت و لیاقت کی بنیاد پر دیئے جائیں اور کسی کو محض اس ڈر سے محروم نہ کر دیا جائے کہ اقرباپروری کا الزام آئے گا۔ کیونکہ تقویٰ، دیانت، ایمانداری اور انصاف کا یہی تقاضا ہے

امراء سرایا کے مطالعہ میں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کی تقرریوں کا تاریخی توقیت کے مطابق مطالعہ کیا جائے۔ اس سے بعض بہت اہم اور دلچسپ نکات ابھرتے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پہلی تین تقرریاں توقیتی لحاظ سے قریش کے تین خاندانوں ہاشم، مطلب اور زہرہ کو بالترتیب ملی تھیں[۲۶]۔ یہ تینوں تقرریاں بالترتیب مارچ، اپریل اور مئی ۶۲۳ء میں کی گئی تھیں۔ یعنی ہجرت کے چھٹے، ساتویں اور آٹھویں مہینے میں۔ پہلے ہاشمی حضرت حمزہ کے لگ بھگ چار سال بعد ایک اور ہاشمی حضرت علی بن ابی طالب نے اسلامی افواج کی کمان دسمبر ۶۲۷ء یا جنوری ۶۲۸ء / شعبان ۶ھ میں کی تھی[۲۷]۔ جبکہ موصوف کو دوبارہ مزید یہ سعادت، ربیع الثانی ۹ھ / جولائی۔ اگست ۶۳۰ء اور دسمبر ۶۳۱ء / رمضان ۱۰ھ میں ملی تھی[۲۸]۔ تیسرے ہاشمی حضرت جعفر بن ابی طالب نے موتہ کی مہم میں یہ ذمہ داری سنبھالی تھی۔ جبکہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین امراء سریہ میں ایک نامزد کیا تھا[۲۹]۔

اگرچہ کسی اموی کی پہلی تقرری کافی تاخیر سے یعنی ۷ھ / ۶۲۸ء میں ہوئی تھی جبکہ حضرت ابان بن سعید نے عسکری قیادت کا فریضہ انجام دیا تھا[۳۰]، تاہم امویوں کے ایک حلیف حضرت عبداللہ بن جحش کو یہ سعادت اسلامی ریاست کے قیام کے آغاز ہی میں رجب ۲ھ / جنوری ۶۲۴ء میں سریہ نخلہ میں ملی تھی[۳۱]۔ دو اور اموی حلیف حضرت عکاشہ بن محصن اور شجاع بن وہب نے بالترتیب ۶ھ / ۶۲۷ء اور ۸ھ / ۶۲۹ء میں یہ فریضہ انجام دیا تھا[۳۲]۔ بہرحال اموی خانوادے کے ایک اور فرزند حضرت خالد بن سعید کو، جو اتفاق سے پہلے اموی کمانڈر کے حقیقی بھائی تھے، ۸ھ / ۶۳۰ء میں اسلامی فوج کی کمان کرنے کا موقعہ ملا[۳۳]۔ اسی برس ایک اور اموی حضرت ہشام بن عاص کی بھی اس خدمت پر تقرری ہوئی[۳۴]۔ عہد نبوی کے چوتھے اور آخری کمانڈر حضرت ابوسفیان بن حرب تھے جنہوں نے مشترکہ طور سے یہ خدمت انجام دی تھی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ۸ھ / ۶۳۰ء میں اپنے قبول اسلام اور زوال مکہ کے فوراً بعد انہوں نے یہ فریضہ انجام دیا تھا[۳۵]۔

بقیہ قریشی کمانداروں میں حضرت خالد بن ولید مخزومی اور حضرت عمرو بن عاص سہمی نمایاں مقام رکھتے ہیں نہ صرف عہد نبوی میں اپنی جنگی اور فوجی صلاحیتوں اور کارناموں کے لیے بلکہ خلافت راشدہ کے زمانے میں بھی[۳۶]۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے عہد نبوی

میں اپنی اکلوتی مہم کی قیادت ذی قعدہ ۱ھ / مئی ۶۲۳ء میں کی تھی[۳۷]۔ جبکہ حضرت عمرو بن عاص سہمی کو پہلی کمان جمادی الاولیٰ ۸ھ / اکتوبر ۶۲۹ء میں ملی تھی۔ ان کی دوسری تقرری اسی ماہ میں ہوئی تھی جس میں مکہ فتح ہوا تھا[۳۸]۔ حضرت خالد بن ولید مخزومی کے سلسلے میں اب تک جو کچھ کہا جا چکا ہے۔ اب اسے دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور عظیم صحابی حضرت ابو عبیدہ بن جراح کو پہلی اور آخری کمان عہد نبوی میں ۶ھ / ۶۲۷ء میں ملی تھی[۳۹]۔ یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ عظیم ترین قریشی صحابہ کرام کو عسکری تنظیم کے اس شعبہ میں بہت کم نمائندگی ملی تھی اور جن کو قیادت کی سعادت ملی بھی تھی۔ انہیں کافی تاخیر سے ملی تھی اس کے علاوہ دوسروں کے مقابلے میں ان کی مہمیں کافی چھوٹی اور غیر اہم تھیں۔

اوس کو خزرج کے مقابلے میں فوجی قیادت کا موقعہ کچھ پہلے ملا تھا یعنی رمضان ۲ھ / مارچ ۶۲۴ء میں جبکہ خزرج کو اس کے ایک ماہ بعد یہ سعادت ملی تھی[۴۰]۔ اس سال اوس کو عسکری قیادت کا موقعہ بار بار ملا مگر خزرج کے کسی فرد کو یہ منصب ایک سال بعد محرم ۴ھ / جون ۶۲۵ء میں ملا۔ دوسرے برس ان کو تیسری بار یہ منصب ملا[۴۱]۔ دوسری طرف اوس کے ایک نمائندے حضرت محمد بن مسلمہ نے اپنے قبیلے کے لئے یہ اعزاز تین برس کی مدت گذرنے کے بعد حاصل کیا۔ صحابی موصوف کی اس عہدہ عظیم پر دوسری تقرری اس کے دوسرے برس اور آخری بار کسی اوسی کو تقرری کی سعادت مزید تین برس بعد ۸ھ / ۶۳۰ء میں ملی[۴۲]۔ جبکہ خزرج کو مسلسل ۶۲۶ء سے ۶۳۰ء تک اسلامی افواج کی کمان کرنے کا موقعہ ملتا رہا۔ سوائے ۶۲۸ء کے[۴۳]۔ حیات نبوی کے آخری دو برسوں میں نہ کسی اوسی کو اور نہ ہی کسی خزرجی کو فوجی قیادت کا موقعہ ملا[۴۴]۔ غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ ان برسوں میں مہموں کی تعداد کافی کم تھی اور دوسرے قبیلے کے مسلمانوں کی تعداد زیادہ۔ بہر حال انصار کے ان دونوں قبیلوں کی مشترکہ تقرریاں جو چھ برس تک مسلسل ہوتی رہیں اس بات کی شاہد ہیں کہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل اعتماد حاصل تھا اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قریش کے شانہ بشانہ وہ بھی اسلامی ریاست کی تعمیر و ترقی میں برابر کے شریک اور حکومت اسلامی میں برابر کے سہیم تھے۔

عسکری تنظیم کے اس شعبۂ سالاران میں آخری اہم عرب قبیلہ کنانہ تھا جس کے نمائندے حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو پہلی تقرری ۶ھ / ۶۲۷ء میں ملی[۴۵]۔ اس قبیلہ کے دوسرے سالار حضرت غالب بن عبد اللہ لیثی تھے۔ جن کی چار مہموں میں قیادت کا ذکر پہلے آ چکا ہے[۴۶]۔ کنانہ کی آخری کمان ربیع الثانی ۹ھ / جولائی اگست ۶۳۰ء میں رہی تھی۔ دوسرے قبائل اور بطون عرب کو سالاران افواج نبوی کے شعبہ میں بہت کم نمائندگی مل سکی تھی۔ اس کے متعدد اسباب تھے۔ جن میں اہم ترین مہموں کی تعداد کا محدود ہونا، قبائل عرب کا مدینہ سے دور آباد ہونا۔ امت مسلمہ میں ان کی مختصر و محدود نمائندگی وغیرہ تھے[۴۷]۔ بہر حال اس ضمن میں یہ قابل ذکر بات ہے کہ مذکورہ بالا قبیلوں کے علاوہ دوسرے قبائل عرب جیسے ازد، بجیلہ، غطفان اور ہوازن وغیرہ کو سالاران سرایا کے اس شعبہ میں تقرری حیات نبوی کے آخری دو برسوں میں ملی تھی جبکہ قیس عیلان اور بنو سلیم کو بالترتیب یہ سعادت ۳ھ / ۶۲۵ء اور ۸ھ / ۶۲۹ء میں ملی تھی[۴۸]۔ اس عسکری شعبہ میں قبائل عرب کی نمائندگی مندرجہ ذیل شجرے سے واضح ہوگی جو مسلم مہموں کی سالانہ تعداد اور مختلف قبائل کی متناسب نمائندگی کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

سنہ عیسوی	۶۲۳	۶۲۴	۶۲۵	۶۲۶	۶۲۷	۶۲۸	۶۲۹	۶۳۰	۶۳۱	۶۳۲
مہموں کی تعداد	۳	۶	۴	۲	۱۲	۹	۱۳	۱۸	۶	۱
(۱) قریش										
(الف) بنوہاشم	۱	-	-	-	۱	-	۱	۱	۱	-
(ب) بنوامیہ	-	-	-	-	-	۱	-	۳	-	-
(ج) بنوسہم	-	-	-	-	-	-	۱	۱	۱	-
(د) بنومخزوم	-	-	۱	-	-	-	-	۳	۱	-
(س) بنوفہر	-	-	-	-	۱	۱	۱	-	-	-
(ص) بنوزہرہ	۱	-	-	-	۱	-	-	-	-	-
(ط) بنومطلب	۱	-	-	-	-	-	-	-	-	-
(ع) بنوتیم	-	-	-	-	-	۱	-	-	-	-
(ف) بنوعدی	-	-	-	-	-	۱	-	-	-	-
میزان قریش	۳	-	۱	-	۳	۴	۳	۸	۳	-
(۲) خزرج	-	۱	۲	۱	-	۲	۴	۱	-	-
(۳) اوس	-	۳	-	-	۲	-	-	۱	-	-
(۴) کلب	-	۱	-	-	۵	۲	۱	-	-	۱
(۵) سلیم	-	-	-	-	-	-	۱	-	-	-
(۶) بلی	-	-	-	-	-	-	-	-	۱	-
(۷) غطفان	-	-	-	-	-	-	-	۱	-	-
(۸) ہوازن	-	-	-	-	-	-	-	۲	-	-
(۹) قیس عیلان	-	-	۱	-	۱	-	-	-	-	-
(۱۰) اسد	-	۱	-	-	۱	-	۱	۱	-	-
(۱۱) کنانہ	-	-	-	۱	-	۱	۳	۲	-	-
(۱۲) ازد	-	-	-	-	-	-	-	۲	-	-
(۱۳) بجیلہ	-	-	-	-	-	-	-	-	۱	-
(۱۴) غیر معروف	-	-	-	-	-	-	-	-	۱	-
میزان کل	۳	۶	۴	۲	۱۲	۹	۱۳	۱۸	۶	۱

اس شجرہ سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں تک امیران سرایا میں قریش کی تقرری اور نمائندگی کا تعلق ہے پورے مدنی دور میں غیر شعوری طور پر بھی ایک خاص قسم کا توازن برقرار رہا تھا سوائے ۸ھ / ۶۳۰ء کے جب ان کے امیروں کی تعداد میں ایک نمایاں اضافہ نظر آتا ہے اس کا غالباً ایک سبب یہ تھا کہ فتح مکہ کے سال مہموں کی تعداد سب سے زیادہ تھی اور دوسرا یہ کہ صلح حدیبیہ کے بعد قابل و لائق قریشی سالاروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ دوسرا سبب بقیہ عرب قبائل کے حق میں بھی صحیح تھا[۴۹]۔ قریشی سالاروں میں حضرات خالد بن ولید مخزومی اور عمرو بن عاص سہمی اپنی عسکری قیادت اور فوجی صلاحیتوں کے لیے مشہور تھے[۵۰]۔ یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنے کے لائق ہے کہ اس برس آٹھ سالاروں کی تقرری ہوئی تھی۔ جن میں سے پانچ وہ سالار تھے۔ جو فتح مکہ سے کچھ قبل یا اسکے دوران مشرف بہ اسلام ہوئے تھے[۵۱]۔ اس تاریخی شہادت سے بعض حلقوں اور طبقوں کے اس مزعومہ اور خیال کی تردید ہوتی ہے۔ کہ صحابہ کرام کے طبقہ سابقین اولین کو محض اپنی سبقت اسلام کے سبب ریاستی، عسکری، یا حکومتی مناصب حاصل کرنے کا زیادہ حق تھا[۵۲]، یہ صحیح ہے کہ اسلام کے قبول کرنے میں پہل ایک انتہائی تحسین آمیز اور ثواب آگیں اقدام تھا تاہم حکومت و ریاست کے عہدے اور مناصب میں ترجیح کا وہ قطعی ذریعہ یا عنصر نہیں تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پورے دہ[(۱۰)] سالہ مدنی دور میں اس کی رعایت حکومتی مناصب کے بارے میں چاہے وہ فوجی ہوں یا غیر فوجی کبھی نہیں کی تھی۔ اس عہد مبارک کا اولین و آخرین سبب محرک یا اساس صرف صلاحیت اور موقعہ کی مناسبت تھی۔ جیساکہ ہم مسلسل اپنے تجزیوں میں دیکھتے رہیں گے۔

بہر حال تمام سالاران سرایا کے ضمن میں ان کی مذہبی مقام و حیثیت کا تجزیہ ذیل کی مختصر سی لوح یا جدول میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سالاران افواج نبوی میں سے بیشتر کا زمانہ قبول اسلام یا تو مکی عہد کا آخری دور ہے یا مدنی دور ہے۔ بہر حال جدول یہ ہے

زمانہ قبول اسلام							
مکی عہد	الف	ب	ج	د			
	۱۳	۵	-	۱۵			
مدنی عہد	س	ص	ط	ع	ف	ق	ل
	۴	-	۳	۴	۱	۴	۱
غیر متعین	م						
	۴						

یہ ممکن ہے کہ بعض حالات میں سبقت اسلام تقرری کا ایک محرک رہا ہو۔ لیکن عموماً اس کی بنیاد پر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ سابقین اولین کو ریاستی مناصب میں ترجیح حاصل ہونی چاہیئے یا عہد اسلامی میں واقعتاً وہ کسی وقت موجود رہی تھی۔ اگر ایسا رہا ہوتا تو عہد نبوی میں یا بعد میں خلافت راشدہ کے عہد زریں میں متاخر مسلمان شائد ہی کوئی منصب یا عہدہ حاصل کر سکتے۔ جبکہ صورت حال یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظام حکومت میں شریک زیادہ تر صحابہ کرام کا تعلق، سابقین اولین سے نہیں تھا۔

عہد نبوی کے سالاروں کی قبائلی تقسیم کے بعد عرب کے مختلف خطوں کی نمائندگی کا اس شعبہ میں مطالعہ دلچسپی کا حامل ہوگا۔

جو ذیل کی جدول سے واضح ہوتا ہے۔

علاقہ	قبیلہ/خاندان	تقرری	فیصد	منصب دار	فیصد
مرکزی عرب	۱۔ قریش ۲۔ خزرج ۳۔ اوس	۴۲	۵۶٫۷۵	۲۹	۰۴۳
شمالی عرب	۱۔ کلب ۲۔ بلی	۱۱	۱۴٫۸۹	۳	٫۲۵
مشرقی عرب	۱۔ سلیم ۲۔ غطفان ۳۔ ہوازن ۴۔ اسد ۵۔ قیس عیلان	۱۰	۱۳٫۵۱	۹	۱۶٫۶۷
مغربی عرب	۱۔ کنانہ ۲۔ ازدشنوءہ	۹	۱۲٫۱۵	۶	۲٫۵
جنوبی عرب	۱۔ بجیلہ	۱	۱٫۳	۱	۲٫۰۹
غیر معروف		۱	۱٫۳	۱	۲٫۰۹
میزان		۷۴		۴۹	

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس شعبہ میں مرکزی عرب کو سب سے زیادہ نمائندگی ملی تھی جو بوجوہ معلوم بالکل فطری بات تھی شمالی قبائل کی کمترین نمائندگی ان کے نمائندوں اور افراد کی کمی کے سبب تھی جیسا کہ بلاذری کے ایک تبصرہ سے معلوم ہوتا ہے[۵۳]۔ جو بات شمالی قبیلوں پر صادق آتی ہے۔ وہی جنوبی عرب کے قبائل کے لئے صحیح ہے[۵۴]۔ جبکہ دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی قبیلوں کی نمائندگی کم وبیش یکساں ہے۔ اس کا ظاہری سبب ان علاقوں کے قبیلوں میں زیادہ توسیع اسلام اور مدینہ سے قربت تھی اس وجہ سے ان کے نمائندوں اور افراد کو ریاستِ اسلامی کی خدمت کرنے کا زیادہ موقعہ ملا تھا۔

اسی طرح ایک اہم نکتہ اس ضمن میں یہ ہے کہ اس شعبہ تنظیم عسکری میں کل کتنے عرب قبائل کو نمائندگی ملی تھی۔ مثال کے طور پر آٹھ اہم ترین شمالی قبائل میں سے صرف دو کو نمائندگی ملی تھی جبکہ مشرقی عرب کے سات بڑے قبیلوں میں سے چار قبیلوں کو اور پانچ اہم مغربی قبیلوں میں سے دو کو اور دس جنوبی قبیلوں میں سے محض ایک کو سالاری وقیادت کا شرف ملا تھا اور قبائل پراگندہ میں سے کسی کو کوئی بھی نمائندگی نہیں ملی تھی[۵۵]۔

سالاران سرایا پر بحث کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کی کمان میں جانے والی چھوٹی اور بڑی مہموں کی عددی طاقت کتنی تھی؟ اگرچہ تمام سالاروں کی مہموں کی قوت کا مفصل ذکر کتاب کے آخر میں درج ضمیمے میں دیا گیا ہے۔ تاہم یہاں اس نقطۂ نظر سے ان کا تجزیہ دلچسپی کا سبب ہوگا۔ اس سے یہ بھی بیک نظر معلوم ہوگا کہ بڑی مہموں کی سالاری کا شرف صحابہ کرام میں سے کن کو ملا تھا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل جدول اسی مقصد کو اجاگر کرنے کے لیے دی جا رہی ہے۔

نمبر شمار	مہم کی عددی طاقت	مہموں کی تعداد	منصبدار/سالار کا قبیلہ اور اس کی مہمیں
الف	١٠٠ سپاہیوں سے کم	٣٤	(١) ٨ - قریش کے سالاروں کے زیر کمان
			(٢) ٢ - اسد " " " "
			(٣) ٥ - اوس " " " "
			(٤) ٩ - خزرج " " " "
			(٥) ٢ - قیس عیلان " " " "
			(٦) ٣ - کنانہ " " " "
			(٧) ١ - کلب " " " "
			(٨) ١ - سلیم " " " "
			(٩) ١ - بجیلہ " " " "
			(١٠) ١ - ہوازن " " " "
			(١١) ١ - غطفان " " " "
(ب)	١٠٠-٢٠٠ سپاہیوں کے درمیان	٧	(١) ٢ - زیر کمان حضرت زید بن حارثہ کلبی
			(٢) ٢ - " " علی بن ابی طالب ہاشمی
			(٣) ٢ - " " غالب بن عبداللہ لیثی
			(٤) ١ - " " ہشام بن عاص اموی
(ج)	٢٠٠-٣٠٠ کے درمیان	٥	(١) ١ - " " بشیر بن سعد خزرجی
			١ - " " ابوعبیدہ بن جراح فہری۔ قریشی
			١ - " " خالد بن سعید اموی
			(٤) ١ - " " علی بن ابی طالب ہاشمی
			(٥) ١ - " " علقمہ بن مجزز کنانی
د	٣٠٠-٤٠٠ کے درمیان	٢	دونوں ہی " " خالد بن ولید مخزومی

(س)	۴۰۰-۵۰۰ کے درمیان	۳	(۱)	۱۔ " " زید بن حارثہ کلبی
			(۲)	۱۔ " خالد بن ولید مخزومی
			(۳)	۱۔ " " عمرو بن عاص سہمی
(ص)	۷۰۰ سپاہ پر مشتمل	۱	(۱)	۱۔ " " عبدالرحمٰن بن عوف زہری/قریشی
(ط)	۳۰۰۰ " " "	۲	(۱)	۱۔ " " زید بن حارثہ کلبی (شریک سالار تھے جعفر بن ابی طالب ہاشمی اور عبداللہ بن رواحہ خزرجی
			(۲)	۱۔ " " اسامہ بن زید کلبی۔

مذکورہ بالا جدول سے یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ عددی لحاظ سے سب سے بڑی مہمیں یا فوجیں کسی قریشی یا انصاری عرب شریف کی کمان میں نہیں گئی تھیں بلکہ ایک مولیٰ اور اس کے نوخیز فرزند کی کمان میں بھیجی گئی تھیں۔ ان کی کامیابیوں نے نہ صرف ان کی اپنی تقرریوں کی توثیق کر دی تھی بلکہ اسلامی افواج کے سالار اعظم کی اس پالیسی کی بھی تصدیق کر دی تھی کہ عہدے اور مناصب صلاحیت و لیاقت کی بنیاد پر دیے جانے چاہییں نہ کہ قبائلی، خاندانی یا کسی دوسری سماجی اساس کے سبب۔ حضرت زید بن حارثہ کلبی کی سالاری اور فوجی قیادت نے ان کی تمام مہموں میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اگرچہ یہی بات ہم غزوۂ موتہ کے بارے میں اتنے وثوق سے نہیں کہہ سکتے۔ حالانکہ اس مہم میں ان کی شہادت یا مسلم فوج کی پسپائی قیادت کے فقدان یا کسی خامی کے سبب نہ تھی بلکہ اس کے کچھ اور اسباب تھے۔

عہد نبوی کی دوسری اہم مہموں کے سالاروں میں نمایاں تھے حضرات عبدالرحمٰن بن عوف زہری، عمرو بن عاص سہمی اور خالد بن ولید مخزومی۔ ان کا شمار مہموں کی عددی طاقت کے اعتبار سے حضرات زید اور اسامہ کے بعد آتا ہے۔ ایک لحاظ سے وہ سالاروں کے دوسرے طبقہ میں تھے اور تیسرے طبقہ میں جو شامل تھے۔ ان میں حضرات علقمہ بن مجزز مدلجی کنانی، علی بن ابی طالب ہاشمی، خالد بن سعید اموی، ابو عبیدہ بن جراح فہری اور بشیر بن سعد خزرجی نمایاں مقام کے حامل تھے۔ یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ عہد نبوی کے عظیم ترین سالار اپنے وقت کے اکثر و بیشتر عظیم ترین صحابہ میں شامل نہیں تھے اور نہ ہی ان کو بعد کی نسلوں نے اس حیثیت سے یاد رکھا۔

عسکری تنظیم کے اس شعبہ سے متعلق ایک مطالعاتی پہلو یہ ہے کہ مہموں کی منازل کیا تھیں؟ اس مطالعہ سے ہم کو نہ صرف جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں کی فوجی اہمیت کا حال علم ہوگا بلکہ اس مخالفت کی شدت اور کیفیت و کمیت کا بھی پتہ چلے گا۔ جو انہوں نے اسلامی ریاست کے خلاف کی تھی۔ ذیل کی جدول میں سو یا سو سے اوپر سپاہ پر مشتمل مہموں کا تجزیہ پیش ہے۔

نمبر شمار	قبیلہ/علاقہ	اسلامی مہم کی عددی طاقت
۱	قریش (کا ایک چھوٹا سا حصہ)	۱۰۰ اور ۱۷۰ (دو مہمیں)
۲	بنو سعد	۱۰۰
۳	بنو طے	۱۰۰

نمبر شمار	قبیلہ/علاقہ	اسلامی مہم کی عددی طاقت
۴	بنو ثعلبہ	۱۳۰
۵	بنو اسد	۱۵۰
۶	بنو سلیم	۲۰۰
۷	عرینہ	۳۰۰
۸	عطفان (اکا ایک حصہ)	۲۰۰ اور ۳۰۰ (دو مہمیں)
۹	جہینہ وغیرہ (راہزنوں کا گروہ)	۳۰۰
۱۰	حبشہ (کی ایک بحری فوج)	۳۰۰
۱۱	مذحج	۳۰۰
۱۲	جذیمہ	۳۵۰
۱۳	کندہ / دومۃ الجندل کی عیسائی مملکت	۴۲۰
۱۴	نجران	۴۰۰
۱۵	جذام	۵۰۰
۱۶	بلی اور قضاعہ وغیرہ	۵۰۰
۱۷	(کلب (دومۃ الجندل کا علاقہ)	۷۰۰
۱۸	عنسان اور انکے حلفاء اور رومی سرپرست	۳۰۰۰ اور ۳۰۰۰۰ (دو مہمیں)

اکیس بڑی مہموں میں سے پانچ مہمیں شمال کے طاقتور قبائل جیسے کلب، جذام، کندہ اور عنسان وغیرہ کے خلاف بھیجی گئی تھیں جبکہ دوسب سے بڑی مہمیں شمال کے قبائل کے اتحاد اور اس سے زیادہ رومی سلطنت کی باجگذار حکومتوں کے خلاف روانہ کی گئی تھیں۔ اسی طرح چار بڑی مہمیں جنوبی عرب کے منظم قبائل کے خلاف ترتیب دی گئی تھیں۔ ان دونوں دور دراز کے مقامات پر بڑی مہموں کی روانگی سے معلوم ہوتا ہے کہ فوجی لحاظ سے یہ دونوں علاقے اہم تھے۔ اس کے علاوہ طویل مسافت کا بھی ایک عنصر ان میں موجود تھا کیونکہ یہ خیال بھی ذہن میں رہا ہوگا کہ فوج اتنی بڑی ہونی چاہیئے کہ ہر قسم کی صورتحال سے بخوبی عہدہ برا ہو سکے۔ اس کے علاوہ یہ دونوں علاقے منظم و مرتب قبیلوں بلکہ منظم حکومتوں کے علاقے تھے جہاں ان کی اپنی عسکری روایات خاصی مضبوط تھیں اور مزید برآں وہ وقت کی دو بڑی سلطنتوں۔ رومی سلطنت۔ اور ایرانی سلطنت۔ کے علاوہ ایک چھوٹی طاقت حبشہ کی مملکت کے زیر اثر علاقے تھے۔ صرف ایک بڑی مہم مدینہ کے مغرب میں رہزنوں کے ایک منظم گروہ کی سرگرمیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی البتہ مشرق میں آباد قبائل کے خلاف سات بڑی مہمیں بھیجی گئی تھیں۔ اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی سمت سے اسلامی ریاست کو خطرات زیادہ لاحق تھے۔ سرایا کے مطالعہ میں اتنی بحث کافی ہے۔

غزوات نبویؐ

عسکری تنظیم کے ضمن میں غزوات نبوی پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے کہ وہ بھی اسی کا ایک بلکہ اہم تر حصہ ہیں ۔ ذیل میں توقیتی اعتبار سے تمام غزوات نبوی کے بارے میں مع ان کی منازل کے تفصیلات دی جا رہی ہیں ۔

نمبر شمار	مہم / غزوہ کی عددی طاقت	نام / منازل غزوات / قبیلے
١ -	٦٠ سپاہ	الواء / ودان
٢ -	٢٠٠ "	بُواط
٣ -	٢٠٠ "	سفوان
٤ -	٢٠٠ - ١٥٠	ذوالعشیرہ
٥ -	٣١٤	بدر عظیم / قریش
٦ -	(٣١٤ ؟)	بنو قینقاع
٧ -	٤٠٠ - ٢٠٠	سویق / قریش
٨ -	٢٠٠	الکدر / سلیم و غطفان
٩ -	٤٥٠	ذو امر / ثعلبہ، محارب / غطفان
١٠ -	٣٠٠	بحران / سلیم
١١ -	٧٠٠	احد / قریش
١٢ -	٩٠٠ - ٦٢٣	حمراء الاسد / قریش
١٣ -	١٠٠٠	بنو نضیر / یہود
١٤ -	١٥٠٠	بدر الموعد / قریش
١٥ -	٨٠٠ - ٤٠٠	ذات الرقاع / انمار، ثعلبہ، غطفان
١٦ -	١٠٠٠	دومۃ الجندل
١٧ -	—	مریسیع / بنو المصطلق
١٨ -	٣٠٠٠	خندق / احزاب عرب
١٩ -	٣٠٠٠	بنو قریظہ / یہود
٢٠ -	٢٠٠	عسفان
٢١ -	٧٠٠ - ٥٠٠	ذو قرد / غطفان

۲۲-	۱٫۶۰۰	حدیبیہ / قریش
۲۳-	۱٫۶۰۰	خیبر / یہود
۲۴-	۲۰۰۰	عمرۃ القضاء / مکہ / قریش
۲۵-	۱۰۰۰۰	مکہ / فتح / قریش
۲۶-	۱۲٫۰۰۰	حنین / ہوازن
۲۷-	۱۲٫۰۰۰	طائف / ثقیف اور ہوازن
۲۸-	۳۰٫۰۰۰	تبوک / غسان اور انکے اتحادی عرب اور رومی

مندرجہ بالا جدول سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کی سب سے بڑی فوجی مہم شمالی قبائل کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ غزوات نبوی میں نسبتاً تمام بڑی مہموں کا رخ یا تو اسلامی ریاست کے عظیم ترین دشمن قریش کے خلاف تھا یا مشرق میں آباد طاقت ور بدوی قبائل ہوازن، غطفان اور ثقیف کے خلاف۔ یہودیوں کے خلاف بھیجی گئی چار مہمیں بھی نسبتاً عددی لحاظ سے بڑی تھیں کہ ان میں شریک مجاہدین کی تعداد خاصی تھی۔ بہرحال اسلامی ریاست کی سب سے زیادہ مخالفت اور سب سے زیادہ مزاحمت کرنیوالے چار طبقات تھے: شمالی قبائل۔ قریش مکہ، یہود مدینہ وخیبر اور مشرقی قبائل۔ لہذا یہ فطری تھا کہ ان کے خلاف کم از کم اتنی بڑی مہم بھیجی جائے جو یا تو ان کی بخوبی سرکوبی کر سکے یا ان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے۔

آخر میں سرایا کے امراء کا اسلامی عسکری تنظیم میں مقام اور ان کے اختیارات پر گفتگو مناسب معلوم ہوتی ہے۔ مآخذ کا اتفاق ہے کہ جب بھی مہمیں روانہ کی جاتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے امیروں کو عام ہدایات اور احکامات دیتے تھے[56] اس کے علاوہ ان کو مکمل آزادی اور اختیار حاصل ہوتا تھا۔ وہ کون سا راستہ اپنائیں، کیا طرز جنگ اختیار کریں، میدان جنگ کہاں بنائیں؟ خیمہ زن کہاں ہوں، کیا حربی تدابیر اختیار کریں، شکست خوردہ کے ساتھ نرمی اور معافی کا سلوک کیونکر کریں۔ اور اموال غنیمت اور قیدیوں کے لئے کیا انتظامات کریں۔ وغیرہ وغیرہ یہ تمام اور ان سے متعلقہ امور کو ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ بہرحال سالاران فوج حالات و مواقع کے تقاضوں کے مطابق تدابیر اختیار کرتے تھے اور بہت کچھ ان کی صوابدید اور صلاحیت پر چھوڑا جاتا تھا اور یہی قرون وسطی میں بہترین فوجی پالیسی تھی۔ کہ جب مواصلات اور رسل ورسائل کے ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے۔ ان حالات میں نہ تو کوئی یکا طریق کار یا طریق جنگ پہلے سے متعین کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی اس کی پیش بندی کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ مآخذ سے سالاروں کے آزادانہ اقدامات کی جو انہوں نے حالات کے تقاضوں کے مطابق کئے متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً نخلہ کی مہم میں جو کچھ ہوا وہ امیر سریہ اور ان کے رفقاء کا فیصلہ تھا۔ اگرچہ بظاہر وہ ہدایات نبوی کی خلاف ورزی تھی[57]۔ موتہ کی مہم میں حضرت خالد بن ولید مخزومی کا اعلی کمان سنبھالنا اور پسپائی کا فیصلہ کرنا، ان کا نجی فیصلہ تھا جس کی زبان رسالت نے تحسین وتوصیف فرمائی[58]۔ اسی طرح بنی جذیمہ کے خلاف مہم کے دوران ان کے آزادانہ فیصلے پر دربار رسالت سے سرزنش بھی ہوئی۔ اس کے علاوہ متعدد دوسری مثالیں ہیں جو مہموں کے بیان میں مآخذ میں محفوظ ہیں[59]۔

عام نتائج

ہجرت کے چھ ماہ کے بعد اسلامی ریاست کی پہلی مہم کا ایک آزاد سالار مقرر کیا گیا۔ جس نے مدینہ کے نواح میں اس کی کمان کی۔ اس دن سے وفات نبوی تک برابر آزاد مہموں کے سالار مقرر کئے جاتے رہے ان کی کل تعداد ۴۹ تھی۔ جبکہ امیر سریہ کے عہدہ پر تقرریوں کی تعداد ۴۷ تھی یعنی کہ بعض سالاروں کو ایک سے زیادہ مرتبہ یہ سعادت حاصل ہوئی تھی۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عسکری تنظیم کے اس شعبہ میں تقرریاں مستقل نہیں تھیں جبکہ عہدہ مستقل تھا۔ سالار یا امیر سریہ کی تقرری اس لئے عارضی ہوتی تھی کہ خود فوج یا مہم عارضی ہوتی تھی۔ جیسے ہی مہم کا کام ختم ہوتا تھا۔ فوج توڑ دی جاتی تھی اور لازمی طور سے سالار کا عہدہ بھی ختم ہو جاتا تھا۔ دوسرے موقعہ پر پھر موقعہ ومحل کی مناسبت سے امیر سریہ کا انتخاب ہوتا تھا۔ ان اور ان جیسی اور مثالوں سے مغربی مورخین نے یہ لازمی اور حتمی نتیجہ نکال لیا ہے۔ کہ عہد نبوی میں نہ عہدے مستقل تھے اور نہ عہدیدار وہ سب کے سب محض عارضی کارکن ہوتے تھے۔ حالانکہ یہ تصور غلط ہے جیساکہ ہم مسلسل اپنے تجزیوں اور مطالعوں میں دیکھیں گے۔ بہرحال مغربی خام کاری کا سبب اس حقیقت سے صرف نظر کر لینا ہے کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی افواج کے مستقل سالار اعظم تھے اور تمام عسکری اختیارات واقتدار ان کو حاصل تھے۔ چنانچہ جب کبھی آپ بنفس نفیس تشریف لیجانا ضروری نہیں تصور فرماتے تھے تو آپ اپنی جگہ کسی صحابی کو اپنا جانشین بنا دیتے تھے اور ظاہر کہ اصل ومستقل سالار کی موجودگی میں یہ جانشینی لازمی اور ناگزیر طور سے عارضی ہوتی تھی

سالاران سرایا کی تقرریوں میں اسوقت کی امت مسلمہ کے تمام طبقات اور قبائل کو ان کی صلاحیت اور افراد کی تعداد کے مطابق نمائندگی دی گئی تھی۔ زیادہ تر تقرریاں قریشی مہاجرین اور انصار مدینہ کو ملی تھیں اور وہ ہر لحاظ سے بجا تھیں کیونکہ یہی دو طبقات اسلامی ریاست کی اصل تھے۔ اس طرح سے مغربی اور مشرقی قبائل کو بھی برابری سے نمائندگی ملی تھی کیونکہ وہ تیسرے اہم ترین طبقۂ امت تھے۔ جبکہ شمالی اور جنوبی قبائل کے افراد کی کمی کے سبب ان کی نمائندگی کم تھی۔ بہرحال حیات نبوی کے آخری دو برسوں میں ان دونوں آخری طبقات کی نمائندگی میں نمایاں اضافہ ہوا تھا۔

تقرری کی اصل بنیاد صلاحیت ولیاقت اور موقعہ ومحل کی مناسبت تھی۔ بقیہ دوسرے اسباب جیسے خاندانی یا قبائلی علاقائی یا مذہبی محرکات وعوامل کا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ تنقید یا تحسین، اسلام سے پہلے کی مخالفت یا محبت، علاقائی اور قرابتی دوستی یا محبت یا رشتہداری کی بنیادوں پر نہ تو عہدے دیئے جاتے تھے نہ ان سے محروم کیا جاتا تھا۔ اگرچہ قبول اسلام میں سبقت ایک تحسین وآفرین آمیز بات تھی تاہم عسکری تنظیم کے کسی عہدے کے لئے تنہا وہی ذریعہ نہیں تھی اور نہ ہی وہ حکومت کے کسی اور منصب کے لئے اساس بن سکتی تھی۔

زیادہ بڑی مہمیں ان صحابہ کرام یا سالاران امت مسلمہ کے سپرد کی گئی تھیں جو عہد نبوی میں اپنی عسکری اور فوجی صلاحیتوں کے لئے ممتاز ومعروف تھے۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ عہد نبوی کے سب سے اہم سالار یا امیر سریہ نہ کوئی قریشی تھا نہ کوئی انصاری بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مولی حضرت زید بن حارثہ کلبی تھے۔ جنہوں نے اپنے مفروضہ فروتر سماجی مقام کے باوجود رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ مہموں کی کمان کی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ان کی مہمیں عددی طاقت کے اعتبار سے بھی غزوات کے بعد سب سے بڑی تھیں دوسرے عظیم ترین سالاروں میں حضرات اسامہ بن زید کلبی، عبدالرحمٰن بن عوف زہری، خالد بن ولید مخزومی عمرو بن عاص سہمی، علی بن ابی طالب ہاشمی اور علقمہ بن مجزز مدلجی کنانی بالترتیب شمار کیے جانے چاہییں۔ امیران سرایا ہدایات نبوی کے بموجب اپنے عسکری فرائض انجام دیتے تھے۔ لیکن فوجی تدبیروں کے معاملہ میں وہ آزاد و خود مختار ہوتے تھے اور وقت و موقعہ و محل کی مناسبت سے اپنی صوابدید کے مطابق کام کرتے تھے۔ امراء سرایا اور ان کے سپاہیوں کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی، بلکہ اموال غنیمت میں سے حصہ ملتا تھا۔ یہ حصہ امیر کا بھی ایک عام مجاہد کے برابر ہوتا تھا۔ البتہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اموال غنیمت میں سے خمس اور صفی لینے کا حق تھا۔ صفی تو وہ چیز تھی جسے آپ پسند فرما لیتے تھے اور خمس پورے مال کا پانچواں حصہ ہوتا تھا۔ یہ خمس آپ کا ذاتی اور نجی حصہ یا ملکیت نہیں ہوتی تھی بلکہ پوری امت مسلمہ کی فلاح و بہبود کے لیے آپ کو اسکے خرچ کرنے کا اختیار ہوتا تھا۔ صفی آپ کی نجی ملکیت ہوتی تھی مگر عموماً آپ وہ شے کسی کو بخش دیتے تھے۔ بھلا رحمت للعالمین کو اپنی ہی فلاح کی فکر دوسروں کو چھوڑ کر کیسے ہو سکتی تھی۔

اسلامی فوج کی ساخت اور طریق جنگ

"تاریخ اسلام کے فلسفی مورخ ابن خلدون کا بیان ہے کہ جاہلی عربوں میں جنگ کا عام اور معروف طریقہ "الکرّ والفرّ" یعنی حملہ اور پسپائی) تھا۔ لیکن اسلام سے کچھ پہلے انہوں نے "تعبیہ" طریق جنگ اپنایا تھا جو عجم میں استعمال ہوتا تھا تعبیہ کے لغوی معنی صف آرائی اور اقدام کے ہیں۔ اس تبدیلی کے دو سبب تھے: اول یہ کہ عجم کے طریقوں کو انہیں کے جیسے طریقوں سے توڑا جا سکے۔ اور دوم یہ کہ وہ باقاعدہ اور جم کر لڑی جانیوالی جنگ (اِستماتۃ) کے لیے زیادہ موزوں تھا"[۶۰] یہ طریق جنگ یا فوجی ساخت دراصل "خمیس"[۶۱] کہلاتی تھی۔ جس کے معنی ہوتے ہیں پانچ حصوں والی۔ اس ساخت کے مطابق اسلامی فوج کو پانچ بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

۱ - قلب (فوج کا وہ مرکزی حصہ جو درمیان میں ہوتا تھا اور جس میں سالار اعظم موجود ہوتا تھا۔)

۲ - میمنہ (فوج کا دایاں بازو جس کو RIGHT WING کہتے ہیں یہ قلب کے دائیں ہاتھ پر ہوتا تھا)

۳ - میسرہ (فوج کا بایاں بازو جس کو Left wing کہا جاتا ہے اور جو قلب کے بائیں جانب ہوتا تھا)

۴ - مقدمہ (فوج کا وہ ہراول دستہ جو اصل فوج یعنی مذکورہ بالا تینوں حصوں سے کچھ آگے ہوتا ہے)

۵ - ساقہ[۶۲] (فوج کا وہ عقبی دستہ جو اصل فوج کے کچھ پیچھے رہتا ہے تاکہ عقب پر نظر رکھی جا سکے۔

ابن خلدون تعبیہ طریق جنگ کو زحف طریقہ بھی کہتا ہے۔ یہ دراصل صف طریق جنگ کا دوسرا نام ہے جس میں فوج صفوں کی شکل میں میدان جنگ میں آراستہ کی جاتی ہے۔ کیونکہ فلسفی مورخ کے نزدیک یہ طریقہ دشمنوں کے لیے زیادہ پریشان کن اور خوفناک تھا اور یہ نظام جنگ اسلام کے آنے سے پہلے عرب میں معروف و مستعمل ہو چکا تھا[۶۳]۔ آیئے اب ہم اسلام کی

فوجی تنظیم کے اس شعبہ سے متعلق مواد کا تجزیہ کریں اور مختلف مراحل سے اس کے گذرنے کا مطالعہ کریں۔

ایک غلط فہمی یہ عام ہوگئی ہے کہ اسلامی عسکری تنظیم میں فوج کو پانچ حصوں میں تقسیم کرنے کا عمل بعد کے زمانے میں شروع ہوا تھا۔ جب وہ زیادہ منظم اور مستقل ہوگئی تھی اور عہد نبوی میں قبائلی نظام یعنی الکر والفر کا طریقہ جاری و مستقل تھا۔ جس میں یہ نظام ممکن ہی نہیں تھا۔ مگر مآخذ سے واضح ہوتا ہے کہ خمیس نظام عہد جاہلیت میں بھی موجود تھا۔ اور اسلامی عہد کے عہد نبوی سے تو متعدد بلکہ کثیر مثالیں اس کی ملتی ہیں اور ان کی بنیاد پر اس کے ارتقاء کی تاریخ اور اس کے مختلف ارتقائی منازل کی ترتیب و تعین کی جاسکتی ہے۔ زیادہ تر اس کی مثالیں ہم کو غزوات نبوی کے ضمن میں ملتی ہیں اور مختلف مہمات نبوی میں بازوؤں کے افسروں کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان بازوؤں کی موجودگی اور ضرورت عددی اعتبار سے ایک بڑی فوج ہی میں ممکن اور موجود ہوسکتی تھی۔ اور چونکہ سرایا چھوٹی فوجوں بلکہ دستوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اس لئے عموماً ان میں یہ دستے یا بازو غیر ضروری ہوتے تھے۔ البتہ بڑی سرایا میں ان کے حوالے ملتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اپنے اگلے تجزیے میں دیکھیں گے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام وارتقاء کے اولین مرحلہ میں اس فوجی بناوٹ کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی گئی تھی بلکہ کسی مخصوص فوجی تنظیم کی طرف ہی دھیان نہیں دیا گیا تھا۔ کیونکہ نہ تو کوئی مستقل فوج تھی اور نہ ہی اس کی فوری ضرورت محسوس کی گئی تھی۔ ساری بالغ مرد آبادی فوج تھی[۶۴] جسے بوقت ضرورت اکٹھا کیا جاسکتا تھا۔ مزید یہ کہ چونکہ مسلمانوں کو ابھی تک کسی باقاعدہ جنگ و جدال کا تجربہ نہیں ہوا تھا اس لئے انہوں نے اس قسم کی کسی تنظیم کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔[۶۵]

بہر حال جلد ہی مسلمانوں کو میدان بدر میں قریشی اشرافیہ کی مسلح اور منظم فوج سے پالا پڑا۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلم فوج کو متداول و معروف طریقہ کے مطابق میدان جنگ میں آراستہ کیا گیا۔ مآخذ میں بکثرت حوالے اس کے ملتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذاتی نگرانی میں مسلم فوج کی صف بندی کرائی تھی۔ اگرچہ اس غزوہ کے ضمن میں خمیس کی اصطلاح کا واضح حوالہ نہیں ملتا ہے تاہم اس کا ذکر مضمر طور سے ملتا ہے جو پورے بیان جنگ بدر میں موجود اور جاری و ساری ہے[۶۶] واقدی نے فوج نبوی کے دو بازوؤں میمنہ اور میسرہ کا واضح طور سے ذکر متعدد جگہوں پر کیا ہے۔ یہ بھی معلوم و معروف حقیقت ہے کہ بطور سالار اعظم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قلب میں موجود تھے اور جنگ کے دوران مسلسل ہدایات جاری فرماتے رہے تھے اسی سلسلہ میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے کہ آپ میدان جنگ سے ہٹ کر ایک جھونپڑی (عریش) میں صرف دعا و سجدہ میں معروف رہے تھے وہ ایک نازک اور اہم لمحہ تھا جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے امداد الٰہی کی دعا فرمائی تھی ورنہ بقیہ وقت آپ شریک جنگ اور فوج کے درمیان موجود رہے تھے۔ عریش کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کوئی خانقاہ یا مسجد نہ تھی بلکہ ایک ایسی اونچی چٹان پر ایک فوجی چوکی تھی جہاں سے سالار اعظم پورے میدان جنگ کا معائنہ فرما سکیں[۶۷] بہر حال ایک روایت کے مطابق میمنہ کے سالار حضرت ابو بکر صدیق تھے اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میسرہ بھی کسی افسر کے ماتحت نگرانی میں دیا گیا ہوگا۔[۶۸] لیکن مآخذ میں ایک روایت یہ بھی ملتی ہے کہ اس غزوہ میں نہ تو مسلم فوج میں دونوں بازوؤں کے افسر مقرر ہوئے تھے اور نہ مکی فوج میں[۶۹]۔ بہر حال اس سے

افسران میمنہ اور میسرہ کی تقرری کی تردید تو ہوتی ہے مگر ان دونوں بازوؤں کی غیر موجودگی کی تائید نہیں ہوتی عین ممکن ہے کہ دونوں طرف افسروں کی تقرری نہ ہوئی ہو۔ لیکن مآخذ کی یہ زیادہ قوی روایت پہلی بینہ طور پر ضعیف روایت سے زیادہ قوی

نہیں معلوم ہوتی ہے۔ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ نوزائیدہ مسلم فوج اپنی ناتجربہ کاری اور قلت وقت کے سبب اپنے بازوؤں کو ترقی نہیں دے سکی تھی اور خمیس طریقے کو نہیں اپنا سکی تھی تو مکی فوج کو کیا ہوا تھا؟ وہ تو تجربہ کار بھی تھی اور وقت کی کمی بھی اس کے پاس نہیں تھی، پھر جنگ فجار میں وہ خمیس نظام اپنا سکتی تھی۔ تو اس کے تیس پینتیس برس بعد بدر کے میدان میں اس کو اپنانے میں کیا چیز مانع تھی؟ اس کے علاوہ اسلامی فوج تین قبائلی دستوں میں بھی منقسم تھی: ایک مہاجرین کا دستہ تھا اور باقی دو دستے مدینہ کے انصاری قبیلوں کے تھے یہ عرب کے قبائلی عسکری نظام کے عین مطابق تھے۔

جنگ احد کے بارے میں ہم کچھ زیادہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی فوج خمیس کے اصولوں پر مبنی تھی کیونکہ ماخذ کا اصرار ہے کہ مکی فوج اس نظام پر مرتب کی گئی تھی اس لئے[۱] اسلامی فوج کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ ان کی چالوں کی کاٹ کرنے کے لئے وہی نظام اپنائے۔ واقدی کا بیان ہے کہ مکی سالاروں نے خالد بن ولید مخزومی کو اپنی فوج کے میمنہ پر اور عکرمہ بن ابی جہل مخزومی کو اپنے میسرہ پر سالار مقرر کیا تھا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فوج میں بھی یہ دونوں بازو بنائے تھے[۱] اور ظاہر ہے یہ دونوں بازو اپنے متعلقہ سالاروں کی کمان میں تھے۔ اس کی تصدیق اسد الغابہ کی ایک روایت سے اگرچہ جزوی طور سے ہی ہوتی ہے۔ اس کے مطابق حضرت منذر بن عمرو اس غزوہ میں اسلامی فوج کے میسرہ کے سالار تھے[۲]۔ بہر حال اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا لازمی ہو جاتا ہے کہ دائیں بازو کا بھی کوئی سالار ضرور تھا جس کا نام ماخذ محفوظ نہیں رکھ سکے۔ مزید تصدیق طبری کے اس بیان سے ہوتی ہے۔ جس کے مطابق حضرت حمزہ بن عبد المطلب کو اس موقعہ پر مقدمہ کا سالار مقرر کیا گیا تھا[۳]۔ اگرچہ بقیہ بازوؤں یا ان کے سالاروں کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ تاہم یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ خمیس نظام اسلامی فوج کا بنیادی طور سے جزو بن چکا تھا اس کے علاوہ غزوۂ مریسیع کے ضمن میں ہم ساقہ کا ذکر بھی پاتے ہیں[۴]۔ جبکہ بنو قریظہ کے غزوہ میں ایک بار پھر مقدمہ کا ذکر ملتا ہے۔ مؤخر الذکر کے سالار حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی تھے[۵]۔

سیرت نبوی میں توفیقی اعتبار سے پہلی بار خمیس کی اصطلاح کا واضح ذکر واقدی کے یہاں خیبر کی مہم کے بیان میں ملتا ہے[۶]۔ اس کے بعد اسلامی فوج کا جب بھی ذکر آتا ہے۔ خمیس کا حوالہ وضاحت کے ساتھ یا مبہم طور سے ضرور ملتا ہے۔ چنانچہ غزوات عمرۃ القضیہ، موتہ، فتح مکہ، حنین، اوطاس، طائف اور تبوک کے ضمن میں اس کے حوالے ملتے ہیں۔ عمرۃ القضیہ میں مقدمہ کے سالار حضرت محمد بن مسلمہ اوسی تھے۔ اور ان کے ماتحت سپاہی   تھے   سب کے سب شہسوار (الخیل) تھے جبکہ ہتھیاروں اور اسلحہ جات کا افسر حضرت بشیر بن سعد خزرجی کو مقرر کیا گیا تھا[۷]۔ چھ ماہ بعد حضرت قطبہ بن قتادہ کو غزوہ موتہ کی اسلامی فوج میں میمنہ کا سالار مقرر کیا گیا تھا[۸]۔ خمیس نظام کی سب سے اچھی مثال اور ثبوت حضرت خالد بن ولید مخزومی کی اس حربی تدبیر میں ملتا ہے جو انہوں نے اس غزوہ میں اپنائی تھی اس عظیم سالار نے تین نامزد سالاران نبوی کی شہادت کے بعد اپنی فوج کی ترتیب و بناوٹ میں مکمل تبدیلی یوں پیدا کی تھی کہ میمنہ کو میسرہ کی جگہ متعین کیا تھا[۹]۔ بازوؤں کی اس نئی ترتیب سے دشمن دھوکہ کھا گیا کہ مسلمانوں کی تازہ کمک آ گئی ہے اور اس سبب سے اس نے جنگ سے گریز کیا اور اس طرح مسلمانوں کو باعزت پسپا ہونے کا موقعہ مل گیا۔ فتح مکہ کے غزوہ میں ہم کو یہ یقینی علم ہوتا ہے کہ حضرت خالد بن ولید مخزومی نے مقدمہ کی کمان کی تھی۔ جو نفوس پیادہ ۲۰۰،

دو ہزار شہسواروں پر مشتمل تھا۔ جبکہ باقی دونوں بازو اپنے اپنے سالاروں کی کمان میں تھے اور اصل قیادت فوج کی خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔ آپ کے بارے میں مزید شہادت یہ ملتی ہے کہ تمام کتائب (دستوں / بازوؤں) پر آپ کا اختیار تھا اور ان کو ہدایات دے رہے تھے۔ یہ دستے مختلف قبیلوں نے مہیا کئے تھے اور ان کے اپنے اپنے سالار تھے [80]۔ حنین و طائف کی مشترکہ مہم کے ضمن میں بھی خمیس کا ذکر ملتا ہے اور خیل (شہسوار دستہ) کا ذکر اس کے عظیم المرتبت سالار حضرت خالد بن ولید کے نام کے ساتھ کیا جاتا ہے [81]۔ ان کثیر روایتوں اور شہادتوں کی روشنی میں یہ فرض کیا جانا جائز ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک میں بھی اسلامی فوج اس نظام پر مبنی تھی [82]۔ بہرحال ان تاریخی واقعات اور شواہد کی بنیاد پر یہ نتیجہ بخوبی نکالا جا سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعبیہ خمیس نظام کا تجربہ اپنی پہلی عظیم مہم سے کرنا شروع کر دیا تھا اور رفتہ رفتہ یہ نظام مکمل اور پختہ ہو گیا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ کچھ مدت کے بعد ہی اسلامی فوج ایک طاقت بن کر ابھری۔ ایک ایسی طاقت جس نے نہ صرف عرب قبائل کی مزاحمت کو توڑا بلکہ عربوں کی سب سے بڑی فوجی قوت قریش مکہ کا سرنگوں کیا اور عہد نبوی کے مابعد اسلامی فوج نے نہ صرف وقت کی دو عظیم ترین طاقتوں سے لوہا منوایا بلکہ ان میں سے ایک کو مختصر سی مدت میں نیست و نابود کر دیا اور دوسری کو اپاہج بنا دیا۔

عہد نبوی کے عظیم ترین بازوؤں کے سالاروں میں حضرات منذر بن عمرو [83]، اوس بن خولی خزرجی [84]، علی ابن ابی طالب ہاشمی [85]، حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی [86]، زبیر بن عوام اسدی [87]، ابوعبیدہ بن جراح فہری [88] اور خالد بن ولید مخزومی [89] کے علاوہ قطبہ بن قتادہ سعدی [90]، ورد بن خالد سلمی [91] اور ابو عامر اشعری کے [92] اسمائے گرامی نمایاں نظر آتے ہیں جنہوں نے مختلف غزوات و سرایا میں شاندار خدمات انجام دی تھیں۔

الحرس (محافظ فوج)

جنگ کے زمانے میں جب اسلامی فوج دشمنوں سے مقابلے کرنے یا ان کی مزاحمت کو کچلنے کے لیے باہر گئی ہوتی تھی تو ریاست کے پایۂ تخت کو بلا کسی محافظ فوج کے نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں شہری آبادی ارد گرد کے دشمن یا مخالف قبائل کے حملہ کا شکار ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ شہر کے مسلمان اپنے آپ کو محفوظ تصور نہیں کر سکتے تھے خاص کر اس صورت میں کہ جب اندرونی دشمن جیسے منافقین اور یہود اپنی سازشوں سے باز نہیں آ رہے تھے [93]۔ ان حالات میں صدر مقام کی حفاظت اور دفاع کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی تھی بہرحال یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دوربینی اور فوجی سوجھ بوجھ تھی کہ آپ نے شہر کے دفاع کے مکمل انتظامات کئے تھے۔ چنانچہ جب کبھی آپ کسی مہم یا سفر پر شہر سے باہر تشریف لیجاتے تو شہر کی حفاظت کے لئے ایک فوج چھوڑ جاتے تھے۔ جو دشمن کے منصوبوں کو خاک میں ملا سکتی تھی یا ان کو شرارت سے باز رکھ سکتی تھی۔ یہ انتظامات صرف اپنی غیر حاضری میں ہی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنی موجودگی میں بھی جب حالات غیر معمولی ہوتے تھے۔ ان کی طرف پوری توجہ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ اپنا ایک جانشین (خلیفہ، نائب) بھی چھوڑ کر جاتے تھے۔ جو مسلمانوں اور اسلامی ریاست کے مفادات کی دیکھ بھال آپ کی غیر حاضری میں کرتا تھا۔ ان خلفاء یا نوّاب سے ہم اگلے باب میں بحث کریں گے کیونکہ ان کے فرائض منصبی کسی قدر مختلف تھے۔

تقریباً تمام اہم غزوات کے بیان میں ہم کو ایک محافظ فوج (الحرس) کا ذکر ملتا ہے۔ غزوہ احد کے دوران قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ اوسی کو حرس کا سالار مقرر کیا گیا تھا [94]۔ خندق کی جنگ کے پرآشوب و خطرناک موقعہ پر دو سالاران حرس حضرت

زید بن حارثہ کلبی اور حضرت سلمیٰ بن اسلم اوسی کو باری باری سے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی اور وہ بالترتیب ۲۰۰ اور ۳۰۰ شہسوار وں پر مشتمل دستوں کے ساتھ شہر کا گشت لگاتے رہتے تھے۔ کیونکہ خدشہ یہ تھا کہ یہود بنی قریظہ کہیں عقب سے حملہ نہ کر دیں[95] اسی طرح ربیع الثانی سنہ ۶ھ / اگست ۶۲۷ء میں جب آپ غطفان کے خلاف ایک مہم میں مشغول تھے۔ حضرت سعد بن عبادہ خزرجی کو تین سو سپاہ پر مشتمل ایک محافظ فوج کا، جو پوری طرح انہی کے قبیلہ والوں کی تھی، سالار مقرر کیا گیا تھا[96]۔ اگرچہ شہر مدینہ کی محافظ فوج کے لئے اس سے زیادہ اطلاعات نہیں ملتی ہیں۔ تاہم اتنی شہادتیں اس بات کے لئے کافی ہیں کہ شہر کے دفاع اور حفاظت کا پورا انتظام کیا جاتا تھا۔ عموماً ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محافظ فوج کے سپاہی مدینہ کے انصاری قبیلوں اوس و خزرج ہی سے لئے جاتے تھے۔ جیسا کہ آخری مہم میں خزرجی سپاہیوں کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے اس کے علاوہ مزید شہادتیں اس ضمن میں الحرس کی ایک اور قسم کے بارے میں بھی ملیں گی۔

الحرس یا محافظ فوج کی ایک اور قسم تھی جس کو ہم چوکسی کی فوج یا دستہ بھی کہتے ہیں۔ یہ مہموں کے دوران رات میں اسلامی معسکر یا کیمپ کی حفاظت کرتی تھی یا دشمن کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتی تھی تاکہ شب خون سے بچا جا سکے[97]۔ بدر کے غزوہ کے دوران اس قسم کا کوئی انتظام کیا گیا تھا یا نہیں ہم نہیں جانتے۔ امکان غالب یہی ہے کہ کچھ نہ کچھ انتظام ضرور کیا گیا ہوگا۔ بہر حال غزوہ احد کے بارے میں ہم یقینی طور سے جانتے ہیں کہ اس قسم کی محافظ یا چوکسی کی فوج اور اس کا سالار مقرر کیا گیا تھا[98]۔ مختلف غزوات و سرایا کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ شب بیدار محافظوں پر مشتمل دستے اپنے سالاروں کے ماتحت مقرر کئے جاتے تھے اور یہ ایک معمول تھا چنانچہ حضرات محمد بن مسلمہ اوسی عباد بن بشر اوسی، اوس بن خولی خزرجی اور عمر بن خطاب عدوی قریشی ایسے شب بیدار محافظوں کے نمایاں سالار تھے[99]۔ لیکن اعداد و شمار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ اوس اس فرض منصبی کو ادا کرنے میں پیش پیش تھا۔ دوسرا اہم نکتہ اس ذیل میں یہ بھی ہے کہ اکثر حالات میں یہ شب بیدار محافظ صرف شخص واحد ہوتا تھا۔ بہر حال سنہ ۳ھ / ۶۲۵ء سے سنہ ۸ھ / ۶۳۰ء تک کے عرصے میں اوس کے دو افراد نے یہ فرض چھ مواقع پر انجام دیا تھا[100]۔ ماخذ کا بیان بھی ہے اور واقعات سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ اول الذکر دو محافظ یعنی حضرات محمد بن مسلمہ اور عباد بن بشر نے اس اہم اور ذمہ دارانہ کام میں مہارت حاصل کر رکھی تھی اور وہ اس کے لئے معروف و مشہور تھے[101]۔ عمرۃ القضیہ کے موقع پر تین حضرات محمد بن مسلمہ، عباد بن بشر اور اوس بن خولی نے باری باری سے پہرہ دیا تھا۔[102]

شب بیدار محافظوں کے علاوہ الحرس میں کیمپ محافظ بھی تھے۔ یہ محافظ اسلامی کیمپ کا گشت لگاتے رہتے تھے اور اپنے ساتھی مجاہدین کی حفاظت کرتے تھے۔ کبھی ایک پورا دستہ اس کام کو انجام دیتا تھا اور کبھی ایک یا دو آدمی کافی سمجھے جاتے تھے[103]۔ ظاہر ہے کہ محافظین کی تعداد حالات اور مواقع کے تقاضوں کے مطابق ہوتی تھی۔ خطرہ کم ہوتا تھا یا مہم چھوٹی ہوتی تھی تو ایک دو آدمی کافی ہو جاتے تھے یا اچانک ضرورت پیش آ جانے پر بھی ایک آدمی کفایت کر جاتا تھا۔ مثال کے طور پر جنگ خندق کے دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اچانک گشت کرتے ہوئے ایک ایسی جگہ پر پڑی جہاں سے خندق پار کی جا سکتی تھی۔ آپ نے بذات خود اس کی نگرانی فرمائی۔ تا آنکہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے آپ کی جگہ سنبھال لی[104]۔ اسی غزوہ میں مکمل محافظ دستہ حضرت عباد بن بشر انصاری کی قیادت میں برابر گشت لگاتا رہا تھا۔ بہر حال ان تمام شواہد سے واضح ہوتا ہے کہ الحرس یا محافظ فوج کا ایک باقاعدہ نظم تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مہموں کے دوران اس کے انتظامات کرتے تھے۔ یہ عہد نبوی کی عسکری تنظیم کا ایک شعبہ تھا۔ اگرچہ مختصر سا تھا۔

معسکر سالار

خیمہ گاہ (معسکر) کا سالار عموماً اسلامی فوج کا سالار اعلیٰ ہوا کرتا تھا اور جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تھے تو آپ افواج کے ساتھ ساتھ کیمپ کمانڈر بھی ہوتے تھے۔ بہر حال دو واضح مثالیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی غیر حاضری میں اپنا جانشین سالار معسکر بنایا تھا۔ واقدی کا بیان ہے کہ آپ نے غزوات بنو نضیر اور خیبر کے دوران حضرات علی بن ابی طالب ہاشمی[105] اور عثمان بن عفان اموی[106] کو اپنا جانشین سالار لشکر بنایا تھا۔ آپ کی عارضی غیر حاضری میں یہ دونوں حضرات سالار افواج بھی مقرر کئے گئے تھے (استخلف)۔ خیبر کی مہم کے سلسلہ میں اس عہدہ کی کچھ تفصیلات ملتی ہیں جن کے مطابق آپ کسی ضرورت سے رجیع کے مقام سے ہٹ گئے۔ جہاں اسلامی لشکر خیمہ زن تھا۔ چنانچہ آپ نے اپنی غیر حاضری میں حضرت عثمان بن عفان اموی کو کیمپ اور لشکر دونوں کا سالار مقرر کیا تھا۔ حضرت عثمان اموی کی اس عہدہ پر تقرری خاصی اہم بات ہے کیونکہ ان کی شہرت عموماً فوجی امور کے لئے نہیں ہے۔

عرض

عہد نبوی کی عسکری تنظیم کا ایک اہم پہلو فوجی معائنہ (عرض) تھا۔ عام طور سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ اہم کام اپنے کسی صحابی کے سپرد کر دیتے تھے جو اس فن میں ماہر ہوتا تھا۔ معمول یہ تھا کہ اسلامی فوج کے سپاہیوں کا معائنہ اس کے اکٹھا ہونے کے بعد ہوتا تھا جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اسلامی فوج کوئی مستقل فوج نہیں تھی۔ جس کا معائنہ وقتاً فوقتاً ہوتا رہے۔ کبھی کبھی یہ معائنہ فوج کے کوچ سے پہلے یا اسکے دوران یا جنگ شروع ہونے سے کچھ پہلے کیا جاتا تھا۔ بہر حال یہ یقینی ہے کہ معائنہ کا طریقہ پہلی اہم مہم سے شروع ہو گیا تھا[107]۔ واقدی کے مطابق جب اسلامی فوج بدر جانے کے لئے بئر ابی عنبہ نامی مقام تک پہنچی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی حضرت قیس بن ابی صعصعہ کو مجاہدین کے معائنہ کا حکم دیا۔ چنانچہ تعمیل حکم میں انہوں نے سپاہیوں کا شمار لگایا (عَدَّهُمْ) اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انکی تفصیلات سے آگاہ کیا[108]۔ ابن سعد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ معائنہ اس وقت ہوا تھا جب اسلامی فوج شہر سے ایک میل دور جا چکی تھی اور معائنہ میں جن مجاہدین کو کم عمر پایا گیا تھا ان کو واپس کر دیا گیا تھا[109]۔ اسی طرح غزوہ احد کے موقعہ پر بھی اسلامی فوج کا معائنہ کیا گیا تھا اور یہ معائنہ شیخین کے مقام پر ہوا تھا۔ واقدی کے مطابق اس بار گیارہ مجاہدین کو ان کی کم عمری کے باعث مسترد کر دیا گیا تھا۔ جب کہ ان میں سے دو حضرات رافع بن خدیج اور سمرہ بن جندب کو ان کی جسمانی طاقت اور فن جنگ میں مہارت کے سبب کم عمری کے باوجود اجازت دیدی گئی تھی[110]۔ عرض یا معائنہ کی دوسری مثال غزوہ خندق کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ غزوہ احد میں مسترد کئے جانے والے متعدد مجاہدین، جیسے حضرات عبد اللہ بن عمر، زید بن ثابت اور براء بن عازب وغیرہ کو فوجی عمر تک پہنچ جانے کے سبب اس بار اجازت جہاد دے دی گئی تھی[111]۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ فوجی عمر یا فوجی خدمت کی کم از کم عمر پندرہ سال تھی۔ عام حالات میں اس سے کم عمر کے لڑکوں کو فوج میں شرکت کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

اگرچہ غزوہ خیبر کے بیانات میں ابتدائی مآخذ معائنہ (عرض) کا کوئی حوالہ نہیں دیتے ہیں۔ تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس اہم غزوہ میں بھی

عرض (معائنہ) کیا گیا تھا۔ ماخذ کا یہ متفقہ بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت خزرجی کو اموال غنیمت میں مجاہدین کے حصے متعین کرنے کی غرض سے مجاہد شماری کا طریقہ سونپا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس بیان میں عرض بھی مضمر ہے۔ بہر حال اس ضمن میں ایک اہم ترین نکتہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ غزوہ خیبر کے بعد حضرت زید بن ثابت کو عرض کا مستقل افسر مقرر کر دیا گیا تھا کیونکہ انہوں نے اپنی کم عمری کے باوجود یہ کام عہد نبوی میں بقیہ تمام مہموں کے زمانے میں انجام دیا تھا اور ان میں فتح مکہ، حنین، طائف اور تبوک جیسی بڑی مہمیں شامل تھیں۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کم از کم عرض (معاینہ کے افسر) کا عہدہ اور منصب مستقل طور سے ایک عہدہ دار کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اور حضرت زید بن ثابت اس کے مستقل افسر تھے[113]۔

اسلامی فوج کے ڈویژن

اسلامی فوج نے اپنے پیشرو جاہلی نظام فوج سے بہت سی چیزیں مستعار لی تھیں اور ان میں فوجی ڈویژن یا دستے شامل تھے۔ چنانچہ عرب فوج میں چاہے وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی پانچ اہم ڈویژن ہوتے تھے پیادہ فوج (المشاۃ) شہسوار فوج (الخیل) تیر اندازوں کا دستہ (الرُّماۃ) مسلح و کیل کانٹے سے لیس دستہ (اَھلُ السّلاح) اور سامان رسد کا نگران دستہ (اَصحَابُ الرِّحَال) اونٹ (بَعِیر) سواری اور نقل و حمل کے ذرائع تھے اور غالباً ان پر مشتمل کوئی دستہ نہیں ہوتا تھا۔ ان تمام دستوں کے حوالے مختلف مہمات نبوی کے بیانات میں ملتے ہیں۔ بدر کی مہم کے ذیل میں حضرت قیس بن ابی صَعصَعَہ خزرجی کو واقدی[114]، اور ابن سعد[115] پیادہ فوج (مُشَاۃ) کا سالار بتاتے ہیں جبکہ ابن اسحاق[116] اور طبری[117] نے ان کو ساقہ (فوج کے پچھلے حصہ) کا افسر بتایا ہے ممکن ہے کہ ساقہ پیادہ فوج ہونے کے سبب یہ تضاد پیدا ہوا ہو اور چار دل ماخذ کی مراد اس سے ساقہ کے پیدل مجاہدین سے ہو۔ بہر حال یہ تو معلوم ہوتا ہی ہے کہ پوری فوج بدر میں ایک دو کے سوا پیادوں پر مشتمل تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سالار اعلیٰ تھے[119]۔ اور ساقہ بہر حال اصل فوج سے کچھ پیچھے ہوتا تھا اس لئے اس کا ایک علیحدہ افسر ہونا ضروری تھا۔ خیبر کی مہم میں حضرت اوس بن خولی اھل السلاح کے افسر تھے[120]، جبکہ حضرت علی کی مہم فلس میں حضرت عبداللہ بن عتیق خزرجی مشاۃ اور رَجّالہ کے افسر تھے[121] بہر حال ان مثالوں سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ پیادہ فوج عہد نبوی کی عسکری تنظیم کا ایک لازمی حصہ تھا۔ جہاں تک شہسوار فوج کا تعلق ہے تو مختلف غزوات کے بیانات میں اس کے حوالے ملتے ہیں۔ چونکہ اسلامی فوجی نظام میں اس کا ارتقاء ایک اہم عنصر تھا اس پر الگ سے بحث کرنا مناسب معلوم ہے۔

شہسوار فوج (الخیل) کا ارتقاء

اسلامی فوج میں شہسوار فوج ابتدائی مہموں میں نظر نہیں آتی۔ غزوہ بدر میں مسلمانوں کے تین سو چودہ سپاہیوں میں سے کل دو کے پاس گھوڑے تھے جبکہ ان کے مکی مقابلوں اور حریفوں کے پاس ایک سو شہسوار تھے[122]۔ بدر کے مال غنیمت میں مسلمانوں کو دس گھوڑے ملے تھے[123]، جس سے ان کی شہسوار فوج کی غالباً بنیاد پڑی تھی۔ اس کے چھ ماہ بعد ذو امر کے غزوہ میں مسلم فوج میں سے متعدد مجاہد شہسوار تھے۔ لیکن ان کی حتمی تعداد نہیں معلوم ہوتی ہے[125]۔ غزوہ احد میں مسلم فوج کے پاس کم از کم پچاس گھوڑے تھے جبکہ سہ ہزاری

مکی فوج کے پاس دو سو گھوڑے، تین ہزار اونٹ اور سات سو زرہ بکتر تھے[126]۔ اس کے علاوہ ان کے پاس ایک سو تیر اندازوں پر مشتمل دستہ تھا، جبکہ مسلمانوں کا یہی دستہ کل پچاس تیر اندازوں پر مشتمل تھا اور حضرت عبداللہ بن جبیر خزرجی کی قیادت میں تھا[127]۔ مریسیع کی مہم کے ذیل میں مسلم شہسواروں کی تعداد محض تیس رہ گئی تھی[128]۔ لیکن خندق کی مہم کے دوران مسلم شہسواروں کی تعداد پانچ سو معلوم ہوتی ہے کیونکہ دو شہسوار دستوں کا ذکر ملتا ہے جو بالترتیب تین سو اور دو سو پر مشتمل تھے اور حضرات زید بن حارثہ اور سلمی بن اسلم اوسی کی کمان میں تھے[129]۔ اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ واقدی کے بیان میں اس غزوہ کے دوران فریقین کے عسکری اعداد و شمار کا تقابلی مطالعہ ملتا ہے جس سے دونوں کی حربی طاقت کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بیان اور دوسرے ماخذ کے بیانات کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنگ خندق دراصل شہسواروں اور تیر اندازوں کی لڑائی تھی اس کے علاوہ وہ فن حرب کی بعض باریک و پیچیدہ تدابیر کی بھی جنگ تھی۔

اس کے بعد تمام دوسرے غزوات نبوی میں ہم کو شہسوار دستوں کی مسلسل موجودگی کے حوالے ملتے ہیں۔ چنانچہ مہمات عسفان[130]، غابہ[131]، حدیبیہ[132]، خیبر[133]، اور عمرۃ القضاء[134] جو ۶ھ / ۶۲۷ء تا ۷ھ / ۶۲۹ء کے دو برس کی مدت میں بھیجی گئی تھیں شہسواروں (الخیل)، کا ذکر ملتا ہے، لیکن ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان تمام مہموں میں ان کی تعداد کافی کم معلوم ہوتی ہے اس کا ایک ہی سبب ہے اور وہ یہ کہ فوجی نقطۂ نظر سے یہ تمام مہمیں بہت معمولی تھیں۔ بہر حال فتح مکہ کے دوران اسلامی فوج میں شہسواروں کی تعداد ڈھائی ہزار کے قریب تھی[135]۔ ایک سال سے کچھ زیادہ مدت کے بعد غزوہ تبوک میں شہسوار (الخیل) دس ہزار کی عظیم تعداد کو جا پہنچے تھے۔ جبکہ پیادہ سپاہ کی تعداد بیس ہزار تھی[136]۔ اس تجزیہ سے اسلامی عسکری تنظیم بالخصوص اس کے اس شعبے کے ارتقاء کا اندازہ ہوتا ہے کہ آٹھ برس کی مدت میں اسلامی فوج کی کل عددی طاقت تین سو سے کچھ زیادہ سپاہ سے بڑھ کر تیس ہزار ہو گئی اور گھوڑوں کی تعداد دو سے بڑھ کر دس ہزار ہو گئی تھی اور یہ عہد نبوی کی عسکری تنظیم کا ایک شاندار کارنامہ تھا۔

یہاں دو اہم سوال پیدا ہوتے ہیں: اول یہ کہ شہسوار فوج کو ترقی دینے کا کیا کیا محرک یا محرکات تھے؛ اور دوم یہ کہ اسکے لیے کیا ذرائع اختیار کئے گئے تھے؟ جہاں تک محرکات و عوامل کا تعلق ہے تو وہ ظاہر تھے، اول یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں کی طاقت کا بھرپور مقابلہ کرنا چاہتے تھے اور چونکہ ان کی افواج میں شہسوار ہوتے تھے اس لئے آپ نے بھی اس کی ترقی پر توجہ دی۔ دوم یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ تجربہ بھی ہوتا گیا کہ گھوڑ سوار فوج میں حملہ اور اقدام کی زیادہ اور کارگر صلاحیت ہوتی ہے۔ سوم یہ کہ ان کی وجہ سے مسافت کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے اور قلیل عرصے میں صدر مقام سے مقام جنگ یا جائے فتنہ تک پہنچا جا سکتا ہے ان اسباب سے نہ صرف آپ نے بنفس نفیس شہسوار فوج کی ترقی پر توجہ دی بلکہ مسلمانوں کو بھی گھوڑے حاصل کرنے کی پوری ترغیب دی اس میں ترغیب الٰہی بھی شامل تھی[137]۔ اور اس کا یقیناً خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ مسلم فوج میں شہسوار دستوں کی ترقی بلکہ زود و تیز رفتار ترقی کا ایک اہم سبب شہسواروں کا دوگنا حصہ بھی تھا جو ان کو پیادوں کے مقابلے میں اموال غنیمت میں سے ملتا تھا۔ بلکہ بعض روایات میں تو شہسواروں کا تین گنا حصہ بتایا گیا ہے۔ لیکن واقدی کے مطابق اول الذکر تناسب پہلی مہم سے آخری مہم تک عہد نبوی میں برابر قائم و جاری رہا تھا[138]۔ ظاہر ہے کہ اس محرک نے مسلمان مجاہدین کو گھوڑے زیادہ سے زیادہ

حاصل کرنے کی عملی ترغیب دی تھی اس کے علاوہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں ایک بڑی اسلامی ریاست کی جانب سے اپنائی تھی اور وہ یہ تھی کہ اموال غنیمت کے خمس کے ایک حصہ کو اور اکثر حالات میں اضافی آمدنی کو گھوڑوں اور اسلحوں کی خرید پر خرچ فرماتے تھے۔ متعدد مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لئے آپ نے عرب دنیا کے بازاروں سے گھوڑے خریدنے کے لئے اپنے فرد مقرر کئے تھے ۱۳۹ اس پالیسی کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور مختصر سی مدت میں اسلامی ریاست کے پاس اتنی بڑی شہسوار فوج ہو گئی کہ پورے عرب میں اس کا کوئی مقابل و حریف نہ تھا۔

عہد نبوی کی فوج میں ڈویژن عموماً قبائلی بنیادوں پر مرتب ہوتے تھے اور یہ ان حالات کے اعتبار سے ناگزیر تھا۔ کیونکہ پورا نظام حیات قبائلی تھا۔ یہ قبائلی فوجی کردار چھوٹی مہموں میں زیادہ واضح نہیں معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کی سپاہ کی تعداد ہی بہت مختصر ہوتی تھی۔ لیکن بڑی مہموں میں وہ پوری طرح سے نمایاں نظر آتا ہے۔ چونکہ اسلامی فوج مستقل اور دوامی نہیں تھی اور وقت ضرورت قبیلوں سے لیا جاتا تھا اور وہ اپنے قبائلی دستوں کے ساتھ جمع ہو جاتے تھے اور یہی قبائلی دستے اسلامی فوج بناتے تھے عام طور سے کہ اہم مواقع پر اسلامی فوج کے تین دستے ہوتے تھے۔ ایک مہاجرین کا اور باقی دو دستے مدینہ کے دو انصاری قبیلوں اوس اور خزرج کے ہوتے تھے لیکن مخصوص حالات اور مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قبائل عرب کو بھی اپنے دستوں کے ساتھ طلب فرماتے تھے جیسا کہ فتح مکہ اور تبوک کے غزوہ کے دوران بہت واضح طور سے نظر آتا ہے۔ عام طور سے قبائلی روایات کے مطابق یہ قبائلی دستے اپنے سرداروں کی کمان میں ہوتے تھے ۱۴۰ لیکن جب وہ اسلامی فوج میں منقلب ہو جاتے تھے تو ان کے قبائلی سردار ریاست اسلامی کے سالار اعلیٰ کے ماتحت ہو جاتے تھے۔ بہرحال یہ قبائلی کردار اول مہم سے آخری مہم تک پورے عہد نبوی میں نظر آتا ہے۔ مثلاً جنگ بدر میں انصار اور مہاجرین کے بالترتیب دو اور ایک یعنی کل تین دستے تھے۔ خندق سے پہلے تقریباً تمام مہمات نبوی میں یہی صورت حال برقرار رہی تھی۔ اس کے بعد کی مہموں میں خاص کر غزوہ فتح مکہ اور غزوہ تبوک کے مواقع پر کئی مسلم قبائل عرب جیسے سلیم، اشجع، فزارہ، غفار، اسلم، مزینہ، جہینہ، خزاعہ، اسد اور متعدد اوروں کے دستوں کا حوالہ ملتا ہے۔ یہ قبائلی کردار ان کے سرداروں کی تسکین خاطر اور اعزاز و اکرام کے لئے بھی برقرار رکھنا ضروری تھا کیونکہ وہی قبائل سپاہیوں کو قابو میں رکھ سکتے تھے۔ لیکن بہرحال آہستہ آہستہ اسلامی فوجی نظام میں مرکزیت پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی جس کا بھرپور مظاہرہ خلافت راشدہ میں عموماً اور خلافت حضرت معاویہ میں خصوصاً ہوا۔

صوبائی فوجی تنظیم

عہد نبوی میں معمول یہ تھا کہ صوبوں جن کو ولایات کہا جاتا تھا میں فوجی تنظیم من جملہ فرائض والی یا گورنر ہوتی تھی لیکن بعض مخصوص حالات میں بعض ولایات میں فوجی انتظامات گورنر یا والی کے دائرہ اختیار سے نکال کر یا اسی کے اندر ایک خاص افسر فوج (جند) کے حوالے کر دیے جاتے تھے۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن میں وہاں کے مخصوص حالات کے سبب کیا تھا۔ اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن ربیع مخزومی کو یمن کی مرکزی اسلامی افواج (الجند) کا افسر مقرر کیا گیا تھا۔ یہ تقرری غالباً ۹ھ/ ۶۳۰ء اور ۱۱ھ/ ۶۳۲ء کے درمیان کسی وقت ہوئی تھی جب حضرت معاذ بن جبل خزرجی وہاں کے گورنر جنرل تھے۔ ماخذ کا مزید بیان ہے کہ حضرت عبداللہ

مخزومی اس عہدے پر مدتوں سرفراز رہے تھے[۴۱] خلافت فاروقی میں ایک مرکزی دیوان الجند (فوجی محکمہ) قائم ہوا تھا جس کے ماتحت صوبائی محکمے یا شعبے ہوتے تھے اور ان کے الگ الگ افسر مقرر کئے جاتے تھے۔

آخر میں ایک دو لفظ حضرت ابوبکر صدیق کے مقام و اختیار کے بارے میں کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو انکو غزوہ تبوک کے دوران حاصل تھے۔ واقدی کا بیان ہے کہ جب اسلامی فوج کے مختلف دستے کیمپ یا خیمہ گاہ میں اکٹھا ہوگئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو لشکر پر اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ (استخلفہ) اور وہاں وہ امام لشکر کی حیثیت سے مجاہدین کی نمازوں کی امامت بھی فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ سالار اعظم نے ان کو اپنا سب سے بڑا پرچم (لِوَاءُ الاعظم) بھی فوج کے کوچ سے ذرا قبل عطا فرمایا تھا[۴۲] کیا اس بیان سے یہ مقصد ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق کو لشکر کے بڑے ہونے کے سبب اپنا نائب سالار اعظم مقرر فرمایا تھا؟ تمام قرائن اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔

افسرانِ افواجِ اسلامی کی قبائلی نمائندگی

عہد نبوی کی فوجی تنظیم کے بیان میں عام طور سے اور افسرانِ افواج رسالت کے بیان میں خاص طور سے ہم پہلے ہی متعدد افسروں کی قبائلی شناخت کو دیکھ چکے ہیں۔ یہاں ان افسروں کی قبائلی شناخت پر جو غزوات نبوی میں بازوؤں، ڈویژنوں، حرس وغیرہ کے افسر ہوتے تھے، مکمل روشنی ڈالنے کے لئے ذیل میں ایک جدول دی جا رہی ہے۔ جو ان افسروں کی سالانہ تقرری بھی ظاہر کرتی ہے۔

نمبر شمار	سن	۶۲۴	۶۲۵	۶۲۶	۶۲۷	۶۲۸	۶۲۹	۶۳۰	۔۳۲	۶۳۱
۱	قریش	-	-	-	-	-	-	-	-	-
(الف)	بنو ہاشم	-	۲	-	۱	-	-		-	-
(ب)	بنو اسد	-	۱	-	-	-	-	۲	-	-
(ج)	بنو امیہ		-	-	-	۱	-	-	-	.
(د)	بنو تیم	۱-	-	-	-	-	-	-	-	۱
(س)	بنو عدی	-	-	-	-	۱	-	۱	-	-
(ص)	بنو فہر	-	-	-	-	-	-	۱	-	-
(ط)	بنو مخزوم	-	-	-	-	-	-	۳	-	۱
	میزان	۱	۳	-	۱	۲	-	۷	-	۲
(۲)	خزرج	۱	۱	-	۱	۱	۲	۲		-
(۳)	اوس	-	۴	-	۶	-	۲	۱		-

(۴)	کلب	-	-	-	١	-	-	-	-
(۵)	سلیم	-	-	-	١	-	-	٢	-
(۶)	سعد ہذیم	-	-	-	-	-	١	-	-
(۷)	اشعر	-	-	-	-	-	-	١	-
	میزان	٢	٨	-	١٠	٣	۵	١٣	٢

جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ قریش نے بطور ایک قبیلہ سب سے زیادہ تقرریاں یا عہدے حاصل کئے تھے تاہم اوس وخزرج نے مل کر اس سے کہیں زیادہ عہدے حاصل کئے تھے۔ صرف اوس کا تناسب نمائندگی مکی مہاجرین کے تناسب کے قریب تھا قریشی سالاروں یا امیروں میں تقریباً سب کے سب مشہور و معروف جنگجو اور ماہر فن حرب اشخاص تھے اور ان میں سے بعض نے ایک سے زیادہ مرتبہ عہدے حاصل کئے تھے۔ مثال کے طور پر حضرات زبیر بن عوام اسدی، خالد بن ولید مخزومی اور عمر بن خطاب عدی نے اس شعبہ میں دوبارہ سرفرازی حاصل کی تھی۔ مآخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد حضرت خالد بن ولید مخزومی اسلامی فوج میں مقدمہ کے افسر مستقل طور سے ہو گئے تھے اور بعد میں عمرۃ القضاء، فتح مکہ، حنین، طائف اور تبوک وغیرہ تمام غزوات نبوی میں وہ اس کے افسر رہے تھے۔ اس لحاظ سے نہ صرف ان کا عہدہ مستقل تھا بلکہ وہ خود بھی مستقل فوجی سالار تھے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ حضرت خالد بن ولید مخزومی اسلام سے قبل مکی اشرافیہ کی فوج میں مقدمہ اور خیل ہی کے مستقل افسر تھے اور اس حیثیت سے انہوں نے احد اور خندق میں کارنامے انجام دیئے تھے۔

انصاری افسروں میں حضرت محمد بن مسلمہ اوسی، عباد بن بشر اوسی، اسید بن حضیر اوسی، اور عبداللہ بن جبیر اوسی بہت نمایاں افسر تھے جبکہ حضرات زید بن ثابت، عبداللہ بن عتیک، اوس بن خولی اور سعد بن عبادہ خزرج کے اہم ترین افسر تھے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شب بیدار افسروں (الحرس) کا عہدہ تقریباً انہیں دونوں انصاری قبیلوں کی جاگیر بن گیا تھا۔ اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابت افسر عرض (معائنہ لشکر) مستقل طور سے بن گئے تھے۔ اس کے علاوہ تقسیم اموال غنائم کے بھی وہ مستقل افسر تھے باقی عرب قبائل میں سلیم کے علاوہ بقیہ دوسروں کی نمائندگی نام بھر کی ہے۔ اگرچہ یہ حتمی امر ہے کہ اس قسم کے تمام افسروں کا ذکر ہمارے مآخذ نے محفوظ نہیں رکھا ہے ظاہر ہے کہ تمام غزوات نبوی میں اس قسم کے فوجی انتظامات کئے گئے تھے اور ان کے متعدد افسر بھی تھے۔ لیکن ان کا ذکر محفوظ نہیں رہا ورنہ اس شعبہ کے تمام افسروں کا شمار موجودہ اعداد سے کہیں زیادہ ہوتا۔

جہاں تک ان افسروں کی علاقائی نمائندگی کا تعلق ہے تو مرکزی عرب کے قبیلوں کا تقریباً مکمل قبضہ ان مناصب پر رہا تھا۔ دوسرے علاقوں کو کوئی خاص نمائندگی حاصل نہیں تھی بلکہ بعض علاقوں کی نمائندگی نام بھر کی تھی۔ اس کا اولین سبب تو یہی تھا کہ اسلامی فوج کوئی مستقل فوجی ادارہ نہیں تھی اور کچھ سبب یہ بھی تھا کہ بہت کم مہمیں بڑی تھیں جن میں مستقل دستوں اور ان کے افسروں کی ضرورت پڑتی اور یہ بھی ایک سبب تھا کہ باقاعدہ جم کر لڑی جانے والی مہموں کی تعداد بہت کم تھی۔

ذیل کی جدول سے معاملہ بالکل واضح ہو جائے گا۔

علاقہ	نمبر شمار	قبیلہ	تقرریاں	سالار
مرکزی عرب	۱۔	قریش	۱۶	۱۰
	۲۔	خزرج	۸	۶
	۳۔	اوس	۱۳	۸
شمالی عرب	۱۔	کلب	۱	۱
	۲۔	سعد ہذیم	۱	۱
مشرقی عرب	۱۔	سلیم	۳	۳
جنوبی عرب	۱۔	اشعر	۱	۱
میزان		۷ قبیلے	۴۳	۳۰

اگر ہم ان افسروں کے زمانہ قبولِ اسلام کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان کی اکثریت بعد کے مکی اور مدنی زمانے کی مسلمان تھی اس سلسلہ میں یہ نکتہ زیادہ واضح ہوتا ہے کہ جو بھی کوئی قابل قدر شخص اور موزوں افسر مسلمان ہوتا تھا اسے بلا کسی پس و پیش کے عہدہ دیدیا جاتا تھا۔ یہ حضرت خالد بن ولید مخزومی، حضرت ورد بن خالد سلمی اور حضرت عبد اللہ بن ربیعہ مخزومی کے معاملے میں بالکل واضح نظر آتا ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائے تھے۔ مگر فوراً اپنے ان اعلیٰ مناصب پر فائز کردیئے گئے تھے۔

علمبردار (اصحاب الالویۃ والرایات)[۱۴۳]

عرب کی فوجی روایات میں مہم کے دوران یا میدان جنگ میں پرچم یا علم کا محافظ ہونا بڑی عزت کی بات تھی[۱۴۴] اور عام طور سے کسی ایک قبیلے کے ایک خاص خاندان کو یہ اعزاز حاصل ہوتا تھا ایک مشہور مستشرق ریوبن لیوی (RUBEN LEVY) کا بیان صحیح ہے کہ "مسلم فن جنگ میں پرچم کی ایک اور اہمیت تھی"۔ ہر قبیلہ کا اپنا پرچم ہوتا تھا جو جنگ کے میدان میں اس کا نقطہ اجتماع اور نشان وقار ہوتا تھا، کیونکہ اسی کے قریب سالار موجود ہوتا تھا[۱۴۵] اس کے علاوہ پرچم قبائلی یا قومی آن و عزت کا نشان بھی ہے۔ مکی اشرافیہ میں علمبرداری کا اعزاز قریش کے خاندان بنو عبد الدار کو زمانہ قدیم یعنی قصی بانی شہر مکہ کے زمانے سے موروثی طور سے حاصل تھا اور زمانہ جاہلیت یا عہد نبوی میں جتنی بھی قریش نے جنگیں لڑی تھیں، ان سب میں اسی کو قومی پرچم اٹھانے کا افتخار ملا تھا[۱۴۶] اسلامی ریاست نے بھی اسی عرب روایت قدیم کو اپنایا تھا اور پہلی مہم میں یہ اعزاز سالار سریہ حضرت حمزہ بن عبد المطلب ہاشمی کو ملا تھا[۱۴۷] چنانچہ عربی میں لواء باندھنا (عقد لوائہ) کا مفہوم ہی مہم بھیجنا ہو گیا تھا۔ بہر حال سرایا میں یہ اعزاز ہمیشہ سالاران سرایا کو حاصل رہا تھا۔ لیکن غزوات نبوی میں اس کا ایک مخصوص افسر ہوتا تھا۔ جب کبھی اسلامی افواج میں مختلف قبائلی دستے ہوتے تھے تو ان میں سے ہر ایک کا ایک یا کئی پرچم ہوتے تھے اور اتنے ہی اس کے افسر۔ ظاہر ہے کہ اس بنا پر عسکری تنظیم کے اس شعبہ میں بھی قبائلی کردار باقی رہا تھا۔ بہر حال ان قبائلی پرچموں کے علاوہ اسلامی ریاست کی نمائندگی کرنے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ایک مخصوص علم (رایہ یا لواء) ہوتا تھا جسے آپ اپنے کسی عظیم صحابی کے

سپرد کرتے تھے "۴۹"۔ جیسے کہ بدر اور احد کی جنگوں میں آپ نے یہ خدمت عظیم حضرت مصعب بن عمیر عبدری کے سپرد کی تھی اور اس میں ان کے قبیلہ و خاندان کی رعائت بھی منظور تھی۔ بہر حال ذیل میں ایک جدول دی جارہی ہے جس سے تمام مذکور علمبرداران نبوی کے بارے میں تفصیلات معلوم ہو جائیں گی۔

نمبر شمار	سنہ	۶۲۳	۶۲۴	۶۲۵	۶۲۶	۶۲۷	۶۲۸	۶۲۹	۶۳۰	۶۳۱	۶۳۲	تقرریاں	علمبردار
(۱)۔	مہاجرین												
(الف)	قریش	۵	۳	۴	۱	۲	۴	-	۶	۲	-	۲۷	۸
(ب)	قیس عیلان	۱	-	-	-	-	-	-	-	-	-	۱	۱
(ج)	قضاعہ	۱	-	-	-	۱	-	-	-	-	-	۲	۱
(د)	کلب	-	-	-	-	۱	-	-	-	-	-	۱	۱
(۲)	خزرج	-	۱	۱	-	۲	۴	-	۱۱	۷	-	۲۶	۱۵
(۳)	اوس	-	۱	۱	-	-	-	-	۷	۱	-	۱۰	۸
(۴)	سلیم	-	-	-	-	-	-	-	۲	-	-	۲	۳
(۵)	غطفان	-	-	-	-	-	-	-	۱	-	-	۱	۱
(۶)	مزینہ	-	-	-	-	-	-	-	۴	-	-	۴	۳
(۷)	جہینہ	-	-	-	-	-	-	-	۴	-	-	۴	۴
(۸)	خزاعہ	-	-	-	-	-	-	-	۳	-	-	۳	۳
۹	اسلم	-	-	-	-	-	-	-	۲	۱	۱	۴	۳
	میزان سالانہ	۷	۵	۶	۱	۶	۸	-	۴۱	۱۱	۱	۸۶	۵۲

یہاں اس اعتراف کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ فہرست بہت ہی نامکمل ہے۔ کیونکہ متعدد اہم غزوات نبوی جیسے تبوک وغیرہ کے علمبرداروں کے نام نہیں معلوم ہو سکے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ اس شعبہ کے فوجی افسروں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہوگی لیکن بہر حال موجودہ فہرست سے بھی اس کے افسروں کا کچھ اندازہ ہوتا ہی ہے۔ چنانچہ قریش اور انصار نے سب سے زیادہ عہدے حاصل کئے تھے۔ اس کے دو سبب تھے: اول یہ کہ وہ دس سالہ مدنی دور میں برابر تمام مہمات میں شریک رہے تھے اور دوم یہ کہ ان کی تعداد خاص کر انصار کی تعداد مجاہدین دوسروں کے مقابلے میں زیادہ رہی تھی۔ اگرچہ قریش کی تقرریاں سب سے زیادہ نظر آتی ہیں لیکن ان کے علمبرداروں کی تعداد اس تناسب سے نہیں ہے۔ اس اعتبار سے وہ خزرج کے کافی پیچھے ہیں۔ کیونکہ موخر الذکر کے افسروں کی تعداد ان کی تقریباً دوگنا ہے۔ اسی طرح انصار کے دوسرے طبقہ کی تقرریاں کم ہیں۔ لیکن ان کے افسروں کی تعداد قریش کے برابر ہے۔ اس سے بالواسطہ طور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فوج بنیادی طور سے ان نئے مسلم طبقات پر مشتمل ہوتی تھی جہاں تک دوسرے قبائل عرب

کا تعلق ہے انہوں نے جہاد میں شرکت اور اس کے نتیجہ میں علمبرداری کے عہدے صرف ان مہموں میں حاصل کیے، جو بعد میں ہوئیں۔ اور ان کا واضح بیان فتح مکہ کے ضمن میں ملتا ہے۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ علموں یا پرچموں کی تعداد کسی قبیلہ/خاندان کو اس کے سپاہیوں کی تعداد کے تناسب سے دی ہوتی تھی۔ اس کا اظہار ایک جدول کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے جو ذیل میں ہے۔

نمبر شمار	قبیلہ/خاندان	سپاہ کی تعداد	علمبرداروں کی تعداد
(۱)	**خزرج**		
	بنو ساعدہ		
	بنو سلمیٰ		
	بنو نجار		
	بنو حارث		
	بنو بخار		
(۲)	**اوس**		
	بنو واقف		
	بنو عبد الله تہل		
	بنو معادیہ		
	بنو خطمہ		
	بنو خطمہ		
(۳)	**خزرج**		
	بنو ساعدہ		
	بنو ظفر		
	بنو حارثہ		
میزان	۱۴ خاندان	۴۰۰۸ سپاہ / ۵۰۰ گھوڑے	۱۲
(۴)	قریش	۷۰۰ سپاہ / ۵۰۰ گھوڑے	۳
(۵)	مزینہ	۱۰۰۰ ″ / ۱۰۰ ″	۳
(۶)	جہینہ	۸۰۰ ″ / ۵۰ ″	۴
(۷)	اسلم	۴۰۰ ″ / ۳۰۰ ″	۲

(۸) خزاعہ/کعب ۵۰۰ سپاہ / گھوڑے ۳

(۹) اشجع

چونکہ سپاہیوں کی تعداد اور علمبرداروں کی تعداد کا تناسب واضح طور سے مذکور نہیں ملتا ہے۔ اس لئے اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دو سو اور تین سو سپاہ پر ایک علم مل جاتا تھا۔ جیسا کہ اوپر کی جدول سے معلوم ہوتا ہے۔

عسکری تنظیم کے اس شعبہ میں نمایاں ترین افسروں میں شامل تھے حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی، جن کو کم از کم دس مواقع پر یہ سعادت و افتخار حاصل ہوا۔ حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی، سعد بن ابی وقاص زہری، زبیر بن عوام اسدی، مصعب بن عمیر عبدری، ابو بکر تیمی اور عمر بن خطاب عدوی یہ قریشی علمبردار تھے۔ خزرج میں حضرات سعد بن عبادہ، حباب بن منذر، زید بن ثابت، عمارہ بن حزم نمایاں تھے۔ جبکہ سعد بن معاذ اور اُسَید بن حُضَیر اوس کے عظیم نمائندے تھے۔ بدوی قبائل میں اسلم کے حضرت بُرَیدہ بن حُصَیب بہت اہم شخص تھے۔ بقیہ دوسرے عرب قبائل کے علمبردار دراصل ان کے قبیلوں کے سردار اور سربرآوردہ اشخاص تھے اور اسی حیثیت سے ان کو یہ اعزاز عطا ہوتا تھا۔ جہاں تک علاقائی نمائندگی کا سوال ہے تو زیادہ تر عہدے مرکزی عرب کے قبیلوں کو ملے تھے۔ ان کے بعد مغربی قبیلوں کا نمبر تھا جبکہ بقیہ کو کوئی خاص نمائندگی حاصل نہیں تھی صورتحال ذیل کی جدول سے واضح ہو جائے گی۔

علاقہ	قبیلہ	تقرریاں	علمبردار
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۲۷	۸
	۲۔ خزرج	۲۹	۱۵
	۳۔ اوس	۱۰	۸
شمالی عرب	۱۔ کلب	۱	۱
	۲۔ قضاعہ	۲	۱
مشرقی عرب	۱۔ سلیم	۳	۳
	۲۔ غطفان	۱	۱
	۳۔ قیس عیلان	۱	۱
مغربی عرب	۱۔ مزینہ	۴	۴
	۲۔ جہینہ	۴	۴
	۳۔ اسلم	۴	۳
	۴۔ خزاعہ	۳	۳
جنوبی عرب		–	۔
میزان		–	
		۸۶	۵۲

طلیعہ (گشتی دستے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عسکری تنظیم میں طلیعہ (گشتی دستے) کے شعبہ کو ضروری اہمیت دی گئی تھی کیونکہ وہ فوج کے لئے بعض اہم کام انجام دیتا تھا۔ اس بحث میں ہم نے بعض ایسے کارکنوں کو بھی شامل کر لیا ہے جو اگرچہ اصطلاحاً طلیعہ نہیں کہے گئے ہیں مگر ان کا کام طلیعہ جیسا تھا اور وہ بھی فوجی نظام کا ایک اٹوٹ حصہ تھے۔ طلیعہ کا کام دشمنوں کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنا، ان کے سپاہیوں کو پکڑ لانا، خیمہ گاہ کے لئے مناسب جگہ تلاش کرنا، پانی اور چارہ وغیرہ کی جگہوں کا پتہ لگانا وغیرہ تھا۔ چونکہ طلیعہ اور جاسوس (عیون) کے کام میں بہت نازک سا فرق ہے۔ غالباً اسی سبب سے ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے طلیعہ کے کام کو بھی فوجی جاسوسی۔ کے شعبہ کا ایک حصہ سمجھ لیا ہے[۱۴۹]۔ بہر حال جاسوسوں اور طلائع (طلیعہ کی جمع) کے کام اور نوعیت میں خاصا فرق تھا۔ طلیعہ عموماً ایک چھوٹی سی جماعت ہوتی تھی جو دو تین نفر سے لیکر بیس نفر تک پر مشتمل ہو سکتی تھی جبکہ جاسوس عموماً ایک یا دو کر کے بھیجے جاتے تھے۔ طلیعہ علانیہ کام کرتی تھی جبکہ جاسوسوں کا کام خفیہ تھا۔ پھر طلیعہ فوج کا ایک حصہ ہوتی تھی جو ضرورت کے مطابق آگے یا ادھر ادھر بھیجی جاتی تھی جبکہ جاسوسوں کا فوج کا حصہ ہونا ضروری نہیں تھا۔

بہر حال طلیعہ کی پہلی مثال ہم کو جنگ بدر کے ضمن میں ملتی ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار نفر حضرت زبیر بن عوام، علی بن ابی طالب، بسبس بن عمرو اور سعد بن ابی وقاص پر مشتمل ایک جماعت جنگ بدر سے ذرا پہلے دشمنوں کے بارے میں پتہ لگانے کے لئے بھیجی تھی[۱۵۰]۔ اگرچہ ماخذ اس جماعت کے لئے لفظ طلیعہ کا استعمال نہیں کرتے۔ تاہم وہ اپنے کام کی نوعیت کے سبب طلیعہ ہی معلوم ہوتی ہے[۱۵۱]۔ طبری کا بیان ہے کہ آپ نے ایک جماعت (عُصبَہ) حضرت زبیر بن عوام کے ساتھ یا کمان میں بھیجی تھی[۱۵۲]۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایک طلیعہ ایک افسر کی ماتحتی میں روانہ کی گئی تھی۔ بہر حال یہ جماعت بدر کے کنوؤں تک پہونچی جہاں اس نے مکی فوج کے پانی پلانے والے بہشتیوں (سَقّاۃ)[۱۵۳] کو پکڑنے میں کامیابی حاصل کی جن سے پہلی بار یہ راز کھلا کہ مکی فوج بدر کے نواح میں پہنچ چکی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ مسلم طلیعہ اور دوسرے مسلم فوجی بھی اس جماعت سقاء کو ابو سفیان بن حرب اموی کی قیادت میں شام سے لوٹنے والے کارواں سے متعلق سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ بیچارے بار بار اعتراف کر چکے تھے کہ ان کا تعلق مکی فوج سے ہے۔ بہر حال جب یہ معاملہ صاف ہو گیا تو اس خبر نے مسلم فوج کو بدر پہنچ کر جنگی اعتبار سے اہم ترین مقامات پر قبضہ کرنے میں مدد دی تھی اور دشمن کو اپنی پسند کے میدان جنگ میں خیمہ زن ہونے اور لڑنے پر مجبور کیا تھا[۱۵۴]۔

اسد الغابہ کا بیان ہے کہ قبیلہ اسلم کے دو شخص حضرات مالک بن خلف اور ان کے بھائی نعمان بن خلف اس طلیعہ کے رکن تھے جس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ احد سے کچھ قبل اطلاعات فراہم کرنے کے لئے بھیجا تھا اور وہ دونوں اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے شہید ہو گئے تھے[۱۵۵]۔ اس کے بعد حمراء الاسد کی مہم میں اسلم ہی کے تین آدمیوں پر مشتمل ایک طلیعہ مکی فوج کے منصوبوں کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس مہم میں بھی طلیعہ کے جاں نثاروں نے شہادت پائی تھی[۱۵۶]۔ ربیع الاول ۶ھ / جولائی ۶۲۷ء میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو لحیان کے خلاف ایک مہم کی قیادت کی تھی تو آپ نے حضرت ابو بکر کو ایک

جماعت کے ساتھ بھیجا تھا تاکہ وہ الغمیم نامی مقام تک جاکر دشمن کے ارادوں کا پتہ لگائیں[۱۵۷]۔ واقدی اور ابن سعد کے مطابق حدیبیہ کی مہم
کے دوران مسلم طلیعہ بیس شہسواروں پر مشتمل تھا اور حضرت عباد بن بشر اوسی کے زیر کمان بھیجا گیا تھا۔[۱۵۸] انہیں حضرت عباد بن بشر کے زیر کمان
خیبر کی مہم کے دوران بھی ایک مسلم طلیعہ روانہ کیا گیا تھا جو شہسواروں پر مشتمل تھا۔ انہوں نے یہود خیبر کے ایک جاسوس کو جو قبیلہ اشجع سے تعلق
رکھتا تھا پکڑ لیا تھا اور اس نے نہ صرف تمام ضروری معلومات مسلمانوں کو بتا دی تھیں۔ بلکہ خود بھی مسلمان ہو گیا تھا[۱۵۹]۔ اس مہم کے دوران حضرت
محمد بن مسلمہ اوسی کے سپرد یہ فریضہ کیا گیا تھا کہ وہ مسلم فوج کے خیمہ زن ہونے کے لئے کوئی عمدہ جگہ تلاش کریں جو انہوں نے کرلی تھی مشہور
واقعہ ہے کہ فتح مکہ کے لئے روانہ ہونے سے ذرا پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات علی بن ابی طالب اور زبیر بن عوام کو ایک عورت
سے ایک خط وصول کرنے کے لئے بھیجا جسے ایک نیک اور متقی مسلم حضرت حاطب بن ابی بلتعہ لخمی نے اپنی سادہ لوحی میں مکہ والوں
کے نام لکھا تھا اور مکہ پر مسلمانوں کے حملہ کی خبر کر دی تھی[۱۶۱]۔ تبوک کے غزوہ کے دوران حضرت اسید بن حضیر اوسی کو ایک چشمۂ آب کا
پتہ لگانے کی خدمت سپرد کی گئی تھی[۱۶۲]۔ اس طرح یہ واضح ہوتا ہے کہ طلیعہ گوناگوں قسم کے کام انجام دیتا تھا جو نہ صرف مسلم فوج کے لئے
ضروری تھے بلکہ ان کے سبب اکثر و بیشتر مسلم فوج کو دشمنوں کے مقابلے میں زیادہ فوجی فوائد حاصل ہوتے تھے اور اس طرح طلیعہ مسلم
کامیابیوں کی ایک کلید بن جاتا تھا۔

دوسری قسم کا فوجی کارکنوں میں وہ منادی اور خبر نگار شامل ہوتے تھے جو مسلم فتح کی خبر مدینہ پہنچاتے تھے۔ یا دور دراز
کی مہموں کے زمانے میں مسلم آبادی کو تسکین خاطر فراہم کرنے کے لئے ان کی خیر و عافیت کی خبریں لیکر آتے تھے۔ محمد بن حبیب بغدادی
نے ایسے خوشخبری دینے والوں کو بشراء الرسول کی سرخی کے تحت بیان کیا ہے اور اپنی کتاب کا ایک باب ان کے لئے مخصوص کیا
ہے[۱۶۳]۔ مثال کے طور پر غزوہ بدر کی فتح کی خبر مدینہ والوں کو پہونچانے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ
اور عبداللہ بن رواحہ کو بھیجا تھا[۱۶۴] اسی طرح جعال بن سراقہ ضمری کو ذات الرقاع کی مہم کے دوران اپنی اور مسلم فوج کی خیر و عافیت
سے مطلع کرنے کے لئے مدینہ روانہ کیا تھا[۱۶۵]۔ ایک اور بشیر یا خوش خبری دینے والے حضرت سلمہ بن اسلم اشہلی تھے۔ جنہوں نے
صلح حدیبیہ کے کامیاب معاہدے کی خبر مدینہ والوں کو پہنچائی تھی[۱۶۶]۔ جبکہ حضرت نہیک بن اوس خزرجی نے فتح حنین کی خوشخبری
اہل مدینہ کو سنائی تھی[۱۶۷]۔

کچھ مختلف النوع کاموں کو جو فوجی مہمات کے دوران لازمی طور سے انجام دینے ہوتے ہیں کرنے کے لئے مختلف و
متفرق لوگوں / کارکنوں کو مقرر کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر حضرات ابو لیلیٰ خزرجی اور عبداللہ بن سلام کو ایک غزوہ کے دوران کھجور
کی ایک خاص قسم کے درختوں کو جن کو قرآن کریم میں لینہ کہا گیا ہے۔ کاٹنے کا حکم دیا گیا تھا تاکہ محصور دشمن کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا
جائے۔ اسی قسم کے بہت سے کاموں کے لئے مختلف لوگوں کو مقرر کیا جاتا تھا۔

آخر میں یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب ہوگا کہ طلیعہ کو مہموں کے دوران دشمنوں کی خبر لینے کے لئے روانہ کیا جاتا تھا اور ان کی
کامیاب کارگذاری سے مسلم فوج کو بے انتہا قیمتی فوائد حاصل ہوتے تھے جو بالآخر کامیابی کی راہ کھولتے تھے اس شعبہ عسکری کے
افسروں اور کارکنوں میں جن کا نام مآخذ میں ملتا ہے۔ متعدد قبیلوں اور علاقوں کے لوگ شامل تھے۔ جن کو ذیل کی جدول میں اجاگر کیا گیا ہے

علاقہ	قبیلہ	تقرریاں	افسر
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۵	۳
	۲۔ خزرج	۴	۴
	۳۔ اوس	۶	۴
	۴۔ قینقاع	۱	۱
شمالی عرب	۱۔ کلب	۱	۱
مغربی عرب	۱۔ جہینہ	۱	۱
	۲۔ اسلم	۵	۵
	۳۔ ضمرہ / کنانہ	۱	۱
جنوبی عرب	۱۔ ازد	۱	۱
قبائل پراگندہ	۱۔ تمیم	۱	۱
میزان	۱۰ قبیلے	۲۶	۲۲

مذکورہ بالا جدول کے مطابق زیادہ تر تقرریاں مرکزی عرب کے قبیلوں کو ملی تھیں اور ان کا مجموعی تناسب ۶۵ فیصد تھا۔ لیکن واضح رہے کہ یہ طلیعہ کے تمام افسروں کی جدول نہیں ہے۔ متعدد بلکہ بہت سے ایسے ہوں گے جن کا ذکر نہیں آسکا۔ بہرحال اس شعبہ کے اہم ترین اشخاص میں حضرات زبیر بن عوام اسدی، علی ابن ابی طالب ہاشمی، عباد بن بشر اوسی، اسید بن حضیر اوسی اور عبداللہ بن سلام قینقاعی تھے۔[۱۰۰] جہاں تک ان کے زمانہ قبول اسلام کا تعلق ہے تو ان میں سے چند ابتدائی مسلمان تھے۔ بقیہ بعد کے زمانے کے۔

جاسوس (عیون)

موجودہ زمانے میں بھی قرون وسطیٰ کی مانند جنگی چالوں کی کامیابی جاسوسوں کی خبر گیری پر کافی منحصر ہوتی تھی چنانچہ آج کل بھی ہر ملک میں فوجی جاسوسی کا شعبہ الگ اور منظم و فعال ہوتا ہے۔ اسی طرح عہد اوسط میں بھی جاسوسوں کا کام بہت ضروری سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ ان ہی کے ذریعہ دشمنوں کی عددی طاقت، ہتھیاروں کی تعداد، جنگی منصوبوں، راستوں کے انتخاب وغیرہ بہت سے اہم معاملات کی خبر حاصل کی جاسکتی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوجی تنظیم کے اس شعبہ کی بھی باقاعدہ ترتیب و تنظیم کی تھی اور اپنے دَہ سالہ دور میں جاسوسوں سے بڑے اہم کام لئے تھے۔ ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی تمام مہموں کے دوران ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا تھا۔[۱۰۱] فوجی جاسوسی کی پہلی دستاویزی مثال کا تعلق غزوہ بدر سے ہے کہ جب آپ نے حضرات طلحہ بن عبید اللہ تیمی اور سعید بن زید عدوی کو بدر کی جنگ سے کچھ پہلے شام سے لوٹنے والے قریشی کارواں کی خبر حاصل کرنے کے لئے بھیجا تھا۔[۱۰۲] اس مہم کے دوران جب قریشی کارواں

کے نکل جانے کے بعد مسلمانوں کا سابقہ قریشی فوج سے پڑا تھا تو آپ نے بدر پہنچ کر دو اور جاسوسوں حضرات بسبس بن عمرو اور عدی بن ابی الزغباء کو بدر کے کنوؤں کی طرف خبریں حاصل کرنے کے لئے بھیجا تھا جب مسلم طلیعہ کے ذریعہ قریشی سقوں کے پکڑے جانے سے قریشی فوج کی بدر کے نواح میں موجودگی یقینی ہوگئی تھی تو آپ نے دو ابتدائی مکی مسلمانوں حضرات عمار بن یاسر اور عبداللہ بن مسعود کو قریشی سقوں کی خبر کی تصدیق کرنے کی غرض سے روانہ کیا تھا[۷۴]۔ غزوہ احد کے دوران دو خزرجی حقیقی بھائی حضرات انس اور مونس فرزندان فضالہ خزرجی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاسوس بنا کر بھیجا تھا کہ وہ دشمن کی خبریں لائیں چنانچہ وہ دونوں وادی عقیق تک سفر کرکے پہنچے اور جونہی ان کو موقعہ ملا وہ قریشی سپاہیوں میں اس طرح مل گئے کہ ان کو کوئی پہچان بھی نہ سکا۔ قریشی فوج کے ساتھ انہوں نے الولاء کے مقام تک سفر کیا اور پھر موقع پاتے ہی نکل کر سیدھے بارگاہ نبوی میں ضروری اطلاعات کے ساتھ پہنچے اور آپ کو آگاہ کیا اس وقت تک قریشی لشکر احد نہیں پہنچا تھا[۷۵]۔ اس کے وہاں خیمہ زن ہونے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک عظیم ماہر امور حرب اور عالم فنون جنگ صحابی حضرت حباب بن منذر خزرجی کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ وہ دشمن کی طاقت اور ارادوں کا پتہ لگائیں۔ ان کو یہ بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ تخلیہ میں اپنی اطلاعات عرض کریں اور مسلمانوں کے سامنے نہ بیان کرنا شروع کر دیں جس سے ان کے حوصلے پست ہو جائیں۔ بہرحال انہوں نے ارشاد نبوی کے مطابق مکمل اور بالکل صحیح اطلاعات فراہم کی تھیں[۷۶]۔ جنگ کے بعد جب دشمن پسپا ہو کر حمراء الاسد کی طرف روانہ ہونے والا تھا تو حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کو ان کے اگلے منصوبوں کے بارے میں پتہ لگانے کا حکم دیا گیا تھا۔ جس کی انہوں نے پرجوش تعمیل کی تھی[۷۷]۔

اُسد الغابہ کا بیان ہے کہ واقعہ رجیع کے بعد حضرت امیہ بن خویلد ضمری کو قریش کے منصوبوں کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنے کی غرض سے جاسوس بنا کر بھیجا گیا تھا[۷۸]۔ اس مقصد سے ان کے بعد ان کے فرزند حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو بھیجا گیا تھا[۷۹]۔ جب مدینہ منورہ میں بنو مصطلق کے مریسیع کے مقام پر جمع ہونے کی خبر پہنچی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی کو تحقیق حال کیلئے بھیجا۔ انہوں نے جائے فتنہ وفساد پر پہنچ کر خبروں کی تصدیق کی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحیح صورتحال سے باخبر کردیا[۸۰]۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو غزوہ بنی مصطلق میں فتح حاصل ہوئی۔ لیکن سب سے زیادہ دلچسپ واقعہ مسلم جاسوسوں کے اس کارنامے سے متعلق ہے جو انہوں نے خندق کے غزوہ کے زمانے میں انجام دیا تھا۔ اس زمانہ میں جبکہ محاصرہ کافی طول پکڑ چکا تھا اور مسلمانوں کو احزاب کے صحیح ارادوں کی خبر نہ تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خوات بن جبیر کو ان کے منصوبوں کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنے کو کہا اور انہوں نے اپنا فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا[۸۱]۔ اس سے کچھ پہلے حضرت زبیر بن عوام نے بنی قریظہ کے احزاب میں شامل ہونے کی خبر کی تصدیق کر دی تھی[۸۲]۔ محاصرہ کے آخری دنوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ بن یمان کو قریشی خیمہ گاہ میں خبریں فراہم کرنے کی غرض سے بھیجا۔ وہ قریشی فوج میں مل گئے اور ایک جماعت کے ساتھ جا بیٹھے جو الاؤ کے گرد بیٹھی تھی کسی نے ان کو نہیں پہچانا۔ ابھی وہ بیٹھے ہی تھے کہ قریش کے سالار اعلیٰ ابوسفیان بن حرب اموی آ گئے اور انہوں نے اپنے سپاہیوں کو دشمن کے جاسوسوں سے خبردار رہنے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ ہر شخص اپنے ساتھی کے بارے میں واقفیت حاصل کرلے یہ بڑا خطرناک موقعہ تھا لیکن مسلم جاسوس بھی ہوشیار بہت تھا قبل اس کے کہ کوئی ان سے سوال پوچھتا انہوں نے خود ہی اپنے داہنے اور بائیں بیٹھے ہوئے

ساتھیوں کے نام دیتے پوچھنا شروع کر دیے اس طرح ان کے شبہات کا ازالہ کر دیا۔ آخر وہ دشمن کے پسپائی کے ارادے اور منصوبے سے آگاہ ہو گئے اور انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے باخبر کر دیا۔[۱۴۳] اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقعہ پر حضرت بُسر بن سفیان خزاعی مکہ سے خبر لائے تھے کہ قریش مسلمانوں کے شہر میں داخلہ کی سخت مزاحمت کریں گے۔[۱۴۴] غزوہ حنین کے دوران حضرت عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی نے جاسوسی کا کام انجام دیا تھا اور دشمن کے بارے میں ساری ضروری اطلاعات اکٹھا کی تھیں۔[۱۴۵]

مذکورہ بالا جاسوسوں کے علاوہ متعدد ایسے جاسوس تھے جن کی خدمات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مہموں کے دوران حاصل کی تھیں۔ مگر ان کے نام مآخذ میں محفوظ نہیں رہ سکے۔ بہرحال انہوں نے مسلم افواج کی کامیابی میں خاصا اہم حصہ لیا تھا اور شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ چونکہ جاسوسی کا کام بڑا اہم اور خطرناک تھا اس لیے عموماً کم معروف یا غیر معروف لوگوں کے ذریعہ لیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ دشمن کی فوجوں میں جا گھستے تھے تو کوئی ان کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ جیسا کہ حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی اور ان سے بھی بڑھ کر حضرت حذیفہ بن یمان کے واقعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ ذیل میں ان مسلم جاسوسوں کی ایک جدول دی جا رہی ہے جن کے نام مآخذ میں مذکور ہوئے ہیں۔ اس جدول میں ان کی سالانہ تقرری اور علاقائی تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔

علاقہ	قبیلہ	تقرریاں باعتبار سنہ	۶۲۴	۶۲۵	۶۲۶	۶۲۷	۶۲۸	۶۳۰	جاسوس
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۲	-	۱	-	۱	-	-	۲
	۲۔ خزرج	۳	-	۳	-	-	-	-	۳
مشرقی عرب	۱۔ ہذیل	۱	۱	-	-	-	-	-	۱
	۲۔ قیس عیلان	۱	-	-	-	-	-	۱	۱
	۳۔ غطفان	۱	-	-	-	۱	-	-	۱
مغربی عرب	۱۔ جہینہ	۲	۲	-	-	-	-	-	۲
	۲۔ ضمرہ	۳	-	-	۲	-	-	۱	۲
	۳۔ خزاعہ	۱	-	-	-	-	۱	-	۱
	۴۔ اسلم	۲	-	-	-	۱	-	۱	۲
جنوبی عرب	۱۔ مذحج	۱	۱	-	-	-	-	-	۱
میزان	۱۰ قبیلے	۱۷	۴	۴	۲	۳	۱	۳	۱۶

جیسا کہ جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ تقرریاں اس شعبہ میں مغربی قبیلوں نے حاصل کی تھیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ مخالفین میں کم معروف تھے یا بالکل اجنبی تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ ان تمام مہموں کے متعلقہ علاقوں سے بخوبی واقف تھے اور ظاہر ہے کہ جاسوسی کے لیے یہ دونوں چیزیں بڑی اہم اور سودمند تھیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ممتاز ترین جاسوسوں

ہیں حضرات عمرو بن امیہ ضمری، بسبس بن عمرو جہنی، بریدہ بن حصیب اسلمی اور حذیفہ بن یمان مذحجی بہت اہم تھے۔ ان سب نے عظیم ترین خدمات اور شاندار ترین کارنامے انجام دیکر مسلم مہموں کی کامیابی کی راہیں کھولیں۔ جہاں تک ان کے قبول اسلام کے زمانے کا تعلق ہے تو مذکورہ سولہ جاسوسوں میں سے پانچ ابتدائی مسلمان تھے جبکہ پانچ اور آخری مکی عہد کے یا ابتدائی مدنی دور کے مسلمان تھے اور بقیہ چھ حضرات نے صلح حدیبیہ سے قبل اسلام قبول کیا تھا۔ گویا کہ ان کی اکثریت کو ہم سابقین اولین میں نہیں شمار کر سکتے۔

راہبر (دلیل)

جزیرہ نمائے عرب میں بالعموم اور اس کے صحراؤں میں بالخصوص جہاں کوئی راستہ یا پگڈنڈی تک نہیں ہوتی کارواںوں مسافروں اور فوجوں کے گم ہو جانے کا انتہائی شدید خطرہ رہتا ہے اور وہ اپنی اس گمشدگی کے دوران قعر ہلاکت میں بھی گر سکتی تھیں اس لئے تمام کارواںوں، مسافروں اور فوجوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ ماہر راہبروں (دلیل خریت) کی رہنمائی حاصل کریں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ قرون وسطیٰ میں کوئی بھی شخص راہبر کے بغیر سفر کرنے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ کارواںوں اور مسافروں کو تو صرف حفاظت و سلامتی کی فکر ہوتی ہے مگر فوجوں کے لئے وقت کا مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ اگر وہ بروقت جائے واردات پر نہ پہنچیں تو شدید نقصانات کا احتمال رہتا ہے۔ اس کے علاوہ کافی حد تک ان کی تیز رفتاری کی ضمانت بھی راہبر ہی فراہم کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ مختصر راستوں سے واقف ہوتا ہے۔ واقدی کا بیان ہے کہ تمام عرب لوگوں کے لئے راہبروں کی خدمات ازبس ناگزیر تھیں۔ کیونکہ وہ پیشہ ور ہونے کیساتھ ساتھ راستوں (سنن) اور مختصر راستوں (تنکیب) سے واقف ہوتے تھے۔ فوجوں کے لئے یہ اور بھی ناگزیر تھے۔ کیونکہ اس طرح وہ دشمنوں کے سر پر جا پہنچتے تھے اور ان کو خبر بھی نہ ہوتی تھی۔[186] عام طور پر ان راہبروں (دلیلوں) کا تعلق بدوی عرب قبائل سے ہوتا تھا اور اجرت پر کوئی بھی فریق ان کی خدمات حاصل کر سکتا تھا۔[187]

سیرت نبوی کے ضمن میں چاہے اس کا تعلق سماجی، مذہبی اور معاشرتی زندگی ہو یا سیاسی اقتصادی اور فوجی پہلوؤں سے ہو ہم کو قدم قدم پر راہبروں کے حوالے ملتے ہیں وہ نہ صرف حاجیوں کے کارواںوں اور زائرین کے قافلوں کی راہنمائی کرتے تھے بلکہ مسافروں کو راہ دکھاتے تھے اور لوگوں کو ان کی منزلوں پر پہنچاتے تھے وہ سیاسی جماعتوں اور فوجی اور تجارتی کارواںوں کی بھی راہنمائی کرتے تھے۔ اس لئے یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ تمام مہمات نبوی کے دوران راہبروں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں چاہے ان کا برملا ذکر ملے یا نہ ملے۔ بہر حال یہ مشہور واقعہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہجرت کا مشہور سفر عبد اللہ بن اریقط دئلی کی رہنمائی میں[188] عرج کے مقام تک طے کیا تھا اور وہاں سے مدینہ تک حضرت سعد العرجی کی راہ نمائی میں۔[189]

جہاں تک مہمات نبوی کا تعلق ہے یہ مسلم امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی راہبر ضرور ہوتا تھا اگرچہ بدر تک ابتدائی مہموں میں ان کا واضح ذکر نہیں ملتا ہے۔ بہر حال احد کی مہم کے دوران ایک راہبر کا واضح حوالہ ملتا ہے۔ واقدی کی زیادہ مستند روایت کے مطابق اس موقعہ پر حضرت ابو حثمہ حارثی نے راہبری کے فرائض انجام دیئے تھے۔[190] حمراء الاسد کی مہم میں جو دراصل احد کا تکملہ اور تتمہ تھی حضرت ثابت بن ضحاک خزرجی نے جو غالباً حضرت زید بن ثابت خزرجی کے والد تھے۔[191] مسلم فوج کی راہنمائی کی تھی۔

واقدی کا بیان ہے کہ حضرت ابو سلمٰی بن عبد الاسد مخزومی کے سریہ قطن کے دوران ولید بن زہیر نامی ایک طائی شخص کو بطور راہبر منتخب کیا گیا تھا[192] اسی مہم کی واپسی کے سفر کے دوران ایک دوسرا راہبر اجرت پر رکھا گیا تھا۔ جس نے مسلمانوں سے ان کے مال غنیمت کا خمس بطور اجرت مانگا تھا جو اسے دیا گیا تھا کیونکہ وہ مزید اموال غنیمت حاصل کرنے کا سبب بنا تھا[193] غزوہ دومۃ الجندل میں بنو عذرہ کے ایک مشہور راہبر حضرت مذکور نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر کمان فوج کی راہنمائی کی تھی۔ انہوں نے ایک طلیعہ کا کام بھی کیا تھا اور مسلمانوں کے لیئے ایک موزوں مقام خیمہ گاہ کے لئے تلاش کیا تھا[194] اسی سال غزوہ مریسیع کے لیے حضرت مسعود بن ہنیدہ اسلمی نامی ایک مشہور راہبر نے مسلمانوں کو ان کی منزل تک پہنچایا تھا[195] اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت ابو حدرد اسلمی نے ۶ھ میں غطفان کے خلاف ایک غزوہ میں یہی خدمت انجام دی تھی[196] پھر اسی برس واقدی کے بیان کے مطابق بنو عذرہ کے ایک گمنام راہبر نے حضرت زید بن حارثہ کی سریہ حسمیٰ کی راہنمائی کی تھی[197] حدیبیہ کی طرف سفر نبوی میں اسلم کے ایک راہبر حضرت عمرو بن عبد نہم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے راہبر ہونے کی سعادت حاصل کی تھی[198]

یہ امر دلچسپ بھی ہے اور قابل ذکر بھی کہ خیبر کے مقامی یہودیوں کے تین افراد نے الگ الگ مواقع پر مسلمانوں کی راہ بری کا فرض رضا کارانہ طور سے انجام دیا تھا۔ اسی مہم کے ذیل میں طبری اور ابن اثیر نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق حضرت حُسَیل بن نُوَیرَہ / خارجہ جو قبیلہ غطفان کے خاندان اشجع سے تھے اور خیبر کے نواح میں رہتے تھے۔ اتفاقاً مدینہ کے بازار میں خرید و فروخت کی خاطر آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی مہم کی تیاری کر رہے تھے۔ بازار ہی میں آپ سے انکی ملاقات ہو گئی اور آپ نے ان کو بیس صاع کھجور کی پیشکش کی اگر وہ رہبری کا کام انجام دے سکیں۔ انہوں نے پیشکش قبول کر لی۔ اپنا وعدہ ایفا اور فریضہ انجام دیا اور دلچسپ بات یہ کہ مہم انجام دینے کے بعد وہ بھی مسلمان ہو گئے[199] اسد الغابہ کے مطابق اس مہم میں ایک اور رہبر جنگجو اجرت پر حاصل کیا گیا تھا۔ حضرت عبد اللہ بن نعیم الاشجعی تھے[200]

غزوہ خیبر کے سات ماہ بعد جناب نامی مقام کی طرف جانے والی حضرت بشیر بن سعد خزرجی کی مہم کے دوران انہیں حضرت حسیل نے پھر رہنمائی کے فرائض انجام دیئے تھے[201] اسد الغابہ کی ایک روایت سے ایک انتہائی اہم واقعہ کی اطلاع ملتی ہے اس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت غالب بن عبد اللہ لیثی سے فتح مکہ سے ذرا پہلے مکہ کے مختصر راستے کی نشاندہی کرنے کی درخواست کی اور پھر مہم کے دوران انہیں نے مسلم فوج کی رہنمائی کی تھی[202] رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری عظیم مہم غزوہ تبوک میں حضرت علقمہ بن فغواء خزاعی کو اپنا راہبر بنایا تھا[203] اور آپ کی مقرر کردہ آخری مہم یعنی سریہ اسامہ بن زید کے دوران ایک عذری راہبر نے رہنمائی کی خدمات انجام دی تھیں[204] اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولین مہم سے آخری مہم تک برابر راہبری کی خدمات حاصل کی جاتی رہی تھیں۔ ان متعدد رہبروں میں سے چودہ کے نام بصراحت مذکور ہیں اور یہ یقینی ہے کہ مختلف سرایا اور غزوات میں اس سے کہیں زیادہ راہبروں نے کام کیا ہوگا۔ اگرچہ ان کے نام محفوظ و مذکور نہیں رہ سکے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جہاں تک راہبروں کا تعلق ہے۔ مغربی، شمالی، مشرقی اور مرکزی عرب کے قبیلوں نے اسی ترتیب کے ساتھ خدمات انجام دی تھیں۔ ان کو ذیل کی جدول میں واضح کر دیا گیا ہے۔

علاقہ	قبیلہ	تقرریاں	راہبر
مغربی عرب	۱- اسلم	۴	۴
	۲- کنانہ	۱	۱
	۳- خزاعہ	۱	۱
شمالی عرب	۱- عذرہ	۱	۱
	۲- یہود خیبر	۳	۳
مشرقی عرب	۱- غطفان	۳	۲
مرکزی عرب	۲- خزرج	۱	۱
	۲- اوس	۱	۱
میزان	۸- قبیلے	۱۵	۱۴

جہاں تک ان راہبروں کی سبقت اسلام یا زمانۂ قبول اسلام کا تعلق ہے تو چودہ مذکورہ اور نامزد اشخاص میں سے چار ابتدائی مدنی یا آخری مکی عہد کے مسلم تھے، پانچ دوسرے صلح حدیبیہ کے زمانے سے پہلے کے اور چار ۶۲۸ء اور سنہ ۶۳۰ء کے درمیانی عرصہ کے اور باقی ایک حیات نبوی کے آخری دو برسوں میں کسی وقت مسلمان ہوئے تھے[۲۰۷]۔ لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ بات غیر مسلم راہبروں کی خدمات حاصل کرنے کی ہے جنہوں نے پوری وفاداری اور ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیئے تھے۔

اموال غنیمت اور قیدیوں کے نگران افسر (اصحاب المغانم)

میدان جنگ میں فتح کے نتیجہ میں مسلمانوں کو اموال غنیمت کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی قیدی بھی ہاتھ لگتے تھے۔ ان قیدیوں کو عموماً زر فدیہ لیکر آزاد کر دیا جاتا تھا۔ کچھ اسلام لانے کے سبب آزاد ہو جاتے تھے اور کچھ کو رحمت نبوی معاف کر دیتی تھی۔ بہر حال قیدی اور اموال دونوں ہی المغانم کی وسیع اصطلاح میں آتے تھے۔ مآخذ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے تمام غزوات وسرایا میں جن میں اموال اور قیدی ہاتھ لگیں۔ ان کے لئے مخصوص افسر مقرر کرتے تھے۔ بہر حال ہم ایسے افسروں کی تقرریوں کی متعدد مثالوں کو پہلی جنگ سے لیکر آخری جنگ کے زمانے تک دیکھتے ہیں۔

فطری طور پر اموال غنیمت اور قیدیوں کے افسروں کی تقرری کی پہلی مثال کا تعلق غزوہ بدر سے ہے۔ واقدی کے بیان کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن کعب خزرجی کو تمام مغانم کا افسر مقرر کیا تھا، مگر ایک اور روایت کے مطابق اس افسر کا نام حضرت خبّاب بن ارت تمیمی تھا۔ لیکن پہلی روایت بوجوہ معلوم زیادہ صحیح ہے۔ اس غزوہ میں قیدیوں کی افسری خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مولیٰ (غلام) حضرت صالح شقران کے سپرد کی گئی تھی[۲۰۸]۔ ان کو غلام ہونے کے

سبب مال غنیمت میں سے حصہ نہیں ملا تھا مگر ان کو انعام و اکرام سے نوازا گیا تھا۔[۲۰۹] جبکہ اول الذکر افسر کو آزاد مسلم ہونے کے سبب پورا حصۂ غنیمت ملا تھا۔ اسد الغابہ کے بیان کے مطابق بدر کے بعد ہونے والے غزوات و سرایا میں سے متعدد میں حضرت عبد اللہ بن کعب خزرجی خمس (ریاست اسلامی یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مال غنیمت میں ۵/۱ حصہ) کے افسر مقرر کیے گئے تھے۔[۲۱۰]

حضرت صالح شقران کی دوبارہ تقرری کا ذکر غزوہ مریسیع کے ضمن میں ملتا ہے جبکہ انہیں تمام حاصل شدہ مال غنیمت کا افسر مقرر کیا گیا تھا۔ یہ نکتہ قابل ذکر بھی ہے اور دلچسپ بھی کہ اس غزوہ میں تین مزید افسروں کی تقرری کی گئی تھی۔ ان میں سے حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی کو جنگی قیدیوں کا افسر مقرر کیا گیا تھا[۲۱۱] تو حضرت محمیہ بن جزء زبیدی کو مسلم مجاہدین کے حصوں کا[۲۱۲] جبکہ حضرت مسعود بن ہُنیدہ اسلمی کو خمس ریاست اسلامی کا۔[۲۱۳]

مگر کبھی کبھی ایک ہی شخص کو اموال غنیمت اور قیدیوں کا افسر مقرر کر دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ حضرت محمد بن مسلمہ اوسی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ان کو غزوہ بنی قینقاع میں دونوں کا افسر مقرر کیا گیا تھا۔[۲۱۴] اسی غزوہ میں دو اور افسروں کو دو مختلف النوع کاموں کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ حضرت منذر بن قدامہ کو تمام گرفتار شدہ قیدیوں کو ہتھکڑیاں لگانے کا کام سونپا گیا تھا۔[۲۱۵] جبکہ حضرت عبادہ بن صامت خزرجی کے مدینہ کی شہری حدود سے بنو قینقاع کو جلاوطن کرنے کے انتظامات کی نگرانی سپرد کی گئی تھی۔[۲۱۶] حضرت محمد بن مسلمہ نے اسی قسم کا کام بنو نضیر کے غزوہ میں انجام دیا تھا، جبکہ دشمن نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے تھے۔[۲۱۷] اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور غلام حضرت ابو رافع کو اس موقعہ پر اموال غنیمت پر افسر مقرر کیا گیا تھا۔[۲۱۸] یہود مدینہ کے خلاف آخری غزوہ میں کئی افسروں کی تقرری کے حوالے ماخذ میں ملتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن سلام قیدیوں کے اعلیٰ افسر تھے[۲۱۹] تو حضرت محمیہ بن جزء زبیدی خمس کے[۲۲۰] حضرت محمد بن مسلمہ کے سپرد قیدیوں کو ہتھکڑیاں لگانا تھا[۲۲۱] تو حضرات زبیر بن عوام اسدی اور علی بن ابی طالب ہاشمی کو مشہور روایت کے مطابق بنو قریظہ کے قتل کے مجرم قیدیوں کے قتل کے انتظامات کا نگران مقرر کیا گیا تھا۔[۲۲۲] اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت مسلم بن بہرہ جو ایک گمنام صحابی ہیں، ان قیدیوں کے افسر مقرر کیے گئے تھے جن کے بارے میں حکم حضرت سعد بن معاذ اوسی نے قتل کا فیصلہ کیا تھا۔[۲۲۳] ان کے علاوہ دو مزید افسروں کے نام ملتے ہیں۔ یہ تھے حضرات سعد بن عبادہ[۲۲۴] اور سعد بن زید[۲۲۵] جن کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا۔ کہ یہودی بچوں اور عورتوں کو جو قیدی بنائے گئے تھے، شام اور نجد کے بازاروں میں بالترتیب بیچ دیں۔ یہودان خیبر کے خلاف کامیاب مہم کے بعد کم از کم تین افسروں کی تقرری کے حوالے ملتے ہیں۔ واقدی اور ان کے شاگرد و کاتب ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت فروہ بن عمرو بیاضی خزرجی کو صاحب المغانم (اموال غنیمت کا افسر) بنایا گیا تھا۔[۲۲۶] جبکہ ابن اثیر کا دعویٰ ہے کہ حضرت مرداس بن مروان خزرجی کو بھی اس ضمن میں کچھ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔[۲۲۷] قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غالباً موخر الذکر کو خمس یا مسلمانوں کے حصوں کی دیکھ بھال سپرد کی گئی ہو گی۔ اسد الغابہ کے مطابق تیسرے افسر ابو جُہیمہ انصاری تھے۔ جن کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ تمام مویشی اور جانور جو اموال غنیمت میں دشمنوں سے حاصل ہوئے ہیں کچھ لوگوں کی مدد سے انکو مدینہ لیکر پہنچیں۔[۲۲۸]

اگرچہ فتح مکہ کے ضمن میں واقدی نے نہ کسی مال غنیمت کے حصول کا ذکر کیا ہے اور نہ اس کے کسی افسر کی تقرری کا۔ تاہم ابن اثیر کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاریخ ساز دن حضرت خُزاعی بن عَبد نہم کو مال غنیمت کا افسر مقرر کیا تھا۔[۲۲۹] ممکن ہے

کہ یہ تقرری اس مال غنیمت کے سلسلے میں ہوئی ہو جو مکہ کے ان مزاحمین سے حاصل ہوا تھا، جو حضرت خالد بن ولید مخزومی کے دستے کے بالمقابل آئے تھے۔ طبری اور ابن خلدون دونوں کا اتفاق ہے کہ حضرت مسعود بن عمرو غفاری کو فتح حنین میں حاصل شدہ اموال غنیمت اور قیدیوں کو جعرانہ میں اکٹھا کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔[۲۳۰] مگر اسد الغابہ کا بیان ہے کہ اس کے افسر حضرت مسعود بن عمرو القاری تھے[۲۳۱]۔ بہر حال یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جب جعرانہ میں تمام اموال غنیمت کو اکٹھا کر لیا گیا تو اس کے افسر اعلیٰ ایک نومسلم حضرت بُدَیل بن ورقاء خزاعی کو مقرر کیا گیا[۲۳۲]۔ یہاں رحمت نبوی اور رافت محمدی کے ایک واقعہ کا ذکر بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جیسے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ہوازن کے قیدیوں کے پھٹے پرانے کپڑوں پر پڑی، آپ کی رحمت جوش میں آئی اور آپ نے حضرت بسر بن سفیان خزاعی کو ان کے لیے نئے کپڑے خریدنے کا حکم دیا جس کی فوری تعمیل کی گئی[۲۳۳]۔ حضرت زید بن ثابت خزرجی جو عہد نبوی میں فرائض (اموالِ غنیمت کے حصوں) کے مستقل افسر بن چکے تھے کے سپرد ان قیدیوں کو گننے اور ان کی ایک فہرست تیار کرنے کا حکم دیا گیا[۲۳۴]۔ یہاں اس واقعہ کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا تو حضرت عمر بن خطاب عدوی، حضرت زید بن ثابت خزرجی اور حضرت ابو جہم غفاری کو مقرر کیا کہ وہ بالترتیب قریش، انصار اور قبائل عرب کے سپاہیوں کو اپنے حصے کے قیدی آزاد کرنے پر آمادہ کریں۔[۲۳۵]

صرف غزوات ہی میں ان افسروں کی تقرری نہیں کی جاتی تھی بلکہ بعض مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے انتظامات سرایا کے لیے بھی کیے جاتے تھے چنانچہ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت علی کی مہم الفلس کے دوران ایک صحابی حضرت ابو قتادہ خزرجی کو اموال غنیمت اور قیدیوں کا افسر مقرر کیا گیا تھا[۲۳۶]۔ اگرچہ یہ سرایا کے سلسلے میں خبر واحد ہی ہے لیکن اس سے شہادت ملتی ہے کہ سرایا میں بھی اس قسم کے افسروں کی تقرری کا معمول تھا۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ بعض سرایا میں کافی مال غنیمت اور بعض قیدی بھی مسلمانوں کو ملے تھے۔ جیسا کہ آگے چل کر ہم اس کو تفصیل سے دیکھیں گے اور ظاہر ہے کہ ان کے سلسلہ میں نگرانوں کا تقرر بھی ہوا ہوگا یہ ممکن ہے کہ اس قسم کے انتظامات یا تقرریاں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر سریہ اور ہر مہم کے لیے بنفس نفیس نہ فرمائی ہوں۔ بلکہ ان کو امیر سریہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہو مگر یہ تصور کرنا کہ سرایا میں اموال غنیمت اور قیدیوں کے لیے افسر مقرر کیے ہی نہیں گئے تھے حقیقت کے منافی ہوگا۔

ذیل میں ایک جدول دی جا رہی ہے۔ جس میں اس شعبہ کے تمام مذکور افسروں کا قبائلی اور علاقائی تعلق ظاہر کیا گیا ہے۔

علاقہ	قبیلہ / خاندان	سنہ ۶۲۴	۶۲۵	۶۲۷	۶۲۸	۶۳۰	تقرریاں	افسر
مرکزی عرب	۱۔ قریش	-	-	۲	-	۱	۳	۳
	۲۔ خزرج	۲	-	۱	۲	۳	۸	۸
	۳۔ اوس	۲	۱	۲	-	-	۵	۲
	۴۔ انصار (غیر متعین)	-	-	۱	۱	-	۲	۲
	۵۔ قینقاع	-	-	۱	-	-	۱	۱

مشرقی عرب	۱۔ قارہ	-	-	-	-	۱	۱	۱
مغربی عرب	۱۔ اسلم	-	-	۲	-	-	۲	۱
	۲۔ مزینہ	-	-	-	-	۱	۱	۱
	۳۔ غفار	-	-	-	-	۲	۲	۲
	۴۔ خزاعہ	-	-	-	-	۲	۲	۲
جنوبی عرب	۱۔ زبید	-	-	۲	-	-	۲	۱
غیر عرب مسلم	۱۔ حبشی	۱	-	۱	-	-	۲	۲
غیر معروف	۱۔ مولی رسول کریم	-	۱	-	-	-	۱	۱
میزان		۵	۲	۱۲	۳	۱۰	۳۲	۲۸

جیسا کہ جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیادہ تر تقرریاں مرکزی عرب کے قبیلوں کو حاصل ہوئی تھیں اور ان میں بھی خزرج کا سب سے زیادہ حصہ تھا اور ان کے بعد اوس کا جبکہ قریش کی نمائندگی بہت کم تھی۔ دوسرے نمبر پر مغربی عرب کے قبیلے تھے اگرچہ ان میں انفرادی طور پر کوئی بھی بہت اہم نہیں تھا۔ حالانکہ ان کو اجتماعی طور سے سات تقرریاں حاصل تھیں۔ بہرحال یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حقیقتاً جتنے افسر مقرر کیے گئے تھے۔ ان میں سے صرف چند کا ذکر ہے۔ ورنہ اگر تمام غزوات اور سرایا کے تمام افسروں کا ذکر ملتا تو فہرست اس سے کہیں زیادہ بڑی ہوتی اور ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے قبیلوں اور علاقوں کا تناسب بھی ہوتا۔ بہرحال اس شعبہ میں اہم اور نمایاں ترین افسروں میں حضرات محمد بن مسلمہ اوسی، عبداللہ بن کعب خزرجی زید بن ثابت خزرجی۔ بریدہ بن حصیب اسلمی مسعود بن ہنیدہ اسلمی۔ محمیہ بن جزء زبیدی اور شقران (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حبشی غلام) تھے۔ ان میں سے کم از کم دو یعنی حضرات عبداللہ بن کعب خزرجی اور محمیہ بن جزء زبیدی بالترتیب اموال غنیمت اور خمس رسول کے مستقل افسر معلوم ہوتے ہیں۔ کہ انہوں نے یہ ذمہ داری کئی سرایا اور غزوات میں انجام دی تھی جہاں تک ان افسروں کے زمانۂ اسلام کا تعلق ہے تو ۲۸ میں سے صرف پانچ کو سابقین اولین کے طبقہ میں شمار کیا جا سکتا ہے جبکہ دو دوسرے آخری مکی عہد کے مسلم تھے اور گیارہ مدنی عہد میں اسلام لائے تھے اور بقیہ حیات نبوی کے آخری دو برسوں میں[۲۳۷]

اسلحہ اور گھوڑوں کے افسر (اَصحابُ السّلاحِ وَالفَرَس)

اگرچہ اسلحہ اور گھوڑوں کے افسروں کے بارے میں ہماری معلومات بہت ناقص ہیں تاہم یہ حتمی ہے کہ عسکری تنظیم کے اس شعبہ میں بھی کئی تقرریاں ہوئی تھیں[۲۳۸] کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہتھیاروں اور گھوڑوں کے حصول کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ جیسا کہ ہم کو معلوم ہے کہ ابتداء میں اسلامی ریاست کے پاس بہت کم ہتھیار تھے اور اس سے کم گھوڑے تھے۔ موخر الذکر کے ارتقاء کے بارے میں

ہم دیکھ چکے ہیں اور اوّل الذکر کے ذخیرہ یابی کے بارے میں ہم ابھی کچھ دیر میں مطالعہ کریں گے لیکن وقت کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور ان سے شدید تر تقاضوں نے اسلامی ریاست کو اسلحہ اور گھوڑوں کی فراہمی کے لئے تمام امکانی کوششیں کرنے پر مجبور کر دیا تھا اس لئے قیاس اور منطق دونوں کا تقاضا ہے کہ یہ باور کر لیا جائے کہ ان کے افسر بھی مقرر کئے گئے تھے اور یہ قیاس بلا سند شہادت بھی نہیں ہے اسد الغابہ کا بیان ہے کہ بدر سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین گھوڑے حاصل کئے تھے اور ان کو حضرت سعد بن اسعد بن زرارہ خزرجی کی دیکھ بھال کو دیدیا تھا[۲۳۹] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک یا اس کے کچھ مدت لبعد تک ہتھیار اور گھوڑے مسلم مجاہدین کی ذاتی ملکیت ہوا کرتے تھے اور اسلامی ریاست کی اپنی فوجی تنظیم کے تحت نہیں ہوتے تھے لیکن جوں جوں جنگی تقاضے بڑھے اور اس کے ساتھ اسلامی نظام عسکری میں تنظیم و تربیت پیدا ہوئی۔ اسلامی ریاست نے اس کے حصول اور ملکیت کے انتظامات کئے۔ غزوہ حنین کے ضمن میں ذکر ملتا ہے کہ حضرت عبد الرحمٰن بن ازہر زہری کو گھوڑوں کا افسر مقرر کیا گیا تھا۔[۲۴۰] ممکن ہے کہ اس قسم کے انتظامات اور دوسرے غزوات میں بھی کئے گئے ہوں۔ اس سلسلہ میں اسلامی ریاست کی روز افزوں ہتھیاروں کی طاقت کا ایک مفصل مطالعہ دلچسپی کا سبب ہوگا۔

اسلامی ریاست کا روز افزوں ذخیرہ حربی

عہد نبوی کی تمام فتوحات اور بیشتر مہموں میں مسلمانوں کو اموال غنیمت میں متعدد چیزوں کے علاوہ تھوڑے بہت ہتھیار بھی ہاتھ لگتے تھے۔ ان کے حصول کی دو صورتیں تھیں۔ اوّل سلب کی صورت میں یعنی جنگ سے پہلے دوران مبارزت یا جنگ کے دوران عام مغلوبہ حملہ میں فاتح مسلم سپاہی اپنے مقتول دشمن کی ذاتی چیزوں کا جن میں ہتھیار بھی شامل ہوتے تھے۔ حق دار ہوتا تھا۔[۲۴۱] دوسری صورت دشمن کی پسپائی یا شکست کی صورت میں جو کچھ مسلمان فاتح کو اجتماعی طور سے حاصل ہو۔ پہلی مہم سریہ نخلہ میں جس میں مسلمانوں کو کچھ مال غنیمت میں ملا تھا غالباً ہتھیار شامل نہیں تھے۔[۲۴۲] البتہ جنگ بدر میں اونٹوں، گھوڑوں، چمڑے کی کھالوں کپڑے کے تھانوں اور روزمرہ کی ضروریات زندگی کے علاوہ کچھ ہتھیار (سلاح)[۲۴۳] بھی ہاتھ لگے تھے جن میں تلواریں (سُیُوف)[۲۴۴] زرہ بکتر (دُرُوع) کپڑے یا چمڑے کے خود (مِغفَر، مَغافِر) لوہے کے خود (بَیضَۃ، بَیض)[۲۴۵] نیزے (رُمح، رِماح) اور چھوٹے تیر یا برچھیاں (عَنَزَۃ، عَنَز) وغیرہ شامل تھے۔[۲۴۶] اس کے علاوہ مسلمانوں کو اس غزوہ میں دس گھوڑے مال غنیمت کے طور پر ہاتھ لگے تھے[۲۴۷]۔ ماخذ میں یہ ذکر نہیں ملتا کہ ان ہتھیاروں کی تعداد کتنی تھی اور نہ ہی یہ ذکر ملتا ہے کہ آیا وہ مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے یا ریاست کے خمس میں ان کو مخصوص و محفوظ رکھا گیا تھا۔ بہرحال کوئی بھی صورتحال رہی ہو۔ یہ امر مسلم ہے کہ مسلم مجاہدین کے سلاح خانہ میں خاصا اضافہ ہوا تھا اور اس سے ان کی حملہ کرنے کی طاقت بڑھی تھی۔ قریشی اشرافیہ سے دوسرے تصادم میں مسلمان ہر قسم کے اسلحہ سے لیس نظر آتے ہیں اور کم از کم سو مجاہدین زرہ بکتر پوش (دَارِع) تھے[۲۴۸]۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کم از کم پچاس سوار بھی تھے اس غزوہ میں عارضی فتح کے مختصر زمانے میں مسلمانوں کو کچھ غنیمت بھی ملی تھی۔ لیکن وہ طویل افراتفری کے عالم میں کھو گئی تھی۔

بہرحال یہود مدینہ اور خیبر وغیرہ سے مسلمانوں کو تصادم اور غزوات میں کافی ہتھیار مال غنیمت میں ملے تھے اور اس سے

ان کے ذخیرۂ حربی میں خاطر خواہ یا قابل قدر اضافہ ہوا تھا۔ بنو قینقاع کے پہلے تصادم میں یہودی سپاہ کی تعداد سات سو تھی۔ جن میں سے چار سو زرہ بکتر پوش تھے اور باقی تین سو اس کے بغیر (حاسر) تھے[۲۵۰] پندرہ دنوں کے محاصرہ کے بعد جب انہوں نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالے تو ان کے غالباً تمام چار سو زرہ بکتر مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے تھے۔ کیونکہ معاہدہ کے مطابق یہودیوں کو تمام ہتھیار مسلمانوں کے حوالے کرنے تھے[۲۵۱] اس کے علاوہ مسلمانوں نے ان کے قلعوں یا گڑھیوں (آطام) میں کافی تعداد میں ہتھیار اور سناری زرگری کے اوزار پائے تھے۔ کیونکہ وہ اس فن کے ماہر کاریگر تھے[۲۵۲] مونٹگمری واٹ کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ان کی دوکانوں میں مسلمانوں کو اسلحہ سازی کے اوزار بھی ملے تھے۔ کیونکہ وہ ماہر اسلحہ ساز بھی تھے[۲۵۳] مدینہ کے دوسرے یہودی قبیلہ بنو نضیر کے خلاف مہم میں مسلمانوں کو بہت کم حَلَقَہ یعنی ہتھیار ملے تھے۔ وہ پچاس زرہ بکتروں، اتنے ہی آہنی خودوں اور تین سو چالیس تلواروں پر مشتمل تھے۔ ماخذ کا الزام یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ بنو نضیر مدینہ سے جلاوطنی کے سفر کے وقت بہت سے ہتھیار معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے اپنے کجاووں میں چھپا کر لے گئے تھے اور اس طرح ان کی کافی بڑی تعداد سے مسلمانوں کو محروم کر دیا تھا[۲۵۴] مشہور عام روایت کے مطابق مدینہ کے آخری یہودی قبیلہ یعنی بنو قریظہ کے خلاف مہم میں مسلمانوں کو ہتھیاروں کی کافی بڑی کھیپ ہاتھ لگی تھی وہ پندرہ سو تلواروں، تین سو زرہ بکتروں، دو ہزار نیزوں اور پندرہ سو لوہے اور چمڑے کی ڈھالوں (تُرُوس وحَجَفَة) پر مشتمل تھی۔[۲۵۵] اس کے علاوہ بنو قریظہ کے قتل عام کی کہانی اگر صحیح ہے تو تقریباً ایک ہزار یہودی عورتیں اور بچے بطور غلام ہاتھ لگے تھے جنکو بازار میں بیچ دیا گیا تھا اور ان کی قیمت سے مزید ہتھیار اور گھوڑے (السلاح والخیول) خریدے گئے تھے[۲۵۶]

ہتھیاروں اور دوسرے آلاتِ حرب پر مشتمل سب سے بڑی تعداد غزوہ خیبر کے نتیجہ میں مسلمانوں کے قبضہ میں آئی تھی، واقدی کا بیان ہے کہ قلعہ نطاۃ کے زوال کے بعد مسلم ذخیرۂ حربی[۲۵۷] میں ایک قابل مرمت منجنیق اور دو دبابوں دَبَّابَة[۲۵۸] کے علاوہ کافی بڑی تعداد میں زرہ بکتروں، آہنی خودوں اور تلواروں کا اضافہ ہوا تھا۔ منجنیق کی فوراً مرمت کر کے لئے قابل استعمال بنا لیا گیا تھا۔ چنانچہ یہ مقبوضہ ہتھیار خصوصاً منجنیق اور دبابے اگلے قلعوں کو فتح کرنے میں بہت کام آئے تھے۔ انہی کی بدولت قلعۂ شق، قلعۂ نزار، قلعۂ قموص[۲۵۹] اور قلعہ صعب بن معاذ فتح ہوئے[۲۶۰] تھے۔ صرف قلعہ قموص میں اسلامی فوج کو ایک سو زرہ بکتر، چار سو تلواریں ایک ہزار نیزے اور پانچ سو عربی کمانیں مع اپنے ترکشوں (جعاب) کے حاصل ہوئی تھیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے خیبر کے قلعوں میں اور کتنے ہتھیار ملے ہوں گے۔ بہر حال بطور آخری تجزیہ یہ بات اب زیادہ قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ کہ دوسرے اسباب وسامان جیسے کپڑوں، مویشیوں، چمڑوں، کھانے پینے کے برتنوں اور دوسرے ضروری روزمرہ کے سامان کے ساتھ کافی بڑی تعداد میں اسلحہ بھی خیبر کے مال غنیمت میں شامل تھا۔ جیسا کہ واقدی کا بیان بھی ہے[۲۶۲]

لیکن کیا یہ ہتھیار اور اسلحے مسلم فوج کی روز افزوں ضرورت کے لئے کافی تھے؟ اس سوال کا جواب مفصل طور سے کہیں اور دیا جا چکا ہے۔ مگر یہاں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ یہود مدینہ اور یہود خیبر سے حاصل شدہ ہتھیار اتنے زیادہ تھے کہ وہ مسلم فوج کی مکمل ضروریات تو درکنار اس کے ایک تہائی یا چوتھائی کو بھی کافی نہ تھے۔ بلکہ وہ مسلم فوجیں جنہوں نے ان یہودی قبیلوں کے خلاف اقدامات کئے تھے ان کی ضرورت کے لئے بھی کافی نہیں تھے۔ اس کی تصدیق ان تمام ہتھیاروں کی مجموعی تعداد سے ہوتی ہے جو مسلمانوں

نے یہودی قبیلوں سے حاصل کئے تھے۔ ان کا میزان یہ تھا: ۵۰۸ زرہ بکتر، ۵۰۰ آہنی خود، ۲۲۴۰ تلواریں، ۳۰۰۰ نیزے، ۱۵۰۰ ڈھالیں اور ۵۰۰ عربی کمانیں مع اپنے ترکشوں کے اس کے علاوہ اس میں ایک منجنیق، دو دبابے اور ہتھیاروں کی وہ غیر متعینہ تعداد بھی شامل کر دی جائے۔ جو دوسرے قلعوں سے ملے تھے۔ تب بھی آلات حرب اور ہتھیاروں کا اس سے کافی کم تناسب نکلتا ہے جو مسلم افواج کو چاہیئے تھا۔ بہر حال اس سب کے باوجود یہ تسلیم کرنا، ہر دیانت دار مورخ کا فرض ہے کہ یہودی قبیلوں سے حاصل شدہ ہتھیاروں اور آلات حرب کی تعداد نے مسلم سلاح خانے کی قوت میں کافی اضافہ کیا تھا اور مسلم سپاہیوں کو لیس ہونے میں کافی مدد کی تھی[263]۔

یہاں ایک ستم ظریفی کے واقعہ کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ غزوہ احزاب کے زمانے میں مسلمانوں نے کافی بڑی مقدار میں زمین / خندق کھودنے اور مٹی ہٹانے کے اوزار اور برتن بنو قریظہ کے یہودیوں سے مستعار لئے تھے۔ ان میں آہنی پھاوڑے (مَسَاحِی)، چمڑے کے تھیلے (کِرَازِین) اور کھجور کی پتیوں کی بنی ہوئی بڑی بڑی تھیلیاں اور چھابیاں جنھیں ۵ اصاع وزن آجاتا تھا (مَکَاتِل) شامل تھیں[264]۔ مؤخر الذکر دو چیزیں مٹی ہٹانے کے لئے استعمال کی گئی تھیں۔ خندق کی مٹی سلع کے پہاڑ کے دامن میں جمع کر دی جاتی تھی اور واپسی میں انہیں چھابیوں اور تھیلیوں وغیرہ میں پتھر بھر کر لائے گئے تھے۔ جن کو ترتیب کے ساتھ اس طرح پشتہ بنا کر رکھا گیا تھا کہ وہ کھجوروں کے پہاڑ معلوم ہوتے تھے۔ واقدی کے بقول یہ پتھر بعد میں جنگ کے دوران بطور ہتھیار استعمال ہوئے تھے اور روایات کے بموجب مسلمانوں کے سب سے زیادہ کارگر اور مؤثر ہتھیار تھے جن کی مار سے کوئی بچ کر نہیں نکلتا تھا[265]۔ بہر حال یہودیوں سے تصادم میں مسلمانوں کو کافی ہتھیار اور اوزار وغیرہ ہاتھ لگے تھے جن سے ان کی جارحانہ قوت میں اضافہ ہوا تھا۔

عہد نبوی کی دوسری مہموں میں مسلم فوج کافی کیل کانٹے سے لیس اور ضروری ساز و سامان سے مسلح نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ۷ھ / ۶۲۹ء میں عمرۃ القضاء کی مہم کے دوران دو ہزار مسلم مجاہدین پوری طرح سے مسلح اور زرہ بکتر میں غرق تھے اور ہر قسم کے کیل کانٹے سے لیس تھے۔ صلح حدیبیہ کی شرائط کے تحت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام اسلحے اور ہتھیار حرم مکہ کے باہر چھوڑ دیئے تھے[266] اور حضرت بشیر بن سعد انصاری کو ان کا نگران افسر مقرر کیا تھا[267]۔ بعد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم سلاح خانہ کی حفاظت کے لئے دو سو سپاہیوں پر مشتمل ایک دستہ حضرت اوس بن خولی کے زیر کمان تعینات کیا تھا[268]۔ ایک سال بعد جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے ارادے سے کوچ فرمایا تو دس ہزار مسلم فوج پوری طرح سے لیس تھی اگرچہ پوری مسلم فوج کے ہتھیاروں کا صریحی ذکر ماخذ میں نہیں ملتا ہے۔ تاہم مضمر مقصود یہی ہے۔ اس کے علاوہ واقدی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو سلیم کا آٹھ سو یا ایک ہزار سپاہیوں پر مشتمل دستہ لوہے میں غرق تھا۔ کیونکہ "ان کے زرہ بکتر چمک رہے تھے اور ان کے نیزوں کی چھوٹ پڑ رہی تھی"[269]۔ اسی طرح واقدی نے بنو سلیم اور بنو فزارہ کا "مسلح ہونے کا حوالہ اس مفاخرت میں دیا ہے جو ان دونوں قبیلوں نے اس موقعہ پر کی تھی"[270]۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر کمان اصل فوج "لوہے میں اتنی غرق تھی کہ ان کے آخری آدمی تک کی آنکھوں کی صرف پتلیاں (احدَق) نظر آتی تھیں[271]۔ ایک روایت کے مطابق صرف آپ کے دستے میں جو انصار اور مہاجرین پر مشتمل تھا۔ ایک ہزار سپاہی زرہ بکتروں سے مسلح تھے۔ مکہ کے عظیم ترین قریشی سردار ابو سفیان بن حرب اموی نے اسلامی فوج کی شان و شوکت دیکھ کر

برجستہ کہا تھا: یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں جو دس ہزار لوہے (اسلحہ پوش) میں غرق سپاہیوں کے ساتھ آرہے ہیں[۲۷۴]

غزوہ حنین کے آغاز سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سپاہ کے لئے مکہ کے ایک دولتمند تاجر صفوان بن امیہ حجمی سے ایک ہزار زرہ بکتر مستعار لئے تھے[۲۷۵]۔ اسد الغابہ کا بیان ہے کہ مشہور صحابی رسول حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے ہم نام بھتیجے حضرت عبدالرحمٰن بن ازہر کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوہ میں گھوڑوں کا افسر مقرر کیا تھا۔[۲۷۶]

طائف کے محاصرہ کے دوران اسلامی فوج کی تعداد میں نہ صرف چار سپاہیوں کا اضافہ ہوا تھا۔ جو حضرت طفیل بن عمرو ازدی اپنے قبیلہ سے لائے تھے بلکہ ایک دبابہ اور ایک منجنیق کا بھی اضافہ ہوا تھا[۲۷۷]۔ اس اختلاف کے باوجود کہ دبابہ اور منجنیق کون لایا تھا[۲۷۸] واقدی کا یہ بیان بڑا دلچسپ ہے کہ اس زمانے میں دبابہ عام طور سے گائے کی کھالوں سے بنائے جاتے تھے۔[۲۷۹] اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض اور احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں اور دفاع کے لئے قدرتی چیزوں سے فائدہ اٹھایا تھا۔ روایات کے مطابق آپ نے اپنے خیمہ کے اردگرد حسک نامی کانٹے دار جھاڑیوں کو پھیلوا دیا تھا تاکہ دشمن اچانک شب خون نہ مار سکے[۲۸۰]۔ منجنیق اور دبابہ کو آپ نے محاصرہ ختم کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہا تھا، مگر بعض اصحاب کے مشورہ پر اس کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اگرچہ غزوہ تبوک کے ضمن میں اسلامی فوج کے ہتھیاروں کا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے۔ تاہم یہ یقین کرنے کی وجوہ ہیں کہ پوری فوج ہر طرح کیل کانٹے سے لیس تھی۔ کیونکہ یہ عہد نبوی کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور فوج تھی۔ اس غزوہ کے دوران حضرت خالد بن ولید مخزومی کی قیادت میں ایک اسلامی مہم نے دومۃ الجندل کے عیسائی بادشاہ سے تلواروں، نیزوں اور زرہ بکتروں پر مشتمل کم از کم آٹھ سو ہتھیار حاصل کئے تھے۔[۲۸۱]

مذکورہ بالا مفصل بحث سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست اپنے سلاح خانے کے ذخیرہ کو ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی اور اس کے لئے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی تھی۔ لیکن اس بحث سے یہ غلط فہمی نہ پیدا ہونی چاہئے کہ اسلامی ریاست تمام تر ذخیرہ حربی صرف اموال غنیمت کے ذریعہ حاصل ہوا تھا۔[۲۸۲] یقیناً یہ بھی ایک اہم ذریعہ تھا اور اس کے سبب اسلامی ریاست کے سلاح خانے میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔ لیکن صرف وہی تنہا ذریعہ نہ تھا۔ اس کے حصول کے متعدد ذرائع تھے۔ کیونکہ اسلامی فوج کے تمام ہتھیاروں کا اگر اموال غنیمت میں ملنے والے ہتھیاروں سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اس کی چوتھائی ضرورت کو بھی کافی نہیں تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی مآخذ سے نہیں معلوم ہوتا کہ دس ہزار گھوڑے صرف جنگوں اور مہموں میں حاصل شدہ مال غنیمت کے نتیجہ میں حاصل ہوئے تھے۔ بلا ریب گھوڑوں اور ہتھیاروں کی زیادہ تر تعداد خرید و فروخت کے ذریعہ حاصل کی گئی تھی۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ خمس کا ایک حصہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہتھیاروں اور گھوڑوں کی خرید پر صرف فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے آلات حرب بھی بعض صلح پسند قسم کے ذرائع سے حاصل کئے گئے تھے۔ ان میں مسلم امت کے چندوں اور عطیوں کا خاصا حصہ تھا۔ مسلمانوں میں سے متمول افراد نے ہر اہم موقعہ پر دامے درمے اور قدمے عطیات دیئے تھے اور اسلامی فوج کو مسلح کرنے میں بھرپور مدد کی تھی۔ اس کی تفصیل تو آگے آئے گی۔ یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ تنہا حضرت عثمان بن عفان نے غزوہ تبوک کے ایک تہائی لشکر کو اپنی جیب خاص سے مسلح کیا تھا۔[۲۸۳]

بہر حال مذکورہ بالا تجزیے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سات آٹھ سال کے قلیل عرصے میں اسلامی فوج ایک ٹوٹی پھوٹی ہتھیاروں سے تہی اور شہسواروں سے خالی اور غیر تربیت یافتہ وغیر منظم فوج سے ترقی کر کے ایک منظم و مرتب، ہتھیاروں اور اسلحوں سے لیس شہسواروں پر مشتمل اور عظیم جنگی مشین میں ڈھل گئی تھی۔ وہ اپنے وقت کی نہ صرف جزیرہ نمائے عرب میں ایک عظیم ترین فوج بن گئی تھی، بلکہ غالباً پڑوسی ملکوں اور ریاستوں میں بھی کوئی ایسی جنگی قوت نہ تھی جو اس کی طاقت کا مقابلہ کر سکتی۔ اس عظیم فوج نے نہ صرف اس سیاسی نظام کی بنیاد رکھی جس نے غیر منظم، وحشی اور نظم و نسق کے دشمن عربوں کو مدینہ کی مرکزی اسلامی حکومت کا فرمانبردار شہری بنا دیا بلکہ وقت کے ساتھ ایک ایسی جنگی مشین میں ڈھل گئی، جس نے کچھ مدت کے بعد عالمگیر فتوحات کے جھنڈے گاڑے۔

محافظ جسم فوج یا دستے

عسکری تنظیم کے آخر میں محافظ جسم دستوں (Body - guards) کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک اہم ترین کام یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا انتہائی نازک فریضہ انجام دیتے تھے۔ چنانچہ اس شعبہ میں ان تمام حضرات کو شامل کیا گیا ہے جنہوں نے مہموں یا جنگوں کے دوران یا زمانہ جنگ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کی حفاظت کی تھی۔ آپ کی جسمانی حفاظت محض اس لئے ضروری نہیں تھی کہ آپ خدا کے رسول اور مسلمانوں کے محبوب سردار تھے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ آپ کی ذات اقدس ہی پر اس وقت اسلامی ریاست منحصر تھی۔ اگر خدانخواستہ آپ کی ذات کو ابتدائی زمانے میں کوئی گزند پہنچ جاتا تو وہ پوری عمارت زمین پر دھڑام سے آگرتی جس کو اتنی جاں فشانیوں اور قربانیوں سے آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے تعمیر کیا تھا۔ زمانہ جنگ میں آپ کی ذات کیلئے خطرات کئی گنا بڑھ جاتے تھے کیونکہ عرب روایات میں قبیلوں کے سرداروں کو اچانک قتل کرا دینے کی اجازت تھی۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کا حوصلہ پست ہو جاتا اور یقینی تھا کہ وہ سارا کام ملیا میٹ ہو جاتا جس کے لئے اتنے پاپڑ بیلے گئے تھے۔ بہر حال اس ذیل میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ آپ کی حفاظت کے انتظامات مسلمانوں نے از خود کئے تھے اور ان کے لئے آپ نے احکامات یا ہدایات نہیں دی تھیں تاہم ان انتظامات کو آپ کی پسندیدگی ضرور حاصل تھی جس کو حدیث کی اصطلاح میں تقریر (تصدیق) کہتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیعت عقبہ ثانیہ میں انصار کے دونوں قبیلوں اوس اور خزرج نے جو آپ کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا اسے انہوں نے تا زندگی بحسن و خوبی نبھایا۔ لہٰذا یہ حیرت انگیز بات نہیں معلوم ہونی چاہیے کہ آپ کی ذات کی حفاظت میں پیش پیش یہی دونوں قبیلے تھے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم اور نمایاں ترین حضرات دونوں قبیلوں کے سردار حضرت سعد بن معاذ اوسی اور حضرت سعد بن عبادہ خزرجی تھے۔ بدر کی مہم کے دوران جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عریش میں تشریف فرما اور سجدہ میں مشغول تھے تو آپ کی محافظت حضرت سعد بن معاذ اوسی نے کی تھی [۲۸۴] غزوہ احد کے بعد جب دشمن حمراء الاسد کی جانب پسپا ہو گیا تو مسلمان مدینہ لوٹ آئے تھے مگر دونوں مدنی سرداروں نے اپنے محبوب اور زخمی رسول کی حفاظت کی طرف سے غفلت نہیں برتی تھی اور رات بھر وہ دونوں اپنی خستہ حالی کے باوجود اپنے ایک اور ساتھی حضرت اُسَید بن حُضَیر کے ساتھ آپ کے مکان کا پہرہ دیتے رہے تھے۔ کیونکہ خطرہ تھا کہ کہیں آپ پر شب خون نہ مارا جائے [۲۸۵] حمراء الاسد کی مہم کے دوران جب آپ وہاں خیمہ زن ہوئے تو اوس و خزرج کے ممتاز و

سربرآوردہ اشخاص باری باری آپ کی حفاظت کے لئے پہرہ دیتے رہے تھے۔ ان میں سے چار حضرات سعد بن معاذ، عباد بن بشر، عبید بن اوس اور قتادہ بن نعمان کا تعلق اوس سے تھا تو باقی تین حضرات سعد بن عبادہ، حباب بن منذر اور اوس بن خولی کا تعلق خزرج سے تھا[۲۸۶] بعد کی اور مہموں جیسے ذات الرقاع، حدیبیہ، وادی القراء اور متعدد دوسرے غزوات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظ جم جاں نثاروں کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے۔

اس طبقۂ جاں نثاراں میں سب سے عظیم شخصیت بلاریب حضرت عباد بن بشر اوسی کی تھی۔ وہ اپنے محبوب رسول کی حفاظت کے لئے ہمیشہ تیار اور پیش پیش رہتے تھے۔ ان کا بار بار ذکر مآخذ میں اس سلسلہ میں ملتا ہے[۲۸۷]۔ بقیہ دوسرے ممتاز حضرات کا ذکر پہلے ہی آچکا ہے لہذا ان کے ناموں کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہاں یہ بات کہہ دینے کی ضرورت ہے کہ دوسرے لوگوں نے بھی اپنے محبوب و مکرم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں کوئی دقیقہ نہیں فروگذاشت کیا تھا۔ انہوں نے بھی اسی محبت، خلوص اور جاں نثاری کے ساتھ آپ کی حفاظت کی تھی۔ ان کے اسمائے گرامی عموماً مآخذ نے محفوظ نہیں رکھے۔ پھر بھی بعض نام مل ہی جاتے ہیں مثلاً حضرت عمار بن یاسر مذحجی اور حضرت بلال بن رباح حبشی نے آپ کی متعدد مواقع پر محافظت کا خوشگوار فرض انجام دیا تھا[۲۸۸]

بہر حال جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ زیادہ تر محافظین کا تعلق اوس و خزرج کے قبیلوں سے تھا۔ جو نام مذکور ہوئے ہیں۔ ان میں آٹھ اوس کے ہیں اور چار خزرج کے اور ان اوسی اور خزرجی جاں نثاروں نے یہ سعادت مجموعی طور سے پندرہ مواقع پر حاصل کی تھی۔ جہاں تک اس طبقہ کے جاں نثاروں کے زمانۂ اسلام کا تعلق ہے تو یہ ظاہر ہے کہ وہ زیادہ تر ابتدائی مسلمان تھے۔ یا تو وہ ابتدائی مکی عہد کے مسلم تھے یا ابتدائی مدنی عہد کے۔ ذیل میں ایک مختصر سی جدول دی جا رہی ہے تاکہ ان سے متعلق اعداد و شمار واضح ہو سکیں

علاقہ	قبیلہ	نفر زیاں	افسر محافظ
مرکزی عرب	۱۔ اوس	۱۰	۶
	۲۔ خزرج	۵	۴
جنوبی عرب	۱۔ مذحج	۱	۱
غیر عرب مسلم	۱۔ حبشی	۱	۱
میزان	۴ طبقات	۱۷	۱۲

خلاصۂ بحث

تاریخی نقطۂ نظر سے مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کا قیام دار تقا ایک عظیم تہذیبی سنگ میل تھا خاص کر اسلامی تاریخ میں۔ اس کے قیام، توسیع اور ارتقاء میں خالص انسانی کوششیں اور جد و جہد کی کارفرمائی رہی تھی۔ جہاں مذہبی نقطۂ نظر سے اہم عناصر جیسے

نصرت و توفیق الٰہی سے براہ راست ہمیں بحث نہیں ہے۔ تاہم اس ضمن میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ نصرت غیبی اور توفیق الٰہی انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو اس کے راستے میں کوشش و جہد کرتے ہیں۔ قرآنی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ نصرت الٰہی جد و جہد کے ساتھ مشروط ہے اور خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی کہ جس کو خود اپنی حالت کے بدلنے کا احساس و خیال نہ رہا ہو۔ تاریخی تناظر میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مٹھی بھر انسانوں نے تیرہ برس تک مسلسل جد و جہد کی تھی۔ بے نظیر قربانیاں دی تھیں۔ بے مثال تگ و دو کی تھی۔ تب جا کر اس ریاست کی اوّل بنیاد فراہم ہوئی تھی اور یہ اولین بنیاد تھی اسلامی امت کی پھر مدینہ منورہ کے دہ سالہ دور میں اسی امت اسلامی نے جد و جہد اور کوشش کی ایک نئی جہت نئی سمت تلاش کی تھی۔ اس دور میں مسلمانوں کی جد و جہد گوناگوں عناصر سے مرتب ہوئی تھی اور ان میں ایک اہم ترین عنصر فوجی تھا۔

بحث گذر چکی ہے کہ جغرافیائی سیاسیات اور سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات نے مدینہ منورہ کے مسلمانوں کو اپنی ایک فوجی تنظیم قائم کرنے پر مجبور کیا تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر ان کی زندگی محال اور اسلامی ریاست کا قیام ناممکن تھا۔ یہ اسلامی فوجی تنظیم ایک دن میں یا اچانک ایکدم سے وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ حالات و واقعات کے تقاضوں کے تحت رفتہ رفتہ وجود میں آتی اور ارتقا پذیر ہوتی رہی تھی۔ مختلف مرحلوں اور منزلوں سے گذرتی ہوئی وہ عہد نبوی کے آخری برسوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔

مدینہ میں مسلمانوں کی ریاست کے قیام کے بعد ارد گرد کے قبائل سے تعلقات قائم کرنا ناگزیر ہو گیا تھا اس کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی مشن ترتیب دیئے۔ حالات اور حفاظت خود اختیاری کے تحت ان پر امن جماعتوں کی حیثیت فوجی بھی ہو گئی یہ ابتدائی مہمیں تھیں۔ جن میں غزوات و سرایا دونوں شامل تھے۔ بنیادی طور سے ان کی حیثیت عسکری نہیں تھی لیکن مخالف عرب قبائل سے بالعموم اور قریشی اشرافیہ سے بالخصوص مسلح تصادم نے غزوات و سرایا کو صرف فوجی و عسکری نوعیت عطا کر دی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک خالص اسلامی عسکری تنظیم رفتہ رفتہ وجود میں آگئی اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس کے مختلف شعبے اور ان میں کام کرنے والے کارکن بھی وجود میں آئے۔

پیغمبر خدا ہونے کے ناطے محمد بن عبداللہ ہاشمی صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی امت کے سربراہ تھے اور اس حیثیت سے عسکری تنظیم کے صدر بھی۔ آپ کے تمام اختیارات کا سرچشمہ آپ کی رسالت تھی۔ چنانچہ جنگ و صلح کا کلی اختیار صرف آپ کو حاصل تھا۔ اُمت مسلمہ آپ کو مشورہ دینے کی مجاز تھی بلکہ اس سے مشورہ کرنا آپ کے لئے ضروری بھی تھا۔ مگر آخری فیصلہ صرف آپ کے ہاتھ میں تھا چنانچہ اس حیثیت سے اسلامی فوج کے واحد مستقل کمانڈر اور جنرل صرف آپ تھے اور تمام امت اسلامیہ کی بالغ مرد آبادی اسلامی فوج تھی جس پر آپ کے احکام کی تعمیل بہر صورت واجب و فرض تھی۔ اپنے انہیں اختیارات کے تحت آپ متعدد افسروں اور کارکنوں (امرا و عمال) کو مقرر فرماتے تھے۔ عسکری تنظیم میں اہم ترین عمال میں سرایا کے امراء ہوتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی کسی مہم کی قیادت کسی سبب سے بنفس نفیس کرنا نہیں پسند کرتے تھے تو اپنی جگہ اپنے کسی صحابی کو اس مہم کا قائد مقرر کر دیتے تھے۔ یہ قائد عارضی ہوتا تھا جس طرح کہ وہ مہم عارضی ہوتی تھی۔ وہ صرف اسی مہم کا قائد مقرر کیا جاتا تھا اور جونہی مہم پوری ہوتی تھی۔ قائد کی تقرری بھی یا عہدہ بھی ختم ہو جاتا تھا۔ اس طرح پورے مدنی دور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کل ۴۲ مہمیں بھیجی تھیں اور اتنی ہی تقرریاں کی

تھیں۔ مگر قائدین نبوی کی کل تعداد صرف ۴۹ رہی تھی۔ کیونکہ ان میں سے بعض نے ایک سے زیادہ مہموں کی قیادت کی تھی۔ ان میں دو صحابہ نے تین تین اور دو اور صحابہ نے چار چار مہموں کی قیادت کی تھی۔ حضرت زید بن حارثہ کلبی مولائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آقا و مولا کے بعد سب سے زیادہ یعنی بہ اختلاف روایت تیرہ یا گیارہ مہموں کی کمان کی تھی اور ہر ایک میں سرخرو رہے تھے۔ تقرری کا معیار صلاحیت و لیاقت تھی جس کے لئے حالات و زمانہ کی رعایت بھی کی جاتی تھی عموماً امراء سرایا کی تقرریوں میں تمام مسلم طبقات اور ان کے علاقوں کو مدنظر رکھا گیا تھا۔ لیکن فطری طور سے مرکزی عرب کے قبائل۔ قریش اور انصار۔ کو زیادہ مناصب اور عہدے ملے تھے کہ وہی اسلامی امت کی ریڑھ کی ہڈی تھے۔ جہاں تک ان قائدین نبوی کی مہموں کی عددی طاقت کا تعلق ہے تو وہ مختلف عناصر کی بنیاد پر طے ہوتی تھی۔ ان میں دشمن و مخالف قبیلہ کی طاقت، خطرہ کی نوعیت اور مدینہ سے جائے فتنہ و فساد کی مسافت اہم ترین عناصر تھے۔ متعدد قریشی، انصاری اور بدوی عرب مسلمانوں نے ۲۱ بڑی مہموں کی قیادت کی تھی تاہم عددی لحاظ سے سب سے طاقتور مہموں کی قیادت کی سعادت حضرت زید بن حارثہ اور ان کے فرزند اسامہ یعنی ایک مولیٰ اور مولیٰ زادہ کے نصیب میں آئی تھی۔ یہ اس بات کا مزید ثبوت تھا کہ صلاحیت اور صرف صلاحیت قائد کے منصب پر تقرری کا معیار و کسوٹی تھی، خاندانی شرافت اور نجابت نہیں تھی۔ مہموں کی روانگی سے قبل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم امراء سرایا کو عام فوجی اور اخلاقی ہدایات دیتے تھے مگر اپنی مہموں کے سلسلے میں امراء سرایا کو مکمل آزادی اور خود مختاری حاصل ہوتی تھی۔ امراء کو یا ان کے سپاہ کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ وہ مال غنیمت میں برابر کے حصہ دار ہوتے تھے۔ امراء سرایا کی یہ تقرریاں ہجرت نبوی کے چھ ماہ بعد شروع ہوئی تھیں اور حیات نبوی کے آخری لمحہ تک برابر جاری تھیں۔

تمام بڑی اہم مہموں کی قیادت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس کی تھی۔ اصطلاح میں ان کو غزوات کہتے ہیں اور روایات کے مطابق ان کی کل تعداد ۲۸ تھی۔ ایک غزوہ کی عددی طاقت، ۷ تھی اور ایک اور کی ایک سو پچاس اور دو سو کے درمیان، پانچ غزوات میں مسلم سپاہ کی تعداد دو سو تھی جبکہ اتنے ہی غزوات میں تین سو سے چار ساڑھے چار سو تک، چار اور غزوات میں چھ سات سو مسلم سپاہ تھی اور ایک ڈیڑھ ہزار سپاہ پر مشتمل پانچ غزوات تھے۔ باقی غزوات میں مسلم سپاہ کی تعداد تین ہزار سے لیکر تیس ہزار تک تھی۔ غزوات میں کثرت سپاہ کے سبب اور دوسرے فوجی اسباب سے بھی ان کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ عرب فوجی روایات کے مطابق ایک مسلم فوج کے پانچ حصے۔ مقدمہ، میمنہ، قلب، میسرہ اور ساقہ۔ ہوتے تھے۔ اس لئے وہ خمیس کہلاتی تھی۔ اپنے نظام و تنظیم کے سبب اسے تعبیہ بھی کہتے تھے۔ مسلم فوج کے ہر بازو یا حصہ کا ایک سالار بھی ہوتا تھا اور وہ سالار اعظم یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتحت ہوتا تھا۔ طریق جنگ صف آرائی کے نظام پر مبنی تھا۔ جو عربوں نے اسلام سے کچھ قبل عجم سے مستعار لیا تھا اور عموماً غزوات نبوی اور بالخصوص جم کر لڑی جانے والی جنگوں میں عربوں کا پرانا طریق جنگ الکرّ والفرّ (حملہ کرنا اور پلٹ جانا) ترک کر دیا گیا تھا۔ جم کر لڑنے کو اصطلاحاً زحف بھی کہا جاتا تھا۔ یہ طریق جنگ اور خمیس نظام دونوں لازم و ملزوم تھے اور دونوں ہی شروع سے موجود تھے۔ چنانچہ بدر سے اس کی مثالیں ملنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ یہ نظام خمیس مکمل و منظم ہو گیا تھا اور بعد کی جنگوں اور غزوات میں مکمل طور سے موجود رہا تھا۔ غزوات کے نتیجہ میں اسلامی ریاست کے حدود اور رقبہ میں

کافی اضافہ ہوا تھا اور وہ ایک شہری ریاست سے ترقی کر کے ملک گیر ریاست بن گئی تھی۔

اسلامی عسکری تنظیم میں محافظ فوج (الحرس) ایک اہم شعبہ تھا۔ یہ محافظ فوج مختلف طرح کی ہوتی تھی۔ ایک قسم وہ تھی، جو جنگی زمانے میں یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ سے غیر حاضری کے زمانے میں شہری ریاست کے صدر مقام کی حفاظت کے لئے تعینات کی جاتی تھی چنانچہ بدر، احد، حمراء الاسد، خندق وغیرہ متعدد مواقع پر اس محافظ فوج کے حوالے مآخذ میں ملتے ہیں اسکے علاوہ محافظ فوج کی ایک قسم وہ ہوتی تھی جو دوران مہم مسلم فرودگاہ کی حفاظت کرتی تھی۔ ہم اس کو شب بیدار محافظ فوج بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ عموماً اس کی ضرورت رات کی تاریکی میں پڑتی تھی۔ یہ محافظ فوج کبھی ایک پورا دستہ ہوتی تھی اور کبھی چند افراد پر مشتمل ہوتی تھی۔ خطرہ نہ ہونے کی صورت میں ایک دو محافظ کافی سمجھے جاتے تھے۔ عموماً مہم کا سالار مسلم فرودگاہ کا سالار بھی ہوتا تھا لیکن کبھی کبھی سالار اعظم اپنا جانشین بھی مقرر کر دیتے تھے۔ تبوک کے غزوہ کے دوران حضرت ابوبکر صدیق نائب سالار اعظم نظر آتے ہیں۔

عرض یا لشکر کا معائنہ اسلامی فوجی تنظیم کا ایک اہم پہلو تھا۔ مستقل فوج نہ ہونے کے سبب عرض وقتاً فوقتاً نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے عموماً وہ مجاہدین کے اکٹھا ہونے کے بعد یا کوچ کے دوران یا جنگ شروع ہونے سے پہلے کیا جاتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس خدمت کے لئے کسی صحابی کو مامور فرما دیتے تھے جو افسر عرض ہوتا تھا۔ متعدد افسروں کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید بن ثابت خزرجی جنگ خندق کے بعد سے مستقل افسر عرض مقرر کر دیئے گئے تھے کیونکہ وہ ریاضی و حساب کے ماہر صحابی تھے۔

جہاں تک اسلامی فوج کے دستوں (ڈویژن) کا تعلق ہے وہ بنیادی طور سے پانچ ہوتے تھے۔ پیادہ دستے (المشاة)، شہسوار دستے (الخیل)، تیر اندازوں پر مشتمل دستہ (الرماة)، ہتھیاروں سے مسلح دستہ (اھل السلاح) اور سامان رسد و اسباب کا نگران دستہ (اھل الرثة)۔ بعد میں منجنیق اور دبابہ کو چلانے والا بھی دستہ خیبر کی مہم سے بڑھ گیا تھا۔ نقل و حمل کے لئے عربوں میں واحد ذریعہ اونٹ تھے۔ ابتدا میں اسلامی فوج صرف پیدل سپاہ پر مشتمل ہوتی تھی اور اس میں شہسوار بالکل نہیں تھے۔ احد کی جنگ سے شہسواروں کی تعداد میں اضافہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ جو خندق اور فتح مکہ کی مہم میں کافی تناسب رکھتا تھا۔ خندق میں تین ہزار سپاہ میں سے پانچ سو یعنی ۱/۶ حصہ اور فتح مکہ میں دس ہزار سپاہ میں سے ڈھائی ہزار یعنی ۱/۴ حصہ شہسوار تھا جو غزوہ تبوک میں بڑھ کر ۱/۳ یعنی تیس ہزار سپاہ میں سے دس ہزار شہسوار ہو گیا تھا۔ شہسوار فوج کے اس روز افزوں ارتقا میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی حکمت کا اصل حصہ تھا اور آپ نے ہر ممکن طریقہ سے شہسواروں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسلامی دستوں کی ایک نمایاں خصوصیت اس دور میں یہ تھی کہ وہ قبائلی خطوط پر مرتب و منظم ہوتے تھے۔ یعنی متعدد مسلم قبائل اپنے دستے جمع کرتے تھے جن سے اسلامی فوج بنتی تھی۔ ہر قبائلی دستہ اپنے قبائلی سردار کی ماتحتی میں ہوتا تھا۔ لیکن یہ تمام سردار اسلامی فوج کے سالار اعظم کے احکامات کے پابند ہوتے تھے۔ ابتدا میں اور چھوٹی مہموں میں صرف تین دستے ہوتے تھے، ایک مہاجرین کا اور باقی دو انصار کے دو قبیلوں اوس و خزرج کے۔ لیکن پھر بعد میں اور بڑی مہموں میں عرب قبائل کے دستے بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس قسم کی مہمیں عام طور سے خندق، حدیبیہ، خیبر، فتح مکہ اور تبوک تھیں۔ قبائلی کردار کے باوجود اسلامی عسکری تنظیم میں مرکزیت اور اجتماعیت پیدا ہونے لگی تھی کیونکہ سالار اعظم کا حکم سب کے لئے واجب التعمیل تھا۔ فتح مکہ کے بعد صوبائی فوجی تنظیم بھی ابھرنے لگی تھی۔ کیونکہ وقت ضرورت مرکز سے فوجوں کے

آنے میں تاخیر ہونے کے سبب صورت حال بگڑ سکتی تھی۔ چنانچہ یمن وغیرہ دور دراز کے صوبوں میں صوبائی فوج جو مرکزی مسلمانوں کے علاوہ بیشتر علاقائی مجاہدین پر مشتمل ہوتی تھی بنائی گئی تھی اور اس صوبائی فوج کا افسر اعلیٰ عموماً گورنر / والی ہوتا تھا۔ مگر بعض حالات میں ایک خاص فوجی افسر اعلیٰ بھی مقرر کیا جاتا تھا جو گورنر کا ماتحت ہوتا تھا۔

اسلامی عسکری تنظیم نے جاہلیت کے عربوں سے علم / پرچم اور علمبرداروں کی روایت بھی ترکہ میں پائی تھی۔ فوجی پرچم عزت و آبرو کا نشان ہوتا تھا اور مہموں کے دوران اس کا علمبردار ہونا افتخار کا معاملہ تھا۔ عرب روایت کے مطابق پرچم بردار ہونا کسی ایک قبیلہ کا حق ہوتا تھا۔ لیکن اسلام نے اسے کسی طبقہ کا جاگیری حق نہیں بننے دیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مسلم قبائلی دستوں کو پرچم عطا فرماتے تھے اور ایک پرچم اسلامی ریاست کی نمائندگی کے لئے ہوتا تھا۔ جو عموماً کسی عظیم صحابی کو عطا کیا جاتا تھا۔ عام پرچم کو لواء اور خاص پرچم کو رایہ کہتے تھے۔ لیکن لبا اوقات یہ فرق زیادہ ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ سرایا میں عموماً ایک ہی پرچم ہوتا تھا۔ لیکن غزوات میں کم از کم تین یا اس سے زیادہ ہوتے تھے۔ ان پرچموں کے علمبردار افسر ہوتے تھے۔ جو پہلی مہم سے آخری مہم تک برابر مقرر ہوتے رہے تھے ان کا عہدہ عارضی ہوتا تھا اور بعض علمبرداروں کو یہ سعادت بار بار ملی تھی۔ حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کو کم از کم دس مہموں میں علمبرداری کا افتخار ملا تھا۔ اندازہ یہ ہے کہ دو تین سو پر مشتمل دستہ کو ایک علم عطا کیا جاتا تھا۔

ان افسروں کے علاوہ متعدد کارکن بھی اسلامی فوجی تنظیم کا ناگزیر حصہ تھے۔ ان میں طلیعہ (گشتی دستے) کے سپاہی اور افسر ہوتے تھے۔ طلیعہ عموماً ایک جماعت ہوتی تھی جو دو تین افراد سے لیکر بیس سپاہیوں تک مشتمل ہوتی تھی اور ان کا ایک سالار ہوتا تھا طلیعہ فوج کا ایک حصہ ہوتا تھا جو ضروری اطلاعات فراہم کرنے کی غرض سے بھیجا جاتا تھا۔ وہ دن میں کھلم کھلا کام کرتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ جاسوسوں (عیون) سے مختلف ہوتے تھے۔ جاسوس عموماً ایک یا دو کر کے بھیجے جاتے تھے اور وہ خفیہ طور سے کام کرتے تھے۔ دونوں کا کام اطلاعات فراہم کرنا اور دشمن کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہوتا تھا۔ تمام مسلم مہموں میں چاہے وہ سرایا ہوں یا غزوات طلیعہ اور جاسوسوں نے کام کیا تھا اور بڑی حد تک ان کی وجہ سے اسلامی افواج کو کامیابی ملی تھی۔ اس طرح تمام مسلم مہموں میں لازمی طور سے راہبر (دلیل) کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں کہ ان کے سبب نہ صرف منزل مقصود پر پہنچنا یقینی ہو جاتا تھا۔ بلکہ گمشدگی کا خطرہ جاتا رہتا تھا اور مختصر سے وقت میں مختصر سے راستے کے ذریعہ اچانک دشمن کے سر پر پہنچا جا سکتا تھا۔ راہبروں کا تعلق عام طور سے بدوی قبائل سے ہوتا تھا کیونکہ وہ جغرافیائی حالات سے واقف ہوتے تھے اور ان کی خدمات فریقین میں سے کوئی بھی معاوضہ پر حاصل کر سکتا تھا۔

اسی طرح اسلامی عسکری تنظیم میں افسروں کی ایک قسم وہ ہوتی تھی جو اموال غنیمت اور قیدیوں کے لئے مقرر کئے جاتے تھے کبھی کبھی ان دونوں کے لئے ایک ہی افسر کافی سمجھا جاتا تھا۔ اور کبھی الگ الگ اموال غنیمت اور قیدیوں کے افسر مقرر ہوتے تھے۔ بعض اوقات غنیمت میں خمس کے لئے علیحدہ اور مسلمانوں کے حصوں کے لئے الگ افسر مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ ان کی نگرانی کے افسر ہوتے تھے۔ تقسیم اموال غنیمت کے افسر الگ ہوتے تھے۔ خیبر کی مہم کے زمانے سے حضرت زید بن ثابت خزرجی تقسیم اموال غنیمت کے مستقل افسر ہو گئے تھے۔ اس قسم کے افسروں کا تقرر غزوات اور سرایا دونوں کے لئے ہوتا تھا۔ کبھی سرایا کے لئے یہ تقرری خود رسول مقبول

صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اور کبھی کبھی اس کو امیر سریہ کی صوابدید پر چھوڑ دیتے تھے۔ اسی طرح اسلحوں اور گھوڑوں کے لئے بھی الگ الگ افسر مقرر کئے جاتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی اموال غنیمت کا افسر صاحب المغانم ہی ان دونوں کا افسر بھی ہوتا تھا۔ مسلم سلاح خانے یا ذخیرہ حربی کی ترقی کے ایک مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداء میں مسلمان فوج کے پاس ہتھیار خاصے کم تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان میں اضافہ ہوتا رہا۔ ان میں کچھ تو اضافہ مال غنیمت میں حاصل شدہ ہتھیاروں کے سبب ہوا تھا لیکن زیادہ تر وہ مسلمانوں کی خرید اور عطیہ کا مرہون منت تھا۔ مسلم عسکری تنظیم کا آخری کارکن محافظ جسم دستہ اور اس کے سپاہی ہوتے تھے جو اپنے سالار اعظم یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی حفاظت کرتے تھے۔ خاص کر مہموں کے دوران یا زمانہ جنگ میں اس شعبہ میں امتیاز مدینہ کے انصار قبیلوں خاص کر اوس کو حاصل تھا جنہوں نے بیعت عقبہ ثانیہ میں کئے گئے وعدہ کو پوری طرح سے وفا کیا تھا کہ یہی شرط بیعت تھی

اسلامی عسکری تنظیم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے مختلف قبیلوں اور علاقوں کے عربوں میں ایک فوجی و عسکری اتحاد پیدا کر دیا تھا اور ان کے اندرونی قبائلی اور علاقائی اختلافات کو بھلا کر ان کو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ایک متحد و منظم فوج میں ڈھال دیا تھا۔ جن کا واحد نصب العین اپنی اسلامی ریاست کا دفاع اور ارتقاء تھا۔ مادی لحاظ سے یہی اسلامی عسکری تنظیم تھی۔ جس نے مدینہ کی شہری ریاست کے اندرونی دشمنوں خاص کر مدینہ کے یہودی قبائل کی سرکوبی و بیخ کنی کی تھی اور اس کے نتیجہ میں ریاست کی حدود و رقبہ میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔ پھر اسی فوجی تنظیم نے اردگرد کے قبائل کی طاقت کو توڑا تھا۔ اور ان کو اسلامی ریاست یا اسلامی امت کا رکن بنایا تھا۔ شمال میں یہودی قبیلوں اور عیسائی مملکتوں اور آزاد مگر جنگجو قبیلوں کو اس قدر مرعوب و دہشت زدہ کیا تھا کہ انہوں نے عراق و شام میں متمکن ایرانی اور رومی آقاؤں سے منہ پھیر کر اسلامی ریاست کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر لی تھی۔ مگر ان سب سے بڑھ کر اسی فوجی طاقت نے عرب کی سب سے بڑی فوجی قوت اور منظم اشرافیہ۔ قریش مکہ۔ کا کس بل نکال دیا تھا اور بالآخر اس کو اسلامی ریاست کا ایک ماتحت و محکوم حصہ بنا دیا تھا۔ فتح مکہ کے بعد پورا جنوبی اور مشرقی عرب اسلام اور اسلامی پرچم کے تلے آ گیا تھا لہٰذا یہ بلاخوف و خطر کہا جا سکتا ہے۔ کہ اگر اسلام نے دلوں کو فتح کر کے اسلامی ریاست و امت کی داغ بیل ڈالی تھی تو اسلام کی عسکری تنظیم نے انسانی جسموں کو فتح کر کے ان کی گردنوں میں اطاعت کے حلقے ڈالے تھے اور اسی کی بدولت شمال میں حدود شام سے جنوب میں عدن تک اور مغرب میں بحر احمر سے مشرق میں خلیج فارس و حدود ایران و عراق تک پورا کفرستان عرب لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی روح پرور صداؤں سے گونجنے لگا تھا۔

اسلامی ریاست کا شہری نظم و نسق

ایک دہائی کی مدت سے کم عرصے میں مدینہ منورہ کی شہری ریاست ترقی کر کے مسلمانوں کی قومی ریاست بن گئی تھی اگرچہ وہ عربوں کے قبائلی نظام پر استوار ہوئی تھی لیکن جلد ہی وہ ایک مرکزی سلطنت اور حکومت کی شکل میں ارتقاپذیر ہوئی۔ یہ عربوں کے لیے ایک بالکل نیا سیاسی تجربہ تھا اس سے پہلے پورا جزیرہ نمائے عرب کبھی بھی کسی ایک مرکزی اقتدار کے تابع اور محکوم و مطیع نہیں رہا تھا۔ اگرچہ عربوں کی فطری مرکزیت مخالف فطرت ان کو ہمیشہ کسی غیر کے اقتدار بلکہ مرکزی حکومت کے تصور کے خلاف بھی اکساتی اور بغاوت پر آمادہ کرتی رہتی تھی۔ لیکن نئے دین —— یعنی اسلام —— نے ایک سیاسی آئیڈیالوجی کے بطور ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرکزی طاقت و اقتدار کے سامنے اپنے سر خم کرنے کی ضرورت کا قائل بنا دیا تھا۔ دراصل اسلام کی مذہبی اجتماعیت کے تصور نے مسلم قوم ہونے یا اسلامی قومیت کے تصور کو جنم دیا تھا۔ ایک دین سے وابستگی اور اس کے نتیجہ میں برادرانہ اخوت نے علاقہ، قبیلہ، وطن، رنگ، نسل اور زبان وغیرہ کے امتیازات کو مٹا دیا تھا اور پورے جزیرہ نمائے عرب کے مسلمان ایک دوسرے کو اپنا اسلامی بھائی سمجھتے تھے اور اسی احساس و ادراک اخوت نے ان کو ایک قوم بنا دیا تھا۔ عربوں یا دوسری تہذیبوں کے معاشرتی اصولوں اور بنیادوں —— نسل، وطن، رنگ —— کی جگہ اسلام نے اپنی معاشرت کی بنیاد مذہب پر رکھی تھی اور خون کے رشتہ کی جگہ مذہبی تعلق نے لے لی تھی۔ اس انقلاب آفریں معاشرتی تصور نے ہی مدینہ کی اسلامی ریاست کو ایک قومی ریاست میں تبدیل کر دیا تھا جس سے تمام مسلمانوں کو جذباتی وابستگی اور روحانی محبت تھی۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے دین و دنیا کے فرق کو مٹا کر اسلام اور اسلامی ریاست کو ایک دوسرے کا مترادف بنا دیا تھا۔ اسلامی ریاست کی خدمت دراصل اسلام کی خدمت تھی کیونکہ دین و ریاست دونوں توام تھے، اور ان دونوں کے سربراہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

اسلامی سیاسی تصور کے مطابق اسلامی ریاست کا حاکم حقیقی اور مقتدر اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہیں اور انہی کے احکام و مرضی کے مطابق اسلامی ریاست کو چلایا جاتا تھا۔ یہ احکام و مرضی کچھ تو اس کی نازل کردہ کتاب میں موجود تھی اور کچھ کا مہبط و ماویٰ وامین قلب محمدی تھا جس سے وہ جب عمل میں منتقل ہوتی تو سنت محمدی میں ڈھل جاتی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر مرضیٔ الٰہی اور احکام خداوندی کو اور کون جاننے اور سمجھنے اور تعبیر کرنے والا تھا۔ لہذا فطری بات تھی کہ اس کائنات رنگ و بو میں آپ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور اس حیثیت سے مملکت اسلامی کے جانشین حاکم خداوندی تھے۔ خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے آپ کو تمام مذہبی اور سیاسی اختیارات حاصل تھے۔ سیاسی اختیارات میں قانون سازی، انتظامیہ، عدلیہ اور فوجی اختیارات شامل تھے۔ بشریت کے سبب اور ایک ریاستی نظم و نسق اور انتظامیہ بنانے کی غرض سے بھی آپ اپنے بہت سے اختیارات کو ثانوی طور سے اپنے بہت سے صحابہؓ کو

منتقل کر دیتے تھے اور ان کو مختلف عہدوں اور منصبوں پر مقرر کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ کارکن، عارضی ہوں یا مستقل، آپ کی مرضی اور پسندیدگی کی ہی صورت میں اپنے مناصب پر برقرار رہ سکتے تھے اور اس اعتبار سے وہ آپ کے ماتحت و محکوم تھے۔

آپ کے شہری نظم ونسق میں مرکزی، صوبائی یا علاقائی اور مقامی منتظمین اور انتظامیہ کے کارکن شامل تھے۔ ذیل کے صفحات میں ہم عہد نبوی کے شہری نظم ونسق کے تاریخی ارتقا سے بحث کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے یہ نکتہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ عہد نبوی میں بلکہ قرون وسطیٰ کی تمام سیاسی تنظیموں میں شہری، فوجی، عدلیہ وغیرہ کے شعبوں کی تقسیم نہیں تھی۔ یہ تقسیم ہم اپنی آسانی کے لیے کرتے ہیں۔ تاکہ حکومت کے مختلف شعبوں کے تاریخی ارتقاء اور ان کی کارکردگی کو سمجھا اور اجاگر کیا جا سکے۔ ہر لحاظ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مرکزی حکومت کے شہری نظم ونسق سے بحث کی جائے۔

مرکزی شہری نظم ونسق

اگرچہ تمام سیاسی اختیارات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں مرکوز تھے۔ تاہم آپ اپنی مدد، بہتر نظم ونسق اور انتظامیہ کے ارتقاء کے لئے اپنے متعدد صحابہ کو حکومت کے کاروبار میں شریک کرتے تھے۔ اس سلسلے میں جن منتظمین اور کارکنوں، عمال اور افسروں کے حوالے مآخذ میں ملتے ہیں۔ ان میں خلفاء و نائبین نبوی، مشیروں، سیکریٹریوں (کاتبین)، سفیروں (رسل)، مخصوص کاموں کے افسروں، شاعروں (شُعَرَاء)، خطیبوں (خُطَبَاء)، کے علاوہ متعدد کم درجہ کے کارکنوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے وقار و افتخار کے لحاظ سے سب سے ممتاز منصب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء کا تھا۔ لہذا اسی سے بحث کا آغاز کیا جاتا ہے۔

۱۔ مدینہ منورہ میں خلفاء (نائبین) رسول

جب کبھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی ضرورت سے مدینہ منورہ کے باہر تشریف لیجاتے تھے تو اپنا ایک جانشین شہر میں چھوڑ جاتے تھے۔ اگرچہ عام تصور یہ ہے کہ یہ جانشین رسول نماز کی امامت کے لئے مقرر کیا جاتا تھا۔ کیونکہ عموماً مآخذ اس کے لیے فقرہ علی الصَّلٰوۃ (نماز پر کے لیے) استعمال کرتے ہیں۔ اس سے یہ غلط فہمی رائج ہو گئی کہ آپ کی غیر موجودگی میں نائب و خلیفہ رسول صرف امام نماز ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ تصور صحیح نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مآخذ میں ان نوّابِ رسول کے فرائض و اختیارات کی صراحت کہیں نہیں ملتی ہے۔ مگر مآخذ اس جانشینی کے جو لفظ استعمال کرتے ہیں وہ بڑا معنی خیز ہے۔ عام طور سے جانشین کے لفظ خلیفہ اور جانشینی کے لئے اِستَخلَفَ (جانشین بنایا) یا اس کا مضارع یَستَخلِفُ (جانشین بناتے ہیں) استعمال کیا جاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں اصطلاحات ہیں جن کے مخصوص اور وسیع معنی ہیں۔ تاریخی شواہد سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ جانشین رسول محض نماز کے لئے آپ کا نائب نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ آپ کا بحیثیت سربراہ مملکت کے جانشین و خلیفہ ہوتا تھا اور وہ آپ کی غیر موجودگی میں مدینہ میں موجود و مقیم امت مسلمہ کی فلاح و بہبود اور ریاست اسلامی کے مفادات کا نگران ہوتا تھا وہ اصطلاحی معنی میں خلیفۃ الرسول یعنی آپ کا سیاسی جانشین ہوتا تھا۔ نماز پر تقرری یا نیابت کی اصطلاح بڑے وسیع معنی اور مفہوم کی حامل تھی اور عہد خلافت

راشدہ بالخصوص عہد فاروقی میں گورنروں (ولاۃ : والی) کی تقرری کے لئے بھی یہی فقرہ استعمال ہوتا رہا تھا۔ جو دراصل عہد نبوی کی میراث تھی[۲]۔ کیونکہ نماز دین کا اہم ترین ستون اور نماز کی امامت امت مسلمہ کی امامت کے مترادف و ہم معنی تھی۔ اس شعبۂ انتظامیہ کے تاریخی ارتقاء سے نائبین رسول کے مقام و مرتبے، اختیارات و فرائض اور کارکردگی کا بخوبی علم ہوگا۔

پہلے دو غزوات وَدّان اور بُواط میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالترتیب خزرج اور اوس کے قبائلی سرداروں حضرات سعد بن عبادہؓ اور سعد بن معاذؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ دو مقامی سربرآوردہ مسلمانوں اور قبائلی سرداروں کی یکے بعد دیگرے تقرری آپ کی سیاسی دوراندیشی اور انتظامی حکمت عملی کی دلیل تھی۔ اس طرح آپ نے شعوری یا غیر شعوری طور سے نہ صرف مدینہ کے دو اہم ترین اور طاقت ور ترین مسلم طبقات کو ریاستی و حکومتی معاملات میں شریک و سہیم ہونے کا احساس دلایا تھا۔ بلکہ ان کی وفاداری اور محبت بھی حاصل کرلی تھی۔ اس منصب جلیل پر تیسری تقرری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مولا و محبوب صحابی حضرت زید بن حارثہ کلبی کی ہوئی تھی[۵] حضرت زید کی تقرری کو وسیع تر تاریخی تناظر اور پیچیدہ تر سماجی پس منظر میں دیکھنا چاہیئے وہ ایک طرف تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روز افزوں سیاسی طاقت کی دلیل تھی تو دوسری طرف اسلامی امت میں موالی (غیر عرب مسلمانوں) کی سماجی قدر و منزلت بلکہ اسلامی مساوات کی ایک روشن مثال تھی۔ جیسا کہ گذشتہ باب میں حضرت زید اور ان کے فرزند جلیل کے تقرر کے بارے میں تفصیل کے ساتھ کہا جا چکا ہے۔ یہ تقرری یہ بھی ثابت کرتی تھی کہ حکومتی عہدے اور ریاستی مناصب کے لئے صلاحیت و لیاقت ہی واحد بنیاد تھی۔ خاندانی قبائلی یا علاقائی اسباب و عناصر نہیں[۶]۔ بہرحال پہلے قریشی صحابی جنہیں یہ اعزاز حاصل ہوا تھا حضرت ابو سلمہ بن عبدالاسد مخزومی تھے۔ جنہوں نے اسی برس غزوہ ذات العشیرہ کے دوران غیبت نبوی میں آپ کی جانشینی کا شرف حاصل کیا تھا[۷]۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مکہ کے قریش کے درمیان مسلح تصادم کے دوران جانشینانِ رسول کی تعداد اور طریق تقرری کے بارے میں ماخذ میں اختلاف نظر آتا ہے۔ ابن اسحاق اور ان کے جامع ابن ہشام کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن ام مکتوم کو اس عہدہ پر سرفراز فرمایا تھا لیکن بعد میں کچھ مصالح کے پیش نظر آپ نے ان کی جگہ حضرت ابولبابہ بشیر بن عبدالمنذر خزرجی کی تقرری فرمادی تھی اور ان کو آپ نے بدر کی طرف اپنے کوچ کے دوران روحاء نامی مقام سے واپس بھیجا تھا کہ وہ حضرت ابن ام مکتوم کی جگہ لیں[۸]۔ جبکہ بعض دوسرے ماخذ کا خیال ہے کہ حضرت ابولبابہ نے جس نائب رسول کی جگہ سنبھالی تھی وہ حضرت ابن ام مکتوم نہیں تھے بلکہ حضرت عاصم بن عدی اوسی تھے۔ لیکن ان تمام ماخذ کا اتفاق ہے کہ غزوہ بدر کے دوران دوسرے نائب رسول حضرت حارث بن حاطب تھے۔ جن کو شہر کے بالائی حصے (العالیہ) کے لوگوں کی دیکھ بھال کا فریضہ سپرد کیا گیا تھا[۹]۔ دوسری طرف ابن سعد کی روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر کم از کم تین حضرات کو شہر کے تین مختلف حصوں کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ حضرت ابولبابہ کو خاص شہر مدینہ کی، حضرت عاصم بن عدی عجلانی کو شہر کے بالائی علاقے (العالیہ) کی، اور حضرت حارث بن حاطب (بنو عمرو بن عوف) کو اپنے قبیلے کے علاقے کی[۱۰] کیونکہ ان کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ خبریں سننے کو ملی تھیں! بہرحال اس کے بعد حضرت ابولبابہ کو اس عہدہ عظیم پر ۶۲۴ء کے وسط (۲ھ کے اواخر) میں غزوات بنو قینقاع اور سویق کے دوران دو مزید تقرریوں کی سعادت ملی تھی اور اس طرح ان کو مجموعی طور سے یہ سعادت تین بار حاصل ہوئی تھی۔

امراء وعمال نبوی کے اس شعبہ میں سب سے نمایاں شخصیت بلاریب حضرت ابن ام مکتوم کی تھی۔ صحابی موصوف کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ نابینا تھے مگر اس خلقی کمزوری کے باوجود انہوں نے بارہ یا تیرہ[12] مواقع پر خلافت رسول کی سعادت حاصل کی تھی۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ حضرت ابن ام مکتوم کی پہلی تقرری بدر کے غزوہ کے دوران ہوئی تھی اگرچہ وہ عارضی رہی تھی اور ان کو دوسرے جانشین رسول کے حق میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ بہرحال چار ماہ بعد غزوہ الکدر کے موقع پر ان کی دوسری تقرری عمل میں آئی تھی ربیع الاول ۳ھ / ستمبر ۶۲۴ء میں ایک غزوہ کے سوا جب حضرت عثمان بن عفان اموی کو یہ سعادت ملی تھی[13] حضرت ابن ام مکتوم کی جمادی الاولیٰ ۳ھ / اکتوبر ۶۲۴ء تا شوال ۳ھ / مارچ ۶۲۵ء تک تین متواتر مواقع پر اس عہدہ جلیل پر تقرری ہوتی رہی تھی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوات بحران، احد اور حمراء الاسد کے زمانے میں شہر سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ پھر ایک مختصر سے عرصے کے بعد ان کی چھٹی تقرری غزوہ بنو نضیر کے زمانے میں ہوئی تھی۔ اس کے دوسرے برس کے دوران چار دوسرے صحابہ کرام حضرات عبداللہ بن رواحہ خزرجی[14]، عثمان بن عفان اموی[15]، سباع بن عرفطہ غفاری[16] اور زید بن حارثہ کلبی کی بالترتیب اتنے ہی غزوات کے دوران تقرریاں ہوئی تھیں۔ ان کے بعد حضرت ام مکتوم کی تقرریوں کا ایک سلسلہ دراز تھا جو ذی قعدہ ۵ھ / اپریل ۶۲۷ء سے محرم ۷ھ / مئی ۶۲۸ء تک وسیع تھا اور جس کے دوران انہوں نے پانچ غزوات۔ خندق۔ بنو قریظہ، لحیان، غابہ اور حدیبیہ کے زمانے میں متواتر نیابت رسول کی تھی۔ صحابی موصوف کی آخری تقرری رمضان ۸ھ / جنوری ۶۳۰ء میں فتح مکہ کے زمانے میں ہوئی تھی[17]۔ ماخذ کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے تیرہ مواقع پر یہ سعادت حاصل کی تھی۔ مگر تاریخی شواہد صرف بارہ کے لئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ماخذ کا دعویٰ کلی طور پر صحیح رہا ہو اور ایک موقع کی شہادت فراہم نہ کی جا سکی ہو۔ بہرحال اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ بڑی اہم تھی کہ ان کو اتنے کثیر مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتماد حاصل رہا تھا۔ یہ نکتہ اس حقیقت کے پس منظر میں اور بھی معنی خیز ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف جسمانی طور سے معذور تھے بلکہ قریش کے ایک غیر اہم خاندان بنو عامر بن لوئی سے متعلق تھے جو سیادت و قیادت کے لحاظ سے دوسرے درجہ کے خاندان بلکہ قریش البطاح کے باہر تصور کیا جاتا تھا۔ یہ بھی بہرحال ایک حقیقت ہے کہ اپنی تمام تر جسمانی اور خاندانی کم مائیگی کے باوجود وہ امت اسلامی کے اہم ترین افراد میں تھے۔ کیونکہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا غیر متزلزل اعتماد حاصل تھا اور اس سے بڑھ کر ان کی عظمت کا شاہد خود قرآن کریم بھی ہے۔

مرکزی انتظامیہ کے اس شعبہ میں دوسرے اہم اور نمایاں افسروں میں حضرت سباع بن عرفطہ غفاری کا ذکر خصوصی کرنا چاہیے وہ بعض جدید مورخین کے مطابق اگرچہ ایک نسبتاً چھوٹے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، تاہم ان کو خلیفہ رسول کے منصب عظیم پر تقرری کی تین بار سعادت ملی تھی۔ ان کی پہلی تقرری ربیع الاول۔ الثانی ۵ھ / اگست ستمبر ۶۲۶ء میں ہوئی تھی اور باقی دو صفر ۷ھ / جون ۶۲۸ء اور ذی الحجہ ۱۰ھ / مارچ ۶۳۲ء میں بالترتیب ہوئی تھیں[19]۔ بنو غفار کے ایک اور فرد حضرت ابو رہم کلثوم بن حصین غفاری کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جن کو ذی قعدہ ۷ھ / مارچ ۶۲۹ء میں غزوہ عمرۃ القضیہ کے دوران یہ عہدہ عظیم ملا تھا[20]۔ اس عہدہ پر ایک اموی یعنی حضرت عثمان بن عفان کی دو بار تقرری کی خاص اہمیت ہے[21]۔ بالخصوص اس حقیقت کے پس منظر میں کہ کسی ہاشمی کو یہ عہدہ پورے دور نبوی میں نہیں ملا تھا۔ غزوہ تبوک کے دوران حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کو صرف خاندان رسالت میں آپ کی جانشینی کا شرف ملا تھا[22]۔

جبکہ ریاست اسلامی کی سربراہی ایک اوسی صحابی حضرت محمد بن مسلمہ کے نصیب میں آئی تھی۔ یہ بھی اہم نکتہ ہے کہ بعض اہم ترین قریشی صحابہ کرام جیسے حضرات ابوبکر، عبد الرحمٰن بن عوف اور طلحہ، زبیر وغیرہ کو بھی اس شعبہ میں کوئی نمائندگی نہیں ملی تھی۔ نوابِ رسول کی علاقائی اور قبائلی نیز سال بسال تقرری کو بہتر طور سے سمجھنے کے لئے ذیل کی جدول کافی ہوگی۔

خلفاء	تقرریاں	۶۳۲	۶۳۱	۶۳۰	۶۲۹	۶۲۸	۶۲۷	۶۲۶	۶۲۵	۶۲۴	۶۲۳	قبیلہ/خاندان	علاقہ
۲	۱۷	-	-	۱	-	۱	۴	۱	۴	۵	۱	۱۔ قریش	مرکزی عرب
۱	۲	-	-	-	-	-	-	۱	-	۱	-	(الف) بنو امیہ	
۱	۱۳	-	-	۱	-	۱	۴	-	۳	۴	-	(ب) عامر بن لوی	
۱	۲	-	-	-	-	-	-	-	۱	-	۱	(ج) مخزوم	
۲	۲	-	-	-	-	-	-	۱	-	-	۱	۲۔ خزرج	
۵	۶	-	-	-	-	-	-	-	-	۵	۱	۳۔ اوس	
۱	۲	-	-	-	-	-	۱	-	-	-	۱	۱۔ کلب	شمالی عرب
۲	۴	۱	-	-	۱	۱	-	۱	-	-	-	۱۔ غفار	مغربی عرب
۱۳	۳۲	۱	-	۲	۱	۲	۵	۳	۴	۱۰	۴	۵ قبیلے	میزان

مذکورہ بالا جدول سے تمام حقائق از خود واضح ہو جاتے ہیں نیز گذشتہ باب میں اس موضوع پر خاصا کلام کیا جا چکا ہے لہٰذا اسے دہرانے کی مزید ضرورت نہیں رہتی۔ اس کی روشنی میں مذکورہ بالا جدول کی تشریح و تعبیر کی جا سکتی ہے۔ البتہ جہاں تک اس شعبۂ افسران کے زمانۂ قبولِ اسلام کا تعلق ہے تو تیرہ صحابہ کرام میں اکثر و بیشتر مکی دور کے سابقین اولین تھے اور باقی مدنی دور کے ابتدائی مسلمان۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان میں ایک دو کے سوا بقیہ سے کہیں زیادہ قدیم مسلم تھے۔ مگر ان کو ریاستی مناصب نہیں ملے تھے۔

۲۔ مشیرانِ نبوی (المشیرون)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام قسم کے "معاملہ میں مسلمانوں سے مشورہ کرنے" کا حکم دیا ہے[۲۴] مفسرین عظام نے معاملہ الامر کی تشریح میں مختلف قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن حکم خداوندی کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام ایسے امور میں جو امت مسلمہ کے اجتماعی مفادات سے متعلق ہوں، مسلمانوں سے مشورہ لینا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ یہ امور سیاسی، سماجی، اقتصادی اور فوجی اور مذہبی تک ہو سکتے تھے۔ جہاں تک مذہبی معاملات کا تعلق ہے تو وحی الٰہی انکو وقتاً فوقتاً

طے کرتی رہتی تھی۔ مگر ایسا بھی ہوا ہے کہ بہت سے مذہبی معاملات خاص دین کے معاملات کے اسلامی امت میں نفاذ کا معاملہ مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے بھی طے پایا ہے۔ بہرحال مشورہ لینا اور صلاح کرنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ضروری ضرور تھا تاہم آخری فیصلہ آپ کے ہاتھ ہی میں ہوتا تھا۔ اور جب آپ عزم مصمم کر لیتے تھے تو پھر اسے امت مسلمہ کا اجتماعی فیصلہ بھی تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ اسی سے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اسلامی سیاسیات میں امیر المومنین یا سربراہ مملکت کو وسیع اختیار حاصل ہوتے ہیں اور وہ صرف مشورہ کا پابند ہوتا ہے۔ مگر اسے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار حاصل ہوتا ہے اور آخری فیصلہ کا وہ مجاز کل ہوتا ہے۔ بہرحال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ جیسا کہ ماخذ ثابت کرتے ہیں۔ تمام اہم اجتماعی امور پر قرآنی ہدایت کے مطابق مسلم صحابہ کرام سے مشورہ کرتے تھے جن میں ریاستی و حکومتی امور بھی شامل تھے۔ یوں تو عام مسلمانوں سے مشورہ کرنے کا حکم تھا۔ جس کے سبب ادنیٰ سے ادنیٰ مسلم مشورہ دینے کا مجاز تھا مگر بوجوہ معلوم ریاستی معاملات میں مشورہ ہر کس و ناکس کی بات نہ تھی۔ اس لئے ان تمام اہم امور پر جن میں سوجھ بوجھ، فہم و فراست اور معاملات کے ادراک کی ضرورت ہوتی تھی صرف عظیم ترین صحابہ کرام سے مشورہ کرتے تھے۔

عہد نبوی میں مسلم امت کے اکابر سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ و صلاح کرنے کی بیشتر مثالوں کا تعلق فوجی امور سے ہے اور اس طرح واقدی کے اس عام تبصرے کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ جنگ (حرب) کے معاملات میں آپ صحابہ کرام سے اکثر و بیشتر صلاح و مشورہ کرتے تھے۔[25] جہاں تک شہادت مل سکی ہے کسی جنگی معاملہ پر مشورہ کا پہلا ثبوت غزوہ بدر سے تعلق ملتا ہے۔ ابن اسحاق، واقدی، بخاری اور طبری وغیرہ متعدد مورخین اور سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ جوں ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکی خروج کی بدر کی جانب پیش قدمی کی خبر ملی۔ آپ نے اس اہم مسئلہ کو اپنے مشیروں کے حلقہ کے سامنے غور و خوض اور مشورہ کے لئے رکھا۔ مہاجرین میں سے حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ اور مقداد بن عمرو خزاعی نے آپ کے منصوبہ کی بھرپور حمایت کی۔ جبکہ انصار میں سے حضرات سعد بن معاذ اوسی، سعد بن عبادہ خزرجی اور حباب بن منذر خزرجی نے انصار کی طرف سے آپ کو مکمل تعاون و حمایت کا یقین دلایا۔[26] یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسی متحدہ رائے اور شوریٰ نے جنگ بدر میں قتال کا حتمی فیصلہ کیا تھا۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے بدر میں مسلم خیمہ گاہ کے لئے جگہ کا انتخاب اور کنوؤں کے اندھا کئے جانے کا فیصلہ بھی آپ نے مشہور ماہر امور حرب حضرت حباب بن منذر کے مشورہ پر کیا تھا۔[27] مشہور واقعہ ہے کہ جنگ کے خاتمے پر جنگی قیدیوں کے ساتھ رویہ و سلوک پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا تھا اور حضرت ابوبکر صدیق کی صلاح کہ ان کو زر فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے کو قبول کر لیا تھا۔ جبکہ حضرت عمر فاروق کے قتل کرنے کے مشورہ کو آپ نے مسترد کر دیا تھا کہ یہی رحمت عالم کے لئے مناسب بھی تھا اس میں دوسرے فوائد مضمر تھے۔[28]

اسی طرح غزوہ احد کے موقعہ پر آپ کا مسلمانوں سے مشورہ کرنا مشہور واقعہ ہے۔ آپ کی پختہ رائے تھی کہ دشمن کی کثرت تعداد و بہتر جنگی لیاقت کے پیش نظر شہر میں محصور ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ اتفاق دیکھئے کہ اس رائے سے مشہور منافق سردار عبداللہ بن ابی بن سلول کو بھی اتفاق تھا اور بعض دوسرے اہم اور مخلص مسلمان صحابہ کو بھی لیکن اس کے باوجود آپ نے مسلم امت کے اہل رائے سے مشورہ کیا۔ ان میں سے ایک خاصے بڑے طبقہ کی رائے تھی کہ شہر سے باہر نکل کر کھلے میدان میں جنگ کرنا زیادہ سود مند ہوگا۔ اس پرجوش و دلیر طبقہ میں ناتجربہ کار نوجوانوں کے علاوہ متعدد تجربہ کار اور صاحبان فہم و فراست بھی شامل تھے واقدی

کے مطابق حضرات حمزہ بن المطلب ہاشمی، سعد بن عبادہ خزرجی، نعمان بن مالک، مالک بن سنان، ایاس بن اوس، خیثمہ بن حارث اور انس بن قتادہ جیسے سرآوردہ لوگ پیش پیش تھے[29] بالآخر اس طبقہ کی رائے کو ان کی پرجوش وکالت کے سبب آپ نے قبول بھی کر لیا اور کھلے میدان میں جنگ کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ مگر جب آپ زرہ بکتروں سے لیس ہو کر میدان جنگ کے لیے گھر سے نکلے۔ تو اس طبقہ کے بعض لوگوں کو ندامت ہوئی کہ انہوں نے آپ کو اپنی رائے کے خلاف اقدام کرنے کے لئے تقریباً مجبور کر دیا ہے اور انہوں نے فیصلہ پر نظر ثانی کی درخواست کی جسے آپ نے عزیمت رسول اور صلابت نبوی کے خلاف قرار دیکر فیصلہ کو بدلنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ آپ کے اس عزم بالجزم سے فوری طور پر مسلم فوج کی تعداد میں منافقین کے تقریباً ڈھائی سو سپاہ کی پسپائی سے کافی کمی واقع ہوتی تھی تاہم اس کے دو فائدے بھی ہوئے تھے: اول یہ کہ مسلم صفوں سے گھر کے بھیدیوں کا اور ان کے ساتھ ان کے مکر و فریب کا خاتمہ ہو گیا تھا اور میدان جنگ میں مسلم فوج میں فوجی آہنگی کے سبب پورا اتحاد و نظم تھا۔ جس کے سبب شکست کے لمحات میں بھی مسلمانوں میں پژمردگی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ بلکہ اسی کی بدولت انہوں نے کم از کم دشمن کی جیت کو پسپائی میں بدل دیا تھا۔ دوم یہ کہ تقریباً ایک چوتھائی مسلم فوج کی اس طرح پسپائی کے اصل راز کو دشمن فوج اور اس کے قائدین نے نہیں سمجھا تھا اور وہ اس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہر کے دفاع کی ایک حربی تدبیر سمجھے تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے مدینہ پر اپنی فتح کے باوجود حملہ نہیں کیا تھا۔ اس طرح رحمت خداوندی، انسانی ابتلا و آزمائش کا بھیس بدل کر آئی تھی۔

اسلامی ریاست کے بعض خطرناک دشمنوں کا قتل بھی باہمی صلاح و مشورے کے بعد ہی کیا گیا تھا۔ ایسے قتل و حملہ کی اجازت عرب کے سماجی نظام میں فوجی روایات دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی اس ضمن میں یاد رکھنے کی ہے کہ اسلامی ریاست نے اپنے حلیفوں اور معاہدوں ہی کا اس طرح قتل کرایا تھا۔ کیونکہ دراصل یہ اسلامی ریاست کے غداروں اور باغیوں کا قتل تھا۔ بہرحال سردست ہم کو اس مسئلے سے بحث نہیں ہے بلکہ اس کے پہلو سے بحث ہے۔ چنانچہ مآخذ کے مطابق مشہور یہودی شاعر کعب بن اشرف جس نے جنگ احد برپا کرانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا، کا قتل کئی دنوں تک انصار کے سرآوردہ اشخاص اور سرداروں کے گرماگرم مباحثے اور صلاح و مشورہ کے بعد ہوا تھا[30] اگرچہ اس قسم کے دوسرے واقعات کے بارے میں صلاح و مشورہ کا واضح ذکر نہیں ملتا ہے۔ تاہم قرائن ایسے ہیں کہ دوسرے سیاسی قتل بھی صلاح و مشورے کے بغیر نہیں کئے گئے تھے

جنگ احزاب کے موقعہ پر کثیر تعداد میں دشمن فوج کا مقابلہ کرنے کے ضمن میں شہر کے شمالی حصہ میں ایک عظیم خندق کھودنے کا مشورہ مشہور صحابی حضرت سلیمان فارسی نے دیا تھا اور جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کر لیا تھا[31] یہ واقعہ اتنا مشہور ہے کہ اس کی تفصیلات کو دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم اسی غزوہ کے دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے مشیروں سے صلاح و مشورہ کرنے کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے جب محاصرہ زیادہ طول کھینچ گیا اور مسلمانوں کو اس کے سبب شدید زحمتوں کا سامنا ہوا تو آپ نے احزاب کے ایک اہم رکن قبیلہ غطفان کو متحدہ محاذ سے واپسی کے لیے سال بھر تک مدینہ کی پیداوار کا ایک تہائی حصہ دینے کی پیشکش کی اور اس سلسلے میں گفت و شنید شروع ہوئی۔ لیکن آخری فیصلہ سے قبل آپ نے مدینہ کے سرداروں حضرات سعد بن معاذ اوسی، سعد بن عبادہ خزرجی اور اسید بن حضیر اوسی سے مشورہ کیا جنہوں نے اپنے کسی

ذلت آمیز معاہدہ کو قبول کرنے کی شدید مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ جاہلیت کے زمانے میں بھی کوئی دشمن مدینہ سے خراج وصول نہیں کر سکا تو اب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں وہ ایسے کسی معاہدے کو قبول کرنے کے بجائے لڑ کر مرجانا پسند کریں گے۔ آپ نے ان کی صلابت ایمانی اور عزم بالجزم دیکھ کر گفت و شنید منقطع کر دی[32]۔ یہاں اس امر کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بنو غطفان سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح کی گفتگو صرف ایک حربی تدبیر معلوم ہوتی ہے جس کا مقصد متحدہ محاذ کے اراکین میں پھوٹ ڈالنا تھا۔ وہ مقصد پوری طرح سے حاصل ہوا تھا۔ کیونکہ ماخذ کے مطابق بنو غطفان پہلے لوگ تھے جو میدان جنگ سے پسپا ہوئے تھے۔

تقریباً تمام ماخذ کا اس پر اتفاق ہے کہ صلح حدیبیہ کے زمانے میں اشراف مکہ سے صلح کی اور مکہ میں عمرہ کے لئے مسلمانوں کے داخلہ کی بات چیت کرنے کے لئے حضرت عثمان بن عفان کی بحیثیت مسلم سفیر اور نمائندے کے تقرری حضرت عمر بن خطاب کے مشورے پر ہوئی تھی[33]۔ اس طرح غزوہ خیبر کے دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے باغوں میں کھجوروں کے بعض درختوں کو کاٹنے کی حضرت حباب بن منذر کی تجویز قبول کر لی تھی، لیکن بعد میں حضرت ابوبکر صدیق کے مشورے پر اس کی ممانعت کے احکام صادر فرمائے تھے۔ انہیں[34] دونوں مشوروں اور حکمت عملی کے مظاہروں کی افادیت اور صحت کی طرف قرآن کریم کی ایک آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے[35]۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگی امور میں حضرت حباب بن منذر خزرجی کی رائے ہمیشہ دربار رسالت میں منظور و قبول ہوتی تھی۔ چنانچہ متعدد غزوات جیسے بدر، خندق، خیبر، طائف وغیرہ میں ان کی آراء کو خاص کر مسلم فرودگاہ کے لئے جگہ کے انتخاب کے ضمن میں دوسروں پر ہمیشہ ترجیح ملتی تھی[36]۔ اسی طرح غزوہ خیبر کے موقعہ پر بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود خیبر کے اتحادی عرب قبیلہ غطفان کو ان کی اتحاد سے واپسی یا غیر جانب داری کے لئے وہی شرائط پیش کی تھیں جو اس سے قبل ان کے اتحادی یہودیوں نے طے کی تھیں لیکن بعد میں آپ نے حضرت سعد بن عبادہ جیسے مسلم مشیروں کی رائے پر اپنی پیشکش واپس لے لی تھی[37]۔

شوال سنہ ۷ھ / فروری سنہ ۶۲۹ء میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے شمال میں خباب کے مقام کی طرف ایک مہم بھیجنے کا قصد کیا۔ مگر آپ اس کی قیادت کے مسئلہ کو طے نہیں کر سکے۔ چنانچہ آپ نے ماخذ کے مطابق حضرات ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کو مشورے کے لئے بلایا۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ دونوں مشیران نبوی نے حضرت بشیر بن سعد خزرجی کو قائد مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ جسے آپ نے فوراً اور بخوشی قبول فرمالیا[38]۔ اگرچہ امراء سرایا یا عمال نبوی کی تقرری کے سلسلے میں تقریباً یہ خبر واحد اور اکلوتی شہادت ہے۔ تاہم اس سے اس خیال و نظریہ کو تقویت ملتی ہے۔ کہ حکومت کے دوسرے عہدیداروں خاص کر بڑے افسروں کی تقرری صلاح و مشورے کے بعد ہی ہوتی تھی۔

طریق جنگ اور حربی تدابیر کے اختیار کرنے کے سلسلہ میں بھی مشورہ کے بعض واقعات ملتے ہیں۔ چنانچہ ماخذ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ حنین کے دوران طریق جنگ کے بارے میں حضرت عمر فاروق سے مشورہ کیا تھا اور غالباً ان کے مشورے کو قبول کیا تھا[39]۔ اسی طرح طائف کے محاصرہ کے دوران آپ نے محصورین کے خلاف حضرت سلمان فارسی کی منجنیق استعمال

کرنےکی رائے کو نہ صرف قبول کر لیا تھا۔ بلکہ ان کو ایک منجنیق بنانے کا حکم بھی دے دیا تھا۔ لبعد میں آپ نے غالباً کسی اور صحابی کے مشورے پر یا اپنی رائے سے منجنیق استعمال نہیں کی تھی[٤٠]۔ اسی طرح بالآخر آپ نے شہر کا محاصرہ حضرت نوفل بن معاویہ دُیلی جو عرب قبائل کے عادات واطوار کے ماہر تھے کے مشورے پر اٹھالیا تھا۔ اس ضمن کا آخری واقعہ یہ ہے کہ غزوہ تبوک کے زمانے میں جب تبوک میں مسلمانوں کا قیام کافی طویل ہو چکا اور دشمن نظر نہ آیا تو آپ نے آئندہ اقدام کے بارے میں حضرت عمر فاروق سے مشورہ کیا جنہوں نے مدینہ واپسی کا مشورہ دیا اور دوسرے دن ہی مسلم فوج اپنی واپسی کے سفر پر مدینہ کی جانب گامزن تھی[٤١]

حربی امور ومعاملات کے علاوہ دوسرے مذہبی، سماجی اور سیاسی معاملات پر بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مسلمانوں سے مشورہ کرنے کی مثالیں ملتی ہیں۔ چند مثالیں کافی ہوں گی۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ اذان ایک مذہبی شعار ہے اور نمازِ باجماعت کا ایک لازمی جز۔ مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو نماز کے لئے مسجد میں کیسے اکٹھا کیا جائے مختلف تجاویز کے بعد آخر کار ایک صحابی کے مشورے پر اذان کی تجویز قبول کر لی گئی تھی[٤٢]۔ اسی طرح مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی جگہ کا انتخاب صلاح ومشورہ کے بعد ہی کیا گیا تھا[٤٣] اور اس کے بعد مواخاۃ کا نظام بھی مسلمانوں کی پسندیدگی اور مرضی سے قائم کیا گیا تھا۔ خاص طور سے دو مسلمانوں کے باہمی رشتۂ اخوت ومحبت میں ان کے مزاج وطبیعت کی ہم آہنگی کے علاوہ ان کی رائے کو بھی مدنظر رکھا گیا تھا[٤٤]۔ مدینہ کے یہودی قبیلوں سے مال غنیمت میں حاصل شدہ اراضی کی غریب مہاجرین اور بعض غریب انصار میں بھی تقسیم انصار کے سربرآوردہ لوگوں کے صلاح ومشورے اور مرضی کے بعد ہی عمل میں آئی تھی[٤٥]۔ اسی طرح جب بحرین اسلامی ریاست کا حصہ بن گیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں انصار کے لوگوں کو کچھ اراضی اور قطائع دینے چاہے تو انصار نے بمثال جذبۂ اخوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس وقت تک قطائع لینے سے انکار کیا۔ جب تک اتنے ہی ان کے مہاجر بھائیوں کو نہ دیئے جائیں[٤٦]

غزوہ بدر میں گرفتار ہونے والے قریشی قیدیوں کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلوک کا ذکر آچکا ہے۔ اسی قبیل کے بعض اور واقعات کا ذکر یہاں کیا جا سکتا ہے۔ اس کا قوی امکان ہے کہ بدر کے قیدیوں کے رہا ہونے کے لئے زرِ فدیہ کی مختلف شرحیں اور غریب مگر پڑھے لکھے قیدیوں کے لئے مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی زرِ فدیہ کی جگہ شرطِ رہائی غالباً صلاح ومشورے کے بعد ہی طے کی گئی تھیں[٤٧]۔ اس سے زیادہ دلچسپ اور اہم واقعہ یہ ہے کہ اسی موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دخترِ نیک اختر حضرت زینب نے اپنے کافر وقیدی شوہر ابو العاص بن ربیع کی رہائی کے لئے مکہ سے بطور زرِ فدیہ اپنا گلوبند بھیجا تھا۔ جو ان کی مرحومہ والدہ حضرت خدیجہ نے ان کی شادی کے موقعہ پر بطور تحفہ دیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی محبوب ومرحوم بیوی کی آخری یادگار کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے اور اس کو واپس کرنا چاہتے تھے مگر مسلمانوں کی مرضی کے بغیر آپ نے ایسا نہیں کیا تھا[٤٨]۔ اسی طرح جب کچھ سال بعد ابو العاص بن ربیع ایک مسلم مہم کے دوران قریشی سامان تجارت سمیت

پکڑے گئے۔ ان کا ساز و سامان اور سامان تجارت مسلمانوں کے صلاح و مشورے کے بعد ہی واپس کیا گیا تھا۔ اور جس کا یہ خوشگوار نتیجہ نکلا تھا کہ حضرت ابوالعاص بن ربیع اموی امت مسلمہ کے ایک فرد فرید بن گئے تھے۔[۵۲] واقعہ افک کے دوران جو غزوہ مریسیع کے دوران پیش آیا تھا اور جس نے پچاس دن تک مسلم مدنی سماج کو زیر و زبر رکھا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قریبی صحابہ کرام سے متعدد مواقع پر صلاح و مشورہ کیا تھا۔ اگرچہ آپ نے اپنے مشیروں میں سے کسی کا مشورہ قبول نہیں کیا تھا۔ اور فیصلہ کو خداوند قدوس پر چھوڑ دیا تھا اور شان کریمی کے صدقے جایئے کہ اس نے معصوم ملزمہ کے حق میں اپنے کلام پاک میں برأت کی آیات اتاری تھیں۔ جو تا قیام قیامت بلکہ تا ابد اس عظیم شخصیت کی پاکیزگی اور تقدس کی ربانی شہادت بن گئیں۔

عہد نبوی کے مختلف برسوں میں بعض سماجی معاملات سے متعلق قوانین نافذ کئے گئے تھے۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر کا نفاذ وحی الٰہی کے نزول کے بعد ہوا تھا۔ تاہم ان میں متعدد کا مشورہ صحابہ کرام نے اس سے پہلے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت عمر بن خطاب کا نام نامی و اسم گرامی ماخذ میں نمایاں طور سے نظر آتا ہے۔ حدیث نبوی ہے کہ "حق عمر کی زبان سے بولتا ہے۔ اور ان کی رائے وحی و کتاب سے متفق ہوتی تھی۔" مثال کے طور پر عورتوں کے پردے اور عوام یا بازار میں ان کے طرز عمل کے سلسلہ میں جو احکام نافذ کئے گئے۔ ان کا مشورہ حضرت عمر نے ہی دیا تھا۔[۵۳] اس ضمن میں صلح حدیبیہ کے موقع پر ام المؤمنین حضرت ام سلمیٰ کا ذکر کیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ صلح حدیبیہ کی تکمیل کے بعد مسلمانوں پر پژمردگی اور احساس شکست طاری تھا اور اتنا شدید کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے احرام کھولنے اور قربانی کرنے کو کہا تو مارے غم کے کوئی نہیں اٹھا۔ آپ نے حضرت ام سلمیٰ سے ان کی سرد مہری کی شکایت کی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ خود قربانی کریں اور مسلمان آپ کی مثال کی تقلید کریں گے اور ان کی رائے کس قدر صحیح ثابت ہوئی۔[۵۴] خیبر کی مہم میں چند عورتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بلا اجازت و مرضی شریک ہو گئی تھیں۔ دوران سفر جب آپکو ان کی موجودگی کا علم ہوا تو آپ نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ مگر بالآخر ان کی دردمندانہ درخواستوں پر ان کو شرکت کی اجازت دیدی۔[۵۵] فتح مکہ کے موقع پر اسلام کے بعض مخالفین بالخصوص حضرت ابوسفیان بن حرب، حضرت عکرمہ بن ابی جہل وغیرہ کو امان عطا کرنا اور پھر ابوسفیان کے گھر کو دار الامان قرار دینا دراصل بعض مسلمانوں کے مشورے ہی پر روبہ عمل آیا تھا۔[۵۶] ۹ھ / ۶۳۱ء میں ایلاء ازواج مطہرات سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عارضی جدائی کے واقعہ کے دوران حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کیا تھا۔[۵۷]

اگرچہ معاہدات امن و صلح اور سیاسی اتحادوں کے سلسلہ میں شوریٰ کی واضح مثالیں نہیں ملتی ہیں۔ تاہم یہ فرض کرنا جائز ہوگا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مشیروں کو ضرور اپنے اعتماد میں لیا ہوگا۔ جیسا کہ حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کی صلح حدیبیہ کے لئے بطور فرستادہ و نمائندہ رسول تقرری سے ظاہر ہوتا ہے۔[۵۸] اس کی مزید تصدیق خندق اور خیبر کے غزوات کے دوران بنو غطفان کے معاملہ میں انصار کے سرداروں سے مشورہ کی دو مثالوں سے ہوتی ہے۔

ان واقعات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا جائز ہوگا کہ دوسرے معاملات میں شوریٰ سے کام لیا جاتا تھا۔ اور خاص کر ریاستی و حکومتی امور میں بلا صلاح و مشورہ کے کوئی فیصلہ نہیں کیا جاتا تھا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ آخری فیصلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار و اقتدار خصوصی تھا جس پر کوئی قدغن نہیں لگا سکتا تھا۔

مشیران نبوی میں جن صحابہ کرام کے اسمائے گرامی نمایاں نظر آتے ہیں ان میں حضرات ابوبکر و عمر سرفہرست تھے۔ ان کے علاوہ حضرات عثمان، علی، حباب بن منذر، سعد بن عبادہ، سعد بن معاذ، طلحہ، زبیر وغیرہ متعدد بڑے صحابہ کرام بھی شامل تھے۔ شوریٰ کا رکن بننے کے لئے کسی رسمی طریقہ کار کی ضرورت نہ تھی، البتہ صلاحیت و لیاقت ناگزیر تھی اور وہی کسی شخص کو اہل الرای کے طبقہ میں شامل کرتی تھی اور اسی کی بنیاد پر وہ شوریٰ کا رکن بنتا تھا، اگرچہ رکن شوریٰ کسی تنخواہ کا حقدار نہیں ہوتا تھا مگر اس کو اسلامی امت میں کافی قدر و منزلت حاصل ہوتی تھی۔

۳۔ سکریٹری (کاتبین)

کاتب کے لغوی معنی لکھنے والے، نویسندہ اور ناقل کے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ لفظ اصطلاح بنتا گیا۔ اور حکومتی تنظیم میں سکریٹری کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ یہ لفظ بطور اصطلاح اسلامی عہد سے قبل عرب میں مستعمل تھا۔ کیونکہ لکھنے کا رواج بہت کم تھا۔ حتیٰ کہ مکہ میں جو عرب کا ہر لحاظ سے عظیم ترین شہر تھا، چند ہی لوگ لکھنے کا فن جانتے تھے۔ جو لوگ لکھنا (کتابت) جانتے تھے۔ ان کو سماج میں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی اور احتراماً ان کے نام کے ساتھ الکاتب (لکھنے والا) لگایا جاتا تھا۔[61] اسلام کی آمد کے بعد کتابت کے فن کو خاص طور سے اور دوسرے علوم و فنون کو عام طور سے ترقی ملی۔ کیونکہ حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی دور حیات ہی میں وحی الٰہی اور سیاسی دستاویزات کی کتابت کے لئے متعدد کاتبوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ایک روایت کے مطابق مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم ترین کاتبوں میں حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی شامل تھے جو ابتدائی مسلمان ہونے کے علاوہ اس فن کے ماہر تھے۔[62] مجموعۃ الوثائق میں منقول ایک دستاویز نبوی سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ جس کے مطابق انہوں نے داریین الخم کے کچھ لوگوں کے لئے جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ میں ملاقات کی تھی۔ ایک خط امان لکھ کر دیا تھا۔[63] مکی عہد میں اور جن صحابہ کرام نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لکھا تھا۔ ان میں حضرات عبداللہ بن سعد بن ابی سرح عامری، ابوبکر تیمی، عمر بن خطاب عدوی، عثمان بن عفان اموی اور علی بن ابی طالب ہاشمی کے علاوہ متعدد دوسرے بھی غالباً شامل تھے۔

مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد کاتبوں کے کام کی نوعیت مذہبی ہونے کے ساتھ سیاسی رنگ بھی اختیار کر گئی تھی۔ چودھویں صدی کا ایک متاخر مصنف القلقشندی اپنے زمانے کے ریاستی شعبہ دیوان الانشاء (شعبہ مراسلات و رسل و رسائل) کے نقطہ آغاز سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ پہلا دیوان تھا جو اسلام میں پہلی بار اس وقت متعارف ہوا تھا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بنیاد ڈالی تھی۔[64] اگرچہ اس زمانے میں وہ اس نام سے نہیں جانا جاتا

تھا۔ بہر حال یہ ناقابل انکار و تردید تاریخی حقیقت ہے کہ اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے فوجی افسروں، امراء سرایا، سالاروں، گورنروں اور صوبائی و مقامی منتظموں، قبائلی سرداروں، ملک و بیرون ملک کے حکمرانوں اور مسلم عوام کے نام خطوط و فرامین لکھنے پڑتے تھے۔ ان کے علاوہ آپ نے متعدد عرب، عیسائی اور یہودی قبیلوں سے صلح و باہمی تعاون کے معاہدے کئے تھے۔ بعد کے زمانے میں غیر مسلم طبقات کے نام فرامین صادر کئے تھے۔ متعدد افراد اور گروہوں کو خط امان و آزادی عطا فرماتے تھے اور بہت سے لوگوں کو قطائع عطا کئے تھے تو ان کے پروانہ ہائے قبض و دخل بھی لکھواتے تھے۔ ان تمام اور ان جیسے دوسرے متعدد مقاصد کے لئے کاتبوں کے ایک پورے شعبہ کی ضرورت تھی اور رفتہ رفتہ یہی شعبہ پہلے دیوان رسالت اور پھر دیوان الانشاء کہلایا تھا۔

ان کاتبوں کی تعداد جنہوں نے عہد نبوی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لکھنے کی سعادت حاصل کی تھی مختلف مصنفین کے نزدیک مختلف ہے۔ ابن اسحاق اور ان کے جامع ابن ہشام نے اپنی سیرت میں ان میں سے محض چند کے نام گنائے ہیں[65] جبکہ واقدی نے متعدد کاتبوں کا ذکر کیا ہے[66]۔ ابتدائی مصنفین میں ابن سعد نے صرف سولہ کاتبین رسول کا حوالہ دیا ہے[67] جبکہ بلاذری اور طبری نے صرف دس نام گنائے ہیں[68]۔ بہر حال یہ متاخر مصنفین اور سیرت نگاروں کی کاوشیں تھیں جنہوں نے تمام کاتبین رسول کا استقصا کرنے کی کوشش کی اور اپنے بس بھر ان کی تعداد بتائی۔ ابن عساکر نے اپنی تصانیف تاریخ دمشق اور بہجۃ المحافل میں بالترتیب ۲۳ اور ۲۵ کاتبین نبوی کا ذکر کیا ہے[69]۔ ان میں سے بیشتر کا ذکر ابن سعد کی طبقات میں ملتا ہے[70]۔ اتنی ہی تعداد کا ذکر ابن عبد البر نے اپنی کتاب الاستیعاب میں کیا ہے[71]۔ قرطبی کی تفسیر قرآن میں ۲۶ کاتبوں کا ذکر ملتا ہے۔ جبکہ شیر المسی کی فہرست میں پورے چالیس کاتبوں کا حوالہ ملتا ہے۔ حافظ زین الدین عراقی کی منظوم سیرۃ میں اس سے زیادہ ۴۲ کاتبوں کے نام ملتے ہیں۔ جبکہ سب سے زیادہ نام گنانے کا شرف برہان حلبی کی کتاب حواشی الشفاء کو حاصل ہے۔ جس کے مطابق ان کی کل تعداد ۴۳ تھی[72]۔ بہر حال اس تمام تر تحقیق و تفتیش کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہی آخری فہرست یا مکمل حقیقی تعداد تھی۔ کیونکہ اس کا امکان بہر حال موجود ہے کہ متعدد دوسرے صحابہ نے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لکھا ہو۔ اور ان کے ناموں کو مآخذ میں سے کسی نے محفوظ نہ رکھا ہو۔

بہر حال سر دست ہماری گفتگو کا موضوع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں کی تقرری اور انکی کارکردگی ہے۔ یہ نکتہ شروع میں ذکر کرنے کے قابل ہے کہ اس زمرہ کارکنان ریاست اسلامی میں مستقل کاتبوں سے لے کر نیم مستقل اور عارضی یا جز وقتی کارکنوں تک کا ذکر ملتا ہے۔ ذیل میں ہم ان کاتبوں کی کارکردگی کا مطالعہ کریں گے۔

اسلام کی اہم ترین کتاب قرآن پاک ہے۔ جس کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے۔ روایات کے مطابق اس کی کتابت اہم ترین اہمیت کی حامل تھی اور چونکہ وہ ایک انتہائی ذمہ داری کا کام تھا جس میں محض فن کتابت کی مہارت کے علاوہ خلوص و ایمان اور ایمانداری بھی ضروری تھی۔ اس لئے اس کی کتابت کی ذمہ داری صرف چند مخلص و وفادار صحابہ کرام کے سپرد کی جاتی تھی کہا جاتا ہے کہ اس کی سعادت حضرات شرحبیل بن حسنہ کندی، ابو بکر تیمی، عمر عدوی، عثمان اموی اور علی ہاشمی کے علاوہ ایک روایت کے مطابق

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح عامری کو بھی ملی تھی ۳"۔ لیکن مآخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ وحی الٰہی زیادہ تر اس زمانے میں حضرات عثمان اموی اور علی ہاشمی لکھا کرتے تھے۔ جبکہ مدینہ منورہ میں یہ سعادت بیشتر حضرات ابی بن کعب خزرجی اور زید بن ثابت خزرجی کے نصیب میں آئی تھی۔ بعد میں یہ سعادت حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی کے نصیب کا مستقل و لازمی حصہ بن گئی تھی ۴"۔ بلا ریب موخر الذکر تینوں صحابہ کرام وحی الٰہی کے مستقل کاتب تھے۔ ان میں سے روایات کے مطابق حضرت ابی بن کعب کاتب اکبر تھے کہ ان کی موجودگی میں کسی اور کو یہ سعادت نہیں ملتی تھی ۵"۔ روایت ہے کہ ان کی غیر حاضری میں حضرت زید بن ثابت کتابت وحی الٰہی کیا کرتے تھے ۶"۔ متعدد مستند مصنفین و محدثین جیسے ابن عبد البر، بخاری، نووی، اور حوراتی وغیرہ کا اتفاق ہے کہ ہجرت کے بعد حضرت زید بن ثابت مستقل خدمت نبوی میں حاضر رہتے تھے۔ اس لئے ان کو خطوط و فرامین نبوی اور وحی الٰہی لکھنے کی جس قدر سعادت ملی کسی اور کے نصیب میں نہیں آئی۔ لیکن فتح مکہ (یا عمرۃ القضاء) کے بعد حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی نے کچھ اس عزیمت و محبت، پابندی و دلجمعی اور استقلال کے ساتھ صحبت نبوی اختیار کی کہ کوئی ان کا اس معاملہ میں ثانی نہیں رہا۔ چنانچہ روایات کے مطابق انہوں نے بقیہ عہد نبوی میں مسلسل کلام الٰہی کی کتابت کی سعادت حاصل کی تھی"۔

اس شعبہ ریاست اسلامی کے مطالعہ میں ایک دلچسپ پہلو ان دستاویزات و معاہدات نبوی کا تجزیہ بھی ہیں جو مجموعۃ الوثائق میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے جمع کر دیئے ہیں۔ اس کے تجزیئے سے بعض بہت اہم اور دلچسپ نکات سامنے آتے ہیں۔ اس میں منقول کل دستاویزات کی تعداد ۲۴۶ ہے۔ جن کا تعلق عہد نبوی سے ہے۔ ان میں سے متعدد خطوط مختلف عرب حکمرانوں، قبائلی سرداروں اور غیر ملکی بادشاہوں یا مسلم گورنروں اور افسروں کے ہیں۔ جو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں بھیجے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسی بھی دستاویزیں ہیں جن کا متن ندارد ہے۔ لہٰذا ان کی حیثیت محض حوالوں کی سی ہے۔ جن سے کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا۔ سوا اس کے کہ آپ نے یہ خطوط و معاہدات لکھوائے تھے۔ بہر حال کم از کم ۴۷ دستاویزیں ایسی ہیں جو اپنے کاتبوں کے نام بھی رکھتی ہیں ۸"۔ ان کا تجزیہ ذیل میں پیش ہے۔

نمبر شمار	کاتب کا اسم گرامی	تعداد دستاویزات مکتوبہ
۱	حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی	۱۲
۲	حضرت ابی بن کعب خزرجی	۱۱
۳	حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی	۱۱
۴	حضرت خالد بن سعید اموی	۹
۵	حضرت مغیرہ بن شعبہ ثقفی	۷
۶	حضرت علاء بن عقبہ	۴
۷	حضرت ارقم بن ارقم مخزومی	۴
۸	حضرت ثابت بن قیس بن شماس خزرجی	۴
۹	حضرت عثمان بن عفان اموی	۲
۱۰	حضرت شرجبیل بن حسنہ کندی	۲

۱۱	حضرت جہیم بن صلت	۲
۱۲	حضرت علاء بن حضرمی	۲
۱۳	حضرت عبداللہ بن زید	۱
۱۴	حضرت عبداللہ بن ابی بکر تیمی	۱
۱۵	حضرت محمد بن مسلمہ اوسی	۱
۱۶	حضرت زبیر بن عوام اسدی	۱

اس واقعاتی تجزیے سے مذکورہ بالا مصنفین کے بیانات کی کسی حد تک تصدیق ہوتی ہے۔ اس فہرست سے سب سے اہم استثنا حضرت زید بن ثابت خزرجی کا ہے جن کا نام کسی ایک بھی دستاویز میں نہیں ملا۔ حالانکہ ماخذ کا دعویٰ ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل کاتبوں میں سے ایک تھے۔ اس کی یہی توجیہ کی جا سکتی ہے کہ صحابی موصوف زیادہ تر وحی الٰہی، فرائض صدقات وترکہ کے متعلق امور) اور سہمان (مال غنیمت کے حصص) کی کتابت کیا کرتے تھے[٨٠] جبکہ مذکورہ بالا تجزیے میں جن دستاویزات کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تعلق سیاسی و انتظامی قسم کے معاملات و امور سے تھا۔

دوسری قسم کی دستاویزات میں صلح کے معاہدوں اور پروانہ ہائے امان و تحفظ کو اہم مقام حاصل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی زیادہ تر صلح و باہمی تعاون کے معاہدوں کی کتابت کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ بعض ابتدائی مصنفین کا دعویٰ بھی ہے[٨١]۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا معاہدات و دستاویزات نبوی کا تجزیہ بھی اس کی پوری طرح سے تصدیق کرتا ہے۔ مثال کے طور پر قریش کے ساتھ معاہدہ (صلح حدیبیہ[٨٢]) کے علاوہ انہوں نے مقنا، بنو زیاد، بن الحارث بن کعب کے لوگوں[٨٣] ہمدان کے ایک سردار عبیر[٨٤]، احمر بن معاویہ تمیمی[٨٥] اور نعیم بن مسعود[٨٦] شجعی[٨٧] وغیرہ سے جو معاہدے مذکور ہیں۔ وہ سب حضرت علی ہاشمی نے ہی تحریر کیے تھے۔ مذکورہ بالا تمام سولہ کاتبوں کو اس شعبہ میں بھی شمار کرنا چاہیئے۔ کیونکہ انہوں نے ایک یا دو خط اس زمرہ میں بھی لکھے تھے۔ اس فہرست میں حضرت ابوبکر صدیق کے مولیٰ حضرت عامر بن فہیرہ کا ذکر نہیں آیا ہے۔ جنہوں نے سفر ہجرت نبوی کے دوران سراقہ بن مالک مدلجی کو پروانہ امان لکھ کر عطا کیا تھا[٨٨]۔

کتانی کا دعویٰ ہے کہ حضرات عبداللہ بن ارقم اور زید بن ثابت وہ خطوط و فرامین نبوی لکھا کرتے تھے۔ جو غیر ملکی حکمرانوں، اسلامی ریاست کے مختلف گورنروں اور اسلامی لشکروں کے سالاروں کا نام ہوتے تھے[٨٩]۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ غیر ملکی حکمرانوں کے نام لکھے گئے خطوط نبوی میں جن کے متن دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی کے کاتب کا نام نہیں مذکور ہوا ہے۔ دوسری جانب مدائنی کے اس دعوے کی کہ حضرت معاویہ اموی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور عرب قبائل کے درمیان معاہدے لکھا کرتے تھے[٩٠] تصدیق متعدد حقائق سے ہوتی ہے۔ نہد کے ایک خاندان بنو قرہ، نجران کے عیسائی طبقات، ربیعہ بن ذی المرحب اور حضرموت کے قیل (حکمراں)، حضرت وائل بن حجر کے نام تحریر کردہ تمام فرامین حضرت معاویہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں[٩١]۔ ممکن ہی نہیں یقینی ہے کہ بہت سے ایسے خطوط و دستاویزات ہوں گی جو ان کے قلم کی رہین منت رہی ہوں گی

مجموعۃ الوثائق میں منقول متعدد قطائع کے فرامین مختلف کاتبوں جیسے حضرات علی، معاویہ، خالد بن سعید، الارقم، علاء بن عقبہ، یزید بن ابی سفیان، مغیرہ بن شعبہ، جہیم بن صلت، قیس بن ثابت اور ابی بن کعب وغیرہ کے تحریر کردہ تھے[91]۔ ماخذ کا یہ بھی بیان ہے کہ دو صحابی حضرات حصین بن نمیر اور مغیرہ بن شعبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بعض خاص معاملات اور خفیہ امور کے بارے میں لکھا کرتے تھے۔ جبکہ حضرات زبیر بن عوام اور جہیم بن صلت صدقات و محاصل سے متعلق امور کی تحریر و کتابت کے ذمہ دار تھے۔ حضرت حذیفہ بن یمان اراضی کی پیداوار کے معاملات تحریر کرتے تھے۔ جبکہ حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی بادشاہوں اور حکمرانوں کے نام خطوط نبوی تحریر کیا کرتے تھے[92]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف کاتبوں کو مختلف کام انکی صلاحیتوں اور فنی مہارتوں کے سبب عطا کئے گئے تھے۔

اس بحث میں عہد نبوی کے طریق کتابت اور طرز تحریر کا مطالعہ بھی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ جب کبھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تحریر لکھوانے کی ضرورت پیش آتی تھی تو آپ کاتب کو طلب فرماتے تھے۔ کاتب لکھنے کے تمام ساز و سامان جیسے قلم، روشنائی، کاغذ یا چمڑے یا چھال کی تختیوں یا اوراق کے ساتھ حاضر ہوتا تھا اور خدمت نبوی میں دو زانو بیٹھ کر آپ سے املا لیتا تھا[93]۔ نامہ مبارک کی ابتدا بسم اللہ[94] سے ہوتی تھی جو بالکل اوپر لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد لکھنے والے یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی اسم گرامی لکھا جاتا تھا اور اس کے بعد مکتوب الیہ کا نام[95]۔ ان دونوں ناموں کے ساتھ مناسب خطابات یا القابات ہوتے تھے۔ مختصر سے تمہیدی یا دعائیہ کلمات کے بعد امّا بعد کا سکہ بند فقرہ آتا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اب اصل متن شروع ہو رہا ہے۔ اصل متن کے بعد عام طور سے خط کا خاتمہ والسلام کے فقرہ سے ختم ہوتا تھا۔ اور اس کے بعد کبھی کبھی کاتب خط کا نام بھی ضبط تحریر میں آجاتا تھا۔ معاہدے کی زبان تھوڑی سی مختلف ہوتی تھی اور اس کے آخر میں اکثر و بیشتر گواہوں کے نام بھی مذکور ہوتے تھے[96]۔ خط کے آخر میں مہر رسالت لگائی جاتی تھی۔ یہ مہر دراصل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتم (انگوٹھی) تھی جو چاندی کی تھی اور جسے روایات کے مطابق آپ نے پہلی بار صلح حدیبیہ کے بعد اس وقت بعض صحابہ کرام کے مشورے پر بنوایا تھا۔ جب آپ نے غیر ملکی پڑوسی حکمرانوں کو خطوط بھیجنے کا ارادہ کیا تھا[97]۔ اس مہر میں کلمہ طیبہ کا آخری جملہ (محمد رسول اللہ) محمد اللہ کے رسول ہیں، کندہ تھا اور الفاظ کی ترتیب یہ تھی کہ آپ کا نام سب سے نیچے اور اللہ کا نام سب سے اوپر کندہ تھا اور درمیان میں لفظ رسول (محمد رسول اللہ[98])

[99] ماخذ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر مبارک کا ایک محافظ بھی تھا۔ بخاری کی تاریخ میں ایک روایت ہے جس کی تائید اسد الغابہ سے بھی ہوتی ہے[100] کہ حضرت معیقب بن ابی فاطمہ دوسی، جو خاندان سعیدی بنو امیہ کے ایک حلیف اور قدیم مکی مسلم تھے، صاحب خاتم الرسول تھے اور جب کبھی آپ انگوٹھی کو اپنی انگلی میں پہننا پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپ اس کو ان کی حفاظت میں دے دیتے تھے اور وقت ضرورت طلب کر کے استعمال فرماتے تھے۔ العقد الفرید کے مصنف نے اس سلسلہ میں دو روایتیں بیان کی ہیں۔ ایک مذکورہ بالا روایت کی مکمل تصدیق کرتی ہے۔ مگر دوسری خاتم رسول کے محافظ صحابی کا نام حضرت حنظلہ بن ربیع اسدی بتاتی ہے[101]۔ اگرچہ امکان کم ہے تاہم اس سے قطعی طور پر انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس سعادت کو حاصل

کرنے والے دونوں ہی صحابی رہے ہوں اور پہلے ایک کو یہ سعادت حاصل رہی ہو اور بعد میں دوسرے کے حصہ میں آئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی زمانے میں باری باری سے دونوں کو یہ خدمت سونپی جاتی رہی ہو۔

اس بحث کے خاتمہ پر ذیل میں تمام کاتبوں کی ایک جدول دی جارہی ہے، جس میں ان کے قبائلی تعلق، علاقہ اور ہر قبیلہ کے مجموعی کاتبوں کی تعداد ظاہر کی گئی ہے۔

علاقہ	قبیلہ / خاندان	کاتبوں کی تعداد
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۲۲
	(الف) ہاشم	۱
	(ب) امیہ	۷
	(ج) مطلب	۱
	(د) مخزوم	۳
	(س) زہرہ	۲
	(ص) تیم	۳
	(ط) عدی	۱
	(ع) سہم	۱
	(ف) عامر بن لوئی	۲
	(ق) الارم	۱
	۲۔ خزرج	۷
	۳۔ اوس	۲
	۴۔ انصاری (طبا لقیس)	۱
مشرقی عرب	۱۔ ثقیف	۱
مغربی عرب	۱۔ اسلم	۱
	۲۔ دوس	۱
شمالی عرب	۱۔ عذرہ	۱
جنوبی عرب	۱۔ کندہ	۱
	۲۔ عیسائی نومسلم	۱
	۳۔ حضرموت	۱

قبائل پراگندہ	۱۔	تمیم	۱
غیر معروف		-	۵
میزان	۱۳	قبیلے	۴۴

حضرت بلال حبشی کا مقام

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیکرٹریوں پر بحث کے اختتام پر حضرت بلال حبشی کے مقام و مرتبے پر گفتگو ضروری معلوم ہوتی ہے۔ غالباً وہ کبھی اسلامی ریاست کے شعبہ کاتبین میں شامل نہیں رہے۔ لیکن جہاں تک لفظ سیکرٹری کا تعلق ہے۔ وہ صحیح معنوں میں اس کے حقدار تھے وہ سفر و حضر، دکھ و سکھ، امن و جنگ کسی بھی عالم میں صحبت نبوی سے دور نہیں رہتے تھے۔ تعلق خاطر ان کو کہیں اور چین نہیں لینے دیتا تھا۔ اور خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ مآخذ کا بیان ہے کہ وہ آپ کے بیشتر ذاتی اور سرکاری کاموں اور ضروریات (حوائج) کی تکمیل کرتے تھے۔ چند مثالیں اس بیان کی تصدیق کے لیے کافی ہوں گی۔

جہاں تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی اور نجی ضروریات کا تعلق ہے تو حضرت بلال حبشی آپ کے تمام گھریلو کاموں جیسے بازار سے روزمرہ کا سودا سلف خریدنا، قرضوں کی فراہمی اور ادائیگی کے انتظامات کرنا، آپ کے مہمانوں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا۔ اور اس جیسے متعدد کاموں کی دیکھ بھال کرتے تھے[۲]۔ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نمازوں کے اوقات اور جماعت کی تیاری کی اطلاع بھی کرتے تھے۔ جیسا کہ واقدی اور بلاذری کا بیان ہے[۴]۔ بلاذری کے ایک بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلال حبشی آپ کے وضو کے پانی کے انتظام کے بھی نگران تھے۔ اور نمازوں میں آپ آگے سترہ کے لیے نیزہ رکھا کرتے تھے[۵]۔ اور خاص خاص مواقع پر وہ نیزہ لیکر آپ کے آگے آگے چلا کرتے تھے۔

اسدالغابہ کا بیان ہے کہ حضرت بلال حبشی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خازن (خزانچی) بھی تھے[۶]۔ اور وہ اپنے کپڑے یا جیب میں چاندی رکھا کرتے تھے[۷]۔ یہ خام چاندی بھی ہوتی تھی جو وزن کے اعتبار سے سکوں کی جگہ استعمال ہوتی تھی یا ڈھلے ہوئے سکے بھی ہوتے تھے۔ اس بیان کی تصدیق ابن اسحاق جیسے متعدد ابتدائی مآخذ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ غزوہ ذات الرقاع کے دوران جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے ایک اونٹ ایک اوقیہ چاندی (چالیس درہم) میں خریدا تھا تو اس کی ادائیگی حضرت بلال ہی نے ہدایت نبوی کے بموجب کچھ اضافہ و انعام کے ساتھ کی تھی[۸]۔ اس کے علاوہ بعض اور خریداریوں کی رقم بھی حضرت بلال نے ادا کی تھی۔ جس کے حوالے مآخذ میں جا بجا ملتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت سربراہ مملکت جن لوگوں کو انعامات سے نوازتے تھے۔ ان کی ادائیگی حضرت بلال ہی کے ہاتھوں سے ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر جعرانہ میں اموال غنیمت کی تقسیم کے وقت جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرداران قریش و عرب قبائل کو انعامات سے مشرف کیا تھا۔ تو حضرت معاویہ اور یزید فرزندان ابوسفیان اموی کو فی کس چالیس اوقیہ چاندی

حضرت بلال حبشی ہی نے اپنے دست مبارک سے عطا کی تھی[109]۔ امکان ہے کہ اس موقعہ پر دوسرے سرداروں کو جو چاندی کی رقم ملی تھی وہ ان ہی کے توسط سے ملی تھی۔ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلامی مساوات کے مظاہرہ کی پالیسی بھی کارفرما تھی کہ ایک حبشی مولیٰ کے ہاتھوں اشراف قریش و عرب کو انعامات دلوائے تھے۔ واقدی کا بیان ہے کہ حضرت بلال ہمیشہ اپنے ساتھ چاندی رکھا کرتے تھے اور جب اور جہاں کہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو عطایا دینا چاہتے تھے وہ حضرت بلال کو اشارہ کرتے تھے اور اس کی وہ فوری تعمیل کرتے تھے[110]۔ اسی طرح متعدد حوالے ان انعامات کے بھی ملتے ہیں جو بحکم نبوی حضرت بلال حبشی نے عرب وفود کے بعض ارکان کو عطا فرمائے تھے۔ ان میں بنو تمیم کے وفد کا ذکر صریحاً ملتا ہے[111]۔ غالباً وہ خراج اور صدقات کی شکل میں آنے والی سرکاری رقوم کے مصارف کے بھی نگران تھے۔ جیسا کہ فدک اور بحرین کے صدقات و خراج کے بارے میں معلوم ہوتا ہے[112]۔

ماخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت بلال حبشی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل منادی (اعلان کرنے والے) تھے۔ غزوات حمراء الاسد اور بنو قریظہ کے زمانے حضرت بلال حبشی ہی نے مسلم مجاہدین کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم سے باخبر کیا تھا کہ وہ دشمنوں سے آخری وقت تک جنگ کریں[113]۔ غزوہ خیبر میں انہوں نے ہی اپنے اعلان کے ذریعہ محصور دشمنوں کے باغات میں کھجور کے درختوں کے کاٹنے کی ممانعت کر دی تھی اور اس طرح پہلے حکم نبوی کو منسوخ کیا تھا[114]۔ غزوہ حنین میں بھی انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک حکم کو مسلم مجاہدین تک پہنچایا تھا[115]۔ ان وقتی اعلانات کے علاوہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل منادی تھے کہ مسلمانوں کو مسجد نبوی میں حکم و اذن نبوی پر جمع کیا کرتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی مسلمانوں سے کوئی عام یا خاص خطاب کرنا چاہتے تھے تو کبھی حضرت بلال مسجد نبوی سے اذان دیتے تھے اور کبھی مدینہ کی گلیوں میں الصلوٰۃ جامعۃ (نماز جمع کرنے والی ہے) کی صدائیں دیتے گذرتے اور مسلمانان شہر کو دعوت نبوی پہنچاتے تھے[116]۔

ان کے علاوہ حضرت بلال حبشی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد دوسرے متفرق کام بھی انجام دیتے تھے مثال کے طور پر غزوہ ذو امر میں ایک نو مسلم کی مذہبی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری نبھائی تھی[117]۔ وہ مہمانان رسول کی مستقل طور سے ضیافت کے انتظامات کے نگران تھے۔ چنانچہ متعدد وفود کی ضیافت انہوں نے ہی کی تھی۔ اس سلسلے میں تمیم اور ثقیف کے ارکان وفود کی ضیافت کے صریح حوالے ملتے ہیں[118]۔ خیبر کی مہم کے دوران حضرت بلال نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نئی بیوی حضرت صفیہ کو خیمہ نبوی میں پہنچانے کا نازک کام انجام دیا تھا[119]۔ سریہ دومۃ الجندل کی روانگی سے قبل حضرت بلال ہی نے امیر سریہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کو علم (لواء) عطا فرمایا تھا[120]۔ فتح مکہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو حضرت طلحہ بن عثمان عبدری متولی کعبہ سے بیت اللہ کے دروازے کی چابی لانے کو کہا تھا۔ جس کی انہوں نے تعمیل کی تھی[121]۔ اور یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خانہ کعبہ میں داخل ہونے والے دو صحابہ میں متولی کعبہ کے علاوہ حضرت بلال حبشی ہی تھے یہ تمام اور ان جیسے دوسرے متعدد امور اور واقعات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ حضرت بلال حبشی کو نہ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی ضروریات کی نگرانی حاصل تھی بلکہ وہ ریاست اسلامی میں حکومتی شعبہ میں سلسلہ افسران میں بھی تھے اور کافی اہم اور محبوب مقام رکھتے تھے۔

۴ سفیرانِ نبوی (رُسل)

سفارہ کا ادارہ یا عہدہ اسلام سے قبل جزیرہ نمائے عرب میں یا کم از کم مکہ میں معروف تھا۔ کیونکہ قریشی اشرافیہ میں وہ موجود تھا[۱۲۲]۔ روائتی لحاظ سے خاندان بنو عدی مدت مدید سے اس کا منصب دار تھا۔ اور اسی کے اراکین اس اہم عہدے پر فائز ہوتے چلے آئے تھے۔ بعثت نبوی کے زمانے میں حضرت عمر بن خطاب عدوی اس کے منصب دار تھے۔ جنہوں نے غالباً اپنے باپ خطاب سے یہ عہدہ پایا تھا۔ ان کے دادا نفیل کے بارے میں صراحت کے ساتھ ذکر ملتا ہے۔ کہ وہ اس منصب کے منصبدار ہونے کے علاوہ قریشی رؤسا و شیوخ میں شمار ہوتے تھے۔ بہرحال حضرت عمر اسلام سے قبل کے سیاسی نظام قریش میں اس کے آخری عہدیدار تھے اور اس حیثیت سے وہ عرب قبائل اور قریش کے درمیان تعلقات کے ضمن میں قریش کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس سے زیادہ ہم اس عہدے کی کارکردگی کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتے کیونکہ تفصیلات معدوم ہیں[۱۲۳]۔

بہرکیف ماخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست نے جاہلی عربوں کے ادارۂ سفارہ کو ترکہ میں پایا تھا اور پھر اپنی ضروریات اور عصری تقاضوں کے تحت اس میں نئی جہتوں کا اضافہ کیا تھا اور اس کو ایک مخصوص شکل میں ترقی و وسعت دی تھی۔ قدیم جاہلی عہدہ سفارہ اسلامی ریاست کے انتظامیہ میں رسالۃ اور سفیر رسول کہلانے لگا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور امتیاز یہ پیدا ہوا تھا کہ جاہلی نظام میں سفیر مستقل منصبدار ہوتا تھا۔ جو تا زندگی اپنے عہدے پر فائز رہتا تھا۔ اور اس کے بعد وہ عہدہ اسی کے خاندان کے افراد کو ملتا تھا۔ اس طرح سے یہ منصب موروثی بھی تھا، مگر اسلامی سیاسی نظام میں موروثی عہدوں کی اصولاً گنجائش نہیں تھی اور نہ ہی تا زندگی منصبداری کے حق کی ضمانت، کیونکہ عہدے دار کے لئے اہلیت و لیاقت کے سوا حسن عمل اور بہتر کارکردگی اور خوشنودی سربراہ مملکت بھی لازمی تھی، جو حالات کے تحت بدل سکتی تھی۔ بہرحال اسلامی ریاست میں رسالہ کا عہدہ تو مستقل تھا۔ مگر رسول کے عہدے دار عارضی ہوتے تھے اور ان کو وقت و ضرورت کے مطابق مقرر و مبتدل کیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی ریاست میں متعدد بلکہ بہت سے لوگ اس عہدۂ جلیل پر سرفراز ہوئے۔

ایک اچھے سفیر یا رسول کے لئے ضروری اوصاف اور خوبیوں کا ذکر صراحت کے ساتھ ماخذ میں کہیں نہیں ملتا۔ تاہم ان سے ان کو مستنبط کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ کتانی نے اس موضوع پر پوری ایک فصل باندھی ہے اور اس کے مطابق ایک عمدہ سفیر کے لئے کم از کم چار اوصاف لازمی و ناگزیر تھے۔ اعلیٰ فراست و ذہانت، عمدہ زبان و طرز ادا، جاذب نظر شخصیت اور علاقہ تقرری و ادائیگی فرائض کی زبان پر قدرت۔ یہ وہ اوصاف تھے، جو ایک اچھا سفیر بناتے تھے[۱۲۴]۔ اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم موقعہ محل کی مناسبت سے مخصوص و موزوں شخص کا انتخاب کرتے تھے اور اس کی روانگی سے قبل حسب معمول اس کو ہدایات دیتے تھے کہ نرم اور اچھی گفتگو کریں، رحمت و نرم دلی کا مظاہرہ کریں، سختی اور سخت روی سے پرہیز کریں، آسانی پیدا کریں اور اختلاف و تصادم سے گریز کریں، خوشخبری سنائیں۔ نفرت و عداوت سے اجتناب کریں۔ اور رحمت و اتفاق کا رویہ اپنائیں[۱۲۵]۔

عہد نبوی میں مقرر ہونے والے تمام سفیروں (رسل) کو کتانی نے مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے اور ہر ایک طبقے الگ فصل میں گفتگو کی ہے۔ اس کے مطابق کچھ سفیر تبلیغ اسلام کے لئے بھیجے گئے تھے تو کچھ دوسرے تعلیم کے معاہدے کرنے کے لئے، کچھ نے دوسروں کو امان دی تھی تو کچھ اور نے بادشاہوں سے مسلم طبقات کی واپسی کی درخواست اور اپنے علاقہ یا ملک میں مقیم ایک مسلمان عورت سے امام کی شادی کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ بعض سفیروں نے امام کی جانب سے دوسروں کو تحائف پہنچائے تھے اور بعض دوسروں نے کافروں کو ان کے کفر کے برے نتائج سے آگاہ کیا تھا[26]۔ ظاہر ہے کہ یہ تقسیم و تعین کار نہ تو مکمل و ہمہ گیر ہے اور نہ ہی ضروری ہے۔ ذیل میں عہد نبوی کے انتظامیہ کے اس شعبہ کی تاریخی ارتقا سے بحث کی جا رہی ہے۔

جہاں تک واقعات شہادت دیتے ہیں۔ اسلامی ریاست میں کسی سفیر کی پہلی تقرری عسکری یا نیم عسکری مہموں کے دوران ہوئی تھی۔ اگرچہ ان کارکنوں یا افسروں کے لئے بسا اوقات مآخذ رسول کی اصطلاح نہیں استعمال کرتے ہیں مگر ان کے کاموں کی نوعیت ان کو اسی شعبۂ افسران میں شامل کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پہلے بھی بعض سفیروں کا تقرر رہا ہو۔ مگر مآخذ میں پہلی مثال یا شہادت کا تعلق سنہ ۴ھ/۶۲۵ء سے ہے جب بنو نضیر کے غزوہ کے دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت محمد بن مسلمہ اوسی کو سفیر بنا کر بنو نضیر کے یہودیوں کے پاس اس غرض سے بھیجا تھا کہ وہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کے معاملہ میں آخری فیصلے سے آگاہ کر دیں[27]۔ دو برس بعد جب مدینہ احزاب کے محاصرہ میں گھر چکا تھا تو تین مسلم سفیروں کی تقرری ہوئی تھی۔ ان کے نام تھے حضرات سعد بن معاذ اوسی، سعد بن عبادہ خزرجی اور عبد اللہ بن رواحہ خزرجی[28]۔ ان کو بنو قریظہ کے پاس بھیجا گیا تھا تاکہ ان کو ان کا عہد و معاہدہ یاد دلائیں جو انہوں نے اسلامی ریاست کے دفاع کے لئے کیا تھا اور ان کو احزاب میں شامل ہونے سے روکیں[29]۔ صلح حدیبیہ کے دوران کم از کم تین مسلم سفارتیں یکے بعد دیگرے مکہ بھیجی گئی تھیں۔ مسلم جماعت زائرین کے حدیبیہ میں قیام کے معاً بعد حضرت خراش بن امیہ خزاعی کو مکہ کے اشراف و رؤساء کے پاس بھیجا گیا تھا تاکہ وہ حرم مکہ میں مسلمانوں کے داخلے اور عمرہ کرنے کی اجازت حاصل کریں۔ لیکن ان کی یہ سفارت ناکام رہی[30]۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد حضرت عثمان بن عفان اموی کو حضرت عمر کے مشورہ پر اسی غرض سے بھیجا گیا تھا[31]۔ بہر حال اس پوری مدت میں قریش کی جانب سے بھی متعدد سفیر آئے تھے اور آخر کار ان کی آخری سفارت قریش کے شاعر و خطیب سہیل بن عامری اور حویطب کی سرکردگی میں آئی تھی جس نے معاہدہ حدیبیہ لکھا تھا۔ مسلم جماعت کی نمائندگی اس موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی نے کی تھی اور انہوں نے ہی صلح کے معاہدہ کی تحریر بھی لکھی تھی۔ صلح حدیبیہ دراصل انہی تمام گفت و شنید کا نتیجہ تھی[32]۔

عام طور پر خیال یہ ہے کہ اسلامی ریاست نے پہلی بار محرم سنہ ۷ھ/مئی۔ جون ۶۲۸ء میں سفیروں کی تقرری کی تھی اور متعدد سفیروں کو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف حصوں کے علاوہ بعض پڑوسی ملکوں کے حکمرانوں کے پاس بھی بھیجا تھا۔ ابن ہشام کی روایت ہے[33] کہ حسب ذیل سفیروں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دینے کیلئے مختلف ملکوں میں روانہ کیا تھا:

۱: حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی کو — رومی شہنشاہ ہرقل کے پاس

۲: حضرت عبد اللہ بن حذافہ سہمی کو — خسرو ایران پرویز کے پاس

۳: حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو — نجاشی حبش اصحمہ کے پاس

۴ : حضرت حاطب بن ابی بلتعہ لخمی کو	مقوقس مصر کے پاس
۵ : حضرت شجاع بن وہب اسدی کو	ملک غسان شام کے پاس

ابن سعد[۱۳۵] نے مذکورہ بالا سفیروں میں ایک چھٹے سفیر کا اضافہ کیا ہے کہ اسی دن حضرت سلیط بن عمرو عامری کو شاہان یمامہ کے پاس بھیجا گیا تھا۔ نامہ نبوی کے متون[۱۳۶] کے علاوہ ماخذ[۱۳۷] سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ ان سفیران حرم کو تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا گیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں سیاسی طور سے ان سفارتوں کا مقصد یہ تھا کہ پڑوسی شاہان وقت کو اسلامی دعوت کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت اور صلح کے لئے آمادہ کیا جائے تاکہ ایک طرف تو اسلام کی عالمگیر تبلیغ کا دروازہ کھلے تو دوسری طرف تصادم و جارحیت کے امکانات یا خطرات میں کمی پیدا ہو۔ سوائے ایک سفارت کے یہ تمام سفارتیں اپنی مہموں میں کافی کامیاب رہیں۔ اور انہوں نے اپنے اپنے علاقہ کے حکمرانوں میں خیر سگالی اور دوستی کے جذبات پروان چڑھانے میں کافی موثر کردار ادا کیا۔ ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ رومی شہنشاہ نے نبوت محمدی کی نہ صرف تصدیق کی بلکہ اپنے عوام کو اسلام کے لئے آمادہ بھی کیا۔ اگرچہ وہ سیاست دربار و امراء سے ڈر گیا۔ تاہم اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تحائف بھیجے۔ اسی طرح مقوقس مصر اور نجاشی حبش نے نذرانے بھیجے تھے اور سفیران نبوی کا خیر مقدم کیا تھا۔ اور اسلامی ریاست سے دوستی کا دم بھرا تھا۔ ان کے علاوہ دوسرے علاقوں کے سفراء بھی شاداں و فرحاں لوٹے تھے۔ صرف کسرائے ایران خسرو پرویز نے نخوت بادشاہت و غرور طاقت میں دعوت نبوی کو علانیہ ٹھکرا دیا اور یہی نہیں بلکہ نامہ نبوی کو نہ صرف پھاڑ کر پھینک دیا تھا بلکہ اس نے گورنر یمن کے ذریعہ اسلامی ریاست کے خلاف کسی فوجی اقدام کا منصوبہ بھی بنایا تھا۔ لیکن قدرت کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ وہ خود ہی اپنے لخت جگر کے ہاتھوں مارا گیا اور اس طرح اپنے انجام کو پہنچا[۱۳۸]

ان سفارتوں کے علاوہ متعدد دوسری سفارتوں کے حوالے ماخذ میں ملتے ہیں۔ ان کے مطابق حضرت علاء بن حضرمی حضرت عمرو بن عاص سہمی اور حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کو بالترتیب بحرین، عمان اور حمیر (یمن) کے بادشاہوں کے پاس بھیجا گیا تھا[۱۳۹] ابن سعد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر دونوں سفیروں کو ۸ھ / ۶۳۰ء میں کسی وقت غالباً فتح مکہ کے فوراً بعد بھیجا گیا تھا۔ جبکہ موخر الذکر کو کچھ تاخیر سے روانہ کیا گیا تھا[۱۴۰]

یہ غلط فہمی عام ہو گئی ہے کہ صرف یہی سفارتیں عہد نبوی میں بھیجی گئی تھیں۔ حالانکہ ماخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ متعدد اور سفارتیں ملکی حکمرانوں کے درباروں اور علاقوں میں روانہ کی گئی تھیں۔ ۹ھ / ۳۱-۶۳۰ء میں کم از کم سات سفیروں کو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف حکمرانوں اور قبیلوں کے پاس بھیجا گیا تھا۔ ذیل میں ان سفراء نبوی کے اسمائے گرامی اور ان کے علاقوں کے نام دیئے جا رہے ہیں

سفراء نبوی کے نام	علاقے یا قبیلے / حکمران
۱۔ حضرت عمیر بن خرشہ ثقفی	طائف کے قبیلوں کے پاس
۲۔ حضرت ظبیان بن مرثد سدوسی	قبیلہ بکر بن وائل

٣۔	حضرت حارث بن عمیر ازدی	شاہ بصریٰ حارث بن عمیر غسانی کے پاس
۴۔	حضرت عیاش بن ابی ربیعہ مخزومی	حمیر کے پاس
۵۔	حضرت وحیہ بن خلیفہ کلبی	اسقف نجران ضغاطر الاسقف کے پاس
۶۔	حضرت علقمہ بن فغواد خزاعی	حضرت ابوسفیان بن حرب اموی کے پاس
۷۔	حضرت عمرو بن فغواد خزاعی	

ابن سعدؒ[141] نے ان میں پہلے پانچ سفراء کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ باقی دو کا ذکر ابن اثیر نے کیا ہے[142]۔ پہلی پانچ سفارتیں کلی طور پر سیاسی تھیں یا مذہبی یا دونوں مقاصد پیش نظر تھے جبکہ آخری دو سفیروں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ رقم دے کر مکہ بھیجا تھا تاکہ غریب قریشیوں میں اس کو تقسیم کر دیا جائے۔ اسی طرح حضرت عمرو بن امیہ ضمری کے بارے میں بھی ذکر ملتا ہے کہ ان کو بھی کسی وقت اسی مقصد سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوسفیان اموی کے پاس بھیجا تھا[143]۔

حیات نبوی کے آخری برس یعنی ۱۰-۱۱ھ ر ۶۳۱-۳۲ء میں کسی ایک سال میں سب سے زیادہ سفارتوں کا مشاہدہ کیا جن کی کل تعداد سولہ تھی۔ ان سب کا ذکر اسد الغابہ کے مختلف تراجم میں ملتا ہے۔ مگر ان میں سے بعض کی تصدیق دوسرے ماخذ سے بھی ہو جاتی ہے۔ ابن سعد نے ان میں سے دو کا ذکر کیا ہے[144]۔ یہ تھیں حضرات عمرو بن امیہ ضمری اور جریر بن عبداللہ بجلی کی سفارتیں جو بالترتیب قبیلہ بنو حنیفہ کے جھوٹے نبی مسیلمہ کذاب اور کلاع اور ظلیم کے حکمرانوں کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ طبری نے ان میں سے آٹھ کا ذکر کیا ہے[145]۔ ان کا بیان ہے کہ جریر بن عبداللہ کی روانگی کے بعد سات سفراء کو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں میں بھیجا گیا تھا جو حسب ذیل تھے۔

۱۔	حضرت وبر بن عُنَیس خزاعی کو	ابناء یمن اور ان کے سرداروں کے پاس
۲۔	حضرت فرات بن حیّان عجلی کو	بنو حنیفہ کے ایک مسلم سردار حضرت ثُمامہ بن اُثال کے پاس
۳۔	حضرت اقرع بن عبداللہ حمیری	ذُو دا اور مرّان کے حکمرانوں کے پاس
۴۔	حضرت صلصل بن شرحبیل کو	قبیلہ بنی عامر کے پاس
۵۔	حضرت ضرار بن الازو اسدی کو	قبیلہ بنو اسد کے خاندان بنو صیدا اور قبیلہ بنو دیل کے پاس
۶۔	حضرت زیاد بن حنظلہ تمیمی کو	بنو تمیم کے پاس
۷۔	حضرت نعیم بن مسعود اشجعی کو	بنو غطفان یا بنو اشجع کے پاس

بقیہ سفیروں کے اسمائے گرامی اور ان کے علاقوں کے ناموں کے لیے جن کا ذکر صرف اسد الغابہ میں ملتا ہے۔ کتاب کے آخر میں متعلقہ ضمیمہ دیکھنا مفید ہوگا[146]۔ جہاں تک ان سفارتوں کا تعلق ہے تو یہ واضح ہے کہ ان کا سیاسی اور مذہبی دونوں مقصد تھے غیر مسلم حکمرانوں اور قبیلوں کے پاس جو سفارتیں گئی تھیں ان کا مطلوب تھا۔ ان کا اسلام اور اسلام قبول کرنے ہی سیاسی مقصد حاصل ہو جاتا کہ وہ از خود اسلامی ریاست کے مطیع و فرمانبردار بن جاتے۔ مسلم سرداروں کے پاس یا تو اس غرض

سے سفیر بھیجے گئے تھے کہ ان سے ان کے اپنے قبیلہ یا پڑوس کے قبیلہ میں تبلیغ اسلام کا کام لیا جائے۔ یا ان کے قبیلہ کے باغیوں کی سرکوبی کے لئے ان کے مسلم طبقات کی حمایت اور مدد حاصل کی جائے جیسا کہ ابناء یمن اور حضرت ثمامہ حنفی کے نام سفارتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض سفارتیں انتظامی مقاصد کے لئے بھیجی گئی تھیں اور قبیلوں یا حکمرانوں سے صدقات و جزیہ کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ عموماً یہ تمام سفارتیں کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھیں۔ سوائے مسیلمہ کذاب اور شاہ بصریٰ کے نام کی سفارت کے۔ اوّل الذکر کے بارے میں ہم ابھی مزید دیکھیں گے۔ جب کہ شاہ بصریٰ حارث بن عمیر غسانی نے سفیر نبوی حضرت حارث بن عمیر ازدی کو قتل کر دیا تھا جس کے نتیجے میں اسلامی ریاست کو فوج کشی کرنی پڑی تھی جس کا مطالعہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔

یہاں مسیلمہ کذاب کے پاس مختلف نبوی سفارتوں کی روانگی کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہوگا۔ اس سے ایک طرف تو ان مدعیانِ نبوت کے اصل عزائم پر روشنی پڑے گی تو دوسری طرف ان سرکشوں کے بارے میں اسلامی ریاست کی پالیسی واضح ہو گی۔ مزید یہ کہ قبائل عرب کے بارے میں اسلامی ریاست کے رویہ پر بھی روشنی پڑے گی۔ اس ضمن میں پہلی سفارت حضرت عمرو بن امیہ ضمری کی معلوم ہوتی ہے۔ جو غالباً ۱۰ھ (۶۳۱ء) میں بھیجی گئی تھی۔ اس نامہ مبارک سے جو سفیر موصوف لیکر مدعی نبوت کے پاس گئے تھے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جوابی سفارت تھی۔ اس سے پہلے مسیلمہ کذاب نے خدمت نبوی میں ایک عریضہ بھیجا تھا جس میں اس نے یہ تجویز رکھی تھی کہ وہ تعاون کے لیے تیار ہے۔ بشرطیکہ جزیرہ نمائے عرب کو دو آزاد و خود مختار مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ جس میں سے ایک اس کے زیر اقتدار ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اس کی تجویز کو مسترد کر دیا تھا۔ بلکہ اس کو مخالفانہ و معاندانہ رویہ سے باز رہنے کی بھی تلقین کی تھی[۱۴۷]۔ بظاہر یہ سفارت پوری طرح ناکام رہی تھی۔ کیونکہ وہ مسیلمہ کو اس کے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکی تھی۔ چنانچہ بلاذری[۱۴۸] کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد دو مزید سفارتیں حضرات حبیب بن زید خزرجی اور عبداللہ بن وہب اسلمی کی سرکردگی میں بھیجی گئی تھیں۔ بظاہر ان کا بھی مقصد یہی تھا کہ مسیلمہ کذاب کو مخالفت کی راہ اپنانے سے روکا جائے[۱۴۹]۔ لیکن اس کا انجام برا نکلا کہ مسیلمہ کذاب نے حضرت حبیب بن زید کو اتنا ستایا کہ ان کو مار ڈالا مگر کسی نہ کسی طرح سے حضرت عبداللہ اسلمی بچ کر نکل آئے اور سارا قصہ خدمت نبوی میں جا کہہ سنایا[۱۵۰]۔ طبری کے بیان سے ایسا[۱۵۱] معلوم ہوتا ہے کہ اس المناک حادثہ کے بعد ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فرات بن حیان عجلی کی سفارت بنو حنیفہ کے سردار حضرت ثمامہ بن اثال کے پاس بھیجی تھی جس میں ان سے مسیلمہ کذاب کے شر کا انسداد کرنے کی ہدایت تھی[۱۵۲]۔ اگرچہ یہ آخری سفارت مسیلمہ کذاب کے فتنہ کو مکمل طور سے ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تاہم بنو حنیفہ کے بڑے خاصے طبقہ کو اس کے جال سے آزاد کرنے اور اسلامی ریاست کا ہمنوا بنانے میں یقیناً کامیاب ہوئی تھی۔ اس ضمن میں ابناء یمن کے نام حضرت وبر بن یحنس کی سفارت آتی ہے۔ جس نے یمن کے ایرانی اشراف و حکمرانوں سے وہاں کے مدعی نبوت و قائد بغاوت اسود عنسی کے فتنہ و فساد کا خاتمہ کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ سفارت مکمل کامیاب رہی تھی۔ کیونکہ ابناء یمن نے ایک متحدہ محاذ بنا کر اسود عنسی کا خاتمہ کر دیا تھا۔[۱۵۳]

کتانی[۱۵۴] نے فتح مکہ کے بعد اس کے مفرورین کو تحفظ و ضمانت عطا کرنے والے سفراء نبوی کے ذیل میں دو سفیروں کا

ذکر کیا ہے جن کے نام تھے، حضرات عمیر بن وہب جمحی اور ام حکیم بنت ہشام مخزومی۔ ان دونوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بالترتیب صفوان بن امیہ جمحی اور عکرمہ بن ابی جہل مخزومی کو تحفظ کی ضمانت دی تھی اور بالآخر ان کو دربار رسالت میں لاکر انہیں ایمان کی دولت سے سرفراز کرنے کا سبب بنے تھے۔ سفراء نبوی کی جو فہرست حافظ زین الدین عراقی نے تیار کی ہے اس میں ان دونوں سفیروں کا ذکر نہیں ہے[۵۵]۔ اس فہرست میں کل سترہ سفراء نبوی کے نام شامل ہیں۔ ان مذکورہ بالا تمام سفیروں کے علاوہ مآخذ سے متعدد اور سفیران نبوی کے حوالے ملتے ہیں۔ مگر ان کے نام نہیں مذکور ہوئے ہیں۔ جیسے فردہ بن عمرو جذامی بنو عمرو/حمیر، جدس/لخم کے مسلمانوں، خالد بن ضماد ازدی، عمرو بن حزم، تمیم اوس، یزید بن طفیل اور بنو زیاد بن الحارث کے پاس متعدد سفیر بھیجے گئے تھے۔ امکان ہے کہ ان کے علاوہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد سفیر عرب اور بیرون عرب بھیجے ہوں جن کے نام اور کام محفوظ نہیں رہ سکے بہرحال تمام سفیران نبوی جن کے نام مآخذ میں مذکور ہوتے ہیں کی کل تعداد میری تحقیق کے مطابق ۳۸ ہے۔ جبکہ اس شعبہ میں کل تقرریوں کی تعداد ۴۲ ہے۔ ذیل کی جدول میں ان کا قبائل اور علاقائی تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

علاقہ	قبیلہ/خاندان	تقرریاں	سفراء
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۷	۷
	(الف) بنو ہاشم	۱	۱
	(ب) بنو امیہ	۱	۱
	(ج) بنو سہم	۲	۲
	(د) بنو عامر بن لوی	۱	۱
	(س) بنو مخزوم	۲	۲
	۲۔ خزرج	۳	۲
	۳۔ اوس	۲	۲
شمالی عرب	۱۔ کلب	۳	۲
	۲۔ لخم	۱	۱
مشرقی عرب	۱۔ غطفان	۱	۱
	۲۔ ہوازن	۲	۳
	۳ خزیمہ	۲	۲
مغربی عرب	۱ خزاعہ	۷	۷

	۲- کنانہ	۳	۱
	۳- ازد شنوءہ	۱	۰
جنوبی عرب	۱- بجیلہ	۲	۲
	۲- حضرموت	۱	۱
	۳- حمیر	۱	۱
	۴- سدوس	۲	۲
قبائل پراگندہ	۱- تمیم	۱	۱
غیر معروف		۲	۲
میزان	۱۶ قبیلے	۴۲	۳۸

۵- مخصوص افسران نبوی (کمشنر)

مرکز میں جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ تمام انتظامی امور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس انجام دیتے تھے لیکن بعض معاملات میں آپ اپنے اختیارات اپنے صحابہ کو منتقل کر دیتے تھے اور ان کے سپرد بعض معاملات کا نفاذ بھی کر دیتے تھے۔ مذکورہ بالا افسران حکومت کے علاوہ آپ نے بعض ایسے افسروں کو بھی مقرر کیا تھا جن کو ہم کسی خاص خانے میں نہیں رکھ سکتے، اور نہ ہی مآخذ ان کے لیے کسی مخصوص اصطلاح کا ذکر کرتے ہیں کہ افسران نبوی کا ایک نیا طبقہ بنا دیا جاتا۔ اس کے باوجود بھی یہ طبقہ افسران حکومت نبوی بالکل جدا تھا۔ اور اس کا تعین ہم نے ان کے کاموں کی نوعیت کے لحاظ سے کیا ہے۔ بعض مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کرام کو مخصوص قسم کے کام سونپے تھے۔ یہ کام بھی عارضی تھے اور ان کے افسر اور عہدے بھی عارضی۔ اس لیے ہم ان کو افسران بکار خاص یا کمشنر بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان خصوصی افسروں اور عاملوں کے کاموں کی نوعیت جداگانہ تھی۔ ان میں سے بعض کو اہم ترین کام اور فرائض سونپے گئے تھے۔ جبکہ بعض دوسروں کے کام معمولی نوعیت کے تھے۔ مشہور واقعہ ہے اگرچہ اب جدید مؤرخین نے اس کی صحت پر شک کا اظہار کیا ہے کہ حضرت سعد بن معاذ اوسی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کے یہودیوں کی غداری کے سلسلہ میں فیصلہ کا مجاز یا حکم مقرر کیا تھا اور پھر ان کے فیصلے کو نافذ بھی کیا تھا۔[۱۵۷]

ایک خصوصی افسر نبوی حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی تھے جن کو تین مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا تھا ان میں سے دوبارہ وہ بنو جذیمہ کے قبیلہ کے مسلمانوں کا خون بہا اور دیت ادا کرنے گئے تھے۔ جن کو مسلمان سپاہیوں اور سالاروں نے غلطی سے قتل کر دیا تھا یہ تقرری شوال ۸ھ / فروری ۶۳۰ء میں ہوئی تھی۔ اس سے ایک ماہ قبل حضرت علی کو فتح مکہ کے دوران اسی مقصد سے ہی مقرر کیا گیا تھا جس میں کچھ مسلمانوں نے جوش میں غلطی کی تھی۔[۱۵۸] اس سے قبل حضرت علی کی اس شعبہ خاص میں تقرری جذام کے قیدیوں اور مال غنیمت کی واپسی کے لیے ہوئی تھی۔ جن کو مسلمان فوج نے غلطی سے پکڑ لیا تھا۔[۱۵۹] دوسرے

دو معاملات میں ہم کو اسلامی ریاست کی سازشوں کے بارے میں پالیسی اور طرزِ عمل کا علم ہوتا ہے۔ دونوں واقعات کا تعلق اس زمانے سے ہے جبکہ اسلامی ریاست اپنے اوج و کمال پر تھی۔ یہ غزوہ تبوک کے ذرا قبل اور ذرا بعد کے زمانے کا واقعہ ہے کہ حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی کو مدینہ میں منافقوں اور سازشیوں کے اس گھر کو منہدم کرنے کا حکم ملا تھا جہاں وہ بیٹھ کر اسلامی ریاست کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ انہوں نے حکم نبوی کی پوری طرح سے تعمیل کی تھی[۱۶۰]۔ اسی طرح غزوہ تبوک کے بعد بحکم نبوی حضرات مالک بن الدخشم اور معن بن عدی اوسی کو منافقوں کے اس مرکز سازش و جائے فتنہ و فساد کو گرانے کا حکم دیا گیا تھا[۱۶۱]۔ جس کو انہوں نے مسجد کا نام دے رکھا تھا۔ مگر جسے قرآن کریم نے مسجد ضرار (تکلیف و بغاوت کی مسجد) کا نام دیا ہے[۱۶۲]۔ ماخذ نے ان مراکز فتنہ و فساد کے انہدام کا ذکر تو کیا ہے۔ لیکن ان کے مجرموں کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔ اس لئے کچھ حتمی طور پر کہنا مشکل ہے۔ غالباً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بغاوت اور فتنہ جوئی کا سدِّ باب کرنا کافی سمجھا تھا اور ان کو عذاب آخرت کے لئے چھوڑ دیا تھا۔

ان سیاسی نوعیت کے مخصوص کاموں کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اخلاقی جرائم کی سزاؤں کے نفاذ کے لئے بھی چند افسروں کو مقرر کیا تھا۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ حضرت انیس بن ضحاک اسلمی کو ان کے قبیلہ کی ایک زانی عورت کو رجم (سنگسار) کرنے کے لئے مامور کیا تھا اور انہوں نے اس کی تعمیل کی تھی[۱۶۳]۔ یہاں حضرت عمر بن خطاب عدوی کی تقرری کا بھی ذکر کرنا چاہیئے جن کو اسد الغابہ کے مطابق ایک عیسائی کی آدھی دولت ضبط کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا[۱۶۴]۔ ماخذ کا آخری جملہ ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ قبول اسلام سے انکار اسلامی قانون میں تعزیری جرم نہیں ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ عیسائی محاصل کی عدم ادائیگی کا مجرم تھا یا اس نے کسی اور تعزیری جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ ایک روایت میں ہم کو دو حقیقی بھائیوں کے درمیان جائیداد کے معاملہ پر اختلاف کا علم ہوتا ہے۔ جس کو طے کرنے کے لئے حضرت حنظلہ بن یمان کو مامور کیا گیا تھا اور انہوں نے بطریق احسن اسے سلجھا دیا تھا[۱۶۵]۔ کتانی نے حضرات علاء بن عقبہ اور ارقم کو اسی قسم کے مخصوص افسروں کے طبقہ میں شمار کیا ہے[۱۶۶]۔ اگرچہ ان کے طبقہ کی یہ نشاندہی نہیں کی ہے۔ اصابہ کے مطابق حضرت ابو امامہ باہلی کو خون کھانے کی تحریم کا اعلان کرنے کے لئے مختلف علاقوں میں بھیجا گیا تھا[۱۶۷]۔ تحریم ماکولات کے ذیل میں بعض افسروں کی تقرری کے امکانات ہیں۔ اسی طرح حضرت علی کی ۹ھ میں سورہ توبہ کی چند آیات جن کا تعلق مکہ میں کافروں کے قیام و داخلہ سے تھا کے اعلان کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جس کی انہوں نے تعمیل کی تھی[۱۶۸]۔ بہر حال امکان ہی نہیں یقین ہے کہ مذکورہ بالا افسروں کے علاوہ بہت سے اور بھی افسر تھے جو بکار خاص مقرر کئے گئے تھے ذیل میں ایک جدول دی جا رہی ہے جو مذکورہ بالا افسروں پر مبنی ہے اس سے ان کے علاقائی اور قبائلی تعلق کا علم ہوتا ہے۔

علاقہ	قبیلہ/خاندان	سنہ تقرری ۶۲۸	۶۳۰	۶۳۱	۶۲۲ - ۳۲	میزان
مرکزی عرب	۱- قریش	۱	۲	۲	۲	۷

	(الف) بنو ہاشم	۱	۲	۲	-	
	(ب) بنو عدی	-	-	-	۱	
	(ج) بنو تیم	-	-	۱	-	
	(د) بنو مخزوم	-	-	-	۱	
	۲۔ اوس	۱	-	۲	-	۲
مغربی عرب	۱۔ اسلم	-	-	-	۱	۱
	۲۔ باہلہ	-	-	-	۱	۱
مشرقی عرب	۱۔ غطفان	-	-	-	۱	۱
غیر معروف	-	-	-	-	۱	۱
میزان	۵ قبیلے	۲	۲	۴	۶	۱۴

۶۔ شعراء وخطباء (شاعر اور خطیب)

آج کے زمانے میں شعراء اور خطباء کو سرکاری یا ریاستی افسروں میں شمار کرنا مضحکہ خیز سمجھا جائے گا مگر قرون وسطیٰ میں ان کی ایک سرکاری اہمیت ہوتی تھی اور عرب میں تو ان کو ایک بےمثال اور عدیم النظیر حیثیت اور مقام حاصل تھا ایک جدید مورخ و مستشرق نے "شعراء کو اپنی قوم کے قلب وضمیر کا محافظ" بجا طور سے کہا ہے چونکہ عرب اہل زبان تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، اس لئے ان کو اپنے شاعروں اور خطیبوں پر بہت ناز تھا۔ دوسری طرف شاعر وخطیب نہ صرف اپنے قبیلہ اور لوگوں کی آواز تھے اور ان کے جذبات وخیالات کی وہ ترجمانی کرتے تھے بلکہ وہ آراء وخیالات کو بنانے بگاڑنے بھی تھے۔ وہ جذبات برانگیختہ کرتے، اپنی قوم یا قبیلہ کو اکساتے اور ان کی ذہنی نشو ونما کرتے تھے، عرب شاعری میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ انہیں شاعروں اور خطیبوں نے جذبات میں ہیجان برپا کر کے جنگ تک بھڑکائی۔ اس کے علاوہ خیالات، نظریات اور آراء کے رسل ورسائل کا بھی ایک اہم ذریعہ تھے، بہرحال عرب سماج میں ان کا اہم مقام تھا اور اس سے کوئی عرب حکومت صرف نظر نہیں کر سکتی تھی۔

اگرچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاعرانہ مبالغہ آرائی اور فاحش نگاری اور فحش سخنی کو کبھی پسند نہیں کیا بلکہ ان کی سختی سے مخالفت کی لیکن اس کے باوجود آپ نے شاعری کے خوبصورت ودلآویز پہلوؤں کو ہمیشہ بنظر تحسین دیکھا اور بہتر شاعری کی ہمیشہ تعریف فرمائی اور اس کو پسند کیا آپ اس کے غیر معمولی سماجی اثرات سے واقف تھے۔ لہٰذا اسکو آپ نے اسلامی امت اور اسلامی ریاست کے مفاد میں بہتر سے بہتر طریقے پر استعمال بھی کیا۔ اگر اسلام اور اس کے رسول عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ جسمانی تہذیب کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو عام طور سے اور

آپ کو خاص طور سے اپنی پوری عوامی زندگی کے دوران سخت ترین عقلی و ذہنی تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اسلام اور اسلامی اصولوں کا اسی شاعری و خطابت کے ذریعہ مذاق اڑایا گیا تھا، مسلمانوں خاص کر مسلمان عورتوں کی عزت و آبرو سے کھیلا گیا تھا، ان کے نسب و حسب پر کیچڑ اچھالی گئی تھی، مختلف مسلم طبقات کے درمیان نسلی اور علاقائی منافرت اور دشمنی پھیلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان کے ذاتی مصائب پر پھبتیاں کسی گئی تھیں۔ اسلامی ریاست کے خلاف اس کے دشمنوں کو آمادہ پیکار کیا گیا تھا اور وہ ساری کوششیں کی گئی تھیں جن سے مسلمانوں کی سبکی ہو، آپ کی مخالفت ہو اور اسلامی ریاست کی بیخ کنی ہو۔ اینٹ کا جواب اینٹ سے دینے کے لئے ضروری تھا کہ اسلامی ریاست بھی شاعری اور خطابت کو اپنے دفاع اور مسلمانوں کی عزت و وقار کے تحفظ کی خاطر استعمال کرے۔ چنانچہ ماخذ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین اہم شاعروں کی خدمات حاصل کی تھیں، جو آپ کا اور اسلامی ریاست کا دفاع کرتے تھے۔ ان میں سے حضرت حسان بن ثابت خزرجی عظیم ترین شاعر دربار رسالت تھے، جو عرب کی اسلامی شاعری میں ایک خاص ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت حسان عربوں کے حسب نسب (انساب) پر تنقید کیا کرتے تھے، جبکہ حضرت کعب بن مالک ان کو جنگ کے مہلک اثرات و نتائج سے آگاہ کرتے رہتے تھے، اور تیسرے شاعر حضرت عبد اللہ بن رواحہ خزرجی ان کو ان کے کفر پر عار دلاتے رہتے تھے"[۱۹] ابن اثیر نے اس بیان میں ان شعراء نبوی کی اہم ترین خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ورنہ صحیح بات تو یہ ہے کہ یہ تینوں شاعر ناموس رسول کے محافظ اور اسلامی ریاست کے ترجمان تھے جو ہر موضوع اور سخن کے ماہر تھے۔ آیئے ابن اسحاق کی سیرت نبوی اور دوسرے ماخذ کے اوراق الٹیں اور دیکھیں کہ اسلامی ریاست کو جاہلی شعراء اور خطباء سے کس قسم کی تنقید کا سامنا تھا اور اس کے جواب میں مسلمانوں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا طریقے اختیار کئے اور ان کے ان تینوں شعراء نے کس طرح سے اپنے رسول اور اپنے اسلامی بھائیوں کا دفاع کیا۔ اس سے ہم کو ان کے عرب سماج میں تاثیر اور تسخیر کی قوت کا اندازہ بھی ہو سکے گا۔

پہلے ہم حضرت حسان بن ثابت خزرجی کی کاوشوں کا مطالعہ کریں گے۔ انہوں نے ہجرت سے پہلے جن موضوعات کو اپنی شاعری کی اساس بنایا تھا۔ ان میں بنو ہاشم کے قریشی اشرافیہ کے ہاتھوں سماجی مقاطعہ"[۲۰] اور اس کی منسوخی اور ہجرت نبوی پر ان کی تنقید"[۲۱] وغیرہ کا جواب شامل تھا۔ ابن اسحاق کی سیرت رسول اللہ ان کی شاعری کے نمونوں سے بھری ہوئی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ اسلام و رسول دشمنی میں یہودی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ اور انصار کے اوس و خزرج کی صفوں میں منافقین کی صورت میں ان کے ہمدردوں اور خیر خواہوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ حضرت حسان بن ثابت نے ایک موقعہ پر بنو کعب کے ایک شخص ضحاک بن ثابت کو منافقت اور یہودیوں سے اسلام کے خلاف ساز باز کے لئے سخت تنقید کا نشانہ بنایا تھا"[۲۲]۔ جنگ بدر میں قریشی فوج کی شکست پر ان کی زبردست تنقید نے اہل مکہ کے سر شرم سے جھکا دیئے تھے"[۲۳] مشہور یہودی شاعر کعب بن اشرف کے خلاف جو مکہ والوں کو بدر کا انتقام لینے پر اکسانے کی خاطر مکہ گیا ہوا تھا۔ حضرت حسان بن ثابت کی شاعرانہ تنقید اور اس کے مکی میزبانوں پر چوٹ اتنی گہری تھی کہ کعب بن اشرف کو مکہ سے بھاگنا پڑا تھا[۲۴]۔ مگر یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اپنے فرار سے قبل وہ مکہ میں بدر کے انتقام کے لئے آگ بھڑکا چکا تھا اور اس نے ایک طرح احد کی جنگ کے برانگیختہ کرنے میں کلیدی کردار ادا

کیا تھا۔ حضرت حسان بن ثابت نے جنگ احد کے دوران بعض سرداران قریش کے غیر انسانی رویہ اور غیر معیاری سلوک کیخلاف شدید تنقید کی تھی[۶۶]۔ واقعہ رجیع کے ذمہ دار بنو ہذیل کے خلاف حضرت حسان کی تنقید اتنی شدید اور گہری تھی کہ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اس قبیلہ نے اپنے قاتل کے خلاف اقدام کر کے اس کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ اور اس طرح مسلمانوں کے ساتھ کئے گئے ظلم کی تلافی کرنی چاہی تھی[۶۷]۔ اسی طرح بئر معونہ کے واقعہ کے بعد حضرت حسان بن ثابت نے ابو البراء اور ان کے خاندان والوں کو اپنے عہد کا تحفظ نہ کر سکنے پر اتنی عار دلائی تھی۔ کہ انہوں نے واقعہ کے ذمہ دار عامر بن طفیل کو جان سے مار ڈالنے کی کوشش کی تھی[۶۸]۔ مختصر طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت حسان کی شاعری کے نمونے ابن اسحاق کی سیرت میں تقریباً ہر موضوع پر مل جاتے ہیں اور ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور اسلامی ریاست کے دفاع میں ان کی کسقدر زبردست افادیت تھی[۶۹]۔ یہی بات حضرات کعب بن مالک اور عبد اللہ بن رواحہ باقی دو شاعران دربار رسالت کے بارے میں بھی صحیح ہے[۷۰]۔

مذکورہ بالا شعراء کے علاوہ عہد نبوی میں بہت سے شاعر تھے۔ جن میں سے بعض عرب شاعری اور ادب کی آبرو ہیں ان میں سے بھی بعض نے اپنے نجی مقام اور حیثیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محافظتِ لسانی کی تھی اور ریاست اسلامی کی ہر طرح سے خدمت کی تھی۔ مشہور سیرت نگار رسول ابن سید الناس (م ۷۳۴ھ / ۱۳۳۳-۳۴ء) نے اپنی تصنیف "منح المدح" میں عہد نبوی کے دو سو شعراء کو شمار کیا ہے۔ ان میں اہم ترین تھے: حضرات کعب بن زہیر، لبید، خنساء، علی بن ابی طالب، عامر بن اکوع اور عباس بن مرداس سلمی وغیرہ[۷۱]۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سرکاری خطیبوں میں صرف ایک حضرت ثابت بن قیس بن شماس خزرجی کا ذکر ملتا ہے جو انصار کے قومی خطیب تھے۔ ان کی خدمات کا ذکر بنو تمیم کے اس وفد کی آمد اور اس کے شاعروں اور خطیبوں کی مفاخرت کے ضمن میں ملتا ہے جس میں حضرت زبرقان بن بدر وغیرہ شامل تھے۔ اس موقعہ پر انہوں نے تمیمی مفاخر پسندوں سے اپنی برتری منوائی تھی[۷۲]۔ ان کے علاوہ متعدد صحابہ کرام وقت کے شعلہ نوا خطیب تھے۔ ان میں حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق، علی بن ابی طالب، جعفر بن ابی طالب، سہیل بن عمرو، عامری وغیرہ بہت ممتاز مقام کے مالک تھے۔ ان کے جواہر پارے آج بھی دلوں کو گرماتے ہیں۔ لیکن یہ کتنی خوشگوار حیرت کی بات ہے کہ اس زمانے کے سب سے بڑے اور پُرشکوہ خطیب خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ جن کے کلمات طیبات عربی ادب کی آبرو اور عربی خطابت کی شان ہیں اور جن کا ادبیت کے لحاظ سے مرتبہ صرف کلام اللہ کے بعد ہے۔

۷۔ متفرق ماتحت اور چھوٹے کارکن

مآخذ ایک ایسے دلچسپ طبقہ کارکنان کا حوالہ دیتے ہیں جو عہد نبوی میں چھوٹے موٹے کام انجام دیتا تھا اور جنکو مختلف ناموں آذن (اجازت دینے والا)، بوّاب (چوکیدار، دروازہ کا نگران)، حاجب (دروازہ پر پوچھ گچھ، روک ٹوک کرنے والا)

سے پکارا جاتا تھا۔ مختلف ناموں کے سبب بعض متاخر مصنفین کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ یہ تینوں مختلف افسر تھے اور اسی لحاظ سے ان پر بحث کی ہے۔ حالانکہ ان تینوں کارکنوں کے فرائض کی نوعیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کارکن صرف ایک تھا جس کے لئے مختلف اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ وہ دراصل مترادفات ہیں اور ان کا مفہوم یہ تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لئے اجازت کی ضرورت ہوتی تھی جو یہ کارکن ملاقاتی کے لئے فراہم کرتے تھے۔ لیکن یہاں یہ بات واضح کر دی جائے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، کیا بحیثیت رسول خدا اور کیا بحیثیت سربراہ ریاست وحکومت، ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بلکہ ہر شہری کی پہنچ کے اندر تھے، اور ہر شخص آپ سے ہر وقت ملاقات بلا کسی روک ٹوک کے کر سکتا تھا جیسا کہ بخاری کی ایک روایت سے واضح ہوتا ہے۔[183] تاہم بعض اوقات سیاسی تقاضے اور وقتی ضرورت اس بات کا مطالبہ کرتی تھی کہ خدمتِ نبوی میں آنے والوں پر پابندی لگائی جائے۔ یہ اہم مواقع ہوتے تھے جب اس قسم کی روک ٹوک کے لئے کسی چوکیدار یا بواب کی ضرورت پڑتی تھی۔ ایسے مواقع پر بلا اجازت نبوی بڑے سے بڑے صحابہ کو بھی داخلہ کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ جیسا کہ ہم اپنے اس بیان میں دیکھیں گے۔

ایسے کسی کارکن کی پہلی تقرری کی شہادت ہم کو ۲ھ / ۶۲۴ء میں غزوہ بنو قینقاع کے بیان کے ضمن میں ملتی ہے واقدی کا بیان ہے کہ جب یہود بنی قینقاع کے اخراج مدینہ کا فیصلہ نبوی لوگوں کو معلوم ہوا تو منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول نے، جو ان کا قدیم حلیف تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موضوع پر بات کرنی چاہی مگر اسے درِ نبوی پر حضرت عُوَیم بن ساعدہ نے جو اس دن بواب کے فرائض انجام دے رہے تھے روک دیا اور بلا اجازت داخل نہیں ہونے دیا۔ عبداللہ بن ابی نے حضرت عویم کو دھکا دے کر زبردستی داخل ہونے کی کوشش کی۔ مگر دربار نبوی کے محافظ نے اس کے چہرے پر اس زور کا ہاتھ مارا کہ وہ لہولہان ہو گیا بعد میں جب رئیس المنافقین نے حضرت عویم کی شکایت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تو آپ نے اس کو موردِ الزام ٹھہرایا کیونکہ اس نے کارکن نبوی کی حکم عدولی کی تھی اور غلط طور سے خدمت نبوی میں داخل ہونا چاہا تھا۔[184] یہ واقعہ کچھ تفصیل سے اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ اس عامل نبوی کے کام کی نوعیت کے ساتھ ساتھ اس کے مقام و مرتبہ کی حیثیت بھی اجاگر ہو جائے۔

دوسری متعین شہادت کا تعلق واقعہ ایلاء[185] سے ہے جو ۹ھ میں پیش آیا تھا اور جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عارضی طور سے اپنی ازواج مطہرات سے جدائی اختیار کر لی تھی اور مشربہ ام ابراہیم یا مشربہ عائشہ میں رہائش اختیار کر لی تھی[186] اسی اثناء میں یہ افواہ بازاروں میں گشت کرنے لگی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ازواج مطہرات کو طلاق دیدی ہے ہر شخص مضطرب اور بے چین تھا۔ چنانچہ حضرت عمر بن خطاب اصل واقعہ معلوم کرنے کے لئے آپ کے دولت کدے پر پہنچے مگر آپ کے دروازے پر متعین چوکیدار (آذن)، حضرت رباح حبشی نے دوسری بار اجازت مانگنے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ پہلی بار اجازت طلبی پر آپ نے سکوت اختیار فرمایا تھا۔ بہر حال بعد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو اجازت عطا کر دی تھی اور حضرت رباح حبشی نے ان کو داخل ہونے دیا تھا۔[187]

بلاذری اور طبری کا بیان ہے کہ حضرت رباح حبشی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل دربان (آذن) تھے۔[188] یہی دونوں

مؤرخین رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور مولیٰ حضرت انسہ کو بھی دربانوں میں شمار کرتے ہیں[۱۸۹] جبکہ محمد بن حبیب بغدادی نے ان کو حاجیوں میں شمار کیا ہے۔ حالانکہ ان کے لئے لفظ آذن ہی استعمال کیا ہے۔ بخاری اور مسلم کی ایک روایت حضرت ابوموسیٰ اشعری کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک موقعہ پر دربان بتاتی ہے۔ جب انہوں نے حضرات ابوبکر و عمر و عثمان کے لئے خدمت نبوی میں داخلہ کی اجازت حاصل کی تھی اور دوسروں کو آنے سے روک دیا تھا[۱۹۰]۔ اسی طرح قضاعی اپنی کتاب انباء الانبیاء اور ابن العربی اپنی تصنیف "الاحکام" میں کہتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک بھی یہ خدمت انجام دیا کرتے تھے[۱۹۱]

اسد الغابہ کی ایک روایت کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن زمعہ اسدی اپنے اسلام کے بعد زندگی بھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دربانی کرتے رہے اور اس طرح سے دربار نبوی میں آنے والوں کی آمد کو منظم کرتے رہے[۱۹۲]۔ اس روایت سے ایک مستقل دربان کی موجودگی کا علم ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مستقل تقرری اگرچہ رضاکارانہ تھی۔ تاہم اس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت حاصل تھی۔ مگر اس دربان کی تقرری کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ شرف ملاقات حاصل کرنے میں کسی قسم کی قدغن لگ گئی تھی۔ تمام مسلمان بلا کسی روک ٹوک کے اب بھی آپ سے مل سکتے تھے۔ یہ صرف ان مواقع کے لئے مخصوص تھی کہ جب حکومت و ریاست کے اہم معاملات پر غور و خوض کر رہے ہوتے تھے یا اپنے مشیروں سے گفتگو اور صلاح و مشورے میں مشغول ہوتے تھے۔ کیونکہ فتح مکہ کے بعد ریاستی اور حکومتی امور خاصے پیچیدہ اور اہم ہو گئے تھے۔ جن کو بھرپور توجہ کی ضرورت تھی۔ قسطلانی اور ان کے شارح زرقانی کے مطابق دربان نبوی کا عہدہ خالصتاً اعزازی تھا اور اس کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی[۱۹۳] آخر میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عہد نبوی میں سرکاری دربان کا عہدہ اموی اور عباسی عہد کے عہدے حاجب یا بواب سے قطعی مختلف تھا[۱۹۴]۔ بعد کے زمانے میں خلیفہ اور عوام کے درمیان ایک مستقل حد فاصل قائم کرنا مقصود تھا جبکہ عہد نبوی میں مخصوص مواقع پر غیر ضروری آمد پر قدغن لگانا تھا۔

(ب) صوبائی انتظامیہ / شہری نظم و نسق

اسلامی فتوحات کے بعد خاص کر فتح مکہ کے بعد اسلامی ریاست کا رقبہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور مختلف خطے مدینہ کی ریاست و حکومت کی ماتحتی میں آ گئے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے علاقے تھے۔ جن کی اپنی منظم حکومتیں تھیں اور باقاعدہ نظام حکومت تھا۔ جیسے یمن، بحرین، حضر موت، عمان، ایلہ، کندہ وغیرہ کے علاقے۔ بقیہ علاقوں میں قبائلی سیاسی نظام قائم و جاری تھا۔ مدینہ کی نبوی حکومت سے ان تمام مفتوحہ و مقبوضہ و محروسہ علاقوں کو کسی نہ کسی قسم کا تعلق قائم کرنا تھا۔ ذکر آ چکا ہے کہ ابتدائی زمانے میں اسلامی ریاست نے پڑوسی قبائل اور علاقوں سے باہمی تعاون اور دوستی و حلف کے تعلقات استوار کئے تھے[۱۹۵] چنانچہ آغاز ۶۲۳ء (وسط ۱ھ) سے اواخر ۶۲۷ء (اواخر ۶ھ) تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے نواح میں آباد مختلف قبائل سے دوستی کے معاہدے کر لئے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ علاقے اسلامی ریاست کے سیاسی اثر و نفوذ میں آتے گئے اور بالآخر اس میں ضم ہو گئے۔ اسی طرح یہود مدینہ کے مفتوحہ علاقے بھی اسلامی ریاست کے حصے بن گئے۔ چونکہ یہ مرکز اسلامی سے

قریب تھے۔ لہٰذا ان کے انتظام و انصرام کا کوئی مسئلہ نہیں تھا وہ از خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرکزی انتظامیہ کے ماتحت آ گئے۔ مگر جب مرکز سے دور کچھ علاقے فتح ہوئے یا انہوں نے اپنی مرضی سے اسلامی ریاست کا حصہ بننا پسند کیا، تو ان کے انتظام و انصرام کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اسی دوران ریاست اسلامی کی قبائل عرب کے بارے میں پالیسی میں تبدیلی ہوئی اور اب باہمی تعاون اور حلف کے معاہدوں کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔ کیونکہ وہ ایک طرح سے سیاسی افتراق و انتظامی انتشار کو دعوت دینے کے مترادف تھا، جبکہ اسلام کا مقصود مذہبی اتحاد کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی اتحاد بھی تھا۔ اسی پالیسی کے تحت مختلف علاقوں یا ولایتوں کے لئے مرکزی منتظم، والی یا گورنر مقرر کئے گئے۔ تاکہ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں کو مرکز حکومت سے وابستہ کیا جائے۔

۱۔ والی / ولاۃ گورنر

عام خیال ہے کہ عہد نبوی میں اسلامی ریاست کو صوبوں یا انتظامی اکائیوں میں تقسیم کیا نہیں گیا تھا۔ مگر یہ خیال غلط ہے۔ مآخذ سے عام طور سے اور طبری کے بیان[196] سے خاص طور سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسلامی ریاست کو مختلف اور باقاعدہ ولایات میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اور یمن بلکہ جنوبی عرب کے بارے میں تو یہ حتمی طور پر بیان ملتا ہے۔ کہ وہ مختلف ولایات میں نہ صرف تقسیم کیا گیا تھا، بلکہ ان کی باقاعدہ سرحدیں یا حدود (حیز) تھے۔ ممکن ہے کہ باقاعدہ جغرافیائی تقسیم اتنی پختہ اور حتمی نہ ہو۔ جیسے کہ موجودہ زمانے میں ہوتی ہے۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ ہر والی کو اپنے علاقہ اور ولایت کے حدود کا بخوبی علم تھا۔ بہرحال اندازہ یہ ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں اسلامی ریاست ۲۷ ولایتوں میں تقسیم کی گئی تھی۔ اور ان میں سے ہر ایک پر ایک والی مقرر کیا گیا تھا۔ جو اپنے علاقہ کے نظم و نسق میں خود مختار ہوتا تھا۔

غالباً وادی القریٰ[197] پہلا علاقہ تھا جو کسی والی کی ماتحتی میں دیا گیا تھا۔ یہ والی بعض تاریخی قرائن کے مطابق ۷ھ/ ۶۲۸ء میں کسی وقت مقرر کیا تھا اور ان کا نام حضرت عمرو بن سعید اموی تھا جو بنو امیہ کے سعیدی خاندان کے ایک معزز فرد ہونے کے علاوہ قدیم مسلم تھے[198]۔ ان کا مرکز حکومت یا صدر مقام وادی ہی میں تھا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ایک خاصے وسیع اور بڑے خطے کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور اس عہدہ عظیم پر وفات نبوی کے وقت تک فائز رہے تھے[199]۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ خاصے طویل عرصے یعنی ساڑھے تین چار سال تک گورنر رہے تھے۔ یہ عہد نبوی کی حکومت میں مرکزیت اور طبقۂ افسران و عمال کے استقلال کی واضح علامت اور بین شہادت تھی۔ حضرت عمرو اموی کے بھائی حضرت عبد اللہ د حکم ابن سعید اموی کو محمد بن حبیب بغدادی[200] کے بقول "قریٰ عربیہ[201]" کا والی غالباً اسی زمانے میں مقرر کیا گیا تھا[202]۔ ایک اور گورنر جن کی تقرری اس زمانے میں ہوئی تھی۔ حضرت یزید بن ابی سفیان اموی تھے۔ جن کو تیماء کی ولایت سونپی گئی تھی[203]۔ یہاں اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تین گورنروں کا تعلق بنو امیہ کے دو اہم ترین خاندانوں سے تھا۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ بنو امیہ لیاقت و صلاحیت کے اعتبار سے ممتاز و فائق تھے۔ اسی زمانے میں غالباً چوتھے گورنر کی اسی علاقے میں تقرری

ہوئی تھی جن کا نام سواد بن غزیہ تھا اور جو بنو نجار / خزرج کے ایک اہم فرد تھے۔ ان کو خیبر کے علاقے کی گورنری تفویض ہوئی تھی[204]

یہ محض اتفاق تھا یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوچی سمجھی پالیسی تھی کہ اسلامی ریاست کی مرکزی حکومت کے دائرے کو سب سے پہلے مرکز اسلام کے شمال میں وسعت دی گئی تھی اور بعض اہم شمالی علاقوں کو مرکزی حکومت کے ماتحت اور اقتدار کے تحت لایا گیا تھا[205]۔ تمام تاریخی شواہد دوسرے متبادل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ شمالی علاقے سیاسی اور فوجی لحاظ سے بہت اہم تھے۔ جزیرہ نمائے عرب کی شمالی سرحدوں پر وقت کی دو عظیم طاقتوں کی باجگذار اور ماتحت حکومتیں / سلطنتیں موجود تھیں اور ان کے پرے ان کے سیاسی و فوجی آقا اپنی پوری طاقت کے ساتھ موجود تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت ان خطرات کی طرف سے آنکھیں نہیں موند سکتی تھی جو ان طاقت ور حکومتوں کی موجودگی سے اس کو لاحق تھے چنانچہ آپ نے شمالی علاقے میں اپنی طاقت کو شروع سے مستحکم اور پائیدار کرنا شروع کیا تھا۔ اور اپنی سیاسی بالادستی کو ہر طرح سے قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ شمال کے غیر مسلم قبائل سے خراج اور جزیہ کی وصولیابی جو اسلامی تاریخ میں اس کی پہلی مثالیں تھیں۔ اسی سیاسی بالادستی کی ایک علامت اور ان شمالی علاقوں کی محکومیت اور زیردستی کی شہادت تھی۔ اور ان علاقوں پر مرکزی والیوں کی تقرری مرکز کے مکمل اقتدار و انتظام کی ایک مزید علامت۔ صحیح تاریخی اور واقعاتی تناظر میں دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ سے قبل اس اہم ترین شمالی علاقے میں چار والیوں کی مستقل تقرری دراصل سیاسی اور انتظامی مرکزیت کی تمہید تھی۔ جس کے نتیجہ میں پورا عرب ایک مرکز کے تحت مجتمع ہونے والا تھا[206]۔

فتح مکہ کے بعد کا متصل زمانہ جزیرہ نمائے عرب کے تمام علاقوں اور خطوں کے ایک انتظامی مرکز سے وابستہ ہونے کا زمانہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی ریاست اور حکومت کی مرکزیت و اجتماعیت اب پورے عرب پر محیط ہو گئی تھی۔ مدینہ میں مقیم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سیاسی اور انتظامی اقتدار و اختیار عرب کے ہر قبیلہ، خطہ بلکہ ہر فرد کے لئے ناگزیر تھا اور اس بالادستی کو تسلیم کرنے کی علامت محض بعض صدقات اور محاصل کی ادائیگی ہی نہیں تھی بلکہ ہر قبیلہ اور خطہ کے درمیان والیٔ رسول کی موجودگی و حکمرانی بھی تھی۔ یہاں تک عرب کا سب سے اہم اور طاقت ور شہر مکہ بھی اسلامی ریاست کا ایک ماتحت علاقہ / ولایت بن گیا تھا جو سیاسی اور انتظامی اعتبار سے مدینہ کا ماتحت و محکوم تھا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت ہبیرہ بن شبل ثقفی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ حنین کے لئے روانہ ہونے سے قبل مکہ کا گورنر / والی مقرر کیا تھا[207]۔ مگر جلد ہی کہ ان کو تبدیل کر دیا گیا اور ان کی جگہ مکہ ہی کے ایک باشندے اور قریشی خانوادے بنو امیہ کے ایک نمایاں فرد حضرت عتاب بن اسید اموی کو جو صرف ۲۰ سال کے نوجوان تھے اور فتح مکہ کے بعد ہی اسلام لائے تھے مکہ اور اس کے ماتحت علاقوں کا گورنر / والی مقرر کر دیا گیا تھا[208]۔ نوجوانی کی ناتجربہ کاری اور تاخیر سے اسلام قبول کرنے کی مفضولیت کے ساتھ ساتھ حضرت عتاب بن اسید کی تقرری کی اہمیت اس حقیقت کے پس منظر میں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کو اس منصب جلیل کے لئے کثیر تعداد میں موجود اشراف مکہ اور اکابر قریش پر ترجیح دی گئی تھی[209]۔ یہ حقیقت ان کی انتظامی صلاحیت و حسن تدبیر کی شہادت فراہم کرتی ہے۔ بہر حال معلوم یہ ہوتا ہے کہ ان کی تقرری شوال ۸ھ / فروری ۶۳۰ء میں کسی وقت عمل میں آئی تھی۔ اور وہ پورے عہد نبوی میں اپنے اس عہدہ پر برقرار رہے تھے۔ بلکہ خلافت صدیقی میں بھی اس عہدہ کو انہوں نے سرفراز کیا تھا[210]۔ گویا کہ وہ کل ملا کر پانچ چھ برس اس منصب پر فائز رہے تھے: تقریباً تین برس عہد نبوی میں اور اتنی ہی مدت تک خلافت صدیقی میں۔ کیا یہ عہد نبوی کے انتظامیہ میں مرکزیت اور استقلال

کے پیدا ہونے کی ایک واقعاتی شہادت نہیں ہے، حضرت عتاب بن اسید ہی کے معاملہ میں ہم کو مزید شہادت اس امر کی ملتی ہے کہ گورنروں / والیوں کو ان کی خدمات کے لئے باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔ مآخذ کے مطابق حضرت عتاب کو چالیس اوقیہ چاندی ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ اور غالباً وہ ان کو ان کی تقرری کے آخری دن تک ملتی رہی تھی[۲۱۱]

دوسرے برس طائف از خود مدینہ کی سیاسی بالادستی اور انتظامی اقتدار کی چھتر چھایا تلے آگیا اور اس کو بھی نتیجتاً ایک گورنر والی کی ماتحتی میں دے دیا گیا۔ طائف کے گورنر حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی اٹھارہ برس کے نوجوان تھے اور مآخذ کے مطابق وہ اس وفد کے اراکین میں سے ایک تھے۔ جس نے مدینہ پہنچ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دی تھی اور طائف کے قبول اسلام و تسلیم اقتدار مدینہ کا اعتراف و معاہدہ کیا تھا۔ حضرت عثمان ثقفی حضرت عتاب اموی گورنر مکہ سے بھی زیادہ مدت تک اپنے عہدے پر برقرار رہے تھے۔ مآخذ کے مطابق وہ حضرت عمر فاروق کی خلافت کے ابتدائی زمانے تک۔ وہاں کے گورنر رہے تھے[۲۱۲] ابن اسحاق کا ایک تبصرہ ان کی اس عہدہ عظیم پر تقرری کے سبب و اساس کو ظاہر کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن ابی العاص کو ان پر ان کی نوعمری کے باوجود اس لئے مقرر کیا تھا کہ وہ اسلام اور قرآن سیکھنے کے معاملے میں سب سے زیادہ پرجوش تھے[۲۱۳] اس تبصرہ سے ان کی مذہبی معلومات کا علم ہوتا ہے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہی ان کی تقرری کی اصل یا واحد بنیاد تھی۔ یہ ان کی تقرری کی مزید بنیاد یا استحقاق تھا۔ ورنہ اصل سبب انتظامی اور تنظیمی لیاقت تھی۔ اس کی ایک شہادت تو ان کی وفد ثقیف میں شمولیت تھی اور دوسری شہادت اتنی مدت تک اس اہم عہدہ پر ان کا فائز رہنا تھا۔ اس کے علاوہ اسلام اور قرآن میں تفقہ کا مطلب محض مذہبی معلومات نہیں تھیں بلکہ اسلامی قوانین سے واقفیت بھی تھی۔

ایک اور گورنر حضرت خدیفہ بن یمان ازدی تھے۔ جن کو طائف کے قریب واقع دبا نامی ولایت سونپی گئی تھی اور انہوں نے حیات نبوی کے اواخر تک اس کے انتظام و انصرام کو سنبھالا تھا[۲۱۴] اسی زمانے میں ایک اور گورنر کی تقرری جدہ کے لئے ہوئی تھی۔ اسد الغابہ کے مطابق حضرت حارث بن نوفل ہاشمی کو غالباً ۹ھ کے آغاز اور ۶۳۰ء کے وسط میں اس منصب پر مقرر کیا گیا تھا[۲۱۵] ان کی تقرری کے سلسلہ میں دو تین نکات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے اول یہ کہ وہ واحد ہاشمی تھے جن کو یہ منصب عظیم عطا کیا گیا تھا۔ دوم یہ کہ وہ مدتوں تک اسلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن رہے تھے۔ سوم یہ کہ انہوں نے کافی تاخیر سے اسلام قبول کیا تھا۔ اور چہارم یہ کہ وہ حیات نبوی کے آخر تک اس عہدہ پر برقرار رہے تھے اور خلافت راشدہ میں بھی اس عہدہ پر اسلامی ریاست کی خدمت کی تھی[۲۱۶]

فتح مکہ کے بعد اسلامی ریاست کی قبائل عرب کے بارے میں پالیسی بدلی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ جنوب، مشرق اور جنوب مشرق میں اسلام اور اسلامی ریاست کے اقتدار کے داخلہ کا دروازہ بھی کھل گیا تھا چنانچہ وہ تمام علاقے جو طاقت کے ذریعہ فتح کئے گئے ہوں (عنوۃً) یا صلح کے ذریعہ (صلحاً) اسلامی اقتدار کی ماتحتی میں آئے ہوں یکے بعد دیگرے گورنروں اور والیوں کی ماتحتی میں دیدیئے گئے تھے۔ ان علاقوں میں ایک طرح سے دہرا انتظام حکومت قائم کیا گیا تھا۔ جن مملکتوں اور خطوں کے حکمرانوں اور بادشاہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کو ان کے مقام پر برقرار رکھا گیا تھا مگر

اب ان کی حیثیت آزاد و خود مختار حکمرانوں کی بجائے ماتحت گورنروں کی تھی جن کو مدینہ کی مرکزی حکومت کا اقتدار تسلیم اور اس کی ہدایات و احکام کی تعمیل کرنا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ان علاقوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادہ نمائندوں کو بھی نگرانی یا مرکزی حکومت کے مفادات کے تحفظ کی خاطر تعینات کیا گیا تھا اور جن کی اطاعت دراصل مرکزی حکومت یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری سمجھی جاتی تھی۔

اس پورے خطے میں سب سے پہلے مشرقی خطوں کے علاقوں میں گورنر یا والی مقرر کئے گئے تھے اور ان کی یہ تقرری فتح مکہ کے معاً بعد ہوئی تھی۔ حضرت عمرو بن عاص سہمی کو مملکت عمان پر مرکزی منتظم کی حیثیت سے مقرر کیا گیا تھا۔ جہاں کے مقامی حکمران حضرات عبد و جیفر فرزندان جلندی نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اسلامی ریاست کے وفادار بن گئے تھے[۲۱۸] اسی طرح بحرین کے بادشاہ حضرت منذر بن ساوی نے اسلام قبول کر کے اپنی مملکت کو اسلامی ریاست میں ضم کر دیا تھا اور ان کے علاقے کے لئے حضرت علاء بن حضرمی کو مرکزی منتظم بنایا گیا تھا۔ لیکن محمد بن حبیب بغدادی کا خیال ہے کہ مملکت بحرین کیلئے دو گورنروں یا مرکزی منتظموں کی تقرری ہوئی تھی۔ حضرت علاء بن حضرمی کو قطیف کا علاقہ تفویض کیا گیا جبکہ حضرت ابان بن سعید اموی کو جو بنو امیہ کے خاندان سعیدی کے ایک ممتاز فرد اور متاخر مسلم تھے۔ الخط کے علاقے پر مقرر کیا گیا تھا[۲۱۹] بلاذری نے اس سلسلے میں بالکل دوسری بات کہی ہے وہ اس روایت کو بیان ضرور کرتے ہیں۔ مگر اس کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اصل معاملہ یہ تھا کہ حضرت علاء بن حضرمی کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت ابان بن سعید اموی کو بحرین کا گورنر یا منتظم مقرر کیا گیا تھا[۲۱۹]۔ حضرت علاء بن حضرمی کی تقرری اور معزولی کے بارے میں خاصا اختلاف و تناقض ہے جو کسی حتمی فیصلے اور قطعی رائے پر پہنچنے میں حارج ہے۔ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ مملکت بحرین کے دو مختلف حصوں کیلئے دو مختلف مرکزی منتظم مقرر کئے گئے تھے۔ کیوں کہ تمام اختلاف و تناقض کے باوجود حضرت علاء بن حضرمی کی مسلسل و متواتر موجودگی اس علاقے میں ملتی ہے۔

مدینہ منورہ کے شمال قریب کی چار ولایتوں کے علاوہ شمال بعید میں وادی القریٰ اور شمالی حدود شام کے درمیان خاصا بڑا خطہ تھا جہاں متعدد عرب، عیسائی اور یہودی بستیاں، قبیلے اور مملکتیں تھیں۔ ان کے حکمران سروات (اشراف) کہلاتے تھے۔ فتح مکہ اور غزوہ تبوک کے زمانے میں ان سروات نے اسلامی ریاست کے صلح کے معاہدوں یا مہمات نبوی کے نتیجہ میں تسلیم کر لیا تھا۔ ان میں کندہ کی مملکت دومۃ الجندل بھی شامل تھی۔ جس کا حکمران ملک (بادشاہ) کہلاتا تھا۔ اور جس نے اسلامی ریاست کو جزیہ ادا کرنا منظور کیا تھا۔ ان تمام طاقت کے علاقوں یا خطوں میں مرکزی منتظمین یا گورنر مقرر کئے گئے تھے اگرچہ ان منتظمین کے نام واضح طور سے مآخذ میں نہیں ملتے ہیں تاہم ان علاقوں سے کئے گئے معاہدات نبوی میں خاص کر صلح ناموں میں ان کے حوالے بکثرت ملتے ہیں۔ ان مرکزی منتظمین میں عاملین صدقات و جزیہ ٹیکس و محاصل کے افسروں کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے[۲۲۰]

بہرحال مملکت ایلہ کے ضمن میں اسلامی مرکزی منتظمین کے نام بھی بصراحت ملتے ہیں۔ جس سے اس علاقہ کی انتظامی مشنری کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ابن سعد وغیرہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایلہ کے مختلف علاقوں پر کم از کم

پانچ مرکزی منتظمین مقرر کیے گئے تھے۔ ان کے نام تھے: حضرات شرحبیل بن حسنہ کندی[۲۲۱]، ابی بن کعب خزرجی[۲۲۲]، حرملہ حریث بن زید طائی[۲۲۳]، [۲۲۴] اور جہم بن صلت[۲۲۵]۔ غالباً ان سب کی تقرری ۹ھ کے آغاز یا اواخر میں ہوئی تھی۔ ایلہ اور دوسرے علاقوں کے سرداران کے نام ایک فرمانِ نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ آپ کے فرستادوں (رسل) کی مکمل اطاعت کریں[۲۲۶]۔ اگرچہ دوسرے علاقوں جیسے جرباء، مقنا، اذرح، دومہ وغیرہ کے لیے مرکزی منتظمین یا عاملین صدقات کا صریح ذکر نہیں ملتا ہے تاہم یہ یقینی ہے کہ ان علاقوں کے لیے بھی کچھ منتظمین ضرور مقرر کیے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی کو اس پورے شمالی خطے کا گورنر جنرل یا منتظم اعلیٰ مقرر کیا گیا تھا اور ان کا صدر مقام ایلہ کو بنایا گیا تھا۔ بقیہ مرکزی منتظمین ان کے ماتحت اور تابع تھے۔ غالباً یہ انتظام مدینہ سے طویل مسافت کے سبب کیا گیا تھا تاکہ اس دور دراز کے علاقے میں انتظامی وحدت اور سیاسی مرکزیت پیدا کی جا سکے۔

یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ سب سے زیادہ تعداد میں مرکزی منتظمین اور گورنر جنوبی عرب کے مختلف خطوں میں بھیجے گئے تھے اس کے بہت ہی ظاہری اور نمایاں اسباب تھے۔ اوّل یہ کہ جغرافیائی لحاظ سے یہ بہت بڑا رقبہ تھا۔ جس پر ایک فرد کا حکومتی اداروں کی نگرانی کرنا ناممکن تھا۔ دوم یہ کہ سیاسی لحاظ سے یہ پورا علاقہ متعدد متمدن اور منظم حکومتوں کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ سوم یہ کہ تہذیب و تمدن کے بلند معیار کے سبب یہاں کا سیاسی نظام خاصا پیچیدہ تھا اور چہارم یہ کہ مدینہ سے طویل مسافت کے سبب ہر علاقہ پر زیادہ قریبی نگرانی کی ضرورت تھی اور پنجم یہ کہ پورا علاقہ اسلام سے کافی دیر میں روشناس ہوا تھا اس لئے اس علاقے میں ابھی تبلیغ اسلام اور اس سے زیادہ تعلیم اسلام کی زیادہ ضرورت تھی۔

اس علاقہ میں پہلا خطہ جو اسلامی ریاست کی انتظامی ماتحتی میں آیا وہ نجران تھا۔ جہاں کے عیسائی طبقات نے نہ صرف از خود مدینہ پہنچ کر جزیہ ادا کرنے پر صلح کر لی تھی[۲۲۷]، بلکہ ایک عامل اور منتظم کو اپنے علاقہ میں مقرر کرنے کی بھی درخواست کی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خواہش پر حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہری کو ان کے وفد کے ساتھ ۹ھ میں ان کے علاقہ کا منتظم و عامل بنا کر بھیجا تھا[۲۲۸]۔ ماخذ کے مختلف بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابی موصوف کو نجران کا محض عامل یا مذہبی مبلغ و منتظم بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا۔ بلکہ ان کو مکمل انتظامی اختیارات بھی حاصل تھے۔ روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ جائیں اور ان کے اختلافی معاملات میں ایمانداری سے فیصلے کیا کریں[۲۲۹]۔ ابن اسحاق ان کی تقرری کو ایک "عہدہ" قرار دیتے ہیں جبکہ ابن خلدون اس عہدہ دار کو "والی" بتاتے ہیں[۲۳۰]۔ اس کے علاوہ ابن سعد کا یہ بیان بڑا اہم اور دلچسپ ہے کہ حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہری کی ایک اپنی مہر تھی جس کو وہ کاغذات پر لگایا کرتے تھے۔ اس مہر پر نقش تھا یہ کہ "الخمس للہ" خمس یعنی ۱/۵ اللہ کے لئے ہے۔ یہ گویا ان کی ولایت کی ایک قطعی دلیل تھی۔

۹ھ / ۶۳۱ء[۲۳۱] میں جب حضرت خالد بن ولید مخزومی نے نجران کے علاقے میں بنو الحارث بن کعب کے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کر کے ابتدائی کام کر لیا تھا تو ذی قعدہ ۱۰ھ / فروری ۶۳۲ء[۲۳۲] میں خزرج کے خاندان بنو نجار کے ایک نوجوان صحابی حضرت عمرو بن حزم کو اس علاقہ کا گورنر مقرر کیا گیا[۲۳۳]۔ اس بات کے پختہ قرائن ہیں کہ انہوں نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہری کی جگہ لی تھی، جو

سبکدوش ہوکر واپس مدینہ چلے گئے تھے۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ ماہ بعد جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت ناک کا واقعہ پیش آیا تھا تو حضرت ابوعبیدہ مدینہ میں موجود تھے۔ جبکہ حضرت عمرو بن حزم نجران میں اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے تھے

مآخذ میں دراصل نجران اور جرش کی ولایات پر تقرریوں کے بارے میں متنازع فیہ اور مختلف روایات ہیں جو ان علاقوں کے انتظامی تبدیلیوں یا تقرریوں ہی کے بارے میں کسی صحیح یا قطعی نتیجہ پر پہنچنے میں رکاوٹ ڈالتی ہیں لیکن اس اختلاف و تصادم کے باوجود جو صورت حال ابھرتی معلوم ہوتی ہے وہ نجران کے سلسلہ میں اوپر پیش کی گئی۔ جہاں تک جرش کا تعلق ہے تو فتوح البلدان کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابوسفیان بن حرب اموی کو نجران کی ولایت میں حضرت عمرو بن حزم کی جانشینی میں مقرر کیا گیا تھا۔[233] مگر یہ روایت واضح طور سے غلط ہے کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نجران کے دو والی عہد نبوی میں یکے بعد دیگرے حضرت ابوعبیدہ فہری اور حضرت عمرو بن حزم رہے تھے۔ اور مؤخر الذکر نے وفات نبوی تک اپنے فرائض وہاں انجام دیئے تھے۔ ایک اور روایت سے وضاحت ہوتی ہے کہ خود بلاذری کا پختہ خیال یہ تھا کہ حضرت ابوسفیان اموی کی تقرری جرش کے علاقے پر ہوئی تھی[234] عہد نبوی کے اواخر یا خلافت صدیقی کے اوائل میں جب حضرت ابوسفیان اموی نے سبکدوشی حاصل کی تو ان کی جگہ پر بنو امیہ کے ایک حلیف حضرت سعید بن قشیب ازدی کو جرش کی ولایت سونپی گئی تھی۔[235] مؤخر الذکر صحابی کے بارے میں ہماری معلومات کافی ناقص ہیں۔ لیکن یہ روایت صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ تو قیتی ترتیب کے عین مطابق ہے۔

یمن کے ایرانی گورنر حضرت باذان یا باذام کے قبول اسلام اور اس کے نتیجے میں ان کی اور ان کے ہموطن الابناء کی سیاسی وفاداری نے جزیرہ نمائے عرب کی جغرافیائی سیاسیات میں ایک تاریخ ساز سنگ میل قائم کیا تھا۔ ہمارے مآخذ عموماً ان کے قبول اسلام کے زمانے کے مسئلہ پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتے ہیں[236] لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ۹ھ/۶۳۰ء میں کسی وقت غالباً اس کے آغاز میں اسلام قبول کر لیا تھا کیونکہ ایرانی روایات کے مطابق شہنشاہ ایران خسرو پرویز ۶۲۸ء میں اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا اور اس کے بعد ایرانی سلطنت ابتری اور افراتفری کا شکار ہو گئی تھی۔ صوبائی گورنر یا تو خود مختار ہو گئے تھے یا انہوں نے اپنی سیاسی وفاداریوں کا رخ بدل دیا تھا۔ حضرت باذان کو اسلامی ریاست کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور طاقت کا بخوبی احساس و ادراک تھا چنانچہ انہوں نے اپنی قسمت مدینہ سے وابستہ کر لی اور اس میں وہ پوری طرح سے مخلص تھے[237] بہر حال اس خوش آئند اور تاریخی موڑ کے سبب یمن کا صوبہ جو وقت کی تمام بڑی طاقتوں کے سیاسی کھیل کا اکھاڑہ بن کر رہ گیا تھا اسلامی ریاست کا ایک اٹوٹ حصہ بن گیا۔ جب تک حضرت باذان زندہ رہے وہ بلا شرکت غیرے اس کے گورنر رہے[238]۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند حضرت شہر بن باذان نے عارضی طور سے اقتدار سنبھال لیا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے حالات مدینہ لکھ بھیجے آپ نے ان کی وفاداری اور خلوص کی توصیف و تحسین کی اور متبادل انتظامات ہونے تک ان سے کام کرتے رہنے کو کہا[239] اس کے بعد ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے جنوبی عرب یعنی یمن، عدن اور حضر موت کے پورے علاقے کے لئے مرکزی منتظم روانہ کئے[240] جن کے سربراہ، منتظم اعلیٰ اور گورنر جنرل حضرت معاذ بن جبل خزرجی تھے۔

حضرت معاذ بن جبل کے مقام اور مرتبے کو جدید مؤرخوں نے عام طور سے غلط سمجھا ہے[241]۔ جنوبی عرب کے انتظامیہ میں انکو

ایک مذہبی مبلغ و معلم یا زیادہ سے زیادہ عامل صدقات کا درجہ دیا جاتا ہے۔ دراصل ان کے بارے میں متعدد روایات مآخذ میں ملتی ہیں جن میں سے ہر ایک میں ان کے کسی ایک پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے اور مورخین نے ان کو الگ الگ سمجھ کر ان کے بارے میں رائے قائم کی ہے حالانکہ اگر تمام روایات کو جمع کر کے تجزیہ و تحلیل کی جاتی تو ان کے صحیح مقام کا عرفان کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ بہرحال تمام روایات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کی حیثیت منتظم اعلیٰ اور گورنر جنرل کی تھی اور ان کے اختیارات واقتدار اس علاقہ کے تمام والیوں، عاملین صدقات اور مقامی منتظمین پر قائم و حاوی تھا۔ ابن اسحاق نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نامۂ مبارک کا متن نقل کیا ہے۔ جس میں آپ نے حضرت زرعہ ذی یزن (علاقہ یزن کے حکمران) کو ہدایت کی تھی کہ وہ فرستادگان رسول کی نہ صرف اطاعت و فرمانبرداری کریں بلکہ اپنے علاقے کے تمام صدقات اور جزیہ کی رقوم کو جمع کر کے ان کے حوالے کریں۔ اس نامۂ گرامی کا اس ضمن میں سب سے اہم فقرہ یہ تھا کہ ان فرستادگان رسل کے سردار و قائد حضرت معاذ بن جبل ہیں"۔[۲۴۲] بلاذری کی روایت ہے کہ ان کو الجند پر گورنر (والی) مقرر کیا گیا تھا۔ اور ان کو یمن میں قضا (تمام مقدمات کے فیصلے کا اختیار) اور تمام صدقات وصول کرنے کا مجاز قرار دیا گیا تھا[۲۴۳] بلاذری نے اپنی دوسری تصنیف میں حضرت معاذ بن جبل کے اختیارات و فرائض کی تفصیل و تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ یمن کے تمام لوگوں کو اسلامی اصولوں، قوانین اور قرآن کریم کی تعلیم دینے کے علاوہ عدل و انصاف کرنے اور تمام صدقات وصول کرنے کا حکم دیا گیا تھا[۲۴۴]۔ اسی طرح دوسرے مآخذ جیسے ابن ہشام[۲۴۵] یا ابن سعد[۲۴۶]، بخاری[۲۴۷] اور ابن اثیر[۲۴۸] اور ابن خلدون[۲۴۹] کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کو تمام والیان جنوبی عرب پر ایک امتیازی تفوق و برتری حاصل تھی اور وہ پورے علاقے کے منتظم اعلیٰ تھے۔ طبری کی ایک روایت سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے جو حضرت معاذ کو معلم قرار دیتی ہے[۲۵۰]۔ معلم کے ایک عام معنی استاد کے ہیں لیکن لغوی اعتبار سے یہاں اس کے دوسرے معنی آقا اور مالک کے مراد ہیں[۲۵۱]۔ اس روایت کے مطابق حضرت معاذ کا صدر مقام الجند تھا۔ مگر وہ مستقل طور سے یمن اور حضرموت کے ہر عامل یا گورنر کے علاقے (عمالہ) میں دورہ کرتے رہتے تھے۔ اور ان کے کاموں کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ جنوبی عرب میں ردہ تحریک کے خاتمے کے بعد جب تمام ولاۃ یمن و حضرموت ایک جگہ جمع ہوئے تو انہوں نے صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد حضرت معاذ بن جبل ہی کو اپنا سربراہ تسلیم کیا تھا[۲۵۲]۔ اس سے بڑھ کر ان کے مقام و مرتبے کی اور کیا شہادت ہو سکتی ہے۔

حضرت معاذ بن جبل کے جنوبی عرب کے انتظامیہ میں مقام و مرتبے کی مانند ان کی تاریخ تقرری بھی کافی مختلف فیہ ہے۔ ابن سعد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ربیع الثانی سنہ ۹ھ (جولائی۔ اگست سنہ ۶۳۰ء) میں جنوبی عرب کیلئے روانہ ہوئے تھے[۲۵۳]، جبکہ دوسرے مآخذ سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کی تقرری کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کے بعد کا واقعہ سمجھتے ہیں[۲۵۴]۔ لیکن متعدد وجوہ سے ابن سعد کی تاریخ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اسود عنسی کی بغاوت کے بارے میں طبری کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سنہ ۱۰ھ کے وسط یا اوائل میں پیش آئی تھی جب اس نے حضرت شہر بن باذان کو قتل کر کے صنعا کی حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس سلسلہ میں دو اہم نکات پر توجہ رکھنا ضروری ہے۔ اول یہ کہ تمام مآخذ حضرت شہر کو صنعا کا گورنر قرار دیتے ہیں۔ صحابی موصوف کی یہ تقرری مدینہ سے مرکزی منتظمین کے آنے کے بعد ہوئی تھی جبکہ وہ ان کی آمد

سے قبل پورے یمن کے عارضی گورنر تھے۔ دوم یہ کہ ماخذ کا واضح بیان ہے کہ اسود عنسی کی بغاوت کے زمانے میں تمام مرکزی منتظمین اپنے اپنے علاقوں میں پہنچ کر اپنے فرائض منصبی سنبھال چکے تھے[۲۵۵] اور پھر جب اس بغاوت کے نتیجہ میں افراتفری اور سیاسی انارکی پھیلی تو وہ سب نجران کے علاقے میں جمع ہو گئے تھے اور بالآخر بغاوت کے استیصال کے بعد حضرت معاذ بن جبل کی امارت اعلیٰ پر اتفاق کیا تھا۔ اور اپنے اپنے علاقوں کے لئے پھر روانہ ہو گئے تھے۔ ان شہادتوں سے یہ حتمی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل اور ان کے ماتحت گورنروں / والیوں اور طبقہ افسران کی تقرری ۹ھ کے آغاز میں یا وسط میں ہوئی تھی اور وہ اسی برس کے اواخر سے پہلے یمن پہنچ کر اپنے فرائض انجام دے رہے تھے[۲۵۶]

حضرت معاذ بن جبل خزرجی کے ماتحت گورنروں کی کل تعداد دس معلوم ہوتی ہے۔ جن کو طبری کے مطابق[۲۵۷] مخصوص علاقوں میں جن کی حدود معلوم و متعین تھیں اور جن کے صدر مقامات کی بھی نشاندہی کر دی گئی تھی تعینات کیا گیا تھا ان گورنروں اور ان کے علاقوں کی تفصیل ذیل میں دی جا رہی ہے۔

۱۔ حضرت شہر بن باذان	صنعاء اور اس کے ماتحت علاقے۔
۲۔ حضرت عامر بن شہر ہمدانی[۲۵۸]	علاقہ ہمدان
۳۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری	مارب کا علاقہ یا رمع، زبید، عدن اور سواحل کے علاقے[۲۵۹]
۴۔ حضرت خالد بن سعید اموی	نجران رمع اور زبید کے درمیانی علاقے[۲۶۰]
۵۔ حضرت طاہر بن ابی ہالہ	عک و اشعر کے علاقے۔[۲۶۱]
۶۔ حضرت یعلیٰ بن امیہ	الجند کا علاقہ[۲۶۲]
۷۔ حضرت عمرو بن حزم خزرجی	نجران
۸۔ حضرت زیاد بن لبید	حضر موت[۲۶۳]
۹۔ حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومی	بنو معاویہ / کندہ کا علاقہ[۲۶۴]
۱۰۔ حضرت عکاشہ بن ثور غوثی	سکاسک اور سکون کے علاقے[۲۶۵]

ان ماتحت گورنروں میں سے حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کے بارے میں روایت ہے کہ وہ اپنی تقرری کے بعد بیمار ہو گئے تھے۔ اس لئے ان کی روانگی میں تاخیر ہوئی تھی اور ان کی غیر حاضری میں ان کے فرائض کی انجام دہی حضرت زیاد بن لبید خزرجی کرتے تھے۔ ان کو غالباً اس لئے ان کے فرائض سونپے گئے تھے کہ ان کا علاقہ غیر حاضر گورنر کے علاقے سے متصل تھا۔ بہر حال ان میں سے تین مؤخر الذکر گورنر حضر موت کے مختلف علاقوں یا ولایات کے حکمران تھے۔ جبکہ بقیہ سات یمن کے مختلف علاقوں پر مقرر کئے گئے تھے[۲۶۶]

ان تمام ماتحت گورنروں کے علاوہ جو اپنے اپنے علاقہ کے خود مختار و آزاد حکمران تھے۔ متعدد مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل کے ساتھ متعدد افسر اور مددگار کارکن بھی بھیجے گئے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی عرب کے انتظامیہ

میں ایک طبقہ افسران یا سکریٹریٹ بھی قائم کی گئی تھی جو مختلف انتظامی امور کے نفاذ کا کام دیکھتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی شہادت حضرت زرعہ والی یزن کے نام مذکورہ بالا نامہ نبوی سے ہوتی ہے۔ جس کے مطابق حضرت معاذ بن جبل کے ساتھ متعدد افسر و کارکن (عمال) بھیجے گئے تھے۔ ابن اسحاق، طبری اور دوسرے مآخذ سے ان میں سے صرف چار افسروں کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔ یہ تھے: حضرات عبداللہ بن زید، مالک بن عبادہ، عقبہ بن نمر، اور مالک بن مرّہ۔ ان کے علاوہ بھی متعدد تھے جن کو مذکورہ بالا چاروں اصحاب کے ساتھی کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔[۲۶۷] مزید تصدیق اسد الغابہ کی ایک روایت سے ہوتی ہے۔ جس کے مطابق حضرت عبید بن صخر بن لوذان انصاری بھی حضرت معاذ بن جبل خزرجی کے "اصحاب" میں سے ایک تھے[۲۶۸] ان شہادتوں کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہو گا کہ یمن و حضرموت کے تمام گورنروں کی ماتحتی میں مرکزی کارکنوں کا ایک طبقہ بھی کام کرتا تھا جو ان کے کاموں میں ان کی مدد کرتا اور صوبائی انتظام و انصرام کو چلانے میں تعاون دیتا تھا۔ اس ضمن میں اسد الغابہ کی ایک اور روایت کا حوالہ پھر دینا مناسب ہو گا۔ جس کے مطابق حضرت عبداللہ بن ابی ربیعہ مخزومی کو یمن اور اس کے ماتحت علاقوں کی صوبائی فوج کا امیر مقرر کیا گیا تھا[۲۶۹] اس سے یہ تصدیق ہوتی ہے کہ گورنروں / والیوں کے لئے کچھ فوجی افسر بھی مقرر کئے گئے تھے۔ اس بات کے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی کہ اس وسیع خطہ سے صدقات کی وصولی کے لئے بھی بہت سے افسر مقرر کئے گئے تھے۔ مؤخر الذکر کے بارے میں ہم اگلے باب میں تفصیل سے پڑھیں گے۔

مرکزی منتظمین اور والیوں کے سلسلے میں ایک اہم نکتہ ان کی مدت عہدہ کا تھا۔ مختلف گورنروں / والیوں کے سلسلہ میں ان کی مدتِ ملازمت و عہدہ کا ذکر بھی آچکا ہے۔ یہاں اس سلسلے میں چند اہم نکات پر توجہ دلانا مقصود ہے۔ اوّل یہ کہ تمام گورنر مستقل عہدے دار تھے۔ جو کافی مدت کے لئے مقرر کئے جاتے تھے۔ دوسرے مرکزی افسروں کی مانند وہ عارضی افسر نہیں ہوتے تھے دوم یہ کہ بیشتر گورنر پوری حیات نبوی کے دوران اپنے عہدوں پر برقرار و سرفراز رہے تھے اور صرف چند ہی کو ان کے عہدوں سے معزول یا تبدیل کیا گیا تھا۔ سوم یہ کہ ان میں سے بعض گورنر تو خلافت صدیقی کے پورے زمانے میں بھی برقرار رہے تھے۔ مکہ، نجران، بحرین اور جرش کے چار گورنروں کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے مختصر مدت کے لئے عہدہ سنبھالا تھا اور ان کی جگہ دوسروں نے سنبھالی تھی۔ دو گورنروں حضرات باذان اور ان کے فرزند شہر نے اپنے عہدوں کے زمانے ہی میں وفات پائی تھی جبکہ باقی پچیس گورنروں نے اسلامی ریاست کی حیات نبوی کے اواخر تک خدمت کی تھی۔

ذیل میں ان تمام ولاۃ نبوی کے قبائل اور علاقائی تعلق کو ظاہر کرنے کے ایک جدول دی جا رہی ہے۔ اس جدول سے ان کی سال بسال تقرری کا بھی علم ہوتا ہے۔ جس سے صوبائی انتظامیہ کے ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

		سنہ تقرری				
علاقہ	قبیلہ / خاندان	۶۲۸/۷	۶۳۰ /	۳۱۸-۶۳۱/۹	۶۳۱/۹	تعداد ولاۃ
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۳	۲	۵	۲	۱۲
	(الف) ہاشم	-	-	۱	-	۱

	ب۔ امیہ	۳	۱	۲	۱	۷
	(ج) مخزوم	-	-	-	۱	۱
	(د) فہر	-	-	۱	-	۱
	(س) مطلب	-	-	۱	-	۱
	(ص) سہم	-	۱	-	-	۱
	۲۔ خزرج	۱	-	۲	۳	۶
مشرقی عرب	(۱) ثقیف	-	۱	۱	-	۲
	(۲) طے	-	-	۱	-	۱
شمالی عرب	۱۔ ازد	-	-	۱	۱	۲
	۲۔ اشعر	-	-	-	۱	۱
	۳۔ غوث بن مر	-	-	۱	۱	۲
	۴۔ حضرموت	-	۱	-	-	۱
	۵۔ ہمدان	-	-	-	۱	۱
	۶۔ الابناء ایرانی	-		۱	۱	۲
قبائلِ پراگندہ	۱۔ تمیم	-	-	-	۲	۲
میزان	۱۱ قبیلے	۴	۴	۱۲	۱۲	۳۲

اس جدول سے بعض دلچسپ نکات سامنے آتے ہیں۔ والیوں یا مرکزی منتظمین کی کل تعداد عہد نبوی میں ۳۲ تھی جن میں سے حصہ غالب یعنی ۱۲ والیوں کو قریش کے مختلف خاندانوں سے بالکل فطری طور پر منتخب کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ بنو امیہ کے سات افراد کو یہ منصب جلیل حاصل ہوا تھا جو ایک لحاظ سے کارنامہ تھا۔ ان میں سے چار گورنروں کا تعلق بنو امیہ کے ایک خاندان بنو سعید بن العاص سے تھا اور وہ سب کے سب حقیقی بھائی تھے۔ اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے تین بھائی بیک وقت گورنروں کے عہدے پر سرفراز تھے، چوتھے کے بارے میں اختلاف ہے اور امکان ہے کہ وہ بھی اپنے بقیہ تین ممتاز و سر برآوردہ بھائیوں کے ساتھ ساتھ اس عظیم عہدے پر فائز رہے ہوں۔ یہ چاروں بھائی تھے۔ عبداللہ بن سعید، عمرو بن سعید، ابان بن سعید، اور خالد بن سعید جنہوں نے بالترتیب قریٰ عربیہ، وادی القریٰ، بحرین اور صنعا کے اہم ترین ولایات سنبھال رکھی تھیں۔ دو اور اموی گورنروں حضرات ابوسفیان بن حرب اور ان کے فرزند یزید کا تعلق بھی مکہ کے ایک اہم و ممتاز ترین خاندان سے تھا جو اپنی انتظامی، فوجی اور سیاسی لیاقت کے علاوہ

اپنی اقتصادی دولت کے لئے بھی مشہور و معروف تھا اور آخری اموی گورنر حضرت عتاب بن اسید تھے۔ جنہوں نے سب سے پروقار و پر افتخار عہدہ ولایت مکہ کو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ سوائے ابوسفیان بن حرب اموی کے جنکو اپنے عہدے سے معزول کر دیا گیا تھا یا جنہوں نے از خود سبکدوشی حاصل کر لی تھی باقی تمام اموی گورنر کافی دنوں تک اپنے عہدوں پر سرفراز رہے تھے۔ ان میں سے عبداللہ بن سعید کا جلد ہی انتقال ہو گیا تھا جبکہ پانچ اموی گورنر حیات نبوی کے اواخر تک اپنے اپنے علاقوں کے گورنر رہے تھے۔ بلاذری نے اپنی متعدد روایات میں سے ایک میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ وفات نبوی کے وقت صرف چار اموی گورنر اپنے عہدوں پر برقرار تھے لیکن مورخ موصوف نے حضرت یزید بن ابی سفیان اموی گورنر تیما کا نام اس فہرست میں نہیں گنایا ہے ورنہ تعداد پانچ ہوتی۔ بہرحال اتنی بھی تعداد میں عہد نبوی کے انتظامیہ میں اموی گورنروں کی شمولیت کی اہمیت اس پس منظر میں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ حضرت ابوسفیان بن حرب اور سعید بن العاص نے مدتوں تک اسلام اور اسلامی ریاست کی مخالفت کی تھی۔ سعید کا تو کفر ہی پر جنگ بدر کے بعد انتقال ہو گیا تھا جبکہ حضرت ابوسفیان نے فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ ان کے فرزند یزید بھی کافی متاخر مسلمان تھے کہ انہوں نے عمرۃ القضیہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ صرف خاندان سعیدی کے دو گورنر حضرات خالد و عمرو ابتدائی مسلم تھے اور باقی دو سعیدی افراد نیز حضرت عتاب گورنر مکہ بھی فتح مکہ کے آس پاس کے زمانے کے مسلمان تھے۔ بہرحال اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ امویوں نے اسلام اور اسلامی ریاست کی بحیثیت قبیلہ یا خاندان کے مخالفت کی تھی۔ اس موضوع پر باب دوم میں مکمل و مدلل بحث کی جا چکی ہے جسے اب یہاں دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس سلسلہ میں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ عہد نبوی کی ۲۷ ولایات میں سے ۷ پر کسی نہ کسی وقت اموی گورنر فائز رہے تھے اور ۵ ولایات پر تو بیک وقت انہوں نے حکمرانی کی تھی یہاں اس نکتہ کیطرف بھی اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دو گورنروں حضرات علاء بن حضرمی گورنر بحرین اور سعید بن قشیب ازدی گورنر جرش کا تعلق بھی بنو امیہ کے خاندان سے تھا۔ کہ وہ دونوں ان کے حلیف تھے۔ اس لحاظ سے عہد نبوی کے اس شعبۂ عمال و امراء میں امویوں کی کل تعداد ۹ ہو جاتی ہے۔ جو گورنروں کی کل تعداد کی ایک چوتھائی سے بھی کچھ زیادہ یا ایک تہائی سے کچھ کم ہے۔ باقی قریشی گورنروں میں سے ایک ایک بنو ہاشم، بنو فہر، بنو مطلب، بنو سہم اور بنو مخزوم میں سے تھا اور آخری خاندان سے یمن میں اسلامی فوج کے صوبائی کمانڈر کا بھی تعلق تھا۔

امت اسلامی کا دوسرا اہم سماجی طبقہ خزرج کا تھا جن کے چھ ارکان نے ریاست اسلامی کی متعدد اہم ولایات پر گورنری کی تھی۔ ان میں سے سب سے نمایاں اور اہم مقام کے مالک حضرت معاذ بن جبل خزرجی تھے۔ جنہوں نے وسیع و عریض جنوبی عرب کے خطے کی تمام ولایات کے گورنر جنرل کی حیثیت سے تاریخ اسلامی میں اپنی انمٹ چھاپ چھوڑی ہے باقی خزرجی گورنروں نے خیبر، ایلہ، نجران اور حضرموت کے علاقوں کی ولایات پر حکمرانی کی تھی۔ اس طبقہ عمال نبوی میں مدینہ کے ایک اور اہم ترین قبیلہ اوس کی عدم شمولیت خاصی اہم اور حیرت انگیز ہے۔

دوسرے قبائل عرب میں ثقیف، غوث بن مر اور تمیم ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے۔ کیونکہ ان کے دو دو نمائندے اس

طبقۂ افسرانِ نبوی میں شامل تھے۔ اس سلسلہ میں یہ دلچسپ بات قابلِ ذکر ہے کہ دونوں تمیمی گورنروں نے اپنے علاقوں کو چھوڑ کر مکہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور قریش کے خاندانوں میں کسی نہ کسی کے حلیف بن گئے تھے۔ اس لحاظ سے ان کی تقرریاں دراصل قریش کی تقرریاں شمار ہونی چاہئیں۔

وُلاۃِ نبوی کے بارے میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ ان میں سے غالب اکثریت کا تقرر ان کے اپنے علاقے یا آبائی وطن میں نہیں ہوا تھا۔ صرف مکہ اور طائف کے گورنر اور کسی حد تک ہمدان کے گورنر اپنے اپنے علاقہ کے لوگ تھے ورنہ بقیہ گورنروں کا تعلق ان علاقوں یا قبائل سے نہیں تھا جن پر ان کو حکمرانی کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یہ عہدِ نبوی کے انتظامیہ یا حکومت کی مرکزیت کی ایک اہم علامت تھی کیونکہ عرب قبائل اپنے مزاج کے سبب جس کو قبائلی روایات نے بنایا تھا کسی "غیر" کی حکومت و حکمرانی کو کبھی برداشت نہیں کرتے تھے اور مجبوراً کبھی ایسا ہو جاتا تھا تو اس کی حکومت کے خلاف ہر موقع کی تاک میں رہتے تھے۔ بہرحال ان میں مدینہ کی مرکزی حکومت کی اطاعت کا جذبہ دراصل اسلام کی ایک دین تھی۔

جہاں تک ان گورنروں کے زمانۂ قبولِ اسلام کا تعلق ہے تو ۲۲ اشخاص میں سے صرف پانچ کو سابقین اولین کے زمرہ میں شمار کیا جا سکتا ہے جبکہ آٹھ دوسروں نے ہجرت سے ذرا قبل یا کچھ بعد اسلام قبول کیا تھا۔ بقیہ نے جواب بھی اکثریت میں ہیں کافی تاخیر سے اسلام قبول کیا تھا۔ ان میں سے سات نے صلحِ حدیبیہ سے کچھ پہلے یا اس کے بعد میں جبکہ باقی نے فتح مکہ کے زمانے میں امتِ اسلامی میں داخل ہونا پسند کیا تھا۔

والیوں / گورنروں کے اختیارات

اس بحث کے آخر میں چند الفاظ والیوں کے اختیارات کے ضمن میں کہنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ پہلے مختصر طور سے ہی مگر ذکر آ چکا ہے کہ گورنر / والی اپنی ولایت کے نظم و نسق میں بالکل آزاد و خود مختار ہوتے تھے اور اس لحاظ سے ان کو کافی بلکہ غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔ وہ نہ صرف شہری نظم و نسق کے ذمہ دار ہوتے تھے بلکہ وہ اپنے علاقہ کے فوجی سالار، قاضی اور عاملِ صدقات بھی ہوتے تھے۔ ان کو سیاسی و عصری تقاضوں کے مطابق قوانین وضع کرنے اور نافذ کرنے کے بھی اختیارات ہوتے تھے۔ ان پر صرف کتاب و سنت کی پابندی تھی یا وقتاً فوقتاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جو ہدایات و احکام بھیجتے رہتے تھے۔ ان کی تعمیل لازمی تھی اور یہ آخری پابندی دراصل سنت میں ہی شامل ہے۔ اس سلسلہ میں ابن سعد اور ترمذی کی روایت کردہ حدیث اکثر نقل کی جاتی ہے جس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل خزرجی سے ان کی یمن کو بطور گورنر جنرل روانگی سے قبل پوچھا تھا کہ وہ کس بنیاد پر فیصلے کیا کریں گے۔ حضرت معاذ نے پہلے کتاب کی روشنی میں اور اس میں اگر ہدایت نہ ملے تو سنت کی روشنی میں فیصلہ کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ پھر سوالِ نبوی پر کہ اگر دونوں میں کوئی ہدایت نہ ملے تو وہ کیا کریں گے۔ اس پر انہوں نے اپنی رائے پر فیصلہ کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعریف و تحسین فرمائی تھی"[۲]۔ اس حدیث سے یہ نکتہ مزید واضح ہوتا ہے کہ کتاب و سنت کی حد بندی کے اندر اندر

تمام گورنر بلکہ افسران و عمال نبوی اپنے اپنے علاقوں میں انتظام و انصرام چلانے میں پوری طرح آزاد تھے۔ ایک طرح سے صوبائی نظم و نسق مرکزی انتظامیہ کی بالکل نقل تھی۔

بہرحال یہ معمول نبوی تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اپنے تمام افسروں، عاملوں اور گورنروں کو ان کی روانگی سے قبل ہدایات دیتے تھے۔ جیسا کہ حضرات معاذ بن جبل اور عمرو بن حزم وغیرہ گورنروں کے معاملہ سے معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے حضرت معاذ بن جبل کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے علاقہ کے لوگوں کو، جو اتفاق سے "اہل کتاب" تھے۔ اسلام کی دعوت دیں نمازوں کا حکم کریں، اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی ہدایت دیں۔ آپ نے ان کو یہ بھی ہدایت دی تھی کہ وہ ان کی دولت کی بہترین چیزوں کو صدقات میں لینے سے احتراز کریں۔ اور مظلوم و بیکس کی بددعا سے بچیں۔[۲۰۲] ایک اور روایت کے مطابق آپ نے ان کو لوگوں کے لئے دشواری کی جگہ آسانی پیدا کرنے کی ہدایت کی۔ اختلاف بجائے تعاون کو بڑھاوا دیں اور نفرت کی جگہ محبت پیدا کریں۔[۲۰۳] آپ نے ان کو لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور نرم رویہ اپنانے کی بھی ہدایت کی تھی۔[۲۰۴]

اگرچہ ایک جدید مؤرخ نے شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے۔[۲۰۵] تاہم اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ حضرت عمرو بن حزم کو جو ہدایات نبوی دی تھیں وہ مفصل بھی ہیں اور جامع بھی۔ آپ نے ان کو ہدایت دی تھی کہ وہ ہر حال میں خدا کا خوف و تقویٰ اختیار کریں، سچائی و صداقت کا معاملہ کریں۔ لوگوں کو خوشخبری سنائیں۔ ان کو قرآن کریم کی تعلیم دیں، غلط کام کرنے سے روکیں ان کے اختیارات، حقوق اور فرائض سے آگاہ کریں، لوگوں کے صحیح طرز عمل اختیار کرنے کی صورت میں ان کے ساتھ نرمی اختیار کریں، اور غلط کام کرنے کی صورت میں ان کو سزا دیں۔ انہیں جنت کی بشارت دیں اور اس کو حاصل کرنے کا طریقہ بتائیں اور جہنم سے ڈرائیں۔ لوگوں کے ساتھ دوستی قائم کریں۔[۲۰۶] تاکہ ان کو آسانی سے دین کی تعلیم دے سکیں اور ان کو حج کے مراسم کی تعلیم دیں۔ ان کو ایک کپڑے میں جس کے دونوں سرے ان کے شانوں پر دھرے ہوں نماز ادا کرنے سے منع کریں۔ اسی طرح ان کو ایسا لباس پہن کر بیٹھنے سے روکیں۔ جس سے ان کا جسم کھل جائے۔ اگر ان کے بال لمبے اور شانہ پر پڑے ہوں تو ان کو چوٹی گوندھنے سے روکیں، لڑائی جھگڑے کی صورت میں ان کو قبیلے اور خاندان کی دہائی دینے سے روکیں بلکہ خدا سے استمداد کی ہدایت کریں اور جو لوگ خدا کی طرف رجوع نہ کریں بلکہ اپنے قبائل اور خاندانوں ہی کی دہائی دیتے رہیں۔ ان کو تلواروں سے ٹھیک کریں حتیٰ کہ وہ خدا کی طرف رجوع ہو جائیں۔ لوگوں کو وضو اور پاکی کا حکم دیں، وقت پر نمازوں کا حکم دیں ان کو جب بلایا جائے وہ مسجدوں میں جمع ہو جایا کریں، اور جانے سے پہلے وہ پاکی اختیار کریں۔ ان کو حکم دیں کہ وہ مال غنیمت سے خدا کا خمس نکالیں اور اپنے اموال سے وہ صدقات ادا کریں جو تمام مسلمانوں کے لیے ان کی اراضی پر واجب ہوتے ہیں۔ یعنی چشمہ اور بارش کے پانی سے سیراب ہونے والی اراضی کی پیداوار میں عشر ۱/۱۰ اور بالٹیوں سے سینچی جانے والی اراضی کی پیداوار میں سے نصف العشر ۱/۲۰۔ اور ان کے ہر دس اونٹوں پر دو بھیڑ یا بکری اور ہر بیس اونٹوں پر چار بھیڑ یا بکری لیں جبکہ ہر چالیس گائے پر ایک گائے اور ہر تیس گائے پر ایک بیل یا بچھڑا لیں اور ہر چالیس بکریوں / بھیڑوں پر ایک بکری / بھیڑ وصول کریں۔ ایک یہودی یا عیسائی اگر خلوص کے ساتھ اپنے آپ اسلام قبول کرلے اور دین اسلام کی مخلصانہ پیروی کرے

تو اسے ایک مسلمان کے سارے حقوق اور فرائض حاصل ہوں گے۔ اگر ان میں سے کوئی اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہے تو اسکو زبردستی اس سے ہٹایا نہیں جائے گا، ہر بالغ مرد، عورت، آزاد اور غلام (غیر مسلم) کو ایک دینار طلائی یا اس کی قیمت کا کپڑا (جزیہ میں) دینا ہوگا۔ جو کوئی اس کی پابندی و تعمیل کرے گا، اس کو خدا اور اس کے رسول کا ذمہ حاصل ہوگا۔ اور جو کوئی اس کی مخالفت کرے گا وہ خدا، اس کے رسول اور تمام مسلمانوں کا دشمن تصور ہوگا"[۱۹]

یہ ہدایات نبوی ظاہر ہے کہ مختلف النوع ہیں۔ ان میں انتظامی احکام کے علاوہ مذہبی اور سماجی ہدایات بھی شامل ہیں۔ سیاسی نقطہ نظر سے قبائلی عصبیت کے رجحانات کو ختم کرنے کی ہدایات اور ان لوگوں کے خلاف جو قبائلی عصبیتوں کو بھڑکائیں اور اس طرح معاشرے میں ابتری پھیلائیں تلوار اٹھانے کی اجازت بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے ایک طرف تو قبائلی عصبیت کو ختم کرنے میں مدد ملتی اور دوسری طرف اسلامی بلکہ عرب معاشرے میں مرکزیت و اجتماعیت کی سعادت پیدا ہوتی۔ جہاں تک مالی معاملات و امور کے بارے میں ہدایات نبوی کا تعلق ہے تو ہم ان پر بحث اگلے باب میں کریں گے۔ بہرحال مجموعی طور سے یہ نامۂ نبوی ولایات کے گورنروں کے نبوی انتظامیہ میں مقام و مرتبہ کے علاوہ ان کے اختیارات و فرائض کی واضح نشاندہی کرتا ہے۔ اصولی طور سے تمام گورنر مرکزی حکومت کے پابند بھی تھے اور اس کے سامنے جوابدہ بھی۔ لیکن اپنے اندرونی نظم و نسق کے معاملہ میں وہ قطعی آزاد اور خود مختار تھے۔ انکو کافی وسیع سیاسی، انتظامی، فوجی اور مالی اختیارات حاصل تھے۔ کتانی نے ان کے اختیارات کی وضاحت کے لئے ایک مشہور مصنف کا قول نقل کیا ہے۔ کہ ولاۃ/والی وہ عمال تھے۔ جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علاقوں (البلاد)، الضیاف (القضاء)، صدقات و محاصل (الصدقات) اور حج کا امیر مقرر کیا تھا۔[۲۰] اس کی تصدیق مزید بلاذری کے بیان سے ہوتی ہے، جس کے مطابق کہ امیر وہ شخص ہوتا تھا جو کسی علاقہ کا حکمران ہوتا اور وہاں سے صدقات وصول کرتا تھا ارزقی کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸ھ/۶۳۰ء میں حضرت عتاب بن اسید اموی نے حج اپنی امارت میں انجام دیا تھا کیونکہ وہ علاقہ کے گورنر (امیر البلد) تھے۔ حالانکہ اس روایت کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو اس فریضہ کی ادائیگی کا صریحی حکم نہیں دیا تھا۔[۲۱] بہرحال تمام تاریخی شواہد اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے صوبوں/ولایتوں کی حکومت کا نظام مرکزی انتظامیہ کے مثل ہوتا تھا اور اسی کی مانند ان کے مختلف مالی، انتظامی اور فوجی شعبے ہوتے تھے جن میں متعدد افسر اور عمال کام کرتے تھے۔ یہ عربوں کے لئے ایک نیا سیاسی تجربہ تھا جس میں اختیار و اقتدار کا سرچشمہ مرکز میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات تھی اور بقیہ تمام مرکزی اور صوبائی عمال و افسر آپ کے ماتحت اور آپ کے سامنے جوابدہ تھے۔

۲۔ مقامی منتظمین

دوسرے معلوم اسباب و وجوہ کے علاوہ عرب کا قبائلی نظام بھی اس امر کا ذمہ دار تھا کہ مرکزی منتظمین، والی اور گورنر اور صوبائی افسر نہ تو مقامی معاملات و مسائل کو پوری طرح سمجھتے تھے اور نہ ہی ان کو سلجھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس کے

علاوہ وہ مقامی لوگوں کی تسکین اور اطمینان کے مطابق بھی کام نہیں کر سکتے تھے۔ ہر زمانے میں اور ہر علاقے میں ایسے لوگوں کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے جو مقامی مسائل کو سمجھ اور حل کر سکیں اور ساتھ ہی اپنے لوگوں میں خود اعتمادی اور اعتماد بھی پیدا کر سکیں چنانچہ ان اسباب و وجوہ سے مقامی منتظمین کی تقرری ناگزیر ہو گئی تھی۔ عام طور سے یہ مقامی منتظمین اپنے اپنے علاقوں کے قبائلی سردار ہوتے تھے۔ لیکن بعض علاقوں میں جہاں شیوخ قبائل نے اسلام نہیں قبول کیا۔ اور ان کی معتدبہ تعداد نے اس شرف کو حاصل کر لیا ہو تو اس علاقے کے مسلمانوں کا ایک مقامی سردار مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اور اس تقرری میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کلی اختیار حاصل ہوتا تھا۔ لیکن اس اختیار کے باوجود آپ ہمیشہ اس "قوم" یا "قبیلہ" کے لوگوں کے خواہشات و جذبات کا احترام کرتے تھے، اور انہیں کے پسندیدہ اور سربرآوردہ شخص کو سردار مقرر فرماتے تھے۔ بعض مسلم قبیلوں کے شیوخ و سادات کی تقرری اور تبدیلی بھی آپ کے حکم و مرضی سے ہوئی تھی۔ اور یہ آپ کی عظیم سیاسی طاقت اور اقتدار مطلق و حاوی کی ایک علامت تھی۔ یہ نکتہ ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ یہ تمام مقامی منتظمین بلا استثنا عاملین صدقات بھی ہوتے تھے۔ لہذا عاملین صدقات اور مقامی منتظمین دونوں ایک دوسرے کے مترادف تھے۔ مگر اس بحث میں ہم نے تکرار سے بچنے کی خاطر عاملین صدقات کو شامل نہیں کیا ہے اور صرف انہی سرداروں اور شیوخ (رؤس = راس) کو شامل کیا ہے جن کو ماخذ میں صرف اس حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بات یہاں واضح کرنی ضروری ہے کہ مذکورہ بالا بحث میں تمام مقامی منتظمین یا قبائلی سرداروں کو شامل نہیں کیا جا سکا اور ہماری فہرست بہت ہی ناقص اور نامکمل ہے کیونکہ ان سب کا نام بنام ذکر نہیں ملتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مقامی منتظمین یا قبائلی سرداروں کی حقیقی اور اصل تعداد ان کے قبائل کی تعداد کے تناسب سے تھی۔ بلکہ ایک طرح ان سے کئی گنا زیادہ تھی کیونکہ ہر قبیلہ کی متعدد اہم شاخیں (بطون) ہوتے تھے اور ان بطون کی بھی ذیلی شاخیں ہوتی تھیں۔ جیسا کہ ہم باب دوم میں دیکھ چکے ہیں۔ اور ان تمام مادر قبیلوں، اہم بطون اور ان کی ذیلی شاخوں کے سردار الگ الگ ہوتے تھے۔ اگرچہ ایک متاخر مصنف کا قبائل عرب پر تبصرہ کہ "ان کی تعداد اتنی تھی جتنی کہ آسمان پر ستارے" مبالغہ آمیز ہے لیکن وہ درحقیقت صورتحال کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ مونٹگمری واٹ کا یہ خیال کہ بعثت نبوی کی جگہ قبائل کی جگہ بطون ہر لحاظ سے عرب سماج میں اہمیت اختیار کر چکے تھے صحیح ہے اور اس کے ساتھ اس میں یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ قبائلی سرداروں کی جگہ اب بطون کے سرداروں نے لے لی تھی۔ اور ان کا اختیار اور اقتدار زیادہ موثر اور فعال تھا۔

مقامی منتظمین اور قبائلی سرداروں کے بارے میں کافی حوالے اور معلومات پہلے دو ابواب میں آ چکی ہیں۔ لہذا ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بحث میں صرف چند اہم نکات اٹھائے جائیں گے تاکہ اس تاریخی عمل کو سمجھا جا سکے جس کے نتیجہ میں اسلامی حکومت جزیرہ نمائے عرب کے اندرونی، سرحدی اور دور دراز کے علاقوں میں قائم و مستحکم ہو سکی تھی۔

خیال یہ ہے کہ ۹ھ / ۶۳۰-۳۱ء جس کو عام طور سے ماخذ میں عام الوفود (وفود کا سال) کہا جاتا ہے اندرون عرب اور دور دراز کے مقامات میں اسلامی حکومت بلکہ اسلام کے نفوذ کا نقطہ آغاز تھا۔ جب کہ تقریباً تمام قبائل عرب نے اپنے

اپنے وفود نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں مدینہ بھیجے تھے۔ لیکن صحیح تاریخی تناظر میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہجرت کا نواں سال دراصل اس تاریخی عمل کا نقطۂ عروج تھا جو مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد شروع ہوا تھا۔ بلکہ اسلام کی حد تک تو اس کا نقطہ آغاز مزید تیرہ سال قبل مکہ میں ہوا تھا۔ جیسا کہ ہم اشعر، عبدالقیس، غفار، اسلم، جہینہ، مزینہ، مدلج، ضمرہ اور متعدد دوسرے قبائل کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں۔ قبائل عرب کے وفود کی آمد مدینہ پر ابن سعد کی بحث سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ ۹ھ / ۶۳۰-۶۳۱ء سے کہیں پہلے عربوں کے وفود بارگاہ نبوی میں آنے شروع ہو گئے تھے۔ بہر حال انہیں زیارتوں کے دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عربوں کے مختلف قبیلوں کے نمائندوں سے ملاقات کا موقعہ ملتا تھا۔ اور آپ حالات کے مطابق ان کے سرداروں کو برقرار رکھتے تھے۔ یا از سر نو مقرر فرماتے تھے۔ چونکہ بیشتر وفود عرب ۹ھ ہی میں مدینہ آئے تھے۔ اس لئے قبائلی سرداروں یا مقامی منتظمین کی یہ تقرری زیادہ تر اسی برس ہوئی تھی جس برس انہوں نے اسلامی ریاست کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کیا تھا۔

اکثر حالات میں فطری طور سے کسی رکن وفد کو اس قبیلہ یا خاندان (البطن) کے مسلمانوں کا سردار اور مقامی منتظم مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اگر اس وفد میں سردار قبیلہ خود موجود ہوتا تھا تو عام طور سے اس کو بحال رکھا جاتا تھا۔ از سر نو تقرری کی صورت میں دو اہم نکات سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ اس کی تقرری قبیلہ والوں کی بجائے خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں عمل میں آتی تھی اور دوم یہ کہ منتخب سردار لازمی طور سے وفد کے سب سے زیادہ معمر یا تجربہ کار اشخاص میں سے نہیں ہوتا تھا۔ جیسا کہ حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی کے معاملہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ عام طور سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقامی منتظم کا انتخاب دو بنیادوں پر کیا جاتا تھا۔ ایک یہ کہ وہ مقامی انتظام و انصرام کی صلاحیت سے متصف ہو اور دوسرے یہ کہ اس کو اسلام کی کافی معلومات اور دین کا تفقہ ہو۔ دوسری بنیاد یا سبب بعض حالات میں دوسرے اسباب پر فوقیت رکھتا تھا۔ کیونکہ مقامی منتظم یا سردار قبیلہ سے تبلیغ اسلام کا کام بھی لینا ہوتا تھا۔ جو سردار زیادہ آسانی اور موثر طور سے انجام دے سکتا تھا۔

جہاں تک اسلام کے سیاسی اور انتظامی نظام میں مقامی منتظم یا مقامی سردار کے مرتبے کا تعلق ہے تو وہ خاصا دلچسپ اور ایک طرح سے بالکل نیا تھا۔ قدیم جاہلی نظام میں مقامی سردار، مقامی مسائل کا ذمہ دار ہوتا تھا اور غالباً وہ قبائل سردار کے سامنے جوابدہ اور ماتحت بھی ہوتا تھا۔ اب اسکی نوعیت ذرا مختلف نظر آتی ہے۔ وہ قبائلی سردار کی بالادستی کے تحت ہونے کے ساتھ ساتھ مدینہ کی مرکزی حکومت کے سامنے بھی جوابدہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ صوبائی اور مرکزی منتظمین اور مقامی مسلمانوں یا اسلامی ریاست کے شہریوں کے درمیان ایک رابطہ اور کڑی کا کام بھی کرتا تھا۔ بسا اوقات اس کو اختیار اور اجازت حاصل ہوتی تھی کہ وہ براہ راست مدینہ کی مرکزی حکومت سے رابطہ و تعلق قائم کرے ورنہ عموماً اور اصولاً اس کو اپنے علاقے کے مرکزی منتظمین کی اطاعت کرنی ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی علاقوں کے مقامی منتظمین کا تعلق براہ راست مدینہ سے بھی ہو سکتا تھا جبکہ سرحدی مقامات یا دور دراز کے علاقوں کے منتظمین اور سرداروں کو لازمی طور سے اپنے اپنے علاقوں کے گورنروں / یا والیوں کی اطاعت کرنی پڑتی تھی آیئے اس ضمن میں چند مثالیں دیکھیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سرحدی مقامات پر چند مملکتیں اور حکومتیں قائم تھیں جن کے حکمران ماضی میں وقت کی بڑی سلطنتوں میں سے کسی نہ کسی کے باجگذار رہ چکے تھے۔ مشرقی علاقے میں ایسی دو مملکتیں بحرین اور عمان کی تھیں۔ جن پر بالترتیب حضرات منذر بن ساوی اور جیفر و عبد حکومت کرتے تھے۔ ان حکمرانوں نے جب اسلامی ریاست کی سیاسی و انتظامی بالادستی قبول کی تو انہوں نے اپنے علاقوں میں مرکزی منتظمین یا نمائندگان رسول کے قیام و سکونت کی بھی شرط قبول کی تھی۔ چنانچہ بحرین میں حضرت علاء بن حضرمی اور ان کے ساتھ یا ان کے بعد حضرت ابان بن سعید اموی مدینہ کے نمائندے کی حیثیت سے مقیم تھے جبکہ اس حیثیت سے حضرت عمرو بن عاص بھی عمان میں قیام پذیر رہے تھے۔ اپنے علاقوں کے اندرونی نظم و نسق میں خود مختار ہونے کے باوجود وہ ان مرکزی نمائندوں کی نگرانی اور ہدایت کے پابند تھے۔ اور ان کی اطاعت ان پر لازمی تھی [280] اور ایسے معاملات میں جن کا تعلق مرکزی حکومت کے مفادات سے ہو یہ مقامی حکمران پوری طرح سے ان نمائندگان رسول کے تابع و محکوم تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرات منذر بن ساوی اور فرزندان جلندی کے نام فرامین سے اسکی مکمل شہادت ملتی ہے۔ اسی طرح ایران کے کسریٰ کے ایک اور باجگذار مقامی حکمران حضرت سیبخت کو ایک نامۂ گرامی میں عمال نبوی کی فرمانبرداری کی ہدایت کی گئی تھی [281] بحرین کے طاقتور قبیلہ عبد القیس کے سردار کو بھی حضرت علاء بن حضرمی کی اطاعت کی ہدایت کی گئی تھی [282] نجران میں انتظامی معاملات کے ضمن میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ امین امت، حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہری کی سیاسی بالادستی کو نجران کے سرداروں نے قبول کیا تھا۔ اور ان کے قبیلوں کو علاقہ کے حاکم اعلیٰ کی مانند تسلیم کیا تھا [283] اسی طرح حضرت زرعہ والی یزن کے نام نامہ مبارک جس کا ذکر کئی بار آچکا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مرکزی منتظمین کی بالادستی کے تحت تھے [284] مختصر طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد خطوط و فرامین موجود ہیں۔ جن میں مقامی حکمرانوں، بادشاہوں، قبائلی سرداروں سے فرستادگان مدینہ اور عمال نبوی کے احکام و ہدایات کی تابعداری کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جس کو انہوں نے بخوبی قبول و منظور کیا تھا۔ اس ضمن میں ہمدان [285]، حضرموت [286]، مہرہ [287]، جذام اور قضاعہ [288]، باہلہ [289]، دومۃ الجندل [290]، بنو اسد [291] اور متعدد دوسروں کے نام فرامین نبوی کے متون سے اس امر کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔

جزیرہ نمائے عرب میں اور شمالی عرب میں بھی بہت سے مقامی سردار اور منتظم تھے۔ جن میں سے کچھ کا ذکر ماخذ میں ملتا ہے۔ ان کے بارے میں دستیاب تمام مکمل معلومات تو اس کتاب کے آخر میں متعلقہ ضمیمہ میں ملیں گی یہاں اس بارے میں چند اہم نکات کی طرف توجہ دلانا کافی ہوگا۔ مرکزی اور شمالی دونوں علاقوں کے سرداروں اور مقامی منتظمین کی تقرری یا بحالی اسلامی حکومت ہی نے کی تھی۔ ان میں ایک اہم قبائلی سردار حضرت امرؤ القیس تھے جو ابن الاصبغ کے نام سے مشہور تھے اور وہ قبیلہ بنو کلب کی دومۃ الجندل کے علاقے کی شاخ کے سردار تھے۔ وہ قضاعہ کے متعدد سرداروں کے ساتھ اسلامی ریاست کے ہمیشہ فرمانبردار رہے تھے۔ حتیٰ کہ ردہ کے زمانے میں بھی وہ وفاداری کی صراط مستقیم سے نہیں ہٹے تھے [292] اسد الغابہ نے اس علاقے کے دو اور سرداروں کا بھی ذکر کیا ہے جو بنو ذہل اور بنو عنزہ بن وائل کے تھے [293]۔ مشرقی خطوں کے

قبائلی سرداروں میں جو دو اہم سرداروں حضرت مالک بن عوف نصری اور حضرت عدی بن حاتم طائی کا بہت نمایاں ذکر ملتا ہے ان میں سے اول الذکر کو ہوازن کے خاندانوں شمالہ، سلمہ اور فہم وغیرہ[۲۹۴] پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا تھا جبکہ مؤخر الذکر کو ان کے قبیلہ کے عہدہ پر برقرار رکھا تھا۔[۲۹۵] جنوبی عرب کے قبائل میں سے تقریباً ایک درجن مقامی سرداروں کے ناموں کا ذکر ملتا ہے، جن کا تعلق خولان، ازد جرش، بنو حارث / ہمدان، مراد، زبید، مذحج، کلاب، مریم، بنو ارحب / ہمدان صداء، کندہ اور متعدد دوسروں سے تھا۔[۲۹۶] اسی طرح حضرات جارود بن معلیٰ اور زبرقان بن بدر بالترتیب قبائل پراگندہ عرب میں سے قبیلہ عبد القیس اور بنو اوس / تمیم کے بہت اہم سردار تھے۔[۲۹۷] اس قسم کی بہت سی دوسری معلومات ہمارے مقامی عاملین صدقات کے مباحثہ میں بھی آئیں گی۔ جس سے ان کے بارے میں ہمیں اور بھی معلوم ہوگا۔ آخر میں ایک جدول دی جارہی ہے۔ جس میں تمام نامزد مقامی منتظمین کی سال بسال تقرری کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہر حال یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ فہرست مکمل تو کیا تکمیل کے قریب بھی نہیں پہنچی ہے۔ اصل منتظمین کی فہرست اس سے کم ازکم دس گنا بڑی ہوتی۔ لیکن ماخذ سے ان سب کے نام نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ بہر حال اس جدول سے مذکورہ بالا نکات کو سمجھنے میں مزید مدد ملے گی۔ اور عہد نبوی کے انتظامیہ میں ان کے مقام و مرتبے کی تعیین میں سہولت ہوگی۔

علاقہ	قبیلہ / خاندان	سنین تقرری ۶۲۷	۶۳۰	۶۳۱	۶۳۱-۲	غیر مورخہ	مقامی منتظمین
شمالی عرب	۱۔ کلب	-	-	-	-	۲	۲
	۲۔ بنو عنزہ بن وائل		-	-	-	۱	۱
	۳۔ مران / جذام	۱	-	-	-	-	۱
مغربی عرب	۱۔ اوس	۱	-	-	-	-	۱
مشرقی عرب	۱۔ ہوازن	-	۱	-	-	-	۱
	۲۔ بنو عامر	-	-	۱	-	-	۱
	۳۔ ذہل / اسد	-	-	-	-	۱	۱
	۴۔ طے اور اسد	-	-	۱	-	-	۱
جنوبی عرب	۱۔ ازد جرش	-	-	۱	-		۱
	۲۔ ہمدان	-	-	۱	۱	۱	۳
	۳۔ مراد	-	-	-	۱	-	۱
	۴۔ جرش	-	-	-	-	۱	۱
	۵۔ مذحج	-	-	-	۱	-	۱

	۶. جعفی	-	-	-	۱	-	۱
	۷. رہاء	-	-	-	۱	-	۱
	۸. حضرموت	-	-	-	۱	-	۱
	۹. صداء	-	-	-	۱	-	۱
	۱۰. کندہ	-	-	-	۱	-	۱
قبائل پراگندہ	۱. تمیم	-	-	۱	-	-	۱
	۲. عبدالقیس	-	۱	-	-	-	۱
غیر معروف	-	-	-	۲	-	-	۲
میزان	۲۰ قبیلے	۲	۲	۷	۸	۶	۲۵

۳۔ نقیب

نقیب (یعنی قبیلہ یا خاندان کا سردار، نمائندہ قوم) بہت قدیم ادارہ ہے جس کے آثار و شواہد یہودی اور عیسائی روایات میں پائے جاتے ہیں۔[۲۹۸] مصر سے اخراج کے بعد جزیرہ نمائے سینائی میں یہود کے بارہ قبائل میں بطور مختلف قوموں کے تقسیم ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم کہتا ہے کہ پھر خدا نے ان میں سے بارہ نقیب (سردار) بنائے۔"[۲۹۹] اس نقیب کے ادارہ کی مکمل تصدیق اور مزید تشریح انجیل مقدس کی آیات میں ملتی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیتی ہیں کہ وہ تمام بنو اسرائیل کی جماعتوں اور طبقوں کو شمار کریں اور تمہارے ساتھ ہر قبیلہ کا ایک شخص ہو، ہر وہ شخص جو اپنے آباؤ اجداد کے گھرانے کا سربراہ ہو۔"[۳۰۰] ان نقیبوں کی تقرری کا مقصد یہ تھا کہ وہ خدا کی طرف سے ودیعت کئے گئے الہامی فرائض کی ادائیگی میں حضرت موسیٰ کی مدد کریں اور اس بات پر بھی نظر رکھیں کہ ان کے اپنے متعلقہ قبیلے صراط مستقیم سے نہ بھٹک جائیں۔ یا خداوند قدوس سے کئے گئے اپنے معاہدہ کو نہ توڑ ڈالیں۔ یہودی سواد اعظم میں ان کے مقام و مرتبے کی مزید تشریح انجیل کی آیت نمبر ۱۶ کرتی ہے۔ کہ یہ "نقیب" سواد اعظم کے سربرآوردہ لوگ، اپنے آباء کے قبائل کے بادشاہ و شہزادے اور مملکت اسرائیل کے ہزاروں اشخاص کے سربراہ و سردار تھے۔"[۳۰۱] مولانا اشرف علی تھانوی[۳۰۲] اور رچرڈ بیل (RECHARD BELL) نے متعلقہ آیت قرآنی میں لفظ نقیب کے معنی سردار LEADER کے دیئے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ان سربرآوردہ (ELDERS) کا انتخاب اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے (فرائض منصبی کے) بوجھ کو ہلکا کریں۔"[۳۰۳]

یہودی روایت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی قبول و شائع کیا اور اس کی اتباع میں بھی انہوں نے بارہ نقیب (شاگرد

حواری، سردار (APOSTLES DISCIPLES) مقرر کئے[۲۰۴] تاکہ کلام مقدس کی وہ بنواسرائیل میں تبلیغ و اشاعت کرسکیں۔ انجیل کے عہدنامہ جدید، باب دہم کی آیات نمبر ۱ - ۵ کا بیان ہے کہ ان بارہ (نقیبوں) کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے روانہ کیا اور ان کو حکم دیا کہ وہ دشمنوں GENTILES کے راستے پر نہ جائیں اور نہ ہی سمرتوں (SAMARITANS) کے کسی شہر میں داخل ہوں۔ بلکہ بنواسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کے پاس جائیں اور جب تم پہنچو تو یہ کہہ کر نصیحت و تبلیغ کرو کہ جنت کی بادشاہت قریب ہے...[۲۰۵]

نقیب کی اس یہودی اور نصرانی روایت کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۲۲ء میں بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر اسلامی تہذیب و دین میں جذب کرلیا اور اس کے اتباع میں آپ نے مدینہ کے دو قبیلوں اوس و خزرج سے بارہ نقیب منتخب کئے، جن میں سے تین اول الذکر کے تھے اور نو موخر الذکر کے۔ ابن اسحاق[۲۰۶]، ابن سعد[۲۰۷]، بلاذری[۲۰۸]، بغدادی[۲۰۹] اور طبری[۲۱۰] کے علاوہ متعدد دوسرے ماخذ میں مذکورہ متعدد روایات یہودیوں اور عیسائیوں کی روایت نقیب کے مستعار ہونے کی وافر شہادت دیتی ہیں۔ جیساکہ ہم ابھی اپنے مباحثہ میں دیکھیں گے۔

اسلام میں نقیب کا تصور اور ادارہ تقریباً انہی خطوط پر قائم ہوا تھا جن پر یہودی مذہبی نظام میں ماضی میں قائم تھا۔ عیسائی تصورِ نقیب نسبتاً کچھ مختلف معلوم ہوتا ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ ان تینوں الہامی مذاہب میں کم و بیش یکساں ہے۔ بلاذری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث نقل کرتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنواسرائیل سے بارہ نقیب منتخب کئے تھے۔ اسی طرح سے میں بھی بارہ نقیب منتخب کروں گا......"[۲۱۱] اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ میں اکٹھا ہونے والے مدنی زائر مسلمین سے کہا تھا کہ "میرے پاس اپنے بارہ سرداروں کو لاؤ جو اپنے اپنے لوگوں یا قوم کے کفیل اور ذمہ دار ہوسکیں۔" یہ بات بہت اہم ہے کہ اس ارشاد نبوی کے بعد انصاری مسلمانوں اور قبیلہ والوں نے خود اپنے سرداروں کو منتخب کیا تھا اور "نو خزرج سے اور تین اوس سے" منتخب کرکے آپ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور آپ نے ان کی بحیثیت نقیب تقرری کی توثیق کردی تھی[۲۱۲]۔ یعنی مدینہ کے سرداروں کا انتخاب آپ نے بنفس نفیس نہیں فرمایا تھا۔ جیساکہ عام خیال ہے۔ پھر آپ نے "سرداروں سے فرمایا تھا": "تم اپنے اپنے لوگوں (قوم) کے اسی طرح ذمہ دار (کفیل) ہو جس طرح عیسیٰ ابن مریم کے حواری (شاگرد) ان کے سامنے جوابدہ تھے، جبکہ میں اپنی قوم کے لئے ذمہ دار ہوں۔"[۲۱۴] بلاذری اور ابن سعد کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نجار (خزرج) کے ایک معزز فرد حضرت ابوامامہ اسعد بن زرارہ کو ان سب کا نقیب اعظم (نقیب النقباء) اور سردار (مراس) مقرر کیا تھا۔ بلاذری کا مزید بیان ہے کہ اس انتخاب و تصدیق انتخاب کے بعد تمام نقیبوں نے یکے بعد دیگرے کھڑے ہوکر بعد حمد و ثنائے رب جلیل اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئے گئے معاہدہ و عہد کے ایفا کا حلف اٹھایا تھا[۲۱۶]۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نقیب کا مقام و مرتبہ مدینہ کی شہری ریاست کے سربرآوردہ ترین اشخاص اور مقامی منتظمین کے مقام و مرتبہ کے بہت مشابہ تھا جو اوس و خزرج کے مختلف خاندانوں کے لوگوں کے طرز عمل اور معاملات کے کفیل اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جوابدہ تھے۔

بلاریب یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ نقیب کے عہدہ و ادارہ میں مذہبی روح کارفرما تھی اور بنیادی طور پر وہ مذہبی اور صرف اس کے نتیجے میں سیاسی اور معاشرتی ادارہ بنا تھا۔ جیسا کہ تینوں الہامی مذاہب کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی تسلیم کیا جانا چاہیئے کہ نقیب کا تصور اور عہدہ پوری طرح سے قبائلی بنیادوں پر مبنی نہیں تھا یا قبائلی کردار نہیں رکھتا تھا اگرچہ نقیبوں کا انتخاب و تعلق بلاریب انصار کے مختلف خاندانوں اور قبیلوں سے تھا۔ بظاہر یہ بیان متضاد "نظر آتا" ہے مگر دراصل ایسا ہے نہیں۔ چنانچہ اس کی وضاحت ایک دوسری دلیل سے بھی کی جا سکتی ہے۔ جو زیادہ جاندار اور واضح ہے۔ یہ "تاریخی حقیقت" ہے کہ بنیادی طور سے نقیبوں کی تعداد بارہ تھی اور جہاں تک ہماری معلومات ہیں وہ ہمیشہ اور ہر سہ مذاہب میں بارہ ہی رہی نہ کبھی گھٹی اور نہ کبھی بڑھی جبکہ اوس و خزرج کے خاندانوں کی تعداد بارہ نہیں تھی۔ خاص کر اول الذکر کے تین نقیب اس کے محض تین خاندانوں سے تھے اور بقیہ خاندانوں میں ایک بھی نقیب نہیں تھا۔ اسی طرح خزرج کے معاملے میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے بعض خاندانوں کو بالکل نمائندگی نہیں ملی تھی۔ پھر بعض طاقتور قبائل کے خاندانوں میں دو دو نقیب تھے۔ جبکہ دوسرے اہم خاندانوں میں صرف ایک ایک نقیب تھا۔ کتاب کے آخر میں نقیبوں کی فہرست میں ان کے قبائلی اور خاندانی تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔ ۲۱۷ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوس کے نقیبوں کا تعلق ان کے تین خاندانوں بنو عبد الاشہل، بنو غنم، اور بنو عمرو بن عوف سے تھا۔ جبکہ خزرجی نقیبوں میں ایک ایک کا بنو النجار، بنو قوافلہ، بنو زریق سے اور دو دو کا بنو الحارث، بنو ساعدہ اور بنو سلمہ سے تھا۔ اگر یہ قبائلی بنیادوں پر انتخاب ہوا ہوتا تو عقبہ میں موجود دوسرے خاندانوں کو بھی نمائندگی ملی ہوتی اور کسی بھی انصاری خاندان کو اس سعادت سے محروم نہ ہونا پڑا ہوتا۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں موجود و شریک حضرات و خواتین کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو بیاضہ میں ایک بھی نقیب نہیں تھا اور اسی طرح بنو النجار اور غنم کو جو کافی بڑے خاندان بلکہ قبیلہ بن گئے تھے۔ اور ان کی متعدد شاخیں تھیں متناسب نمائندگی نہیں ملی تھی۔ ۲۱۸

اس بحث سے بعض جدید مورخین کے اس نظریہ کی تردید ہوتی ہے کہ نمائندوں (REPRESENTATIVES) یعنی نقیبوں کی خاندانوں میں تقسیم عقبہ میں موجود اس خاندان کے ارکان کی تعداد اور صلاحیت پر مبنی تھی ۲۱۹۔ اگر ایسا ہوتا تو بنو النجار کا خاندان جو عددی اور صلاحیت کے اعتبار سے سب سے بڑا تھا اور جس کی اس موقعہ انتخاب پر کافی نمائندگی بھی تھی۔ ایک سے زیادہ نقیبوں کی سعادت کا حقدار بنتا۔ حقیقت یہ تھی کہ نقیبوں کا انتخاب منتخب افراد کی ذاتی صلاحیتوں، لیاقتوں اور اوصاف کے علاوہ مدینہ کے سماج و سیاست میں ان کے مقام و مرتبے پر مبنی تھا اور بلاریب اس وقت کے نظام میں یہی لوگ سب سے زیادہ اہم تھے۔

اسی طرح نقیبوں کی کارکردگی اور افادیت کے بارے میں بعض مورخین نے شبہات و شکوک کا اظہار کیا ہے اور یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ عہد نبوی میں ان عہدہ داروں نے کوئی کام نہیں کیا اور یہ ادارۂ نقیب بے سود تھا ۲۲۰۔ لیکن ماخذ میں جو بھی تھوڑی بہت معلومات اس کے بارے میں ملتی ہیں۔ وہ اس نظریہ و خیال کی تردید کرتی ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ نقیبوں کا یہ ادارہ تا اواخر عہد نبوی کام کرتا رہا تھا اور اس کے نمائندے اپنے اپنے فرائض برابر انجام دیتے رہے تھے۔ تقریباً تمام ماخذ کا اتفاق ہے کہ نقیب النقباء حضرت اسعد بن زرارہ کے شوال ۱ھ / مارچ ۶۲۳ء میں انتقال کے بعد بنو النجار کے لوگوں نے،

جن کے وہ خاندانی نقیب بھی تھے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ ان کے لئے کسی نئے نقیب کی تقرری فرما دیں۔ آپ نے بجائے کسی نئے نقیب کو مقرر کرنے کے خود یہ ذمہ داری سنبھال لی تھی[۲۲۱]۔ اس سے کم از کم مدینہ کے ابتدائی عہد نبوی میں نقیبوں کے ادارے کا کام کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہاں اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہے کہ حضرت اسعد بن زرارہ کی جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فریضہ سنبھالنا محض اس سبب سے نہ تھا کہ آپ اپنی پر دادی کے ذریعہ بنو النجار کے رشتہ دار اور عزیز تھے بلکہ اس بنا پر بھی تھا کہ آپ اب تمام مسلمانوں کے سردار کی حیثیت سے نقیب النقباء بھی بن گئے تھے۔ بہر حال اس کے علاوہ دوسرے واقعات اور حقائق بھی اس ادارہ کی کارکردگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں ایک اور نقیب حضرت براء بن معرور جن کا تعلق بنو سلمہ کے گھرانے سے تھا صفر سنہ ۱ھ اگست ۶۲۲ء میں انتقال کر گئے[۲۲۲] یعنی انکا انتقال ہجرت نبوی سے ایک ماہ قبل ہو گیا تھا۔ بہر حال آپ کی آمد مدینہ کے بعد ہی کسی وقت حضرت براء کی جگہ ان کے فرزند حضرت بشر کو ان کے خاندان کا نقیب مقرر کیا گیا جیسا کہ اسد الغابہ کا خیال ہے[۲۲۳]۔ افسوس یہ کہ اس تقرری کے زمانے کی تصریح و تعیین نہیں کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا ماخذ تین مزید انصاریوں کا ذکر کرتا ہے جن کو عہد نبوی میں نقیب مقرر کیا گیا تھا۔ یہ تھے حضرات عمرو بن جموح جو خزرج کے خاندان بنو سلمہ کے نقیب تھے[۲۲۴]۔ رافع بن خدیج جو اوس کے خاندان عمرو بن مالک کے نقیب مقرر ہوئے تھے[۲۲۵] اور مسیب بن عمرو جن کے خاندان اور میدان کار کا ذکر نہیں ملتا[۲۲۶]۔ ان تینوں کے معاملے میں بھی زمانۂ تقرری کی تصریح نہیں ملتی مگر حضرت رافع بن خدیج کے معاملے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تقرری کم از کم غزوہ احد کے بعد ہوئی ہو گی کیونکہ وہ اس وقت تک نہ صرف نابالغ تھے بلکہ اس عہدہ کے لائق نہ تھے۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ یہ نقیب کس طرح کام کرتے تھے اور کیا کام کرتے تھے ہم نہیں جانتے البتہ بعد میں اموی اور عباسی ادوار میں عباسی اور علوی نقیبوں[۲۲۷] کے کارناموں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنظیم جماعت کا کام کرتے تھے اور ان کا مقصود و مطلوب اپنے حامیوں اور ہمنواؤں کی صفوں میں اتحاد، سماجی، فوجی اور سیاسی ہم آہنگی اور اجتماعیت پیدا کرنا ہوتا تھا۔ ان کے کام کرنے کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ہر نقیب اپنے اپنے علاقہ میں ایک تنظیمی مرکز قائم کرتا تھا۔ اور اپنے حامیوں خاص کر داعیوں (دعاۃ) کو جن کی کل تعداد ستر تھی مبلغین و معلمین و منتظمین کی حیثیت سے مختلف علاقوں میں بھیجتا تھا اور ان کے ذریعہ سے دعوت پھیلایا کرتا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس نہج پر اموی دور میں عباسی دعاۃ اور نقیبوں نے عباسی انقلاب کے لئے کامیاب کوششیں کی تھیں[۲۲۸]۔ جبکہ عباسی دور میں اسی طرح علوی نقیبوں اور داعیوں نے کام کیا تھا مگر وہ اپنی تنظیمی خامیوں کے سبب کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئے تھے۔ چونکہ یہ عباسی اور علوی نقیب ان کے سرداروں کے دعوؤں کے مطابق اسوۂ نبوی پر منظم و مرتب کئے گئے تھے۔ اس لئے یہ خیال ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں بھی اولین اسلامی نقیبوں نے اس طرح اپنے مراکز قائم کر کے اپنے نمائندوں / داعیوں اور مددگاروں کے ذریعہ اسلامی جماعت کی شیرازہ بندی کی تھی۔ اور مقامی نظم و نسق میں ہاتھ بٹا کر اسلامی ریاست کی بیش بہا خدمت انجام دی تھی۔ دونوں میں فرق یہ تھا کہ نبوی نقیب حکومت و ریاست کے وفادار اور حامی تھے تو عباسی اور علوی نقیب حکومت وقت کے مخالف اور باغی تھے۔

۴۔ قضاۃ (قاضی)

یہ غلط فہمی عام ہو گئی ہے اور کم از کم جدید مؤرخین اور مستشرقین کی حد تک راسخ بھی ہو گئی ہے کہ قضا (عدل و انصاف) کا ادارہ عہد نبوی میں ارتقا پذیر نہیں ہو سکا تھا۔ اس غلطی اور غلط فہمی کے شائع ہونے کا اصل سبب مستشرقین اور جدید مؤرخین کی وہ طافنوز تحریریں ہیں جو انہوں نے اس موضوع پر سپرد قلم کی ہیں اور جو عموماً جدید نظام عدلیہ کی روشنی میں اسلام کے کلاسیکی زمانے کے نظام عدل و انصاف کا مطالعہ کرتے ہیں۔ بہر حال مآخذ پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اس نظام کے فعال و موجود ہونے کے وافر ثبوت اس عہد مبارک میں ملتے ہیں اور متاخر مسلمان مصنفین نے تو اس موضوع پر بڑا وسیع اور قیمتی ذخیرہ چھوڑا ہے[۳۲۹]۔ بہر حال قرآن کریم کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عدل و انصاف کا نہ صرف سرچشمہ قرار دیا گیا ہے بلکہ آپ کے فیصلوں کو واجب التعمیل اور حکم ناطق ہونے کے علاوہ مسلمانوں کو ان کو بلا کسی جھجک اور دل کی کھٹک کے قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سیاسی طور پر بھی یہ انصاف کا تقاضا ہے کہ اسلامی ریاست کی عدلیہ کے سربراہ ہونے کا منصب آپ ہی کو عطا کیا جاتا۔

مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ عدل و انصاف کے سب سے بڑے قاضی یا حاکم کی حیثیت سے یا بطور عدالت عالیہ و مطلقہ کے آپ نے مدنی دور میں متعدد مقدمات کا فیصلہ فرمایا تھا، جن میں سے بعض کا حوالہ مذکورہ بالا ابواب میں آچکا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک یہودی زانی، ایک یہودی چور اور ایک مسلم زانی مرد اور چور عورت کے مقدمات میں آپ کے فیصلے بڑے اہم تھے۔ آپ کے نظم و نسق کے اس پہلو کی حیثیت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ متعدد مسلم مصنفین نے آپ کے مقدمات اور فیصلوں پر بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہیں اور جن میں کر ان کو جمع کر دیا ہے[۳۳۰]۔ کتانی نے ان کو مختلف فصول اور ذیلی فصول میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک پر خاصی مفصل بحث کی ہے[۳۳۱]۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرکزی اور صوبائی قاضیوں پر بھی ایک علیحدہ فصل میں بحث کی ہے[۳۳۲]۔ کثیر قضاۃ نبوی میں سے آٹھ حضرات کا نام بنام ذکر ملتا ہے۔ یہ تھے حضرات عمر، علی، معاذ بن جبل، عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب زید بن ثابت، ابو موسیٰ اشعری، عقبہ اور معقل بن یسار[۳۳۳]۔

یہاں یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ عہد نبوی کے تمام قاضی چاہے وہ مرکز اسلام مدینہ میں مقرر ہوئے ہوں یا صوبوں اور ولایتوں میں ان کی حیثیت مقامی افسران قضاء و انصاف کی تھی۔ یعنی ان کے اختیار اور اقتدار کی وسعت و احاطہ دوسرے قاضیوں پر نہیں تھی اور صوبائی یا مقامی قاضی ان کے ماتحت نہیں تھے۔ یہ اختیار تنہا ذات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ جو قاضی القضاۃ یا پوری اسلامی مملکت کے قاضی تھے۔ جن کا اختیار نہ صرف دوسرے قضاۃ پر حاوی و جاری تھا بلکہ وہ ان کے فیصلوں کو کالعدم قرار دے سکتے تھے۔ بہر حال کچھ مدینہ کے مرکز میں قاضی مقرر کیے گئے تھے اور کچھ کو ولایات میں۔ موخر الذکر میں قضاء کے فرائض عموماً گورنر یا والی انجام دیتا تھا۔ جیسا کہ حضرات معاذ بن جبل، ابو موسیٰ اشعری اور ابو عبیدہ بن جراح فہری وغیرہ کے بارے میں صراحتاً معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں والیوں کے فرائض و اختیارات پر گذشتہ بحث کی طرف حوالہ دیا جاتا ہے اور ان کو اب دہرانے کی ضرورت نہیں کہ تکرار اور تحصیل حاصل ہو گی۔ گورنروں اور والیوں کے علاوہ یہ اختیار کسی حد تک امراء

سالاران مہم اور عاملین صدقات کو بھی مخصوص حالات میں حاصل ہوتا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ماخذ، امیر، قاضی، جابی، محصل، اور عامل رکارکن، وغیرہ اصطلاحات کا استعمال مترادفات کے طور پر کرتے ہیں[۳۲۴]۔ بہر حال معلوم یہ ہوتا ہے کہ تمام مرکزی، صوبائی اور مقامی منتظموں کو قضا (فیصلہ کرنے) اور عدل و انصاف کے اختیارات حاصل تھے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ عہد نبوی میں تقسیم فرائض کا جدید سیاسی نظریہ موجود نہیں تھا جس کے مطابق عدلیہ، مقننہ اور عاملہ کو تین ناقابل اشتراک اور شدید شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اس زمانے میں عدل و انصاف کا فریضہ اور کام دراصل عام نظم و نسق کا حصہ تھا۔ اور کوئی افسر و عامل نبوی اسکی انجام دہی کا مجاز تھا

بہر حال عہد نبوی میں قضا کے اس مستقل بندوبست کے علاوہ ماخذ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مواقع پر اپنی موجودگی ہی میں بعض اصحاب سے مقدمات فیصل کرائے تھے۔ ترمذی، احمد بن حنبل اور حاکم کی بعض روایات سے معلوم ہے کہ تین مختلف مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متصادم و متخاصم فریقین (خصمان) کے درمیان جو خدمت نبوی میں اپنے مقدمات لیکر آتے تھے۔ حضرات عمر بن خطاب، معقل بن یسار اور عقبہ سے فیصلے کرائے تھے۔ اور انکے فیصلوں کو پسند بھی کیا تھا[۳۲۵]۔ ظاہر ہے کہ اس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی ریاست کے ان افسروں کو اپنی موجودگی میں تربیت دیں اور وقت کے روز افزوں مسائل کے حل کے لئے ایک عدلیہ کا نظام بھی مرتب کریں جو آپ کی موجودگی کا محتاج نہ ہو۔ اس نبوی نقطہ نظر کا بہترین اظہار آپ کے حضرت معاذ بن جبل کے درمیان اس گفتگو سے ہوتا ہے جو موخر الذکر کے بطور گورنر جنرل یمن جانے سے پہلے ہوئی تھی۔ اسی طرح یہ بھی نتیجہ نکالنا جائز ہے کہ عہد نبوی میں مختلف اصحاب قضاء اور عدل و انصاف کا کام مستقل طور سے آزادانہ کیا کرتے تھے اور اختلاف کی صورت میں یا فریقین میں سے کسی کی بے اطمینانی کی صورت میں مقدمات آپ کی عدالت میں بھی لائے جاتے ہوں گے، جہاں آپ ان کی توثیق یا تردید کرتے تھے۔ اس کی مزید تصدیق متاخر مصنفین کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ آپ نے صرف اکا دکا اصحاب سے ہی مقدمات فیصل نہیں کرائے تھے بلکہ مستقل طور سے ایک پورے گروہ (جماعت) کو اس کے لئے مقرر کر دیا تھا[۳۲۶]۔ صبح الاعشیٰ کے مطابق عہد نبوی میں اور بعد کے زمانے میں بھی قاضی کا کام یہ تھا کہ وہ شریعت کے تمام امور کے سلسلہ میں فریقین کے اختلافات اور جھگڑوں کو طے کیا کرتے[۳۲۷]۔ اس میں دیوانی اور فوجداری دونوں کے مقدمات شامل تھے۔ بہر حال جب بھی قاضی مناسب سمجھتے تھے تو وہ بعض پیچیدہ مقدمات اور معاملات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے لے لیتے تھے۔ کیونکہ دراصل آپ ہی اسلامی ریاست کی عدالت اعلیٰ تھے۔

۵- بازار کا انتظام اور اس کے افسر

چودھویں صدی عیسوی کے ایک عظیم ہندوستانی مورخ ضیاء الدین برنی کے مطابق بازاروں کا نظم و نسق ہمیشہ قرون وسطیٰ کی حکومتوں کے لئے دردسر رہا ہے۔ کیونکہ تاجر و سوداگر اور دوسرے بازار کے لوگ انتہائی شاطر، فریبندہ صفت اور عیار و مکار رہے ہیں۔ ان پر قابو پانا ایک امر محال رہا ہے[۳۲۸]۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام نے جو سماج کے تمام طبقات

کے عمل وکردار کی پاکیزگی کا علمبردار ہے۔ تاجروں اور بازار کے لوگوں کے عمل وکردار کی بھی صحیح تعبیر وتشکیل کرنا چاہتا تھا چنانچہ قرآن کریم اور احادیث نبوی میں اس قسم کی بہت سی ہدایات اور احکام ملتے ہیں۔ انتظامی طور سے یہ اسلامی ریاست کے سربراہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ شرعی حدود کے اندر بازاروں کے نظم ونسق کے لئے اقدامات کرے کیونکہ محض اخلاقی وروحانی تعلیمات کسی نظام کی بقا اور اثر کے لئے کافی نہیں ہوا کرتیں۔ چنانچہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس بازاروں کا چکر لگاتے اور دورہ کرتے تھے اور تاجروں اور خریداروں دونوں کے اعمال واخلاق کی درستگی کے لئے برابر احکام و ہدایات جاری کیا کرتے تھے۔ ترمذی کی روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ کا گذر ایک بازار سے ہوا اور آپ نے وہاں ایک شخص کے پاس گیہوں کا ڈھیر دیکھا جو وہ فروخت کے لئے لایا تھا۔ آپ نے اس ڈھیر میں اپنا ہاتھ ڈال دیا تو دیکھا کہ وہ اندر سے نم ہے۔ آپ نے تاجر کو سرزنش کی اور دھوکہ دینے سے منع کیا[٣٣٩]۔ اسی طرح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غلہ واناج کی ایک جگہ خرید وفروخت کو بھی آپ نے ممنوع قرار دیا تھا[٣٤٠]۔ آپ نے اناج کے تاجروں کو جو مجازفہ[٣٤١] طریق تجارت سے خرید و فروخت کرتے تھے، دوہری تجارت کرنے کی ممانعت کی تھی تاآنکہ وہ اپنے علاقہ یا قیام گاہوں (رحال) تک نہ پہنچ جائیں[٣٤٢] اناج کی خرید وفروخت صرف بازاروں میں یا ان مقامات پر جائز قرار دی گئی تھی جہاں وہ عام طور سے ہوا کرتی تھی[٣٤٣]۔ اس قسم کی تمام ہدایات کا مقصود یہ تھا کہ اناج کے تاجروں کی باقاعدہ نگرانی کی جا سکے اور ان کے پر فریب طریقوں کا انسداد کیا جا سکے۔

اس مقصد کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بازار کے مختلف افسروں کی تقرری بھی کی تھی۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے فوراً بعد آپ نے بنو امیہ کے خاندان سعیدی کے ایک فرد حضرت سعید بن سعید بن العاص کو مکہ کے بازار کا افسر (السوق) مقرر کیا تھا[٣٤٤]۔ مکہ کی اقتصادی دولت اور اس کی تجارت پر کلی انحصار کی حقیقت کے پس منظر میں یہ تقرری بہت اہم تھی۔ اسی طرح حضرت عمر بن خطاب کو آپ نے مدینہ کے بازار کا افسر مقرر کیا تھا[٣٤٥]۔ اور یہ ظاہر و بین حقیقت ہے کہ مدینہ کا بازار خاصی بڑی تجارتی اہمیت کا حامل تھا۔ اس لئے یہ تقرری بھی خاصی اہم تھی۔ مگر اس تقرری کا زمانہ نہیں معلوم ہو سکا۔ اندازہ یہ ہے کہ یہ تقرری شروع ہی میں عمل میں آگئی تھی کیونکہ مدینہ کے یہودی تاجروں کے علاوہ جو اپنے پر فریب اقتصادی اور تجارتی معاملات کے لئے مشہور ہے۔ کچھ انصاری اور تمام تر مہاجرین بھی تجارت میں لگ گئے تھے[٣٤٦]۔ اس کے علاوہ قرب وجوار کے تاجران عرب اور شام جیسے دور دراز علاقوں تک کے نبطی تاجر بھی وہاں آتے تھے[٣٤٧]۔ گویا کہ وہ ایک بین الاقوامی تجارتی منڈی تھی اور ایسے اہم تجارتی مرکز کے نظم وانتظام کے لئے حضرت عمر فاروق جیسے عظیم و دوربین منتظم ہی کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ یہ دونوں افسران وعمال بازار نبوی مستقل افسر تھے۔ اگرچہ حضرت سعید بن سعید اموی جلد ہی ایک مہم میں شہید ہو گئے تھے۔ نگران کی جگہ قیاس کے مطابق کسی اور افسر کا تقرر ضرور عمل میں آیا ہو گا۔ بہرحال قرائن کہتے ہیں کہ تمام بڑے بازاروں اور تجارتی مراکز کے لئے اس قسم کے افسر مقرر کئے جاتے تھے۔ اگرچہ ان کے بارے میں تاریخی شواہد کم ملے ہیں اور جہاں اس قسم کے مخصوص افسر نہیں تھے۔ وہاں بازاروں کی نگرانی اور ان کا نظم ونسق، مرکزی منتظمین، گورنروں اور مقامی منتظموں کے فرائض واختیارات میں شامل تھا کہ یہ بھی عام نظم ونسق کے شعبے کے دائرہ کار میں آتا تھا۔

خلاصہ بحث

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریاست اسلامی کے سربراہ کی حیثیت سے جس قسم کے نظام حکومت کی بنیاد ہجرت کے بعد ڈالی تھی وہ رفتہ رفتہ دس سال کی مدت میں ترقی کے مختلف مراحل سے گذرتا ہوا نقطۂ کمال کو پہنچا تھا۔ عربوں میں ایک تو قبائلی سیاسی نظام تھا جس میں ہر قبیلہ آزاد و خود مختار ہوتا تھا اور جس کا نظام حکومت اگر کوئی تھا تو وہ باہمی تعاون یا اشرافیہ کے اصولوں پر چلایا جاتا تھا۔ اس قدیم قبائلی نظام میں شراکت کا اصول کارفرما تھا۔ کہ ایک قبیلہ کے تمام خاندانوں کے سارے سربرآوردہ اور شیوخ کی ایک مجلس بنتی تھی جو مکی اشرافیہ میں ملاء کہلاتی تھی اور یہی تمام قریشی معاملات کی دیکھ بھال کرتی تھی اس نظام میں مرکزیت نہیں تھی۔ لیکن دوسرا نظام جو عربوں میں معروف اور جزیرہ نمائے عرب کے سرحدی علاقوں میں رائج تھا۔ بادشاہت (ملوکیت) کا تھا اور وہ کلی طور سے مرکزیت کا حامل تھا۔ مگر جہاں دوسری خرابیاں تھیں۔ عربوں کو جب بھی خیال آیا تو انہوں نے مرکزیت کی خاطر اسی نظام بادشاہی کو اختیار کرنا چاہا۔ جیسا کہ علامہ وقت سید سلیمان ندوی نے واضح کیا ہے۔ کہ یہ غلط فہمی عام ہوگئی کہ عربوں کے نزدیک بادشاہت یا ملوکیت ناپسندیدہ طرز حکومت تھی۔ دراصل عربوں کو جو چیز اس نظام کی ناگوار تھی وہ اس کی حد سے بڑھی ہوئی مرکزیت تھی۔ جس میں ان کی آزادروی کی گنجائش نہیں تھی۔ بہرحال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں نظاموں سے مختلف اسلامی نظام حکومت قائم کیا تھا۔ جس میں افراد اور شخصی آزادی کی فطری رعائت بھی رکھی گئی تھی اور اجتماعیت اور مرکزیت کے اصولوں کو بھی پوری طرح سے بروئے کار لایا گیا تھا۔ اس نظام نبوی میں انفرادی آزادی اور خودمختاری اجتماعیت اور مرکزیت کی دشمن اور متصادم نہیں بلکہ اس کی ممد و معاون اور تصدیق کرنے والی تھی۔

عصری ضرورتوں اور نئے حالات کے تقاضوں کے تحت حکومت اور انتظامیہ کے شعبے بھی وجود میں آتے گئے اور آپ نے ان میں مختلف سیاسی و انتظامی تجربات کئے اور ان کو رفتہ رفتہ ارتقائی شکل دیتے گئے چنانچہ تاریخی توقیت کے مطابق سب سے پہلے نائبین رسول یا خلفاء رسول کا طبقہ انتظامیہ وجود میں آیا۔ ہجرت کے پہلے سال ہی آپ کو مدینہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش آئی اور اس غیر حاضری میں آپ نے مدینہ کی نوزائیدہ ریاست کے معاملات کی دیکھ بھال اور اسلامی امت کے مفادات کی نگرانی کی خاطر شہر میں اپنا ایک خلیفہ۔ نائب چھوڑا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد معمول ہو گیا کہ آپ جب کبھی باہر تشریف لیجاتے اپنے پیچھے ایک جانشین چھوڑ جاتے جو عموماً نماز کا امام یا امیر کہلاتا تھا مگر وہ آپ کا سیاسی و انتظامی جانشین ہوتا تھا اور آپ کی غیر حاضری میں سربراہ مملکت کا قائم مقام بھی اس طرح پورے عہد نبوی میں کل ۳۱ تقرریاں اس شعبہ افسران میں ہوئی تھیں مگر نواب رسول کی کل تعداد صرف ۱۳ تھی۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے متعدد کی تقرری ایک سے زیادہ مرتبہ ہوئی تھی، اور سب سے اہم شخصیت حضرت ابن ام مکتوم عامری کی تھی جو اس منصب جلیل پر تیرہ بار فائز ہوتے تھے۔ اسی سے یہ نکتہ بھی آشکارا ہوتا ہے کہ نائبین رسول کا عہدہ تو مستقل تھا اور مستقبل میں منارۂ نور بننے والا تھا۔ مگر عہد نبوی میں اس کے عہدیدار عارضی ہوتے تھے۔ کیونکہ مستقل سربراہ مملکت موجود و باحیات تھے۔ دوسرے شعبوں میں تقرری کی بنیادوں کی طرح اس شعبہ میں بھی وہ صرف

لیاقت اور موزونیت تھی مگر یہ عہدہ اعزازی تھا کہ عہدیدار کو کوئی تنخواہ یا مالی منفعت نہیں حاصل ہوتی تھی۔

اسلام کے سیاسی نظام میں سربراہ ریاست کے لئے مشورہ کرنا، امت کے افراد سے رائے لینا اور مباحثہ کرنا تو ضروری ہے۔ لیکن کم از کم عملاً مشیروں کا مشورہ مان لینا عہد اسلامی کے زریں عہد میں کبھی کبھی لازمی اور ناگزیر نہیں رہا۔ بہر حال اس حکم الٰہی کے موجب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے تمام اجتماعی معاملات چاہے وہ سیاسی ہوں، انتظامی ہوں، سماجی یا اقتصادی اور حتیٰ کہ مذہبی ہوں۔ آپ مسلمانوں کے اہل رائے سے مشورہ ضرور کرتے تھے اور اکثر و بیشتر ان پر عمل بھی کرتے تھے۔ لیکن یہ آپ کا اختیار تھا کہ انہیں تسلیم کریں یا مسترد کریں۔ اس عہد میں مجلس شوریٰ کی کوئی خاص شکل نہیں تھی اور نہ ہی مشیران حکومت کے لئے کسی قسم کی شرائط متعین تھیں۔ اصولاً ہر مسلم مشورہ دے سکتا تھا لیکن آپ عملاً مسلمانوں کے مرکز کے سربرآوردہ اور اہل رائے کے ایک مخصوص طبقے سے ہی رائے لیتے تھے۔ کبھی کبھی آپ پوری امت اسلامی کے مرکزی نمائندوں کو بھی جمع کر لیتے تھے جنگی معاملات میں آپ کے مشورہ لینے کے بہت کثیر حوالے ملتے ہیں اور اس ضمن میں سب سے بڑے مشیر نبوی حباب بن منذر خزرجی تھے۔ اگرچہ دوسرے شعبہ ہائے حیات میں مشورہ لینے کی اتنی شہادتیں نہیں ملتی تاہم یہ نتیجہ نکالنے کے لئے کافی ہیں کہ آپ کی حکومت شوریٰ کے نظام پر قائم تھی کہ یہی صفت جماعت مؤمنین تھی۔ آپ کے دوسرے مستقل مشیروں میں حضرات ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کا درجہ سب سے بلند تھا اور تمام مشیران نبوی فی سبیل اللہ یہ کام انجام دیتے تھے۔

حکومت کا کام جوں جوں پھیلتا گیا اور اسلام کی جوں جوں تکمیل ہوتی گئی توں توں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مددگاروں اور سیکریٹریوں کی ضرورت اور دستاویزات وغیرہ لکھوانے کی حاجت بڑھتی گئی۔ جاہلی عربوں میں لکھنا پڑھنا اگرچہ وصف محمود تھا تاہم عملاً اس کے جاننے والے لوگ کم تھے خاص کر بدوی اور نیم متمدن علاقوں میں۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک عظیم صفت آپ کا امی ہونا تھا۔ لیکن آپ نے "کتابت" کی فن کی بڑی حوصلہ افزائی کی کہ یہی اسلام کا تقاضا بھی تھا۔ مسلمانوں کے لئے مذہبی اور سیاسی دونوں لحاظ سے قرآن کریم کی حفاظت سب سے بڑا کام تھا۔ جو کتابت کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مکی عہد سے آپ نے قرآن کی نازل شدہ آیات کا اہتمام و انتظام کیا تھا۔ اس ابتدائی دور میں اس کے کاتبین میں حضرات شرحبیل بن حسنہ کندی، عثمان بن عفان اموی اور علی بن ابی طالب ہاشمی سرفہرست تھے۔ مدنی دور میں یہ سعادت مستقل طور سے حضرات ابی بن کعب خزرجی، زید بن ثابت خزرجی اور معاویہ بن ابی سفیان اموی کو حاصل ہو گئی تھی۔ قرآن کریم کے علاوہ سیاسی دستاویزات جیسے قبیلوں سے معاہدے، افراد و قبائل کو خط ضمانت اور پروانۂ قطائع آراضی، گورنروں اور عاملوں یا عوام الناس کے نام فرامین و سرکاری خطوط اور غیر ملکی یا ملکی حکمرانوں کے نام خطوط وغیرہ بھی لکھوائے جاتے تھے اور ان کی کتابت کے کبھی کبھی الگ اور مخصوص افسران کتابت ہوتے تھے۔ اسی طرح انتظامی معاملات جیسے اموال غنیمت میں مسلمانوں اور ریاست کے حصص، صدقات و عشور و جزیہ وغیرہ کی رقوم اور پیداوار اراضی کے اعداد و شمار رکھنے کی غرض سے مستقل افسران کتابت یا کاتبین مقرر کئے گئے تھے۔ یہ اسلامی ریاست کا دراصل دیوان رسالت تھا جو عہد نبوی میں شروع ہو کر بعد میں خلافت راشدہ اور اموی و عباسی عہد میں ارتقا پذیر ہوا تھا۔ عہد نبوی میں کاتبین مستقل، نیم مستقل اور عارضی اور جز وقتی ہوتے تھے جو اپنے اپنے فرائض اللہ کے لئے انجام دیتے تھے۔ نامہائے گرامی کا طرز تحریر سادہ، مبالغہ و غلو سے

پاک اور مختصر ہوتا تھا۔ عموماً نامہ مبارک کا آغاز اللہ کے نام سے ہوتا تھا اور کاتب اور مکتوب الیہ کے ناموں کے بعد دعائیہ کلمات ہوتے تھے۔ جن کے بعد اصل متن ہوتا تھا۔ نامہ کا خاتمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر مبارک پر ہوتا تھا۔ جو اصل میں آپ کی انگوٹھی تھی اور اس پر محمد رسول اللہ کندہ تھا۔ مآخذ کے مطابق جب بھی آپ اسے استعمال نہیں فرماتے تھے تو ایک افسر خاتم کے سپرد کر دیتے تھے جو اس کی حفاظت کرتا اور بوقت ضرورت خدمت اقدس میں پیش کر دیتا تھا۔ اب تک کل کاتبوں کی تعداد ۴۴ مل سکی ہے، اور امکان ہے کہ کچھ اور بھی تھے جن کے نام محفوظ نہیں رہ سکے۔

لیکن اصل سیکرٹری کا مقام حضرت بلال حبشی کو حاصل تھا جو اس عہدہ کے صحیح معنوں میں مصداق تھے وہ آپ کے گھریلو اور نجی کاموں (حوائج) کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ متعدد سرکاری کام انجام دیتے تھے۔ ان میں سرکاری مہمانوں کی میزبانی، سرکاری رقوم کی ارشادِ نبوی کے مطابق تقسیم جن میں عطایا اور انعامات بھی شامل تھے۔ وغیرہ شمار کئے جاتے ہیں۔ غرض کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے منتظم، خازن، منادی، میزبان، محافظ اور نہ جانے کیا کیا تھے۔

اسلامی ریاست کی توسیع کے ساتھ ساتھ غیر مسلم طبقات، قبائل، اقوام اور حکمرانوں سے تعلقات و روابط کی بھی ضرورت پڑی تھی اور ان سے مختلف مواقع پر گفت و شنید کی حاجت ہوتی تھی اس کام کے لئے مکہ کے جاہلی عرب نظام میں سفارہ کا عہدہ تھا۔ جس کے آخری عہدیدار حضرت عمر فاروق تھے۔ عہد نبوی میں یہ عہدہ رسالۃ اور اس کے منصبدار رسول = رسل کہلائے اور وہ جاہلی سفیروں کے مقابلے میں عارضی ہوتے تھے۔ جبکہ ان کا عہدہ مستقل تھا۔ عام خیال ہے کہ عہد نبوی میں پہلی بار سفراء کا تقرر ۶ھ / ۶۲۸ء میں صلح حدیبیہ کے معاہدہ کے بعد ہوا تھا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ سات ملکی اور غیر ملکی حکمرانوں کو دعوت اسلام دینے کے لئے اپنے سفیروں کو بھیجا تھا۔ لیکن یہ اس شعبہ کے ارتقاء کا ایک اہم موڑ تھا۔ "رسالۃ کا عہدہ" اور "رسول" کا تقرر پہلی بار غالباً غزوہ بنو قینقاع کے زمانے میں سنہ ۲ھ / ۶۲۴ء میں ہوا تھا اور حیرت و دلچسپی کی بات ہے کہ اولین سفراء نبوی کا تقرر فوجی اور نیم فوجی مہموں کے دوران فریق مخالف سے گفتگو کے لئے کیا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ سفیروں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور بعد کے زمانے میں متعدد قبائل کے شیوخ اور غیر ملکی حکمرانوں سے گفت و شنید کے لئے بہت سے سفیر بھیجے گئے۔ عہد نبوی کے اس انتظامی شعبہ میں کل ۴۰ سفیروں کے نام ملے ہیں۔ جن کو ۴۲ بار تقرریاں ملی تھیں یعنی بعض کو ایک سے زیادہ مرتبہ یہ سعادت ملی تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کو کسی قسم کی تنخواہ ملتی تھی یا نہیں تاہم یہ حتمی ہے کہ تمام سفیروں کے سفر کے اخراجات کی کفالت کی ذمہ داری اسلامی ریاست کی تھی۔

عہد نبوی کے انتظامیہ میں ایک شعبہ افسران بکار خاص کا ہوتا تھا۔ جو مختلف قسم کے کام ارشادِ نبوی کے موجب انجام دیتے تھے۔ یہ کام اہم بھی ہوتے تھے اور معمولی نوعیت کے بھی۔ بنو قریظہ کے معاملہ میں حضرت سعد بن معاذ اوسی کی تحکیم تین مواقع پر حضرت علی ہاشمی کا دیت ادا کرنا، منافقوں کے ایک گھر اور مسجد ضرار کو منہدم کرنا، سزاؤں اور حدود کو نافذ کرنا۔ اسلامی قوانین کے نفاذ کا اعلان کرنا وغیرہ کو ان افسروں کا کام شمار کیا گیا۔ یہ طبقہ ہم نے اپنی آسانی کے لئے بنا لیا ہے۔ ورنہ حقیقتاً ایسا کوئی طبقہ اس زمانے میں موجود نہیں تھا۔ کیونکہ مآخذ اس کے لئے کسی خاص اصطلاح کا ذکر نہیں کرتے۔ یہ افسر و عمال بھی عارضی ہوتے

تھے۔ کیونکہ ان کا کام بھی عارضی ہوتا تھا۔ ایسے افسروں کی کل تعداد محض ۲۸ تک مل سکی ہے اور ظاہر ہے کہ اور بھی بہت سے ہوں گے

عربوں میں شاعری، زباندانی اور زبان آوری کے سمجھی جاتی تھی کہ وہ ان کے جذبات کی ترجمان تھی اور وہ اس کو جذبات وخیالات کے رسل ورسائل اور ابلاغ کے ایک مؤثر ذریعہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ شعراء اور خطباء کو سماج میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور بقول ایک جدید مؤرخ "وہ قوم کے قلب وضمیر کے محافظ تھے۔" اسلامی ریاست نے بھی شعراء اور خطباء کی خدمات سے فائدہ اٹھایا تھا اور ان کو سیاسی وسماجی مقاصد کے لئے استعمال کیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین شاعر حضرات حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ مدینہ کے قبیلے خزرج کے افراد اور اسلامی ریاست کے ترجمان تھے۔ وہ دشمنوں کے عقلی اور ذہنی حملوں کا جواب دیتے اور مسلمانوں، اسلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت وناموس کا دفاع کرتے تھے۔ ابن اسحاق کی سیرۃ اور دوسرے مآخذ ان کی شاعری کے نمونوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے شعراء وقتاً انفرادی حیثیت میں اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ عہد نبوی میں یوں تو متعدد خطیب تھے۔ لیکن "سرکاری حیثیت میں" صرف حضرت ثابت بن قیس شماس خزرجی نظر آتے ہیں۔ وقت کے سب سے بڑے خطیب خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے جن کے کلمات طیبات عربی ادب میں نثر کی آبرو ہیں۔

بخاری کی روایت صحیح ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت کدہ وبارگاہ نبوی پر کوئی مستقل دربان تعینات نہیں تھا مگر مآخذ سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض خاص مواقع پر جب تخلیہ چاہتے تھے یا اصلاح ومشورہ کر رہے ہوتے تھے تو کسی صحابی کو دربانی کی یہ سعادت سونپ دیتے تھے۔ یہ عارضی اور مخصوص مواقع کے لئے انتظام ہوتا تھا۔ ورنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رسول خدا اور سربراہ ریاست وحکومت دونوں حیثیتوں میں ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بلکہ ارذل ترین شہری کی پہنچ میں تھے اور ہر شخص آپ سے ہر مناسب وقت پر مل سکتا تھا۔

فتوحات اور معاہدات صلح کے نتیجہ میں جب مرکز اسلام سے خاصی دور واقع علاقے اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی کے پرچم تلے آ گئے تو ان کو مرکزی انتظامیہ سے وابستہ کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا، کہ اس کے بغیر مرکزیت نہیں پیدا ہو سکتی تھی جو اسلامی سیاسی نظام کی ایک نمایاں خصوصیت تھی چنانچہ جوں جوں علاقے جنگ کے ذریعہ (عَنوۃً) یا صلح کے ذریعہ (صُلحاً) اسلامی ریاست کا حصہ بنتے گئے توں توں ان کے لئے مرکزی منتظم (گورنر / والی مقرر ہونے گئے۔ یہ انتظامی علاقے ولایات کہلاتے تھے اور طبری کے بقول ان کے جغرافیائی حدود تھے۔ عہد نبوی کے اواخر تک ایسی ۲۷ ولایات تھیں۔ ان کے والی مستقل عہدیدار تھے۔ جن کی تقرری خوشنودی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوران قائم رہتی تھی۔ اور عملاً ان کی غالب اکثریت اپنی تقرری کے زمانے سے وفات نبوی کے زمانے تک اپنے عہدوں پر قائم وبرقرار رہی تھیں۔ صرف تین والیوں کو معزول کیا گیا تھا۔ جبکہ دو اور کا اپنے عہدے کے دوران ہی انتقال ہو گیا تھا۔ اس طرح کل ولاۃ نبوی کی تعداد ۳۲ تھی۔ والیوں کو ان کی خدمات کے لئے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن اس کی حتمی مقدار نہیں معلوم ہو سکی البتہ والی مکہ کے ضمن میں وہ سولہ سو درہم معلوم ہوتی ہے اور وہ بھی مختلف فیہ ہے۔ والیوں کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ جن میں سیاسی، انتظامی، فوجی، مالی اور عدل وانصاف وغیرہ کے اختیارات شامل

تھے۔ ان کے ماتحت مختلف افسروں کا ایک عملہ ہوتا تھا۔ جو ایک طرح سے صوبائی یا علاقائی سیکریٹریٹ کا کام کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمالی علاقوں اور جنوبی عرب کو دو بڑے انتظامی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جن پر ایک ایک منتظم اعلیٰ یا گورنر جنرل ہوتا تھا اور اس کی ماتحتی میں مختلف ولایتوں کے والی اپنے اپنے علاقوں کا نظم ونسق چلاتے تھے۔ شمال میں حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی اور جنوب میں حضرت معاذ بن جبل خزرجی گورنر جنرل تھے اور ان کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ مدینہ کے شمال میں ولایتوں کی کل تعداد آٹھ تھی۔ جبکہ جنوب میں دس تھی۔ اور باقی مرکزی اور مشرقی عرب میں واقع تھیں۔ عملاً گورنر آزاد و خود مختار ہوتا تھا۔ صرف اس کو ہدایات نبوی یا سنت اور کتاب کی پابندی کرنی لازمی ہوتی تھی۔ نئی صورتحال میں وہ اپنی رائے سے کام لینے کا مجاز تھا۔ قریش کے بطور قبیلہ ۱۲ ر والی تھے جن میں سات اموی افراد تھے اور دو ان کے حلیف۔ مدنی قبیلوں میں خزرج کے چھ والی مقرر ہوئے تھے۔ بقیہ قبائل کی نمائندگی معمولی تھی۔ بلکہ مغربی قبائل تو اس سے بالکل محروم رہے تھے۔

مدینہ کی مرکزی حکومت اور ولایتوں کی صوبائی حکومتوں کے عوام الناس سے رابطہ کا کام مقامی منتظمین کرتے تھے۔ جو عموماً قبائل اور ان کے اہم بطون کے شیوخ اور سردار تھے۔ اس لحاظ سے ان کی تعداد بہت تھی۔ ماخذ میں ان کی بہت تھوڑی تعداد کے ناموں کا ذکر ملتا ہے۔ بہرحال ان شیوخ وسادات قبائل کو ان کے قبول اسلام کے بعد اسلامی ریاست ان کے عہدوں پر عموماً برقرار رکھتی تھی۔ شاذونادر ہی ان کو ہٹایا جاتا تھا۔ البتہ جن قبیلوں کے سردار اسلام قبول نہیں کرتے تھے اور ان کے خاصے افراد مسلمان ہو چکے تھے۔ اسلامی ریاست ان مسلمانوں کا سردار اپنی طرف سے مقرر کر دیتی تھی۔ مرکزی حکومت کا یہ اختیار اس کے روز افزوں اقتدار کا اور ساتھ ساتھ مرکزیت کی اندرون ملک میں توسیع کا بین ثبوت تھا۔ کیونکہ قبیلہ کی سرداری طے کرنا قبیلہ کا اندرونی معاملہ تھا جس میں کوئی خارجی عنصر دخل نہیں دے سکتا تھا۔ ان مقامی منتظمین کے عموماً انتظامی اور مالی اختیارات وفرائض تھے۔ امن وامان قائم رکھنا اور صدقات وصول کر کے مرکزی حکومت، صوبائی حکومت یا اس کے عاملین تک پہونچانا ان کا بنیادی فرض تھا۔ جہاں تک مدینہ منورہ کا تعلق تھا۔ اس کے دونوں قبیلوں کے بارہ سردار جو نقیب کہلاتے تھے۔ اپنے اپنے لوگوں اور علاقوں کے معاملات کے ذمہ دار تھے۔ نقیب ایک مذہبی اور انتظامی یا تنظیمی ادارہ تھا۔ جو یہودی اور عیسائی شریعتوں میں بھی موجود تھا۔ اور انہیں سے اسلام میں آیا تھا۔ یہ ادارہ پورے عہد نبوی میں موجود اور کام کرتا رہا تھا۔

عدل وانصاف اور قضا کے سب سے بڑے افسر خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ مگر آپ نے متعدد اصحاب سے خود اپنی موجودگی میں مقدمات فیصل کرائے تھے۔ اور ان کو پسند کیا تھا۔ خود مدینہ میں بعض مستقل قاضی تھے جو مقدمات فیصل کرتے تھے۔ ولایتوں میں یہ اختیار عموماً گورنروں اور والیوں کو حاصل ہوتا تھا۔ جیسا کہ حضرات معاذ بن جبل، ابوموسیٰ اشعری اور ابو عبیدہ بن جراح فہری کے معاملہ سے واضح ہوتا ہے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ مقامی منتظمین کو بھی یہ اختیار محدود طور سے حاصل تھا۔ باقاعدہ قاضیوں کا تقرر بعد کے زمانے میں شروع ہوا تھا۔

اقتصادی معاملات میں بازاروں کا نظام خاصی اہمیت کا حامل تھا اور اخلاق اور اعمال کی درستگی کا بڑی حد تک انحصار اس کی صحیح کارکردگی پر تھا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اور دوسرے کاموں کی طرح بازاروں کی معاملات کی

دیکھ بھال کرتے رہتے تھے اور اقتصادی و تجارتی معاملات سے متعلق وقتاً فوقتاً احکام و فرامین جاری کرتے رہتے تھے اس کے علاوہ آپ نے مکہ اور مدینہ کے بازاروں کے دو مستقل افسر مقرر فرمائے تھے۔ جو بالترتیب حضرات سعید بن سعید اموی اور عمر بن خطاب عدوی تھے۔ دوسرے بازاروں یا تجارتی مراکز کے بارے میں اس قسم کی تقرریوں کا اگرچہ ثبوت نہیں ملتا۔ مگر یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے افسر ضرور مقرر کئے گئے تھے اور جہاں اس قسم کے افسر نہیں تھے۔ وہاں مقامی اور صوبائی منتظموں خاصکر والیوں کا یہ فریضہ تھا۔ کہ وہ بازاروں کے معاملات کی دیکھ بھال کریں۔

عہد نبوی کے شہری نظم ونسق میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلم طبقات اور علاقوں کو نمائندگی ضرور دی تھی۔ تاہم صرف یہی سیاسی عنصر تقرریوں کی اساس نہیں تھا اور نہ ہی قبائلی یا سماجی اسباب وعوامل اس کی اساس بنے تھے۔ بنیادی طور سے حکومتی مناصب کے لئے بنیاد و اساس صرف صلاحیت ولیاقت تھی۔ باقی دوسرے عوامل ضمنی یا ثانوی تھے۔ چنانچہ سبقت اسلام ایک صفت حمیدہ تھی۔ تاہم وہ بھی انتظامی یا حکومتی مناصب میں ترجیح وتقرر کا ذریعہ نہیں بن سکی تھی۔ عہد نبوی کے نظام حکومت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بیشتر عمال وافسران حکومت نسبتاً نوجوان اور متاخر مسلمان تھے اور ان کو سابقین، اولین پر ترجیح دی گئی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں سبقت نہ وجہ تقرر تھی نہ وجہ ترجیح۔

اسلامی تعلیمات نے مذہبی اور سماجی اجتماعیت و مرکزیت کی مانند سیاسی مرکزیت کی بھی تبلیغ کی تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا مدینہ کی مرکزی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو پورے جزیرہ نمائے عرب میں تسلیم کیا جائے۔ آپ کے نظام حکومت نے عملاً اس مرکزیت کو شمال سے جنوب اور مغرب سے مشرق تک جاری وساری کر دیا تھا۔ متعدد مرکزی، صوبائی اور مقامی افسران وعمال کے ذریعہ تمام علاقوں کو مدینہ منورہ کے مرکز سے جوڑ دیا گیا تھا اور ہر ایک علاقہ اور اس کے قبیلے اور ان کے لوگ اور افسر مرکزی حکومت کے ماتحت و تابع تھے۔ سیاسی مرکزیت کا یہ تصور وعمل اگرچہ عربوں کے لئے نیا تھا تاہم اسلام اور اسلامی ریاست کی قوت نے اس کو ذہنی اور عملی طور سے سب سے منوا لیا تھا اور اس طرح اس نظام حکومت کی بدولت اسلامی حکومت میں وہ سیاسی استحکام پیدا ہوا تھا۔ جس نے مسلمانوں کو ایک قوت بنا دیا تھا۔ جس سے عصری طاقتیں صرف نظر نہیں کر سکتی تھیں۔ اور تاریخ نے ثابت کر دیا کہ جلد ہی وقت کی عظیم ترین سلطنتوں نے بھی اسلام کی سیاسی قوت و حشمت کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔

باب پنجم

اسلامی ریاست کا مالی نظام

اب یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ عہدِ نبوی میں اسلامی ریاست اپنے آغاز سے اوجِ کمال تک ارتقائی مراحل سے گزری تھی۔ اس عرصے میں اسلامی ریاست نے اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے خلاف متعدد عسکری اور نیم عسکری مہیں ترتیب دی تھیں۔ ان کے نتیجے میں رفتہ رفتہ اس کا ایک عسکری نظام وجود میں آیا تھا۔ ایک اُمت اور اجتماعی اکائی کے بطور زندہ رہنے کے لیے مسلمانوں نے شہری نظم ونسق یا انتظامیہ کا ایک ڈھانچہ بھی کھڑا کیا تھا جو بعد میں اسلامی ریاست کی کارکردگی کا عملی پیکر بن گیا۔ انھوں نے پہلے اپنے تمام ہم وطنوں یعنی باشندگانِ عرب کو، اور پھر ساری دنیا کے لوگوں کو اسلامی اُمت کا رکن بنانا چاہا اور اس کے لیے پورا ایک مذہبی نظام وجود میں آیا۔ ان تمام حکومتی شعبوں اور ریاستی معاملات کے لیے اسلامی ریاست نے ایک مالی نظام بھی قائم کیا جو دوسرے شعبوں کی طرح اسلام کے معاشی و اقتصادی نظریات پر مبنی اور اس کا نمائندہ تھا۔ اب تک اسلام کے معاشی نظریات اور مالی اصولوں پر بہت کچھ وقیع اور علمی انداز میں لکھا جا چکا ہے اور خاص بحث اسلام کے زرعی، تجارتی، مالی اور دوسرے اقتصادی پہلوؤں سے متعلق نظام پر بھی کی جا چکی ہے لیکن وہ نظریاتی زیادہ ہے اور تاریخی کم۔[1] کم از کم اس میں تاریخی عوامل کا تجزیہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس بحث میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کے عملی اور حقیقی نظامِ مالیات سے اس طور سے بحث کی جائے کہ اس کے ہر پہلو کا تاریخی ارتقا واضح طور سے اُجاگر و نمایاں ہو سکے۔

۱۔ مسلمانوں کی اقتصادی حالت

تاریخی توقیت کا تقاضا ہے کہ اس بحث کا آغاز مسلمانوں کی عمومی اقتصادی حالت سے کیا جائے۔ اگرچہ اسلامی ریاست کے مالی نظام کا تعلق عہدِ نبوی کے زمانے سے ہے لیکن اس کا خاصا اہم تعلق مکی دور سے بھی ہے کہ مسلمانوں کا ایک خاصا بڑا طبقہ مکہ سے مہاجرت کر کے مدینہ پہنچا تھا۔ مکی مسلمانوں کی معیشت و اقتصادی حالت کے بارے میں قدیم وجدید، مسلم وغیر مسلم مورخین و سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ ان میں مالدار و متمول بھی تھے اور غریب و نادار بھی۔[2] مسلم مورخین اور علماء کا عموماً رجحان دولت کے جمع کرنے کے خلاف ہے اس لیے وہ نہ صرف فقر و فاقہ کی افضلیت کا دعویٰ کرتے ہیں بلکہ یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ اولین مسلمانوں کا تعلق زیادہ تر ناداروں اور معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے کمزوروں یا کمزور طبقات سے تھا۔[3] حالانکہ یہ قطعی صحیح نہیں ہے۔ تاریخی حقائق شہادت دیتے ہیں کہ مکی مسلمانوں کے اقتصادی لحاظ سے تین طبقے تھے۔ پہلا طبقہ خاصے متمول اور مالدار مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ اگرچہ یہ طبقہ مکی معیشت کے پس منظر میں تاجرانِ مکہ کی صفِ دوم میں آتا تھا تاہم وہ خاصا مالدار تھا۔ ان میں

حضرات عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبید اللہ، عبد الرحمٰن بن عوف، خدیجہ بنت خویلد، ابوبکر بن ابی قحافہ، عمر بن خطاب، عبد اللہ نحام وغیرہ شامل تھے یہ وہ لوگ تھے جو مکی اقتصاد اور معیشت میں اپنی تجارتی حیثیت بنا چکے تھے اور آزاد و خود مختار تاجر کی حیثیت سے اپنی چھاپ قائم کر چکے تھے۔(۴) مکی مسلمانوں کے دوم طبقہ میں قریشی اشراف کے خاندانوں کے نوجوان فرزندانِ دل بند شامل تھے جو اپنی اقتصادی و تجارتی حیثیت کے لیے اپنے خاندانوں پر منحصر تھے اور ابھی تک اپنی آزاد تجارتی حیثیت نہیں قایم کر سکے تھے۔ وہ ابھی ابھرتے ہوئے تاجر تھے جو دنیائے تجارت میں اپنی پہچان قایم کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ اقتصادی لحاظ سے اسی طبقہ میں وہ مکی مسلمان بھی شامل تھے جو اگرچہ آزاد حرفت والے اور دستکار تھے۔ لیکن ان کی آمدنی اوسط درجہ کی تھی۔ مسلمانوں کے وہ نوجوان تاجر بھی اسی طبقہ میں شمار کیے جانے چاہئیں جو درجہ اول کے مسلم تاجروں کے ساتھ شراکت کی بنیاد پر مکی تجارت میں اپنی جگہ بنا رہے تھے۔(۵) اور تیسرا مسلم طبقہ ان افراد والوں پر مشتمل تھا جو غلام تھے یا اجیر یا ایسے لوگ جن کی آمدنی ان کے مصارف کی کفالت معمولی درجہ میں یا بقدرِ کفاف کر پاتی تھی۔(۶) یہی وہ نادار و مفلس مسلمان تھے جن کو سماجی لحاظ سے ضعفاءُ المسلمین میں سب سے اونچا مقام حاصل تھا۔

ظاہر ہے کہ مکی سماج میں مسلم اجتماعی معیشت کی آزادی کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ مسلمانوں کا نہ کوئی مالی نظام تھا نہ کوئی اجتماعی اقتصادی تنظیم۔ لیکن سماجی اور مذہبی اجتماعیت اور اُمتِ مسلمہ واحدہ سے یکساں تعلق کے احساس نے مسلمانوں میں اقتصاد و معیشت کے میدان میں یہ شعور پیدا کر دیا تھا کہ ان کے مالداروں نے اپنے اقتصادی طور سے کمزور دینی بھائیوں کے لیے اپنے مال میں ان کا "حق" تسلیم کر لیا تھا اور حضرات ابوبکر و عثمان جیسے مسلمان اپنی دولت کا خاصا بڑا حصہ اپنے دینی رفقا کی اقتصادی و معاشی ضروریات پر خرچ کیا کرتے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ بوقتِ اسلام حضرت ابوبکر صدیق کے پاس چالیس ہزار درہم نقد تھے لیکن تیرہ برس کے بعد یہ "اصل مال"، گھٹ کر صرف چار ہزار درہم یا اس کے لگ بھگ رہ گیا تھا۔(۷) اور بیشتر مال مسلمانوں کی ضروریات پر صرف ہو چکا تھا۔ حضرت عثمان غنی مکہ کے مالدار ترین مسلمانوں میں بلکہ ایک حد تک مالدار ترین مکیوں میں شمار ہونے لگے تھے مگر ہجرتِ مدینہ کے وقت ان کے پاس صرف سات ہزار یا اس کے مساوی رقم رہ گئی تھی۔(۸) مکہ میں مسلمانوں کا اجتماعی اقتصادی نظام اگر کوئی تھا تو وہ امداد باہمی کے اصولوں یا طریقوں پر مبنی تھا۔

عہدِ نبوی کے مدنی دور میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت کے بارے میں سخت غلط فہمی عام ہو گئی ہے۔ مسلم مورخین نے اکثر و بیشتر یہ فرض کر لیا کہ قریشی اشراف و رؤساءِ مکہ کی روک ٹوک کے سبب مکہ کے مسلمان ہجرت کے وقت مکہ سے کچھ بھی ساتھ نہیں لے جا سکے تھے اور بالکل "نگھرے" مدینہ پہنچے تھے اس لئے ان کی معاشی ضروریات کی تکمیل و تسکین کلی طور سے انصارِ مدینہ ——— اوس و خزرج ——— کے مسلمانوں کی فیاضی و سخاوت، مہمان نوازی و میزبانی اور مالی و اخلاقی نصرت و امداد کی مرہونِ منت تھی۔ ان مورخین کا یہ بھی خیال ہے کہ اسی فیاضی و سخاوت بلکہ دولت و جائداد میں شراکت کے سبب مکی مسلمانوں کو اقتصادی طور سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا موقع ملا اور بعد میں اموالِ غنیمت میں حاصل شدہ جائدادوں نے اور ان کی اپنی تجارت و زراعت نے نہ صرف مکی مسلمانوں کی اقتصادی حالت بہتر بنائی بلکہ مدینہ کی مسلم معیشت کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف مستشرقین کا خیال ہے کہ نادار و مفلس مکی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جب مدینہ پہنچی تو وہ مقامی معیشت کے لیے بوجھ بن گئی اور انصارِ مدینہ کی پہلے سے دگرگوں

معیشت نے بالآخر کچھ دنوں تک لڑکھڑانے کے بعد بالکل ہی دم توڑ دیا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا کہ وہ جاہلی عرب کے مسلمہ دستور کے مطابق مدینہ کے قریب سے گزرنے والے کاروانوں کی لوٹ مار کریں۔ مالا مال مکی تجارتی کاروانوں نے جو مکہ سے شام جاتے ہوئے مدینہ کے قریب سے گزرتے تھے "رزیہ" کی ترغیب دی اور بالآخر معاشی دباؤ اور اقتصادی مجبوریوں نے چھین جھپٹ کے تصور کو عملی جامہ پہنا دیا اور بدر سے پہلے کی تمام ابتدائی مہمیں اسی مقصد کے لیے وجود میں آئی تھیں۔ گویا کہ تمام غزوات و سرایائے نبوی عموماً اور ابتدائی مہمیں خصوصاً اسی لوٹ مار کا نتیجہ یا شاخسانہ قرار پائیں۔[9]

بوقتِ مہاجرت مسلم معاشی حالت اور مسلم معیشت میں اموالِ غنیمت کے تناسب پر مکمل بحث تو کہیں اور کی جا چکی ہے[10] جسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم یہاں توفیقی و تاریخی تقاضوں کی تسکین کی خاطر یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نہ مسلم مہاجرینِ مکہ بالکل نادار و مفلس اور خالی ہاتھ مدینہ پہنچے تھے اور نہ ہی مدنی مسلم معیشت اتنی دگرگوں تھی کہ مسلمانوں کو روزی روٹی چلانے کے لیے لُوٹ مار کی حاجت ہوتی۔ مہاجرینِ مکہ میں متمول بھی تھے اور اوسط درجہ کے مالدار بھی اور نادار و مفلس بھی۔ دراصل مکی مسلم معیشت کے تینوں طبقات اپنی مکمل معاشی حالت کے ساتھ مدینہ پہنچے تھے۔ ان میں حضرات عمر فاروق، ابوبکر صدیق، عثمان غنی، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبید اللہ، عبدالرحمن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص جیسے مالدار اشخاص کے علاوہ بنو مظعون، بنو غنم بن دودان اور بنو بکیر/کنانہ جیسے متمول خاندان بھی شامل تھے جو اپنی تمام منقولہ جائداد ——— نقد و اسباب ——— کے ساتھ مدینہ پہنچے تھے۔ بہت سے درجہ دوم کے مسلمانوں کو بھی اپنی دولت کا خاصا حصہ نئے وطن میں لانے کا موقعہ مل گیا تھا۔ انھیں میں سے کچھ بلکہ معدودے چند ایسے تھے جو سیاسی یا سماجی مجبوریوں کے تحت اپنی دولت یا تو بالکل نہیں لا سکے تھے یا اس کا محض ایک معمولی حصہ لائے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جو مکہ میں نادار و مفلس تھے وہ مدینہ بھی نادار و مفلس پہنچے تھے لیکن وہ وہاں سب کے سب نادار و مفلس نہیں رہے تھے جیسا کہ غلط خیال لوگوں کے دماغ میں راسخ ہو گیا ہے۔ کچھ مدت کے بعد وہ نہ صرف اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے تھے بلکہ مدنی مسلم معیشت کے ارتقاء کا سبب بھی بنے تھے۔[11] البتہ ایک خاصا بڑا طبقہ مسلمانوں کا ایسا ہمیشہ رہا جو اقتصادی لحاظ سے نہ صرف کمزور رہا تھا بلکہ وہ مسلمانوں کا محتاج اور ان کی دولت پر منحصر تھا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو کسی سبب سے اپنا کوئی ذریعۂ آمدنی مستقل طور سے نہیں رکھتا تھا۔ ان میں اہلِ صفہ کے علاوہ بعض اجیر و مزدور بھی شامل تھے جو وقت کی آندھیوں میں پیٹ کا چراغ جلانے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔

ہجرتِ نبوی کے بعد جب مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت مسلمانوں کے دو سماجی طبقے ——— مہاجرین اور انصار ——— کے علاوہ یہودیوں پر مشتمل ایک اہم طبقہ بھی مدینہ کی آبادی کا ایک حصہ تھا۔ ان کے سوا چوتھا مختصر سا طبقہ اوس مناۃ کے غیر مسلموں کا تھا جو ۵ھ تک اپنا آزاد وجود قائم رکھنے میں کامیاب رہا تھا اور بالآخر وہ مسلم طبقۂ انصار میں ضم ہو گیا تھا۔ جہاں تک اس طبقہ کی اقتصادی حالت کا تعلق تھا تو وہ انصار کے کسی خاندان کی مانند تھی البتہ یہودیوں کا طبقہ جو بیس سے اُوپر چھوٹے بڑے قبیلوں پر مشتمل تھا اقتصادی لحاظ سے نہ صرف خوشحال تھا بلکہ مدنی معیشت کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں تھی۔ ان میں بنو قینقاع اور کچھ دوسرے خاندان اور قبیلے تاجر اور دستکار تھے۔ وہ خاصے دولتمند لوگ تھے اور ان کا اپنا خاص بازار تھا جو غالباً شہر کا سب سے اہم بازار تھا۔ بلکہ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاصی بڑی تجارتی منڈی تھی۔[12] ان کے علاوہ بنو نضیر[13] اور

بنو قریظہ وغیرہ[۱۴] متعدد دوسرے یہودی قبیلے زراعت پیشہ تھے۔ اوران کے مدینہ اور حوالی مدینہ میں کھجوروں اور پھلوں کے باغات اور کھیت تھے۔ ان کے یہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ چنانچہ وہ بڑی بڑی گڑھیوں میں جو قلعہ نما تھیں رہا کرتے تھے اور نقد و جنس ہر طرح کی جائدادوں کے مالک تھے۔ تجارت، زراعت اور دستکاری کے علاوہ مدنی یہودی خاصے بڑے مہاجن بھی تھے جو سُودی کاروبار کے ذریعے بے اندازہ دولت کماتے تھے۔[۱۵] ایک مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پچاس فیصد سالانہ پر سُودی کاروبار کرتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ مدنی معیشت پر چھائے ہُوئے تھے اور اپنے بدنام زمانہ مہاجنی طور طریقوں کے سبب مدینہ کے انصار کے ایک خاصے بڑے طبقے کو اپنا دست نگر بنائے ہوئے تھے تاہم ایسا نہیں تھا کہ انصار پوری طرح سے اپنی معیشت کے لیے ان پر منحصر ہوں۔ تاریخی واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہود و انصار کے مخلوط طبقات سیاسی و سماجی اسباب کے علاوہ اقتصادی اسباب سے بھی ایامِ جاہلیت میں باہم دست بگریباں رہے تھے بہرحال عہد نبوی میں مہاجرینِ مکہ کی مانند انصارِ مدینہ کے بھی اقتصادی لحاظ سے تین طبقے تھے۔ دونوں مسلم طبقات میں اگر کوئی اہم فرق تھا تو بس یہ کہ مکی مسلمان زیادہ تر تجارتی پس منظر رکھتے تھے جبکہ ان کے مدنی بھائی زیادہ تر زراعت پیشہ تھے اور اس فرق کا بڑی حد تک ذمہ دار ان دونوں طبقات کا جغرافیائی پس منظر تھا۔[۱۶]

مہاجرینِ مکہ میں سے اکثر نے اپنے وطن ثانی میں قیام کے فوراً بعد اپنا آبائی پیشہ ——— تجارت ——— شروع کر دیا تھا جبکہ ان کے کچھ لوگ زراعت میں بھی لگ گئے تھے۔ مدینہ اور حوالی مدینہ میں افتادہ زمینوں کی کمی نہیں تھی۔ ان میں بعض اراضی انصار کی تھی جو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دی تھی اور کچھ اراضی بلا ملکیت تھی۔ چنانچہ ان تمام فاضل زمینوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکونت و زراعت کے لیے مہاجرین کو تقسیم کر دیا تھا۔ بعد میں کچھ اراضی مدینہ اور اس کے اطراف میں عسکری مہموں کے نتیجہ میں بطور اموال غنیمت ہاتھ آئی تھی اور وہ بھی زیادہ تر مہاجرین کے حصے میں آئی تھی اور اس طرح مکی مہاجرین کے لیے نہ صرف سکونت کا مسئلہ حل ہو گیا تھا بلکہ زرعی زمینوں کی بدولت اقتصادی مسئلہ بھی کافی حد تک طے ہوا تھا۔ مہاجرین میں سے حضرات زبیر بن عوام، ابوبکر صدیق، عمر فاروق، سعد بن ابی وقاص وغیرہ متعدد اکابر صحابہ کا شمار ان لوگوں میں کیا جاتا ہے جو زرعی جائدادوں اور کاروبار کے مالک تھے۔[۱۷] اسی طرح مذکورہ بالا اکابر مہاجرین کے علاوہ حضرات عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ بن عبیداللہ، عثمان بن عفان وغیرہ متعدد بلکہ بیشتر مکی مسلمانوں نے تجارتی کاروبار بھی شروع کر دیا تھا۔[۱۸] یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ بہت سے مکی مسلمانوں نے بیک وقت زراعت اور تجارت دونوں میں دلچسپی لی تھی اور اس طرح انہوں نے مدنی اقتصاد و معیشت کے ارتقا میں دوہرا حصہ لیا تھا۔

مدینہ منورہ کی مسلم معیشت کے مطالعے کے ضمن میں بعض ٹھوس تاریخی حقائق کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہوگا۔ ان سے نہ صرف مسلمانوں کی انفرادی دولت مندی اور تمول کا علم ہوگا بلکہ اجتماعی مسلم دولت کا بھی اندازہ لگ سکے گا۔ اگرچہ انصار و مہاجرین دونوں مسلم طبقات کی نقد و جنس دولت کے حوالے مآخذ میں بہت کم ہیں تاہم وہ عہد نبویؐ کی معاشی حالت کا ایک موٹا سا اندازہ دینے کے لیے کافی ہیں۔ قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ خاصے دولتمند آدمی تھے اور وہ کافی باغات اور زرعی زمینوں کے مالک تھے۔ ان کی دولتمندی کا اندازہ اسلامی ریاست کے لیے ان کے عطیات سے ہوتا ہے۔[۱۹] اسی طرح اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ مدینہ کے متمول ترین لوگوں میں سے تھے اور کافی جائداد کے مالک تھے۔[۲۰] میزبانِ رسول کریمؐ

حضرت ابو ایوب انصاری نہ صرف دو منزلہ پختہ مکان کے مالک تھے جو بذاتِ خود تموّل کی ایک نشانی تھی بلکہ متعدد کھجور کے باغات اور زرعی اراضی کے مالک تھے۔[21] انصار میں حضرت عمارہ بن حزم کا شمار متموّل لوگوں میں ہوتا تھا جبکہ حضرت سعد بن ربیع کافی بڑی جائدادوں کے مالک تھے۔[22] ایک روایت کے مطابق ایک انصاری نے ایک موقعہ پر ریاستِ اسلامی کے ہنگامی مصارف کے لئے طلائی سکّوں ـــــ دینار ـــــ کی اتنی بڑی اور بھاری تھیلی عطیہ میں دی تھی جس کو وہ بمشکل اٹھا پا رہے تھے۔[23] بخاری کی ایک روایت کے مطابق حضرت جابر بن عبد اللہؓ انصاری کا مدینہ میں کھجور کا ایک بڑا باغ تھا جس سے کافی آمدنی ہوتی تھی۔[24] اس کے علاوہ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ اور حوالی مدینہ میں انصار کے بڑے بڑے کھیت تھے جہاں کافی غلہ پیدا ہوتا تھا۔[25] زرعی جائدادوں کے علاوہ انصار میں مویشی خاص کر دودھاری جانور پالنے کا عام رواج تھا کیونکہ دودھ عربوں کا محبوب کھاجا تھا۔[26] انصار کی دولتمندی کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے ان کی معیشت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا ذکر ہمارے اگلے مباحث میں آتا رہے گا۔

جہاں تک مہاجرین کا تعلق ہے تو ذکر آچکا ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ نقد و جنس میں نہ صرف دولت ساتھ لائے تھے بلکہ انھوں نے تجارت کا بازار گرم کر دیا تھا۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی صحابہ تھے جو زراعت میں بھی لگ گئے تھے اور بعض غیر معمولی صلاحیتوں کے لوگوں نے دونوں پیشوں میں دلچسپی لی تھی۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف جلد ہی مدینہ میں مالدار ترین تاجروں میں شمار ہونے لگے تھے کیونکہ انھوں نے مختلف اشیاء کی تجارت کا خداداد ملکہ پایا تھا۔[27] اس طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مدینہ کے اطراف میں سنح کے مقام پر کپڑے سازی کا ایک چھوٹا موٹا کارخانہ لگا لیا تھا اور غالباً دوسرے اجیروں کی مدد سے وہ پیداوار کے ساتھ ساتھ تجارت بھی کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروق مقامی تجارت سے بڑھ کر بین الاقوامی تجارت میں حصہ لینے لگے تھے اور ان کی تجارت ایرانؔ و شام تک وسیع ہو گئی تھی۔ حضرت عثمان غنی شروع میں بنو قینقاع کے بازار میں کھجوروں کا کاروبار کرتے تھے۔ بعد میں وہ اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف غلاموں کی تجارت میں دولت کمانے لگے تھے۔ اس کے علاوہ یہ دونوں مہاجر تاجر کپڑے، غلے وغیرہ دوسری اشیاءؔ کی تجارت بھی کرتے تھے اور اپنے مکی عہد کے شراکت کے طریقے کو بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ یعنی وہ دوسروں کو اپنا مال تجارت کے لیے پچاس فیصدی نفع کی شرکت پر اُدھار دیتے تھے۔ اندازہ یہ ہے کہ مسلمان جزیرہ نمائے عرب کے تمام بازاروں میں اپنا سامانِ تجارت لے کر پہنچتے تھے۔[28]

مسند احمد بن حنبل میں مدینہ اور اطراف مدینہ کے مختلف روزانہ اور ہفتہ واری بازاروں کا ذکر ملتا ہے جہاں مسلمانانِ مدینہ مختلف اشیاء کی تجارت کرتے تھے۔[29] محمد بن حبیب بغدادی نے جزیرہ نمائے عرب کے تمام بازاروں کا ذکر کیا ہے جو سال بھر مختلف مقامات پر یکے بعد دیگرے اس طرح لگتے تھے کہ ان کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں پاتا تھا۔ ان میں سے عکاظ، مجنہ، ذو المجاز، جاشہ، مشقر، دومۃ الجندل، ہجر، وغیرہ اہم ترین تھے۔ ان میں سے سرحدی علاقوں کے بازار بین الاقوامی تجارت کی منڈیاں تھے جہاں شام، عراق، ایران حتیٰ کہ ہندوستان اور چین کے تاجر اپنے اسباب تجارت کے ساتھ پہنچتے تھے۔[30] ان کے علاوہ حج کے زمانے میں لگنے والے مکہ، منیٰ اور عرفات وغیرہ کے بازار بھی تھے۔[31] پھر وہ مقامی تجارت کے بازار تھے جہاں مسلمان اور دوسرے لوگ باقاعدہ پہنچا کرتے تھے۔ ان مقامی بازاروں میں مسلم تجارت خوب پھلی پھولی تھی۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذی قعدہ سنہ ۴ھ/

اپریل ۶۲۶ء میں غزوہ بدر الموعد کے موقعہ پر مسلمان تاجر اور مجاہد اپنا تجارتی سامان بدر کے مقامی بازار میں لے کر گئے تھے جو اس ماہ کی پہلی تاریخ سے آٹھ تاریخ تک لگتا تھا۔ مسلمانوں نے اس موقعہ پر خوب نفع کمایا تھا اور حضرت عثمان بن عفان کے بارے میں تو آتا ہے کہ انھوں نے ایک دینار کے عوض ایک دینار یعنی سو فیصد نفع کمایا تھا۔[۳۲] یہ حقیقت بڑی اہم ہے کہ کیا مسلم اور کیا غیر مسلم عرب مثالی تاجر تھے اور وہ ہر موقع سے فائدہ اٹھاتے تھے۔[۳۳] چنانچہ عسکری مہموں کے دوران بھی ان کا معمول تھا کہ وہ اپنا تجارتی سامان ساتھ لاتے تھے اور موقعہ ملنے پر تجارت کا بازار بھی گرم کرتے تھے۔ غزوہ بدر عظیم کے موقعہ پر مکی فوج میں وہ عظیم و ماہر تاجرین مکہ شامل تھے جو کھالوں (ادم) وغیرہ پر مشتمل خاصا اسباب تجارت ساتھ لائے تھے۔[۳۴] اسی طرح مسلم تاجروں کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خیبر کے غزوہ کے دوران تجارت کی تھی اور بڑا نفع کمایا تھا۔[۳۵] غالباً انھوں نے دوسری مہموں کے دوران بھی اپنے اس معمول کو ترک نہیں کیا تھا۔

مدنی مسلمانوں نے دُور دراز کے مقامات کو بھی تجارتی کارواں بھیجے تھے۔ ۶ھ / ۶۲۸ء میں حضرت زید بن حارثہ کی قیادت میں ایک ایسا ہی تجارتی کارواں اصحاب رسولؐ کا سامان تجارت لے کر شام کے لیے گیا تھا مگر بدقسمتی سے وُہ وادی القریٰ کے علاقے میں بنو فزارہ کے ہاتھوں لُوٹا گیا۔[۳۶] اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ مدنی مسلمانوں کا یہ اکلوتا تجارتی کارواں تھا جو شام بھیجا گیا تھا اس قسم کے تجارتی کاروانوں کے متعدد حوالے مآخذ میں خاص کر حضرات عبد الرحمٰن بن عوف، عثمان بن عفان، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام وغیرہ جیسے تاجر صحابہ کرام کے تراجم میں ملتے ہیں۔[۳۷]

۲۔ اسلامی ریاست کی آمدنی کے ذرائع اور وسائل

اُمتِ مسلمہ کی عمومی اقتصادی حالت کے مختصر سے تجزیے کے بعد اسلامی ریاست کے مالی نظم و نسق کا مطالعہ زیادہ قابلِ فہم بھی ہوگا اور آسان بھی۔ گزشتہ مختلف ابواب میں ہم اسلامی ریاست کے بعض ذرائع آمدنی پر ضمناً اور مختصراً نظر ڈال چکے ہیں۔ ان میں نقد و جنس کی صورت میں اموال غنیمت، خمس، جزیہ اور صدقات کے کثیر حوالے آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ عطیات اور چندوں کا ذکر اشارۃً آیا ہے۔ اس بحث کا آغاز ہم اُمتِ اسلامی کے انفرادی اور اجتماعی عطیات سے کر رہے ہیں کہ تاریخی ترتیبِ واقعات کے لحاظ سے اسی ذریعۂ آمدنی کو اولیت کی فضیلت حاصل ہے۔

(ا) عطیات

انصارِ مدینہ کی مستقل سخاوت و فیاضی کے سوا وقتی اور ہنگامی انفرادی اور اجتماعی عطیات ہی مدینہ کی نوزائیدہ و نوخیز ریاست کے آمدنی کے ذرائع میں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے خاص کر اس کے ابتدائی اور مشکل زمانۂ ارتقاء میں اور بعد میں بھی جب اسلامی ریاست اپنے سیاسی اوجِ کمال کو پہنچ گئی تھی عطیات کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ مآخذ میں جا بجا بکھرے واقعات و شواہد عطیات پر ایک نظر سے اس تبصرہ کی صحت کی شہادت بخوبی مل جائے گی۔ ایک بار ایک بدو کا شخص خدمتِ نبویؐ

میں حاضر ہوا۔ آپ نے حضرت ابو طلحہ کے سپرد ان کی میزبانی کر دی۔ انھوں نے جس مثالی انداز میں اپنے مہمان کی مہمان داری کی اس کی تحسین قرآن کریم نے کی۔(۳۸) اس قسم کی سخاوت و فیاضی کی متعدد مثالیں اصحاب صُفّہ کے بیان کے ضمن میں ہمارے تمام مآخذ میں بھری پڑی ہیں۔(۳۹) ایک بار مسلم کی روایت کے مطابق ایک نو مسلم قبیلہ کی مالی ضروریات کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو عطیات کا حکم دیا۔ ہر شخص اس کار خیر کے لیے دوڑ پڑا اور ذرا ہی دیر میں خدمت نبوی میں کھانے، کپڑے اور اسباب کا ڈھیر لگ گیا۔ ایک انصاری نے اس موقعہ پر تو کافی بڑی رقم عطیہ میں دی۔(۴۰) یہ مشہور واقعہ ہے کہ اسیران بدر کے قیام و طعام اور دوسری ضروریات کی تکمیل کلیتاً مسلمانوں کی دریا دلی کی مرہون منت تھی۔(۴۱) اسی طرح ہوازن کے چھ ہزار قیدیوں کے لیے کپڑے مسلمانوں کے عطیات ہی کے ذریعہ فراہم کیے گئے تھے۔(۴۲)

مہموں سے قبل یا ان کے دوران مخیر مسلمان بڑی فیاضی سے اجتماعی اخراجات کے لیے عطیات دیتے تھے۔ خندق کی مہم کے دوران حضرات سعد بن عبادہ، جابر بن عبداللہ اور متعدد دوسرے مالدار انصاریوں اور مہاجروں نے مسلم فوج کے لیے کھانے پینے کا سامان خاص کر کھجوریں فراہم کی تھیں۔(۴۳) بنو قریظہ کی مہم کے دوران حضرت سعد بن عبادہ نے مسلم سپاہ کے لیے کھجوروں کے ڈھیر کے ڈھیر بھیجے تھے۔(۴۴) اسی طرح صحابی موصوف نے ذی قرد کی مہم کے دوران اپنے صاحبزادے حضرت قیس بن سعد کے ہمراہ کھجوروں کے متعدد ڈھیروں کے علاوہ دس اونٹ (جزور) بطور غذا بھیجے تھے۔(۴۵) حضرت سعد بن عبادہ خزرجی کی اس قسم کی سخاوت کے متعدد واقعات کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے۔ رجب ۸ھ / نومبر ۶۲۹ء میں سیف البحر کی مہم کے زمانے میں قیس بن عبادہ خزرجی نے، جو مدینہ کے متمول ترین صحابہ میں شمار ہوتے تھے، مسلم سپاہیوں کے لیے تین دن متواتر اونٹ ذبح کیے تھے اور واپسی پر ان کے والد مکرم و مخیر نے ان کے اقدام کی زبردست تحسین و تعریف کی تھی۔(۴۶) صرف حضرت سعد بن عبادہ یا ان کے فرزند گرامی ہی نے اس قسم کی سخاوت و عطیات کا مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ متعدد صحابہ کرام نے مہموں کے دوران مسلم سپاہ کے لیے سامان رسد اور دوسرے اسباب کی فراہمی میں حصہ لیا تھا۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ غزوۂ خیبر کے دوران مسلم ضعیف عورتوں نے، جن کا کوئی خاص ذریعۂ آمدنی نہیں تھا، سوت کات اور بیچ کر رقم جمع کی تھی اور سخت محنت سے حاصل شدہ یہ رقم عطیہ میں دی تھی۔(۴۷) ایک موقعہ پر عورتوں نے اپنے زیورات تک عطیہ میں نذر کر دئے تھے۔

جنگی اور فوجی ضروریات کے لیے مسلم عطیات کی بہترین مثال کا تعلق غزوۂ تبوک سے ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عطیات کے لیے اعلان کرنا تھا کہ چند گھنٹوں کے اندر آپ کے سامنے ہر قسم کے سامان اور نقد کے انبار لگ گئے۔ حضرت ابوبکر نے اپنی کل دولت جو روایات کے مطابق چار ہزار درہم پر مشتمل تھی نذر رسول کر دی۔ حضرت عمر فاروق نے اپنی آدھی دولت جو کافی خطیر رقم تھی عطیہ میں دی تھی۔ دوسرے صحابہ کرام میں جنھوں نے "مال" (خطیر رقم) عطیہ میں دی تھی حضرات عباس بن عبدالمطلب، طلحہ بن عبیداللہ تیمی، سعد بن عبادہ، محمد بن مسلمہ وغیرہ متعدد لوگ شامل تھے۔ روایت ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف کا "مال" دو سو اوقیہ چاندی (آٹھ ہزار درہم) پر مشتمل تھا جبکہ حضرت عاصم بن عدی نے ۹۰ وسق (تقریباً ۹۰ کوئنٹل) کھجوریں فراہم کی تھیں۔ لیکن سب سے بڑا عطیہ حضرت عثمان بن عفان اُموی کا تھا۔ جنھوں نے روایات کے مطابق

مسلم فوج کے ایک تہائی حصہ کی ضروریات کے لیے سامان فراہم کیا تھا۔[۴۸] بلاذری کے مطابق رقم میں عثمانی عطیہ ستر ہزار درہم یا اس سے زیادہ کی خطیر رقم پر مشتمل تھا۔[۴۹] بہرحال اصل بات یہ ہے کہ جب کبھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ریاست یا امت کیلیے کسی قسم کی مالی ضرورت پیش آتی تھی آپ مسلمانوں سے عطیات کے لیے فرما دیتے تھے اور مسلمان اپنے محبوب رسول کے حکم کو اپنا فرض سمجھ کر دل کھول عطیے اور چندے دیتے تھے۔ یہ نفل صدقات تھے لیکن اجتماعی ضرورت نے ان کو مسلم عوام خاص کر دولتمند طبقہ کے لیے لازمی اور ناگزیر بنا دیا تھا۔ اس سلسلہ میں اسد الغابہ نے ایک دلچسپ تجزیہ کیا ہے جس کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے ان عطیات کی فہرست مرتب کی گئی ہے جو انھوں نے مختلف مہموں کے مواقع پر عہدِ نبویؐ میں نذرِ رسول کیے تھے۔[۵۰] مذکورہ بالا مثالوں کا تعلق دراصل نقد و جنس اور اسباب کی شکل میں مسلم عطیات سے تھا۔

اُمتِ اسلامی کے مختلف افراد نے جن میں انصار اور مہاجرین دونوں شامل تھے اراضی اور جائداد پختہ وخام کی شکل میں بھی عطیات دیئے تھے جن کی مثالیں مآخذ میں کافی ملتی ہیں۔ ذکر آچکا ہے کہ انصار نے مدینہ اور حوالیِ مدینہ میں اپنی افتادہ زمینوں کے علاوہ باغات اور اراضی بھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اجتماعی مقاصد کے لیے پیش کر دئے تھے اور آپ نے انھیں میں سے متعدد مسلمانوں کو قطائع عطا فرمائے تھے۔ اس پر بحث تفصیل کے ساتھ ذرا بعد میں کی جائے گی۔ ہجرت کے معاً بعد قبا کے زمانۂ قیام میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اوّلین مسجدِ اسلام کی تعمیر کی تھی اس کے لیے زمین حضرت کلثوم بن ہدم نے فراہم کی تھی اور سامان تعمیر متعدد انصاری مسلمانوں نے مہیا کیا تھا۔[۵۱] اس طرح مدینہ کی مسجد نبوی کی تعمیر کے لیے زمین کی قیمت حضرت ابو ایوب انصاری نے ادا کی تھی[۵۲] اور سامان غالباً اور لوگوں نے بھی فراہم کیا تھا۔ ایک انصاری خاتون حضرت ام انس نے اپنی کچھ جائداد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کی تھی جو آپ نے اپنی انا حضرت اُمِّ ایمن کو بخش دی تھی۔[۵۳] حضرت حارثہ بن نعمان انصاری ایک مالدار ترین اور صاحبِ جائداد شخص تھے۔ انہوں نے متعدد مکانات، باغات اور کھیت خدمتِ نبوی میں نذر کیے تھے جن میں سے ایک آپ نے اپنی محبوب دختر حضرت فاطمہ کو ان کی شادی کے موقعہ پر ۲ھ/ ۶۲۴ء میں عطا کیا تھا۔[۵۴] بنو نجار کے ایک گمنام مخیر انصاری نے ایک محل یا گڑھی (قصر) رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں غالباً اجتماعی معاملات کے لیے پیش کیا تھا۔[۵۵]

یہاں ایک نومسلم یہودی حضرت مخیریق نضری کے جائداد کے عطیات کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مآخذ کے مطابق وہ ایک مخلص نومسلم تھے اور بنو نضیر کے ایک متمول فرد۔ اُحد سے کچھ قبل اُنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور جہاد میں حصہ لیا تھا۔ انھوں نے وصیّت کر دی تھی کہ ان کی شہادت کی صورت میں تمام جائداد غیر منقولہ و منقولہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت ہوگی۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد "ان کی کھجوروں کے باغات پر مشتمل کافی جائداد" آپ کو ملی جو ایک روایت کے مطابق سات باغوں (حوائط) پر مشتمل تھی۔ ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ "رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں جتنے بھی صدقات تقسیم فرماتے تھے وہ سب اسی موہوبہ جائداد سے آتے تھے۔"[۵۶] اسی طرح بعض دوسرے مدنی مسلمانوں اور مہاجرین کے اراضی کے صدقات کی بڑی دلچسپ مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں کنوؤں (بئر) کے صدقات بہت اہم تھے جو پیاسے عربوں کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ

سے کم نہ تھے۔ حضرت عثمان بن عفان اموی کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں نے متعدد دوسرے کنوؤں کے علاوہ بئر رومہ جو مدینہ کے کنووں میں سب سے میٹھا پانی رکھتا تھا مسلمانوں کے لیے خرید کر وقف کر دیا تھا۔[٥٧] یہ امر قابلِ تصور اور قرینِ قیاس ہے کہ دوسرے مالدار اور مخیر مسلمانوں نے اس قسم کی جائدادوں کو عوامی ضرورت کے لیے ضرور وقف کیا تھا۔

(ب) اموالِ غنیمت : نقد و جنس

مہموں اور غزوات کے نتیجے میں ملنے والی غنیمت پر بہت زور دیا گیا ہے مگر ابھی تک مدنی مسلمانوں کی معیشت میں اس کے تناسب کا مکمل تجزیہ نہیں کیا گیا تھا۔ بہرحال اس کا سرِدست ہم سے تعلق نہیں تاہم بالواسطہ تعلق یُوں ہے کہ وہ کسی نہ کسی حد تک مسلم اقتصادی خوشحالی کا سبب بنی تھی جس سے مسلمانوں کو عطیات اور صدقات دینے کی صلاحیت ملی تھی اس لیے اس کا ایک تجزیہ ضروری ہے۔ مزید یہ کہ اس غنیمت کا خمس (۱/۵) اسلامی ریاست کا ایک اہم ذریعہ آمدنی تھا۔ اس کی تعیین و تشخیص و تخمینہ اس تجزیہ کے بغیر ناممکن ہے۔ تیسرے باب میں ہم مسلم ذخیرۂ حربی کے افزوں ارتقاء کے ضمن میں مہمات میں حاصل شدہ اسلحوں اور شہسوار فوج کے ارتقاء کے ضمن میں گھوڑوں کا جائزہ لے چکے ہیں جسے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ہم دوسرے سامان اور نقد کا جائزہ لیں گے جو مختلف غزوات، سرایا اور مہموں کے نتیجے میں مسلمانوں کو ملا تھا۔

یہ حقیقت اب روشن ہو چکی ہے کہ بدر سے قبل کی تمام ابتدائی مہموں میں سوائے سریہ نخلہ کے مسلمانوں کو کوئی مالِ غنیمت نہیں ملا تھا۔ سریہ نخلہ میں مسلمانوں کو جس قریشی کارواں کی صورت میں جو مالِ غنیمت ملا تھا وہ شراب کے مشکیزوں، کھالوں (ادم) خشک کھجوروں (زبیب) اور بعض سامانِ تجارت کے علاوہ دو قیدیوں پر مشتمل تھا۔[٥٨] ان میں سے ایک قیدی مسلمان ہو گیا تھا[٥٩] اس لیے بلا زرِ فدیہ رہا کر دیا گیا تھا جبکہ دوسرے قیدی نے چالیس اوقیہ چاندی (سولہ سو درہم) ادا کر کے رہائی پائی تھی۔[٦٠] اسلامی ریاست کو اس مالِ غنیمت میں سے خمس ملا تھا۔ سرایا کی مانند ابتدائی غزوات میں بھی کوئی مالِ غنیمت نہیں ملا تھا — غزوۂ بدر پہلا تھا جس میں مسلمانوں کو کافی مالِ غنیمت ملا تھا۔ ہتھیاروں اور گھوڑوں کے سوا مسلمانوں کو خاصا مالِ غنیمت حاصل ہوا تھا جو اسباب روزمرہ (متاع) چرمی چٹائیوں (انطاع) کپڑوں (ثیاب) اور کھالوں (ادم) پر مشتمل تھا۔ موخر الذکر کافی تعداد میں تھیں کیونکہ وہ تجارت کی غرض سے ساتھ لائی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ ایک سو پچاس اونٹ بھی ملے تھے۔[٦١] رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مال میں سے خمس[٦٢] کے علاوہ صفی بھی ملی تھی۔[٦٣] جبکہ مسلم سپاہ میں سے کچھ کو ایک اونٹ اور کچھ سامان (رِثّہ) اور کچھ کو دو اونٹ حصہ میں ملے تھے جبکہ باقی سپاہیوں کو صرف کھالیں ملی تھیں۔[٦٤] کل تین سو سترہ (٣١٧) حصے لگے تھے، ٣١٣ حصے مسلم سپاہیوں کے اور چار حصے دو گھوڑوں کے لیے۔ واقدی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان مجاہدین کی توقع سے مالِ غنیمت کافی کم تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مالِ غنیمت قیمت و کمیت کے لحاظ سے بھی کافی کم تھا۔[٦٥]

بہرحال اسیرانِ بدر سے مسلمانوں کو زرِ فدیہ کی شکل میں خاصی خطیر رقم ملی تھی۔ اس ذریعہ آمدنی کا مفصل تجزیہ دلچسپی کا سبب ہو گا۔ ابنِ اسحاق، ابنِ ہشام، واقدی، بلاذری اور طبری کے بیانات کا ایک جامع تجزیہ بتاتا ہے کہ بیس قیدیوں نے پچھتر ہزار

درہم کی رقم مجموعی طور سے ادا کی تھی ، اٹھارہ قیدیوں نے فی کس چار ہزار درہم جبکہ باقی دو نے دو ہزار اور ایک ہزار درہم ادا کیے تھے۔ یہ اعداد و شمار ان اسیرانِ جنگ کے بارے میں ہیں جن کے سلسلہ میں مآخذ نے زرِ فدیہ کی صراحت کی ہے۔ دس اور قیدیوں کے بارے میں ذکر آیا ہے کہ انہوں نے زرِ فدیہ ادا کر کے رہائی پائی تھی۔ لیکن ان کے فدیہ کی رقم کی تعیین نہیں کی گئی ہے۔ اگر ان کے زرِ فدیہ کو بھی گراں ترین شرح یعنی چار ہزار درہم فی کس[۶۶] فرض کر لیا جائے تو ان کے زرِ فدیہ کی مجموعی رقم چالیس ہزار درہم اور مسلمانوں کو ملنے والی کل رقم ایک لاکھ پندرہ ہزار درہم ہوگی' جو خاصی بڑی رقم تھی۔ باقی اسیرانِ جنگ میں سے کچھ تو بلا فدیہ رہا کر دیئے گئے تھے، کچھ جنگی جرائم کی پاداش میں مقتول ہوئے تھے اور کچھ مسلمان ہو گئے تھے باقی کے بارے میں مآخذ خاموش ہیں۔

مشہور روایات کے مطابق اسیرانِ جنگِ بدر کی مجموعی تعداد ستر تھی۔ کچھ دُوسری روایات میں ان کی تعداد کچھ کم بیان کی گئی ہے۔ بہرحال جن قیدیوں کے نام بنام ذکر مآخذ میں ملتا ہے ان کی تعداد واقدی کے مطابق صرف ۴۹ ہے۔[۶۷] بہرحال مآخذ سے یہ صراحت تو ہوتی ہے کہ زرِ فدیہ قیدی کو گرفتار کرنے والے مسلمان مجاہد کو ملتا تھا۔[۶۸] لیکن اس کی وضاحت نہیں ہوتی کہ ریاست اسلامی کو اس میں سے خمس ملتا تھا یا نہیں۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ خمس بھی نکالا جاتا تھا جیسا کہ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ اس صورت میں مسلم سپاہ کا ½ یا زیادہ سے زیادہ ¼ حصہ اوسط درجہ میں فدیہ کی رقم کے ذریعہ مالدار ہوا تھا۔ جبکہ بدر کے دُوسرے مجاہدین کو کافی کم مالِ غنیمت حاصل ہُوا تھا۔ البتہ اسلامی ریاست کو اچھی خاصی رقم خمس کی صورت میں مل گئی تھی جو اس زمانۂ فقر میں کافی معاون ثابت ہوئی ہوگی۔

دوسری مہم جس میں مسلمانوں کو کچھ مالِ غنیمت ملا تھا مدینہ کے یہودی قبیلے بنو قینقاع کے خلاف غزوہ تھا۔ اس میں زیادہ تر غنیمت اسلحہ اور اوزاروں پر مشتمل تھی۔[۶۹] یہ عجیب بات ہے کہ نہ تو مالِ غنیمت کی تقسیم کا ذکر ملتا ہے اور نہ خمس کا۔ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفی کا ذکر ملتا ہے۔[۷۰] مشہور روایات کے مطابق مسلمانوں کو یہودی جائدادوں اور اراضی پر بھی قبضہ مل گیا تھا لیکن برکات احمد کی تحقیق کے مطابق مالِ غنیمت صرف ہتھیاروں اور زیادہ سے زیادہ اوزاروں پر مشتمل رہا تھا۔[۷۱] نقد و جنس میں سے کچھ بھی ہاتھ نہیں لگا تھا۔ غزوۂ سویق میں مسلمانوں کو سویق (ستو) کی چند بوریاں ملی تھیں جو دو سو افراد پر مشتمل مکی فوج بھاگتے وقت اپنے اونٹوں کے کجاووں کو ہلکا کرنے کی خاطر پھینک گئی تھی۔[۷۲] کدر کی مہم میں ایک روایت کے مطابق مالِ غنیمت پانچ سو اونٹوں (بعیر) پر مشتمل تھا جن میں سے خمس سو اونٹوں کا تھا جو اسلامی ریاست کی ملکیت میں آیا تھا۔ جبکہ بقایا چار سو اونٹ مسلمان مجاہدین میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ دوسری روایت کے مطابق مالِ غنیمت کے اونٹوں کی تعداد سولہ سو اسی تھی[۷۳] کیونکہ ہر مجاہد کو سات اونٹ ملے تھے اور خمس کے اونٹوں کی تعداد صرف دو سو اسی تھی۔[۷۴] لیکن مورخین کا اصرار ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے۔[۷۵] بہرحال دونوں صورتوں میں ہم کو یقینی طور سے خمس اور مسلمان مجاہدین کے حصّوں کے بارے میں علم ہوتا ہے۔

سریہ قردہ میں، جو حضرت زید بن حارثہ کی ماتحتی میں بھیجا گیا تھا اور جس نے ایک مکی کاروانِ تجارت پر کامیاب چھاپہ مارا تھا کافی مالِ غنیمت نقد ملا تھا۔ اس کی کل مالیت ایک لاکھ درہم تھی' کیونکہ خمس کی ہی مالیت بیس ہزار درہم تھی۔[۷۶] جنگِ اُحد میں

مسلم مجاہدین کو فتح کے لمحات میں کافی مالِ غنیمت ہاتھ لگا تھا لیکن وہ سارے کا سارا عالمِ شکست میں کھو یا گیا۔ ممکن ہے کہ بعض مجاہدین کے ہاتھ میں کچھ باقی رہ گیا ہو لیکن اس کی مالیت ناقابلِ توجہ تھی۔ بہرحال مسلمانوں کے اس "ممکنہ مالِ غنیمت" سے اسلامی ریاست کو کچھ بھی خمس نہیں ملا تھا۔ حضرت ابو سلمہ کے سریہ قطن میں جو ایک سو پچاس سپاہیوں پر مشتمل تھی فی کس سات اونٹ مالِ غنیمت میں ملے تھے۔(۷۵) اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل غنیمت بارہ سو ساٹھ اونٹوں پر مشتمل تھی اور خمس ریاست میں دو سو دس اونٹ پڑے تھے۔ چونکہ صفی کا ذکر نہیں مل سکا اس لئے امکان ہے کہ کل غنیمت کے اونٹوں کی تعداد کچھ زیادہ رہی ہو۔ یہودی قبیلہ بنو نضیر کے خلاف فوجی کارروائی کے نتیجے میں نقد و جنس کی صورت میں ہتھیاروں کے سوا اور کوئی مالِ غنیمت نہیں ملا تھا۔(۷۶) ربیع الاول ۵ھ / اگست، ستمبر ۶۲۶ء میں دومۃ الجندل کی مہم کے دوران جو دراصل عرب رہزنوں کی لوٹ مار سے تجارتی کاروانوں کو بچانے کے لیے بھیجی گئی تھی مسلمانوں کو مویشیوں کی صورت میں کچھ غنیمت ملی تھی جس کی مالیت و مقدار کا اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ مآخذ اس کے بارے میں بالکل خاموش ہیں۔(۷۷)

مریسیع کی مہم کے دوران بنو مصطلق سے مسلمانوں کو مویشیوں، قیدیوں اور شاید دوسرے اسباب اور نقد کی شکل میں خاصی غنیمت ملی تھی۔ اسلحہ اور سامان (رثۃ و متاع) کے علاوہ جوان کے کجاووں (رحال) میں پایا گیا تھا مالِ غنیمت دو ہزار اونٹوں (بعیر) اور پانچ ہزار بھیڑ بکریوں (شاۃ) پر مشتمل تھا۔ قیدیوں کی تعداد دو سو خاندانوں (رھط) پر مشتمل تھی۔ ان میں سے نصف قیدیوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کے سردار کی دختر حضرت جویریہ بنت حارث خزاعی سے شادی کے سبب(۷۸) بلا زر فدیہ آزاد کر دیا گیا تھا جبکہ باقی کو ان کے اعزہ نے فدیہ ادا کر کے رہا کرا لیا تھا۔(۷۹) ایک عورت اور اس کے بچوں پر مشتمل خاندان کے بارے میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا فدیہ چھ فرائض (اونٹ) تھے۔(۸۰) خود حضرت جویریہ کا معاملہ بڑا دلچسپ ہے۔ ان کی شادی سے قبل وہ قیدی کے بطور دو صحابیوں حضرت ثابت بن قیس اور ان کے عم زاد بھائی کے حصہ میں مشترکہ طور سے آئی تھیں۔ حضرت ثابت نے اپنے عم زاد کا حصہ مدینہ میں واقع ایک چھوٹے سے کھجوروں کے باغ (نخلہ) کے عوض خرید لیا تھا۔ بعد میں حضرت جویریہ نے حضرت ثابت کو ۹ اوقیہ سونے (تقریباً چار ہزار درہم) کے عوض اپنی رہائی کے لیے راضی کر لیا تھا۔ اسی رقم مکاتبت کا سوال لے کر وہ درِ نبوی پر پہنچی تھیں اور نبی رحمت نے ان کی مطلوبہ رقم ادا کر کے ان سے نکاح کر لیا تھا۔(۸۱) مویشیوں کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور پورے مالِ غنیمت کا خمس اور اپنی صفی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قبل وصول کر لی تھی۔(۸۲)

مدینہ منورہ کے آخری دشمن یہودی قبیلہ کے خلاف مہم میں مسلمانوں کو مشہور روایات کے مطابق ہتھیاروں کے علاوہ کافی مقدار میں اسباب (اثاث)، برتن (آنیۃ)، کپڑے (ثیاب) اور کافی تعداد میں عمدہ اونٹ اور مویشی ملے تھے۔ مسلمانوں کے حصوں کے نکالنے کے بعد ریاست کو اس کا خمس ملا تھا۔ اگرچہ کافی بڑی تعداد میں شراب کے مٹکے بھی ملے تھے لیکن وہ توڑ دیے گئے تھے اور شراب بہا دی گئی تھی۔(۸۳) عورتوں اور بچوں پر مشتمل یہودی قیدیوں کو مختلف بازاروں میں بیچ دیا گیا تھا اور اس سے حاصل شدہ رقم کو گھوڑوں اور اسلحوں کی خرید پر صرف کیا گیا تھا۔(۸۴) لیکن بنو قریظہ کے تمام قیدیوں کو جن کی تعداد ایک ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے فروخت نہیں کیا گیا تھا۔ ان میں سے بہت سوں کو بلا شرط رہا کر دیا گیا تھا اور ان کی جائداد منقولہ اور غیر منقولہ ان کو واپس کر دی گئی تھی۔ دلچسپ بات ہے کہ ایسا بعض مسلمانوں جیسے حضرت ثابت بن قیس(۸۵) اور حضرت ام منذر(۸۶) وغیرہ کے

مشورہ اور سفارش پر کیا گیا تھا۔ اسی طرح خمس کے حصہ میں پڑنے والے قیدیوں کو بھی بلا شرط رہا کر دیا گیا تھا۔ حضرت محمد بن مسلمہ اوسی کے سند پر مروی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شہسوار مجاہد کا حصہ ۵۴ دینار تھا۔[۸۷] اس رقم میں ان کا سامان، نقد، غلاموں اور اراضی سب کا حصہ شامل تھا۔ گویا کہ یہ کل معیاری حصہ تھا۔[۸۸] اس شرح کے مطابق حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ کل غنیمت کی مالیت تقریباً ۵۰،۰۰۰ دینار ہوتی ہے جو تین ہزار مجاہدین اور ۳۶ گھوڑوں کے حصوں کے بشمول تھی۔ اس میں خمس بھی شامل تھا۔ بہر حال کل غنیمت کی مالیت کسی طور ساٹھ ہزار دینار سے زیادہ نہ تھی۔

ہجرت کا چھٹا برس (جون ۶۲۷ء تا مئی ۶۲۸ء) سرایا کا سال تھا۔ جہاں تک غنائم کا تعلق ہے اس برس کے ۲۱ غزوات و سرایا میں سے صرف سات سرایا میں تھوڑی بہت غنیمت ملی تھی۔ محرم میں حضرت محمد بن مسلمہ کی مہم قرطاء کے نتیجہ میں ایک سو پچاس اونٹ اور تین ہزار بھیڑ بکریاں حاصل ہوئی تھیں۔[۸۹] تین ماہ بعد حضرت عکاشہ بن محصن کے سریہ غمر کے دوران مالِ غنیمت صرف دو سو اونٹوں پر مشتمل تھا۔[۹۰] جبکہ حضرت ابو عبیدہ کے سریہ ذو القصہ کے نتیجہ میں کچھ مویشی اور مال ملا تھا جس کی مقدار و تعداد کی ماخذ میں صراحت نہیں کی گئی ہے۔[۹۱] البتہ حضرت زید بن حارثہ کی مہم العیص کے نتیجے میں مسلمانوں کو قریشی کارواں سے کافی مقدار میں خام چاندی اور کچھ اور اسباب تجارت کے علاوہ دو قیدی بھی ملے تھے لیکن ان میں حضرت ابو العاص بن ربیع کو جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے داماد تھے۔ ان کی اہلیہ کی سفارش پر مع ان کے سامان کے رہا کر دیا گیا تھا۔[۹۲] غالباً دوسرے قیدی نے زرِ فدیہ ادا کر کے رہائی پائی تھی اور یہی کل غنیمت اس مہم کی تھی۔ اس کے دوسرے ماہ میں حضرت زید نے اپنے سریہ طرف میں بیس اونٹ اور تقریباً ایک سو ستر[۱۷۰] بھیڑ بکریاں[۹۳] حاصل کی تھیں جبکہ ایک اور سریہ میں جو حسمی کے علاقے میں گیا تھا انھوں نے تمام حاصل شدہ کثیر مالِ غنیمت واپس کر دیا تھا۔[۹۴] اس کے بعد حضرت علی کی مہمِ فدک میں پانچ سو اونٹوں اور دو ہزار بھیڑ بکریوں پر مشتمل غنیمت ملی تھی۔[۹۵] اس برس کی آخری مہم میں حضرت زید کو بنو فزارہ کی ایک باندی ام قرفہ حاصل ہوئی تھی جس کی ایک مسلمان سے شادی کر دی گئی تھی۔[۹۶]

ہجرت کے ساتویں برس کی اولین مہم غزوۂ خیبر تھا جس میں مسلمانوں کو کافی غنائم ملے تھے اور جو اموال منقولہ اور غیر منقولہ دونوں پر مشتمل تھے۔ اسلحہ کے علاوہ اموالِ غنیمت ہر طرح کے کھانے کی اشیاء (طعام)، گھریلو اسباب (اثاث)، سونے چاندی وغیرہ دھات کے برتنوں (اوانی)، کپڑوں خاص کر اعلیٰ سوتی اور ریشمی چادروں (بز و قطائف) کے علاوہ مویشیوں (گائے، بکری، اونٹ وغیرہ)، چمڑے کی چٹائیوں، زیورات اور خزانوں پر مشتمل تھے۔ کھانے کی اشیاء، چمڑے کی کھالوں اور چارے (علف) کو تقسیم نہیں کیا گیا بلکہ اجتماعی ضرورت کے لیے عام کر دیا گیا تھا جس کو جتنی ضرورت ہوتی وہ اٹھا لے جاتا تھا۔[۹۷] بعد میں مالِ غنیمت کو اسلامی قانون کے مطابق تقسیم کیا گیا تھا۔ پورے مالِ غنیمت کی مالیت کا صحیح تخمینہ لگانا مشکل ہے تاہم کچھ اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہودی محصورین نے اپنے دس ہزار سپاہیوں سمیت کل یہودی آبادی کے لیے سال بھر کا سامانِ رسد جمع کر لیا تھا۔ بہر حال واقدی کے ایک حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلم شہسوار کا حصۂ غنیمت ۱۱ ½ دینار تھا جبکہ پیادہ کو اس کا ایک تہائی یا نصف ملا تھا۔[۹۸] اس بنیاد پر کل مالیت صرف ۹،۵۰۰ دینار یا زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار دینار تھی جو خاصی کم تھی۔ بہر حال اس سے زیادہ قیمتی اموال یا جائدادوں پر مشتمل اراضی تھی جس پر بحث ہم کچھ دیر بعد کریں گے۔ فدک سے حاصل شدہ غنیمت بھی زمین پر مشتمل تھی۔[۹۹] وادی القریٰ کی مہم میں البتہ مسلمانوں کو کچھ سامان (اثاث، متاع) پر مشتمل غنیمت

ملی تھی لیکن اس کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔[۱۰۰] وادی القریٰ اور تیماء کے یہودیوں نے بھی اپنی پیداوار کے نصف پر صلح کر لی تھی اگرچہ تیماء کے ضمن میں لفظ جزیہ ذکر کیا گیا ہے۔[۱۰۱]

اس برس کی دوسری مہموں میں حضرت ابوبکر کے سریہ نجد میں معمولی سا مالِ غنیمت ملا تھا۔[۱۰۲] حضرت غالب بن عبداللہ لیثی کے سریۂ فدک کے نتیجے میں جو حضرت بشیر بن سعد خزرجی کے سریہ پر حملہ کا انتقام لینے کے لیے ترتیب دیا گیا تھا مسلمانوں کو مویشیوں کی شکل میں خاصا مالِ غنیمت ہاتھ لگا تھا۔ روایت کے مطابق اس فوج کے دو سو مجاہدین میں سے ہر شخص کو، اونٹ یا اس کے مساوی بھیڑ بکری ملے تھے۔ گویا کہ کل مالِ غنیمت بشمول خمسِ رسول سترہ سو پچاس اونٹوں پر مشتمل تھا۔ حضرات غالب بن عبداللہ اور بشیر بن سعد کی باقی دو مہموں میں جو بالترتیب مَیفعہ اور جِناب کے علاقوں میں بھیجی گئی تھیں کافی مالِ غنیمت مویشیوں میں ملا تھا لیکن اس کی صحیح مالیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ مآخذ میں اس کا کوئی قرینہ نہیں ملتا۔[۱۰۳]

۸ھ / ۶۲۹-۳۰ء میں تقریباً بیس مہمیں پیش آئیں۔ صفر / جون میں حضرت غالب بن عبداللہ کی مہم کدید میں قیدیوں اور مویشیوں پر مشتمل تھوڑا سا مالِ غنیمت ملا تھا۔[۱۰۴] دوسرے ماہ حضرت شجاع بن وہب کے سریہ سی نے روایت کے مطابق اتنے مویشی مالِ غنیمت کے بطور حاصل کیے تھے کہ ۲۴ مجاہدین پر مشتمل مسلم دستہ کو فی کس ۱۵ اونٹ حصہ میں پڑے تھے یا ان کے مساوی بھیڑ بکری ملے تھے (ایک اونٹ کے عوض دس بھیڑ بکریوں کی شرحِ تبادلہ معیاری سمجھی جاتی تھی)[۱۰۵] جنگِ موتہ اگرچہ کسی طور فتح کا عنوان نہ تھی تاہم بعض مجاہدین کو دشمنوں سے غنیمت حاصل کرنے میں کامیابی ملی تھی۔ غالباً یہ سلب کے بطور حاصل ہوئی تھی۔ اب تک معلوم شہادتوں کے مطابق ایک مجاہد کو ایک انگوٹھی اور دوسرے مجاہد کو ایک ہیرا (یاقوتہ) ملا تھا جو ایک دشمن سپاہی کے خود میں جڑا ہوا تھا اور جس کی قیمت عہدِ فاروقی میں سو دینا یا ہزار بارہ سو درہم آنکی گئی تھی۔[۱۰۶] حضرت عمرو بن عاص کی مہم ذات السلاسل میں کچھ بھی مالِ غنیمت نہیں ملا تھا سوائے ان گنتی کے بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کے جو مسلم فوج کی لذتِ کام و دہن کے کام آئے تھے۔[۱۰۷]

حضرت ابو قتادہ بن ربعی کی مہم خَضِرہ کے نتیجے میں جو مالِ غنیمت ملا تھا دو سو اونٹوں اور ایک ہزار بھیڑ بکریوں پر مشتمل ہونے کے علاوہ کافی تعداد میں جنگی قیدیوں پر بھی مشتمل تھا مگر ان کی تعداد کا کوئی ذکر نہیں مل سکا ہے۔[۱۰۸] لیکن اس برس کے سب سے زیادہ مالیت کے غنائم غزوۂ حنین میں حاصل ہوئے تھے۔ ان میں چھ ہزار جنگی قیدی، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زیادہ بھیڑ بکریاں (شاۃ) اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی۔ اموالِ غنیمت کی تقسیم اور عرضِ سپاہ کے افسر حضرت زید بن ثابت کے مطابق ہر پیادہ سپاہی کو چار اونٹ یا چالیس بھیڑ بکریاں حصہ میں پڑی تھیں جبکہ ہر شہسوار مجاہد کا حصہ اس کا تین گنا تھا۔[۱۰۹] ظاہر ہے کہ کچھ کے حصے میں چاندی یا دوسری اشیائے غنیمت (اگر کچھ تھیں) ملی تھیں جو مالیت میں اپنے اپنے طبقہ کے مجاہدین کے حصہ کے مساوی تھیں۔ جیسا کہ معلوم و معروف ہے تمام جنگی قیدیوں کو ہوازن کے مسلم اور غالباً غیر مسلم سرداروں کی دردمندانہ درخواستوں پر بلا شرط رہا کر دیا گیا تھا۔[۱۱۰]

اگلے برس یعنی ۹ھ / ۶۳۰-۳۱ء کی کل نو مہموں میں ایک دو کے سوا سب میں مالِ غنیمت کم یا بیش مسلمان مجاہدین کے ہاتھ لگا تھا۔ تمیم کے خاندان بنو الانبار کے خلاف حضرت عُیَینہ بن حصن فزاری کی تعزیری مہم کے نتیجہ میں کچھ قیدی پکڑے گئے تھے اور

امکان ہے کہ کچھ سامان بھی ملا ہو لیکن اس کا صریح ذکر مآخذ میں نہیں ملتا ہے۔ بہرحال کچھ قیدیوں کو ازراہِ ترحم رہا کر دیا گیا تھا جبکہ بعض دُوسروں نے فدیہ ادا کر کے رہائی پائی تھی۔[111] دوسرے مہینے قبیلہ خثعم کے ایک خاندان کے خلاف تعزیری مہم کے دوران حضرت قطبہ بن عامر کے ۲۰ مجاہدوں پر مشتمل دستے میں سے فی کس چار اونٹ یا اس کے مساوی بھیڑ بکریوں پر مشتمل مالِ غنیمت ملا تھا۔ اس سے قبل اس کا خمس نکال لیا گیا تھا۔[112] اس برس کی پانچویں مہم حضرت علی بن ابی طالب کا سریہ فلس تھا جس میں مسلمانوں کو کافی تعداد میں مویشی، قیدی اور کچھ ہتھیار ملے تھے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ ہتھیار قبیلہ طے کے صنم کدہ میں ملے تھے۔ اگرچہ خمس کے نکالنے اور صفی کے علیحدہ کرنے کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے مگر ان کی تعداد یا مقدار یا مالیت کا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے۔[113] غزوہ تبوک کے دوران حضرت خالد بن ولید مخزومی دومۃ الجندل کی مملکت کے خلاف ایک مہم لے کر گئے تھے۔ اس کے عیسائی حکمران اُکیدر بن عبدالملک کندی نے حضرت خالد کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ایک معاہدہ صلح کیا تھا جس کی رُو سے اس نے دو ہزار اونٹ، آٹھ سو گھوڑے (راس)، چار سو ڈھالیں اور زرہ بکتر اور اتنے ہی نیزے ادا کیے تھے۔ بعد میں اکیدر نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر مستقل سالانہ جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔[114] حضرت خالد بن ولید کو جو "اموال" اکیدر نے ادا کئے تھے وہ تکنیکی لحاظ سے مالِ غنیمت میں نہیں آتے کیونکہ وُہ صلح کے ایک معاہدہ کے نتیجے میں اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی کو قبول کرنے کی ایک علامت کے طور پر دئے گئے تھے۔

ہجرت کے دسویں برس یعنی ۳۲-۶۳۱ء میں صرف ایک مہم یعنی سریۂ علی جانب یمن میں کچھ مال ملا تھا جو قیدیوں، مویشیوں اور کپڑوں پر مشتمل تھا۔ اس کا خمس یمنی کپڑوں اور مویشیوں پر مشتمل تھا۔ حضرت علی اس موقع پر مذحج وغیرہ کے مسلمانوں کے صدقات بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔[115]

عہدِ نبوی کی کل یہی مہمیں تھیں جن میں مسلمانوں کو مذکورہ بالا مالِ غنیمت ملا تھا۔ اس بحث کو ہم نے نقد و جنس پر مشتمل مالِ غنیمت تک محدود رکھا ہے۔ اگر ان تمام مہموں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام غزوات و سرایا میں سے صرف ایک تہائی سے کچھ زیادہ میں مالِ غنیمت دستیاب ہوا تھا اور اکثر مہموں میں وہ کافی حقیر تھا تاہم یہ حقیقت ہے کہ اموالِ غنیمت نے عام مسلمان مجاہدین کو اور ان کے ذریعہ مسلم اُمت کے مختلف طبقات کو کسی نہ کسی حد تک "مالدار" بنایا تھا جبکہ خمس اور صفی نے اسلامی ریاست کی ضروریات کی کفالت کی تھی۔ لیکن یہ "مالداری" اور "کفالت" کتنی تھی اس پر کہیں اور مفصل بحث کی جا چکی ہے اور وہ سردست ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ لیکن نقد و جنس میں حاصل شدہ اموالِ غنیمت مسلم معیشت اور اسلامی ریاست کے لیے اتنے اہم نہ تھے جتنے کہ جائدادوں اور اراضی پر مشتمل اموالِ غنیمت جن کو کبھی کبھی اصطلاح میں "فے" کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اگرچہ فے اموالِ غنیمت میں حاصل ہونے والی جائدادوں کی ایک مخصوص شکل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ بہرحال فی الحال ہماری اس سے کوئی بحث نہیں۔ ذیل میں ہم اموالِ غنیمت میں یا مہموں کے نتیجے میں حاصل ہونے والی اراضی سے بحث کر رہے ہیں کہ وہ مسلم معیشت کے لیے زیادہ مفید تھی۔

(ج) اموالِ غنیمت : جائداد مشتمل بر اراضی

اگر محمد بن حبیب بغدادی کی روایت صحیح ہے تو پہلی اراضی (اموال) جو بطور مالِ غنیمت مسلمانوں کو حاصل ہوئی ہوگی وہ مدینہ سے جلاوطن کیے جانے والے پہلے یہودی قبیلہ / خاندان بنو قطیبون کی تھی۔[116] مگر اس روایت کے سلسلے میں کئی اشکال ہیں:

اوّل یہ کہ بغدادی نے ان کے اخراج کا تو ذکر کیا ہے مگر دوسری تمام تفصیلات سے گریز کیا ہے۔ دوم یہ کہ ان کی جائداد رہائشی تھی یا پیداواری یا دونوں یہ کہنا مشکل ہے کیونکہ ہم کو بنو قطیبون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ اسی طرح بنو قینقاع کا معاملہ ہے۔ اگر مشہور روایات صحیح ہیں تو ان کے مدینہ سے جلاوطنی کے بعد ان کی جائدادیں — بازار، دکانیں، مکانات — مسلمانوں یا اسلامی ریاست کی ملکیت میں آگئی تھیں[117] لیکن اگر حمید اللہ کی رائے اور برکات احمد کی مدلل بحث صحیح ہے تو ان کو ان کی جائدادوں اور اراضی پر بحال رکھا گیا تھا۔ بہرحال ماخذ کا یہ بیان ہے کہ ان کا بازار مدینہ کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا[118] جہاں ان کی مسقف و پختہ دکانیں تھیں۔[119] وہ اپنے رہائشی مکانات گڑھیوں (آطام) میں بناتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی زرعی جائدادیں یعنی باغات و کھیت وغیرہ نہیں تھے[120] کیونکہ وہ تجارت پیشہ اور دستکار تھے۔[121] ان کی جائدادوں کی مالیت کا اندازہ مشکل ہے مگر محال نہیں۔ روایات کے مطابق ان کے بالغ و جنگ کے قابل مردوں کی تعداد سات سو افراد پر مشتمل تھی۔[122] اور ان کی کل آبادی انھیں کے خاندانوں کی تھی جو ہمارے اندازے کے مطابق تقریباً چار پانچ ہزار افراد کے درمیان تھی۔ اسی سے ان کی جائدادوں کی مالیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال حتمی طور پر جو جائداد و اراضی — رہائشی و پیداواری دونوں — پہلی بار مسلمانوں کے قبضۂ تصرف میں بطور مالِ غنیمت آئی تھی وہ مدینہ کے مالدار یہودی قبیلہ بنو نضیر کی تھی جن کو معاہدہ توڑنے اور فساد فی الارض پھیلانے کے جرم میں مدینہ سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ ان کی اراضی و جائداد (اموال) ان کے رہائشی مکانات جو گڑھیوں اور قلعوں (آطام) میں واقع تھے کے علاوہ باغات اور کھیتوں پر مشتمل تھی کیونکہ وہ زراعت پیشہ تھے۔[123] واقدی اور دوسرے متعدد مستند مصنفین کا بیان ہے کہ ان کے اموال میں کھجور کے باغات میں ہی اناج و سبزی وغیرہ کے کھیت ہوتے تھے جہاں خاصی بڑی مقدار میں (زرع کثیر) ہوتی تھی۔[124] بنو نضیر کا قبیلہ کم و بیش بنو قینقاع کی مانند یا اس سے بھی بڑا تھا لیکن ان کی جائدادوں کی مالیت کا صحیح تخمینہ کافی مشکل ہے۔ بہرحال کچھ اندازہ بعض قرینوں سے ہوتا ہے۔ روایت ہے کہ اموالِ بنی نضیر کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غریب مہاجرین اور دو انصاریوں حضرات سہل بن حُنیف اور ابو دجانہ کے درمیان تقسیم کر دیا تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کتنے مہاجرین کو اس سے فیض پہنچا تھا کیونکہ ماخذ اس نکتہ پر خاموش ہیں۔ بہرحال اس زرعی اراضی کی پیداواری صلاحیت کے بارے میں بعض بڑی دلچسپ روایات ملتی ہیں جن کا مطالعہ ہمارے لیے مفید ہوگا۔ واقدی اور ابنِ سعد وغیرہ نے حضرت عمر بن خطاب کی سند پر روایت بیان کی ہے کہ اموال بنی نضیر، فدک اور خیبر کے بعض اراضی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفی / صفایا میں شامل تھی[125] جس کو تکنیکی لحاظ سے فقہ میں فے بھی کہا جاتا ہے۔[126] بہرحال وہ مسلمانوں میں تقسیم کی گئی ہو یا اسلامی ریاست کی ملکیت میں بطور فے رہی ہو یہ حتمی و ناقابلِ تردید

امر ہے کہ اس سے تمام اُمتِ مسلمہ یعنی مسلمانانِ مدینہ فیض یاب ہوئے تھے۔ روایات کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سال بھر اموال بنی نضیر اور عطایائے حضرت مخیریق نضری کی پیداوار میں سے صدقات تقسیم کیا کرتے تھے۔[127] ان کے علاوہ آپ اپنے خاندان بنی عبدالمطلب کے متعدد افراد اور اپنی تمام ازواجِ مطہرات کو بھی انھیں جائدادوں سے اتنی پیداوار جو کھجور اور جَو پر عموماً مشتمل ہوتی تھی عطا فرمایا کرتے تھے جو ان کی ضروریات کے لیے سال بھر کافی ہوتی تھی۔ اور اس سے جو کچھ بچ رہتا تھا اس کو اسلحوں اور گھوڑوں کی خرید پر خرچ کیا کرتے تھے۔[128] روایات کے مطابق آپ کے غلام حضرت ابو رافع اموالِ بنی نضیر کے مہتمم و نگران افسر تھے جو اس کے باغوں اور کھیتوں میں پیدا ہونے والی کھجور، اناج اور سبزیوں کی پہلی کھیپ (اَبْکرہ) آپ کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔[129]

اموالِ بنی نضیر کی مالیت کا مزید اندازہ ان کی بعض جائدادوں کے تذکرہ سے بھی ہوتا ہے جو مسلم مجاہدین یا اراکینِ امت کو ملی تھی۔[130] یحییٰ بن آدم کا بیان ہے کہ سات باغوں (حوائط) کے علاوہ تمام اموال بنی نضیر کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ سات باغ جو صفیِ رسول یا فے کے ضمن میں تھے ان باغات و کھیتوں کے علاوہ تھے جو بنو نضیر کے ایک مالدار مسلم حضرت مخیریق نے آپ کو ہبہ کیے تھے۔ واقدی نے اموال بنی نضیر کے بعض عطایائے نبوی کا ذکر بطورِ خاص کیا ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق کو بئر حجر ملا تھا جبکہ حضرت عمر فاروق کے حصے میں بئر جرم آیا تھا۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ دونوں بزرگوں کو دو کنوؤں کا عطیہ ملا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ ان کنوؤں کے ساتھ ان دونوں سابقین اولین کو ان کی ملحقہ اراضی بھی ملی ہو کیونکہ عرب میں اراضی عام طور سے اپنے علاقے میں واقع کنوؤں کے نام سے بھی موسوم ہو جاتی تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کو "سُعالہ" نامی جائداد ملی تھی جو بعد میں "مال سُلیم" کے نام سے مشہور ہوئی تھی۔ حضرت صہیب بن سنان نمری کو "الضرطہ" نامی جائداد بلا شرکتِ غیرے عطا ہوئی تھی جبکہ حضرات زبیر بن عوام اور ابو سلمہ بن عبدالاسد کو "البویلہ" نامی جائداد مشترکہ طور پر ملی تھی حضرات ابو دجانہ اور سہل بن حُنیف کو بھی مشترکہ جائداد ملی تھی جو عام طور سے "مال ابن خرشہ" کے نام سے مشہور تھی۔[131] واقدی کا بیان ہے کہ ان کے زمانے تک یہ تمام جائدادیں معلوم و معروف تھیں۔ لیکن بعد کے زمانے میں ان پر وقت کی گرد جم گئی اور وہ "تاریخ کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئیں۔ ابنِ سعد نے اپنے استاد کی روایت پر یہ اضافہ کیا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو اموال بنی نضیر سے "کیذمہ" نامی ایک جائداد ملی تھی جو بعد میں انہوں نے خلیفۂ وقت حضرت عثمان کے ہاتھوں چالیس ہزار دینار میں فروخت کر دی تھی۔[132]

مدینہ کے چوتھے یہودی قبیلہ بنو قریظہ سے جو جائداد مسلمانوں کو ملی تھی اس کے بارے میں ہماری معلومات بہت ہی ناقص ہیں اور سوائے اس کے کہ وہ "آطام" میں رہتے تھے اور کھجوروں کے باغات اور اناج و سبزی کے کھیتوں کے مالک تھے[133] ہم بہت کم جانتے ہیں۔ یحییٰ بن آدم کی کتاب الخراج میں ایک وادیٔ مہزور کے بارے میں حوالہ ملتا ہے کہ وہ حرۃ (لاوا کے علاقے) میں واقع تھی جہاں اناج کے بڑے بڑے کھیت اور باغات تھے۔[134] قاضی ابو یوسف کا بیان ہے کہ بنو قریظہ کی اراضی مسلم مجاہدین میں نہیں تقسیم کی گئی تھی جبکہ واقدی اس کی تقسیم کے قائل ہیں۔[135] قاضی موصوف کے مطابق وہ فے تھی اور اسلامی ریاست کی ملکیت تھی جبکہ واقدی نے کہا کہ وہ مالِ غنیمت کی مانند پانچ حصوں میں تقسیم کی گئی تھی اور صرف خمس اسلامی

ریاست کو ملتا تھا اور چار حصے مسلم مجاہدین میں تقسیم کر دئے گئے تھے۔ پیادوں سے شہسواروں کو دوگنا حصہ ملا تھا۔ واقدی کے مطابق بنو عبد الاشہل، بنو ظفر، بنو حارثہ اور بنو معاویہ کے انصاری خاندانوں کو (جن کو عام طور سے بنو نابت کہا جاتا ہے) ایک خاص اراضی سے حصہ ملا تھا جبکہ بنو عمرو بن عوف اور بقیہ دوسرے اوسی خاندانوں کو دوسرا حصہ ملا تھا۔ اسی طرح خزرج کے خاندان بنو نجار، بنو مازن، بنو مالک، بنو ذبیان اور بنو عدی کو ایک جائداد میں حصہ دار بنایا گیا تھا تو بنو سلمہ، بنو زریق اور بنو حارث کو دوسرے میں۔[۱۳۶] دل چسپ بات ہے کہ اموالِ بنی قریظہ میں سے کسی کا نام نہیں مذکور رہا ہے سوائے وادی مہروز کے جس کا ایک کافی وسیع حصہ حضرت زبیر بن عوام اسدی کو اور ان کے ایک گمنام پڑوسی کو جن کا تعلق انصار کے خاندان بنی امیہ سے تھا عطا کیا گیا تھا۔[۱۳۷] پہلے کسی باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ بعض قرظی خاندانوں اور افراد کو نہ صرف معاف کر دیا گیا تھا بلکہ ان کی جائدادیں بھی ان کو واپس کر دی گئی تھیں۔ متعدد قرائن ایسے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ بنو قریظہ کے صرف مقتولین اور جلا وطن ہونے والوں کی جائدادیں جو کافی کم تھیں مسلمانوں میں تقسیم کی گئی تھیں۔

اگرچہ "اموالِ خیبر" کے بارے میں کافی معلومات ملتی ہیں تاہم ان کی نوعیت اور مالیت کا صحیح تخمینہ لگانے کے لیے وہ ناکافی ہیں۔[۱۳۸] دوسری پیداواری اراضی کی مانند یہ یہودی اراضی بھی کھجوروں کے باغات اور اناج و سبزیوں کے کھیتوں پر مشتمل تھی۔ عرب دستور کے مطابق سبزیوں کے کھیت عموماً کھجوروں کے باغات میں ہی واقع ہوتے تھے جہاں ان کے زیر سایہ کاشت کی جاتی تھی۔[۱۳۹] بعض ماخذ کا دعویٰ ہے کہ اگرچہ خیبر کو مسلمانوں نے طاقت کے بل پر (عنوۃً) فتح کیا تھا اور اس لحاظ سے وہ مالِ غنیمت تھا اور اس کو دوسرے غنائم کے مانند اسلامی قانون کے مطابق مسلم مجاہدین میں تقسیم کر دینا تھا لیکن اس کو فے یا صفی رسول قرار دیا گیا اور ان کے قلعوں، باغوں اور کھیتوں کو یہودی کاشت کاروں کے قبضہ میں چھوڑ دیا گیا اور صلح اس شرط پر کر لی گئی کہ مسلمان اور یہود خیبر ان زرعی زمینوں کی پیداوار کے نصف نصف کے مالک ہوں گے۔[۱۴۰] ماخذ میں اس طرح کی تقسیم پیداوار کو مساقہ (بٹائی کا متناسب طریقہ) کہا جاتا ہے۔[۱۴۱] دوسری طرف قاضی ابو یوسف اور ان کے ہم خیال فقہا کا خیال ہے کہ امام کو اموالِ مفتوحہ کو تقسیم کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے۔ وہ اگر چاہے تو اسلامی اُمت و ریاست کے وسیع تر مفادات میں مفتوحہ اراضی کو مسلم مجاہدین میں تقسیم نہ کرے اور پوری اُمت کے لیے وقف کر کے اس کی ملکیت اور پیداوار اپنے قبضہ تصرف میں رکھے۔ چنانچہ انھیں اسباب سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر، بنو قریظہ کے علاوہ دوسرے عرب قبائل کے مفتوحہ علاقوں کو فے یا صفی رسول قرار دے کر تقسیم نہیں کیا تھا جبکہ اموال خیبر کو تقسیم کر دیا گیا تھا۔[۱۴۲] ابن واقد کا خیال ہے کہ اموال خیبر کو غنیمہ شمار کیا گیا تھا اور اس لحاظ سے مسلمانوں میں اس کو تقسیم کر دیا گیا تھا اور صرف خیبر کے خمس کو جو قلعہ کتیبہ پر مشتمل تھا اسلامی ریاست کا حق قرار دیا گیا تھا[۱۴۳] اور اسی سے آپ صدقات و عطایا دیا کرتے تھے۔[۱۴۴]

اس نظریہ کے مطابق قلعۂ کتیبہ کی کھجور کی کل پیداوار آٹھ ہزار وسق (تقریباً آٹھ ہزار کوئنٹل) سالانہ تھی جس میں سے نصف یہودیوں کو اور نصف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملتی تھی۔ کتیبہ کی جَو[۱۴۵] کی پیداوار تین ہزار صاع (تقریباً ساڑھے چار ہزار کلو) تھی۔ وہ بھی فریقین میں نصف نصف تقسیم ہو جاتی تھی۔ اس کی نوی (گٹھلی لغوی معنی) کی پیداوار عام طور سے ایک ہزار

صاع تھی اور اس کا نصف حصہ رسول کریم کا تھا۔ اسی سے اس نظریہ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو کھجور، اناج اور نوی کے صدقات وعطیات مسلمانوں کو عطا کرتے رہتے تھے۔ واقدی کے بیان کردہ اعداد و شمار کے مطابق خیبر کی کل زرعی پیداوار میں مسلم حصہ حسب ذیل تھا:

۱۔ کھجور	۴۰،۰۰۰ وسق
۲۔ جو	۱۵،۰۰۰ صاع
۳۔ نوی	۵،۰۰۰ صاع

اس کی مزید تصدیق واقدی ہی کی بیان کردہ ایک اور روایت میں ہوتی ہے جس کے مطابق ایک سال حضرت عبداللہ بن رواحہ نے خیبر کی کل کھجور کی پیداوار میں مسلم حصہ چالیس ہزار وسق آنکا تھا۔[۱۴۶]

سہمان المسلمین (مسلمانوں کے حصہ) میں آنے والی زمینیں اور خمس کی اراضی کے انتظامات اور نگرانی کے لیے دو طرح کے افسروں کو مقرر کیا گیا تھا جن کو مآخذ میں رؤوس (رأس کی جمع بمعنی سردار) کہا گیا ہے۔ تمام اراضی پر یہودیوں کا قبضہ برقرار رہا تھا جو ان کو جوتتے بوتے، سینچتے، فصل کاٹتے اور ان کی حفاظت کرتے تھے جیسا کہ قاضی ابو یوسف نے اس کی توضیح کی ہے۔[۱۴۷] جب فصلیں پکنے کے قریب ہوتیں تو مدینہ سے ان کے تخمینہ و تقسیم کے لیے خارص (افسر تخمینہ) بھیجے جاتے تھے۔ ابتدا میں یہ کار منصبی حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجی نے کچھ ایسی بے مثل دیانتداری، فرض شناسی اور لگن سے انجام دیا کہ عام تاثر یہ بن گیا کہ وہ تمام پیداوار خیبر کے تخمینہ و تقسیم کے افسر تھے[۱۴۸] حالانکہ ابن اسحاق اور واقدی وغیرہ کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجی صرف ریاست اسلامی کے خمس کے افسر تھے یا مجموعی طور سے من جملہ اٹھارہ افسروں میں سے ایک تھے جو مسلم حصوں کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ کتیبہ کی خمس اراضی کی پیداوار کے تخمینے کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ (اور بعد میں ان کے جانشین بھی) اس کو دو برابر برابر ڈھیروں میں بانٹ دیتے تھے اور یہودی کاشتکاروں کو اختیار دیتے تھے کہ وہ جو چاہیں وہ ڈھیر لے لیں۔[۱۴۹] قاضی ابو یوسف کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات حضرت عبداللہ کھجوروں کی قیمت نقد طلب کرتے تھے اور اسے یہودی بخوشی قبول کر لیتے تھے۔[۱۵۰] بدقسمتی سے ہم اس نرخ سے واقف نہیں ہو سکے جس پر کھجوروں کی پیداوار کی قیمت کو جنس سے نقد میں بدلا جاتا تھا ورنہ مسلم حصہ کی مالیت اور اس کی بنا پر مسلم معیشت میں اس کی اصل حیثیت کو متعین کر لیا جاتا۔ بہر حال یہ اندازہ ہے کہ نقد میں جنس کی شرح تبادلہ یقینی طور سے رائج قیمتوں کی بنیاد پر رہی ہوگی اور جس سے یہودی کاشتکاروں کو فائدہ رہا ہوگا کہ انھوں نے زیادہ بہتر قیمت پر دوسرے صارفین کے ہاتھ اس کو بیچا ہوگا۔

جیسا کہ حوالہ آ چکا ہے کہ مسلمانوں کے حصوں کی نگرانی، تخمینے اور تقسیم وغیرہ کے معاملات اٹھارہ افسروں کے سپرد کر دئے گئے تھے۔ ہر افسر کل سو حصوں (سہمان) کا ذمہ دار تھا۔[۱۵۱] ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے کل اٹھارہ سو حصے لگائے گئے تھے اور ان کی حصہ میں آنے والی اراضی نطاۃ اور شق نامی قلعوں کے مجموعہ میں واقع تھی۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ نطاۃ میں کل پانچ مجموعی حصے (یا پانچ سو حصے) تھے جبکہ شق میں تیرہ مجموعی حصے (تیرہ سو حصے) تھے۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں

رہ جاتی کہ نطاۃ میں پانچ افسر تھے اور شق کے تیرہ افسر۔ یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ابنِ اسحاق اور واقدی وغیرہ نے جن اٹھارہ یا کچھ کم و بیش حصّوں کا ذکر کیا ہے وُہ دراصل انھیں صحابہ کے حصّے (سہمان) نہیں تھے جن کے نام سے وُہ موسوم ہیں دراصل یہ اٹھارہ مجموعی حصّے اپنے مشہور ترین حصّہ دار کے نام سے موسوم ہو گئے تھے۔(۱۵۲) ورنہ ان میں سے ہر ایک میں ننانوے اور حصّہ دار تھے۔ واقدی کا بیان مزید تشریح کرتا ہے کہ ہر سو آدمیوں / حصّہ داروں کا ایک رأس (سردار) ہوتا تھا جو ایک معروف شخصیت ہوتا تھا (یُعرَفُ) اور وہی اپنے تمام شرکا، کو "غلّہ" (پیداوار / اناج) تقسیم کیا کرتا تھا جو اس کے مجموعۂ حصص سے حاصل ہوتا تھا۔ واقدی نے رؤوس (سردارانِ حصص) میں سے صرف گیارہ کے نام گنائے ہیں۔ یہ تھے حضرات:

۱۔ عاصم بن عدی	۲۔ علی بن ابی طالب
۳۔ عبدالرحمٰن بن عوف	۴۔ طلحہ بن عبید اللہ
۵۔ معاذ بن جبل	۶۔ اسید بن حضیر
۷۔ عبداللہ بن رواحہ	۸۔ فروہ بن عمرو
۹۔ عمر بن خطاب	۱۰۔ سعد بن عبادہ
۱۱۔ بریدہ بن حصیب	

روایت کے بموجب موخر الذکر صحابی نے اوس کے ایک حصّہ کو خرید لیا تھا جس کو "سہم اللفیف" کہا جاتا تھا اور غالباً اسی بنا پر وہ "یکے از افسرانِ انتظام" بن گئے تھے۔(۱۵۳) ابن اسحاق نے اپنی فہرست میں حضرت زبیر بن عوام کو بھی "ایک افسرِ انتظامِ مال" بتایا ہے۔(۱۵۴) اس طرح کل بارہ حضرات کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔ بقیہ چھ افسروں کے نام پردۂ خفا میں ہیں۔ بہر حال موجودہ حقیقت کے مطابق چار افسروں کا تعلق قریش سے تھا، اتنے ہی افسروں کا تعلق خزرج سے تھا اور تین اوس سے متعلق تھے، جبکہ ایک بدوی قبیلہ اسلم کے ممتاز فرد تھے۔ یہ تقریباً یقینی ہے کہ ان افسروں کا تناسب حصّہ داروں کے تناسب کے مطابق تھا۔ یہاں اس امر کی طرف توجہ دلانا ازبس ضروری ہے کہ ابن اسحاق کے انگریزی مترجم مشہور مستشرق الفریڈ گلیوم نے اموالِ خیبر کے تقسیمِ حصص کے معاملہ کو بالکل نہیں سمجھا ہے اور ترجمہ میں خاصا خلط مبحث کیا ہے جس کے سبب ان کو پورا "بیان غیر منظم اور پیچیدہ" نظر آیا ہے۔(۱۵۵)

تقسیم اموالِ خیبر کے سلسلہ میں ایک روایت کا ذکر یہاں قابلِ توجہ معلوم ہوتا ہے جس سے مسلم مجاہدین کے ضبطِ نفس، ایمانداری، اتباعِ رسولؐ کے علاوہ اسلامی ریاست کی پالیسی بھی واضح ہوتی ہے۔ خیبر کی فتح اور یہودی کاشتکاروں سے نصف پیداوار کے بٹوارے (مساقہ) کے معاہدے کی انجام دہی کے معاً بعد بعض فتح سے سرشار مسلمان سپاہیوں نے ان کے کھیتوں میں اُگی فصلوں (الحرث) اور سبزیوں (البقل) کو لوٹنا شروع کر دیا۔ یہودیوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمان کے طرزِ عمل کی شکایت کی اور آپ نے مسلمانوں کو سختی سے منع فرماتے ہُوئے کہا کہ "یہودیوں نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم نے ان کے کھیتوں (حضیر) کو تاراج کر دیا ہے۔ ہم نے ان کے خون، اموال اور ان کی تمام

اراضی کی جو ان کے قبضہ میں ہے حفاظت کی ضمانت دی ہے اور ہم نے ان سے ایک معاہدہ کیا ہے۔ بلا ریب مُعَاہَدِین (عہد والے لوگوں) کے اموال میں سے صرف حق کے ساتھ کچھ لینے کی اجازت ہے۔" راوی کا تبصرہ ہے کہ اس تقریر نبوی کے بعد مسلمانوں نے یہودیوں سے سبزی وغیرہ ہمیشہ پیسے/قیمت (ثمن) دے کر خریدی۔[156] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم فاتحین نے جو لوٹ مار کی تھی وہ اس غلط تصور کے نتیجہ میں کی تھی کہ وہ معاہدے کے مطابق بھی نصف کے حقدار رہیں۔

تقریباً تمام مآخذ کا اتفاق ہے کہ خیبر کے اموال سے حاصل شدہ خمس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تین مصارف میں صرف کرتے تھے:

اوّل اپنے خاندان بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب کو ایک حصہ عطا کرتے تھے،

دوسرا اپنے خاندان یعنی ازواجِ مطہرات پر صرف کرتے تھے،

اور تیسرا غریب مسلمانوں پر خرچ کرتے تھے۔[157]

ابنِ اسحاق اور واقدی وغیرہ مستند مورخین نے ان تمام حضرات وخواتین کا خصوصی ذکر کیا ہے جن کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خمسِ خیبر میں سے کچھ بھی عطیہ دیا تھا۔[158] عطایا میں تقسیم کردہ ایسے حصوں کا میزان تین ہزار وسق بنتا تھا جیسا کہ ابنِ اسحاق نے بیان کیا ہے۔[159] ان میں سے ازواجِ مطہرات کو فی کس اسّی یا سو وسق سالانہ عطیہ کی شرح سے کل عطیہ سات سو وسق تھا۔[160]

فتح خیبر اور نصف پیداوار کے مساقہ (بٹوارے) کے معاہدہ کے بعد خیبر کی زرعی حالت انتظام کے بارے میں ایک دلچسپ اور اہم روایت ملی ہے جو ایک طرف مفتوح قوموں کی علومی ذہنیت کی طرف عام طور سے اور یہودی مزاجِ شر و فساد کی طرف خاص طور سے اشارہ کرتی ہے۔ واقدی کا بیان ہے کہ اس معاہدہ کے بعد ہی پیداوار میں کافی گراوٹ آئی اور اس سال اتنی کم پیداوار ہوئی کہ خیبر کی زرعی دولت اور خوشحالی جس کے لیے وہ پورے جزیرہ نمائے عرب میں معلوم ومشہور تھا، ماضی کی کہانی بن گئی۔[161] مسلمان مورخین نے اس زرعی پیداوار کی کمی کا سبب تین چیزوں کو قرار دیا ہے۔ اوّل یہ کہ خیبر کے دولت مند اور صاحبِ ثروت کاشتکار لوگ جو دراصل مقامی طبقۂ اشراف بھی تھا جلد ہی فنا ہو گیا اور وہ جو مال و دولت کاشتکاری میں لگاتے تھے وہ دستیاب نہ رہا۔ دوم یہ کہ باقی رہ جانے والے یہودی محض کاشتکار اور مزدور (عُمّال ایدیہم) رہ گئے جن کے پاس سرمایہ کاری کے ذرائع نہیں تھے۔ اور سوم یہ کہ یہودی کاشتکاروں نے عمداً مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی خاطر اپنی پیداواری صلاحیت کو مسلسل گھٹایا۔[162] یہ مسلم تبصرہ حقیقت پر مبنی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم اُمت اور ریاست کو خیبر کی اصل پیداوار کا نصف ان مذکورہ بالا اسباب سے کبھی نہیں ملا۔ مذکورہ بالا پیداوار کے اعداد وشمار فتح خیبر کے سال کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد پیداوار کی شرح میں مسلسل کمی ہوتی رہی تھی۔

خیبر سے ملحق دوسری یہودی بستی فدک بھی صلح کے ذریعہ مسلمانوں کے قبضہ میں آئی تھی اور اسی بنا پر اس کو بھی فے قرار دیا گیا تھا۔[163] روایات کے مطابق حضرت محیصہ بن مسعود نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے اور سفیر کے فرائض انجام دئے تھے اور انھوں نے خیبر کی شرائط پر صلح کا معاہدہ کر لیا تھا۔ یعنی ان کو بھی اپنی تمام پیداوار کا نصف (نصف

الارض) مسلمانوں کو یا اسلامی ریاست کو سالانہ یا فصل کے موقع پر ادا کرتے رہنا تھا، جبکہ تمام اراضی ان کے قبضے ہی میں رہنے دی گئی تھی۔[۱۶۴] البتہ ملکیت ارض اسلامی ریاست کو منتقل ہو گئی تھی۔ فدک کے بارے میں ہماری معلومات بہت ہی ناقص ہیں نہ ہم ان کی اراضی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں نہ کل پیداوار یا اس میں مسلم حصہ کے بارے میں۔ البتہ یہ یقینی طور پر ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ فدک کی زمین بہت ہی زرخیز تھی اس کا ایک سبب یہ تھا کہ وہاں آبپاشی کا بہت اچھا نظام تھا۔[۱۶۵] عہدِ فاروقی میں کل اراضی کی مالیت ایک لاکھ درہم آنکی گئی تھی چنانچہ یہود حجاز کے جزیرہ نمائے عرب سے اخراج کے وقت یہود فدک کو ان کے نصف حصہ کی قیمت پچاس ہزار درہم ادا کی گئی تھی۔[۱۶۶] یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دس بارہ سال میں قیمتوں میں کافی فرق آگیا تھا اور عہد نبوی کے مقابلے میں عہدِ فاروقی یا عہدِ عثمانی میں اشیائے صرف یا جائدادوں کی قیمتیں کافی چڑھ گئی تھیں۔ اس کا ایک سبب غالباً افراطِ زر تھا جو عالمگیر فتوحات اور بین الاقوامی مسلم تجارت کے ضمن میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ غالباً یہ علاقہ قریٰ عربیہ کے انتظامی علاقے (عمالہ) میں شامل رہا تھا[۱۶۷] اور وہاں کے گورنر حضرت عبد اللہؓ بن سعید اموی فدک کی زمینوں کے انتظامات اور وہاں کے محاصل کی وصولیابی کے ذمہ دار رہے تھے۔ یہاں سے حاصل شدہ محاصل کے مصارف روایات کے مطابق رفاہ عام کے کام تھے خاص کر مسافروں (ابن السبیل) کی ضروریات پر ان کو خرچ کیا جاتا تھا۔[۱۶۸] کیونکہ روایات کے مطابق فدک فے اراضی تھی جس کے انتظام و انصرام کی کل ذمہ داری اسلامی ریاست کی تھی۔

اگرچہ اخراجِ یہود کا تعلق ہمارے موضوع سے نہیں ہے تاہم یہاں یہودِ حجاز کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کی شرائط کا ذکر کرنا کافی اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اس سے ایک طرف تو ہم کو یہودیوں سے مسلم معاہدہ کی صحیح نوعیت سمجھنے میں مدد ملے گی تو دوسری طرف عہد فاروقی میں جزیرہ نمائے عرب سے ان کے اخراج پر روشنی بھی پڑے گی۔ ابنِ اسحاق اور طبری کے مطابق معاہدۂ نبوی کی من جملہ شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ "اگر ہم تم لوگوں کو جلا وطن کرنا چاہیں تو ہم ایسا کر سکیں گے۔"[۱۶۹] چنانچہ اس شرط کی روشنی میں حضرت عمر فاروق کا اقدام سنتِ نبوی کے خلاف یا معاہدہ شکنی کے مترادف نہیں تھا جیسا کہ مستشرقین اور بعض جدید مورخین دعویٰ کرتے ہیں۔ یہودیوں کی جلا وطنی کے اور بھی اسباب تھے لیکن معاہدہ نبوی کی اس شرط نے اس کی راہ ہموار کی تھی۔ خیال یہ ہے کہ خیبر کے یہود کے اخراج میں ان کی سازشی فطرت کے علاوہ ان کی زراعت کو عمداً نقصان پہنچانے کی مذموم حرکت نے بھی کافی اہم حصہ لیا تھا۔ یہاں یہ بھی ذکر کرنا ناگزیر ہے کہ تیما اور وادی القریٰ کے یہود کو ان کے وطن سے اس عہد میں بھی جلا وطن نہیں کیا گیا تھا کیونکہ وہ حجاز کے یہودیوں میں شمار نہیں ہوتے تھے جیسا کہ واقدی کا خیال ہے۔[۱۷۰] ممکن ہے کہ ان علاقوں نے معاہدہ شکنی کا اور ریاست اسلامی کے مفادات کے خلاف کوئی ایسا اقدام نہ کیا ہو جو ان کے اخراج کا تقاضا کرتا لہٰذا وہ اپنے علاقوں میں حسبِ دستور سابق برقرار و بحال رکھے گئے۔

وادی القریٰ کی اراضی تھوڑے سے تصادم اور مزاحمت کے بعد (عنوۃً) فتح ہوئی تھی لہٰذا اس کو مالِ غنیمت تصور کیا گیا اور اسی لحاظ سے مسلمان مجاہدین میں اس کو تقسیم کر دیا گیا۔ اسلامی ریاست کے حصہ میں اس کا خمس آیا لیکن بعد میں اس علاقے کے یہودیوں نے خیبر اور فدک جیسی شرائط پر صلح کر لی لہٰذا ان کی اراضی ان کے قبضہ میں چھوڑ دی گئی اور اسلامی ریاست کو حقِ ملکیت

کے عوض اس کی نصف پیداوار بطور خراج[۱۷۱] ہر فصل پر مستقل ملتی رہی۔ وادی القریٰ کی اراضی کی نوعیت، پیداوار، زرخیزی وغیرہ کی تمام تفصیلات مآخذ میں کہیں بھی مذکور نہیں ہیں۔

تیماء کے یہودیوں نے جب خیبر، فدک اور وادی القریٰ کے زوال کی خبریں سنیں تو انھوں نے از خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کر لی اور جزیہ ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔[۱۷۲] عہد نبوی میں زمین پر محصول کے لیے جزیہ کی اصطلاح کا استعمال پہلی بار تیماء کے ہی معاملہ میں ہوا ہے۔ یہ امر بحث طلب ہے کہ یہ جزیہ محصول ذات (علی الرقاب، علیٰ انفسھم) تھا یا محصول زمین (علی الارض)۔[۱۷۳] ذات پر محصول کی مثالیں یعنی جزیہ کی صحیح تکنیکی نوعیت کی مثالیں ہم بنوکلب وغیرہ کے معاملہ میں دیکھ چکے ہیں۔ لیکن تیماء کے ضمن میں قرائن یہ کہتے ہیں کہ محصول بر ذات نہیں تھا بلکہ محصول بر زمین تھا۔ کیونکہ جزیہ کی کسی شرح کا اول تو ذکر نہیں، دوسرے خیبر، فدک اور وادی القریٰ کے پس منظر میں یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ اس علاقہ کا بھی معاملہ دوسری پڑوسی یہودی بستیوں سے مختلف نہیں تھا۔ واقدی کی مذکورہ بالا روایت جس میں یہود حجاز کے اخراج اور یہود وادی القریٰ اور تیماء کے عدم اخراج کا ذکر ہے بالواسطہ طور پر تصدیق کرتی ہے کہ ان کی زمینیں ان کے قبضۂ تصرف میں رہنے دی گئی تھیں اور وہ بھی دوسری یہودی بستیوں کی مانند اپنی پیداوار پر پچاس فیصد "جزیہ" ادا کرتے تھے جو دراصل "جزیہ علی الارض" یا "خراج" تھا۔ تیماء کے سلسلے میں بھی وادی القریٰ اور فدک کی مانند ہم کو نہ تو خارص (تخمینہ لگانے والے افسر) کا ذکر ملتا ہے نہ ہی دوسرے زرعی اور مالی افسران و عمال کا۔ لیکن اس کے گورنر (والی) کا صریح ذکر ملتا ہے۔[۱۷۴] اس کا قوی امکان ہے کہ محاصل کی وصولیابی اور دوسرے مالی معاملات کی آخری ذمہ داری بہرحال گورنر کی تھی۔ جہشیاری کے اس تبصرہ سے کہ حجاز کی پیداوار کا حساب کتاب رکھنے کے لیے مرکز میں ایک افسر ہوتا تھا[۱۷۵] اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ حجاز سے پرے واقع علاقوں کے محاصل کے انتظامات بھی کیے گئے ہوں گے اور بلاریب تیماء اور وادی القریٰ کے لیے عمال صدقات مقرر کیے گئے تھے خواہ ان کا تذکرہ مآخذ میں ملے یا نہ ملے۔

یہ بڑی دلچسپ اور اہم حقیقت ہے کہ مکہ مکرمہ کے سوا اور کسی عرب علاقے کو بزور شمشیر (عنوۃ) فتح نہیں کیا گیا تھا۔ تمام عرب علاقے جو اس کے بعد اسلامی ریاست کا حصہ بنے تھے وہ یا تو بلا استثناء صلح کر کے داخل ریاست اسلامی ہوئے تھے اور انھوں نے جزیہ ادا کرنے کا معاہدہ کیا تھا اور یا وہ اسلام قبول کر کے اسلامی امت میں ضم ہو گئے تھے اور اس حیثیت سے انھوں نے وہ صدقات ادا کیے تھے جو صرف مسلمانوں پر عائد ہوتے تھے۔

اس بحث کے آخر میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے اس ذریعۂ آمدنی ـــــ خمس ـــــ کے افسر جو "صاحب الخمس" کہلاتا تھا کے بارے میں بھی مختصراً مطالعہ کر لیں۔ گزشتہ اوراق میں اور بعض دوسرے مقامات پر بھی ہم نے غنیمت منقولہ اور غیر منقولہ دونوں کے بارے میں انتظامی افسروں کا مطالعہ ہم نے کر لیا ہے اور یہ دیکھ چکے ہیں کہ کبھی کبھی صاحب المغانم خمس کے معاملات کو بھی دیکھتا تھا لیکن اکثر و بیشتر خمس کے لیے ایک خاص افسر متعین کیا جاتا تھا۔ مآخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمیہ بن جزء زبیدی عہد نبوی میں خمس کے مستقل افسر تھے۔ واقدی، ابن سعد اور ابن اثیر وغیرہ جیسے مستند مورخین کے متعدد بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ خمس کے معاملات و انتظامات سنبھالے تھے۔ دلچسپ

امر یہ ہے کہ وہ نہ صرف زمانۂ جنگ میں تقسیم اموالِ غنیمت کے وقت خمس کے نگراں ہوتے تھے بلکہ زمانۂ امن میں بھی اس مد میں جمع شدہ رقوم کے خرچ وغیرہ کے انتظامات کے ذمہ دار ہوتے تھے۔[۱۷۶]

(د) جزیہ[۱۷۷]

اسلامی ریاست کے کسی غیر مسلم طبقہ سے جزیہ وصول کرنے کی ایک مثال ہم تیماؔ کے یہود کے معاملے میں دیکھ چکے ہیں لیکن وہ نہ تو پہلی مثال تھی اور نہ ہی اصطلاحی جزیہ کی حقیقی وصولیابی۔ عہد نبوی میں اب تک جو ثبوت اور شہادتیں ملی ہیں ان کے مطابق جزیہ کی پہلی مثال کا تعلق حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کی مہم دومۃ الجندل سے ہے جو شعبان ۶ھ / دسمبر ۶۲۷ء میں پیش آئی تھی۔ گویا کہ تیماؔ کے بنو عادیا یہودیوں کے معاہدہ سے تقریباً چھ ماہ قبل دومۃ الجندل کے بنو کلب کے غیر مسلم طبقات نے جزیہ ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ ماخذ میں دومہ کے جزیہ کی رقم کی مقدار، اور ادا کرنے والوں کی تعداد کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ ہی اور دوسری تفصیلات مل سکی ہیں۔ قیاس ہے جو صحیح ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ہی کلب کے غیر مسلموں سے جزیہ کی پہلی قسط وصول کر کے مدینہ لائے ہوں گے اور بعد میں اس کی وصولیابی کے دوسرے انتظامات کیے گئے ہوں گے۔ بہر حال عہد نبوی میں جزیہ کا لفظ دُوسری بار بنو عادیا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ وہ جزیہ بھی ہو سکتا ہے اور خراج بھی۔ جیسا کہ ہم اوپر بحث کر چکے ہیں۔

جزیہ کی پہلی واضح مثال جو توقیتی لحاظ سے تیسری ہے اور جس کا تعلق ۸ھ / ۶۳۰ء سے ہے بحرین کے مجوسی طبقات سے متعلق ہے۔ وہاں کے مسلم مقامی منتظم اور سابق بادشاہ حضرت منذر بن ساویٰ نے اپنے مکتوب میں بحرین میں آباد مجوسی رعایا کے مقام و حیثیت و ذمہ داری کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا تھا اور آپ نے بشرط عہد شناسی و وفاداری فی کس ایک دینار معافری مقرر فرمایا تھا۔[۱۷۸] یہی جزیہ بحرین کے دوسرے غیر مسلم طبقات خاص کر یہودیوں پر بھی عائد کیا گیا تھا۔ ایک اور گرامی نامۂ نبوت میں جو مجموعۃ الوثائق میں محفوظ ہے حضرت منذر بن ساویٰ کو حکم دیتا ہے کہ وہ ہجر کے علاقے میں آباد مجوسیوں کے بے زمین و بے مِلک افراد سے فی کس چار درہم اور ایک قبا (عباءۃ) سالانہ وصول کریں۔[۱۷۹] ایک اور مکتوب نبوی میں غیر مسلم طبقات پر جزیہ کی شرط عائد کرنے کا ذکر ضرور ہے مگر اس کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں البتہ ان کے پڑوس میں آباد مسلم طبقات پر بعض پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر ان مسلمانوں کے لیے غیر مسلم طبقات کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے شادی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔[۱۸۰] یہ بات بیان ہو چکی ہے اور یہاں پھر ذکر کے قابل ہے کہ حضرت منذر بن ساویٰ کی عملداری سے جزیہ کی رقوم وصول کر کے مدینہ پہنچانے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مخصوص عمال حضرات ابو ہریرہؓ دوسی اور قدامہ کو روانہ فرمایا تھا اور انھوں نے حکم نبوی کی بخوبی تعمیل کی تھی۔ اس سلسلہ میں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ مرکزی ہدایات کی تعمیل میں مقامی منتظم حضرت منذر بن ساویٰ اور مرکزی منتظم حضرت علاؔ بن حضرمی نے اپنا بھرپور تعاون دیا تھا۔[۱۸۱]

جزیہ کی ایک اہم ترین مثال کا تعلق نجران کے عیسائیوں سے ہے۔ یہ دراصل اس معاہدہ کا نتیجہ تھا جو اُنھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ۹ھ / ۶۳۱ء میں کیا تھا۔ خوش قسمتی سے اس معاہدہ کا مکمل متن محفوظ رہ گیا ہے اور اس سے نہ صرف

جزیہ کی ایک مخصوص نوعیت کا علم ہوتا ہے بلکہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم طبقات کے مقام و مرتبے کا بھی صحیح تعین ہوتا ہے۔ چنانچہ معاہدہ نبوی کے متن، کا ترجمہ ذیل میں دیا جا رہا ہے:

"یہ پیغمبرِ خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ ہے جو انھوں نے اہلِ نجران سے کیا۔ آپ ہی کو ان کے تمام پھلوں اور زرد، سفید اور سیاہ تمام غلاموں پر اختیار و اقتدار حاصل ہے لیکن آپ نے از راہِ کرم یہ سب ان کے (اہلِ نجران کے) قبضہ میں اس شرط پر بحال رکھا کہ وہ دو سو جوڑے کپڑے (حُلّے) سالانہ آپ کو ادا کیا کریں گے۔ یہ حُلّے اواقی، کے ہوں گے (یعنی ہر حلّہ ایک اوقیہ چاندی یا ۴۰ درہم کا ہوگا) اور وہ ہر سال رجب میں ایک ہزار اور صفر میں ایک ہزار (یعنی دو قسطوں میں) ادا کیے جائیں گے۔ اگر ان حُلّوں میں سے کسی کی مالیت ایک اوقیہ سے کم یا بیش ہوگی تو اس کا باقاعدہ حساب کر لیا جائے گا۔ اسی طرح ان سے جو بھی زرہ بکتر، گھوڑے، سواری کے اونٹ اور دوسرا سامان مستعار لیا جائے گا اس کا بھی حساب رکھا جائے گا۔ نجران کے لوگوں پر فرض ہوگا کہ وُہ میرے فرستادوں (رسل) کی بیس دن یا اس سے کم دنوں کی مہمانی کریں گے لیکن ان کو (فرستادوں کو) کسی حال میں ایک ماہ سے زیادہ نہیں روکیں گے۔ یہ ان پر لازم قرار دیا گیا ہے کہ وُہ میرے فرستادوں یا نمائندوں کو یمن میں جنگ یا ہنگامہ (کید) ہونے کی صورت میں ۳۰ زرہ بکتر، ۳۰ گھوڑے اور ۳۰ اُونٹ فراہم کریں گے۔ ان مستعار زرہ بکتروں، گھوڑوں اور اونٹوں میں سے جو کچھ بھی ضائع ہوگا میرے فرستادے ان کی قیمت ادا کر دیں گے۔ اہلِ نجران اور ان کے لواحقین کو اپنے نفوس کے لیے، اپنی زمین، سامان جو موجود ہے یا آئندہ حاصل ہو، گرجا گھروں اور ملازمتوں یا مذہبی عبادتوں کی آزادی حاصل ہوگی اور اس کے لیے ان کو خدا اور اس کے رسول محمد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذمہ حاصل ہے اور اس کے علاوہ ان کی تمام مملوکہ چھوٹی بڑی چیزوں کی حفاظت کی ضمانت دی جاتی ہے۔ کسی پادری کو اس کے عہدے سے معزول نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی کسی راہب کو اس کی خانقاہ سے اور نہ کسی افسرِ گرجا گھر کو اس کے منصب سے ہٹایا جائے گا۔ اہلِ نجران نہ تو سودی کاروبار لیں گے اور نہ ہی عہدِ جاہلیت کے انتقام لیں گے (لا دم الجاهلية)۔ اگر ان میں سے کوئی صحیح راہ پر چلے گا تو اسے انصاف ملے گا۔ ان کا یہ بھی فرض ہوگا کہ وُہ اپنے افراد کو غلط کاری سے روکیں۔ ان میں سے کسی پر نہ کوئی ظلم ہوگا اور نہ زیادتی۔ اگر اس کے بعد بھی ان میں سے کوئی سُود لے گا تو اسے میری ضمانت و حفاظت حاصل نہ ہوگی۔ ان میں سے کسی پر دوسرے کے جُرم و غلط کاری کا کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ ان شرائط پر جو اس صحیفہ میں بیان ہوئی ہیں خدا کی حفاظت (جوار) اور اس کے رسول کا "ذمہ" اہلِ نجران کو وفادار رہنے کی صورت میں برابر حاصل رہے گا بشرطیکہ وُہ اپنے فرائض بھی برابر انجام دیتے رہیں اور کوئی غلط کام نہ کریں تا آنکہ خدا کا کوئی اور حکم آ جائے۔"[۱۸۳]

اس صحیفہ نبوی کی مزید تشریح و تعبیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ معاہدہ و مکتوب نبوی نہ صرف اہلِ نجران پر عائد کردہ

جزیہ کی رقم کو بیان کرتا ہے بلکہ ریاست اسلامی میں غیر مسلموں کے فرائض اور ان کے مرتبہ کو بھی واضح کرتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ نجران کے عیسائیوں سے نقد جزیہ کی رقم وصول کرنے کے بجائے ان سے جنس میں کپڑوں کا مطالبہ کیا گیا ہے اور شرط رکھی گئی ہے کہ ہر حُلّہ کی قیمت ایک اوقیہ چاندی سے کم نہ ہو۔ اس کے علاوہ اسلامی لشکر کی مادی و فوجی معاونت اور فرستادگان نبوی کی میزبانی بھی ضروری قرار دی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان پر سود نہ لینے اور عہد جاہلیت کے انتقام نہ لینے کی بھی شرط عائد کی گئی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ نجران سے کل جزیہ کی رقم کا بھی علم ہوتا ہے جو اسّی ہزار درہم سالانہ یا دو ہزار اوقیہ چاندی بنتی ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نجران کی محصول ادا کرنے کے لائق کل آبادی لگ بھگ دو تین ہزار افراد رہی ہوگی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ جزیہ کی یہ مثال اجتماعی محصول کی تھی اور اندرونی طور پر اس کو جمع کرنے کی ذمہ داری اہلِ نجران کی اپنی تھی۔[۱۸۳] اسلامی ریاست کو کل جمع شدہ رقم یا اس کے مساوی کپڑوں کی ادائیگی سے غرض تھی۔

حضرت عمرو بن حزم کی بطور والیِ نجران روانگی سے قبل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ان کو نامۂ مبارک عطا فرمایا تھا اس میں بھی اس علاقہ کے عیسائیوں اور یہودیوں پر عائد کردہ جزیہ کا حوالہ موجود ہے۔ اس نامہ گرامی کے مطابق یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس خطہ کے ہر فرد بشر کو خواہ وہ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت ایک دینار یا اس کی قیمت کے مساوی کپڑا بطور جزیہ اسلامی ریاست کو ادا کرنا تھا۔ تمام جزیہ ادا کرنے والوں کو اللہ اور اس کے رسول عظیم کے ذمہ وحفاظت کی ضمانت دی گئی تھی بشرطیکہ وہ پابندی سے جزیہ ادا کرتے رہیں اور مرکز سے جاری ہونے والے احکام و ہدایات کی تعمیل میں کوتاہی نہ کریں۔[۱۸۴]

یمن کی تین چھوٹی چھوٹی مملکتوں رُعَین، مُعافر اور ہمدان کے حکمرانوں حضرات حارث بن عبد کُلال، نُعَیم بن عبد کلال اور نعمان بن عبد کلال کے خطوط و استفسارات کے جواب میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان علاقوں کے تمام غیر مسلم طبقات کے لیے بلا امتیاز فی کس ایک دینار مُعافری سالانہ یا اس کی قیمت کا مساوی کپڑا جزیہ میں مقرر کیا تھا۔[۱۸۵] یزن کے حکمراں حضرت زرعہ کے نام مکتوبِ نبوی کا ذکر اوپر بار بار آچکا ہے۔ اس کے مطابق حضرت زرعہ کو اپنی عمالہ یا مملکت سے تمام صدقات اور جزیہ اکٹھا کر کے مرکزی نمائندوں کے حوالے کرنے تھے جو ان کو مدینہ پہنچاتے۔[۱۸۶] مذکورہ بالا تاریخی شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی اور مشرقی خطوں میں آباد تمام غیر مسلموں کے لیے جزیہ کی شرح الگ الگ مقرر کی گئی تھی تاہم ایک دینار مُعافری عہدِ نبوی میں اس علاقہ کے لیے معیاری شرح معلوم ہوتی ہے۔

جنوبی اور مشرقی عرب کے علاوہ شمالی عرب میں بعض یہودی اور عیسائی قبائل اور طبقات بستے تھے جنھوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی قبول کی تھی۔ خیبر، فدک، تیماء، وادی القریٰ کے غیر مسلم طبقات کے اسلامی مملکت کے ساتھ معاہدات اور ان کے نتیجے میں ان کے تعلقات کی نوعیت پر ہم پہلے ہی بحث کر چکے ہیں۔ اسی دومۃ الجندل کے قبیلہ بنو کلب کے سنہ ۶ھ / سنہ ۶۲۷ء میں جزیہ ادا کرنے کا بھی حوالہ آچکا ہے۔ بہر حال یہاں دومۃ الجندل کی عیسائی مملکت کے حکمران اکیدر بن عبد الملک کندی کا اس عہد کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جس کے مطابق اس نے اپنے غیر مسلم طبقات کی جانب سے جزیہ ادا کرنے کا اقرار کیا تھا۔[۱۸۷] یہ معاہدہ غزوۂ تبوک کے تتمہ کے طور پر انجام پذیر ہوا تھا۔ اسی زمانے میں شمال بعید کی چار غیر مسلم بستیوں ایلہ، جرباء، مقنا اور اذرح نے بھی اپنے حکمرانوں کے ذریعہ جزیہ کی ادائیگی پر صلح کر لی تھی کیونکہ ان کو فوجی کارروائی کا خدشہ تھا

جس سے دومہ کے لوگ دوچار ہوئے تھے۔ ایلہ کے بارے میں واضح طور سے ذکر آتا ہے کہ اس کے تین سو بالغ و توانا مردوں نے سالانہ تین سو دینار جزیہ دینا شروع کیا تھا۔ واقدی کے مطابق یہی ایلہ کی کل مردانہ (رجل) آبادی تھی۔[188] گویا کہ فی کس ایک دینار جزیہ مقرر ہوا تھا۔ جرباؑ اور اذرح کے لوگوں کو ہر سال رجب میں سو سو دینار ادا کرنے ہوتے تھے اور اس کے بدلہ میں ان کو خداوند کریم اور رسولِ عظیم کی امان حاصل تھی۔[189] لیکن مقناؑ اور اس علاقہ کے ایک قبیلہ بنو جنبہ کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ ان کو اپنی پھلوں اور کپڑوں (غزول) کی پیداوار کا ایک چوتھائی حصہ (ربع) بطور جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔[190] اس کے بعد مکتوب نبویؐ نے ان کو ضمانت فراہم کی تھی کہ وہ "تمام قسم کے جزیہ اور سُخرہ (بیگار) سے آزاد ہوں گے اور ان پر سوائے ان کے اپنے لوگوں کے یا خاندانِ رسولِ عظیمؐ کے افراد کے اور کسی کو "امیر" مقرر نہیں کیا جائے گا۔"[191]

ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت کے مرکزی علاقوں میں یعنی حرمین شریفین کے ارد گرد کے علاقوں میں جو حجاز و نجد کے وسیع خطوں پر محیط تھے متعدد غیر مسلم طبقات خاص کر یہودی اور عیسائی آباد تھے۔ ان کے مقام و مرتبہ نیز جزیہ وغیرہ کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں جانتے سوائے متفرق معلومات کے۔ مثلاً یحییٰ بن آدم نے بیان کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں رہنے والے ایک عیسائی سے ایک دینار سالانہ جزیہ وصول کیا تھا۔[192] ابن اثیر کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کے باسی ایک عیسائی کی نصف دولت کسی جرم کی پاداش میں ضبط کر لی گئی تھی۔ ان کے علاوہ ہماری معلومات غیر مسلم طبقات کے بارے میں ناقص ہیں۔ ہم ان یہودی قبیلوں اور طبقات کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے جو بنو قریظہ کے واقعہ کے بعد مدینہ میں سکونت پذیر رہے تھے۔ لیکن گزشتہ شواہد کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا جائز معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب اسلامی مملکت نے ملک گیر اور مرکزی مالی پالیسی اپنائی تھی تو مرکزی عرب کے تمام غیر مسلم طبقات کو بھی جزیہ ادا کرنا پڑا ہوگا اور یحییٰ بن آدم کے حوالے سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ ان علاقوں کے لیے بھی ایک دینار فی کس سالانہ جزیہ کی معیاری شرح رہی ہوگی۔ ممکن ہے کہ بعض دستکار یا زراعت پیشہ طبقات سے نقد کے بجائے کسی جنس میں جزیہ وصول کیا گیا ہو۔ جنس کی صورت میں جزیہ کی شرح معیاری ربع یا ½ معلوم ہوتی ہے۔ بعض حالات میں جزیہ کی رقم نقد اور جنس دونوں صورتوں میں لی جا سکتی تھی اور اس کی اقساط بھی کی جا سکتی تھیں اگر جزیہ اجتماعی طور سے وصول کیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کا مالی سال چھ چھ ماہ کے دو وقفوں میں منقسم تھا۔ پہلا وقفہ صفر اور رجب کے درمیان تھا اور دوسرا رجب تا محرم۔ رجب مالی سال کا آغاز معلوم ہوتا ہے جزیہ کی بروقت ادائیگی وفاداری کی علامت اور عدم ادائیگی یا کوتاہی عہد شکنی کے مترادف تھی۔ جزیہ ادا کرنے والوں کو اصطلاحاً ذمی یا اہل الذمہ کہا جاتا تھا کہ ان کی جانوں اور مالوں کی حفاظت کی ضمانت اسلامی ریاست کی ذمہ داری متصور ہوتی تھی۔

جہاں تک غیر مسلم طبقات سے جزیہ وصول کرنے کے مسئلہ کا تعلق ہے مذکورہ بالا بیان و مباحثہ کی بنیاد پر ہم ذرا قطعیت کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مقامی سردار و شیوخ یا حکمران اور بادشاہ جیسا بھی علاقائی نظم و نسق ہوا اپنے علاقے کے ذمیوں سے اس کی وصولیابی کے ذمہ دار ہوتے تھے اور جمع شدہ رقوم کو وہ اپنے علاقے میں تعینات مرکزی محصلین و عاملینِ صدقات یا مرکزی منتظمین کے حوالے کر دیتے تھے جو ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پہنچاتے تھے۔ ہم گزشتہ بحث

میں حضرات منذر بن ساویٰ اور جیفر و عبد کے بحرین و عمان کے علاقوں کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں۔ اسی طرح ہم نجران کے عیسائیوں، یزن کے حکمران حضرت زرعہ، حضرموت کے اقیال، یوحنا اور دوسرے سرداتِ ایلہ، دومر کے اکیدر وغیرہ متعدد دوسرے مقامی حکمرانوں، شاہوں اور مقامی شیوخ کے اپنے غیر مسلم اور ذمی طبقاتِ رعایا سے جزیہ کی وصولیابی اور پھر اس کی رقوم کی مرکزی منتظمین کے سپرد حوالگی کی تاریخی اور واقعاتی شہادتیں بھی دیکھ چکے ہیں۔ کتانی کا یہ بیان کہ حضرات معاذ بن جبل اور ابو عبیدہ بن جراح جزیہ کی وصولیابی کے ذمہ دار تھے جامع و مکمل نہیں ہے۔(۱۹۳) اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے اپنے علاقوں میں یہ دونوں افسرانِ حکومتِ نبوی مقامی منتظمین کی جمع کردہ رقوم کو وصول کر کے مدینہ روانہ کرتے تھے، ورنہ یہ حقیقت ظاہر و باہر ہے کہ صرف یہی دونوں مرکزی منتظمین نہیں تھے بلکہ ان کے علاوہ متعدد اور بھی تھے جو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف خطوں میں بکھرے ہوئے اپنے فرائض منصبی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔ ہم ان افسران و عمالِ حکومتِ الٰہی پر بحث کچھ دیر بعد ایک الگ فصل میں کریں گے۔

(س) صدقات

صدقات دراصل ایک وسیع تر علومی اصطلاح ہے جو متعدد محاصلِ مذہبی کے مجموعہ کو محیط ہے۔ یہ تمام محاصل جیسے زکوٰۃ، عشر، نصف العشر، عشور وغیرہ مسلمان بطور ایک مذہبی فریضہ کے ادا کرتے تھے۔ صدقہ/صدقات میں لازمی اور نفلی دونوں طرح کے عطیات شامل تھے۔ قرآن کریم میں متعدد ایسی آیات ہیں جو صدقات اور زکوٰۃ کو بالترتیب مذہبی تقرب و مرضیِ الٰہی اور فریضۂ خداوندی کے بطور بیان کرتی ہیں۔ زکوٰۃ یعنی لازمی مالی فریضہ کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم کی آیات عموماً نماز (صلوٰۃ) کے ساتھ زکوٰۃ کے حکم کو بھی حاوی ہیں۔(۱۹۴) پھر اسلامی تعلیمات محض مالی فریضہ کی ادائیگی پر ہی بس نہیں کرتیں بلکہ نفل صدقات پر بھی ابھارتی ہیں۔ اللہ کے راستے میں خرچ کرنا جو دراصل امتِ اسلامی کے مفاد میں اصلاً اور انسانیت کے مفاد میں ضمناً خرچ کرنا تھا اسلام میں ایک انتہائی پسندیدہ فعل ہے جس پر آخرت کے اجر و ثواب کے علاوہ دنیاوی فلاح و بہبود کا بھی وعدہ ہے۔ مسلم فقیہوں نے حدیث و تاریخ کی شہادتوں(۱۹۵) کی اساس پر بیان کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مرد و عورت مسلم پر جو آزاد، عاقل و بالغ اور مالکِ نصاب ہو اور جس کے مال پر سال گزر جائے زکوٰۃ کو بطور مالی فریضہ کے روشناس کیا تھا جس کی ادائیگی نماز یعنی بدنی عبادت و فریضہ کی مانند لازمی و ضروری تھی۔ زکوٰۃ نقد، زیور، مویشیوں اور پیداوار زمین پر مختلف شرحوں میں لی جاتی تھی۔ نقد بچت پر زکوٰۃ ۲½ فیصد یا چالیسواں حصہ (۱/۴۰) ہے۔ جبکہ سونے اور چاندی پر مثقال کے اعتبار سے لی جانی چاہیے جو کہ عملاً اور شرح کے اعتبار سے نقد کے مانند ہے۔ البتہ مویشیوں پر زکوٰۃ ان کی جنس کے اعتبار سے مختلف ہے۔ ذیل میں پالتو مویشیوں پر زکوٰۃ کی مختلف شرحیں دی جا رہی ہیں جس سے یہ مسئلہ واضح ہو جائے گا۔

(١) بھیڑ/بکری

نصاب	زکوٰۃ
٤٠ - ١٢٠	ایک عدد بھیڑ / بکری
١٢١ - ٢٠٠	٢ " "
٢٠١ - ٣٠٠	٣ " "
٣٠٠ کے بعد ہر سیکڑہ پر	١ " "

(٢) اونٹ

٥ - ١٠	١	بھیڑ/ بکری
٥ - ١٥	٢	" "
١٥ - ٢٠	٣	" "
٢٠ - ٢٤	٤	" "
٢٥ - ٣٥	١	نبت مخاض
٣٦ - ٤٥	١	نبت لبون
٤٦ - ٦٠	١	حقہ
٦١ - ٧٥	١	جزعہ
٧٦ - ٩٠	٢	نبت لبون
٩١ - ١٠٠	٢	حقہ
١٢٠ کے بعد ہر ٥٠ پر	١	حقہ
اور ہر ٤٠ پر	١	نبت لبون

(٣) گائے

٣٠ گائیں	١	جزع/جزعہ
٤٠ "	١	مُسِنّہ (١٩٦)

ظاہر ہے کہ مویشی پر یہ زکوٰۃ صرف ان جانوروں پر لگائی گئی تھی جو "تجارتی مقاصد" سے پالے جاتے تھے۔

زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ بیان کرتے ہوئے واقدی کہتے ہیں کہ وہ اراضی جس کی آب پاشی بہتے پانی (الغیل) سے کی جاتی تھی اس پر زکوٰۃ پیداوار کا دسواں حصہ ہوتا تھا جو اصطلاحاً "عُشر" کہلاتا تھا جبکہ ڈول / بالٹی (الغرب) سے سینچی جانے والی اراضی پر زکوٰۃ پانچ فیصد (۱/۲۰) ہوتی تھی جو "نصف العشر" کہلاتی تھی۔[۱۹۷] پیداوار کا نصاب کم از کم ۵ وسق ہوتا ہے جیسا کہ اکثر فقہاء کا خیال ہے۔[۱۹۸]

مذکورہ بالا پیداواری شرح زکوٰۃ نظریاتی یا اصولی ہے۔ واقدی کے بیان سے اس کی واقعاتی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یحییٰ بن آدم کی بیان کردہ دو روایتوں سے کسی حد تک مزید ثبوت ملتا ہے کہ عہدِ نبوی میں زکوٰۃ کی وصولیابی کا ایک باقاعدہ نظام تھا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت معاذ بن جبل کو جب یمن اور حضرموت وغیرہ کے شمالی خطوں کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا تھا تو ان کو ہدایت نبوی تھی کہ وہ گیہوں (الحنطۃ)، جَو (الشعیر)، کھجور (النخل) اور انگور (العنب) کی پیداوار سے "صدقہ" وصول کریں۔[۱۹۹] ایک دوسری روایت کے مطابق (جو اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ وہ عہدِ نبویؐ کے ایک اہم واقعہ پر روشنی ڈالتی ہے اور جس کو عام طور سے شہرت حاصل نہیں ہے) حضرت معاذ بن جبل کو "قریٰ عربیہ" کے علاقے سے زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ (حظ الارض) وصول کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔[۲۰۰] بلاذری اور ابو داؤد کا متفقہ بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتاب بن اسید اُموی کو مکہ پر گورنر (والی) مقرر کرنے کے علاوہ ثقیف کے علاقوں سے ان کی (مکہ والوں کی) کھجور اور انگور کی پیداوار کے تخمینہ اور صدقات کا بھی عامل مقرر کیا تھا۔[۲۰۱] بلاذری کا مزید بیان ہے کہ مشہور مؤذنِ رسولؐ حضرت بلال حبشی پھلوں کی پیداوار پر وصول کئے گئے صدقات کے افسر تھے۔[۲۰۲] یہ چند مثالیں ہیں ان محاصل کے مجموعہ کی جو "صدقات" کی وسیع تر اصطلاح سے معروف تھے۔ ان کے علاوہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد گرامی ناموں میں زکوٰۃ، صدقہ / صدقات، عشر، عشور، نصف العشر وغیرہ کے حوالے بکثرت ملتے ہیں[۲۰۳] جیسا کہ ہم ابھی مطالعہ کریں گے۔

مستشرقین کے تصور و نظریۂ زکوٰۃ[۲۰۴] کے برخلاف ہم کو عہدِ نبویؐ میں زکوٰۃ کے ارتقاء اور تکمیل کے متعدد ثبوت متواتر مآخذ میں ملتے ہیں۔ دوسرے شواہد کے علاوہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرامی نامے بلاشک وشبہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ زکوٰۃ عہدِ نبویؐ میں ایک "قانونی مذہبی محصول" بن چکا تھا جو مالدار مسلمانوں کے لیے لازمی تھا۔ مکتوباتِ نبوی میں صرف زکوٰۃ کے لازمی ہونے کی شہادت نہیں ملتی بلکہ مسلم طبقات کے ایمان کی شہادت زکوٰۃ کی ادائیگی کو قرار دیا گیا ہے۔ اس قسم کے حوالے اور ہدایات حسب ذیل حکمرانوں اور منتظمین کے نام مکتوبات رسولؐ میں ملتے ہیں:

۱۔ حضرت فروہ بن عمرو، عامل معن

۲۔ حضرت صیفی بن عامر سردار بنی ثعلبہ / غسان

۳۔ مسلمانان قبیلۂ بنی حدس / لخم

۴۔ مسلمانان و سرداران بنو الحارث / بنو نہد

۵۔ حضرات حارث، نُعیم اور نعمان جو یمن کی تین چھوٹی چھوٹی مملکتوں کے حکمران اور مقامی منتظم تھے۔

۶۔ قبیلۂ ازد کے متعدد مختلف طبقات

۷۔ قبیلۂ اسلم

۸۔ قبیلہ طے وغیرہ۔ (۲۰۵)

مستشرقین کے خیالِ خام کی تردید کے لیے وہ مکتوباتِ نبویؐ بڑے اہم ہیں جو نہ صرف زکوٰۃ کا لازمی فریضہ ہونا ثابت کرتے ہیں بلکہ زکوٰۃ، صدقہ، عشر اور نصف العشر کی مقررکردہ شرحوں اور تناسب کا بھی برملا ذکر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مذکورہ بالا تین شاہانِ یمن کے خطوط کے جواب میں جو گرامی نامہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا تھا اس میں زمین کی پیداوار پر عشر اور نصف العشر کے علاوہ مویشیوں کی شرحیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں حضرت زرعہ والیِ یزن کے نام مکتوب نبوی زیادہ اہم ہے کیونکہ وہ زکوٰۃ اور صدقہ سے متعلق بعض امور پر کافی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتا ہے۔ پہلے وہ حضرت زرعہ سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تمام جمع شدہ رقوم کو مدینہ بھیج دیں۔ پھر یہ بیان کرتا ہے کہ "صدقہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے خاندان والوں (اھل البیت) کے لیے جائز نہیں ہے، زکوٰۃ کو غریب مسلمانوں اور مسافروں میں تقسیم کرنا چاہیے۔"(۲۰۶) خثعم کے مسلمانوں کے نام مکتوب نبوی میں تحریر ہے کہ ان کے تمام مسلمان کاشتکاروں کو خواہ وہ نرم زمین (جناب) پر کاشت کرتے ہوں یا سخت زمین (عزاز) پر، اپنی ان تمام فصلوں پر $\frac{1}{10}$ (عشر) دینا ہے جو آبِ رواں (سیح) سے سیراب کی گئی ہوں اور نصف العشر ($\frac{1}{20}$) دینا ہے جو ڈول / بالٹی (غراب) سے سینچی گئی ہوں۔(۲۰۷) اسی طرح عمان کے قبائل ثمالہ اور حدان سے بھی ان کی پیداوار پر عشر کا مطالبہ کیا گیا تھا۔(۲۰۸) ان کے معاملہ میں یہ امر بڑا اہم ہے کہ ان کو اپنی پیداوار میں دس وسق پر ایک وسق دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ یہ زکوٰۃِ ارض کا مقررہ تناسب تھا جو "قانونی زکوٰۃ" یا "لازمی مذہبی محصول" کا واضح ترین ثبوت تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ کا جو نصاب بعد کے فقہاء نے مقرر کیا تھا اس کی بنیاد بعد کے مسلم حکمرانوں کے عمل پر نہیں تھی بلکہ اس کی اساس سنتِ نبوی تھی۔ صدقہ اور عشور کے بارے میں حضرت منذر بن ساوی کے حوالے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہاں اس مکتوب نبویؐ کا ذکر البتہ مناسب معلوم ہوتا ہے جس کے مطابق رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمان اور بحرین کے مسلمانوں سے ان کی کھجور کی پیداوار پر زکوٰۃ یعنی عشر اور ان کے اناج کی پیداوار پر نصف العشر کا مطالبہ کیا گیا تھا۔(۲۰۹) ایک اور گرامی نامہ میں بحرین کے طاقتور قبیلہ عبد القیس کو ممانعت کی گئی تھی کہ وہ اپنے پھلوں کی پیداوار (حریم الثمار) کو پک جانے کے بعد روکا کریں۔(۲۱۰) اسی طرح حضرموت کے اقیال کو ان کی اراضی کی پیداوار پر عشر کی بلا تاخیر ادائیگی کا حکم دیا گیا تھا۔(۲۱۱)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف گرامی ناموں، مراسلات اور معاہدات سے مسلمان طبقات پر ان کے مویشیوں میں متناسب قانونی محصول یا قانونی مذہبی زکوٰۃ کی فرضیت و ادائیگی کا ثبوت ملتا ہے۔ مذکورہ بالا معاہدات و رسالات نبوی کے علاوہ جن میں ضمناً مویشیوں پر "صدقہ" یا "زکوٰۃ" کا ذکر آیا ہے۔ ذیل میں ہم ان مکتوباتِ نبویؐ کا ذکر کرتے ہیں جن میں مویشیوں پر زکوٰۃ کی تفصیلات باقاعدہ ملتی ہیں۔ قبیلہ اسلم کے علاوہ متعدد دوسرے بدوی قبیلوں کے پاس جو ساحلی مقامات پر آباد تھے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط موجود تھے جن میں ان کے "مواشی" پر "صدقہ" یا "فرائض" (حصوں) کا ذکر تھا۔(۲۱۲) قبیلہ باہلہ اور ان تمام لوگوں کو جو بیشہ نامی

علاقے میں آباد تھے حسب ذیل شرح سے جانوروں کی زکوٰۃ ادا کرتی تھی:

مویشیوں کی تعداد / نصاب	زکوٰۃ
۳۰ گائیں	ایک فارض (کافی عمر کی گائے)
۴۰ بھیڑ / بکری (الغنم)	ایک عُتُود (ایک عمر دراز بکری / بھیڑ)
۵ اونٹ	ایک ساغیہ مُسنہ (ایک معمر اونٹ)[۲۱۳]

دومہ اور کلب کے لوگوں کو اپنے مویشیوں پر یہی زکوٰۃ ادا کرنی تھی۔ اس کے علاوہ عُشر اور نصف عشر بھی اپنی پیداوار پر ادا کرنا تھا۔[۲۱۴] حضرت عمرو بن حزم کے نامۂ تقرر میں نجران کے قبیلہ بنو الحارث بن کعب کے مویشیوں اور اراضی کی پیداوار پر حسب ذیل قانونی واجب زکوٰۃ بیان کی گئی ہے:

۱۔ پیداوار (العقار) پر عشر بشرطیکہ چشموں اور بارش کے پانی (العین والسماء) سے سنچائی کی گئی ہو۔
۲۔ پیداوار پر نصف العشر بشرطیکہ بالٹیوں یا ڈولوں سے آبپاشی کی گئی ہو۔
۳۔ ہر دس اونٹوں پر ۲ بھیڑ / بکری، اور ہر بیس اونٹوں پر چار بھیڑ / بکری زکوٰۃ۔
۴۔ ہر چالیس سے زیادہ گایوں پر ایک گائے، جبکہ ہر تیس گایوں پر ایک تبیع / تبیعہ یا جزعہ۔
۵۔ ہر چالیس بھیڑ / بکریوں (الغنم) پر ایک بھیڑ / بکری۔[۲۱۵]

"یہ تمام صدقہ ان کے (مسلمانوں کے) مالوں پر خدا کی جانب سے فرض قرار دیا گیا ہے" جیسا کہ مکتوب نبوی میں آخر میں بیان ہے۔[۲۱۶] یہ اور ان جیسے متعدد دستاویزات سے جو مآخذ میں پائی جاتی ہیں یہ حتمی شہادت ملتی ہے کہ عہدِ نبوی ہی میں "صدقہ" یا "زکوٰۃ" کا تناسب اور شرح مقرر ہو چکی تھی اور اس کو ریاست اسلامی کے تمام مسلمانوں سے وصول بھی کیا جاتا تھا۔

عمال الصدقات (افسرانِ محصول)

صدقات اور جزیہ کی فرضیت کے بارے میں عام طور سے مسلم فقہا اور علماء کا یہ خیال ہے کہ وہ فتح مکہ کے بعد کسی وقت روبہ عمل ہوئی تھی جب قرآن کریم کی متعلقہ آیت کریمہ کا نزول ہوا تھا جس کے مطابق خدائے ذوالجلال نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا تھا کہ "ان کے مالوں سے صدقہ لیجئے اور ان کو اس کے ذریعہ پاک وصاف کیجئے......"[۲۱۷]۔ طبری کا بیان ہے کہ یہ آیت کریمہ ۹ھ / ۶۳۰-۳۱ء میں کسی وقت نازل ہوئی تھی اور اسی بنا پر صدقہ "اس برس" فرض ہوا تھا۔[۲۱۸] تقریباً یہی دعویٰ جزیہ کی فرضیت کے بارے میں کیا جاتا ہے۔

لیکن تاریخی حقایق سے معلوم ہوتا ہے کہ محاصل کی فرضیت اور وصولیابی دونوں اس سے کئی برس قبل شروع ہو چکی تھیں۔ دومۃ الجندل کے علاقے میں آباد بنو کلب کے عیسائیوں نے ۵ھ / ۶۲۶ء میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو جزیہ ادا کیا تھا۔

۷ھ کے آغاز اور ۶۲۸ء کے وسط میں تیما کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے یہودی کاشتکاروں نے "جزیہ" اسلامی ریاست کو دینا شروع کیا تھا جبکہ خیبر، فدک اور وادی القریٰ کے یہودی مزارعین نے اپنی پیداوار کا نصف جو اصطلاحاً اور معناً "خراج" تھا ادا کیا تھا۔ البتہ زکوٰۃ کی وصولیابی کی تاریخ ماخذ سے علاً ثابت نہیں ہوتی اس لیے اس باب میں حتمی طور سے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ قرینہ یہی ہے کہ "صدقات" بھی لازمی طور سے فتح مکہ سے قبل وصول کیے جانے لگے تھے۔ اس سلسلہ میں چند مثالیں کافی ہوں گی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خیبر، فدک، وادی القریٰ اور تیما کے علاوہ "قریٰ عربیہ" کے والی ۸ھ/ ۶۲۹ء میں مقرر ہو چکے تھے ان کے من جملہ فرائض میں سے صدقات کی وصولیابی بھی تھی۔ حضرت ولید بن عقبہ اموی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ بنو مصطلق کے قبول اسلام کے "دو برس بعد" ان کو اس قبیلہ کا عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو مصطلق کا خاصا بڑا طبقہ (اگر اکثریت نہیں) ۵ھ میں اسلام قبول کر چکا تھا۔ اس لحاظ سے حضرت ولید اموی کی تقرری کا زمانہ ۸ھ/ ۶۲۹ء بنتا ہے قریٰ عربیہ کے سلسلہ میں دلچسپ روایت یہ ہے کہ یمن جانے سے قبل حضرت معاذ بن جبل وہاں کے عامل صدقات مقرر کئے گئے تھے اور وہ حقیقتاً وہاں سے زمین کی پیداوار کی زکوٰۃ وصول کر کے لائے تھے اور یہ غالباً ۹ھ سے قبل کا واقعہ ہے۔ طبری کا حتمی بیان ہے کہ حضرت عمرو بن عاص سہمی کی عمان کو بطور عامل صدقات (مرکزی منتظم) روانگی ۸ھ/ ۶۳۰ء میں فتح مکہ کے معاً بعد ہوئی تھی۔ (۲۱۹) ان شواہد کی بنیاد پر یہ کہنا مناسب و جائز معلوم ہوتا ہے کہ صدقات کی بالعموم اور جزیہ و خراج کی بالخصوص وصولیابی ۷ھ کے آغاز وسط ۶۲۸ء میں شروع ہو چکی تھی۔ اور اس طرح اسلامی ریاست نے اپنے باشندوں سے اپنے مصارف کے لیے محاصل وصول کرنے کی پالیسی کا آغاز کر دیا تھا۔

صدقات و محاصل کی وصولیابی کا گہرا تعلق وصولیابی کے افسروں کی تقرری کے نظام سے تھا۔ اگرچہ "ولایات" کے والی ان کی وصولیابی اور صدر مقام ریاستِ اسلامی کو روانگی کے ذمہ دار تھے تاہم ان کے جمع و وصول کا ایک الگ، مکمل اور جامع نظام تھا جو عہد نبوی میں وقوع پذیر ہوا اور رفتہ رفتہ تکمیل کے مدارج طے کرتا ہوا کمال کو پہنچا۔ محاصل ادا کرنے والوں سے صدقات اور جزیہ وصول کرنے کے لیے خاص افسر مقرر کیے جاتے تھے جن کے مختلف نام تھے۔ سب سے زیادہ معروف و عام لفظ "عامل" ہے اور قرآن کریم نے یہی لفظ استعمال کیا ہے۔ کبھی کبھی شبہ کے ازالہ اور مزید توضیح کے لیے ماخذ "عامل صدقات" یا "عمال الصدقات" یا "عاملین صدقات" یعنی صدقات کی اضافہ و اضافت کے ساتھ بھی استعمال کرتے ہیں کیونکہ لفظ عامل وسیع تر عمومی معنی میں استعمال ہوتا ہے جس سے مراد محاصل وصول کنندہ کے علاوہ گورنر، والی، منتظم، سرکاری افسر وغیرہ سبھی کچھ ہو سکتا ہے۔ تاریخی ماخذ میں مختلف اصطلاحیں اور الفاظ استعمال ہوتے ہیں جیسے مُصَدِّق (مُصَدِّقِین)، سَاعِی (سُعَاۃ)، جَابِی (جُبَاۃ)، مُحَصِّل (محصلین) وغیرہ۔ ان کے علاوہ مخصوص اصطلاحات کا استعمال بھی ماخذ میں مفقود نہیں ہے جیسے صاحب العشور (عشر کا افسر)، ولاۃ علی الجزیۃ (جزیہ کے افسر)، صاحب الخراج (خراج کا افسر) وغیرہ۔ (۲۲۰)

ماخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محاصل و صدقات کی وصولیابی کا نظام درجہ بندی پر مشتمل اور دُہرا تھا۔ ہر علاقے (ولایت) یا قبیلہ میں کچھ مقامی محصلین ہوتے تھے جو محاصل دہندوں سے براہِ راست صدقات و جزیہ وصول کرتے تھے۔

یہ مقامی افسرانِ صدقات ہوتے تھے۔ مرکزی سطح پر ریاستِ اسلامی کی نمائندگی کرنے والے افسرانِ صدقات ان مقامی افسروں سے جمع شدہ رقوم وصول کرکے مرکز پہنچاتے یا اس کی ہدایات کے مطابق صرف کرتے تھے۔ پہلے ہم مرکزی افسرانِ صدقات کے نظام سے بحث کریں گے۔

(۱) مرکزی عاملینِ صدقات

ایسے تمام عاملینِ صدقات جن کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم براہِ راست اس عہدہ پر مقرر کرکے مدینہ سے بھیجتے تھے اور ان کو مختلف علاقوں اور قبیلوں میں تعینات کرتے تھے اس زمرے میں آتے ہیں۔ عام طور سے ان مرکزی افسروں کا علاقائی یا قبائلی تعلق اپنی تقرری کے علاقوں سے نہیں ہوتا تھا۔ ان میں اور مقامی عاملینِ صدقات میں واضح امتیاز موجود ہوتا تھا۔ یہ مرکزی افسر اپنے اپنے علاقوں یا قبیلوں کے صدر مقام پر قیام پذیر رہتے تھے اور براہِ راست صدقات دہندوں سے رابطہ نہیں رکھتے تھے۔ وہ صرف مقامی افسرانِ صدقات سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسری جانب مقامی صدقات کے عاملین اپنے لوگوں سے صدقات وصول کرتے تھے اور ان کی مجموعی رقوم اپنے متعلقہ مرکزی افسروں کے حوالے کردیتے تھے۔ کبھی کبھی مقامی عاملینِ صدقات مرکزی افسروں کا کام کرتے تھے اور جمع شدہ رقوم خود لے کر مدینہ منورہ پہنچ جاتے تھے۔

تمام مرکزی عاملینِ صدقات کو (اور مقامی افسروں کو بھی) عام طور سے ایک پروانۂ تقرری ملتا تھا جس میں نہ صرف عاملین کے لیے ہدایات و احکام درج ہوتے تھے بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی ہدایات ہوتی تھیں جن کے پاس وہ بھیجے جاتے تھے۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مکتوب مشترکہ طور پر قضاعہ کے سعد ہذیم اور جذام کو عطا فرمایا تھا جس میں "صدقہ" کے فرائض بیان کیے گئے تھے اور ان سے یہ بھی مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنے تمام "صدقہ اور خمس" دو سفیران و افسرانِ نبوی حضرات ابی بن کعب اور عنبسہ کو ادا کردیں۔[۲۲۱] اسی طرح کی ہدایات حضرات عمرو بن حزم اور وائل بن حجر حضرمی کے پروانوں میں تحریر تھیں۔ واضح رہے کہ یہ دونوں مذکورہ بالا افسر بالترتیب نجران اور حضرموت کے مرکزی اور مقامی عاملین بھی تھے۔ اسی طرح کی ہدایات نبوی متعدد دوسرے مراسلاتِ نبوی میں بھی مندرج تھیں جن میں کچھ کا مطالعہ ہم پہلے ہی کرچکے ہیں۔ ان کے علاوہ عاملینِ صدقات کو کچھ اخلاقی ہدایات بھی دی جاتی تھیں جو اسلامی مزاجِ حکومت کی بہتر نمائندگی کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر صدقات کے افسروں کو حکم تھا کہ وہ لوگوں کی دولت کا خواہ وہ مویشیوں کی شکل میں ہو یا نقد و جنس کی صورت میں، کا بہترین حصہ (کرائم اموالھم) صدقہ و جزیہ میں وصول نہ کیا کریں۔ ان پر ظلم و ستم نہ کریں، ان کا استحصال نہ کریں، واجب صدقہ / رقم / تعداد و مقدار سے زیادہ وصول نہ کریں یا ناجائز طریقے نہ اختیار کریں۔[۲۲۲] اسی طرح ان کو یہ بھی حکم تھا کہ وہ لوگوں کے چراگاہوں (مراعی) (اور گھروں سے) صدقہ وصول کریں۔[۲۲۳] اس کا مطلب یہ تھا کہ عاملینِ صدقات خود محاصل دہندوں کے پاس جایا کریں اور ان کو اپنے پاس اپنے پڑاؤ پر آنے کی زحمت نہ دیا کریں۔

یہ اور ایسی دوسری ہدایات نے فرض شناسی اور ایمان قلب کے جوہر کے ساتھ مل کر صدقات و جزیہ کی ادائیگی کو عوام کے لئے ایک خوشگوار فرض بنادیا تھا جس میں تلخی سے زیادہ خوشدلی، بوجھ سے زیادہ تعاون اور کدورت سے زیادہ مسرت کا احساس

شامل تھا۔

یہ امر کہ عاملینِ صدقاتِ نبوی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی مکمل تعمیل کرتے تھے حدیث وسنت کے متعدد مآخذ کی روایات سے ثابت ہوتا ہے۔ نسائی نے حضرت سُوید بن غفلہ کی روایت بیان کی ہے کہ ایک بار ان کے پاس ایک مصدق آیا اور اس نے مویشیوں کی ان تمام اقسام کو بالتصریح بیان کیا جن کا صدقہ میں لینا ممنوع تھا۔ اسی موقع پر ایک صدقہ دہندہ ایک بہت عمدہ قسم کی اونٹنی صدقہ میں دینے کے لیے لایا مگر مصدق نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے بہترین "اموال" وصول کرنے سے احتراز کی ہدایت دی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک اوسط درجہ کا جانور قبول کیا۔[۲۲۴] اسی قسم کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ ایک بار دو عاملینِ صدقات ایک مسلمان کے پاس پہنچے جو اپنے جانور ایک چراگاہ میں چرا رہا تھا اور اس کے مویشیوں کا صدقہ اس سے طلب کیا۔ اس مسلمان نے ایک عمدہ دُودھاری بکری پیش کی مگر دونوں نے اس کو قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اعلیٰ نسل کی تھی۔ چنانچہ وہ ایک عام قسم کی بکری صدقہ میں لے کر چلے گئے۔[۲۲۵]

مآخذ سے واضح ہوتا ہے کہ مرکزی عاملینِ صدقات اکثر وبیشتر مستقل عہدہ دار ہوتے تھے۔ عام طور سے وہ ایک متعین علاقے میں یا متعین قبیلے کے افسرِ صدقات ہوتے تھے اور بعض حالات میں ان کے کام وکارکردگی کے علاقے بدل سکتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ اور منفرد معاملہ حضرت عمرو بن عاص سہمی کا ہے۔ فتح مکہ کے بعد ان کو عمان کا عاملِ صدقات بنا کر بھیجا گیا تھا (اور وہ مرکزی منتظم بھی تھے)۔ ۹ھ / ۶۳۰-۳۱ء میں ہم ان کو ہوازن کے علاقے سے صدقات وصول کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ اسی زمانے میں ایک اور روایت کے مطابق انہوں نے بنو فزارہ / غطفان کے صدقات بھی وصول کئے تھے۔ اس کے بعد ان کو قضاعہ کا عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافی عرصے تک اس علاقے میں مقیم اپنے فرائض انجام دیتے رہے تھے۔ پھر ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں حجۃ الوداع کے بعد طبری کے بقول رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک بار پھر عمان روانہ کیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ فرائض کی انجام دہی کے بعد ان کو پھر ان کے پرانے عہدے یعنی صدقاتِ قضاعہ کی افسری پر واپس بحال کر دیا جائے گا۔ اگرچہ عہد نبوی میں ان کی واپسی مدینہ منورہ نہیں ہو سکی تھی تاہم خلافتِ صدیقی کے اوائل میں وہ "صدقات عمان" لے کر مرکز پہنچے تھے اور خلیفۂ اول نے اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدہ کو شرطِ ایمان سمجھ کر وفا کیا تھا اور ان کو ان کے عہدۂ موعود پر بحال کر دیا تھا۔[۲۲۶] حضرت عمرو بن عاص سہمی کی مانند حضرات عنبسہ، عبّاد بن بشر، بُریدہ بن حصیب، رافع بن مکیث، ضحاک بن سفیان، عکرمہ بن ابی جہل، حُذیفہ بن یمان، قضاعی بن عمرو اور متعدد دوسرے ممتاز مرکزی عاملینِ صدقات تھے اور یہ تمام اپنے عہدوں پر مستقل طور سے وفاتِ نبویؐ کے وقت تک فائز رہے تھے۔[۲۲۷]

بعض مرکزی عاملوں کے معاملات میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے عارضی طور سے اسلامی ریاست کے شعبۂ مالیات میں کام کیا تھا۔ روایات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ انھوں نے ایک بار ہی صدقات کی وصولیابی کا کام کیا تھا۔ مثلاً حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی کو حضرموت کے قیل (شہزادے، حکمران) حضرت وائل بن حُجر کے ساتھ ان کی مملکت میں بھیجا گیا تھا اور وہ وہاں کے صدقات وصول کر کے مدینہ واپس آ گئے تھے۔[۲۲۸] کسی بھی روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انھوں نے اس نوع کی اور کوئی خدمت کبھی اور انجام دی تھی

تاریخی مآخذ کا دعویٰ ہے کہ یمن کے قبیلۂ ازد کی ایک شاخ سے حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی نے صدقہ اور جزیہ وصول کرکے خدمت نبوی میں مکہ مکرمہ پہنچایا تھا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آخری حج کے لیے وہاں تشریف فرما تھے۔ فقہا و مورخین نے ایک "ہاشمی" کے صدقہ وصول کرنے کے "جواز" یا "صحت" پر کلام کیا ہے اور طرح طرح کی تاویلیں کی ہیں۔(۲۳۹) حالانکہ حدیث وحکم نبوی کا منشا یہ ہے کہ کوئی ہاشمی "صدقہ" خود کھا نہیں سکتا مگر اس کی صرف وصولیابی میں کوئی قباحت نہیں۔ مزید برآں حضرت علی ہاشمی بطور مصدق بنیادی لحاظ سے یمن نہیں گئے تھے بلکہ وہ اصلاً معلم و مبلغ کی حیثیت سے گئے تھے اور واپسی میں ضمناً انھوں نے "صدقات" کے مرکز پہنچانے کا کام بھی انجام دے دیا تھا۔ جب تمیم کی ایک دشمن مدینہ شاخ نے خزاعہ کے خاندان بنو کعب سے صدقات وصول کرنے کی راہ میں حضرت بُسر بن سفیان کے لیے روڑے اٹکائے تھے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عُیینہ بن حصن فزاری کو مقرر کیا تھا اور انھوں نے نہ صرف "مانعین" کو سزا دی تھی بلکہ وفادار و مسلم خزاعیوں سے صدقات بھی وصول کرکے لائے تھے۔(۲۴۰) ان مثالوں سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ عہدِ نبویؐ میں مرکزی عاملین صدقات کے دو طبقے تھے: ان میں سے اکثر و بیشتر مستقل عہدہ دار تھے جو برابر اپنے کام انجام دیتے رہتے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو عارضی طور سے صدقات کی وصولی کا کام بعض مخصوص سیاسی یا معاشی اسباب کی وجہ سے انجام دیتے تھے۔

مصدق یا عامل صدقات کے عہدہ پر تقرری کے لیے کچھ اوصاف درکار تھے اور کچھ شرائط کو پورا کرنا لازمی تھا۔ سب سے بڑا وصف تو بلا ریب صلاحیت و لیاقت تھی۔ علاقۂ تقرر کے جغرافیائی اور قبائلی حالات سے واقفیت بھی ایک اہم شرط ہو سکتی تھی اس کے علاوہ کسی حد تک اس علاقے کے لوگوں سے دوستی، تعارف اور قربت یا قرابت بھی اس عہدے پر تقرری کی سفارش کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ سب سے اہم شرط یہ تھی کہ کردار بیداغ، اخلاق بلند، حرص و طمع سے دور اور عہدے کے لالچ سے آزاد ہو۔ عاملِ صدقات ہونے کی ایک اہم شرط یہ بھی تھی کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان بنی ہاشم سے عہدہ دار یا امیدوار کا تعلق نہ ہو۔ چند مثالوں سے ان شرائط و اوصاف کا تاریخی ثبوت بھی مل جائے گا۔ ایک بار حضرت ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ دو شخص خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور اُنھوں نے آپ سے مصدق کے عہدے پر تقرری کی درخواست کی۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی اس باب میں رائے مانگی تو انھوں نے عرض کیا کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ دونوں حضرات اس نیت سے آپ کے پاس آئے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں امیدواروں کی درخواستِ تقرری رد کر دی اور فرمایا کہ "ہم ان لوگوں کو عہدے نہیں دیتے جو ان کے طالب ہوتے ہیں۔" اس روایت کا دلچسپ حصہ یہ ہے کہ کچھ مدت کے بعد حضرت ابوموسیٰ اشعری کو بلا طلب یمن کے ایک بڑے علاقے کا والی مقرر کر دیا گیا جس کے فرائض میں صدقات کی وصولیابی بھی شامل تھی۔(۲۴۱) ذکر آچکا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رشتہ داروں کو مصدق کے عہدے پر مقرر کرنے کو غیر قانونی اور ناجائز قرار دے دیا تھا اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ پر منفعت یا باتنخواہ عہدہ تھا اور اس کی تنخواہ دراصل صدقات ہی کا ایک حصہ ہوتی تھی۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات کی رقم سے حاصل ہونے والی تنخواہ کو "وَسَخ" (گندگی) اپنے خاندان والوں کے لیے اس لیے قرار نہیں دیا تھا کہ آپ ان کے لیے کسی امتیازی سماجی سلوک کے قائل تھے بلکہ اس کی اصل

حکمت یہ تھی کہ آپ اس "پرمنفعت عہدے" کا دروازہ اپنے خاندان والوں پر بند کرنا چاہتے تھے تاکہ آئندہ کی حکومتوں کو کان ہو جائیں اور دوسری جانب آپ کے خاندان والے (اہل البیت) مادی فوائد کے حصول کی خاطر حکومتی عہدوں کے پیچھے نہ بھاگیں۔ چنانچہ خیبر کی مہم کے دوران یا اس کے کچھ بعد واقدی کے بقول جب حضرات عبدالمطلب بن ربیعہ ہاشمی اور فضل بن عباس ہاشمی نے اپنے والدین کی خواہش و ہمت افزائی پر مصدق یا عامل صدقات کا عہدہ چاہا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست کو اس بنا پر ٹھکرا دیا کہ وہ "اہل بیت" میں سے تھے۔[۲۳۲] جہاں تک تقرری کے لیے دوسری صلاحیتوں، اوصاف اور شرائط کا تعلق تھا ان کا تصریحاً یا ضمناً ذکر پہلے بھی آ چکا ہے اور بعد میں بھی مختلف مصدقین کے ذکر میں آتا رہے گا۔

عام طور پر مآخذ کا رجحان یہ ہے کہ وہ عہد نبوی میں عاملین صدقات کی تقرری کا زمانہ اور تاریخ یکم محرم ۹ھ / ۳۰ اپریل ۶۳۰ء بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس روز سعیدہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ سے اپنی واپسی کے بعد جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لیے متعدد مرکزی عاملین صدقات روانہ فرمائے تھے۔[۲۳۳] لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عاملین صدقات کی یہ "پہلی تقرری" یا پہلی روانگی نہیں تھی۔ اور ظاہر ہے کہ وہ آخری تقرری بھی نہ تھی۔ مورخین نے اس سے عموماً یہ تاثر لیا ہے کہ محصلین کی یہ پہلی تقرری تھی ظاہر ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ تاثر یا دعویٰ غلط ہے کیونکہ اس تاریخ سے بہت پہلے صدقات کے افسر مقرر ہو چکے تھے۔ اس ضمن میں یہ تاریخی حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ مدنی حیات طیبہ کے دور دوم میں جب جب کوئی علاقہ یا قبیلہ اسلامی اُمت یا اسلامی ریاست کا حصہ بنا تب تب مرکزی اور مقامی عاملین صدقات کا تقرر عمل میں آیا تھا۔

اس خیال و حقیقت کی تصدیق طبری کے ایک بیان سے ہوتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے امیروں اور صدقات کے عاملوں کو ان تمام علاقوں (البلدان) میں سے ہر ایک پر مقرر کیا تھا جو اسلام کے دائرۂ کار و حلقۂ اثر میں آ گئے تھے (اوطاء الاسلام)۔[۲۳۴] ابن سعد اور ان کے استاد واقدی کی مرتب کردہ اس فہرست عاملین صدقات سے بھی اس کی ضمناً تائید ہوتی ہے جس کے مطابق محرم ۹ھ / اپریل ۶۳۰ء میں وہ بھیجے گئے تھے۔ واقدی کی روایت کے مطابق افسران صدقات اور ان کے علاقے حسب ذیل تھے:[۲۳۵]

۱۔ حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی	بنو اسلم اور بنو غفار
۲۔ حضرت عباد بن بشر اشہلی	سلیم اور مزینہ
۳۔ حضرت رافع بن مکیث جہنی	جہینہ
۴۔ حضرت عمرو بن عاص سہمی	فزارہ
۵۔ حضرت ضحاک بن سفیان کلابی	بنو کلاب وغیرہ
۶۔ حضرت بسر بن سفیان کعبی	بنو کعب / خزاعہ
۷۔ حضرت ابن اللتبیہ ازدی	بنو ذبیان
۸۔ ایک نامعلوم صحابی (بنو سعد بن ہذیم کے فرد)	بنو سعد بن ہذیم

ابن سعد نے اپنے استاد کی مذکورہ بالا فہرست کی تائید کرتے ہوئے صرف ایک اور مصدق کا اضافہ کیا ہے۔ چنانچہ ان کے مطابق حضرت عُیینہ بن حصن فزاری کو بنو تمیم کے لیے اسی زمانہ بلکہ اسی دن روانہ کیا گیا تھا۔(۲۳۶) اس فہرست عاملین صدقات سے بعض بڑے دل چسپ نکات روشنی میں آتے ہیں۔ یہ کس قدر دلچسپ اور اہم حقیقت ہے کہ مذکورہ بالا تمام صدقات دہندہ قبیلوں کا تعلق اسلامی ریاست کے مرکزی علاقوں سے تھا۔ ان میں سے غالب اکثریت ان کی تھی جو قدیم مدنی دور کے مسلم تھے۔ اس کے علاوہ بیشتر عاملین صدقات کا تعلق انھیں صدقات دہندہ قبیلوں سے تھا، اگرچہ کچھ "آفاقی" یا "غیر ملکی" بھی تھے۔

طبری کی فہرستِ امیران و عاملینِ صدقاتِ عہدِ نبوی میں جن افسروں کے نام شامل تھے وہ اور ان کے علاقے حسب ذیل ہیں:

۱۔ حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومی	صنعاء
۲۔ حضرت زیاد بن لبید بیاضی	حضرموت
۳۔ حضرت عدی بن حاتم طائی	طے اور اسد
۴۔ حضرت مالک بن نویرہ تمیمی	بنو یربوع/تمیم
۵۔ حضرت علاء بن حضرمی	بحرین
۶۔ حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی	نجران
۷، ۸۔ دو گمنام صحابہ کرام	بنو سعد (۲۳۷)

یہ فہرست نہ صرف یہ کہ بہت مختصر ہے بلکہ بعد کے زمانے کی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں گورنروں اور مبلغوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

عاملِ صدقات کی حیثیت سے حضرت ولید بن عقبہ اموی کے کردار، کارکردگی اور اسلام پر مآخذ میں بڑی بحث ملتی ہے اور اس کے نتیجے میں قدیم و جدید دونوں مورخین نے کافی غلطیاں کی ہیں۔ مفصل بحث تو کہیں اور کی جا چکی ہے(۲۳۸) مگر یہاں عاملینِ صدقاتِ نبوی کے بیان کے ضمن میں ان کے صحیح تاریخی تناظر میں تقرری اور کارکردگی کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مآخذ کی روایات کا لب لباب یہ ہے کہ بنو مصطلق کے اسلام قبول کرنے کے دو سال بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ولید بن عقبہ اموی کو ان پر عاملِ صدقات مقرر کیا۔ ان کی آمد کی خبر جب بنو مصطلق نے سُنی تو وہ ان کے استقبال کے لیے اپنے علاقہ سے باہر نکلے لیکن حضرت ولید ان کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اور واپس خدمت نبوی میں سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اُنھوں نے غالباً بنو مصطلق کے صدقات روک لینے کا خیال بھی ظاہر کیا تھا۔ ان کی خبر پر اعتماد کر کے مسلمانانِ مدینہ نے بنو مصطلق کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ بنو مصطلق کا وفد اپنی معروضات کے ساتھ مدینہ جا پہنچا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فریقین کے بیانات اور معروضات کو بالآخر قبول کر لیا اور پھر بنو مصطلق کی خواہش پر حضرت بشر بن عباد اوسی کو ان کا عاملِ صدقات مقرر کیا جو ان سے صدقات وصول کر کے لائے بھی۔(۲۳۹) روایات میں حضرت ولید پر عمداً کذب و افتراء کا الزام لگایا گیا ہے اور سورۂ حجرات کی آیت ۶ میں لفظ فاسق کا مصداق بھی بنایا گیا ہے۔ بنیادی طور سے یہ تمام الزامات تنقید و نقد کے معیار پر کھرے نہیں اُترتے۔ وہ سراسر بعد کی جھوٹی

افواہوں اور اموی دشمن رجحانات کے آئینہ دار ہیں[۲۴۰]۔ حضرت ولید بن عقبہ اموی عہدِ نبوی کے ایک معتمد، باکردار اور عظیم صحابیِ رسول ہونے کے علاوہ ایماندار عاملِ صدقات تھے اور ان کی صداقت و بلندیِ کردار کے لئے یہی ثبوت کافی ہے کہ انہوں نے اس واقعہ کے بعد عہدِ نبوی ہی میں "قضاعہ کے ایک نصف" پر عاملِ صدقات کے فرائض انجام دئے تھے اور بعد میں خلافتِ صدیقی اور عہدِ فاروقی میں اسی نوع کے عہدوں پر مسلسل کام کیا تھا[۲۴۱]۔

دوسرے ابتدائی مورخین و سیرت نگاروں میں بلاذری نے عہدِ نبوی کے عاملینِ صدقات کی جو فہرست دی ہے وہ کافی جامع ہے اگرچہ اس کو بھی کسی طرح سے مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ بہر حال بلاذری کی روایت کے مطابق مصدقینِ رسول اور ان کے علاقے حسب ذیل تھے[۲۴۲]:

۱۔ حضرت بلال حبشی	مدینہ/اسلامی ریاست کے پھلوں کے صدقات
۲۔ حضرت عباد بن بشر اشہلی	بنو مصطلق/خزاعہ
۳۔ حضرت اقرع بن حابس تمیمی	بنو دارم بن مالک/تمیم
۴۔ حضرت زبرقان بن بدر تمیمی	عوف بن کعب، مقاعس بن عمرو بن کعب، اور الابنا (بنو سعد بن زید مناۃ) نیز بنو کعب بن سعد اور بنو عمرو بن سعد۔
۵۔ حضرت مالک بن نویرہ یربوعی	بنو یربوع بن حنظلہ
۶۔ حضرت عدی بن حاتم طائی	طے اور اسد
۷۔ حضرت عیینہ بن حصن فزاری	فزارہ/غطفان
۸۔ حضرت حارث بن عوف مری	مرہ/غطفان
۹۔ حضرت نعیم بن مسعود اشجعی	اشجع/غطفان، انمار بن بغیض، عبس بن بغیض/غطفان
۱۰۔ حضرت مالک بن عوف نصری	عجزِ ہوازن (جشم، نصر، سعد بن بکر اور ثقیف بن منبہ)
۱۱۔ حضرت عباس بن مرداس سلمی	بنو سلیم اور بنو مازن
۱۲۔ حضرت عامر بن مالک بن جعفر	بنو عامر
۱۳۔ حضرت الاعجم بن سفیان بلوی	عذرہ، سلامان، بلی اور کلب (حدودِ شام کے قریب آباد قبیلے)
۱۴۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری قرشی	بنو کلب (دومۃ الجندل کے قریب آباد شاخ)
۱۵۔ حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی	اسلم، غفار اور جہینہ
۱۶۔ حضرت رافع بن مکیث جہنی	جہینہ
۱۷۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح فہری قرشی	مزینہ، ہذیل اور کنانہ
۱۸۔ حضرت ضحاک بن سفیان کلابی	بنو کلاب

۱۹ - حضرت قُرّہ بن ہبیرہ قشیری — بنو قُشَیر اور بنو جعدہ / عامر بن صعصعہ

۲۰ - حضرت سالف بن عثمان بن معتب ثقفی — طائف اور احلاف (ثقیف کے دونوں گروہ)

۲۱ - حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی — یمن کے علاقے میں (بطور امیر)

دوسرے مورخین کی فہرستوں کی مانند بلاذری کی فہرست بھی مرکزی اور مقامی عاملین کی مخلوط فہرست ہے صرف حضرت علی کے نام نامی کی شمولیت دُوسری نوعیت کی ہے۔ البتہ یہ نکتہ اہم ہے کہ بلاذری نے اس فہرست میں والیوں یا گورنروں کو شامل نہیں کیا ہے۔ صرف حقیقی عاملینِ صدقات کو ہی شامل کیا ہے۔

بہرحال مذکورہ بالا فہرستہائے عاملینِ صدقات کے علاوہ مآخذ کے صفحات میں دوسرے متعدد مرکزی مصدقینِ رسول کا ذکر جابجا بکھرا ہوا ہے۔ ابنِ سعد دو عمالِ صدقات کا ذکر کرتے ہیں جن کی تقرری ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں کسی وقت ہوئی تھی۔ ان کے نام تھے قضاعی بن عمرو عذری اور عکرمہ بن حفصہ۔ اول الذکر بنوالحارث کے صدقات وصول کرتے تھے اور مؤخر الذکر بُدَیل، بُسر اور ان کے حلیفوں کے لیے عاملِ صدقات تھے۔[۲۴۳] طبری کے مطابق حضرت عمرو بن عاص سہمی نے ۹ھ / ۶۳۰ء کے زمانے میں جنین کے علاقوں سے صدقات وصول کئے تھے اور اس کے بعد وُہ قضاعہ کے عاملِ صدقات مقرر ہوئے جو ان کی مستقل تقرری کا علاقہ تھا اور پھر اس کے بعد وہ عارضی طور سے عمان بھی بھیجے گئے تھے۔[۲۴۴] ان کے علاوہ حضرت سنان بن ابی سنان کو ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں کسی وقت بنو مالک کا عاملِ صدقات بھی مقرر کیا گیا تھا۔[۲۴۵]

مذکورہ بالا مصدقین کے علاوہ متعدد عاملین صدقات کا ذکر صرف اسد الغابہ میں ملتا ہے۔ ان میں سے کچھ کا ذکر ان کے اسمائے گرامی اور منازلِ تقرری کے ساتھ ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت کلاب بن امیہ لیثی کو ثقیف کے لوگوں سے ان کے اونٹوں کے عشور کی وصولیابی کے لیے بھیجا گیا تھا۔[۲۴۶] جبکہ حضرت عکرمہ بن ابی جہل مخزومی نے ہوازن کے مالوں پر قانونی ولازمی صدقات کی وصولیابی کی تھی۔[۲۴۷] حضرت ارقم بن ابی ارقم بھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مصدق تھے لیکن ان کے میدانِ عمل کا ذکر مآخذ میں نہیں کیا گیا ہے۔[۲۴۸] حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی کے بارے میں ابن اثیر کا اضافہ یہ ہے کہ صحابی موصوف نے نہ صرف حضرت وائل بن حجر سے بلکہ تمام اقیالِ حضرموت سے جو رقوم صدقات کی مد میں اپنے لوگوں سے جمع کی تھیں ان کے لانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔[۲۴۹] حضرات عبادہ بن صامت اور زیاد بن حنظلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو اور عاملینِ صدقات تھے مگر ان کے بھی میدانِ عمل کا کوئی ذکر یا حوالہ نہیں ہے۔[۲۵۰] ان کے علاوہ مآخذ میں دو ایسے افسرانِ صدقات کا بھی ذکر ملتا ہے جنہوں نے اسلامی ریاست کو اپنے ارتداد اور فرائض سے لاپرواہی کر کے دھوکا دیا تھا اور بالآخر فتح مکہ کے دن اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے تھے۔[۲۵۱]

اسد الغابہ کی مانند اصابہ نے بھی بعض مرکزی اور مقامی عاملینِ صدقات کا ذکر کیا ہے۔ حضرت حنظلہ بن یمان غالباً مرکزی افسرِ صدقات تھے جن کو اپنے قبیلہ — ازد — سے صدقات وصول کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔[۲۵۲] کتانی نے کلاعی کی سیرۃ کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ مدینہ منورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مصدق حضرت عمر بن خطاب عدوی تھے۔ محدث ابوداؤد کا خیال ہے کہ ان کو ان کی خدمات کے عوض کچھ تنخواہ یا معاوضہ (عمالۃ) ملتا تھا۔[۲۵۳] یہ تقریباً یقینی ہے کہ مذکورہ بالا

عاملینِ صدقات کے علاوہ اور بھی کافی تعداد میں مرکزی افسرانِ مالیات تھے کیونکہ مذکورہ بالا تعداد عرب کے قبائل/خاندانوں کی تعداد سے کہیں کم ہے۔ ابنِ قیم کا یہ تبصرہ دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی کہ ہر ایک خاندان/قبیلہ کے لیے ایک مصدق/گورنر/والی تھا۔ اس لحاظ سے یہ موٹی سی حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ عہدِ نبوی میں عاملین صدقات کی تعداد اتنی تھی جتنی کہ عرب کے مسلم قبائل اور ان کے اہم خاندانوں کی تعداد تھی۔

جب عاملینِ صدقات اپنے اپنے علاقوں سے صدقات لے کر مدینہ منورہ پہنچتے تھے تو ان کا باقاعدہ "محاسبہ" ہوتا تھا۔ اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پورا حساب کتاب لیتے تھے۔ مسلم کی ایک حدیث کے مطابق حضرت ابن اللتبیہ ازدی کو بنو سلیم کا عامل مقرر کیا گیا تھا۔ جب وہ اپنے علاقہ کے صدقات لے کر مدینہ پہنچے تو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: "یہ آپ کے لیے ہے اور یہ مجھے تحفہ میں دیا گیا ہے۔" آپ نے ان کو سخت سرزنش کی اور فرمایا کہ "اگر تم ایمانداری سے کہو تو تم اپنے باپ کے گھر میں قیام پذیر رہتے اور تمہارا تحفہ تم تک از خود پہنچ جاتا۔" آپ کا مطلب صاف تھا کہ عامل موصوف کو جو کچھ "تحفہ" میں حاصل ہوا تھا وہ دراصل ان کے عہدے کے سبب تھا۔ اس موقع پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا تھا جس میں آپ نے تمام عاملینِ صدقات کو خاص کر اور دوسرے افسرانِ حکومت کو عام طور سے دورانِ تقرری یا عہدہ نوازی لوگوں سے تحائف وصول و قبول کرنے سے منع فرمایا تھا[۲۵۴] کہ اس سے رشوت کی بو آتی تھی۔ اس بنا پر حافظ ابن قیم اور دوسرے فقہا نے یہ نتیجہ بجا طور سے اخذ کیا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام عاملوں اور افسروں کی آمدنی اور مصارف کا باقاعدہ محاسبہ فرمایا کرتے تھے۔[۲۵۵]

عاملینِ صدقات کی بحث کے اس موڑ پر ان کی تنخواہ کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جس کو "عمالہ" یا "رزق" کہا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بطور مصدق تنخواہ کا ذکر آچکا ہے اگرچہ اس کی مقدار کا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے۔ محدثین و مورخین نے اس موضوع پر پوری پوری فصلیں مخصوص کی ہیں۔ بہرحال اصولِ اسلامی یہ تھا کہ "جو کوئی ہمارے عامل کے بطور کام کرے اس کو اجازت ہے کہ وہ اپنے اور اپنی بیوی کے مصارف کے لیے ضروری اور واجب رقم لے لے اور اگر وہ کوئی نوکر یا غلام رکھتا ہے تو اس کے اخراجات کے لیے بھی ضروری رقم لے سکتا ہے۔ اگر کسی کے پاس مکان نہ ہو تو اس کے مصارف کے لیے بھی وہ رقم لے سکتا ہے۔ مگر جو کوئی اپنی جائز ضروریات سے زیادہ رقم لیتا ہے وہ غبن (غل) کا مرتکب ہوتا ہے۔"[۲۵۶] ذکر آچکا ہے کہ قرآنِ کریم کی آیت کے مطابق عاملینِ صدقات کی تنخواہ کی ادائیگی صدقات کی جمع شدہ رقوم ہی سے کی جاتی تھی۔[۲۵۷] بہرحال مآخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمال کی تنخواہ کے دو طریقے تھے: اوّل یہ کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس کسی عامل کو اس کی تنخواہ عطا فرماتے تھے جیسا کہ حضرت عمر کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ عاملینِ صدقات کو اختیار تھا کہ وہ اپنی ضروریات کے لیے رقم خود لے لیں اور پھر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حساب پیش کر دیں۔ آپ اکثر تمام عاملین کے جائز اخراجات کی تصدیق و توثیق کر دیتے تھے مگر بعض معاملات میں جہاں آپ کو گمان ہوتا تھا کہ زاید از ضرورت صرف کیا گیا ہے ان کے مصارف کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے تھے جیسا کہ حضرت ابن اللتبیہ ازدی کے معاملہ سے واضح ہوتا ہے۔ ابنِ سعد نے بعض

مقامی منتظمین اور عاملینِ صدقات کے سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جوائز (انعامات) عطا فرمائے تھے۔ غالباً یہ انعامات ان کی خدمات کے عوضانہ تھے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو عاملینِ صدقات کی تنخواہوں کا ایک موٹا سا اندازہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت قیس بن حصین مذحجی کو ½ ۱۲ اوقیہ چاندی عطا کی گئی تھی[94] جبکہ ایک دوسرے عامل کو جو نجران کے علاقے سے آئے تھے دس اوقیہ چاندی کا انعام ملا تھا۔ موصوف نے حضرت خالد بن ولید مخزومی کی یمن میں کافی معاونت کی تھی اور انھیں کے ساتھ مدینہ آنے پر ان کو انعام سے نوازا گیا تھا۔[95] جنوبی عرب کے ایک اور عاملِ صدقات حضرت فروہ بن مسیک مرادی کو جنھوں نے مراد، زبید بلکہ پورے قبیلہ مذحج سے صدقات وصول کرنے میں حضرت خالد بن سعید اموی کی مدد کی تھی بارہ اوقیہ چاندی کے علاوہ ایک عمدہ اونٹ اور ایک شاندار قبا بھی عطا کی گئی تھی۔[96] ان ٹھوس مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مصدقین و عاملین صدقات کو ان کی خدمات کے عوض کافی انعام و اکرام اور تنخواہ سے نوازا جاتا تھا۔ بہرحال اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ وہ ریاست اسلامی کے باتنخواہ افسر تھے۔

معلوم و معروف مرکزی عاملینِ صدقات کے قبائلی تجزیے سے بعض اہم نکات روشنی میں آتے ہیں۔ ضمیمہ میں مذکورہ ۲۸ مرکزی عاملین صدقات میں سے ایک تہائی کا تعلق قریش کے مختلف خاندانوں سے تھا۔ ان قریشی عمالِ صدقات میں بلاریب حضرت عمرو بن عاص سہمی سب سے اہم اور ممتاز اور صاحبِ لیاقت و صلاحیت نظر آتے ہیں کہ انھوں نے ابتدائے تقرری سے وفات نبوی تک نہ صرف یہ کہ مستقل طور پر اس عہدے پر کام کیا تھا بلکہ مختلف علاقوں اور قبیلوں میں بڑی کامیابی سے صدقات وصول کئے تھے۔ قریش کے بعد خزرج کا درجہ ہے جس کے تین عاملین نے کارنامے انجام دئے تھے اور امتیاز حاصل کیا تھا۔ اگرچہ اوس کے صرف ایک مصدق حضرت عباد بن بشر کا نام نظر آتا ہے انھوں نے خاصے طویل عرصہ تک اور مختلف علاقوں میں اس عہدے پر کام کیا تھا۔ ازد کے سوا جس کے دو عاملوں کا ذکر ملا ہے باقی تمام قبائل میں سے صرف ایک ایک عامل تھا اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مرکزی عاملینِ صدقات میں سے اکثریت کا تعلق مرکزِ اسلام یعنی مدینہ منورہ سے تھا جو قطعی فطری تھا۔ جہاں تک علاقائی نمائندگی کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ نمائندگی مرکزی عرب کے علاقوں کو حاصل تھی ان کے بعد بالترتیب مشرقی اور مغربی قبائل کا درجہ تھا جو اتفاق سے مساوی تھا دُوسرے علاقوں کے قبائل کی نمائندگی اس طبقۂ افسرانِ حکومت نبوی میں خاصی کم تھی۔ جہاں تک مرکزی عاملینِ صدقات کی سبقتِ اسلام کا تعلق ہے تو بیس فیصد اولین مسلم تھے، دوسرے بیس فیصد کے اسلام کا تعلق آخری مکی عہد یا ابتدائی مدنی زمانہ سے تھا جبکہ باقی ساٹھ فیصد عاملین کے اسلام کا زمانہ صلح حدیبیہ کے آس پاس کا ہے۔ ان تمام نکات کی مزید اور مکمل وضاحت کے لیے آخر میں ایک جدول دی جا رہی ہے:

علاقہ	قبیلہ/خاندان	تقرریاں	عاملین صدقات
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۱۰	۹
	(ا) ہاشم	۱	۱
	(ب) امیہ	۲	۲

	(ج) مخزوم	٢	٢
	(د) عدی	٢	٢
	(ہ) سہم	٢	١
	(و) ادرم	١	١
	٢۔ خزرج	٣	٣
	٣۔ اوس	٢	١
شمالی عرب	٤۔ عذرہ	١	١
مشرقی عرب	٥۔ فزارہ/غطفان	١	١
	٦۔ کلاب	١	١
	٧۔ اسد	١	١
	٨۔ قیس عیلان	١	١
	٩۔ ثقیف	١	١
مغربی عرب	١٠۔ کنانہ	١	١
	١١۔ خزاعہ	١	١
	١٢۔ جُہَینہ	١	١
جنوبی عرب	١٣۔ ازد	٢	٢
	١٤۔ تمیم	١	١
میزان	١٤ قبیلے/خاندان	٢٠	٢٥

(٢) مقامی عاملینِ صدقات

اس طبقے میں صرف ان عاملینِ صدقات کو شامل کیا گیا ہے جن کا میدانِ عمل اور دائرۂ کار ان کے اپنے قبیلوں تک محدود تھا عموماً یہ افسرانِ صدقات اپنے قبیلہ والوں سے خود صدقات وصول کر کے مرکزی عاملینِ صدقات کے حوالے کرتے تھے۔ لیکن اس امکان سے بھی قطعی طور پر قطعِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مرکزی عمال کی صدقات کی براہِ راست وصولیابی میں مدد کرتے ہوں۔ مآخذ عموماً ان مقامی عاملین کے فرائض کی انجام دہی اور عہدے کے بیان کے لیے سکہ بند فقرہ علیٰ صدقاتِ قومہ (اپنی قوم کے صدقات پر مقرر کیے گئے تھے) استعمال کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ ان مقامی عاملین میں سے اکثر و بیشتر اپنے اپنے قبیلوں/خاندانوں کے سردار و شیوخ ہوتے تھے یا اپنے قبیلوں کے مسلمانوں کے مرکز کی جانب سے مقرر کردہ سردار

ہوتے تھے۔ اس حقیقت کے پیش نظر ان تمام افسروں کو بھی مقامی عاملینِ صدقات کے طبقہ میں شمار کرنا چاہیے جن کا ذکر ہم نے مقامی منتظمین میں کیا ہے کیونکہ ان کے من جملہ فرائض میں صدقات کی وصولیابی اور مرکزِ ریاستِ اسلامی کو ان کی ادائیگی بھی تھی۔ مرکزی منتظمین کی مانند مقامی عاملینِ صدقات بھی مستقل عہدہ دارانِ حکومت تھے۔ ان کی مدّتِ عہدہ تاحیات ہوتی تھی یا دوسرے الفاظ میں اس وقت تک ہوتی تھی جب تک ان کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی و اعتماد حاصل رہے۔ شاذ و نادر ہی کسی مصدق کو آپ نے اس کے عہدے سے برطرف کیا تھا۔

مآخذ تمام مقامی عاملینِ صدقات کا صریحی ذکر نہیں کرتے ہیں تاہم ان میں اتنا اس موضوع پر مواد مل ہی جاتا ہے جس سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ صدقات و محاصل کی وصولیابی کے ضمن میں درجہ بند نظام موجود تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مطالعہ کو ہم علاقائی ترتیب سے کریں تاکہ ایک طرف تو ہم کو مقامی عاملینِ صدقات کی کارکردگی کا بھی بخوبی علم ہو تو دوسری جانب یہ حقیقت بھی اُجاگر ہو سکے کہ کس طرح تمام عرب قبائل اور خاندان اسلام اور اسلامی ریاست کے انتظامی اور مالی نظام کے دائرہ کار میں لائے گئے تھے اگرچہ اس مطالعہ میں بعض مباحث کی تکرار اور بعض معاملات میں تبادل کا خطرہ بھی پایا جاتا ہے۔

خزاعہ کے تین قبیلے یا خاندان اپنے صدقات اپنے مرکزی اور مقامی عاملین کے توسط سے ادا کرتے تھے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی اسلم اور غفار کے قبیلوں کے صدقات وصول کر کے مدینہ پہنچاتے تھے۔ یہ حقیقت دلچسپ ہے کہ اسلم اگرچہ خزاعہ کا ایک حصہ تھا مگر غفار کا تعلق کنانہ سے تھا۔ ان دونوں کو ایک مالی نظام میں یا ایک مرکزی عاملِ صدقات کے دائرہ کار میں اس لیے شامل کیا گیا تھا کہ وہ دونوں نہ صرف یہ کہ اچھے اور قریبی پڑوسی تھے بلکہ حلف کے تعلقات زمانۂ قدیم سے رکھتے تھے۔ واقدی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلم کے ایک سربرآوردہ شخص نے غزوۂ حنین (بلکہ فتح مکہ) سے قبل اپنے تمام واجب الادا صدقات حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی کے حوالے کر دئے تھے۔ اور یہی اس کے ایمان کی دلیل ٹھہری تھی۔[۲۶۱] جہاں تک ٹھوس تاریخی مثال کا تعلق ہے تو اسلم کے صدقات ادا کرنے کی یہ اکلوتی مثال ہے جو اب تک دستیاب ہو سکی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ حضرت بریدہ بذاتِ خود یا اسلم کا کوئی اور شخص مقامی عامل بھی رہا ہو۔ اسی طرح بنو کعب کے مقامی عامل کا واضح ذکر نہیں ملتا حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ قریش / عدی کے حضرت بُسر بن سفیان ان کے صدقات بطور مرکزی عامل کے وصول کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے بنو مصطلق کے بارے میں ہم مرکزی اور مقامی دونوں مصدقین کا واضح حوالہ پاتے ہیں۔ مآخذ کے مطابق حضرت عباد بن بشر ان کے مرکزی مصدق تھے اور حضرت حارث بن ضرار جو ان کے قبائلی سردار تھے ان کے مقامی عاملِ صدقات تھے اور وہ اپنے قبیلہ والوں سے صدقات وصول کر کے مرکزی عامل کے حوالے کرتے تھے۔ اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت حارث خزاعی نے زکوٰۃ سمیت تمام صدقات اپنے قبیلہ والوں سے وصول کر کے اپنے قبیلہ کے پہلے مرکزی عامل صدقات کے حوالے کرنے کی ذمہ داری لی تھی۔[۲۶۲] لیکن جب پہلے مصدق حضرت ولید بن عقبہ اموی مذکورہ بالا اسباب سے ان کے قبیلے تک نہیں پہنچ سکے تو حضرت عباد بن بشر نے ان سے صدقات وصول کئے تھے۔

جہاں تک معلومات ہو سکی ہیں کنانہ کے قبیلہ کے مقامی عاملینِ صدقات کا ذکر نہیں مل سکا ہے اگرچہ ہم کنانہ اور غفار دونوں

سے ایک مرکزی مصدق کے صدقات وصول کرنے سے واقف ہیں۔ بہرحال یہ فرض کرنا حقیقت کے خلاف ہرگز نہ ہوگا کہ کنانہ کے مختلف خاندان جیسے ضمرہ، لیث، دئل، مدلج، بکر بن عبد مناۃ اور حارث بن عبد مناۃ کے مقامی عاملین تھے جن کے ذریعہ وہ صدقات مرکزی عاملین کے حوالے کرتے تھے جیسا کہ حضرت عثمان بن عمرو دئلی کے واقعہ سے ثابت بھی ہوتا ہے۔(۲۶۳)

جُہینہ کے بارے میں ہم ذرا قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں مرکزی اور مقامی.. نوں عاملین صدقات تھے۔(۲۶۴) روایات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو حقیقی بھائی حضرات رافع بن مکیث اور جندب بن مکیث بالترتیب مرکزی اور مقامی عامل تھے۔ قبیلۂ مزینہ کے بارے میں روایت یہ ملتی ہے کہ وہ اپنے تمام صدقات مدینہ منورہ سے بھیجے گئے عاملِ صدقات کو ادا کرتا تھا۔ اس کے مقامی مصدقین کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ مآخذ قبیلہ ازد کے دو عاملینِ صدقات کا ذکر کرتے ہیں مگر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کا تعلق ازدِ شنوءہ سے تھا یا ازدِ یمن سے۔ بہرحال یہ قطعیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت سعد بن ابی ذباب دوسی (جن کا تعلق حجاز کے دوسی بطن سے تھا) ایک مقامی مصدق تھے جو اپنے قبیلہ والوں کے صدقات وصول کرتے تھے اور ریاست اسلامی کے مرکز کو برابر پہنچاتے تھے انہوں نے یہ خدمت صرف عہدِ نبوی ہی میں نہیں انجام دی بلکہ حضرات ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کے زمانۂ خلافت میں بھی انجام دی تھی۔(۲۶۵)

طے کے مقامی عاملِ صدقات حضرت عدی بن حاتم طائی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم اور ممتاز عمال میں سے تھے۔ حضرت عدی اپنے اسلمی ہم عہدہ کی مانند اپنی قوم طے کے صدقات کے علاوہ اپنے قریبی پڑوسیوں بنو اسد / خزیمہ کے صدقات کے بھی عامل تھے۔(۲۶۶) اس لحاظ سے وہ مرکزی عاملِ صدقات بھی تھے۔ ابنِ اثیر کے مطابق انہوں نے خلافتِ فاروقی کے زمانے تک یہ خدمت شاندار طریقے سے انجام دی تھی۔ بنو اسد کے ایک اور عامل صدقات حضرت قضاعی بن عمرو تھے جو نہ صرف ان کے صدقات وصول کرتے تھے بلکہ ان کے علاقے میں مرکزی منتظم بھی تھے۔(۲۶۷) مآخذ کی ان شہادتوں سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ حضرت قضاعی بن عمرو مرکزی عامل تھے جبکہ حضرت عدی بن حاتم طائی مقامی مصدق تھے۔ کتانی نے ایک روایت بیان کی ہے کہ حضرت کافیر بن سبیع الاسدی اپنی قوم کے صدقات پر مقرر کیے گئے تھے۔(۲۶۸) مجموعۃ الوثائق میں ایک دستاویز ہے جس کے مطابق بلی کا ایک خاندان بنی جُعیل متعدد مشرقی قبیلوں جیسے نصر، سعد بن بکر، ثمالہ اور ہذیل کے سِعایۃ (صدقات کی وصولیابی) کا ذمہ دار بنایا گیا تھا وہ حضرات جو ان کی وصولیابی اور اس کے نتیجہ میں اس سے مالی فائدہ کے مستحق تھے حسب ذیل تھے:

حضرات عاصم بن ابی صیفی، عمرو بن ابی صیفی، الاعجم بن سفیان اور علی بن سعد۔(۲۶۹)

ان میں سے حضرت الاعجم بن سفیان کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ یکے از عمالِ رسول تھے۔ کتانی نے ایک اور روایت اصابہ کی سند پر بیان کی ہے کہ حضرت کہل بن مالک ہذلی اپنے قبیلہ ہذیل کے صدقات کے عامل تھے۔(۲۷۰)

مشرقی قبیلوں میں ہوازن کی بعض اہم شاخوں جیسے فہم، ثمالہ، سلمہ وغیرہ جن کو عجز ہوازن بھی کہا جاتا تھا کے عامل صدقات حضرت مالک بن عوف نصری تھے جو ہوازن کے عظیم سرداروں میں سے ایک تھے۔ جہاں تک ہوازن کے اور بطون اور خاندانوں کا تعلق ہے تو ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ متعدد قبیلوں جیسے کلاب، عامر بن صعصعہ، ثقیف اور احلاف پر مرکزی عاملین صدقات

مقرر کئے گئے تھے اور قیاس یہ کہتا ہے کہ ان کے مقامی عاملین بھی تھے۔ کتانی کا بیان ہے کہ حضرات مرداس بن مالک اور خزیمہ بن عاصم کو بنو عنس/قیس عیلان اور الاحلاف کا مقامی عامل مقرر کیا گیا تھا۔(۲۷۱) حضرت عباس بن مرداس سلمی کے علاوہ جو کہ مرکزی مصدق تھے حضرت ہیثم اسد الغابہ کے بیان کے مطابق سلیم کے مقامی مصدق تھے۔(۲۷۲) قبیلۂ غطفان جو عددی لحاظ سے کافی بڑا اور طاقت ور قبیلہ تھا اپنے مختلف بطون اور خاندانوں کے لیے عمالِ صدقات کی ایک پوری جماعت رکھتا تھا چنانچہ اشجع، فزارہ، مُرّہ، ثعلبہ، انمار اور عبس و ذبیان وغیرہ کے متعدد مقامی عاملین صدقات تھے۔

شمالی قبائل عذرہ، سلامان، بلی اور کلب کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ اپنے صدقات مرکزی عاملین صدقات کو ادا کرتے تھے۔ یہی حال سعد ہذیم کا بھی تھا۔ جہاں تک ان کے مقامی مصدقین کا تعلق ہے تو ذکر ملتا ہے کہ عذرہ کے عامل حضرت ہوذہ بن نعمان اپنے قبیلہ کے مقامی افسر تھے اور ایک بار خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے قبیلہ کے صدقات لے کر مدینہ پہنچے تھے۔(۲۷۳) سعد ہذیم کے دو مرکزی عاملین صدقات حضرات ابی بن کعب اور عنبسہ کا ذکر پہلے ہی آچکا ہے۔ یہ بھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف زہری دومہ کے بنو کلب کے مرکزی عامل تھے تو ان کے شیخ قبیلہ حضرت امرؤ القیس جو ابن الاصبغ کلبی کے نام سے زیادہ معروف ہیں مقامی محصل تھے۔ موخر الذکر کے شرف کی بات ہے کہ انہوں نے نہ صرف عہدِ نبوی میں یہ خدمتِ عظیم انجام دی تھی بلکہ ردّہ کے پُر آشوب و ابتلا کے زمانے میں بھی پوری ایمان داری سے صدقات وصول کرکے مدینہ منورہ پہنچاتے رہے تھے۔(۲۷۴) اسد الغابہ کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد قبیلوں کے گروہ قضاعہ کے لئے متعدد عمالِ صدقات کا تقرر کیا گیا تھا۔(۲۷۵) اس خیال کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ قضاعہ کے ایک خاندان بنو قین کا مصدق حضرت عمرو بن حکم کو بتایا گیا ہے۔(۲۷۶) مجموعۃ الوثائق کی ایک دستاویز کے مطابق لخم کے ایک خاندان حدس کو اپنی زکوٰۃ اور دوسرے محاصل کی رقوم کی ادائیگی کی ہدایت کی گئی تھی۔(۲۷۷) ظاہر ہے کہ یہ ادائیگی ایک مقامی عاملِ صدقات کے ذریعہ ہوتی تھی۔ اسی طرح کا معاملہ غسان کے ایک خاندان بنو ثعلبہ کے ساتھ کیا گیا تھا جب ان کو زکوٰۃ اور خمس وغیرہ کی ادائیگی کا حکم دیا گیا تھا۔(۲۷۸) ان شہادتوں سے صراحتاً نہ سہی تو مضمراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان قبیلوں میں مقامی عاملینِ صدقات موجود تھے۔

جیسا کہ ہم گزشتہ بحث میں دیکھ چکے ہیں کہ جنوبی عرب کے لیے متعدد مرکزی عاملینِ صدقات مقرر کئے گئے تھے۔ عام طور سے وہ سب کے سب مختلف علاقوں اور ولایات کے والی اور مرکزی منتظمین تھے جن کے فرائض منصبی میں صدقات کی وصولیابی بھی شامل تھی۔ چنانچہ الجند، صنعا، عک، اشعر، کندہ (سکاسک، سکون، معاویہ) نجران، جرش، بنو حارث، زبید، رمع، عدن، ساحل مغرب اور حضر موت اور ان کے ماتحت علاقے اپنے اپنے مرکزی عاملین کو بالآخر صدقات ادا کرتے تھے لیکن یہ ادائیگی ان کے مقامی عاملوں کے ذریعہ ہوتی تھی اگرچہ زیادہ تر معاملات میں اس کا صریحی ذکر نہیں ملتا ہے۔

دراصل تمام مقامی منتظمین اور قبائلی سردار مقامی مصدقین بھی ہوتے تھے جو اپنے اپنے لوگوں سے صدقات وصول کرکے مرکزی عاملین تک پہنچاتے تھے۔ جنوبی عرب کے ضمن میں یہ بیان اور بھی بجا طور پر منطبق ہوتا ہے۔ چنانچہ مقامی منتظمین پر گزشتہ بحث سے یہ امر کہ ان مقامی سرداروں کا سب سے اہم فریضہ صدقات کی اپنے علاقوں سے وصولیابی اور مرکزی نمائندوں کی ان کی

حوالگی تھا پوری طرح سے ثابت ہوتا ہے۔ یہاں صرف ان قبائل اور "اقوام" کے نام گنا دینا کافی ہو گا جن کے سرداروں کا ذکر صراحتاً ملتا ہے جو حسب ذیل تھے:

خولان، ازد جرش، بنو خارف/ ہمدان، بنو بجیلہ/ ہمدان (اس بطن کو بنو ناعز بھی کہا جاتا تھا)، مراد، جرش، بنو حارث بن کعب/ مذحج، مرّان، حریم اور کُلاب اور ان کے "موالی"، بنو ارحب/ ہمدان، رُہا، صُداء، کندہ اور حضرموت۔

مجموعۃ الوثائق میں بعض بڑے دل چسپ خطوط و دستاویزات ہیں جو جنوبی عرب میں مقامی عاملین صدقات کی موجودگی پر کافی اہم روشنی ڈالتی ہیں۔ ایک دستاویز کے مطابق حضرت مطرف بن کاہن باہلی کو ان کے قبیلہ کی اس شاخ کا عامل مقرر کیا گیا تھا جو بیشہ نامی مقام پر آباد تھی۔[۲۷۹] ان کے لوگوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ مذکورہ بالا مصدق کو اپنے مویشیوں کی زکوٰۃ ادا کریں۔ حضرت نہشل بن مالک باہلی کے نام گرامی نامۂ نبوت میں صاف تصریح کی گئی ہے کہ ان کے قبیلہ والے اپنی زکوٰۃ اور خمس وغیرہ اپنے قبائلی عامل کے سپرد کر دیں۔[۲۸۰] بنو حارث اور بنو نہد کے لوگوں کو حضرت قیس بن حصین کے ذریعہ تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی بشرطیکہ وہ اپنے اموال میں زکوٰۃ وغیرہ صدقات وقت پر ادا کر دیا کریں۔[۲۸۱] اسی طرح حضرت طہفہ اور ان کی قوم کو جن کا تعلق نہد سے تھا زکوٰۃ اور دوسرے صدقات ادا کرنے کی ہدایت کی گئی تھی[۲۸۲] اور تمام معاملات میں مقامی مصدقین کی موجودگی اور کارکردگی سامنے کی بات ہے۔

خثعم کے بارے پہلے ہی یہ ذکر آ چکا ہے کہ وہ عشر اور نصف العشر ادا کیا کرتے تھے۔[۲۸۳] لیکن اس سے زیادہ نمائندہ اور دلچسپ معاملہ حضرت وائل بن حجر حضرمی کا ہے جو حضرموت کے اقیال (شہزادوں اور حکمرانوں) میں سے ایک تھے۔ مرکزی منتظم اور والی حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کے نام رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک گرامی نامہ میں حضرت وائل کی دوسرے اقیالِ حضرموت کے مقابلے میں حیثیت و مرتبہ کا تعین ملتا ہے۔ چنانچہ ان کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ دوسرے اقیال سے تمام صدقات وصول کر کے مرکزی منتظم کے حوالے کر دیں۔[۲۸۴] اس کی مزید تصدیق دوسرے دو خطوطِ نبوی سے ہوتی ہے جن میں ان کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اقیال سے زکوٰۃ، مویشیوں پر صدقہ، پیداوار پر عشر اور سیوب (پانی بہنے کی جگہیں) پر خمس (نصف العشر) وصول کر کے ایک اور مرکزی عامل حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی کے حوالے کریں جن کو خاص اسی مقصد سے مدینہ منورہ سے ان کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔[۲۸۵]

قبائل پراگندہ عرب میں تمیم کا معاملہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد بھی ہے اور نمائندہ بھی۔ اس کے کم از کم سات مختلف بطون/ خاندانوں کے مقامی عاملین صدقات کا ذکر ہم ماخذ میں پاتے ہیں۔ ان عاملین صدقات کے اسمائے گرامی مع ان کے میدان ہائے عمل کے یہ ہیں:

(۱) حضرت قیس بن عاصم بنو سعد/تمیم کے لیے

(۲) حضرت زبرقان بن بدر بنو سعد کے ایک اور خاندان کے لیے

(۳) حضرت مالک بن نویرہ بنو حنظلہ کے لیے

(۴) حضرت سہل بن منجاب (۵) حضرت صفوان بن صفوان (۶) متمم بن نویرہ اور (۷) حضرت غالب بن سمرہ بنو تمیم کے مختلف خاندانوں (اپنے اپنے بطون) کے لیے تھے۔[۲۸۶]

ایک اور مقامی عامل صدقات حضرت خزیمہ بن عاصم تھے جو اپنے قبیلہ بنو عوف / وائل بن بکر سے صدقات وصول کرتے تھے۔[۲۸۷] مجموعۃ الوثائق میں شامل ایک دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ عبدالقیس کے ایک سردار حضرت اکبر بن عبدالقیس اپنے قبیلہ کے علاوہ ازدِ عمان سے صدقات وصول کر کے مرکزی منتظم حضرت علاء بن حضرمی کے حوالے کرتے تھے۔[۲۸۸] اگرچہ مہرہ کے قبیلہ میں مقامی عاملین کا ذکر واضح طور سے نہیں ملتا ہے لیکن ان کی موجودگی کا پکا قرینہ اس ہدایت نبوی میں ملتا ہے جس نے اس قبیلہ کے لوگوں کو اسلام کے شرائع (قوانین) کی پابندی بشمول زکوٰۃ و صدقہ عمال کو ادائیگی کی تاکید کی تھی۔[۲۸۹] حضرت ثمامہ بن اثال حنفی کے زیر اقتدار بنو حنیفہ کے طبقات نے ان کے ذریعہ اپنے صدقات ادا کیے تھے جبکہ تغلب / بکر بن وائل کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ (در اصل جزیہ) کا معاہدہ ایک معروف و مشہور حقیقت ہے۔

صدقات و محاصل کی وصولیابی کے نظام کی بحث کے آخر میں یہ جاننا دلچسپی اور اہمیت کا حامل ہوگا کہ اسلامی ریاست کو مختلف ولایات، علاقوں اور قبیلوں سے کس قدر صدقات نقد یا جنس میں حاصل ہوتے تھے۔ بدقسمتی سے اکثر معاملات میں نقد یا جنس کی مجموعی رقم کا کوئی ذکر نہیں ملتا تاہم بعض معاملات میں صراحتاً اور کہیں کہیں مضمراً صدقات کی مالیت کا ذکر آیا ہے۔ بحرین کے بارے میں ذکر آیا ہے کہ اس کے مرکزی منتظم حضرت علاء بن حضرمی ایک سال یا ایک بار ستر ہزار درہم کی رقم لے کر مدینہ پہنچے تھے جو مال بحرین کہا گیا ہے۔[۲۹۰] دوسری صریح مثال تمیم کے قبیلہ بنو سعد کے نصف کے عامل حضرت زبرقان بن بدر کی ہے جو اپنی قوم کے صدقہ کے سات سو اونٹ لے کر ایک بار خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تھے۔[۲۹۱] نجران کے عیسائیوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو معاہدۂ صلح کیا تھا اس کی رُو سے ان کے جزیہ کی تخمینی رقم / مالیت تقریباً اسی ہزار درہم تھی۔ بظاہر اور اپنی جگہ یہ تمام خاصی خطیر رقمیں معلوم ہوتی ہیں لیکن جب ان کا موازنہ مسلمانوں کے عطیات سے کیا جاتا ہے جو در اصل مسلم معیشت کی پیمائش کا ایک پیمانہ بھی ہے تو ان کی اصل مالیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر حضرت عثمان غنی نے تنہا ستر ہزار درہم کی رقم عطیہ میں دی تھی جو حسنِ اتفاق سے بحرین کے وسیع صوبے اور مملکت کے صدقات کی رقم کے برابر تھی۔ اس موقعہ پر مسلمانوں کے عطیات کی کل رقم بلاذری کی روایت کے مطابق دو لاکھ دس ہزار درہم تھی کیونکہ حضرت عثمان کے عطیہ کو ثلث (⅓) کہا گیا ہے۔ اس موازنہ سے صدقاتِ ولایات کی مالیت کا مکمل نہ سہی ایک موٹا سا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔

(۳) صدقات کے کاتبین

ابن حزم کی جوامع السیرہ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت میں دُوسرے شعبوں کی مانند مالی نظام کے مختلف محکموں کا حساب کتاب باقاعدہ رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت زبیر بن عوام اسلامی ریاست کے صدقات کے کاتب تھے اور وہی سارا حساب کتاب رکھا کرتے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں حضرات جہیم بن صلت اور حذیفہ بن الیمان صدقات کی آمدنی کو

ان کے رجسٹروں میں لکھا کرتے تھے"۔ لیکن قضاعی کی روایت سے انتظامی امور کچھ مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کی روایت کے مطابق حضرات زبیر بن عوام اور جہیم بن صلت صدقات کی آمدنی کے کاتب تھے جبکہ حضرت حذیفہ بن الیمان کھجور کی پیداوار کے تخمینے سے متعلق امور کی کتابت و اندراج کیا کرتے تھے۔ ان روایات کو بیان کرنے کے بعد کتانی کا تبصرہ یہ ہے کہ اگر یہ روایات صحیح ہیں اور بظاہر ان کی صحت میں کوئی احتمال وکلام نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ دونوں دیوان (شعبے) عہدِ نبوی ہی میں قائم ہو چکے تھے(٢٩٢)

بہرحال سیرتِ نبوی کے مختلف مآخذ سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ انتظامی امور سے تمام معاملات و امور کا خواہ ان کا تعلق فوجی انتظامیہ سے ہو یا شہری نظم ونسق سے، مالی معاملات سے یا مذہبی امور کے نظام سے، ایک باقاعدہ تحریری ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ اس کی متعدد مثالیں گزشتہ مباحث میں گزر چکی ہیں اور کچھ اور کا مطالعہ ہم آگے بھی کریں گے۔

(۴) خَرص اور خارص (پیداوار کا تخمینہ اور اس کے افسر)

زمین کی پیداوار پر ہماری بحث میں ان افسرانِ حکومتِ نبوی کا حوالہ آچکا ہے جو خیبر اور دوسری یہودی بستیوں کے باغات اور کھیتوں کی پیداوار کا تخمینہ لگاتے اور اس کو یہودی کاشتکاروں اور مسلم حصہ داروں کے درمیان برابر برابر تقسیم کیا کرتے تھے۔ چونکہ عشر، نصف العشر، خراج اور جزیہ (جنس میں) وغیرہ تمام صدقات متناسب محاصل اور صدقات تھے، اس لیے تخمینہ (ASSESSMENT) ناگزیر ہوگیا تھا۔ ایسے پیداواری تخمینے کو مآخذ کی اصطلاح میں "خَرَص" کہا جاتا ہے اور اس کے افسر کو "خارص"۔ کتانی کی خرص کی بیان کردہ تعریف کہ اس سے مراد صرف کھجور کے باغوں (النخل) میں پختہ کھجور (الرُطب) یا تحفظ یا اندازہ (حضر) تھا(٢٩٣) جزوی طور سے صحیح ہے کیونکہ وہ اس کے زمرہ سے تمام دوسری فصلوں کو نکال باہر کرتی ہے۔ دوسری طرف خزاعی کا بیان ہے کہ عہدِ نبوی میں خرص کا تعلق صرف کھجوروں، انگوروں اور اناج کے دانوں (الحبوب) سے تھا اور انھیں پر تخمینہ کے اصول کا اطلاق ہوتا تھا۔(٢٩٤) لیکن یہ تعریف بھی مکمل طور سے صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ پیداوار کی تمام قسموں کا احاطہ نہیں کرتی ہے جبکہ عہدِ نبوی میں ہر وہ پیداوار جو ایک خاص نصاب کو پہنچ جائے پیداواری زکوٰۃ یا محصول کے دائرہ میں آجاتی تھی اور اس لحاظ سے وہ خرص کے اصول اور خارص کے میدانِ عمل کی چیز تھی۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار جناب رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس ایک کھجور کے باغ کی پیداوار کا تخمینہ لگایا تھا۔ اس کا تعلق غزوۂ تبوک کے زمانے سے ہے۔ روایت کے مطابق جب آپ اپنے لشکر کے ساتھ وادی القریٰ کے علاقے میں پہنچے تو آپ کا گزر ایک مسلمان عورت کے ایک کھجور کے باغ پر ہوا۔ آپ نے اپنے بعض اصحاب سے اس کی پیداوار کا تخمینہ لگانے کو کہا اور خود آپ نے اس کا تخمینہ دس وسق لگایا جو بالکل صحیح تھا۔ بعد میں آپ نے اس کے مالکوں کو کھجور کے خوشوں کو شمار کرنے اور محفوظ رکھنے کی اپنی واپسی تک ہدایت دی۔(٢٩٥) روایت یہاں ختم ہو جاتی ہے لیکن اس کے بعد کے واقعات کو قیاس سے بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قیاس یہ ہے کہ بعد میں ماہرینِ تخمینہ نے اس کی پیداوار کا اصلی تخمینہ لگایا ہوگا اور اس کی بنیاد پر اس کی زکوٰۃ وصول کی ہوگی۔ چنانچہ اس روایت کی بنیاد پر یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی مملکت کے

تمام مسلم اور غیر مسلم باشندوں کی قابلِ کاشت یا زیرِ کاشت اراضی خواہ باغ کی شکل میں ہو یا کھیت کی خرص کے اصول کے ماتحت تھی۔ اور اسی اعتبار سے خارص کے دائرۂ کار اور محاصل کے حلقہ میں بھی تھی۔

ہر معیار اور اصول کے اعتبار سے حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجی ایک عظیم تخمینہ کار افسر (الخراص) تھے۔ وہ ہر فصل پر خیبر کی پیداوار کا تخمینہ لگایا کرتے تھے اور اپنے اس عہدۂ عظیم پر وہ غزوۂ موتہ میں اپنی شہادت تک فائز رہے تھے۔ ہمارے مستند مورخین کا اس بات پر اختلاف ہے کہ ان کا جانشین کون ہوا تھا؟ کچھ کا خیال ہے کہ ان کے بعد خیبر کے خارص کے عہدہ پر حضرت ابوالہیثم بن التیہان اوسی کا تقرر ہوا تھا،[٢٩٦] جبکہ دوسروں کا خیال ہے کہ حضرت جبار بن صخر حضرت عبداللہ بن رواحہ کے جانشین بنے تھے۔[٢٩٧] دوسرے نقطۂ نظر کے مطابق حضرت جبار بن صخر کے ساتھ خیبر کی پیداواروں کے تخمینے کے کام میں حضرت زید بن سلمہ خزرجی کو بھی کسی اعتبار سے شریک کیا گیا تھا۔[٢٩٨] اسد الغابہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرو بن سعید اموی کو خیبر کی پھلوں کی پیداوار کا "خارص" مقرر کیا گیا تھا۔[٢٩٩] اس علاقے کے لیے ایک اور تخمینہ کے افسر (خراص) کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے۔ وہ حضرت ابوحثمہ عامر بن ساعدہ خزرجی تھے جن کو عہدِ نبوی کے آخری زمانے میں اس منصبِ عظیم پر مقرر کیا گیا تھا اور ان کے سلسلے میں دلچسپ اور اہم امر یہ ہے کہ وہ اس عہدہ پر نہ صرف عہدِ نبوی ہی میں فائز رہے بلکہ پوری خلافتِ راشدہ میں بھی اس پر قائم و دائم رہے اور حضرت علی کی خلافت کے اواخر میں غالباً اپنے انتقال کے سبب اس سے الگ ہوئے تھے۔[٣٠٠] ریاستی ملازمت میں مدت کے اعتبار سے یہ تقرری طویل ترین مثالوں میں سے ایک ہے جو تیس سال سے زیادہ مدت پر محیط ہے اور یقیناً وہ ایک عظیم انتظامی کارنامہ ہے۔ اس سے صحابی موصوف کی عظیم صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

اسلامی ریاست کے دوسرے خطوں میں مدینہ منورہ کی زمین کی پیداوار کا حوالہ بھی مآخذ میں ملتا ہے جو ہمارے مطالعہ میں ایک دلچسپ عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسد الغابہ اور کتانی کے مطابق حضرت فروہ بن عمرو بیاضی خزرجی مدینہ منورہ کی پیداوار کا تخمینہ لگایا کرتے تھے۔ ان کا خاص میدانِ عمل کھجوروں کے باغ تھے اور دلچسپ امر یہ ہے کہ وہ اس کے خوشوں کو گن کر پورے باغ کی پیداوار کا تخمینہ لگا لیتے تھے جو حقیقتاً بالکل صحیح ہوتا تھا۔ مآخذ کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے کام میں اس قدر ماہر تھے کہ ان کا تخمینہ یا اندازہ (حساب) کبھی غلط نہیں ہوا۔[٣٠١] اس تبصرہ سے مزید یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہدِ نبوی میں مدینہ کی پیداوار کے ایک مستقل خراص تھے۔ ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سہل بن حثمہ بھی عہدِ نبوی کے خارصوں میں سے ایک تھے مگر ان کے بارے میں یہ ذکر نہیں مل سکا ہے کہ وہ کہاں اور کیسے اپنے فرائض کو انجام دیتے تھے۔[٣٠٢]

محدث ابوداؤد نے اپنی ایک حدیث میں بیان کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتاب بن اسید اموی کو مسلمانوں کی انگور کی پیداوار کے تخمینہ کا افسر مقرر کیا تھا۔ وہ کھجوروں کی پیداوار کو بھی ماپتے تھے اور ایک ہی اصول و ضابطہ کے مطابق انگوروں اور کھجوروں کی پیداوار کی زکوٰۃ وصول کرتے تھے۔[٣٠٣] اس روایت کی مزید تشریح بلاذری کی ایک روایت سے ہوتی ہے جس کا بیان ہے کہ صحابی موصوف طائف کے علاقے میں واقع بنو ثقیف کے انگور وغیرہ کے باغوں کی پیداوار کا تخمینہ لگاتے اور ان سے زکوٰۃ وصول کرتے تھے۔[٣٠٤] اس روایت کے مطابق یہ دلچسپ حقیقت ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ

حضرت عتاب اموی مکہ کے والی تھے لیکن وہ اپنے پڑوسی علاقے کے خارص (افسر پیداوار و مصدق) بھی تھے۔ گویا کہ وہ اسلامی ریاست کے لیے بیک وقت دُہرا کام انجام دیتے تھے۔ لیکن تاریخی تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ بلاذری کو کچھ تسامح ہوا ہے۔ حضرت عتاب اموی یقیناً طائف اور اس کے مضافات میں واقع باغوں اور کھیتوں وغیرہ کی پیداوار کے افسر تھے مگر یہ پیداوار بنو ثقیف کی نہیں تھی بلکہ مکہ مکرمہ کے مالدار تاجر قریشیوں کی تھی جو اس علاقے میں بہت سی پیداواری زمین رکھتے تھے دراصل حضرت عتاب کا دائرۂ کار مکہ مکرمہ اور اس کے باشندوں کی جائدادیں تھیں خواہ وہ مکہ کے حدود میں واقع ہوں یا طائف اور دُوسرے مضافات کے علاقے میں۔

ماخذ میں دو اور "خارصوں" کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی تھے حضرات ابوزید بن الصلت اور الصلت بن معدی کرب۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں کا تعلق جنوبی عرب کے قبیلہ کندہ سے تھا۔[۵۰] غالباً دونوں اپنے اپنے مقامی علاقوں یا قبیلوں میں کام کرتے تھے کیونکہ ماخذ میں ان کے دائرۂ کار کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ جنوبی عرب میں زمین کی پیداوار کے تخمینہ اور اس کے افسروں (خارصوں) کے بارے میں ہماری معلومات کافی تشنہ ہیں لیکن مذکورہ بالا حقائق و شواہد اس نظریۂ خیال کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ اسلامی مملکت کے دوسرے خطوں کی مانند جنوبی عرب میں بھی تمام قابل کاشت یا زیرِ کاشت اراضی کا تخمینہ لگایا جاتا تھا اور اس تخمینہ کی بنیاد پر پیداواری صدقات مقرر کیے جاتے تھے۔ اس فرض کی انجام دہی کے لیے یا تو مدینہ منورہ سے مرکزی افسرانِ خرص و تخمینہ روانہ کیے جاتے تھے یا مقامی "خارصین" کی تقرری کی جاتی تھی۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ جنوبی عرب کے مختلف علاقوں کے والی اپنے اپنے علاقوں کے لیے مقامی خارصین مقرر کرتے تھے اور انھیں کے ذریعہ پیداوار کا تخمینہ لگایا جاتا تھا اور پھر اس کی بنیاد پر صدقات وصول کیے جاتے تھے۔

مذکورہ بالا دس خارصین" کی علاقائی و قبائلی تحلیل سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی غالب اکثریت یعنی تقریباً ساٹھ فیصد کا تعلق مدینہ کے انصاری قبیلہ خزرج سے تھا۔ اس سے یہ قیاس کرنا جائز ہو جاتا ہے کہ اس انصاری قبیلے کے لوگ اچھے کاشتکار اور ماہر تخمینہ کار تھے باقی پانچ میں سے دو کا تعلق قریش کے تاجر قبیلے سے تھا۔ اس حقیقت سے صحیح بخاری کی اس روایت کی مزید تصدیق ہوتی ہے جس کے مطابق مہاجرینِ مکہ یعنی قریشِ مکہ میں سے کافی تعداد میں لوگ زراعت میں لگ گئے تھے۔ دو اور کا تعلق قبیلہ کندہ سے تھا جو یمن کے زرخیز علاقہ میں آباد تھا جبکہ آخری خارص کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔ حضرت عمرو بن سعید اموی کے سوا جو ابتدائی مکی مسلم تھے باقی خارصین کا تعلق اسلام مکہ کے آخری زمانے یا مدینہ کے زمانے سے تھا۔ آخر میں یہ اعتراف لازمی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے عہد نبوی میں خارصین کی جتنی حقیقی تعداد تھی اس کا عشر عشیر بھی ماخذ میں مذکور نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا خارصین کی مذکورہ بالا تعداد کو ہی مکمل نہ سمجھا جائے۔ ان کی اصل تعداد بلاریب اس سے کئی گنا زیادہ تھی۔

(۵) حمیٰ (چراگاہ) کا نظام اور اس کے افسر

زرعی نظام میں آخری طبقہ، عمالِ حکومتِ نبوی ان افسروں پر مشتمل تھا جو ریاستی چراگاہوں کے محافظ تھے۔ "حمیٰ" کے لفظی معنی محافظت، دفاع یا محفوظ علاقہ کے ہیں لیکن اصطلاحی معنی محفوظ چراگاہ کے آتے ہیں۔ غالباً یہ معنی اس سبب سے اس کے ہوئے کہ ہر قبیلہ / خاندان کی چراگاہ زمانہ ماقبل اسلام میں محفوظ و مخصوص متصور ہوتی تھی۔ اس میں کسی "غیر" کا بلا اجازت داخلہ یا اس سے متعلق جاہلی روایات سے انحراف عام طور سے ایک جرم عظیم سمجھا جاتا تھا جو بسا اوقات متحارب و متخاصم فریقوں کے بیچ مسلح ٹکراؤ کی صورت میں منتج ہوتا تھا اور اگر کبھی ایسا نہ ہوا تو جنگ و جدال کا خدشہ ہمیشہ برقرار رہتا تھا۔ دراصل اس کے بعض اہم معاشی اسباب تھے۔ ریگستان میں سبزہ عارضی اور معمولی ہوتا تھا جو ایک قبیلہ / خاندان کی ضروریات کے لیے بھی کافی نہیں ہوتا تھا۔ نخلستان میں اگرچہ سبزہ مستقل ہوتا تھا اور نسبتاً زیادہ بھی۔ لیکن وہ بھی مطلوبہ مقدار کی کفایت نہیں کرتا تھا۔ لہذا یہ عربوں کے لیے فطری امر تھا کہ وہ اپنے اپنے سبزہ کی حفاظت کریں کہ ان کی زندگی کا بڑی حد تک انحصار اسی پر تھا۔ چنانچہ ہر قبیلہ اور خاندان خواہ وہ بدوی ہو یا شہری اپنے سبزہ اور چراگاہ کی زندگی کی مانند قدر کرتا تھا۔ جاہلی روایات نے تمام چراگاہوں کو چاہے وہ ریگستان میں ہوں یا نخلستان میں ان کے مخصوص قبیلوں اور خاندانوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا اور یہ روایات "اول قبضہ و تصرف اور اول و آخر مالک و حقدار" کے اصول پر مبنی تھیں۔ جاہلی عرب بھی ان روایات کا احترام عام طور سے کرتے تھے اور کبھی کبھی معاشی دباؤ سے تنگ آکر ان چراگاہوں (حمیٰ) پر حملہ کرنے کے مرتکب بھی ہوتے تھے۔ عموماً یہ چراگاہیں واضح و صاف حدود رکھتی تھیں تاکہ غیروں کو اپنی آزادی کی حدود معلوم رہیں۔

اسلامی ریاست کے قیام سے پہلے مدینہ والوں کی اپنی چراگاہیں مدینہ کے مضافات میں تھیں اور ہجرت نبوی کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائلی روایات کے مطابق اسلامی ریاست کی مخصوص چراگاہیں بھی قایم کیں۔ مسلمانانِ مدینہ کی قبائلی یا اجتماعی چراگاہیں از خود ریاستی چراگاہوں میں تبدیل ہوگئیں جہاں مسلمانوں اور ریاست کے جانور چرا کرتے تھے بعد میں اسلامی ریاست کی خاص اپنی چراگاہیں بھی قائم کی گئیں جو مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان چراگاہوں کی حفاظت، وہاں چرنے والے مویشیوں کے تحفظ و نگرانی اور غیروں اور غارتگروں کے بلا اجازت داخلہ و غارتگری سے بچانے کی خاطر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم محافظوں کو باقاعدہ مقرر فرماتے تھے۔ مونٹگمری واٹ اور ان جیسے دوسرے مورخین نے اسلامی ریاست کے ان کارکنوں کو سماجی اور اقتصادی لحاظ سے کمزور اور فروتر اور ان کے کام کو "ادنیٰ و ذلیل" قرار دیا ہے۔ یہ دراصل عرب کے راعیانہ (PASTORAL) نظامِ معیشت سے نابلد ہونے کی دلیل ہے۔ عرب میں "راعی" (چرواہا) ہونا "ادنیٰ یا ذلیل" کام نہیں تھا۔ تاریخی شواہد اس کے بہت ہیں کہ قریش مکہ کے ممتاز خاندانوں کے نوجوان لڑکے لڑکیاں یہ کام بلا کسی عار و ننگ کے انجام دیا کرتے تھے کہ یہ ان کی معیشت کا ایک حصہ تھا۔ اسی طرح دوسرے لوگ جو آمدنی کے ذرائع محدود رکھتے تھے اس پیشہ کو بلا تردد اپنا لیتے تھے اور محض اس پیشے کے سبب وہ عرب سماج میں حقارت کی نگاہ سے

نہیں دیکھے جاتے تھے۔ سماج میں اس پیشہ کے مقام و مرتبے کی مزید شہادتیں ہم کو اپنی اس موجودہ بحث میں آگے ملیں گی جن سے مستشرقین و جدید مورخین کے خیال کی خام کاری واضح ہو جائے گی۔

ماخذ کا بیان ہے کہ مدینہ منورہ کی چراگاہ (حمیٰ) جس مقام پر واقع تھی وہ "الجمّع" کہا جاتا تھا۔ شہرِ رسولِ اکرم سے تین میل کے فاصلہ پر ایک مضافاتی خطہ تھا جو خاصا وسیع بھی تھا اور سرسبز و شاداب بھی۔ ہجرتِ نبوی کے محض ایک برس کے بعد ربیع الاول ۲ھ / ستمبر ۶۲۳ء میں مکہ کے ایک سردار کرز بن جابر فہری نے اس پر حملہ کیا اور اسلامی ریاست کے کچھ جانوروں پر قبضہ کر کے ساتھ لے گئے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جوں ہی اس حملہ کی خبر ملی آپ نے حملہ آوروں کا تعاقب کیا لیکن وہ مسلمانوں کے کچھ مویشیوں کے ساتھ نکل بھاگنے میں کامیاب رہے۔[۳۰۶] رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور چراگاہ (حمیٰ) ایک مضافاتی مقام پر واقع تھی جس کو "ذوالجدر" کہا جاتا تھا اور وہاں آپ کے اونٹ بلکہ اونٹنیاں بھی (لقاح) چرا کرتی تھیں۔ واقدی کے مطابق یہ چراگاہ مدینے سے آٹھ میل دور واقع تھی جبکہ ابن سعد کا خیال ہے کہ وہ قبا کے نواح میں شہرِ نبی سے صرف چھ میل دور تھی۔[۳۰۷] اس چراگاہ کے افسر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مولیٰ حضرت یسار تھے جو اپنے اصحاب کے ساتھ اس کی نگرانی کرتے تھے۔ شوال ۶ھ / فروری۔ مارچ ۶۲۸ء میں قبیلہ عُرینہ کے کچھ شرپسندوں نے دھوکا سے حضرت یسار کو قتل کر دیا اور ان کے زیرِ نگرانی مسلمانوں کے اونٹ (سرح) پکڑ لے گئے مگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بروقت اقدام نے حملہ آوروں اور غارت گروں کو ان کے انجام تک پہنچا دیا۔[۳۰۸]

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور چراگاہ جس کا ذکر ماخذ میں ملتا ہے الغابہ تھی۔ یہ دراصل ایک سرسبز و شاداب وادی تھی جو مدینہ اور مکہ کے درمیان تجارتی شاہراہ کے قریب عسفان سے آٹھ میل پرے واقع تھی۔[۳۰۹] یہاں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ دودھاری اونٹنیاں اور مسلمانوں کے جانور چرتے تھے۔ واقدی نے غزوۂ ذی قرد کے بیان میں ربذہ کی حمیٰ اور اس کے مضافاتی علاقہ البیضاء کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس چراگاہ میں اسلامی ریاست کے جانوروں کی چرائی وغیرہ کے انتظامات کی ذمہ داری حضرت ابوذر غفاری کے ایک صاحبزادے جن کا نام "ذر" تھا اور جن کے نام صحابی موصوف کی کنیت بھی تھی۔ اور کتانی کے بقول ایک اور صحابی حضرت عُریب المالکی جو ایک گمنام مسلم صحابی ہیں بھی ریاستی کارکن راعی تھے۔

بہرحال واقدی کے بیان سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ تمام مسلم مالکان نے اپنے اپنے مویشیوں کی دیکھ بھال کے لیے بھی اپنے آدمی رکھ چھوڑے تھے جو عام طور سے ان کے غلام تھے۔ ان میں حضرات مقداد بن عمرو، محمد بن مسلمہ اور عبدالرحمٰن بن عوف کے غلاموں کا ذکر صراحتاً کیا گیا ہے جو اپنے آقاؤں کے جانوروں کو وہاں چراتے تھے۔[۳۱۰] عام طور سے ہمارے سیرتِ نبوی کے ماخذ میں انھیں چراگاہوں کو اسلامی یا مسلم چراگاہوں کا درجہ دیا جاتا ہے اور بقیہ کا ذکر چھوڑ دیا جاتا ہے مگر ماخذ کے متفرق شواہد اور حوالوں سے بعض اور حمیٰ کا بھی ذکر ملتا ہے جو اسلامی ریاست نے جزیرہ نما کے مختلف علاقوں میں قائم کی تھیں۔

ایک بہت اہم شہادت واقدی کے بیان میں ملتی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی قطعۂ زمین کو کس طرح حمیٰ (چراگاہ) بنایا جاتا تھا اور کس طرح اس کی حد بندی کی جاتی تھی اور کیا اس کی حدود ہوتی تھیں۔ مورخ کا بیان ہے کہ

مریسیع کی مہم سے واپسی پر مسلم فوج کا گزر نقیع نامی ایک مقام سے ہوا جہاں متعدد تالاب (غدر) اور گھاس و سبزے (کلاء) کے خوب صورت قطعے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی خوب صورتی، وسعت اور سرسبزی سے بہت متاثر ہوئے۔ آپ نے وہاں قیام کیا اور اس علاقے کی آب و ہوا اور پانی کی فراہمی کے بارے میں معلومات و پوچھ تاچھ کی۔ آپ کو بتایا گیا کہ موسم گرما میں پانی کم ہو جاتا ہے کیونکہ تالاب سوکھ جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ایک مشہور صحابی حاطب بن ابی بلتعہ کو وہاں ایک کنواں کھودنے کا حکم دیا جو ظاہر ہے کہ متعدد مسلمانوں کی مدد سے کھودا گیا۔ آپ نے پورے علاقہ نقیع کو محفوظ کرنے (یُحمٰی) کا حکم دیا اور اعلان کیا کہ وہ پورا علاقہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی "حمی" میں شامل کر لیا گیا ہے۔ پھر آپ نے مشہور صحابی اور قبیلہ مزینہ کے ایک سردار حضرت بلال بن حارث مزنی کو اس کا افسر مقرر کیا اور اس کی نگاہ و پرداخت کے لیے واضح ہدایات و احکام دیے۔ حضرت بلال مزنی نے دریافت کیا کہ اس کی حدود حفاظت و نگرانی کیا ہوں گی اور اس کی حفاظت و حد بندی کیونکر کی جائے؟ آپ نے حضرت بلال کو ہدایت کی کہ "ایک بلند آواز شخص سے کہو کہ صبح تڑکے ایک پہاڑی پر چڑھ کر اپنی آواز کی انتہائی قوت کے ساتھ پکارے اور وہ چاروں کونے جہاں تک اس کی آواز سنی جائے اس حمی کی حدیں ہوں گی۔ اور یہ چراگاہ مسلمانوں اور اسلامی ریاست کے جنگی گھوڑوں اور اونٹوں کے لیے محفوظ ہوگی"۔ ایک اہم اور دلچسپ بات اس چراگاہ کے ضمن میں یہ بھی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اپنے جانوروں (صوائم) کی آزادی سے چرنے کی اس چراگاہ میں ممانعت کر دی تھی سوائے کسی مسلمان عورت یا کمزور و غریب مسلمانوں کے جانوروں کے اور ان کو بھی صرف اس صورت میں مستثنیٰ کیا گیا تھا کہ بشرطیکہ ان کے جانور بھٹک کر وہاں پہنچ گئے ہوں۔ روایت کا مزید بیان ہے کہ یہ چراگاہ ریاست کی ملکیت اور اس کے لیے مخصوص تھی اور عہد عثمانی تک اس کی یہی حالت رہی تھی۔(۳۱۱) نقیع کی ریاستی چراگاہ کے ایک اور افسر نگراں کا نام تھا حضرت عبید بن مُرَوِّج مزنی جو غالباً حضرت بلال مزنی کے جانشین یا ساتھی تھے۔(۳۱۲) یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ریاستی مویشیوں کی دیکھ بھال کے لیے مددگاروں کی ایک جماعت ان کارکنوں کے ساتھ رہتی تھی۔ مآخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ قبیلۂ مزینہ کے علاقے میں واقع تھا اور ان کے لوگوں سے اس کی حمایت و حفاظت کرائی جاتی تھی۔

طائف کے لوگوں کے قبول اسلام کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثقیف کے لوگوں کو جو نامۂ تحفظ دیا تھا اس میں یہ حکم بھی تھا کہ "وج" کا علاقہ ریاستی حمی ہوگا۔(۳۱۳) یاقوت حموی کا خیال ہے کہ یہ طائف کا دوسرا نام تھا۔(۳۱۴) لیکن یہ کلی طور پر صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ پورے طائف کو حمی بنانا ناممکن تھا البتہ یہ ممکن ہے کہ وہ طائف کے کسی مضافاتی علاقہ کا نام ہو۔ بہرحال یہ حمی غالباً ریاستی مقاصد کے لیے مخصوص تھی اور اس کی لمبی خاردار جھاڑیوں (اضاح) اور شکار (صید) کو کاٹنا اور مارنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ حکم عدولی کرنے والوں کو کوڑوں کی سزا دی جا سکتی تھی یا ان کے کپڑوں سے ان کو محروم کیا جا سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حمی کا افسر مشہور صحابیِ رسول اور قریش کے ایک سربرآوردہ رکن حضرت سعد بن ابی وقاص زہری کو مقرر کیا تھا۔ حضرت سعد قریشی اور دو سربرآوردہ مزنی صحابہ کی اس عہدہ پر تقرری سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک اہم عہدہ تھا اور اس سے محض "چرواہا" مراد لینا

غلط ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس عہدہ پر فائز ہونا کسی طرح سے "عزبت و فروتر سماجی مقام" کی کسی طور علامت نہیں تھی، جیساکہ ہمارے بعض جدید مورخوں نے سمجھا ہے۔ (۳۱۵)

(۶) عہدِ نبوی میں نظامِ قطائع

اراضی پر مشتمل جائدادوں کی تقسیم ریاستوں اور مملکتوں کی ایک رسمِ قدیم ہے اور حکمراں و محکوم دونوں طبقات اس کو ریاستوں کا ایک قانونی اور دستوری حق تسلیم کرتے آئے ہیں۔ معاشرتی سطح پر حکمرانوں نے زمین کے چھوٹے بڑے ٹکڑے اپنی غریب اور ضرورت مند رعایا کے علاوہ مذہبی طبقات اور اداروں اور اپنے سیاسی وفاداروں کے درمیان ہمیشہ تقسیم کیا ہے۔ حکمرانی کے اس قدیم دستور کے مطابق اسلامی ریاست کے قیام کے بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے سیرت نگاروں اور مورخینِ اسلام کے بیان کے مطابق زمین کے چھوٹے بڑے ٹکڑے اور قطعے صحابہ کرام کے درمیان، خواہ وہ مہاجرین رہے ہوں یا انصار یا بدوی عرب قبائلی مسلمان، بانٹے تھے۔ تاریخِ اسلام میں ان موہوبہ اراضی کے قطعوں کو قطائع (واحد قطیعہ) کہا جاتا ہے جس کے لغوی معنے کاٹے ہوئے حصہ یا قطعہ کے ہوتے ہیں۔ بعد کی اسلامی حکومتوں کے زمانے میں یہ نظام "قطائع" اقطاع کے نام سے زیادہ مشہور ہوا اور مختلف اسلامی ممالک میں عمل پذیر بھی ہوا۔

اسلامی تاریخ میں اراضی پر مشتمل جائدادوں کی تقسیم بڑی دلچسپ اور اہم ہے۔ یہ اب ایک مسلّم حقیقت ہے کہ ہجرت کے معاً بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شہرِ رسول کا واحد حکمراں تسلیم کر لیا گیا تھا جس کو حکمرانی کے تمام اختیارات اور اقتدار کے سارے ذرائع حاصل تھے اور ان میں سے ایک قطائع تقسیم کرنے کا حق و اختیار بھی تھا۔ ابنِ سعد نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف اصحاب کے تراجم و سوانحی خاکوں میں عام طور سے ان قطائع کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کو دربارِ رسالت سے ملے تھے۔

ان بیانات سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ انصارِ مدینہ نے شہر اور اس کے مضافات کی تمام افتادہ زمینوں پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے الفاظ میں اسلامی ریاست کا حقِ ملکیت تسلیم کر لیا تھا۔ بلکہ فیاض انصار نے تو اپنی مملوکہ جائدادیں بھی آپ کے قدموں پر نچھاور کر دی تھیں۔ بہرحال ہجرت کے بعد مہاجرین کی سب سے بڑی ضرورت رہائش کی تھی۔ شروع کے زمانے میں وہ وسیع دل، کشادہ چشم اور سخی انصار کے گھروں میں ان کی بے مثل فیاضی و سخاوت و ضیافت کے مزے لوٹتے رہے۔ لیکن کچھ مدت بعد وہ اپنے مکانوں اور جھونپڑوں میں منتقل ہو گئے۔ یہ مکانات اور جھونپڑے ان قطائع پر بنائے گئے تھے جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصارِ مدینہ کی موہوبہ اراضی یا افتادہ زمینوں سے عطا کیے تھے۔ جن صحابہ کرام کے بارے میں صراحتاً ذکر آتا ہے کہ ان کو رہائشی مکانات بنانے کے لیے قطائعِ نبوی ملے تھے ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں: حضرات عبیدہ بن حارث مُطّلبی اور ان کے دو بھائی طفیل اور حصین مُطّلبی، (۳۱۶) عثمان بن عفان اموی، (۳۱۷) زبیر بن عوام اسدی، (۳۱۸) عبداللہ بن مسعود ہذلی، (۳۱۹) سعد بن ابی وقاص زہری اور ان کے بھائی، (۳۲۰) مقداد بن عمرو قضاعی، (۳۲۱) ابوبکر تیمی، (۳۲۲) طلحہ بن عبداللہ تیمی، (۳۲۳) ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی، (۳۲۴) ارقم بن ابی ارقم مخزومی، (۳۲۵) عمار بن یاسر عنسی مذحجی، (۳۲۶) عمر بن خطاب عدوی، (۳۲۷) عثمان بن مظعون جمحی اور ان کے متعدد بھائی، (۳۲۸) اور بہت سے دوسرے

مہاجرین۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ تمام بے گھر مہاجرین کو آباد کاری کے لیے رہائشی قطائع ملے تھے خواہ ان کے نام ماخذ میں مذکور ہوں یا نہ ہوں۔ کچھ ایسے بھی مکی مسلمان تھے جو اسلام سے قبل مکہ کی سکونت ترک کرکے مدینہ آبسے تھے اور وہاں انھوں نے جائدادیں بنالی تھیں۔ ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص کے ایک بھائی حضرت عتبہ جیسے لوگ شامل تھے۔

بعد میں جوں جوں مسلمان مکہ یا دوسرے علاقے سے آتے گئے ان کو رہائشی مکانات کے لیے قطائع ملتے گئے جیساکہ حضرات خالد بن ولید مخزومی[۳۲۹]، عباس بن عبدالمطلب ہاشمی[۳۳۰] اور نوفل بن حارث ہاشمی[۳۳۱] وغیرہ متعدد مہاجرین کے معاملات سے واضح ہوتا ہے۔ اسلامی ریاست کے سیاسی اثر و نفوذ کے دائرہ میں وسعت و توسیع اور پھر بعد میں علاقائی مقبوضات کے حصول و حق ملکیت ارض کے اصول کے تسلیم کرنے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قطائع تقسیم کرنے کے حق کو شہر مدینہ کی حدود کے باہر بھی تسلیم کرلیا گیا۔ چنانچہ روایت ہے کہ رمضان ۲ھ / مارچ ۶۲۴ء میں حضرت کشد جہنی کے ایک بھانجے کو ینبوع کے علاقے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک وسیع قطیعہ عطا فرمایا تھا۔ یہ واضح رہے کہ یہ قطیعہ اصلاً حضرت کشد جہنی کو ان کی خدمات کے عوض عطا کیا جارہا تھا۔ لیکن بوڑھے چچا نے اپنی درازعمری کے سبب اپنے بھانجے کو دلوا دیا تھا۔[۳۳۲] بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زبیر بن عوام اسدی اور حضرت خالد بن ولید مخزومی کو بالترتیب مدینہ کے یہودی قبیلہ بنو نضیر اور یہود خیبر کی اراضی سے قطائع عطا کئے گئے تھے۔[۳۳۳]

رہائشی مکانات کے لیے قطائع کے علاوہ متعدد قطائع زرعی اور تجارتی مقاصد سے بھی دئے گئے تھے۔ حضرت زبیر بن عوام کا بنو نضیر کی زمین کا قطیعہ جس کا ابھی ذکر ہوا اس قسم اور زمرے میں بھی آتا ہے کیونکہ وہ ایک "بقیع" پر مشتمل تھا۔ "بقیع" اصطلاحی طور پر اس اراضی کو کہتے تھے جس میں کافی درخت ہوتے تھے۔ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قطیعہ کھجوروں اور دوسرے درختوں کے باغ پر بھی مشتمل تھا۔ اسی طرح حضرات ابوبکر اور ربیعہ بن اسلمی کو جو قطائع ملے تھے ان میں کھجور کے درخت بھی تھے۔[۳۳۴] حضرت عبداللہ بن جحش اسدی کے ایک صاحبزادے حضرت محمد بن عبداللہ اسدی کو جو قطیعہ عطا ہوا تھا وہ سوق الدقیق (آٹے کا بازار) میں واقع تھا[۳۳۵] اور غالباً کسی دکان وغیرہ پر مشتمل تھا۔ اور اگر نہیں بھی تھا تو اس کی تجارتی اہمیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر برکات احمد وغیرہ کی دلیل کے مطابق بنو قینقاع کی اراضی اور بازار مسلمان مجاہدین میں تقسیم نہیں ہوا تھا تو کم از کم بنو نضیر کے باغات اور کھیت نیز بنو قریظہ کے مجرمین کی ضبط شدہ اراضی بھی زرعی مقاصد سے مسلمان مہاجرین اور انصار میں تقسیم کی گئی تھی۔ ہم پہلے ہی ان جائدادوں کی تقسیم پر بحث کرچکے ہیں اس لیے اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمام مفتوحہ اراضی جو خیبر یا دوسرے شمالی علاقوں میں حاصل کی گئی تھی عام طور سے ان کے پرانے مالکوں کے قبضہ میں دی گئی تھی، لیکن ان میں سے بھی بعض قطائع دئے گئے تھے۔ عام طور سے یہ قطائع ان زمینوں میں سے عطا کیے گئے تھے جو اسلامی ریاست کے حصہ — خمس — میں پڑی تھیں جیساکہ حضرت ہذیم بن ماکولا جن کا تعلق بنو عبدمناف سے تھا کے معاملہ سے ظاہر ہوتا ہے۔[۳۳۶]

مدنی لوگوں کے علاوہ جن لوگوں کو ابتدائی زمانے میں قطائع ملے تھے ان کا تعلق ان دو بدوی قبیلوں سے تھا جو

شہرِ رسول کے مغرب میں آباد تھے یعنی جہینہ اور مزینہ سے۔[۳۳۷] موخر الذکر کے ایک اہم فرد حضرت بلال بن حارث مزنی کے قطیعہ کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے۔ مآخذ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فُرع کے علاقے میں اَلقَبَلِیَۃ کی کانیں نیز قُدس کے علاقے کی قابلِ کاشت اراضی قطیعہ میں دی تھی۔ ان کا قطیعہ کافی وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا تھا جس میں کھجور کے باغ، پیداواری کھیت اور درخت تھے جن پر شہد کی مکھیوں کے چھتے بھی لگے تھے۔[۳۳۸] یحییٰ بن آدم کا خیال ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ قطیعہ ان کی درخواست پر دیا تھا۔[۳۳۹] دوسرے مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بلامشروط تملیکِ ارض کا قطیعہ نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ یہ شرط بھی عاید کر دی گئی تھی کہ وہ کاشت کرتے رہیں گے۔ دُوسرے مزنی صحابی جن کے قطیعہ کا مآخذ میں صریح ذکر ملتا ہے حضرت معقل بن سنان ہیں۔[۳۴۰] لیکن اس کی نوعیت، مقام اور حدود وغیرہ کے بارے میں تفصیلات کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے اس لیے کچھ مزید کہنا مشکل ہے۔

قبیلہ جہینہ کے لوگوں کو اجتماعی طور سے بڑے قطائع دئے گئے تھے جو وسیع اراضی اور عریض وادیوں پر مشتمل تھے مگر ان پر یہ شرط عائد کر دی گئی تھی کہ اپنی زمینوں کی پیداوار پر خمس (۱/۵) ادا کرتے رہیں گے۔ اس کے بعد ان کو ان کے سبزہ اور پانی وغیرہ سے فائدہ اٹھانے کا پُورا حق حاصل ہوگا۔[۳۴۱] رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک گرامی نامے کے مطابق جہینہ کے ایک خاندان بنو شمخ کو سُفَینہ نامی زمین میں سے وہ اراضی قطیعہ میں دے دی گئی تھی جس کو وہ زیرِ کاشت لے آئیں۔[۳۴۲] اسی طرح ایک جہنی سردار حضرت عوسجہ بن حرملہ کو ذی المروہ کے علاقے میں ایک وسیع قطیعہ عطا کیا گیا تھا اور اس کی حدود کو صاف صاف واضح کر دیا گیا تھا۔[۳۴۳]

دو غفاری صحابہ کرام حضرات نضلہ بن عمرو اور عُمیر کو بالترتیب الصفراء اور وادی القریٰ کے علاقوں میں کچھ زمین بطور قطیعہ دی گئی تھی جہاں وُہ دونوں رہتے بھی تھے،[۳۴۴] جبکہ قبیلہ اسلم کے ایک فرد حضرت حصین بن اوس کو اَلفُرغَین اور ذات اَعشاح کے علاقے میں اراضی کا قطیعہ دیا گیا تھا۔[۳۴۵] غالباً یہ دونوں گاؤں تھے۔ روایت ہے کہ قبیلہ عُقیل بن کعب کے تین افراد کو وادی عقیق کا غالباً کچھ حصہ قطیعہ کے طور پر عطا کیا گیا تھا۔ ان کے قطائع میں چشمے اور کھجور کے باغات تھے۔ ان پر یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ وہ اسلامی ریاست کے ہمیشہ وفادار رہیں گے اور وقت پر نمازیں پڑھیں گے اور باقاعدہ زکوٰۃ ادا کیا کریں گے۔[۳۴۶]

قبیلہ بنو سلیم کے متعدد صحابہ کا ذکر ملتا ہے جن کو اسلامی ریاست کی جانب سے قطائع عطا کئے گئے تھے۔ سب سے اہم اور دلچسپ قطیعہ حضرت ہوذہ بن نبیشہ کا تھا جن کا قبائلی تعلق عُصَیہ کے خاندان سے تھا۔ ان کو اتنی اراضی دی گئی تھی جو الجفر پر محیط تھی۔[۳۴۷] اسی طرح خاندانِ رِعل کے ایک صحابی حضرت سعید بن سفیان کو سوارقیہ کے علاقے میں کھجوروں کا ایک باغ مع ایک محل (قصر) کے عطا ہوا تھا۔[۳۴۸] اسی طرح حضرت سلیمہ بن مالک، وقاص بن قدامہ اور ان کے بھائی عبداللہ، عباس بن مرداس سلمی الاجب، رشید بن عبدالرب اور ہرفی بن عوف کو بھی ایسے قطائع عطا کیے گئے تھے جن کے حدود پوری طرح واضح کر دیئے گئے تھے۔[۳۴۹] غالباً ان تمام حضرات کے قطائع ان کے روایتی علاقوں میں تھے جہاں بنو سلیم آباد تھے۔ لیکن حضرت سراج بن مجاعہ سلمی کو یمن کے ایک علاقے میں قطیعہ عطا ہوا تھا جس کا نام الغورہ تھا۔[۳۵۰] یہ حقیقت بھی دلچسپ ہے کہ حضرت عتبہ بن فرقد سُلمی کو اپنا مکان بنانے کے لیے ذی المروہ کے قریب مکہ میں اراضی عطا کی گئی تھی۔[۳۵۱] اسی طرح حضرات ابو ہوذہ عرض اور عمرو بن عامر بن

ربیعہ کو اپنے رہائشی مکانات بنانے کے لیے بعض مقامات پر اراضی کے قطیعے ملے تھے۔[۳۵۲]

ہوازن کے متعدد اشخاص کو بھی اپنے وطن کے قریبی علاقوں میں قطائع ملے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت ثور بن عروہ قشیری کو وادی عقیق میں دو قطیعے ملے تھے جن کا نام حمّام اور السدّ تھے۔[۳۵۳] حضرت الرفاد بن ربیعہ کو جو قطیعہ ملا تھا اس کی تفصیلات مذکور نہیں ہیں۔[۳۵۴] حضرت ثمن بن عمرو بن حجر کا قطیعہ الرسلین اور الدرکاء نامی علاقوں کے بیچ میں آباد تھا۔[۳۵۵] حضرت حصین بن نضلہ جن کا تعلق بنو اسد/خزیمہ سے تھا۔ کو جو قطیعہ ملا تھا اس کا نام ترمذ تھا۔[۳۵۶] جبکہ حضرت عدا بن خالد بن عمرو بن عکرمہ کو خرار نامی علاقے سے ایک وسیع اراضی بطور قطیعہ ملی تھی۔[۳۵۷]

ذکر آچکا ہے کہ بنو عذرہ کے ایک مسلم حضرت حمزہ بن نعمان جب اپنے لوگوں کے صدقات لے کر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تو غالباً ان کی شاندار خدمات اور اسلامی ریاست سے غیر متزلزل وفاداری کے سبب ان کو وادی القریٰ میں ایک وسیع رقبۂ اراضی پر مشتمل قطیعہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا تھا۔ ان کا قطیعہ اتنا وسیع وطویل تھا کہ جہاں ان کا گھوڑا دوڑ سکتا تھا اور وہ خود تیر اندازی کی مشق کر سکتے تھے۔[۳۵۸] عام طور پر یہ مبالغہ کیا جاتا ہے کہ جہاں تک صحابیِ موصوف کا گھوڑا دوڑ سکا تھا وہاں تک کی زمین ان کو بطور قطیعہ عطا کر دی گئی تھی حالانکہ یہ تعبیر قیاس کے بھی خلاف ہے اور روایت کی منشا کے بھی۔ پھر ان کی تیر اندازی کی مشق کے لیے کافی زمین کا فقرہ بھی اس کی مناسب حد بندی کرتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان کو میلوں زمین عطا کر دی گئی تھی صحیح نہیں۔ البتہ وہ اتنی وسیع وعریض ضرور تھی جہاں وہ تیر اندازی اور گھوڑ سواری کی مشق کر سکیں۔ بنو عذرہ کے ایک اور صحابی حضرت جمیل بن ردم کو زمین کا ایک قطعہ عطا کیا گیا تھا جو رمدہ کہلاتا تھا۔[۳۵۹] قبیلہ جذام کے ایک خاندان بنو جفل بن ربیعہ کو اجتماعی طور سے جو قطیعہ دیا گیا تھا وہ اران کہلاتا تھا۔[۳۶۰] ان روایتوں کو جن کے مطابق قبیلہ لخم کے داری لوگوں کو عہدِ نبوی میں فتوحات سے قبل شام میں قطائع دئے جانے کا ذکر کیا گیا ہے قرونِ وسطیٰ کے مسلمان فقہا اور جدید مورخوں اور مستشرقین نے یکساں طور سے غیر صحیح قرار دے کر مسترد کر دیا ہے اگرچہ دونوں کے دلائل الگ الگ ہیں۔[۳۶۱]

شمالی قبائل میں بنو الحارث کے متعدد لوگوں کو بھی باقاعدہ حد بند قطائع عطا کئے گئے تھے۔ یہ تمام قطائع مشروط تھے کیونکہ ان کے مالکوں سے نماز قائم کرنے کے علاوہ زکوٰۃ ادا کرنے، جہاد میں حصہ لینے، مشرکوں سے قطع تعلق کرنے اور تمام معاملات میں خدا اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و امور کو بلا کسی پس وپیش کے قبول کرنے کی شرائط عاید کی گئی تھیں۔[۳۶۲]

یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ نہد کے خاندان بنو قرہ کو المنظلہ نامی علاقہ بطور حمیٰ عطا کیا گیا تھا تاکہ وہ وہاں اپنے مویشی چرا سکیں۔[۳۶۳] اسی طرح بنو سمعان کے ایک شخص حضرت ہلال کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثعلبہ نامی وادی بطور چراگاہ دی تھی۔[۳۶۴] دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ عطیہ صحابی موصوف کی درخواست پر دیا گیا تھا، جبکہ حضرت قرہ بن ربیعہ کو حضر موت کے علاقے میں ایک قطیعہ ملا تھا۔[۳۶۵]

مآخذ میں یمامہ کے بعض لوگوں کے قطائع دئے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت مجاعہ بن مرارہ کو الغورہ، الغربہ اور الحبل نامی تین اراضی عطا کی گئی تھیں۔[۳۶۶] اسد الغابہ میں حضرت حصین بن مشمت تمیمی کو ایک قطیعہ عطا کرنے کا دلچسپ

بیان ملتا ہے۔ اس کے مطابق ان کو ایک وسیع رقبہ عطا گیا تھا جس میں متعدد چشمے (میاہ) تھے۔ ان کے علاوہ گھاس کے تختے اور درخت بھی کافی تعداد میں تھے۔ ان پر یہ شرط بھی عائد کی گئی تھی کہ وہ نہ تو اس کے پانی سے کسی کو محروم کریں گے اور نہ ہی اس کی گھاس اور درختوں کو کاٹیں یا ضائع کریں گے۔[٣٦٧] حضرت مشمرج بن خالد سعدی کو جو قبیلہ عبد القیس کے وفد میں آئے تھے ان کے وطن کے میدانی علاقوں میں واقع ایک چشمہ بطور قطیعہ عطا گیا تھا۔[٣٦٨] غالباً اس چشمہ کے ساتھ کچھ اراضی بھی ملی تھی۔ دہنا کے علاقے میں حضرت قتادہ بن اعور تمیمی کو ایک گاؤں بطور قطیعہ ملا تھا جس کا نام شبکہ تھا۔[٣٦٩] اصابہ کے مطابق مشہور صحابیِ رسول حضرت فرات بن حیان عجلی کو یمامہ کے علاقے میں ایک اراضی پر مشتمل جائداد بطور قطیعہ عطا ہوئی تھی اور دل چسپ بات یہ ہے کہ اس کی سالانہ آمدنی بیالیس ہزار درہم تھی۔[٣٧٠] غالباً یہ واحد قطیعہ ہے جس کی بالکل صحیح مالیت کا اندازہ ملتا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ نہ صرف منفرد بھی ہے بلکہ بے انتہا اہم تاریخی شہادت بھی۔

مذکورہ بالا قطائع کے علاوہ جو غالباً سب کے سب قابلِ کاشت اراضی پر مشتمل تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ مردہ زمینوں (ارض موات) بھی مختلف لوگوں کو بطور قطائع عطا فرمائی تھیں تاکہ ان پر کاشت کی جائے اور زراعت کو اس طرح ترقی دی جائے۔ اصطلاح میں ایسی زمین کو ارضِ احیاء کہا جاتا ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ مُردہ اور بے کاشت زمینوں کو زراعت کے قابل بنایا جائے۔ اس کا واضح سبب یہ تھا کہ زراعت کو ترقی دی جائے اور زمین کی پیداوار کو بڑھایا جائے جو عرب میں کافی کم تھی مگر حیاتِ انسانی کے لیے انتہائی ضروری اور مفید تھی۔ بیشہ کے باہلی باشندوں کو ایسی ہی زمین عطا کی گئی تھی۔[٣٧١] دوسری زمین یا قطیعہ جو اس زمرہ میں آتا ہے پہلی کی مانند ذکر کی جا چکی ہے یعنی وہ سفینہ نامی زمین تھی جو جہینہ کے خاندان بنو شمخ کو عطا کی گئی تھی۔ اسی طرح ذکر آچکا ہے کہ حضرت بلال مزنی کو بھی قطیعہ اسی شرط پر دیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں صحابیِ موصوف کے قطیعہ کا بیشتر حصہ واپس لے لیا تھا کیونکہ وہ اس پورے علاقہ یا رقبے کو زیرِ کاشت رکھنے میں ناکام رہے تھے۔[٣٧٢] یہی معاملہ جہینہ یا مزینہ کے لوگوں کے قطائع کے ساتھ ہوا تھا جنھوں نے اپنی زمینوں کو مدتوں بلا کاشت کیے بیکار چھوڑے رکھا تھا۔[٣٧٣] اس کا مطلب یہ ہوا کہ بلا کاشت اراضی عام طور سے اور قابلِ کاشت زمینیں خاص طور سے اس وقت قطائع پانے والوں کے قبضہ و تصرف میں رہ سکتی تھیں جب تک وہ ان پر کاشت کرتے رہیں۔ کافی مدت تک ان کو بلا کاشت چھوڑنا دراصل ان پر اپنا حقِ ملکیت یا حقِ تصرف کھو دینے کے مترادف تھا۔

(ب) طُعمہ / طُعَم

قطائع کے علاوہ جن میں اراضی پر ملکیت حاصل ہو جاتی تھی اور اس کے نتیجے میں صاحبانِ قطائع اس کی پیداوار وغیرہ سے مستفید ہو سکتے تھے عطیہ کی ایک اور قسم کا بھی مآخذ میں ذکر ملتا ہے اس کو طُعمہ کہا جاتا ہے اس میں صاحبِ طعمہ کو زمین کی پیداوار کے ایک حصہ سے مستفید ہونے کا حق مستقل یا عارضی طور پر مل جاتا تھا مگر ملکیت کے حقوق نہیں ملتے تھے۔ ایک لحاظ سے یہ بھی اقطاع یا قطائع کی ایک قسم تھی۔ اس قسم کے عطیہ کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ طُعمہ اور عطاءٌ ہیں اور عطاءٌ

کرنے کے فعل کے لیے لفظ اُطعِمَ (کھلایا) آتا ہے۔[۳۷۴] طُعمَہ کی اولین عطیات کا تعلق غالباً خیبر اور اس کی نواحی یہودی بستیوں کی زمینوں سے ہے جن سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد اصحاب کو طُعَم (جمع طُعمہ) عطا فرمائے تھے۔ واقدی کے مطابق یہ عطایا حسبِ ذیل تھے:

نمبر شمار	صاحبِ طعمہ	کھجوریں		جو (شعیر)
۱	نو ازواج مطہرات میں سے ہر ایک	۸۰ وسق	+	۲۰ وسق
		کل ۷۲۰ وسق	+	۱۸۰ وسق
۲	حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمی	۲۰۰ وسق		۰
۳	حضرات علیؓ و فاطمہ ہاشمی	۲۱۵ وسق	+	۸۵ وسق [۳۷۵]
۴	حضرت اسامہ بن زید[۳۷۶]	۱۱۰ وسق	+	۴۰ وسق
۵	حضرت ام رمثہ بنت عمر بن ہاشم بن عبدالمطلب	۰		۵ وسق
۶	حضرت مقداد بن عمرو	۰		۱۵ وسق
	میزان	۱۳۲۵ وسق	+	۳۲۵ وسق

واقدی کے بیان کے مطابق موخر الذکر صحابی نے اپنا حصہ خلافت راشدہ میں کسی وقت ایک لاکھ درہم میں بیچ دیا تھا۔[۳۷۷] روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابی موصوف کے وارثوں نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان کے ہاتھ ان کی خلافت کے زمانے میں یہ سودا کیا تھا۔ یہاں یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ خلافتِ راشدہ و معاویہ میں قیمتوں میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا اور ان پر عہدِ نبوی کی قیمتوں کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ اس بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صحابی موصوف کے حصہ کی اصل مالیت کیا تھی۔

واقدی کی ایک اور مفصل روایت کے مطابق حسبِ ذیل حضرات کو یہ حصے ملے تھے:

نمبر شمار	صاحبانِ طُعَم	کھجور / جو وغیرہ
۱	حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ تیمی	۱۰۰ وسق
۲	حضرت عقیل بن ابی طالب ہاشمی	۱۴۰ وسق
۳	حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمی	۵۰ وسق
۴	حضرت ربیعہ بن حارث ہاشمی	۱۰۰ وسق
۵	حضرت ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب ہاشمی	۱۰۰ وسق
۶	حضرت صلت بن مخرمہ بن مطلب مطلبی	۳۰ وسق

۷	حضرت ابو نبقہ	۵۰ وسق
۸	حضرت رکانہ بن عبد یزید	۵۰ وسق
۹	حضرت قاسم بن مخزمہ مطلبی	۵۰ وسق
۱۰	حضرت مسطح بن اثاثہ بن عباد اور ان کی بہن ہند	۳۰ وسق
۱۱	حضرت صفیہ بنت عبد المطلب ہاشمی	۴۰ وسق
۱۲	حضرت بجینہ بنت حارث بن مطلب	۳۰ وسق
۱۳	حضرت ضُباعہ بنت زبیر بن مطلب	۴۰ وسق
۱۴	حضرت حصین ، خدیجہ اور ہند اولاد حضرت عبیدہ بن حارث	۱۰۰ وسق
۱۵	حضرت ام حکیم بنت زبیر بن عبد المطلب ہاشمی	۳۰ وسق
۱۶	حضرت ام ہانی بنت ابی طالب ہاشمی	۴۰ وسق
۱۷	حضرت جمانہ بنت ابی طالب ہاشمی	۳۰ وسق
۱۸	حضرت ام طالب بنت ابی طالب ہاشمی	۴۰ وسق
۱۹	حضرت قیس بن مخرمہ بن مطلب	۵۰ وسق
۲۰	حضرت ابو ارقم	۵۰ وسق
۲۱	حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر صدیق	۴۰ وسق
۲۲	حضرت ابو بسرہ	۴۰ وسق
۲۳	حضرت ابن ابی حبیش	۳۰ وسق
۲۴	حضرت عبداللہ بن وہب اور ان کے دو فرزند [۳۷۸]	۵۰ وسق
۲۵	حضرت نمیلہ کلبی	۵۰ وسق
۲۶	حضرت ملکان بن عبدہ	۳۰ وسق
۲۷	حضرت ام حبیبہ بنت جحش	۳۰ وسق
۲۸	حضرت محیصہ بن مسعود	۳۰ وسق
۲۹	رہاویون (قبیلہ رُہاء کے لوگ)	۱۰۰ وسق
۳۰	داریون (لخم کے خاندان کے لوگ جو دس تھے) [۳۷۹]	۱۰۰ وسق
۳۱	اشعریون (اشعر کے لوگ)	۱۰۰ وسق
	میزان	۱۷۴۰ وسق

ابنِ اسحاق کے بیان میں طعمہ پانے والوں کے نام اور ان کے حصے بھی کچھ مختلف ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق کل عطایا کا میزان ۲،۸۳۰ وسق کھجور اور ۳۲۵ وسق گیہوں (حنطہ) ہے، جبکہ واقدی کے یہاں وُہ ۲۹۹۵ وسق کھجور ہے البتہ گیہوں کا میزان دونوں کا ایک ہے۔ یہاں ایک تبصرہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور وُہ یہ کہ طعمہ پانے والوں میں سے کچھ حضرات اور طبقات نے غزوۂ خیبر کے فوراً بعد ہی اپنا حصہ نہیں پایا تھا بلکہ اسلام لانے کے بعد جب وُہ ہجرت کرکے مدینہ پہنچے تھے تو ان کو عطایائے نبوی حاصل ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر افراد میں حضرت عقیل بن ابی طالب ہاشمی فتح مکہ کے مسلمان تھے اور اس کے بعد ہی ان کو طعمہ ملا تھا۔ طبقات میں اشعری تو خیبر کے زمانے میں ہی مدینہ پہنچ گئے تھے البتہ داری اور رہاوی حضرات تبوک کے زمانے میں یا اس کے بھی بعد آئے تھے۔ یہ لوگ جیسا کہ اُوپر ذکر آچکا ہے وفد کی صورت میں خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تھے اور بعد میں مدینہ اور اس کے مضافات میں ہی بس گئے تھے۔

دوسرے مسلمانوں میں جن کو اسلامی ریاست کے کسی اور علاقے کی زمین کی پیداوار سے طُعمہ عطا ہُوا تھا حضرت قیس الهدانی نامی ایک جنوبی عرب کے مسلم کا ذکر مل سکا ہے جن کو ایک روایت کے مطابق تین سو فَرَق کا طُعمہ عطا ہوا۔ اس میں خیوان کی دو سو وسق زبیب (سوکھی کھجور) اور ذرہ شطران (شطران کا باجرا) اور سو فَرَق عمران الجوف کے علاقے کا گیہوں (بُرّ) شامل تھا لیکن دوسری روایت کے مطابق ان کا طعمہ یا قطیعہ نصر کے علاقہ کے دو سو صاع باجرے (ذرہ نصر) اور دو سو صاع زبیب خیوان (خیوان کی سُوکھی کھجوروں) پر مشتمل تھا۔[۳۸۰] اس اختلاف روایت کو حل کرنا ناممکن نظر آتا ہے کیونکہ قرائن وشواہد کچھ بھی نہیں ہیں۔ محض قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دُوسری روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ پہلی روایت کے مطابق طعمہ مقدار کے اعتبار سے بہت زیادہ تھا۔

لیکن سب سے دلچسپ اور ایک لحاظ سے اہم تر وُہ طعمہ تھا جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے وادی القریٰ کے ایک یہودی خاندان بنو عُریض کو عطا کیا تھا۔ یہ دس وسق گیہوں (قمح)، دس وسق جَو (شعیر) فی فصل (حصد) اور پچاس وسق کھجور (تمر) فی سال مقرر ہوا تھا۔[۳۸۱] واقدی کی ایک روایت ہے کہ جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک جاتے ہوئے وادی القریٰ میں خیمہ زن ہُوئے اور عُریض یہودی کے فرزندوں نے آپ کی خدمتِ گرامی میں ہَریس (ایک میٹھا پکوان، جو میدے، مکھن اور شکر سے تیار کیا جاتا ہے) پیش کیا اور آپ نے اس کو نوش فرمایا۔ اس مہمان نوازی اور اخلاق کے عوض رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چالیس وسق کا طُعمہ عطا فرمایا (اطعمهم)۔[۳۸۲] یہ عطیہ نبوی مستقل (جاریہ) تھا جو عباسیوں کے عہد تک جاری رہا۔[۳۸۳]

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ طُعمہ تمام معاملات میں ایک مستقل اور دوامی عطیہ تھا بالکل اُسی طرح جس طرح قطیعہ ہوتا تھا۔ قطیعہ بعد میں اقطاع تملیک کہا جانے لگا کیونکہ اس میں صاحبِ قطیعہ کو مالکانہ حقوق بھی حاصل ہوتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قطیعہ اور طُعمہ دونوں عملی لحاظ سے مِلک (مملوکہ جائداد / حق) سمجھے جاتے تھے۔ اس کو منتقل کیا جاسکتا تھا، فروخت کیا جاسکتا تھا اور ترکہ میں دیا جاسکتا تھا جیسا کہ متعدد مثالوں سے ثابت ہوتا ہے۔ چند مثالیں کافی ہوں گی۔ حضرت مقداد

بن عمرو کے ورثہ کے اپنے جد امجد کے طُعمہ کو حضرت معاویہ کے ہاتھوں فروخت کیے جانے کا ذکر آچکا ہے۔ پھر واقدی کا واضح بیان ہے کہ طُعمہ پانے والوں (المُطْعَمِین) میں سے جو کوئی عہدِ نبوی اور خلافتِ صدیقی میں وفات پا جاتا تھا اس کا طعمہ اس کے ورثہ پاتے تھے[۳۰۴] لیکن بعد میں خلیفہ اول نے اسلامی ریاست کے حق میں تمام طُعَم سوائے ازواجِ مطہرات کے واپس لے لیے تھے اور ان کی منتقلی، وراثت اور فروخت ممنوع قرار دے دی تھی۔[۳۰۵] لیکن یہ غالباً غیر مستقل طُعَم کے بارے میں پالیسی تھی بہرحال خلافتِ راشدہ کی پالیسی سے سرِ دست ہمیں بحث نہیں۔

باب ششم

عہدِ نبویؐ کا مذہبی نظام

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد میمون و مبارک الفاظِ نبویؐ میں خیر القرون (بہترین زمانہ) تھا جب دین و ریاست، مذہب و حکومت اور اسلام و مملکت دو ایسے لازم و ملزوم توام تھے جن کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک پیغمبر و مذہبی مصلح کی صفات اور ایک سربراہ مملکت و ریاست کے اختیارات کا وہ پاکیزہ اجتماع تھا جس کی مثال انسانی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام بنیادی طور سے مذہب اور حکومت میں کوئی خط تفریق یا حدِ فاصل نہیں کھینچتا اور نہ ہی ان دونوں کو ایک دوسرے کا متضاد و مخالف قرار دیتا ہے جیسا کہ جدید زمانے میں کلیسا اور حکومت کے درمیان قرون وسطیٰ میں ابھرنے والی چپقلش اور تصادم کے نتیجہ میں سیاسی نظریہ ابھرا ہے اور مختلف سیاسی اور اقتصادی وجوہ سے جس کی عام طور سے حمایت و تائید کی جاتی ہے۔ اسلام و اسلامی مفکرین کا روزِ اول سے دعویٰ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کو خواہ وہ سیاسی ہو یا سماجی یا اقتصادی، محیط و حاوی ہے اور اس کی گرفت سے انسان کا کوئی کام باہر نہیں ہے۔ یہی تصور و نظریہ تھا جس کے تحت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا وہ مذہب اسلام کا ایک حصہ بن گیا۔ آپؐ کے ارشادات (قول) اور اعمال ہی نہیں بلکہ آپؐ کی موجودگی میں کوئی بات کہی گئی یا کوئی عمل کیا گیا اور آپ نے اس پر سکوت فرمایا (جس کو اصطلاح میں "تقریر" کہتے ہیں) تو یہ خاموش رضامندی بھی "سنّت نبویؐ" بن کر اسلام کا حصہ بن گئی۔ چنانچہ فقہاء اور محدثین کے نزدیک قرآن حکیم اور سنّتِ نبویؐ اسلام کی دو بنیادی اور الہامی یا ربانی اساس ہیں۔ اور عہد نبویؐ میں انھیں دونوں پر اسلام کی پوری عمارت قائم و استوار ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے حکومتِ نبویؐ کی خدمت دراصل اسلام کی خدمت تھی۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے جیسا کہ جدید زمانے میں بعض افراد اور جماعتوں نے سمجھ لیا ہے کہ اسلام کا بنیادی مقصد سیاسی اقتدار حاصل کرنا اور پھر حکومت قائم کرنا ہے اور اسلام بغیر حکومت کے پوری طرح سے نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل حکومت کا قیام اور سیاسی اقتدار کا حصول اسلام کے استحکام کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ عامل و سبب۔ یہ عہد نبویؐ میں اسلام اور اسلامی ریاست کے ارتقاء و استحکام کی تاریخ سے پوری طرح واضح ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصد اور اولین و آخرین عشق اسلام کو قائم و مستحکم کرنا تھا اور اس کے قیام و استحکام کے نتیجے میں حکومت و ریاست از خود قائم و دائم ہوتی ہے۔ مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کا قیام کسی سوچی سمجھی سیاسی پالیسی کا زائیدہ نہیں تھا بلکہ ہجرت کے بعد پیش آنے والے واقعات و حقائق کا ایک فطری نتیجہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار اور کارناموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کی شخصیت بنیادی طور سے ایک پیغمبر، مصلح اور فرستادۂ ربانی کی نظر آتی ہے اور باقی تمام دوسری حیثیتیں یا پہلو اس "نبوی شخصیت"

کے پرتو اور مظہر معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کے تمام کام خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی، اقتصادی ہوں یا فوجی، صرف مذہبی اسباب و عوامل کے نتیجہ میں ظہور میں آئے تھے۔ گویا کہ آپ کی اصل طاقت اور قوت مذہبی تھی جو دوسرے تمام کارناموں کو متعین و منظم کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ پھر آپ اپنے بنیادی کام یعنی تبلیغِ اسلام اور تعلیم مذہب ربانی کے فرض کو کیونکر چھوڑ سکتے یا اس کی جانب سے ذرا بھی صرف نظر کر سکتے تھے۔ سیرت نبویؐ کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشاعتِ اسلام اور تبلیغِ دین کا آپ کو اتنا خیال و فکر تھا کہ ہر لمحہ و ہر آن اسی کی دھن میں رہتے تھے، یہاں تک کہ جب آپ میدانِ جنگ میں دشمنوں کے سامنے صف آرا اور تلواروں کی چھاؤں میں معرکہ آرا تھے۔ یا اسلامی ریاست کی تعمیر و ترقی کے کام میں تن من سے مصروف تھے یا امت اسلامی کی تشکیل و تنظیم کے عمل میں ہمہ تن مصروف تھے غرض کہ کسی حال میں آپ نے تبلیغ و تعلیم سے صرف نظر نہیں کیا۔ صرف یہی نہیں کہ آپ نے ان لوگوں کو دعوت دین دی جو آپ کے رابطہ و تعلق میں ارادتاً یا غیر ارادی طور سے آگئے، بلکہ آپ نے اشاعتِ دین اور دعوتِ حق کی خاطر تبلیغی جماعتیں منظم کیں اور ان کو مختلف علاقوں میں بھیجا۔ یہ جماعتیں کبھی دوسروں کی درخواست و مطالبہ پر بھیجی گئیں اور کبھی آپ نے از خود ان کی ضرورت محسوس کی۔ تاریخ شاہد ہے کہ بسا اوقات ان تبلیغی کاوشوں کا زمانہ سراسر پُر از خطر تھا اور کبھی کبھی تو مبلغین کے سر سے جوئے خون گذر گئی جیسے کہ واقعاتِ بئر معونہ اور رجیع کے بارے میں سب کو علم ہے۔ ان کے علاوہ متعدد تبلیغی جماعتیں ایسی ہیں جن کو بدقسمتی سے جدید و قدیم مورخین نے "فوجی مہم" بنا دیا ہے۔ پھر خالص فوجی مہموں کے دوران بھی آپ نے اور آپ کے صحابہ نے دعوتِ دین کے فرض کو نہیں بھلایا۔ گذشتہ اوراق میں متعدد ایسے واقعاتِ قبول اسلام کا ذکر آچکا ہے جو مہموں کے دوران ہی پیش آئے تھے۔ جنوبی عرب کو بھیجی گئی تقریباً تمام مہمیں سراپا مذہبی اور دعوتی مشن تھے جن کا اولین مقصد تبلیغ دینِ حق تھا۔

ان تبلیغی کوششوں اور کاوشوں کے علاوہ تمام صحابہ کرام خاص کر اور دوسرے معاصر مسلمان عام طور سے اپنی اپنی جگہ مبلغِ دین تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے افسروں اور حکومتی کارکنوں کے دل و دماغ میں یہ بات اچھی طرح بٹھا دی تھی کہ اسلام یا دین سب سے اہم و افضل چیز ہے جس کی لوگوں کو ہر آن دعوت دینی ہے چنانچہ سالاران و سپاہ فوج ہوں یا شہری نظم و نسق کے افسر، یا صدقات کے وصول کرنے والے عاملین ہوں سب کا اولین فرض تھا کہ وہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت اور مسلمانوں کو دین کی تعلیم دیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حکومتی کارکنوں کو اس کی صرف زبانی ہدایت ہی نہیں فرمائی بلکہ مسلسل اپنے خطوط و فرامین میں بھی اس کی طرف توجہ دلاتے رہے چنانچہ متعدد افسرانِ حکومتِ نبویؐ جیسے حضرات معاذ بن جبلؓ، عمرو بن حزمؓ، علی بن ابی طالبؓ، خالد بن ولیدؓ اور بہت سے دوسروں کے نام آپ کے گرامی ناموں میں اس کے ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہیں۔ ان کو واضح اور غیر مبہم الفاظ میں یہ بتا دیا گیا تھا کہ ان کو لوگوں پہ حاکم بنا کر نہیں بنا کر بھیجا جا رہا ہے بلکہ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ سیاست کے دروازے سے لوگوں کو دین میں داخل کریں۔ یہاں سیاست دین کی خادم تھی نہ کہ دین کی حاکم۔ اور تاریخِ اسلامی شاہد ہے کہ حکومت نبویؐ کے تمام افسروں، سالاروں اور عاملوں نے تبلیغ دین اور تعلیم اسلام کا فریضہ حسنِ انداز سے انجام دیا تھا اور جس نے اس میں نادانستگی یا دانستگی میں ذرا بھی کوتاہی کی تھی اس کو سخت سرزنش کی گئی تھی۔ بہر حال اس لحاظ سے تمام مرکزی اور مقامی منتظمین اور دوسرے تمام سیاسی، انتظامی اور فوجی افسران و کارکنانِ حکومت کو بھی مبلغین و معلمینِ اسلام میں

شمار کرنا چاہیے اور تاریخی واقعات اس کے شاہد ہیں کہ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف خطوں کے لوگ چاہے وہ دور کے باسی ہوں یا گھر کے پچھواڑے آباد ہوں انھیں افسران و منتظمین حکومت کی تبلیغی کوششوں کے سبب دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے اور انھیں کی تعلیمی کاوشوں کے نتیجے میں پکے اور راسخ العقیدہ مسلمان بنے تھے۔

دوسرا باب قبائلِ عرب کے اسلام قبول کرنے کے نہج، رفتار اور انداز سے بحث کرتا ہے اور اس کے ضمن میں بالواسطہ بھی مبلغین اور معلمین پر بھی بحث آچکی ہے جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رض کی تبلیغی اور تعلیمی سرگرمیوں پر روشنی پڑتی ہے تاہم یہاں ایک مختلف زاویہ سے اس موضوع پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ بعض جدید مورخین نے دانستہ یا نادانستہ طور سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنی دور میں تبلیغی کارناموں کو گھٹا کر بیان کیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ آپ کی سیرت اور کردار کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کی ہیں۔

۱۔ دعوت اور دُعاۃ

مکی اور مدنی دونوں عہد میں تبلیغِ دین کے دو منبع تھے۔ ایک تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ انور تھی اور دوسرے صحابہ کرام کی مقدس ہستیاں تھیں۔ ان دونوں سطحوں پر دعوت کا کام ہوتا تھا۔ ایک طرح سے ہم ان کو مرکزی اور علاقائی تبلیغ دعوت کی سطحیں کہہ سکتے ہیں۔ جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات کا تعلق تھا آپ ہر لمحہ، ہر مقام اور ہر موقع پر دعوت کا کام کرتے رہتے تھے۔ جب بھی اور جہاں بھی لوگوں سے رابطہ میں آتے سب سے پہلے ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں جیسا کہ ذکر آچکا ہے ابھی تک کچھ افراد و طبقات دائرہ اسلام سے خارج تھے اور اپنے پرانے ادیان شرک یہودیت یا عیسائیت پر قائم تھے۔ آپ نے پہلے موقعہ پر ہی ان کو اسلام کی دعوت دی اور آپ کی دعوت پر کچھ یہودی اور غیر مسلم عرب جلد ہی اسلام لے آئے اور کچھ نے دو چار برس کے بعد دعوت قبول کی۔ دراصل مدنی لوگوں کی غالب اکثریت کے قبولِ اسلام کا شرف حضرت مصعب بن عمیر رض کو جاتا ہے جن کو ہجرت سے کچھ قبل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مبلغ، معلم اور مقری (استاد) بنا کر مدینہ بھیجا تھا۔[1] ان کے دعوتی کام میں حضرات اسعد بن زرارہ اور ان کے دوسرے مدنی ساتھیوں نے بھرپور مدد کی تھی۔[2]

بہرحال اس دوران رسول اکرم ص نے اپنی ذاتی حیثیت اور مرکزی سطح پر دعوتی کام برابر جاری رکھا اور ہر اس فرد بشر کو اسلام کی دعوت دی جو آپ ص کے رابطہ میں آیا۔ چنانچہ مہم نخلہ کے نتیجے میں جب ایک مکی قیدی الحکم بن کیسان مدینہ لائے گئے تو آپ ص نے ان کو اسلام کی دعوت دی جو انہوں نے بڑی دلچسپی سے قبول کر لی۔[3] اسی طرح بدر کے اسیروں کو بھی آپ ص نے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی اور ان میں سے کئی نے اسے قبول بھی کر لیا تھا جس کے نتیجے میں ان کو بلا فدیہ رہائی ملی تھی۔[4]

یہ معمول نبوی ص بلکہ آپ ص کی سرکاری حکمت عملی بھی تھی کہ آپ ص اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے سامنے جنگ شروع ہونے سے قبل میدانِ جنگ میں یا مہموں کے دوران حملہ سے قبل اسلام کی دعوت سب سے پہلے دیتے تھے۔ اور اسی طرح

سے قیدیوں اور اسیروں کو بھی دعوت دیا کرتے تھے۔[٥]

آپ نے ان دشمنوں اور مخالفوں کو بھی ہمیشہ دعوتِ حق پہلے دی جن کا مقصدِ حیات ہی اسلام اور اسلامی ریاست کی مخالفت کرنا تھا حتیٰ کہ مختلف سیاسی اور مذہبی جرائم کے مرتکب مجرمین اور مخالفین کا اسلام بھی آپ نے قبول کر لیا جیسا کہ فتح مکہ کے بعد اس شہرِ معدودہ کے عظیم قریشی سرداروں کے قبولِ اسلام کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔[٦] اس کے بعد جب عام الوفود کے دوران تمام قبائل عرب کے نمائندے مدینہ پہونچ رہے تھے آپ نے ان کے سامنے سب سے پہلے اسلام ہی پیش کیا تھا۔[٧] حیاتِ ارضی کے آخری دنوں میں جب آپ اپنے آخری حج پر گئے، تو آپ کو سب سے زیادہ فکر کتاب و سنہ کے ساتھ وابستگی (تمسک) کے ساتھ تبلیغ اسلام ہی کی تھی۔[٨] اور بالکل آخری لمحات میں اسلام ہی کا نام لب مبارک پر تھا۔

ہمارے مستند مؤرخین میں سے ایک سے زیادہ کا بیان ہے کہ آپ اپنے تمام سالارانِ سرایا اور امرأ فوج کو ہدایت کرتے تھے کہ وہ لوگوں کو سب سے پہلے اسلام کی دعوت دیں اور اگر وہ اسے قبول نہ کریں تو ان سے صلح و دوستی کا معاہدہ کریں اور ان کو اسلامی ریاست کا ذمی بنائیں۔ تلوار تو فتنہ و فساد کچلنے کا آخری حربہ تھا ہدایت نبوی کے مطابق مسلم فوجی مہمیں ہمیشہ رات کو سفر کرتی اور صبح سویرے منزل پر پہونچتی تھیں تاکہ فجر کی اذان سے معلوم ہو جائے کہ اسلام اس مقام تک پہونچ چکا ہے یا نہیں۔[٩] یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ اسلام ابھی تک وہاں سعادت اخروی کے برگ و بار نہیں لایا ہے مسلمان امیر و سالار لازمی طور سے اس علاقے کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیا کرتا تھا اور اس وقت تلوار سے کام نہیں لیا جاتا تھا جب تک زبان کے ذریعہ قبولِ اسلام یا قبول صلح کا اقرار نہ ہو جاتا۔[١٠] اسی حقیقت کا تذکرہ بیان حضرات عبدالرحمٰن بن عوف، خالد بن ولید، علی ابن ابی طالب اور اسامہ بن زید وغیرہ کی مہموں کے ضمن میں ملتا ہے اور دلچسپ بات ہے کہ اس حکمت عملی کے نتیجے میں متعدد قبائل عرب پورے کے پورے اور بعض کے متعدد لوگ یا اکثریت نے اسلام قبول کر لیا تھا۔[١١]

مکی دورِ حیاتِ نبوی کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ آپ نے تبلیغی جماعتیں اور وفود نہیں بھیجے تھے مگر یہ تاثر غلط ہے متعدد صحابہ کرام کی کاوشوں کا دائرۂ کار محض مکہ کی حدود تک محدود نہیں تھا۔ پھر حدودِ حرم میں بھی صحابہ کرام کی تبلیغی کوششوں کو کسی طرح تبلیغی اور مذہبی جماعتوں سے کم نہیں سمجھا جا سکتا۔ جہاں تک بیرونِ حرم مکہ کی تبلیغی جماعتوں کا تعلق ہے تو وہ حضرات مُعتب ثقفی، ابو موسیٰ اشعری، طفیل بن عمرو دوسی، ابو ذر غفاری وغیرہ متعدد صحابہ کرامؓ کی مذہبی سرگرمیوں سے ظاہر ہوتا ہے۔[١٢]

مختلف قبائل عرب کے نمائندہ مسلمانوں کو اپنے اپنے علاقے اور قبیلے میں واپس بھیجنے کی حکمت یہی تھی کہ وہ وہاں جا کر دعوت کا کام کریں گے۔ اور یہی تبلیغی جماعتیں تھیں اور انھیں مبلغین کی کوششیں تھیں جنھوں نے چار دانگِ عرب میں اسلام کے پودے کی آبیاری کی تھی۔ مکی دورِ حیات کی مانند مدنی دورِ حیات میں بھی رسول اکرمؐ نے متعدد تبلیغی جماعتیں منظم کی تھیں اور ان جماعتوں یا انفرادی مبلغوں کو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں بلکہ اس کے باہر دوسرے ملکوں میں بھی بھیجا تھا۔ توقیتی اعتبار سے ایسی پہلی جماعت جس کا باقاعدہ واضح ذکر ماخذ میں آتا ہے صفر ۴ھ / جولائی ۶۲۵ء میں منظم کی گئی تھی۔

"ابو براء عامر بن مالک کلابی مدینہ میں خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوا اور آپ سے درخواست کی کہ آپ اپنے صحابہ میں سے کچھ لوگوں کو بھیج دیں تاکہ وہ نجد کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں۔"

چنانچہ آپؐ نے حضرت منذر بن عمرو ساعدی کے ساتھ چالیس مبلغین پر مشتمل ایک جماعت بھیجی جو آپؐ کے بہترین مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ لیکن ان سب کو بئر معونہ کے مقام پر بے رحمی سے قتل کر ڈالا گیا۔[۱۳] اسی قسم کے ایک اور المیہ میں مسلم مبلغین کی ایک اور جماعت کو رجیع کے مقام پر اسی زمانے میں شہید کیا گیا تھا۔ موخر الذکر جماعت عضل اور قارہ کے لوگوں کی درخواست پر بھیجی گئی تھی۔[۱۴] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دو المناک واقعات کے بعد رسول اکرمؐ نے اپنے صحابہؓ کو باہر بھیجنا پسند نہیں کیا تھا تا آنکہ آپ کو ان کی حفاظت کا مکمل یقین نہ ہو جاتا۔ دوسری مذہبی جماعتوں کے عدم ذکر اور واقعات بئر معونہ اور رجیع کے مفصل ذکر کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد تبلیغی جماعتیں نہیں بھیجی تھیں یا صرف یہی دو تبلیغی جماعتیں بھیجی گئی تھیں جو ناکام رہیں۔ متعدد مذہبی مہمیں اور تبلیغی جماعتیں اس کے بعد بھی گئی تھیں ان میں بیشتر سرایا اور غزوات شامل تھے۔ ۶ھ کے اوائل میں آپ نے متعدد غیر ملکی حکمرانوں جیسے شاہان روم، ایران، مصر، عراق، شام اور حبشہ وغیرہ کے پاس مبلغین بھیجے تھے اور پھر متعدد مختلف اوقات میں جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں اور مملکتوں میں بھی تبلیغی مہمیں بھیجی تھیں۔ تفصیل کے لیے باب اول و دوم خاص کر اور باب چہارم میں سفیران نبویؐ پر بحث کے مطالعہ کی سفارش کی جاتی ہے۔ یہاں ایک نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس زمانے کی تبلیغی جماعتوں میں مبلغین کی تعداد بہت کافی نظر آتی ہے۔ اس کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں: اول یہ کہ مبلغین کی جسمانی حفاظت مقصود تھی کہ اگر اچانک کوئی غیر معمولی صورت پیدا ہو جائے تو وہ اپنی حفاظت کر سکیں اور فتنہ جو اور مخالف لوگوں کو کسی قسم کی جرأت بے جا کی اجازت نہ دیں۔ دوم یہ کہ ابتدائی زمانے میں مسلم مبلغین کو کافی بڑے دائرہ کار میں کام کرنا تھا جس کے لئے زیادہ افراد کی ضرورت تھی۔

فتح مکہ کے بعد رسول اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ دونوں کی تبلیغی سرگرمیوں میں زبردست اضافہ ہوا اور تقریباً جزیرہ نما عرب کے ہر کونے اور گوشے میں مبلغین پہونچے۔ اس زمانے میں چونکہ اسلامی ریاست ایک ایسی سیاسی اور فوجی طاقت بن چکی تھی جس کی مخالفت یقینی نقصان کا موجب اور موافقت عملی فوائد کا باعث بن سکتی تھی اس لیے اشاعت اسلام کی رفتار میں تیزی بھی آئی اور ساتھ ہی مسلم جماعتوں اور مبلغوں کے لئے کوئی خاص خطرہ بھی نہیں رہا۔ چنانچہ بعض اوقات بہت مختصر جماعتیں بھی بھیجی گئیں جو بئر معونہ اور رجیع کے صدمات سے محفوظ رہیں۔ خاص طور سے مختلف قبائل عرب کے اصنام شکنی کی مہمیں جو محض ایک دو نفروں یا زیادہ سے زیادہ چند افراد پر مشتمل تھیں۔[۱۵] اس دور کی اہم ترین پہلی دو مہمیں یا تبلیغی جماعتیں حضرات علاء بن حضرمی اور عمرو بن عاص کی تھیں جو بالترتیب بحرین اور عمان کی مملکتوں میں بھیجی گئی تھیں اور مکمل طور سے کامیاب رہی تھیں۔[۱۶] حضرت خالد بن ولید مخزومی نے بنو الحارث بن کعب کے لوگوں میں اشاعت دین کا کام پوری کامیابی کے ساتھ کیا تھا۔[۱۷] اس سے قبل انہوں نے بنو جذیمہ کے لوگوں کے درمیان دعوت کا کام کیا تھا۔ اسی طرح حضرت علی بن ابی طالبؓ نے رسول اللہ کے ارشاد گرامی کے مطابق ہمدان اور مذحج کے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا تھا۔[۱۸] طبری کا بیان ہے کہ حیات طیبہ کے آخری دنوں میں رسول اکرمؐ نے جزیرہ نما کے مختلف علاقوں میں کم و بیش آٹھ مبلغوں کو اشاعت دین کی خاطر بھیجا تھا۔ ان کے علاوہ متعدد اور مبلغین اور داعی تھے جو تبلیغ و دعوت کا کام مختلف علاقوں میں پوری تندہی اور جوش کے ساتھ کر رہے تھے اس سلسلے میں رسول اللہ کے ان سفیروں کا ذکر کرنا

ضروری معلوم ہوتا ہے جن کو آپ نے مختلف مقامی سرداروں اور منتظمین کے پاس بھیجا تھا۔

جیسا کہ کہیں اور مفصل ذکر کیا جا چکا ہے[۲۰] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر (رسل) دو قسم کے تھے۔ ایک تو وہ سفرا تھے جن کو غیر ملکی حکمرانوں اور شہزادوں کے درباروں میں بھیجا گیا تھا اور دوسرے وہ تھے جن کو مقامی سرداروں اور عرب قبائل کے شیوخ کے پاس روانہ کیا گیا تھا۔ ان میں سے اکثر سفارتوں کے پس پشت جو حکمت عملی کارفرما تھی وہ اصلاً مذہبی تھی کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے گرامی ناموں کے متون دستیاب ہوئے ہیں ان میں علانیہ اور غیر مبہم انداز میں مکتوب الیہم کو اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر تمام غیر ملکی حکمرانوں جیسے حبشہ کے نجاشی، بازنطین کے ہرقل غسان کے حارث بن شمر، مصر کے مقوقس، ایران کے کسریٰ اور اس کے ایک ماتحت حکمران ہرمزان وغیرہ کو اسلامی امت کا رکن بننے کی دعوت دی ہے۔[۲۱] اسی طرح ملکی حکمرانوں میں بحرین کے منذر بن ساوی، عمان کے جیفر وعبد اور یمن و حضرموت کے متعدد حکمرانوں کے نام خطوط نبوی کا معاملہ ہے۔ دوسرے قبائل عرب کا سرداروں مثلاً یمامہ کے ہوذہ بن علی۔ نجران کے بشپ ضغاطر، ایلہ کے بشپ حکمران مقنا وغیرہ شمالی بستیوں کے فرمانرواؤں، بنو حنیفہ اور یمامہ کے سرداروں مسیلمہ اور ثمامہ بن اثال اور جنوبی عرب کے متعدد دوسروں کے نام خطوط نبوی میں اسلام کی دعوت ہی کا مضمون ملتا ہے۔[۲۲]

اس لحاظ سے ان تمام خطوط کے حاملین اور سفارتوں کے سفراء کرام بھی مذہبی مبلغین اور داعی تھے جنھوں نے صرف خطوط نبویؐ اور پیغام الٰہی کو پہونچانے کا ہی کام نہیں کیا تھا بلکہ اپنے ایمان، کردار و عمل کے ذریعے اسلام کی سچی تصویر کشی بھی کی تھی اور کم از کم ملکی حکمرانوں اور سرداروں کی حد تک وہ مکمل طور سے کامیاب رہے تھے جبکہ غیر ملکی حکمرانوں کے درباروں میں جزوی کامیابی کے علاوہ انھوں نے اسلام کے اچھے اور دل نشین نقوش چھوڑے تھے۔

جہاں تک مقامی سرداروں اور انتظامیہ کے افسروں کے تبلیغ و اشاعتِ دین میں حصہ لینے کا معاملہ ہے تو کسی حد تک اس کا ذکر یا کم از کم اشارہ باب دوم اور چہارم میں آچکا ہے۔ یہاں ان کے مذہبی فرائض کی انجام دہی کی جانب مختصر سا حوالہ کافی ہوگا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ مختلف اوقات میں مختلف سرداروں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور پھر خود بھی اسلام کے مبلغ بن گئے تھے اور انھوں نے اپنے علاقوں یا پڑوسیوں میں بھی تبلیغ کی تھی۔ مثال کے طور پر حضرات جرثوم بن ناشیم خشنی / قضاعہ، عبادہ بن اشیب عنزی / بنو وائل، عمرو بن مرہ جہنی وغیرہ کے علاوہ بہت سے شیوخ قبیلہ تھے جنھوں نے اپنے قبیلوں کے لوگوں کو اسلام کے دائرہ میں داخل کیا تھا۔ اسد الغابہ کے مطابق ان سب کو دعوت دین کا کام کرنے کا حکم رسول کریم نے دیا تھا۔[۲۳]

اسی طرح مرکزی منتظمین کو بھی اپنے اپنے علاقوں میں اسلامی دعوت پھیلانے اور لوگوں کو اسلام سکھانے کا ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ حضرت معاذ بن جبل کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ جنوبی عرب کے وسیع خطے کے گورنر جنرل ہونے کے علاوہ معلم اور مبلغ بھی تھے اور بقول طبری "ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں جاتے رہتے تھے اور خلقِ خدا میں پیغام ربانی کو پھیلاتے رہتے تھے۔"[۲۴] حضرت عمرو بن حزم کو بطور گورنر نجران مفصل ہدایات ملی تھیں لیکن ان میں سب سے زیادہ زور خدا کے دین کو اس کی

مخلوق تک پہونچانے پر تھا۔[۲۵] تبلیغ واشاعت دین پر اسی قسم کی تاکید دوسرے گورنروں، عاملوں اور افسروں کے نام خطوط نبوی ؐ میں ملتی ہے[۲۶] حکمت نبوی ؐ کی بنیاد در اصل اس عقیدے پر تھی کہ محض اشاعت دین ہی اسلامی ریاست کی بقا اور استحکام کی ضمانت دے سکتی ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ نہ صرف اسلامی ریاست کے کارکن بلکہ ہر مسلمان اپنی جگہ ایک داعی ایک مبلغ تھا۔ اس کے سوا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی لوگوں کو دعوت حق دی تھی اور مبلغین اور دعاۃ کی جماعتیں بھی جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں میں بھیجی تھیں اور اس طرح اسلام کے مبلغوں اور داعیوں کا اسلامی ریاست کی توسیع اور استحکام میں خاصا مثبت اور عملی حصہ تھا۔[۲۷]

۲ - معلمین

محض اسلام کی تبلیغ سے نہ تو سرزمین عرب پر ریاست اسلامی کی توسیع و استحکام کا عمل پورا ہوسکتا تھا اور نہ ہی خارجی دنیا میں اس کی طاقت کو محسوس کیا جاسکتا تھا جب تک کہ نومسلموں کے دلوں کی گہرائیوں میں اسلامی تعلیمات اور قرآنی احکام کو جاگزیں نہ کر دیا جاتا۔ اسی بنا پر قرآن کریم کا حکم ہے کہ:

"اور ایسے تو نہیں مسلمان کہ سارے کوچ میں نکلیں، سو کیوں نہ نکلے ہر فرقے میں سے ان کے ایک حصہ تا سمجھ پیدا کریں دین میں اور تا خبر پہونچاویں اپنی قوم کو جب پھر آویں ان کی طرف ....."[۲۸]

تعلیم دین و اسلام کی اہمیت کا احساس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداء کار سے تھا چنانچہ آپ نے نومسلموں کی تعلیم کا اہتمام بڑی محنت و عنایت سے کیا تھا۔ اس تعلیم کے حصول کے بعد ایمان میں پختگی اور مذہب کی سمجھ آتی تھی جس کو اسلامی اصطلاح میں "تفقہ فی الدین" کہا جاتا ہے اور در اصل اسلام اور ایمان میں جو فرق قرآن کریم نے کیا ہے[۲۹] وہ ایک لحاظ سے تبلیغ و تعلیم کا فرق ہے اور یہ دونوں سچے مسلمان کے لازم و ملزوم ہیں۔

عہد نبوی میں نومسلموں میں تعلیم کی متعدد مثالیں ہم گذشتہ ابواب میں خاص کر باب دوم میں دیکھ چکے ہیں۔ مگر اس بحث میں ان پر ایک نئے زاویہ سے مجموعی طور پر دیکھنا مفید ہوگا کیوں کہ اس سے رسول کریم ؐ کے نظام تعلیم و تربیت کا صحیح علم ہو سکے گا۔ یہ نکتہ ذہن نشین رکھنے کا ہے کہ ہر اصلاحی تحریک اور مذہب کی مانند رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے عظیم اور اول معلم تھے اور ابتداءً میں آپ نے ہی تمام مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ نے ابتدا ہی سے اپنے قابل اصحاب کو اس طرح سے تعلیم و تربیت دی تھی کہ وہ دوسروں کے لیے معلم اور مشعل راہ بن سکیں تاکہ چراغ سے چراغ جلتے رہیں۔ مکی عہد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کو براہ راست تعلیم دی تھی ان میں عبد القیس کے سردار الاشج کے بھتیجے کی تعلیم کا واقعہ دل چسپ ہے جو ہم دیکھ چکے ہیں۔ آپ کے اجل اصحاب نے اس دور میں معلم ثانی کا فریضہ انجام دیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ نومسلموں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ آپ اپنے اصحاب میں سے کسی کے سپرد کر دیتے تھے۔ ہجرت کے زمانے تک قابل معلمین کی تعداد معتد بہ ہو چکی تھی۔ بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ مکی عہد میں جن صحابہ کرام نے بھی آپ کی صحبت کا فیض کچھ مدت تک اٹھا لیا تھا وہ کندن بن گیا تھا۔

چنانچہ ہجرت مدینہ سے ذرا قبل جب اہلِ مدینہ کی تعلیم و تربیت کے لئے کسی معلم کی ضرورت پڑی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ انتخاب عبدالدار / قریش کے ایک نوجوان، صالح و قابل صحابی حضرت مصعب بن عمیرؓ پر پڑی اور آپ نے ان کو مدینہ بھیج دیا۔ اس سے قبل اہلِ مدینہ کی تعلیم کا فریضہ حضرت اسعد بن زرارہؓ، نقیب النقباء کیا کرتے تھے۔ ماخذ کا بیان ہے کہ تمام مدنی مسلمان ان کے گھر یا اس کے پہلو میں آباد مسجد خانہ میں جمع ہو جاتے تھے اور حضرت اسعد بن زرارہؓ ان کو مذہبی تعلیم دیا کرتے تھے۔[۳۰] یہاں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کی مدینہ آمد سے قبل خدانخواستہ مدنی مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام ناقص تھا یا حضرت اسعدؓ اچھے معلم نہ تھے۔ بلکہ اصل بات یہ تھی کہ مسلمانانِ مدینہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ و تربیت کردہ صحابی سے تعلیم و تربیت کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ دوسرا نکتہ یہ بھی ہے کہ اکثر و بیشتر مبلغین ہی معلمین کے فرائض انجام دیتے تھے کیونکہ معلم کی صلاحیتوں سے مالا مال ہوتے تھے۔ لیکن مخصوص حالات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاص کر نئے مسلمانوں کے لئے "معلمین" کا تقرر فرماتے تھے۔ اس بحث میں ہم ایسے ہی معلمین کا ذکر بطورِ خاص کریں گے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ؓ کے ایک اور معلم حضرت ابن ام مکتومؓ بھی تھے۔ حضرت براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہ ہجرت سے قبل حضرت مصعب بن عمیرؓ اور حضرت ابن ام مکتومؓ لوگوں کو قرآن کریم پڑھاتے تھے اور خود راویٔ حدیث نے جو اس وقت چھوٹی عمر کے تھے مفصل سورتوں میں سورہ الاعلیٰ حضرت ابن ام مکتومؓ سے سیکھی تھی بلاشبہ ہجرت کے بعد بھی حضرت ابن ام مکتومؓ معلم کے فرائض بدستورِ سابق انجام دیتے رہے تھے کیونکہ وہ حضرت مصعبؓ کے بعد ہی مدینہ پہونچے تھے۔[۳۱] عین ممکن ہے کہ ان کی ہجرت میں سبقت کے پیچھے اشارۂ نبویؐ رہا ہو۔ بہر حال یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہجرت کے بعد رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم معلمِ اوّل رہے تھے اور تمام مسلمانوں کی تعلیم و تربیت فرماتے تھے۔ لیکن آپ کے علاوہ اب پوری پوری جماعتیں معلمین کی بن گئی تھیں۔ ان میں سے ایک غریب مسلمانوں کی جماعت تھی جو کہ عام طور سے "اہل الصفہ" کے نام سے مشہور ہے۔ وہ مستقل خدمتِ نبویؐ میں حاضر رہتے تھے اور رات دن اسلام اور دین کے احکام و اصول و حقائق سیکھتے رہتے تھے جبکہ دوسرے مسلمان دنیاوی مشاغل جیسے کھیتی باڑی، تجارت یا محنت مزدوری میں مشغول رہتے تھے اور بوقت ضرورت ہی حاضر ہو جاتے تھے۔ ایسا نہیں گمان کرنا چاہیے کہ صرف اصحابِ صفہ ہی معلم و حاملِ علم تھے۔

اجل اصحابِ نبیؐ میں سے بہت سے ایسے تھے جن کا درجہ و معیار و مبلغِ علم صرف معلمِ اول کے بعد ہی تھا اور ان میں سے متعدد تو ان اصحابِ صفہ کے بھی استاد تھے۔ چنانچہ ابوداؤد کی ایک روایت کے مطابق حضرت عبادہ بن صامتؓ بہت سے اصحابِ صفہ کو قرآن حکیم اور لکھنے پڑھنے کی تعلیم اپنے گھر پر دیا کرتے تھے۔[۳۲]

ابنِ حنبل نے حضرت انسؓ بن مالک کی سند پر روایت بیان کی ہے کہ "اصحابِ صفہ میں سے ستر اشخاص مدینہ کے ایک معلم کے گھر رات کو پڑھنے جاتے تھے اور وہاں فجر تک علم کا بازار گرم رکھتے تھے"۔[۳۳] اس "مرکزِ علم و دانش" سے بہرہ ور ہونے والے

طالبانِ علم ایک دن خود بھی مسندِ تعلیم و معلم پر فائز ہو گئے تھے۔ تقریباً اسی[۳۳] مبلغین و معلمین جو بئرِ معونہ اور رجیع کے المیوں میں شہادت کے درجہ پر فائز ہوتے اسی مدرسہ علم کے فارغین اور اسی دانش کدہ کے معلمین تھے[۳۴]۔ بعد کے زمانے میں احادیث نبوی کے ایک بڑے راوی اور عالم حضرت ابوہریرہ دوسیؓ معلمین کے اسی طبقہ ممتازہ سے تعلق رکھتے تھے[۳۵]۔

اصحابِ صفہ کے علاوہ متعدد دوسرے اساتذہ و معلمین کا ذکر ماخذ میں ملتا ہے۔ ان میں سے وہ ممتاز ترین تھے جن سے قرآن حکیم وغیرہ کا علم حاصل کرنے کا حکم خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ چنانچہ بخاری کی ایک روایت ہے کہ آپ مسلمانوں کو اپنے چار اصحاب حضرات عبداللہ بن مسعودؓ، سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ، ابی بن کعبؓ اور معاذ بن جبلؓ سے قرآن کریم پڑھنے اور اسلام سیکھنے کا حکم دیا کرتے تھے[۳۶]۔ اصابہ کا بیان ہے کہ ایک نو مسلم حضرت وردانؓ جو بعد کی ایک مشہور شخصیت فرات بن یزید کے دادا تھے قرآن حکیم کی تعلیم کے لیے حضرت ابان بن سعید امویؓ کے حوالے کئے گئے تھے اور یہ کام کسی اور نے نہیں بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس کیا تھا[۳۷]۔ اسی طرح "کنز العمال" کی ایک روایت کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نو مسلم حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ کو حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہریؓ کے دامن تربیت میں دیا تھا اور فرمایا تھا کہ "میں نے تم کو ایک ایسے شخص کے حوالے کیا ہے جو تم کو اچھی تربیت دے گا اور ادب سکھائے گا"[۳۸]۔

قریش کے خاندان سعیدی کے حضرت عبداللہ بن سعیدؓ اموی اسلام لائے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مسلمانانِ مدینہ کے لیے معلم مقرر کیا تاکہ وہ ان کو قرآن حکیم اور لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیں[۳۹]۔ عہد نبویؐ میں قرآن حکیم کو جمع کرنے والے صحابہ کرام (جماع القرآن) کے بارے میں محمد بن حبیب بغدادیؒ نے ایک علٰحدہ اور مکمل فصل باندھی ہے جس میں انہوں نے چھ (۶) اصحاب کو جامع و حافظ قرآن بتایا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ تھے:

۱۔ سعد بن عبیدؓ، بنو عمرو بن عوف / اوس
۲۔ ابو الدرداء عویمر بن زیدؓ، بنو عدی بن کعب / خزرج
۳۔ معاذ بن جبل، بنو جشم / خزرج
۴۔ ثابت بن زید، بنو ثعلبہ بن کعب / خزرج
۵۔ ابی بن کعب،
۶۔ زید بن ثابت / بنو مالک بن نجار / خزرج[۴۰]

ابن سعد نے ایک اور انصاری صحابی کا نام قرآن مجید کے جامعین میں شمار کیا ہے۔ وہ حضرت قیس بن سکنؓ تھے جو بدری صحابی تھے اور خزرج کے خاندان نجار کے بطن بنو غنم بن عدی سے تعلق رکھتے تھے[۴۱]۔ اس ضمن یہ بات یاد رکھنی چاہیے جیسا کہ کتانی نے بھی اس نوع کی حدیثوں اور روایتوں کی تشریح میں واضح کیا ہے کہ صرف مذکورہ بالا اصحاب ہی قرآن کریم کے جامع اور حافظ نہیں تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے تھے۔ مثال کے طور پر اوپر حضرات عبداللہ بن مسعودؓ اور سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ کا ذکر نہیں آیا ہے حالانکہ ان سے قرآن سیکھنے کی ہدایت خود زبانِ رسالتؐ اور حامل وحی سے ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ مذکورہ بالا چھ سات جماع القرآن میں سب کے سب انصاری صحابہ ہیں اور مہاجرین میں سے کسی کا نام نہیں دیا گیا ہے جبکہ یہ ناقابلِ یقین امر ہے کہ موخر الذکر طبقہ میں کوئی حافظ و جامع قرآن عہد نبوی میں تھا ہی نہیں۔ دراصل اس قسم کی روایات مختلف طبقاتِ حفاظ و جماع کو بیان کرتی ہیں نہ کہ ان کی تحدید و تحصیر کرتی ہیں۔

دوسرے مآخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام اکابر صحابہ قرآن کریم کے جمع و حفظ کرنے والے تھے اور بہت سے ایسے بھی تھے جو نسبتاً آج کم معروف ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں خواتین کی بھی ایک معتدبہ تعداد شامل تھی جن کو عام طور سے ہمارے مآخذ اور مورخین دونوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس طبقۂ حفاظ میں حسبِ ذیل اصحاب کو بھی شامل کرنا چاہیے:

"حضرات ابوبکر صدیق رضؓ، عمر فاروق رضؓ، عثمان غنی رضؓ، علی مرتضیٰ رضؓ، طلحہ بن عبیداللہ تیمی رضؓ، سعد بن ابی وقاص رضؓ، حذیفہ امولیٰ سالم، ابوہریرہ رضؓ، عبداللہ بن سائب رضؓ، عبداللہ بن عمر رضؓ، عبداللہ بن عباس رضؓ، عبداللہ بن عمرو بن عاص رضؓ، معاویہ بن ابی سفیان رضؓ، ابوزید انصاری رضؓ، تمیم داری، عبادہ بن صامت رضؓ، ابوایوب انصاری رضؓ"۔ ان کے علاوہ خواتین میں حضرت ام ورقہ بنت عبداللہ بن حارث انصاری رضؓ کا نام نامی قرآن کے حافظوں میں بیان ہوا ہے۔"[۴۲] بیشتر ازواج مطہرات خاص کر حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کو اسی زمرہ میں شمار کیا جانا چاہیے۔

بہر حال یہ یقینی ہے کہ ان مذکورہ بالا حضرات و خواتین کی تعداد سے کئی گنا زیادہ حفاظ قرآن عہد نبوی میں تھے اور یہ سب کے سب معلم بھی تھے جو دوسروں تک علم و دانش کی روشنی پہونچاتے تھے۔ اس طرح مآخذ سے کافی شہادت اس بات کی ملتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں جو اسلام اور اسلامی ریاست کا مرکز تھا مسلمانوں کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے خاص انتظامات فرمائے تھے۔

مدینہ کے دانشکدۂ علم و عرفان سے صرف مسلمانانِ شہر ہی مستفیض نہیں ہوتے تھے بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو آنے والے دوسرے طالبانِ حق بھی فیضیاب ہوتے تھے لیکن اس سلسلے میں دو مشکلیں تھیں: اول یہ کہ باہر سے آنے والے خاص کر دور دراز کے مسلمان مدینہ میں زیادہ قیام نہیں کر سکتے تھے اور دوم یہ کہ تمام مسلمانانِ عرب مرکز آ بھی نہیں سکتے تھے۔ نہ ہی سب کے سب ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں مستقل سکونت اختیار کر سکتے تھے۔ اسلئے جزیرہ نما کے مختلف علاقوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کے لیے ان کے اپنے وطن میں مقامی سطح پر انتظامات ناگزیر تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ضرورتوں کو مدنظر رکھا تھا اور ان پر پورا دھیان بھی دیا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات جاننی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ نومسلموں کے چھوٹے بڑے گروہ مدینہ منورہ زیارت رسول کریم کے لیے آتے تھے اور مختصر سے عرصے کیلئے وہاں قیام بھی کرتے تھے۔ آپ نے اسی مختصر مدت میں ان کی بنیادی تعلیم کا انتظام بھی کر دیا تھا تاکہ وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقف ہو جائیں۔ تفسیر خازن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کی سند پر ایک روایت یہ بیان ہوئی ہے کہ تمام مسلم قبائل عرب میں سے ہر ایک سے ایک نمائندہ گروہ (عصبۃ) خدمت نبوی میں حاضر ہوتا تھا اور آپ سے اپنے دین و مذہب کے بارے میں جو چاہتا تھا پوچھتا تھا اور اس طرح دین کی سمجھ اور اس سے واقفیت پیدا کرتا تھا۔"[۴۳] اس روایت یا عمومی تبصرہ کی تصدیق تاریخی واقعات سے بھی ہوتی ہے۔ بخاری کی روایت ہے کہ حضرت مالک بن حُوَیرِث اپنی قوم کے وفد میں مدینہ منورہ آئے جہاں وہ بیس دنوں تک مقیم رہے اور اس دوران وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات حاصل کرتے رہے۔ اپنے وطن کو جب وہ جانے لگے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی موصوف اور ان کے ساتھیوں کو یاد دہانی اور تاکید کی کہ جو کچھ انہوں نے اپنے مدینہ کے قیام میں سیکھا ہے اسے جا کر اپنی قوم کو سکھائیں اور اس میں ذرا کوتاہی نہ کریں۔[۴۴] اس طرح قبیلہ عبدالقیس کے حضرت عمرو بن عبد قیس نے جو تعلیم مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

سے حاصل کی تھی اس کو اپنی واپسی پر اپنی قوم میں پھیلایا تھا۔"[۴۵] اس لحاظ سے وفودِ عرب میں جو مسلمان مدینہ آئے یا جہاد میں شرکت کے لئے پہونچے یا حج و زیارت کے سلسلہ میں حاضرِ خدمت اقدس ہوئے غرضکہ کسی سبب سے وہ مدینہ پہونچے وہ سب کے سب مدینہ علم سے دینی تعلیم و تربیت لے کر نکلے اور اپنی قوم اور اپنے علاقے کے لئے معلم و مربی بن کر لوٹے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "بیعت ہجرت" اور "بیعت عربیت" میں جو فرق روا رکھا تھا[۴۶] اس کا مقصد یہ تھا کہ نومسلم بدوی عربوں کو مناسب تعلیم و تربیت کے ذریعے اسلامی امت کا ایک پکا رکن اور اسلام کا صحیح علمبردار بنا دیا جائے کیونکہ انھیں بدو اور گنوار عربوں کو ایک دن دنیا کی امامت و سیادت کرنی تھی۔ جو لوگ بیعت ہجرت کو ترجیح دیتے تھے وہ ترکِ سکونتِ وطن کر کے مدینہ آ بستے تھے اور اسلامی امت کے "طبقہ خیر" میں ضم ہو جاتے تھے اور ہمہ وقت وہ اسلامی ریاست اور اسلام کی گوناگوں خدمات کے لئے دستیاب ہوتے تھے، جبکہ وہ لوگ جو "بیعت عربیت" کو پسند کرتے تھے وہ مختصر مدت کے لئے مدینہ آتے، اسلامی تعلیمات حاصل کرتے، دین میں تفقہ حاصل کرتے اور اپنے گھروں کو مبلّغ اور معلّم بن کر لوٹتے تھے۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بیعت ہجرت ان کمزور عرب قبیلوں کے نومسلموں سے طلب کی جاتی تھی جن کے اسلام کے لیے اندرونی یا بیرونی خطرات ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد بیعتِ ہجرت باقی نہیں رہی تھی کیونکہ اب بادِ مخالفت اتنی طاقت ور نہیں رہ گئی تھی کہ نومسلموں پر وہ کسی قسم کا منفی دباؤ ڈال سکتی۔ بعض بدوی قبائل جیسے خزاعہ، اسلم اور مزینہ (اور غالباً متعدد دوسروں) کو "مہاجر" کا مرتبہ و مقام ترک سکونت وطن اور قیام مدینہ کے بغیر بھی عطا کیا جاتا اس سبب سے نہیں تھا کہ اسلامی امت میں مہاجرین کو کوئی خاص مراعات اور حقوق حاصل تھے جو دوسرے مسلم طبقات کو نہیں ملتے تھے جیسا کہ بعض مستشرقین نے ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔[۴۷] بلکہ اس بنا پر تھا کہ وہ اپنے ایمان میں پختہ تھے اور دین کی سمجھ رکھتے تھے۔ بہر حال ان تمام شواہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان قبیلوں کی دینی تعلیم و تربیت کے لئے ان کے اپنے علاقوں میں موزوں انتظامات کئے گئے تھے۔

اب ہمارے لیے اس مسئلہ کا مطالعہ کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ جو عرب قبائل مدینہ نہیں آ سکتے تھے اُن کی مذہبی تعلیم و تربیت کے لیے عہد نبوی میں کیا انتظام تھا؟ ایک روایت کا حوالہ گذر چکا ہے کہ قبائل عرب کے لوگ مدینہ آتے تھے اور اسلامی تعلیمات سیکھ کر اپنے لوگوں کو جا کر سکھاتے تھے۔ اس کی مزید تائید بخاری کی ایک اور روایت سے ہوتی ہے جو عمرو بن سلمہ کی سند پر بیان ہوئی ہے۔ اس کے مطابق مدینہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خبر سے قبائل عرب میں خاصی ہلچل پیدا ہوگئی تھی اور ان کے قافلے (رُکبَان) جوق در جوق اور شوق بر شوق خدمت اقدس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اس حدیث کے راوی کا بیان ہے کہ ان کا قبیلہ بنو جرم قافلوں کی آمد و رفت کے راستے پر واقع تھا اور وہ آنے جانے والوں سے آپؐ کے اور آپؐ کے صحابۂ کرام کے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔ حضرت عمرو بن سلمہ ان قافلہ والوں سے قرآن سن سن کر یاد کر لیا کرتے تھے حالانکہ وہ خاصے کمسن تھے اور مکہ کی فتح کے زمانے تک ان کو اتنا قرآن یاد ہو گیا تھا کہ وہ اپنے قبیلہ کے سب سے بڑے حافظ سمجھے جاتے تھے۔ یہ سارا قرآن انہوں نے اسی طرح پوچھ پوچھ کر یاد کیا تھا۔[۴۸]

طبری کا بیان ہے کہ بنو حنیفہ کے ایک نو مسلم نے خدمت نبوی میں حاضری دی، کچھ مدت تک رہ کر دین کی سمجھ پیدا کی اور اپنے وطن یمامہ کو جب ان کی واپسی ہوئی تو وہ معلم بن چکے تھے اور وہاں پہونچ کر انہوں نے اپنی قوم میں تبلیغ و تعلیم پھیلائی۔(۴۹)

جب مکہ فتح ہوا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وطن مالوف کے لوگوں کی دینی تعلیم و تربیت کی فکر دامنگیر ہوئی۔ تمام مآخذ کا متفقہ بیان ہے کہ آپ نے مکہ کے نو مسلموں کو قرآن حکیم سکھانے اور اسلام کی بنیادی تعلیمات بتانے کی خاطر اپنے دو عظیم صحابیوں حضرات معاذ بن جبل خزرجی اور ابو موسٰی اشعری کو بطور معلم وہاں چھوڑا تھا اور انہوں نے خاصی مدت تک یہ فرض خوش گوار انجام دیا تھا۔(۵۰)

اسی طرح طائف کے محاصرے کے دوران ثقیف کے جن غلاموں نے اپنے آقاؤں کا ساتھ چھوڑ کر اسلام کے دامن میں پناہ لی تھی آپ نے ان کو مختلف صحابہ کرام کے دامن تربیت سے وابستہ کر دیا تھا تاکہ ان کی صحیح اور مناسب دینی تعلیم و مذہبی تربیت ہو سکے۔ اس ضمن میں جن معلمین کے نام نامی مذکور ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ حضرت عمرو بن سعید اموی رضؓ۔ ۲۔ حضرت خالد بن سعید اموی رضؓ۔ ۳۔ حضرت ابان بن سعید اموی رضؓ
۴۔ حضرت عثمان بن عفان اموی رضؓ۔ ۵۔ حضرت سعد بن عبادہ خزرجی رضؓ ۶۔ حضرت اسید بن حضیر اوسی رضؓ۔(۵۱)

یہ دلچسپ اور اہم حقیقت ہے کہ مہاجرین میں سب کا تعلق بنو امیہ کے دو خاندانوں سے تھا اور حضرت عثمان کے سوا بقیہ کا سعیدی گھرانے سے جبکہ انصاری معلمین میں سے ایک ایک کا تعلق مدینہ کے دونوں قبیلوں سے تھا۔ بالواسطہ ہی۔ لیکن اس سے عہد نبوی میں بنو امیہ کے علم و فضل اور اسلام میں پختگی کا پورا ثبوت ملتا ہے جو اموی مخالف نگاہوں کو نہیں دکھائی دیتا۔

اسلامی ریاست کے دوسرے علاقوں میں والی / گورنر، مرکزی اور مقامی منتظمین حتیٰ کہ فوجی سالار اور صدقات کے عاملین بھی اپنے اپنے علاقہ کے مذہبی اور دینی تقاضوں کی تسکین کے ذمہ دار تھے۔ جنوبی عرب کے گورنر جنرل حضرت معاذ بن جبل، زبید، رمع، عدن اور سواحل کے گورنر حضرت ابو موسٰی اشعری، نجران کے گورنر حضرت عمرو بن حزم عمان کے گورنر حضرت عمرو بن عاص، بحرین کے گورنر حضرت علاء بن حضرمی اور صنعاء کے گورنر حضرت خالد بن سعید کے بارے میں واضح طور سے ذکر ملتا ہے کہ وہ اپنے علاقوں کے لوگوں کی دینی اور مذہبی تربیت بھی کرتے تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے متعدد گورنروں اور والیوں کے بارے میں مضمراً بیان ملتا ہے۔(۵۲) حضرت معاذ بن جبل کے بارے میں لفظ "معلم" کا اطلاق طبری نے بار بار کیا ہے۔ سالاران فوج میں حضرت خالد بن ولید مخزومی کی تعلیمی اور تربیتی کارناموں کا ذکر کئی مقام پر ملتا ہے(۵۳) اسی طرح حضرت علی بن ابی طالب کے قبیلہ ہمدان میں تعلیم قرآن و اسلام کا حوالہ وضاحت سے آتا ہے۔(۵۴)

دوسرے سالاروں میں حضرات عبدالرحمٰن بن عوف، عمرو بن عاص، وغیرہ کے بارے میں مضمراً اور سب سے بڑھ کر سالار اعظم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صراحتاً متعدد بیانات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام سالاران فوج اور ان کے اہل علم سپاہی بھی تلوار و تبر کے علاوہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ بھی اسلامی ریاست کی خدمت انجام دیا کرتے تھے۔

جہاں تک عاملین صدقات کے اشاعت علم و تبلیغ و تربیت میں حصہ لینے کا تعلق ہے تو حضرت عباد بن بشر انصاری کے بارے میں تمام مآخذ نے دل چسپ بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق صدقات کی وصولی کے بعد بھی حضرت عباد بنو مصطلق میں دس دنوں تک مقیم رہے تھے اور اس دوران ان کو اسلام کی بنیادی باتوں کی تعلیم دیتے رہے تھے اور تربیت کے ذریعہ ان کو پاکیزگی بخشتے رہے تھے۔[55] ان کے علاوہ تقریباً تمام عاملین صدقات کو بھی معلمین وقت میں شمار کرنا چاہئے۔ کیونکہ وہ اپنے قول و فعل سے ہی نہیں بلکہ باقاعدہ لوگوں کو اسلام کے مبادی سے روشناس کراتے تھے۔ ذکر آچکا ہے کہ کس طرح دو گمنام عاملوں نے صدقات میں بہترین جانور قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور صدقات ادا کرنے والوں کو ان کے حقوق اور صدقات کے جانوروں کے بارے میں بتایا تھا۔[56] اس بحث کے آخر میں بہر حال ان دو مثالوں کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے جن سے ایک طرف تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ذریعے اور درس گاہ سے علم حاصل کرنے کی فکر و احساس کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف مذہب کے دفاع کے عظیم احساس و طاقت کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ پہلی مثال کا تعلق اس نادر مگر مشہور واقعہ سے ہے جس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیران بدر میں سے اہل علم کو صرف اس شرط پر رہا کر دیا تھا کہ وہ فی کس مدینہ کے دس مسلم بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔[57]

دوسری مثال کا تعلق سنہ ۴ھ / ۶۲۶ء سے ہے جب آپ نے حضرت زید بن ثابت انصاری کو عبرانی زبان اور سابق سماوی کتب کا علم حاصل کرنے کا حکم دیا تھا اور بعض روایات کے مطابق حضرت زید نے اور کئی زبانیں بھی سیکھی تھیں۔[58] ظاہر ہے کہ کتب سماوی کا یہ علم یا مختلف زبانوں سے واقفیت حضرت زید بن ثابتؓ تک ہی محدود نہیں رہی ہوگی۔ بہر حال یہ محض مفروضہ و قیاس نہیں ہے بلکہ تاریخی شہادت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے معاصر مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بہترین انتظامات کئے تھے اور بہترین معلمین کو اس خدمت کے لئے مقرر کیا تھا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا واقعاتی شہادت ہو سکتی ہے کہ عہد نبوی میں بھی اور اس کے معاً بعد خاص کر یہی صحبت نبوی کے فیض یافتہ عرب معلمین پوری دنیا کو دین، اسلام، اخلاق اور پاکیزگی کا سبق سکھانے نکلے تھے اور اقوام عالم کے اولین مسلم اساتذہ تھے۔

۳۔ افتاء اور مفتی

ایک لحاظ سے عہد نبوی کے مفتیان دین متین اساتذہ اور معلمین ہی کی فہرست میں آتے ہیں کیونکہ وہ بھی بنیادی طور سے مسلمانوں کو اسرار و رموز دین و ایمان سے آگہی بخشتے تھے۔ بہر حال متعدد مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں کم از کم مدینہ میں متعدد مفتی تھے جو دین سے متعلق امور پر اپنی رائے دیتے تھے یا اسلامی احکام کی صحیح تعبیر و تشریح کرتے تھے۔[59] یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک انتہائی دور اندیشی پر مبنی اور عملی حکمت تھی کہ آپ نے اپنی موجودگی ہی میں کتاب و سنت کے ایسے عالم و شارح پیدا کر دیئے تھے جو آپ کے بعد بھی اسلام کی امامت و سیادت کا کام بخوبی کر سکتے تھے۔ خاص طور پر دوسرے ملکوں اور بدلے ہوئے حالات میں دین کی نئی اور مناسب تشریح ضروری تھی اور اس کے لیے "تفقہ فی الدین" لازمی

مشروط تھی اور آپؐ نے اسی تقاضے کے تحت اپنے بعض صحابہ کی جن میں جوہر قابل تھا خصوصی تربیت فرمائی تھی تاکہ چراغ سے چراغ جلتے رہیں اور پورا عالم انسانی اسلام کے نور سے مستفیض ہو سکے۔ یہ خیال کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف ملکوں اور کرۂ ارض کے متعدد خطوں میں اسلام کی اشاعت و استحکام کا اپنی حیات طیبہ ہی میں ادراک کر لیا تھا محض ایک مفروضہ اور اٹکل نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے جس پر سب سے بڑی شہادت قرآن کریم کی ہے کہ اسلام ایک عالمی مذہب ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری رسولؐ ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے صحابہ کو نئے حالات میں اور نئے لوگوں کی ضرورتوں کے مطابق دین کی تشریح و تعبیر کا کام کرنے کے قابل بنانے کے لیے متعدد صحابہ کی ٹھوس تربیت کی۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کی وہ حدیث جس میں انہوں نے قرآن حکیم اور سنت نبویؐ کے بعد اپنی رائے پر عمل کرنے کا اظہار کیا تھا اس تربیت نبویؐ کے فیضان کا اظہار تھا(۶۰)

اسی طرح آپؐ نے اپنی موجودگی میں بعض صحابہ کرام سے دینی امور اور مذہبی مسائل پر فیصلے کرائے تھے ظاہر ہے کہ اس عہد مبارک و میمون میں تین اصول پوری طرح ظہور و عمل میں آچکے تھے اول یہ کہ معاملات زیر بحث کو قرآن حکیم کی روشنی میں حل کیا جائے اور وہاں کوئی ہدایت نہ مل سکے تو سنت کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے لیکن ان دونوں سے بھی اگر کسی خاص معاملہ پر روشنی نہ مل سکے تو اس "رائے" اور "خیال" پر اعتماد کیا جائے جو کتاب و سنت کی فہم کا زائیدہ و پابندہ ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کا واقعہ تنہا نہیں ہے۔ بلکہ وہ نمائندگی کرتا ہے اس امر واقعی کی کہ تمام مرکزی منتظمین اور ان کے ماتحت عامل کارکنان مذہبی و دینی معاملات کی تشریح و تعبیر کرنے کی نہ صرف پوری صلاحیت رکھتے تھے بلکہ عملاً انہوں نے ایسا کیا بھی تھا۔ اگر کسی معاملہ پر ان کو پورا شرح صدر نہیں ہوتا تھا تو وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کر لیتے تھے کہ آپؐ ہی شارع اول و مفتی اعظم تھے۔ بہر حال آپؐ کے بعد عموماً صحابہ کرامؓ اپنی ذاتی آراء و خیالات پر اعتماد کرتے تھے۔ البتہ بعض امور میں وہ خلیفۂ وقت سے بھی مشورہ کر لیا کرتے تھے کہ وہ ان سے زیادہ اہلِ علم اور تجربہ کار تھے۔

بہر حال ابن سعد نے اپنی مختلف روایتوں میں عہد نبوی کے مدینۂ منورہ کے کم از کم آٹھ صحابہ کرام کو مفتیان وقت میں شمار کیا ہے۔ ان میں سے پانچ کا تعلق مہاجرین قریش سے تھا اور باقی تین کا انصار کے قبیلہ خزرج سے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ تھے:

۱۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ ۲۔ حضرت عمر فاروقؓ ۳۔ حضرت عثمان بن عفانؓ ۴۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ

۵۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ۶۔ حضرت معاذ بن جبلؓ ۷۔ حضرت ابی بن کعبؓ اور ۸۔ حضرت زید بن ثابتؓ۔(۶۱)

ابن جوزی نے عہد نبویؐ کے مفتیوں کی تعداد تیرہ بتائی ہے اور مذکورہ بالا صحابہ کرام کے علاوہ حضرات عبداللہ بن مسعودؓ، حذیفہ بن یمانؓ، ابوالدرداءؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ اور سلمان فارسیؓ کے اسمائے گرامی کا اضافہ کیا ہے(۶۲)۔ ایک اور ماخذ کے مطابق کم از کم چودہ پندرہ صحابہ کرام فتویٰ دینے کے مجاز تھے۔ ان میں سے نئے نام یہ ہیں: حضرات عبداللہ بن عباسؓ، ابو ہریرہؓ، انس بن مالک اور زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ صدیقہؓ ایک اور ماخذ میں حضرت عمار بن یاسرؓ کا نام بھی انھیں اہلِ علم میں شمار کیا گیا ہے۔(۶۳)

جلال الدین سیوطیؒ نے جو فہرست دی ہے اس میں چھبیس صحابہ کے نام گنائے گئے ہیں اور دعویٰ کیا ہے کہ ان میں بعض کے

فتاویٰ کو متعدد ضخیم جلدوں میں مدون کیا جا سکتا ہے۔ اس فہرست میں جو نئے نام ہیں وہ یہ ہیں: حضرات عبداللہ بن عمر، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمرو بن عاص، جابر بن عبداللہ، ابوسعید خدری، زبیر بن عوام، عمران بن حصین، ابوبکرہ، عبادہ بن صامت، معاویہ بن ابی سفیان، عبداللہ بن زبیر اور زوجہ مطہرہ حضرت ام سلمہ۔(۶۴) یہ یقینی ہے کہ عہد نبوی میں مفتی بننے کے اہل صحابہ کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی اور ایک روایت جو ان کی تعداد ایک سو بیس بتاتی ہے بالکل قرین قیاس ہے۔(۶۵) اس سلسلہ میں یہ حقیقت یاد رکھنے کے لائق ہے کہ تمام صحابہ کرام جو اہل علم تھے اور کچھ مدت تک صحبت نبوی سے فیضیاب بھی ہوئے تھے "افتا" کے اہل تھے اور حقیقتاً "فتاویٰ" دیتے بھی تھے۔ لیکن عہد نبوی کے مفتیوں میں ایسے صحابہ کرام کو جو اس وقت محض خورد سال تھے جیسے حضرات عبداللہ بن عباس عبداللہ بن زبیر اور انس بن مالک وغیرہ شمار نہیں کرنا چاہئے۔ ان حضرات نے عہد نبوی کے بعد یہ خدمت انجام دی تھی اور خوب خوب انجام دی تھی۔

۴۔ ائمہ مساجد

اللہ تعالیٰ کے آخری رسول و پیغمبر ہونے کی وجہ سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باجماعت نمازوں کی امامت فرماتے تھے اور آپ کی موجودگی میں اصولی یا عملی طور سے کوئی اور نہ صرف یہ کہ نمازوں میں امامت نہیں کر سکتا تھا بلکہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں بھی کسی طرح کی قیادت کا حق دار نہیں بن سکتا تھا تاآنکہ آپ اس کو اپنا اختیار عارضی یا مستقل طور سے منتقل نہ کر دیں۔ چنانچہ مکی دورِ حیات میں صرف آپ ہی کی امامت کی مثالیں ملتی ہیں۔ البتہ آپ کی غیر حاضری میں کوئی صالح مسلمان امامت کے فرائض انجام دے سکتا تھا۔ اور عموماً آپ خود ایسے اماموں کا تقرر فرما دیتے تھے۔ مدینہ منورہ میں آپ کی آمد سے قبل مختلف مواقع پر مختلف اماموں کا ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ ابن سعد کا بیان ہے کہ انصار مدینہ کے نقیب النقباء حضرت اسعد بن زرارہ نمازوں میں مسلمانان مدینہ کی امامت کیا کرتے تھے۔(۶۶) اور کچھ مدت بعد جب حضرت مصعب بن عمیر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ فرستادہ کی حیثیت سے آ گئے تھے تو وہ ان کی جگہ مدینہ کے امام نماز بن گئے تھے۔(۶۷) پھر جب حضرت مصعب ملاقات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مکہ گئے تو ان کی جگہ امامت کا فریضہ حضرت اسعد بن زرارہ انجام دینے لگے تھے۔(۶۸) اسد الغابہ کا بیان ہے کہ قبا کی مسجد میں جو اسلام میں پہلی مسجد تھی حضرت حنظلہ بن ابی حنظلہ امامت کیا کرتے تھے۔(۶۹)

بخاری، ابوداؤد، ابن اسحاق اور ابن ہشام وغیرہ کی متعدد روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے مدینہ کے مسلمانوں کے دو امام نماز ہوا کرتے تھے؛ ایک حضرت مصعب بن عمیر عبدری تھے جو انصار کے امام تھے اور دوسرے حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ تھے جو مہاجرین کی امامت کیا کرتے تھے۔(۷۰) اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مدینہ میں دو مسجدیں تھیں اور ان کے علاوہ قبا کی مسجد تیسری تھی۔ ہجرت نبوی کے بعد مدنی مسلمانوں کے امام خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہو گئے تھے۔

جوں جوں اسلام کی اشاعت اور اسلامی ریاست کے اثر و نفوذ کا دائرہ وسیع ہوا توں توں مسجدوں کی تعداد میں اضافہ ہوا گیا اور جزیرہ نمائے عرب کے تقریباً تمام قبیلوں اور ان کے خاندانوں میں مسجدیں تعمیر ہو گئیں۔ کیونکہ نماز (الصلوٰۃ) دین کا سب سے اہم رکن

ہے۔ دراصل یہ مسجدیں محض عبادت گاہیں نہیں تھیں بلکہ مقامی مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، تنظیمی اور تہذیبی مراکز تھے جہاں امت اسلامیہ کا شیرازہ مجتمع کیا جاتا تھا۔ خود اسلامی ریاست کے صدر مقام مدینہ منورہ میں متعدد مسجدیں بن گئی تھیں کیونکہ وہاں مسلم آبادی اتنی زیادہ تھی کہ مسجد نبوی تمام مدنی مسلمانوں کے لیے کفایت نہیں کر سکتی تھی۔ صحیح بخاری کی متعدد روایات مدینہ منورہ کی مختلف مساجد کی طرف اشارہ کرتی ہیں جہاں پابندی کے ساتھ نماز باجماعت ادا کی جایا کرتی تھی۔ مدینہ اور قبا کی دو مسجدوں کے علاوہ جو عام طور پر معروف ہیں امام بخاری نے دو اور مسجدوں کا ذکر کیا ہے جو دو انصاری خاندانوں بنو زریق[۱] اور بنو عمرو بن عوف کی مسجدوں[۲] کے نام سے مشہور تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان تمام مساجد میں نمازوں کے امام مقرر تھے اور جن کی تقرری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہوئی تھی[۳]۔

ایک اور روایت کا بیان ہے کہ حضرت عتبان بن مالک انصاری اپنی قوم کے امام تھے اور ان کی باجماعت نمازوں میں امامت کیا کرتے تھے اگرچہ اس روایت سے ان کے قبیلہ یا خاندان کا نام نہیں معلوم ہوتا ہے[۴]۔ بہرحال اسد الغابہ کی روایت سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ وہ خاندان بنی سالم کے جو خزرج کا ایک اہم بطن تھا امام تھے اور انہوں نے اپنے نابینا ہونے تک امامت کا فریضہ انجام دیا تھا اور اس کے بعد انہوں نے ایک خانہ مسجد بنالی تھی جہاں یاد خدا کیا کرتے تھے[۵]۔ اسی ماخذ کا بیان ہے کہ انصار کے قبیلہ اوس کے ایک خاندان بنو خطمہ نے بھی اپنی ایک مسجد بنالی تھی جس کے امام حضرت عبداللہ بن عمیر خطمی تھے[۶]۔ حضرت معاذ بن جبل کے بارے میں روایت آتی ہے کہ وہ اپنی قوم یعنی بنو جشم خزرج کے امام تھے۔ اور مسجد نبوی میں نماز عشاء پڑھنے کے باوجود اپنی قوم کی مسجد میں لوگوں کی امامت کیا کرتے تھے[۷]۔

سنن ابی داؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اوس کے خاندان بنو عبد الاشہل کے ممتاز صحابی اور سردار حضرت اسید بن حضیر اپنی قوم کے امام مسجد تھے[۸]۔

محدث ابو داؤد نے اپنی سنن ہی کے ایک الگ باب میں جس کو انہوں نے "کتاب المراسیل" کا عنوان دیا ہے مدینہ کی کم از کم نو مسجدوں کا ذکر کیا ہے جن میں عہد نبوی میں باقاعدہ جماعت کے ساتھ نمازیں ان کے اپنے اماموں کی امامت میں ادا کی جاتی تھیں۔ یہ تمام مسجدیں مختلف انصاری اور بدوی مہاجر قبیلوں کے نام سے منسوب تھیں۔ چنانچہ بنو عمرو، بنو ساعدہ، بنو عبید، بنو سلمہ، بنو ریاح، بنو زریق، بنو غفار، بنو اسلم اور بنو جہینہ کی مساجد کا ذکر ملتا ہے[۹]۔ موخر الذکر مسجد کا حوالہ ابن سعد نے بھی دیا ہے[۱۰]۔

صحیح بخاری کی شرح عینی کے ایک موضوع پر بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا نو مسجدوں کے علاوہ مدینہ منورہ اور اس کے نواحی علاقوں میں کم و بیش بائیس اور مسجدیں تھیں جہاں پابندی کے ساتھ جماعت پنجگانہ ادا کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان نمازوں کی امامت کے لئے مستقل امام مقرر کئے گئے تھے۔ ان مساجد کے نام تھے:

مسجد بنو خدرہ، مسجد بنو امیہ، مسجد بنو بیاضہ، مسجد بنو حبلی، مسجد بنو عصیبہ، مسجد بنو ابی فیصلہ، مسجد بنو دینار،
مسجد ابی بن کعب، مسجد نابغہ، مسجد ابن عدی، مسجد بنی الحارث (خزرج)، مسجد بنی خطمہ، مسجد الفضیح، مسجد بنی حارثہ،

مسجد بنی ظفر، مسجد بنی عبد الاشہل، مسجد وقیم، مسجد بنی معاویہ، مسجد عائکہ، مسجد بنی قریظہ، مسجد بنی وائل اور مسجد الشجرہ(۸۱)۔ یہ تمام مساجد یا تو انصار کے خاندانوں کی طرف منسوب تھیں یا ان کے بعض اہم افراد کی طرف۔ ایک دو کا انتساب مقامات کی طرف بھی تھا۔ بہرحال اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان میں ایک مسجد مشہور یہودی قبیلہ بنی قریظہ کے نام سے بھی موسوم تھی۔ اگرچہ اس کی تاریخی اور سماجی اہمیت پر بحث کا یہ موزوں مقام نہیں ہے تاہم یہ عرفات اور برکات احمد کی تحقیقات کی بالواسطہ تصدیق کرتی ہے کہ بنی قریظہ کا قتل عام نہیں کیا گیا تھا۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ ایک خاصی بڑی بستی تھی جہاں کافی مسلم آبادی تھی اور تقریباً اوس و خزرج کے تمام بڑے بڑے خاندانوں کی اپنی مسجدیں تھیں۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے مہاجر یا مقامی باشندوں کے طبقات کی بھی مساجد تھیں اور ان کی تعداد کافی تھی۔ ان تمام مساجد میں مستقل امام تھے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ تھے۔

اسلامی ریاست کے صدر مقام مدینہ منورہ کے باہر جزیرہ نمائے عرب کے ہر گوشے میں جہاں مسلمان بستے تھے بلکہ ہر قبیلہ اور ہر خاندان (بطن) کے بیچ ایک یا اس سے زیادہ مساجد موجود تھیں(۸۲)۔ اوپر حوالہ آچکا ہے کہ بحرین کے قبیلہ عبد القیس کی ایک مسجد جواثی نامی مقام پر تھی جہاں مسجد نبوی کے بعد پورے عرب میں سب سے پہلا جمعہ قائم کیا گیا تھا(۸۳)۔ ظاہر ہے کہ بحرین میں صرف یہی ایک مسجد نہ تھی، روایات میں آتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی وہاں متعدد مسجدیں تھیں۔ خانہ کعبہ اور اس کے گرد مسجد حرام مکہ مکرمہ کی مسجد جامع تھی جس کے امام وہاں کے گورنر حضرت عتاب بن اسید اموی تھے(۸۴)۔

اگرچہ مکہ کی اور کسی مسجد کا ذکر نہیں ملتا لیکن یہ قرین قیاس ہی نہیں بلکہ یقینی امر ہے کہ اس کے علاوہ بھی وہاں متعدد مساجد تھیں۔ مکہ کی قریبی بستی طائف میں اس کے گورنر حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی نمازوں کے امام بھی تھے(۸۵) اور ظاہر ہے کہ دوسری مساجد بھی طائف اور ثقیف کے علاقے میں تھیں جہاں مستقل ائمہ کام کرتے تھے۔ جب حضرت عمرو بن العاص سہمی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمان کا گورنر بنا کر بھیجا تھا تو ان کے ساتھ حضرت ابو زید انصاری کو اس علاقے کا پیش امام مقرر فرما کر ساتھ روانہ کیا تھا(۸۶)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمان کے لیے ایک مخصوص انتظام تھا ورنہ عام طور سے علاقوں اور ولایات کے مرکزی منتظمین یا والی ہی ان کے امام بھی ہوتے تھے۔ جیسا کہ مکہ، طائف، جنوبی عرب، اور اسی کے ماتحت مختلف ولایات سے معلوم ہوتا ہے(۸۷)۔

مرکزی منتظمین یا والی تو عام طور سے ولایات کے صدر مقام پر سکونت پذیر رہتے تھے اس لیے وہ وہاں کی جامع مسجد ہی کے امام ہو سکتے تھے اور ظاہر ہے کہ پورے شہر میں صرف ایک ہی مسجد نہیں ہوتی تھی بلکہ محلہ محلہ میں مسجدیں ہوتی تھیں جیسی کہ آج کل ہوتی ہیں اور ان مسجدوں میں مقامی لوگ ہی خاص کر مقامی سربرآوردہ لوگ یا منتظمین ہی امام ہوتے تھے بشرطیکہ ان کو قرآن کریم کا مناسب علم ہو اور مسائل سے ضروری واقفیت ہو۔ چنانچہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شداد بن ثمامہ کو جو بنو کعب بن اوس کے سردار تھے اپنی قوم کا امام مقرر کیا گیا تھا کیونکہ وہ اس منصب کے پوری طرح اہل تھے(۸۸)۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امام نماز کے لیے اوصاف اور شرائط مقرر کردی تھیں چنانچہ صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق "جو لوگ قرآن کے سب سے زیادہ حافظ (اور عالم) ہوں وہ امامت کے سب سے زیادہ اہل ہیں۔ اگر تمام نمازی اس میں مساوی ہوں تو وہ شخص جو سنت کا سب سے

زیادہ علم رکھتا ہے - اگر اس میں بھی سب برابر ہوں تو سب سے قدیم مہاجر اور، اگر اس میں بھی سب مساوی ہوں تو سب سے زیادہ معمر آدمی امام بنے گا۔" (۸۹)

حضرت عثمان بن ابی العاص اور عمرو بن سلمہ کا بنو ثقیف اور بنو جرما کا امام مقرر کیا جانا اسی اصول کی بنا پر تھا حالانکہ یہ دونوں نسبتاً بہت کمسن تھے - مگر چونکہ وہ اپنے قبیلوں میں سب سے زیادہ قرآن جانتے تھے اس لئے ان کو دوسروں پر ترجیح دی گئی تھی۔

واقدی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کثیر آبادی والے عرب قبیلوں اور خاندانوں کی اپنے اپنے علاقوں میں متعدد مسجدیں ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر بنو جذیلہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے کھیتوں، میدانوں یا صحنوں (ساحاتہم) میں متعدد مسجدیں تھیں۔(۹۰) اسی طرح بنو مصطلق نے اپنے کھلے میدانوں میں کئی مسجدیں (مساجد) بنالی تھیں۔(۹۱) یہاں عہد نبوی کے تمام اماموں یا ان کی مسجد کا ذکر مقصود نہیں ہے بلکہ یہ ثابت کرنا مطلوب ہے کہ جہاں جہاں معتدبہ مسلم آبادی تھی وہاں ان کی تعداد کی مناسبت سے مسجدیں آباد ہو گئی تھیں اور جہاں پنج وقتہ نمازیں ادا کی جاتی تھیں وہاں امام نماز تھے۔ ان ائمہ مساجد کا تقرر یا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود فرمایا تھا یا قبیلہ / خاندان کے مسلمانوں نے منتخب کر لیا تھا اور ان کی تقرری کو خاموش اجازت نبوی حاصل تھی۔

غیر معمولی حالات میں مسجد نبوی میں یا کسی دوسری جگہ صحابہ کرام میں کوئی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ مسلمانوں کی نماز میں امامت کر سکتا تھا۔ چنانچہ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ مدینہ منورہ سے آپؐ کی غیر حاضری کے زمانے میں نائبین رسولؐ مسجد نبوی میں مسلمانانِ مدینہ کی امامت کیا کرتے تھے۔ یہ بھی حوالہ گذر چکا ہے جیسا کہ واقدی اور ابن سعد کے متفقہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے زمانے میں جب عظیم اسلامی لشکر شمالی سرحدوں کی طرف رواں دواں تھا تو اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا - ایک حصہ کی امامت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اور دوسرے کی حضرت ابوبکر صدیقؓ۔(۹۲) یہاں یہ بھی بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کارکنان ریاست جیسے والی، گورنر اور سالار وغیرہ بھی مستقل امام نماز ہوا کرتے تھے، سالاروں کے سلسلہ میں حضرت عمرو بن عاص سہمی کی امامت نماز کا واقعہ بڑا دلچسپ بھی ہے اور اہم (۹۳) بھی۔ غزوہ تبوک کے دوران ایک موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے امامت کی تھی۔ یہ واقعہ ماخذ میں بڑے دلچسپ انداز سے بیان ہوا ہے:

روایت کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی ضرورت سے تھوڑی دیر کے لئے لشکر گاہ سے کہیں چلے گئے۔ اسی دوران نماز کا وقت آگیا (بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت تنگ ہونے لگا اور خدشہ پیدا ہوا کہ نماز قضا نہ ہو جائے)۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے نماز پڑھانے کو کہا۔ ان کو تردد تھا لیکن قضا ہونے کے خوف سے انہوں نے نماز شروع کر دی۔ ایک رکعت ہو چکی تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے آپ کو دیکھ کر پیچھے ہٹنا چاہا مگر آپ نے ان کو اشارہ سے نماز مکمل کرنے کی ہدایت کی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ اپنی نماز ان کی امامت میں پوری کی بلکہ بعد میں ان کے اقدام کی تعریف و تحسین فرمائی کہ "تم نے خوب کیا۔ کسی نبی نے اس وقت تک وفات نہیں پائی

جب تک کہ اس کے صحابہ میں سے کسی نیک آدمی کی امامت میں اس نے نماز نہ پڑھ لی۔"[۹۴]

یہ واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں روایات کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق نے سترہ نمازیں پڑھائی تھیں اور ایک بار آپ خود بھی اس میں شریک ہوتے تھے۔[۹۵] علماء و فقہاء کا خیال ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رض اس وقت امام نہیں رہے تھے بلکہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرتے تھے اور ان کی اقتدا تمام مسلمان کرتے تھے۔ مگر یہ دور کی اور غیر معقول دلیل اور تاویل ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رض کی امامت میں آپ کے نماز پڑھنے کی روایت اگر صحیح ہے (اور اس کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں، تو پھر حضرت ابوبکر صدیق رض کی امامت میں آپ کا نماز پڑھنا کیوں مشتبہ سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال مذکورہ بالا بحث سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے اس اولین رکن کی ادائیگی کے لیے آپ نے مستقل ائمہ مساجد کا تقرر کیا تھا جو دن رات پانچ وقت اللہ کی عظمت کے گن گاتے تھے۔

۵۔ مؤذنینِ رسول ؐ

اذان نماز کو قائم کرنے کی ایک لازمی اور منطقی شرط ہے کہ مسلمانوں کو باقاعدہ اعلان کرکے نماز کے لیے جمع کرنا مختلف وجوہ سے ناممکن تھا۔ ہجرت نبوی کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو جماعت پنجگانہ کے لئے کیونکر اکٹھا کیا جائے۔ اس سے پہلے مدنی مسلمان ایک مقررہ وقت پر جمع ہو جایا کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں اذان کی ابتدا کا دلچسپ واقعہ نقل ہوا ہے۔ اس کے مطابق تمام مسلمان مسجد میں جمع ہوئے اور یہ بحث ہوئی کہ نماز کے لیے مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کا بہتر طریقہ کیا ہے۔ مختلف تجاویز پیش کی گئیں مگر ان میں سے کوئی بھی بابِ رسالت سے منظور نہ ہوئی۔ بالآخر حضرت عمر بن خطاب نے[۹۶] "اذان" کا طریقہ تجویز کیا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پسند آیا۔ بہرحال اسی پر عمل درآمد شروع ہوا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال حبشی کو اسلام میں پہلا مؤذن مقرر فرمایا۔"[۹۷] وہ جماعت پنجگانہ کے لیے مسجد نبوی سے مسلمانوں کو خدا کی بارگاہ میں حاضری کے لیے بلاتے تھے۔"[۹۸] روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد میں روزوں کی فرضیت کے بعد رمضان میں وقت سحری کے شروع ہونے کا اعلان اپنی اذان سے کرتے تھے۔"[۹۹] مآخذ کے متفقہ بیانات کے مطابق حضرت بلال حبشی رض نے حیات نبوی کے آخری لمحہ تک خواہ آپ سفر میں ہوں یا حضر میں مؤذن رسول ؐ ہونے کی سعادت پائی تھی اور بلا ریب اس میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا، نہ شریک و سہیم۔[۱۰۰]

ابن سعد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین مؤذن تھے: حضرت بلال حبشی رض، حضرت ابو محذورہ رض جن کا اصل نام اوس بن معیر جمحی تھا اور حضرت عمرو بن ام مکتوم عامری رض۔ اس روایت کے مطابق حضرت بلال رض کی غیر حاضری میں حضرت ابو محذورہ اذان دیتے تھے اور حضرت ابو محذورہ کی عدم موجودگی میں حضرت ابن ام مکتوم۔[۱۰۱]

لیکن ابن سعد کی اس روایت کا آخری حصہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ بلاشبہ یہ تینوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن تھے مگر حضرت ابن ام مکتوم۔ کے بارے میں اب تک جتنی روایات مل سکی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رمضان میں سحری کے ختم ہونے کے اعلان کی اذان دیتے تھے۔"[۱۰۲] اور غیبت نبوی میں امام نماز ہوتے تھے نہ کہ مؤذن۔ جہاں تک حضرت ابو محذورہ کا تعلق ہے

انہوں نے عہد نبوی میں ہمیشہ مکہ مکرمہ کے خانہ کعبہ میں اذان دی۔ انہوں نے مدینہ میں کبھی اذان نہیں دی۔ روایات کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ حضرت ابو محذورہ جمحی فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھے اور ان کی شیریں آواز اور دل سوز انداز کی بنا پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خانہ کعبہ یا حرم مکہ کا مؤذن مقرر کر دیا تھا۔[۱۰۳] یہ خدمت نبوی ان کو ایسی راس آئی کہ ان کی حیات کے بعد حرم کعبہ میں اذان کی سعادت ان ہی کے خاندان میں نسل در نسل منتقل ہوتی رہی تھی۔[۱۰۴]

اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت سعد بن عائذ کو جو سعد القرظ کے نام سے زیادہ مشہور رہیں، مسجدِ قبا کا مؤذن مقرر کیا گیا تھا لیکن اس روایت کے مطابق وہ حضرت بلال حبشی کی عدم موجودگی میں مدینہ میں بھی اذان دیتے تھے۔[۱۰۵] اس روایت کا بھی آخری حصہ صحیح نہیں ہے۔ ابن قتیبہ دینوری کا واضح اور صریح بیان ہے کہ صحابی موصوف حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کی خلافت کے آخر تک مسجد قبا ہی کے مؤذن رہے تھے۔ جب حضرت عمر بن خطابؓ خلیفہ ہوئے اور حضرت بلال رضؓ حبشی ان کی اجازت سے شام چلے گئے تو خلیفہ دوم ان کو مدینہ کی مسجد نبوی میں لے آئے تھے۔[۱۰۶]

بہر حال صحابی موصوف عہد صدیقیؓ میں مدینہ آئے ہوں یا عہد فاروقیؓ میں یہ امر اپنی جگہ مسلم ہے کہ وہ عہد نبوی میں مسجد قبا ہی کے مؤذن رہے تھے۔ اور ابنِ قتیبہ کے مطابق حضرت سعد القرظ کے جانشین مؤذنین ان کے اپنے خاندان والے تھے جو ابنِ قتیبہ کے زمانے میں بھی اپنے عہدے پر برقرار رہے تھے۔

اسد الغابہ کے ایک بیان کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور مؤذن کا نام حضرت عبد العزیز بن اصم تھا۔ اس روایت میں اس کے علاوہ اور کچھ مذکور نہیں ہے۔[۱۰۷] بہر حال کتانی کا خیال ہے کہ صحابی موصوف نے صرف ایک بار عہد نبوی میں اذان دی تھی۔[۱۰۸] موخر الذکر مصنف کا مزید بیان ہے کہ حضرت زید بن حارث الصدائی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مؤذن تھے۔[۱۰۹] مصنف عبد الرزاق کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور مؤذن کا نام حضرت ثوبان تھا جو آپ کے مولیٰ تھے اور جنہوں نے صرف ایک بار یہ خدمت انجام دی تھی۔[۱۱۰] مقریزی کی خطط کی بنیاد پر کتانی کا مزید بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آٹھویں مؤذن اور کوئی نہیں جناب عثمان بن عفان اموی تھے جو منبر رسولؐ کے پاس اذان دیا کرتے تھے۔[۱۱۱] غالباً اس سے مراد جمعہ کی دوسری اذان ہے جو خطبہ کے شروع ہونے سے قبل امام کے سامنے دی جاتی ہے۔ مآخذ میں عام طور سے مؤذنین رسولؐ کے بارے میں یہ سکہ بند فقرہ ملتا ہے کہ "وہ حضرت بلالؓ کے جانشین مؤذن تھے۔" عموماً اس تبصرہ کا سبب مورخین یا راویوں کی یہ غلط فہمی معلوم ہوتی ہے کہ وہ مسجد نبوی کو جہاں حضرت بلالؓ اذان دیتے تھے مدینہ کی صرف ایک مسجد تصور کر لیتے ہیں۔ بہر حال دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ کبھی کبھی حضرت بلال حبشی کی غیر حاضری میں کسی اور نے بھی ضرور اذان دی ہوگی۔

اسد الغابہ میں ایک خبر واحد سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوقات مختلف قبائل عرب کے لیے بھی ائمہ کی مانند مؤذنوں کا بھی تقرر کیا تھا۔ روایت کے مطابق حضرت سفیان بن قیس رضؓ کندی کو جو کندہ کے وفد میں حضرت اشعث بن قیس رضؓ کے ساتھ آئے تھے اور ان کے حقیقی بھائی بھی تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے قبیلہ کے لیے مؤذن مقرر کیا تھا۔[۱۱۲] بہر حال یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف خطوں میں بکھری ہوئی مسجدوں میں مؤذنین بھی تھے۔ خواہ ان کی تقرری رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے براہ راست کی ہو یا بالواسطہ - دونوں صورتوں میں وہ عہد نبوی کے مذہبی نظام کا ایک حصہ تھے۔ کیونکہ اذان نماز کے قائم کرنے کے لیے ایک ضروری بلکہ ناگزیر شرط بن گئی تھی۔

بعض اوقات جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان کو بعض اہم سیاسی اور سماجی امور پر بحث کرنے کی خاطر مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ جب کبھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی اہم اور غیر معمولی مسئلہ پر بحث مباحثہ کے لیے مسلمانوں کو جمع کرنا چاہتے تھے تو حضرت بلال حبشی یا اور کوئی موذن اذان دیتا تھا یا مدینہ کی گلیوں میں الصلوٰۃ جامعۃ (نماز جمع کرنے والی ہے) کی صدائیں دیتا گذرتا تھا اور لوگ مسجد میں جمع ہو جاتے تھے۔ لیکن اس کام کے لیے بھی اکثر اذان کا ہی استعمال کیا جاتا تھا۔

۶ - امورِ حج کی تنظیم

حج اسلام کا چوتھا رکن ہے اور ان تمام مسلمانوں پر جو اس کے اخراجات برداشت کر سکتے ہوں فرض ہے۔ اسلامی اصولوں کے مطابق حج کا قیام اور ادائیگی صرف اسلامی حکومت کی نگرانی میں ہو سکتی ہے۔ اسی بنا پر مسلمانوں نے فتح مکہ سے قبل خانہ کعبہ کا حج نہیں کیا تھا، حالانکہ صلح حدیبیہ کے بعد وہ عمرہ کے لیے انفرادی طور سے اور باجماعت جاتے رہے تھے۔ اسی بنا پر اسلام میں پہلے حج کے سوال پر مورخین اور محدثین کے نزدیک اختلاف بھی ہے کہ وہ کب اور کس کی زیر نگرانی ہوا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے تقریباً تین ماہ بعد مسلمانوں نے پہلی بار حج مکہ کے اموی گورنر حضرت عتاب بن اسیدؓ کی نگرانی وامارت میں ادا کیا تھا۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی موصوف کو امیر حج مقرر نہیں کیا تھا تاہم انہوں نے یہ فریضہ اپنی امارتِ بلد (شہر کے گورنر ہونے) کے سبب ادا کرایا تھا۔[13] لیکن دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دربارِ رسالتؐ سے ان کو باقاعدہ امیرِ حج مقرر کیا گیا تھا۔[14] بہر حال اس اختلافِ روایات سے قطع نظر کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس حیثیت سے تقرری صراحتاً کی تھی یا محض آپ کی خاموش رضا حاصل تھی یہ امر مسلم ہے کہ اسلام میں اول حج ان کی امارت میں ادا ہوا تھا۔

بہر حال دوسرے برس جیسا کہ تمام روایات کا اتفاق ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سب سے عظیم صحابی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو باقاعدہ "امیرِ حج" مقرر کر کے مدینہ سے روانہ کیا تھا۔[15] یہ تقرری اس حقیقت کی علامت تھی کہ آئندہ سے حج کے فریضہ کی ادائیگی اسلامی ریاست کی زیر نگرانی ہوا کرے گی بہر حال اس برس غیر مسلم عربوں کو بھی حج میں شرکت کی اجازت دے دی گئی تھی لیکن اسی موقعہ پر یہ اعلان بھی کر دیا گیا تھا کہ اگلے برس سے غیر مسلموں کو نہ تو حج میں شرکت کی اجازت ہو گی اور نہ مکہ مکرمہ میں داخلے کی۔ اس اہم اعلان کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو اپنا خصوصی ایلچی بنا کر حضرت ابوبکر صدیق کی روانگی کے بعد مکہ بھیجا تھا۔[16] جہاں انہوں نے سورہ توبہ کی متعلقہ آیات[17] لوگوں تک پہونچائی تھیں۔ عہد نبوی کا آخری حج جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی امارتِ خاص میں ادا کیا گیا تھا۔[18] حقیقت میں یہ آپ کی عوامی زندگی اور عہدۂ رسالت کا نقطۂ عروج تھا کہ جب آپ نے انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کے سامنے جن کی تعداد ایک لاکھ ساٹھ ہزار بتائی جاتی ہے۔[19] اللہ تبارک تعالیٰ کا آخری پیغام پہنچایا تھا اور اسلام کی تکمیل کی تھی۔ اسی مبارک موقع پر آپ نے مسلمانوں کو ہدایت کی تھی کہ ان کے حاضر (شاہد) لوگ اپنے پیچھے رہ جانے والے بھائیوں (غائب) کو اللہ کا پیغام پہونچا دیں۔ گویا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کا اعلان

خفی اور مسلمانوں کو "کارِ نبوی" کا حامل ہونے کا اظہار برملا کر دیا تھا۔[120]

ابن اسحاق اور طبری کے بیانات کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر اپنی آواز دوسروں تک پہونچانے کے لئے حضرت ربیعہ بن امیہ بن خلف کو اپنا منادی اور اعلان کو دہرانے والا (الذی یصرخ فی الناس) مقرر کیا تھا۔ چنانچہ وہ آپ کے فقرے اور جملے اپنی غیر معمولی بلند آواز میں دہراتے رہتے تھے۔[121] اسی طرح بخاری اور مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری حج کے دوران متعدد مواقع پر ایک اور صحابی حضرت جریر بن عبداللہ بجلی نے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی کا کام کیا تھا۔[122]

یہ عین ممکن اور قرین قیاس ہے کہ اس عظیم اجتماع کے موقع پر جب قرون وسطیٰ کے معیار کے مطابق بہت بڑا مجمع تھا متعدد صحابہ مختلف مواقع پر آپ کے فقروں، جملوں اور خطبات کو دہراتے رہے ہوں تاکہ تمام سننے والوں تک آپ کا پیغام پہنچ جائے۔ اسی ضمن میں یہ بھی بیان کر دیا جائے کہ ۹ھ / ۶۳۱ء کے حج کے موقعہ پر حضرت اوس بن حدثان کو جن کا تعلق قبیلہ ہوازن سے تھا منیٰ میں ایک مذہبی اعلان کرنے کے لئے مدینہ سے روانہ کیا گیا تھا۔[123]

عہد نبوی کے مذہبی نظام میں حج کے سلسلہ میں جن افسروں اور کارکنوں کو مقرر کیا گیا تھا ان میں ایک اہم افسر وہ ہوتا تھا جو عمرہ یا حج کے مواقع پر قربانی کے جانوروں کا نگراں ہوتا تھا۔ ایسے جانوروں کو ھدی کہا جاتا ہے اور افسر کو صاحب الھدی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۶ھ / ۶۲۸ء سے جب آپ پہلی بار عمرہ کے لیے تشریف لے گئے تھے اور جس موقع پر صلح حدیبیہ ہوئی تھی آخری حج کے زمانے تک یا تو بنفس نفیس قربانی کے جانور ساتھ لے جاتے تھے یا ان کو کسی صحابی کے ساتھ روانہ فرماتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے زمانے میں آپ کی ھدی کے نگراں افسر حضرت ناجیہ بن جندب اسلمی تھے۔[124]

ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس "منصب" پر مستقل طور سے فائز تھے کیونکہ وہ اس کے بعد تمام مواقع حج اور عمرہ پر "ھدی رسول" لے کر مکہ جاتے رہے تھے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ، عمرۃ القضیہ، حج ابی بکر اور حجۃ الوداع کے دوران ان کے اس فریضہ کا ذکر ملتا ہے۔[125]

بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار حضرت علی بن ابی طالبؓ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ھدی لے کر مکہ گئے تھے۔[126] لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ صحابی موصوف نے کس موقع پر یہ فریضہ انجام دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی عمرہ کے سفر کے دوران یہ ھدی رسول لے کر گئے تھے۔ اسی طرح اسد الغابہ کی دو روایات دو اور صحابیوں حضرات ذویب بن طلحہ کعبی خزاعیؓ اور عمرو بن ثمالی / ہمازن کا بھی بطور صاحبانِ ھدی رسول ذکر کرتی ہیں لیکن وہ بھی مواقع یا زمانے کا کوئی حوالہ نہیں دیتی ہیں۔[127] قیاس یہی ہوتا ہے کہ مختلف عمروں کے زمانے میں یہ تقرری ہوئی ہوگی۔ اس کے علاوہ ابن حزم نے بھی ایک جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صاحب الھدی کا ذکر کیا ہے جن کا اسم گرامی خالد بن سیار غفاریؓ تھا۔[128]

یہ ممکن ہے کہ بعض دوسرے صحابہ کرام نے بھی وقتاً فوقتاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا اسلامی ریاست کے لیے یہ فریضہ انجام دیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک یا دو مواقع پر ہی متعدد لوگوں نے یہ خدمت انجام دی ہو۔

خانہ کعبہ کی دیکھ بھال اور تولیت ایک اہم مذہبی ذمہ داری تھی۔ اسی طرح حرم مکہ کے حدود کی تعیین کی بھی دینی اہمیت تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے لیے مناسب انتظامات فرمائے تھے۔ یہ مشہور حقیقت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباس بن عبد المطلب کو قدیم مکی عہدہ سقایہ (حجاج کو پانی پلانے کی ذمہ داری) پر بحال کیا تھا۔[129] جو انھیں بہ اختلاف روایت ان کے والد ماجد عبد المطلب یا بھائی ابو طالب سے زمانۂ جاہلیت میں ملا تھا۔[130] اسی موقع پر آپ نے تولیت کعبہ کے عہدے پر جس کو قدیم زمانے سے حجابہ کہا جاتا تھا حضرت عثمان بن طلحہ عبدری کو بدستور سابق بحال رکھا تھا۔[131] جن کے خاندان میں یہ منصب بانی شہر مکہ قصی بن کلاب کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔[132] روایت ہے کہ اسی موقع پر آپ نے حضرت تمیم بن اسید خزاعی کو حرم مکہ کے حدود کی از سر نو تنصیب اور تعیین کے لیے مامور کیا تھا۔[133] قبیلہ خزاعہ کے ایک شخص کو اس خدمت کے لئے غالباً اس لئے منتخب کیا گیا تھا کہ یہ قبیلہ حرم اور کعبہ کے معاملات کا آشنا و عارف تھا اور مدتوں ان سے وابستہ رہا تھا۔[134]

عہدِ نبویؐ کی ابتدائی مہمیں
محرکات، مسائل اور مقاصد

سیرت نبویؐ کے اولین مؤلف ابن اسحاق اور مغازی نگاروں کے سرخیل واقدی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی مہموں کے بارے میں جو نقطۂ نظر اپنے زمانے میں متعین کر دیا تھا وہ بعد کے دوسرے تمام سیرت نگاروں اور مغازی نویسوں نے بلا تحقیق و تنقید قبول کر لیا۔ ابتدائی مؤلفین سیرت و مغازی بنیادی طور پر اپنے پیشرو "راویوں" اور "اخباریوں" کی "روایات" اور "اخبار" کے پابند تھے۔ اور وہ اپنے پیشرؤوں کے طے کردہ خطوطِ فکر و نظر سے ہٹنا بدعت تصور کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو فکری رخ ابتدائی رواۃ و اخباریوں نے اپنی دانست میں صحیح سمجھ کر آنے والی نسلوں کے لیے متعین کیا تھا وہ دوسری اور تیسری صدیوں کے جامعین سیرت و تاریخ کی تحریروں میں انمٹ نقوش چھوڑ گیا۔ اس میں ابتدائی راویوں اور اخباریوں کی کسی بدنیتی یا غلط بیانی کو عموماً دخل نہیں تھا بلکہ اس کی ذمہ داری دراصل ان کے غیر مورخانہ اور غیر تنقیدی طرزِ روایت و نگارش پر عائد ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک راوی یا اخباری کا فرض بس یہ تھا کہ ان تک پہونچنے والی روایت کو جوں کا توں بیان کر دے۔ ابتداءً تاریخ نگاری اسلام میں تو راویوں کی شخصیت، دیانت اور ثقاہت وغیرہ کو بھی نہیں پرکھا جاتا تھا لیکن جب مختلف، متصادم اور موضوع روایات ایک ہی واقعہ یا معاملہ کے بارے میں ان کے سامنے آئیں تو اصل منبعِ روایت تک کسی روایت کو جانے اور بتانے کا اصول وضع کیا گیا اور سند کا سلسلہ شروع ہوا لیکن اس کے بعد بھی صرف توجہ اس پر مرکوز رہی کہ راویوں کے ثقہ اور قابل اعتماد ہونے کا یقین کر لینے کے بعد روایت کو بیان کر دیا جائے۔ اس کے سوا نہ تو متنِ روایت کو تنقید کی کسوٹی پر کسا جاتا تھا اور نہ ہی درایت کے دوسرے اصولوں پر حتیٰ کہ راوی اپنی رائے دینے سے بھی اجتناب کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی کتب تاریخ و سیرت میں ایک ہی واقعہ یا معاملہ کے بارے میں متعدد اور بسا اوقات متصادم روایات و اخبار جمع ہو گئے اور دوسرے جو نقطۂ نظر یا نقطہ ہائے نظر شروع میں متعین ہو گئے تھے، غلط یا صحیح طور پر وہ بعد کے مؤلفوں کے یہاں راہ پا گئے جو بقول ابن خلدون محض ناقابل اور منطقوں (بچکانہ ذہن و دماغ والے) تھے۔

ابتدائی راویوں اور ان کی اتباع میں ابتدائی مؤلفین سیرت و مغازی نے بنیادی طور سے ہجرت کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر تحریک کو عام طور سے اور ابتدائی مہموں کو خاص طور سے قریش مکہ کی اسلام سے عداوت کے پس منظر میں دیکھا اور سمجھا ہے۔ وہ صحیح سمجھتے تھے کہ قریش مکہ مدینہ میں اسلام کے کسی مذہبی، سیاسی اور فوجی نظام کو پنپنے نہیں دیں گے کیونکہ وہ اشراف مکہ کی سیاسی اور مذہبی بالادستی کے خاتمے کے مترادف ہوتا۔ عداوت قریش کے اس پس منظر میں اخباریوں نے یہ خیال کیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں جو بھی سیاسی یا فوجی کارروائی کی یا کرنی چاہی وہ دراصل قریش کے عداوت اسلام کے بطن سے پیدا ہونے والی ممکنہ کارروائیوں کی پیش بندی تھی۔ چنانچہ اپنے اس خیال کے مطابق انہوں نے یہ سمجھا کہ ہجرت

کے بعد اور غزوہ بدر سے پہلے سترہ اٹھارہ مہینوں کے عرصے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے اردگرد کے علاقوں میں جو سیاسی اور فوجی حکمت عملی اختیار کی تھی اس کا اصل نشانہ قریشی کارواں تھے جو مدینہ کے قریب سے گذرنے والی بین الاقوامی شاہراہ تجارت پر ہر سال شام اور دوسرے شمالی علاقوں کو جایا کرتے تھے۔

جدید مؤرخین نے عام طور سے اور مغربی مؤرخین نے خاص طور سے مآخذ اسلامی کے متعین کردہ نقطۂ نظر کی روشنی میں ان ابتدائی مہموں کی تاریخی تشریح و تعبیر کا کام شروع کیا اور ان کے اسباب و عوامل، مسائل و وسائل اور مقاصد و محرکات کی چھان بین کی اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ مدینہ ایک چھوٹی سی بستی تھی جو خالی ہاتھ آنے والی کثیر مہاجر آبادی کا بوجھ نہیں برداشت کر سکتی تھی۔ چنانچہ ان مہاجرین کی معاشی اور اقتصادی ضروریات کی فراہمی کے لیے پیغمبر اسلام نے عربوں کے قدیم اور مسلّمہ طریق غارت گری یعنی "رزیہ" کو اختیار کیا کہ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ قریش مکہ کے تجارتی کاروانوں سے بڑھ کر اور کون سا فوری اور مفید ذریعۂ آمدنی تھا چنانچہ ان کاروانوں پر چھاپے مارنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے بعد میں کچھ ایسے واقعات بھی پیش آگئے جن سے اس تاثیر یا نتیجہ کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ مغربی مصنفین و مؤرخین نے پہلے دور میں چونکہ اسلام کا مطالعہ یہودیت اور اسلام یا عیسائیت اور اسلام کی مذہبی اور سیاسی آویزش کے پس منظر میں کیا تھا اس لیے انہوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام پر شدید اور بسا اوقات متعصبانہ و مخالفانہ حملے کئے اور اسلامی غزوات و سرایا کو عموماً اور ابتدائی مہموں کو خصوصاً قبل اسلام عرب کے "رزیوں" یا لوٹ مار کے حملوں اور چھاپوں کے مماثل قرار دیا اور مسلمانوں اور ان کے پیغمبر کو ایک غارتگر جماعت کے روپ میں پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ مطالعہ معاندانہ تھا اور اسلامی تاریخ و تہذیب کو مسخ کرنے کی نیت سے کیا گیا تھا۔ ہمارے موجودہ عہد میں خاص کر بیسویں صدی کے وسط میں جب مغربی مصنفوں اور مستشرقوں نے اسلام کا مطالعہ معروضی اور سائنٹیفک بنیادوں پر کرنے کا دعویٰ کیا تو ان مہموں کے دوسرے سماجی اور سیاسی محرکات و مقاصد تلاش کئے لیکن بنیادی طور پر ابتدائی مہموں کے بارے میں ان کے یہاں بھی اولیت اقتصادی محرکات و عوامل کو حاصل رہی جس کی داغ بیل ان کے پیشروؤں نے ڈالی تھی البتہ یہ ضرور ہوا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام پر معاندانہ حملوں سے گریز کیا گیا اور ذمہ داری انسانی طمع و حرص اور لٹیرانہ ذہنیت سے حالات و زمانہ کی اقتصادی مجبوریوں اور معاشی محرکات کی طرف منتقل کر دی گئی۔ یعنی ابتدائی مہموں کو لوٹ مار اور غارت گری کی پرانی کاروائیوں کی ہی رہی البتہ مسلمان اس کے لیے کسی حرص و ہوس کی وجہ سے ذمہ دار نہ تھے بلکہ حالات ذمہ دار تھے۔ جدید مغربی مؤرخین میں سے اکثریت اسی نقطۂ نظر کی حامی ہے لیکن اب بھی کوئی نہ کوئی ان مہموں کی پرانی تشریح و تعبیر کو اپنا مذہبی اور ملی فرض سمجھ لیتا ہے۔

ہمارے مشرقی اور مسلم جدید مؤرخین کی اکثریت جدید مغربی مؤرخین کے نقطۂ نظر کو قبول کرتی ہے لیکن تھوڑے سے فرق کے ساتھ۔ ان کا خیال یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اصلاح امت کے کام کے بعد قریش مکہ کے خلاف ایک جارحانہ یا اقدامی پالیسی اختیار کی اور اس کا پہلا اظہار ان ابتدائی مہموں کی شکل میں ہوا یعنی آپ نے ہجرت اور غزوۂ بدر کے درمیان سات آٹھ فوجی مہمیں ترتیب دیں جن کا اصل نشانہ قریشی کارواں تھے لیکن مقصد ان کا لوٹنا نہیں تھا بلکہ اشراف مکہ کے ذہنوں پر یہ نقش

مرتسم کرنا تھا کہ اسلامی ریاست ایک فوجی اور سیاسی طاقت تھی جس کے ساتھ ان کو کسی قسم کی مصالحت یا مفاہمت کرنا ناگزیر ہوگا۔ یہ مفاہمت اور مصالحت اس مقصد سے کی جا رہی تھی کہ عداوت اور دشمنی کا دور ختم ہو اور دوستی اور بھائی چارے کے زمانے کا آغاز ہو کیونکہ اسلام کا اصل پیغام یہی ہے۔ اس طرح ان مسلم مؤرخین کے نزدیک ان ابتدائی مہموں کا مقصد یہ تھا کہ اقتصادی دباؤ ڈال کر مکیوں کو سیاسی مفاہمت پر مجبور کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس نقطۂ نظر کے مطابق بھی ابتدائی مہموں کا اصل نشانہ قریشی کارواں ہی تھے چاہے ان کا مقصد ان کو لوٹنا نہ رہا ہو، محض اقتصادی دباؤ ڈالنا رہا ہو۔

ان جدید مسلم مشرقی مورخین کے علاوہ خال خال کچھ ایسے بھی مسلمان سیرت نگار پائے جاتے ہیں جنہوں نے ابتدائی مہموں کو ان کے صحیح تناظر میں سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کا طرزِ نگارش و طریق استدلال یا تو معذرت خواہانہ اور دفاعی ہو گیا ہے یا انہوں نے اپنی رائے کو دلائل و براہین سے مستحکم نہیں کیا ہے۔ ضرورت تھی کہ ان مہموں کا ایک تنقیدی مطالعہ پیش کیا جائے تاکہ ان کے محرکات، مسائل اور مقاصد کی نشاندہی کی جائے اور واضح کیا جائے کہ آیا ان مہموں کا مقصد لوٹ مار و غارت گری تھی، تاکہ ننگے بھوکے مہاجرین کی مادی ضروریات پوری کی جا سکیں یا قریش مکہ کو اقتصادی طور پر زک پہونچانا اور سیاسی اشتعال دلانا تھا کہ آئندہ کے لیے فوجی اقدام کا راستہ کھل جائے اور اس کی ذمہ داری مکیوں پر ہی رہے، یا محض اقتصادی دباؤ ڈال کر ان کو سیاسی مفاہمت پر مجبور کیا جائے اور اس طرح عرب دنیا میں اسلام اور مکی اشرافیہ باہمی مفاہمت کے سائے میں دو الگ الگ اور خود مختار اکائیوں کی طرح جئیں اور جینے دیں یا ان تمام صورتوں سے الگ ان مہموں کی کوئی اور تشریح و تعبیر کی جا سکتی ہے جو ان کی اصل نوعیت اور ماہیت کو اجاگر کرتی ہے اور جو اسلامی تعلیمات، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت و مزاج اور اسلامی تہذیب سے میل کھاتی ہے کیوں کہ موجودہ تمام تعبیرات و تشریحات تمام اسلامی اصولوں اور اقدار کی نفی کرتی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ماخذ میں مذکور بعض اہم حقائق سے بھی ان کی تائید نہیں ہوتی اور ان پر بعض شدید اور اہم اعتراضات وارد ہوتے ہیں جن سے ذہنوں میں شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مہموں کا محرک اور مقصد کچھ اور تھا جو ابھی تک پوری طرح سے واضح نہیں ہوا ہے۔ یہ مضمون اسی ضرورت کی تکمیل ہے۔

۱- پہلی مہم :-

مغازی نگاروں کے سالار واقدی کا بیان ہے کہ مدینہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آمد کے چھ ماہ کے اندر پہلی مہم (سریہ) ترتیب دی جو ایک نواحی علاقے میں بھیجی گئی تھی اور ہجرت کے تقریباً اٹھارہ ماہ کے اندر سات مزید مہمیں منظم کی گئی تھیں۔ ان میں چار سرایا اور چار ہی غزوات تھے اور انہیں مہموں کو ابتدائی مہموں کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اسلامی ریاست کی تشکیل کے آغاز میں اور غزوۂ بدر سے پہلے واقع تھیں۔ محمد بن حبیب بغدادی کے نزدیک ابتدائی مہموں کی تعداد دس تھی جن میں سے چھ غزوات تھے۔ آخری دو غزوات بدر سے پہلے واقع ہوئے تھے۔ ابتدائی مؤرخین و سیرت نگاروں کے درمیان اس امر پر اختلاف ہے کہ پہلی مہم کی قیادت کی سعادت (لواء) کس کے حصہ میں آئی تھی؟ ابن اسحاق کا بیان و خیال ہے کہ یہ خوش نصیبی حضرت عبیدہ بن حارث

کے حصہ میں آئی تھی۔ اور یہی خیال ابن اسحاق کے بعض متبعین کے یہاں پایا جاتا ہے۔ سیرت نگاروں کا دوسرا طبقہ جس کی سرخیلی واقدی کو حاصل ہے اور جس میں ابن سعد بلاذری وغیرہ شامل ہیں اس خیال کا حامی ہے کہ اوّلیت کا سہرا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کے سر بندھا تھا۔ جدید مؤرخین کی غالب اکثریت دوسرے نقطۂ نظر کے حق میں ہے اور ایک جدید مغربی مستشرق جے۔ایم۔بی۔جونس (J. M. B. JONES) کی تحقیق ہے کہ واقدی کی ترتیب مغازی رسولؐ زیادہ صحیح ہے اس لیے جہاں روایات میں تناقض وتصادم ہو وہاں واقدی کی روایت و ترتیب کو ترجیح حاصل ہونی چاہیے۔

بہر حال اگر واقدی اور ان کے ہمنواؤں کا نقطۂ نظر تسلیم کر لیا جائے تو عہد نبوی کی پہلی مہم رمضان ۱ھ مطابق مارچ ۶۲۳ء میں حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کی سرکردگی میں ساحلی پٹی (سیف البحر) کی جانب گئی تھی۔ اس مہم میں کل تیس مسلم سپاہی تھے۔ واقدی نے ان مسلم سپاہیوں کی قبائلی نمائندگی و نسبت کے بارے میں دو روایتیں بیان کی ہیں۔ عام اور مشہور روایت تو یہ ہے کہ تمام شرکاء مہم مہاجر تھے اور ان میں انصاری کوئی نہ تھا۔ لیکن دوسری روایت کے مطابق جو پہلے اور زیادہ تفصیل سے بیان ہوئی ہے اس پہلی مہم میں مہاجر اور انصار برابر شامل تھے۔ ساحلی پٹی پر مسلمانوں کا سامنا (تعرض) ایک قریشی کارواں سے ہو گیا جو شام سے مکہ سے لوٹ رہا تھا۔ اس میں تین سو مکی تھے اور ان کا قائد ابو جہل تھا۔ سامنا ہوتے ہی وہ جنگ (قتال) کیلئے صف آرا ہو گئے (اصطفوا) لیکن ان کے درمیان جہینہ کا سردار مجدی بن عمرو حائل ہو گیا۔ کبھی وہ ان کی طرف کبھی وہ ان کی طرف دوڑتا رہا یہاں تک کہ مکہ والے اپنے کارواں اور محافظوں کے ساتھ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے اور حضرت حمزہؓ مدینہ کو واپس ہو لئے اور ان کے بیچ کوئی لڑائی (قتال) نہیں ہوئی۔

ابن سعد کا بیان تقریباً یہی ہے۔ صرف اضافہ یہ ہے کہ وہ مہم کی منزل کا نام العیص بتاتا ہے۔ اس کا بیان دراصل ابن اسحاق، ان کے جامع ابن ہشام اور واقدی کے بیانات کا مجموعہ ہے۔ ابن اسحاق اور ان کے جامع کے بیان میں مہم کے شرکاء میں انصار کی شمولیت کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف یہ دعویٰ بھی ہے کہ انصار میں سے کوئی اس مہم میں شریک نہ تھا۔ بلاذری نے واقدی اور ابن سعد سے اتفاق کیا تو یعقوبی اور ابن اثیر نے ابن اسحاق سے۔ طبری کے بیان میں کچھ اضافے ہیں۔ اول یہ کہ العیص اور اس کے نواح میں قبیلہ جہینہ بستا تھا جس کی تائید بالواسطہ دوسرے تمام مذکورہ ماخذ سے بھی ہوتی ہے لیکن ابن اثیر کے بیان سے بصراحت ہوتی ہے۔ دوسرے طبری کا اپنا تبصرہ یہ ہے کہ واقدی کے بقول بہ سریہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشی کارواں (عیرات قریش) پر چھاپہ مارنے کے لیے (لیعترض) ترتیب دیا تھا۔ مذکورہ بالا تمام ماخذ میں یہ بات ضرور کہی گئی ہے کہ یہ مہم ساحل کی جانب گئی جہاں اس کا سامنا ایک قریشی کارواں سے ہوا۔ مگر طبری کے بیان سے قریشی کارواں پہ چھاپہ مارنا یا روک ٹوک کرنا اس کا مقصد معلوم ہوتا ہے طرفہ ستم یہ کہ طبری نے اپنی طرف سے اضافہ کر کے واقدی کے نام سے اسے منسوب کر دیا۔ طبری کے سوا تمام ماخذ سے صاف واضح ہوتا ہے کہ قریشی کارواں سے سامنا اور ملاقات اتفاقی تھی جبکہ اوّل الذکر بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بھیجی گئی تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مہم کیوں اور کس علاقے میں بھیجی گئی تھی؟ اگر اس کا مطالعہ آزادانہ کیا جائے جیسا کہ طبری نے کیا یا جو ہمارے جدید مورخین کا طریقہ ہے تو یہی تاثر نکلتا ہے کہ قریشی کارواں اس کا اصل نشانہ تھا۔ لیکن یہ مطالعہ تاریخی تناظر میں نہ ہوگا۔ کیوں کہ اس صورت میں کئی معاملات تشنہ رہ جاتے ہیں۔ اوّل تو مہم کا علاقہ ہے۔ طبری اور ابن اثیر کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ العیص اور اس کے نواح قبیلہ جہینہ کے علاقے تھے۔ دوسرے ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ جہینہ مدینہ کے انصار کے ایک قبیلہ خزرج کا قدیم حلیف و دوست تھا جبکہ اسی نواح کا دوسرا بدوی قبیلہ مزینہ مدینہ کے اوس قبیلے کا حلیف و دوست تھا۔ اور اسی رشتہ حلف اور دوستی کے سبب ان دونوں بدوی قبیلوں نے اپنے اپنے مدنی حلیفوں کی جانب سے جنگ بعاث میں فعال حصہ لیا تھا۔ اور صرف اسی جنگ میں نہیں بلکہ اوس اور خزرج کی اور بھی آویزشوں میں یہ دونوں بدوی قبیلے حصہ لیتے رہے تھے۔ اور اس طرح ان کا اپنے اپنے مدنی حلیفوں سے رشتہ اتحاد مضبوط تر اور مستحکم ہو گیا تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی سیاسی اور سماجی نظام قائم کیا تو پرانے حریف و متحارب اوس و خزرج کے قبیلے آپس میں بھائی بھائی بن گئے اور مہاجرین کے ساتھ مل کر وہ اسلامی امت کے رکن رکین ہوئے۔ عرب دستور کے مطابق حلیف کے حلیف دوست ہوتے تھے چنانچہ بظاہر اوس اور خزرج کے حلیف مزینہ اور جہینہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کے حلیف اور دوست ہو گئے تھے بالکل اسی طرح جس طرح وہ انصار کے تھے۔ گویا کہ وہ اب انصار کے دو الگ الگ قبیلوں کے حلیف نہ تھے بلکہ اسلامی امت کے حلیف تھے۔ اسلامی ماخذ میں ان قبائل سے اس رشتہ حلف کے استوار ہونے کی حقیقت کا بصراحت کہیں بھی ذکر نہیں ہے لیکن وہ ان کے متعدد بیانات میں مضمر ہے۔ قبیلہ جہینہ کے سردار مجدی ابن عمرو کے مصالحانہ کردار کے ذیل میں ماخذ کا بیان ہے کہ اس نے قریش مکہ اور سریہ حمزہ کے بیچ مصالحت اس لیے کرائی تھی کہ وہ دونوں فریقوں کے ساتھ صلح کے تعلقات رکھتا تھا۔ موجودہ عہد کے ایک اہم مستشرق مونٹگمری واٹ (MONTGOMERY WATT) کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ مہاجرین و انصار کے بعد سب سے زیادہ مدد و تعاون اسلامی ریاست کو انھیں دو مغربی بدوی قبیلوں سے ملا تھا اور ان کے بعد باقی دوسرے مغربی قبائل بھی اسلامی امت کے زیر اثر آ گئے تھے اور کچھ مدت بعد وہ امت کے مکمل رکن بن گئے تھے۔

اس تاریخی تناظر میں اس مہم کو دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصل مقصد قبیلہ جہینہ سے دوستی کے تعلقات استوار کرنا تھا جیسا کہ طبری اور ابن اثیر کے ایک فقرے سے ظاہر ہوتا ہے۔ مزید تصدیق بالواسطہ سبھی بعد کی تمام دوسری مہموں سے بھی ہوتی ہے جو مغربی ساحل کے دوسرے علاقوں میں گئی تھیں۔ اس کے علاوہ جہنی سردار کا رویہ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ مزید برآں فریقین کی عددی طاقت بھی اس کے حق میں ہے۔ تیس مسلمانوں کا مقابلہ تین سو مکیوں سے تھا۔ اگر بعض مغربی محققین کا یہ نظریہ کہ مکی کارواں کے محافظوں کی تعداد میں مبالغہ ہے تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بہر حال فریق مخالف کو مسلم جماعت پر کئی گنا برتری حاصل تھی۔ اور ظاہر ہے کہ مسلم جماعت اپنے سے کئی گنا طاقتور فریق پر حملے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی وہ گھات لگا کر کامیاب ہو سکتی تھی۔ پھر یہ کہ اگر یہ مہم چھاپہ مار کارروائی کے لیے ترتیب دی گئی تھی تو ظاہر ہے کہ مخبروں اور جاسوسوں کی اطلاعات پر ہی کی گئی ہوگی۔ یہ تسلیم کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ مسلم جاسوسوں نے فریق مخالف

کی تعداد و عسکری قوت کو معلوم نہ کرتے کی غلطی کی ہوگی - اگر مسلمانوں کو قریشی کارواں کی عددی طاقت کا ذرا بھی اندازہ تھا تو اتنی چھوٹی سی جماعت کے ساتھ اس پر چھاپہ مارنے کے لیے نکلنا زیادہ سے زیادہ جراٴت بے جا کہلائےگی اور سب سے بڑھ کر یہ حقیقت بھی مدِ نظر رکھنی چاہیے کہ مآخذ سے چھاپہ مار منصوبے یا مقصد کی تصدیق نہیں ہوتی - ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قریشی کارواں اور مسلم جماعت کا سامنا اتفاقاً اور اچانک ہوگیا تھا - ورنہ درحقیقت یہ مہم قبیلہ جہینہ سے کسی معاہدہ یا دوستی کا رشتہ استوار کرنے گئی تھی اور سردار جہینہ کی موقعہ پر موجودگی بھی اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے -

۲- دوسری مہم :-

واقدی کی ترتیب مغازی کے مطابق دوسری مہم پہلی مہم کے ایک ماہ کے اندر حضرت عبیدہؓ بن حارث کی زیرِ قیادت رابغ کے علاقے میں بھیجی گئی تھی ، رابغ قُدید جانے والے راستے پر جحفہ سے دس میل کی مسافت پر واقع ہے - اس مہم میں ساٹھ سوار تھے - ان کا سامنا ایک قریشی کارواں سے جو ابوسفیان کی سرکردگی میں (غالباً مکہ سے آرہا) تھا - وادی رابغ میں واقع ایک احیا نامی چشمے پر ہوا - قریشی کارواں میں دو سو تھے - اگرچہ کوئی جنگ نہیں ہوئی تاہم حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے مسلم جماعت کی طرف سے ایک اور دوسری روایت کے مطابق اپنے ترکش کے کل بیس تیر چلا ڈالے - پھر فریقین اپنے اپنے راستے ہو لئے - حضرت سعد بن ابی وقاص کا بیان ہے کہ اس مہم میں سب کے سب مہاجر تھے اور کوئی انصار نہ تھے اور انہوں نے عبیدہ سے کہا تھا کہ قریشی مرعوب ہوگئے ہیں اگر ہم ان کا تعاقب کریں تو ان کو بہ آسانی جا پکڑیں گے مگر کسی نے ہماری بات نہ مانی اور ہم مدینہ لوٹ آئے -

ابن اسحاق اور ان کے جامع کا بیان اس مہم کے بارے میں کچھ مختلف ہے - اوّل یہ کہ دونوں کے نزدیک یہ اسلام میں پہلا سریہ تھا - دوم یہ کہ شرکائے مہم کی تعداد ساٹھ یا اسی تھی - سوم یہ کہ مہم کی منزل کی تصریح نہیں کی گئی ہے صرف یہ کہا گیا ہے کہ حجاز میں ثنیۃ المرۃ کے زیریں علاقے کے ایک چشمہ کی طرف کی گئی تھی - چہارم یہ کہ مسلمانوں کے حامی تھے (وللمسلمین حامیۃؓ) پنجم یہ کہ مشرکوں کی جماعت سے بنو زہرہ کے حلیف مقداد بن عمرو بہرانی اور بنو نوفل کے حلیف عتبہ بن غزوان بن جابر مازنی ٹوٹ کر مسلمانوں سے آملے تھے کیونکہ وہ دونوں مسلمان تھے اور اسی غرض سے قریشی کارواں میں شامل ہوکر آئے تھے - ششم یہ کہ قریشی کارواں کے قائد عکرمہ بن ابی جہل مخزومی اور دوسری روایت کے مطابق مکرز بن حفص تھے -

ابن سعد کی روایت اگرچہ واقدی کے مماثل ہے تاہم اس میں کچھ قابلِ قدر اضافے ہیں - اوّل یہ کہ اسلامی مہم کا پرچم (لوائ) سفید رنگ کا تھا اور علمبردار حضرت مسطح بن اُثاثہ مطلبی تھے - دوم یہ کہ دونوں فریقوں کا آمنا سامنا جس جگہ ہوا وہ شاہراہ تجارت سے ذرا بائیں کو ہٹ کر تھی اور سوم یہ کہ مشرکین مکہ اپنے جانوروں کو چرانے کے لیے شاہراہ چھوڑ کر اُدھر آئے تھے - بلاذری کی روایت واقدی کی تلخیص ہے - سوائے اس نکتہ کے کہ وہ اس مہم کو سریہ ثنیۃ المرۃ کے نام سے یاد کرتا ہے - یعقوبی کی روایت ابن اسحاق اور ان کی جامع کی روایات کا مکمل چربہ ہے - صرف تشریحی تعلیقات کا اضافہ ہے طبری نے اپنی روایت میں واقدی اور ابن سعد کی روایات کے تمام اہم نکات کو جمع کر دیا ہے -

مآخذ میں سے اس مہم کے بارے میں کسی کا دعویٰ نہیں ہے کہ یہ مہم قریش کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ ان سب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وادی رابغ کے چشمے پر ان کی ملاقات اتفاقی تھی۔ ابن سعد کے بیان سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ اگر قریشی کارواں نے اپنا راستہ چھوڑ کر قیام نہ کیا ہوتا اور جانوروں کو چرانے کے لئے وادی میں داخل نہ ہوئے ہوتے تو مسلم جماعت سے ان کا سامنا بھی نہ ہوا ہوتا۔ اس سے ایک نکتہ اور روشنی میں آتا ہے جو کافی اہمیت کا حامل ہے۔ مآخذ میں سے بعض نے صراحتاً اور بعض نے اشارتاً کہا ہے کہ مسلم مہم کی منزل مقصود ثنیۃ المرۃ کے زیریں علاقہ کا ایک چشمہ تھا اور یہ چشمہ عام راستے سے ہٹ کر تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں نے یا تو قریشی تجارت کی شاہراہ پر سفر ہی نہیں کیا تھا یا کیا بھی تھا تو وہ اس راستے سے ہٹ کر اندرون وادی گئے تھے اگر تجارت کا قریشی کارواں ان کا اصل نشانہ تھا تو ان کے راستے سے ہٹنا نہ تھا بلکہ اسی پر سفر کرنا تھا اور جہاں موقع ملتا گھات لگا کر حملہ کرتے۔ دوسری طرف کاروانِ قریش کے راستے سے ہٹ کر قیام کرنے اور جانوروں کے چرانے کا مسئلہ تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ مرکز اسلام کے بالکل قریب اور مسلمانوں کے حلیفوں اور زیر اثر قبیلوں کے علاقے سے گزر رہے تھے۔ ان کا اس علاقہ میں قیام کرنا، راستہ چھوڑ کر اپنے جانوروں کو چرانے کے لیے چھوڑ دینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کو کم از کم مدینہ کے مسلمانوں سے اپنے اس کارواں یا تجارت کے لیے کوئی خطرہ اب تک محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس ضمن میں یہ حقیقت بھی مدنظر رکھنی چاہئے کہ صرف ایک ماہ پہلے ان کے شام سے مکہ لوٹنے والے ایک کارواں کی مسلم جماعت سے ملاقات ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کاروان کے لوگوں سے مکہ والوں نے اس ملاقات کا ذکر ضرور کیا ہوگا۔ اگر مکہ والوں کو ذرا سی بھی بھنک مل گئی ہوتی یا تھوڑا سا بھی احساس ہوا ہوتا کہ مدینہ کے مسلمان ان کے کاروانوں پر حملہ کرنے کی نیت رکھتے ہیں تو وہ اس کے تدارک کا مکمل بندوبست کرتے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مآخذ اور جدید محققین دونوں کا دعویٰ ہے کہ مکی اپنی تجارت اور اس کے تحفظ کے بارے میں بڑے حساس تھے اور ظاہر ہے کہ یہ قدرتی بھی تھا کیونکہ ان کی مادی آسائشوں بلکہ پوری اقتصادی زندگی کا انحصار اسی تجارت پر تھا۔ بہر حال اس کے برخلاف ہمارے مشاہدے میں آتا ہے کہ اس بار مکی کارواں کے افراد میں ایک تہائی کی کمی آتی ہے۔ اور وہ محض دو سو رہ جاتے ہیں جبکہ پہلے کارواں میں ان کی عددی طاقت تین سو تھی۔ اس کے علاوہ ایک اہم نکتہ اس ضمن میں یہ ہے کہ بقول ابن اسحاق مسلمانوں کے حامی بھی تھے۔ یہ حامی کون تھے؟ اور ان کا ذکر کیوں کیا گیا؟ ان سوالوں کا جواب مآخذ کے ان بیانات سے تو نہیں ملتا تاہم دوسرے مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ وادی رابغ جحفہ اور ابواء یا ودان کے درمیان واقع تھی اور وہاں حاجیوں کا راستہ گزرتا تھا (تجارتی قافلوں کا نہیں) اور یہ پورا علاقہ قبائل خزاعہ اور ان کے حلیف بنو ضمرہ کا تھا۔ خزاعہ سے خاندان رسولؐ کے قدیم حلیفانہ تعلقات تھے جبکہ بنو ضمرہ سے آپؐ نے مدینہ پہنچ کر معاہدۂ حلف کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں مغربی قبیلے نہ صرف مدینہ کے زیر اثر تھے بلکہ ان کے انصار سے قریبی تعلقات اسلام سے پہلے کے تھے اور غالباً یہی قبیلے مسلمانوں کے حامی بتائے گئے ہیں۔ اگر مسلم جماعت کی عددی طاقت کاروان قریش سے فروتر تھی تو اس کی تلافی ان بدوی قبیلوں سے کمک مانگ کر پوری کی جا سکتی تھی بشرطیکہ مسلمانوں کو اس کارواں پر چھاپا مارنا مقصود ہوتا۔ پھر حضرت سعد بن ابی وقاص کا یہ بیان کہ انہوں نے قریشی کارواں کی مرعوبیت دیکھ کر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی مگر امیر سریہ یا ان کے ساتھیوں میں سے کسی نے اسے قبول نہیں کیا صاف ظاہر کرتا ہے

کہ مسلمانوں کا مقصد کچھ اور تھا، کارواں پر چھاپہ مارنا کم از کم نہ تھا اس ضمن میں یہ نکتہ بھی خاصا اہم ہے کہ اگر بفرض محال یہ قریشی کارواں مسلم مہم کے چنگل سے نکل گیا تھا تو اس کو آگے کی کسی منزل پہ پھر گھیرا جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ شام کو جا رہا تھا۔ مسلم امیر سریہ ایک یا دو تیز رفتار قاصدوں کے ذریعہ مدینہ خبر بھیج کر ایسا بندوبست بہ آسانی کروا سکتے تھے کیونکہ وہ لامحالہ مدینہ کے قریب سے دو چار دن کے بعد ضرور گزرتا اور مدینہ سے ایک بڑا یا برابر کا لشکر لا کر اس کو بہ آسانی گھیرا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلم مہم کا مقصد قریشی کارواں پر چھاپہ مارنے کے بجائے اور کچھ تھا اور یہ کچھ غالباً اس علاقے کے بدوی قبیلوں سے رشتہ دوستی استوار یا مضبوط کرنا معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ تیسری مہم :-

اس سلسلے کا تیسرا سریہ خرار تھا جو حضرت سعد بن ابی وقاص کے زیر کمان خرار نامی علاقے تک گیا تھا۔ واقدی کے بقول یہ دوسری مہم کے ٹھیک ایک ماہ بعد ذی قعدہ ۱ھ مطابق مئی ۶۲۳ء میں بھیجی گئی تھی۔ مہم کی منزل کے علاقہ میں چشمہ خم کے قریب تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد سے کہا تھا کہ ایک قریشی کارواں گزرنے والا ہے لہٰذا وہ خرار جائیں اور اس سے آگے نہ بڑھیں۔ چنانچہ وہ بیس یا اکیس پیادوں (راجل) کے ساتھ مہم پر نکلے اور دن میں چھپتے اور رات کو سفر کرتے پانچویں صبح کو منزل پر پہنچے مگر قافلۂ تجارت کچھ مدت پہلے (بالامس) گذر چکا تھا۔ حضرت سعد کی طرف بیان منسوب ہے کہ اگر ممانعتِ نبوی نہ ہوتی تو وہ خرار سے آگے بڑھ کر قافلے کو جا لیتے۔ ابن سعد کے بیان میں صرف اضافہ یہ ہے کہ اس سریہ میں بھی پرچم سفید تھا جس کے بردار حضرت مقداد بن عمرو بہرانی تھے۔ ابن اسحاق اور ابن ہشام کے متحدہ بیان میں شرکاء مہم کی تعداد محض آٹھ بتائی ہے۔ جو سب کے سب مہاجر تھے۔ اس کے مطابق خرار ارض حجاز میں تھا۔ مسلمانوں کی ملاقات کسی کید (لڑائی بھڑ) سے نہیں ہوئی اس لیے وہ واپس لوٹ آئے۔ اس بیان میں کسی قریشی کارواں کی طرف نہ تو اشارہ ہے نہ کوئی حوالہ۔ بلاذری نے واقدی کی روایت کی تلخیص کر دی ہے۔ یعقوبی نے ایک اہم اور دلچسپ اضافہ کیا ہے کہ جب حضرت سعدؓ کی مہم نے خرار نامی چشمے پر پڑاؤ کیا تو اس نے بنو ضمرہ کے کچھ مویشی پکڑ لیے اور واپسی میں اپنے ساتھ مدینہ لائے۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ سارے مویشی بنو ضمرہ کو لوٹا دیئے کیوں کہ ان سے آپ کا دوستی (حلف) کا معاہدہ تھا۔ یعقوبی بھی کسی قریشی کارواں کا ذکر نہیں کرتا ہے۔ طبری نے واقدی اور ابن سعد کی روایت بیان کی ہے اور یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ کاروان قریش حضرت سعد کے خرار پہنچنے سے صرف ایک دن پہلے (قبل ذلک بیوم) نکلا تھا۔ دوسرا اختلاف یہ ہے کہ طبری نے مسلمانوں کی تعداد پندرہ یا اکیس مہاجر پیادے بتائی ہے جبکہ قریشی کارواں کی عددی طاقت ساٹھ بتائی ہے۔

ماخذ میں سے ابن اسحاق، ابن ہشام، یعقوبی وغیرہ سے اس مہم کا قریشی کارواں کے خلاف بھیجا جانا ثابت نہیں ہوتا بلکہ واضح ہوتا ہے کہ اس کا مقصد کم از کم قریشی کارواں پر چھاپا مارنا نہ تھا بلکہ یعقوبی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنو ضمرہ کا علاقہ تھا۔ غالباً ان سے گفت و شنید یا کسی قسم کا معاملہ طے کرنے کے لیے اس کو بھیجا گیا تھا مسلمانوں نے غلطی سے ان کے بعض مویشی پکڑ لیے تو ان کو

واپس کر دیا گیا۔ اس سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ بنو ضمرہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدۂ حلف پہلے سے ہو چکا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کب اور کہاں یہ معاہدہ ہوا تھا؟ اس کا ممکن اور قرینِ قیاس جواب یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ معاہدہ حضرت عبیدہ کی مہم رابغ کے دوران ہوا ہوگا۔ بہرحال یہ حتمی ہے کہ یہ معاہدہ حضرت سعدؓ کی مہم خرار سے پہلے تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

جہاں تک واقدی، ابن سعد، بلاذری اور طبری کی روایت کا تعلق ہے وہ واضح طور سے ایک قریشی کارواں کا ضرور ذکر کرتی ہیں۔ لیکن کیا اس سے یہ سمجھ لینا صحیح ہوگا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد کو کارواں پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا؟ جدید مؤرخین نے اس سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ کسی طور سے بھی نہیں نکلتا۔ بلکہ اس کی تردید کے متعدد ثبوت ملتے ہیں۔ پہلا نکتہ اور ثبوت تو یہ ہے کہ مآخذ میں سے کسی نے بھی قریشی کارواں پر حملہ کرنا مقصود یا محرک نہیں بتایا ہے۔ پھر اگر چھاپہ مار اور لوٹ مار ہی مقصد تھا تو حضرت سعد کو خرار سے آگے بڑھنے سے کیوں روکا گیا تھا؟ بالخصوص یہ حقیقت بھی مدنظر رہنی چاہئے کہ اگر ممانعتِ رسولؐ آڑے نہ آتی تو وہ کارواں کو جا لیتے۔ ظاہر ہے کہ قرینِ قیاس تو یہ تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے کہ کسی بھی طور سے قریشی کارواں پر حملہ کرنا ہے۔ پھر جیسا کہ روایات مذکورہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کاروانِ قریش کے گزرنے کا علم تھا اور غالباً تاریخ کا بھی۔ پھر آپ نے یہ ساری مہم پیادوں پر کیوں مشتمل بھیجی تھی جس نے سفر میں چار قیمتی دن ضائع کر دیئے۔ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر یہ مہم سواروں پر مشتمل ہوتی تو قافلے کے گزرنے سے بہت پہلے (طبری روایت کے مطابق) ورنہ کچھ پہلے (دوسروں کی روایت کے مطابق)، تو ضرور اپنے مقام تک پہنچ گئی ہوتی۔ اس کے علاوہ دونوں مہموں یعنی فریقین کی عددی طاقت کا معاملہ ہے۔ اس تیسری مہم میں دونوں کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ کیا دونوں فریق کم تعداد کرنے کی مسابقت کر رہے تھے؟ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ قریش کو اپنی تجارت کے لئے مدینہ کی طرف سے کوئی خطرہ اب تک محسوس نہیں ہوا تھا۔ تو جدید مؤرخین کے دعوے کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پورے ہوش و حواس اور منصوبے کے ساتھ قریشی کارواں پر حملہ کرنا یا ان کو مرعوب کرنا چاہ رہے تھے۔ بیس اکیس یا محض آٹھ پیادوں کے ساتھ تو یہ دونوں مقصد حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ رات میں سفر کرنا اور دن میں چھپے رہنا بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مقصد جو اس مہم کا ہو سکتا ہے وہ قریشی کارواں کے بارے میں خبریں اور معلومات فراہم کرنا تھا۔

۴۔ چوتھی مہم :۔

واقدی اور ان کے طبقۂ فکر کے مؤرخین کے بقول ان تین "سرایا" کے بعد پے در پے چار غزوات پیش آئے جن کی قیادت خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔ ان میں سے پہلا غزوہ ابواء یا ودان کہا جاتا ہے۔ واقدی کے بقول صفر ۲ھ اگست ۶۲۳ء میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ساٹھ سواروں کے ساتھ کاروانِ قریش کو روکنے کی غرض سے نکلے لیکن کسی کے کید (لڑائی مکر) سے مڈبھیڑ نہ ہوئی۔ اسی غزوہ میں آپ نے کنانہ کے ایک خاندان بنو ضمرہ سے معاہدہ کیا (کتاب) کیا کہ نہ وہ آپ پر حملہ کریں اور نہ آپ کے خلاف کسی کی مدد کریں۔ معاہدہ لکھ کر آپ مدینہ واپس آئے جہاں سے آپ کی غیر حاضری کی مدت پندرہ راتوں کی تھی۔ ابن سعد نے

اپنے استاد کی روایت پر کچھ اضافے کئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس مہم میں علمبردار حضرت حمزہ بن عبدالمطلب تھے۔ اور مدینہ میں نائب رسول حضرت سعد بن عبادہ خزرجی تھے۔ دوسرے یہ کہ شرکاء مہم سب مہاجر تھے اور ان میں کوئی انصاری نہ تھا۔ تیسرے یہ کہ یہ غزوۂ ابواء بھی کہلاتا اور غزوۂ ودان بھی اور ان دونوں مقامات میں محض چھ میل کا فاصلہ تھا۔ چوتھے یہ کہ یہ پہلا غزوہ تھا۔ پانچویں یہ کہ آپ نے معاہدہ بنوضمرہ کے اس زمانے کے سردار مخشی بن عمرو ضمری سے کیا تھا۔ چھٹے یہ کہ معاہدہ کی شرطیں یہ تھیں کہ نہ آپ بنوضمرہ پر حملہ کریں گے اور نہ بنوضمرہ آپ پر۔ ابن اسحاق اور ابن ہشام نے اس غزوہ کو آپ کا پہلا غزوہ قرار دیا ہے اور اس کو تمام سرایا سے پہلے ذکر کیا ہے۔ اس کے مطابق آپ قریش اور بنوضمرہ بن بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ کے ارادے سے نکلے تھے اور اس غزوہ میں بنوضمرہ نے اپنے مذکورہ بالا سردار کے ذریعہ آپ سے صلح کا معاہدہ کر لیا تھا اور بغیر کسی جنگ و جدال کے آپ مدینہ لوٹ آئے تھے۔ بلاذری نے حسب دستور واقدی کی روایت کی تلخیص کر دی ہے۔ جبکہ یعقوبی نے صرف ایک سطر میں آپ کے ودان جانے اور وہاں کسی کید (الطائی) سے نہ ملنے پر مدینہ لوٹ آنے کو بیان کیا ہے۔ طبری کا بیان واقدی، ابن سعد اور ابن اسحاق کے بیانات کا مجموعہ ہے۔

تمام روایات کو جانچنے پرکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ابن اسحاق، ابن ہشام اور طبری کے نزدیک اس مہم میں آپ نے قریش اور بنوضمرہ دونوں کو مقصود بنایا تھا۔ جبکہ واقدی، ابن سعد اور بلاذری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نکلے تو آپ کاروانِ قریش کے لئے تھے مگر بعد میں آپ نے بنوضمرہ سے معاہدہ صلح کر لیا۔ یعقوبی کے یہاں مقصدِ مہم پر سکوت پایا جاتا ہے۔ اس مہم کے بارے میں پہلا اہم نکتہ یہ ہے کہ واقدی اور ان کے متبعین کے سوا اور کسی نے کسی کاروانِ قریش کا ذکر نہیں کیا ہے خود ان مورخین کی روایات میں بھی کارواں کی مزید تفصیلات یا اشارے نہیں ملتے وہ کہاں سے آ رہا تھا کہاں جا رہا تھا، اس میں کتنے اشخاص تھے اور وہ کس کی قیادت میں جا رہے تھے ان تمام سوالات کا کوئی جواب نہیں ملتا اور نہ ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ پھر اس کارواں کا کیا ہوا! محض قیاس کیا جا سکتا ہے جیسا کہ اکثر جدید مورخین نے کیا ہے کہ وہ نکل گیا ہوگا، چونکہ قریش کا کارواں ہاتھ نہیں آیا تھا اس لیے آپ نے بطورِ مجبوری بنوضمرہ سے صلح کا معاہدہ کر لیا۔ پھر ابن اسحاق وغیرہ کے اس تبصرہ کا کیا مطلب ہوگا کہ آپ قریش اور بنوضمرہ دونوں کے بارے میں کوئی ارادہ لے کر نکلے تھے۔ اگر یہ قیاس کر لیا جائے کہ بنوضمرہ نے لڑنے کے بجائے صلح و دوستی میں مصلحت دیکھی تھی اور آپ نے ان کی خواہشات و جذبات کے احترام میں ان کی دوستی کا ہاتھ تھام لیا تھا تو کیا اگر قریشی کارواں ہاتھ لگ جاتا اور وہ آپ سے صلح کا طالب ہوتا تو آپ کا کیا رویہ ہوتا؟ قیاس کہتا ہے کہ آپ ان سے بھی صلح کر لیتے۔ اگر ایسا تھا تو پھر کارواں پر حملہ کرنے کا منصوبہ کہاں رہ گیا؟ پھر ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ اگر آپ بنوضمرہ اور قریشی کارواں سے ملاقات کی صورت میں کہ وہ صلح سے انکار کر دیتے تو ظاہر ہے کہ آپ ان سے نبرد آزما ہوتے۔ تو کیا ساٹھ مسلمانوں کے ساتھ آپ بنوضمرہ کے علاقے ہی میں ان سے یا ان کی اور قریشی محافظ فوج کی متحدہ طاقت کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتے تھے؟ اور بصورتِ جنگ کامیابی کی توقع کر سکتے تھے فوجی حکمت عملی کا ایک معمولی سا طالب علم بھی بیانگِ دہل کہہ سکتا ہے کہ اتنی مختصر سی فوج کے ساتھ آپ دشمن کے علاقے میں ان کے خلاف جارحانہ کاروائی کرنے کے لئے نہیں نکلے تھے۔ اس لیے واضح ہوتا ہے کہ آپ کا اصل مقصد بنوضمرہ سے معاہدۂ صلح کرنا یا اس کی تجدید کرنا تھا۔ قریشی کارواں پر حملہ کرنا نہیں تھا۔

۵۔ پانچویں مہم :-

دوسرا غزوہ بواط ابتدائی مہموں کے سلسلے کی پانچویں کڑی تھی۔ واقدی کے مطابق بواط ایک مقام تھا جو ضبہ کے کنارے ذی خشب کے نواح میں واقع تھا اور مدینہ سے اس کا فاصلہ محض تین برد تھا۔ ربیع الاول ۲ھ / ستمبر ۶۲۳ء میں یعنی چوتھی مہم کے ایک ماہ کے اندر اندر آپ کاروان قریش کو روکنے کی غرض سے نکلے۔ اس بار کاروان مکہ میں سو قریشی تھے۔ اور پندرہ سو اونٹ اور سالار کاروان امیہ بن خلف جمحی تھا لیکن کوئی مڈبھیڑ نہیں ہوئی اور آپ لوٹ آئے۔ مدینہ سے آپ کی غیر حاضری تقریباً ایک ماہ رہی۔ ابن سعد کی روایت میں کچھ اہم اضافے ہیں۔ اوّل آپ کے سپید پرچم کے علمبردار حضرت سعد بن ابی وقاص تھے اور مدینہ میں آپ کے جانشین حضرت سعد بن معاذ اوسی۔ دوم یہ کہ مسلم لشکر دو سو صحابہ پر مشتمل تھا۔ سوم یہ کہ بواط ایک پہاڑی کا نام تھا جو قبیلہ جہینہ کا علاقہ تھا اور جو رضوی پہاڑ کے نواح میں واقع تھا۔ چہارم یہ کہ بواط مدینہ سے تین برد نہیں بلکہ چار برد کے فاصلے پر تھا۔ بلاذری کی روایات ان دونوں پیشروؤں کی روایات کی تلخیص ہے۔ جبکہ یعقوبی نے اس کو ابواء کے مانند قرار دیا ہے اور طبری نے ایک بار پھر واقدی اور ابن سعد کی روایات کو جمع کر دیا ہے۔ ابن اسحاق اور ابن ہشام کی مختصر روایات میں قریش کے ارادے سے نکلنے اور کسی مڈبھیڑ کے نہ ہونے پر مدینہ واپس آنے کا ذکر ہے۔

اگرچہ اکثر مآخذ میں اس مہم کا مقصد یا نشانہ کاروان قریش یا صرف قریش کو بتایا گیا ہے۔ اور کارواں کے بارے میں بعض مآخذ میں کچھ تفصیلات بھی ہیں خاص کر پہلے غزوہ کے مقابلے میں۔ لیکن پھر بھی بعض تفصیلات تاریکی میں ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کارواں کہاں سے کہاں کو جا رہا تھا؟ پھر اس بار مسلم فوج کی تعداد بعض روایت کے مطابق قریشی کارواں سے دوگنی تھی۔ موقعہ اچھا تھا۔ اور اگر کارواں نکل بھی گیا تو اس کا تعاقب آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ مسلمان سب کے سب سوار تھے اور قریشی کارواں خاصا بڑا تھا۔ (وہ پندرہ سو اونٹوں پر مشتمل تھا) اور ان کے ساتھ محافظ محض سو تھے اس لیے وہ تیز رفتاری سے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ اور اگر مسلمان بالکل مکہ کے قریب سے ایک کارواں پکڑ لا سکتے تھے جیسا کہ ہم سریہ نخلہ کے ضمن میں دیکھیں گے تو پھر چند منزل دور اس کارواں کو جا پکڑنے میں کیا چیز مانع ہو سکتی تھی؟ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقصد نبوی کاروان قریش نہ تھا بلکہ ان کی منزل قبیلہ جہینہ کا علاقہ تھا جہاں وہ کسی سیاسی و سماجی مصلحت سے گئے تھے جیسا کہ ابن سعد کے ایک اشارے سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ مقصد یا مصلحت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ پرانے حلیفوں اور دوستوں سے رشتۂ اتحاد مستحکم تر کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک اہم نکتہ مدینہ سے آپ کی غیر حاضری کی مدت تھی۔ پہلے غزوہ میں آپ پندرہ دن مدینہ سے باہر رہے تھے اور اس غزوہ میں ایک ماہ۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں مقامات مدینہ سے ایک یا دو دن کی مسافت پر واقع تھے۔ باقی مدت آپ وہاں کیوں مقیم رہے؟ ظاہر ہے کہ آپ قریشی کارواں کی واپسی کی توقع اتنی مدت میں نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علاقہ جہینہ میں آپ کا قیام کسی اور مقصد سے تھا اور غالب گمان ہے کہ یہ مقصد اس علاقے کے لوگوں سے دوستی کرنا اور مدینہ کی اسلامی ریاست کا حلیف بنانا تھا۔ کاروان قریش پر حملہ کرنا اور اس کو لوٹنا کم از کم اس غزوہ کا مقصد تو کسی طور سے ثابت نہیں ہوتا اور اس کی تردید خود مآخذ کی داخلی شہادتوں

سے ہو جاتی ہے۔

۶- چھٹی مہم

تیسرا غزوہ بدر اولیٰ اور غزوۂ سفوان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ واقدی کا بیان ہے کہ ربیع الاوّل ۲ھ میں کرز بن جابر فہری نے مدینہ کے اونٹوں پر، جو حِمّا اور اس کے نواح میں چرتے تھے حملہ کیا تھا۔ خبر سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حملہ آوروں کے تعاقب میں نکلے مگر وہ بچ کر نکل گئے۔ ابنِ سعد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس غزوہ میں بھی مسلم فوج کا پرچم سفید تھا اور علمبردار حضرت علی بن ابی طالب تھے۔ اور مدینہ میں آپ کے نائب حضرت زید بن حارثہ تھے۔ حِمّا، ایک پہاڑی تھی جو وادی عقیق میں جُرُف کی سمت میں واقع تھی اور مدینہ سے اس کا فاصلہ محض تین میل تھا۔ کرز بن جابر نے نہ صرف حملہ کیا تھا بلکہ وہ مسلمانوں کے جانوروں میں سے کچھ پکڑ بھی لے گیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے نواح میں واقع وادی سفوان تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے بلاذری اس غزوہ کو غزوۂ سفوان کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اس کا بیان واقدی اور ابن سعد کی روایتوں کی تلخیص ہے یعقوبی نے اس غزوہ کو قرقرۃ الکدر سے خلط ملط کر دیا ہے۔ طبری کے بیان کے مطابق اضافہ ہے کہ شرکائے مہم سب کے سب مہاجر تھے لیکن ان کی تعداد کسی نے بھی نہیں بیان کی ہے ابن اسحاق اور ابنِ ہشام کے بیانات بھی دوسروں کی مانند ہیں۔ فرق بس یہ ہے کہ ان کے یہاں اس غزوہ کی تاریخ وقوع چوتھے غزوہ کے بعد جمادی الآخر ۲ھ میں اور واقعہ نخلہ سے متصلاً پہلے بتائی گئی ہے۔ اس غزوہ کے بارے میں کسی بھی مورخ کا چاہے وہ قدیم ہو یا جدید دعویٰ نہیں ہے کہ وہ کسی کاروانِ قریش کے خلاف تھا اور نہ اس کی کسی سیاسی یا فوجی اہمیت کا ذکر کرتا ہے حالانکہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ پہلی اینٹ تھی جو دشمن کی طرف سے پھینکی گئی تھی۔ صرف منٹگمری واٹ نے اس کی اہمیت کا احساس کیا ہے اور کہا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کے خطرات سے مستقل طور سے باخبر رہنا تھا۔ چنانچہ آپ نے قرب وجوار کے ایک لٹیرے کے خلاف تادیبی کارروائی کی تھی اور آئندہ آپ نے اس قسم کے لٹیروں کے ساتھ بڑی سختی کا سلوک کیا تھا۔

۷- ساتویں مہم :-

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چوتھا غزوہ اور اس عہد کی ساتویں مہم غزوہ ذی العُشَیرہ کے نام سے موسوم ہے۔ واقدی کا خیال ہے کہ جمادی الآخر ۲ھ / دسمبر ۶۲۳ء میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کو جانے والے قریشی کاروان (عیرات قریش) پر چھاپہ مارنے کے لیے منظم کیا تھا۔ مسلمان شرکا کی تعداد ڈیڑھ سو یا دو سو تھی۔ آپ کو خبر ملی تھی کہ مکہ والوں نے اپنا سارا مال (اموال) اس کاروان میں لگا دیا تھا اور پھر آپ کو شام کے لیے مکہ سے کاروان کی روانگی کی خبر ملی تھی۔ آپ بنو دینار کے راستے (النقب اسے بیوت السقیا کے لیے روانہ ہوئے۔ یہی غزوہ ذو العشیرہ تھا۔ مدینہ سے آپ کی غیر حاضری تقریباً ڈیڑھ دو ماہ رہی تھی۔ واقدی کا بیان یہاں ختم ہو جاتا ہے اور باقی تفصیلات تشنہ رہ جاتی ہیں۔ البتہ واقدی کے شاگرد و کاتب ابن سعد نے باقی دوسری تفصیلات بہم پہنچائی ہیں اس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں اپنا جانشین حضرت ابو سلمہ بن عبد الاسد مخزومی کو مقرر کر کے اپنی فوج کے ساتھ روانہ

ہوئے جس کے علمبردار حضرت حمزہؓ تھے اور جس کا پرچم سفید تھا۔ پوری فوج کے لیے کل تیس اونٹ تھے جن پر وہ باری باری بیٹھتے تھے۔ ذوالعشیرہ قبیلہ بنو مدلج کا علاقہ تھا اور وہ ینبع کے نواح میں واقع تھا۔ مدینہ سے ینبع کا فاصلہ نو برد تھا۔ آپؐ کے وہاں پہنچنے سے پہلے کارواں کئی دن پہلے نکل چکا تھا۔ یہ وہی کارواں تھا جس کو آپؐ نے اس کی واپسی کے موقع پر بھی روکنا چاہا تھا مگر کارواں نے ساحل کے کنارے کنارے سفر کر کے اپنے کو بچا لیا تھا اور قریش مکہ کو آپؐ کے ارادے سے باخبر کر دیا چنانچہ انہوں نے اپنے کارواں کی حفاظت کے لیے ایک فوج بھیج دی تھی اور جس کے نتیجہ میں غزوۂ بدر پیش آیا تھا۔ اسی غزوہ میں آپؐ نے حضرت علیؓ کو نرم مٹی (الیوغار) میں سوتے دیکھ کر جگایا تھا اور ابوتراب کے خطاب سے سرفراز فرمایا تھا اور اسی غزوہ میں آپؐ نے قبیلہ بنو مدلج اور بنو ضمرہ میں ان کے حلفاء سے معاہدہ کیا تھا۔ آپؐ کی کسی سے کوئی مڈبھیڑ نہیں ہوئی اور آپؐ واپس مدینہ لوٹ آئے تھے۔ بلاذری نے مختصراً ابن سعد کی روایت کرتے ہوئے یہ اضافہ کیا ہے کہ مسلم فوج میں صرف ایک گھوڑا تھا اور جب مسلم فوج بنو مدلج کے علاقہ سے گذری تو انہوں نے مسلمانوں کی خوب خوب مہمان نوازی کی مگر قریشی کارواں بچ کر نکل گیا۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ آپ اس غزوہ میں قریش کے ارادے سے نکلے تھے اور ابن ہشام نے صرف یہ اضافہ کیا ہے کہ مدینہ میں آپ نے ابوسلمہ کو اپنا جانشین بنایا۔ پھر دونوں کا بیان زیادہ تر مسلم جماعت کے سفر کی مختلف منازل اور ان میں ان کے قیام، کھانے پینے اور نماز پڑھنے یا مساجد بنانے سے متعلق ہے۔ بنو دینار کے راستے سے آپؐ روانہ ہوئے اور فیفاء الخبار کے راستے آپؐ وادی ابن ازہر میں داخل ہوئے جہاں آپؐ نے ایک درخت کے نیچے قیام کیا، نماز پڑھی اور کھانا پکا کر کھایا اور المشترب کے چشمہ سے پانی پیا۔ پھر الخلائق کو اپنے بائیں چھوڑتے ہوئے ایک تنگ وادی سے گزرے جو آج تک وادی عبداللہ کے نام سے مشہور ہے۔ پھر بائیں جانب کے راستے سے روانہ ہوئے حتیٰ کہ آپؐ وادی یلیل پہنچے اور اس حصہ میں قیام کیا جو ضبوعہ سے ملتا ہے اور اس کے کنوئیں سے پانی پیا پھر آپؐ ملل کے میدان سے سفر کرتے ہوئے صخیرات الیمام میں شاہراہ پر پہنچے اور اس پر سفر کرتے ہوئے آپؐ وادی ینبع میں واقع مقام مقصود ذوالعشیرہ پہنچے یہاں آپؐ نے پورے ماہ جمادی الاولیٰ اور دوسرے مہینے کے کچھ دنوں تک قیام کیا۔ آپؐ نے بنو مدلج اور ان کے بنو ضمرہ کے حلیفوں سے دوستی کا معاہدہ کیا اور بغیر کسی جنگ و جدال کے مدینہ واپس آگئے۔ اسی غزوہ میں آپؐ نے حضرت علیؓ کو ابوتراب کی کنیت عطا فرمائی اور اس سلسلہ میں کئی روایات بیان کی ہیں۔ یعقوبی نے صرف اتنا بیان کیا ہے کہ ان دو بدوی عربی قبیلوں سے معاہدہ آپؐ نے ان کے سردار مخشی بن عمر ضمری کی معرفت کیا۔ طبری میں مندرج روایات ابن اسحاق اور ان کے جامع اور واقدی اور ان کے کاتب کی روایات کا حسب معمول مجموعہ ہیں تاہم ان میں غزوہ کی تفصیلات سے زیادہ زور حضرت علیؓ کی کنیت کے بارے میں روایات پر ہے۔ بلکہ ایک طرح سے طبری سے پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ غزوہ کس مقصد سے ہوا تھا اور اس میں کیا مسائل و مقاصد مسلمانوں کے پیش نظر تھے؟

مذکورہ بالا مآخذ سے اکثریت غزوہ کے بیان کے شروع میں یہ کہہ کر مسلم فوج قریش کے ارادے سے نکلی تھی پھر کاروان قریش کا کوئی ذکر نہیں کرتی حتیٰ کہ واقدی نے بھی بعد میں صرف اتنا کہا ہے کہ قریش نے اس کارواں میں اپنا سارا مال لگا دیا تھا۔ اور وہ مسلم جماعت کے ذوالعشیرہ پہنچنے سے پہلے نکل گیا تھا۔ تفصیلات صرف ابن سعد کی روایات سے ملتی ہیں اور یہ پتہ چلتا ہے کہ ابن سعد نے جس قریشی کارواں کی طرف اشارہ کیا ہے یہ وہ کارواں تھا جو ابوسفیان بن حرب اموی کی قیادت میں بدر سے کچھ پہلے شام گیا تھا اور جس کو واپسی پر مسلمانوں

نے روکنا چاہا تھا اور جس کے نتیجہ میں غزوۂ بدر پیش آیا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ عظیم و مالامال کاروانِ قریش کب شام کے لئے مکہ سے روانہ ہوا تھا کیونکہ واقدی نے جنگ بدر کے اسباب کے بارے میں اپنی دو روایتوں میں اور ابن سعد نے غزوۃ العشیرہ کے سبب و محرک پر اپنی ایک روایت میں دعویٰ کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کاروانِ قریش کو اس کی آمد و رفت دونوں مواقع پر روکنا چاہا تھا۔ ظاہر ہے کہ واقدی اور ان کے کاتب نے صراحتاً کہا ہے کہ یہ کارواں مکہ سے جمادی الآخر میں غزوہ العشیرہ سے پہلے روانہ ہوا تھا۔ دوسری طرف ابن اسحاق اور ان کے جامع کا بیان ہے کہ غزوہ ذوالعشیرہ جمادی الاولیٰ کے شروع میں پیش آیا تھا۔ گویا کہ بالواسطہ طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ابن اسحاق اور ابن ہشام کو اس سے اتفاق نہیں کہ غزوہ ذوالعشیرہ نے ابوسفیان کے زیر قیادت تجارتی قافلے کو شام جاتے وقت روکنا چاہا تھا۔ طبری میں مذکورہ ایک روایت جو عروہ بن زبیر نے عبدالملک بن مروان کے استفسار پر اپنے خط میں لکھی تھی، سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ نخلہ کے بعد یہ کارواں قریش مکہ سے شام کے لیے روانہ ہوا تھا۔ کیونکہ اس کے مطابق یہ سریہ نخلہ ہی تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑکائے تھے۔ (وكانت تلك الموقعة هاجت الحرب بين رسول الله صلى الله عليه وسلم وبين قريش واول ما اصاب به بعضهم بعضا من الحرب، وذلك قبل مخرج ابى سفيان واصحابه الى الشام ......) اس کے علاوہ اس کاروانِ قریش کا ایک سیاسی مقصد جس پر ہم کچھ بعد میں بحث کریں گے اور واقعہ نخلہ کے نتائج کے علاوہ بعض دوسری تفصیلات یہ واضح کرتی ہیں کہ یہ قریشی کارواں واقعہ نخلہ کے بعد کسی وقت رجب ۲ھ میں روانہ ہوا تھا اور اس کی واپسی دو ماہ بعد رمضان ۲ھ میں ہوئی تھی۔ اگر یہ تعیین وقت صحیح ہے تو واقدی اور ابن سعد کا یہ دعویٰ کہ غزوہ ذوالعشیرہ میں آپؐ نے اسی کارواں پر حملہ کرنا چاہا تھا غلط معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ واقعہ بدر کے اسباب کی بعض تفصیلات ثابت کرتی ہیں کہ آپؐ نے اس قریشی کارواں پر اس کی واپسی پر ہی حملہ کرنا چاہا تھا۔ خود واقدی اور ابن سعد کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کارواں کی واپسی کے وقت کا انتظار کرتے رہے تھے اور جب وہ وقت آگیا تو آپؐ نے اپنے اصحاب کو بلا کر کہا کہ:

> "یہ قریش کا کارواں آرہا ہے جس میں ان کا تمام مال لگا ہے شاید اللہ تم کو اس میں غنیمت عطا فرمائے"

اس کے علاوہ ابن اسحاق اور ان کے جامع اور ان کے تمام ماخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ شام سے واپسی کے دوران کاروانِ قریش پر چھاپہ مارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ خاص کر ابن اسحاق کا یہ جملہ کہ مسلمانوں میں سے بعض نے یہ حکم نبوی بخوشی قبول کیا تھا اور بعض نے ناگواری سے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ آپؐ مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کے لیے نہ خود جائیں گے نہ ان سے کہیں گے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے آپؐ کی تمام مہمیں بشمول غزوۂ ذوالعشیرہ چھاپہ مار کارروائی یا جنگ کے لیے نہ تھیں کیونکہ چھاپہ مار کارروائی میں بھی جنگ کا اور خونریزی کا خطرہ ضرور تھا اور اسی خطرے سے بعض لوگ بچنا چاہتے تھے۔

قریشی کارواں کی تعیین اوقات آمد و رفت کے علاوہ اس غزوہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جادۂ سفر کا معاملہ بہت اہم ہے۔ ابن اسحاق کے بیان پر کسی قسم کا شبہ کرنے کا کوئی سبب نہیں ہے بہرحال اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ نے علم

سفر کے راستے سے ہٹ کر کافی دور سفر کیا تھا اور منزل مقصود کے قریب معمول کے راستے پر لگے تھے جہاں سے ذوالعشیرہ پہنچے ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاصا پیچدار اور لمبا راستہ تھا۔ عام راستہ کو چھوڑنا تو رازداری کی خاطر بھی ہو سکتا تھا مگر ایک طویل تر اور پیچیدہ تر راستہ اختیار کرنا قیمتی وقت لیتا ہے جیسا کہ اس مہم کے دوران ہوا اگر آپ مدینہ سے سیدھے شاہراہ تجارت کا رُخ کرتے اور بجائے مغرب شمال کے مغرب جنوب یا سیدھے مغرب میں جاتے تو زیادہ جلد اور شاید وقت پر پہنچ جاتے جیسا کہ آپؐ نے غزوۂ بدر سے پہلے کیا تھا لیکن در اصل شاہراہ تجارت آپؐ کی اصل منزل نہ تھی۔ آپ کی اصل منزل تو بنو مدلج کا علاقہ تھا جن کی خاطر آپ نے یہ سفر کیا تھا۔

تقریباً تمام ماخذ سے عام طور پر اور بلاذری کے ایک جملے سے خاص کر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس مہم کا مقصد بنو مدلج اور ان کے ضمری حلیفوں سے معاہدۂ اخوت و دوستی تھا۔ اس کی مزید تائید اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ آپ نے ذوالعشیرہ میں مختلف روایات کے مطابق ایک ماہ سے زیادہ اور دو ماہ سے کم وقت گزارا یہ وقت گزاری محض عام قریشی کاروانوں کے گذرنے یا اس مخصوص بڑے قریشی کاروانوں کی واپسی کی خاطر نہ تھی جیسا کہ واقدی کی دو روایتوں میں ایک جذامی شخص کے تاثر سے ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ بیّن امر تھا کہ قافلہ جلد ہی گزر چکا تھا اور ماہ ڈیڑھ ماہ میں اس کی واپسی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لیے یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آپ کا علاقۂ بنو مدلج میں قیام قریشی کارواں کی واپسی کے انتظار میں نہ تھا بلکہ اس علاقہ کے لوگوں کی خاطر تھا۔ اس خیال کی مزید تائید خود واقدی ہی کی روایتوں سے ہوتی ہے جن میں کہا گیا ہے کہ آپؐ قریشی کارواں کی واپسی کے سلسلے میں وقت شماری کرتے رہے تھے یعنی آپ کو اندازہ تھا کہ اس کی واپسی کا متوقع وقت کون سا ہوگا اور غزوۂ بدر کے لیے آپ کی ۱۲ رمضان ۲ھ کو روانگی اور وہ بھی اپنے ان جاسوسوں کی واپسی کا انتظار کئے بغیر جو قریشی کارواں کے بارے میں حتمی معلومات حاصل کرنے گئے تھے کہ مراجعت مدینہ سے پہلے اور پھر ۱۶ رمضان ۲ھ کو بدر میں پہنچنے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ آپ کو اس تاریخ یا اس کے مابعد قافلۂ مکہ کے بدر سے گزرنے کا کتنا صحیح اندازہ تھا۔ ابوسفیان نے اپنا قافلۂ تجارت مسلمانوں کی اندازۂ تاریخ و وقت مقام گذر و راہ گزر وغیرہ کی وجہ سے نہیں بچا لیا تھا بلکہ محض اپنی دُور اندیشی، سوجھ بوجھ اور عین بدر سے پہلے اصل راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر کے اور تیز رفتاری سے قریش کو خبر کر کے اور مسلم فوج کے تعاقب کی راہ کو مسدود کر کے بچایا اور محفوظ کیا تھا۔

اسی ذیل میں ایک اہم نکتہ اور ابھرتا ہے۔ واقدی، ابن اسحاق اور بغدادی کے بیان سے واضح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈیڑھ ماہ کے قریب قیام کیا تھا۔ اگر اس غزوہ کی تاریخ واقدی کی بتائی ہوئی تسلیم کر لی جائے تو مدینہ کو آپ کی واپسی ماہ رجب کے اواخر یا کم از کم اواسط کے بعد ہونی چاہیے مگر یہ نتیجہ ماخذ کے صریح بیانات سے عموماً اور ابن اسحاق کے بیان سے خصوصاً مردود قرار پاتا ہے۔ تقریباً تمام ماخذ کا اس پر اتفاق ہے کہ جمادی الآخر، رجب، شعبان اور رمضان کے پہلے ہفتہ تک آپ مدینہ میں مقیم رہے تھے اور غزوۂ ذوالعشیرہ سے واپسی پر آپ نے سریہ نخلہ بھیجا تھا اس سے دو اہم نتیجے سامنے آتے ہیں اوّل یہ کہ غزوہ ذوالعشیرہ کے بارے میں ابن اسحاق کی بیان کردہ تاریخیں زیادہ صحیح ہیں اور واقدی کی مشتبہ۔ دوم یہ کہ ابوسفیان کا کارواں

شام اس وقت تک روانہ ہی نہ ہوا تھا۔ تو پھر اس پر مسلم چھاپے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے!

پھر آخری نکتہ اس کاروان قریش کے بارے میں یہ ہے کہ اس عظیم و مالامال قافلے کے ساتھ کل تیس چالیس اور ایک روایت کے مطابق ستر آدمی تھے اور وہ کل ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل تھا۔ اس پر تمام مآخذ کا اتفاق ہے کہ ماضی قریب میں یہ سب سے بڑا کاروان مکہ تھا جس میں ہر مکی مرد و عورت کا کچھ نہ کچھ پیسہ لگا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ بعض قریشی کاروانوں کا ذکر آ چکا ہے اور ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ کسی میں تین سو کسی میں دو سو اور کسی میں سو محافظ یا اشخاص تھے۔ ایک کارواں کے بارے میں تو یہ کہا گیا ہے کہ اس میں پندرہ سو اونٹ تھے۔ ظاہر ہے کہ سب کے سب ابو سفیان کے زیرِ قیادت مکی کارواں کے مقابلے میں کافی حقیر تھے۔ ان میں اتنی بڑی تعداد میں محافظوں یا تاجروں کی موجودگی کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کی تعداد میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے اس خیال کو مغربی مورخین خصوصاً منٹگمری واٹ نے قبول کر لیا ہے۔ دوسرے یہ کہ مکی تاجروں نے شروع میں مدینہ میں اور مسلم حکومت کے قیام سے خوف محسوس کیا تھا اور حفاظت کی خاطر زیادہ سے زیادہ محافظ ساتھ لیے تھے لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا ان کے دل سے خوف دور ہوتا گیا اور اسی وجہ سے قریشی کاروانوں میں شامل افراد کی تعداد گھٹتی گئی تا آنکہ ان کے عظیم ترین کارواں میں افرادی طاقت سب سے کم رہ گئی اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ جب ابو سفیان اپنا کارواں لے کر شام روانہ ہوئے تھے تو نہ صرف ان کو بلکہ مکہ والوں کو مدینہ کے مسلمانوں سے کم از کم کوئی خطرہ اپنی تجارت کے لئے محسوس نہیں ہوا تھا۔ اور نہ ہی اس قافلے والوں نے پورے سفر کے راستے میں خاص کر مدینہ کے قریب سے گذرتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ ان کو پہلی بار خطرہ شام میں قیام کے دوران یا اپنی واپسی پر شام کی سرحد پر بنو جذام و عذرہ کے علاقہ میں محسوس ہوا تھا اور وہ ہوشیار ہو گئے تھے اور انھوں نے اپنی پہلی فرصت میں اس کی حفاظت کا بندوبست کیا تھا۔ ان تمام نکات و حقائق کی روشنی میں یہ بات حتمی طور سے کہی جا سکتی ہے کہ غزوہ ذوالعشیرہ کا مقصد و محرک قریشی کاروانِ تجارت پر چھاپہ مارنا نہیں تھا بلکہ اس علاقے کے بدوی قبائل سے صلح و دوستی کے معاہدے کرنا تھا۔

۸ - آٹھویں مہم :-

ابتدائی مہموں کے سلسلے کی آخری اور غالباً اہم ترین مہم نخلہ کی تھی جو حضرت عبداللہ بن جحش بن رباب الاسدی کی قیادت میں مکہ کے بالکل قریب واقع مقام نخلہ کو بھیجی گئی تھی۔ ابن اسحاق اور ان کے جامع کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ سفوان یا بدر اولیٰ سے اپنی واپسی پر رجب میں آٹھ مہاجرین پر مشتمل یہ مہم روانہ فرمائی تھی۔ آپ نے حضرت عبداللہ بن جحش کو ایک ہدایت نامہ (کتاب) عطا فرما کر حکم دیا تھا کہ دو دن کے سفر کے بعد اسے کھول کر دیکھیں اور اس میں تحریر شدہ حکم پر عمل کریں اور اگر ان کے ساتھیوں میں سے کوئی نہ چاہے تو اس کو مجبور نہ کریں۔ ان آٹھ مہاجرین کے نام یہ تھے :-

۱۔ حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ اموی رض
۲۔ حضرت عبداللہ بن جحش اسدی رض (حلیف بنو امیہ)
۳۔ حضرت عکاشہ بن محصن اسدی رض (حلیف بنو امیہ)
۴۔ حضرت سعد بن ابی وقاص زہری رض
۵۔ حضرت عامر بن ربیعہ عنزی (حلیف بنو عدی)
۶۔ حضرت عتبہ بن غزوان مازنی (حلیف بنو زہرہ)

۷۔ حضرت بکیر خالد بن بکیر لیثیؓ (حلیف بنو سعد)   ۸۔ حضرت سہیل بن بیضا حارثیؓ

دو دن کے سفر کے بعد جب حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے نامۂ مبارک کھولا تو اس میں تحریر تھا:

اذا نظرت فی کتابی ھذا فامض حتی تنزل نخلة بین مکة و الطائف فترصد بھا قریشا وتعلم لنا من اخبارھم

(جب تم میرا یہ خط پڑھو تو چلتے رہو یہاں تک کہ مکہ اور طائف کے درمیان واقع نخلہ میں قیام کرو اور وہاں قریش پر کڑی نظر رکھو اور ہمارے لئے ان کی خبریں معلوم کرو۔)

خط کا مضمون پڑھ کر انہوں نے آمنا وصدقنا کہا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ:

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو نخلہ جا کر قریش پر نظر رکھنے اور ان کی خبریں معلوم کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ نے مجھ کو تم میں سے کسی کو مجبور کرنے سے منع کیا ہے۔ اگر کسی کو شہادت کی تمنا ہے تو وہ آگے چلے اور جس کو نہ ہو وہ واپس چلا جائے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل کروں گا۔“

چنانچہ وہ روانہ ہو گئے اور ان کے تمام اصحاب نے ان کا ساتھ دیا اور کسی نے بھی پیچھے رہنا پسند نہ کیا۔ وہ حجاز کے راستے سفر کرتے رہے یہاں تک کہ جب وہ فرع کے علاقہ بالا میں واقع ایک کان (معدن) پر پہنچے جس کو بحران کہا جاتا تھا تو سعد اور عتبہ کا اونٹ گم ہو گیا جس پر وہ آگے پیچھے بیٹھتے تھے۔ چنانچہ وہ اس کی تلاش میں پیچھے رہ گئے۔ جبکہ حضرت عبداللہ اور ان کے بقیہ ساتھی نخلہ جا پہنچے۔ ایک قریشی کارواں جو سوکھی کھجوریں (زبیب) کھالیں (ادم) اور کچھ دوسرا سامان تجارت (تجارة من تجارة قریش) لے جا رہا تھا۔ ان کے پاس سے گذرا۔ اس میں عمرو بن حضرمی، عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ مخزومی اور اس کا بھائی نوفل مخزومی اور ہشام بن مغیرہ مخزومی کا مولیٰ حکم بن کیسان شامل تھے۔ جب کارواں والوں نے مسلمانوں کو دیکھا تو خوفزدہ ہو گئے کیونکہ وہ ان کے قریب ہی خیمہ زن ہوئے تھے عکاشہ نے جنہوں نے اپنا سر گھٹا لیا تھا ان کے سامنے آ گئے اور ان کو یہ دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ ”وہ عمرہ کرنے والے ہیں اور ان سے خوف کی کوئی ضرورت نہیں“ مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کیا کیونکہ یہ رجب کا آخری دن تھا اور آپس میں کہا کہ ”اگر تم ان کو آج کی رات چھوڑتے ہو تو یہ حرم مکہ میں داخل ہو جائیں گے اور تم سے بچ نکلیں گے اور اگر تم ان کو قتل کرتے ہو تو تم ایسا ماہ مقدس میں کرو گے۔“ چنانچہ وہ ان پر حملہ کرنے سے گریزاں و ترساں تھے۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کو ہمت دلائی اور آخر کار فیصلہ کر لیا کہ ان میں جتنوں کو قتل کرنا ممکن ہو ان کو مار ڈالا جائے اور ان کے مال پر قبضہ کر لیا جائے۔ واقد بن عبداللہ تمیمی نے عمرو بن حضرمی پر ایک تیر چلایا اور اس کو مار ڈالا۔ عثمان بن عبداللہ مخزومی اور حکم بن کیسان نے اپنے کو حوالہ کر دیا اور نوفل بچ کر نکل گیا۔ حضرت عبداللہ اور ان کے اصحاب نے کارواں اور دونوں قیدیوں پر قبضہ کر لیا اور ان کو لے کر مدینہ پہنچے۔ عبداللہ کے ایک خاندان والے کا بیان ہے کہ اول الذکر نے کہا تھا کہ: ”مال غنیمت میں سے خمس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ ہے۔“ (یہ فیصلہ مال غنیمت میں خمس کا حکم خداوندی کے نازل ہونے سے پہلے کیا گیا تھا) بہرحال

انہوں نے خمس الگ کر کے باقی مال اپنے تمام اصحاب میں تقسیم کر دیا۔

جب یہ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپؐ نے فرمایا کہ:

"میں نے تم کو ماہ مقدس میں لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا۔"

اور آپ نے کارواں اور دونوں قیدیوں کا معاملہ معطل رکھا اور ان میں سے کچھ بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا تو اصحاب سریہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور ان کو اپنی ہلاکت نظر آنے لگی۔ ان کے مسلمان بھائیوں نے ان کو ان کے فعل پر لعن طعن شروع کر دیا اور قریش نے کہا "محمدؐ اور ان کے اصحاب نے ماہ مقدس کی بے حرمتی کی ہے اس میں خون ریزی کی، مال لوٹا اور قیدی بنائے۔"

مکہ میں موجود مسلمانوں نے اس کی تردید کی اور جواباً کہا کہ انہوں نے یہ سب کچھ شعبان میں کیا ہے۔ یہودیوں نے اس واقعہ سے فال نکالی (جس کا مفہوم و مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں اور مکہ والوں کے درمیان اس واقعہ کی بنا پر جنگ چھڑنے والی ہے) لیکن خدا نے اس (فال) کو ان پر ہی الٹ دیا اور ان کے حق میں نہ رہنے دیا اور جب اس معاملہ پر بہت گفتگو ہونے لگی تو خدا نے اپنے رسول پر نازل فرمایا:

یسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیہ قل قتالٌ فیہ کبیر، وصدٌّ عن سبیل اللہ وکفرٌ بہ والمسجد الحرام واخراج اھلہ منہ اکبر عند اللہ والفتنۃ اکبر من القتل، ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا....

(۲ : ۲۱۷)

ترجمہ: تجھ سے پوچھتے ہیں حرام کے مہینے کو اس میں لڑائی کرنے، تو کہہ لڑائی اس میں بڑا گناہ ہے اور روکنا اللہ کی راہ سے اور اس کو نہ ماننا اور مسجد حرام سے روکنا اور نکال دینا اس کے لوگوں کو وہاں سے اس سے زیادہ گناہ ہے اللہ کے ہاں اور دین سے بچلانا مار ڈالنے سے زیادہ اور وہ تو لگے ہی رہتے ہیں تم سے لڑنے کو یہاں تک کہ تم کو پھیر دیں تمہارے دین سے اگر مقدور پاویں۔

(ترجمہ از شاہ عبدالقادر دہلوی)

جب اس معاملہ کے بارے میں قرآن نازل ہوا اور اللہ نے مسلمانوں کی تشویش دور کر دی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کارواں اور قیدیوں پر قبضہ کر لیا۔ قریش نے آپؐ کے پاس عثمان اور حکم کو رہا کرانے کے لئے بھیجا لیکن آپؐ نے فرمایا کہ:

"ہم ان کو اس وقت تک رہا نہیں کریں گے جب تک ہمارے دونوں ساتھی واپس نہیں آ جاتے (آپ کی مراد حضرت سعدؓ اور عتبہؓ سے تھی) اگر تم ان کو مار ڈالو گے تو ہم تمہارے ساتھیوں کو قتل کر دیں گے۔"

لیکن جب حضرت سعدؓ اور عتبہؓ واپس آ گئے تو آپ نے ان دونوں قیدیوں کو زر فدیہ لے کر رہا کر دیا۔ جہاں تک حکم کا تعلق ہے وہ اچھے مسلمان بنے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مقیم رہے یہاں تک کہ بئر معونہ میں شہید ہوئے۔ عثمان اللعنہ مکہ چلا گیا جہاں وہ کافر

کی حیثیت سے مرا۔ قرآن کے نازل ہونے پر جب حضرت عبداللہ کی تشویش دور ہو گئی تو ان کو اجر و ثواب کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اور انہوں نے پوچھا: "کیا ہمارے اس کارنامے کو جہاد مانا جائے گا اور ہم کو مجاہدین کا اجر ملے گا؟"

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا:

ان الذین آمنوا والذین ھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ اولٰئک یرجون رحمۃ اللہ واللہ غفور رحیم (۲-۲۱۸)

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور لڑے اللہ کی راہ میں وہ امید وار ہیں اللہ کی مہر کے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

(ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی)

اس طرح اللہ نے ان کی سب سے بڑی آرزو پوری کر دی۔

حضرت عبداللہؓ کے ایک خاندان والے کا کہنا ہے کہ خدا نے مالِ غنیمت کے چار حصے مجاہدین کے لئے اور خمس خدا اور اس کے رسولؐ کے لیے مقرر فرما دیئے۔ یہ فیصلۂ خداوندی اس کاروانِ قریش کے مالِ غنیمت کے بارے میں حضرت عبداللہؓ کے فیصلہ کے مطابق تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عبداللہ کے سریے کے بارے میں کچھ اشعار کہے تھے اور بعض راویوں کا خیال ہے کہ یہ اشعار خود امیر سریۂ نخلہ نے کہے تھے۔ ان اشعار کا مفہوم قرآنی آیت ۲ : ۲۱۷ کے مطابق ہے۔ صرف اضافہ یہ ہے کہ ابن حضرمی کے قتل اور واقد کے ہاتھوں جنگ کے شعلے بھڑکائے جانے اور عثمان مخزومی کے مسلمانوں کے قبضہ میں ہونے کی طرف اشارہ کئے گئے ہیں) ابن اسحاق کی روایت بیان کرنے کے بعد ابن ہشام نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ پہلا مالِ غنیمت تھا جو مسلمانوں کو ملا، عمرو بن حضرمی پہلا مقتول تھا جس کو مسلمانوں نے مارا تھا جبکہ عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان ان کے پہلے قیدی تھے۔

واقدی کی روایت میں حسبِ ذیل اہم اضافے اور اختلافات ہیں:

۱۔ یہ مہم ہجرت کے سترھویں مہینے کے آغاز میں (علی راس سبعۃ عشر شھرا) نخلہ بھیجی گئی تھی جو ابن عامر کا باغ تھا۔

۲۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روانگی سے ایک شام قبل حضرت عبداللہ کو نمازِ عشاء کے وقت طلب فرمایا تھا اور اگلی صبح مسلح ہو کر آنے کی ہدایت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "میں صبح کو تمہیں کہیں بھیجوں گا۔"

۳۔ حسبِ ہدایت نبوی جب وہ صبح کو حاضر ہوئے تو تلوار، تیر کمان و ترکش اور چمڑے سے بنی ہوئی ڈھال سے مسلح تھے۔ نمازِ صبح کے بعد لوگوں کے منتشر ہونے پر حضرت عبداللہ دولتکدۂ نبوی پر پہنچے تو وہاں پہلے سے قریش کے کچھ لوگ موجود تھے۔

۴۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب کو بلا کر خولانی چمڑے کے ٹکڑے (ادیم خولانی) پر خط لکھوایا۔

۵۔ حضرت عبداللہ بن جحش کے استفسار پر آپؐ نے ان کو رکیۃ کی سمت میں نجدی راستے (نجدیۃ) سے سفر کی ہدایت فرمائی تھی۔

۶۔ آپ نے امیر سریہ کو ابن ضمیرہ کے کنوئیں (بئر) نامی مقام پر پہنچنے کے بعد خط پڑھنے کا حکم دیا تھا۔

۷۔ نخلہ پہنچنے پر ان کو واقدی کے مطابق قریش پر نظر رکھنے کے بجائے کاروانِ قریش پر نگاہ رکھنے کا حکم نامۂ نبوی میں دیا گیا تھا (فترصد بھا عیر قریش)

۸۔ حضرت عکاشہ نے مکی کارواں والوں کا خوف دور کرنے کے لیے فوراً "حلق" کرایا تھا اور عامر بن ربیعہ کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے ان کا سر مونڈا تھا۔

۹۔ قریشیوں نے اپنی سواریاں (رکابہم) کھول دی تھیں اور کھانا پکانے میں مصروف ہو گئے تھے۔

۱۰۔ دن اور تاریخ کے بارے میں اصحاب نبیؐ میں اس پر اختلاف تھا کہ وہ آخری رجب تھی یا یکم شعبان۔

۱۱۔ مسلم جماعت دو فریقوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک کا خیال تھا کہ ان پر حملہ کر کے ان کا مال و متاع چھین لیا جائے اور دوسرے فریق نے اس خیال کی مخالفت کی تھی اور پہلے فریق کو دنیاوی مال کی طمع (عرض اللہ) سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ لوگ غالب ہوئے تھے جو دنیاوی مال و دولت کی فکر میں تھے"۔

۱۲۔ حضرت مقداد بن عمرو کا بیان ہے کہ میں نے جب حکم بن کیسان کو پکڑ لیا تو ہمارے امیر نے ان کی گردن مارنی چاہی مگر ہم نے ان کو اس سے باز رکھا۔ واقدی نے حضرت حکم کے مسلمان ہونے کی تفصیلات اسی جگہ بیان کی ہیں اور کہا ہے کہ ان کے مدینہ پہنچنے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے جب اسلام پیش کیا تو کافی دیر تک کلام کرتے رہے اور ان کو سمجھاتے رہے لیکن وہ برابر خاموش رہے۔ حضرت عمرؓ نے ان کی عدم قبولیتِ اسلام کو دیکھ کر ان کی گردن مارنے کی دھمکی دی لیکن پھر بھی ان کے بند لب نہ کھلے۔ آخر کار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلسل تبلیغ کام کر گئی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ واقدی نے زہری کی روایت بیان کی ہے کہ حضرت حکم بن کیسان نے اسلام لانے سے پہلے اسلام کی تعریف پوچھی تھی اور جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بتایا کہ اسلام توحید الٰہی اور رسالت محمدیؐ کا اقرار صادق ہے تو وہ اسلام لے آئے۔

۱۳۔ واقدی کے مطابق قریشی کارواں میں ادم، زبیب کے علاوہ خمر (شراب) بھی تھی اور یہ سامان وہ طائف سے لا رہے تھے۔

۱۴۔ بحران نامی کان کے بارے میں واقدی نے یہ تصریح کی ہے کہ وہ بنو سُلیم کی مشہور کان کا ایک حصہ (ناحیۃ) تھی۔

۱۵۔ حضرت سعد بن ابی وقاص زہری کا بیان یہ ہے کہ اس مہم میں بارہ اشخاص تھے۔ پھر انہوں نے اپنے بچھڑ جانے کا قصہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ بحران میں ہم نے اپنے اونٹ چرنے کے لیے چھوڑ دیے تھے۔ ہر دو آدمیوں کے لیے ایک اونٹ تھا جس پر وہ مشترکہ طور سے سواری کرتے تھے۔ ان کا اونٹ چرتے چرتے کھو گیا تھا اس لیے وہ مہم سے پیچھے رہ گئے تھے۔ حضرت سعدؓ نے اپنے واپسی کے سفر کی تفصیلات مع منازل کے بیان کی ہیں۔

۱۶۔ واقدی کے مطابق قریش کے ہر قیدی کا زر فدیہ چالیس اوقیہ تھا اور ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے تھے۔

۱۷۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں یہ وضاحت کی ہے کہ خمس (۱/۵) کی جگہ جاہلیت کے زمانے میں ربع (۱/۴) ہوتا تھا۔

۱۸۔ ابو بردہ بن نیار کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف خمس کو معطل نہیں کیا تھا بلکہ پورا کارواں ہی موقوف رکھا تھا اور نخلہ کے مالِ غنیمت کو بدر کے مالِ غنیمت کے ساتھ تقسیم کیا تھا۔

۱۹۔ مقتول نمی ابن حضرمی کی روایت کے سلسلے میں دو متضاد روایتیں ملتی ہیں اول عروہ کی روایت ہے جس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت ادا کی تھی۔ اور ماہ مقدس کی حرمت کی تصدیق کی تھی اور اس کو برقرار رکھا تھا۔ جبکہ دوسری روایت ابن عباس

کی ہے جس کے مطابق آپؐ نے ابن حضرمی کی دیت نہیں ادا کی تھی۔

۲۰۔ ابومعشر کی روایت ہے کہ اسی غزوہ میں حضرت عبداللہ بن جحشؓ کو امیرالمومنین کا خطاب ملا تھا۔

۲۱۔ آخر میں واقدی نے شرکاء مہم کی فہرست دی ہے جس میں کل آٹھ نام گنائے ہیں اور کہا ہے کہ یہی روایت زیادہ صحیح اثبت ہے بعض دوسری روایتوں کے مطابق ان کی تعداد بارہ اور تیرہ بھی بتائی گئی ہے۔

ابن سعد کی روایت ان کے استاد واقدی کی روایت کی تلخیص ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے یہاں شرکاء مہم کی تعداد بارہ ہی بتائی گئی ہے اور نامہ نبوی کی عبارت کی جگہ ان کے اپنے الفاظ میں کاروان قریش (عیر قریش) پر نظر رکھنے کے حکم کی طرف اشارہ ہے۔ بلاذری کی روایت بھی واقدی کی روایت کا چربہ ہے لیکن کچھ فرق کے ساتھ۔ ایک تو فرق یہ ہے کہ اس میں حکم بن کیسان کو بھی محلوق بتایا گیا ہے، دوم نامۂ نبوی کے اصل فقرے میں فعل مختلف ہے اور فارصد بھا عیر قریش کے الفاظ ہیں۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ شہر حرام میں جنگ و جدال کے بارے میں استفسار جس کی طرف قرآنِ کریم کی متعلقہ آیت میں حوالہ ہے مسلمانوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا۔ یعقوبی کی روایت ابن اسحاق کی روایت کا اختصار ہے۔ طبری نے تین روایات بیان کی ہیں اس سلسلہ میں پہلی تو ابن اسحاق کی روایت ہے جو پوری مفصل ہے۔ دوسری واقدی کا صرف ایک مختصر حوالہ ہے اور تیسری روایت سدی کی ہے جو مذکورہ بالا دونوں قسم کی روایتوں سے کافی مختلف ہے۔ اس تیسری روایت کے مطابق نخلہ کی مہم میں کل سات نفر تھے۔ ان میں عمار بن یاسر اور عامر بن فہیرہ کے دو نئے نام ہیں۔ اور حضرت عبداللہ بن جحش نے جس جگہ نامۂ مبارک پڑھا تھا اس کا نام بطن ملل یا وادی ملل بتایا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ نے اپنے ساتھیوں کو موت کے لیے تیار رہنے اور وصیت کر لینے کی ہدایت بھی کی تھی۔ مکی کارواں کے شرکاء کی تعداد چار ہی بتائی گئی ہے اور ایک کے سوا سب کے نام بھی دوسروں کی طرح ہیں۔ نیا نام مغیرہ بن عثمان ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہی شخص مسلمانوں کے ہاتھوں سے بچ نکلا تھا۔ ایک نیا فرق یہ ہے کہ جب مسلمانوں پر کافروں نے رجب میں قتل و خونریزی کرنے کا الزام لگایا اور لعن طعن کیا تھا تو مسلمانوں نے اپنے جواب میں تردید کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ مہینہ جمادی الآخر کا تھا۔ ابوجعفر کی روایت کے مطابق پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو امیر سریہ بنا کر بھیج دیا تھا مگر پھر ان کو واپس بلا کر حضرت عبداللہ بن جحش کو ان کی جگہ امیر سریہ مقرر کر کے روانہ کیا تھا۔

جدید مغربی مورخین نے خاص طور پر اور عام جدید مصنفین نے عام طور سے اس سریہ پر کافی بحث کی ہے اور مسلمانوں بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریشی کاروان پر ماہ مقدس میں مال و دولت کی حرص و ہوس میں غدارانہ حملے کا مورد الزام قرار دیا ہے کارل بروکلمن (CARL BROCKELMANN) کا خیال ہے کہ مسلم مہم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر ماہ مقدس کی بے حرمتی کر کے ایک مالا مال کارواں کو لوٹ لیا کیونکہ مکی کارواں کے محافظ ماہ مقدس کی وجہ سے اس کے تحفظ کی طرف سے مطمئن تھے۔ لیکن اس قبائلی اخلاقی ضابطہ کی اس خلاف ورزی پر جب خود مدینہ میں ایک طوفان ناراضگی اٹھ کھڑا ہوا تو رسولؐ نے حملہ کرنے کا حکم دینے کی واقعیت سے انکار کر دیا حالانکہ اس کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ حملہ آپ کی خواہشات کے مطابق ہوا تھا اور بعد میں آپ کی تردید یا انکار آپ کے اپنے احکام کی غلط تعبیر و تشریح تھی۔ لیکن جب کثیر مالِ غنیمت نے آپ میں شدید حرص پیدا کر دی تو آپ نے ایک بعد کی آیت

منزلہ میں کافروں کے خلاف اعلان جہاد کرنے اور مال غنیمت کی تقسیم اور ماہ مقدس میں جنگ کے جواز کا اعلان کرنے کی جرأت کی۔ فرانسسکو جبرئیلی (FRANCESCO GABRIELI) نے اس مہم کو مدینہ کی کثیر آبادی کی مادی ضروریات پوری کرنے کے عوامل کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے اس کو ایک غدارانہ حملہ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اس نے صلح کے زمانے کا خاتمہ کر دیا اور جس کے نتیجہ میں مکہ میں شدید ردعمل ہوا اور مدینہ میں بھی خاصی بے چینی پیدا ہو گئی۔" مونٹگمری واٹ نے ان سب میں سب سے طویل بحث کی ہے۔" اور تقریباً انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے جن سے ہمارا سابقہ اگلے صفحات میں پڑے گا۔ مآخذ کی مختلف روایات اور مغربی مورخین کی شدید بحث میں سریہ نخلہ کی اصل نوعیت اجاگر نہیں ہوتی اس لیے تاریخی دیانت کا تقاضہ ہے کہ اس پر مفصل بحث کی جائے تاکہ اس متنازعہ فیہ آخری سریہ کے محرکات، مسائل اور مقاصد تاریخی حقائق کی روشنی میں واضح ہو سکیں۔

بحث کا آغاز اس نکتے سے کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم کا محرک و مقصد کیا تھا؟ اور کیا مآخذ سے وہ نتیجہ نکلتا ہے جو جدید مغربی مورخین نے نکالا ہے؟ ہم اوپر مآخذ کی بیان کردہ روایات میں دیکھ چکے ہیں کہ مآخذ کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک طبقہ ابن اسحاق، ابن ہشام، یعقوبی، طبری اور ابن اثیر پر بنیادی طور سے مشتمل ہے۔ جن کے مطابق سریہ نخلہ کا مقصد و محرک قریش کے آئندہ ارادوں، منصوبوں اور کارروائیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھا۔ دوسرا طبقہ واقدی، ابن سعد اور بلاذری پر مشتمل ہے اور ان کے مطابق ان کا مقصد کسی قریشی کارواں پر نظر رکھنا تھا۔ ان دونوں طبقات کا نقطہ نظر درحقیقت نامہ نبویؐ کی عبارت پر منحصر ہے۔ یہ دلچسپ اور اہم حقیقت ہے کہ مختلف مآخذ میں نامہ نبوی کی عبارت مختلف انداز میں نقل ہوئی ہے۔ نقلی اختلافات تو اتنے زیادہ اہم نہیں ہیں کیونکہ ان سے اصل معنی و مفہوم پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا ہے۔ البتہ بعض الفاظ اور فقروں کی موجودگی اور حذف سے صورت حال خاصی مختلف اور پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ پہلے طبقہ کے مطابق "سریہ نخلہ کے مجاہدین کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ نخلہ جائیں اور وہاں قریش پر نظر رکھیں اور مسلمانوں کے لیے ان کی خبریں فراہم کریں۔ جبکہ دوسرے طبقہ کے مطابق ان کو "کسی خاص کاروان قریش پر نظر رکھنی تھی۔ چنانچہ ان کے یہاں پہلے طبقہ کی نقل کردہ عبارت کا آخری فقرہ" و تعلم لنا من اخبارھم" (ہمارے لیے ان کی خبریں حاصل کرو) نہیں ہے۔ جبکہ پہلے ٹکڑے میں ترصد بھا قریشا (قریش پر نظر رکھو) کی جگہ ترصد بھا عیر قریش عبارتوں میں سے کون سی عبارت زیادہ صحیح ہے؟ تاریخی اصولوں اور تاریخ نویسی کے قواعد کا تقاضا تو یہی ہے کہ اختلاف و تضاد کی صورت میں قدیم ترین روایت کو ترجیح حاصل ہو۔ چنانچہ اس بناء پر ابن اسحاق اور ان کے متبعین کی روایت کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ ان کے حق میں یہ بات بھی جاتی ہے کہ اکثر مورخین ان ہی کی روایات سے اتفاق کرتے ہیں۔ اس لئے بنیادی طور پر اس سریہ کا مقصد قریش کے ارادوں پر نظر رکھنا اور ان کے بارے میں معلومات فراہم کرنا ہی قرار پاتا ہے۔

پھر اگر واقدی اور ان کے ہمنوا مورخین کی روایت کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کسی خاص مکی کارواں پر نظر رکھنے کی ہدایت مہم والوں کو دی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں دو نکتے ابھرتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے کون سا کارواں مراد تھا؟ طائف سے مکہ آنے والا کارواں جس پر مجاہدین نخلہ نے چھاپہ مارا تھا۔ یا کوئی اور؟ بیشتر جدید محققین نے اس سے یہی مراد لیا ہے کہ نامۂ نبوی میں نخلہ کے کارواں کی طرف اشارہ تھا۔ مونٹگمری واٹ نے اس نکتہ پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کاروان کے اس راستہ سے نخلہ سے گزرنے کا علم تھا کہ نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کو اس کارواں کے نخلہ سے گذرنے کا علم تھا لیکن وقت و تاریخ کے بارے میں یقین نہ تھا۔ غالباً وہ کچھ مدت بعد گزرنے والا تھا۔ لیکن کسی وجہ سے وہ کارواں وقت سے پیشتر آ نکلا تھا۔ اس لیے آپ کے تمام اندازے غلط ہو گئے اور مسلمان مجاہدین کو مجبوراً ماہ مقدس میں حملہ کرنا پڑا۔

دوسرا امکان مونٹگمری واٹ کے نزدیک یہ ہے کہ آپ کو اس کارواں کے گذرنے کا علم نہ رہا ہو۔ بلکہ آپ نے عمومی امکان کو مدِنظر رکھ کر ہدایت دی ہو کہ اس نسبتاً محفوظ راستے پر کارواں عموماً گذرتے ہی رہتے ہیں۔ غالباً آپ کو یہ خیال تھا کہ شامی شاہراہ تجارت کے مقابلے میں اس مقامی شاہراہ پر کارواں کے ساتھ محافظ بھی کم ہوں گے۔"[108] واٹ کی یہ دلیلیں تسلیم کرنے میں کئی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اول یہ کہ مکہ سے اتنی دور مدینہ میں بیٹھ کر آپ کو نخلہ سے کسی مخصوص کارواں کسی مخصوص تاریخ کو گذرنے کا علم ہونا ناممکن نہیں مگر محال ضرور تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کو علم کیونکر ہوا ہوگا؟ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ مسلم جاسوسوں کے ذریعے یا کسی مسافر کے ذریعے۔ مسافر کا ذریعہ قطعیت کے ساتھ خبر فراہم کرنے کا وسیلہ نہیں بن سکتا جہاں تک مسلم جاسوسوں کا تعلق ہے تو اول تو یہ ناممکن نظر آتا ہے کہ مرکز اسلام سے اتنی دور ان کی جولان گاہ رہی ہو اور اگر مکی مسلمانوں کے امکان کو مدِنظر رکھ کر یقین بھی کر لیا جائے تو پچھلے چھ تجربات کی روشنی میں اس کی واقعاتی تردید ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جدید مورخین کے خیال کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اپنی زیر کمان یا آپ کی بھیجی ہوئی مہمیں محض اس بنا پر اکثر حالات میں ناکام رہی تھیں کہ ان کو قریشی کاروانوں کے گذرنے کی صحیح تاریخ اور وقت کا علم نہیں تھا۔ پھر اگر اپنے زیرِ اثر علاقے اور قریبی شاہراہ سے گزرنے والے قافلوں کا وقتِ گزر مسلم جاسوس معلوم کرنے میں کامیاب نہیں رہے تھے۔ تو اتنی دور کے کسی قافلے کے گزرنے کے وقت کا حتمی علم ان کو کیونکر ہو سکتا تھا؟ جہاں تک کاروانوں کے عمومی امکان کا تعلق ہے یہ خاصا اہم اور وزنی امکان ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے کسی قریشی کارواں پر صرف نظر رکھنے سے مسلمانوں کا بھلا ہو سکتا تھا؟

چنانچہ جدید مغربی مورخین نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہدایت نبوی میں قریشی کارواں پر نظر رکھنا یا نگرانی کرنا مقصود نہیں تھا۔ بلکہ اصل مقصد ان پر چھاپہ مارنا تھا۔ اور مال غنیمت حاصل کرنا تھا۔ اور اسی بنا پر ان مورخین کے نزدیک "ترصّد" کے معنی نگاہ رکھنے یا نگرانی کرنے کے بجائے گھات لگانے کے ہیں۔ واٹ نے مزید تحقیق یہ کی ہے کہ لفظ ترصد کے معنی گھات لگانے کے بجائے نگرانی کرنے کے قرار دینے کے لیے بعض روایتوں میں تعلم لنا من اخبارھم (یعنی ان کی خبریں ہمارے لیے معلوم کرو) کا فقرہ الحاق ہے جو بعد میں راویوں نے جوڑ دیا ہے۔"[109] لیکن واٹ کی یہ تحقیق عربی نحو کے قواعد اور تاریخی اصولوں کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی لغوی اعتبار سے کسی بھی قاموس و لغت سے ثابت نہیں ہوتا کہ نامہ نبوی کی منقولہ عبارت میں لفظ ترصّد کے معنی گھات لگانے اور چھاپہ مارنے کے ہوتے ہیں۔ تمام لغات کیا قدیم کیا جدید اس پر متفق ہیں کہ اس لفظ کے معنی نگرانی کرنے، امید کرنے، انتظار کرنے یا توقع کے ہیں۔"[110] عربی نحو کے مطابق جب تک لفظ ترصّد کے لیے ل کا صلہ نہ آئے اس وقت تک اس کے معنی گھات لگانے کے لیے نہیں بن سکتے۔"[111]

چنانچہ اس قاعدے کے مطابق واقدی وغیرہ کے یہاں عبارت "ترصّد بھا لعیر قریش" ہونا چاہیے تھی۔ یہ تصور بھی نہیں کیا

جاسکتا کہ ان راویوں کو ترصّد اور ترصد کا فرق نہ معلوم ہو۔ پھر اگر لفظ ترصد کے معنی نگرانی کرنے کے قرار دینے کے لیے ایک پورا فقرہ الحاق کیا جاسکتا تھا۔ تو صرف ایک حرف کا اضافہ زیادہ آسان ہوتا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ جس روایت میں تعلم لنا من اخبارھم والا مبینہ الحاقی فقرہ موجود ہے اس میں لفظ غیر موجود نہیں ہے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ فقرہ ابن اسحاق وغیرہ کی روایت میں موجود ہے جو کاروان قریش کے بجائے صرف قریش پر نظر رکھنے کی ہدایت نبوی کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس فقرہ کے الحاقی ہونے کے ثبوت میں کوئی دلیل مورخ موصوف نے نہیں دی ہے۔

دوسری اہم بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ الحاقی ہونے کا الزام "بعد" کی روایت پہ لگانا تو قرین قیاس ہے لیکن ترتیب زمانی کے لحاظ سے کسی قدیم تر یا اولیں روایت پر لگانا تو خلاف عقل ہی ہوگا۔ اس بنا پہ تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ واقدی وغیرہ جو ابن اسحاق کے نصف صدی اور اس سے زیادہ مدت کے بعد لکھ رہے تھے۔ بلا غور و فکر کئے اپنی روایتوں میں قریش سے پہلے لفظ غیر بڑھانے کے مرتکب ہوئے تھے۔ نہ کہ ابنِ اسحاق۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ واٹ نے لفظ ترصّد کے معنی و مفہوم پر خاصی گفتگو کر ڈالی مگر اس نکتے کی طرف اشارہ تک نہ کیا اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انہوں نے زہری اور یزید بن رومان کے واسطے سے عروہ بن زبیر کی اس معیاری روایت میں جو ابنِ اسحاق کے یہاں پہلی بار مذکور ہوئی ہے۔ کی کارواں پر گھات لگانے کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ اصل روایت میں قریش ہے۔ کاروان قریش نہیں ۔"[۱۱۲]

مورخ موصوف نے نامۂ رسالت کی عبارت سے گھات لگانے کے مفہوم کی مزید تائید اس دلیل سے فراہم کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سریہ کی ترتیب و تنظیم میں کافی احتیاط اور رازداری سے کام لیا تھا۔ آپ نے نہ صرف مجاہدین پر مہم کی منزل اور اس کے مقصد کو واضح نہیں کیا تھا بلکہ قائد سریہ کو ایک مہر بند خط عطا فرمایا تھا۔ جس کے مضمون سے آپ کے علاوہ آپ کے کاتب اور غالباً ایک دو مشیروں کے سوا اور کوئی واقف نہ تھا اس کے علاوہ آپ نے مہم کو عام راستے کے بجائے نسبتاً ایک غیر معروف نجدی راستے سے جانے کی تاکید کی تھی۔ ان کا سفر تقریباً مشرقی سمت میں ہوا تھا۔ جبکہ منزل مقصود تقریباً بالکل تہامہ کے جنوب میں تھی۔ بلاشبہ آپ نے یہ ساری احتیاط و رازداری صرف اس لئے برتی تھی کہ آپ مکیوں کے جاسوسی نظام کو اپنے اصل ارادوں کے بارے میں تاریکی میں رکھنا چاہتے تھے۔ غالباً آپ کی بعض سابقہ مہمیں صرف اس لیئے ناکام رہی تھیں۔ کہ ان کے مقاصد کا علم دشمن کو ہو گیا تھا۔ لیکن چونکہ یہ مہم مدینہ کے بجائے مکہ کے زیادہ قریبی علاقے میں جا رہی تھی۔ اس لیے اس کے منصوبے کے دشمنوں کی نظر میں آجانے کی صورت میں ستر کا، مہم کی زندگی خطرہ میں پڑ سکتی تھی۔"[۱۱۳]

بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اگر اس مہم کے بارے میں دشمن کو ذرا بھی پتہ لگ جاتا یا سن گن مل جاتی تو نہ صرف ان مسلمان مجاہدین کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جاتا۔ بلکہ اس مہم کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ لیکن آپ کے محتاط اور رازدارانہ اقدامات سے یہ مفہوم کیونکر نکلتا ہے کہ اس مہم کا مقصد چھاپہ مار کارروائی تھا۔ چاہے ابن اسحاق کا نقطۂ نظر تسلیم کیا جائے چاہے واقدی کا۔ دونوں صورتوں میں یہ واضح ہوتا ہے کہ ساری احتیاط اور رازداری کے پیچھے یہ مقصد کارفرما تھا کہ قریش کو اپنے اتنے قریب ایک مسلمان مجاہد جماعت یا طلیعہ کی موجودگی کا علم نہ ہونے پائے اور اگر ان کو علم ہو جاتا تو پھر اس صورت میں مسلمان مجاہدین نہ تو قریش کے بارے میں خبریں حاصل کر سکتے اور

نہ ان کی نگرانی کرکے ان کے اصل ارادوں پر نظر رکھ سکتے اور نہ ہی قریش کے مخصوص کارواں کی کارروائیوں، مقاصد اور تیاری وغیرہ پر نظر رکھ سکتے۔ مزید خود ان کا تحفظ ذاتی خطرہ میں پڑ جاتا اس لئے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ نخلہ میں قیام کرکے قریش یا کاروانِ قریش کے بارے میں خبریں حاصل کرنے کے لیے بھی احتیاط اور رازداری کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی کہ کسی کارواں پر چھاپہ مارنے کے لیے۔

واٹ نے ایک دلیل یہ مزید دی ہے کہ نامۂ مبارک پڑھنے کے بعد مسلم جماعت کو احکامِ نبی پر عمل کرنے میں ہچکچاہٹ تھی اور وہ اس بنا پر نہیں تھی کہ ان کو تعمیلِ احکام کی صورت میں کسی قسم کی اخلاقی ضابطہ شکنی یا اپنی مہم کے اخلاقی پہلوؤں کے بارے میں کسی قسم کا احساس ستا رہا تھا۔ ان کی جھجک بلاشبہ اس مہم میں مضمر واضح خطرہ کے سبب تھی۔ کیونکہ عرب خون جوش کھا جانے پر عاقبت نااندیش حد تک شجاعت کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔ لیکن عام حالات میں اپنے پورے ہوش وحواس کی درستگی کی صورت میں وہ گمبھیر خطرات سے حتی الامکان گریز کرتا ہے۔ بلاشبہ اسی بنا پر امیر سریہ کو ہدایت نبوی تھی۔ کہ وہ صرف اس منصوبے کے حامی صحابہ کے ساتھ کارروائی کریں اور جو اصحاب اس سے پوری طرح متفق نہ ہوں۔ ان کو واپس مدینہ بھیج دیں۔ واٹ نے اس سلسلہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص اور ان کے ہم سفر و ہم رکاب ساتھی حضرت عتبہ بن غزوان کے معاملہ کو پیش کیا ہے۔ ان کا اخذ کردہ نتیجہ یہ ہے کہ اونٹ کے گم ہو جانے اور اس کی تلاش میں ان کے قافلے سے بچھڑ جانے کی کہانی انہوں نے مہم کی کامیابی مدینہ واپسی کے کئی دنوں بعد مدینہ پہنچ کر سنائی تھی۔ واٹ کا کہنا ہے کہ ان کا یہ کہانی بیان کرنا ایک واقعہ ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کہانی صحیح ہی تھی اور ایک روایت تو یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ کہانی صحیح نہیں تھی۔[114] ان دونوں نے یقیناً کافی وقت ضائع کیا تھا۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ یہ واقعہ بنو سلیم کے علاقے میں ہوا تھا۔ جو عتبہ بن غزوان کی ولادت کا علاقہ بھی تھا۔[115]

منٹگمری واٹ نے اس سلسلے میں ان دونوں اصحاب پر صرف اسی مہم میں بزدلی کا الزام نہیں لگایا ہے۔ بلکہ حضرت سعد کو خاص طور سے نشانہ بناتے ہوئے ان کو جنگ قادسیہ میں بھی دوں ہمتی کا طعنہ صرف اس بنا پر دیا ہے کہ اس جنگ میں انہوں نے مسلم فوج کی کمان بیماری کے سبب ساقۂ لشکر میں ایک پالکی میں بیٹھ کر کی تھی۔ غالباً ان دونوں مواقع پر ان کی دوں ہمتی پر پردہ ڈالنے کے لئے اس روایتی مواد کو حقیقت کا روپ دیا گیا ہے۔ جس کے مطابق حضرت سعد کے شرف میں یہ روایت گڑھی گئی کہ انہوں نے اسلام کی راہ میں پہلا تیر چلایا تھا۔ اس پر مہم نخلہ میں واقد بن عبداللہ تمیمی کے ہاتھوں عمرو بن حضرمی کے قتل کے واقعہ سے کہیں زیادہ زور دیا گیا ہے حالانکہ یہ صحابی اسلام میں پہلے قتل کرنے والے کا شرف رکھتے تھے واٹ کا خیال ہے کہ یہ فرق غالباً اس لئے روا رکھا گیا ہے کہ حضرت واقد خلافتِ فاروقی کے آغاز میں وفات پاگئے تھے اور ان کے جانشین نہ تھے۔ جبکہ حضرت سعد چالیس برس تک زندہ رہے تھے اور نہ صرف یہ کہ وہ امت کے ایک سربرآوردہ اور اہم فرد تھے۔ بلکہ ان کے کافی تعداد میں اولاد و اخلاف تھے۔ اور حضرت کے کارناموں کے بارے میں زیادہ روایات جن میں بعض تضادات بھی ہیں یا تو خود ان سے مروی ہیں یا ان کے خاندان کے افراد سے۔ بہرحال واٹ کی مراد صرف اتنی سی ہے کہ حضرت سعد اور ان کے ہم سفر نے بزدلی کا ثبوت دیا تھا کیونکہ وہ مہم نخلہ کے خطرات سے واقف تھے اور منصوبے سے متفق نہ ہونے کے سبب جان بوجھ کر پیچھے رہ گئے تھے اور اس سے ان کے نزدیک پوری جماعت کی ہچکچاہٹ اور پس وپیش ثابت ہوتا ہے۔[116]

اب ذرا ماٰخذ پر نظر ڈالی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کیا مسلم جماعت مجاہدین کی جھجک کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔ بلاشبہ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے نامۂ مبارک پڑھنے کے بعد اپنے اصحاب سے کہا تھا کہ "رسول کریمؐ نے مجھے نخلہ جاکر وہاں قریش کی خبریں معلوم کرنے کی ہدایت کی ہے اور مجھ کو تم میں سے کسی پر جبر د زور، زبردستی کرنے سے منع کیا ہے۔ چنانچہ تم سے جس کسی کو تمنائے شہادت ہو وہ آگے ساتھ چلے اور جس کو نہ ہو وہ واپس چلا جائے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں تعمیل حکم کرنے جا رہا ہوں"۔ چنانچہ وہ روانہ ہوگئے اور اسی طرح ان کے تمام ساتھی بھی چل پڑے اور ان میں سے کوئی بھی پیچھے نہیں ہٹا۔ وہ حجاز کے راستے چلتے رہے۔ یہاں تک بحران نامی کان کے علاقے میں پہنچے اور جہاں بعد میں دو اصحاب کا اونٹ گم ہوگیا اور وہ اس کی کھوج میں پیچھے رہ گئے اور باقی جماعت نخلہ جا پہنچی۔"[117] ابن اسحاق کے اس بیان سے مسلم جماعت میں سے کسی ایک کے بھی پیچھے ہٹنے، دوں ہمتی دکھانے یا پس و پیش کرنے کی طرف ذرا سا حوالہ اور اشارہ تک نہیں ملتا۔ پھر اگر دو صحابیوں کے اونٹ کی تلاش کے بہانے پیچھے رہ جانے کو بفرض محال ان کی بزدلی سے تعبیر بھی کر لیا جائے۔ تو اس سے پوری جماعت کی ہچکچاہٹ کہاں ثابت ہوتی ہے۔ جماعت کے دو ارکان ہی تو اس دعوے کے مطابق ہمت ہار گئے تھے۔ بقیہ چھ یا دس یا نو اصحاب تو بلا تکلف و تامل نخلہ جا پہنچے تھے۔

پھر ایک اہم نکتہ یہ بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ نامۂ مبارک پڑھنے کے معاً بعد ان دونوں پیچھے رہ جانے والے اصحاب نے پس و پیش نہیں کیا تھا بلکہ وہ اس کے بعد بھی مہم کے ساتھ رہے تھے۔ اور بحران کے علاقے میں جہاں بقول واقدی انہوں نے اپنے اونٹ چرنے کے لیے کھول دیئے تھے۔ وہ قافلے سے بچھڑے تھے۔"[118] گویا کہ انہوں نے پس و پیش کا مظاہرہ فوراً نہیں کیا تھا۔ بلکہ سوچ سمجھ کر اور منصوبہ بندی کر کے کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ امیر سریہ نے ان کو بخوشی اجازت دے دی تھی۔ پھر ان کو تھوڑی دور جاکر منصوبہ بندی کے ماتحت بہانہ بنانے اور پیچھے رہ جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے علاوہ مدینہ واپس آکر ان کو اپنے پیچھے رہ جانے کی کہانی بنانے کی کیا حاجت تھی؟ کسی سے اس سلسلہ میں تو کوئی مواخذہ ہونے والا نہیں تھا۔ کیوں کہ انہوں نے محض اجازت نبویؐ سے فائدہ اٹھایا تھا اور یہ رعایت تو ان کو اخلاق، قانون اور ہر طرح کے روایتی ضابطہ کی رو سے حاصل تھی۔ اس طرح ان دلیلوں سے یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ ان دونوں صحابیوں کی کہانی محض واقعہ نہیں تھی بلکہ صحیح بھی تھی۔ اس کی تائید واقدی اور ان کے پیرو مورخین کی روایات سے بھی ہوتی ہے اگرچہ اصحاب مہم میں سے کسی کو مجبور نہ کرنے کا فقرہ واقدی کے یہاں نامۂ مبارک کی عبارت کا جز ہے جب کہ ابن اسحاق کے یہاں حضرت عبداللہ بن جحش کی تقریر کا جو انہوں نے نامۂ مبارک پڑھنے کے بعد اپنے ساتھیوں کے سامنے کی تھی۔ واقدی کی تائید میں ابن ابی حاتم کی روایت ملتی ہے جو ابن کثیر نے نقل کی ہے اور جو جندب بن عبداللہ کی سند پر بیان ہوئی ہے۔"[119] باقی تمام روایات زیادہ تر ابن اسحاق کی تائید میں ہیں۔ اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ ابن اسحاق کے مطابق رسول کریمؐ نے اپنی زبانی ہدایات میں کسی کو مجبور نہ کرنے کی ہدایت بھی دی ہوگی لیکن اگر واقدی وغیرہ کے نقل کردہ مبارک نامے کی عبارت ہی کو معیاری مان لیا جائے تو بھی کسی جھجک کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔ جہاں تک غیر متفقین کے مدینہ واپس بھیجے جانے کے واٹ کے دعویٰ کا تعلق ہے تو اس کی مذکورہ بالا کسی روایت سے تصدیق و تائید نہیں ہوتی ہے۔ طبری نے اپنی تفسیر میں محمد بن عبدالاعلیٰ الصنعانی کے واسطہ سے حضرت جندب بن عبداللہ کی ایک اور روایت بیان کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمی لوٹ آئے تھے۔[120]

لیکن کہاں سے اور کیوں لوٹ آئے تھے۔ اس کی تصریح نہیں ملتی ہے۔ بہرحال بیشتر شواہد ثابت کرتے ہیں کہ مسلم جماعت کو خاص طور سے اور افراد جماعت کو عام طور سے کسی قسم کا تردد یا تامل نہ تھا۔ جہاں تک حضرت سعد بن ابی وقاص کی اس موقعہ اور جنگ قادسیہ میں بزدلی یا دوں ہمتی کے مظاہرے اور پھر اس کو چھپانے کے لئے ان کے تیر چلانے کی روایت گھڑنے اور اس پر بلاضرورت زور دینے اور حضرت واقد کے کارنامے کو گھٹانے اور دونوں کے بارے میں مآخذ کے رویہ میں ان کے سیاسی اور سماجی پس منظر کے مدنظر فرق پائے جانے کا تعلق ہے اس کا سردست ہمارے اس موضوع سے تعلق نہیں ہے لیکن مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت سعدؓ پر دوں ہمتی کا الزام سراسر بہتان ہے اور اس کی تاریخی واقعات سے تردید ہوتی ہے۔ حضرت سعد کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ بیشتر بلکہ تمام ابتدائی مہموں میں شریک رہے تھے اور بعد کے تمام غزوات میں اور بعض سرایا میں بھی پورا پورا حصہ لیا تھا۔[121]

ابن سعد اور ابن اثیر کا بیان ہے کہ اصحاب نبیؐ میں ان کا شمار ماہر تیر اندازوں میں ہوتا تھا۔[122]

سریۂ عبیدہ میں ان کے تیر چلانے کی فضیلت کا واقعہ کوئی تنہا نہیں ہے۔ جنگ احد میں انہوں نے ماہرانہ تیر اندازی کیا تھا کہ متعدد روایات کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف و توصیف فرمائی تھی۔[123]

اس کے علاوہ بھی بعض دوسرے غزوات و مواقع پر ان کی شجاعت و مردانگی کے حوالے ملتے ہیں۔[124]

یہ صحیح ہے کہ ان کے کارناموں کے بارے میں بعض روایات ان کی سند پر یا ان کے اہل خاندان سے ہی کسی سے مروی ہیں، لیکن اس سے کہیں زیادہ تعداد ان روایتوں کی ہے جو ان کے علاوہ دوسرے غیر متعلق راویوں سے مروی ہیں۔[125] پھر واٹ کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ ان کی تیر اندازی کی خیرہ کن روشنی میں حضرت واقد کے کارنامے کو کم کر کے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ابن ہشام نے اپنے تبصرے میں ابن حضرمی کے قتل کو اسلام کے لیے اولین قتل قرار دے کر ان کے کارنامے کی قدر و قیمت کا اعتراف و اعلان کیا ہے۔[126] بہرحال یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص زہریؓ حضرت واقد بن عبداللہؓ تمیمی کے مقابلے میں امت کے زیادہ اہم اور نمایاں ترفرد تھے۔ اگر ان کے کارنامے زیادہ اجاگر نظر آتے ہیں تو یہ فطری بھی ہے اور تاریخی حقیقت بھی اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ان کی سماجی و مذہبی برتری اور کثرتِ اولاد کی نعمت بعض دوسرے صحابہ یا افرادِ امت خاص کر امویوں کو حاصل تھی۔ پھر وہ کیوں مطعون و بدنام نظر آتے ہیں۔ کیا ان کے اخلاف و جانشین ان کی تعریف و توصیف میں یہ خدمت انجام نہیں دے سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ واٹ کی اس سلسلے میں تمام دلیلیں نہ صرف بے وزن اور لچر ہیں۔ بلکہ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ وہ مآخذ کے بالکل خلاف ہیں۔

نامۂ نبوی پڑھنے کے بعد حضرت عبداللہ کی اپنے ساتھیوں کے سامنے کی جانے والی تقریر میں ایک فقرہ شہادت کی تمنا کے بارے میں ہے جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ امیر سریہ یا ان کے ساتھیوں کو یا خود ذات نبویؐ کو جانی نقصان کا خدشہ تھا۔ واٹ اور ان کے حامی دوسرے جدید مورخین نے اس فقرے اور بعض دوسرے قرائن سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ مہم اس لیے خطرناک تھی کہ مسلمان مجاہدین چھاپہ مار کارروائی کے لیے جا رہے تھے۔ جس میں دونوں فریقوں کے لیے جانی نقصان کا احتمال و اندیشہ رہتا ہے۔[127]

کسی حد تک بات صحیح ہو سکتی ہے لیکن معاملہ صرف مہم نخلہ تک ہی محدود نہیں ہونا چاہیے جدید مغربی مورخین کا تو دعویٰ ہے کہ اس سے

پہلے چھ مہمیں اسی نوعیت کی اور اسی غرض سے بھیجی گئی تھیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی اتنے جانی خطرے کا احساس نہیں پایا جاتا۔ بلکہ انھیں مؤرخین کے دلائل کے مطابق ان مہموں میں جانوں کو زیادہ خدشہ وخطرہ لاحق ہوسکتا تھا کیونکہ وہ شامی شاہراہ تجارت پر گذرنے والے قریشی کاروانوں کے خلاف بھیجی گئی تھیں جو عددی طاقت کے لحاظ سے کافی بڑے ہوتے تھے اور اس طرح ان مہموں کے مجاہدین کے لیے جانی نقصان کا احتمال زیادہ تھا۔ پھر ان مہموں میں اس حقیقتِ صادقہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا حتی کہ خرار کی مہم میں بھی اس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا جو صرف آٹھ افراد پر مشتمل تھی اور کسی اور کی قیادت میں نہیں بلکہ خود حضرت سعدؓ کی قیادت میں گئی تھی جو بقول واٹ اسی خطرے سے نخلہ کی مہم میں جان چرا گئے تھے بہرحال واضح یہ ہوتا ہے کہ اگر امیر سریہ یا ان کے اصحاب میں سے کسی کو اس قسم کے احتمالات تھے تو ان کا سبب مہم جوئی یا چھاپہ مار کارروائی نہ تھی بلکہ سریہ نخلہ کی مخصوص نوعیت تھی اور یہ مخصوص نوعیت اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ وہ دیدہ دانستہ شیروں کی کچھار میں جارہے تھے۔ سریہ کہ اور طائف کو ہوجاتا تو وہ ہر قیمت پر مسلمانوں کو پکڑنے یا ختم کرنے کی کوشش کرتے کیونکہ ان کے اپنے گھر کے پچھواڑے دشمن جاسوسوں کی موجودگی نہ صرف ان کو اشتعال دلاتی بلکہ ان کو خدشات سے بھی دوچار کردیتی اور وہ اس صورت میں ہر قسم کا اقدام کرسکتے تھے۔ اسی لیے امیر سریہ نے شہادت کی تمنا رکھنے والوں کو ساتھ لے جانا چاہا تھا اور مذبذب لوگوں کو روکنا چاہا تھا کیونکہ دوسرے قسم کے لوگوں کی موجودگی مضبوط دل والوں کے لیے بھی کسی وقت اضطراب کا سبب بن سکتی تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے اس جماعت مجاہدین میں کوئی بزدل، دوں ہمت یا شہادت سے گریزاں نہ تھا۔

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کم از کم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کاروانِ قریش پر حملہ کرنے کا حکم نہیں دیا تھا آپ کی ہدایت صرف قریش پر نظر رکھنے اور ان کے بارے میں خبریں فراہم کرنے یا کسی خاص کاروانِ قریش کے بارے میں معلومات حاصل کرنے تک محدود تھی۔ تمام مآخذ کا اس پر حیرت انگیز اتفاق ہے کہ اس موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چھاپہ مارنے کا حکم نہ تھا اور اس تاریخی شہادت کی قدر و قیمت اور اہمیت میں اس حقیقت سے اور اضافہ ہوجاتا ہے کہ یہ انھیں تمام رواۃ اور مؤلفین سیرت اور مغازی نگاروں کی فراہم کردہ ہے جو سابقہ چھ مہموں کے بارے میں براہ راست یا بالواسطہ صراحت کے ساتھ یا مضمر انداز میں چھاپہ مار کارروائی اور کارواں لوٹنے کے مقصد و محرک کے قائل ہیں۔ لہٰذا اس دعوے کی ان مغازی نویسوں اور تذکرہ نگاروں نے ماہ حرم میں کاروانِ قریش لوٹنے کی ذمہ داری کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مسلمان مجاہدین مہم کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ از خود تردید ہوجاتی ہے مونٹگمری واٹ کا تو یہ دعویٰ ہے کہ اس غدارانہ حملے اور ماہ مقدس کی بے حرمتی پر جب خود مدینہ میں شدید ردِ عمل ہوا تو آپؐ نے اس حقیقت سے انکار کردیا کہ آپؐ ہی نے کارواں پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا اور اس طرح امیر سریہ اور ان کے جانبازوں کے کندھوں پر اس کی تمام ذمہ داری ڈال دی"[12] گویا کہ آپؐ رائے عامہ کے خوف سے نہ صرف یہ کہ اپنی سابقہ حکم کی حقیقت سے مکر گئے بلکہ وفادار مسلم مجاہدین کو معرض خطر میں ڈال دیا اور مسلمان مورخین نے آپ کے دفاع میں نامۂ مبارک کی عبارت میں الحاق و تحریف کی اور خاص کر "اُن کی خبریں ہمارے لیے معلوم کرو۔" والا فقرہ گڑھ کر شامل کر دیا" تاکہ آپ کو اس حملہ کی ذمہ داری سے بچایا جائے اور بے چارے مسلم مجاہدین کو قربانی کا بکرا بنا دیا جائے۔

اور شہادتوں کے علاوہ جن میں سے کچھ اوپر گزر چکی ہیں خود ماخذ کی تمام روایات کی داخلی شہادتوں سے اس دعوے کی تردید ہوتی ہے ابن اسحاق اور واقدی اور ان کے متبعین کا اتفاق ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ گرامی پڑھنے کے بعد مجاہدین کو "حکم نبوی" کا بخوبی علم ہو گیا تھا اور بقول واقدی برابن شیبہ اور بقول سدی بطن ملل میں نامۂ نبوت پڑھنے کے بعد نخلہ تک وہ بلاشبہ تعمیل حکم نبوی کی خاطر ہی آئے تھے اور اسی لیے وہاں فروکش ہوئے تھے پھر ان مجاہدین کو ابن حضرمی والے کارواں پر حملہ کرنے میں نخلہ پہنچ کر تذبذب کیوں ہوا تھا؟ انہوں نے بحث و مباحثہ کیوں کیا تھا؟ اور بقول ابن اسحاق وہ حملہ کرنے سے گریزاں و ترساں کیوں تھے؟ کیوں ایک دوسرے کو ہمت دلا رہے تھے؟ اور بالآخر انہوں نے یہ فیصلہ کیوں کیا تھا کہ جتنا ممکن ہو کارواں والوں کو مار ڈالا جائے اور ان کے مال پر قبضہ کر لیا جائے؟ مال پر قبضہ کرنے اور اس سلسلہ میں ممکنہ خونریزی کرنے کے لیے تو وہ نخلہ تک آئے ہی تھے پھر یہ سارا تذبذب، مباحثہ و مناقشہ اور انجام کار اور لوٹ لینے کا فیصلہ کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا اس سے پوری طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ ان کا اپنا فیصلہ تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو اس کی ہدایت نہیں ملی تھی؟ یہ دعویٰ کہ ان کو حملہ کرنے کا حکم نبوی کی تعمیل میں تردد ماہ مقدس کے سبب تھا تو اس کی تردید بھی اسی دلیل سے ہوتی ہے۔ جب وہ نامۂ گرامی کے مضمون سے واقف ہونے کے بعد روانہ ہوئے تھے تو بخوبی جانتے تھے کہ وہ مہینہ مقدس و حرام تھا۔ یہ علم ان کو ماخذ کی بیشتر روایات کے مطابق مدینہ سے روانگی کے وقت سے تھا اور اچانک پہونچنے پر نہیں ہوا تھا۔ پھر واٹ کا دعویٰ تو ہے کہ حملہ کا وقت اول یا آخر رجب نہ تھا بلکہ وسط رجب تھا۔[۱۲۹] جبکہ ان کے نزدیک اشتباہ کی گنجائش بھی نہ تھی۔ اس نکتہ پر ہم مفصل بحث ذرا بعد میں کریں گے لیکن کیا اس سے ان کے اس دعوے کی تردید نہیں ہو جاتی کہ حملہ کی ذمہ داری کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مجاہدین کی طرف دیدہ و دانستہ نہیں منتقل کیا گیا ہے اور کیا اس سے بخوبی واضح نہیں ہوتا کہ حملہ کرنے اور لوٹنے کا فیصلہ مسلم مجاہدین کا تھا جو انہوں نے مخصوص حالات و اسباب کی بنا پر کیا تھا؟ اس نتیجہ کی مزید تائید واقدی کی روایت کے مذکورہ بالا گیارھویں نکتے سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق مسلم جماعت مجاہدین کارواں نخلہ پر حملہ کرنے اور ان کا مال لوٹنے کے معاملہ پر دو فریقوں میں بٹ گئی تھی اور حملہ کے مخالف فریق نے حملہ کے حامی فریق کو دنیاوی مال کی طمع پر لعن طعن کیا تھا۔ اگر وہ نخلہ کارواں لوٹنے ہی آئے تھے تو پھر مسلم جماعت کے حامی و مخالف حملہ فریقوں میں منقسم ہونے کے کیا معنی تھے اور کیوں ایک فریق کو دنیاوی دولت کا حریص قرار دے کر مطعون کیا گیا تھا۔ مال غنیمت مقصود تھا تو دنیاوی مال و دولت کی حرص کا الزام ہر دو فریق مجاہدین نخلہ کے بجائے سرکار مدینہؐ پر عائد ہونا چاہیے تھا۔ جیسا کہ جدید مغربی مورخین نے کیا ہے لیکن نہ صرف اس کا ثبوت ماخذ سے نہیں ملتا بلکہ اس کی واضح تردید ان سے ہوتی ہے۔ مزید تصدیق ماخذ کے اس تبصرے سے ہوتی ہے جس کے مطابق سریہ نخلہ کی مدینہ واپسی پر مسلمانان شہر نے مجاہدین کو حملہ کرنے اور مال لوٹنے کا ملزم قرار دیا تھا اور ان کو اس پر لعنت ملامت کی تھی۔ کسی روایت کے فقرے یا اشارے سے بھی نہیں معلوم ہوتا کہ مسلمانوں میں سے کسی نے بھی حملہ کی ذمہ داری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ کہ آپؐ نے پہلے حکم دیا اور پھر ردعمل دیکھ کر مکر گئے۔ آپ کی پوری سیرت و کردار کے منافی ہے دشمن تک آپ کے صادق اور امین ہونے کے قائل اور گواہ تھے اس کے علاوہ اپنے ساتھیوں کو معرض خطر میں ڈال دینا یا ان کو کسی مشکل وقت میں عاق کر دینا یا

چھوڑ دینا ایک عام سیاسی قائد کے کردار سے فروتر سمجھا جاتا ہے پھر آپؐ کے بارے میں اس کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے جبکہ آپؐ دنیا کے چند عظیم ترین سیاسی مدبروں میں سے تھے - اس کے علاوہ تاریخی شہادتوں سے بھی اس دعوے کی تردید ہوتی ہے - آپؐ کی پوری نجی اور عوامی زندگی کے کسی ایک واقعہ یا پہلو سے بھی یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا جب آپؐ نے اپنے ساتھیوں کو کسی مشکل وقت میں چھوڑا ہو یا ان کے دفاع، تحفظ اور امداد سے گریز کیا ہو یا کسی قسم کی روگردانی کی ہو۔

یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ ابن حضرمی کے کارواں کو لوٹنے کا منصوبہ خود مجاہدین نخلہ کا تھا اس سلسلہ میں دو اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں - ایک یہ کہ حملہ کس تاریخ کو ہوا تھا اور دوسرے یہ کہ کیوں ہوا تھا جبکہ وہ ایک طرح سے حکم نبویؐ سے تجاوز تھا۔

جہاں تک وقت و تاریخ حملہ کا تعلق ہے مآخذ کی متعدد روایات میں اختلاف و تناقض ہے - ابن اسحاق و ابن ہشام کی مطبوعہ سیرتوں میں عروہ کی معیاری روایت میں مدینہ سے مہم کی روانگی کا وقت ماہ رجب بتایا گیا ہے۔[۱۳۰]

محمد بن حبیب بغدادی نے رجب کے آخری عشرے میں روانگی اور یکم شعبان کو واپسی کی تاریخیں دی ہیں - ابن اسحاق کے تمام متبعین نے اپنے یہاں اسی ماہ کا ذکر کیا ہے - چنانچہ اس کے مطابق نخلہ میں کارواں پر حملہ کرتے یا نہ کرنے کی بحث چھڑی تو ابن اسحاق کے نزدیک وہ حتمی طور سے رجب کا آخری دن تھا اور مجاہدین نخلہ نے پورے علم و دانست میں ماہ مقدس میں حملہ کیا تھا -[۱۳۱] واقدی کی روایت میں مدینہ سے مہم نخلہ کی روانگی کی تاریخ ہجرت کے سترھویں مہینے بتائی گئی ہے جس سے بالواسطہ مراد رجب ہی ہے۔[۱۳۲] لیکن نخلہ میں کارواں پر حملہ کرنے سے قبل مسلمانوں نے جو بحث کی تھی اس میں یہ اختلاف یا اشتباہ ابھرا تھا کہ وہ رجب کی آخری تاریخ تھی یا شعبان کی؟[۱۳۳] واقدی کا رجحان اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجاہدین کو اس معاملے پر دو فریقوں میں منقسم پاتے ہیں - ایک آخر رجب کا قائل تھا تو دوسرا یکم شعبان کا - یعنی یہ معاملہ اشتباہ کا نہ تھا اختلاف کا تھا - طبری میں مذکورہ سدی کی روایت میں تاریخ حملہ آخر رجب تھی نہ اول شعبان بلکہ وہ آخری جمادی الاخریٰ یا یکم رجب تھی۔[۱۳۴] یہ بہت اہم حقیقت ہے کہ طبری نے اپنی تفسیر میں زہری کی سند پر عروہ کی اسی روایت کو ہو بہو نقل کیا ہے مگر اس میں حملہ کی تاریخ کو جمادی الاخریٰ کا آخری دن قرار دیا گیا ہے۔[۱۳۵] تفسیر طبری میں سریہ نخلہ کے بارے میں مذکورہ سترہ روایتوں میں سے اکثر میں یہ مذکور ہے کہ در اصل تھی تو وہ یکم رجب لیکن مسلمان جانبازوں کا خیال تھا کہ وہ آخری جمادی الاخریٰ کا دن تھا۔[۱۳۶] بعض روایتوں میں حتمی طور سے اس کو جمادی الاخریٰ کی آخری رات قرار دیا گیا۔[۱۳۷] بہر حال یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ طبری نے اپنی کسی بھی روایت تفسیر میں شعبان کے مہینے یا اول تاریخ کا حوالہ تک نہیں دیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ احادیث و آثار کے علماء کے نزدیک مہم نخلہ کا مہینہ جمادی الاخریٰ تھا - نہ کہ رجب اور حملہ کا دن آخری رات تھی جمادی الاخریٰ کی یا اول رجب تھی، گویا شعبان کا بیان سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے اسی طرح ابن کثیر نے اپنی روایات تفسیر جن کی تعداد تقریباً دس ہے حملہ کی تاریخ آخری جمادی الاخریٰ یا اول رجب قرار دی ہے - اور طبری سے مکمل اتفاق کیا ہے۔[۱۳۸]

یہ امر خاصہ اہم ہے کہ ابن کثیر کی روایات کی اسناد اکثر و بیشتر روایات میں طبری کی روایات سے قطعی مختلف اور نئی ہیں - اور ان میں دو روایتوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے - ایک زہری سے موسیٰ بن عقبہ کی روایت - موسیٰ کو محدثین نے

صحیح ترین اور ثقہ ترین مغازی نویس کہا ہے۔[139] اور دوسری روایات میں ابن کثیر نے ابو بکر بیہقی کی کتاب دلائل النبوۃ کا حوالہ دیا ہے جس کے مطابق حافظ موصوف نے اس معاملہ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیا ہے۔ ان کے علاوہ تفسیر و حدیث کے متعدد دوسرے علماء و مصنفین نے بھی اسی کی تائید میں متعدد روایات بیان کی ہیں۔[140] مزید برآں ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں مہم نخلہ کی روانگی کے بارے میں جو جملہ تحریر کیا ہے وہ بھی بالواسطہ طور پر اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ مہم دراصل جمادی الاخریٰ میں روانہ ہوئی تھی اور رجب ناکام متین روایت میں یا تو مصنف کی غلط فہمی کی بنا پر یا کاتب کی غلطی سے راہ پا گیا۔[141] اس کی تصدیق و تائید ان تمام دوسرے مورخین، مفسرین اور محدثین کی بیان کردہ روایات سے ہوتی ہے۔ جو انہوں نے اسی سند پر یعنی زہری کے واسطہ سے عروہ بن زبیر سے بیان کی ہیں۔ اس طرح روایات و آثار کی غالب اکثریت کا فیصلہ یہ ہے کہ سریہ نخلہ ماہ جمادی الاخریٰ کے اواخر میں کسی وقت بھیجا گیا تھا اور حملہ کاروان نخلہ پر اس ماہ کے آخری دن / رات یا رجب کی پہلی رات کو ہوا تھا۔ اس غالب اکثریتی فیصلہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حملہ کی تاریخ آخری جمادی الاخریٰ تھی یا اول رجب نہ کہ آخری رجب یا اول شعبان۔ اس طرح واٹ کا خیال کہ حملہ وسط رجب میں ہوا تھا۔ بالکل بے بنیاد ثابت ہوتا ہے۔

اب یہ مسئلہ رہ جاتا ہے کہ آخری جمادی الاخریٰ کا یا رجب کا۔ مجاہدین کو یقین تھا یا اس کو معاملہ میں سچ مچ اشتباہ ہو گیا تھا۔ ابن اسحاق میں عروہ کی روایت سے بصراحت معلوم ہوتا ہے۔ کہ مجاہدین میں سے کسی کو بھی شبہ نہیں تھا کہ حملہ کی تاریخ ماہ حرام کی تھی۔ لیکن طبری نے اپنی تفسیر میں یہی روایت بیان کی ہے اور اس میں صراحت کی ہے کہ مجاہدین نے جب حملہ کیا تو ان کو یقین تھا کہ وہ جمادی الاخریٰ کا آخری دن تھا۔ تفسیر طبری ہی میں مجاہد کی روایت میں بھی اسی کی تائید ہے اور ذکر آ چکا ہے کہ تاریخ طبری میں سدی کی روایت اسی کی تائید کرتی ہے اور یہی روایت پھر طبری نے تفسیر میں بھی دی ہے۔ ابن کثیر نے بھی اس روایت کو اپنی تفسیر میں معمولی اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے اس کے علاوہ بعض دوسری روایتوں میں بھی یہ تاثر ملتا ہے کہ مجاہدین کو تاریخی سلسلہ میں کوئی اشتباہ نہ تھا اور ان کو حتمی یقین تھا کہ وہ جمادی الاخریٰ کا آخری دن تھا اور یہی حقیقت بھی تھی۔

ان روایتوں کے بالمقابل متعدد اور کثیر روایات اس مضمون کی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان تاریخوں کے بارے میں اشتباہ تھا اور یہ واقعی بھی تھا۔ وہ یقینی طور پر یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ دن آخری جمادی الاخریٰ کا تھا یا رجب کا طبری کی تفسیر میں اس نوع کی روایات میں کئی کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح تفسیر ابن کثیر کی کئی روایات میں یہی مضمون پایا جاتا ہے۔

واقدی کے یہاں اگرچہ مہینے مختلف ہیں تاہم   حرام مہینوں میں اشتباہ کا جہاں تک تعلق ہے یہی خیال اس سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ لیکن ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے علاوہ کچھ روایات ایسی بھی ہیں جو تیسرے نقطہ نظر کی ترجمان ہیں۔ یعنی حقیقتاً مخصوص دن تھا تو یکم رجب کا لیکن صحابہ کرام کی مجاہد جماعت اس کو اپنے یقین و اعتماد و علم کی حد تک جمادی الاخریٰ کا آخری دن سمجھتی رہی۔

تفسیر طبری میں حسن بن یحییٰ کی سند پر مقسم مولیٰ ابن عباس کی روایت، محمد بن سعد کی سند پر ابن عباس کی دوسری روایت اور عمارہ بن حسن کی سند پر ابو مالک غفاری کی روایت اور تفسیر ابن کثیر میں عوفی کی سند پر ابن عباس کی روایت کے علاوہ متعدد اسناد پر مروی متعدد روایتیں اس کی تائید کرتی ہیں۔

بہرحال تاریخ، حدیث، تفسیر اور آثار و تذکرہ کی تمام روایات ان میں تین انواع میں سے کسی نہ کسی کی ہیں - اس شدید تناقض و اختلاف کی صورت میں بعد کے کسی مورخ کے لئے حتمی فیصلہ کرنا کہ حملہ کے دن کی اصلی تاریخ کیا تھی - خاصہ دشوار کام ہے ابن اسحاق کے مکتب فکر کا واضح فیصلہ ہے کہ بعض ناگریز اسباب کی بنا پر جماعت مجاہدین نے دیدہ و دانستہ کارواں پر ماہ حرام میں حملہ کیا تھا جبکہ واقدی اور ان کے حامیوں کا زور اس پر ہے کہ تاریخ میں اختلاف رائے تھا - لیکن ان دونوں ابتدائی مآخذ سے دو الگ الگ نکات پر زور معلوم ہوتا ہے -

ابن اسحاق وغیرہ کے نزدیک وقت عمل سے زیادہ شناعتِ فعل پر زور ہے بہرحال ان تینوں امکانات کا قوی احتمال تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ وزن آخری نقطۂ نظر کے حق میں جاتا ہے اس کی مزید تائید مکہ والوں کے اس الزام کہ مسلمانوں نے ماہ حرم کی بے حرمتی کی تھی - کی تردید میں کی مسلمانوں کا جواب تھا کہ حملہ ماہ حلال میں کیا گیا تھا نہ کہ ماہ حرام میں - بہرحال کوئی بھی صورت رہی ہو البتہ یہ قطعی اور حتمی ہے کہ ماہ حرام کی بے حرمتی کی ذمہ داری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں تھی اور اگر کسی پر تھی بھی تو وہ امیر سریہ اور ان کے حامی مجاہدین کے سر تھی - کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حملہ کا کوئی حکم سرے سے دیا ہی نہیں گیا تھا -

مغربی مورخین نے حملہ کی ذمہ داری اور اس کے ذریعہ ماہ حرام کی بے حرمتی کی ذمہ داری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سر ڈالنے کی غیر معقول حد تک کوشش کی ہے - مونٹگمری واٹ نے اس سلسلے میں عجیب و غریب منطق سے کام لیا ہے - ایک طرف تو وہ سر توڑ کوشش کرتے ہیں کہ ماہ مقدس کی بے حرمتی کا جرم ذات نبوی سے منسوب کر دیں اور دوسری طرف اس کی تردید بھی کرتے ہیں - کہتے ہیں کہ اگر آپؐ نے رجب میں حملہ کا منصوبہ بنایا بھی تھا - اور آپؐ کے ساتھیوں نے اس کو عملی جامہ پہنایا بھی تھا تو آپؐ نے ایسا کر کے ارادتاً بے حرمتی کا ارتکاب نہیں کیا تھا - کیونکہ آپؐ ماہ رجب یا مقدس مہینے کے تصور کو جاہلی مذہب کا حصہ سمجھتے تھے اور پورے جاہلی قدیم مذہب کے خلاف برسر پیکار تھے اس لئے اس خاص مہینے یا کسی بھی مقدس مہینے کی تقدیس کے قائل ہی نہ تھے - اس لیے آپؐ کے نزدیک اس ماہ میں کارواں پر حملہ کرنا کوئی گناہ کا کام نہ تھا - پھر آپؐ نے سریہ نخلہ کی واپسی پر مجاہدین مہم کو کیوں سرزنش کی تھی کہ آپؐ نے اُن کو ماہ مقدس میں جنگ کرنے کا تو حکم نہیں دیا تھا - اور کیوں مالِ غنیمت کو قبول نہیں کیا تھا اور کیوں اس کو معطل رکھا تھا؟

واٹ کا خیال ہے کہ مہم روانہ کرنے سے پہلے آپؐ کو مدینہ والوں کے اس معاملہ پر اتنے شدید ردعمل اور اتنے نازک و مشتعل جذبات کا علم نہیں تھا اس کا احساس آپؐ کو مہم کی واپسی پر مدینہ کے مسلمانوں کے ردِعمل سے ہوا -

واٹ کی یہ بھی منطق نرالی ہے کہ مدنی مسلمانوں میں بہت سوں کو غالباً اس بات کا ڈر تھا کہ ماہ مقدس کی بے حرمتی کی پاداش میں قدیم دیوی دیوتاؤں کا عذاب کہیں ان کو یا اس جرم میں پوری قوم کو نہ آن پکڑے - اسی ردِعمل اور شدید بے چینی کی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اول تو حملہ کرنے کے اپنے سابقہ حکم کی تردید کر دی تھی - اور اس وجہ سے آپؐ نے مجاہدین کو سرزنش کی تھی اور مالِ غنیمت کی تقسیم کو معطل رکھا تھا - [142]

واٹ کی اس سلسلہ میں تمام دلیلیں اور خیالات حماقت کی حد تک بچگانہ ہیں - یہ خیال کہ آپؐ کو مدینہ کے مسلمانوں کے ماہ مقدس کی بے حرمتی کے بارے میں شدید جذبات اور نازک احساسات کا علم نہیں تھا قابل قبول نہیں ہے - اس سے زیادہ حیرت انگیز

اور نامعقول یہ تصور ہے کہ مدینہ کے مسلمان ماہ حرام کی بے حرمتی پر دیوتاؤں کے عذاب سے ترساں و لرزاں تھے۔ یعنی مدنی مسلمانوں کو اپنے پرانے دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں توڑنے میں تو کوئی خوف ان کے عذاب کا نہ محسوس ہوا اور ہوا بھی تو ماہ مقدس کے بے احترام ہونے پر۔ واٹ نے اس سلسلہ میں دو نادر تحقیق کے نمونے اور پیش کئے ہیں۔ ایک یہ کہ مدینہ کے لوگوں کو قدیم مذہب سے مکہ والوں کی بہ نسبت زیادہ لگاؤ تھا اور دوسرے یہ کہ مکیوں کے مقابلے میں مدینہ والوں کو جنگ و جدال کا اتنا تجربہ نہ تھا۔ مکہ والوں کو چونکہ مسلسل جنگ و جدال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس لیے ان کے یہاں تو ماہ مقدس کا اتنا احترام تھا اور نہ ہی دوسرے محرمات کا۔ جنگ کے زمانے میں ان کے یہاں ان تقدیسات کی مکمل خلاف ورزی ہوتی ہے۔[۱۴۳]

واٹ کا یہ پورا تجزیہ غیر علمی اور سطحی ہے۔ جہاں تک قدیم مذہب سے وابستگی کا تعلق ہے۔ مدینہ والوں کے یہاں وہ مکہ والوں سے کسی طور زیادہ نہ تھی۔ تاریخی روایات اور شواہد سے اس کا قطعی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ بلکہ اس کی تردید کے متعدد قوی ثبوت ملتے ہیں۔ اور سب سے بڑا ثبوت ان کی تیز رفتاری کے ساتھ اور خلوص سے قبول اسلام کی حقیقت ہے اس کے علاوہ متعدد مدنی صحابہ کرامؓ کے دلچسپ بت شکنی کے واقعات سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔[۱۴۴]

اس ذیل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی وابستگی، ان کی محبت اور تعمیل حکم میں جاں نثاری اور خاص کر آپ کی سماجی اور مذہبی اصلاحات کو بطیب خاطر قبول کرنے کے حقائق کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کیونکہ ان سے براہ راست اور بالواسطہ دونوں طرح سے اسلامی دین سے وابستگی اور محبت معلوم ہوتی ہے۔ وہیں قدیم مذہب سے بیزاری اور بے تعلقی کا بھی علم ہوتا ہے۔

جہاں تک جنگ و جدال کے ان کے تجربے کا تعلق ہے وہ بھی مدینہ والوں سے اگر زیادہ نہ تھا تو کچھ کم بھی نہ تھا۔ واٹ نے اس سلسلہ میں یہ تاریخی حقیقت بھلادی کہ مدینہ کے انصاری قبیلوں اوس اور خزرج نے پہلے یہودی قبائل کے خلاف مدتوں نبرد آزمائی کی تھی اور پھر بعد میں باہم دست بگریباں ہو گئے تھے اور جس کے نتیجے میں بیس بیس سال طویل اور خون آشام جنگیں جیسے حرب سمیر، حرب حالب، حرب کعب بن عمرو اور جنگ بعاث وغیرہ لڑی گئی تھی۔[۱۴۵]

ان جنگوں کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ نہ صرف مدینہ کے متعدد قبائل دو متحارب اتحادوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ بلکہ قرب و جوار کے بدوی قبائل جیسے جہینہ، مزینہ، بنو غطفان وغیرہ بھی ان اتحادوں کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔[۱۴۶]

بلکہ بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ دور دراز شمالی علاقوں کے بعض بدوی قبائل بھی ان اتحادوں میں حلیف کی حیثیت سے شامل تھے۔[۱۴۷]

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ واٹ کی ماہ حرام سے مدینہ والوں کی جذباتی وابستگی کی پوری تحقیق غیر علمی، غیر سنجیدہ اور غیر معقول ہے اسی ذیل میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس ماہ حرام کی بے حرمتی کے نکتہ پر مدینہ میں مسلمانوں کی طرف سے شدید ردِ عمل بے چینی و اضطراب اور ناگواری کا کیا ثبوت ماخذ سے ملتا ہے۔ یا یہ محض روایات سے نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ جہاں تک ماخذ کا تعلق ہے ایک روایت میں بھی اس نکتہ پر مدینہ والوں کے شدید ردعمل یا ناگواری و اضطراب کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔ مغربی مورخین کے استدلال کی ساری عمارت ان کے روایات و حقائق سے استنباط پر ہے۔ واٹ کے نزدیک اس کے دو ثبوت ہیں۔ اول یہ کہ آپؐ نے مال غنیمت کی تقسیم کو معطل رکھا اور سریہ کے مجاہدین کو سرزنش کی اور دوم یہ کہ قرآن مجید کی متعلقہ آیت میں ماہ حرام میں

جنگ کرنے کے بارے میں جن سوال کرنے والوں کی طرف اشارہ ہے - اس سے مسلمانان مدینہ مراد ہیں - جہاں تک مال غنیمت کے معطل یا موقوف رکھنے کا سوال ہے ماخذ سے بصراحت واضح ہوتا ہے کہ ایسا کرنا مسلمانوں کے کسی مخالفانہ ردِ عمل کے نتیجے میں نہیں تھا۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ کاروان نخلہ چھلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر کیا گیا تھا اور اس بنا پر وہ حملہ اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہونے والا مالِ غنیمت دونوں غیر قانونی اور ناجائز تھے ۔ غالباً منشا یہ تھا کہ مسلمانوں پر یہ واضح کر دیا جائے کہ بلا صریح حکم و اجازت کے حملہ کرنا اور مالِ غنیمت لوٹ لانا جائز نہیں ہے اور مسلمان حملہ آوروں کو مستقبل میں کسی مالی منفعت کی امید ایسے حملوں یا چھاپوں میں نہ رکھنی چاہیے۔ دراصل یہ مستقبل میں حکم عدولی یا حکم سے تجاوز سے باز رکھنے کی پیش بندی تھی یا اسی بنا پر غالباً ماخذ کے مطابق مسلمان مجاہدین کو اپنی ہلاکت کا اور عذابِ الٰہی کا اندیشہ ہوا تھا - اس سے بڑا سبب یہ تھا کہ مالِ غنیمت کے سلسلے میں ابھی تک کوئی قرآنی نص نہ تھی ۔ مسلمان مفسرین اور علماء نے اس پر تقریباً اتفاق کیا ہے کہ مالِ غنیمت کے سلسلے میں تمام احکام غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوئے تھے - تاریخی ماخذ میں ابن اسحاق ، واقدی وغیرہ تمام سیرت نگاروں نے اسی کی تائید میں روایات نقل کی ہیں اور تفسیری و حدیثی روایات بھی اسی کی تائید میں ہیں -[۱۴۸] حتیٰ کہ جدید مغربی مؤرخین نے بھی اس کو قبول کیا ہے -[۱۴۹]

حیرت کی بات ہے کہ خود مونٹگمری واٹ کو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں ہے -[۱۵۰] کیا یہ ان کے دعوؤں کی تردید کے لئے کافی نہیں ہے - جہاں تک سورہ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت کا تعلق ہے تو کسی تفسیری یا تاریخی روایت سے اس کی تائید نہیں ہوتی ہے کہ ماہ مقدس میں قتال و جدال کرنے کے سلسلے میں مسلمانوں نے سوالات کئے تھے - صرف واقدی اور بلاذری کا خیال ہے کہ بعض مسلمانوں نے اس سلسلے میں استفسار کیا تھا - جبکہ ابن اسحاق نے سوالات کرنے والوں کی صراحت نہیں کی ہے - طبری اور ابن کثیر نے اپنی تفاسیر میں متعدد روایات بیان کی ہیں جن سے عیاں ہوتا ہے کہ آیت میں مذکورہ سائلین سے مراد کفار و مشرکین مکہ تھے - نہ کہ مسلمانانِ مدینہ -[۱۵۱] پھر بعض مفسرین اور علماء نے بھی اس کی وضاحت کی ہے کہ آیت کا سیاق و سباق بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں کفار سائلین اور ان کے اعتراضات کا جواب مذکور ہے - ان کی دلیل یہ ہے کہ خدا کی راہ سے روکنے اور مسجد حرام میں نہ داخل ہونے دینے اور کفر الٰہی کرنے اور مسجد حرام کے باسیوں کو جلا وطن کرنے اور قتل سے زیادہ فتنہ کے خطرناک ہونے کا مسلمانوں کو جواب میں طعنہ نہیں دیا جا سکتا تھا - دراصل یہ وہ جرائم تھے جن کے مرتکب کفار مکہ ہوئے تھے اور شہر حرام میں قتال پر ان کی طعنہ زنی کے جواب میں ان کے تمام بڑے بڑے جرائم گنائے گئے تھے -[۱۵۲] اس کے علاوہ آیت کا آخری فقرہ کہ وہ تم سے برابر لڑتے رہیں گے - اور اپنی استطاعت بھر تم کو تمہارے دین سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے - سے آیت کے اولین فقرے کی تصریح ہو جاتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ الزامی جوابات مکہ کے قریش کے اعتراضات کے ردِ عمل کے طور پر بیان ہوئے ہیں - جہاں تک "شہر حرام" میں قتال کی خطرناکی کا تعلق ہے قرآن مجید اس کا سبب بے حرمتی کو خاصہ اہم معاملہ (کبیر) تصور کرتا ہے اور اس حقیقت سے نہ صرف اس آیت میں انکار کیا گیا ہے بلکہ قرآن مجید کی ماہ حرام سے متعلق دوسری آیات میں بھی اس سے انکار نہیں ہے بلکہ حرمت مقدس ماہ کو اسلام میں بھی برقرار رکھا گیا ہے - جیسے کہ ابھی ہم دیکھیں گے اسی طرح تاریخی روایات میں بھی مقدس مہینے یا مہینوں کی حرمت و تقدیس کا اعتراف کیا گیا ہے - ضمناً اس سے واٹ کے اس خیال کی تردید بھی ہوتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ماہ مقدس کی

حرمت کا خیال نہ تھا۔ یا آپؐ ان کی بے حرمتی کو جائز سمجھتے تھے۔ مقدس مہینوں کے معاملہ میں عرب کے قدیم جاہلی مذہب اور دین اسلامی میں بنیادی طور پر کوئی فرق خداوند کریم نے نہیں روا رکھا ہے اگر کوئی فرق ہے بھی تو وہ ان مہینوں میں قتال کی ممانعت کا مشروط ہونا ہے یعنی مسلمان اپنی طرف سے جنگ کا آغاز تو نہیں کرسکتے لیکن اگر اینٹ دوسری طرف سے آئے تو اس کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔[154] اسی بنا پر اکثر مسلمان علماء اس آیت کے ناسخ ہونے کے قائل ہیں۔[155] اور اسی سبب سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد کے زمانے میں متعدد غزوات و سرایا مختلف مقدس مہینوں میں بھیجے یا خود لے کر گئے تھے۔[156] جدید محققین کی اسلامی سال میں مقدس مہینوں کے بارے میں تحقیق بڑی دلچسپ مگر غیر منطقی ہے۔ واٹ کا خیال ہے کہ "شہر حرم" (مقدس مہینوں) کی تعیین خاصی مشکل ہے حالانکہ سورہ توبہ کی آیت ۳۶ کی نص قرآنی میں جن مقدس مہینوں کا ذکر ہے ان کی تعیین مسلم علماء و محققین نے بصراحت اور حتمی طور سے کردی ہے۔ چنانچہ مفسرین اسلام - اسلامی تقویم کے چار ماہ - رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم کو مقدس و حرام بتاتے ہیں۔ واٹ کا یہ بھی کہنا ہے کہ قرآن بعض دوسری جگہوں پر صرف ایک ماہ مقدس کا ذکر کرتا ہے اور پھر انہوں نے ایک اور مستشرق کے اس خیال سے اتفاق کیا ہے کہ غالباً عرب میں مختلف علاقے اور قبیلے مختلف مہینوں کی تقدیس و حرمت کے قائل تھے۔ چنانچہ ان دونوں مستشرقین کے نزدیک چار ماہ مقدس کی قید و شرط دراصل ایک مصالحانہ کوشش ہے اس سے[157] یہ واضح ہوتا ہے کہ واقعہ نخلہ پر مدینہ میں اتنا شدید ردعمل کیوں ہوا تھا۔ اور آپؐ کو اس ردعمل پر کیوں حیرت سے دوچار ہونا پڑا تھا؟ یہ پورا تجزیہ غیر علمی اور غیر مستند ہے اور محض اپنے دعویٰ کی دلیل فراہم کرنے کی غرض سے کیا گیا ہے۔ ورنہ اس میں تضاد ہیں۔ اور گہرائی سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے دعوے کی دلیل نہیں فراہم ہوتی بلکہ اس کی ان ہی کی دلیل سے تردید ہوتی ہے نص قرآنی میں بصراحت فیصلہ خداوندی ہے کہ "مہینوں کی گنتی اللہ کے پاس بارہ مہینے ہیں۔ اللہ کے حکم میں جس دن پیدا کئے زمین و آسمان۔ ان میں چار ہیں ادب کے۔"[158] اگرچہ نص قرآنی میں ان کی تعیین نہیں ملتی۔ لیکن تفسیری روایات احادیث و آثار اور تاریخی شہادتوں سے ان کی واضح و غیر مبہم تصریح ملتی ہے۔ اور تمام روایات و شواہد میں مکمل اتفاق ہے اور ایک روایت بھی ایسی نہیں پائی جاتی جس سے یہ شبہ ہی پیدا ہوسکے کہ مذکورہ بالا چاروں مہینوں کے سوا اور کوئی مہینہ مقدس تھا یا ہوسکتا ہے۔[159] واٹ نے قرآن کریم کی ان آیتوں سے جن صرف ایک ماہ حرام کا ذکر ہے۔ یہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے کہ قرآن کے نزدیک بھی متبرک مہینوں کا معاملہ مشتبہ یا کم از کم غیر متعین ہے۔ لیکن یہ استنباط غیر علمی ہے۔ جہاں جہاں قرآن نے ماہ مقدس کے لیے واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے وہاں انہیں مذکورہ بالا مقدس مہینوں میں سے کوئی ایک مخصوص مہینہ مراد ہے۔ جس کا آیت متعلقہ کے سباق و سیاق سے صاف پتہ چل جاتا ہے۔[160] تاریخی شواہد اس پر قطعی طور پر دلالت کرتے ہیں کہ مقدس مہینوں کے بارے میں قرآنی تصریح اور احادیث و آثار اور عربوں کے سماجی دستور و عادت میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ مستشرقین کا یہ خیال کہ چار ماہ کی قید ایک مصالحانہ کوشش ہے ورنہ مختلف علاقوں میں مختلف مہینے مقدس سمجھے جاتے تھے۔[161] نہ تو تاریخی ثبوت اور نہ ہی تنقید کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے۔ اس خیال کی تردید عربوں کے "قاعدہ نسی"[162] سے بھی ہوتی ہے۔ جس کے مطابق وہ اپنی دنیاوی مصلحتوں کی خاطر ماہ حرام کو حلال کر لیتے تھے۔ قرآن مجید کی اگلی آیت ہی میں اس بے حرمتی ماہ مقدس پر شدید نکتہ چینی کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مختلف علاقے

میں مختلف مہینے مقدس یا حرام ہوتے تو شاید سال کا کوئی حصہ اس سے خالی نہ جاتا۔ لہذا مختلف مقامات پر "نسی" کی ضرورت ہی نہ پڑتی اس کے علاوہ اس صورت میں مقدس مہینوں کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ ان مقدس مہینوں میں جان و مال کی حفاظت کی ضمانت ملتی تھی کیونکہ جنگ و جدال کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ جنگ و جدال، لوٹ مار سے بھرپور اور غیر محفوظ و غیر مامون زندگی میں عرب قبائل کو ان میں مقدس مہینوں میں امن و چین کا سانس لینے کا موقع ملتا تھا اور بلا خوف و خطر وہ ایک دوسرے علاقے میں سماجی و معاشی ضروریات سے آ جا سکتے تھے۔ اگر پلسنر (PLESSNER) اور لیون کیبانی وغیرہ کا خیال قبول کر لیا جائے تو عرب سماج میں جان و مال کے تحفظ کا تصور ہی ختم ہو جائے گا اور سال کا کوئی حصہ بھی محفوظ و مامون نہیں سمجھا جا سکتا اس کے علاوہ اس خیال سے ان کے اپنے دعوے کی تردید ہوتی ہے اور وہ یوں کہ اس خیال کے مطابق عین ممکن تھا کہ رجب کا مہینہ مدینہ والوں کے لیے مقدس نہ رہا ہو اور اس کی تقدیس کے قائل صرف مکہ والے رہے ہوں۔[163] یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسلمانانِ مدینہ نے مجاہدین نخلہ کو ماہ مقدس کی بے حرمتی پر لعن طعن نہیں کیا تھا۔ بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کی وجہ سے کیا تھا۔[164] پھر ماہ مقدس کا اعتراض اٹھانے والے مکی تھے۔ مدنی مسلمان نہیں۔[165] تاہم قرآن تسلیم کرتا ہے کہ اس ماہ مقدس کی تقدیس بدستور قائم تھی۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو بحال رکھا اور تسلیم کیا تھا۔ بہر حال یہ بات قطعیت کے ساتھ ثابت ہوتی ہے کہ اسلامی تقویم میں چار مخصوص ماہ حرام تھے اور ان کی تعیین میں کسی قسم کا اشتباہ و اختلاف نہ تھا اور یہ کوئی مصالحانہ کوشش نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔

اب آخر میں اس نکتہ پر توجہ کرنا ضروری ہے کہ آخر مجاہدین نخلہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے تجاوز کر کے یا ایک طرح سے آپ کے حکم کی مخالفت کر کے ماہ مقدس میں کاروانِ نخلہ پر حملہ کیا ہی کیوں تھا؟ وہ تو قریش یا کاروانِ قریش کی خبریں فراہم کرنے گئے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ واقدی وغیرہ کے خیال میں یہ حملہ عرض دنیا کے طالبوں کی طلب کی وجہ سے ہوا تھا اور مغربی مورخین تو اس حملہ کا مقصد و محرک ہی لوٹ مار قرار دیتے ہیں۔ ماہ مقدس میں حملہ و لوٹ مار کا ارتکاب کرنے کی توجیہہ ماخذ سے یہ ہوتی ہے کہ تاخیر کی صورت میں کارواں ہاتھ سے نکل جاتا۔ واٹ نے ایک مزید توجیہ یہ کی ہے کہ کاروان نخلہ نے متوقع تاریخوں سے کچھ پہلے آ کر سارے اندازے گڑبڑ کر دیے تھے۔ لیکن ان دونوں توجیہات کی تردید روایات و تنقید سے ہوتی ہے اگر وہ کارواں اپنی تقدیم آمد کے سبب توقع کے خلاف آ گیا تھا۔ تو اسے نکل جانے دیتے کیونکہ اس راہ پر تو کارواں گزرتے ہی رہتے ہیں۔ ایک دن کے صبر کے بعد وہ کسی اور کارواں کو نشانہ بنا لیتے یا پھر جس کاروانِ قریش کا حوالہ واقدی وغیرہ کے یہاں موجود ہے۔ اس سے یہی مخصوص کارواں مراد تھا۔ لیکن اس خیال کی تردید مختلف شہادتوں سے ہوتی ہے۔ واقدی کی روایت کا وہ حصہ جو مسلم مجاہدین کے حملہ حامی و مخالف طبقوں میں بٹ جانے کا ذکر کرتا ہے۔[166] اس کی تردید کرتا ہے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "عرض دنیا" اور حملہ مخالف طبقہ کیوں حملہ میں شریک اور حملہ حامی طبقہ سے متفق ہوا تھا۔ روایات میں اس کا کوئی جواب یا توجیہ نہیں ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حملہ حامی فریق کے پاس کچھ دلائل اور مصالح تھے جنہوں نے حملہ مخالف فریق کو بھی ان کے خیال سے متفق ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

در اصل صورتِ حال یہ پیدا ہو گئی تھی کہ مسلم مجاہدین غالباً سر شام نخلہ میں پہنچ کر مقیم ہی ہوئے تھے کہ اچانک غیر متوقع طور پر

کاروان نخلہ وہاں پہنچ گیا اور اتفاق سے ان کے قریب ہی میں خیمہ زن ہوا دونوں جماعتوں کو ایک دوسرے سے خوف محسوس ہوا۔ کاروانِ نخلہ والوں کو تو غارتگری کا خوف تھا جسے حضرت عکاشہ بن محصن اسدی نے فوری طور پر حلق کرائے اور اس کے ذریعہ ان کو یہ تاثر دے کر کہ وہ زائرین کی جماعت ہے۔ غارتگروں کی نہیں۔ قریشیوں کا خوف تو فوری طور سے دور کر دیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حضرت عکاشہ کا حلق کرانا مخالف جماعت کو اطمینان دلانے کے لیے تھا وہاں مسلمانوں کا یہ بھی صحیح مطمح نظر تھا کہ قریشی ان کے بارے میں مزید تفتیش نہ کریں۔ یہ ترکیب غارت گری کے منصوبے کی تکمیل کے لیے نہیں کی گئی تھی جیسا کہ اس کو عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ مسلم جماعت غارت گری کے لیے نہیں بلکہ خبروں کی فراہمی اور جاسوسی کے لئے آئی تھی۔ ابن اسحاق اور واقدی دونوں کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عکاشہ کا حلق کرانا قریشی کارواں آنے کے فوراً بعد ہوا تھا۔ اور اس پر مجاہدین نے حملہ کرنے کا فیصلہ بعد میں کیا تھا۔"[۲۷] روایات کی یہ ترتیب ثانی ہے اور اس کے اس طرح ماننے کا ایک سبب یہ ہے کہ مسلمان مجاہدین خود بھی قریشیوں کی نظر میں آنے سے کترا رہے تھے۔ اور بچنا چاہتے تھے۔

چنانچہ روایات میں صراحت ہے کہ قریشیوں کے سامنے صرف حضرت عکاشہ آئے تھے۔ مسلمانوں کے قریشیوں کی نگاہ سے بچنے کا سبب ظاہر یہی تھا کہ وہ سب کے سب محلوق نہ تھے۔ اور اگر ان کو قریشی دیکھ لیتے تو سمجھ جاتے کہ وہ جماعت زائرین نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ لیکن اس ظاہری سبب کے علاوہ اس سے کہیں زیادہ ایک اور باطنی سبب تھا اور وہ یہ تھا کہ مسلم جماعت میں قریشِ مکہ کے کئی جانے پہچانے چہرے تھے اور کوئی ہو یا نہ ہو لیکن کم از کم دو حضرات ایک تو خود امیر سریہ حضرت عبداللہ بن جحش [۲۸] اور دوسرے حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ اموی [۲۹] مکہ اور قریش کی جانی بوجھی شخصیتیں تھیں اور کسی بھی مکی کی نظروں سے وہ چھپ نہیں سکتی تھیں۔ یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ مکی کارواں پورے کا پورا بنو مخزوم کے اہم اشخاص پر مشتمل تھا۔ اور ان کے اور بنو امیہ کے درمیان تجارتی، معاشی اور سماجی تعلقات بہت گہرے اور قریبی تھے۔"[۳۰] اس لیے ان دونوں مسلموں کی شناخت اور بھی آسان تھی۔ بظاہر حضرت عکاشہ کو محلوق دیکھ کر قریشی مطمئن ہو گئے تھے۔ لیکن مسلمانوں کا اضطراب ختم نہ ہوا تھا۔ ان کا سامنا اس کارواں سے اچانک ہوا تھا اور فوری طور پر وہ اپنی شناخت سے بچ بھی گئے تھے۔ لیکن اس کا احتمال تھا کہ کسی وقت کوئی قریشی تفتیش حال یا کسی ضرورت سے مسلم جماعت کے قریب آنکلے تو وہ بڑی آسانی سے مسلمان مجاہدین کی شناخت کر کے پورے قافلے کو ہوشیار کر سکتا تھا اور نہ صرف ان کو بلکہ قرب جوار کے قبیلوں کو اور مکہ والوں کو بھی اور مسلمانوں کی شناخت سے نہ صرف یہ کہ قریش کے بارے میں خبروں کی فراہمی کا کام مشکل ہو جاتا بلکہ خود مسلم مجاہدین کی زندگی کے لالے پڑ جاتے اور غالباً یہی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم جماعت کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ کاروانِ قریش پر حملہ کر کے ان کے تمام آدمیوں کو مار ڈالتے یا گرفتار کرنے کی کوشش کریں، کہ ان کی وہاں موجودگی کا راز نہ کھلنے پائے۔ اور درحقیقت انہوں نے ایسا اسی لیے کیا بھی تھا اور اس میں کافی حد تک کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن ایک شخص کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور اس طرح مجاہدین کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔

ماخذ میں مسلمانوں کے کاروانِ نخلہ پر حملہ کرنے کے فیصلے کے ضمن میں دو جملے بہت اہم ہیں۔ ان کا فیصلہ تھا کہ ان میں

سے جو مل جائے اسے قتل کر دیا جائے ۔ یا گرفتار کر لیا جائے اور ان کے سامان پہ قبضہ کر لیا جائے ۔ یہ دونوں جملے ثابت کرتے ہیں کہ اصلاً حملہ کرنا یا چھاپہ مارنا مقصود نہ تھا بلکہ یہ ایک وقتی فیصلہ تھا جو حالات کے تحت فوراً کیا گیا تھا اور رازداری یا خود حفاظتی کے اسباب وعوامل کی وجہ سے کیا گیا تھا ۔ کارواں کے ایک شخص کے نکل جانے کی وجہ سے مسلم جماعت کا نخلہ میں قیام بے معنی ہو گیا تھا ۔ اس لئے مدینہ واپس ہونا فطری اور حقیقی تھا ۔ مآخذ کے اس اصرار کی روشنی میں کہ نخلہ کی مہم کا مقصد قریش یا کاروانِ قریش پر نظر رکھنا تھا مسلم مجاہدین کے کاروان قریش پر حملہ کرنے کی یہی فطری اور قابلِ قبول توجیہہ کی جا سکتی ہے ۔

محققین نے اب تک اس نکتہ سے بحث نہیں کی ہے اور نہ ہی مآخذ سے اس کا بدیہی طور پہ پتہ چلتا ہے کہ آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش یا کاروانِ قریش پہ نظر رکھنے کے لیے ایک مختصر سی جماعت کو مکہ کے اتنے قریب نخلہ کیوں بھیجا تھا؟ ظاہر ہے کہ آپؐ کو ان کے بارے میں کوئی خاص خبر یا پریشان کن اطلاع ملی تھی اس لیے آپ نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا ۔ وہ خبر یا اطلاع کیا تھی؟ قیاس یہ کہتا ہے کہ وہ خبر یہ تھی کہ قریش ایک بہت بڑا کارواں شام کو بھیجنا چاہتے ہیں جس کے بارے میں مآخذ کا بیان یہ ہے کہ اس میں قریش کے ہر مرد و عورت نے جس کے پاس ایک مثقال یا اس سے زیادہ رقم تھی حصہ لیا تھا حتیٰ کہ بوڑھی عورت اور کمزور عورتوں نے سوت کات کر اس کارواں میں مال لگایا تھا ۔ جس کی مالیت پچاس ہزار   کی خطیر رقم کے برابر تھی ظاہر ہے کہ یہ خبر مسلمانانِ مدینہ کے لئے خاصی چونکا دینے والی تھی اس میں حیران کن عنصر تجارتی مفادات نہ تھے بلکہ اس مخصوص کارواں کی نوعیت اور اس کے اسباب وعوامل تھے ۔ آخر ایسی کون سی فوری معاشی اور اقتصادی ضرورت پیش آگئی تھی ۔ جس کے لیے قریشیوں نے غیر معمولی کارواں ترتیب دیا تھا؟ کسی حد تک یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کارواں کی غیر معمولی نوعیت ہی تھی ۔ جس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تفتیش حال کے لیے ایک مختصر سا طلیعہ مکہ کے بالکل عقب میں بھیجنے پر مجبور کیا تھا ۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ بعض روایات میں قریش کے بجائے قریشی کارواں پہ نظر رکھنے کی وجوہات کہی گئی ہیں ۔ غالباً کیا یقیناً اس سے ہی غیر معمولی اور عظیم کاروانِ قریش مراد تھا ، کاروانِ نخلہ نہیں ۔

مؤخر الذکر تو محض موقعہ و محل کی وجہ سے اور مسلم جماعت کی کارروائی کی وجہ سے اہمیت اختیار کر گیا اور اس طرح سے غلط فہمی اور صورتِ حال کے صحیح تجزیے میں ناکامی کا سبب بن گیا ۔ بہر حال اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اس عظیم و غیر معمولی کاروانِ قریش کی ترتیب و تنظیم اور اس کے محرکات و عوامل سے جن کی سن گن آپؐ کو کسی طرح سے مل گئی تھی تو آپؐ کو خدشہ تھا کہ یہ ساری تیاری غالباً مدینہ کی اسلامی ریاست اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کسی بڑے منصوبے کی خاطر کی جا رہی ہے وہ منصوبہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ تجارتی دولت کو سیاسی و فوجی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے اور مسلمانوں پہ ایک کاری ضرب لگائی جائے ۔[۲۱]

واضح رہے کہ یہ قریشی سیاسی و فوجی پالیسی کسی نئے معاشی سبب یا مسلمانوں کی جانب سے اپنی تجارت کو خطرہ میں دیکھ کر نہیں اپنائی گئی تھی جیسا کہ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں اور اپنے آخری مجموعی تجزیے میں تفصیل کے ساتھ دیکھیں گے بلکہ اس قدیم عداوت اسلام اور دشمنی رسولؐ کے سبب تھی جو ان کو مکی عہد سے تھی اس کے بعض سیاسی اسباب بھی تھے قریش مکہ دیکھ رہے تھے کہ مدینہ کی اسلامی ریاست روز بروز وسیع تر اور طاقتور ہوتی جا رہی تھی ۔ شہر کے اردگرد کے علاقے میں بسے ہوئے بدوی قبائل اس کے حلیف دوست

بنتے جارہے تھے [۶۱] اور اس طرح مدینہ مکہ کے حریف کی حیثیت سے ابھر رہا تھا وہ جانتے تھے کہ اگر اس کو اسی طرح اور پنپنے کا موقعہ دیا گیا تو وہ ایک دن اتنا طاقت ور ہو جائے گا کہ ان کی سیاسی بالادستی کو ختم کر دے گا اس سیاسی حیثیت کا خاتمہ نہ صرف ان کی سیاسی موت کے مترادف ہوتا بلکہ ان کے مذہبی تخصص اور معاشی طاقت کے لیے بھی آخری کیل ثابت ہوتا چنانچہ انہوں نے مدینہ پر ایک کاری ضرب لگانے کے لئے اپنی تمام دولت ایک کارواں میں جھونک دی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ مکہ میں قریش کے متعدد مقتدر افراد مدینہ سے مخاصمت اور جدال مول لینے کے حق میں نہ تھے اور وہ تاریخی فطری عناصر کو ان کی قدرتی نشو و نما کی بلا روک ٹوک اجازت دینے کے حق میں نہ تھے۔ لیکن تاریخی شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ مکہ کا یہ معتدل اور نرم مزاج طبقہ آہستہ آہستہ ختم یا کمزور ہو رہا تھا۔ اور اس کی جگہ سیاسی قیادت اور زمام کار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتی جا رہی تھی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے دشمن ہی نہ تھے بلکہ وہ تلوار کے زور سے ان کو مٹا دینے کی پالیسی میں یقین رکھتے تھے۔ اس کا ثبوت غزوہ بدر کے موقعہ پر مکہ کے معتدل و صلح جو طبقہ پر اس کے جنگ جو اور جدال پسند طبقہ کی برتری سے ملتا ہے۔ کیونکہ آخر کار یہ موخر الذکر طبقہ ہی تھا جو جنگ کرانے اور مستقبل میں اس کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا تھا [۶۲]

اس طرح یہ بات تقریباً پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ مہم نخلہ کا مقصد قریش کے آئندہ منصوبوں کی ٹوہ لینے کے لیے تھا اور اس کا محرک اس عظیم قریشی کارواں کی ترتیب و تنظیم تھی جو ابو سفیان بن حرب کی قیادت میں شام جانے والا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی غیر معمولی نوعیت اور زبردست تیاریوں کی خبریں سن کر تشویش ہونی لازمی تھی کیوں کہ آپ کے سامنے مدینہ کے دفاع اور امت مسلمہ کی جانی حفاظت کا زبردست سوال تھا اور دونوں مقاصد کو اسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا تھا جبکہ دشمنوں کے ہر منصوبے سے باخبر رہا جائے۔ اسی لیے آپ نے نخلہ کی مہم ترتیب دی تھی۔ واقعات، شواہد اور دلائل کی روشنی میں یہ بلا ریب ثابت ہوتا ہے کہ اس مہم کا محرک و مقصد غارت گری مال کی حرص اور روز افزوں امت کی اقتصادی ضروریات کو پورا کرنا نہ تھا جیسا کہ مغربی مورخین نے دعویٰ کیا ہے۔ بلکہ اس کا محرک و مقصد سیاسی اور دفاعی تھا اس کی مزید تصدیق سریہ نخلہ میں شامل مجاہدین کی تعداد سے بھی ہوتی ہے محض آٹھ یا بارہ آدمیوں پر مشتمل کوئی دستہ بڑا کارواں اور وہ بالکل دشمن کے گھر میں نہیں لوٹ سکتا تھا اور نہ ہی لوٹ کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ پھر یہ کارروائی اصلاً چھ آدمیوں کے دستے نے کی تھی اتفاق سے کاروان نخلہ مختصر تھا لیکن اس کا بھی تو احتمال تھا کہ وہ مسلم دستے سے کافی بڑا ہوتا ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں چھاپا مارنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اس سے یہ خیال تقویت حاصل کرتا ہے کہ اگر چھاپہ مار کارروائی مقصود ہوتی تو نسبتاً بڑا فوجی دستہ بھیجا جاتا اور علاقائی یا جغرافیائی اسباب کی بنا پر یہ ضروری تھا کہ فوجی دستہ اتنا بڑا ضرور ہونا چاہیے تھا کہ وہ ہر قسم کی ممکنہ و غیر متوقع صورت حال سے پوری طرح نمٹنے کا اہل ہوتا اس تمام طویل بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ماخذ کا یہ بیان صحیح ہے کہ مہم نخلہ کا مقصد دشمن کی جاسوسی تھی نہ کہ غارت گری اور لوٹ مار ان کے علاوہ متعدد دوسری دلیلیں اور شواہد ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ نہ صرف یہ آخری ابتدائی مہم بلکہ ابتدائی مہمیں اقتصادی محرکات و مقاصد نہیں رکھتی تھیں

(۹/۱۰) نویں اور دسویں مہمیں: ہمارے مقبول و معروف ماخذ میں ابتدائی مہموں کی تعداد آٹھ بیان کی گئی

ہے جن میں چار سرایا اور اتنے ہی غزوات شامل کئے جاتے ہیں۔ ان کا ہم مفصل مطالعہ کر چکے ہیں۔ لیکن ابتدائی مگر معروف مورخ یا مصنف نے ان ابتدائی مہموں کی تعداد دس بتائی ہے اور چار کے بجائے چھ غزوات غزوہ بدر سے پہلے ہونے کا ذکر کیا ہے اگرچہ موجودہ مورخین اور ان کے طرزِ تاریخ نویسی کا اندازہ یہ ہے کہ مسلمہ مآخذ سے مختلف یا مستزاد روایات کو آسانی سے قبول نہیں کرتے اور اس کو ماننے میں غیر ضروری احتیاط برتتے ہیں تاہم ایک ابتدائی مورخ کی روایت کو بلا کسی منطقی سبب یا معقول شہادت کے نظر انداز کرنا محال ہے بہرحال محمد بن حبیب بغدادی (متوفی ۲۴۵ھ) کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنگ بدر سے پہلے ماہ شعبان میں دو مہمیں دو مختلف علاقوں میں لے کر گئے تھے۔ اس کے بیان کے مطابق نویں ابتدائی مہم بروز جمعرات ۲۰ شعبان ۲ھ کو ینبع کے علاقے میں گئی تھی۔ وہاں کوئی مڈبھیڑ نہیں ہوئی اور آپؐ واپس آگئے لیکن دسویں ابتدائی مہم کے بارے میں بڑا دلچسپ بیان ہے اور وہ یہ کہ ۱۴ شعبان ۲ھ بروز منگل آپ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے اور صفوان پہنچے وہاں آپؐ نے قبیلۂ غفار سے باہمی امداد و اعانت کا ایک معاہدہ (کتاب مداجتہ) لکھا اور ایسا دوسرا معاہدہ بنو اسلم سے بھی کیا اس غزوہ میں بھی کوئی جنگ نہیں ہوئی۔[۱۷۴] بظاہر یہ بیان مسلمہ مآخذ کے خلاف ہے کیونکہ اول تو وہ ان غزوات کا سرے سے ذکر ہی نہیں کرتے۔ دوم یہ کہ بعض مآخذ کا اصرار ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمادی الآخرہ تا اول رمضان مدینہ میں قیام پذیر رہے اور کہیں باہر تشریف نہیں لے گئے۔[۱۷۵] سوم یہ کہ غزوات و سرایا کی تعداد سے جو ان مآخذ میں صراحتاً بیان ہوئی ہے۔[۱۷۶] یہ بیان متصادم ہے اور اوپر کی بیان شدہ دلیلوں کی تردید کرتے ہیں۔ مسلمہ مآخذ پر اضافہ یا اضافی معلومات کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ وہ غلط ہیں پھر آپ کے مدینہ میں جہاں تک مدت قیام کا تعلق ہے اس کی توثیق بعض دوسرے مآخذ سے نہیں ہوتی بلکہ کہیں کہیں تو تردید ہوتی ہے۔[۱۷۷] اس کے علاوہ ستائیس غزوات اور اڑتیس سرایا کی تعداد بھی بعض مآخذ میں کم یا زیادہ پائی جاتی ہے۔[۱۷۸] اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ دراصل مورخین اور اصحاب سیرت کو جتنی مہموں اور ان کی تفصیلات کا علم ہو سکا اور جہاں تک وہ معلومات ان کے طریق نگارش یا طبیعت کتاب سے لگا سکیں انہوں نے ان کو بیان کیا۔ یہی سبب ہے کہ سیرت نبویؐ کے بارے میں عموماً اور مہموں کے بارے میں خصوصاً مختلف مآخذ میں معلومات کم و بیش ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ کم از کم دوسری مہم کے بارے میں واقعاتی شہادت یہ ہے کہ بنو غفار اور بنو اسلم سے جو معاہدے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئے تھے ان کے متن دستیاب ہیں۔[۱۷۹] اور دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ ان معاہدوں کے پس منظر کے بارے میں کہ وہ کب اور کہاں ہوئے کچھ بھی مآخذ میں نہیں بیان ہوا ہے۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ بغدادی کا بیان صحیح ہے کیونکہ ممکن ہے کہ یہ معاہدے انھیں مہموں کے دوران ہوئے ہوں مزید برآں ان معاہدوں کی زبان و طرز بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ معاہدے عہد نبوی کے مدنی دور کے ابتدائی زمانے کے ہیں۔ بہرحال ان شواہد و دلائل کی روشنی میں یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ بغدادی کا بیان صحیح ہے اور ابتدائی مہموں کی تعداد آٹھ نہیں بلکہ دس تھی اگرچہ بغدادی نے اپنی اختصار پسندی اور تفصیلات سے گریز کی بری عادت کی وجہ سے ان مہموں کے پس منظر، حالات و اسباب وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔[۱۸۰] تاہم موجودہ تحقیقات اور معیارِ تحقیق کی بنا پر ان کے اسباب و علل اور عوامل کا پتہ لگانا اب کچھ مشکل نہیں ہے یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں مہموں کے حالات و اسباب و عوامل وہی تھے جو دوسری ابتدائی مہموں کے تھے یعنی عرب کے بدوی قبائل سے تعلقات محبت و دوستی اختیار کرنا اور اسلامی ریاست

ے ان کو کسی نہ کسی طرح وابستہ کرنا خوش قسمتی ہے بنو غفار اور بنو اسلم سے غزوۂ سفوان کے ذیل میں معاہدۂ باہمی نصرت و امانت کا جو ذکر کیا ہے اس کی مکمل تصدیق ان معاہدوں کے متن سے ہوتی ہے جو دوسرے ماخذ میں مذکور ہیں اور یہ ایک مزید دلیل ہے جو ابتدائی مہموں کے بارے میں وضاحت کرتی ہے کہ ان کے محرکات اقتصادی نہ تھے جیسا کہ ہمارے جدید مؤرخین کا اصرار ہے اس پر مزید بحث ہم اپنے آخری تجزیے میں کر رہے ہیں، جواب شروع ہوتا ہے۔

آخری تجزیہ

اب تک ہم نے دس ابتدائی مہموں کے محرکات، مسائل اور مقاصد کا الگ الگ جائزہ لیا ہے اور اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "یہ تمام کوششیں اور کاوشیں کارروائیاں اور مجاہدے، مساعی اور سرگرمیاں دراصل ایک سوچی سمجھی اور منصوبہ بند سیاسی حکمت عملی کی مختلف کڑیاں تھیں۔ ان مہموں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانانِ مدینہ۔ مہاجرین اور انصار۔ کے سیاسی و سماجی پس منظر میں دیکھنا چاہیے ہجرت کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں ایک مذہبی اور سماجی نظام کا ڈھانچہ کھڑا کر رہے تھے۔ جس کی ابتدا مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارے (مواخاۃ) سے ہوئی تھی اور پھر جب مسلمانوں کے ان دو علاقائی طبقوں کو دین کی بنیاد پر متحد کر لیا گیا تو مدینہ میں ایک اسلامی امت وجود میں آئی۔"[۱۸۱] اس امت کی اساس اول اسلام تھا۔ اور اس لحاظ سے وہ عرب کے قبائلی پس منظر میں بالکل نیا تجربہ تھا۔ جس میں سماجی نظام یا معاشرت کا انحصار خون کے رشتوں کے بجائے مذہبی اخوت اور یگانگت پر تھا۔ امت مسلمہ کی تشکیل کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مدینہ کی یہودی قبائل اکا دکا عیسائی افراد کا مسئلہ تھا پھر انصار کے دونوں عرب قبیلوں اوس و خزرج کے ان یہودی قبائل سے سیاسی، سماجی اور فوجی نوعیت کے تعلقات تھے جو کافی قدیم تھے ان کے علاوہ مدینہ کے لوگوں کے قرب و جوار کے بدوی قبائل سے دوستی اور حلیفانہ تعلقات تھے۔ ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان تعلقات کو نہ تو نظر انداز کر سکتے تھے اور نہ ان کو جوں کا توں رہنے دے سکتے تھے۔ امت مسلمہ دنیا سے کٹ کر اور اپنی ارد گرد کی بستیوں اور قبیلوں سے منہ پھیر ایک سماجی خلا میں زندہ نہیں رہ سکتی تھی اور نہ ہی پرانے تعلقات نئے حالات میں اور نئے لوگوں کے لیے مفید ہو سکتے تھے۔ ان سماجی تقاضوں اور ضروریات نے امت مسلمہ کے سربراہ کے لیے ایک عملی اور مفید لائحہ عمل تیار کرنا ناگزیر بنا دیا تھا۔ چنانچہ آپ نے پہلے ایک سیاسی و سماجی نظام قائم کیا جس کو عام طور سے سماجی تحفظ کا نظام (SOCIAL SECURITY SYSTEM) کہا جاتا ہے اس کے مطابق امت مسلمہ کے سماجی تعلقات مدینہ کے یہودی قبیلوں سے قائم کئے گئے اور ایک معاہدہ کے ذریعہ جس کو عموماً دستور مدینہ کہا جاتا ہے اور جس کو ابن اسحاق نے "کتاب رسول" یا "صحیفۂ رسول" کا نام دیا ہے مدینہ کی پوری آبادی کو سماجی و سیاسی تحفظات و ضمانتوں کی خاطر ایک سیاسی نظام کے تحت مجتمع کر دیا گیا۔ مذہبی اختلافات کے باوجود مسلمان اور یہود اور ان کے حلیف ایک دوسرے کے حلیف و دوست قرار پائے اور ان کے بعض فرائض و ذمہ داریوں کے ساتھ ان کے حقوق واضح کر دیے گئے۔[۱۸۲] اس طرح مدینہ میں ایک نیا سیاسی نظام از خود وجود میں آ گیا اس سیاسی و سماجی نظام کا دائرہ کار مدینہ تک محدود نہ رہ سکا۔ کیونکہ مسلمانوں کو اپنے پڑوسیوں سے سماجی تعلقات فطرتاً رکھنے تھے اور سیاسی تعلقات بھی بعض اسباب کی بنا پر قائم کرنا ناگزیر تھا۔

قرب وجوار خاص کر مغربی علاقے کے بدوی قبائل سے انصار کے قدیم حلیفانہ و دوستانہ تعلقات نے ایک مضبوط بنیاد فراہم کی اور وہ اپنے پرانے تعلقات کی بنا پر مہاجرین وامیر مہاجرین کے بھی دوست بن گئے لیکن اب نوعیت دوسری ہو چکی تھی مدینہ میں عملاً مہاجرین و انصار کے دو ممتاز طبقات کی تفریق مٹ چکی تھی اور ایک امت مسلمہ قائم ہو چکی تھی اس امت کا ایک سیاسی نظام قائم ہو چکا تھا جس میں ایک باقاعدہ حکومت کا تصور ابھرنے لگا تھا۔ پڑوس کے قبائل کے تعلقات اب انفرادی قبائل اور چھوٹی بڑی سماجی اکائیوں سے نہیں بلکہ ایک بڑے سماجی وسیاسی نظام اور ایک باقاعدہ منظم حکومت سے استوار ہوئے تھے۔ مدینہ کی شہری ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسی قبائل سے دوستانہ و حلیفانہ تعلقات قائم کئے لیکن کب اور کیسے؟ اس پر ہمارے مآخذ کا واضح جواب نہیں ملتا البتہ ابتدائی مستند مؤرخین اور جدید مورخین دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ تعلقات ہجرت کے فوراً بعد قائم ہو گئے تھے اور معاہدوں کے ذریعہ وجود میں آئے تھے۔ ابتدائی مہمیں جن کو بدقسمتی اور غلط فہمی سے فوجی مہمیں سمجھ لیا گیا ہے۔ دراصل سیاسی سفارتیں یا مشن تھے اور انھیں مہموں کے دوران قرب وجوار کے علاقوں سے تعلقات قائم ہوئے تھے۔

علاقائی یا جغرافیائی سیاست ایک اہم عنصر مکہ کا قریشی اشرافیہ تھا پورے عرب میں اس کو مذہبی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی بالادستی حاصل تھی[143] اگرچہ بعض اوقات اس کے بعض حریفوں سے برد آزما ہونے کے واقعات ملتے ہیں[144] تاہم تمام عرب قبائل قریش کی ہمہ جہت بالادستی کے معترف تھے۔ اسلام کی آمد نے اور پھر اس کی بتدریج ترقی وتوسیع نے اس بالادستی کو چراغ دکھانا شروع کر دیا تھا اور اسی بنا پر مکی اشرافیہ نے اس کی بھرپور مخالفت کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی اور بالآخر مسلمانوں کو ایک جائے پناہ یثرب میں مل گئی اور مکی مسلمانوں نے وہاں پہنچ کر اپنے دینی مدنی بھائیوں کے ساتھ ایک سیاسی وسماجی نظام قائم کر لیا۔ ظاہر ہے کہ مکی اشرافیہ کو یہ نظام کسی طور پر پسند نہیں آسکتا تھا اور وہ اس کے لئے نفرت وعناد کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں رکھتے تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی سیاسی بصیرت نے بخوبی محسوس کر لیا تھا کہ قریش مکہ کی اسلام ورسول دشمنی ایک دن رنگ لا کر رہے گی[145] اس لئے عرب دستور قبائل کے مطابق آپ نے ایک سیاسی اتحاد کا منصوبہ بنایا جس کے تحت اس علاقے کے تمام عناصر کو اس کا رکن بنانا مقصود تھا کہ بوقتِ ضرورت قریش کی سیاسی وفوجی طاقت کا کامیاب مقابلہ کیا جا سکے چنانچہ آپ کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ قریب کے بدوی قبائل سے حلف و دوستی کے تعلقات از سرِ نو اور نئی بنیادوں پر قائم کئے جائیں اور یہی کام ان ابتدائی مہموں کے دوران کیا گیا تھا۔

خوش قسمتی سے مآخذ میں ان ابتدائی مہموں کے سلسلے میں بعض ایسے اشارے، حوالے اور کہیں کہیں واضح تصریحات ایسی موجود ہیں جو ان مہموں کے اس مقصد ومحرک کی طرف صاف نشاندہی کرتی ہیں۔ پہلی مہم کے ذیل میں مآخذ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک مغربی قبیلہ۔ جہینہ کے علاقے میں گئی تھی۔ ان لوگوں سے مسلمانوں کے دوستانہ تعلقات تھے جیسا کہ جہنی سردار مجدی بن عمرو کے بارے میں مآخذ نے صراحت سے کہا ہے اور جس طرح کہ قریشی کارواں اور مسلم جماعت کے درمیان اس کے مصالحانہ رویے سے مضمر طور سے معلوم ہوتا ہے۔ دوسری مہم جس علاقے میں گئی تھی۔ وہ بنو خزاعہ اور بنو ضمرہ کا تھا۔ ان دونوں بدوی قبیلوں سے مسلمانوں کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے اور ان سے معاہدوں کا کیا جانا یا اس کے سلسلے میں گفت وشنید کرنا اسی زمانے

میں ہوتا نظر آتا ہے۔ تیسری مہم سریہ خرار بھی بنو ضمرہ کے علاقے میں گئی تھی۔ اور یعقوبی نے تصریح کی ہے کہ مسلمانوں کا ان لوگوں سے بھی دوستی کا معاہدہ تھا چوتھی مہم میں ماخذ کا واضح بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس بنو ضمرہ سے ایک معاہدہ ان کے سردار مخشی بن عمرو ضمری کے ذریعہ کیا تھا۔ اس سلسلہ میں کیا یہ محض اتفاق تھا یا ایک منصوبہ بند پالیسی کہ موخر الذکر تین مہمیں یکے بعد دیگرے بنو ضمرہ کے علاقے میں پہنچی تھیں؛ پہلی دو مہموں کے سیاق میں ماخذ نے مبہم انداز سے صرف دوستی اور معاہدہ کا ذکر کیا ہے جبکہ تیسری مہم میں ایک معاہدہ، صلح طے پا جانے کی بات بصراحت کہی گئی ہے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ بنو ضمرہ کے علاقے میں جانے والی پہلی دو مہموں میں زمین ہموار کی گئی تھی۔ اور تیسری مہم میں ان سے باقاعدہ معاہدہ عمل میں آیا۔ پانچویں ابتدائی مہم علاقہ بنو جہینہ میں گئی تھی۔ غالباً پہلی ابتدائی مہم اور اس مہم کا مقصد ایک تھا یعنی قبیلہ جہینہ سے تعلقات دوستی استوار کرنا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ قبیلہ جہینہ اور مزینہ اسلامی امت کے اولیں ارکان میں تھے لیکن ان سے مسلمانان مدینہ کے تعلقات قائم ہونے کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا لیکن یہ حقیقت تھی اور مسلم حقیقت تھی اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قبیلے سے انہیں مہموں کے دوران دوستی کے تعلقات قائم ہوئے ہوں گے۔ اسی طرح اس نوع کی چھٹی مہم میں ماخذ کا واضح بیان ہے کہ آپ نے ذو العشیرہ کے بنو مدلج اور ان کے پڑوسی بنو ضمرہ جو ان کے حلیف بھی تھے، سے معاہدہ صلح کیا تھا جہاں تک ساتویں اور آٹھویں مہموں کا تعلق ہے ان کی نوعیت قطعی جداگانہ تھی، ایک تادیبی کارروائی تھی اور ایک غارت گر کے تعاقب میں بھیجی گئی تھی اور دوسری خبر گیری اور اطلاعات کی فراہمی کی مہم تھی۔ اگرچہ نویں مہم کے بارے میں بغدادی نے تصریح نہیں کی ہے کہ اس کا مقصد کیا تھا۔ تاہم اندازہ یہی ہوتا ہے کہ بنو ع کے لوگوں سے دوستی اور معاہدہ مقصود ہوگا جس طرح کہ دسویں مہم میں غفار و اسلم سے ہوا تھا۔

ماخذ کے بیانات میں بلاشبہ یہ افتتاحی کلمہ ملتا ہے کہ آپ یا آپ کی بھیجی ہوئی مہم قریش یا قریش کے کارواں یا کاروانوں کے ارادے سے نکلی لیکن ان بیانوں میں استقامت و یکسانیت نہیں ہے۔ کہیں قریش کے ساتھ بعض بدوی قبیلوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اور کہیں آپ کے یا مہم کے محرک و مقصد کا بیان نہیں ہے۔ صرف درمیان کلام میں قریش کا یا قریشی کارواں کا ذکر ملتا ہے۔ اور کہیں قریشی کارواں یا قریش کا ذکر شروع میں تو آ گیا ہے لیکن پھر بعد میں ان کا کوئی حوالہ ہے اور نہ ذکر اس کے علاوہ ماخذ کے بیانات اس ضمن میں ایک دوسرے سے اگر متصادم نہیں ہیں تو مختلف ضرور ہیں پہلی مہم سریہ العیص کے بارے میں ابن اسحاق اور ان کے جامع واقدی اور ان کے شاگرد بلاذری، یعقوبی اور ابن اثیر نے کسی محرک کا ذکر نہیں کیا ہے اور جہاں قریشی کارواں کا ذکر ہے وہاں یہ کہا گیا ہے کہ یہ مہم جب اپنی منزل مقصود پر پہنچی تو اس کی نشاندہی کر دی گئی تھی کہ قریشی کارواں سے سامنا ہو گیا۔ صرف طبری ایسے مورخ ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ مہم اس لئے ترتیب دی گئی تھی کہ قریشی کاروانوں کے سامنے ہوا جائے (لیعترض لعیرات قریش)، دوسری مہم کے بارے میں کسی مورخ نے بھی دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ قریش یا قریشی کارواں کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ قریشی کارواں سے اس کا سامنا پہلی مہم کی طرح اتفاقاً ہو گیا تھا۔ اس مہم کے سلسلے میں اس کے ایک شریک حضرت سعد بن ابی وقاص کا یہ بیان کہ قریشی کارواں پر چھاپہ مارنے کی ان کی تجویز سے کسی نے اتفاق نہیں کیا تھا۔ بڑا اہم ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ بنیادی طور پر اس کا مقصد چھاپہ مارنا ہرگز نہ تھا۔ تیسری مہم کے سلسلے میں ماخذ کو دو طبقوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک طبقہ جس میں ابن اسحاق، ابن ہشام، یعقوبی شامل ہیں کسی قریشی کارواں کا ذکر کرتا ہے۔ نہ قریش کا حوالہ دیتا ہے جبکہ واقدی او

ان کے دو بین متبعین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد کو خرار اس لیے بھیجا تھا کہ وہاں سے ایک قریشی کارواں گزرنے والا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب کیوں کر لے لیا جائے کہ اس سے مراد چھاپہ مارنا تھا۔ اس کا مقصد ان کے بارے میں خبریں فراہم کرنا بھی تو ہو سکتا تھا۔ غزوہ ابوا یا ودان کے بارے میں تین نقطہ ہائے نظر ملتے ہیں۔ ابن اسحاق اور ان کے متبعین کا خیال ہے کہ آپ قریش اور بنو ضمرہ بن بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ کے ارادے سے نکلے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ارادہ کیا ہے۔ کیا دونوں کے بارے میں ایک ارادہ تھا یا الگ الگ البتہ واقدی اور ان کے دو پیروکاروں کا بیان ہے کہ قریشی کارواں کا سامنا کرنے کے لئے نکلے تھے تیسرا نقطۂ نظر یعقوبی کا ہے اور وہ مکمل سکوت ہے۔ دوسرے غزوۂ بواط کے بارے میں ابن اسحاق اور ان کے جامع کا بیان ہے کہ آپ کا مقصود قریشی تھے جبکہ واقدی اور ان کے متبعین نے مقصود کاروانِ قریش کو روکنا بتایا ہے۔ یعقوبی پھر خاموش ہیں اس نوع کی آخری مہم کے بارے میں ابن اسحاق کے مکتبِ فکر کا خیال ہے کہ آپ قریش کے ارادے سے اور واقدی کے مکتبِ فکر کے مطابق کاروانِ قریش پر چھاپہ مارنے کے لئے نکلے تھے سریہ نخلہ کے بارے میں کسی بھی مورخ نے اپنا تبصرہ نہیں کیا ہے کہ اس کا محرک کیا تھا۔ ان دونوں کاتبِ فکر کے مطابق قریش یا قریش کے کاروان کی نگرانی اور خبرگیری کرنا تھا۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ ان مہموں میں سے بواط اور ذوالعشیرہ کے بارے میں واقدی اور ابن سعد نے کھل کر کہا کہ ان کا مقصد مکہ کے کاروانوں کو روکنا تھا۔ لیکن کسی اور سریہ یا غزوہ کے بارے میں ایسا واضح بیان نہیں ہے۔ مآخذ میں اس کے لیے جو افعال استعمال ہوئے ہیں وہ بڑے دلچسپ ہیں اور ان میں کسی کے معنی لوٹنے، چھاپہ مارنے کے نہیں ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ان کے معنی لوٹ مار کے کیونکر لیے گئے ہیں۔[196] اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مآخذ کی داخلی شہادتوں سے بھی ان مہموں کا مقصد لوٹ مار، مالِ غنیمت حاصل کرنا یا قریش کو اشتعال دلانا اور ان کی تجارت کے لیے خطرہ پیدا کرنا ثابت نہیں ہوتا۔

اس سے ایک اہم نکتہ ابھرتا ہے اور وہ ہے مختلف منازل کا۔ بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ ان مہموں کا مقصد قریشی کاروانوں پر تاخت تھی تو مہموں کو شاہراہ تجارت یا قریشی کاروانوں کی گذرگاہ کے مختلف منازل پر بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ مہمیں مدینہ سے جن مختلف منازل کی جانب بھیجی گئی تھیں ان کی مسافت شہرِ رسول سے تیس[30] اور سو میل کے درمیان تھی۔ یہ نکتہ حسبِ ذیل نقشے سے اور زیادہ واضح ہو جائے گا۔

مہم	منزل	مدینہ سے فاصلہ
سریہ حمزہ	العیص / سیف البحر	تقریباً ۳۰ میل
سریہ عبیدہ	رابغ	〃 ۶۰ میل
سریہ سعد	خرار	〃 ۱۰۰ میل
غزوہ ودان	ابواء / ودان	〃 ۸۰ میل
غزوہ بواط	بواط	〃 ۲۰ میل
ذوالعشیرہ	ذوالعشیرہ	〃 ۹۰ میل
ینبع	ینبع	
سفوان	سفوان	

اس نقشہ میں سریہ نخلہ اور پہلے غزوہ سفوان کی مسافت نہیں دکھائی گئی ہے کیونکہ ان کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ لیکن اگر سریہ نخلہ

کو بھی شامل کر لیا جائے جیسا کہ جدید تاریخ دانوں کا اصرار ہے کہ اس کی منزل مدینہ سے چار سو کلو میٹر کے قریب تھی۔[187] اور اس سے ہماری دلیل کو اور تقویت ملتی ہے عام تاثر بلکہ یقین یہ ہے کہ مذکورہ بالا پہلی چھ مہمیں اس بین الاقوامی شاہراہ تجارت پر گزرنے والے قریشی کاروانوں کو لوٹنے کے لیے گئی تھیں جو یمن سے شام کو براہ مدینہ جاتا تھا۔ کیا یہ سب مختلف منازل مہمات نبوی سچ مچ اسی شاہراہ کارواں پر واقع تھیں؟ جدید محققین کا جواب اثبات میں ہے لیکن یہ جواب مآخذ کے واضح بیانات کے خلاف ہے۔ خوش قسمتی سے بعض مہموں کے سلسلے میں مسلم جماعت کے راستے اور قریشی کاروانوں کی گزرگاہ کے بارے میں بعض ایسے اشارے ملتے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ بعض مواقع پر دونوں کے راستے الگ الگ تھے۔ یا کم از کم مسلم مہم کی منزل قریشی کاروانوں کے راستے سے ہٹ کر تھی۔ دوسری ابتدائی مہم کے سلسلے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگر قریشی کارواں نے ابن سعد کے بیان کے مطابق اپنا راستہ چھوڑ کر جانوروں کی وادی میں چرانے کے لیے قیام نہ کیا ہوتا تو مسلمانوں سے اس کا سامنا ہوا ہوتا۔ تمام مآخذ کا اس پر اتفاق ہے کہ مسلم مہم کی منزل ثنیۃ المرۃ کا ایک چشمہ تھا جو قرائن کے مطابق اس عام شاہراہ تجارت سے پرے تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں نے شاہراہِ تجارت سے ہٹ کر سفر کیا تھا اور وہ اندرون وادی سفر کرتے رہے تھے خرار کے بارے میں اگرچہ مآخذ کی تصریح نہیں ملتی کہ وہ کارواں کے راستے پر تھا کہ نہیں لیکن اس مہم کے سیاق و سباق سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اندرون وادی تھا اور راستے سے کچھ دور تھا۔ اس کی مزید تائید اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ رسول کریم نے اپنے سفرِ ہجرت کے دوران جو راستہ اختیار کیا تھا۔ اس پر خرار پڑا تھا۔[188] جہاں تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے غزوہ کا تعلق ہے تو ابواء یقیناً مکی کارواں کے راستے پر واقع تھا۔ لیکن ودان راستے سے چھ میل اندر کی جانب تھا۔ یہ دلچسپ حقیقت یاد رکھنے کی ہے کہ زیادہ تر مآخذ اس کو غزوہ ودان ہی کہتے ہیں اور یہ بھی اہم نکتہ ہے کہ کسی نے بھی کسی کارواں کے گزرنے نہ گزرنے، اس کی آمد و رفت کی منازل، تعداد و قیادت وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے جو بالواسطہ اس امر کی تائید کرتا ہے کہ آپ کی منزل قریشی کارواں کے راستے پر نہ تھی۔ اس طرح باقی دونوں غزووں کی منازل بواط اور ذو العشیرہ شاہراہ تجارت سے ہٹ کر واقع ہوئی تھیں

اسی ذیل میں ایک اہم تر نکتہ یہ ہے کہ فوجی حکمت عملی کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ اگر چھاپا مارنا ہو تو گزرگاہ یا راستے کے قریب چھپ کر گھات لگانی چاہیے اور بہتر طریقہ ہوتا کہ کسی ایک مقام کو خاص کر منتخب کر لینا چاہیے تھا تاکہ کارواں بچ کر نہ نکلنے پائے اسلامی تاریخ میں اس کی ایک دلچسپ مثال خود عہد نبوی ہی سے ملتی ہے صلح حدیبیہ کے بعد حضرت ابو بصیر اور اس کے ساتھیوں نے العیص میں قیام کر کے قریشی کاروانوں کی زندگی عذاب کر دی تھی اور انہوں نے مختصر سی مدت میں کسی کارواں کو وہاں سے گزرنے نہ دیا تھا۔[189] کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کے بارے میں ایک مغربی مورخ واٹ کی تحقیق ہے کہ ابو بصیر کا العیص میں قیام اور قریشی کاروانوں پر تاخت کرنا آپ کی مرضی یا مضمر اجازت سے تھا۔[190] بذاتِ خود وہاں کسی دستے کو مستقل طور سے متعین نہیں کر سکتے تھے؟ یہ نکتہ اس حقیقت کی روشنی میں مزید اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ اسلام کے پہلے سریہ کی منزل العیص ہی تھی اور وہاں ایک کارواں سے اتفاقاً مسلمانوں کی مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔ غالباً یہ نقطہ سفر تھا جہاں سے کاروانِ قریش کا گزرنا ناگزیر تھا۔ جیسا کہ ابو بصیر کے واقعہ سے ثابت ہوتا ہے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خاص کر اس ذات کے بارے میں جس نے اپنی تمام جنگوں اور مہموں میں بہترین حکمت عملی کا شاندار مظاہرہ کیا تھا کہ وہ کاروانوں کی تاخت کے مسئلہ پر ایسی فوجی بے تدبیری کا مظاہرہ کرے گی کہ مسلسل اپنی فوجی گھات کے علاقوں اور منزلوں کو بدلتا رہے اور اس طرح کاروانوں کے ہاتھ سے نکل جانے کا احتمال پیدا کرے

ایک اہم حقیقت جو جدید مؤرخین کی نظر سے اب تک اوجھل رہی ہے وہ ابتدائی مہموں کے دوران مسلم جماعت کی اپنے علاقے یا منزل پر قیام کی مدت ہے - بغدادی کے مطابق سریہ عبیدہ اور سریہ حمزہ میں بالترتیب تقریباً ایک ماہ پندرہ دن لگے تھے - سریہ خرار کے بارے میں مدت قیام کا علم نہیں ہوتا ہے البتہ غزوۂ ابوا یا ودان میں واقدی کے بقول پندرہ دن اور بغدادی کے مطابق قریب ایک ماہ کی مدت لگی تھی - غزوہ بواط میں تقریباً سترہ دن لگے تھے اور واقدی کے مطابق یہ مدت ایک ماہ کی تھی - غزوۂ ذوالعشیرہ کے بارے میں بغدادی کا حتمی فیصلہ ہے کہ ایک ماہ بائیس دن لگے تھے - جبکہ دوسرے مآخذ سے ڈیڑھ دو ماہ کی مدت معلوم ہوتی ہے سریہ نخلہ میں بغدادی کا حتمی فیصلہ ہے کہ ایک ماہ بائیس دن لگے تھے - جبکہ دوسرے مآخذ سے ڈیڑھ دو ماہ کی مدت معلوم ہوتی ہے - سریہ نخلہ میں بغدادی کے مطابق کل دس بارہ دن لگے تھے - جبکہ ینبوع کے غزوہ کے بارے میں وہ تاریخ روانگی کا ذکر تو کرتا ہے مگر تاریخ واپسی کا کوئی حوالہ نہیں دیتا ہے غالباً ہفتہ عشرہ سے زیادہ مدت نہیں لگی ہوگی کیونکہ اسی کے مطابق وسط شعبان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا آخری ابتدائی غزوہ لے کر سفوان گئے تھے - بدقسمتی سے اس غزوہ کی مدت کا ذکر نہیں ملتا ہے بہرحال مدینہ سے مسلم مہمات کی مختلف منزلوں کے فاصلے کو مدنظر رکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ تیس اور ستر میل کے درمیان ان تمام منازل کا سفر دو سے چھ سات دن کے اندر کیا جا سکتا تھا اور واپسی ہی میں اتنی مدت لگتی - دو چار دن سفر کی تکان دور کرنے کے لیے منزل پر قیام کے لیے درکار ہوتے اس لحاظ سے حضرت حمزہ کو ہفتہ عشرہ اور حضرت عبیدہ کو دس پندرہ دن کافی تھے - رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دوسرے غزوہ میں صرف پانچ چھ دن اور باقی میں دس پندرہ دن سے زیادہ درکار نہ تھے - ۱۹۱ خاص کر غزوہ ذوالعشیرہ میں آپ کا قیام کافی طویل تھا - ظاہر ہے کہ اتنی مدت تک آپ کا قیام مبینہ قریشی کارواں کے انتظار میں نہیں تھا -

واقدی نے بنو جذام کے جس مخبر کی روایت بیان کی ہے وہ اس کے غلط اندازے پر مبنی تھی - ورنہ یہ بڑی حیرت کی بات ہوگی کہ آپ قریشی کارواں کے ایک دو دن پہلے گزرنے کے بعد ذوالعشیرہ پہونچے اور پھر ڈیڑھ ماہ تک وہاں ٹھہرے رہے اس کے انتظار میں - اور جب اس کے شام سے لوٹنے کا وقت قریب آیا تو واپس مدینہ آ گئے اور پھر وہاں سے ایک نیا لشکر لے کر اس کارواں کو روکنے کے لئے بدر پہونچے اور بالآخر وہ اسی آمد و رفت کے چکر اور حیص بیص کے نتیجہ میں نکل گیا - اگر وہی کارواں قریشی مراد تھا تو بہتر حکمت عملی یہ ہوتی کہ جہاں اتنی مدت قیام کیا تھا - تھوڑا اور رک لیتے اور اگر کمک کی ضرورت تھی تو چند ہرکارے یا ایک مختصر دستہ مدینہ بھیج کر طلب فرما لیتے بہرحال مختلف مہموں میں منازل پر قیام کی مدت سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ مطمح نظر کم از کم قریشی کارواں نہ تھے

اسی فوجی حکمت عملی سے وابستہ ایک اور پہلو جاسوسی کے نظام کا ہے - ۱۹۲ جدید مورخین کا اصرار ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریشی کاروانوں کے شاہراہ تجارت پر مدینہ کے قریب سے گزرنے کا علم مسلم جاسوسوں کے ذریعہ ہوتا تھا اسی کے ساتھ اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ مسلم، جاسوس قریشی کاروانوں کے گزرنے کا صحیح وقت و تاریخ معلوم کرنے میں ناکام رہتے تھے - اسی لئے آپ کسی موقع پر تاخت کرنے میں کامیاب نہیں رہے دوسری طرف ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس کے برخلاف مکی جاسوسی نظام بہت طاقتور اور مستعد تھا اور وہ مسلمانوں کے منصوبوں سے قبل از وقت یا بروقت واقف ہو جاتا تھا - اس لئے وہ مسلم فوج یا مہم کے چنگل سے اپنے آپ کو بچا لے جاتا تھا - (۱۹۳) ایک مورخ واٹ نے اپنی ان دلیلوں کی کاٹ خود نخلہ کی مہم کے سلسلے میں کر دی ہے کہ آپ کو وہاں سے گزرنے والے کارواں کی تاریخ گذر کا اتنا حتمی علم تھا کہ مدینہ کا فوجی دستہ تین چار سو کلو میٹر کا سفر کر کے کارواں کو لوٹنے میں کامیاب رہا - کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ اتنی دور تو

مسلم جاسوسوں کی اطلاع صحیح نکلی لیکن اپنے گھر کے پچھواڑے کی صحیح خبر معلوم کرنے میں وہ ناکام رہے اور اس سے زیادہ حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے زیر اثر و اقتدار علاقے میں ایک دو بار نہیں پورے چھ سات بار ناکام رہے تھے۔ اس دعوے کو بعض دوسرے حقائق کی روشنی میں دیکھنے سے جدید مؤرخین کی دلیلوں کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ بدر سے پہلے جس عظیم قریشی کاروان کو آپ نے پہلی بار شام سے واپسی پر روکنا چاہا تھا اس کے بارے میں آپ کی معلومات اتنی پکی تھیں کہ آپ نے ان دونوں مسلم جاسوسوں کی واپسی کا بھی انتظار نہ کیا تھا۔ جن کو آپ نے قریشی کاروان کے بارے میں تازہ خبریں معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا اور آپ شاہراہِ تجارت کی طرف نکل کھڑے ہوئے تھے اور عین اس مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں سے وہ کاروان بچ بچ گزرنے والا تھا۔ مگر وہ اپنے زیرک امیرِ کاروان کی دوراندیشی اور فوجی حکمتِ عملی کے سبب بچ نکلا تھا۔[194] بدر اور حدیبیہ کے دوران جب مکہ و مدینہ ایک دوسرے سے باقاعدہ جنگ پر تھے مسلم فوج نے کسی قریشی کاروان کو بچ کر نکلنے نہیں دیا تھا۔ اس مدت میں حضرت زید بن حارثہؓ نے دو قریشی کاروانوں پر نومبر ۶۲۴ء[195] اور ستمبر اکتوبر ۶۲۷ء[190] میں کامیاب چھاپے مارے تھے۔ بس یہی دو کاروان اس دوران گزرے تھے جو مسلمانوں سے بچ کر نہ جا سکے یعنی نہ تو مسلم جاسوسوں نے ناکامی کا منہ دیکھا تھا نہ فوجی غارت گر دستوں اور مہموں نے اور نہ ہی مسلم فوجی حکمت عملی نے منہ کی کھائی تھی۔ اس دوران مسلم فوجی حکمت عملی کی وجہ سے مکی تجارت ختم ہو گئی تھی اور مفرور مکی تاجر بھوکوں مرنے لگے تھے۔ غالباً صلح حدیبیہ پر ان کو مجبور کرنے کا سب سے بڑا سبب بھی اقتصادی صدمہ تھا کیوں کہ اس کے بعد ان کی تجارت کو نئی زندگی ملی تھی اور جب ابوبصیر اور ان کے ستر ساتھیوں نے ان کی تجارت کو پھر تہس نہس کر دیا تو وہ صلح حدیبیہ کی اس شق کو بھی ختم کرنے پر نہ صرف آمادہ بلکہ متدعی ہوئے تھے جو مسلمانان مدینہ و مکہ کو سخت ناگوار تھی اور اس طرح انہوں نے اپنی گرتی ہوئی اقتصادی زندگی کو سنبھالا دینے کی کوشش کی تھی۔

اس بحث سے ایک اہم حقیقت یہ اجاگر ہوتی ہے کہ قریش کہ کیا مدینہ کے مسلمانوں سے مخاصمت کی پالیسی اپنا کر اقتصادی طور سے زندہ رہ سکتے تھے؟ جواب نفی میں ملتا ہے اس کی کئی دلیلیں اور ثبوت ہیں اوّل تو مکی تجارتِ شام جس پر ان کی اقتصادیات کا دارومدار تھا کے بارے میں قریش کا شدید احساس بلکہ حساسیت تھی وہ اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے۔ کہ ان کی اقتصادیات کی زندگی اور ان کی اپنی مادی خوشحالی کا انحصار شاہراہ تجارت کے ارد گرد بسے ہوئے تمام بدوی قبائل کی دوستی اور تعاون پر ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس پورے علاقے کے تمام عربوں سے حلف اور دوستی کے معاہدے کر رکھے تھے۔[197] یہ عین ممکن ہے کہ ان بدوی قبائل کو قریش سے دوستی کرنے پر ان کی مذہبی، سماجی اور فوجی بالادستی نے بھی مجبور کر دیا ہو لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالباً ان بدوؤں کو قریشی کاروانوں کے گزرنے سے مادی فوائد حاصل ہوتے ہوں گے بعض جدید مغربی مورخین کو اعتراف ہے کہ تاجر عرب قبیلے بدوی قبائل کو اپنے تجارتی کاروانوں کی بسلامت روی اور بحفاظت گزران کے لیے کچھ معاوضہ دیتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ قریش نے ایسا کوئی محصول دینا کسرِ شان اور اپنے مقام سے فروتر سمجھا ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ علاقے کے بدوی قبائل کو خوش رکھنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ اور حتی الامکان ان کی مادی ضروریات کی تسکین کی کوشش کرتے تھے تاکہ ان کی مدد و تعاون حاصل رہے اس سلسلہ میں ماخذ کا بیان کردہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ کس طرح غزوۂ بدر کے موقع پر بدر کے کنویں کے قریب دو باندیاں آپس میں ایک معمولی رقم کے قرض کے معاملے میں دست بگریباں تھیں اور کس طرح قرضدار اپنی قرض خواہ سہیلی کو تسلی دے رہی تھی کہ قریشی کاروان کے آنے پر وہ اس کا قرض چکا دے گی۔[189]

اس کے سوا یہ حقیقت بھی مآخذ سے بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ قریشی تاجران مکہ اپنی شاہراہ تجارت پر بسے ہوئے بدوی قبائل سے نہ صرف مخالفت و مخاصمت مول لینے سے گریزاں رہتے تھے بلکہ اس کے لئے کوشاں رہتے تھے کہ ان کو کسی طرح سے ناراض نہ ہونے دیں۔ اس سلسلے میں دو مثالیں کافی ہوں گی۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے اسلام کے ابتدائی مکی عہد میں جب اپنے قبول اسلام کا برملا اعلان حرم مکہ میں کیا تو قریش کی دینی و سیاسی حمیت اس کو برداشت نہ کر سکی اور انہوں نے صحابی موصوف کو زد و کوب کرنا شروع کر دیا حضرت عباسؓ بن عبد المطلب جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، نے اُن کو روکا اور کہا "تم لوگ تاجر ہو اور تمہاری تجارت کا راستہ بنو غفار کے راستے سے گزرتا ہے کیا تم اپنی تجارت کو ختم کرنا چاہتے ہو؟" حضرت عباس کے اس سادہ سے سوال نے بجلی کا کام کیا اور مارنے والے ہاتھ رک گئے اور نہ صرف رُکے رہے بلکہ پھر کبھی ان پر اُٹھ نہ سکے حالانکہ وہ پہلے سے زیادہ اشتعال انگیز اعلان اسلام کیا کرتے تھے۔[199] دوسرے واقعہ کا تعلق ہجرت کے بعد اور غزوۂ بدر سے پہلے زمانے سے ہے۔ واقدی اور بخاری کی روایت ہے کہ اس زمانے میں حضرت سعد بن معاذ اوسی عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ گئے اور وہاں اپنے عزیز و قدیم دوست امیہ بن خلف جمحی کے گھر مقیم ہوئے ایک دن عمرہ کرتے ہوئے ان کا سامنا ابوجہل سے ہو گیا اس نے حضرت سعد کو دیکھتے ہی کہا "تم لوگوں نے صابیوں (مسلمانوں) کو اپنے یہاں پناہ دے رکھی ہے اس لئے تم لوگوں کو زیارت کعبہ کی اجازت نہیں دی جائے گی اگر تم اُمیہ کے ساتھ نہ ہوتے تو آج ہی بچ کر نہ جا پاتے۔" حضرت سعد نے جواب دیا تھا "کہ اگر تم ہمیں حج و عمرہ کی ادائیگی سے روکو گے تو ہم تمہاری تجارت کا راستہ کاٹ دیں گے"[200] ظاہر ہے کہ اس جواب نے قریش کے مغرور ترین اور بدترین اسلام دشمن کو بھی ان مشکلات و دقتوں کا احساس دلا دیا تھا۔ جو مدینہ کے مسلمانوں سے مخاصمت و جنگ کی صورت میں ان کی تجارت کو لاحق ہو سکتی تھیں اور جو درحقیقت بدر اور حدیبیہ کے دوران اس کو لاحق بھی رہیں جیسا کہ حضرت زید بن حارثہ کی مہمیں[201] اور حضرت ابوبصیر کی کامیاب تاختیں ثابت کرتی ہیں۔ اس لیے مدینہ سے مکیوں کی دشمنی انھیں کو زیادہ مہنگی پڑتی اور اسی لئے وہ کسی قسم کی مسلح مخاصمت و کھلی جنگ سے پہلو تہی کرتے تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مکی مدینہ مخالف یا جنگی پالیسی اختیار کرنے سے گریزاں تھے تو انہوں نے ابوسفیان کے زیر قیادت بدر سے پہلے شام سے واپس ہونے والے قافلے کی اجازت کے لیے فوجی کارروائی کیوں کی تھی؟ اور قریشی کارواں کے بچ جانے پر مدینہ سے چھیڑ کر جنگ کیوں مول لی تھی؟ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنے تجارتی قافلے کی حفاظت کے لیے آئے تھے اس کے ثبوت تو متعدد ہیں مگر یہاں دو کافی ہوں گے۔

مآخذ کا بیان ہے کہ جوں ہی مکیوں کو ممکنہ مسلم حملے کی خبر ملی تو ان میں شدید رَدِّ عمل ہوا اور انہوں نے قسم کھائی کہ وہ مسلمانوں کو کارواں نخلہ کی کہانی دہرانے نہ دیں گے۔[202] اور پھر یہ کہ مقتدر و ذی اثر مکی نے اپنی اقتصادیات کو بچانے کے لیے یا تو خود بھرپور حصہ لیا تھا یا اپنی جگہ کسی دوسرے کو بھیجا تھا۔[203]

مآخذ کی کسی روایت سے ثابت نہیں ہوتا کہ وہ مکہ سے جنگ کی غرض سے نکلے تھے۔ اولین مقصد کارواں کی حفاظت تھی۔ لیکن وہ ہر قسم کی تیاریوں کے ساتھ ہر قسم کے حالات کے لئے مستعد ہو کر آئے تھے۔ دوسرے یہ کہ قریشی کارواں کے بچ جانے کے بعد مکی قائد ابوسفیان نے ان کو واپسی کا حکم بھیجا تھا کیونکہ مکی فوج کا مقصد — کارواں کا بہ حفاظت نکال لے جانا۔ حاصل ہو چکا تھا لیکن[204]

جذبات اور خیالات کا اظہار قریشی فوج کے اکثر سربرآوردہ سرداروں نے کیا تھا اور بعض قبیلے[205] /خاندان تو پورے کے پورے اور کچھ افراد اسی سبب سے واپس بھی چلے گئے تھے۔[206] جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے تو اس کا جواب میں ماخذ سے ثبوت ملتا ہے کہ قریش کے کاروان کے بچ نکلنے کے بعد بدر تک اقدام کرنا اور وہاں قیام کرنا جنگ کی خاطر نہ تھا بلکہ قبائل عرب کے لئے عموماً اور مسلمانان مدینہ کے لیے خصوصاً طاقت کا مظاہرہ تھا جیسا کہ ابوجہل کی تقریر و اصرار سے ظاہر ہوتا ہے اور جو واقعتاً صحیح بھی تھا لیکن[207] بدر میں مسلم فوج کی موجودگی نے مسلم دشمن طبقے کو موقعہ سے فائدہ اٹھانے پر اکسایا۔ کیونکہ اس طرح ان کا خیال تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے مسلم خطرہ کو مٹا دیں گے۔[208] معتدل طبقۂ قریش اس موقعہ پر بھی سماجی و قبائلی اسباب کے علاوہ اقتصادی پہلوؤں سے جنگ سے گریزاں تھا۔ لیکن حامیٔ جنگ طبقہ یقینی فتح دیکھ کر پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ اپنی عددی قوت بہتر سامان جنگ، جنگ کے طویل تجربے وغیرہ پر ان کو غرور تھا اور یقین تھا کہ فتح ان ہی کی ہوگی۔[209] اگر ان کو ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ شکست کا بھی امکان ہے تو وہ یقیناً جنگ سے ہاتھ روک لیتے۔ لیکن ان کے اندازے غلط نکلے اور انہوں نے اپنی شامی تجارت کو خطرات میں ڈال لیا جو اب تک اس کو درپیش نہ تھے اور اگر تھے تو خطرات کے بادل بکھر چکے تھے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور اہم نکتے پر بحث کی جائے جدید مغربی مورخین کا خیال ہے کہ ابتدائی مسلم مہموں کی قریشی تجارت پر چھاپہ مار کارروائیوں کی وجہ سے قریش مکہ اپنی تجارت کی سلامتی کی طرف سے متفکر و متردد تھے اور دراصل یہ مسلم مہمیں مکہ والوں کے لیے شدید اشتعال انگیز کارروائیاں تھیں کیا ماخذ سے قریشی تجارت کو ان مہمات سے پیچ پیچ خطرات درپیش ہونا ثابت ہوتا ہے اور کیا قریشیوں کو ان خطرات کا واقعہ نخلہ تک بلکہ اس کے بعد قریشی کاروان کے شام سے واپسی تک کا احساس ہوا تھا اور کیا وہ ان مسلم مہموں کو انہیں نظروں سے دیکھتے تھے۔ جن نظروں سے جدید مغربی مورخین اور ہمارے بعض مسلم سیرت نگار دیکھتے ہیں؟ اس سلسلے میں کئی نکات پر غور کرنا ضروری ہے۔

اول نکتہ مکیوں کے جاسوسی نظام سے متعلق ہے جدید مورخین کا دعویٰ ہے کہ چھ سات مواقع پر متعدد چالاک مکی جاسوسوں کی چوکس نظر و خبر پر وہ اپنے کاروانوں کو بچا لے جانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ماخذ میں مکی جاسوسوں اور ان کی کارگزاری کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ اس کے برخلاف عظیم قریشی کارواں کو مکہ سے شام تک جاتے ہوئے ابن سعد اور ان کے استاد کے دعوے کے مطابق مسلم اقدام "تاخت کی خبر کیا سن گن" تک نہ ملی تھی۔ بلکہ جب پہلی بار ان کو واقدی کے بقول حدود شام میں واپسی پر ایسی کسی صورت حال کے امکان کا علم ہوا تھا تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور کارواں والوں نے اعتراف کیا تھا ان کو مسلم ارادوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم[210] قریش کے عظیم ترین کارواں کے بارے میں مکی جاسوسوں کی یہ کارگزاری اور مستعدی تھی اس سے باقی کاروانوں کے بارے میں ان کی مستعدی اور کارگزاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بدر سے پہلے تک ان کو مسلم تاخت و غارت گری کے ارادوں کا قطعی کوئی علم نہ تھا اور نہ کوئی احساس ہی۔ اگر مکی تجارت کو مسلم مہموں سے کوئی واقعی خطرہ تاجران قریش کو محسوس ہوا تھا تو ان کی بکثرت آمد و رفت پر تھوڑی بہت پابندی تو لگنی فطری تھی یا کم از کم اسی پیمانے پر ان کی آمد و رفت نہیں ہو سکتی تھی جیسی کہ خطرے کے احساس سے پہلے ہو رہی تھی۔ ابتدائی مہموں کے سلسلے میں ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ مارچ ۶۲۳ء اور جنوری ۶۲۴ء کی دس

ماہ مدت کے دوران قریش نے چھ کارواں بھیجے تھے مگر مدینہ سے جنگ مول لے لینے کے بعد نومبر ۶۲۴ء اور ستمبر، اکتوبر ۶۲۷ء کی تین سال کی مدت میں وہ صرف دو کارواں مغربی و مشرقی شاہراہ تجارت پر بھیج سکے تھے اس تقابل سے واضح ہوتا ہے کہ جنگ نے کس طرح مکی اقتصادیات کو متاثر کیا تھا اور کس طرح ان کے کاروانوں کی تیز رفتار آمد و رفت پر پابندی لگی تھی۔ ہجرت اور بدر کے درمیان اتنی زیادہ تعداد میں مکی کاروانوں کا شام جانا یوں بھی مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ مآخذ نے ابتدائی مہموں کے بارے میں اگرچہ تاثر یہی دیا ہے کہ مسلمانوں نے ہر موقعہ پر کسی نہ کسی کاروان مکہ کو نشانہ بنایا تھا۔ یا بنانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن یہ حیرت کی بات ہے کہ شامی تجارت کی شاہراہ پر سفر کرنے والے کاروانوں میں سے صرف تین کا واضح انداز میں ذکر ملتا ہے۔ ایک سریہ حمزہ کے دوران دوسرا سریہ عبیدہ کے موقعہ پر اور تیسرا غزوہ بواط میں ان میں سے بھی پہلے دو کاروانوں کا مسلم مہم والوں سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ باقی کسی کا نہیں اس سے زیادہ حیرت انگیز معاملہ یہ ہے کہ اس پورے زمانے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مڈبھیڑ کسی کارواں سے تینوں مہموں میں نہ ہو سکی غزوۂ مذکورہ بالا میں جس قریشی کاروان کا ذکر ہے وہ بھی آپ کی منزل پر آمد سے قبل نکل چکا تھا۔ بہرحال ان تین قریشی کاروانوں کے بارے میں مکمل تفصیلات ملتی ہیں کہ وہ کہاں سے آرہے تھے کہاں جارہے تھے۔ اس میں کتنے لوگ تھے اور ان کے قائد کون تھے؟ غزوۂ بواط کے کاروان قریش کے بارے میں سامانِ تجارت کا بھی ذکر یا حوالہ ملتا ہے بہرحال یہ تفصیلات اعتماد پیدا کرتی ہیں۔ کہ یہ مکی کارواں حقیقتاً اسی زمانے میں گزرے تھے۔ اگرچہ غزوۂ بواط میں کوہ قریشی کارواں کا معاملہ بھی خاصا مشتبہ ہے۔ باقی تین مواقع سریہ خرار اور غزوات ودان وذوالعشیرہ کے بارے میں قریشی کاروانوں کا ذکر بڑے مبہم انداز میں کیا گیا ہے۔ ان میں کسی قسم کی کوئی واضح خبر نہیں ملتی ہے اس سے شبہ کو تقویت ملتی ہے کہ یہ کارواں دراصل کبھی گزرے ہی نہ تھے۔ ورنہ راوی ان کی کچھ ضروری تفصیلات بیان کرتے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مؤلفین سیرت اور راویان صدر اول قریش کی اسلام دشمنی کے پس منظر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر تحریک کو سمجھتے تھے جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں اور اسی بنا پر انہوں نے ہر مہم کے ساتھ قریشی یا قریشی کارواں کا ذکر کر دیا یا اس کی طرف اشارہ کر دیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض مؤرخین و مؤلفین کے نزدیک بھی کاروانوں کا معاملہ مشتبہ تھا۔ اسی لیے ان کے یہاں ان کا بعض مواقع پر حوالہ بھی نہیں ملتا ہے خصوصاً محمد بن حبیب بغدادی نے اس کی دس ابتدائی مہموں کے بارے میں کسی قریشی کارواں کا حوالہ تک نہیں دیا ہے اس کے علاوہ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ قریش کی شام سے تجارت اسلام سے پہلے زمانے میں یا عہد نبوی میں خاص اوسط درجہ کی تھی اندازہ قریش کے عظیم ترین کارواں کی مالیت سے لگایا جاسکتا ہے قریش نے جب اپنی تمام اقتصادی دولت اور سامان تجارت اس میں جھونک دیا تھا۔ تو اس کی مالیت پچاس ہزار دینار یا چھ لاکھ درہم ہو سکی تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ مالیت اصل سرمایہ کی تھی یا بشمول منافع تھی۔ جو بعض اندازوں بلکہ حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سو فیصد تھا۔[۲۱۱] اصل سرمایہ کی صورت میں شام سے واپسی پر کل مالیت کا تخمینہ ایک لاکھ درہم رہا ہوگا۔ یعنی تقریباً بارہ لاکھ درہم۔ بظاہر یہ رقم خاصی خطیر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس پس منظر میں کہ پورے شہر مکہ کے تاجروں کی کل دولت تھی۔ یا اس کا بیشتر حصہ تھا۔ خاصی حقیر رقم تھی۔ خاص کر چند برسوں کے بعد مسلم تاجروں میں سب سے کمزور اور پست طبقے کے تاجر کا سرمایہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔[۲۱۲]

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ مکی تجارت بہت ہی مختصر پیمانے پر ہو رہی تھی اور اس حقیقت کی روشنی میں مکی کاروانوں کی اتنی تیز رفتاری سے شام جانا خاصا مشتبہ معاملہ معلوم ہوتا ہے۔

اسی سے متعلق ایک مسئلہ عددی طاقت کا ہے۔ جدید مورخین کے اس دعویٰ کی روشنی میں کہ مکی تجارت کو ان مہموں سے خطرہ پیدا ہو چکا تھا اور اس پر مکیوں کو تشویش تھی کہ اس لیے کہ مکی کاروانوں کے ساتھ محافظوں کی تعداد یا افرادی طاقت زیادہ سے زیادہ ہونی چاہیے تھی تاکہ مسلم ارادوں سے بخوبی عہدہ برآ ہوا جا سکے لیکن حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے کاروانوں کی عددی طاقت ہر کارواں میں کم ہوتی چلی جاتی ہے ہم دیکھ چکے ہیں کہ پہلے کارواں میں تعداد تین سو بتائی گئی ہے دوسرے میں دو سو اور تیسرے میں صرف ساٹھ جبکہ پانچویں کارواں میں ان کی تعداد سو ہو جاتی ہے۔ مگر سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ عظیم ترین قریشی کارواں میں ابتدائی مورخین کے بقول صرف تیس یا چالیس اور عروہ کے خط بنام عبدالملک کے مطابق زیادہ سے زیادہ ستر تھی۔ موخرالذکر کارواں میں قریشی محافظوں کی قلت تعداد کی وجہ سے بعض مورخین کا خیال ہے کہ پہلے قریشی کاروانوں میں انکے محافظوں کی تعداد میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ بجائے مبالغہ ہو یا نہ ہو قریشی کاروانوں کی عددی قوت کی ہر کارواں میں مسلسل کمی ثابت کرتی ہے کہ جنگ بدر تک قریشیوں کو اپنی تجارت کیلئے کم از کم کوئی خطرہ مسلمانان مدینہ سے عموماً اور مسلم ابتدائی مہموں سے خصوصاً محسوس نہیں ہوا تھا وہ اتنے غیر محتاط لوگ نہ تھے۔

کو اپنی تجارت کے لیے کم از کم کوئی خطرہ مسلمانان مدینہ سے عموماً اور مسلم ابتدائی مہموں سے خصوصاً محسوس نہیں ہوا تھا بہرحال یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ قریشیوں نے دیدہ و دانستہ خطرات کو دیکھ کر اپنے کاروانوں کی حفاظت کا بندوبست نہیں کیا تھا وہ اتنے غیر محتاط لوگ نہ تھے۔

اسی طرح خود مسلم مہموں میں افرادی طاقت ثابت کرتی ہے کہ ان مہموں کا مقصد لوٹ مار نہ تھا۔ پہلی مہم میں تیس مسلمانوں کا سامنا تین سو سے ہو چکا تھا فوجی حکمت عملی کے علاوہ محض عقل سلیم کا تقاضہ تھا کہ آئندہ مہم میں مسلم فوجی طاقت زیادہ سے زیادہ کی جاتی اتنی کہ اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں اگر برتر نہ ہوتی تو بہت زیادہ فروتر بھی نہ ہوتی یا کم از کم ان دونوں کا تفاوت کئی گنا تو نہ ہوتا مگر دوسری مہم میں یہ تعداد محض دوگنی ہو سکی اور تیسری مہم میں مسلمان صرف، آٹھ یا پندرہ بیس تھے۔ چوتھی مہم میں یہ تعداد بڑھ کر اگرچہ پھر ساٹھ ہو گئی تھی لیکن پھر بھی بہت کم تھی۔ پانچویں مہم میں البتہ یہ تعداد معتدبہ تھی یعنی دو سو لیکن پھر چھٹی مہم میں وہ کم ہو گئی تھی اور ڈیڑھ دو سو کے بیچ تھی اور آٹھویں مہم میں تو محض آٹھ آدمی تھے اور کارروائی صرف چھپنے کی تھی۔ باقی دو مہموں میں مسلم جماعت کی عددی طاقت کے بارے میں کچھ نہیں معلوم بہرحال یہ گھٹتی بڑھتی تعداد یہ ثابت کرتی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے تجربات سے کچھ نہ سیکھا تھا۔ لیکن یہ حقیقت کے خلاف ہے بلکہ زمانے میں جب مسلمان اپنے دشمنوں سے برسرپیکار تھے تو ہم مسلمانوں کی تعداد میں ہر آنے والی مہم میں چند در چند اضافہ پاتے ہیں اور ایک موٹے سے اندازہ کے مطابق دو مہموں کے درمیان یہ اضافہ تقریباً تین گنا تھا۔ جنگ بدر میں مسلمان تین سو سے اوپر تھے[۲۱۳] تو جنگ احد میں ان کی تعداد ساڑھے سات سو تھی بلکہ شروع میں ایک ہزار تھی[۲۱۴] جنگ خندق میں مسلم سپاہ تین ہزار[۲۱۵] تھی اور فتح مکہ کی مہم میں دس ہزار کا لشکر جرار تھا جو بقول[۲۱۶] ابوسفیان بن حرب پورا لوہے میں غرق تھا[۲۱۷]۔ اور اگرچہ غزوہ تبوک مکیوں کے خلاف نہ تھا تاہم اس میں مسلم فوج کی تیس[۲۱۸] ہزار تعداد ثابت کرتی ہے کہ اسلامی مملکت نے تصادم اور جنگ کے زمانے میں اپنی فوج کی عددی طاقت کو ہمیشہ بڑھایا ہی تھا اور کبھی گھٹانے کی غلطی نہیں کی تھی اس پس منظر میں ابتدائی مہموں میں مسلم جماعتوں کی گھٹتی بڑھتی تعداد کو دیکھنے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ان مہموں میں دشمن سے کسی قسم کی نبرد آزمائی مقصود نہ تھی۔

ضمیمہ اوّل - ۱ امرائے سرایا (مہموں کے قائدین)

[نوٹ: ضمائم کی حد تک دو صفحات کو ایک صفحہ شمار کیا گیا ہے کیونکہ پہلے صفحے کا تعلق دوسرے صفحے سے بھی ہے]

نمبر شمار	قائدِ مہم کا نام	قبیلہ / خاندان	زمانۂ قبول اسلام	مہم	تاریخ مہم	تعداد مجاہدین	مخالفین / منازل
۱	حضرت حمزہ بن عبد المطلب	قریش / ہاشم	الف	سیف البحر	رمضان ۱ھ / مارچ ۶۲۳ء	۳۰ (رکاب)	قریش
۲	" عبیدہ بن حارث	" / مطلب	"	رابغ	شوال ۱ھ / اپریل ۶۲۳ء	۶۰-۸۰ (رکاب)	"
۳	" سعد بن ابی وقاص	" / زہرہ	"	خرار	ذیقعدہ ۱ھ / مئی ۶۲۳ء	۱۰-۲۰ (رجال)	"
۴	" عبد اللہ بن جحش	اسد خزیمہ / بنی غنم بن دودان	"	نخلہ	رجب ۲ھ / جنوری ۶۲۴ء	۱۲-۶ (بعیر)	"
۵	" عمیر بن عدی	اوس / خطمہ	د	اسماء بنت مروان	رمضان ۲ھ / مارچ ۶۲۴ء	۱ (راجل)	بنو امیہ بن زید / خطمہ
۶	" سالم بن عمیر	خزرج / نجار	د	ابو عفک یہودی	شوال ۲ھ / اپریل ۶۲۴ء	۱ .	یہود
۷	" محمد بن مسلمہ	اوس / عبد الاشہل	د	کعب بن اشرف	ربیع الاول ۳ھ / اگست ستمبر ۶۲۴ء	۵ (رجال)	"
۸	" زید بن حارثہ	کلب / مولائے رسول	الف	القردہ	جمادی الآخرہ ۳ھ / نومبر ۶۲۴ء	۱۰۰ (راکب)	قریش
۹	" سعد بن زید	اوس / عبد الاشہل	س / بدری	القردہ (تتمہ)	"	.	"
۱۰	" ابو سلمہ بن عبد الاسد	قریش / مخزوم	الف	قطن	محرم ۴ھ / جون ۶۲۵ء	۱۵۰	اسد / خزیمہ
۱۱	" عبد اللہ بن انیس	خزرج	س	سفیان لحیانی	" "	۱ (راجل)	لحیان / ہذیل
۱۲	" منذر بن عمرو	خزرج / ساعدہ	د	بئر معونہ	صفر ۴ھ / جولائی ۶۲۵ء	۴۰ - ۷۰	سلیم / بنو عامر
۱۳	" مرثد بن ابی مرثد	قیس عیلانی / بنو غنی	ب	رجیع	" "	۷ - ۱۰	لحیان
۱۴	" عبد اللہ بن عتیک	خزرج / سلمہ	س	ابو رافع یہودی	ذی الحجہ ۴ھ / مئی ۶۲۶ء	۵	ابو رافع
۱۵	" عمرو بن امیہ ؂	کنانہ / ضمرہ	س	(مکہ)	"	۲	قریش
۱۶	" محمد بن مسلمہ	اوس / عبد الاشہل	د	القرطاء	محرم ۶ھ / جون ۶۲۷ء	۳۰	بکر بن کلاب
۱۷	" عکاشہ بن محصن	اسد خزیمہ / بنو غنم	د	الغمر	ربیع الثانی ۶ھ / اگست ستمبر ۶۲۷ء	۴۰	اسد

؂ بلاذری، انساب ۱ / ۳۰۹ کے مطابق یہ مہم ۶ھ میں کی گئی تھی۔

حوالہ جات

افسر مخالف	تعداد مخالفین	نوعیت مہم	نتیجہ مہم	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری انساب	طبری	اسد الغابہ	
ابوجہل مخزومی	۳۰۰ کاروان والے	کاروان	بلا تصادم	۵۹۵	۹ - ۱۰	۶/۲	۳۷۱/۱	۴۰۲/۲	۴۶-۵۰/۲	۱
ابوسفیان/عکرمہ مخزومی	۲۰۰ ״	״	״	۵۹۱	۱۰ - ۱۱	״ ۷	״ ״	״ ۴۰۲-۴	۳۵۶-۷/۳	۲
۰	۶۰ ״	״	بلا تصادم و بلا اتصال	۶۰۰	۱۱	״ ۷	״ ״	۴۰۳	۹۰-۹۳/۲	۳
۰	۰	״	حملہ و غنیمت	۶۰۱	۱۳ - ۱۹	۱۰ - ۱۱	״ ۳۷۱-۳	۴۱۰-۱۵	۱۳۱-۲/۳	۴
۰	۰	فوجی	کامیاب	۶۳۶	۱۷۲-۴	۲۷-۲۸	״ ۳۷۳	۰	۰	۵
۰	۰	״	״	۶۳۵	۱۷۴-۵	۲۸	״ ۳۷۳-۴	۰	۲۴۷-۸/۲	۶
۰	۰	״	״	۶۰۹	۱۸۴-۹۳	۵۷	״ ۳۷۴	۴۸۹-۹۱	۳۳۰/۴	۷
صفوان بن امیہ جمحی	۰	کاروان/فوجی	״	۶۰۹	۱۹۷-۸	۳۶	״	۴۹۲-۳	۲۳۴-۷/۲	۸
״	۰	״	״	۰	۰	۰	۰	۱۵۴/۳	۲۷۹-۸/۲	۹
۰	۰	فوجی	״	۵۹۸	۳۴۰-۳۶	۵۰	״ ۳۷۴-۵	۱۵۵/۳	۲۱۸/۵	۱۰
سفیان لحیانی	۰	״	״	۶۱۹	۵۳۱-۳۳	۵۰-۵۱	״ ۳۷۶	۱۵۶/۳	۱۲۰-۱/۳	۱۱
۰	۰	مذہبی/تبلیغی	سب شہید	۶۰۹	۳۴۶-۵۳	۵۱-۵۴	״ ۳۷۵	۵۴۵-۸	۴۱۸-۱۹	۱۲
۰	۰	״ ״	״	۱۶۹ ۶۰۹/۲	۳۵۴-۶۳	۵۵-۶	۳۷۵-۶	۵۳۸	۳۴۵/۴	۱۳
ابورافع	۰	فوجی	کامیاب	۶۱۹	۳۹۱-۵	۹۱-۲	״ ۳۷۶	۴۹۳-۹	۳۵۸/۴	۱۴
ابوسفیان	۰	״	ناکام	۶۳۳	۰	۹۳-۴	״ ۳۷۹-۸۰	۵۴۲-۵	۸۶/۴	۱۵
۰	۰	״	کامیاب	۶۱۱ - ۲	۵۳۴-۵	۷۸	״ ۳۷۶	۱۵۵/۳	۳۳۰/۴	۱۶
۰	۰	״	״	״	۵۵۰-۱	۸۴-۵	״ ״	۶۲۰	۲-۳/۴	۱۷

۱۸	حضرت محمد بن مسلمہ	اوس/عبد الاشہل	د	ذو القصہ	ربیع الثانی ۶ھ/اگست ستمبر ۶۲۷ء	۱۰	ثعلبہ
۱۹	〃 ابو عبیدہ بن جراح [1]	قریش/فہر بن حارث	الف	〃	〃 〃	۴۰	〃
۲۰	〃 زید بن حارثہ	کلب/مولائے رسول	〃	الجموم	〃 〃	۰	سلیم
۲۱	〃 〃 〃	〃 〃	〃	العیص	جمادی الاولیٰ ۶ھ/ستمبر اکتوبر ۶۲۷ء	۱۷۰	قریش
۲۲	〃 〃 〃	〃 〃	〃	الطرف	جمادی الآخرہ 〃/اکتوبر۔ نومبر 〃	۱۵	ثعلبہ
۲۳	〃 〃 〃	〃 〃	〃	حسمیٰ	〃 〃	۵۰۰	جذام
۲۴	〃 〃 〃	〃 〃	〃	وادی القریٰ	رجب ۶ھ/نومبر۔ دسمبر ۶۲۷ء	۰	فزارہ/غطفان
۲۵	〃 عبد الرحمٰن بن عوف	قریش/زہرہ	〃	دومۃ الجندل	شعبان ۶ھ/دسمبر ۶۲۷ء۔ جنوری ۶۲۸ء	۷۰۰	کلب
۲۶	〃 علی بن ابی طالب	〃/ہاشم	〃	فدک	〃 〃	۱۰۰	سعد
۲۷	〃 زید بن حارثہ	کلب/مولائے رسول	〃	ام قرفہ	رمضان ۶ھ/جنوری۔ فروری ۶۲۸ء	۰	بدر بن فزارہ
۲۸	〃 عبد اللہ بن رواحہ	خزرج/حارث	د	اسیر بن رازم	شوال ۶ھ/فروری مارچ ۶۲۸ء	۳۰	یہود خیبر
۲۹	〃 کرز بن جابر	قریش الظواہر/فہر	ط	الحرہ	〃 〃	۲۰	عرینہ
۳۰	〃 عبد اللہ بن المعتم	قیس عیلان/عبس	ط	شاہراہ شام	قبل حدیبیہ	۹	قریش
۳۱	〃 زید بن حارثہ	کلب/مولائے رسول	الف	مدین	۰	۰	مدین
۳۲	〃 ابان بن سعید	قریش/بنو امیہ	ع	نجد	محرم ۷ھ/مئی۔ جون ۶۲۸ء	۰	۰
۳۳	〃 عمر بن خطاب	〃/عدی	ب	تربہ	شعبان ۷ھ/دسمبر ۶۲۸ء	۳۰	ہوازن
۳۴	〃 ابو بکر بن ابی قحافہ [2]	〃/تیم	الف	نجد	〃 〃	۰	ہوازن/کلاب
۳۵	〃 بشیر بن سعد	خزرج/حارث	د	فدک	〃 〃	۳۰	غطفان/مُرّہ
۳۶	〃 غالب بن عبد اللہ	کنانہ/لیث	۰	〃	〃 〃	۲۰۰	〃
۳۷	〃 〃 〃	〃 〃	۰	ثعلبہ	رمضان ۷ھ/جنوری ۶۲۹ء	۱۳۰	ثعلبہ
۳۸	〃 بشیر بن سعد	خزرج/حارث	د	جناب ویمن	شوال ۷ھ/فروری ۶۲۹ء	۳۰۰	غطفان
۳۹	〃 ابن ابی العوجاء	سلیم	۰	۰	ذی الحجہ ۷ھ/اپریل ۶۲۹ء	۵۰	سلیم
۴۰	〃 غالب بن عبد اللہ	کنانہ/لیث	۰	الکدید	صفر ۸ھ/جون ۶۲۹ء	۱۰ یا زیادہ	سلیم/بنو الملوح
۴۱	〃 کعب بن عمیر	کنانہ/غفار	۰	ذات اطلاع	ربیع الاول ۸ھ/جولائی ۶۲۹ء	۱۵	قضاعہ

[1] بلاذری، انساب ۱/۳۷۷ نے حضرت ابو عبیدہ فہری کی ذو القصہ کو دو مہمیں بتائی ہیں۔

[2] بلاذری، انساب ۱/۳۷۶ اور ۱/۳۷۹ نے بالترتیب دو مہمیں ۷ھ اور ۸ھ میں بیان کی ہیں۔ ۷ھ کی مہم اتباع بنی لحیان کے خلاف تھی۔

۰	۱۰۰	فوجی	کامیاب	۰	۵۵۱-۲	۸۵	۳۷۷/۱	۶۴۰	۲-۳/۴	۱۸
۰	۱۰۰	〃	〃	۶۰۹	۵۵۲	۸۵-۶	۳۷۷ 〃	۶۴۱	۲۴۹/۵	۱۹
۰	۰	〃	〃	۶۱۱-۲	۵۵۳	۸۶	〃 〃	〃	۲۳۳/۲	۲۰
ابوالعاص بن ربیع	۰	کاروان/فوجی	〃	۰	۵۵۳-۵	۸۷	〃 〃	〃	〃	۲۱
۰	۰	فوجی	〃	۶۱۶	۵۵۵	〃	〃 〃	〃	〃	۲۲
۰	۰	〃	〃	۶۱۱-۲	۵۵۵-۶۰	۸۸	〃 〃	〃	〃	۲۳
بدر بن فزارہ	۰	〃	〃	۰	۰	۸۹	۳۷۷-۸ 〃	۶۴۲	〃	۲۴
الاصبغ بن عمرو	۰	〃	〃	۶۳۲	۵۶۰-۶۲	〃	۳۷۸ 〃	〃	۳۱۳-۱۶/۳	۲۵
وبر بن عُلیم	۲۰۰	〃	〃	۶۱۱-۲	۵۶۲-۳	۸۹-۹۰	〃 〃	〃	۱۶-۳۰/۴	۲۶
۰	۰	〃	〃	۰	۵۶۴-۵	۹۰-۹۱	〃 〃	۶۴۲-۳	۲۳۴-۷/۲	۲۷
اسیر بن رازم	۰	〃	〃	۶۱۸	۵۶۶-۸	۹۲-۳	〃 〃	۱۵۵/۳	۱۵۶-۹/۳	۲۸
۰	۰	〃	〃	۶۴۰	۵۶۸-۷۱	۹۳	۳۷۸-۹ 〃	۶۴۴	۲۳۴/۴	۲۹
۰	۰	〃	〃	۰	۰	۲۹۵-۶/۱	۰	۹/۳	اصابہ ۳/۱۲۵	۳۰
۰	۰	〃	〃	۶۳۵	۰	۰	۰	۰	۲۳۴-۷/۲	۳۱
۰	۰	〃	〃	۰	۰	۰	۰	۰	۳۵-۷/۱	۳۲
۰	۰	〃	〃	۶۰۹	۷۲۲	۱۱۷	۳۷۹/۱	۲۲/۳	۵۲-۷۲/۴	۳۳
۰	۰	〃	〃	〃	〃	۱۱۷-۸	〃	۶۴۳/۴ ۲۲/۳	۲۵-۲۳/۳	۳۴
۰	۰	〃	ناکام	۶۱۱-۱۲	۷۲۳	۱۲۰	〃	۲۲/۳	۱۹۵/۱	۳۵
۰	۰	〃	کامیاب	۶۲۲	۷۲۳-۶	۱۲۶	〃	〃	۱۶۸/۴	۳۶
۰	۰	〃	〃	۰	۷۲۶-۷	۱۱۹	〃	۲۲-۲۳/۳	〃 〃	۳۷
۰	۰	〃	〃	۶۱۱-۱۲	۷۲۷-۳۱	۱۲۰	〃	۲۳/۳	۱۹۵/۱	۳۸
۰	۰	〃	〃	〃	۷۳۱	۱۲۳	〃	۲۶/۳	۲۶۶/۵	۳۹
۰	۰	〃	〃	۶۰۹	۷۵۰-۲	۱۲۴	〃	۲۷-۸/۳	۱۶۸/۴	۴۰
۰	۰	〃	ناکام	۶۲۱	۷۵۲-۳	۱۲۷-۸	〃	۲۹/۳	۲۲۶/۴	۴۱

۴۲	حضرت شجاع بن وہب	اسد خزیمہ/حلیف بنو امیہ	ب	سی	ربیع الاول ۸ھ/ جولائی ۶۲۹ء	۲۴	ہوازن/عامر
۴۳	" زید بن حارثہ	کلب/مولائے رسول	الف	موتہ	جمادی الاولیٰ ۸ھ/ ستمبر ۶۲۹ء	۳,۰۰۰	غسان
۴۴	" جعفر بن ابی طالب	قریش / ہاشم	"	"	" "	"	"
۴۵	" عبداللہ بن رواحہ	خزرج / حارث	د	"	" "	"	"
۴۶	" عمرو بن عاص	قریش / سہم	ع	ذات السلاسل	جمادی الآخرہ ۸ھ/ اکتوبر ۶۲۹ء	۵۰۰	بلی قضاعہ شمال
۴۷	" ابوعبیدہ بن جراح	" / فہر	الف	خبط	رجب ۸ھ/ نومبر ۶۲۹ء	۳۰۰	علاقہ جہینہ
۴۸	" ابوقتادہ	خزرج / ربیعہ	ط	خضرہ یا غابہ	شعبان ۸ھ/ دسمبر ۶۲۹ء	۱۵ یا ۱۶	غطفان
۴۹	" " "	" "	"	بطن اضم	رمضان ۸ھ/ "	۸	شمالی حدود عرب
۵۰	" خالد بن ولید	قریش / مخزوم	ع	نخلہ	" / جنوری ۶۳۰ء	۳۰	نخلہ/عزّیٰ
۵۱	" عمرو بن عاص	" / سہم	"	سواع	" "	۰	ہذیل/سُواع
۵۲	" سعد بن زید	اوس/عبدالاشہل	د	منات	" "	۲۰	مشلل/مناۃ
۵۳	" ہشام بن عاص	قریش / امیہ	ب	یلملم	" "	۲۰۰	۰
۵۴	" خالد بن سعید	" "	الف	عُرنہ	" "	۳۰۰	۰
۵۵	" خالد بن ولید	" / مخزوم	ع	جذیمہ	" "	۳۵۰	بنو جذیمہ
۵۶	" طفیل بن عمرو	ازد شنوءہ / دوس	ب	دوس	شوال ۸ھ/ "	۰	ازد دوس
۵۷	" غالب بن عبداللہ	کنانہ / لیث	۰	فدک	" "	۰	مرہ
۵۸	" ابوسفیان بن حرب	قریش / امیہ	ف	اللات	شوال ذیقعدہ ۸ھ/ جنوری فروری ۶۳۰ء	۰	ثقیف
۵۹	" مغیرہ بن شعبہ	ثقیف	ط				
۶۰	" عُیَینہ بن حصن	غطفان / فزارہ	ع	العرج	محرم ۹ھ	۵۰	تمیم
۶۱	" قطبہ بن عامر	خزرج / سلمہ	د	مصحب	صفر ۹ھ/ مئی جون ۶۳۰ء	۲۰	خثعم
۶۲	" ضحاک بن سفیان	ہوازن / کلاب	ف	القرطاء	ربیع الاول ۹ھ/ جون جولائی "	۰	۰
۶۳	" علقمہ بن مجزز	کنانہ / مدلج	۰	شعیبہ	ربیع الثانی ۹ھ/ جولائی اگست "	۳۰۰	غارتگران حبشہ
۶۴	" جزء بن حدرجان	ازد	ق	طے	" "	۰	طے
۶۵	" علی بن ابی طالب	قریش / ہاشم	الف	الفلس	" "	۱۵۰	طے/فلس
۶۶	" عکاشہ بن محصن	اسد خزیمہ / بنو غنم	ب	الجناب	۰	۰	۰
۶۷	" خالد بن ولید	قریش / مخزوم	ع	دومۃ الجندل	رجب ۹ھ/ اکتوبر ۶۳۰ء	۴۲۰	بنو کندہ/مملکت

۰	۰	فوجی	کامیاب	۰	۷۵۳-۵	۱۲۷	۳۷۹/۱	۲۹/۳	۳۸۶/۲	۴۲
۰	۱۰۰,۰۰۰	″	کامیاب/ناکام				″ ″	۰	۲۳۴/۲	۴۳
۰	″	″	″ ″	۶۲۱ ۳۵۹/۲ ۳۷۳	۷۵۵-۶۹	۱۲۸-۳۰	″ ″	۳۶-۴۲/۳	۲۸۶-۹/۱	۴۴
۰	″	″	″ ″				″ ″		۱۵۶-۹/۳	۴۵
۰	۰	″	کامیاب	۶۲۳	۷۶۹-۷۴	۱۳۱	۳۸۰-۸۱ ″	۳۱-۲/۳	115-۱۸/۴	۴۶
۰	۰	″	″	۶۳۲	۷۷۴-۷	۱۳۲	۳۸۱ ″	۳۲-۳/۳	۲۴۹/۵	۴۷
۰	۰	″	″	۰	۷۷۷-۸۰	″	″ ″	۳۴-۵/۳	۲۷۴/۵	۴۸
۰	۰	″	″	۰	۰	۱۳۳	″ ″	۳۵-۶/۳	″	۴۹
۰	۰	مذہبی/فوجی	″	۴۳۶/۲	۸۷۰	۱۳۵-۶	″ ″	۶۵/۳	۹۳-۶/۲	۵۰
۰	۰	″ ″	″	۰	″	۱۳۶	″ ″	۶۶/۳	115-۱۸/۴	۵۱
۰	۰	″ ″	″	۰	″	۱۳۶-۷	″ ″	″	۲۷۹-۸۰/۲	۵۲
۰	۰	″ ″	″	۰	۸۷۳	۰	۰	۰	۹۳-۹۴/۵	۵۳
۰	۰	″ ″	″	۰	″	۰	۰	۰	۸۲-۳/۲	۵۴
۰	۰	″ ″	″	۰	۸۷۵-۸۱	۱۴۷-۹	۳۸۱/۱	۶۶-۷/۳	۹۳-۶/۲	۵۵
عامر بن جحمہ	۰	″ ″	″	۰	۸۷۰و۹۲۳	۱۵۷-۸	۳۸۲/۱	۰	۵۴-۵/۳	۵۶
۰	۰	فوجی	″	۰	۰	۰	۰	۰	۳۴۷/۴	۵۷
۰	۰	فوجی/مذہبی	″	۱۴۵	۹۷۱	۰	۰	۹۹-۱۰۰/۳	۲۱۶/۵	۵۸
								″	۴۰۶-۷/۴	۵۹
۰	۰	فوجی	″	۶۲۱	۹۷۴-۵	۱۶۰-۶۱	۳۸۲/۱	۰	۱۶۶-۷/۴	۶۰
۰	۰	″	″	۰	۹۸۱	۱۶۲	۳۸۰/۱	۰	۲۰۵-۶/۴	۶۱
۰	۰	″	″	۰	۹۸۲-۳	۱۶۲-۳	۳۸۲/۱	۰	۳۶/۳	۶۲
۰	۰	″	″	۶۴۰	۹۸۳-۴	۱۶۳	۰	۰	۱۴/۴	۶۳
۰	۰	″	″	۰	۰	۰	۳۸۲/۱	۰	۲۸۱-۸۲/۱	۶۴
۰	۰	فوجی/مذہبی	″	۶۱۱-۱۲	۹۸۴-۹	۱۶۴	″ ″	۱۱۱-۱۴/۳	۱۶-۴۰/۴	۶۵
۰	۰	″ ″	″	۰	۰	″	۰	۱۵۵/۳	۲-۳/۴	۶۶
اکیدر بن عبدالملک	۰	فوجی	″	۵۲۶/۲	۱۰۲۵-۳۰	۱۶۶	۳۸۲-۳۸۳/۱	۱۰۸-۹/۳	۹۳-۶/۲	۶۷

۶۸	حضرت خالد بن ولید	قریش / مخزوم	ع	نجران / یمن	ربیع الاول ۱۰ھ / جون جولائی ۶۳۱ء	۴۰۰	الحارث بن کعب
۶۹	〃 علی بن ابی طالب	〃 / ہاشم	الف	〃	رمضان ۱۰ھ / دسمبر ۶۳۱ء	۳۰۰	مذحج
۷۰	〃 جریر بن عبداللہ	بجیلہ	ق	ذو الخلصہ	〃 〃	۱	بجیلہ
۷۱	〃 مسیب بن عمرو	۔	د	۔	۔	۔	۔
۷۲	〃 عبداللہ بن حذافہ	قریش / سہم	ب	۔	۔	۔	۔
۷۳	〃 ثابت بن اقرم	بلی / عجلان	د	نجد	۔	۔	۔
۷۴	〃 اسامہ بن زید	کلب / مولائے رسول	الف / پیدائشی	موتہ	صفر-ربیع الاول ۱۱ھ / جون ۶۳۲ء	۳,۰۰۰	غسان

.	.	مذہبی	کامیاب	۵۹۲/۲	.	۱۶۹	۳۸۳/۱	۱۲۶-۷/۳	۹۳-۶/۲	۶۸
.	.	〃	〃	۶۹۱	۱۰۷۹-۸۳	۱۶۹-۷۰	〃 〃	۱۳۱-۴/۳	۱۶-۳۰/۴	۶۹
.	.	〃	〃	.	.	۲۶۶و۳۳۷	〃 〃	۱۵۸/۳	۱۷۹-۸۰/۲	۷۰
.	.	.	.	.	.	.	.	.	۳۶۷/۴	۷۱
.	.	.	.	.	.	.	.	.	۱۳۲-۴/۳	۷۲
.	.	.	.	.	.	.	.	.	۲۲۰/۱	۷۳
.	.	فوجی	کامیاب	۶۰۶	۱۱۱۷-۲۷	۱۹۰	۳۸۳/۱	۱۸۳-۵/۳	۶۳-۶/۱	۷۴

ضمیمہ اوّل-۲ اُمرائے خمیس (سالارانِ رسالہ)

نمبرشمار	سالار	قبیلہ / خاندان	زمانہ قبول اسلام	مہم	تاریخ مہم
۱	حضرت قیس بن ابی صعصعہ	خزرج / نجار	د / عقبہ	بدرعظیم	رمضان ۲ھ / مارچ ۶۲۴ء
۲	״ محمد بن مسلمہ	اوس / عبدالاشہل	د / عقبہ	اُحد	شوال ۳ھ / مارچ ۶۲۵ء
۳	״ ذکوان بن عبد قیس	.	.	״	״ ״
۴	״ المنذر بن عمرو	خزرج / ساعدہ	د / عقبہ	״	״ ״
۵	״ عبداللہ بن جبیر	اوس / عمرو بن عوف	״	״	״ ״
۶	״ حمزہ بن عبدالمطلب	قریش / ہاشم	الف	״	״ ״
۷	״ زبیر بن عوّام	״ / اسد	״	״	״ ״
۸	״ سعد بن زید	اوس / عبدالاشہل	س	״	״ ״
۹	״ سعد بن معاذ	״	د	״	״ ״
۱۰	״ علی بن ابی طالب	قریش / ہاشم	الف	بنونضیر	ربیع الاول ۴ھ / اگست ۶۲۵ء
۱۱	״ صفوان بن معطل	سُلیم / ذکوان	س	مریسیع	شعبان ۵ھ / جنوری ۶۲۷ء
۱۲	״ عباد بن بشر	اوس / عبدالاشہل	د	خندق	ذی قعدہ ۵ھ / اپریل ۶۲۷ء
۱۳	״ سعد بن ابی وقاص	قریش / زہرہ	الف	״	״ ״
۱۴	״ اُسید بن حُضیر	اوس / عبدالاشہل	د / عقبہ	״	״ ״
۱۵	״ عمر بن خطاب	قریش / عدی	ب	״	״ ״
۱۶	״ زید بن حارثہ	کلب / مولائے رسول	الف	״	״ ״
۱۷	״ سلمہ بن اسلم	اوس / عبدالاشہل	س	״	״ ״
۱۸	״ علی بن ابی طالب	قریش / ہاشم	الف	بنوقریظہ	ذی الحجہ ۵ھ / مئی-جون ۶۲۷ء
۱۹	״ اُسید بن حُضیر	اوس / عبدالاشہل	د / عقبہ	״	״ ״

منصب سالار	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
ساقہ/مشاۃ اور عرض کے افسر	۰	۲۶	۵۱۷/۳	۰	۴۳۳/۲	۲۱۸/۴	۱
الحرس کے افسر	۰	۲۱۷	۳۹/۲	۰	۰	۳۳۱/۴	۲
" " " واپسی کے سفر میں	۰	۲۱۷ و ۱۱۳	۰	۰	۰	۰	۳
میسرہ کے افسر	۰	۰	۰	۰	۰	۴۱۹/۴	۴
تیر اندازوں کے افسر	۰	۲۱۹	۴۰/۲	۳۱۷/۱	۵۰۷/۲	۱۳۰-۱/۳	۵
مقدمہ کے افسر	۰	۰	۰	۰	۵۰۸/۲	۴۶-۵۰/۲	۶
الخیل (شہسواروں) کے افسر	۰	۰	۰	۰	"	۱۹۶-۹/۲	۷
" " "	۰	۰	۰	۰	"	۰	۸
مدینہ کی محافظ فوج (الحرس) کے افسر	۰	۰	۰	۰	"	۲۹۶-۹/۲	۹
سالار معسکر	۰	۳۷۱	۰	۰	۰	۰	۱۰
مستقل سالار ساقہ	۰	۴۲۸ و ۱۰۹۳	۰	۳۴۲/۱	۰	۲۶-۷/۳	۱۱
شب بیدار الحرس کے افسر	۰	۴۶۴	۶۷/۲	۰	۰	۱۰۰-۱/۳	۱۲
" " "	۰	۴۶۳	۰	۰	۰	۰	۱۳
۲۰۰ شہسوار دستہ کے افسر	۰	۴۶۷-۵ و ۴۷۳	۶۸/۲	۰	۰	۹۲-۳/۱	۱۴
شب بیدار الحرس کے افسر	۰	۴۶۶	۰	۰	۰	۰	۱۵
۲۰۰ شہسوار محافظ دستہ (الحرس) کے افسر	۰	۴۶۰	۶۷/۲	۰	۰	۰	۱۶
۲۰۰ " " " "	۰	"	"	۰	۰	۰	۱۷
مقدمہ کے افسر	۰	۴۹۹	۰	۰	۵۸۲/۲	۱۶-۴۰/۴	۱۸
ایک دستہ کے افسر	۰	"	۰	۰	۰	۹۲-۳/۱	۱۹

۲۰	حضرت محمد بن مسلمہ	اوس / عبدالاشہل	د / عقبہ	بنو قریظہ	ذی الحجہ سنہ ۵ھ / مئی جون سنہ ۶۲۶ء
۲۱	〃 سعد بن عبادہ	خزرج / ساعدہ	〃	غطفان	ربیع الثانی سنہ ۶ھ / اگست سنہ ۶۲۶ء
۲۲	〃 سعد بن زید	اوس / عبدالاشہل	س	〃	〃 〃
۲۳	〃 زید بن ثابت	خزرج / نجار	〃	خیبر	صفر سنہ ۷ھ / مئی جون سنہ ۶۲۸ء
۲۴	〃 عثمان بن عفان	قریش / امیہ	الف	〃	〃 〃
۲۵	〃 عمر بن خطاب	〃 / عدی	ب	〃	〃 〃
۲۶	〃 محمد بن مسلمہ	اوس / عبدالاشہل	د	عمرۃ القضیٰ	ذی قعدہ سنہ ۷ھ / مارچ سنہ ۶۲۹ء
۲۷	〃 اوس بن خولی	خزرج / سالم	س	〃	〃 〃
۲۸	〃 عباد بن بشر	اوس / عبدالاشہل	〃	〃	〃 〃
۲۹	〃 اوس بن خولی	خزرج / سالم	〃	〃	〃 〃
۳۰	〃 قطبہ بن قتادہ	سعد ہذیم / عذرہ	٠	غزوہ موتہ	جمادی الاولیٰ سنہ ۸ھ / ستمبر سنہ ۶۲۹ء
۳۱	〃 عبایہ بن مالک	انصاری	٠	〃	〃 〃
۳۲	〃 عمر بن خطاب	قریش / عدی	ب	فتح مکہ	رمضان سنہ ۸ھ / جنوری سنہ ۶۳۰ء
۳۳	〃 زبیر بن عوام	〃 / اسد	الف	〃	〃 〃
۳۴	〃 ضحاک بن سفیان	عامر / کلاب	ف	〃	〃 〃
۳۵	〃 ابو عبیدہ بن جراح	قریش / فہر	الف	〃	〃 〃
۳۶	〃 خالد بن ولید	〃 / مخزوم	ع	〃	〃 〃
۳۷	〃 سعد بن عبادہ	خزرج / ساعدہ	س	〃	〃 〃
۳۸	〃 زبیر بن عوام	قریش / اسد	الف	〃	〃 〃
۳۹	〃 ورد بن خالد	سلیم	ف	〃	〃 〃
۴۰	〃 خالد بن ولید	قریش / مخزوم	ع	غزوہ حنین	شوال سنہ ۸ھ / فروری سنہ ۶۳۰ء
۴۱	〃 ابو عامر	اشعر	ط	〃 اوطاس	〃 ذیقعدہ 〃 / 〃 〃
۴۲	〃 خالد بن ولید	قریش / مخزوم	ع	〃 طائف	〃 〃
۴۳	〃 عبداللہ بن عتیک	خزرج / سلمہ	س	سریہ علی (الفلس)	ربیع الثانی سنہ ۹ھ / اگست ستمبر ۶۳۰ء
۴۴	〃 عباد بن بشر	اوس / عبدالاشہل	د	غزوہ تبوک	رجب رمضان سنہ ۹ھ / اکتوبر نومبر سنہ ۶۳۱ء
۴۵	〃 عبداللہ بن ابی ربیعہ	قریش / مخزوم	ف	یمن	سنہ ۹-۱۰ھ / سنہ ۶۳۰-۳۱ء

شب بیدار الحرس کے افسر	.	۵۰۴	.	.	۵۸۶/۲	۲۳۱/۴	۲۰
مدینہ کی محافظ فوج (الحرس) کے افسر	.	۵۴۷	۸۰/۲	.	.	۲۸۳-۵/۲	۲۱
شہسوار فوج (الخیل) کے افسر	.	۵۴۷، ۵۴۵	.	.	۶۰۱/۲	۲۷۹-۸۰/۲	۲۲
افسر عرض	.	۶۸۹	۱۰۷/۲	.	.	۲۲۱-۳/۲	۲۳
لشکرگاہ رجیع کے افسر	.	۶۴۵	.	.	.	۲۷۶-۸۴/۳	۲۴
″ ″	.	۶۴۷	.	.	.	۵۲-۷۲/۴	۲۵
شب بیدار الحرس کے افسر	.	۶۰۲، ۴۳۲، ۳۵	۱۲۱/۲	.	۱۲۶/۳	۳۳۱/۴	۲۶
″ ″ ″	.	″	.	.	.	۱۴۴-۵/۱	۲۷
″ ″ ″	.	″	.	.	.	۱۰۰-۱/۳	۲۸
الخیل/مقدمہ کے افسر	.	.	۱۲۳/۲	.	.	۱۴۴-۵/۱	۲۹
سالارِ میمنہ	.	.	۳۹/۳	.	.	۳۰۶/۴	۳۰
سالارِ میسرہ	.	.	″	.	.	.	۳۱
الحرس کے افسر	.	۸۱۵	۱۳۵/۲	.	.	۵۲-۷۲/۴	۳۲
سالارِ مقدمہ	.	۸۰۱	.	۳۵۵/۱	.	۱۹۶-۹/۲	۳۳
سالار فوج سلیم	.	.	.	.	.	۳۶/۳	۳۴
سالار دستہ/مقدمہ	.	.	۱۳۵/۲	۳۵۵/۱ قب ۵۲	۵۷/۳	۲۴۹/۵	۳۵
سالار مقدمہ/میمنہ	.	۸۱۹، ۸۲۵	۱۳۵-۶/۲	۵۲ ″	۵۶/۳	۹۳-۶/۲	۳۶
سالار دستہ فوج نبوی	.	۸۲۵	″	.	″	۲۸۳-۵/۲	۳۷
″ ″	.	″	″	″ ″	۵۵-۶/۳	۱۹۶-۹/۲	۳۸
سالار میمنہ	.	.	.	.	.	۸۶/۵	۳۹
سالار مقدمہ	.	۸۹۷	۱۵۰/۲	.	.	۹۳-۶/۲	۴۰
″	.	۹۱۵	۱۵۲/۲	۳۶۵-۶/۱ ″ ۶۷	۷۹/۳	۲۳۸/۵	۴۱
″	.	۹۲۳	۱۵۸/۲	.	.	۹۳-۶/۲	۴۲
مشاۃ (پیادہ سپاہ) اور سامان کے افسر	.	.	.	.	.	۲۰۳-۵/۳	۴۳
مستقل الحرس کے افسر	.	۱۰۳۴	۱۶۶/۲	.	.	۱۰۰-۱/۳	۴۴
فوج یمن کے مستقل افسر	.	.	.	.	.	۱۵۵/۳	۴۵

ضمیمہ اوّل - ۳ امراءِ علم / علمبردار (اصحاب الالویۃ والرایات)

نمبر شمار	علمبردار	قبیلہ / خاندان	زمانۂ قبول اسلام	مہم	تاریخ مہم
۱	حضرت ابو مرثد	قیس عیلان / بنو غنی	الف	سریہ حمزہ (سیف البحر)	رمضان ۱ھ / مارچ ۶۲۳ء
۲	" مسطح بن اثاثہ	قریش / مطلب	"	" عبیدہ بن حارث (رابغ)	شوال ۱ھ / اپریل ۶۲۳ء
۳	" مقداد بن عمرو	قضاعہ / بہراء	"	" سعد بن ابی وقاص (خرار)	ذیقعدہ ۱ھ / مئی ۶۲۳ء
۴	" حمزہ بن عبد المطلب	قریش / ہاشم	"	غزوہ ودان	صفر ۲ھ / اگست ۶۲۳ء
۵	" سعد بن ابی وقاص	" / زہرہ	"	" بواط	ربیع الاول ۲ھ / ستمبر ۶۲۳ء
۶	" علی بن ابی طالب	" / ہاشم	"	" بدر اولیٰ	" "
۷	" حمزہ بن عبد المطلب	" / "	"	" ذات العشیرہ	جمادی الآخرہ ۲ھ / دسمبر ۶۲۳ء
۸	" مصعب بن عمیر [1]	" / عبد الدار	"	" بدر عظیم	رمضان ۲ھ / مارچ ۶۲۴ء
۹	" حباب بن منذر [2]	خزرج / سلمہ	س	" "	" "
۱۰	" سعد بن معاذ	اوس / عبد الاشہل	"	" "	" "
۱۱	" حمزہ بن عبد المطلب	قریش / ہاشم	الف	" بنی قینقاع	شوال ۲ھ / اپریل ۶۲۴ء
۱۲	" علی بن ابی طالب	" "	"	" الکدر	محرم ۳ھ / جولائی ۶۲۴ء
۱۳	" مصعب بن عمیر [3]	" / عبد الدار	"	" اُحد	شوال ۳ھ / مارچ ۶۲۵ء
۱۴	" ابو الروم بن عمیر	" "	"	" "	" "
۱۵	" اسید بن حضیر	اوس / عبد الاشہل	د	" "	" "

---

[1] طبری، ۲/ ۴۳۱ میں حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کو مہاجرین کا علمبردار بتایا گیا ہے۔

[2] " " " " سعد بن عبادہ خزرجی کو خزرج " " " ۔

[3] " ۲/ ۵۱۶ " " علی بن ابی طالب ہاشمی کو مہاجرین " " " ۔

علم قبیلہ / خاندان	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسدالغابہ	
علم سریہ	۰	۰	۲/۶	۰	۲/۳۰۲	۵/۲۹۶	۱
〃	۰	۰	۲/۷	۰	〃	۴/۳۵۴-۵	۲
〃	۰	۰	〃	۰	۲/۳۰۳	۴/۳۰۹	۳
علم غزوۂ نبوی	۰	۰	۲/۸	۰	۲/۳۰۷	۲/۴۶-۵۰	۴
〃	۰	۰	〃	۰	〃	۲/۹۰-۳	۵
〃	۰	۰	۰	۰	〃	۴/۱۶-۴۰	۶
〃	۰	۰	۲/۹	۰	۲/۳۰۸	۲/۴۶-۵۰	۷
〃	۶۱۲-۱۳	۵۸، ۵۶	۲/۱۴	۰	۰	۴/۳۷۰	۸
〃/ خزرج	۰	۵۸	〃	۰	۰	۱/۳۶۴-۵	۹
〃/ اوس	۰	۵۸	〃	۰	۰	۲/۲۹۶-۹	۱۰
〃	۰	۰	۲/۲۹	۰	۲/۳۸۱	۲/۴۶-۵۰	۱۱
〃	۰	۰	۲/۳۱	۰	۲/۳۸۲	۴/۱۶-۴۰	۱۲
〃/ مہاجرین	۰	۲۱۵	۲/۵۸	۱/۳۱۷	۲/۵۰۸	۴/۳۶۸-۹	۱۳
〃/ شہادتِ مصعب کے بعد	۰	۲۳۹	۰	۰	۰	۰	۱۴
〃/ اوس	۰	۲۱۵	۲/۵۸	۱/۳۱۷	۲/۵۰۸	۱/۹۲-۳	۱۵

نمبر	نام	قبیلہ / خاندان	درجہ	غزوہ	تاریخ
۱۶	حضرت حباب بن منذر [1]	خزرج / سلمہ	س	غزوہ احد	شوال ۳ھ / مارچ ۶۲۵ء
۱۷	" علی بن ابی طالب [2]	قریش / ہاشم	الف	" حمراء الاسد	"
۱۸	" " " "	" "	"	" بنی نضیر	ربیع الاول ۴ھ / اگست ۶۲۵ء
۱۹	" " " "	" "	"	" بدر الموعد	ذی قعدہ ۴ھ / اپریل ۶۲۶ء
۲۰	" ابوبکر صدیق	" / تیم	"	" مریسیع	رجب ۵ھ / جنوری ۶۲۷ء
۲۱	" سعد بن عبادہ	خزرج / ساعدہ	س	" "	"
۲۲	" زید بن حارثہ	کلب / مولائے رسول	الف	" خندق	ذی قعدہ ۵ھ / اپریل ۶۲۷ء
۲۳	" سعد بن عبادہ	خزرج / ساعدہ	س	" "	"
۲۴	" علی بن ابی طالب	قریش / ہاشم	الف	" بنی قریظہ	" ذی الحجہ ۵ھ / اپریل مئی ۶۲۷ء
۲۵	" مقداد بن عمرو	قضاعہ / بہراء	"	" غطفان	ربیع الثانی ۶ھ / اگست ۶۲۷ء
۲۶	" ابوبکر صدیق	قریش / تیم	"	" خیبر	صفر ۷ھ / جون ۶۲۸ء
۲۷	" عمر بن خطاب	" / عدی	ب	" "	
۲۸	" علی بن ابی طالب	" / ہاشم	الف	" "	
۲۹	" حباب بن منذر	خزرج / سلمہ	س	" "	" "
۳۰	" سعد بن عبادہ	" / ساعدہ	"	" "	" "
۳۱	" مسطح بن اثاثہ	قریش / مطلب	الف	" "	" "
۳۲	" سعد بن عبادہ	خزرج / ساعدہ	س	وادی القریٰ	" "
۳۳	" حباب بن منذر	" / سلمہ	"	"	" "
۳۴	" سہل بن حنیف [3]	اوس / مالک	"	"	" "
۳۵	" سعد بن عبادہ	خزرج / ساعدہ	"	فتح مکہ	رمضان ۸ھ / جنوری ۶۳۰ء
۳۶	" قیس بن سعد بن عبادہ [4]	" "	"	"	" "

[1] بلاذری نے حضرت سعد بن عبادہ کا نام لیا ہے۔

[2] واقدی نے ایک روایت میں حضرت ابوبکر صدیق کا نام لیا ہے۔

[3] ایک روایت میں حضرت عباد بن بشر کا نام ہے۔

[4] حکم نبوی پر باپ کی جگہ بیٹے نے دوران غزوہ لی تھی۔

علم غزوۂ نبوی / خزرج	.	۲۱۵	۲/۵۸	.	۲/۵۰۸	۱/۵-۳۶۴	۱۶
〃	.	۳۳۶	۲/۴۹	.	.	۴/۳۰-۱۶	۱۷
〃	.	.	۲/۵۸	.	.	〃	۱۸
〃	.	۳۸۸	۲/۵۹	.	.	〃	۱۹
〃 / مہاجرین	.	۴۰۷	۲/۶۴	.	.	۳/۲۳-۲۰۵	۲۰
〃 / انصار	.	〃	〃	.	.	۲/۵-۲۸۳	۲۱
〃 / مہاجرین	.	.	۲/۶۷	.	.	۲/۷-۲۳۴	۲۲
〃 / انصار	.	.	〃	.	.	۲/۵-۲۸۳	۲۳
〃	.	۴۹۷	۲/۷۴	.	.	۴/۳۰-۱۶	۲۴
〃	.	.	۲/۸۰	.	.	۴/۴۰۹	۲۵
	.					.	۲۶
〃 بالترتیب	.				۳/۱۲-۱۱	.	۲۷
	۲/۳۲۸	۵۴، ۶۴۹	۲/۱۰۶	.	.	.	۲۸
〃 / خزرج	.	.	〃	.	.	.	۲۹
〃 〃	.	.	〃	.	.	.	۳۰
.	.	.	.	.	.	۴/۵-۲۵۴	۳۱
انصار						۲/۵-۲۸۳	۳۲
〃		۷۱۰				۱/۵-۳۶۴	۳۳
〃						۲/۵-۳۶۳	۳۴
علم نبوی / 〃						۲/۴-۲۸۳	۳۵
〃		۸۰۱-۸۰۰				۴/۶-۲۱۵	۳۶

۳۷	حضرت قطبہ بن عامر	خزرج / سلمہ	د	فتح مکہ	رمضان ۸ھ	جنوری ۶۳۰ء
۳۸	〃 عمارہ بن حزم	〃 / نجار	〃	〃	〃	〃
۳۹	〃 عبداللہ بن زید	〃 / حارث	〃	〃	〃	〃
۴۰	〃 سلیط بن قیس	〃 / نجار	س	〃	〃	〃
۴۱	〃 زبیر بن عوام	قریش / اسد	الف	〃	〃	〃
۴۲	〃 علی بن ابی طالب	〃 / ہاشم	〃	〃	〃	〃
۴۳	〃 سعد بن ابی وقاص	〃 / زہرہ	〃	〃	〃	〃
۴۴	〃 ہلال بن امیہ	اوس / واقف	س	〃	〃	〃
۴۵	〃 ابو نائلہ	〃 / عبدالاشہل	〃	〃	〃	〃
۴۶	〃 جابر بن عتیک	〃 / بنو معاویہ	〃	〃	〃	〃
۴۷	〃 ابولبابہ بن عبدالمنذر	〃 / خطمہ	〃	〃	〃	〃
۴۸	〃 خزیمہ بن ثابت	〃 / 〃	〃	〃	〃	〃
۴۹	〃 ابو اسید	خزرج / ساعدہ	〃	〃	〃	〃
۵۰	〃 قتادہ بن نعمان	〃 / ظفر	〃	〃	〃	〃
۵۱	〃 ابوبردہ ہانی بن نیار	〃 / حارثہ	〃	〃	〃	〃
۵۲	〃 حیان بن حکم	سلیم	ط	〃	〃	〃
۵۳	〃 یزید بن اخنس	〃	س	〃	〃	〃
۵۴	〃 خفاف بن ندبہ	〃	ط	〃	〃	〃
۵۵	〃 عوف بن مالک	غطفان / اشجع	〃	〃	〃	〃
۵۶	〃 خزاعی بن عبدنہم	مزینہ	〃	〃	〃	〃
۵۷	〃 نعمان بن مقرن	〃	〃	〃	〃	〃
۵۸	〃 عبداللہ بن عمرو	〃	〃	〃	〃	〃
۵۹	〃 بلال بن حارث	〃	〃	〃	〃	〃
۶۰	〃 بریدہ بن حصیب	اسلم	د	〃	〃	〃
۶۱	〃 ناجیہ بن اعجم	〃	〃	〃	〃	〃
۶۲	〃 معبد بن خالد	جہینہ	س	فتح مکہ	〃	〃

علم نبوی / بنوسلمہ						۲۰۵-۶/۳	۳۷
〃 / بنونجار						۴۸/۳	۳۸
〃 / ۰						۱۲۵-۷/۳	۳۹
〃 / ۰		۸۰۰ - ۸۰۱				۳۴۵-۶/۲	۴۰
〃 / مہاجرین					۵۵/۳	۱۹۶-۹/۲	۴۱
〃 〃						۱۶-۴۰/۴	۴۲
〃 〃						۹۰-۳/۲	۴۳
〃 / بنوواقف						۶۶/۵	۴۴
〃 / ۰						۳۱۱/۵	۴۵
〃 / بنومعاویہ		۸۰۰				۲۵۸-۹/۱	۴۶
〃 / ۰						۲۸۴-۵/۴	۴۷
〃 / خطمہ						۱۱۴/۲	۴۸
〃 / ۰		۸۰۰				۱۲۷/۵	۴۹
〃 / ظفر		〃				۱۹۵-۷/۴	۵۰
〃 / حارثہ		۰				۱۴۶/۵	۵۱
〃 / سلیم						۳۶۶/۱	۵۲
〃 / 〃						۱۰۲-۳/۵	۵۳
〃 / 〃						۱۱۸-۹/۲	۵۴
〃 / اشجع						۱۵۶/۴	۵۵
〃 / مُزینہ						۱۱۳/۲	۵۶
〃 / 〃		۸۰۰				۰	۵۷
〃 / 〃		۰				۳۰-۱/۵	۵۸
〃 / 〃		۸۰۰				۲۰۵/۱	۵۹
〃 / اسلم		〃				۱۷۵-۶/۱	۶۰
اسلم		〃				۴/۵	۶۱
جہینہ		۰				۳۹۰/۴	۶۲

۶۳	حضرت سوید بن صخر	جہینہ	د	فتح مکہ	رمضان ۸ھ / جنوری ۶۳۰ء
۶۴	؍؍ زید بن خالد	؍؍	س	؍؍	؍؍ ؍؍
۶۵	؍؍ عبداللہ بن بدر	؍؍	ط	؍؍	؍؍ ؍؍
۶۶	؍؍ بشر بن ابی سفیان	خزاعہ / کعب	؍؍	؍؍	؍؍ ؍؍
۶۷	؍؍ ابو شریح	؍؍ ؍؍	؍؍	؍؍	؍؍ ؍؍
۶۸	؍؍ عمرو بن سالم	؍؍ ؍؍	؍؍	؍؍	؍؍ ؍؍
۶۹	؍؍ علی بن ابی طالب	قریش / ہاشم	الف	غزوہ حنین	شوال ۸ھ / فروری ۶۳۰ء
۷۰	؍؍ سعد بن ابی وقاص	؍؍ / زہرہ	؍؍	؍؍	؍؍ ؍؍
۷۱	؍؍ عمر بن خطاب	؍؍ / عدی	ب	؍؍	؍؍ ؍؍
۷۲	؍؍ حباب بن منذر	خزرج / سلمہ	س	؍؍	؍؍ ؍؍
۷۳	؍؍ سعد بن عبادہ	؍؍ / ساعدہ	؍؍	؍؍	؍؍ ؍؍
۷۴	؍؍ اسید بن حضیر	اوس / عبدالاشہل	د	؍؍	؍؍ ؍؍
۷۵	؍؍ ابوبکر صدیق	قریش / تیم	الف	غزوہ تبوک	شوال - ذی قعدہ ۹ھ / اکتوبر - نومبر ۶۳۱ء
۷۶	؍؍ زبیر بن عوام	؍؍ / اسد	؍؍	؍؍	؍؍ ؍؍
۷۷	؍؍ اسید بن حضیر	اوس / عبدالاشہل	د	؍؍	؍؍ ؍؍
۷۸	؍؍ عمارہ بن حزم	خزرج / نجار	د	؍؍	؍؍ ؍؍
۷۹	؍؍ ابو دجانہ	؍؍	س	؍؍	؍؍ ؍؍
۸۰	؍؍ حباب بن منذر	؍؍ / سلمہ	؍؍	؍؍	؍؍ ؍؍
۸۱	؍؍ زید بن ثابت	؍؍ / نجار	؍؍	؍؍	؍؍ ؍؍
۸۲	؍؍ ابو زید	؍؍ / عمرو بن عوف	؍؍	؍؍	؍؍ ؍؍
۸۳	؍؍ معاذ بن جبل	؍؍ / سلمہ	؍؍	؍؍	؍؍ ؍؍
۸۴	؍؍ عبداللہ بن مالک	؍؍ / بنو قطیعہ بن عبس	•	•	•
۸۵	؍؍ عامر بن سالم	اسلم	د	•	•
۸۶	؍؍ بریدہ بن حصیب	؍؍	؍؍	سریہ اسامہ بن زید	محرم - ربیع ۱۱ھ / مارچ - جون ۶۳۲ء

جہینہ						۳۷۸/۲	۶۳
〃	۰	۸۰۰	۰	۰	۰	۲۲۸/۲	۶۴
〃						۱۲۳-۴/۳	۶۵
خزاعہ / کعب						۰	۶۶
〃	۰	۸۰۱	۰	۰	۰	۲۲۵/۵	۶۷
〃						۱۰۴-۵/۴	۶۸
مہاجرین						〃	۶۹
〃	۰	۸۹۵	۱۵۰/۲	۰	۰	〃	۷۰
〃						〃	۷۱
خزرج						〃	۷۲
〃	۰	〃	〃	۰	۰	〃	۷۳
اوس	۰	۸۹۵-۶	〃	۰	۰	〃	۷۴
مہاجرین						〃	۷۵
〃						〃	۷۶
اوس						〃	۷۷
خزرج						〃	۷۸
〃	۰	۹۹۶-۱۰۰۳	۰	۰	۰	۱۸۴/۵	۷۹
〃						〃	۸۰
〃						〃	۸۱
〃						〃	۸۲
〃						〃	۸۳
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۲۵۱/۳	۸۴
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۸۱/۳	۸۵
علم نبوی	۰	۱۱۱۸	۱۹۰/۲	۰	۰	۱۷۵-۶/۱	۸۶

ضمیمہ اوّل - ۴ افسرانِ طلیعہ (گشتی دستے)

نمبر شمار	طلیعہ افسر	قبیلہ / خاندان	زمانۂ قبول اسلام	مہم	تاریخ مہم
۱	حضرت طلحہ بن عبید اللہ	قریش / تیم	الف	کاروان قریش قبل بدر	رمضان ۲ھ / مارچ ۶۲۴ء
۲	〃 سعید بن زید	〃 / عدی	〃	〃	〃 〃
۳	〃 زبیر بن عوام	〃 / اسد	〃	غزوۂ بدر	〃 〃
۴	〃 علی بن ابی طالب	〃 / ہاشم	〃	〃	〃 〃
۵	〃 بسبس بن عمرو	جہینہ	س	〃	〃 〃
۶	〃 زید بن حارثہ	کلب / مولائے رسول	الف	〃	〃 〃
۷	〃 عبداللہ بن رواحہ	خزرج / حارث	د	〃	〃 〃
۸	〃 مالک بن خلف	اسلم	س	غزوہ اُحد	شوال ۳ھ / مارچ ۶۲۵ء
۹	〃 نعمان بن خلف	〃	〃	〃	〃 〃
۱۰	〃 سلیط بن خالد	〃	〃	〃	〃 〃
۱۱	〃 سفیان بن خالد	〃	〃	〃	〃 〃
۱۲	〃 (نامعلوم)	〃 / بنو عویر	〃	〃	〃 〃
۱۳	〃 ابو لیلیٰ	خزرج / مازن	〃	غزوہ بنی قینقاع	ربیع الاول ۴ھ / اگست ۶۲۵ء
۱۴	〃 عبداللہ بن سلام	بنو قینقاع	〃	〃	〃 〃
۱۵	〃 جعال بن سراقہ	کنانہ / ضمرہ	ب	ذات الرقاع	محرم ۵ھ / جون ۶۲۶ء
۱۶	〃 سعد بن معاذ	اوس / عبدالاشہل	س	خندق	ذی قعدہ ۵ھ / اپریل ۶۲۷ء
۱۷	〃 اسید بن حضیر	〃 〃	د	〃	〃 〃
۱۸	〃 سعد بن عبادہ	خزرج / ساعدہ	د	〃	〃 〃
۱۹	〃 ابوبکر صدیق	قریش / تیم	الف	بنو لحیان	ربیع الاول ۶ھ / جولائی ۶۲۷ء

کام کی نوعیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
کاروان قریش کی آمد کا وقت و راستہ معلوم کرنا	۰	۲۰ - ۱۹	۲/۱۲ - ۱۱	۱/۲۸۸	۲/۴۷۸	۳/۵۹	۱
〃 〃 〃	۰	〃	〃	〃	〃	۲/۳۰۶	۲
بدر کے کنوؤں کے قریب جا کر دشمن کی خبر لانا	۰	۵۱	۲/۱۳	۰	۲/۴۲۲ ۴۳۶	۲/۹-۱۹۶	۳
〃 〃 〃	۰	〃	۰	۰	۰	۴/۴۰-۱۶	۴
〃 〃 〃	۰	〃	۰	۰	۰	۱/۹-۱۷۸	۵
فتح بدر کی خوشخبری اہل العالیہ کو دینا	۰	۱۱۴	۰	۱/۲۹۴	۲/۴۵۸	۲/۷-۲۳۴	۶
〃 〃 زیریں مدینہ کے لوگوں کو دینا	۰	〃	۲/۱۳	۰	〃	۳/۹-۱۵۶	۷
دشمن کے بارے میں خبریں حاصل کرنا	۰	۰	۰	۰	۰	۴/۲۷۸	۸
						۵/۲۵	۹
دشمن کی پسپائی کے بعد ان کے ارادوں کا پتا لگانا	۰	۳۳۷	۰	۰	۰		۱۰
						۴/۲۹۷	۱۱
							۱۲
کھجوروں کے بعض درخت کاٹنا	۰	۳۷۲	۰	۰	۰	۵/۲۸۶	۱۳
						۳/۷-۱۷۶	۱۴
مدینہ والوں کو مسلم فوج کی خیریت سے آگاہ کرنا	۰	۰	۲/۶۱	۰	۰	۱/۴-۲۸۳	۱۵
بنو قریظہ کے بارے میں پتا لگانا	۰	۴۵۸	۰	۰	۰	۲/۷-۲۹۶	۱۶
						۱/۳-۹۲	۱۷
						۲/۵-۲۸۳	۱۸
غمیم تک خبریں معلوم کرنے گئے تھے	۰	۵۳۶	۲/۷۹	۰	۰	۳/۲۳-۲۰۵	۱۹

۲۰	حضرت عباد بن بشر	اوس / عبدالاشہل	د	حدیبیہ	ذی قعدہ سنہ ۶ھ / مارچ سنہ ۶۲۸ء
۲۱	" " "	" "	"	خیبر	صفر سنہ ۷ھ / جون سنہ ۶۲۸ء
۲۲	" عمرو بن طفیل	ازد / دوس	"	"	" "
۲۳	" محمد بن مسلمہ	اوس / عبدالاشہل	"	"	" "
۲۴	" علی بن ابی طالب	قریش / ہاشم	الف	فتح مکہ	رمضان سنہ ۸ھ / جنوری سنہ ۶۳۰ء
۲۵	" زبیر بن عوام	" / اسد	"	"	" "
۲۶	" نہیک بن اوس	خزرج	س	حنین	شوال سنہ ۸ھ / فروری سنہ ۶۳۰ء
۲۷	" اسید بن حضیر	اوس	"	تبوک	سنہ ۹ھ / سنہ ۶۳۱ء
۲۸	" زیاد بن حنظلہ	تمیم	۰	مسیلمہ کذاب کے خلاف	سنہ ۱۱ھ / سنہ ۶۳۲ء

دشمن کی خبر معلوم کرنا۔ ۲۰ سپاہ کے افسر	۰	۵۷۴	۹۵/۲	۰	۰	۱۰۰-۱/۳	۲۰
〃	۰	۶۴۰	۰	۰	۰	〃	۲۱
اپنے قبیلہ سے کمک لانا	۰	۹۲۳	۰	۰	۰	۱۱۵/۴	۲۲
لشکرگاہ کے لیے مناسب جگہ حاصل کرنا	۰	۶۴۴	۰	۰	۰	۳۳۱/۴	۲۳
ایک جاسوس عورت سے خط وصول کرنا	۰	۷۹۷ - ۸	۰	۰	۴۸ - ۹/۳	〃	۲۴
						〃	۲۵
مدینہ والوں کو مسلم سپاہ کی خیریت پہنچانا	۰	۰	۰	۰	۰	۴۴/۵	۲۶
پانی وغیرہ حاصل کرنا / جگہ کا پتا لگانا	۰	۱۰۴۱	۰	۰	۰	۹۲-۹۳/۱	۲۷
اس کے ارادوں کا پتا لگانا	۰	۰	۰	۰	۰	۲۱۳/۲	۲۸

ضمیمہ اوّل - ۵ جاسوس (عیون)

نمبر شمار	جاسوس	قبیلہ/خاندان	زمانہ قبول اسلام	مہم	تاریخ مہم
۱	حضرت بسبس بن عمرو	جُہینہ	س	غزوۂ بدر	رمضان ۲ھ / مارچ ۶۲۴ء
۲	" عدی بن ابی الزغباء	"	"	"	" "
۳	" عمار بن یاسر	مذحج / عنس	الف	"	" "
۴	" عبداللہ بن مسعود	ہذیل	"	"	" "
۵	" انس بن فضالہ	خزرج / ظفر	س	غزوۂ اُحد	شوال ۳ھ / مارچ ۶۲۵ء
۶	" مونس بن فضالہ	" "	"	"	" "
۷	" حباب بن منذر	" / سلمہ	د	"	" "
۸	" علی بن ابی طالب	قریش / ہاشم	الف	"	" "
۹	" امیہ بن خویلد	کنانہ / ضمرہ	س	رجیع	صفر ۴ھ / اپریل ۶۲۶ء
۱۰	" عمرو بن امیہ	" "	"	"	" "
۱۱	" بریدہ بن حصیب	اسلم	د	مریسیع	شعبان ۵ھ / جنوری ۶۲۷ء
۱۲	" خوات بن جبیر	خزرج	س	خندق	ذی قعدہ ۵ھ / اپریل مئی ۶۲۷ء
۱۳	" حذیفہ بن یمان	غطفان / حلیف عبد الاشہل	"	"	" "
۱۴	" زبیر بن عوام	قریش / اسد	الف	"	" "
۱۵	" بسر بن سفیان	خزاعہ / کعب	س	حدیبیہ	ذی قعدہ ۶ھ / مارچ ۶۲۸ء
۱۶	" انس بن ابی مرثد	قیس عیلان / غنی	الف	حنین	شوال ۸ھ / فروری ۶۳۰ء
۱۷	" عبداللہ بن ابی حدرد	اسلم	س	"	" "

	کام کی نوعیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ
۱	جنگ سے قبل بدر جاکر دشمن کی خبر معلوم کرنا	۰	۲۲	۱۲ / ۲	۲۸۹ / ۱	۴۳۳ و ۳۷	۱۷۸ - ۹/۱
۲	″						
۳	دشمن کے خیمہ زن ہونے کے بعد ان کی خبریں معلوم کرنا	۰	۵۴	۰	۰	۰	۴۳-۴۷/۴
۴	″						۰
۵	اُحد سے قبل دشمن کے بارے میں معلومات حاصل کرنا	۰	۲۰۶ - ۷	۳۷/۲	۰	۰	۱۲۵ - ۶/۱
۶	″						۴۲۵ - ۶/۴
۷	احد میں خیمہ زن ہونے کے بعد دشمن کے بارے میں خبریں معلوم کرنا	۰	۲۰۷	″	۰	۰	۳۶۴ - ۵/۱
۸	جنگ کے بعد ″ ″ ″ ″	۰	۰	۰	۰	۵۲۷ - ۸/۲	۱۶ - ۴۰/۴
۹	قریش کے ارادوں کا پتا لگانا	۰	۰	۰	۰	۰	۱۱۷/۱
۱۰	″ ″ ″	۰	۰	۰	۰	۵۴۱ - ۲/۲	۸۶/۴
۱۱	بنو مصطلق کے ارادوں کے بارے میں تصدیق کرنا	۰	۴۰۴	۶۳ / ۲	۰	۰	۱۷۵ - ۶/۱
۱۲	بنو قریظہ ″ ″ ″	۰	۴۶۰ - ۶۱	۰	۰	۰	۰
۱۳	احزاب ″ ″ معلوم کرنا	۰	۴۸۹ - ۹۰	۶۹ / ۲	۰	۵۷۹ - ۸۱/۲	۳۹۰ - ۲/۱
۱۴	بنو قریظہ کی غداری کی خبروں کی تصدیق کرنا	۰	۴۵۷	۰	۰	۰	۱۹۶ - ۹/۱
۱۵	قریش کے ارادوں کا پتا لگانا	۰	۵۷۳	۹۵ / ۲	۰	۰	۱۸۱/۱
۱۶	ہوازن ″ ″ ″	۰	۸۹۴		۰	۰	۱۲۹ - ۳۰/۱
۱۷	دشمن کی کمین گاہ کا پتا لگانا	۰	۸۹۳	۱۵۰ / ۲	۰	۷۳ / ۳	۱۴۱ - ۲/۳

ضمیمہ اوّل-۶   راہ بر (دلیل)

نمبر شمار	راہ بر	قبیلہ / خاندان	زمانہ قبولِ اسلام	مہم	تاریخ مہم
۱	حضرت عبداللہ بن اریقط	/ دئل	س	سفر ہجرت نبوی	صفر-ربیع الاول ۱ھ / اگست ستمبر ۶۲۲ء
۲	״ سعد العرجی	کنانہ / اسلم	״	״	״ ״
۳	״ ابو حثمہ	اوس / حارث	״	اُحد	شوال ۳ھ / مارچ ۶۲۵ء
۴	״ ثابت بن ضحاک	خزرج / عمرو بن عوف	״	حمراء الاسد	״ ״
۵	״ مذکور	عذرہ	۔	دومۃ الجندل	ربیع الاول و الثانی ۵ھ / اگست ستمبر ۶۲۶ء
۶	״ مسعود بن هنیدہ	اسلم	د	مریسیع	رجب ۵ھ / جنوری ۶۲۷ء
۷	״ ابو حدرد	״	״	غطفان	ربیع الثانی ۶ھ / اگست ۶۲۷ء
۸	״ عمرو بن عبد نہم	״	ط	حدیبیہ	ذی قعدہ ۶ھ / مارچ ۶۲۸ء
۹	״ حسیل بن خارجہ / نویرہ	غطفان / اشجع	״	خیبر	صفر ۷ھ / مئی-جون ۶۲۸ء
۱۰	״ عبداللہ بن نعیم	״	״	״	״ ״
۱۱	״ یاسر	یہود خیبر	ع	״	״ ״
۱۲	״ ابو عربیض	״	״	״	״ ״
۱۳	״ سماک	״	״	״	״ ״
۱۴	״ حسیل بن خارجہ / نویرہ	غطفان / اشجع	ط	سریہ بشیر بن سعد	شوال ۷ھ / فروری ۶۲۹ء
۱۵	״ غالب بن عبداللہ	کنانہ / لیث	س	فتح مکہ	رمضان ۸ھ / جنوری ۶۳۰ء
۱۶	״ علقمہ بن فغواء	خزاعہ / عامر بن ربیعہ	د	غزوہ تبوک	رجب-رمضان ۹ھ / اکتوبر-نومبر ۶۳۱ء

نمبر	کام کی نوعیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسدالغابہ
۱	مکہ سے العرج تک راہ بری	۔	۔	۔	۔	۔	۔
۲	العرج سے مدینہ تک راہ بری	۔	۔	۔	۔	۔	۲/۷-۲۸۶
۳	مدینہ سے احد تک 〃	۔	۲۱۸	۲/۳۶	۔	۲/۵۰۶	۵/۱۶۹
۴	مدینہ سے حمراء الاسد تک 〃	۔	۔	۔	۔	۔	۱/۶-۲۲۵
۵	مدینہ سے دومہ تک 〃	۔	۴۰۳	۔	۔	۔	۴/۳۴۲
۶	مدینہ سے مریسیع تک 〃	۔	۔	۔	۔	۔	۴/۳۶۰
۷	〃 〃 علاقہ غطفان تک راہ بری	۔	۔	۔	۔	۔	۵/۷۰-۱۶۹
۸	〃 〃 حدیبیہ تک 〃	۔	۵۸۴	۔	۔	۔	۴/۲۰-۱۱۹
۹	〃 〃 خیبر 〃 〃	۔	۶۳۹	۳/۲۳	۔	۔	۲/۱۶
۱۰	خیبر کی مہم کے دوران	۔	〃	۔	۔	۔	۳/۲۶۸
۱۱	〃 〃	۔	۶۴۱	۔	۔	۔	۔
۱۲	〃 〃	۔	۔	۔	۔	۔	۵/۲۵۳
۱۳	〃 〃	۔	۶۴۷ - ۸	۔	۔	۔	۲/۳۵۲
۱۴	دوران سریہ اور مدینہ سے علاقہ مہم تک	۔	۷۲۷	۔	۔	۔	۲/۱۶
۱۵	مکہ کا مختصر ترین راستہ بتایا اور راہبری کی	۔	۔	۔	۔	۔	۴/۱۶۸
۱۶	مکہ سے تبوک تک	۔	۹۹۹	۔	۔	۔	۴/۱۴-۱۳

ضمیمہ اول۔ ۷ اموالِ غنیمت اور قیدیوں کے نگراں افسر (اصحاب المغانم)

نمبر شمار	صاحب المغانم	قبیلہ / خاندان	زمانہ قبول اسلام	مہم	تاریخ مہم
۱	حضرت عبداللہ بن کعب	خزرج / نجار	س	غزوۂ بدر	رمضان ۲ھ / مارچ ۶۲۴ء
۲	" " "	" "	"	متعدد ۔ غیر متعینہ	۔
۳	" صالح شقران	حبشی / مولائے رسول	الف	غزوۂ بدر	"
۴	" محمد بن مسلمہ	اوس / حارث	د	غزوہ بنی قینقاع	شوال ۲ھ / اپریل ۶۲۴ء
۵	" عبادہ بن صامت	خزرج	د	"	" "
۶	" منذر بن قدامہ	اوس / سالم[1]	س	"	" "
۷	" محمد بن مسلمہ	اوس / حارث	د	" بنو نضیر	ربیع الاول ۴ھ / اگست ۶۲۵ء
۸	" ابو رافع	مولائے رسول	الف	" "	" "
۹	" بریدہ بن حصیب	اسلم	د	مریسیع	شعبان ۵ھ / جنوری ۶۲۷ء
۱۰	" صالح شقران	حبشی / مولائے رسول	الف	"	" "
۱۱	" محمیہ بن جزء	زبید / حلیف بنی جمح	ب	"	" "
۱۲	" مسعود بن ہنیدہ	اسلم	د	"	" "
۱۳	" سعد بن زید	اوس / عبدالاشہل	س	بنو قریظہ	ذی الحجہ ۵ھ / مئی ۶۲۷ء
۱۴	" مسلم بن بجرہ	انصاری	ط	"	" "
۱۵	" محمد بن مسلمہ	اوس / عبدالاشہل	د	"	" "
۱۶	" محمیہ بن جزء	زبید	ب	"	" "
۱۷	" عبداللہ بن سلام	بنو قینقاع	س	"	" "

---

[1] بلاذری کے مطابق سُلَمی تھے۔

کام کی نوعیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
اموال غنیمت کے افسر	۰	۱۰۰	۱۸/۲	۰	۴۵۸/۲	۲۴۸-۹/۳	۱
خمس کے افسر	۰	۰	۰	۰	۰	〃	۲
قیدیوں کے افسر	۰	۱۰۵	۰	۰	۰	۳-۴/۳	۳
قیدیوں کے افسر اخراج اور مغانم کے افسر	۰	۱۷۸	۳۰، ۵۸/۲	۰	۰	۳۳۱/۴	۴
یہود کے اخراج کے انتظامات کے نگراں	۰	۰	۲۹/۲	۰	۴۸۱/۲	۱۰۶-۷/۳	۵
قیدیوں کو ہتھکڑیاں پہنانے کے ذمہ دار	۰	۱۷۷	〃	۳۰۹/۱	۰	۴۱۹/۴	۶
یہود کے اخراج کے نگراں افسر	۰	۳۷۴	۷۵/۲	۰	۰	۳۳۱/۴	۷
اموال غنیمت کے افسر	۰	۳۷۹	۰	۰	۰	۱۹۱/۵	۸
قیدیوں کے نگراں افسر	۰	۴۱۰	۶۴/۲	۰	۰	۱۷۵-۶/۱	۹
اموال غنیمت کے افسر	۰	〃	〃	۰	۰	۳-۴/۳	۱۰
خمس اور سہمان مسلمین کے افسر	۰	〃	〃	۰	۰	۳۳۴/۴	۱۱
خمس کے افسر	۰	۰	۰	۰	۰	۳۶۰/۴	۱۲
قیدیوں کو بطور غلام فروخت کرنے کے افسر	۰	۵۹۱-۲	۰	۰	۰	۲۷۹-۸۰/۲	۱۳
قتل ہونے والے قیدیوں کے نگراں افسر	۰	۰	۰	۰	۰	۳۶۰/۴	۱۴
〃 〃 〃 ہتھکڑی لگانا	۰	۵۰۹	۰	۰	۰	۳۳۰-۱/۴	۱۵
خمس کے افسر	۰	۰	۷۵/۲	۰	۰	۳۳۴/۴	۱۶
قیدیوں کے افسر اعلیٰ	۰	۵۰۹	〃	۰	۰	۱۷۶-۷/۳	۱۷

۱۸	حضرت علی بن ابی طالب	قریش / ہاشم	الف	بنو قریظہ	ذی الحجہ ۵ھ / مئی ۶۲۷ء
۱۹	〃 زبیر بن عوام	〃 / اسد	〃	〃	〃 〃
۲۰	〃 سعد بن عبادہ	خزرج / ساعدہ	س	〃	〃 〃
۲۱	〃 مرداس بن مروان	〃 / سلمہ	ط	غزوہ خیبر	صفر ۷ھ / مئی-جون ۶۲۸ء
۲۲	〃 فروہ بن عمرو	〃 / بیاضہ	د	غزوہ خیبر	〃 〃
۲۳	〃 ابو جہیمہ	انصاری	٠	〃	〃 〃
۲۴	〃 خزاعی بن عبد نہم	مُزینہ	س	فتح مکہ	رمضان ۸ھ / جنوری ۶۳۰ء
۲۵	〃 مسعود بن عمرو	غفار	ب	حنین	شوال ۸ھ / فروری ۶۳۰ء
۲۶	〃 عمرو بن قاری	قارہ	د	〃	〃 〃
۲۷	〃 بدیل بن ورقاء	خزاعہ	ف	〃	〃 〃
۲۸	〃 بسر بن سفیان	〃	ط	〃 طائف	〃 〃
۲۹	〃 زید بن ثابت	خزرج / نجار	س	〃 〃	〃 〃
۳۰	〃 〃 〃	〃 〃	〃	جعرانہ	〃 〃
۳۱	〃 عمر بن خطاب	قریش / عدی	ب	〃	〃 〃
۳۲	〃 ابو رہم کلثوم بن حصین	غفار	〃	〃	〃 〃
۳۳	〃 ابو قتادہ	خزرج / سلمہ	س	سریہ علی طرف الفلس	ربیع الثانی ۹ھ / جولائی-اگست ۶۳۰ء

قتل کے مجرم قیدیوں کے قتل کے افسر	۰	۵ ۱ ۳	۰	۰	۰	۱۶-۴۰/۴	۱۸
〃 〃 〃	۰	〃	۰	۰	۰	۱۹۶-۷/۲	۱۹
بعض قیدیوں کے فروخت کے نگراں افسر	۰	۵ ۲ ۳	۰	۰	۰	۲۸۳-۵/۲	۲۰
اموال غنیمت کے افسر	۰	۰	۰	۰	۰	۳۴۷-۸/۴	۲۱
〃 〃 〃	۰	۶ ۸ ۰	۱۰۷/۲	۰	۰	۱۷۸-۹/۴	۲۲
〃 〃 〃 مدینہ پہنچانے کے افسر	۰	۰	۰	۰	۰	۱۶۵/۵	۲۳
〃 〃 پر قبضہ کرنے کے افسر	۰	۰	۰	۰	۰	۱۱۳/۲	۲۴
〃 〃 اور قیدیوں کو جعرانہ میں اکٹھا کرنے کے افسر	۴۵۹/۲	۰	۰	۰	۸۱/۳	۳۵۹/۴	۲۵
〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃	۰	۰	۰	۰	۰	۱۲۶/۴	۲۶
جعرانہ میں جمع شدہ اموالِ غنیمت کے افسر	۰	۹ ۸ ۳	۰	۰	۰	۱۷۰/۱	۲۷
حنین کے قیدیوں کے لیے کپڑے خریدنے کے افسر	۰	۹ ۴ ۳	۰	۰	۰	۱۸۱-۲/۱	۲۸
اموالِ غنیمت اور قیدیوں کو شمار کرنے کے افسر	۰	۹ ۴ ۹	۰	۰	۰	۲۲۱-۲/۲	۲۹
انصار سے قیدیوں کو رہا کرانے کے ذمہ دار	۰	۹ ۵ ۲	۰	۰	۰	〃	۳۰
مہاجرین سے اسیرانِ حنین کو رہا کرانا	۰	〃	۰	۰	۰	۵۲-۷۲/۴	۳۱
بدوی قبائل سے 〃 〃 〃	۰	〃	۰	۰	۰	۱۹۷/۵	۳۲
اموالِ غنیمت اور قیدیوں کے افسر	۰	۰	۱۶۴/۲	۰	۰	۲۷۴-۵/۵	۳۳

ضمیمہ اوّل - ۸ اسلحہ اور گھوڑوں کے افسر (اصحاب السلاح والفرس)

نمبر شمار	افسر	قبیلہ / خاندان	زمانہ قبول اسلام	مہم	تاریخ مہم
۱	حضرت سعد بن ابی وقاص	قریش / زہرہ	الف	بدر سے قبل	۱-۲ھ / ۶۲۳-۴ء
۲	" بشیر بن سعد	خزرج / ساعدہ	س	عمرۃ القضیہ	ذی قعدہ ۷ھ / مارچ ۶۲۹ء
۳	" اوس بن خولی	"		"	"
۴	" عبدالرحمٰن بن ازہر	قریش / زہرہ	ف	حنین	شوال ۸ھ / فروری ۶۳۰ء

کام کی نوعیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
ریاستی گھوڑوں کے افسر	۰	۰	۰	۰	۰	۲۶۸/۲	۱
اسلحہ کے افسر	۰	۷۳۳	۱۲۱/۲	۰	۲۶/۳	۱۹۵/۱	۲
〃 〃	۰	۷۳۵	〃	۰	۰	۰	۳
گھوڑوں کے افسر	۰	۰	۰	۰	۰	۲۷۹/۳	۴

ضمیمہ اوّل - ۹ (محافظ دستوں کے افسر)

نمبر شمار	محافظ	قبیلہ / خاندان	زمانۂ قبول اسلام	مہم	تاریخ مہم
۱	حضرت سعد بن معاذ	اوس / عبدالاشہل	س	غزوۂ بدر	رمضان سنہ ۲ھ / مارچ سنہ ۶۲۴ء
۲	″ ″ ″	″ ″	″	″ اُحد	شوال سنہ ۳ھ / اپریل سنہ ۶۲۵ء
۳	″ اسید بن حضیر	″ ″	″	″ ″	″ ″
۴	″ سعد بن عبادہ	خزرج / ساعدہ	د	″ ″	″ ″
۵	″ محمد بن مسلمہ	اوس / حارث	″	″ ″	″ ″
۶	″ ذکوان بن عبد قیس	″ / زریق	″	″ ″	″ ″
۷	″ سعد بن عبادہ	″ / ساعدہ	″	حمراء الاسد	″ ″
۸	″ حباب بن منذر	″ .	″	″	″ ″
۹	″ سعد بن معاذ	اوس / عبدالاشہل	″	″	″ ″
۱۰	″ اوس بن خولی	خزرج / سالم	س	″	″ ″
۱۱	″ قتادہ بن نعمان	اوس / ظفر	د	″	″ ″
۱۲	″ عبید بن اوس	″ ″	س	″	″ ″
۱۳	″ عباد بن بشر	″ / عبدالاشہل	د	″	″ ″
۱۴	″ ″ ″	″ ″	″	ذات الرقاع	محرم سنہ ۵ھ / جون سنہ ۶۲۶ء
۱۵	″ عمار بن یاسر	مذحج / عنس	الف	″	″ ″
۱۶	″ عباد بن بشر	اوس / عبدالاشہل	د	حدیبیہ	ذی قعدہ سنہ ۶ھ / اگست ستمبر سنہ ۶۲۷ء
۱۷	″ سلمہ بن اسلم	″ / حارث	″	″	″ ″
۱۸	″ بلال بن رباح	حبشی / مولائے رسول	الف	وادی القریٰ	صفر سنہ ۷ھ / جون سنہ ۶۲۸ء

کام کی نوعیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
میدانِ جنگ میں العریش کے باہر نگراں و محافظ	۰	۵۵	۰	۰	۳۴۹/۲	۲۹۶-۹/۲	۱
رسول کریم کے مکان پر محافظ دستے کے افسر	۰	۲۰۸	۳۷/۲	۳۱۴/۱	۰	″	۲
″ ″ ″	۰	″	″	″	۰	۹۲-۳/۱	۳
″ ″ ″	۰	″	″	″	۰	۲۸۳-۵/۲	۴
پچاس سپاہیوں کے دستے کے افسر	۰	۰	۰	۳۱۵/۱	۰	۰	۵
رسول کریم کے شیخین نامی مقام پر محافظ	۰	۲۱۷	۰	۰	۰	۱۳۷/۲	۶
محافظِ رسول	۰	۳۳۴	۰	۰	۰	۲۸۳-۵/۲	۷
″	۰	″	۰	۰	۰	۳۶۴-۵/۱	۸
″	۰	″	۰	۰	۰	۲۹۶-۷/۲	۹
″	۰	″	۰	۰	۰	۱۴۴/۱	۱۰
″	۰	″	۰	۰	۰	۱۹۵-۶/۴	۱۱
″	۰	″	۰	۰	۰	۳۳۶/۳	۱۲
″	۰	۳۳۶	۰	۰	۰	۱۰۰-۱/۳	۱۳
محافظ افواجِ اسلامی	۰	۳۹۷	۰	۰	۰	″	۱۴
″	۰	″	۰	۰	۰	۴۳-۷/۴	۱۵
محافظ رسول	۰	۶۰۶	۰	۰	۰	۱۰۰-۱/۳	۱۶
″	۰	″	۰	۰	۰	۲۳۲-۳۳/۲	۱۷
″ و فوج اسلامی	۰	۰	۰	۰	۱۷/۳	۲۰۶/۱	۱۸

ضمیمہ دوم - ۱ خلفائے رسُول (نواب، خلفاء)

نمبر شمار	خلیفہ / نائب	قبیلہ / خاندان	زمانہ قبول اسلام	مہم / موقعہ	تاریخ مہم / تقرری
۱	حضرت سعد بن عبادہ	خزرج / ساعدہ	د	ودان	صفر ۲ھ / اگست ۶۲۳ء
۲	" سعد بن معاذ	اوس / عبدالاشہل	"	بواط	ربیع الاول ۲ھ / ستمبر ۶۲۳ء
۳	" زید بن حارثہ	کلب / مولائے رسول	الف	بدر اولیٰ / سفوان	" "
۴	" ابو سلمہ بن عبدالاسد	قریش / مخزوم	"	ذات العشیرہ	جمادی الآخرہ ۲ھ / دسمبر ۶۲۳ء
۵	" عمرو بن ام مکتوم	" / عامر بن لوی	"	بدر الکبریٰ	رمضان ۲ھ / مارچ ۶۲۴ء
۶	" ابو لبابہ بشیر بن عبدالمنذر	اوس / عمرو بن عوف	س	"	" "
۷	" حارث بن حاطب	" "	"	"	" "
۸	" عاصم بن عدی	" / عجلان	"	"	" "
۹	" ابو لبابہ بشیر بن عبدالمنذر	اوس / عمرو بن عوف	"	بنو قینقاع	شوال ۲ھ / اپریل ۶۲۴ء
۱۰	" " "	" "	"	سویق	ذی قعدہ ۲ھ / مئی-جون ۶۲۴ء
۱۱	" عمرو بن ام مکتوم[1]	قریش / عامر بن لوی	الف	الکدر	محرم ۳ھ / جولائی ۶۲۴ء
۱۲	" عثمان بن عفان	" / امیہ	"	ذوامر / غطفان	ربیع الاول ۳ھ / ستمبر ۶۲۴ء
۱۳	" عمرو بن ام مکتوم	" / عامر بن لوی	"	بحران	جمادی الاولیٰ ۳ھ / اکتوبر-نومبر ۶۲۴ء
۱۴	" " "	" "	"	احد	شوال ۳ھ / مارچ ۶۲۵ء
۱۵	" " "	" "	"	حمراء الاسد	" "
۱۶	" ابو سلمہ بن عبدالاسد	" / مخزوم	"	ذات العشیرہ	محرم ۴ھ / جون ۶۲۵ء
۱۷	" عمرو بن ام مکتوم	" / عامر بن لوی	"	بنو نضیر	ربیع الاول ۴ھ / اگست ۶۲۵ء

---

[1] اس مہم میں دوسری روایت کے مطابق حضرت سباع بن عرفطہ غفاری نائب رسول تھے۔

کیفیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
۰	۵۹ - ۶۱/۱	۰	۸/۲	انساب ۱/۲۸۷	۴۰۷/۲	۲۸۳-۵/۲	۱
ابن ہشام ۱/۵۹۸ کے مطابق حضرت سائب بن عثمان جمحی	۰	۰	"	"/"	"	۲۹۶-۹/۲	۲
۰	۰	۰	۹/۲	"/"	"	۲۳۴-۷/۲	۳
۰	۵۹۸/۱	۰	"	۲۹۴/"	۴۰۸/۲	۲۱۸/۵	۴
ابن ہشام کے بقول حضرت عمرو کی جگہ ابولبابہ نے لی تھی	۶۱۲/۱	۰	۰	۰	۰	۱۲۷/۴	۵
حضرت ابولبابہ کو روحاء سے بھیجا گیا تھا	۰	۱۸۰	۱۲/۲	"/"	۴۷۸/۲	۲۹۸/۵	۶
بالائی مدینے کے علاقے میں	۰	"	"	۲۸۹/"	"	"	۷
مدینہ زیریں کے لیے	۰	"	"	"/"	"	۰	۸
پندرہ دن عہدہ مدت	۰	"	۲۹ ۴۳/۲	۳۰۹/"	۴۸۱/۲	ایضاً	۹
پانچ " " "	۴۵/۲	۸۲ و ۱۸۰	۳۰ ۶۲/۲	۳۱۰/"	"	"	۱۰
پندرہ " " "	۴۳/۲	۱۸۴	۳۱/۲	"/"	۴۸۳/۲	"	۱۱
گیارہ " " "	۴۶/۲	۱۹۶	۳۵/۲	۳۱۱/"	۰	۳۷۶-۸/۳	۱۲
دس " " "	"	۱۹۷	۳۵-۶/۲	"/"	۰	۱۲۷/۴	۱۳
۰	"	۱۹۹	۳۹/۲	۳۳۸/"	۰	"	۱۴
پانچ دن عہدہ مدت	۱۰۲/۲	۰	۴۹/۲	"/"	۵۳۶/۲	"	۱۵
۰	۰	۰	"	۰/"	۰	۲۱۸/۵	۱۶
پندرہ دن عہدۂ مدت	۰	۳۷۱	۵۸/۲	۳۳۸/"	۵۵۵/۲	۱۲۷/۴	۱۷

۱۸	حضرت عبداللہ بن رواحہ[1]	خزرج	س	بدر الموعد	ذی قعدہ ۴ھ / اپریل ۶۲۶ء
۱۹	" عثمان بن عفان	قریش / امیہ	الف	ذات الرقاع	محرم ۵ھ / جون ۶۲۶ء
۲۰	" سباع بن عرفطہ	غفار	ب	دومۃ الجندل	ربیع الاول و الثانی ۵ھ / اگست ستمبر ۶۲۶ء
۲۱	" زید بن حارثہ	کلب / مولائے رسول	الف	مریسیع	رجب ۵ھ / جنوری ۶۲۷ء
۲۲	" عمرو بن ام مکتوم	قریش / عامر بن لوی	"	خندق	ذی قعدہ ۵ھ / اپریل ۶۲۷ء
۲۳	" " "	" "	"	بنو قریظہ	" ذی الحجہ ۵ھ / مئی ۶۲۷ء
۲۴	" " "	" "	"	لحیان	ربیع الاول ۶ھ / جولائی ۶۲۷ء
۲۵	" " "	" "	"	الغابہ	ربیع الثانی ۶ھ / اگست ۶۲۷ء
۲۶	" " " [2]	" "	"	حدیبیہ	ذی قعدہ ۶ھ / مارچ ۶۲۸ء
۲۷	" سباع بن عرفطہ [3]	" "	ب	خیبر / فدک / وادی القریٰ	صفر ۷ھ / جون ۶۲۸ء
۲۸	" ابو رہم کلثوم بن حصین[4]	غفار	س	عمرۃ القضیہ	ذی قعدہ ۷ھ / مارچ ۶۲۹ء
۲۹	" عمرو بن ام مکتوم [5]	قریش / عامر بن لوی	الف	فتح مکہ	رمضان ۸ھ / جنوری ۶۳۰ء
۳۰	" " "	" "	"	حنین / طائف	" شوال ۸ھ / فروری ۶۳۰ء
۳۱	" محمد بن مسلمہ [6]	اوس / عبد الاشہل	د	تبوک	رجب۔ رمضان ۹ھ / اکتوبر۔ دسمبر ۶۳۱ء
۳۲	" علی بن ابی طالب	قریش / ہاشم	الف	"	"
۳۳	" سباع بن عرفطہ [7]	غفار	س	حجۃ الوداع	ذی الحجہ ۱۰ھ / مارچ ۶۳۲ء

---

[1] ابن ہشام، ۳/ ۲۰۹، کے مطابق حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن ابی بن سلول نائبِ رسول تھے۔

[2] وکان ابن ام مکتوم علی الصلاۃ ۱/ ۳۵۰۔

[3] ابنِ ہشام، ۳/ ۳۰۰، کے مطابق حضرت عویف بن الاضبط نائبِ رسول تھے۔ بلاذری ۱/ ۳۵۳ میں ابو ذر غفاری کا نام بھی ہے۔

[4] طبری، ۳/ ۱۰۳ کے مطابق حضرت سباع بن عرفطہ غفاری نائبِ رسول تھے۔

سولہ دن عہدہ مدت	۰	۳۸۴	۲/۵۹	۰	۲/۵۶۱	۳/۱۵۶-۹	۱۸
پندرہ دن ″	۲/۲۰۳	۴۰۲	۲/۶۱	انساب ۱/۳۴۰	۲/۵۵۶	۳/۲۷۶-۸۴	۱۹
پچیس دن ″	۲/۲۱۳	۴۰۴	۲/۶۲	″/۳۴۱	۲/۵۶۴	۲/۲۵۹	۲۰
اٹھائیس دن ″	۰	۰	۲/۶۳	″/۳۴۲	۰	۲/۲۳۳-۷	۲۱
پندرہ دن ″	۲/۲۲۰	۴۴۱	۲/۶۶	″/۳۴۵	۰	۴/۱۲۷	۲۲
″ ″ ۲۳ ذی قعدہ تا ۲ ذی الحجہ	۲/۲۳۴	۴۹۶	۲/۷۴	″/۳۴۷	۰	″	۲۳
۰	۲/۲۷۹	۵۳۷	۲/۷۹	″/۳۴۸	۰	″	۲۴
پانچ دن ″	۲/۲۸۴	۵۳۷ ۵۴۷	۲/۸۰	″/۳۴۹	۰	″	۲۵
تقریباً دو ماہ ″	۰	۵۷۳	۲/۹۵	″/۳۵۰	۰	″ [۳]	۲۶
۰	۰	۶۳۶	۲/۱۰۶	″/۳۵۲	۳/۹	۲/۲۵۹	۲۷
۰	۰	۰	۲/۱۲۰	۰	۰	۵/۲۵۰	۲۸
تقریباً دو ماہ ″	۰	۰	۲/۱۳۵	″/۳۶۴	۳/۵۰	″	۲۹
۰	۰	۰	″	۰	۰	″	۳۰
۳ ماہ تقریباً مدتِ عہدہ	۳/۵۱۹	۹۹۵	۲/۱۶۵	۱/۳۶۸	۰	۴/۳۳۱	۳۱
خلیفہ رسول در امور بنی ہاشم	۳/۵۲۰	۰	۰	۰	۰	۴/۱۶-۴۰	۳۲
	۳/۶۰۰	۰	۰	۰	۰	۵/۱۸۴-۵	۳۳

[۳] ابن ہشام ۳/۳۰۸ کے مطابق نمیلہ بن عبداللہ لیثی نائبِ رسول تھے۔

[۴] ابن ہشام ۳/۳۲۸ اور اسد ۵/۳۴۴ کے مطابق نمیلہ بن عبداللہ لیثی نائبِ رسول تھے۔

[۵] ابن ہشام ۳/۲۹۹ کے مطابق حضرت ابورہم غفاری نائبِ رسول تھے مگر واقدی نے تردید کی ہے۔ نیز بلاذری ۱/۳۶۴۔

[۶] ایک روایت میں حضرت ابودجانہ انصاری کا نام ہے۔ بلاذری ۱/۳۶۸ میں حضرت ابن ام مکتوم کا نام ہے۔

ضمیمہ دوم - ۲ مشیرانِ نبوی (المشیرون)

نمبر شمار	مشیر	قبیلہ / خاندان	زمانہ قبول اسلام	مہم / موقعہ	تاریخ مہم / موقعہ
۱	حضرت ابوبکر صدیق	قریش / تیم	الف		
۲	〃 عمر بن خطاب	〃 / عدی	ب		
۳	〃 مقداد بن عمرو	قضاعہ / بہراء	〃		
۴	〃 سعد بن معاذ	اوس / عبدالاشہل	د	غزوۂ بدر	رمضان ۲ھ / مارچ ۶۲۴ء
۵	〃 سعد بن عبادہ	خزرج / ساعدہ	〃		
۶	〃 حباب بن منذر	〃 / سلمہ	〃		
۷	〃 〃 〃	〃 〃	〃	〃	〃 〃
۸	〃 حمزہ بن عبدالمطلب	قریش / ہاشم	الف		
۹	〃 سعد بن عبادہ	خزرج / ساعدہ	د		
۱۰	〃 نعمان بن مالک	اوس / سالم	س		
۱۱	〃 مالک بن سنان	خزرج / خدرہ	〃	غزوۂ اُحد	شوال ۳ھ / مارچ ۶۲۵ء
۱۲	〃 ایاس بن اوس	اوس / عبدالاشہل	〃		
۱۳	〃 خیثمہ بن حارث	〃 / عمرو بن عوف	〃		
۱۴	〃 انس بن قتادہ	〃 / 〃	〃		
۱۵	〃 سلمان فارسی	ایرانی / مولائے رسول	〃	غزوۂ خندق	ذی قعدہ ۵ھ / اپریل ۶۲۷ء
۱۶	〃 سعد بن عبادہ	خزرج / ساعدہ	د	〃	〃 〃 -
۱۷	〃 سعد بن معاذ	اوس / عبدالاشہل	〃	〃	〃 〃
۱۸	〃 عمر بن خطاب	قریش / عدی	ب	حدیبیہ	ذی قعدہ ۶ھ / اپریل ۶۲۸ء
۱۹	〃 حباب بن منذر	خزرج / سلمہ	د	خیبر	صفر ۷ھ / جون ۶۲۸ء

کام کی نوعیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
(۱) جنگ سے پہلے لڑنے یا نہ لڑنے کے بارے میں مشورہ۔ سب کا بالاتفاق جنگ کرنے کے حق میں مشورہ۔				۱/۴-۲۹۳		۲۰۵-۲۳/۳	۱
				″ ۲۹۲/۱		۵۲-۷۲/۴	۲
		۴۸-۵۳ ۱۰۷-۸		″	۴۳۴-۳۰/۲ ۴۷۴-۷/۲	۴۰۹/۴	۳
(۲) جنگ کے بعد قیدیوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں مشورہ خاص کر اول الذکر دو سے۔				″		۲۹۶-۹/۲	۴
				″		۲۸۳-۵/۲	۵
				″		۳۶۴-۵/۱	۶
خیمہ گاہ کے موزوں مقام کا مشورہ	۰	۵۳	۰	۲۹۳/۱	۴۳۰/۲	″	۷
						۴۶-۵۰/۲	۸
						۲۸۳-۵/۲	۹
						۲۹-۳۰/۵	۱۰
ان تمام صحابہ کرام نے شہر سے باہر نکل کر جنگ کرنے کا نہ صرف مشورہ دیا تھا بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال اور فیصلہ کو تبدیل کرایا تھا	۰	۲۰۹-۱۳	۰	۰	۵۰۲-۳/۲	۲۸۱/۴	۱۱
						۱۵۳/۱	۱۲
						۱۲۹/۲	۱۳
						۱۲۶/۱	۱۴
مدینہ کے گرد خندق کھودنے کا مشورہ	۴۵۰/۲	۴۴۴-۵	۰	۳۴۳/۱	۵۶۶/۲	۲۲۸-۳۲/۲	۱۵
قبیلۂ غطفان کو میدانِ جنگ سے واپسی کے عوض مدینہ کی ⅓ پیداوار کی تجویز کے خلاف مشورہ	۰			۳۴۶/۱	۵۷۳/۲	ایضاً	۱۶
						″	۱۷
حضرت عثمان کی بطور سفیر نبوی تقرری کی تجویز	۳۱۵/۲	۶۰۰	۹۷/۲	۰	۶۳۰-۳۱/۲	ایضاً	۱۸
قلعہ سے ذرا دور ہٹ کر خیمہ زن ہونے کا مشورہ	۰	۶۴۳-۴	۰	۰	۰	۳۶۴-۵/۱	۱۹

۲۰	حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ	قریش/تیم	الف	خیبر	صفر ۷ھ / جون ۶۲۸ء
۲۱	″ سعد بن عبادہ	خزرج/ساعدہ	د	″	″ ″
۲۲	″ ابوبکر صدیق	قریش/تیم	الف	سریۂ بشیر بن سعد	شعبان ۷ھ / فروری ۶۲۹ء
۲۳	″ عمر فاروق	″ /عدی	ب	″	″ ″
۲۴	″ ″ ″	″	″	غزوۂ حنین	شوال ۸ھ / فروری ۶۳۰ء
۲۵	″ حباب بن منذر	خزرج/سلمہ	د	″ طائف	″ ″
۲۶	″ سلمان فارسی	ایرانی/مولائے رسول	س	″	″ ″
۲۷	″ نوفل بن معاویہ	دئل	ط	″	″ ″
۲۸	″ عمر بن خطاب	قریش/عدی	ب	تبوک	رمضان ۹ھ / دسمبر ۶۳۱ء

دباؤ ڈالنے کے لیے بعض کھجور کے درختوں کے کاٹنے کا مشورہ	۔	۶۴۳/۴	۔	۔	۔	سابق	۲۰
حضرت ابوبکر کے مشورہ کے خلاف نہ کاٹنے کا مشورہ	۔	۶۵۱/۲	۔	۔	۔	″	۲۱
دونوں کا متفقہ مشورہ کہ حضرت بشیر کو افسر سریہ مقرر کیا جائے	۔	۷۲۸	۔	۔	۔	۔	۲۲، ۲۳
طریق جنگ کے بارے میں مشورہ	۔	۸۹۲	۔	۔	۷۳/۳	سابق	۲۴
خیمہ گاہ کے انتخاب کے بارے میں	۔	۹۲۵/۶	۔	۔	۔	″	۲۵
منجنیق بنانے اور استعمال کرنے کا مشورہ	۔	۹۲۷	۔	۳۶۷/۱	۔	″	۲۶
محاصرہ اٹھا لینے کا مشورہ	۔	۹۳۷	۔	۔	۸۴/۳	۴۷/۵	۲۷
مدینہ کو واپس ہونے کا مشورہ	۔	۱۰۱۹	۔	۔	۔	سابق	۲۸

ضمیمہ دوم - ۳ سکریٹری (کاتبینِ رسول)

نمبر شمار	کاتب / سکریٹری	قبیلہ / خاندان	زمانہ قبول اسلام	مہم / موقعہ	تاریخ مہم / موقعہ
۱	حضرت ابی بن کعب	خزرج / نجار	س	مدنی عہد	سنہ ۱-۱۱ھ / سنہ ۶۲۲-۳۲ء
۲	" زید بن ثابت	" "	"	"	" "
۳	" علی بن ابی طالب لہ	قریش / ہاشم	الف	"	" "
۴	" عثمان بن عفان لہ	" / امیّہ	"	"	" "
۵	" خالد بن سعید لہ	" "	"	"	" "
۶	" ابان بن سعید	" "	ط	"	سنہ ۸-۱۱ھ / سنہ ۶۳۰-۳۲ء
۷	" شرحبیل بن حسنہ لہ	کندہ	الف	"	سنہ ۱-۱۱ھ / سنہ ۶۲۲-۳۲ء
۸	" معاویہ بن ابی سفیان	قریش / امیہ	ع	"	سنہ ۷-۱۱ھ / سنہ ۶۲۹-۳۲ء
۹	" مغیرہ بن شعبہ	ثقیف	ط	"	سنہ ۵-۱۱ھ / سنہ ۶۲۷-۳۲ء
۱۰	" ارقم بن ابی الارقم لہ	قریش / مخزوم	الف	"	سنہ ۱-۱۱ھ / سنہ ۶۲۲-۳۲ء
۱۱	" علاء بن عقبہ	.	.	"	"
۱۲	" علاء بن حضرمی	حضرموت	ب	"	"
۱۳	" عبداللہ بن زید	انصاری	.	"	"
۱۴	" جہیم بن صلت	قریش / مطلب	ط	"	سنہ ۶-۱۱ھ / سنہ ۶۲۷-۳۲ء
۱۵	" زبیر بن عوام	" / اسد	الف	"	سنہ ۱-۱۱ھ / سنہ ۶۲۲-۳۲ء
۱۶	" عبداللہ بن ارقم	" / زہرہ	ع	"	سنہ ۷-۱۱ھ / سنہ ۶۲۹-۳۲ء
۱۷	" حنظلہ الاسیدی	تمیم / اُسید	.	"	.
۱۸	" عقبہ	.	.	"	.
۱۹	" قضاعی بن عمرو	عذرہ	.	"	.
۲۰	" سجل	.	.	"	.

لہ مکی عہد میں بھی کاتب تھے۔

	کام کی نوعیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ
۱	وحیِ الٰہی اور خطوط لکھنا ۔ کاتبِ اعظم	۰	۴۹۲ - ۳، ۷۸۲، ۶۹۴ وغیرہ	۲۶۷-۶۸/۱	۵۳۱/۱	۱۷۳/۳	۴۹/۱
۲	نائب کاتبِ اعظم ۔ وحی / خطوط	۰	۰	۰	″	″	۲۲۱-۲/۲
۳	وحی، خطوط، معاہدے، فرامین / صلح حدیبیہ	۰	۶۱۰	۲۶۷-۷۴/۱، ۹۷/۲	۰	۹۳۴-۵/۲، ۱۷۳/۳	۱۶-۲۰/۴
۴	وحی اور خطوط	۰	۰	۲۸۴/۱	۵۳۲/۱	۱۷۳/۳	۳۷۶-۸۴/۳
۵	″	۵۴۳/۲	۹۶۷	۲۶۵-۸۵/۱	″	″	۸۲/۲
۶	خطوط	۰	۰	۰	″	″	۳۵-۷/۱
۷	وحی اور خطوط	۰	۰	۰	″	۰	۰
۸	وحی، خطوط، فرامین اور معاہدے / مستقل	۰	۰	۲۶۶-۸۷/۱	″	۱۷۳/۳	۳۸۵-۷/۴
۹	خطوط اور فرامین	۰	۰	۲۶۶-۷۴/۱	۰	۰	۴۰۶-۷/۴
۱۰	وحی ، خطوط	۰	۰	۲۶۸-۷۴/۱	۰	۰	۵۹-۶۱/۱
۱۱	خطوط	۰	۰	۲۷۱-۳/۱	۰	۰	۹/۴
۱۲	″	۰	۷۸۲	۲۶۹-۷۱/۱	۵۳۲/۱	۱۷۳/۳	۷-۸/۴
۱۳	″	۰	۰	۲۶۶-۷/۱	۰	۰	۱۶۸/۳
۱۴	″	۰	۰	۲۶۸/۱	۵۳۲/۱	۰	۳۱۱-۲/۱
۱۵	″	۰	۰	۲۶۹/۱	۰	۰	۱۹۶-۹/۱
۱۶	″	۰	۰	۰	۰	۰	۱۱۵/۳
۱۷	وحی اور خطوط	۰	۰	۰	۰	۱۷۳/۳	۵۸/۲
۱۸	خطوط	۰	۰	۲۷۱/۱	۰	۰	۴۱۸-۹/۳
۱۹	″	۰	۰	۲۷۰/۱	۰	۰	۲۰۵/۵
۲۰	وحی اور خطوط	۰	۰	۰	۰	۰	۲۶۱/۲

۲۱	حضرت نامعلوم نصرانی۔ نومسلم[1]	۰	۰	مدنی عہد	۰	
۲۲	〃 عبداللہ بن سعد بن ابی سرح[1]	قریش/ عامر بن لوی	ب/ف	〃	سنہ ۱-۵ھ /	سنہ ۶۲۲-۲۶ء
۲۳	〃 یزید بن ابی سفیان	〃/ امیہ	ع	〃	سنہ ۷-۱۱ھ /	سنہ ۶۲۹-۳۲ء
۲۴	〃 ابوبکر صدیق	〃/ تیم	الف	〃	سنہ ۱-۱۱ھ /	سنہ ۶۲۲-۳۲ء
۲۵	〃 عمر فاروق	〃/ عدی	ب	〃	〃	〃
۲۶	〃 ابوسفیان بن حرب	〃/ امیہ	ف	〃	سنہ ۸-۱۱ھ /	سنہ ۶۳۰-۳۲ء
۲۷	〃 عامر بن فہیرہ	〃/ تیم مولائے صدیق	الف	〃	سنہ ۱-۱۱ھ /	سنہ ۶۲۲-۳۲ء
۲۸	〃 طلحہ بن عبیداللہ	〃 〃	〃	〃	〃	〃
۲۹	〃 عبداللہ بن رواحہ	خزرج/ نجار	د	〃	سنہ ۱-۸ھ /	سنہ ۶۲۲-۲۹ء
۳۰	〃 خالد بن ولید	قریش/ مخزوم	ع	〃	سنہ ۷-۱۱ھ /	سنہ ۶۲۸-۳۲ء
۳۱	〃 حاطب بن عمرو	〃/ عامر بن لوی	الف	〃	سنہ ۱-۱۱ھ /	سنہ ۶۲۲-۳۲ء
۳۲	〃 حویطب بن عمرو	〃 〃	〃	〃	〃	〃
۳۳	〃 حذیفہ بن یمان	اوس/ عبدالاشہل	س	〃	〃	〃
۳۴	〃 حصین بن نمیر	۰	۰	〃	۰	
۳۵	〃 ابوایوب خالد انصاری	خزرج/ نجار	〃	〃	〃	〃
۳۶	〃 معیقب بن ابی فاطمہ	دوس	الف/ب	〃	〃	〃
۳۷	〃 عمرو بن عاص	قریش/ سہم	ع	〃	سنہ ۷-۱۱ھ /	سنہ ۶۲۸-۳۲ء
۳۸	〃 بریدہ (بن حصیب)	(اسلم؟)	س	〃	سنہ ۱-۱۱ھ /	سنہ ۶۲۲-۳۲ء
۳۹	〃 ابوسلمہ بن عبدالاسد	قریش/ مخزوم	الف	〃	〃	〃
۴۰	〃 عبد ربہ	۰	۰	۰	۰	
۴۱	〃 عبداللہ بن عبداللہ بن ابی بن سلول	خزرج	د	〃	〃	〃
۴۲	〃 ثابت بن قیس	〃	س	〃	〃	〃
۴۳	〃 محمد بن مسلمہ	اوس/ عبدالاشہل	د	〃	〃	〃
۴۴	〃 عبداللہ بن ہلال[3] (ابن خطل)[3]	قریش/ ادرم	الف	۰	۰	
۴۵	〃 عبداللہ بن ابی بکر صدیق	〃/ تیم	〃	〃	〃	〃

[1] مرتد ہوگئے۔ [2] مکی عہد میں بھی کاتب تھے۔ [3] مرتد ہوئے اور قتل کے جرم میں قتل ہوئے۔

وحی	۰	۰	۰	بخاری، قصہ اسلام ابی ذر		۰	٢١
″	۴۰۹/۲	۸۵۵	۰	۱/ ۵۳۱	۱۷۳/۳	۱۷۳-۴/۳	٢٢
خطوط	۰	۰	۰	۰	۰	۰	٢٣
وحی، خطوط/ فرامین	۰	۰	۰	۰	۰	۰	٢۴
″ ″ ″	۰	۰	۰	۰	۰	۰	٢۵
خطوط	۰	۰	۰	۰	۰	۰	٢٦
″	۰	۰	۰	۰	۰	۰	٢٧
″	۰	۰	۰	۰	۰	۰	٢٨
″	۰	۰	۰	۰	۰	۰	٢٩
″	۰	۰	۰	۰	۰	۰	٣٠
″	۰	۰	۰	۰	۰	۰	٣١
″	۰	۰	۰	۰	۰	۰	٣٢
″	۰	۰	۰	۰	۰	۰	٣٣
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	٣۴
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	٣۵
خطوط / خاتم نبوی کے محافظ بھی تھے	۰	۰	۰	۰	۰	۴/۳۰۴	٣٦
خطوط	۰	۰	۰	۰	۰	۰	٣٧
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	٣٨
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	٣٩
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۴٠
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۴١
خطوط	۰	۰	۱/۲۸۶	۰	۰	۱/۲۲۹-۳۰	۴٢
″	۰	۰	″	۰	۰	۱/۲۳۰-۱	۴٣
″	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۴۴
″	۰	۰	۱/۲۸۶	۰	۰	۰	۴۵

ضمیمہ دوم - ۴ سفیرانِ نبوی (رسل الرسول)

نمبر شمار	سفیر	قبیلہ / خاندان	زمانہ قبول اسلام	علاقہ / منزل	تاریخ تقرری
۱	حضرت عمر بن خطاب	قریش / عدی	ب	بدر / قریش مکہ	سنہ ۲ھ / سنہ ۶۲۴ء
۲	" محمد بن مسلمہ	اوس / عبدالاشہل	د	بنو نضیر	ذی قعدہ سنہ ۴ھ / .
۳	" نعیم بن مسعود	غطفان / اشجع	ط	غطفان، قریش / قریظہ	" سنہ ۵ھ / اپریل سنہ ۶۲۷ء
۴	" سعد بن معاذ	اوس / عبدالاشہل	د	بنو قریظہ	" "
۵	" سعد بن عبادہ	خزرج / ساعدہ	"	"	" "
۶	" عبداللہ بن رواحہ	" / نجار	"	"	" "
۷	" خراش بن امیہ	خزاعہ / کعب	س	قریش مکہ	ذی قعدہ سنہ ۶ھ / مارچ سنہ ۶۲۸ء
۸	" عثمان بن عفان	قریش / امیہ	الف	"	" "
۹	" علی بن ابی طالب	" / ہاشم	"	"	" "
۱۰	" دحیہ بن خلیفہ	کلب	س	قیصر روم ہرقل	محرم سنہ ۷ھ / مئی جون سنہ ۶۲۸ء
۱۱	" حاطب بن ابی بلتعہ	لخم / خلیفہ	الف	مقوقس مصر	" "
۱۲	" عبداللہ بن حذافہ	قریش / سہم	"	کسرائے ایران خسرو پرویز	" "
۱۳	" شجاع بن وہب	اسد خزیمہ / حلیف بنی امیہ	"	حارث بن ابی شمر شاہ تخوم شام	" "
۱۴	" مہاجر بن ابی امیہ	قریش / مخزوم	ف	شاہِ یمن (حمیر)	" "
۱۵	" سلیط بن عمرو	قریش / بنی عامر بن لوی	الف	سردار یمامہ ہوذہ بن علی	" "
۱۶	" عمرو بن امیہ	کنانہ / ضمرہ	س	شیخ مکہ ابوسفیان اموی	" "
۱۷	" " "	" "	"	شاہِ حبشہ نجاشی	" "
۱۸	" عمرو بن العاص	قریش / سہم	ع	شاہانِ عمان جیفر و عبد	ذی قعدہ سنہ ۸ھ / فروری مارچ سنہ ۶۳۰ء
۱۹	" علاء بن حضرمی	حضر موت	الف / ب	شاہِ بحرین منذر بن ساوی	" "

نوعیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسدالغابہ	
لشکرِ قریش کو واپس مکہ جانے کا حکم پہنچانا	•	•	•	۲۹۲/۱	•	•	۱
یہودی قبیلہ کو اخراج کے فیصلہ نبوی سے آگاہ کرنا	•	۳۶۶	۵۷/۲	•	•	۳۳۱/۴	۲
احزاب کے مختلف گروہوں سے گفتگو کے لیے	•	•	•	•	۵۵۲-۳/۲	۳۳/۵	۳
						سابق	۴
یہودی قبیلہ کو معاہدہ پر قائم رہنے کی یاددہانی	۳۰۳/۲	۴۵۸-۹	•	•	۵۷۱/۲	"	۵
						"	۶
مسلمانوں کے مکہ میں داخلہ کی اجازت کے حصول کے لیے	•	۶۰۰	۹۶/۲	•	۶۳۱/۲	۱۰۸/۲	۷
" " " "	۳۱۵/۲	"	۹۷/۲	•	۶۳۰-۱/۲	سابق	۸
صلح حدیبیہ کا معاہدہ طے کرنے کے لیے	•	•	•	•	۶۳۰/۲	•	۹
دعوتِ اسلام، معاہدۂ صلح، دوستی	۶۰۷/۱	•	۲۵۸-۳/۱	۵۳۱/۱	۶۴۴-۵/۲	۱۳۰/۲	۱۰
" " "	"	•	"	"	"	۳۶۰-۲/۱	۱۱
" " "	"	•	"	"	"	۱۴۲-۴/۳	۱۲
" " "	"	•	"	"	"	۳۸۶/۱	۱۳
" " "	"	•	•	•	•	۴۲۲/۴	۱۴
" " "	"	•	۲۶۲/۱	۵۳۱/۱، فب ۹۷	۶۴۴-۵/۲	۳۴۴/۲	۱۵
تحائف لے کر	•	•	•	•	•	•	۱۶
مسلمانوں کو لانے کے لیے، دعوت	۳۵۹/۲، ۶۰۷	•	۲۵۸/۱	۵۳۱/۱	۶۴۴-۵۵/۲	۸۶/۴	۱۷
دعوت اسلام، معاہدۂ صلح، دوستی	۶۰۷/۱	•	۲۶۱/۱	•	۶۴۵/۲، ۲۹/۳	۱۱۵-۱۸/۴	۱۸
" " "	"	•	۲۶۳/۱	فب ۸۹	۶۴۵/۲، ۱۳۶/۳، ۲۹	•	۱۹

۲۰	حضرت ابو زید	انصاری	س	شاہِ عمان	ذی قعدہ سنہ ھ / فروری مارچ سنہ ۶۳۰ء
۲۱	” علقمہ بن فغواء	خزاعہ / عمرو بن ربیعہ	۰	شیخ مکہ ابوسفیان	غالباً سنہ ۹ھ / سنہ ۶۳۰ء
۲۲	” عمرو بن فغواء	” ”	۰		
۲۳	” نمیر بن خرشہ	ہوازن / ثقیف	۰	طائف، ثقیف	” ”
۲۴	” ظبیان بن مرثد	سدوس	ف	بکر بن وائل	” ”
۲۵	” حارث بن عمیر [1]	ازد / لہب	۰	شاہ بصریٰ شرحبیل بن عمرو غسانی	” ”
۲۶	” عیاش بن ابی ربیعہ	قریش / مخزوم	الف	شاہ حمیر (قوم)	” ”
۲۷	” دحیہ بن خلیفہ	کلب	س	ضغاطر الاسقف / نجران	” ”
۲۸	” وبر بن یحنس	خزاعہ	۰	ابناء الیمن	سنہ ۱۰-۱۱ھ / سنہ ۶۳۱-۲ء
۲۹	” ابو عامر	۰	۰	حدود شام	” ”
۳۰	” قطن بن حارثہ	کلب	ق	بنو کلیب اور حلفاء	” ”
۳۱	” عمرو بن امیہ	کنانہ / ضمرہ	س	مسیلمہ کذاب / یمامہ	” ”
۳۲	” حبیب بن زید [2]	خزرج / نجار	د	” ”	” ”
۳۳	” عبداللہ بن وہب	اسلم	س	” ”	” ”
۳۴	” فرات بن حیان عجلی	ربیعہ / عجل	”	حضرت ثمامہ بن اثال شیخ یمامہ	” ”
۳۵	” صلصل بن شرحبیل	۰	۰	بنو عامر	” ”
۳۶	” ضرار بن الازور	اسد خزیمہ	ق	بنو صیداء / اسد بنی دیل	” ”
۳۷	” عبداللہ بن عوسجہ	ہوازن / عرینہ	”	بنو حارثہ ... بن قریط	” ”
۳۸	” عبداللہ بن بدیل بن ورقاء	خزاعہ / کعب	ب	قبائل یمن	” ”
۳۹	” عبدالرحمٰن ” ” ”	” ”	”	”	” ”
۴۰	” جریر بن عبداللہ	بجیلہ	ق	ذوالکلاع و ذو ظلیم	” ”
۴۱	” اقرع بن عبداللہ	حمیر	”	ذو زود و ذو مران	” ”
۴۲	” زیاد بن حنظلہ	تمیم / عمرو	”	تمیم	” ”
۴۳	” نعیم بن مسعود	غطفان / اشجع	ط	اشجع	” ”

[1] شاہ بصریٰ کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

[2] مسیلمہ کذاب کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

دعوتِ اسلام، معاہدۂ صلح، دوستی	۰	۰	۰	قب ۸۰-۸۷	۰	۲۲۱-۲/۲	۲۰
قریش کے غرباء کے لیے رقم لے کر	۰	۰	۰	۰	۰	۱۳-۲/۴	۲۱
						۱۲۶/۴	۲۲
دعوت، معاہدۂ صلح، دوستی	۰	۰	۲۸۵/۱	۰	۰	۴۱/۵	۲۳
〃 〃 〃	۰	۰	۲۸۲/۱	۰	۰	۰	۲۴
〃 〃 〃	۰	۰	۱۲۸/۲	۰	۰	۳۴۱-۲/۱	۲۵
〃 〃 〃	۰	۰	۲۸۲/۱	۰	۰	۱۶۱/۴	۲۶
〃 〃 〃	۰	۰	۲۷۶/۱	۰	۰	سابق	۲۷
اسود عنسی کی بغاوت کو کچلنے کا حکم لے کر	۰	۰	۰	۰	۱۸۷/۳	۳۳۸/۴، ۸۳/۵	۲۸
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۲۴۰/۵	۲۹
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۲۰۷/۴	۳۰
اس کے خط کے جواب میں	۰	۰	۲۷۳/۱	۰	۰	۸۹/۴	۳۱
دعوت، معاہدۂ صلح، دوستی	۰	۰	۰	قب ۱۰۲	۰	۳۷۰/۱	۳۲
〃 〃 〃	۰	۰	۰	۰	۰	۲۷۲-۳/۳	۳۳
مسیلمہ کی بغاوت کو کچلنے کا حکم لے کر	۰	۰	۰	۰	۱۸۷/۳	۱۷۵/۴	۳۴
۰	۰	۰	۰	۰	〃	۲۹/۳	۳۵
۰	۰	۰	۰	۰	〃	۳۹-۴۰/۳	۳۶
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۲۳۹/۳	۳۷
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱۲۴-۵/۳	۳۸
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۲۸۲/۳	۳۹
دعوت، صلح، دوستی	۰	۰	۲۶۶/۲	۰	۱۸۷/۳	۲۷۹-۸۰/۱	۴۰
〃 〃 〃	۰	۰	۰	۰	〃	۱۱۰/۱	۴۱
〃 〃 〃	۰	۰	۰	۰	〃	۲۱۳/۲	۴۲
〃 〃 〃	۰	۰	۰	۰	〃	۳۳/۵	۴۳

ضمیمہ دوم - ۵ مخصوص افسرانِ نبوی / کمشنر

نمبر شمار	افسر خاص	قبیلہ / خاندان	زمانۂ قبول اسلام	علاقۂ تقرری	تاریخ تقرری
۱	حضرت سعد بن معاذ	اوس / عبدالاشہل	د	بنو قریظہ	ذی الحجہ ۵ھ / مئی ۶۲۷ء
۲	" علی بن ابی طالب	قریش / ہاشم	الف	جذام	جمادی الاولیٰ ۶ھ / نومبر ۶۲۷ء
۳	" ابو امامہ	ازد / باہلہ	ط	ازد / باہلہ	۷ھ / ۶۲۸ء
۴	" علی بن ابی طالب	قریش / ہاشم	الف	مکہ	رمضان ۸ھ / جنوری ۶۳۰ء
۵	" " " "	" "	"	بنو ضبیب / بنو جذیمہ	شوال ۸ھ / فروری ۶۳۰ء
۶	" " " "	" "	"	مکہ	ذی قعدہ ۹ھ / مارچ ۶۳۱ء
۷	" طلحہ بن عبید اللہ	" / تیم	"	مدینہ	۹ھ / ۶۳۱ء
۸	" مالک بن الدخشم	اوس / سالم	د	"	
۹	" معن بن عدی	" / عجلان	"	"	۹ھ / ۶۳۱ء
۱۰	" عاصم بن عدی	" "	"	"	
۱۱	" عمر بن خطاب	قریش / عدی	ب	"	۱-۱۱ھ / ۶۲۲-۳۲ء
۱۲	" انیس بن ضحاک	اسلم	س	قبیلہ اسلم	" "
۱۳	" حنظلہ بن یمان	غطفان / حلیف اوس	"	مدینہ	" "
۱۴	" علاء بن عقبہ	.	.	.	" "
۱۵	" ارقم	.	.	.	" "

کام کی نوعیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
بنو قریظہ کے بارے میں فیصلہ دینا - حکم	۰	۵۱۰	۷۵/۲	۳۴۷/۱ فب ۳۵	۵۸۳-۸/۲	۲۹۶-۹/۲	۱
حضرت زید بن حارثہ کے ہاتھوں مقتولوں کا قصاص ادا کرنا	۰	۵۵۹	۰	۰	۰	۰	۲
خون کھانے کی حرمت کا اعلان کرنے کے لیے جانا	۰	۰	۰	۰	۰	۱۰/۵	۳
حضرت خالد کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کا قصاص ادا کرنا	۴۳۰/۲	۰	۰	۰	۰	۱۶-۴۰/۴	۴
〃 〃 〃 〃	۰	۸۸۲	۰	۰	۰	۶۷-۸/۴	۵
حج ابی بکر میں قرآن کریم کے بعض احکام کا اعلان کرنا	۰	۰	۰	۰	۰	〃	۶
منافقوں کے ایک سازشی اڈے کو منہدم کرنا	۰	۰	۰	۰	۰	۵۹-۶۰/۳	۷
						۲۷۸-۹/۴	۸
منافقوں کی مسجد ضرار کو منہدم کرنا	۰	۱۰۴۶	۱۱۰/۲	۰	۰	۴۰۱/۴	۹
						۰/۳	۱۰
ایک نصرانی کی آدھی دولت ضبط کرنا	۰	۰	۰	۰	۰	۵۲-۷۲/۴	۱۱
اپنی قوم کی ایک زانیہ کو رجم کرنا	۰	۰	۰	۰	۰	۱۳۳/۱	۱۲
دو بھائیوں کے جائداد پر اختلاف کو دور کرنا	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱۳
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱۴
	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱۵

ضمیمہ دوم - ۶ شعراء وخطباءِ رسول

نمبر شمار	افسر خاص	قبیلہ / خاندان	زمانہ قبول اسلام	علاقہ تقرری	تاریخ تقرری
۱	حضرت حسان بن ثابت	خزرج / نجار	س	مدینہ	سنہ ۱-۱۱ھ / سنہ ۶۲۲-۳۲ء
۲	" کعب بن مالک	" / سلمہ	د	"	" "
۳	" عبد اللہ بن رواحہ	" / حارث	"	"	سنہ ۱-۸ھ / سنہ ۶۲۲-۲۹ء
۴	" عامر بن سنان	اسلم	س	"	سنہ ۱-۷ھ / سنہ ۶۲۲-۲۸ء
۵	" ثابت بن قیس بن شماس	خزرج	"	"	سنہ ۱-۱۱ھ / سنہ ۶۲۲-۳۲ء

کام کی نوعیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
ناموسِ رسول و مسلمانان کی حفاظت کرنا	۰	۱۲۲ - ۲۶ ۹۷۷ - ۷۸	۲۹۴ / ۱	۰	۵۲۳-۴۶/۲ ۱۱۷-۱۹/۳	۲۴۸ / ۲	۱
″ ″	۰	۰	۰	۰	۴۸۳و۵۴۸/۲	۲۴۸ / ۳	۲
″ ″	۰	۰	۰	۰	۰	۲۴۸ / ۳	۳
″ ″	۰	۰	۰	۰	۰	۸۲-۳/۳	۴
″ ″	۰	۹۷۶	۲۹۴ / ۱	۰	۱۱۶ / ۳	۲۲۹-۳۰/۱	۵

ضمیمہ دوم - ۷ متفرق ماتحت کارکن

نمبر شمار	افسر خاص	قبیلہ / خاندان	زمانہ قبول اسلام	علاقۂ تقرری	تاریخ تقرری
۱	حضرت عبداللہ بن زمعہ	قریش / اسد	ف	مدینہ	سنہ ۸-۱۱ھ / سنہ ۶۳۰-۳۲ء
۲	" عویم بن ساعدہ	اوس / عمرو بن عوف	د	"	شوال سنہ ۲ھ / اپریل سنہ ۶۲۴ء
۳	" رباح الاسود	حبشی / مولائے رسول	الف / س	"	سنہ ۹ھ / سنہ ۶۳۱ء
۴	" عنبسہ	•	•	"	•
۵	" ابوموسیٰ اشعری	اشعر	ب	"	•
۶	" انس بن مالک	•	س	"	•

کام کی نوعیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
مستقل دربانی دولتکدۂ رسالت	.	.	.	.	.	۱۶۴-۵/۳	۱
ایک بار " " "	.	۱۷۸	.	.	.	۱۵۸/۴	۲
" " " "	.	.	.	.	.	.	۳
" " " "	.	.	.	.	.	.	۴
" " " "	.	.	.	.	.	.	۵
" " " "	.	.	.	.	.	.	۶

ضمیمہ دوم - ۸ والی / ولاۃِ نبوی (گورنر)

نمبر شمار	والی	قبیلہ / خاندان	زمانہ قبول اسلام	علاقہ / ولایت	تاریخ تقرری
۱	حضرت عمرو بن سعید	قریش / امیہ	الف	وادی القریٰ	غالباً ۷ھ / ۶۲۸ء
۲	” یزید بن ابی سفیان	” ”	ع	تیماء	” ”
۳	” سواد بن غزیہ	خزرج / نجار	س	خیبر	” ”
۴	” عبداللہ (حکم) بن سعید	قریش / امیہ	ع	قُریٰ عربیہ	” ”
۵	” ہبیرہ بن شبل	ہوازن / ثقیف	ع	مکہ مکرمہ	شوال ۸ھ / جنوری ۶۳۰ء
۶	” عتاب بن اسید	قریش / امیہ	ف	”	ذی قعدہ ۸ھ / فروری ۶۳۰ء
۷	” عثمان بن ابی العاص	ہوازن / ثقیف	ف	طائف / ثقیف	۸-۹ھ / ۶۳۰ء
۸	” حذیفہ بن الیمان	ازد	ب	دبا	” ”
۹	” حارث بن نوفل	قریش / ہاشم	ط	جدہ	” ”
۱۰	” عمرو بن العاص	” / سہم	ع	عمان	” ”
۱۱	” جیفر بن جُلندیٰ	۔	ق	”	” ”
۱۲	” عبد بن جُلندیٰ	۔	ق	”	” ”
۱۳	” علاء بن الحضرمی	حضرموت	ب	بحرین	” ”
۱۴	” ابان بن سعید	قریش / امیہ	ف	”	۹-۱۰ھ / ۶۳۱ء
۱۵	” منذر بن ساویٰ	تمیم	ف	”	” ”
۱۶	” شرجیل بن حسنہ	کندہ	الف	ایلہ	” ”
۱۷	” معاذ بن جبل	خزرج / جشم	د	یمن کے گورنر جنرل	” ”
۱۸	” یعلیٰ بن امیہ	تمیم / حنظلہ	ق	الجند	” ”
۱۹	” خالد بن سعید	قریش / امیہ	الف	صنعاء	” ”

کیفیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
تا وفاتِ نبوی	•	•	•	فب ۴۸	•	۴/۸-۱۰۷	۱
”	•	•	•	”	•	۵/۳-۱۱۲	۲
”	•	•	”	•	•	۲/۳۷۴	۳
شہید موتہ	•	•	•	کتاب المحبر ۱۲۶	جمہرہ ۷۳	•	۴
مدتِ عہدہ ایک ماہ سے اوپر۔ مبدل	•	•	۲/۱۴۵	•	•	۵/۵۵	۵
تا وفاتِ نبوی	۲/۴۴۴ ، ۳/۵۰۰	۸۸۹ ، ۹۵۹	۲/۱۳۷	۶/۳۰۴ ، فب ۷۰	۳/۹۴ ، ۷۳	۳/۹-۳۵۸	۶
”	۳/۵۴۰	۹۶۸	۱/۳۱۳	فب ۷۰	۳/۹۹	۳/۴-۳۷۲	۷
”	•	•	۵/۵۲۷	•	•	•	۸
”	•	•	•	•	•	۲/۳۵۰	۹
”	۲/۶۰۷	۷۸۸	۴/۱۶۱	فب ۸۷	۳/۹۵	۴/۱۸-۱۱۵	۱۰
”	•	•	•	•	•	•	۱۱
”	•	•	•	•	•	•	۱۲
ایک سال۔ مبدل بہ حضرت ابان بن سعید	۲/۵۷۶ ، ۵۹۹	•	۱/۲۷۶ ، ۲۸۳	فب ۹۲ ، ۸۹	۳/۱۳۷	۵/۸-۷	۱۳
تا وفاتِ نبوی	•	•	•	فب ۹۲	•	۱/۷-۳۵	۱۴
”	•	•	•	•	•	۴/۴۱۷	۱۵
تا وفاتِ نبوی (ماتحت افسر: ابی بن کعب، سرطہ، حریث اور جہیم)	•	•	۱/۸۹، ۲۷۸	•	•	۲/۳۹۰	۱۶
” (ماتحت افسر: مالک بن مرہ، عبداللہ بن زید، مالک بن عبادہ، عقبہ بن نمیر)	۲/۵۹۰	•	۱/۵-۲۶۴	فب ۳-۸۰	۳/۱۲۱ ، ۹-۲۲۸	۴/۸-۳۷۶	۱۷
تا وفاتِ نبوی	•	•	•	•	۳/۲۲۸	۵/۹-۱۲۸	۱۸
”	۲/۵۴۳	•	۱/۲۶۵	فب ۸۰	”	۲/۴-۸۲	۱۹

۲۰	حضرت باذان	ایرانی / الانبار	ع	یمن	سنہ ۸-۹ھ / سنہ ۶۳۰-۳۱ء
۲۱	〃 شہر بن باذان	〃 〃	〃	〃 / صنعاء	سنہ ۹-۱۰ھ / سنہ ۶۳۱ء
۲۲	〃 طاہر بن ابی ہالہ	تمیم / اسد	ب	عک و اشعر	〃 〃
۲۳	〃 عکاشہ بن ثور	غوث	۰	سکاسک و سکون	〃 〃
۲۴	〃 ابو عبیدہ بن جراح	قریش / فہر	الف	نجران	سنہ ۹ھ / سنہ ۶۳۰-۳۱ء
۲۵	〃 عمرو بن حزم	خزرج / نجار	س	〃 / بنو الحارث	سنہ ۹-۱۰ھ / سنہ ۶۳۱-۳۲ء
۲۶	〃 ابو سفیان بن حرب	قریش / امیہ	ف	جرش	〃 〃
۲۷	〃 سعید بن قشیب	ازد / حلیف بنی امیہ	〃	〃	سنہ ۱۰-۱۱ھ / 〃
۲۸	〃 ابو موسیٰ	اشعر	د	زبید، رمع، عدن، ساحل	سنہ ۹-۱۰ھ / سنہ ۶۳۰-۳۱ء
۲۹	〃 زیاد بن لبید	خزرج / بیاضہ	〃	حضرموت	〃 〃
۳۰	〃 عامر بن شہر	ہمدان	۰	ہمدان	〃 〃
۳۱	〃 مہاجر بن ابی امیہ	قریش / مخزوم	ف	کندہ / بنو معاویہ	〃 〃
۳۲	〃 عدی بن حاتم طائی	طے	ق	علاقہ طے	〃 〃

وفات پا گئے	.	.	.	.	۲۲۷-۸/۳	۱۶۳/۱	۲۰
اسود عنسی کی بغاوت میں شہید	.	.	.	.	۲۲۸-۳۰/۳	۶/۳	۲۱
تا وفاتِ نبوی	.	.	.	.	۲۲۸/۳	۵۰/۳	۲۲
〃	.	.	.	.	〃	۲/۵	۲۳
کچھ مدت - مبدل بہ حضرت عمرو	.	.	.	.	.	۲۳۹/۵	۲۴
تا وفات نبوی	۵۹۴-۵/۳	.	.	ف ۸۰	۱۲۸ ۲۲۸/۳	۶۸-۹/۳	۲۵
کچھ مدت۔ قبل وفات نبوی	.	.	.	ف ۸۰ر۷۰	.	۱۱۲-۳/۲	۲۶
تا وفاتِ نبوی	.	.	.	.	.	۳۱۵/۲	۲۷
〃	.	.	.	ف ۸۰	۲۲۸/۳	۳۰۸/۵	۲۸
〃	۶۰۰/۲	.	.	〃	۱۲۷ ۲۲۸/۳	۲۱۷/۲	۲۹
〃	.	.	.	.	.	.	۳۰
〃	.	.	.	.	.	.	۳۱
〃	.	.	.	.	.	.	۳۲

ضمیمہ دوم - ۹ مقامی منتظمین (رؤسا، شیوخ)

نمبر شمار	منتظم	قبیلہ / خاندان	زمانہ قبول اسلام	علاقہ / قبیلہ	تاریخ تقرر
	شمالی قبائل				
۱	حضرت امرؤ القیس (ابن الاصبغ)	کلب	ط	دومۃ الجندل	سنہ ۶ھ / سنہ ۶۲۸ء
۲	" دومی بن القیس	کلب / بنی ذھل	۰	بنی ذھل / کلب	۰
۳	" رفاعہ بن زید	جذام / ذبیب	ع	خولان	سنہ ۷ھ / سنہ ۶۲۸-۹ء
۴	" قیس بن زید	"	"	بنو سعد بن مالک	" "
	مغربی قبائل				
۱	حضرت سعد بن ابی ذباب	ازد / دوس حجاز	ع	اپنی قوم	سنہ ۷ھ / سنہ ۶۲۸-۹ء
۲	" عثمان بن عمرو دئلی	کنانہ / دئل	۰	بنو اسد	وفد کے زمانے میں
	مشرقی قبائل				
۱	حضرت مالک بن عوف نصری	ہوازن / نصر	ف	نصر، ثمالہ، سلمہ، فہم	سنہ ۸ھ / سنہ ۶۳۰ء
۲	" صفوان بن صفوان		ق	بنو عمرو	سنہ ۹ھ / "
	جنوبی قبائل				
۱	حضرت صرد بن عبداللہ	ازد جرش	ق	اپنی قوم کے مسلمان	سنہ ۱۰ھ / سنہ ۶۳۱ء
۲	" مالک بن نمط	ہمدان / خارف	"	"	" "
۳	" عامر بن شہر	" / بکیلہ	"	ہمدان	" "

کیفیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
ایک سریہ میں مسلمان، وفد میں حاضر خدمت نبوی	۰	۵۶۱	۰	۰	۰	۱۱۵/۱	۱
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱۳۴/۲	۲
۰	۰	۰	۰	۰	۱۴۰/۳	۱۸۱/۲	۳
۰	۰	۰	۰	۰		۰	۴
حضرت عمرؓ کی خلافت تک برقرار	۰	۰	۰	۰	۰	۲۷۶/۲	۱
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۲
۰	۴۹۱/۲	۹۵۵	۳۱۲/۱	۰	۸۸-۹/۳	۲۹۰/۳	۱
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۲۳/۳	۲
اپنی قوم کے وفد میں آئے تھے	۵۸۷/۲	۰	۲۳۸/۱	۰	۱۳۰-۱/۳	۱۷/۳	۱
〃	۰	۰	۰	۰	۰	۲۹۳/۳	۲
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۸۳/۳	۳

۴	حضرت فروہ بن مسیک	مراد	ق	مراد ، زبید ، مذحج	سنہ ۱۰ھ /	سنہ ۶۳۱ء
۵	〃 قتادہ بن عیاش	جرش	〃	اپنی قوم	〃	〃
۶	〃 قیس بن حصین	مذحج / حارث	〃	بنو الحارث بن کعب	〃	〃
۷	〃 قیس بن سلمہ	جعفی / سعد العشیرہ	〃	مران، ہویم، کلاب، موالی	〃	〃
۸	〃 قیس بن مالک	ہمدان / ارحب	د	اپنی قوم		
۹	〃 مالک بن مرارہ	رہا	ق	یمن	〃	〃
۱۰	〃 وائل بن حجر	حضرموت	〃	حضرموت	〃	〃
۱۱	〃 حیان بن بح	صُدار	〃	صُدار	〃	〃
۱۲	〃 اشعث بن قیس	کندہ	〃	کندہ	〃	〃

قبائل پراگندہ عرب

۱	حضرت جارود بن معلی	عبدالقیس	ق	عبد القیس	۹-۸ھ /	سنہ ۳۱-۶۳۰ء
۲	〃 زبرقان بن بدر	تمیم / سعد	〃	تمیم / بنو عوف / سعد	〃	〃
۳	〃 قیس بن یزید	۔	〃	اپنی قوم	〃	〃
۴	〃 قیس بن عمیر	۔	〃	〃	〃	〃
۵	〃 عبادہ بن اشیب	عنز بن وائل	〃	〃	〃	〃

اپنی قوم کے وفد میں آئے تھے۔ عامل بھی تھے	۵۸۳/۲	۰	۳۲۷/۱	۰	۱۳۴-۶/۱	۱۸۰/۵	۴
اپنی قوم کے وفد میں آئے تھے	۰	۰	۰	۰	۰	۱۹۴/۵	۵
"	۵۹۴/۲	۰	۳۴۰/۱	۰	۱۲۸/۳	۰	۶
"	۰	۰	۳۲۵/۱	۰	۰	۲۱۷/۴	۷
"	۰	۰	۳۴۰-۱/۱	۰	۰	۲۳۴-۵/۵	۸
"	۰	۰	۰	۰	۰	۲۹۳/۴	۹
"	۰	۰	۰	۰	۰	۸۱/۵	۱۰
"	۰	۰	۰	۰	۰	۶۸/۲	۱۱
"	۰	۰	۱۳۸-۹/۱	۰	۰	۹۷-۹/۱	۱۲

اپنی قوم کے وفد میں آئے	۰	۰	۱۳۶-۷/۱	۰	۰	۲۶۰-۱/۱	۱
"	۰	۰	۱۱۵-۹/۱	۰	۰	۱۹۴-۵/۲	۲
"	۰	۰	۰	۰	۰	۲۲۹/۵	۳
"	۰	۰	۰	۰	۰	۲۲۳/۵	۴
"	۰	۰	۰	۰	۰	۱۰۴/۳	۵

ضمیمہ دوم - ۱۰ نقباءِ مدینہ

نمبر شمار	نقیب	قبیلہ / خاندان	زمانہ قبول اسلام	علاقہ / قبیلہ	تاریخ تقرر
۱	حضرت اسعد بن زرارہ	خزرج / نجار	د	بنو نجار	سنہ ۶۲۲ء
۲	″ سعد بن ربیع	″ / حارث	″	بنو حارث	″
۳	″ عبداللہ بن رواحہ	″ ″	″	″	″
۴	″ رافع بن مالک	″ / زریق	″	بنو زریق	″
۵	″ براء بن معرور	″ / سلمہ	″	بنو سلمہ	″
۶	″ بشر بن براء بن معرور	″ ″	″	″	″
۷	″ عبداللہ بن عمرو	″ •	″	•	″
۸	″ سعد بن عبادہ	″ / ساعدہ	″	بنو ساعدہ	″
۹	″ منذر بن عمرو	″ ″	″	″	″
۱۰	″ عبادہ بن صامت	″ / قواقلہ	″	قواقلہ	″
۱۱	″ عمرو بن جموح	″ / سلمہ	″	بنو سلمہ	″
۱۲	″ اسید بن حضیر	اوس / عبدالاشہل	″	عبدالاشہل	″
۱۳	″ سعد بن خیثمہ	″ / غنم	″	بنو غنم	″
۱۴	″ رفاعہ بن عبدالمنذر	″ / بنو ظفر	″	بنو ظفر	″
۱۵	″ ابو الہیثم بن التیہان	″ / ″	″	بنو عمرو بن عوف	″
۱۶	″ رافع بن خدیج	″ / عمرو بن مالک	″	عمرو بن مالک	•
۱۷	″ مسیب بن عمرو	خزرج	•	•	•
۱۸	″ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	قریش / ہاشم	اولین مسلم	بنو نجار	سنہ ۶۲۲ء

کیفیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
(سلہ متوفی، نقیب اعظم یا نقیب النقباء بھی تھے	۲۰۴/۲	۰	۲۲۰ ۱۰۸-۱۳/۱	انساب ۲۵۲ ق ب ۲۰	۰	۷۱-۲/۱	۱
احد میں شہید	″	۰	۶۱۲″/۳	انساب ۲۵۲	۰	۲۷۷-۸/۲	۲
موتہ میں شہید	″	۰	۶۱۲-″۳/۳	″	۰	۱۵۶-۹/۳	۳
۰	″	۰	۶۲۱-″۲/۳	″	۰	۱۵۷-۹/۲	۴
متوفی سلہ قبل از ہجرت نبوی	″	۰	۶۱۸-″۲۰/۳	″	۰	۱۷۳-۴/۱	۵
اپنے والد کی وفات کے بعد	۰	۰	۰	۰	۰	۱۸۳-۴/۱	۶
۰	″	۰	۶۲۰-″۱/۳	″	۰	۲۳۱-۳/۳	۷
۰	″	۰	۶۱۳-۷/۳	″	۰	۲۸۳-۵/۲	۸
۰	″	۰	۳۱۸/۳	″	۰	۴۱۸-۹/۴	۹
۰	″	۰	۶۲۱/۳	″	۰	۱۰۶-۷/۳	۱۰
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۹۳-۵/۴	۱۱
۰	″	۰	۶۰۳-۷/۳	″	۰	۹۲-۳/۱	۱۲
۰	″	۰	۶۰۷/۳	″	۰	۲۷۵-۶/۲	۱۳
۰	″	۰	۰	۰	۰	۱۸۱-۲/۲	۱۴
۰	۰	۰	۶۰۷/۳	۰	۰	۰	۱۵
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱۵۱-۵۲/۲	۱۶
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۳۶۷/۴	۱۷
حضرت اسعد بن زرارہ کے انتقال کے بعد نقیب النقباء	۰	۰	۶۱۱/۳	۰	۰	۰	۱۸

ضمیمہ سوم-۱ مرکزی عاملین صدقات (عمّال الصّدقات)

نمبر شمار	عامل صدقات	قبیلہ/خاندان	زمانہ قبول اسلام	علاقہ/قبیلہ	تاریخ تقرر
۱	حضرت ابی بن کعب	خزرج / نجار	د	سعد ہذیم / جذام	غالباً ۷ھ / ۶۲۹ء
۲	" عنبسہ	" "	۰	" "	" "
۳	" ولید بن عقبہ اموی	قریش / امیہ	ع/ف	بنو مصطلق	" "
۴	" عباد بن بشر	اوس / عبدالاشہل	د	"	" "
۵	" عمرو بن عاص	قریش / سہم	ع	ہوازن / علاقہ حنین	۸ھ / ۶۳۰ء
۶	" " "	" "	"	غطفان / فزارہ	۸-۹ھ / ۶۳۰-۳۱ء
۷	" " "	" "	"	قضاعہ	" "
۸	" " "	" "	"	عمان	۱۰-۱۱ھ / ۶۳۱-۳۲ء
۹	" کلاب بن امیہ	کنانہ / لیث	۰	ثقیف	آغاز ۹ھ / ۶۳۱ء
۱۰	" سالف بن عثمان بن معتب	ثقیف	۰	"	" "
۱۱	" بسر بن سفیان [1]	قریش / عدی	ع	خزاعہ / کعب	" "
۱۲	" بریدہ بن حصیب	اسلم	س	غفار و اسلم	" "
۱۳	" رافع بن مکیث	جہینہ	"	جہینہ	" "
۱۴	" عباد بن بشر	اوس / عبدالاشہل	د	مزینہ اور سلیم	" "
۱۵	" ضحاک بن سفیان	کلاب / عامر بن صعصعہ	س	کلاب	" "
۱۶	" معاذ بن جبل	خزرج / جشم	د	قرٰی عربیہ	" "
۱۷	" عکرمہ بن ابی جہل	قریش / مخزوم	ف	ہوازن	۹-۱۰ھ / ۶۳۱-۲ء

[1] ایک روایت میں ان کی جگہ حضرت نعیم بن عبداللہ النحام قریشی عدوی کا نام ہے۔ واقدی ص ۲-۹۷۳

کیفیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
دونوں کو مشترکہ طور پر بھیجا گیا تھا	۰	۰	۲۷۰/۱	۰	۰	۴۹-۵۱/۱	۱
تقرری ہوئی مگر وصولیابی نہیں کر سکے	۰	۰	〃	۰	۰	۱۵۱/۴	۲
حضرت ولید اموی کی جگہ مقرر۔ تقرری بنو مصطلق کی فرمائش پر	۰	۹۸۰-۸۱	۱۶۱/۲	۰	۰	۹۰-۹۱/۵	۳
۰	۰	۹۸۱	۱۶۱-۲/۲	۰	۰	۱۰۰-۱/۳	۴
۰	۰	۰	۰	۰	۹۵/۴	۱۱۵-۱۸/۴	۵
۰	۰	۹۷۳	۱۶۰/۲	۰	۰	〃	۶
۰	۰	۰	۰	۰	۰/۳	〃	۷
اونٹوں کے عشور کے لیے	۰	۰	۰	۰	۰	〃	۸
غالباً عام صدقات کے لیے	۰	۰	۰	۰	۰	۲۵۰/۴	۹
خزاعہ نے صدقات ادا کرنا چاہے مگر تمیم نے ان کو جبراً روک دیا	۰	۰	۰	انساب ۱ ۵۳۱ ۲	۳ ۰	۰	۱۰
	۰	۹۷۳	۲۹۳/۱	۰	۰	۱۸۱-۲/۱	۱۱
۰	۰	〃	۱۶۰/۲	۰	۰	۱۷۵-۶/۱	۱۲
۰	۰	〃	〃	۰	۰	۱۵۹-۶۰/۲	۱۳
۰	۰	〃	〃	۰	۰	سابق	۱۴
۰	۰	〃	۳۰۰/۱	۰	۰	۳۶/۳	۱۵
۰	۰	۰	۰	۰	یحییٰ بن آدم	۰	۱۶
روایت کے مطابق وفات نبوی کے سال تقرری	۰	۰	۴۰۴/۷	۰	۲/۳	۴-۶/۴	۱۷

۱۸	حضرت حذیفہ بن یمان	ازد	س	ازد	۹-۱۰ھ / ۶۳۱-۲ء
۱۹	〃 معاویہ بن ابی سفیان	قریش / امیہ	ع	اقیال حضرموت	〃 〃
۲۰	〃 عُیینہ بن حصن فزاری	غطفان / فزارہ	ف	تمیم	〃 〃
۲۱	〃 ابن اللتبیہ	ازد	۰	بنی ظبیان	〃 〃
۲۲	〃 سنان بن ابی سنان	اسد / حلیف عبدالاشہل	د	بنو مالک	〃 〃
۲۳	〃 قضاعی بن عمرو	عذرہ	۰	بنو حارث	〃 〃
۲۴	〃 عکرمہ بن حفصہ	قیس عیلان / ہوازن	۰	بدیل، بسر اور ان کے حلفاء	۰
۲۵	〃 عبادہ بن صامت	خزرج / عمرو بن عوف	د	۰	۰
۲۶	〃 ارقم بن ابی الارقم	قریش / مخزوم	الف	۰	۰
۲۷	〃 زیاد بن حنظلہ	تمیم	۰	۰	۰
۲۸	〃 عمر بن خطاب	قریش / عدی	ب	۰	۰
۲۹	〃 عبداللہ بن خطل [1]	قریش / ادرم	د	۰	۰
۳۰	〃 ادرم بن غالب [2]	۰	۰	۰	۰

[1] و [2] دونوں مرتد ہوگئے اور بعد میں قتل ہوئے۔

۱۸	.	.	.	.	.	.	
۱۹	۳۸۵-۷/۳	.	.	.	.	.	
۲۰	۱۶۶-۷/۳	.	.	۱۶۰/۲	.	.	روایت ہے کہ ان کو ۹ھ میں بھیجا گیا تھا
۲۱	۳۲۹-۳۰/۵	.	.	〃	۹۷۳	.	〃
۲۲	۳۵۸/۲	۱۷۸/۳	.	.	.	.	.
۲۳	۲۰۵/۵	〃	.	۲۷۰/۱	.	.	.
۲۴	.	.	.	۲۷۲-۳/۱	.	.	.
۲۵	۱۰۶-۷/۳	.	.	.	.	.	.
۲۶	۵۹-۶۱/۱	.	.	.	.	.	.
۲۷	۲۱۳/۲	.	.	.	.	.	.
۲۸	بخاری بحوالہ کتانی اول ص ۲۹۶		.	.	.	.	.
۲۹	.	۵۹/۳	.	.	۵۹-۶۰ھ	.	.
۳۰	ابن خلدون اوّل ۸۰۶	.	.	.	.	.	.

ضمیمہ سوم - ۲ مقامی عاملین صدقات

تاریخ تقرر	علاقہ / قبیلہ تقرر	زمانۂ قبول اسلام	قبیلہ / خاندان	عامل صدقات	نمبر شمار
				شمالی قبائل	
سنہ ۹-۱۰ھ / سنہ ۶۳۱-۳۲ء	قین	ق	قضاعہ / قین	حضرت عمرو بن حکم	۱
سنہ ۶-۹ھ / سنہ ۶۲۸-۳۱ء	کلب	ط	کلب	" ابن الاصبغ	۲
سنہ ۹-۱۰ھ / سنہ ۶۳۱-۲ء	بنو ضبیب	ق	بنو ضبیب	" عبداللہ بن حکیم	۳
				مشرقی قبائل	
سنہ ۹-۱۰ھ / سنہ ۶۳۱-۲ء	بنو اسد	ع	عذرہ	حضرت قضاعی بن عمرو	۱
" "	بنو اسد و طے	ق	طے	" عدی بن حاتم طائی	۲
" "	اسد	۰	اسد	" کافیہ بن سبیع	۳
" "	ہذیل	۰	ہذیل	" کہل بن مالک	۴
" "	الاحلاف	ق	عکل	" خزیمہ بن عاصم	۵
" "	بنو غنی	"	قیس عیلان / غنی	" مرداس بن مالک	۶
" "	سلیم	"	سلیم	" الهیثم	۷
				مغربی قبائل	
" "	جہینہ	ط	جہینہ	حضرت جندب بن مکیث	۱
" "	بنو مصطلق	"	بنو مصطلق	" حارث بن ضرار	۲

کیفیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
.	.	.	.	.	.	۹۹۰/۵	۱
.	.	.	.	.	.	۹۹/۵	۲
.	.	.	.	.	.	۱۴۵/۳	۳
.	.	.	۲۷۰/۱	.	.	۲۰۵/۵	۱
.	۶۰۰/۲	.	۳۲۲/۱	.	۱۴۷/۳	۳۹۲-۴/۳	۲
.	.	.	.	کتا ثانی اول ۳۹۶	.	.	۳
.	.	.	.	″ ۳۹۷	.	.	۴
.	.	.	.	″ ″	.	.	۵
.	.	.	.	″ ۳۹۸	.	.	۶
.	.	.	.	″ ″	.	۷۵/۵	۷
.	.	.	.	.	.	۳۰۶/۱	۱
.	.	.	.	.	.	۳۳۴-۵/۱	۲

قبائل پراگندہ عرب

۱	حضرت قیس بن عاصم	تمیم / سعد	ق	تمیم / سعد	سنہ ۱۰-۹ھ / سنہ ۳۲-۶۳۱ء
۲	" سہل بن منجاب	"	"	" •	" "ـ
۳	" زبرقان بن بدر	" "	"	" "	" "
۴	" صفوان بن صفوان	" •	"	" •	" "
۵	" مالک بن نویرہ	" / یربوع	"	" / یربوع	" "
۶	" متمم بن نویرہ	" "	"	" "	" "
۷	" خزیمہ بن عاصم	وائل / عوف	"	بنوعوف / وائل	" "
۸	" غاضرہ بن سمرہ	تمیم / عنبر	"	•	" "
۹	" شبر بن صعقق	•	•	•	•
۱۰	" ابوجہم بن حذیفہ	•	•	•	•
۱۱	" قرہ بن دعموس	•	•	•	•

۱	۲۱۹-۲۱/۳	۱۳۷/۳	•	•	•	۶۰۰/۲	•
۲	۳۶۹-۷۰/۲	•	•	•	•	•	•
۳	۱۹۴-۵/۲	۱۳۷/۳	•	•	•	۶۰۰/۲	•
۴	۲۷-۸/۳	•	•	•	•	•	•
۵	۲۹۵/۳	۱۳۷/۳	•	•	•	۶۰۰/۲	•
۶	•	•	کتانی اول ۳۹۷	•	•	•	•
۷	۱۱۶/۲	•	•	•	•	•	•
۸	۱۶۷/۵	•	•	•	•	•	•
۹	۳۸۴/۲	•	•	•	•	•	•
۱۰	•	•	کتانی اول ۳۹۷	•	•	•	•
۱۱	•	•	،، ۳۹۸	•	•	•	•

ضمیمہ سوم - ۳ پیداوار کے تخمینہ کے افسر (خارص)

نمبر شمار	خارص / افسر	قبیلہ / خاندان	زمانۂ قبول اسلام	علاقہ / قبیلہ	تاریخ تقرر
۱	حضرت فروہ بن عمرو	خزرج / بیاضہ	د	مدینہ	۳-۱۱ھ / ۶۲۵-۳۲ء
۲	" عتاب بن اسید	قریش / امیہ	ف	طائف	۸-۱۱ھ / ۶۳۰-۳۲ء
۳	" عبداللہ بن رواحہ	خزرج / حارث	د	خیبر	۷-۸ھ / ۶۲۸-۹ء
۴	" ابوالہیثم بن التیہان	اوس / عبدالاشہل	"	"	۸-۱۱ھ / ۶۳۰-۳۲ء
۵	" جبار بن صخر	خزرج / سلمہ	"	"	" "
۶	" زید بن سلمہ	" / نجار	س	"	" "
۷	" عمرو بن سعید	قریش / امیہ	الف	"	
۸	" ابوحثمہ عمرو بن ساعدہ	خزرج / حارث	س	"	۱۰-۱۱ھ / ۶۳۱-۲ء
۹	" سہل بن ابی حثمہ	" "	"	•	•
۱۰	" ابوزبید بن الصلت	کندہ	ق	•	•
۱۱	" الصلت بن معدی کرب	"	"	•	•

کیفیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
مدینہ کی پیداوار کا تخمینہ لگاتے تھے خوشوں کی بنیاد پر	•	•	•	•	•	۱۷۸-۹/۴	۱
طائف میں قریشی باغات کے افسر تخمینہ	کتانی اول ۴۰۰	•	•	•	•	سابق	۲
شہید موتہ	۳۵۴/۲	۶۹۱	۱۱۰/۲	قب ۳۷	۲۰ - ۲۱/۳	۱۵۶-۹/۳	۳
حضرت عبداللہ بن رواحہ کے بعد	•	״	•	•	•	۳۱۸/۵	۴
حضرت عبداللہ بن رواحہ کے بعد اور حضرت ابو الہیثم کے ساتھ	۳۵۴/۲	•	•	•	۲۰/۳	۲۶۵/۱	۵
״ ״ ״ ״	•	•	•	•	•	۲۳۲/۲	۶
ایک بار تخمینہ لگایا	•	•	•	•	•	۱۰۷-۸/۴	۷
حضرت علی کی خلافت تک برقرار رہے	•	•	•	•	•	۱۶۹/۵	۸
•	کتانی اول ۴۰۰	•	•	•	•	•	۹
•	•	•	•	•	•	۲۰۵/۵	۱۰
•	کتانی اول ۴۰۰	•	•	•	•	•	۱۱

ضمیمہ سوم - ۴ عاملین علی الحمیٰ (چراگاہ کے افسر)

نمبر شمار	خارص / افسر	قبیلہ / خاندان	زمانۂ قبول اسلام	علاقہ / قبیلہ	تاریخ تقرر
۱	حضرت ذر بن ابی ذر	غفار	ب	مدینہ / الجمع	سنہ ۱-۲ھ / سنہ ۶۲۲-۲۳ء
۲	حضرت یسار	حبشی / مولائے رسول	الف / س	،، / ذوالجدر	سنہ ۱-۶ھ / سنہ ۶۲۲-۲۸ء
۳	،، ابورافع	،، ،،	،،	،، .	سنہ ۱-۱۱ھ / سنہ ۶۲۲-۳۲ء
۴	،، عریب المالکی	. .	ب	،، / الغابہ	سنہ ۱-۲ھ / سنہ ۶۲۲-۲۳ء
۵	،، بلال بن حارث	مزینہ	س	تقیع	سنہ ۵-۱۱ھ / سنہ ۶۲۷-۳۲ء
۶	،، عبید بن مروح	،،	،،	،،	،، ،،
۷	،، سعد بن ابی وقاص	قریش / زہرہ	الف	وج / طائف	سنہ ۹-۱۱ھ / سنہ ۶۳۰-۳۲ء

کیفیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
کرز بن جابر فہری کے ہاتھوں شہید	۔	۔	۔	۔	۔	۔	۱
عرینہ کے لوگوں کے ہاتھوں شہید	۔	۔	۔	۔	۱۷۲/۳	۱۲۴/۵	۲
۔	۔	۔	۔	۔	۔	۱۹۱/۵	۳
۔	۔	۔	۔	۔	۔	۔	۴
۔	۔	۵۳۸/۹	۸۰-۱/۲	انساب ۳۴۸	کتانی اول ۳۳۹	-	۵
۔	۔	۴۲۶/۷	۔	۔	۔	۳۵۳/۳	۶
۔	۔	۔	۔	۔	۔	〃	۷

ضمیمہ چہارم-۱ مبلّغین و معلّمین

نمبر شمار	مبلّغ / معلّم	قبیلہ / خاندان	زمانہ قبول اسلام	علاقہ / قبیلہ	زمانہ تقرر
۱	حضرت مصعب بن عمیر	قریش / عبدالدار	الف	مدینہ / اوس و خزرج	۶۲۱ء
۲	حضرات شہدائے بئر معونہ	•	•	•	•
۳	″ ″ رجیع	•	•	•	•
۴	حضرت معاذ بن جبل	خزرج / جشم	د	مکہ مکرمہ	۸ھ / ۶۳۰ء
۵	″ ابوموسیٰ اشعری	اشعر	ب	″	″ / ″
۶	″ عباد بن بشر [ل]	اوس / عبدالاشہل	د	بنو مصطلق	۸-۹ھ / ″
۷	″ خالد بن ولید مخزومی	قریش / مخزوم	ع	نجران / بنو حارث بن کعب	۹-۱۰ھ / ۶۳۰-۳۱ء
۸	″ علی بن ابی طالب	″ / ہاشم	الف	یمن / مذحج	″ / ″
۹	″ اوس بن حدثان	ہوازن	ط	منیٰ / مکہ مکرمہ	۹ھ / ۶۳۱ء
۱۰	″ محیصہ بن مسعود	اوس / حارث	د	فدک	″ / ″
۱۱	″ عمرو بن مرہ	جُہینہ	•	جہینہ	•
۱۲	″ ضحاک بن سفیان	عامر بن صعصعہ / کلاب	س	کلاب	•
۱۳	″ جرثوم بن ناشیب	قضاعہ	ط	اپنی قوم	•
۱۴	″ ساریہ بن اوفیٰ	بنو قیس	•	بنو مرہ	•
۱۵	″ جریر بن عبداللہ	بجیلہ	ق	ذوالکلاع، ذوعمرو	۱۰-۱۱ھ / ۶۳۲ء
۱۶	″ وبر بن یحنس / عنیس	خزاعہ	•	فیروز دیلمی وغیرہ ابنائے یمن	″ / ″
۱۷	″ اقرع بن عبداللہ	حمیر	ق	ذوزود، ذومران	″ / ″

[ل] بلاذری، انساب ۱/۱۴۳، کے مطابق جنگ مریسیع سے قبل حکم نبوی پر حضرت عمر نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا تھا۔

کیفیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
مدینہ کے بیشتر لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا اور تعلیم دی	.	.	۱/۲۲۰	.	.	۳۶۸-۹/۴	۱
.	.	.	.	.	.	.	۲
.	.	.	.	.	.	.	۳
قریش کے نومسلموں کو اسلام کی تعلیم دینے کےلیے	۲/۵۰۰	۸۰۹ ,۹۵۹	۲/۱۳۷	۱/۳۶۵	۳/۹۴	۳۷۶-۸/۴	۴
						۳۰۸-۹/۵	۵
بنومصطلق کے نومسلموں کو " " " وہیں قیام کیا	.	.	۱۶۱-۲/۲	.	.	۱۰۰-۱/۳	۶
تبلیغ و تعلیم	.	.	.	.	۲۲۶-۷/۳	سابق	۷
"	.	.	.	.	۲۳۰-۱/۳	"	۸
مذہبی اعلان اور تعلیمات بیان کرنے کے لیے	.	.	.	.	.	۱۴۱-۲/۱	۹
تبلیغ و تعلیم	.	۷۰۶ - ۷	.	ف ۴۲	.	۳۳۴/۴	۱۰
"	.	.	۳۳۳-۴/۱	.	.	۱۳۱/۴	۱۱
" قبیلہ والے مسلمان ہوگئے	.	.	.	.	.	.	۱۲
" " " "	.	.	.	.	.	۲۷۶/۱	۱۳
.	.	.	.	.	.	۲۴۴/۲	۱۴
وہاں وفات نبوی تک قیام کیا	.	.	.	.	۱۸۷/۳	۲۷۹-۸۰/۱	۱۵
" " "	.	.	.	.	"	۸۳/۵	۱۶
	.	.	.	.	"	۱۱۰/۱	۱۷

۱۸	حضرت فرات بن حیان	ربیعہ / عجل	ط	ثمامہ اور اسد	سنہ ۱۰-۱۱ھ / سنہ ۶۳۲ء
۱۹	″ زیاد بن حنظلہ	تمیم / عمرو	ق	بنو تمیم	″ ″
۲۰	″ صلصل بن شرحبیل	٠	″	بنو عامر	″ ″
۲۱	″ ضرار بن الازور	اسد خزیمہ	″	بنو صیدار	″ ″
۲۲	″ نعیم بن مسعود	غطفان / اشجع	ط	ابن ذی اللحیان وجبیری	″ ″
۲۳	″ عبداللہ بن مسعود	ہذیل	الف		سنہ ۱-۱۱ھ / ۶۲۲-۳۲ء
۲۴	″ ابی بن کعب	خزرج / نجار	د	مدینہ	″ ″
۲۵	″ سالم مولیٰ ابی حذیفہ	مولیٰ بنی امیہ	الف		″ ″
۲۶	″ عبادہ بن صامت	٠	د		″ ″
۲۷	″ خالد بن سعید	قریش / امیہ	الف		
۲۸	″ عمرو بن سعید	″ ″	″		
۲۹	″ ابان بن سعید	″	ف	مدینہ / طائف	سنہ ۸ھ / سنہ ۶۳۰ء
۳۰	″ عثمان بن عفان	″	الف		
۳۱	″ سعد بن عبادہ	خزرج / ساعدہ	د		
۳۲	″ اسید بن حضیر	اوس / عبدالاشہل	″		

۱۸	۱۷۵-۶/۴	۱۸۷/۳	۰	۰	۰	۰	۰
۱۹	۲۱۳/۲	″	۰	۰	۰	۰	۰
۲۰	۲۹/۳	″	۰	۰	۰	۰	۰
۲۱	۳۹-۴۰/۳	″	۰	۰	۰	۰	۰
۲۲	۳۳-۴/۵	″	۰	۰	۰	۰	۰
۲۳							
۲۴							مدینہ کے اور شہر رسول میں آنے والے
۲۵	۰	۰	۰	۰	۰	۰	مسلمانوں کو تعلیم دیتے تھے
۲۶							
۲۷							
۲۸							
۲۹	۰	۰	۰	۰	۰	۰	طائف کے غلاموں کے معلمین و مربی
۳۰							
۳۱							
۳۲							

ضمیمہ چہارم - ۲ مفتیانِ گرامی

نمبر شمار	مفتی	قبیلہ / خاندان	زمانۂ قبول اسلام	علاقہ / قبیلہ	زمانہ تقرر
۱	حضرت ابوبکر صدیق	قریش / تیم	الف	مدینہ منورہ	سنہ ۱-۱۱ھ / سنہ ۶۲۲-۳۲ء
۲	″ عمر فاروق	″ / عدی	ب	″	″ ″
۳	″ عثمان غنی	″ / امیہ	الف	″	″ ″
۴	″ علی مرتضیٰ	″ / ہاشم	″	″	″ ″
۵	″ عبدالرحمٰن بن عوف	″ / زہرہ	″	″	″ ″
۶	″ معاذ بن جبل	″ / جشم	د	″ / یمن	″ ″
۷	″ ابی بن کعب	″ / نجار	″	″	″ ″
۸	″ زید بن ثابت	″ ″	″	″	″ ″
۹	متعدد دوسرے گمنام حضرات	•	•		″ ″

کیفیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
•	•	•	۲/۳۳۵	•	•	۳/۲۳-۲۰۵	۱
•	•	•	۲/″۳۵۰	•	•	۴/۳۷۷	۲
•	•	•	″	•	•	″	۳
•	•	•	″	•	•	″	۴
•	•	•	۲/۳۴۰	•	•	۳/۷-۳۱۳	۵
•	•	•	۲/″۳۴۰ ۳۵۰	•	•	۴/۳۷۷	۶
•	•	•	۲/۳۵۰	•	•	″	۷
•	•	•	″	•	•	″	۸
•	•	•	•	•	•	•	۹

ضمیمہ چہارم - ۳ ائمہ مساجد و نماز

نمبر شمار	امام مسجد	قبیلہ / خاندان	زمانۂ قبول اسلام	علاقہ / قبیلہ	زمانۂ تقرر
۱	حضرت اسعد بن زرارہ	خزرج / نجار	د	مدینہ	سنہ ۱ھ / سنہ ۶۲۱-۲ء
۲	〃 مصعب بن عمیر	قریش / عبدالدار	الف	〃	〃 〃
۳	〃 سالم مولیٰ ابی حذیفہ	مولیٰ بنی امیہ	الف / س	〃	〃 〃
۴	〃 حنظلہ بن ابی حنظلہ	انصاری	د	〃 / قبا	〃 〃
۵	〃 عتبان بن مالک	خزرج / سالم	〃	〃	سنہ ۱-۱۱ھ / سنہ ۶۲۲-۳۲ء
۶	〃 عبداللہ بن عمیر	اوس / خطمہ	〃	〃 مسجد بنی خطمہ	〃 〃
۷	〃 معاذ بن جبل	خزرج / جشم	〃	〃 مسجد جشم	سنہ ۱-۹ھ / سنہ ۶۲۲-۳۰ء
۸	〃 اسید بن حضیر	اوس / عبدالاشہل	〃	〃 〃 عبدالاشہل	سنہ ۱-۱۱ھ / سنہ ۶۲۲-۳۲ء
۹	〃 ابو زید	انصاری	〃	عمان	سنہ ۸-۹ھ / سنہ ۶۳۰ء
۱۰	〃 شداد بن ثمامہ	بنو کعب بن اوس	ق	اپنی قوم	سنہ ۹-۱۰ھ / سنہ ۶۳۰-۳۱ء
۱۱	〃 عمرو بن سلمہ	بنو جرم	د / س	〃	سنہ ۲-۱۱ھ / سنہ ۶۲۲-۳۲ء
۱۲	〃 عبدالرحمن بن عوف	قریش / زہرہ	الف	لشکر مسلمانانِ تبوک	سنہ ۹ھ / سنہ ۶۳۱ء
۱۳	〃 ابوبکر صدیق	〃 / تیم	〃	〃	〃 〃
۱۴	〃 〃	〃 / 〃	〃	مدینہ / مسجد نبوی	ربیع الاول سنہ ۱۱ھ / جون سنہ ۶۳۲ء

کیفیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
٠	٠	٠	٠	٠	٠	٠	۱
٠	٠	٠	٠	٠	٠	٠	۲
٠	٠	٠	٠	٠	٠	٠	۳
٠	٠	٠	٠	٠	٠	۵۶/۲	۴
٠	٠	٠	٠	٠	٠	۲۵۹-۶۰/۳	۵
٠	٠	٠	٠	٠	٠	۲۳۷/۳	۶
٠	٠	٠	٠	بخاری - بدء الاذان		٠	۷
٠	٠	٠	٠	سنن ابی داؤد		٠	۸
٠	٠	٠	٠	۸۷ - ۸	٠	۲۰۳/۵	۹
٠	٠	٠	٠	٠	٠	۳۸۸/۲	۱۰
٠	٠	٠	٠	٠	٠	٠	۱۱
ایک نماز پڑھائی تھی	٠	٠	٠	٠	٠	٠	۱۲
نصف لشکر کے مستقل امام تھے	٠	۹۹۵	۱۶۵/۲	٠	٠	۲۰۵-۲۳/۳	۱۳
رسول کریم کے مرض الموت میں سترہ نمازیں پڑھائیں	٠	٠	۲۱۵-۶/۲	٠	۱۹۶-۸/۳	″	۱۴

ضمیمہ چہارم - ۴ مؤذنینِ رسول

نمبر شمار	مؤذن	قبیلہ / خاندان	زمانہ قبول اسلام	علاقہ / قبیلہ	تاریخ تقرر
۱	حضرت بلال بن رباح	حبشی / مولائے رسول	الف	مدینہ منورہ / مسجد نبوی	سنہ ۱-۱۱ھ / سنہ ۶۲۲-۶۳۲ء
۲	″ عمرو بن ام مکتوم	قریش / عامر بن لوی	″	″ ″	″ ″
۳	″ سعد بن عائذ (سعد القرظ)	مولیٰ عمار بن یاسر	س	مسجد قبا	″ ″
۴	″ عبد العزیز بن اصم	.	.	.	″ ″
۵	″ زید بن حارث	صدار	.	.	.
۶	″ ثوبان	مولائے رسول	س	مدینہ	.
۷	″ عثمان بن عفان	قریش / امیہ	الف	″	″ ″
۸	″ ابو محذورہ اوس بن معیر	″ / جمح	ف	خانہ کعبہ / مکہ / جعرانہ	سنہ ۸-۱۱ھ / سنہ ۶۳۰-۶۳۲ء
۹	″ سفیان بن قیس	کندہ	ق	قبیلہ کندہ	سنہ ۱۰-۱۱ھ / سنہ ۶۳۱-۶۳۲ء

کیفیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر و حضر کے مؤذن	•	•	۲۴۸/۱	۵۲۶/۱	•	۲۰۶-۹/۱	۱
رمضان میں شب میں ایک اذان دیتے تھے	•	•	۲۳۴/۳	〃	•	〃	۲
مستقل مؤذن	•	•	•	•	•	۲۸۲-۳/۲	۳
〃 / ایک بار اذان دی تھی	•	۷۳۸ ، ۸۴۶	•	•	•	۳۲۸/۳	۴
• 〃	•	•	•	•	کتانی اول ۷۵	•	۵
〃	•	•	•	•	۷۶ 〃	•	۶
جمعہ کی ایک اذان دیتے تھے / دی تھی	•	•	•	۵۲۷/۱	〃 〃	•	۷
مسجد حرام کے مستقل مؤذن / جعرانہ میں پہلی اذان	•	•	۲۴۸/۱	۵۲۶/۱ ۵۲۸	•	۲۹۲/۵	۸
قبیلہ کندہ کے مستقل مؤذن مقرر ہوئے تھے	•	•	•	•	•	۳۲۱/۲	۹

ضمیمہ چہارم - ۵ افسرانِ امورِ حج

نمبر شمار	افسر	قبیلہ/خاندان	زمانہ قبول اسلام[1]	موقعہ/مہم	تاریخ تقرر

امرائے حج

۱	حضرت عتاب بن اسید	قریش/امیہ	ف	فتح مکہ	۸ھ / ۶۳۰ء
۲	" ابوبکر صدیق	" / تیم	الف	سال دیگر	۹ھ / ۶۳۱ء
۳	" رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم	" / ہاشم	اول المسلمین	حجۃ الوداع	۱۰ھ / ۶۳۲ء

خانہ کعبہ کے متولی اور ساقی حرم

۱	حضرت عثمان بن طلحہ	قریش/عبدالدار	ع	خانہ کعبہ/حجابہ	۸-۱۱ھ / ۶۳۰-۳۲ء
۲	" عباس بن عبدالمطلب	" / ہاشم	ف	" / سقایہ	" "

حدودِ حرم کی تعیین کے افسر

۱	حضرت تمیم بن اسید	خزاعہ	ف	حرم مکہ	۸ھ / ۶۳۰ء

ھدی (قربانی کے جانوروں) کے نگراں افسر

۱	حضرت ناجیہ بن جندب	اسلم	س	مدینہ تا مکہ	۶-۱۱ھ / ۶۲۸-۳۲ء
۲	" ذویب بن حلحلہ	خزاعہ/کعب	۰	"	۰
۳	" عمرو بن ثمالی	ہوازن / ثمالہ	۰	"	۰
۴	" علی بن ابی طالب	قریش/ہاشم	الف	"	۰
۵	" خالد بن سیار	کنانہ / غفار	۰	"	۰

کیفیت	ابن ہشام	واقدی	ابن سعد	بلاذری	طبری	اسد الغابہ	
بحیثیت والیِ مکہ امیرِ حج بنے	۵۰۰/۲	۹۵۹	۱۳۷/۲	قب ۵۳	۳۷،۹۴/۳	۳۵۸-۹/۳	۱
رسولِ کریم کے نائب کی حیثیت سے	۵۳۳، ۹۵۲/۲	۱۰۷۷	۱۶۸/۲	۰	۱۲۲-۳/۳	۲۰۵-۲۳/۳	۲
سربراہِ مملکتِ اسلامی کی حیثیت سے	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۳
مستقل متولی اور کلید بردارِ کعبہ	۰	۸۳۳-۸	۱۳۷/۲	۲	۰	۳۷۲/۳	۱
مستقل سقایہ کے عہدہ دار	۰	۸۳۸	〃	〃	۰	۱۰۹-۱۲/۳	۲
از سرِ نو تنصیبِ حرم کی گئی	۰	۸۴۲	۱۳۷/۲	۰	۰	۲۱۴/۱	۱
مستقل افسر حدیبیہ، عمرۃ القضیہ، حج ابی بکر، حجۃ الوداع	۰	۵۷۲، ۷۳۲، ۱۰۹۰، ۱۰۷۷	۱۶۸/۲، ۱۲۱، ۱۷۳	۳۵۳/۱	۶۲۳/۲	۴/۵	۱
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱۴۷/۲	۲
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۹۲/۴	۳
ایک بار	۰	۰	۰	۰	بخاری - کتاب الحج		۴
۰	۰	۰	۰	۰	جمہرہ ۱۷۶	اصابہ ۲۱۷۰	۵

تعلیقات و حواشی

باب اوّل

(۱) اسلامی سلطنت اور دنیاوی سلطنت کے فرق کے لیے ملاحظہ کیجیے: سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبیؐ، جلد ہفتم، نقوش (لاہور) رسولؐ نمبر، جلد دوم، دسمبر ۱۹۸۲ء، ص ۳۲۰ تا ۳۹۹؛ سید ابوالاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت، دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۸۰-۱۳۔

(۲) ازرقی، کتاب اخبار مکہ، مرتبہ فرڈیننڈ وستنفلڈ، بیروت ۱۹۶۴ء، ص ۵۰ تا ۱، وغیرہ؛ ابن عبد ربہ، العقد الفرید، مرتبہ احمد امین، احمد زین، ابراہیم ابیاری، قاہرہ ۱۹۵۲ء، جلد سوم، ص ۱۵-۳۱۴؛ مونٹگمری واٹ، محمدؐ ایٹ مکہ، آکسفورڈ ۱۹۵۳ء، ص ۱۶-۴۔

(۳) مونٹگمری واٹ، محمدؐ ایٹ مکہ، ص ۱۸-۱۷؛ گرونی بام، کلاسیکل اسلام، انگریزی ترجمہ کیتھرین واٹسن، لندن ۱۹۷۰ء، ص ۲۶-۱۳۔

(۴) مذکورہ بالا

(۵) سید سلیمان ندوی، سیرت النبیؐ، جلد ہفتم، ص ۱- ۳۶۵ (عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکومت)

(۶) مونٹگمری واٹ، محمدؐ ایٹ مدینہ، لندن ۱۹۵۶ء، ص ۲۳۹۔

(۷) ملاحظہ ہو: سید ابوالاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت کا باب اوّل۔

(۸) سید سلیمان ندوی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی، مذکورہ بالا۔

(۹) ابنِ اسحاق، سیرۃ رسول اللہ، انگریزی ترجمہ الفریڈ گلیوم، لندن ۱۹۵۵ء، ص ۲۳۴؛ ابنِ سعد، سوم، مختلف تراجم صحابہ؛ نیز ملاحظہ ہو: مونٹگمری واٹ، محمدؐ ایٹ مدینہ، ص ۲۴۹۔ نیز ملاحظہ ہو: ابنِ سعد، الطبقات الکبریٰ، دارصادر بیروت ۱۹۵۷ء، جلد سوم، ص ۳-۲۲؛ مونٹگمری واٹ، محمدؐ ایٹ مدینہ، ص ۲۴۹۔ لیکن ابنِ سعد نے اپنی دوسری روایت میں حضرت سہل بن حنیف انصاری سے مواخاۃ کا ذکر کیا ہے۔ خیال یہ ہے کہ ان دونوں روایتوں کا تعلق بالترتیب مکی اور مدنی زمانے سے ہے۔

(۱۰) ابنِ اسحاق، مذکورہ بالا، ص ۷-۱۹۶۔

(۱۱) ابن اسحاق، مذکورہ بالا، ص ۱۹۷۔

(۱۲) ابنِ اسحاق، مذکورہ بالا، ص ۸-۱۹۷؛ ابنِ سعد، طبقات، اول ص ۲۱۹؛ طبری، تاریخ الرسل والملوک (تاریخ طبری)، مرتبہ محمد ابوالفضل ابراہیم، دار المعارف، قاہرہ ۱۹۶۱ء، دوم ص ۵۵-۳۵۳؛ بلاذری، انساب الاشراف مرتبہ محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء، اوّل ص ۲۳۹۔

ان صالح خزرجیوں کے نام مع ان کے خاندانوں کے حسبِ ذیل ہیں؛

۱۔ اسعد بن زرارہ ——— بنو نجار
۲۔ عوف بن حارث ——— بنو غنم
۳۔ رافع بن مالک ——— بنو زریق
۴۔ قطبہ بن عامر ——— بنو سلمہ
۵۔ عقبہ بن عامر ——— بنو سلمہ
۶۔ جابر بن عبداللہ ——— بنو سلمہ

مؤخر الذکر تینوں بزرگ بنو سلمہ کے مختلف گھرانوں سے متعلق تھے۔

(۱۳) ابنِ اسحاق، سیرۃ، ص ۱۹۸؛ ابنِ سعد، سوم ص ۲۱-۴۲۰ کا بیان ہے کہ اوس/عبدالاشہل کے سردار سعد بن معاذ کے قبولِ اسلام کا اتنا اثر ہوا کہ پورا قبیلہ مسلمان ہوگیا۔ مدینہ میں اسلام کے پُرجوش و زبردست داعی و مبلغ اس زمانہ میں حضرات اسعد بن زرارہ وغیرہ اور کچھ زمانے بعد حضرات سعد بن معاذ اور مصعب بن عمیر عبدری تھے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ پہلے چھ خزرجی مبلغین نے اس تندہی سے کام کیا تھا کہ اللہ و رسول کا نام ہر گھر میں پہنچ گیا تھا۔ طبری، دوم ص ۳۵۵ بھی یہی بیان کرتے ہیں۔

نیز ملاحظہ کیجئے: ڈی۔ایس۔ مارگولیتھ، محمڈ اینڈ رائز آف اسلام، لندن ۱۹۰۵ء، ص ۲۰۲؛ ٹی۔ڈبلیو آرنلڈ، دی پریچنگ آف اسلام، لندن ۱۹۳۵ء، ص ۲۴-۲۲؛ میکسم روڈنساں، محمد، انگریزی ترجمہ این کارٹر، پینگوئن بکس ۱۹۷۶ء، ص ۳-۱۴۲؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، دار المصنفین اعظم گڈھ ۱۹۷۶ء، اوّل ص ۲۶۶۔

(۱۴) ابن اسحاق، سیرہ، ص ۹۹-۱۹۸ کا بیان ہے جو کافی اہم ہے کہ "عقبہ کی یہ بیعت جنگ کا حکم ملنے سے پہلے ہوئی تھی"۔ شرائطِ بیعت یہ تھیں؛

۱۔ وہ خدا کے ساتھ شرک نہیں کریں گے۔ ۲۔ چوری نہیں کریں گے۔
۳۔ زنا نہیں کریں گے۔ ۴۔ اولاد کشی نہیں کریں گے۔
۵۔ بہتان تراشی نہیں کریں گے۔ ۶۔ اور امر بالمعروف میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نہیں کریں گے۔

یہاں یہ نکتہ ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ ہجرت سے قبل اور اسلامی ریاست کے قیام سے پہلے مدینہ کے مسلمانوں سے

مکمل اطاعت و فرمانبرداری کا مطالبہ کیا گیا تھا جیسا کہ آخری شرطِ بیعت سے معلوم ہوتا ہے۔ دراصل نافرمانی اور حکم عدولی آپ کی رسالت کے انکار کے مترادف ہوتی۔

نیز ملاحظہ کیجئے: انساب الاشراف، اول ص ۲۳۹؛ طبری، دوم ص ۳۵۶؛ ابن سعد، سوم ص ۳-۶۰۲؛ رودنساں، محمد، ص ۴۴-۱۴۳؛ واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۴۶-۱۴۴۔

شرکاء بیعت عقبہ اولیٰ کے اسماء گرامی کے لیے دیکھئے: ابن اسحاق، سیرۃ، ص ۹۹-۱۹۸۔

(۱۵) ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، سیرۃ، ص ۸-۱۹۷۔

(۱۶) اس زمانہ میں یثرب میں اشاعتِ اسلام کے لیے ملاحظہ کیجئے: ابن اسحاق، سیرۃ، ص ۹۹-۱۹۸۔

(۱۷) ابن اسحاق، سیرۃ، ص ۱۹۹؛ ابن سعد، سوم ص ۱۱۸؛ انساب الاشراف، اول ص ۲۳۹؛ طبری، دوم ص ۳۵۷ اور ص ۳۶۶۔

(۱۸) ابن اسحاق، سیرۃ، ص ۲۳۰؛ طبری، دوم ص ۳۵۹؛ نیز دیکھئے، ابن سعد، سوم ص ۱۱۸، ص ۲۱-۲۲۰۔ اوس مناۃ کے قبول اسلام کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قبیلہ کا نام اوس اللہ رکھ دیا تھا۔ ناموں کے سلسلے میں یا کسی بھی معاملہ میں شرک کا شائبہ تک قابلِ برداشت نہیں تھا۔ قدیم نام ایک بڑے بُت کی نسبت رکھتا تھا۔

(۱۹) عام طور سے خیال یہ ہے کہ اس بیعت میں صرف ۲، مسلمانانِ مدینہ شریک تھے، ملاحظہ ہو: شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول ص ۲۶۴۔ لیکن اس میں شرکاء کی کل تعداد ۵، تھی۔ ملاحظہ ہو: بلاذری، انساب الاشراف، اول ص ۵۲-۲۴۰۔ بلاذری نے ان میں سے صرف ستر کے مختصر سوانحی خاکے بھی دیے ہیں۔ ابنِ سعد، اول ص ۳-۲۲۱؛ محمد حمید اللہ، محمد رسول اللہ، اردو ترجمہ نذیر حق، نقوش رسول نمبر، جلد دوم ص ۵۶۷۔ یہ بات اہم ہے کہ مسلمان مدنیوں میں دو عورتیں بھی شریک بیعت تھیں اور ان میں سے ایک کے ہاں اسی زمانے میں ایک بچے کی بھی ولادت ہوئی تھی۔ بیعتِ عقبہ ثانیہ کے شرکاء گرامی کے ناموں کے لیے دیکھئے ابنِ اسحاق، سیرۃ، ص ۱۲-۲۰۸، جن کے نزدیک اس میں ۳، مرد اور ۲ عورتیں شامل تھیں۔ ابنِ اسحاق وغیرہ نے ان شرکاء بیعت کے قبائل اور خاندانوں اور ان کے تناسب کا بھی ذکر کیا ہے۔

(۲۰) ابنِ اسحاق، سیرۃ، ص ۴-۲۰۳ کا بیان ہے کہ انصارِ مدینہ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان و مال کا تحفظ دیتے ہوئے کہا تھا کہ "ہم عہد کرتے ہیں اور ہم اہلِ حرب لوگ ہیں۔ ہمارے پاس اسلحے ہیں جو ہم تک ہمارے آباؤ اجداد سے پہنچے ہیں۔ ہم اسی طرح آپ کا تحفظ کریں گے جس طرح ہم اپنے خاندان والوں کا تحفظ کرتے ہیں خواہ اس کے لیے ہمیں ساری دنیا سے (اسود و احمر سے) جنگ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ ہم ہر صورت میں آپ کا ساتھ دیں گے خواہ آپ کے مدِمقابل ہمارے رشتہ دار ہوں یا اجنبی لوگ۔" جواب میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یقین دلایا تھا کہ "میں ان سے لڑوں گا جن سے تم لڑو گے اور ان سے صلح کروں گا جن سے تم صلح کرو گے۔ میرا خون تمہارا خون ہے"

میں تمہارا اور تم میرے ہو۔" اس پر بحث کے آخر میں ابن اسحاق کا بیان ہے کہ "اب انھوں نے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ساری دنیا سے جنگ کرنے اور ہر دُکھ سُکھ، عُسر و یُسر، تنگی و فراخی ہر حال میں آپ کا ساتھ دینے کا عہد کر لیا تھا۔"

ابنِ اسحاق اور دُوسرے مورخین اور مولفین سیرت کے بیان بیعت عقبہ ثانیہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بیعت حرب محض دفاعی جنگ تک محدود نہیں تھی جیسا کہ بعض مورخین کا خیال ہے (مثلاً شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول ص ۳۱۶؛ طبری، دوم ص ۶۴-۲۶۳؛ آرنلڈ ص ۲۴؛ محمد ایٹ مکہ، ص ۹۴-۱۴۷؛ مارگولیتھ، مذکورہ بالا، ص ۴-۲۰۳؛ فرانسسکو جبرئیل، محمد اور فتوحاتِ اسلام، انگریزی، لندن ۱۹۶۸ء، ص ۶۰) حقیقت یہ ہے کہ بیعت حرب میں دفاعی اور جارحانہ جنگ میں کوئی فرق نہیں کیا گیا تھا۔ حیرت بلکہ شدید حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے قدیم و جدید مورخین و سیرت نگاروں نے یہ نتیجہ کہاں سے اخذ کیا ہے کہ انصارِ مدینہ نے بیعتِ حرب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محض دفاعی جنگ میں ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ جارحانہ یا اقدامی جنگ میں نہیں۔ ان مورخین کا خاص مغربی مورخین کا خیال ہے کہ اسی بنا پر انصار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ابتدائی مہموں میں ساتھ نہیں دیا تھا کیونکہ وہ اقدامی مہمیں تھیں۔ اگرچہ یہاں ابتدائی مہموں سے بحث نہیں تاہم بیعتِ حرب پر ماخذ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بیعت دونوں قسم کی جنگوں کے لیے تھی۔ اور جدید و قدیم مورخین کا یہ تاثر کہ وہ صرف دفاع کے پابند تھے صحیح نہیں ہے۔ شاعرِ رسول حضرت حسان بن ثابت نے اپنے اشعار میں جو ابن اسحاق کی سیرت (ص ۹۲۵) میں محفوظ ہیں ان مہماتِ نبوی کو گنایا ہے جن میں انصار نے شرکت کا شرف حاصل کیا تھا۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انصارِ مدینہ ان ابتدائی مہمات میں سے غزوات ودان اور ذوالعشیرہ میں شریک رہے تھے۔ واقدی کا بیان ہے (کتاب المغازی، مرتبہ مارسدن جونس، آکسفورڈ، ۱۹۶۶ء، ص ۹) کہ اسلام کے پہلے سریے جو حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کی کمان میں سیف البحر کے علاقے میں گیا تھا مسلمان شرکاء نصف مہاجر اور نصف انصار تھے اور وہ ان کے نام بھی گناتا ہے۔ اگرچہ دوسری روایت میں وہ اس کی تردید کرکے وہی کہتا ہے جو سب کہتے آرہے ہیں کہ انصار نے ابتدائی مہمات میں شرکت نہیں کی تھی کیونکہ وہ دفاعی جنگ کے پابند تھے۔ واٹ کا خیال ہے (محمد ایٹ مدینہ، ص ۳) کہ انصار بعض ابتدائی سرایا و غزوات میں ضرور شامل رہے ہوں گے۔ بہرحال وہ ابتدائی مہموں میں شامل رہے ہوں یا نہ رہے ہوں یہ حقیقت ہے کہ بدر سے پہلے مدینہ کا جو لشکر قریشی کارواں کی ناک میں نکلا تھا اس میں انصار مہاجرین سے کہیں زیادہ شامل تھے۔ کیا وہ ایک اقدامی معاملہ نہ تھا؟ دراصل دفاعی اور جارحانہ یا اقدامی جنگ کی تفریق اس دل کی پھانس سے کی جاتی ہے جس کا سبب یہ عقیدہ ہے کہ اسلام صرف دفاعی جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ دفاع کبھی اقدام کے ذریعہ بھی کیا جاتا ہے۔

(۲۱) ابنِ اسحاق، سیرۃ ص ۲۰۴؛ ابن سعد، دوم ص ۶۰۲؛ انساب الاشراف، اول ص ۲-۲۵۲؛ طبری، دوم ص ۵۶-۳۵۵۔ نیز ملاحظہ ہو؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ ص ۸-۱۴۷، جنھوں نے اصلاح نقیب کا ترجمہ

نمائندہ (REPRESENTATIVE) کیا مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح ترجمہ سردار، سید یا شیخ ہوگا۔ ملاحظہ کیجئے: رچرڈ بیل، دی قرآن، ایڈنبرا ۱۹۳۷ء، ص ۵۹، حاشیہ نمبر ۴ جن کا خیال ہے کہ اس لفظ کا معنی "لیڈر" ہے۔ نیز ملاحظہ ہو: اے، جی، آربری، دی قرآن انٹرپریٹڈ (THE QUR'AN INTERPRETED)، لندن ۱۹۵۵ء، اول ص ۱۲۹۔ مکمل بحث کے لیے دیکھیے اس کتاب کا باب چہارم بحث برنقیب۔

(۲۲) جزیرہ نمائے عرب کے جن مقامات سے آپ کو دعوتِ ہجرت ملی یا جن پر آپ کی نگاہِ انتخاب روایات کے مطابق گئی ان میں قبیلہ ازدشنوءہ کے خاندان دوس کے شیخ قبیلہ حضرت طفیل بن عمرو کے علاقہ یا جنوب میں بنو ہمدان کے علاقہ یا یمامہ اور ہجر کے کسی پُربہار و سرسبز و شاداب شہر کا ذکر آتا ہے۔ روایات ہم کو باور کراتی ہیں کہ مدینہ کا انتخاب خداوندی تھا جو القاء یا رؤیا کے ذریعے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو: شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول ص ۹۴-۹۳؛ مسلم، جامع صحیح، باب الدلیل علی ان قاتلہ نفسہ لایکفر؛ بخاری، جامع صحیح، باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم؛ زرقانی، شرح المواہب اللدنیۃ، قاہرہ، طبع غیر مورخہ، اول ص ۳۵۹۔

ابن اسحاق، سیرہ ص ۱۹۵ کی ایک روایت میں آتا ہے کہ بنو حنیفہ کے ایک خاندان اور بنو عامر بن صعصعہ کے ایک شیخ قبیلہ بحیرہ بن فراس نے اسلام قبول کرنے اور آپ کو اپنے ہاں پناہ دینے کی پیشکش اس شرط پر کی تھی کہ اسلام کو عروج ملنے پر ان کو حکومت میں شریک یا خلافت کا مجاز قرار دیں جسے آپ نے مسترد فرمادیا۔ بہر حال وہ تمام روایات جو آپ کو پناہ دینے کا ذکر کرتی ہیں ان کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ آپ قبائلِ عرب سے اپنے ذاتی تحفظ کا مطالبہ کرتے تھے یا قبائلِ عرب آپ کو اس کی ضمانت کی پیشکش کرتے تھے۔ بنیادی طور پر آپ کا مطالبہ اسلام کی نصرت و پناہ کا تھا جس کا مطلب تھا قبولِ اسلام کے بعد اس علاقہ میں اسلامی نظام قائم کرنا۔ قبائلِ عرب بھی اس کے مضمرات سمجھتے تھے کہ وہ محض ایک عقیدہ، طرزِ فکر یا چند مذہبی رسوم کا قبول کرنا نہیں ہے بلکہ اس کے دور رس اور گہرے سیاسی اور سماجی مضمرات ہیں جو موجودہ نظامِ حیات کے قاتل ہوں گے اور ان کے سبب ایک عظیم سیاسی اور سماجی انقلاب آئے گا۔ گوناگوں اسباب سے مذکورہ بالا یا دوسرے قبائل عرب کے علاقوں کو وطنِ ہجرت نہ بنایا جاسکا۔

(۲۳) مدینہ کا وطنِ ہجرت بنانے کا خیال خالص ٹھوس تاریخی عوامل کے سبب پختہ ہوا اور عمل میں آیا تھا۔ خواب اور القاء کا جہاں تک تعلق ہے اس سے اس معنی میں انکار نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قدم اور ہر کام اذن و رضائے الٰہی سے ہوتا تھا مگر ہمارے قدیم مورخین و سیرت نگار یا محدثین و مفسرینِ کرام ان تاریخی عوامل کی مذہبی توجیہ تلاش کر لیتے ہیں اور یہ ان کے عہد کا تاریخی شعور تھا۔ مگر صرف تاریخی نقطۂ نظر سے یا تاریخی تناظر میں دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ۶۲۰ء اور ۶۲۲ء کے درمیان مدینہ میں اسلام کی ہمہ گیر اشاعت اور شہر کا تقریباً تمام کا تمام مسلمان ہو جانا (یہودی قبائل کے سوا)، عرب کی مغربی شاہراہِ تجارت پر اس کا محلِ وقوع جو اقتصادی اور فوجی لحاظ سے قریش کی عداوتِ اسلام کے پس منظر میں بے انتہا اہم تھا، وغیرہ ایسے اسباب تھے جنہوں نے درحقیقت مدینہ کو وطنِ ہجرت بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔

(۲۴) مثلاً ملاحظہ ہو: شبلی نعمانی، سیرت النبی، اوّل ص ۲۶۰، ۲۶۲، ۲۶۴ اور ۲۸۴؛ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، محمد رسول اللہؐ، ص ۵۶۸، ۱، ۵؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۱۵۰؛ محمد ایٹ مدینہ، ص ۵ - ۲؛ مارگولیتھ، مذکورہ بالا، ص ۲۳۴۔ تقریباً تمام جدید مورخین اور سیرت نگاروں نے بلا استثناء ہجرتِ مدینہ کے باب میں دو نکات پر اتفاق کیا ہے: اوّل یہ کہ مسلمان خاص طور سے مکہ کے مسلمان چوری چھپے اور چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں یا اِکا دُکا ہجرت کے سفر پر نکلے تھے؛ دوم یہ کہ معدودے چند کو چھوڑ کر تمام مہاجرین خالی ہاتھ مدینہ آئے تھے۔ اور یہ دونوں باتیں مآخذ سے ثابت نہیں ہوتیں بلکہ اس سے قطعی مختلف صورتِ حال اُبھرتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے: خاکسار کا مضمون "کیا مہاجرینِ مکہ خالی ہاتھ مدینہ آئے تھے؟" تحقیقاتِ اسلامی، علی گڈھ۔ اپریل ۱۹۸۳ء۔

(۲۵) تفصیلات اور مآخذ کے لیے ملاحظہ کیجئے مضمون مذکورہ در حاشیہ نمبر ۲۴۔

(۲۶) اسی طرح یہ خیال کہ ہجرت نبوی کے وقت مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اکابر صحابہ میں محض حضرات ابوبکر و علی رہ گئے تھے صحیح نہیں ہے۔ یہ یقیناً صحیح ہے کہ اکثر بزرگ صحابہ مدینہ جا چکے تھے مگر ان کی معتدبہ تعداد اب بھی مکہ میں موجود تھی۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجئے خاکسار کا مضمون "سیرت نبوی میں ہجرت کی اہمیت"۔ یہاں یہ مختصراً کہہ دیا جائے کہ اس غلط فہمی کا سبب ابن اسحاق کا عمومی تبصرہ ہے کہ ان دو بزرگوں کے سوا اور کوئی مدینہ میں باقی نہیں رہا تھا۔ ملاحظہ کیجئے ص ۲۲۱۔ بعد کے قدیم و جدید مورخین نے بلا تنقید و جرح یہ بیان قبول کر لیا۔

(۲۷) ہجرت نبوی کی اب تک مسلّمہ تاریخ زیادہ تر مورخین و سیرت نگاروں کے نزدیک یہی ہے۔ لیکن یہ اس تقویم کے مطابق ہے جس میں ولادتِ نبوی ۲۰ر اپریل ۵۷۱ء تسلیم کی گئی ہے۔ اس سے متعدد علمائے نے اختلاف کیا ہے اور متعدد دوسری تاریخیں بھی ہجرت نبوی کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مذکورہ بالا، ص ۷۰۵، کے نزدیک وہ پیر ۱۲ر ربیع الاول ۳۱ مئی ۶۲۲ء تھی۔ اسحاق النبی علوی، مذکورہ بالا، ص ۵۵ - ۵۲ کی جدول کے مطابق دوشنبہ ۱۲ر ربیع الاول کو ۲۲ نومبر ۶۲۲ء تھی۔ جبکہ مارگولیتھ مذکورہ بالا، ص ۲۱۲؛ ایچ، جی ویلز، آؤٹ لائن آف ورلڈ ہسٹری، ص ۶۰۰، کارل بروکلمن، ہسٹری آف دی اسلامک پیپل، انگریزی ترجمہ، لندن ۱۹۷۹ء، ص ۲۰ اور تقریباً تمام دوسرے مورخین و مستشرقینِ مغرب کا خیال ہے کہ ۸ر ربیع الاول ۱ھ کو ۲۰ر ستمبر تھی۔ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۲۷۰ نے اس تاریخ سے اتفاق کیا ہے اور سند میں محمد بن موسیٰ خوارزمی اور الیعقوبی کو ذکر کیا ہے۔ جدید مورخین میں مونٹگمری واٹ کا خیال ہے یہ تاریخ ۲۴ر ستمبر ۶۲۲ء تھی یا اس کے لگ بھگ، اور مدینہ خاص آپ ۲۴ر ستمبر کو وارد ہوئے تھے۔

بہرحال اسحٰق النبی علوی کی جدید ترین تحقیق کے مطابق ہجرتِ نبوی کی مختلف منزلوں اور مرحلوں کی تاریخیں حسب ذیل تھیں:

۱ - غارِ ثور کو روانگی	جمعہ ۲ر ربیع الاوّل / ۱۲ نومبر ۶۲۲ء
۲ - غار میں قیام سہ روزہ	جمعہ تا دوشنبہ ۲ تا ۵ ربیع الاوّل / ۱۲-۱۵ر نومبر ۶۲۲ء
۳ - قبا میں آمد	دوشنبہ ۱۲ر ربیع الاوّل / ۲۲ر نومبر ۶۲۲ء

۴ - مدینہ میں نمازِ جمعہ	جمعہ ۱۶ ؍ ربیع الاول / ۲۶ ؍ نومبر ۶۲۲ء	
۵ - مدینہ میں مستقل قیام	یکشنبہ یا دوشنبہ ۲۵ یا ۲۶ ؍ " / ۵ ؍ دسمبر ۶۲۲ء	

(۲۸) ابن اسحاق، ص ۲۲۸ -

(۲۹) مورخین کے مختلف نقطہ ہائے نظر کے لیے ملاحظہ کیجئے حاشیہ نمبر ۲ -

(۳۰) مضمون "کیا مہاجرین مکہ خالی ہاتھ مدینہ آئے تھے"؛

(۳۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے باب پنجم - حیرت کی بات یہ ہے کہ بعض مورخین جو مہاجرین کی ناداری کے قائل ہیں ہجرت کے بعد ان کی اقتصادی زندگی خاص کر ہجرت کے فوراً بعد ان کے پیشوں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں - مثلاً ملاحظہ ہو مارگولیتھ مذکورہ بالا، ص ۶ - ۲۳۵؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۸۷ - ۲۸۶ -

(۳۲) ابن اسحاق، سیرہ، ص ۲۱۸ نے انصار کے گھرانوں میں مختلف مہاجرین کے قیام کی تفصیلات دی ہیں - نیز ملاحظہ کیجئے ابنِ سعد، سوم اور چہارم میں صحابہ کرام کے سوانحی خاکے؛ طبری، دوم، ص ۳۸۲؛ بخاری، باب فضل المنیحہ - نیز دیکھیے: آرنلڈ، مذکورہ بالا، ص ۲۶؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱ -

(۳۳) مثلاً حضرت بلال حبشی کی وابستگی بنو خثعم سے، حضرت حسان بن ثابت انصاری کی حضرت عثمان بن عفان اُموی سے حضرت عمر بن خطاب عدوی کی حضرت عتبان بن مالک انصاری سے اور حضرت عبد الرحمن بن عوف زہری کی سعد بن ربیع انصاری سے اور نہ جانے کتنے دوسرے صحابہ کرام کی اخوت کا یہ رشتہ تا عمر قائم و دائم رہا - ملاحظہ ہو: ابنِ سعد، سوم اور چہارم میں سوانحی خاکے - حضرت بلال نے عہدِ فاروقی میں اپنے عطا کو اپنے اسلامی بھائی ابو رویحہ عبد اللہ بن عبد الرحمن الخثعمی کے خاندان کے ساتھ شامل و مندرج دیوان کرایا تھا - ملاحظہ ہو ابن اسحاق، سیرہ، ص ۲۳۵ -

(۳۴) بخاری، کتاب التفسیر، الانفال آیت نمبر ۱، نیز کتاب المناقب، باب اخبار النبی -

ہمارے جدید مورخین نے بھی اس خیال کو تسلیم کر لیا ہے مثلاً شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول ۵ - ۲۸۴؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۴۹؛ آرنلڈ مذکورہ بالا، ص ۳۳ -

(۳۵) ملاحظہ ہو: مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۴۹ -

(۳۶) شبلی نعمانی، مذکورہ بالا، ص ۶ - ۲۸۵ -

(۳۷) ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مذکورہ بالا، ص ۲۷ - ۱۷۵، کا خیال ہے کہ "سیکڑوں مکی مسلمان مدینہ میں پناہ لے چکے تھے - ان کی یہاں کوئی جائیداد وغیرہ نہ تھی - انھیں مقامی معیشت میں کھپا نا وقت کی اشد ضرورت تھی .... انھوں نے تجویز کیا کہ مدینہ کے باوسیلہ اور متمول مسلمان ایک ایک مکی کو اپنا بھائی بنا لیں - دونوں بھائیوں کے خاندان مل کر کمائیں اور کھائیں، یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے کے ترکہ میں بھی حصہ دار ہوں .... یہ انتظام کئی سال تک جاری رہا - مکی مسلمان طفیلی بن کر رہنے کے خواہشمند نہیں تھے - جب انھوں نے محنت سے کافی دولت پیدا کر لی تو انھوں نے اپنے مکی (مدنی)

بھائیوں کی املاک ان کے سپرد کر دیں۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر آزادانہ زندگی بسر کرنا شروع کر دی"

گویا کہ مواخات اقتصادی مجبوریوں اور معاشی ضرورتوں کے تحت عمل میں لائی گئی تھی۔ اور وہ ایک عارضی انتظام تھا۔ شبلی نعمانی بھی اسے اقتصادی اور عارضی ہی سمجھتے ہیں اگرچہ اس کے دیرپا اثرات کی بنا پر "عظیم الشان اغراض اسلامی کی تکمیل کا سامان" بھی سمجھتے ہیں۔

(۳۸) مآخذ اور جدید مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ مواخاۃ کو مدینہ میں پہلی بار اس وقت رُو بہ عمل لایا گیا جب مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی تعمیر تکمیل کے قریب تھی۔ ملاحظہ ہو ابن اسحاق، سیرہ، ص ۲۳۴؛ شبلی نعمانی، مونٹگمری واٹ وغیرہ کے مذکورہ بالا حوالے۔ ابن سعد، سوم، ص ۲۲ کا یہ بیان دلچسپ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر سے قبل پہلے مہاجرین کے درمیان پھر مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخاۃ قائم کی تھی۔ اور آپ نے یہ مواخاۃ سچائی اور باہمی تعاون کی بنیادوں پر استوار کی تھی۔

(۳۹) مونٹگمری واٹ، مذکورہ بالا اس کے قائل ہیں۔

(۴۰) ملاحظہ کیجئے، ابنِ اسحاق، سیرہ، ص ۲۳۴ پر مذکورہ اسمائے گرامی صحابہ۔ نیز ابنِ سعد، سوم اور چہارم میں سوانحی خاکے۔

(۴۱) واٹ، مذکورہ بالا، اس نظریے کے جدید عہد میں بانی ہیں۔

(۴۲) مسلم مفکرین و علماء کا خیال ہے کہ اذن جہاد و قتال دوسری بیعت عقبہ سے کچھ پہلے ملا تھا۔ ملاحظہ ہو ابن اسحاق، سیرہ، ص ۲۱۲-۲۱۳؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۳۰۸-۹ کی تحقیق کے مطابق اجازت جہاد ۱۲ صفر ۲ھ / اگست ۶۲۳ء کو ملی تھی جیسا کہ زرقانی نے مواہب اللدنیہ میں تصریح کی ہے۔

(۴۳) ابن سعد، سوم، ص ۵۵۵۔

(۴۴) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابنِ اسحاق، سیرہ، ۳۲۷-۳۸۰، بدری صحابہ کی فہرست اور ابنِ سعد، سوم۔

(۴۵) مہاجرین میں سے جو صحابہ کرام میدانِ بدر میں موجود نہ تھے ان میں حضرت عثمان بن عفان اموی اور حضرت ابوذر غفاری کافی ممتاز تھے۔ انصار میں حضرات سعد بن عبادہ خزرجی، خارجہ بن زہیر اور عتبان بن مالک نمایاں تھے۔ ان کے علاوہ متعدد مہاجر و انصاری بھائیوں میں کوئی ایک موجود نہ تھا۔ ابنِ سعد، سوم نے تین سو چودہ بدری صحابہ کرام میں سے صرف ایک سو چار بھائی جوڑوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ۵۸ جوڑے مہاجرین کے اور ۴۶ انصار کے ہیں اور متعدد ان میں سے ایک دوسرے میں مشترک ہیں۔

(۴۶) ملاحظہ کیجئے حضرات جعفر طیار بن ابی طالب، ابوہریرہ دوسی وغیرہ کی مواخات کے لیے ابن اسحاق، سیرہ، ص ۲۳۴؛ ابنِ سعد، چہارم کے سوانحی خاکے؛ انساب الاشراف، اول، ص ۲۷۱۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیان کی مواخاۃ حضرت الحتات بن یزید سے قائم کی گئی تھی۔ حضرت معاویہ حدیبیہ کے بعد کسی وقت مسلمان ہوئے تھے۔

(۴۷) ابن اثیر، اسد الغابہ (اسد)، تہران ۱۳۷۷ھ، دوم ص ۳۲۸؛ ابن حجر عسقلانی، الاصابہ فی تمییز الصحابہ،

(اصابہ)، مصر ۱۹۳۸ء، دوم ص ۶۰؛ ابو عمر یوسف بن عبداللہ قرطبی، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب (استیعاب) قاہرہ ۱۹۳۹ء، دوم ص ۴۵۔ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، چہارم، ص ۹۔

(۴۸) متن دستور نبوی میں کتاب اور صحیفہ کے الفاظ آئے ہیں۔ محمد حمید اللہ اس کو میثاق اور انگریزی میں دستور (CONSTITUTION) کہتے ہیں۔ یہی انگریزی اصطلاح مونٹگمری واٹ، سرجنٹ، موشے گل اور ولہاوزن کے انگریزی مترجم نے بھی استعمال کی ہے۔ برکات احمد اسے دستور نہیں مانتے اور صحیفہ کہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ بعض مستشرقین جیسے ریوبن لیوی وغیرہ نے چارٹر (CHARTER) کی اصطلاح استعمال کی ہے تو مارگولیتھ وغیرہ نے کنٹریکٹ کی۔

(۴۹) متنِ دستور کو سب سے پہلے ابن اسحاق، سیرہ، ص ۲۳۱-۲۳۳ نے بیان کیا جو ابنِ ہشام، سیرہ، اول، ص ۵۰۱-۵۰۴ میں نقل ہوا اور وہی تاریخی اعتبار سے قدیم ترین متن ہے۔ اور اسی متن کو بعد کے تمام مورخوں نے نقل کیا ہے۔ ان میں اہم ترین ابو خیثمہ، ابو عبید اور ابنِ کثیر ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس متن کو مختلف متون سے ملا کر مع اپنے تبصرے کے لاہور کے ایڈیشن ۱۹۶۸ء میں "دُنیا کے پہلے تحریری دستور" کے نام سے شائع کیا ہے۔ ریوبن لیوی اور مونٹگمری واٹ نے وینسنک وغیرہ دوسرے مستشرقین کے علاوہ اپنی کتابوں میں اس کا مکمل ترجمہ مع پیراگراف کے دیا ہے۔ محمد حمید اللہ کے مترجم نے اپنی کتاب محمد رسول اللہ، مذکورہ بالا، ص ۶-۳، ۷-۵ میں اس کا ترجمہ بھی دیا ہے لیکن اس میں اصل ترتیب نہیں قایم رکھی گئی ہے۔

اگرچہ دُوسرے ابتدائی مآخذ میں صحیفہ نبوی کا متن نہیں پایا جاتا تاہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ کے مختلف طبقات سے خاص کر یہود سے ایک معاہدہ یا عہد کا حوالہ برابر ملتا ہے۔ واقدی، مغازی، ص ۱۷۶، کا بیان ہے کہ "جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو تمام یہود آپ کے ساتھ ایک معاہدہ (عہد) میں داخل ہوئے آپ نے اپنے اور ان کے درمیان ایک تحریر (کتاب) لکھی۔ اور آپ نے ہر قوم کو ان کے حلیفوں کے ساتھ شامل رکھا۔ آپ نے اپنے اور ان کے درمیان صلح (امان) قائم کیا۔ اور ان کے کچھ فرائض مقرر کیے۔ یہودیوں کے منجملہ فرائض میں سے ایک یہ تھا کہ وہ آپ کے خلاف کسی دشمن کی مدد نہیں کریں گے۔"

ابنِ سعد، دوم، ص ۲۹ کا محض یہ کہنا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ ایک صلح کا معاہدہ کیا تھا۔ جبکہ طبری، دوم ص ۹-۴۸ کا بیان ہے کہ آپ نے یہود مدینہ کے ساتھ دوستی کا ایک معاہدہ کیا تھا۔ جب آپ وہاں پہنچے تھے (وکان قد وادع حین قدم المدینۃ یہودھا)۔ شرائط معاہدہ یہ تھیں کہ وہ آپ کے خلاف کسی کی بھی مدد نہیں کریں گے اور اگر مدینہ پر کوئی دشمن حملہ کرے تو وہ آپ کی مدد کے پابند ہوں گے۔ نیز بلاذری، فتوح البلدان، مصر ۱۹۳۲ء، ص ۳۰۔

مآخذ کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تشکیلِ امت اور قیام ریاست کا آغاز کیا تو آپ نے دو طرح کے معاہدے مختلف طبقات مدینہ سے کئے تھے۔ پہلے تو وہ انفرادی

معاہدے تھے جو آپ نے یہودِ مدینہ کے مختلف قبیلوں اور ان کے اہم خاندانوں سے الگ الگ کیے تھے۔ اس ضمن میں یہ خیال غلط ہے کہ صرف دستورِ مدینہ ہی واحد معاہدہ تھا جو آپ نے یہود مدینہ سے اجتماعی طور سے کیا تھا۔ چنانچہ بدر کی مہم کے بعد جب بنو قینقاع نے معاہدہ شکنی کی تو دُوسرے تمام قبیلوں خاص کر بنو نضیر اور بنو قریظہ نے اپنے اپنے معاہدوں کی تجدید کرلی تھی۔ پھر بنو نضیر کی معاہدہ شکنی اور نتیجتاً جلاوطنی کے ضمن میں ذکر آتا ہے کہ بنو قریظہ نے اپنے معاہدے کی تجدید کی تھی۔ اور بنو قریظہ کے معاملہ کے طے ہونے کے بعد دوسرے تمام یہودی قبیلوں اور خاندانوں نے اپنے اپنے معاہدوں کی تجدید کی تھی۔ ملاحظہ ہو ابن اسحاق، سیرہ، ص ۴ - ۳۶۳، ص ۳۷ ۴ اور ص ۴۶۸؛ ابوداؤد، سنن، کتاب الخراج والامارہ، باب خبر النضیر؛ مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب المغازی، باب غزوہ خندق؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، مصر غیر مورخہ، چہارم، ص ۱۱۳؛ نیز مسلم، جامع صحیح، باب ذکر اجلاء الیہود من الحجاز۔

اس ضمن میں یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ بنو نضیر جب مدینہ سے جلاوطن کیے گئے تھے تو انھوں نے اور ان کے سرداروں خاص کر حی بن اخطب نے معاہدہ کیا تھا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی طرح معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کریں گے۔ ملاحظہ ہو بلاذری، فتوح البلدان ص ۲۵۔

لیکن اس سے الگ ایک اجتماعی معاہدہ تھا جو قریشی مہاجرین اور انصارِ مدینہ کے درمیان کیا گیا تھا جس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے دونوں طبقات اور ان کے حلیفوں اور موالی کو جو مسلمان تھے شامل کیا تھا۔ بعد میں اسی معاہدے میں یہودیوں یا کہنا چاہیے کہ انصار کے یہودی حلیفوں اور موالی کو بھی شامل کرلیا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ یہودی حلفاء انصارِ مدینہ کے یہودی قبیلے نہیں تھے بلکہ وہ عرب یہود تھے جو ان کے اپنے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے جیسا کہ آئندہ ذکر آئے گا۔

(۵۰) بحوالہ واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۶ - ۲۲۵۔

(۵۱) ایضاً (۵۲) ایضاً (۵۳) برکات احمد، مذکورہ بالا، ص ۵۰-۴۷

(۵۴) محمد رسول اللہ، ص ۶ - ۱ ۵

(۵۵) "دستورِ مدینہ" دی اسلامک کوارٹرلی، ہشتم، جنوری - جون ۱۹۶۴ء، ص ۱۶ - ۳۔

(۵۶) ریوبن لیوی، سوشل اسٹرکچر آف اسلام، ص ۷۶ - ۲۷۳

(۵۷) موشے گل "دستورِ مدینہ - ایک تجزیہ" اسرائیل اورینٹل اسٹڈیز، تل ابیب، جلد چہارم، ص ۴، ۱۹۷۴۔

(۵۸) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۲۱، حاشیہ ۱۔

(۵۹) واٹ، محمد ایٹ مدینہ ص ۲۲۱، حاشیہ ۲ کا خیال ہے کہ من دون الناس کے فقرہ کا اگرچہ ظاہری اور لغوی مطلب یہود سے ہے لیکن وہ ایسا اغلباً معلوم نہیں ہوتا۔ یعنی مستشرق موصوف یہود کو خارج امت نہیں سمجھتے اور اس فقرہ سے مراد کچھ اور لوگ لیتے ہیں ان کا خیال قطعی غلط ہے۔

(۶۰) ولہاوزن کا خیال ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ اونٹ پر باری باری بیٹھنا ہے جبکہ کیتانی کا خیال ہے کہ تمام فوجی

امور میں مسلمان باری باری فریضہ ادا کریں گے۔ ملاحظہ ہو: واٹ، محمد ایٹ مدینہ ص ۲۲۲، حاشیہ ۲۔ بظاہر موخرالذکر کا خیال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ولہاوزن کا خیال مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔

(۶۱) بطانہ کے معنی واٹ کے نزدیک (ص ۲۲۴، حاشیہ ۳) مجہول ہیں۔ غالباً اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو یہود مدینہ کے ساتھ حلف کے معاہدے و دوستی کی وجہ سے متحد تھے، خون کا رشتہ ان میں نہ تھا۔ جبکہ ونسنک کا خیال یہ ہے کہ غالباً یہ وہ عرب تھے جو اوس و خزرج کے آنے سے قبل یہود کے ساتھ شامل تھے۔ یہ دونوں نقطۂ نظر یا خیالات صحیح نہیں معلوم ہوتے۔ بطانہ کے معنی لغت کے اعتبار سے اہلِ خانہ یا گھر والوں کے ہوتے ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں کہ معاہد یہودیوں کے ساتھ ان کے اہلِ خانہ بھی انھیں جیسے شمار ہوں گے اور سمجھے جائیں گے۔ اس کی کچھ تشریح دفعہ ۲۴ سے ہوتی ہے جس میں موالی کو ان کے سرپرست خاندانوں کی مانند قرار دیا گیا ہے۔

(۶۲) واٹ، ص ۲۲۴، حاشیہ ۴ کا خیال ہے کہ اس دفعہ کا نصف حصہ مجہول المعنیٰ ہے اور آخری حصہ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "خدا اس سے دور ہے۔" یہ ترجمہ وہی کر سکتا ہے جس کو عربی زبان سے ذرا بھی مس نہ ہو۔

(۶۳) واٹ کا خیال ہے (ص ۲۲۵ حاشیہ ۱) کہ اس دفعہ کا بھی مفہوم واضح نہیں ہے۔ وہ اس کے متضاد معنی دیتے ہیں۔

(۶۴) محمد فؤاد عبدالباقی، المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، قاہرہ ۱۹۴۵ء، ص ۸۰۔

(۶۵) محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۲۵-۲۶؛ نیز ملاحظہ ہو ان کا مضمون "IDEAL FACTORS IN THE ORIGIN OF ISLAM" اسلامک کوارٹرلی، جلد دوم، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۵۵ء، ص ۱۶۱ وغیرہ۔

(۶۶) اے، جے، ونسنک (A. J. WENSNICK)، المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی، لیڈن ۱۹۳۶ء، اول، ص ۹۲ ب یا ۹۸ الف۔

(۶۷) غالباً ولہاوزن، عرب کنگڈم اینڈ اٹس فال، انگریزی ترجمہ، لندن ۱۹۷۰ء، ص ۱۲-۱۱، اس نظریہ کا بانی دل تھا ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ خیال اپنے پیش رو جرمن علمائے تاریخ سے مستعار لیا ہو۔ بہرحال اس کا خیال ہے جو عجیب و غریب تضادات اور نرالی منطق پر مبنی ہے کہ "رشتۂ اتحاد مذہب ہے۔ اور مومنین اس کے حامی و ناصر ہیں۔ چنانچہ ان کو خاص حقوق اور فرائض حاصل ہیں پھر بھی ایسا نہیں ہے کہ صرف مومنین ہی امۃ میں شامل ہیں، بلکہ وہ تمام لوگ جو ان سے اتحاد کرلیں اور ان کے ساتھ مل کر جہاد کریں۔ یعنی تمام باشندگانِ مدینہ۔ امہ ایک وسیع علاقے یا خطے پر حاوی تھی۔ مدینہ کے تمام اطراف وحدود ناقابل تنسیخ معاہدہ کا علاقہ تھا۔ انصار میں اس وقت بھی غیر مسلم عرب تھے اور وہ بھی امہ سے خارج نہیں کیے گئے تھے بلکہ واضح طریقہ سے ان کو شامل کیا گیا تھا۔ یہود بھی اس میں شامل تھے۔ اگرچہ امہ میں ان کو وہ قریبی تعلق اور مقام حاصل نہ تھا جو انصار اور مہاجرین کو حاصل تھا اسی لیے ان کے حقوق و فرائض بھی ویسے ہی اور برابر و یکساں نہ تھے۔" واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۶-۲۲۵ اور ص ۴۲-۲۴۱ بھی ولہاوزن کے اتباع میں مدینہ کے تمام فریقوں اور طبقوں ـــــ مسلمانوں، یہودیوں اور غیر مسلم عربوں ـــــ کو امت میں شامل کرتے ہیں۔

اسی طرح شامل کرتے ہیں ایف، ای، پیٹر، اللہ کی کامن ویلتھ (ALLAH'S COMMON WEALTH)، ص ۶۳؛ برکات احمد، مذکورہ بالا، ص ۴۸ - ۴۶؛ محمد حمید اللہ، محمد رسول اللہ، ص ۱، ۵؛ مضمون امہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، اول طبع۔

حیرت ہوتی ہے کہ اگر امت مذہب — اسلام — پر مبنی تھی، جس کا اعتراف تمام جدید مورخین کو ہے تو یہ کیسی امت تھی جس میں یہود، نصاریٰ، مشرکین وغیرہ برابر کے شامل تھے۔ منطقی لحاظ سے تو صرف اس میں مسلمانوں کے طبقات — مہاجرین وانصار — ہی سے امۃ اللہ یا امت اسلامی عبارت ہوسکتی تھی یا یہ امت سرے سے مذہبی بنیادوں پر ہی قائم نہ تھی یا نہ ہونی چاہیے۔ امت کے نظریہ کے لیے ملاحظہ ہو ابوالاعلیٰ مودودی، اسلام کا نظام حیات، دہلی ۱۹۶۷ء، ص ۱۷ وغیرہ۔

(۶۸) مومنین اور مسلمین دونوں قرآنی اصطلاحات ہیں اور ان کے بہترین معانی قرآن ہی نے بیان کیے ہیں۔ ویسے ایمان کے معنی ہیں عقیدہ اور یقین۔ جبکہ اسلام کا مفہوم ہے خدا کی مرضی کے آگے جھک جانا یا حلقۂ اسلام میں داخل ہوجانا۔ اسلامی دینیات میں ان کے درمیان ایک نازک سا فرق ہے جس کو قرآن نے کیا خوب بیان کیا ہے:

"کہتے ہیں گنوار ہم ایمان لائے، تو کہہ تم ایمان نہیں لائے، پر تم کہو مسلمان ہوئے۔ اور ابھی نہیں بیٹھا ایمان تمہارے دلوں میں...

ایمان والے وہ ہیں جو یقین لائے اللہ اور اس کے رسول پر، پھر شبہ نہ لائے اور بیچھے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے - وہ جو ہیں، وہی ہیں سچے۔"

سورۂ حجرات، آیت ۱۵-۱۴؛ اردو ترجمہ شاہ ولی اللہ دہلوی؛ دو ترجمہ حمائل شریف، مطبع انصاری دہلی ۱۳۰۳ھ، ص ۵۸۵؛ نیز ملاحظہ ہو: رچرڈ بیل، مذکورہ بالا، ص ۵۲۶؛ آربری، دوم، ص ۲۳۲؛ بخاری اور مسلم، جامع صحیح، کتاب الایمان۔

(۶۹) واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۴۱ نے دستورِ مدینہ کی اس دفعہ کا ترجمہ غلط کیا ہے اور صحیح ترجمہ بعد میں دیا لیکن اس کی تعبیر و تشریح الٹی کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ "اس دفعہ کا مطلب ممکن طور پر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہود بنی عوف مسلمانوں کے متوازی ایک امت تھے لیکن غالباً اس کا مطلب ہے وہ ایک ہی امت میں شامل تھے"۔ ابن ہشام، دوم، ص ۴ - ۱۰۵ کے متن میں بنو عوف کے یہود کے لیے فقرہ ہے امۃ مع المومنین نہ کہ امۃ من المومنین۔ جس کا واضح مفہوم ہے کہ یہود بنی عوف مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ایک اور امت ہیں جو بہر حال مسلمانوں سے الگ اور ممتاز تھی۔ عربی زبان میں من (سے) اور مع (ساتھ) کا فرق بدیہی ہے جو تمام علمائے لغت جانتے ہیں۔ مستشرق موصوف بھی اس سے نابلد نہیں اسی وجہ سے وہ اس کا صحیح مفہوم بھی دیتے ہیں لیکن اس کی تشریح الٹی کرتے ہیں ورنہ ان کا نظریۂ امت باطل ٹھہرے گا۔ یہاں یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس دفعہ میں "مسلمانوں کے لیے

ان کا دین اور بنو عوف کے یہودیوں کے لیے ان کا دین" مزید کہہ کر یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ امت ہیں۔ اسی ضمن میں قرآن مجید کی سورہ کافرون کی آخری آیت لکم دینکم ولیَ دین "تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے" بھی سامنے رکھنی چاہیے۔ کیا دستورِ مدینہ کی متعلقہ دفعہ آیت قرآنی کی صدائے بازگشت نہیں ہے؟ محض مستشرقین ہی نے نہیں بلکہ اس سلسلے میں ان کے خوشہ چیں مشرقی مسلم مورخین جیسے برکات احمد اور حمید اللہ نے امت کا مفہوم بے انتہا غلط اور غیر تاریخی بنا دیا ہے۔

(۷۰) ولہاوزن، مذکورہ بالا، ص ۱۱ کا خیال ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دستورِ مدینہ میں "اللہ کا رسول" کہیں نہیں کہا گیا ہے۔ جبکہ واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۲۸، کا بیان ہے کہ محمد رسول اللہ کا فقرہ صرف دیباچہ دستور میں آیا ہے، متن میں کسی جگہ نہیں ہے۔ لیکن دونوں کا خیال خام ہے۔ ابن ہشام کے ذکر کردہ متن میں یہ فقرہ علیحدہ تین جگہوں پر بیان ہوا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ خود واٹ کے انگریزی ترجمہ میں یہی فقرہ ان تینوں مقامات پر بھی موجود ہے۔ ملاحظہ کیجئے: محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۲۱، ۲۲۴، ۲۲۵ پر دفعات دستور ۴۲ اور ۴۷ کے علاوہ دیباچۂ دستور۔

(۷۱) زرِ فدیہ کی رقم اصولی طور سے فریقین کی مفاہمت یا فریق غالب کے فیصلہ پر متعین ہوتی تھی۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زرِ فدیہ کی گراں ترین اور غالباً مقبول و مسلّم ترین شرح چار ہزار درہم تھی جو اکثر اسیرانِ بدر سے مسلمانوں نے مانگی تھی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: خاکسار کا مضمون "عہد نبوی کی مسلم معیشت میں اموالِ غنیمت کا تناسب" تحقیقات اسلامی علی گڈھ، اکتوبر ۱۹۸۳ء، ص ۱۵۔

(۷۲) دیت کی عام شرح عہدِ نبوی میں یا قریش کے یہاں سو اونٹ تھے۔ یہی مسلم اصول تھا۔ ملاحظہ ہو: حجۃ الوداع میں خطبۂ نبوی، محمد حمید اللہ، محمد رسول اللہ، ص ۱۰۹۔

(۷۳) چونکہ عربوں کے قبائلی نظام میں یا اس وقت تک کے اسلامی معاشرے میں قوانین کو نافذ کرنے والی کوئی طاقت یا ادارہ جیسے پولیس وغیرہ نہیں تھا جو مجرم کو پکڑ کر کیفر کردار تک پہنچا سکتا اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سماجی تحفظ کا نظام اجتماعی ذمہ داری پر مبنی تھا۔ کیونکہ صرف ایک بڑا انسانی گروہ خاندان یا قبیلہ ہی قوانین کو نافذ کر سکتا تھا یا مجرم کو جرم کے ارتکاب سے روک سکتا تھا اور ارتکابِ جرم کی صورت میں اس کو سزا دے سکتا تھا یا جرمانہ وصول کر سکتا تھا افراد اپنی انفرادی حیثیت میں اس کی ضمانت نہیں دے سکتے تھے۔

(۷۴) چونکہ قریشی یا غیر قریشی مہاجرین اپنے خاندانوں اور گھرانوں سے کٹ گئے تھے اور وہ عملاً مختلف قبیلوں، خاندانوں کے افراد تھے اس لیے ان کو ایک نیا سماجی شعور یا جماعتی تصور دینے کے لیے اور اس سے زیادہ عملی اعتبار سے آسانی فراہم کرنے کے لیے ان کو ایک سماجی وحدت قرار دیا گیا تھا اور سماجی تحفظ کے نظام میں ان کی ایک قبیلہ کے مانند اجتماعی ذمہ داری سمجھی گئی تھی۔

(۷۵) دیت اور زرِ فدیہ کی ادائیگی کو اجتماعی ذمہ داری کے اصول کی بنا پر پورے قبیلہ یا خاندان کی ذمہ داری قرار دیا گیا تھا

کیونکہ فرد/ افراد سے ان کی وصولیابی کی ضمانت نہ تھی۔ عملی اعتبار سے یہ قومی/ قبائلی/ گروہی اخراجات تھے۔

(۷۶) اس سماجی برتری کا اعتراف مستشرقین کو بھی ہے، ملاحظہ ہو ولہاوزن، ص ۱۲؛ واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۲۸-۲۲۷۔

(۷۷) مدینہ کے یہودی قبائل کے اسلام سے انکار اور عداوت کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ابن اسحاق، سیرہ، ص ۴۴-۲۳۹؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۴۰۴-۳۹۷؛ مونٹگری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۲۰-۱۹۱۔

(۷۸) مثلاً فتح مکہ سے قبل ایک عظیم مخلص و مومن صحابیِ رسول حضرت حاطب بن ابی بلتعہ نے محض قریش کی محبت و حمایت میں ان کو مسلم منصوبوں سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، سیرہ، ص ۵۴۵۔

(۷۹) یہودِ مدینہ اور قریش کے تعلقات کے لیے ملاحظہ ہو: ابنِ اسحاق، سیرہ، ص ۳۶۱ جب غزوہ سویق کے دوران مکی قریشی افواج کے سالار ابوسفیان بن حرب کی ضیافت بنو نضیر کے سردار قبیلہ سلام بن مشکم نے کی تھی۔ یہی نہیں بلکہ مکیوں کو اس نے مدینہ کے بارے میں فوجی اہمیت کی تمام معلومات اور فوجی راز بہم پہنچائے تھے۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے، شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۴۲۵-۳۹۵۔

(۸۰) بدر سے ذرا پہلے جب حضرت سعد بن معاذ اوسی عمرہ کے لیے مکہ گئے تھے تو روایات کے مطابق اپنے پرانے دوست امیہ ابن خلف جمحی کے گھر مقیم ہوئے تھے۔ ملاحظہ ہو، بخاری، جامع صحیح، کتاب المغازی، غزوہ بدر۔

(۸۱) ولہاوزن نے اس بحث کا آغاز کیا اور بنیاد فراہم کی جس پر بعد کے تمام مغربی مورخین نے اپنی تحقیق کی پوری عمارت تعمیر کی ہے۔ ان میں مونٹگری واٹ سب سے اہم ہیں جنہوں نے کافی طویل بحث اس موضوع پر کی ہے۔ ملاحظہ ہو: ولہاوزن، مذکورہ بالا، ص ۱۹-۱۴؛ مونٹگری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۳۸-۲۱۸۔

(۸۲) مونٹگری واٹ، مذکورہ بالا، ص ۲۹-۲۲۸۔ (۸۳) ایضاً، ص ۳۰-۲۲۹۔

(۸۴) ملاحظہ ہو، سیرت النبی، اول، ص ۳۹۴۔

(۸۵) واقعۂ افک میں ملوث ہونے پر عبداللہ بن ابی کے مومن صادق فرزند حضرت عبداللہ نے اپنے باپ کو خود قتل کرنے کی اجازت نبوی مانگی تھی جو رحمۃ للعالمین نے نہیں دی۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ واقعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقتدارِ اعلیٰ کا سب سے بڑا ثبوت ہے مورخ موصوف کو نظر نہیں آیا۔ ملاحظہ کیجئے واقعہ کے لیے: اسد الغابہ، سوم، ص ۱۹۷۔

(۸۶) ابن اسحاق، سیرہ، ص ۱۰-۶۰۹۔

(۸۷) ایضاً، ص ۳۲-۲۳۱۔ مورخ موصوف نے اس ضمن میں مال غنیمت خصوصاً بدر کے موقعہ پر غنیمت کے تقسیم کے معاملہ کو بھی اٹھایا ہے۔ دراصل ان کی پوری بحث بڑی بے جان، غیر علمی اور غیر تاریخی ہے۔ وہ ایک کمزور مقدمہ کی ناکام دفاعی کوشش کے سوا اور کچھ نہیں۔

(۸۸) ابن اسحاق، سیرہ، ص ۲۸۳؛ ابنِ ہشام، اول، ص ۵۹؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۶؛ طبری، دوم، ص ۳۲-۴۳۴۔

زیادہ تر جدید مورخین نے واقدی کی ترتیب و تواریخ سرایا و غزوات کو قبول کیا ہے۔ چنانچہ وہی اس کتاب میں بھی تسلیم کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو، واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲ اور ۸۶ - ۸۵ اور ضمیمہ ب؛ محمود شیت خطاب، الرسول القائد، بغداد ۱۹۵۵ء، ص ۵۲ - ۵۱؛ جے، ایم، بی، جونس "THE CHRONOLOGY OF THE MAGHAZI - A TEXTUAL SURVEY" بلیٹن آف دی اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز (BSOAS)، جلد ۱۹، ۱۹۵۷ء؛ نیز "ابن اسحاق اینڈ واقدی"، BSOAS، جلد ۲۲، ۱۹۵۹ء؛ ڈبلو، ایم، واٹ، "دی مٹیریل یوزڈ بائی ابن اسحاق" HISTORIANS OF MIDDLE EAST، مرتبہ برنارڈ لیوس اینڈ پی، ایم، ہولٹ، لندن ۱۹۶۲ء، ص ۲۴ - ۲۳؛ مارسدن جونس کا مقدمہ بر واقدی، کتاب المغازی، ص ۳۵ - ۲۵۔

اس موضوع پر مکمل اور جامع بحث کے لیے دیکھیے میرا مضمون "عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں — محرکات، مسائل اور مقاصد" برہان دہلی، دسمبر ۱۹۸۲ء تا ستمبر ۱۹۸۳ء۔

(۸۹) محمد بن حبیب بغدادی، کتاب المحبر، ص ۱۱۱ - ۱۱۰۔

(۹۰) ملاحظہ ہو میرا مضمون "کیا مہاجرین مکہ خالی ہاتھ مدینہ آئے تھے؟" تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اپریل ۱۹۸۳ء۔

(۹۱) مضمون "عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں — محرکات، مسائل اور مقاصد"

(۹۲) مثلاً مارگولیتھ، سر ولیم میور، مونٹگمری واٹ وغیرہ۔ مضمون مذکورہ بالا، حوالوں کے لیے۔

(۹۳) مثلاً شبلی نعمانی، محمد حمید اللہ وغیرہ۔ حوالوں کے لیے مضمون مذکورہ بالا۔

(۹۴) کتاب المغازی، ص ۶؛ مضمون عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں۔

(۹۵) "عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں — محرکات، مسائل اور مقاصد" (۹۶) ایضاً

(۹۷) ایضاً۔ واٹ نے اس خیال کو زیادہ قوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

(۹۸) ایضاً (۹۹) ایضاً (۱۰۰) ایضاً

(۱۰۱ - ۱۱۶) حوالوں اور مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو مضمون مذکورہ بالا۔

(۱۱۷) ایضاً۔ پہلی مہم میں مسلمانوں کی تعداد محض تیس ۳۰ تھی جبکہ دشمن کی تعداد تین سو تھی۔ دوسری مہم میں مسلمان ۶۰ - ۸۰ کے درمیان تھے اور قریشی کاروان دو سو افراد پر مشتمل تھا۔ خرار میں مسلم آٹھ، دشمن نامعلوم تعداد میں۔ سریہ نخلہ آٹھ یا بارہ افراد پر مشتمل تھا۔ غزوات نبوی میں پہلے دوسرے اور تیسرے موقعہ پہ مسلمانوں کی عددی طاقت بالترتیب ۶۰، ۲۰۰ اور ۱۵۰ یا ۲۰۰ تھی، باقی کے بارے میں تعداد نہیں معلوم۔ قریشی کاروانوں کی عددی طاقت بھی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مسلم مہموں کا ہدف تھے نہیں مذکور ہے۔

(۱۱۸) ان تعلقات کے لیے دیکھیے: جواد علی، تاریخ العرب قبل الاسلام، بیروت ۱۹۶۸ء، سہ جلد، کتاب المنمق، ص ۹-۸۸۔

(۱۱۹) مکی عہد میں حضرت ابوذر غفاری کے مسلمان ہونے پر قریش مکہ نے ان کو زد و کوب کرنا شروع کیا مگر جونہی حضرت عباس بن عبدالمطلب نے ان کو احساس دلایا کہ ان کا تجارتی راستہ غفار کے قبیلہ کے علاقے سے ہو کر گزرتا ہے انھوں نے ہاتھ کھینچ لیے تھے۔ ایضاً؛ نیز ابنِ سعد، چہارم، ص ۲۲۵۔

(۱۲۰) اس موقع پر قریشی مخالفین کی تعداد ستر یا اسّی سے کم تھی۔ واٹ، مونٹگمری، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۰، کا خیال ہے کہ وہ غالباً کچھ کم ہی تھی۔ تفصیلی بحث کے لیے مضمون مذکورۂ بالا۔

(۱۲۱) بدر سے کچھ قبل جب حضرت سعد بن معاذ اوسی عمرہ کی ادائیگی کے لیے مکہ گئے اور اپنے دوست امیہ بن خلف جمحی کے ساتھ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے تو ابوجہل مخزومی نے ان کو عمرہ و حج سے محروم کر دینے کی دھمکی دی تھی اگر انھوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت سے ہاتھ نہ کھینچا۔ جواب میں حضرت سعد نے ابوجہل کو مکی تجارت کے شامی راستے کو بند کر دینے کی دھمکی دی تھی اور دشمنِ اسلام خاموش ہو گیا تھا۔ یہ واقعہ بلاریب و اشتباہ ثابت کرتا ہے کہ بدر تک نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی اقتصادی ناکہ بندی کی تھی اور نہ مکی قریشیوں کو اپنی تجارت کے لیے کوئی خطرہ محسوس ہوا تھا اور نہ ہی ابتدائی مہمیں قریشی کاروانوں سے چھیڑ چھاڑ، لوٹ مار یا اقتصادی ناکہ بندی کے لیے بھیجی گئی تھیں۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو مضمون مذکورہ بالا۔

(۱۲۲) مضمون مذکورہ بالا۔ (۱۲۳) ایضاً (۱۲۴) ایضاً

(۱۲۵) ان معاہدوں کے متون کے لیے دیکھیے: محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق السیاسیہ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدہ، قاہرہ ۱۹۴۱ء، ص ۱۷-۱۵۱؛ اردو خلاصہ محمد حمید اللہ، محمد رسول اللہ، مذکورہ بالا، ص ۸۰-۵۷۶؛ نیز اردو ترجمہ نثار احمد فاروقی، الرسالات النبویۃ، نقوش لاہور رسولؐ نمبر ۱۹۸۲ء، جلد دوم، ص ۴۱-۲۳۹، ص ۴۴-۲۲ وغیرہ۔

(۱۲۶) ملاحظہ کیجیے نقشہ جزیرہ نمائے عرب۔

(۱۲۷) غزوۂ بدر کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: ابنِ اسحاق، سیرہ ص ۲۳۹-۲۸۹ اور آگے؛ واقدی، ص ۱۷۱-۱۹؛ ابنِ سعد، دوم ص ۲۷-۱۱؛ انساب الاشراف، اول ص ۳۰۸-۲۸۸۔

(۱۲۸) ابن اسحاق، سیرہ، ص ۱۱-۳۰۹؛ واقدی، ص ۳-۲۰۱؛ ابنِ سعد، دوم ص ۳۸-۳۷؛ نیز ملاحظہ کیجیے محمد حمید اللہ، عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ (انگریزی)، حیدر آباد دکن ۱۹۷۳ء، ص ۲۱؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۶-۱۳۔ واقدی اور ابنِ سعد کے متعدد حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قریشِ مکہ کو اپنے جانی نقصان سے اپنے سیاسی وقار اور فوجی برتری کھو دینے کا زیادہ غم تھا۔ ملاحظہ ہو ابنِ اسحاق، ص ۶۰-۳۴۰، جن کا بیان ہے کہ قریشی وان کے ہمدرد شعراءِ عرب کو بدر کی شکست کا یہ زیادہ اندوہ تھا کہ "قریش کو اب وہ سماجی عزت و مرتبہ اور رعب داب نہیں حاصل رہے گا جو ان کو پہلے کبھی تھا، کیونکہ ان کے عظیم ترین قائدین کی اکثریت بدر میں کھیت رہی تھی۔"

(۱۲۹) حوالہ سابق ۔

(۱۳۰) ملاحظہ ہو: کتاب المنمق ص ۹-۴۰۸؛ نیز ابن اسحاق ص ۳۹۰؛ واقدی ص ۲۹-۳۳۸ ۔

(۱۳۱) بدر کے معاً بعد خزاعہ کے لوگوں نے مدینہ کا قریش مکہ کے مقابلہ میں ساتھ دینا شروع کیا تھا ۔ ملاحظہ ہو معبد خزاعی اور دوسرے خزاعی حلیفوں کا رویہ غزوات سویق، اُحد، بدر الموعد، خندق وغیرہ کے مواقع پر ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش مکہ کے منصوبوں کی اطلاع زیادہ تر انھیں خزاعیوں کے ذریعہ پہنچتی تھی؛ ابن اسحاق ص ۳۹۰؛ واقدی ص ۲۹-۳۳۸ وغیرہ؛ طبری، دوم، ص ۵۵۳ وغیرہ؛ نیز شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول ص ۳۸۶ وغیرہ ۔

(۱۳۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو باب دوم، بحث بر اسلام خزاعہ، اسلم و غفار ۔

(۱۳۳) محمد حمید اللہ، عہد نبوی کے میدانِ جنگ (انگریزی) ص ۲۱ ۔

(۱۳۴) ماٰخذ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بدر کے اور زیادہ قریش کے بارے میں محتاط ہو گئے تھے اور ان کی کارروائیوں اور منصوبوں پر بڑی کڑی نظر رکھتے تھے ۔ مکہ میں آپ کے خفیہ جاسوسوں اور ہمدردوں کا ایک خاصا بڑا طبقہ تھا جو آپ کو ان کے ارادوں کے بارے میں برابر خبریں بھیجتا رہتا تھا ۔ ہمارے مسلم قدیم اور جدید مورخین عام طور سے حضرت عباس بن عبد المطلب ہاشمی کو سب سے زیادہ شرف دیتے ہیں ۔ جبکہ مستشرقین عموماً خزاعی ہمدردوں اور حلیفوں اور بنو غفار و اسلم وغیرہ کے دوسرے قبائل کے دوستوں کو نمایاں مقام دیتے ہیں ۔ اگرچہ حضرت عباس کی ہمدردیٔ رسولِ کریم سے انکار نہیں کیا جا سکتا تاہم کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے قدیم ماٰخذ اور جدید مسلم مورخین دونوں ضرورت سے زیادہ ان کے کردار پر زور دیتے ہیں ۔ اور یہ غالباً عہدِ عباسی کی اس تاریخ نویسی کا اثر تھا جس میں عباسی بزرگوں کو اسلام کے صدرِ اول میں نمایاں مقام دینا لازمی سمجھا گیا تھا ۔ بہر حال ماٰخذ سے تنقیدی مطالعہ کے بعد سہی یہ واضح ہوتا ہے کہ بنو خزاعہ کے حلیفوں نے اس سلسلہ میں اسلامی ریاست کی زیادہ خدمت کی تھی ۔ اس خیال کو مزید تقویت اس حقیقت سے ملتی ہے کہ خزاعہ کے کردار کو واقدی نے جو عام طور سے شیعی رجحانات کا حامل سمجھا جاتا ہے نمایاں کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو کتاب المغازی ص ۹-۳۳۸ وغیرہ ۔

مسلم نقطۂ نظر کے لیے شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول ص ۳۰۱ وغیرہ؛ محمد حمید اللہ، عہد نبوی کے میدانِ جنگ، ص ۲۲ ۔ مستشرقین کے نقطۂ نظر کے لیے مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۰۷ وغیرہ ۔

(۱۳۵) ماٰخذ کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ غزوۂ اُحد میں جنگ کے تین مرحلے تھے ۔ پہلا جب مسلمانوں کو برتری حاصل تھی اور مکی پسپا ہو رہے تھے ۔ دوسرا جب تیر اندازوں کی غلطی سے پسپا ہونے والے مکیوں نے حضرت خالد بن ولید مخزومی اور حضرت عمرو بن عاص سہمی کی قیادت میں مسلم لشکر پر عقب اور بازوؤں سے حملہ کر کے مسلمانوں کی صفوں میں ابتری پیدا کر دی جس کے نتیجے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم زخمی اور بہت سے مسلمان شہید ہو گئے اور اس سے بڑھ کر آپ کی شہادت کی افواہ پھیل گئی اور تیسرا اس وقت جب آپ نے زخمی ہونے کے باوجود دل شکستہ مسلمانوں کو نہ صرف جوش و

ولولے سے بھر دیا بلکہ منتشر ہونے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانے والے مسلمانوں کو بھی از سرِ نو اقدام پر آمادہ کر دیا جس کے نتیجے میں مکی لشکر پسپا ہو گیا۔ ملاحظہ ہو ابنِ اسحاق، ص ۳۷۰-۹۰؛ واقدی ص ۲۲۹-۵۴؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۴۱-۴؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۱۸-۲۰؛ طبری، دوم، ص ۵۱۶-۱۷؛ نیز ملاحظہ ہو منٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۲-۲۷؛ محمد حمید اللہ، عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ، ص ۲۶-۲۸؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۲۷۵-۸۱۔

واٹ کا خیال دلچسپ ہے کہ مسلمانوں نے خود غزوۂ احد کو زیادہ تاریک رنگوں میں اور غمناک بنا کر پیش کیا ہے جبکہ مآخذ سے بالکل برعکس تاثر اُبھرتا ہے۔ مستشرق موصوف نے مآخذ پر اس ضمن میں مبالغہ آرائی کے الزام کی تردید بھی کی ہے۔ اگرچہ واٹ نے اس کا جو سبب بتایا ہے وہ انتہائی غیر علمی اور غیر تاریخی ہے۔

(۱۳۶) واقدی، ص ۲۹۹

(۱۳۷) ابنِ اسحاق، ص ۴۸۹-۹۰ کا بیان ہے کہ "حمراء الاسد کے غزوہ میں صرف ان مسلمانوں کو شرکت کی اجازت دی گئی تھی جنھوں نے اُحد کے میدان میں زخم کھائے تھے اور دادِ شجاعت دی تھی۔ آپ نے پسپا ہوتے ہوئے دشمن کا تعاقب اس لیے کیا تھا کہ دشمن کو معلوم ہو جائے کہ آپ ابھی تک طاقتور ہیں اور آپ کے نقصانات نے آپ کو کسی طرح کمزور نہیں کیا تھا اور یہ کہ آپ نے یہ تعاقب علانیہ اور اظہار کر کے کیا تھا تاکہ دشمن کو اس تعاقب کا علم بھی ہو جائے اور وہ مرعوب ہو جائے۔" ظاہر ہے کہ حمراء الاسد تک دشمن کا پیچھا کرنے سے عرب قبائل پر خاص کر ارد گرد کے قبائل پر یہ تاثر قائم ہوا ہوگا کہ مسلم ریاست اب بھی اتنی ہی طاقتور ہے یا کم از کم اس نے صرف ایک معرکہ ہارا ہے جنگ نہیں۔ عرب قبائل کے تاثرات و ردِ عمل کے لیے ملاحظہ ہو: ابنِ اسحاق، ص ۳۹۰-۹۱؛ واقدی، ص ۳۳۶-۴۰؛ طبری، دوم، ص ۵۵۰-۵۴؛ الرسول القائد، ص ۱۱۷ وغیرہ۔

شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۴۰۰ کا خیال ہے کہ "..... بدر کی فتح نے ایک عام رعب بٹھا دیا تھا جس کی وجہ سے تمام قبیلے اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھ گئے تھے لیکن احد کی شکست نے حالت بدل دی اور دوبارہ تمام قبائل دفعۃً اُٹھ کھڑے ہوئے سیرت نبوی میں سرایا..... کا جو اچانک سلسلہ پھیلا ہوا نظر آتا ہے اس زنجیر کی کڑیاں ہیں ....." چنانچہ سریہ قطن، سریہ انیس واقعہ بئر معونہ اور واقعۂ رجیع کو انھوں نے اسی سلسلے میں شمار کیا ہے۔ جبکہ محمد حمید اللہ، عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ، ص ۲۹ نے اُحد میں قریش کی ناکامی اور مدینہ پر قبضہ کرنے میں کوتاہی کو نہ صرف مسلمانوں کی فوجی و سیاسی طاقت کی بحالی قرار دیا ہے بلکہ اگلے مہینوں میں طاقت کے استحکام اور مختلف سمتوں میں توسیعِ حلقۂ اثر و نفوذِ اسلام قرار دیا ہے۔ موخر الذکر کا تجزیہ مآخذ کے بیان کردہ واقعات و حقائق سے زیادہ قریب ہے۔

(۱۳۸) ابنِ اسحاق، ص ۳۹۰؛ واقدی، ص ۳۳۸-۹۔

(۱۳۹) ملاحظہ ہو ابن اسحاق ص ۳۶۱، ۳۶۴، ۴۴۰۔

(۱۴۰) قریشی اتحاد کی فوجی طاقت کے لیے ملاحظہ ہو: ابن اسحاق ص ۴۵۰؛ واقدی ص ۲۰۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۴۷؛ طبری، دوم ص ۵۰۵؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۴۱۹-۴۲۰؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۳۶؛ محمد حمید اللہ، عہد نبوی کے میدانِ جنگ، ص ۲۹-۳۱۔ موخر الذکر کا خیال ہے کہ غزوۂ احزاب دراصل خیبر کے یہودی سازشیوں کا آخری اور جامع منصوبہ تھا۔ یہی بات شبلی نے بھی کہی ہے اور ماخذ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ مونٹگمری واٹ کو بھی احزاب کو مدینہ کے خلاف آمادہ کرنے میں یہودِ خیبر کا کلیدی کردار نظر آتا ہے۔

(۱۴۱) قرآن کریم، سورۂ احزاب، آیت ۲۔

(۱۴۲) ابنِ اسحاق، ص ۴۵۰-۴۶۰؛ ابن سعد، دوم، ص ۴۷، ۶۵؛ نیز ملاحظہ ہو: مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۳۵-۳۹؛ مارگولیتھ، مذکورہ بالا، ص ۳۲۹؛ خطاب، الرسول القائد، ص ۱۵۷-۱۶۲۔

(۱۴۳) بخاری، الجامع الصحیح، باب غزوۃ الخندق، روایت حضرت سلیمان بن صرد۔ مکمل روایت یوں ہے: "عن سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ قال: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الاحزاب نغزوھم ولا یغزوننا۔"

(۱۴۴) بدر کے اسیروں میں حضرت خالد بن ولید مخزومی کے بھائی حضرت ولید بن ولید اسی زمانہ اسیری میں اسلام سے متاثر ہوئے اور کچھ بعد میں مسلمان ہوئے تھے۔ ملاحظہ ہو واقدی، ص ۱۴۰-۱۴۱۔ دوسروں کے لیے ملاحظہ کیجئے، واقدی، ص ۱۳۸ تا ۱۴۴۔

(۱۴۵) ان یہودی حلیفوں میں یہ لوگ شامل تھے:

(۱) اسماء بنت مروان، اوس/ بنو خطمہ کی حلیف، جس کا قتل رمضان ۲ھ/ ۶۲۴ء میں ہوا۔

(۲) ابو عفک، خزرج/ بنو نجار کا حلیف جس کا قتل ایک ماہ بعد ہوا۔

(۳) کعب بن اشرف اوس کا حلیف جو ربیع الاول ۳ھ/ اگست، ستمبر ۶۲۴ء میں مقتول ہوا۔

یہ تینوں یہودی حلیف اسلامی ریاست کے خلاف نفرت پھیلانے، قبائلِ عرب کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے اور مہاجرین و انصار میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرنے کے مجرم تھے۔ جیسا کہ ماخذ سے اور خاص کر ان کی شاعری سے معلوم ہوتا ہے جو ابن اسحاق کی سیرہ میں محفوظ ہے۔ سیرت نگار کا بیان ہے کہ اسماء بنت مروان کا تعلق بنو امیہ بن زید سے تھا اور وہ خود بنو خطمہ کے ایک شخص یزید بن زید سے بیاہی تھی۔ اس نے اپنے اشعار میں بنو مالک، بنو نابت اور بنو عوف و خزرج کی ہجو کرتے ہوئے کہا تھا کہ تم ایک ایسے اجنبی کی اتباع کرتے ہو جو تم میں سے نہیں ہے۔ نہ وہ مراد کا نہ مذحج کا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم کو وہ تمہارے سرداروں کو قتل کرنے کے بعد چھوڑ دے گا۔ کاش کوئی ایسا عزت والا تم میں ہوتا جو اس کا کام تمام کرتا اور اس کے ساتھیوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا۔" رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ سب سنا تو فرمایا کہ کون اس سے میرا پیچھا چھڑائے گا۔ بنو خطمہ ہی کے ایک شخص حضرت عمیر بن عدی نے اسی رات اس کا کام تمام کر دیا۔ اور پھر بڑی جرأت کے

ساتھ صبح اسس کے پانچ جوان بیٹوں کے سامنے اس کے قتل کا اعتراف کر لیا۔ قبیلہ والوں میں سے کوئی کچھ نہ کر سکا کیونکہ بقول ابن اسحاق انھوں نے اسلام کی طاقت دیکھ لی تھی۔ بنو خطمہ کے چھپے ہوئے مسلمانوں نے نہ صرف اپنے اسلام کا اعلان و اظہار کر دیا بلکہ غیر مسلم بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ یہ دراصل حلف کے معاہدے کو توڑنے کی سزا تھی۔

ابو عفک کا معاملہ بھی اسی طرح کا تھا۔ اس کا تعلق بنو عمرو بن عوف سے تھا۔ اس نے بھی اپنی شاعری کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف انصار کے دو طبقوں میں منافرت پھیلانی چاہی تھی۔ چنانچہ بنی عوف ہی کے سالم بن عمیر نے اسس کا خاتمہ کر دیا۔

کعب بن اشرف کا معاملہ کافی مشہور ہے۔ وہ بنو نضیر کا ایک شخص اور اسلامی ریاست کا معاہد تھا مگر غزوہ بدر قریش کی شکست اور مسلمانوں کی فتح پر اس قدر برافروختہ ہوا کہ مکہ گیا اور وہاں اپنی شاعری سے جنگ کی آگ بھڑکا آیا۔

ملاحظہ ہو ابن اسحاق ص ۳۶۴ اور ص ۵-۶۷۴؛ ابن ہشام، اول، ص ۶۰۹ اور ص ۶-۶۳۵؛ واقدی، ص ۵-۱۷۲ اور ۹۳-۱۸۴؛ ابن سعد، دوم ص ۲۸-۲۷ اور ۵۷؛ انساب الاشراف، اول، ص ۴-۳۷۳؛ طبری، دوم، ص ۹۱-۴۸۹؛ بخاری اور مسلم، کتاب المغازی، قتل کعب بن الاشرف۔ آخری تین ماخذ اسماء اور ابو عفک کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں کہتے ہیں۔ نیز ملاحظہ کیجئے: مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۸، جن کا خیال ہے کہ یہ تینوں قتل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی پالیسی کے نظریاتی پہلو کی اہمیت کے احساس و ادراک کے سبب ہوئے تھے۔ دیکھئے روڈنسن، محمد، ص ۱۵۷، ۷۳-۱۷۰۔

(۱۴۶) مثلاً مارگولیتھ، ص ۲۷۷۔

(۱۴۷) ابن اسحاق، ص ۳۱۲ کا بیان ہے کہ جب سہیل کو جنگ بدر میں گرفتار کر لیا گیا تو حضرت عمر بن خطاب نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ سہیل کے اگلے دو دانت اکھڑوا لیے جائیں تاکہ اس کی زبان باہر نکل آئے اور وہ اسس فصاحت و بلاغت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈا نہ کر سکے جیسے کہ وہ کر سکتا تھا۔" مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میں اسس کو مثلہ نہیں کروں گا، شاید کسی دن وہ اسلام کے لیے ایسا کام کرے جس پر تم اسے الزام نہ دے سکو۔" مزید ملاحظہ کیجئے: زبیری (عبداللہ بن مصعب) کتاب نسب قریش، مرتبہ لیفی پروفنسال، قاہرہ سنہ ۱۹۵۳، ص ۴۱۸؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۰۲؛ طبری، دوم، ص ۴۶۵۔

(۱۴۸) گو وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے مگر بیس سال تک اسلام دشمنی میں آپ کی ہجو کرتے رہے۔ ملاحظہ ہو ابن اسحاق، چہارم، ص ۵۱-۴۹۔

(۱۴۹) فتح مکہ تک اسلام اور رسول کے سخت دشمن رہے اور کیا کچھ نہ کیا۔ مگر رحمت عالم نے معاف کر دیا۔ ابن اسحاق، ص ۵۵۱؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۵-۴۔

(۱۵۰) فتح مکہ تک قریشی افواج کے قائد کی حیثیت سے مدینہ کی اسلامی ریاست کو مٹانے کے درپے رہے۔ لیکن نہ صرف

ان کو معاف کر دیا بلکہ ان کے گھر کو دارالامان قرار دے دیا۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۸ - ۵۴۷۔

ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے آپ کے عمِ مکرم کا جگر چاک کر کے چبا ڈالا تھا۔ صفوان بن امیہ جمحی نے ساری زندگی اسلام کی مخالفت میں صرف کی تھی اور بدر کے بعد آپ کو قتل کرانے کی کوشش کی تھی۔ عبداللہ بن زبعریٰ نے اپنی آتش نوائی سے اسلام کے خلاف کتنی سازش کی اور آپ کی ہجویں کی تھیں۔ اور نہ جانے کتنے ایسے ہی دشمنانِ اسلام تھے۔ لیکن آپ نے سب کو معاف کر دیا۔ اسی طرح خیبر کی فتح کے بعد آپ کو زہر دینے والی یہودی عورت تھی آپ نے اس کے خون سے بھی درگزر کیا۔ ان متعدد روایات اور مثالوں سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ آپ نے کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا۔ اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت عائشہ سے مروی ہے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: ابنِ اسحاق، ص ۵۶ - ۵۴۹؛ اسد الغابہ، پنجم، ص ۲۱۶ اور شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۲۷ - ۵۲۱۔

(۱۵۱) ابنِ اسحاق، ص ۳۶۳، کا بیان ہے کہ "بنو قینقاع پہلے یہودی تھے جنھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ شکنی کی تھی اور جنگ لڑی تھی۔" مزید دیکھیے: ابوداؤد، سنن، باب کیف کان اخراج الیہود؛ واقدی، ص ۸ - ۱۷۶؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۳۰ - ۲۸؛ طبری، دوم، ص ۸۳ - ۹ ،۴؛ بلاذری، فتوح البلدان، ص ۳۰؛ انساب الاشراف، اول، ص ۹ - ۳۰۸؛ نیز ملاحظہ ہو، شبلی، سیرت النبی، اول، ص ۵ - ۴۰۳؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۰ - ۲۰۹؛ محمد حمید اللہ، عہد نبوی کے میدانِ جنگ، ص ۴۷۔

(۱۵۲) ابنِ اسحاق، ص ۳۹ - ۴۳۷؛ واقدی، ص ۶۶ - ۳۶۳؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۵۹ - ۵۷؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۳۹؛ فتوح البلدان، ص ۳۲ - ۳۱؛ طبری، دوم، ص ۵۵ - ۵۵۰۔ ان تمام مورخین کا بیان ہے کہ انھوں نے معاہدہ شکنی کی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی سازش کی۔ زرقانی نے شرح المواہب اللدنیہ، دوم، ص ۹۳ میں مغازی موسیٰ بن عقبہ کی روایت واستناد پر ثابت کیا ہے کہ بنو نضیر نے قریش سے ایک دفاعی اور جارحانہ معاہدہ اسلامی ریاست کے خلاف کیا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انھوں نے نہ صرف ایسے معاہدے کر رکھے تھے بلکہ دشمن کو مدینہ کے فوجی رازوں سے بھی باخبر کیا تھا۔ ابوداؤد، سنن، مذکورہ بالا باب، میں مزید بیان کرتے ہیں کہ بنو قینقاع کے معاملے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے باقی یہودی قبائل سے اپنے اپنے معاہدوں کی ازسرِ نو تجدید کے لیے کہا تھا۔ چنانچہ بنو قریظہ اور دوسروں نے اسے قبول کر لیا تھا مگر بنو نضیر نے تجدیدِ عہد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ نیز ملاحظہ ہو بخاری، کتاب المغازی، غزوہ بنی نضیر؛ اور مسلم، اجلاء الیہود من الحجاز؛ مزید دیکھیے: شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۱۲ - ۴۰۹؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۲ - ۲۱۱؛ محمد حمید اللہ، عہد نبوی کے میدانِ جنگ، ص ۴۰؛ برکات احمد، محمد اور یہود، ص ۶۶ - ۶۲۔

(۱۵۳) ابن اسحاق، ص ۷۰ - ۴۶۹، واضح طور سے غزوۂ احزاب کے دوران قریشی اتحاد کے ساتھ ایک جنگی معاہدہ کرنے اور مسلمانوں کی ریاست کو مدینہ سے بیخ و بن سے اکھاڑنے کا ذکر کرتے ہیں، اگرچہ وہ معاہدہ کبھی روبہ عمل نہ آسکا

تاہم بنو قریظہ غداری کے مرتکب ہو چکے تھے۔ نیز ملاحظہ ہو، فتوح البلدان، ص ۲۵، احزاب میں اس یہودی قبیلہ کے جنگی جرائم کے لیے، بخاری اور مسلم، مذکورہ بالا؛ ابو داؤد، مذکورہ بالا؛ واقدی، ص ۵۳۰-۴۹۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۸۰-۷۴؛ انساب الاشراف، اول، ص ۸۰-۳۴۷؛ طبری، دوم ص ۹۳-۵۸۱؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۳۹-۴۳۳؛ مونٹگمری واٹ، مذکورہ بالا، ص ۱۶-۲۱۳؛ محمد حمید اللہ، عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ، ص ۵۰-۴۹۔

(۱۵۴) کتاب المحبر، ص ۸-۱۰۷۔

(۱۵۵) وفاء الوفاء، ص ۱۶-۱۱۴؛ نیز شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۲۵۹۔

(۱۵۶) محمد حمید اللہ، محمد رسول اللہ، مذکورہ بالا، ص ۶۰۲ کا بیان ہے کہ "چنانچہ نبی نے پورے بنی قینقاع کو تو نہیں بلکہ قصوروار خاندانوں کو مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا اور وہ مدینہ سے نکل شام چلے گئے۔" موصوف نے اپنے نظریہ کو دلائل سے نہیں ثابت کیا ہے۔

(۱۵۷) برکات احمد، محمد اور یہود، ص ۶۲-۵۸ نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ بنو قینقاع کے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دینے پر ان کو مدینہ میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

(۱۵۸) برکات احمد کے دلائل یہ ہیں:

(۱) بنو قینقاع کے غیر مشروط ہتھیار ڈال دینے کے بعد ان کی طاقت ٹوٹ گئی تھی اور ان کے حامی منافقین کو سبق سکھایا جا چکا تھا۔ ان کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول کی منافقت کا نہ صرف پردہ چاک کر دیا گیا تھا بلکہ اس کی بھی سیاسی و قبائلی قوت توڑ دی گئی تھی۔ اس لیے مزید کارروائی کی ضرورت نہیں رہی۔

(۲) پہلے سیرت نگار ابن اسحاق نے اپنی سیرہ میں ان کے مدینہ سے اخراج کا قطعی ذکر نہیں کیا ہے۔ واقدی اور ابن سعد نے ان کی جلاوطنی کا ذکر کیا ہے۔

(۳) بخاری اور مسلم نے بنو قینقاع کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تصادم کا الگ سے ذکر نہیں کیا ہے اگرچہ وہ بنو نضیر اور بنو قریظہ کے ساتھ جنگ کا ذکر کرتے ہیں۔ دونوں محدثین نے مدینے کے یہود کی جلاوطنی کے ضمن میں ہی بنو قینقاع کے اخراج کا بھی حوالہ دیا ہے۔ لیکن ان کی روایات میں کسی تاریخ کا ذکر نہیں اور بنو قینقاع کا ذکر بنو نضیر اور بنو قریظہ کے بعد آیا ہے، اس لیے اس اخراج کا تعلق حضرت عمر کی خلافت سے ہے۔ حیاتِ نبوی میں مدینہ سے یہودیوں کے عام اخراج کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔

(۴) عظیم فقہاء و علماء مثلاً قاضی ابو یوسف (۱۱۳ھ/۷۳۱ء - ۱۸۲ھ/۷۹۸ء) اور یحییٰ بن آدم (۱۴۰ھ/۷۵۷ء - ۲۰۳ھ/۸۱۸ء) نے جو اموالِ غنیمت اور اراضی مفتوحہ پر بحث کرتے ہیں بنو قینقاع کی جلاوطنی اور ان کی زمینوں کی تقسیم کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہتے بلکہ موخر الذکر نے تو بنو نضیر کو پہلا جلاوطن کیا جانے والا یہودی قبیلہ بتایا ہے۔

(۵) امام شافعی (۱۵۰ھ/۷۶۷ء - ۲۰۴ھ/۸۲۰ء) نے بیان کیا ہے کہ خیبر کی مہم کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قینقاع کے کرائے کے سپاہی بھرتی کیے تھے۔

(۶) ابن العماد (۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء - ۱۰۸۹ھ/۱۶۷۹ء) صاحب شذرات الذہب نے بھی بنو قینقاع کی جلاوطنی کا ذکر نہیں کیا ہے۔

(۷) قرآن کریم بنو نضیر کی جلاوطنی کو پہلی جلاوطنی بتاتا ہے۔ وُہ ان کی اور بنو قریظہ کی سزاؤں کا تو ذکر کرتا ہے لیکن بنو قینقاع کے بارے میں قطعی کچھ نہیں کہتا۔

(۸) ابنِ اسحاق نے تو بنو قینقاع کے بازار اور جائدادوں کی تقسیم کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن واقدی وغیرہ بھی جو ان کی جلاوطنی کے قائل ہیں مسلمانوں کے درمیان ان کی اراضی کی تقسیم کا ذکر نہیں کرتے۔

(۹) اس لیے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گو بنو قینقاع کے اسلحے اور ہتھیار چھین لیے گئے تھے مگر ان کو مدینہ میں ان کی جائدادوں سمیت بحال رکھا گیا تھا۔

برکات احمد کی نظر سے ایک اہم قدیم تاریخی دستاویز اوجھل رہ گئی ہے۔ ان کے دلائل کی مزید تائید بلاذری کی فتوح البلدان سے بھی ہوتی ہے جو بنیادی طور سے مسلمانوں کی فتوحات ممالک و اراضی سے بحث کرتی ہے۔ یہ اہم بات ہے کہ بلاذری ہجرت نبوی کے ذکر کے بعد ایک اہم نکتہ پیش کرتا ہے کہ بنو قینقاع کے یہودی پہلے لوگ تھے جنھوں نے معاہدہ شکنی اور مخالفت کی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینہ سے نکال دیا اور پہلی زمین بنو نضیر کی اراضی تھی جس کو آپ نے فتح کیا۔ وُہ بنو قینقاع کی زمینوں کی فتح اور ان کی مسلمانوں میں تقسیم کا ذکر نہیں کرتا۔ عہدِ نبوی میں اراضی فتوحات کا آغاز اوّل بنی نضیر سے کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۳۱-۳۰۔

(۱۵۹) برکات احمد، ص ۹۴-۱، کے اہم دلائل یہ ہیں:

(۱) ابنِ اسحاق کی روایات کی اسناد میں الجھن، تضاد اور اختلاف ہے۔ وہ بعد کے زمانے کے اثرات سے متاثر تھے اور یہودیوں کی روایات و قوانین سے نابلد تھے یا ان کا صحیح علم نہیں رکھتے تھے۔

(۲) ابنِ اسحاق، ابنِ ہشام، واقدی اور ابنِ سعد کے یہاں بنو قریظہ کے بیان میں زبردست اختلافات اور تضادات ہیں۔ مثلاً محاصرہ کے دنوں کی تعداد، بنو قریظہ کے ہتھیار ڈالنے کے سلسلے میں حکم نبوی یا حکم سعد بن معاذ، سعد بن معاذ کا ثالث مقرر ہونا، اوس کی ان سے سفارش اور ان کا جواب، بنو قریظہ کے قتل کا فیصلہ صادر کرنا، اور یہود بنی قریظہ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کو اعلان سے پہلے قبول کرنا، مردوں کا قتل اور عورتوں بچوں کو قیدی بنانا، فیصلہ سعد کے بعد اظہار مسرت نبوی، ۶۰۰-۹۰۰ افراد کے قتل کے لیے قبریں کھودنا۔ ان تمام نکات پر مصادر میں زبردست اندرونی تضادات ہیں۔

(۳) ابنِ اسحاق کا پُورا بیان دوسرے بیانات سے طریق نقل و بیان میں میل نہیں کھاتا۔

(۴) حضرت سعد بن معاذ اوسی کا ثالث مقرر کیا جانا عقل و درایت کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ اگرچہ ان کی بطور ثالث تقرری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عام پالیسی کے عین مطابق تھی تاہم راویوں نے یا تذکرہ نویسوں اور مورخوں نے اس میں کہانی اور افسانے کے عناصر شامل کر دئے ہیں۔

(۵) اصل فیصلہ یعنی بنو قریظہ کے قتل کے بارے میں روایات کی اسناد کمزور ہے۔ کن کو قتل کیا جائے؟

اس مسئلہ پر بھی روایات مختلف ہیں: کچھ تمام بالغ مردوں کو قتل کرنا بتاتی ہیں اور کچھ مقاتل (جنگ کرنے والوں) کو۔
تمام مردوں کا قتل قرآن مجید، حدیث اور اسلامی قانون کے خلاف ہے اس لیے وہ از خود مردود قرار پاتا ہے۔
اب معاملہ صرف ان لوگوں کا رہ جاتا ہے جو جنگ کرنے کے مجرم تھے۔

(۶) ان جنگجو یہودی مردوں کی تعداد جن کو قتل کیا گیا ابن اسحاق کے مطابق ۶۰۰ سے ۹۰۰ تک تھی۔ بنو قریظہ کی کل آبادی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ اگر ان مبینہ مقتولین کی تعداد پر ان کے خاندانوں کو قیاس کر لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بنو قریظہ کے کل ۶۰۰، ۳ سے ۴،۵۰۰ اشخاص نے ہتھیار ڈالے ہوں گے۔ اتنے لوگوں کو رسی سے باندھ کر ایک ایک انصاری عورت کے گھر میں قید کر کے رکھنا اس زمانے کے مدینہ شہر کے لیے ناممکن تھا۔

(۷) ابن اسحاق کی روایت کے پہلے حصہ میں یہود بنو قریظہ کو بزدل بتایا گیا ہے اور آخر میں وہ ہیرو نظر آتے ہیں۔

(۸) قتل یہود کے ذمہ دار صرف دو صحابی حضرات علی اور زبیر تھے۔

(۹) یہود بنی قریظہ کافی فاصلے پر رہتے تھے ان کو مدینہ کس طرح لایا گیا۔

(۱۰) نو سو لاشوں کو ایک ہی رات میں کس طرح خندقیں کھود کر دفن کر دیا گیا۔

(۱۱) مسلمانوں میں اس قتلِ عظیم پر کوئی ردِ عمل نہیں ہوا۔

ان تمام تضادات کی بنا پر بنو قریظہ کی قتل کی کہانی درایت کے معیار پر صحیح نہیں اُترتی۔ کیونکہ

(ل) ۶۰۰ یا ۹۰۰ آدمیوں کے قتل کے بعد ان کو کہاں دفن کیا گیا اور اس سے بیماری پھیل سکتی تھی مگر ان کا کہیں ذکر ماخذ میں نہیں ملتا۔

(ب) قتل کرنے والوں پر اس کے مضر اثرات کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ اس لیے نفسیاتی اعتبار سے یہ قتل غیر واقعی معلوم ہوتا ہے۔

(ج) ۶۰۰ یا ۹۰۰ مفروضہ مقتولین کی تعداد مبالغہ آمیز ہے۔ بخاری اور مسلم نے نہ تو ان کی تعداد بیان کی ہے اور نہ ہی قتل کے فیصلے کے نافذ کیے جانے کا ذکر کیا ہے۔

(د) قیدی عورتوں اور بچوں کو بازاروں میں غلام بنا کر بیچے جانے اور ان کے بدلے میں ہتھیاروں اور گھوڑوں کے خریدے جانے کی روایت عمل نبوی کے خلاف ہے۔ یہودی اپنے قیدیوں کو ہمیشہ خرید لیتے تھے اور اس واقعہ میں بھی ہے کہ انھوں نے بعض قیدیوں کو خریدا تھا۔ لہٰذا ان قیدیوں کو نجد کے بازاروں میں بیچنے سے کہیں بہتر اور منافع بخش حجاز کے بازاروں میں یا مدینہ خاص میں بیچنا تھا۔

(ر) مسلم فقہا امام شافعی، قاضی ابو یوسف، یحییٰ بن آدم وغیرہ نے اراضی و اموالِ غنیمت کی مسلمانوں میں تقسیم کے مسئلہ پر بنو قریظہ کے معاملہ سے کوئی استشہاد نہیں کیا ہے۔

(س) ہتھیار ڈالنے کے بعد بنو قریظہ کے یہودیوں کے سرداروں کے ایک فریق کو گرفتار کر لیا گیا۔ حضرت سعد نے ان کے بارے میں قتل کا غلط فیصلہ کیا اور وہ وہیں یعنی بنو قریظہ کے علاقے میں قتل کر دئے گئے۔ ان کو

مدینہ نہیں لایا گیا تھا۔

—— حیی بن اخطب، کعب بن اسد، نباش بن قیس اور عزال بن سموال جیسے لیڈروں کو حضرات علی اور زبیر نے قتل کیا۔

—— کچھ دوسرے درجے کے قریظی سرداروں کو اوس کے حوالہ کر دیا گیا۔ ان میں سے ہر دو مجرموں کو بنو اوس کے مختلف خاندانوں بنو عبدالاشہل، حارثہ، ظفر، معاویہ، عمرو بن عوف اور امیہ بن زید کے حوالے قتل کرنے کے لیے کیا گیا تاکہ بنو قریظہ کے قتل میں تمام اوسی خاندان شریک ہو جائیں۔

(ص) بنو قریظہ کا قبیلہ ۶۰۰ یا ۹۰۰ مردوں پر مشتمل تھا اور صرف ان کے مجرم سرداروں کو قتل کیا گیا تھا اور ان کی تعداد سولہ یا سترہ سے زیادہ نہیں تھی۔

(ط) احزاب میں حصہ لینے کا جرم یا فیصلہ سرداروں نے کیا تھا۔ پوری قریظی آبادی اس کی ذمہ دار نہیں تھی اور ان کا قتل قرآن کریم کے فیصلہ کے صریح خلاف ہوتا۔

(ع) قرآن مجید خود ایک فریق کے قتل اور ایک فریق کے گرفتار ہونے کا ذکر کرتا ہے۔

(ف) حضرت سعد بن معاذ کی تحکیم کا افسانہ گھڑا ہوا ہے اور اس کو اموی حامی عناصر نے واقعہ صفین کے بعد گھڑا تھا۔

—— اصل نتیجہ یہ کہ بنو قریظہ کے صرف سولہ یا سترہ اہم ترین جنگی جرائم کے مرتکب سرداروں کو قتل کیا گیا تھا۔

(۱۶۰) ڈبلو، این، عرفات، "NEW LIGHT ON THE STORY OF BANU QURAYZA AND THE JEWS OF MEDINA"، جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن، ۱۹۷۶ء، ۲، ص ۱۰۰-۱۰۷۔ کا نظریہ یہ ہے کہ بنو قریظہ کی قتل کی کہانی مسدا کے قتل عام کی کہانی سے بالکل مشابہ ہے۔ مسدا کا المیہ یروشلم کے بادشاہ سکندر کے زمانے میں جو ہیرو د اعظم کا پیشرو تھا پیش آیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ دونوں واقعات میں مماثل چیزیں اتنی ہیں کہ یہ یقین ہو جاتا ہے کہ بعد کی یہودی نسلوں نے المیۂ مسدا کی تفصیلات بنو قریظہ کے المیہ کی طرف منسوب کر دیں۔ عرفات کے باقی دلائل برکات احمد کی مانند ہیں۔ لیکن موخرالذکر نے اپنے دلائل زیادہ تفصیل، گہرائی اور گیرائی اور تحقیق کے ساتھ پیش کیے ہیں۔

(۱۶۱) ابن اسحاق، ص ۲۴۶-۲۴۲۔

(۱۶۲) اس کا تعلق خزرج کے سالم بن غنم بن عوف کے خاندان بنو الحبلی سے تھا۔ ہمارے ماخذ عام طور سے اس کو رئیس المنافقین کہتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ہجرت نبوی سے کچھ قبل مدینہ کے اوس و خزرج کے دونوں جنگ سے تنگ آئے ہوئے قبیلے اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لینے کے لیے تیار ہو گئے تھے اور بعض روایات کے مطابق سونے کا تاج بنانے کی تیاری بھی شروع ہو گئی تھی کہ اسلام نے یثرب پہنچ کر اس کی طاقت کا قلعہ توڑ دیا۔ ملاحظہ کیجئے: ابن اسحاق،

ص ۶ - ۲۴۵ ؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اوّل، ص ۶ - ۳۰۵ اور ۴۱۶ وغیرہ ؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ،
ص ۱۶، ۲۱، ۱۵۶ اور ۸۸ - ۱۸۰۔

اگرچہ منافقین کے مدنی سیاست میں کردار سے بروقت ہمارا تعلق نہیں ہے تاہم یہ تبصرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ماٰخذ اور ہمارے جدید مورخین دونوں نے منافقین اور خاص کر عبداللہ بن ابی کی طاقت وقوت اور منافقت کا مبالغہ آمیز بیان اختیار کیا ہے۔ ماٰخذ اور مسلم جدید مورخین ان کی مخالفت اور اسلام دشمنی میں مبالغہ کرتے ہیں اور مستشرقین خاص کر مونٹگمری واٹ نے ہجرت سے کچھ قبل اور بعد کے پانچ برسوں میں عبداللہ بن ابی کو مدینہ کا سب سے بڑا سردار اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلمان سیاسی حریف بنا کر پیش کرنے میں خاصا غیر علمی مبالغہ کیا ہے۔

(۱۶۳) یہودی قبائل سے اوس وخزرج کے حلف کے تعلقات قدیم زمانے سے چلے آ رہے تھے۔ اور ان کا پرتو عہدِ نبوی میں بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ سے جنگوں کے علاوہ غزوۂ اُحد اور خندق کے مواقع پر پڑتا نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو: بنو قینقاع اور بنو نضیر اور بنو قریظہ کے یہود کے ساتھ معاملہ نبوی میں اوس وخزرج کے لوگوں کا رویہ۔ برکات احمد، ص ۵۸ وغیرہ ؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۰ - ۲۰۹۔

(۱۶۴) شبلی نعمانی، سیرت النبی، اوّل، ص ۶ - ۳۰۵ وغیرہ۔

(۱۶۵) دیکھئے حوالہ ۱۵۱ بالا۔

(۱۶۶) دیکھئے حوالہ ۱۵۲ بالا۔

(۱۶۷) دیکھئے حوالہ ۱۵۳ بالا۔

(۱۶۸) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۲ کا خیال ہے کہ ابن ابی کا عین جنگِ اُحد سے پہلے اپنے آدمیوں کے ساتھ الگ ہو جانا عجیب اور غیر فطری معلوم ہوتا ہے اور ماٰخذ کا بیان اس ضمن میں صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ عین ممکن ہے کہ ابن ابی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اور مشورے سے میدانِ جنگ سے ہٹ کر مدینہ کی حفاظت کے لیے آیا ہو۔ یا اس کی پہلوتہی اس خیال سے رہی ہو کہ غیر جانبداری سے اس کی طاقت میں اضافہ ہوگا۔

ممکن ہے کہ دوسرا خیال صحیح ہو کیونکہ جنگِ بعاث کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ ابن ابی اوس وخزرج کے اس تصادم کے موقع پر بھی غیر جانبدار رہا تھا۔ مگر پہلا خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ ماٰخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر غزوہ کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر کے دفاع کا بندوبست کیا تھا اور ہمیشہ ایک فوجی دستہ شہر میں تعینات کیا تھا۔ جنگِ اُحد کے موقعہ پر یہ خدمت حضرت سعد بن معاذ اوسی نے انجام دی تھی۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے باب سوم، بحث بر العرس۔

لیکن بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ابن ابی کے اس طرح واپسی کی خبر کو مکی فوج نے اسی روشنی میں لیا ہوگا کہ مدینہ کی حفاظت کے لیے ایک فوج وہاں موجود ہے۔

(۱۶۹) سورۂ احزاب، آیات ۹ اور آگے؛ نیز شبلی، سیرت النبی، اول، ص ۴۳۰ وغیرہ۔

(۱۷۰) ابنِ اسحاق، ص ۴۶۳ وغیرہ۔

(۱۷۱) ابن اسحاق، ص ۴۹۱۔

(۱۷۲) ابن اسحاق، ص ۴۹۵ وغیرہ۔

(۱۷۳) ابن اسحاق، ص ۶۰۹۔

(۱۷۴) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۹۲-۹۳، کا یہودی مسئلہ پر یہ تبصرہ کافی حقیقت پسندانہ ہے کہ "اصل نکتہ یہ تھا کہ اسلامی معاشرہ سے وفاداری تمام دوسرے اتحادوں اور تعلقات سے بالاتر تھی۔۔۔۔ یہودیوں کی تنقید و نکتہ چینی اس پورے سیاسی اور سماجی تجربے کے لیے خطرہ تھی جس میں آپ اس وقت مصروف تھے اور جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسی بنا پر المناک واقعات کا پورا سلسلہ قائم ہو گیا۔"

واٹ کے اس تبصرہ میں یہ اضافہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہودی محض تنقید و نکتہ چینی کے مجرم نہیں تھے بلکہ وہ باقاعدہ سازشوں اور قبائل عرب کو بھڑکانے اور اسلامی ریاست کو ہر ممکن طریقے سے تباہ کرنے کے مجرم تھے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔

(۱۷۵) شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۳۰۰ کا یہ خیال کہ بدر کی فتح نے صرف رعب بٹھایا اور قبائل عرب کو خاموش کر دیا تھا بالکل صحیح نہیں ہے۔ تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ اس فتح نے کچھ قبائل کو بھڑکا بھی دیا تھا۔ چنانچہ بدر اور اُحد کے درمیان تقریباً نو مہمیں واقع ہوئی تھیں جن میں سے چار یہودیوں کے خلاف، دو قریش اور تین مہمیں چار قبائلِ عرب کے خلاف بھیجی گئی تھیں۔ جبکہ اُحد اور خندق کے درمیان گیارہ مہمیں ہوئی تھیں جن میں سے ایک دو قریش کے دو یہودیوں اور سات قبائل عرب کے خلاف بھیجی گئی تھیں مگر ان ساتھوں میں سے بئر معونہ اور رجیع کی مہمیں فوجی نہ تھیں بلکہ مذہبی مشن تھے جبکہ سفیان لحیانی کے خلاف ایک شخصی کارروائی تھی۔ اس لحاظ سے صرف چار مہمیں رہ جاتی ہیں جو قبائل عرب کے خلاف در اصل گئی تھیں۔

(۱۷۶) ابن اسحاق، ص ۳۶۰؛ واقدی، ص ۱۸۲-۱۸۴؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۳۱، ابن اسحاق کا بیان ہے کہ آپ کا قیام وہاں صرف تین دن رہا جبکہ واقدی اور ان کے کاتب کا خیال ہے کہ قیام کی مدت پندرہ دن تھی۔ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ کوئی جنگ یا لڑائی نہیں ہوئی اگرچہ کچھ مالِ غنیمت ضرور ملا تھا، جو انساب الاشراف، اول، ص ۳۱۰ کے مطابق پانچ سو اونٹوں پر مشتمل تھا۔

(۱۷۷) ابن اسحاق، ص ۳۶۲؛ واقدی، ص ۱۹۶-۷؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۳۵-۶؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۱۱؛ طبری، دوم، ص ۴۸۰۔ ابن اسحاق اور طبری کا خیال ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بحران میں دو ماہ تک مقیم رہے تھے مگر واقدی، ابنِ سعد اور بلاذری کا بیان ہے کہ صرف دس روز قیام رہا تھا۔ اس مہم میں نہ کوئی جنگ ہوئی تھی اور نہ ہی کچھ غنیمت ہاتھ لگی تھی۔

(۱۷۸) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے؛ واقدی، ص ۱۹۵-۶؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۳۵؛ نیز باب دوم، بحث بر اسلام

قبیلہ محارب۔

(۱۷۹) دیکھئے مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۷، ۹۱۔

(۱۸۰) ابنِ اسحاق، ص ۴۳۳، ۵۲۴؛ واقدی، ص ۳۴۶-۳۵۲؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۵۱-۵۴؛ انساب الاشراف، اوّل، ص ۳۷۵؛ طبری، دوم، ص ۵۴۵-۵۵۰؛ بخاری، غزوۃ الرجیع و رعل و ذکوان۔ مآخذ کے متفقہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں مبلغین اس لیے بھیجے گئے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عامر بن طفیل اور اس کے نجدی قبیلہ والوں سے حملہ کا خدشہ تھا۔ چنانچہ ابو براء عامری نے اپنے قبیلہ کی طرف سے تحفظ کی ضمانت دی تھی جب انھوں نے اپنے قبیلہ میں مسلم مبلغین کو بھیجے جانے کی درخواست دربار نبوی میں پیش کی تھی۔ اسی ضمانت کے سبب بنو عامر کے کسی قبیلہ نے عامر بن طفیل کے اشتعال دلانے کے باوجود مسلمانوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ لیکن بنو سلیم کے تین خاندانوں نے اسلام دشمنی میں عامر بن طفیل عامری کا ساتھ دیا تھا۔ مسلمانوں کے قتلِ عام کی خبر جب ابو براء کو پہنچی تو نہ ان کو نہ صرف شدید تکلیف ہوئی بلکہ انھوں نے المیہ کے مجرم عامر بن طفیل کو قتل کرنے کی کوشش کی مگر وہ شدید زخم کھانے کے باوجود بچ گیا۔ یہ بات اہم ہے کہ بنو عامر کے کسی بھی شخص نے عامر بن طفیل کا قصاص ابو براء سے طلب نہیں کیا تھا۔

زبیری، نسب قریش، ص ۱۹۸-۱۹۹، بئر معونہ کے المیہ کا سبب بیان کرتے ہیں جو عام طور سے مورخین نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان مورخین کے نزدیک شہداء بئر معونہ کے قتل کی ساری ذمہ داری حضرت ابو براء پر تھی جنھوں نے دھوکہ سے بلا کر ان مسلم مبلغین کا قتل عام کرایا تھا بلکہ ہمارے بعض مسلم مورخین تو حضرت ابو براء کے اسلام کے بھی قائل نہیں ہیں (ملاحظہ کیجئے شبلی نعمانی، سیرت، اوّل، ص ۳۸۹-۳۹۰ اور حاشیہ ۲ اور ۴)۔ بہرحال زبیری کا کہنا ہے کہ مسلم مبلغین کو قریش کے خاندان بنو نوفل کے ایک شخص طعیمہ بن عدی بن مطعم کے قتل کے بدلے میں مارا گیا تھا، ابنِ اسحاق کے بقول (ص ۴۳۶) طُعَیمہ کو جنگِ بدر میں حضرت نافع بن بدیل بن ورقاء خزاعی نے قتل کیا تھا۔ موخر الذکر صحابی بئر معونہ میں طعیمہ بن عدی کے ماموں انس بن عباس سُلمی کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔ ابنِ اسحاق نے اگرچہ واضح انداز سے اس المیہ کے سبب پر روشنی نہیں ڈالی ہے لیکن مضمر انداز سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بہرحال زبیری کے مطابق طعیمہ کے ماموں انس بن عباس سُلمی نے عامر بن طفیل عامری کو اپنے بھانجے کا قصاص لینے پر مدد دینے کے لیے اکسایا تھا۔ یہ بھی بات یاد رکھنے کی ہے کہ سُلیم کے خاندانِ رعل اور ذکوان قریش کے بنو نوفل کے حلیف تھے اور ان میں ازدواجی تعلقات بھی تھے۔ زبیری نے اس المیہ کا سارا الزام سُلیم کے چار قبیلوں رعل، ذکوان، عصیہ اور فالج پر عائد کیا ہے جبکہ دوسرے مورخین موخر الذکر کا نام نہیں لیتے ہیں۔

مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۳۱-۳۲ نے یہ تحقیق کی ہے کہ بنو عامر بن صعصعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے تاہم ان میں قبائلی سیاست کے نتیجہ میں رسہ کشی تھی۔ قبیلہ کے سردار ابو براء ضرور تھے لیکن سیاسی اقتدار اصل میں دو نوجوان خاص ابو براء کے بھتیجے عامر بن طفیل کے ہاتھوں میں تھا۔ ابو براء نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

اسلام کی تبلیغ کے بہانے دراصل اپنے قبیلہ میں اپنی سیاسی طاقت کو مضبوط کرنا اور اپنے حریفوں کو زیر کرنا چاہا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سیاسی رسّہ کشی سے فائدہ اٹھا کر قبیلہ کی اندرونی سیاست میں مداخلت کرنا مصلحت آمیز سمجھا اور مسلمانوں کا ایک دستہ بھیج دیا۔ واٹ کی اس تحقیق میں اندرونی تضادات بھی ہیں اور بعض دُوسرے خارجی دلائل سے بھی ان کی تردید ہوتی ہے۔ واٹ کو اعتراف ہے کہ ابو براء کو قبیلہ میں طاقت حاصل تھی اور ان کی ضمانت کو قبیلہ والوں نے نہیں توڑا تھا بلکہ کسی نے بھی عامر بن طفیل کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ جو کچھ اس کو مدد ملی تھی وہ دوسرے قبیلہ سے، حالانکہ زہری کے بیان سے پُوری طرح اور ابنِ اسحاق وغیرہ سے کسی قدر واضح ہوتا ہے کہ اصل مُجرم انس بن عباس اور اس کے چار سُلمی خاندان تھے۔ عامر بن طفیل کا جُرم زیادہ سے زیادہ صرفِ نظر کرنے کا تھا یا سلیم کے قاتلوں کا ساتھ دینے کا۔ اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ بئرِ معونہ کی جماعت مسلمین سراسر مذہبی اور تبلیغی نوعیت کی تھی کیونکہ اس میں جو لوگ شریک تھے ان کا تعلق اصحابِ صُفّہ سے تھا۔ واٹ کا یہ خیال کہ شہداءِ بئرِ معونہ کی تعداد مختلف روایتوں کے مطابق ستّر یا چالیس تھی مگر چونکہ ان کے بیان کردہ ناموں کی تعداد بیس سے بھی کم ہے اس لیے تعداد میں مبالغہ کیا گیا ہے اور وہ کافی کم تھی۔ شاید بیس کے لگ بھگ۔ ان کی یہ دلیل بھی ان کی تحقیق کے خلاف جاتی ہے کیونکہ اتنی چھوٹی سی جماعت جو کوئی خاص مسلح بھی نہ تھی عامر بن صعصعہ کی اندرونی سیاست پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔ مزید برآں بنو عامر بن صعصعہ سے مسلمانوں کے دوستانہ تعلقات کے اس واقعہ سے پہلے اور بعد کے زمانے میں ثبوت ملتے ہیں جن کے بھی وہ قائل ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ریاست کو ان کی حمایت پہلے سے حاصل تھی اور بعد میں بھی حاصل رہی جیسا کہ ابو براء کے ضمانت دینے اور ان کی ضمانت و عہد کا عامر بن صعصعہ کی طرف سے مکمل احترام و پابندی کرنے کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ لہذا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قبیلہ کی 'اندرونی سیاست' جو دراصل تھی ہی نہیں، میں دخل دینے کی ضرورت کیا رہ جاتی تھی؟ اس بحث سے واضح ہوتا ہے کہ واٹ کی تشریح و تعبیر نہ صرف مآخذ سے متصادم و متعارض ہے بلکہ وہ حقیقت کے بالکل برخلاف ہے۔ بئرِ معونہ کی مہم اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا ایک درخشاں باب ہے اگرچہ وُہ خونچکاں بھی ہے۔ لیکن یہ کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں کہ مذاہب کی سُرخروئی میں خُون کی سُرخی ہمیشہ شامل رہی ہے۔

اُبلتے خُون کی یہی سُرخی تھی جس نے حضرت عامر بن فہیرہ کے لبوں پر شہادت کے وقت وہ دلگداز کلمہ ثبت کر دیا تھا جس نے اُنؓ کے قاتل جبار کے دل و دماغ کو ہلا دیا تھا اور اتنا متاثر کیا تھا کہ وہ فوراً حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے۔ شہید نے کہا تھا: "فزت ورب الکعبہ: کعبہ کے رب کی قسم، میں تو کامیاب ہو گیا۔" اور پھر قاتل پشیمان، تائب اور مسلم تھا۔ ملاحظہ ہو: ابنِ اسحاق، ص ۴۳۹؛ نیز باب دوم، بحث بر اسلام عامر بن صعصعہ۔

(۱۸۱) روایات میں شہداء بئرِ معونہ کی تعداد میں اختلاف ہے۔ حدیث کی کتابوں میں عموماً یہ تعداد ستّر بتائی گئی ہے، جبکہ ابن اسحاق نے چالیس بتائی ہے۔ ملاحظہ ہو واقدی، ص ۳۴۷، جن کا خیال ہے کہ چالیس والی روایت زیادہ صحیح (ثبت) ہے۔

(۱۸۲) ابن اسحاق، ص ۴۵۰؛ واقدی، ص ۴۴۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۶۔

(۱۸۳) ابن ہشام، دوم، ص ۶۱۱-۱۲؛ واقدی، ص ۵۵۲؛ ابن سعد، دوم، ص ۸۶؛ طبری، دوم، ص ۶۴۱؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۷، کا بیان ہے کہ بعض قیدی بھی اس مہم میں پکڑے گئے تھے۔

(۱۸۴) ابن سعد، چہارم، ص ۲۶۹-۷۰، نے اس زمانے میں قبیلہ بنو سلیم کے کثیر تعداد میں مسلمان ہونے والوں کا ذکر کیا ہے؛ نیز ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۵۸۱۔ تفصیلات کے لیے باب دوم، بحث بر اسلام سلیم۔

(۱۸۵) ملاحظہ کیجیے باب دوم، مذکورہ بالا۔

(۱۸۶) ابن اسحاق، ص ۵۰۴، کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر لشکر نبوی میں سات سو سلیم کے مسلمان موجود تھے جبکہ واقدی، ص ۸۰۰، کے نزدیک ان کی تعداد ایک ہزار یا اس سے اوپر تھی۔

(۱۸۷) بنو سلیم بحران اور عسفان کے قریبی علاقوں میں آباد تھے۔ ملاحظہ ہو باب دوم، مذکورہ بالا۔

(۱۸۸) واقدی، ص ۱۹۲؛ ابن سعد، دوم، ص ۳۴؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۱۱؛ ابن اسحاق، ص ۳۶۲ اور طبری، دوم، ص ۴۸۷، نے اس مہم کا سبب نہیں بیان کیا ہے۔ دوسروں کے مطابق بنو محارب نے اسلامی ریاست پر حملہ کی غرض سے جماؤ کیا تھا۔

ذوامر میں بھی قیام لشکر نبوی کی مدت خاصی طویل تھی۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ آپ غالباً مدینہ سے محرم کے آغاز میں مہم کے لیے نکلے اور "نجد میں تقریباً پورے صفر مقیم رہے۔" اس طرح آپ کے قیام کی مدت تقریباً دو ماہ بنتی ہے۔ طبری کا بیان ہے کہ آپ نے مدینہ میں ماہ محرم کے اواخر تک قیام کیا اور صفر میں آپ نجد میں یعنی صرف ایک ماہ مقیم رہے۔ واقدی مدینہ سے آغاز سفر کی تاریخ ۱۲ ربیع الاول ۳ھ/۲۴ اگست ۶۲۵ء دیتے ہیں اور قیام کی مدت محض گیارہ دن بتاتے ہیں اگرچہ ابن سعد نے تاریخ سفر نہیں دی ہے تاہم وہ اپنے استاد کی تائید کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ابن اسحاق ص ۳۶۲؛ واقدی، ص ۱۹۵؛ ابن سعد، دوم، ص ۳۵؛ طبری، دوم، ص ۴۸۷۔ نیز ملاحظہ ہو: انساب الاشراف، اول، ص ۳۱۱۔

(۱۸۹) ابن ہشام، دوم، ص ۶۱۱-۱۲؛ واقدی، ص ۵۲۵-۳۵؛ ابن سعد، دوم، ص ۷۸؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۱۱؛ طبری، سوم، ص ۱۵۵۔

(۱۹۰) انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۰، کا بیان ہے کہ اس مہم کا یہ نام اس لیے پڑا کہ اس کی منزل مقصود ایک ایسے پہاڑ کا علاقہ تھا جو رنگا رنگ چھینٹ کے کپڑے (رقاع) کی مانند معلوم ہوتا تھا۔

(۱۹۱) واقدی، ص ۳۹۶، کا بیان ہے کہ مسلم سپاہ کی تعداد چار سو تھی جبکہ بعض دوسرے ماخذ میں سات اور آٹھ سو بھی ہے؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۱، نے صرف چار سو اور سات سو کی تعداد بیان کی ہے۔

(۱۹۲) ربیع الثانی ۶ھ/اگست، ستمبر ۶۲۷ء میں حضرت محمد بن مسلمہ کا سریہ ذوالقصہ؛ واقدی، ص ۵۵۱-۵۲؛ ابن سعد،

دوم، ص ۸۵؛ طبری، دوم، ص ۶۴۰۔ ابن سعد کے بیان میں مسلمان سپاہیوں کی تعداد سو بتائی گئی ہے جو بقول واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۹۲، کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ نیز ملاحظہ ہو، انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۷۔

(۱۹۳) اسی ماہ میں ابو عبیدہ بن جراح کی مہم ذوالقصہ۔ ابن ہشام، ص ۶۰۹؛ واقدی، ص ۵۵۵: ابن سعد، دوم، ص ۸۵-۶؛ طبری، دوم، ص ۶۴۱؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۷۔

(۱۹۴) جمادی الآخرہ ۶ھ/ اکتوبر، نومبر ۶۲۷ء میں حضرت زید بن حارثہ کی مہم جانب طرف۔ ملاحظہ فرمائیے: ابن ہشام، دوم، ص ۶۱۲؛ واقدی، ص ۵۵۵؛ ابن سعد، دوم، ص ۸۷؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۷؛ طبری، دوم، ص ۶۴۱؛ الطرف کے لیے ملاحظہ کیجئے: معجم البلدان، بیروت ۱۹۵۶ء، چہارم، ص ۳۱، جس کے مطابق وہ مدینہ سے ۳۶ میل مشرق میں تھا۔

(۱۹۵) رمضان ۷ھ/ جنوری ۶۲۹ء میں غالب بن عبداللہ لیثی کا سریہ میفعہ۔ واقدی، ص ۷۲۶-۷؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۱۹؛ طبری، سوم، ص ۲۲-۲۳؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۹۔

یہ نکتہ اہم ہے کہ پہلی تین مہمیں یکے بعد دیگرے پیش آئی تھیں مگر چوتھی مہم تقریباً ایک سال سے زیادہ کے وقفہ کے بعد بھیجی گئی تھی۔ خیال یہ ہے کہ یہ تبلیغی مشن تھے نہ کہ فوجی مہمیں۔ کیونکہ اتنی چھوٹی مہمیں کسی قسم کی گڑبڑ یا انتشار کو دور کرنے کے لیے دشمن علاقے میں ناکافی ہوتیں۔

(۱۹۶) ابن سعد، دوم، ص ۵۰ کے مطابق طلیحہ بن خویلد اسدی (جس نے خلافتِ صدیقی میں نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا) اور اس کے بھائی سلمہ نے اپنے قبیلہ کے ایک حصے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اکسایا تھا۔ نیز ملاحظہ کیجئے: انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۴-۵۔

(۱۹۷) ابنِ ہشام، دوم، ص ۵۹۸؛ واقدی ص ۳۴۰-۶؛ ابن سعد، دوم، ص ۵۰؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۵؛ طبری، سوم، ص ۱۵۵۔

(۱۹۸) معجم البلدان، چہارم، ص ۲۱۱؛ انساب الاشراف، اوّل، ص ۳۷۶۔

(۱۹۹) ابنِ ہشام، ص ۶۱۱-۱۲؛ واقدی، ص ۵۵۰-۵۱؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۸۴-۵؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۷؛ طبری، دوم، ص ۶۴۰۔

(۲۰۰) ابن اسحاق، ص ۶۶۶؛ ابن ہشام، دوم، ص ۶۱۹؛ واقدی، ص ۵۳۱-۳۲؛ ابن سعد، دوم، ص ۵۰-۵۱؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۷؛ طبری، دوم، ص ۶۴۰۔

(۲۰۱) ابن اسحاق، ص ۴۲۶-۳۳؛ ابنِ ہشام، دوم، ص ۶۰۹؛ واقدی، ص ۳۵۴-۶۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۵۵-۶؛ طبری، دوم، ص ۵۳۸؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۵۔

واقعہ رجیع اپنے محرکات، واقعات، تفاصیل اور نتائج کے لحاظ سے المیۂ بئر معونہ ہی جیسا تھا۔ عضل اور قارہ کے

دو خاندانوں جو خزیمہ سے متعلق تھے بنو لحیان سے ان کے سردار سفیان بن خالد ہذلی کے قتل کے بعد ساز باز کر کے دربارِ رسالت سے مسلم مبلغین کو اپنے قبیلہ میں اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے بلایا۔ سات یا دس افراد پر مشتمل ایک تبلیغی جماعت کو عضل و قارہ کے لوگوں نے بدعہدی کر کے بنو لحیان کے حوالے کر دیا۔ اور موخر الذکر نے پانچ یا سات آٹھ کو قتل کر دیا اور باقی میں سے دو حضرات خبیب اور زید بن دثنہ کو گرفتار کر کے قریش کے ہاتھ بیچ دیا۔ قریش کے بنو حارث بن عامر اور صفوان بن امیہ جمحی نے جنگِ اُحد میں اپنے اپنے مقتولوں کے عوض قتل کر دیا۔ جدید مورخین اور ہمارے ماخذ بجا طور پر اس واقعہ کی ذمہ داری عضل و قارہ کے ساتھ بنو لحیان پر ڈالتے ہیں۔ لیکن کسی نے بھی یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ اس واقعہ کے پیچھے قریش کے کچھ لوگوں کا بھی ہاتھ تھا۔ بئر معونہ اور واقعہ رجیع دونوں میں قریش کی سازش اور مخالفت کارفرما نظر آتی ہے۔

(۲۰۲) کتاب المحبر، ص ۱۱۴۔ بغدادی اس غزوہ کو غزوہ بنی لحیان من ہذیل کہتا ہے اور مقامِ تصادم کدر بتاتا ہے۔ اسی بنا پر اس کے نزدیک یہ غزوہ منگل یکم جمادی الاولیٰ ۵ھ میں ہوا تھا۔ جبکہ دوسرے ماخذ کے مطابق وہ محرم ۳ھ میں واقع ہوا تھا۔

(۲۰۳) شہیدِ رجیع حضرت خبیب بن عدی کے قریشی قاتل ابو سروعہ بن حارث بن عامر جنھوں نے صحابی موصوف کو اپنے باپ کے قتل کے قصاص میں قتل کیا تھا بعد میں مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح حضرت زید بن دثنہ کو قتل کروانے والے صفوان بن امیہ اور ان کے قاتل غلام نسطاس نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ زرقانی، جلد ۲، ص ۸۰ اور ۸۴؛ شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ اول، ص ۹۳-۳۹۲۔ واقعہ رجیع کے نفسیاتی و مذہبی اثرات کے لیے ملاحظہ کیجیے: ابن اسحاق، ص ۲۹-۴۲۸۔

(۲۰۴) ابنِ اسحاق، ص ۴۴۹؛ ابن ہشام، دوم، ص ۴۰۸؛ واقدی، ص ۴۰۲-۴۰۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۳-۶۲؛ طبری، دوم، ص ۵۶۴؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۱۔

ابنِ سعد کے مطابق دومۃ الجندل شامی سرحدوں کے قریب دمشق سے پانچ راتوں کی مسافت پر واقع تھا، جبکہ مدینہ سے اس کا فاصلہ ۱۵ یا ۱۶ راتوں کا تھا۔ یاقوت حموی کے بیان کے مطابق مدینہ سے اس کی مسافت سات منزلوں کی تھی۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: معجم البلدان، دوم، ص ۹-۴۸۷۔

(۲۰۵) یہ نکتہ اہم ہے کہ مدینہ کی اسلامی ریاست نے جو دومہ سے دمشق کی بہ نسبت تین گنا فاصلے پر واقع تھی۔ ان قزاقوں کے خلاف کارروائی کی تھی۔ شام و فلسطین کی بازنطینی حکومت یا ان کی ماتحت غسانی بادشاہت جو مدینہ کے مقابلے میں کافی قریب تھیں کوئی اقدام کرنے سے باز یا قاصر رہی تھیں زیادہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ دومۃ الجندل میں خود ایک کندی خاندان کی بادشاہت قائم تھی جو اچھی خاصی طاقتور تھی یا کم از کم ان لٹیروں کو کچلنے کی قوت رکھتی تھی مگر اس نے بھی کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا ان حقائق و شواہد و قرائن کی روشنی میں یہ بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ یہ قزاق صرف ان کاروانوں کے خلاف کارروائی کرتے تھے جو مسلمانوں کے ہوتے تھے یا اسلامی ریاست کے علاقوں سے تجارت کرتے تھے۔ عین ممکن ہے کہ ان قزاقوں کو مسلمانوں کی اقتصادی ناکہ بندی کرنے کے لیے شمال کے طاقتور قبائل یا منظم حکومتوں نے اکسایا ہو اور یہ تقریباً یقینی

معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم لوٹ مار کی ان کارروائیوں میں قبائل عرب اور سلطنت شام و بصریٰ و فلسطین کی در پردہ یا خاموش حمایت و رضامندی حاصل رہی تھی۔ اس کی تائید اس سے اور بھی ہوتی ہے کہ حضرت زید کی قیادت میں شام جانے والا ایک مسلم کارواں اسی زمانے کے قریب لوٹ لیا گیا تھا۔ پھر حضرت دحیہ بن کلبی کو کچھ مدت بعد اسی علاقے میں لوٹا گیا اور دوسرے مسلم کاروانوں یا قافلوں یا جماعتوں پر غارتگری کی گئی تھی۔

(۲۰۶) واقدی، ص ۴۰۳ اور ابن سعد، دوم، ص ۶۲ سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص اخیس سرایا کے زمانے میں مسلمان ہوگیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا اپنا ایک تبلیغی اثر رہا ہوگا۔ لیکن یہ قیاس بے جا نہیں کہ یہ تنہا واقعہ دراصل اس اجتماعی اور مکمل اثر کا ایک اظہار ہے اور نہ جانے کتنے ایسے ہوں گے جو ان سرایا کے دوران یا دومہ کے اس غزوہ میں اسلام کی دولت سے شرفیاب ہونے ہوں گے۔ (۲۰۷) ایضاً، ص ۵۶۴ - (۲۰۸) واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۱۵۔

(۲۰۹) طبری، ص ۵۶۴؛ یاقوت حموی، معجم البلدان، دوم، ص ۳۶-۳۵ اور ۵۵-۲۵۴ کے مطابق تغلمین ذہل بن ثعلبہ کے ایک چشمے تقیدہ کے نواح میں ایک مقام تھا۔ دوسری روایت کے مطابق وہ اس علاقہ کے بالائی علاقے (الحزن) میں ایک مقام تھا جہاں بنوتیم اللہ، بنوعجل اور قیس بن ثعلبہ کے قبیلے آباد تھے۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ بنوتیم کا نام تیم اللہ غالباً اس غزوہ کے دوران یا بعد میں اس کے مذہبی و تبلیغی اثرات کا ایک نتیجہ ہوگا۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق میں اس معاہدہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ غالباً وہ ان کی نظر سے چوک گیا۔

(۲۱۰) ابنِ سعد، دوم، ص ۶۳؛ نیز دیکھیے واقدی، ص ۴۰۴ -

(۲۱۱) واقدی، ص ۴۰۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۳؛ بلاذری، انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۱؛ طبری، دوم، ص ۶۰۴ -

(۲۱۲) بخاری، باب العتق، اور مسلم، کتاب الجہاد والسیر، کا بیان ہے کہ بنوالمصطلق پر اچانک حملہ کر دیا گیا تھا لیکن واقدی، ص ۴۰۷۔ اور انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۱ کا واضح بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے بنوالمصطلق کے سامنے اپنے دستور کے مطابق اسلام پیش کیا تھا۔ مگر جب انھوں نے انکار کر دیا تو حملہ کیا گیا تھا۔

نیز ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۴۹۰؛ ابن ہشام، دوم، ص ۴۰-۲۵۰؛ طبری، دوم، ص ۶۰۴۔ صحیحین کی روایت معمول و

ابن اسحاق، ص ۴۹۰؛ ابن ہشام، دوم، ص ۴۰-۲۵۰؛ طبری، دوم، ص ۶۰۴۔ صحیحین کی روایت معمول و دستورِ نبوی نیز احکامِ اسلامی کے خلاف ہے اس لئے اسے بلا کسی جھجک کے مسترد کر دینا چاہیے۔ شبلی نعمانی، سیرت، اول، ص ۴۱۵ نے ابنِ حجر کا قول نقل کیا ہے کہ "صحیحین کی روایت پر سیرت کی روایتوں کو ترجیح نہیں ہو سکتی" لیکن پھر انہوں نے صحیح روایت کو "اصولِ حدیث کی رو سے قابلِ حجت نہیں سمجھا ہے کہ اس روایت کا سلسلہ نافع تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور جنگ میں شریک ہونا تو ایک طرف، نافع نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا بھی نہ تھا اس لیے یہ روایت اصطلاحِ محدثین میں منقطع ہے۔" شبلی نعمانی کی اس کوشش پر ان کے جامع سید سلیمان ندوی نے حاشیہ ۲ میں استدراک کیا ہے کہ اسناد میں موجود ہے کہ نافع نے "اس روایت کو

حضرت عبداللہ بن عمر سے سنا جو اس لڑائی میں شریک تھے ..... اس تصریح کے بعد یہ روایت منقطع نہیں باقی رہتی ہے۔ سید سلیمان ندوی نے حدیث صحیحین کے اسناد کی رو سے تو صحیح اور مرفوع ثابت کر دیا تاہم انھوں نے صحیحین اور سیرت کی روایتوں میں سے کسی موازنے پر کلام کرنے سے گریز کیا ہے۔ بہرحال روایت و اسناد کی رو سے صحیحین کی روایت صحیح ہو سکتی ہے مگر درایت کی کسوٹی پر صحیح نہیں اترتی کہ علماء حدیث کا اتفاق ہے کہ ہر وہ حدیث و روایت جو معمول نبوی یا حکم اسلامی کے مخالف، متعارض یا متصادم نظر آئے نا قابل قبول ہوگی۔ لہٰذا اس باب میں ارباب سیرت کی روایت کو ہر حال میں ترجیح حاصل ہوگی۔

(۲۱۳) ابن اسحاق، ص ۴۹۰ اور طبری، دوم، ص ۶۰۴ کے مطابق مریسیع قدید کی سمت میں ساحل کی طرف تھا۔ سمہودی، وفاء الوفاء، قاہرہ ۱۳۲۶ھ، ص ۲، ۳، کے مطابق خزاعہ کا یہ چشمہ فرع سے ایک دن کی مسافت پر واقع تھا۔

(۲۱۴) ابن اسحاق، ص ۴۹۳؛ واقدی، ص ۴۰۱ و ۴۰۷؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۴؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۱؛ طبری، دوم، ص ۶۰۴ و ۶۰۹ - ۶۱۰؛ بخاری اور مسلم، مذکورہ بالا ابواب۔

(۲۱۵) ابن اسحاق، ص ۴۹۳؛ واقدی، ص ۴۱۱؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۴؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۱ - صرف طبری، دوم، ص ۶۱۰ کا بیان ہے کہ ایک سو خاندان (مائۃ اہل بیت) اس طرح آزاد کیے گئے تھے۔ نیز ملاحظہ ہو بخاری، کتاب العتق؛ مسلم، کتاب الجہاد والسیر؛ ابو داؤد، سنن، کتاب العتاق۔

(۲۱۶) مذکورہ بالا تمام مورخین و محدثین کا اتفاق ہے کہ بنو مصطلق کے کافی لوگ اس غزوہ کے بعد مسلمان ہو گئے تھے اور باقی کچھ مدت کے بعد حضرت حارث بن ابی ضرار خزاعی سردار قبیلہ کے قبول اسلام کے وقت ہوئے۔ بہرحال فتح مکہ سے کافی قبل یہ پورا خاندان اسلام کے دائرہ میں داخل ہو چکا تھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو باب دوم، بحث بر اسلام بنی مصطلق۔

(۲۱۷) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے خزاعہ کے ساتھ قدیم تعلقات کے لیے دیکھئے؛ ابن سعد، اول، ص ۸۸ - ۸۷؛ زبیری، نسب قریش، ص ۷۰ - ۶۹؛ محمد بن حبیب بغدادی، کتاب المنمق، مرتبہ خورشید احمد فارق، حیدر آباد دکن ۱۹۶۴ء، ص ۸۸ - ۹۲؛ انساب الاشراف، اول، ص ۷۰ - ۶۹؛ طبری، دوم، ص ۲۵۰۔

(۲۱۸) صرف ابن اسحاق غزوہ بنی المصطلق کے غزوہ احزاب کے بعد ہونے کے قائل ہیں۔ بقیہ مورخین و سیرت نگار اس کو اس واقعہ عظیم سے پہلے کا بتاتے ہیں۔

(۲۱۹) قریش کی قیادت میں قبائل عرب کا احزاب عظیم دس ہزار سپاہ پر مشتمل تھا جن میں سے غطفان کے مذکورہ بالا تین خاندانوں ـــــ فزارہ، اشجع اور مرہ ـــــ نے بالترتیب ایک ہزار، چار سو اور چار سو سپاہی فراہم کیے تھے۔ ملاحظہ کیجئے؛ واقدی، ص ۴۴۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۶؛ نیز دیکھئے ابن اسحاق، ص ۵۰۴؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۳ - ۳۴۶ اور طبری، دوم، ص ۵۶۶ جو ان کے دستوں کی عددی طاقت کا ذکر نہیں کرتے البتہ یہ کہتے ہیں کہ ان خاندان ہائے غطفان کے دستے اپنے اپنے قبائلی سرداروں کی کمان میں تھے۔

(۲۲۰) سب سے اہم سبب وہ فوجی تکنیک تھی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنائی تھی۔ ماخذ کا بیان ہے کہ خندق دیکھ کر

قبائل عرب کے سالار اور فوجی ماہرین حیران و ششدر رہ گئے تھے کیونکہ ان کے لیے فنِ حرب کی تکنیک قطعی نئی اور غیر متوقع تھی وہ اس کا توڑ نہیں تلاش کرسکے۔ دوسرا اہم سبب ان کے سالاروں کی عسکری قیادت اور فوجی سوجھ بوجھ کی کمی تھی کہ پورے ایک ماہ تک محاصرہ کرنے کے باوجود وہ خندق عبور کرنے کی ترکیب یا تدبیر اختیار کرنے میں ناکام رہے۔ اسی سے متعلق تیسرا سبب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم تر اور برتر عسکری قیادت اور فوجی لیاقت تھی جس نے مقابل اور حریف سالاروں کی ہر تدبیر و ترکیب کا کامیاب توڑ تلاش کرلیا۔ چوتھا سبب احزاب میں سیاسی، فوجی اور سماجی اتحاد کی کمی تھی اور اس کے برخلاف پانچواں سبب مسلمانوں میں عظیم اتحاد اور مثالی تعاون تھا۔ چھٹا سبب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی و فوجی حکمت عملی تھی جس نے اتحادیوں میں پھوٹ ڈال دی تھی۔ ساتواں اہم سبب جنگ سے قبل مدینہ کی فصلوں کی قبل از وقت کٹائی تھی جس نے دشمن سپاہ کو غذا اور چارے کی کمی سے دوچار کردیا تھا۔ آٹھواں سبب قدرتی آفات و مصائب تھے جنھوں نے دشمن کی صفوں میں ابتری پھیلا دی تھی۔ نواں اہم سبب محاصرہ کی طویل مدت تھی جس نے دشمنوں میں بددلی، اکتاہٹ، اپنے سالاروں کے بارے میں بدگمانی، ان کی قیادت و سیادت پر شک و شبہ اور اپنے مقصدِ جنگ کے بارے میں اشتباہ و تزلزل پیدا کردیا تھا۔ اور اسی سے متعلق دسواں سبب تھا جو فوجی MORALE (حوصلہ) کی کمی کی صورت میں ظاہر ہوا تھا جبکہ مسلمانوں کا حوصلہ بلند، جذبہ ناقابلِ تسخیر اور اعتماد غیر متزلزل تھا ان کے علاوہ متعدد اور چھوٹے بڑے اسباب بھی تھے۔

(۲۲۱) ابن سعد، دوم، ص ۸۰ کا بیان ہے کہ عُیَینہ بن حصن فزاری نے چالیس شہسواروں کے ساتھ حملہ کیا تھا اور چراگاہ کے نگران جو حضرت ابوذر غفاری کے صاحبزادۂ گرامی تھے مار ڈالا تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا ریاست اسلامی کی بیس اونٹنیاں ہنکا لے گیا تھا۔ نیز ملاحظہ کیجئے: واقدی، ص ۹-۵۳۷ اور ابن اسحاق، ص ۴۸۶' جن کے بیان میں یہ اضافہ ہے کہ نگران چراگاہ کو قتل کرنے کے بعد وہ اونٹوں کے ساتھ نگران کی بیوی کو بھی اٹھالے گیا تھا۔ مزید دیکھئے: انساب الاشراف، اوّل، ص ۴۹-۳۴۸؛ طبری، دوم، ص ۵۹۶ اور آگے۔

(۲۲۲) ابنِ سعد، دوم، ص ۸۱ کے مطابق ذو قرد خیبر کی ایک نواحی بستی تھی۔

(۲۲۳) ابنِ اسحاق، ص ۹۰-۴۸۸؛ واقدی، ص ۷-۵۳۶؛ ابن سعد، دوم، ص ۸۲-۸۱؛ انساب الاشراف، اول، ص ۹-۳۴۸؛ طبری، دوم، ص ۶۰۴-۵۹۹؛ نیز دیکھیے بخاری، غزوۂ ذی قرد۔

(۲۲۴) ابنِ اسحاق، ص ۵-۶۶۴؛ واقدی، ص ۵-۵۶۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۹۱-۹۰؛ طبری، دوم، ص ۴۳-۶۴۲؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۸۔

(۲۲۵) ابنِ ہشام، دوم، ص ۱۲-۶۱۱؛ واقدی، ص ۷۲۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲۰؛ طبری، سوم، ص ۲۲؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۹۔

(۲۲۶) ان کا انتقام جس مہم نے لیا تھا وہ حضرت غالب بن عبداللہ لیثی کی قیادت میں گئی تھی اور سریۂ فدک کہلاتی ہے۔ ملاحظہ ہو

ابن اسحاق، ص ۸ - ۶۶۷؛ ابن ہشام، دوم، ص ۶۲۲؛ واقدی، ص ۲۶ - ۶۲۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲۶؛
طبری، سوم، ص ۲۲؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۹ -

(۲۲۷) ابنِ سعد، دوم، ص ۱۲۰ میں یُمن اور جبار ہے۔ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۹، میں یُمن اور جُبر ہے۔ اور مزید یہ اضافہ ہے کہ یہ دونوں مقامات جناب کے نواح میں تھے۔

(۲۲۸) ابنِ ہشام، دوم، ص ۱۲ - ۶۱۱؛ واقدی، ص ۳۱ - ۷۲۷؛ طبری، سوم، ص ۲۳؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۹ - ابن سعد، دوم ص ۱۲۰ -

(۲۲۹) یہ حضرت ابوقتادہ خزرجی کا سریہ تھا جو شعبان ۸ھ / دسمبر ۶۲۹ء میں خابہ نامی مقام تک گیا تھا۔ ملاحظہ ہو: واقدی، ص ۸۰ - ۷۷۷، ابن سعد، دوم، ص ۳۳ - ۱۳۲؛ طبری، سوم، ص ۲۵ - ۲۴؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۸۱ -

(۲۳۰) ابنِ اسحاق، ص ۲ - ۶۶۲؛ ابن ہشام، دوم، ص ۶۱۱؛ واقدی، ص ۷ - ۵۵۵ - ان تینوں مغازی و سیرت نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ اسی زمانے کے آس پاس جذام کا ایک خاندان بنو ضُبَیب کا ایک اہم اور سربرآوردہ سردار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں مدینہ حاضر ہوا اور اسلام سے سرفراز ہوا۔ بعد میں اس کو ایک کتاب نبوی (معاہدہ) کا مزید شرف ملا۔ مدینہ سے واپسی پر اس نے اپنے قبیلے میں اسلام کی تبلیغ کی اور اس کا پورا خاندان و قبیلہ مسلمان ہوگیا۔ کچھ مدت کے بعد قیصرِ روم کے دربار سے سفیرِ نبوی حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی جذام کے اسی علاقے سے گزرے۔ قبیلہ کے ایک خاندان نے جو روایات کے مطابق لٹیروں پر مشتمل تھا حضرت دحیہ پر حملہ کرکے ان کا سارا سامان لوٹ لیا، اس میں وہ تحائف بھی تھے جو قیصر روم نے خدمت نبوی میں بھیجے تھے۔ بہرحال یہ بات بہت اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی کہ جوں ہی سفیرِ نبوی کے لوٹے جانے کی خبر پھیلی اسی بنی ضُبَیب نے لٹیروں کے خلاف کاروائی کی اور نہ صرف ان کو سزا دی بلکہ ان سے تمام لوٹا جانے والا سامان واپس بھی لے لیا اور پھر قاصدِ رسول کو بحفاظت تمام اپنے علاقے سے گزرنے کے انتظامات بھی کیے۔ ملاحظہ کیجئے: ابن سعد، دوم، ص ۸۸؛ نیز رفاعہ بن زید جذامی سے معاہدے کے لیے دیکھیے: مجموعۃ الوثائق، ص ۱۵۶؛ میثاق، ص ۵۱۷؛ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے باب دوم، بحث بر اسلام جذام۔

(۲۳۱) ابنِ سعد، دوم، ص ۸۸، کے مطابق حِسمیٰ وادی القریٰ سے پرے شمال میں ایک مقام یا علاقہ تھا۔

(۲۳۲) ابنِ اسحاق، ص ۴ - ۶۶۳؛ ابنِ ہشام، دوم، ص ۶۱۲؛ واقدی، ص ۶۰ - ۵۵۸؛ ابن سعد، دوم، ص ۸۸؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۷؛ طبری، دوم، ص ۶۴۱ -

(۲۳۳) ابنِ ہشام، دوم، ص ۱۲ - ۶۱۱؛ واقدی، ص ۳ - ۵۶۲؛ ابن سعد، دوم، ص ۹۰ - ۸۹؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۳۸؛ طبری، دوم، ص ۶۴۲ -

(۲۳۴) ابنِ اسحاق، ص ۶۷۲؛ ابنِ ہشام، دوم، ص ۶۳۲؛ واقدی، ص ۶۲ - ۵۶۰؛ ابن سعد، دوم،

ص ۸۹ ؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۸ اور طبری، دوم، ص ۶۴۲۔

(۲۳۵) واقدی، ص ۶۲-۵۶۱ کا نہایت واضح و صریح بیان ہے کہ مسلم سالار حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری نے دومہ پہنچنے کے بعد تین دن تک بنو کلب کو مسلسل اسلام کی دعوت دی۔ دو دن تک اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا لیکن تیسرے دن قبیلہ کا سردار مسلمان ہوگیا۔ مورخ کا مزید بیان ہے کہ رئیس قبیلہ الاصبغ کے مسلمان ہونے کے بعد حضرت عبدالرحمٰن نے اپنے ایک قاصد کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سردار قبیلہ کی دختر نیک اختر تماضر بنت اصبغ سے شادی کرنے کی اجازت چاہی جو آپ نے مرحمت فرما دی۔ دوسری روایت یہ بھی بیان ہوئی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے لشکر کی روانگی کے وقت ہی حضرت عبدالرحمٰن کو حکم دیا تھا کہ اگر سردار قبیلہ مسلمان ہو جائے تو اس کی لڑکی سے شادی کرلیں۔ بہرحال دونوں روایتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کی تماضر بنت الاصبغ سے شادی رئیس قبیلہ کے اسلام لانے کے بعد ہی ہوئی تھی۔ ابن سعد، دوم، ص ۸۹، کا مزید اضافہ یہ ہے کہ اپنے سردار کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بنو کلب کے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور جو لوگ اپنے پرانے دین پر قائم رہے ان پر جزیہ عاید کر دیا گیا۔ ان بیانات نیز دوسرے ماخذ کے بیانات کی روشنی میں یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ بنو کلب کے اس حصہ کے سردار کے مسلمان ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں رہ جاتا ہے۔ مگر مونٹگمری واٹ (محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۱۵) کا اصرار ہے چونکہ جزیہ وصول کیا گیا تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ (سردار قبیلہ) عیسائی ہی رہا ہوگا۔ مگر یہ خیال خام ہے اور ماخذ کے واضح اور متفقہ بیانات کے بالکل خلاف ہے۔ ابن سعد کی روایت بالکل واضح ہے جو یہ کہتی ہے کہ "جزیہ صرف ان لوگوں سے لیا گیا تھا جو اپنے پرانے دین پر قائم رہے تھے اور جنھوں نے اسلام نہیں قبول کیا تھا۔" نیز ملاحظہ کیجئے انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۸، جس کا عام بیان یہ ہے کہ "جب لوگ (قوم) مسلمان ہو گئے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے تماضر بنت اصبغ سے شادی کر لی۔" حالانکہ وہ جزیہ کے عاید کئے جانے کا ذکر نہیں کرتی؛ نیز دیکھیے: طبری، دوم، ص ۶۴۲ جو بلاذری کی مکمل پیروی کرتے ہیں۔

(۲۳۶) مونٹگمری واٹ نے صرف اسی موقعہ پر یا محض بنو کلب کے معاملے میں جانب داری سے کام نہیں لیا ہے بلکہ شمال بعید اور جنوب بعید کے قبائل عرب کے معاملہ میں عام طور سے اور عیسائی قبیلوں کے معاملے میں خاص طور سے ان کا نقطۂ نظر جانبدارانہ، غیر علمی اور غیر تاریخی معلوم و ثابت ہوتا ہے۔ ان قبائل کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سیاسی تعلقات اور ان میں تبلیغ واشاعت اسلام کے بارے میں مورخ موصوف کا جھکاؤ غالباً ان کے اپنے مذہبی رجحانات کے سبب اس جانب رہتا کہ وہ عہد نبوی میں مسلم نہیں ہوئے تھے یا ان کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلقات محض سیاسی مفاہمت پر مبنی تھے۔ جس کو وہ دوسرے الفاظ میں سیاسی موقعہ پرستی بھی کہتے ہیں۔ باب دوم میں شمالی پالیسی اور شمالی قبائل سے اسلام کے تعلقات پر ہم ان کے نقطۂ نظر کو مفصل طور سے دیکھیں گے۔

(۲۳۷) محمد ایٹ مدینہ، ص ۵۲-۴۶۔

(۲۳۸) ابتدائی مآخذ میں صرف واقدی، ص ۲، ۵، نے خواب میں حکمِ خداوندی کا ذکر کیا ہے۔ ابن اسحاق، ص ۴۹۹ وغیرہ اور ابن سعد وغیرہ نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ دوسرے طبقہ کے مورخین کے مطابق یہ فیصلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صوابدید اور حالات کے تجزیے کے بعد کیا تھا۔

(۲۳۹) سیرت النبی، اول، ص ۹-۴۴۴۔

(۲۴۰) مآخذ کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ غطفان کے دو قبائل اشجع اور مرہ جنگ احزاب کی ناکامی کے بعد ریاست اسلامی سے اپنے تعلقات کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہی حال سلیم اور اسد کا تھا۔ تفصیل ہم دوسرے باب کی متعلقہ فصول میں دیکھیں گے۔

(۲۴۱) ابن اسحاق، ص ۴۹۹ کا بیان ہے کہ اس موقعہ پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف واکناف کے پڑوسی بدو قبائل عرب کو بھی عمرہ کے اس سفر پر چلنے کی دعوت اس غرض سے دی تھی کہ آپ کو خدشہ تھا کہ قریش مکہ آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے بزورِ شمشیر روکیں گے، جیساکہ انھوں نے بعد میں حقیقتاً کیا بھی۔ بہت سے بدوی قبائل اس مسلح تصادم کے ڈر سے آپ کے ساتھ نہیں گئے۔ چنانچہ آپ اس سفر پر ان لوگوں کے ساتھ نکلے جو انصار و مہاجرین میں سے تھے اور جو بدوی قبائل میں سے آپ سے وفادار رہے۔ یہ نکتہ اہم ہے کہ ابنِ اسحاق کا یہ بیان بلا کسی سند کے بیان ہوا ہے اور ان کے اپنے تاثر اور خیالات کا عکاس ہے۔ اس کے معاً بعد جو روایات ابن اسحاق نے بیان کی ہیں وہ زہری کی سند پر بیان ہوتی ہیں جن میں قبائل عرب کو عمرہ میں شرکت کی دعوت دینے، ان کے قبول نہ کرنے اور قریش کے مسلح روک تھام کرنے کا حوالہ نہیں ملتا ہے۔ زہری کی پہلی روایت مسور بن مخرمہ اور مروان بن حکم کی سند پر بیان ہوتی ہے اور اس میں عمرہ کرنے والوں کی تعداد صرف سات سو دی گئی ہے۔ جبکہ ابن اسحاق نے بلا سند حضرت جابر بن عبداللہ، جو اس قافلۂ مشتاقان پر توجمال الٰہی میں شامل تھے، کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ہم حدیبیہ والے چودہ سو تھے۔" (ص ۵۰۰)

بہر حال ابن اسحاق کے بیان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حلیف اور مسلم بدوی قبائل کو شرکت کی دعوت دی تھی اور وہ قریش کے خوف سے غیر حاضر رہے صحیح نہیں ہے۔ اور یہ تو حقیقت کے خلاف ہو گا کہ انصار و مہاجرین میں سے کسی نے حکم نبوی سے عدول و انحراف کرنے کی جرأت بھی کی ہوگی۔ جنگِ احزاب کے موقعہ پر مسلمانوں کی عددی طاقت جو محاذ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی تین ہزار کے قریب تھی۔ اگر آپ بدوی حلیف قبائل کو اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ نہیں کر سکے تھے تو کم از کم آپ مدینہ کے تین چار مسلمانوں کو ساتھ لے جاسکتے تھے۔ دراصل آپ مسلمانوں کی پوری طاقت یا جمعیت کے ساتھ اس سفر مبارک پر نہیں نکلے تھے بلکہ قرائن اور حقائق دونوں یہ کہتے ہیں کہ اس سفر میں شرکت اختیاری تھی۔ انصار و مہاجرین میں سے جس کا جی چاہا ساتھ ہو لیا تھا اور آپ نے سب کے چلنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ اسی طرح یہ نتیجہ نکالنا کہ آپ کے اس سفر میں غیر مسلم زائرین شامل تھے یا ان کو آپ نے شامل ہونے کی دعوت دی تھی صحیح نہیں ہے۔ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۴۶-۴۴، نے ابن اسحاق کے تاثر پر

بنیاد رکھ کر یہی دو غلط نتیجے نکالے ہیں۔

(۲۴۲) ابنِ اسحاق، ص ۵۰۰، زہری کی روایت جو حضرات مسور بن مخرمہ اور مروان بن حکم کی سند پر بیان ہوئی ہے۔

(۲۴۳) ابنِ اسحاق، ص ۲-۵۰۱ کا بیان ہے کہ مکرز بن حفص عامری کے بعد قریش نے اپنے احابیش اتحادیوں کے سردار حُلیس بن علقمہ، جو ابن زبان کی کنیت سے زیادہ مشہور تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کے لیے بھیجا لیکن اس نے قربانی کے جانور (ھدی) دیکھ کر گفت و شنید کی ضرورت نہیں محسوس کی اور مکہ لوٹ گیا اور قریش کو مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے کی اجازت دینے کی اپنی پوری کوشش کی لیکن قریش نے اس کو بدو جاہل کہہ کر خاموش کر دیا کیونکہ وہ بنو حارث بن عبد مناۃ بن بکر بن کنانہ کا سردار تھا۔

الحلیس نے جو کچھ کہا تھا وہ مکہ والوں کے مزاج اور سیاست کو بھی سمجھنے میں مدد دیتا ہے اور دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قبائل عرب کے ایک عام رویے کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتاتا ہے کہ مسلمانوں کے اس اقدام و اعلان مذہب نے کس قدر عرب قبائل کے حلقوں میں ان کے لیے حمایت و طرفداری و ہمدردی پیدا کر دی تھی۔ عبداللہ بن ابوبکر کی روایت ہے کہ قریش کے اس سخت جواب نے الحلیس کو برہم کر دیا اور اس نے سخت لہجے میں کہا " اے قریش! کیا اسی لیے ہم نے تم سے اتحاد و دوستی کی تھی؟ کیا ایک شخص جو خدا کے گھر کی زیارت کے لیے آنا چاہتا ہے اس سے محروم رکھا جائے گا؟ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، یا تو تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس کی اجازت دے دو گے جس کے لیے وہ آئے ہیں یا میں احابیش کے آخری آدمی کو بھی واپس لے جاؤں گا۔" قریش نے اس پر حلیس کو خاموش کیا اور اپنے عندیہ کا یوں اظہار کیا کہ وہ اپنے لیے قابلِ قبول شرائط منوا کر مسلمانوں کو زیارتِ کعبہ کی اجازت دے دیں گے۔" اسی طرح عروہ بن مسعود ثقفی کے تاثرات تھے اور وہ بھی مسلمانوں کو زیارت دینے کے حق میں تھا۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۳-۵۰۲۔

(۲۴۴) حضرات خراش بن امیہ خزاعی کو انھیں احابیش نے بچایا تھا۔ حضرت عثمان بن عفان اُموی کو ان کے خاندان والے یعنی بنو امیہ کے سعیدی گھرانے ابان بن سعید بن العاص نے تحفظ دیا تھا، اور قریش نے اس تحفظ کا احترام کیا تھا۔ ملاحظہ ہو ابنِ اسحاق، ص ۵۰۳۔

(۲۴۵) ابنِ اسحاق، ص ۵۰۰ کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ قریش مسلمانوں کے مکہ میں بلا اجازت و اذن قریش داخل ہونے سے روکنا چاہتے تھے۔ گویا کہ وہ اپنے اقتدار و سیادت کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ اور حضرت خالد کے دستہ کو اسی لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو قریش کی اجازت کے بغیر اور زور زبردستی سے داخل ہونے سے روکے۔

(۲۴۶) ابنِ اسحاق، ص ۳-۵۰۲ - ۴۹۹۔ (۲۴۷) ابنِ اسحاق، ص ۵۰۱۔

(۲۴۸) ابن اسحاق، ص ۵۰۱۔ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۵۰۴ نے اس ضمن میں یہ کہہ دیا ہے کہ "قبیلہ خزاعہ نے اب تک اسلام نہیں قبول کیا تھا۔" یہ بیان کسی حد تک صحیح ہے کیونکہ بدیل بن ورقاء خزاعی کی سفارت کے سلسلہ میں ابن اسحاق ص ۵۰۱ کا بیان ہے کہ خزاعہ کے مسلمان اور مشرک دونوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے۔ یعنی خزاعہ کے لوگ اسلام لا چکے تھے۔ ملاحظہ کیجئے باب دوم بحث بر اسلام خزاعہ۔

(۲۴۹) ابن اسحاق، ص ۵۰۱۔ (۲۵۰) ابنِ اسحاق، ص ۳-۵۰۲۔

(۲۵۱) ابن اسحاق، ص ۵۰۳۔

(۲۵۲) ابن اسحاق کی روایت میں بیعتِ رضوان کو موت تک لڑنے یا جنگ سے نہ فرار ہونے کا عہد قرار دیا گیا ہے لیکن ابنِ ہشام نے یہ اضافہ کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان کی طرف سے بیعت لی تھی۔ ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۴-۵۰۳ اور ص ۷۶۹۔

(۲۵۳) سہیل عامری کو قریش نے صلح کا معاہدہ کرنے کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی تھی کہ مسلمان اس سال واپس جائیں تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ وہ مکہ میں زبردستی اور قریش کی مخالفت کے باوجود داخل ہوئے تھے۔ ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۵۰۴۔

(۲۵۴) حضرت عثمان بن عفان اموی کی سفارت کے ضمن میں ابن اسحاق ص ۵۰۳ نے "ابوسفیان اور دوسرے قریشی سرداروں" کا ذکر کیا ہے جن سے ان کو گفت وشنید کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ لیکن اس صلح کے سلسلہ میں انھوں نے خاص کر ابوسفیان نے کیا کردار ادا کیا تھا ماخذ عام طور پر اس نکتے سے بحث نہیں کرتے۔ ہمارے جدید مورخین نے عام طور سے ابوسفیان کو اس موقعہ پر مکہ سے غیر حاضر تصور کر لیا ہے۔ مونٹگمری واٹ، ص ۵۹ کو ان کی مکہ میں موجودگی یا غیر موجودگی کا یقین نہیں ہے تاہم ان کا خیال ہے جو صحیح ہے کہ وہ صلح و امن حدیبیہ یا صلح کی پالیسی کے حامی تھے۔

قیاس کہتا ہے اور اس کی تائید ماخذ میں مذکور کئی واقعات سے ہوتی ہے جو ابوسفیان کے کردار پر روشنی ڈالتی ہے کہ ابوسفیان بن حرب مکہ میں اس صلح کے وقت نہ صرف موجود تھے بلکہ اس میں انھوں نے کافی فعال اور مثبت حصہ لیا تھا۔ قریشی قائدین میں جو لوگ مدینہ سے مفاہمت کی پالیسی کے حق میں تھے ان میں ابوسفیان سرِفہرست نظر آتے ہیں۔

(۲۵۵) حضرت عمرو بن عاص سہمی سے کسی نے پوچھا کہ آپ اتنے ذہین و فطین اور معاملہ فہم تھے پھر بھی اتنی دیر سے اسلام لائے، ایسا کیوں؟ انھوں نے جواب دیا: "ہم ایسے لوگوں (قوم) کے سایہ میں تھے جو بزرگ اور عمر دراز تھے اور جن کی عقلیں پہاڑوں جیسی بلند تھیں۔ وہ جس وادی میں بھی گئے ہم ان کے پیرو رہے اور ہم نے اس راستہ کو آسان پایا۔ چنانچہ جب انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا تو ہم نے بھی بلا سوچے سمجھے انکار کر دیا اور ان ہی کے نقشِ قدم پر چلتے رہے۔ لیکن جب وہ چلے گئے اور معاملہ ہمارے ہاتھوں میں آیا تو ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں غور کیا اور وہ بالکل صاف اور واضح تھا۔ بس میرے دل میں اسلام جم گیا۔" ملاحظہ ہو زبیری، ص ۱۱-۴۱۰۔

(۲۵۶) بحث و مباحثہ معاہدہ کی شرائط کے علاوہ متن میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" اور "محمد رسول اللہ" لکھے جانے پر ہوا تھا۔ قریش کے نمائندے کو دونوں پر اعتراض تھا چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کاتبِ معاہدہ سے قریش کی مرضی کے مطابق "باسمک اللهم" اور "محمد بن عبد اللہ" لکھوایا۔ ملاحظہ ہو: ابنِ اسحاق، ص ۵۰۴۔ ابن اسحاق نے حضرت علی کے اس فقرہ کا حوالہ نہیں دیا ہے جس کے مطابق انھوں نے اپنے ہاتھ سے محمد رسول اللہ کو مٹانے سے انکار کر دیا تھا۔ شبلی نے (سیرت النبی اول، ص ۴۵۵) اس واقعہ کو بخاری، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء نیز

مسلم، ایضاً کی بنیاد پر بڑے طمطراق سے نقل کیا ہے۔

(۲۵۷) ابن اسحاق، ص ۵۰۴؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۴۵۶؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۴۸۔ موخرالذکر کا خیال ہے کہ موجودہ متن معاہدہ حدیبیہ اصل متن نہیں ہے کیونکہ اس میں صیغے اچانک تبدیل ہوتے ہیں لیکن بہرحال وہ اصل متن کی شرائط ہی کو دوسرے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ متن کے لیے نیز ملاحظہ کیجئے؛ محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق، ص ۱۴-۱۳۔

(۲۵۸) حوالہ جات سابق

(۲۵۹) ابن اسحاق، ص ۵۰۰۔ نیز ملاحظہ کیجئے؛ بخاری، کتاب الشروط؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۶۰-۴۵۹؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۵۲-۵۱۔

(۲۶۰) باب دوم، بحث بر اسلام قبائلِ عرب۔

(۲۶۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے باب دوم، اسلامِ قریش۔

(۲۶۲) ابن اسحاق، ص ۰۱-۵۰۷؛ ابنِ سعد، چہارم، باب دوم۔ ایضاً۔ حضرات خالد اور عمرو بن العاص کے اسلام کی اس زمانے میں قبولیت کی شہرت عام ہے لیکن فرزندانِ ابوسفیان کو عموماً ہمارے مورخین فتح مکہ کا مسلمان بتاتے ہیں۔ اس کے متعدد اسباب ہیں جن سے یہاں بحث نہیں۔ تاہم مآخذ کی چھان پھٹک سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ بھی صلح حدیبیہ کے بعد ہی اسلام لے آئے تھے۔ تفصیلات کے لیے دیکھئے باب دوم، بحث بر اسلام قریش۔ ملاحظہ کیجئے: شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۶۷، ۴ اور ۵۴۳۔ جو حضرات معاویہ اور یزید کو فتح مکہ کا مسلمان قرار دیتے ہیں اور اپنے دعویٰ کی دلیل عام سیرت کے مآخذ سے لاتے ہیں اور اسی بنا پر مسند احمد بن حنبل جلد ۴، ص ۷۰ کی ایک حدیث کو جس کے مطابق حضرت معاویہ نے نامۂ نبوی کے جواب میں آنے والے ہرقل کے خط کو ۸ھ میں کسی وقت پڑھا تھا، غیر صحیح قرار دیتے ہیں۔ لیکن سید سلیمان ندوی نے اپنے استدراک ص ۶۷، ۴ حاشیہ ۱ میں ابن حجر کی فتح الباری جلد ۸، ص ۹۰ اور زرقانی کی المواہب اللدنیہ جلد ۳ ص ۸۸ کی بنیاد پر اس حدیث کو غزوۂ تبوک کا واقعہ قرار دیتے ہوئے صحیح قرار دیتے ہیں اور حضرت معاویہ کو "صلح حدیبیہ یا فتح مکہ کا مسلمان" سمجھا ہے۔ سید صاحب موصوفؒ نے مزید حوالہ ابو عبید قاسم بن سلام، کتاب الاموال، مصر، ص ۲۵۵ کا بھی دیا ہے۔ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۳، بھی ان کے فتح مکہ کے دن مسلمان ہونے کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے مسلمانوں کے لیے دیکھیے، ص ۶۰، ۵۹۔

(۲۶۳) تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجئے ابواب سوم، چہارم، پنجم۔

(۲۶۴) ابن اسحاق، ص ۱۰-۵۱۸؛ واقدی ص ۹۳-۶۳۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۰۶-۱۰۱؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۵۲؛ طبری، سوم، ص ۱۶-۹۔ نیز ملاحظہ ہو بخاری اور مسلم، غزوۂ خیبر؛ بلاذری، فتوح البلدان ص ۴۲-۲۶۔ انتظامی تفصیلات کے لیے دیکھیے باب چہارم و پنجم۔ جدید مورخین میں دیکھئے شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول،

ص ۵۰۲-۴۸۰ ؛ واٹ ، محمد ایٹ مدینہ ، ص ۱۸-۲۱۷ ۔

(۲۶۵) ابن اسحاق ، ص ۵۲۳ ؛ واقدی ، ص ۷-۷۰۶ ؛ ابنِ سعد دوم ، ص ۱۴-۱۱۳ ؛ انساب الاشراف ، اول ص ۳۵۲ ؛ فتوح البلدان ، ص ۴۷-۴۲ ؛ طبری ، سوم ، ص ۱۵۶ اور ص ۲۰ ۔

(۲۶۶) ابنِ اسحاق ، ص ۵۱۶ ؛ واقدی ، ص ۱۱-۷۰۹ ؛ ابن سعد ، دوم ، ص ۱۵-۱۱۴ ؛ انساب الاشراف ، اول ص ۳۵۲ ؛ طبری ، سوم ، ص ۱۶ ؛ نیز ملاحظہ ہو فتوح البلدان ، ص ۴۸-۴۷ ۔

(۲۶۷) واقدی ، ص ۷۱۱ ؛ فتوح البلدان ، ص ۴۸ ۔

(۲۶۸) ان تین یہودی بستیوں سے معاہدات نبوی کا سب سے اچھا بیان بلاذری کی فتوح البلدان میں ملتا ہے ۔ جس کے مطابق یہود فدک اور وادی القریٰ نے اپنی پیداوار کا نصف دینے کا معاہدہ کیا تھا جبکہ یہود تیما پر جزیہ عائد کیا گیا تھا ۔ اغلب خیال یہ ہے کہ یہ جزیہ اپنے اصطلاحی معروف معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ اس سے مراد عام ٹیکس ہے جو بصورت خراج دوسری یہودی بستیوں سے لیا گیا تھا ۔ اس استنباط کی تائید بلاذری کا وہ جملہ کرتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اس طرح وہ لوگ اپنے علاقہ میں بحال رہے اور ان کی اراضی انھیں کے قبضے میں رہیں ۔" یہ بھی ممکن ہے کہ صلح کے نتیجے میں ان سے پچاس فیصد خراج نہ لیا گیا ہو ۔ ملاحظہ کیجئے ؛ مونٹگمری واٹ ، محمد ایٹ مدینہ ، ص ۲۱۸ جو اس کو جزیہ کے اصطلاحی معنوں میں مراد لیتے ہیں ۔

(۲۶۹) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے باب چہارم اور پنجم ۔

(۲۷۰) سفارت ہائے نبوی کی تفصیلات دیکھئے باب چہارم بحث بر سفیران نبوی

مونٹگمری واٹ ، محمد ایٹ مدینہ ، ص ۱۱۳ ' کا خیال ہے کہ ان نبوی سفارتوں کے بیانات میں سے بیشتر کو مسترد کر دینا چاہیے کیونکہ وہ نامہ ہائے نبوی جن میں اسلام کو قبول کرنے کی دعوت شاہانِ روم و بصری وایران وغیرہ کو دی گئی تھی بعد کی تحریریں ہیں جو جعلی ہیں اور گھڑ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام منسوب کر دی گئی ہیں ۔ مورخ موصوف نے ان کے مسترد کرنے کے اسباب و علل سے بحث نہیں کی ہے ۔ جیسے کہ پہلے ذکر آچکا ہے واٹ اور ان کے پیشرو اور ہم عصر مغربی مورخین عیسائی بادشاہوں اور سلاطین کے نام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین و خطوط بھیجے جانے کے اس لیے منکر ہیں کہ اس سے ان کے بنیادی معتقدات و نظریات پر زد پڑتی ہے ۔ مستشرقین بلا استثنائیہ ثابت کرنے کی کوشش اب یہ کرتے ہیں کہ اسلام ایک عربی دین تھا اور آپ کا پیغام صرف عربوں کے لیے تھا ۔ وہ عالمی مذہب نہ تھا اور نہ آپ آفاقی رسول ۔ بہر حال تاریخی تحقیقات نے ان خطوط و فرامین کی اصلیت وسچائی ثابت کر دی ہے ۔ ملاحظہ ہو محمد حمید اللہ ، مجموعۃ الوثائق ، ص ۴۰-۲۱ و ۵۲-۴۹ وغیرہ ؛ محمد رسول اللہ ، مذکورہ بالا ، ص ۱۵-۶۰۵ ۔

(۲۷۱) ابنِ اسحاق ، ص ۵۰۰ کے مطابق آپ نے ان سے فرمایا تھا "جاؤ ، خدا تم کو راحت دے گا اور تمہاری نجات کا راستہ ضرور نکالے گا ۔" اور حضرت ابوجندل اپنے کافر و مشرک باپ سہیل بن عمرو عامری کی قید میں دوسرے مکی مسلمانوں کی طرح ظلم وستم اٹھانے کے لیے چلے گئے تھے ۔ حضرت ابوجندل صلح حدیبیہ کے لکھے جانے سے قبل بیڑیوں میں جکڑے

مسلمانوں میں پہنچ گئے تھے مگر معاہدہ کی رُو سے ان کو دل پر جبر کر کے واپس کرنا پڑا تھا۔ اور حضرت عمر اسی پر بے تاب ہو گئے تھے۔

(۲۷۲) ابن اسحاق، ص ۵۰۷-۸ کے مطابق حضرت ابو بصیر کا واقعہ یہ ہے کہ وہ بھی مکہ کے مسلمان گرفتاران بلا میں سے ایک تھے لیکن وہ کسی طرح مکہ سے نکل بھاگے اور مدینہ پہنچے۔ ازہر بن عبد عوف اور اخنس بن شریق نے بنو عامر بن لوی کے ایک شخص اور ایک آزاد غلام کو خط دے کر خدمت نبوی میں بھیجا اور ان کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ معاہدہ سے مجبور ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس مکہ جانے کا حکم دیا اور تشفی دی کہ "خدا ان جیسے مجبوروں اور بے کسوں کی نجات کی کوئی سبیل نکالے گا"۔ اور ان کے احتجاج کے باوجود ان کو مکہ والوں کے حوالے کر دیا۔ ذوالحلیفہ پہنچ کر حضرت ابو بصیر نے عامری کی تلوار کی تیزی اور کاٹ کی تعریف کی اور اس پر ترکیب سے قبضہ کر لیا۔ اور پھر ایک ہی وار میں عامری کا سر تن سے جُدا تھا اور آزاد کردہ غلام لرزاں و ترساں مدینہ خدمت نبوی میں پہنچا اور اس کے پیچھے پیچھے حضرت ابو بصیر بھی۔ رسالت مآب کی سرزنش کہ "تم نے جنگ بھڑکا دی ہوتی اگر اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہوتے" سے حضرت ابو بصیر نے سمجھ لیا کہ وہ پھر مکہ واپس بھیجے جائیں گے چنانچہ وہ یہ کہہ کر کہ "آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا مگر میں نے اپنی حفاظت خود کر لی"۔ چپکے سے العیص کے علاقے کی طرف نکل گئے اور وہیں شاہراہ تجارت کے قریب پڑاؤ ڈال دیا جس سے مکی کارواں شام کو جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ مکی مسلمانان ابتلاء بھی مکہ سے نکلتے اور حضرت ابو بصیر کے پاس جمع ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ ان کی تعداد ستر کے قریب ہو گئی۔ انھوں نے قریشی کاروانوں کو اتنا پریشان کیا کہ خود قریشِ مکہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو مدینہ واپس بلا لینے کی درخواست کی۔ اور اس طرح معاہدہ حدیبیہ کی وُہ شرط جو مُسلمانوں پر انتہائی شاق گزری تھی کالعدم قرار پائی۔

مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۵۹ نے حضرت ابو بصیر کے قیام العیص کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صرفِ نظر یا باقاعدہ حوصلہ افزائی کا نتیجہ قرار دیا ہے اور بلا شبہ یہ تاثر ابن اسحاق کے ایک جملہ سے ملتا ہے۔ تاہم دو اہم تر سوال پیدا ہوتے ہیں جن سے واٹ نے بحث نہیں کی ہے۔ اول یہ کہ مکی سرداروں نے ابو بصیر کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہیں کی تھی یا دوسرے یہ کہ انھوں نے دیت کا مطالبہ کیوں نہیں کیا تھا؛ ابنِ اسحاق ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ عامری مقتول کے خون بہا کو حاصل کرنے کی کوشش خود سہیل بن عمرو نے کی تھی مگر غالباً اس کو مکہ کے سرداروں خصوصاً ابو سفیان بن حرب کا تعاون و حمایت نہیں ملی تھی۔ دُوسرے یہ کہ قانوناً مکہ والے دیت کا یا حضرت ابو بصیر کی واپسی کا مطالبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں کر سکتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مکہ کے ستر مسلمان جو عیص میں اس طرح قریشی کاروانوں کے لئے بلائے ناگہانی و بے درماں بن گئے تھے سب کے سب قدیم گرفتار شدہ یا مقید مکی نہیں تھے۔ زیادہ تر ایسے رہے ہوں گے جو اسی زمانے میں مسلمان ہُوئے اور چونکہ ان کو خوف تھا کہ ان کے رشتہ دار ان کی واپسی کا مطالبہ کریں گے اس لیے انھوں نے مدینہ کے بجائے ہجرت عیص کو کی۔ چونکہ اسی زمانے میں مکہ کے بعض سربرآوردہ اور عظیم خاندانوں کے افراد نے بھی اسلام قبول کر کے مدینہ کی راہ لی تھی اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکہ والوں نے معاہدہ حدیبیہ کی اس شق کو کالعدم کرنا ہی مناسب سمجھا تھا کیونکہ مکہ کے کس کس فرد کو وہ اسلام سے روکتے یا مدینہ سے واپس بلاتے۔ نیز ملاحظہ فرمائیے: واقدی، ص ۶۲۴-۲۹؛

طبری، دوم، ص ۳۹ - ۶۳۸ -

(۲۷۲) حضرت ام کلثوم اموی کا اسلام اور ان کی مہاجرت اسلام کی اثر پذیری کی ایک عمدہ مثال ہے۔ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن عقبہ بن ابی معیط کی بیٹی تھیں۔ حدیبیہ کے زمانے میں وہ مسلمان ہوئیں یا اس سے قبل مسلمان ہو چکی تھیں مگر اسی زمانے میں انھوں نے یکہ و تنہا مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی۔ مکہ سے باہر نکلی ہی تھیں کہ ایک عرب مکی مل گیا جس کی غیرت و حمیت نے ایک عورت کو تنہا سفر کرنے دینے کی اجازت نہ دی اور وہ ان کو بصد عزت و احترام مدینہ پہنچا کر واپس مکہ چلا گیا۔ ان کے گھر والوں کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے ان کے دو بھائیوں ولید بن عقبہ اور عمارہ بن عقبہ کو واپس لانے کے لیے مدینہ بھیجا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ حجرات میں حکم خداوندی کے مطابق مومن و مہاجر عورتوں کو کافروں میں واپس کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے بھائی ناکام مکہ لوٹ گئے۔ اس طرح اس شق کا ایک حصہ گویا کالعدم ہوا۔ مگر اس سے زیادہ حیرت انگیز ہے مکی رد عمل۔ مآخذ سے کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ اس شق کے سلسلے میں انہوں نے کوئی احتجاج کیا ہو جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود مکیوں کو بھی اس شق کے کم از کم غیر انسانی ہونے کا احساس تھا اور اسی لیے اس پر انھوں نے مزید احتجاج بے سود سمجھا۔ ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۵۰۹-۱۰؛ واقدی، ص ۶۲۹-۳۰؛ زبیری، ص ۱۴۵؛ ابن سعد، ہشتم، ص ۲۳۰-۳۱؛ ابن حزم، جوامع السیرہ (مصر غیر مورخہ) ص ۲۱۱؛ ابن اثیر، الکامل، بیروت ۱۹۶۵ء، اول، ص ۲۰۶۔ تفصیلات کے لیے دیکھئے خاکسار کی کتاب "حضرت ولید بن عقبہ اموی ـــــ حیات و شخصیت" (زیر طبع) باب اول۔

(۲۷۳) یعنی معاہدہ کی دوسری شرط۔

(۲۷۴) حضرت عمر بن خطاب کا سریہ تربہ جو محض تیس سپاہیوں پر مشتمل تھا اور شعبان ۷ھ / دسمبر ۶۲۸ء میں بھیجا گیا تھا۔ اور جس کی حیثیت محض ایک گشتی دستے سے زیادہ نہ تھی۔ ملاحظہ کیجئے ابن ہشام، دوم، ص ۶۰۹؛ واقدی، ص ۷۲۲؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۱۷؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۹؛ اور طبری، سوم، ص ۲۲۔ بلاذری کے مطابق مفرورین کا تعلق بنو جشم بن معاویہ بن بکر، بنو نصر بن معاویہ بن بکر، سعد بن بکر اور ثقیف بن علبہ بن بکر بن ہوازن سے تھا۔ ان کو عجز ہوازن کہا جاتا تھا جو دراصل ہوازن کی تلچھٹ تھے (لسان العرب، لفظ عجز)۔ ابن سعد، دوم، ص ۱۱۷ کے مطابق تربہ ایک مقام کا نام تھا جو عبلاء کے نواح میں مکہ سے چار دن کی مسافت پر صنعاء اور نجران کو جانے والی شاہراہ پر واقع تھا۔

(۲۷۵) حضرت ابوبکر صدیق اسی زمانے میں نجد کے علاقے ذریہ کی جانب ایک گشتی دستہ لے کر گئے تھے۔ ملاحظہ ہو ابن سعد، دوم، ص ۱۱۷-۱۸؛ واقدی، ص ۷۲۲؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۹؛ طبری، دوم، ص ۶۴۳؛ بخاری، کتاب المغازی۔

(۲۷۶) حضرت شجاع بن وہب اسدی کا سریہ بنو عامر بن ہوازن کے خلاف ربیع الاول ۸ھ / جولائی ۶۲۹ء میں۔ ابن سعد کے مطابق یہ علاقہ معدن سے پرے رکبہ کے نواح میں مدینہ سے پانچ راتوں کی مسافت پر واقع تھا۔

ملاحظہ ہو ابنِ سعد، دوم، ص ۱۲۷؛ واقدی، ص ۵۲-۵۷؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۸۰؛ طبری، سوم، ص ۲۹۔

(۲۷۷) ابنِ ہشام، دوم، ص ۶۱۱-۶۱۲؛ واقدی، ص ۲۳، ۷؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲۰؛ طبری، سوم، ص ۲۲۔

(۲۷۸) ابن ہشام، دوم، ص ۶۲۲؛ واقدی، ۲۶-۲۳، ۷؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲۶؛ طبری، سوم، ص ۲۲۔

(۲۷۹) ابن ہشام، دوم، ص ۶۱۱-۶۱۲؛ واقدی، ص ۳۱-۲۷؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۱۲۰؛ طبری، سوم، ص ۲۳۔

(۲۸۰) ملاحظہ کیجئے ضمیمہ اول-۱- امراء سرایائے نبوی (۲۸۱) ایضاً

(۲۸۲) ابن ہشام، دوم، ص ۶۲۱؛ واقدی، ص ۵۲-۲، ۷؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۲۸-۲۷؛ طبری، سوم، ص ۲۹؛ مونٹگری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۱۰ نے اس مہم کی نوعیت کو نہیں سمجھا ہے۔

(۲۸۳) ابنِ اسحاق، ص ۵۳۱-۹؛ ابنِ ہشام، ص ۳۵۹ اور ۳۷۱ اور ۶۲۱؛ واقدی، ص ۵۵-۶۹، ۷؛ ابن سعد، دوم، ص ۲۸-۳۰؛ طبری، سوم، ص ۳۶-۴۲؛ بخاری، باب فی الجنائز، کتاب المغازی، غزوہ موتہ۔ نیز ضمیمہ اول-۱-

اس مہم کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یکے بعد دیگرے تین سالار بیک وقت نامزد فرمائے تھے۔ اول حضرت زید بن حارثہ تھے اور ان کی شہادت کی صورت میں حضرت جعفر بن ابی طالب کو امارت سنبھالنی تھی اور ان کی شہادت کی صورت میں حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجی کو۔ اتفاق یہ کہ تینوں امیران سریہ یکے بعد دیگرے شہید ہوئے اور مسلمانوں کو اپنے سے کئی گنا زیادہ رومی لشکر کے سامنے پسپا ہونا پڑا۔ حضرت خالد بن ولید مخزومی نے اس مہم میں جو فوجی کارنامہ انجام دیا اس پر اور اس کے علاوہ دوسری تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجئے باب سوم، بحث بر امیرانِ سرایا۔

مونٹگری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۳-۴ پر غزوہ موتہ کو نہ صرف "پراسرار شمالی پالیسی" کا حصہ بتایا ہے بلکہ اس کو بجائے خود "سربستہ راز" قرار دیا ہے۔ واٹ کو خود اعتراف ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار پر مشتمل اسلامی لشکر کو موتہ کے علاقے میں اس لیے بھیجا تھا کہ سفیر نبوی حضرت حارث بن عمیر ازدی کے قتل کا قصاص لینے کے لیے بصریٰ کے حاکم شرحبیل بن عمرو غسانی کے خلاف بھیجا تھا۔ معان میں مسلم سالاروں کو ایک بازنطینی لشکر جرار جس میں شمالی سرحد کے متعدد قبائل بھی شامل ہو گئے تھے کے آنے کی خبر مل گئی تھی لیکن پھر بھی انھوں نے دشمن کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور موتہ جا پہنچے جہاں یہ عظیم معرکہ برپا ہوا۔ بہرحال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نامزد کردہ تینوں سالاروں کی شہادت کے بعد حضرت ثابت بن اقرم اور حضرت خالد بن ولید مخزومی نے منتشر مسلم لشکر کو از سرِ نو ترتیب و تنظیم دے کر مقابلہ کیا اور کچھ مزید مقابلے کے بعد مسلم سپاہ پسپا ہو گئی۔ ایک روایت کے مطابق مسلم لشکر نے بازنطینی لشکر کو فرار پر مجبور کر دیا۔

اس قدر اعتراف کرنے کے بعد یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ واٹ کو اس غزوہ میں کیا "راز" یا "عقدہ" نظر آتا ہے؛ واٹ موتہ کے قصے کو بہت زیادہ گھڑا ہوا سمجھتے ہیں اور اس میں متعدد تضادات اور الجھنیں پاتے ہیں۔ چنانچہ ان کا سب سے بڑا شبہ و اعتراض یہ ہے کہ یہ سارا قصہ حضرت خالد کو مطعون کرنے کے لیے گھڑا گیا ہے۔ اور حضرت زید

جعفر اور عبداللہ کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے نامزدگی بھی اس بنا پر گھڑی گئی ہے کہ حضرت خالد کو بلا اجازت نبوی یا غیر قانونی طور پر قیادت و کمان سنبھالنے کا مجرم قرار دیا جائے۔ پھر حضرت ثابت بن اقرم نے حضرت خالد کو کمان سنبھالنے پر جو اصرار کیا تھا اس کو مستشرق موصوف حضرت خالد کو مطعون کرنے والی روایت کا تریاق یا ردِّ عمل بتاتے ہیں۔ پھر حضرت خالد کے مدینہ پہنچنے پر مدینہ کے کچھ لوگوں نے ان پر اور مسلم لشکر پر کنکریاں پھینکیں، برا بھلا کہا اور بزدلی کے طعنے دئے تھے۔ اس کو بھی وہ حضرت خالد کے مدینہ واپس آنے کے فیصلے کو ہدفِ ملامت بنانے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ مورخ موصوف بازنطینی لشکر کے ایک لاکھ سپاہ پر مشتمل ہونے کی روایت کو حضرت خالد کے دفاع میں گھڑی جانے والی روایت تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت خالد کے خلاف منافرت اور دوسرے امراء یا ایک خاندان کے امیر کی تعریف و توصیف کے مبالغہ کو نکالنے کے بعد صرف تین نکات یقینی طور پر ان کے نزدیک رہ جاتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں:

۱۔ دشمن سے کچھ تصادم۔

۲۔ حضرات زید، جعفر، عبداللہ وغیرہ سمیت کچھ لوگوں کی شہادت (زیادہ مسلمان شہید نہیں ہوئے تھے)۔ اور

۳۔ مسلم لشکر کا حضرت خالد کی کمان میں مدینہ واپس ہونا۔

باقی نکات کو وہ غیر یقینی اور راز سربستہ سمجھتے ہیں اور معدودے چند مسلم مقتولوں کی تعداد کے پیش نظر ان کا خیال ہے کہ تصادم پوری بازنطینی فوج کے بجائے صرف اس کے ایک حصہ سے ہوا ہوگا۔ ورنہ کسی بڑے تصادم کی صورت میں مسلمان مقتولین کی تعداد آٹھ یا بارہ سے جیسا کہ واقدی اور ابن ہشام کے بیان سے بالترتیب معلوم ہوتا ہے کہیں زیادہ ہونی چاہیے تھی۔ اس لیے یہ محض معمولی جھڑپ تھی۔ موصوف کو ایسی معمولی جھڑپ میں فوج کے سالارِ اعلیٰ اور ان کے دو عظیم ترین رفقاء کی شہادت بھی ناقابلِ تصور معلوم ہوتی ہے اگرچہ وہ عرب انداز و طریق جنگ میں ایسا ہونا ناممکن بھی نہیں سمجھتے۔ ممکن ہے کہ اس جھڑپ میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا ہو ورنہ مسلمانوں کا نقصان بہت زیادہ ہوا ہوتا۔ واٹ نے مسلم لشکر کی مدینہ واپسی کا سبب نہ دشمن کا خطرہ سمجھا ہے نہ بزدلی کو بلکہ مرکز سے زیادہ دنوں تک غیر حاضری کو اور کسی حد تک ممکن ہے کہ حضرت خالد کی مہم کے صحیح مقاصد سے لاعلمی بھی اس کی ذمہ دار رہی ہو۔ موصوف کا خیال ہے کہ حضرت زید کو جو ہدایات نبوی ملی تھیں وہ بعد کی گھڑی ہوئی ہیں۔ بہر حال واٹ اس کے قائل ہیں کہ اس مہم سے مسلمانوں کی طاقت کا احترام بڑھا ہوگا، اگرچہ سالارِ اعلیٰ کے قتل کا بعض لوگوں پر برا اثر بھی پڑا ہوگا۔

غزوۂ موتہ کے بارے میں منٹگمری واٹ کی پوری بحث اندرونی تضادات سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں اس پورے بیان کا تنقیدی جائزہ لینا ممکن نہیں ہے تاہم چند اہم نکات کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اوّل: حضرت خالد بن ولید مخزومی کو مطعون کرنے کے لیے روایات گھڑنا اور پھر ان کے دفاع میں روایات اختراع کرنا ناقابلِ فہم ہے۔ ایک ہی قسم کی روایت میں یہ دونوں عناصر نہیں پائے جا سکتے۔ دوسرے یہ کہ تمام روایات

یہ ثابت کرتی ہیں کہ حضرت خالد کا انتخاب کمانداروں کی شہادت کے بعد خود مسلم فوج نے کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایسے کسی مرحلے پر جب پوری فوج کی زندگی معرضِ خطر میں ہو سالار کی قیادت کا انتخاب نہیں کیا جاتا بلکہ زندہ قومیں اور فوجیں خود ایسے افراد رکھتی ہیں جو کسی نازک مرحلے پر قیادت سنبھال لیتے ہیں۔ ماٰخذ سے کسی طرح یہ نہیں ثابت ہوتا کہ حضرت خالد کے اعلیٰ کمان سنبھالنے کو خود جناب رسالت مآب نے یا مدینہ کے مسلمانوں نے "غیر قانونی یا غیر دستوری" قرار دیا ہو بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف حضرت خالد کی فہم و فراست کی طرفداری کی تھی بلکہ ان کو سیف اللہ کا خطاب اسی موقعہ پر عطا فرمایا تھا۔ مدینہ کے لوگوں کا سخت ردِّ عمل محض حضرت خالد کے خلاف نہیں تھا بلکہ پوری فوج کا تھا اور یہ فطری جذبہ یا ردِّ عمل تھا جب ان کو معلوم ہوا کہ فوج نے فرار کی راہ اختیار کی تھی۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرار نہیں حکمت عملی سمجھا تھا اور آپ کے تبصرے نے ہی لوگوں کو مطمئن کیا تھا اور پوری فوج کو تسلی دی تھی۔ چنانچہ یہ کہنا کہ حضرات زید، جعفر اور عبداللہ کی نامزدگی کی کہانی گھڑی ہوئی ہے اور حضرت خالد کو مطعون کرنے کے لیے گھڑی گئی ہے بالکل صحیح نہیں ہے۔ دراصل مستشرقین میں سے اکثر و بیشتر اس خیال کے کہ ہمارے ماٰخذ حضرت خالد کے خلاف ہیں اس قدر حامی ہیں کہ ان کو ہر چیز میں حضرت خالد کی مخالفت نظر آنے لگتی ہے۔

دوم یہ کہ یہ معمولی جھڑپ تھی اور زیادہ سنگین معرکہ نہیں تھا محض اس لیے کہ مسلمان مقتولین کی تعداد بہت کم گنائی گئی ہے صحیح نہیں ہے۔ ابن اسحاق، ابن ہشام اور واقدی وغیرہ نے جن مسلمان شہدائے کے نام گنائے ہیں وہ اہم ترین لوگ تھے۔ پھر ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہی کل مقتولین کی تعداد نہیں تھی۔

سوم یہ کہ ممکن ہے کہ رومی فوج اتنی زیادہ نہ رہی ہو اور اس کی تعداد میں مبالغہ رہا ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ مسلم لشکر سے کئی گنا بڑی تھی اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی بے جگری نے یقیناً اچھا اثر ڈالا ہوگا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ اس کثیر تعداد نے مسلمانوں کی پسپائی کی صورت میں ان پر عقب سے حملہ کیوں نہیں کیا اور کیونکر ان کو میدان جنگ سے اس طرح پسپا ہونے دیا۔

چہارم یہ تصور کہ حضرت خالد جیسے شخص کو مہم کے مقصد کا علم نہ رہا ہو صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو نہ حضرت خالد کی شخصیت سے واقف ہو، نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ترتیب و تنظیم سرایا کی نوعیت سے نہ تاریخی عناصر و واقعات سے۔ اس سے بڑھ کر کور دیدہ ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ جہاں تک اس مہم میں لگنے والے وقت کا سوال ہے دو ماہ سے کم کی مدت لگی تھی۔

پنجم یہ کہ خود واٹ کو اعتراف ہے کہ اس مہم سے مسلمانوں کی قدر و منزلت بڑھی تھی اور فوجی حیثیت کو احترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا تھا۔ اب آخر میں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اس مہم میں کیا چیز سربستہ راز یا پُراسرار ہے؟

غزوۂ موتہ پر عمدہ بحث کے لیے دیکھئے سید سلیمان ندوی کا تبصرہ و حاشیہ سیرت النبی، اول، ص ۸-۵۰۷، حاشیہ ۴ جو انھوں نے بخاری، غزوہ موتہ کی بنیاد پر تحریر کیا ہے۔

(۲۸۴) ابن ہشام، دوم، ص ۶۲۳؛ واقدی، ص ۶۹۷ - ۷۰۴؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۱۲۱؛ طبری، دوم، ص ۲-۱۳۱؛ نیز ملاحظہ کیجیے اسد الغابہ، چہارم، ص ۱۸-۱۱۵۔

(۲۸۵) ایضاً (۲۸۶) ایضاً؛ نیز باب دوم، بحث بر اسلام قبائل متعلقہ۔

(۲۸۷) فتح مکہ کے حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے ابن اسحاق، ص ۵۶ - ۵۴۰؛ واقدی، ص ۷۸۰ - ۸۷۱؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۴۵ - ۱۳۴؛ انساب الاشراف؛ اوّل، ص ۳۶۴ - ۳۵۳؛ طبری، سوم، ص ۶۹-۴۲۔

(۲۸۸) ملاحظہ کیجیے باب چہارم، بحث بر والیانِ نبوی۔

(۲۸۹) ابن اسحاق، ص ۸۷، ۵۶۶؛ ابن ہشام، دوم، ص ۸۷ - ۶۷۷؛ واقدی، ص ۹۲۲ - ۸۸۵؛ ابن سعد، دوم، ص ۵۹ - ۱۴۹؛ انساب الاشراف، اوّل، ص ۶۶ - ۳۶۴؛ طبری، سوم، ص ۹۰ - ۷۰؛ نیز ملاحظہ کیجیے: بخاری، کتاب الجہاد، غزوہ حنین؛ مسلم، غزوہ حنین؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۴۰ - ۵۳۰، نے ابتدائی ہزیمت کی ذمہ داری سراسر مکہ کے نومسلموں پر جن کو عام طور سے 'طلقاء' کہا جاتا ہے، ڈالی ہے، یہ صحیح نہیں ہے۔ سید سلیمان ندوی نے بھی ص ۳۸-۵۴۴ پر اپنے حواشی میں انھیں طلقاء کو شکست کا پورا الزام دیا ہے اور کثرت سے مفسرین، محدثین اور راویوں کی آراء اپنے دلیل و دعویٰ کے ثابت کرنے میں نقل کی ہیں۔ لیکن تاریخی روایات سے واضح ہوتا ہے کہ جس نے پہلے پیٹھ دکھائی اور فرار حاصل کیا تھا وہ حضرت خالد کی کمان میں بنو سلیم کا شہسوار دستہ تھا جو نو سو یا کچھ زیادہ پر مشتمل تھا۔ ان کا فرار کسی بزدلی یا دون ہمتی یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے یا منافقت کے سبب نہ تھا جیسا کہ سید صاحب موصوف نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ بنیادی طور پر یہ جنگی اور تکنیکی ہزیمت تھی۔ چونکہ دشمن پہلے سے وادی کے دروں اور غاروں میں چھپ گیا تھا اور مسلم فوج کے مقدمہ پر اس نے اچانک تیر اندازی کرنی شروع کر دی تھی اس لیے ان کے قدم نہ ٹک سکے تھے۔ قرآن کریم کی آیات (سورہ توبہ ۴) واضح طور سے فرار کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر ڈالتی ہیں اور اس کو مسلمانوں کی نازش بے جا کا عمل مکافات قرار دیتی ہیں۔ قرآن مجید نے کسی ایک خاص طبقۂ مسلم کو اس کا ذمہ دار نہیں قرار دیا ہے۔ دوسری اہم چیز یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فرار کے لیے کسی کو بھی موردِ الزام قرار نہیں دیا تھا اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی فرد یا طبقہ کو خاص کیا تھا۔ اس لیے فرار کی ذمہ داری صرف طلقاء یا نومسلمانانِ مکہ پر ڈالنا نہ صرف صریح زیادتی ہے بلکہ قرآن کریم کی واضح آیات کے خلاف ہے۔ مسلمان مورخین، محدثین اور مفسرین کو دراصل مسلمانوں کی اور وہ عہد نبوی کے مسلمانوں کی شکست و ہزیمت شاق گزرتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے لیے صرف فتح بنی تھی۔ یہی رویہ یا طرزِ فکر ہے جس نے ہمیشہ ان کو ہر شکست کے موقع پر "قربانی کے بکرے" تلاش کرنے پر اکسایا ہے اور اسی بنا پر انھوں نے حنین کی ابتدائی شکست کا الزام طلقاء کے نام لکھ دیا ہے۔ اس سے پہلے اور اس سے زیادہ سنگین ہزیمت اُحد کے میدان میں ہو چکی تھی؛ وہاں نہ تو منافقین تھے، نہ غیر راسخ مسلمان نہ طلقاء۔ پھر کون ذمہ دار تھا؟

(۲۹۰) ابن اسحاق، ص ۵۹۲ کے مطابق چھ ہزار عورتیں اور بچے قیدی بنا لیے گئے تھے، اور بھیڑ بکری اور اونٹ کی تعداد

بے شمار تھی۔ واقدی، ص ۹۵۰ کا بیان ہے کہ ہوازن کے مسلمانوں کا ایک وفد جو ۲۴ آدمیوں پر مشتمل تھا خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا اور آپ کے لطف و کرم، عفو و حلم اور رحمت و رافت کا واسطہ دے کر "اپنی خالاؤں، پھوپھیوں اور رضاعی ماؤں، جنھوں نے آپ کی بچپن میں دیکھ بھال اور پرورش و پرداخت کی تھی، کو رہا کرنے کی درخواست کی" یہ اصل میں بنو سعد بن بکر کے قیدیوں کی جانب حوالہ تھا جو آپ کی رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہ کا گھرانا تھا۔ انھیں قیدیوں میں آپ کی رضاعی بہن شیماء بھی تھیں۔ وہ جب خدمت نبوی میں لائی گئیں تو آپ نے ان کو شناخت کر لیا اور ان کا اعزاز و اکرام کیا۔ دل کو چھو لینے والے مناظر، اپنے رضاعی رشتہ داروں کی حالت زار، قبیلۂ ہوازن کے مسلمانوں کی درد بھری درخواست اور ان سب سے بڑھ کر آپ کی فطری رحمت و رافت کا تقاضا تھا کہ ان قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے اپنے خاندان بنو عبدالمطلب کے حصہ آنے والے قیدیوں کو فوراً رہا کر دیا اور مسلمانوں سے اپنے اپنے قیدیوں کو رہا کرنے کی درخواست کی۔ آپ کا حکم اور مثال نے مسلمانوں کو قیدیوں کے رہا کرنے پر آمادہ کر دیا اور چند گھنٹوں میں تمام قیدی آزاد تھے۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر ہزارہا ہوازن کے لوگ مسلمان ہو گئے۔ ان واقعات و حقائق کے لیے ملاحظہ ہو: ابنِ اسحاق، ص ۹۴-۵۹۲؛ واقدی، ص ۵۴-۹۵۰؛ ابن سعد، دوم، ص ۵۴-۱۵۲؛ انساب الاشراف، اول، ص ۷-۳۶۶؛ طبری، سوم، ص ۸۶-۸۰؛ بخاری، غزوۂ حنین؛ مسلم، غزوۂ حنین؛ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، مذکورہ بالا۔

(۲۹۱) ہوازن کی شکست خوردہ فوج نے حنین سے بھاگ کر طائف میں پناہ لی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند دنوں کے محاصرہ کے بعد جعرانہ میں قیام کیا جہاں ثقیف کے ایک وفد نے صلح کی گفتگو کی تھی۔ ملاحظہ کیجئے: بلاذری، فتوح البلدان، ص ۷۰؛ نیز دیکھیے: ابنِ اسحاق، ص ۹۲-۵۸۷؛ واقدی، ص ۳۷-۹۲۲؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۰-۱۵۸؛ انساب الاشراف، اول، ص ۷-۳۶۶؛ طبری، سوم، ص ۸۵-۸۲۔ یہ تمام مورخین جعرانہ میں آنے والے ثقفی وفد کی آمد کا ذکر نہیں کرتے ہیں لیکن دوسری تفصیلات میں وہ بلاذری کے بیان کی تصدیق و تائید کرتے ہیں۔ طائف کی مہم کے لیے بخاری و مسلم وغیرہ کی کتب احادیث بھی ملاحظہ کیجئے۔

(۲۹۲) اصنامِ عرب کو توڑنے کے لیے جو مہمیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجی تھیں وہ حسب ذیل تھیں:

(ا) حضرت خالد بن ولید مخزومی نے تیس آدمیوں کی جماعت کے ساتھ نخلہ میں نصب عزّیٰ کا بت توڑا تھا۔

(ب) حضرت عمرو بن عاص سہمی نے بنو ہذیل کا بُت سواع جو ینبوع کے اطراف رباط میں تھا خاک میں ملایا تھا۔

(ج) حضرت سعد بن زید اوسی نے ازد، غسان، اوس و خزرج کے بت مناۃ کو مشلل میں جاکر توڑا تھا

(د) حضرت ابوسفیان بن حرب اموی اور مغیرہ بن شعبہ ثقفی نے لات کے بت کو توڑا اور اس کے مندر کو ڈھایا تھا۔

(ہ) حضرت طفیل بن عمرو دوسی نے اپنے قبیلہ کے بُت ذوالکفین کو توڑا تھا۔

(س) حضرت جریر بن عبداللہ بجلی نے اپنے قبیلہ کے بُت کو جو ذوالخلصہ میں نصب تھا شکست کیا تھا۔

ان کے علاوہ چھوٹی موٹی اور مہمیں بھی ممکن ہے بھیجی گئی ہوں۔ ان مہموں کے حوالوں اور مآخذ کے لیے ملاحظہ کیجئے ضمیمہ اول-۱؛

نیز دیکھیے، شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۲۹ - ۵۲۷؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۶۹۔

(۲۹۳) ابن اسحاق، ص ۶۲۸ وغیرہ؛ ابن سعد، اول، ص ۲۶۰ - ۲۹۱؛ طبری، سوم، ص ۱۱۹-۱۱۱؛ بخاری، وفود عرب کے مختلف ابواب جیسے وفد بنی تمیم، وفد بنی حنیفہ، وفد اہل نجران، قدوم الاشعریین وغیرہ۔ نیز ملاحظہ کیجئے: باب دوم، بحث بر وفود عرب۔

(۲۹۴) ابن سعد، اول، ص ۲۹۱ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا وفد عرب قبیلہ مزینہ کا تھا جو ۵ھ / ۶۲۶ء میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ وفود کی آمد اس سے بھی پہلے شروع ہو گئی ہو جیسا کہ بعض شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض بدوی قبائل کے وفود ہجرت کے فوراً بعد آنے لگے تھے۔ ابن اسحاق نے بعض وفود عرب کا ذکر مکی زمانے میں بھی کیا ہے ملاحظہ ہو: ص ۱۷۹، ۲۷۰، وغیرہ۔

(۲۹۵) طبقات، اول، ص ۲۶۰ - ۲۹۱ - وفود عرب کی تعداد ہر سیرت نگار و مورخ کے یہاں مختلف ہے۔ بعض مورخین صرف چند وفود کا ذکر کرتے ہیں اور بعض دوسرے کچھ بڑی تعداد کا۔ ابن سعد کی ذکر کردہ تعداد بھی آخری نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ عرب کا ہر قبیلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی وفاداری اور خلوص کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کا وفد مدینہ آیا۔ بقول ابن قیم کے مدینہ میں اتنے ہی وفد آئے جتنے کہ عرب کے قبیلے تھے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اتنے وفود عرب آئے جتنے کہ قبائل عرب اور ان کے بڑے آزاد خاندان تھے جو عملی لحاظ سے خود قبیلہ بن چکے تھے۔

مغربی مورخین اور سیرت نگار خاص طور سے مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۷۹، اور باب چہارم مکمل، اس خیال کے حامی ہیں کہ قبائل عرب کے اس سرعت کے ساتھ اور اتنی بڑی تعداد میں وفود عرب کی آمد میں مآخذ نے بہت مبالغہ کیا ہے لہذا وہ نہ تو یہ مانتے ہیں کہ تمام قبائل عرب نے عہد نبوی میں اسلام قبول کیا تھا اور نہ ہی اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی۔ بلکہ بہت سے قبائل عرب مدینہ کے خلاف تھے حتی کہ بہت سے ان قبائل نے جنھوں نے کسی نہ کسی وجہ سے اسلامی ریاست کی بالادستی قبول کر لی تھی۔ عہد نبوی کے اواخر اور عہد صدیقی کے اوائل میں مدینہ سے منحرف ہو گئے تھے اور ان کو طاقت کے ذریعہ اسلامی ریاست کا مطیع اور اسلام کا ماننے والا بنایا گیا تھا۔ اس خیال پر مزید بحث و تبصرہ کے لیے ملاحظہ کیجیے باب دوم — بحث بر اسلام قبائل عرب۔

(۲۹۶) تفصیلات کے لیے دیکھیے باب دوم — بحث بر اسلام قبائل عرب۔

(۲۹۷) مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدے بنو مدلج، بنو ضمرہ، جُہینہ، مُزینہ، اسلم و غفار وغیرہ سے، محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق، ص ۸۰ - ۱۵۱ وغیرہ؛ نثار احمد فاروقی، الرسالات النبویہ، نقوش، رسول نمبر جلد دوم، ص ۲۳۹، ۲۴۴ وغیرہ۔

(۲۹۸) مثلاً مقابلہ و موازنہ کیجیے رسالات نبوی کا جو قبائل عرب جیسے اہل یمن، ہجر، نجران وغیرہ سے کئے گئے۔ محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق، ص ۱۵۰ - ۵۶ وغیرہ؛ نثار احمد فاروقی، الرسالات النبویہ، مذکورہ بالا، ص ۳۲ - ۲۲۵ وغیرہ۔

(۲۹۹) واقدی، ص ۷۵۵؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۱۲۸؛ بخاری، غزوہ موتہ۔ موتہ کے لیے ملاحظہ کیجیے: معجم البلدان، چہارم، ص ۶۳۶؛ فلپ کے حتی، ہسٹری آف سیریا، لندن ۱۹۵۱ء، ص ۴۰۹ وغیرہ۔

(۳۰۰) ابنِ اسحاق، ص ۶۶۸-۹؛ ابنِ ہشام، دوم، ص ۶۲۳؛ واقدی، ص ۷۶۹-۷۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۳۱؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۸۰-۸۱؛ طبری سوم ص ۳۱-۳۲۔ یہ مہم سریہ ذات السلاسل کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ سلاسل نامی مقام مدینہ سے دس دن کی مسافت پر واقع ہے اور بلاذری کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اس علاقے میں بعض اہم شمالی قبائل جیسے بلی، عذرہ، لخم، جذام، قضاعہ اور عاملہ وغیرہ بستے تھے۔

اس مہم کے بارے میں جو تفصیلات ابن سعد نے فراہم کی ہیں وہ کافی اہم اور وقیع ہیں اور ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں اسلامی ریاست کا اقتدار کہاں تک وسیع ہو چکا تھا۔ ابن سعد کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کی روانگی سے قبل معمول کے مطابق حضرت عمرو بن عاص سہمی امیرِ سریہ کو ہدایات دیں۔ من جملہ ایک ہدایت یہ تھی کہ وہ جب قبائل بلی، عذرہ اور بلقین کے علاقے سے گزریں تو ان سے مدد و اعانت طلب کریں کیونکہ وہ حضرت عمرو بن عاص کی والدہ کے خاندان کے لوگ تھے اور اس طرح ان سے اعانت غیر متوقع نہ تھی۔ بہرحال اس مہم نے بلی کا علاقہ اپنے مکمل قابو میں کر لیا۔ اس کے بعد اس نے اس قبیلہ کے خطے سے گزرنا اور قبضہ کرنا شروع کر دیا حتی کہ وہ ان کے آخری سرے تک پہنچ گئی اور کسی قدر عذرہ اور بلقین کے علاقے پر بھی اقتدار قائم کر دیا۔ آخر میں ان کا مقابلہ شمالی عرب کے بعض دشمن اور مخالف قبائل کے ایک لشکر سے ہوا جو ایک ہلکی سی جھڑپ کے بعد پسپا ہو گئے۔ ان کو اس کے بعد ایک زبردست شکست ہوئی اور وہ منتشر ہو گئے۔ اس بیان سے کم از کم دو اہم نکات نکلتے ہیں۔ اوّل یہ کہ بلی، عذرہ اور بلقین کے قبائل میں مسلمانوں اور اسلامی ریاست کے کچھ ہمدرد اور متفقین موجود تھے جن سے فوجی امداد کی توقع کی گئی تھی۔ دوم یہ کہ یہ پورا علاقہ اسلامی ریاست کے زیرِ اثر کم سے کم آ گیا تھا اگرچہ اس پر اسلامی ریاست کا مکمل قبضہ نہیں ہوا تھا۔ اس حقیقت کی تائید ان تاریخی حقائق سے ہوتی ہے کہ جن کے مطابق بلی، عذرہ، جذام، سعد ہذیم، بہراء وغیرہ کے قبائل کے وفود پہلے ہی مدینہ آ چکے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دوستی اور تعاون کے معاہدے کر چکے تھے۔ ملاحظہ کیجیے ابن سعد، اول، ص ۳۲۹، ۳۲ اور ۵۵-۳۵۴ وغیرہ؛ مجموعۃ الوثائق، ص ۵۹-۶۴، ۱۵۱؛ مزید دیکھیے: مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۶-۱۰۶۔

(۳۰۱) تبوک سے پہلے اور سریہ ذات السلاسل کے بعد صرف دو مختصر اور غیر اہم سرایا بھیجے گئے تھے۔ ان میں سے ایک ابو قتادہ ربعی کا آٹھ نفری دستہ تھا جو بطن اضم کی طرف بھیجا گیا تھا۔ یہ مقام مدینہ سے تین برد کے فاصلے پر تھا۔ اور یہ ایک طلیعہ تھا جس کا مقصد مکہ والوں کو فتح مکہ کے منصوبے سے تاریکی میں رکھنا تھا۔ ملاحظہ کیجیے ابن سعد، دوم، ص ۱۳۳؛ واقدی، ص ۷۷۸-۸۰؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۸۱؛ طبری، سوم، ص ۳۵-۶۔ اور دوسرا حضرت عکاشہ بن محصن کا سریہ تھا جو تبوک سے قبل عذرہ اور بلی کے علاقے میں بھیجا گیا تھا۔ یہ بعض شرپسندوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے

کہ یہ ایک تبلیغی مشن تھا۔ ملاحظہ ہو ابن سعد، دوم، ص ۱۶۴۔

(۳۰۲) بلقاء، شام میں بازنطینی سلطنت کی ایک اہم سرحدی چوکی تھی۔ ملاحظہ ہو: معجم البلدان، اول، ص ۲۶۱؛ ابن اسحاق، ص ۱۰۳؛ حتی، تاریخ شام، مذکورہ بالا، ص ۴۰۳۔

(۳۰۳) واقدی، ص ۹۹۰؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۱۶۵؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۶۸؛ نیز ملاحظہ ہو: فتوح البلدان، ص ۱۷۔

(۳۰۴) واقدی، ص ۹۹۰ - ۹۸۹ کا بیان ہے کہ ساقطہ یا انباط (یعنی شامی تاجروں) کا مسلسل مدینہ آنا جانا ہوتا رہتا تھا۔ ان کے جزیرہ نمائے عرب بالخصوص مدینہ وغیرہ سے تجارتی تعلقات زمانۂ جاہلیت سے قائم تھے۔ ان کے اشیائے تجارت میں گیہوں کے عمدہ آٹے اور زیتون کے تیل وغیرہ شامل تھے جن کی مدینہ میں بہت مانگ تھی۔ ان لوگوں کے ذریعہ مسلمانوں کو شمالی سرحدوں پر ہونے والے اہم واقعات و حالات کی برابر اطلاع ملتی رہتی تھی۔ اس موقعہ پر بھی شمالی سرحد کے مدینہ دشمن قبائل اور بازنطینی سلطنت کی سازباز کی خبریں بھی پہلے پہل انھیں تاجروں کے ذریعہ مدینہ پہنچی تھیں۔ اس کے علاوہ اسلامی ریاست کو شمالی خطرہ کا بخوبی احساس تھا کیونکہ بازنطینی سلطنت اسلامی ریاست کی روز افزوں ترقی اور استحکام کو پسند نہیں کرتی تھی اور وہ اپنے ایشیائی مقبوضات خصوصاً شام و فلسطین کے علاقوں کے لیے اس کو ایک خطرہ تصور کرتی تھی۔ یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ بازنطینی سلطنت خاص کر جزیرہ نمائے عرب کے معاملات میں مداخلت کرتی رہی تھی اور اس زمانے میں اپنی قدیم حریف ایران کی ساسانی سلطنت سے نبرد آزما ہونے کا سبب فوری مداخلت نہیں کر سکتی تھی تاہم ۶۲۸-۲۹ء میں اس کو ذرا سا موقع ملا تو اس نے عرب کے معاملات کی طرف توجہ دینی ضروری سمجھی۔ اسلامی ریاست اور مسلمانوں کو اس خطرہ کا کس قدر احساس تھا، اس کا اندازہ بخاری کی ایک حدیث (کتاب العلم) سے بخوبی ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں ایلاء کا واقعہ مدینہ میں پیش آیا تھا۔ حضرت عمر کے ندیم حضرت عتبان بن مالک انصاری ایک دن حیران و پریشان آئے اور چلا کر حضرت عمر کو اطلاع دی کہ ایک اہم واقعہ ہو گیا۔ حضرت عمر کا پہلا ردِّ عمل یہ تھا: "کیا غسانیوں نے حملہ کر دیا؟" ملاحظہ کیجیے: مسلم، کتاب النکاح؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۵۵۳ خاص کر، ص ۶۲ - ۵۴ عام طور سے۔

(۳۰۵) ابن اسحاق، ص ۶۰۲ - ۹؛ واقدی، ص ۱۰۰۲ - ۱۶؛ ابنِ سعد، ص ۱۶۵ - ۶۶؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۶۸؛ فتوح البلدان، ص ۱۷؛ طبری، سوم، ص ۱۰۷ - ۸؛ بخاری اور مسلم، غزوۂ تبوک۔

واقدی اور ابن سعد کے مطابق مسلم سپاہ تیس ہزار مجاہدین اور دس ہزار گھوڑوں پر مشتمل تھی۔ بلاذری کا اضافہ یہ ہے کہ اس میں بارہ ہزار اونٹ بھی تھے۔

(۳۰۶) ابن اسحاق، ص ۶۰۷؛ واقدی، ص ۱۰۳۱؛ فتوح البلدان، ص ۱۷؛ طبری، سوم، ص ۱۰۸؛ مجموعۃ الوثائق، ص ۴۲۔

ان مآخذ کے مطابق شاہِ ایلہ یوحنا بن روبہ خدمت نبوی میں بذاتِ خود حاضر ہوا تھا اور اس نے اظہارِ وفاداری و استواری کے علاوہ آپ سے ایک معاہدہ بھی کیا تھا۔ واقدی کا بیان ہے کہ شاہِ ایلہ نے سالانہ تین سو دینار

بطور جزیہ اسلامی ریاست کو دینا منظور کیا تھا۔ یہ رقم اس کی چھوٹی سی مملکت کے تین سو کمانے کے لائق مردوں کی تعداد کی بنیاد پر مقرر کی گئی تھی۔ بلاذری نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ فی بالغ مرد ایک دینار جزیہ کے علاوہ ایلہ کے لوگوں پر یہ فرض بھی عائد کیا گیا تھا کہ وہ اپنے علاقے سے گزرنے والے مسلمانوں کی مہمان داری اور پاسداری بھی کریں گے۔ اس "فرض مزید" کی اور تائید اس نامۂ نبوی سے بھی ہوتی ہے جو کچھ مدت بعد شاہ و اشراف ایلہ کے نام مدینہ سے بھیجا گیا تھا۔ اس کے مطابق اہلِ ایلہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ حاکم حضرت حرملہ کو چار قاصدانِ نبوی کے لیے عمدہ قبائیں اور تین وسق گیہوں ادا کرنا تھا۔

(۳۰۷) واقدی، ص ۱۰۳۲؛ فتوح البلدان، ص ۱۷؛ مجموعۃ الوثائق، ص ۳۹ - ۳۶۔ بلاذری کے مطابق اہلِ مقنا پر سالانہ جزیہ جنس میں مقرر کیا گیا تھا جو ان کے پھلوں اور کپڑے اور ہتھیاروں کی پیداوار اور مچھلی کی یافت کا چوتھائی تھا۔

(۳۰۸) ابن اسحاق، ص ۶۰۷؛ واقدی، ص ۳۲ - ۱۰۳۱؛ فتوح البلدان، ص ۱۷؛ طبری، سوم، ص ۱۰۸؛ مجموعۃ الوثائق، ص ۳۵۔ ان دونوں مقامات کے یہودیوں کو ہر سال ماہِ رجب میں سو دینار فی آبادی اسلامی ریاست کو بطور جزیہ ادا کرنا تھا بعض دوسری روایات کے مطابق جزیہ کی رقم ایک ہزار دینار فی آبادی تھی۔ نیز ملاحظہ کیجئے: مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۶ - ۱۱۵۔

(۳۰۹) ابن اسحاق، ص ۸ - ۶۰۷؛ واقدی، ص ۳۰ - ۱۰۲۵؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۱۶۶؛ فتوح البلدان، ص ۷۴، ۷۲؛ طبری، سوم، ص ۹ - ۱۰۸؛ مجموعۃ الوثائق، ص ۶۸ - ۱۶۶۔ روایات کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید مخزومی کو ایک لشکر کے ساتھ دومۃ الجندل کی مملکت کے حکمراں اُکیدر بن عبد الملک کندی سکونی کے خلاف بھیجا۔ حضرت خالد نے ایک معمولی سی جھڑپ کے بعد شاہِ دُومہ کو گرفتار کر لیا اور اس سے جنگ کے خاتمہ پر دو ہزار اُونٹ، آٹھ سو گھوڑے، چار سو زرہ بکتر اور اتنے ہی نیزے وصول کیے۔ اس کے بعد عیسائی بادشاہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہاں اس نے ایک معاہدہ کیا جس کے مطابق اس نے سالانہ جزیہ ادا کرنے کا عہد کیا۔ ایک نامہ نبوی سے جو یقینی طور پر بعد کے زمانے کا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست نے مملکتِ دُومہ کی اراضی کی ملکیت کا اپنا حق جتایا تھا اور اُکیدر اور ان کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ کیونکہ اس نامۂ مبارک کے مطابق اب ان کو "اپنے اموال پر زکوٰۃ ادا کرنی تھی اور مقررہ اوقات پر نماز ادا کرنی تھی"۔ نیز ملاحظہ کیجئے مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۱۵، جنھوں نے ان نامہ ہائے نبوی کو نہ سمجھا ہے اور نہ صحیح طریقے سے پیش کیا ہے۔

(۳۱۰) ملاحظہ کیجئے باب چہارم، بحث بر والیانِ نبوی۔

(۳۱۱) ابن سعد، اوّل، ص ۳۲ - ۳۳۲ و ص ۴۰ - ۳۳۸ کے بیان کے مطابق اس زمانے میں شمالی عرب کے جو وفود مدینہ پہنچے تھے ان میں سلامان، غسان اور حارث بن کعب کے علاوہ بعض اور وفود قبائل تھے۔ نیز ملاحظہ کیجئے: مجموعۃ الوثائق، ص ۴۸-۴۲، ص ۵۹ - ۱۵۵، ص ۷۰ - ۱۶۸، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد خطوط و فرامین ہیں جو بعض اہم شمالی قبائل

جیسے جذام، سعد ہذیم، قضاعہ، عذرہ، کلب، لخم، بلی اور غسان وغیرہ کے اہم شیوخ اور افراد کے نام ہیں ان خطوط نبوی میں ان کے حاملین کو اسلامی ریاست یعنی خدا اور اس کے رسول کا "ذمّہ" عطا گیا ہے بشرطیکہ وہ صدقات مقررہ اور مفروضہ ادا کرتے رہیں اور اسلام کے دوسرے فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی نہ کریں۔ یہ بات بہرحال طے شدہ ہے کہ ان قبائل کے ان افراد و جماعتوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی اقتدار کو قبول کر لیا تھا۔ نیز ملاحظہ کیجئے: واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۰۵-۱۷؛ شمالی قبائل سے مزید تعلقات کے لیے دیکھئے باب دوم، متعلقہ بحث۔

(۲۱۲) یہ دونوں مہمیں حضرات قطبہ بن عامر اور ضحاک بن سفیان کلابی کی قیادت میں بالترتیب تبالہ اور قرطاء کے علاقوں میں بھیجی گئی تھیں ان دونوں مہموں میں عددی طاقت بیس نفر کے لگ بھگ تھی۔ پہلی مہم کے بارے میں بلاذری کا بیان ہے کہ تبالہ اور جرش کے لوگوں نے بلا کسی جنگ و جدال کے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ملاحظہ ہو فتوح البلدان، ص ۷۰؛ نیز دیکھیے واقدی، ص ۹۸۱-۹۸۳، ابن سعد، دوم، ص ۱۶۲-۱۶۳؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۸۲۔

(۲۱۳) واقدی، ص ۹۸۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۳؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۸۲؛ نیز دیکھیے ابن اسحاق، ص ۶۶۴ اور ابن ہشام، ص ۶۴۰ جن کے مطابق یہ مہم حضرت وقاص بن مجزز کا انتقام و قصاص لینے کے لیے گئی تھی جن کو ان غارتگروں نے مار ڈالا تھا۔

(۲۱۴) ابن ہشام، دوم، ص ۵۹۲؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۹؛ بخاری، کتاب المغازی؛ طبری، سوم، ص ۱۲۶-۱۲۸۔ طبری نے دو خطوط نقل کیے ہیں جو کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ پہلا خط حضرت خالد بن ولید کا ہے جو انھوں نے خدمت نبوی میں بھیجا تھا اور جس میں انھوں نے قبیلہ کے اسلام قبول کرنے کی خوشخبری دی تھی اور دوسرے حکم نبوی کی درخواست کی تھی۔ دوسرا نامہ نبوی تھا جو حضرت خالد کے خط کے جواب میں لکھا گیا تھا اور جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کے اہم کام کی بہت تحسین فرمائی تھی اور ان سے مسلمان ہونے والے قبیلہ کا ایک نمائندہ وفد مدینہ بھیجنے کا حکم دیا تھا جس کی انھوں نے فوری تعمیل کی تھی۔ مزید ملاحظہ کیجئے ابن سعد، اول، ص ۳۳۹-۳۴۰ جس کے مطابق بنو حارث بن کعب (نجران) کے وفد نے شوال سنہ ۱۰ھ / جنوری ۶۳۲ء میں بارگاہِ نبوی میں حاضری و زیارت کا شرف حاصل کیا تھا۔

(۲۱۵) ابنِ ہشام، دوم، ص ۶۴۱؛ واقدی، ص ۱۰۷۹-۱۰۸۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۹-۱۷۰؛ طبری، سوم، ص ۱۳۱-۱۳۲؛ بخاری، کتاب المغازی۔

(۲۱۶) فتوح البلدان، ص ۷۹-۸۰۔ بلاذری نے متعدد دوسری روایات بھی بیان کی ہیں جن سے اہل یمن کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی ریاست سے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

(۲۱۷) طبقات، اوّل، ص ۲۵۹-۲۹۱۔

باب دوم

(۱) شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۲۱۶۔

(۲) بنو ہاشم اور بنو امیہ کی رقابت پر ملاحظہ کیجئے خاکسار کا مضمون، برہان، دہلی جنوری ۱۹۸۰ء۔

(۳) اسلام کی مخالفت کرنے والوں میں قریش مکہ کے تمام خاندانوں کے بڑے بڑے شیوخ اور سردار شامل تھے۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۱۹ - ۱۱۸؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۲۰ - ۲۱۲؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۱۳۶ - ۱۰۰۔

(۴) ابن اسحاق، ص ۱۵ - ۱۱۱؛ انساب الاشراف، اول، ص ۱۱۲؛ ابن سعد، سوم، ص ۴۴۔

(۵) ابن اسحاق، ص ۱۸ - ۱۱۷، طبری، دوم، ص ۲۲ - ۳۱۹؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۲۱۰ - نیز ملاحظہ ہو: انساب الاشراف، اوّل، ص ۱۹ - ۱۱۸۔

(۶) صحیح بخاری، بحوالہ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۲۱۰ - نیز ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اوّل، ص ۲۱ - ۱۱۹؛ طبری، دوم، ص ۲۳ - ۳۲۲۔

(۷) ابن اسحاق، ص ۱۵ - ۱۱۱؛ طبری، دوم، ص ۱۰ - ۳۰۹؛ بلاذری، انساب الاشراف، اول، ص ۱۳ - ۱۱۲۔

(۸) شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۶ - ۲۰۵۔

(۹) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۸۶۔

(۱۰) زمانہ ماقبل اسلام میں بھی حضرت ابوبکر مکہ کے ممتاز و سربرآوردہ اشخاص میں شمار ہوتے تھے۔ وہ قریشی اشرافیہ کے ایک ممتاز رکن تھے۔ اس کے علاوہ انساب کی مہارت وقدرت کی وجہ سے وہ مرجع خلائق تھے۔ ان کی ذاتی خوبیاں بھی ان کی سماجی قدر و منزلت کا سبب تھیں۔ لہذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عہد اسلامی میں ان کو جو بلند و بالا مرتبہ ملا تھا اس کا اثر ان کے جاہلی زمانے پر پڑا تھا۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۱۱۵؛ ابن سعد، سوم، ص ۲ - ۱۷۱؛ بلاذری، انساب الاشراف، اول، ص ۱۲۳؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۲۰۶۔

(۱۱) ابن اسحاق، ص ۱۱۵؛ ابن سعد، سوم، ص ۵۵، ۱۰۲، ۱۲۴، ۱۳۹، ۲۱۵۔

(۱۲) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۸۷ - ۸۶ کا خیال ہے کہ چونکہ اسلام میں شرافت و نجابت کا معیار اسلام میں سبقت اور اس کی خدمات تھیں اس لیے بعض بعد کے مسلمانوں نے اپنے پیش روؤں کو سابقین اولین میں شمار کرنا ہی نہیں شروع کیا بلکہ اس کے لیے روایات گھڑیں۔ اسی وضع احتیاط کی بنا پر واٹ کا خیال ہے کہ چونکہ حضرات عثمان، زبیر، عبدالرحمٰن، سعد اور طلحہ حضرت عمر بن خطاب کی نامزد کردہ مجلس شوریٰ کے رکن تھے جو ان کے بعد خلیفہ ثالث کا انتخاب کرنے کے لئے مجاز بنائی گئی تھی اس لیے ان کے سبقتِ اسلام کے دعوے کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ بعض متاخر صحابہ کے لئے ان کے جانشینوں نے سبقت اسلام ثابت کرنے کے لیے جھوٹی روایات کا سہارا لیا ہے لیکن ان پانچ صحابہ کرام کے

اولین مسلمان ہونے کی روایات کو محض اس ظنی و قیاسی معیارِ تنقید پر نہیں مسترد کیا جاسکتا۔

(۱۳) ابنِ ہشام، سوم، ص ۲۰۳؛ ابن سعد، چہارم، ص ۲۱ - ۲۱۹؛ بخاری اور مسلم، اسلام ابی ذر؛ اصابہ نمبر ۳۷۴؛ جمہرہ، ص ۱۷۵۔

(۱۴) ملاحظہ کیجئے قریش کے خاندان بنو عدی کے قبولِ اسلام پر آئندہ بحث۔

(۱۵) قرآن کریم، سورہ انفال، آیات ۲، ۳، ۴، ۵، ؛ سورۂ توبہ، آیت ۲۰۔

(۱۶) قرآن کریم، سورہ توبہ، آیت ۱۰۰۔

(۱۷) ابنِ اسحاق، ص ۱۷ - ۱۱۶۔

(۱۸) ایضاً، ص ۱۱۷۔

(۱۹) یہ ایک عام اور سخت غلط فہمی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ بھی زیادہ تر کم زوروں ہی نے دیا"۔ ہمارے جدید مسلم مورخوں اور سیرت نگاروں نے اولین مسلمانوں کے "کمزور" اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے پیرووں کے کمزور طبقات سے ہونے کا اتنے زور و شور سے ڈھنڈورا پیٹا ہے کہ اب اسے تاریخی حقیقت سمجھا جانے لگا ہے حالانکہ تاریخی واقعات سے اس کی قطعی تردید ہوتی ہے۔ ابتدائی مسلمانوں میں ضعفاء (کمزور) بھی شریک تھے تاہم اکثریت قریشی خاندانوں کے سربرآوردہ اور معزز لوگوں اور ان کی اولادوں کی تھی جیسا کہ ابن اسحاق کے مذکورہ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے۔ کمزور طبقات کی حمایت کے لیے ملاحظہ کیجئے سید جلال الدین عمری کا مضمون "کم زور کے مسائل اسلام نے حل کیے ہیں"، تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ، جنوری ۱۹۸۲ء، خاص کر ص ۸۴۔

(۲۰) مآخذ میں سے کسی نے بھی ان کے زمانہ قبول اسلام کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

(۲۱) ابن اسحاق، ص ۴۵ - ۱۴۳۔

(۲۲) ابن اسحاق، ص ۳۲ - ۱۲۱ نے کسی زمانہ کی صراحت نہیں کی ہے۔ ابن سعد، سوم، ص ۹ نے البتہ یہ وضاحت کی ہے کہ وہ دارِ ارقم میں قیامِ نبوی کے بعد نبوت کے چھٹے برس اسلام لائے تھے۔

(۲۳) ابن اسحاق، ص ۵۹ - ۱۵۵ کا بیان ہے کہ حضرت عمر نے ہجرتِ حبشہ کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ ابن سعد، سوم، ص ۲۶۹ کی دوسری روایت ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی کل تعداد چالیس یا پینتالیس تھی۔ تیسری روایت میں ۳۹ مردوں اور گیارہ عورتوں کی تصریح ہے۔ سید سلیمان ندوی، سیرت النبی، سوم، ص ۳۹ - ۶۳۴ نے شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۸ - ۱۵۷ پر حضرت عمر کے قبولِ اسلام کے بارے میں سیرتوں کی روایت قبول کرنے پر تنقید کی ہے۔ اور بخاری، صحیح، باب اسلامِ عمر، کے حوالے سے ان کے قبول اسلام کا صحیح واقعہ لکھا۔ سید صاحب مرحوم نے روایات کی صحت و ضعف سے زیادہ بحث کی ہے لیکن ان کے زمانہ قبول اسلام کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔

(۲۴) ابن اسحاق، ص ۱۴۶ - ۱۷۱ اولِ ہجرت حبشہ کے مہاجروں کے ناموں اور تعداد میں روایات کا اختلاف ہے۔ ملاحظہ ہو

سیّد سلیمان ندوی کا تبصرہ و حاشیہ، سیرت النبی، اول، ص ۲۳۴-۲۳۵ (حاشیہ ۱)۔

(۲۵) ابن اسحاق، ص ۱۴۷-۱۴۸۔

(۲۶) ابن اسحاق، ص ۱۴۶ اور ۱۶۱ وغیرہ۔

(۲۷) ابن اسحاق، ص ۱۶۱-۱۶۷۔

(۲۸) ابن اسحاق، ص ۱۴۴-۱۴۵۔

(۲۹) بناتِ مطہرات کے لیے ملاحظہ ہو: بلاذری، انساب الاشراف، اوّل، ص ۳۹۶-۴۰۵؛ ابنِ سعد، ہشتم، ص ۱۹-۳۹۔

(۳۰) حضرت زید بن حارثہ کے لیے ملاحظہ ہو: ابنِ اسحاق، ص ۱۱۴-۱۱۵؛ ابنِ ہشام، اوّل، ص ۲۶۵؛ اسد الغابہ، دوم، ص ۲۳۴-۲۳۰؛ نیز ملاحظہ کیجئے ابن سعد، سوم، ص ۴۴۔ قبول اسلام کے وقت حضرت زید تیس سال کے تھے۔

(۳۱) بلاذری، انساب الاشراف، اوّل، ص ۲۶۹؛ ابن ہشام، ہشتم، ص ۲۲۳۔

(۳۲) ابن سعد، سوم، ص ۶۱ اور ۷۲؛ نیز ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اول، ص ۲۶۹ اور ۴۷۳-۴۷۶۔ وفات نبوی کے وقت حضرت اسامہ کی عمر بیس سال تھی۔

(۳۳) ابن اسحاق، ص ۸۲؛ انساب الاشراف، اوّل، ص ۴۶۷۔

(۳۴) ابن سعد، چہارم، ص ۷۳-۷۴؛ انساب الاشراف، اول، ص ۴۷۷-۴۸۰۔

(۳۵) ابن سعد، سوم، ص ۴۹-۵۰؛ انساب الاشراف، ص ۴۷۸-۴۷۹۔

(۳۶) انساب الاشراف، اوّل، ص ۴۷۹-۴۸۰ کے مطابق حضرت یسار مدنی عہد کے مسلم تھے جبکہ حضرت رافع یا رُوَیفع مکی مسلم تھے ملاحظہ ہو: ص ۴۸۲۔

(۳۷) ابنِ سعد، سوم، ص ۴۹؛ انساب الاشراف، اوّل، ص ۴۸۷۔

(۳۸) ابنِ سعد، سوم، ص ۴۸؛ انساب الاشراف، اول، ص ۴۸۷۔

(۳۹) ابنِ اسحاق، ص ۱۱۶؛ زبیری، ص ۲۷۵-۲۷۶۔

(۴۰) ابن اسحاق، ص ۱۱۹۔

(۴۱) ابن حزم، جمہرہ، ص ۱۲۶؛ زبیری، ص ۲۷۵۔

(۴۲) ابن سعد، ہشتم، ص ۲۷۶۔

(۴۳) حضرت عبداللہ بن ابی بکر کے بارے میں تمام ماخذ ذکر کرتے ہیں کہ وہ مکی مسلمان تھے مگر ان کو مکی مسلمانوں کی فہرست میں شامل نہیں کرتے ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۱۱۶-۱۱۷ اور ص ۲۲۴۔ ان کے اسلام اور ہجرت کے لئے ملاحظہ کیجئے زبیری، ص ۲۷۵ اور اصابہ نمبر ۴۵۶۸۔

(۴۴) زبیری، ص ۲۷۷۔

(۴۵) مثلاً ملاحظہ کیجئے: مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۱۷۲، جنھوں نے خاندانِ صدیقی سے صرف حضرت ابوبکر اور ان کے موالی حضرت عامر بن فُہیرہ کو شامل کیا ہے۔

(۴۶) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۱۷۳۔ ابن اسحاق نے تو ان کا بھی نام مکّی مسلمانوں میں شامل نہیں کیا ہے؛ نیز ملاحظہ کیجئے زبیری، ص ۳۴۸؛ اصابہ، نمبر ۴۸۲۵؛ نیز ابن سعد، چہارم، ص ۱۲۲ وغیرہ۔

(۴۷) ابن سعد، ہشتم، ص ۸۱؛ زبیری، ص ۳۴۸-۵۱-۲؛ اصابہ نساء نمبر ۲۹۴۔

(۴۸) زبیری، ص ۳۴۸-۹۔ حضرات عبدالرحمٰن الاکبر اور ان کی والدہ ماجدہ کے لیے مزید دیکھیے اصابہ نمبر ۵۱۶۵ اور اصابہ نساء نمبر ۴۹۷۔

(۴۹) زبیری، ص ۳۴۷-۸ اور ۳۶۳۔

(۵۰) زبیری، ص ۶۶-۳۶۵۔

(۵۱) زبیری، ص ۳۶۳۔

(۵۲) زبیری، ص ۳۴۹۔

(۵۳) ابن سعد، سوم، ص ۹۲-۳۹۱۔

(۵۴) زبیری، ص ۹۵-۹۳؛ ابن سعد، سوم، ص ۵۰۔

(۵۵) زبیری، ص ۹۴-۳۹۳۔

(۵۶) ابن اسحاق، ص ۱۵-۲۱۴؛ زبیری، ص ۹۴-۳۹۳؛ ابنِ سعد، سوم، ص ۸۹ اور ص ۹۷؛ ابن حزم، جمہرہ انساب العرب (جمہرہ)، ص ۲۰۰-۱۹۹۔ مزید بحث کے لیے ملاحظہ ہو: محمد یٰسین مظہر صدیقی "کیا مہاجرین مکہ خالی ہاتھ مدینہ آئے تھے؟" تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ، اپریل۔جون ۱۹۸۳ء، ص ۲۲-۲۱ خاص کر۔

(۵۷) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۷۵-۱۷۴۔

(۵۸) ابن اسحاق، ص ۱۱۶ نے جتنے نام گنا دئے ہیں اتنے ہی مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۳-۱۷۲ انے بھی شمار کئے ہیں حالانکہ ان کی تعداد کہیں زیادہ تھی ملاحظہ ہو: جمہرہ، ص ۱۷۳۔

(۵۹) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۱۷۱ نے حضرات ابومرثد اور مرثد کا ذکر کیا ہے۔

(۶۰) ابن اثیر جزری، اسدالغابہ، اول، ص ۱۲۹ اور ۱۳۵ نے ان کے دو اور فرزندوں حضرات انسؓ اور انیس کا بھی ذکر کیا ہے۔

(۶۱) مثلاً ملاحظہ کیجئے: شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۲۵۰ وغیرہ۔

(۶۲) انساب الاشراف، اوّل، ص ۱۲۳۔

(۶۳) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکّہ، ص ۹۰ - ۸۶۔

(۶۴) مثلاً ملاحظہ ہو: ابن سعد، سوم، ص ۵۳، ص ۱۰۰ - ۹۱ وغیرہ؛ چہارم، ص ۲۴ - ۱۰۲ وغیرہ۔

(۶۵) ابن اسحاق، ص ۱۷۱۔

(۶۶) مثلاً ملاحظہ ہو: شبلی نعمانی، سیرت النبی، اوّل، ص ۲۶۷۔

(۶۷) ابن اسحاق، ص ۲۳۰ - حیرت ہے کہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی، اوّل، ص ۲۸۰ پر خاندان رسول اور خاندان صدیقی کے ہجرت نبوی کے بعد ہجرت کرنے کا واقعہ خود بھی لکھا ہے۔ شبلی سے اس ضمن میں ایک اور تسامح ہوا ہے اور وہ یہ کہ حضرت رقیہ اپنے شوہر حضرت عثمان بن عفان اموی کے ساتھ ہجرت نبوی کے بعد تک حبش میں تھیں۔ حالانکہ ابن اسحاق، ص ۱۶۸ اور دوسرے ماخذ نے بھی یہ واضح طور پر بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان حبشہ سے مکہ لوٹ آئے تھے اور پھر وہاں سے مدینہ ہجرت کی تھی۔ نیز ملاحظہ کیجئے: انساب الاشراف، اوّل، ص ۹۹ - ۳۹۶۔

(۶۸) انساب الاشراف، اوّل، ص ۷۰ - ۲۶۹؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۲۸۰۔

(۶۹) بخاری، صحیح، باب ہجرۃ النبی؛ ابن سعد، سوم، ص ۱۰۳ اور ص ۲۱۵؛ بلاذری، انساب الاشراف، اوّل، ص ۲۷۰ کے مطابق یہ دونوں حضرات ہجرتِ نبوی سے کچھ قبل تجارت کے لیے شام گئے تھے۔ واپسی پر وہ مدینہ کے راستے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے تھے اور آپ کی خدمت میں کپڑوں کا تحفہ پیش کیا تھا اور پھر وہ مکہ چلے گئے تھے اور اس کے کچھ دنوں بعد وہاں سے مدینہ ہجرت کی تھی۔ ملاحظہ ہو شبلی نعمانی، سیرت النبی، اوّل، ص ۲۷۴، جنھوں نے حضرت زبیر کا حوالہ دیا ہے؛ نیز ملاحظہ ہو: قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمۃ للعالمین، اول، ص ۱۰۔

(۷۰) ابن اسحاق، ص ۲۳۰ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد بھی مہاجرینِ مکہ کی ہجرت کا سلسلہ برابر جاری رہا تھا کہ "مکہ کے مہاجر ایک ایک کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر مدینہ ملنے لگے۔"

(۷۱) ابن سعد، چہارم، ص ۱۳۸

(۷۲) ابن سعد، چہارم، ص ۲۱۳

(۷۳) ابن اسحاق، ص ۱۹ - ۳۱۸ - حضرت وہب بن عمیر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادے سے مدینہ میں پہنچے مگر بارگاہِ نبوی میں پہنچ کر ایسے مبہوت و ششدر ہو گئے کہ اسلام قبول کر کے مومن و جاں نثارِ رسول بن گئے۔ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، چہارم، ص ۲۰۰ - ۱۹۹؛ زبیری، ص ۳۹۱۔

(۷۴) غزوۂ بدر میں مکی فوج میں شامل تھے۔ جنگ میں گرفتار ہو کر مدینہ میں اسیر بدر بن کر رہے۔ ان کے دونوں مخزومی بھائی حضرات خالد بن ولید اور ہشام بن ولید نے زرِ فدیہ دے کر ان کو آزاد کرا لیا اور ان کو مکہ لے گئے مگر راستے سے وہ پلٹ کر مدینہ پہنچے اور اسلام قبول کر لیا۔ ان کے دونوں بھائی پیچھے پیچھے مدینہ پہنچے اور ان کو لعنت ملامت کی کہ زرِ فدیہ کی ادائیگی سے پہلے ہی کیوں نہ اسلام قبول کر لیا۔ اُنھوں نے جواب میں فرمایا کہ صرف اس لئے تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ

پیسے کی ادائیگی سے بچنے کے سبب وہ مسلمان ہوئے تھے۔ ملاحظہ ہو ابن سعد، چہارم، ص ۳۲-۱۳۱؛ زبیری، ص ۲۴-۳۲۳۔

(۷۵) ابن اسحاق، ص ۵۰۷ کا بیان ہے کہ اسلام میں اس سے بڑی اور کوئی فتح نہیں تھی۔ اس سے پہلے جب لوگ ملتے تھے تو صرف جنگ وجدال کے لیے۔ لیکن جب یہ صلح ہوگئی اور جنگ بند کر دی گئی تو لوگ ایک دوسرے سے صاف ذہنی سے ملنے لگے اور وہ اسلام کے بارے میں ٹھنڈے دل سے بات چیت کرنے لگے۔ اور جو بھی اسلام کو سمجھ لیتا تھا وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد لوگ پہلے کے زمانے کے مقابلے میں دوگنے یا دوگنے سے بھی زیادہ مسلمان ہو گئے تھے۔

(۷۶) ابن سعد، چہارم، ص ۵۳-۲۵۲ و ۲۵۴ و ۲۶۲۔

(۷۷) زبیری، ص ۲۵-۱۲۴ کا بیان واضح ہے کہ دونوں بھائی صلح حدیبیہ کے دوسرے سال عمرۃ القضا میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ نیز ملاحظہ ہو: اصابہ نمبر ۹۲۶۵ اور ۹۲۶۷؛ ابن اثیر، اسد الغابہ، چہارم، ص ۸۷-۲۸۵ اور پنجم ص ۱۳-۱۱۲۔ عام خیال یہ ہے کہ ان دونوں بھائیوں نے فتح مکہ میں اسلام قبول کیا تھا۔

(۷۸) ماخذ کا اس پر اتفاق ہے کہ فتح مکہ کے بعد پورا مکہ مسلمان ہو گیا تھا اور گنتی کے بعض افراد بچ رہے تھے انھوں نے کچھ دنوں بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔

(۷۹) "بنو عبد مناف" کے متحدہ خاندان پر بحث کے لیے ملاحظہ کیجئے محمد یٰسین مظہر صدیقی، بنو ہاشم اور بنو امیہ کی رقابت کا تاریخی پس منظر "برہان" دہلی جنوری ۱۹۸۰ء، ص ۲۰-۵۔

(۸۰) ملاحظہ ہو حوالہ مذکورہ بالا، ص ۲ تا ۳۷۔

(۸۱) ابو الفرج اصفہانی (متوفی ۳۵۶ھ) نے خاندان حضرت علی کے شہداء پر ایک مکمل کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے "مقاتل الطالبین"۔

(۸۲) ابو طالب کے قبول اسلام کے بارے میں دو مختلف نظریات کے لیے ملاحظہ ہو: شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۹۴-۲۴۷۔ شبلی ان کے اسلام کے قائل نظر آتے ہیں جبکہ ان کے شاگرد و جامع سید سلیمان ندوی کو ان کے نظریہ سے اختلاف ہے۔ ملاحظہ ہو: جامع کا حاشیہ ۲۔

(۸۳) ابن اسحاق، ص ۱۱۴؛ ابن سعد، سوم، ص ۲-۲۱۔

(۸۴) ابن سعد، چہارم، ص ۴۲؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۱۱۶؛ زبیری، ص ۲۹۔

(۸۵) ایضاً؛ نیز ملاحظہ کیجئے: ابن سعد، ہشتم؛ ابن اسحاق، ص ۱۴۶؛ زبیری، ص ۸۰؛ اصابہ نساء نمبر ۵۱۔

(۸۶) زبیری، ص ۳۹؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۲۸۶۔

(۸۷) ابن سعد، چہارم، ص ۴۴-۴۲۔

(۸۸) زبیری، ص ۴۰؛ اصابہ نساء نمبر ۳۱۷۔

(۸۹) واقدی، کتاب المغازی، ص ۹۱۸ ؛ نیز ملاحظہ کیجیے خاکسار کا مضمون "بنو ہاشم اور بنو امیہ کے ازدواجی تعلقات"، برہان دہلی، مئی ۱۹۸۰ء، ص ۲۳-۲۱۔

(۹۰) زبیری، ص ۴۰-۳۹ نے ابو طالب کی دو صاحبزادیوں حضرت اُمّ ہانی اور جُمانہ کا ذکر کیا ہے۔ دونوں کے لیے مزید دیکھیے: اصابہ نساء نمبر ۱۱۰۲، نمبر ۱۵۳۲ اور نساء نمبر ۲۲۳ بالترتیب۔

(۹۱) ابولہب کی اولاد و اخلاف کے لیے ملاحظہ کیجیے: ابن سعد، چہارم، ص ۶۱-۵۹؛ زبیری، ص ۹۰-۸۹؛ اصابہ نمبر ۵۴۱۳ اور ۸۱۲۰۔

(۹۲) ابن اسحاق، ص ۴-۳۰۱ وغیرہ؛ ابن سعد، چہارم، ص ۱۱-۱۰ اور بعض دوسرے مآخذ کا اصرار ہے کہ وہ اگرچہ مکی عہد کے مسلمان تھے اور عقبہ اولیٰ اور عقبہ ثانیہ میں بھی شریک تھے اگرچہ اس وقت تک مُسلمان نہیں ہوئے تھے۔ غزوۂ بدر کے سلسلے میں اکثر روایات یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ وہ مکی عہد میں مسلمان تو ہو گئے تھے مگر اپنے اسلام کو چھپائے ہُوئے تھے اور قریش کے اکراہ و اجبار (زور زبردستی) سے غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تھے چنانچہ ان روایات کا یہ بھی اصرار ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدینِ بدر کو ہدایت کی تھی کہ اگر حضرت عباس ان کے مقابل آجائیں تو ان کو قتل نہ کیا جائے کیونکہ وُہ بحالتِ مجبوری میں آئے تھے۔ لیکن پھر یہی روایات یہ بھی بیان کرتی ہیں کہ وہ حضرت عقیل بن ابی طالب کے ساتھ غزوۂ بدر کے اسیروں میں تھے اور انھوں نے زرِ فدیہ دے کر رہائی حاصل کی تھی۔ اس سلسلے میں یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے زرِ فدیہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا تو انھوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا مگر اس کے باوجود آپ نے ان کا اور حضرت عقیل کا فدیہ وصول کیا۔

ان روایات میں شدید تضادات ہیں۔ اوّل یہ کہ متعدد قریشی افراد اور خاندان جن میں طالب بن ابی طالب ہاشمی اور بنو عدی اور بنو زہرہ وغیرہ شامل تھے قریشی کارواں کے محفوظ ہو جانے کی خبر سُن کر واپس مکہ چلے گئے تھے اور ان کو جنگ میں شریک ہونے پر کوئی مجبور نہیں کر سکا تھا تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرات عباس و عقیل نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ دوم یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد اسیرانِ بدر کو خاص کر مسلمان ہو جانے والوں کو بلا فدیہ رہا کر دیا تھا۔ اگر حضرت عباس کے قبولِ اسلام کی روایت صحیح ہوتی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بھی بلا زرِ فدیہ رہا کر دیتے۔ زرِ فدیہ کی ادائگی ان کے اس وقت تک عدمِ قبولِ اسلام کی دلیل ہے۔ چنانچہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ حدیث نبوی جو حضرت عباس کے مجبوراً بدر میں آنے کو ظاہر کرتی ہے در اصل کلامِ رسول نہیں ہے۔ اور یہ سارے تضادات، الجھنیں اور ابہام صرف اس لیے ہیں کہ ان کے بعد کے زمانے میں اسلام لانے کی حقیقت پر پردہ ڈال کر ان کو ابتدائی مکی مسلم ثابت کیا جائے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ساری علمی کاوشیں عہد عباسی میں ان کے جدامجد کی قدامت اسلام کو ثابت کرنے کے لیے کی گئی تھیں۔

اسی ضمن میں ایک اور نکتہ بھی پیدا کیا گیا ہے اور وہ ہے ان کے مکی قیام کا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وُہ

اسلام لا چکے تھے تو انھوں نے ہجرت کیوں نہیں کی تھی۔ اس کے لیے عموماً یہ دلیل دی جاتی ہے کہ وُہ اسلام کی خدمات کی خاطر اور ہدایاتِ نبوی کے بموجب مکہ میں مقیم رہے تاکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے منصوبوں اور سازشوں سے آگاہ کرتے رہیں چنانچہ اس سلسلے میں غزوات احد، بدر الموعد اور خندق وغیرہ کے مواقع پر آپ کو قریشی منصوبوں سے آگاہ بھی کیا تھا (ملاحظہ کیجئے شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۲۶۴، ۳۲۷، ۳۳۰، ۳۳۳ اور ۳۷۱ وغیرہ)۔

ابن سعد، چہارم، ص ۴۷-۴۶ نے تو ان کی غزوہ خندق میں ہجرتِ مدینہ کی بھی ایک روایت بیان کی ہے کہ انھوں نے نوفل بن حارث ہاشمی کے ساتھ ہجرت کی تھی۔ لیکن یہ تمام کوششیں بھی ان کے ابتدائی مسلم اور مہاجر ہونے کے مفروضہ کو ثابت کرنے کے لیے ہیں۔ ورنہ واقدی کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریشی منصوبوں سے آگاہ کرنے والے آپ کے خزاعی حلیف تھے۔ شبلی نے اگرچہ ان کی ہجرت کا ذکر نہیں کیا ہے تاہم غزوۂ اُحد سے قبل ان کے مسلمان ہونے کی روایت بیان کر دی ہے۔

اور سب سے زیادہ حیرت ناک معاملہ ہے ان کے قبول اسلام کے زمانے کا۔ کسی نے بھی ان کے قبول اسلام کا زمانہ نہیں متعین کیا ہے، صرف یہ کہا جاتا ہے کہ وہ قدیم مسلم تھے۔ بہرحال اندازہ یہ ہوتا ہے کہ وُہ فتح مکہ سے کچھ قبل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ کے قریب بقول ابن ہشام جُحفہ میں اس وقت ملے تھے جب آپ فتح مکہ کے لیے وہاں پہنچ چکے تھے اور یہی ان کے قبولِ اسلام کا زمانہ تھا۔ کیونکہ اسی زمانے میں اور بھی قریشیوں بلکہ ہاشمیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۵۴۶ اور ابن ہشام کا تبصرہ ص ۷۷۳ (حاشیہ ۹۶)۔ ابن ہشام کا یہ تبصرہ غلط ہے کہ وُہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر رہے تھے کیونکہ بعض روایات کے مطابق ہم ان کو حضرت ابوسفیان بن حرب کے ساتھ لشکرِ رسول کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنے کے لیے مکہ سے نکلتے ہُوئے پاتے ہیں۔

(۹۳) زبیری، ص ۲۸-۲۵؛ نیز ملاحظہ کیجئے اصابہ نمبر ۷۰۰۳، ۴۷۸۱، اور استیعاب، جلد دوم، ص ۲۰۸-۱۰۱۔ مذکورہ بالا مآخذ نے ان کی اولاد میں سے صرف حضرات عبداللہ بن عباس اور فضل بن عباس کو صحابہ میں شامل کیا ہے۔

(۹۴) زبیری نے حضرت حمزہ کے خاندان کا سرے سے ذکر نہیں کیا ہے اور اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ ان کی نسل نہیں چلی تھی؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، سوم، ص ۹-۸۔

(۹۵) بحوالہ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۳۰۵، جنھوں نے یہ واقعہ صحیح بخاری اور زرقانی کی سند پر بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو حاشیہ ۲۔

(۹۶) ابن سعد، سوم، ص ۸-۷۴؛ اسدالغابہ، اول، ص ۱۲۹ اور ۱۳۵۔

(۹۷) زبیری، ص ۸۵۔

(۹۸) ابن سعد، چہارم، ص ۵۴-۴۶ کا ان کے بارے میں بھی یہی بیان ہے کہ وُہ مجبوراً غزوۂ بدر میں مکی لشکر کی طرف سے لڑے تھے۔ انھوں نے اپنا زرِ فدیہ خود ادا کیا تھا اور دلچسپ بات ہے کہ ان سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

فدیہ میں ایک ہزار نیزے وصول کیے تھے کیونکہ وہ اسلحہ کے تاجر تھے۔ پھر وہ اسلام لائے تھے اور مکہ لوٹ گئے تھے اور خندق کے زمانے میں ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے۔ لیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ وہ فتح مکہ کے ہی مسلم معلوم ہوتے ہیں ملاحظہ ہو زبیری، ص ۸۶-۸۵؛ اصابہ نمبر ۸۸۲۶۔ وہ حارث بن عبدالمطلب کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ حضرت نوفل کے ایک صاحبزادے حضرت حارث بن نوفل عہدِ نبوی میں جوان ہو چکے تھے۔ ملاحظہ ہو زبیری، ص ۸۶ اور اصابہ نمبر ۱۵۰۰۔

(۹۹) ابن سعد، چہارم، ص ۴۸-۴۷، ۵۴-۹۴ کا خیال ہے کہ حضرت ربیعہ حارثی ہاشمی غزوہ خندق کے زمانے کے مسلم اور مہاجر تھے جبکہ بقیہ دونوں حضرات فتح مکہ کے مسلم۔ زبیری، ص ۸۸-۸۶۔

(۱۰۰) زبیری، ص ۸۸-۸۶۔

(۱۰۱) زبیری، ص ۸۸-۸۶، در اصل ان میں سے کسی کا واضح ذکر نہیں کیا ہے۔

(۱۰۲) زبیری، ص ۴۰ اور اصابہ نساء ص ۲۲۳۔

(۱۰۳) زبیری، ص ۹۱-۱۵ نے ہاشمی خانوادوں میں خاندان رسالتمآب کے علاوہ علوی، عباسی، حارثی، جعفری اور عقیلی خاندانوں کا ذکر کیا ہے، یہ ذکر کافی تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ بہر حال ایک سے کچھ زیادہ صفحہ میں "بقیہ ولد ہاشم بن عبد مناف" کی سرخی کے تحت ہاشم کے تین فرزندوں ابوصیفی، نضلہ اور اسد کا ذکر کیا ہے۔ اول الذکر کے خاندان میں حضرت سارہ کا ذکر کیا ہے جو حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کا خط لے کر قریش مکہ کے پاس فتح مکہ سے پہلے لے جا رہی تھیں اور وہ عمرو بن ابی صیفی کی مولیٰ تھیں۔ ثانی الذکر کی نسل میں ارقم بن نضلہ کو "رجال قریش" مردانِ قریش میں شمار کیا ہے لیکن وہ بعثت سے پہلے گزر چکے تھے۔ ان کی نسل میں صرف خواتین تھیں جن میں سے شفاء بنت ارقم حضرت سائب بن عبید مطلبی کی والدہ ماجدہ تھیں۔ صحابی موصوف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت مشابہ تھے۔ ان کے علاوہ دو اہم خواتین ہند اور ام جمیل تھیں۔ موخر الذکر کی نسل میں حضرت عبداللہ بن ثعلبہ عذری تھے جو زہری کے ایک استاد تھے۔ اسد بن ہاشم کی اولادوں میں سب سے اہم شخصیت حضرت فاطمہ بنت اسد کی تھی جو ابوطالب بن عبدالمطلب کی زوجہ محترمہ حضرت علی کی والدہ ماجدہ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چچی تھیں۔ وہ در اصل ابوطالب کی تمام اولادوں کی ماں تھیں۔ ان کے علاوہ مردوں میں کوئی اہم شخصیت نہیں ہوئی۔ بہر حال ان تینوں کی نسل منقطع ہو گئی تھی۔

(۱۰۴) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چھ پھوپھیاں تھیں: ام حکیم بیضاء، جو والد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جڑواں بہن (توام) تھیں، ان کے علاوہ عاتکہ، برّہ، امیمہ، اروی اور صفیہ تھیں۔ ان کے شوہروں اور ان کے خاندانوں کے نام جاننا دلچسپی کا باعث ہوگا:

۱۔ ام حکیم بنت عبدالمطلب کی شادی کُریز بن ربیعہ/حبیب بن عبد شمس سے ہوئی تھی۔ ان کی اولادیں تھیں: عامر بن کریز، ام طلحہ جو حضرمی کی زوجہ تھیں اور جن کے بطن سے خالد، عامر اور عمر پیدا ہوئے تھے۔ عامر

بن حضرمی وہ نخلہ کا مقتول تھا جس کے سبب بدر کی جنگ ہوئی تھی اور یہ بنی عبد شمس کے حلیف تھے۔ ام حکیم کی ایک صاحبزادی اروی بنت کریز تھیں جو حضرت عثمان بن عفان اموی اور عقبہ بن ابی معیط کے فرزندان گرامی ولید، عمارہ، خالد اور ام کلثوم اور ہند کی والدہ تھیں۔

۲۔ عاتکہ بنت عبدالمطلب ابوامیہ مخزومی کے نکاح میں تھیں جن سے تین بچے عبداللہ، زبیر اور قریبہ پیدا ہوئے تھے۔

۳۔ برّہ بنت عبدالمطلب عبدالاسد بن ہلال مخزومی کی اہلیہ تھیں اور ان سے حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی پیدا ہوئے تھے۔ عبدالاسد کے بعد برّہ نے ابورہم بن عبدالعزّیٰ / عبدوُد سے شادی کرلی تھی اور ان سے ابوسبرہ تھے۔

۴۔ اُمیمہ بنت عبدالمطلب جحش بن رباب / بنی غنم بن دودان / اسد کے نکاح میں تھیں اور ان کی اولادوں عبداللہ، ابواحمد، عبیداللہ، زینب بنت جحش، حمنہ بنت جحش، حبیبہ بنت جحش کی ماں تھیں۔

۵۔ اروی بنت عبدالمطلب عمیر بن وہب / عبد بن قصی کے نکاح میں تھیں اور اُن سے حضرت طُلیب بن عمیر پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے پھر کلدہ بن ہاشم عبدری سے شادی کرلی تھی اور ان کی متعدد اولادیں ہوئی تھیں۔

۶۔ صفیہ بنت عبدالمطلب عوام بن خویلد اسدی قریشی کی زوجہ تھیں اور ان کی اولادوں میں حضرت زبیر بن عوام، ان کے بھائی سائب اور بہن ام حبیب تھیں۔

اس نسبی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو زبیری، ص ۲۰-۱۸۔

آپ کی مسلم پھوپھیوں کے لیے ملاحظہ ہو: ابن سعد، ہشتم، ص ۴۵-۴۱۔

(۱۰۵) طبری، دوم، ص ۳۲۰۔

(۱۰۶) روایات کا اتفاق ہے کہ ذکر یازدہ سالہ حضرت علی بن ابی طالب کے سوا اور کسی نے اسلام نہیں قبول کیا تھا۔ ملاحظہ ہو ۵۵ کے حوالہ جات۔

(۱۰۷) ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون "بنو ہاشم اور بنوامیہ کے ازدواجی تعلقات" برہان، دہلی، جون ۱۹۸۰ء، ص ۸-۷۔

(۱۰۸) ان دونوں نظریات کے لیے ملاحظہ ہو: شبلی نعمانی، سیرت النبی، اوّل، ص ۲۱۶۔

(۱۰۹) خاکسار کے مضمون "بنو ہاشم اور بنوامیہ کی رقابت کا تاریخی پس منظر" برہان، دہلی، جنوری ۱۹۸۱ء کی طرف اشارہ ہے۔

(۱۱۰) تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے مضمون مذکورہ بالا (محولہ در ۱۰۹)

(۱۱۱) خاندان عبد شمس کی یہ تفصیل زبیری، ص ۹۷-۱۹۶ سے ماخوذ ہے۔ نیز ملاحظہ ہو جمہرہ ص ۱۰۶-۶۷۔

(۱۱۲) ابواحیحہ سعید بن عاص کا گھرانا ۔ ملاحظہ ہو زبیری، ص ۸۳ - ۱۷۴؛ جمہرہ، ص ۵ - ۷۳ ۔

(۱۱۳) ابن سعد، چہارم، ص ۹۵ - ۹۴؛ محمد بن حبیب بغدادی، کتاب المنمق - ص ۶۰ - ۳۵۷؛ نیز ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۱۱۶ اور ۱۴۶ ۔

(۱۱۴) ابن سعد، چہارم، ص ۱۰۴ - ۱۰۰ کی روایت ہے کہ حضرت عمرو سعیدی دوسری ہجرتِ حبشہ کے بعد اسلام لائے تھے اور پھر مکہ سے ہجرت کر کے اپنے بھائی حضرت خالد سعیدی سے جا ملے تھے جبکہ کتاب المنمق ص ۸۰، ۲۵۷ کا خیال ہے کہ دونوں بھائیوں نے ساتھ ساتھ اسلام قبول کیا تھا۔ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق ص ۱۱۶ اور ۱۴۶، جنھوں نے حضرت خالد کو ابتدائی چھیالیس مسلمانوں میں شامل کیا ہے لیکن حضرت عمرو کو نہیں کیا ہے البتہ اُنھوں نے دونوں بھائیوں کو دوسری ہجرتِ حبشہ کا مہاجر بتایا ہے اور کہا ہے کہ دونوں نے اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ ہجرت کی تھی۔ ابن سعد نے بھی حضرت خالد کو دوسری ہجرتِ حبشہ ہی میں شامل بتایا ہے ۔

(۱۱۵) ابن اسحاق اور ابن سعد، مذکورہ بالا؛ زبیری، ص ۱۷۴ ۔

(۱۱۶) زبیری، ص ۱۷۴ ۔ (۱۱۷) ایضاً

(۱۱۸) ابن اسحاق، ص ۱۱۶، ۱۴۶، ۱۶۷؛ ابن سعد، سوم، ص ۶ - ۵۵؛ ہشتم، ص ۷ - ۳۶؛ نیز ملاحظہ ہو: زبیری، ص ۱۰۱ ۔

(۱۱۹) زبیری، ص ۱۲۱ - ۱۰۱ نے حضرت عثمان بن عفان کے اور کسی حقیقی بھائی بہن کا ذکر نہیں کیا ہے ۔ البتہ ان کی متعدد اولادوں کا کافی طویل ذکر کیا ہے ۔

(۱۲۰) ابن سعد، ہشتم، ص ۴۲ ۔

(۱۲۱) زبیری، ص ۵ - ۱۰۴ ۔ زبیری کا یہ بھی بیان ہے کہ ہند بنت عتبہ بن ربیعہ نے حضرت رملہ کے قبول اسلام پر ان کو طعنہ دیا تھا اور شیبہ کے مسلمانوں کے ہاتھوں قتل کیے جانے پر عار بھی دلایا تھا۔ زبیری نے ہند کے دو شعر نقل بھی کئے ہیں ۔ نیز ملاحظہ ہو زبیری، ص ۱۵۶ ۔

(۱۲۲) اسد الغابہ، دوم، ص ۳۳؛ چہارم، ص ۳۴۸ ۔

(۱۲۳) زبیری، ص ۱۵۹ کے مطابق حضرت حکم بن عاص اموی کے کل فرزندوں کی تعداد اکیس تھی۔ ان کے علاوہ متعدد صاحبزادیاں بھی تھیں۔ یہ سب اولادیں مختلف ماؤں سے تھیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان میں سے متعدد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر اور مسلم تھے ۔

(۱۲۴) ابن سعد، چہارم، ص ۱۱۸ ۔

(۱۲۵) ابن اسحاق، ص ۱۱۶، ۱۴۶، ۱۶۷؛ ابن سعد، سوم، ص ۱۸۴؛ زبیری، ص ۱۵۳ ۔

(۱۲۶) ابن سعد، سوم، ص ۸ - ۸۵ ۔

(۱۲۷) ابن اسحاق، ص ۱۴۶ اور ص ۵۲۷؛ ابن سعد، ہشتم؛ زبیری، ص ۲۲-۱۲۳۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو نجاشی حبشہ کے پاس بھیجا تھا کہ وہ حضرت ام حبیبہ کا نکاح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیں۔ چنانچہ حضرت خالد بن سعید اموی ان کی طرف سے وکیل بنے تھے اور ان کی اجازت سے نجاشی نے نہ صرف نکاح کر دیا تھا بلکہ چار سو دینار مہر اپنی جانب سے ادا کیا تھا۔ اس کے بعد حضرت ام حبیبہ سمیت تمام مسلمانوں کو بحفاظت تمام مدینہ بھیج دیا تھا۔

(۱۲۸) زبیری، ص ۱۲۴ اور ۲۶-۱۲۵۔

(۱۲۹) ان کی اولادوں میں جو فتح مکہ میں زندہ تھیں زبیری نے نو فرزند اور سات صاحبزادیاں گنائی ہیں۔ ملاحظہ ہو ص ۲۶-۱۲۳۔ نیز ملاحظہ کیجئے: جمہرہ، ص ۴-۱۰۲۔

(۱۳۰) ابن اسحاق، ص ۱۱۶، ۱۴۶، ۲۱۵۔

(۱۳۱) ابن سعد، سوم، ص ۹۰-۸۹؛ چہارم، ص ۴-۱۰۲۔

(۱۳۲) ابن اسحاق، ص ۲۱۵۔ نیز ملاحظہ کیجئے خاکسار کا مضمون "کیا مہاجرینِ مکہ خالی ہاتھ مدینہ آئے تھے؟"

(۱۳۳) ابن سعد، ہشتم، ص ۶-۴۵۔

(۱۳۴) ابن سعد، چہارم، ص ۱۸-۱۱۶۔

(۱۳۵) ابن اسحاق، ص ۱۶۴ وغیرہ؛ بلاذری، انساب الاشراف، اول، ص ۱۴۸۔ نیز ملاحظہ ہو زبیری، ص ۳۸-۱۳۵۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب حضرت ولید بن عقبہ اموی ــــ حیات و شخصیت (زیرِ طبع)، باب اول۔

(۱۳۶) ابن سعد، ششم، ص ۲۴؛ ابنِ قتیبہ، المعارف، ص ۳۱۹؛ ابنِ اثیر، اسد الغابہ، پنجم، ص ۹۰؛ اصابہ نمبر ۹۱۴۷؛ زبیری، ص ۱۳۸ و ص ۶-۱۴۵؛ استیعاب، برحاشیہ اصابہ (مصر ۱۹۳۹ء)، سوم، ص ۹۴؛ ذہبی، سیر اعلام النبلاء، تحقیق محمد اسعد طلس، قاہرہ ۱۹۶۲ء، سوم، ص ۲۰۵؛ خاکسار کی مذکورہ کتاب کا باب اول۔

(۱۳۷) زبیری، ص ۴۶-۱۳۸، نے عقبہ بن ابی مُعَیط اُموی کے چار فرزندوں ولید، عمارہ، خالد، ہشام اور تین دختروں ام کلثوم، ام حکیم اور ہند کا ذکر کیا ہے۔ ان کی سوانح کے لیے ملاحظہ کیجئے اصابہ نمبر ۹۱۴۷ و ۲۴، ۵؛ نیز دیکھئے ابن اسحاق، ص ۵۰۹۔

(۱۳۸) ابن اسحاق، ص ۱۷-۳۱۶؛ زبیری، ص ۵۸-۱۵۷؛ ابن سعد، ہشتم، ص ۴۰-۳۹۔

(۱۳۹) زبیری، ص ۱۸۷؛ ابن ہشام، دوم، ص ۲۰۴؛ سوم، ص ۵۰۰؛ واقدی، ص ۸۸۹ اور ۹۵۹؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۳۷؛ پنجم، ص ۲۴۶؛ طبری، سوم، ص ۳، اور ۹۴؛ انساب الاشراف، اول؛ فتوح البلدان، ص ۵۳؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۱۲ اور اسد الغابہ، سوم، ص ۹-۳۵۸۔

(۱۴۰) زبیری، ص ۹۶-۱۸۷۔

(۱۴۱) مثلاً بنو ابو العاص بن امیہ میں حضرت عثمان بن عفان کے تین اور چچاؤں عفیف، عوف اور عثمان کے گھرانے تھے۔ حرب بن امیہ میں ابوسفیان بن حرب کے ایک اور فرزند عتبہ بن ابی سفیان کا گھرانا تھا۔ ان کے ایک اور فرزند عنبسہ بن ابی سفیان کا گھرانا تھا۔ پھر حرب بن امیہ کے ایک فرزند عمرو بن حرب کا خاندان تھا۔ حارث بن حرب کا ایک گھرانا اسی بطن میں تھا۔ ان کے بنو عمرو بن امیہ ایک الگ خاندان تھے۔ خاندان ابو عمرو بن امیہ میں عقبہ بن ابو معیط کے علاوہ کمیم بن ابی عمرو اور ابو وحرہ بن ابی عمرو کے دو گھرانے تھے پھر حبیب بن عبد شمس کے تین ذیلی خاندان تھے جن کا حوالہ اُوپر آ چکا ہے لیکن ان کے مسلمانوں کا ذکر کم ملتا ہے۔ تاہم زبیری نے ان کے متعدد مردوں اور عورتوں کے نام گنائے ہیں جن میں حضرات ابو کبشہ حارث بن کُریز، عامر بن کریز اور ان کے فرزند عبداللہ بن عامر، عبدالرحمن بن سمرہ وغیرہ عظیم صحابی تھے۔ ایک اور خاندان امیہ اصغر بن عبد شمس کا تھا جن میں کافی مرد اور عورتیں تھیں۔ عبد شمس کے ایک اور فرزند عبد امیہ کا گھرانا تھا جن کے متعدد مرد اور عورتیں مسلمان اور معاصر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھیں۔ بنو نوفل بن عبد شمس میں حضرات عثمان، ہبار وغیرہ متعدد صحابی تھے۔

عتبہ اور شیبہ یعنی بنو ربیعہ بن عبد شمس کے بھی متعدد گھرانے تھے جن کے کئی مردوں اور عورتوں کے بارے میں یقین ہے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر اور مسلم تھے۔ اسی طرح بنو عبد العزّٰی کے خاندان میں بنو ربیع کے علاوہ دوسرے گھرانے تھے۔ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ حکم بن ابی العاص کے اکیس فرزند تھے اور ان سب کی نسلیں خوب پھلی پھولی تھیں۔ چنانچہ مروان بن حکم کے علاوہ حارث بن حکم، عبدالرحمن بن حکم، یحییٰ بن حکم، حبیب بن حکم کے خاندان تھے۔ ابو العاص کے ایک اور فرزند مغیرہ کا گھرانا تھا۔ اسی طرح اور بھی متعدد گھرانے تھے جن کے مسلمانوں کے نام سے ہم واقف نہیں ہو سکے۔ ملاحظہ ہو زبیری ص ۱۰۰، ۳۴-۱۳۲، ۵۲-۱۴۷، ۵۷-۱۵۴، ۹-۱۵۸، ۳-۱۶۹ وغیرہ۔

(۱۴۲) خلافت یزید بن معاویہ میں واقعہ حرہ سے قبل مدینہ والوں نے اپنے شہر کے اُمویوں کے ساتھ بڑا ناز یبا سلوک کیا تھا اور ان سب کو شہر بدر کیا تھا۔ اس ضمن میں ان کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ بتائی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو: طبری، تاریخ، پنجم، ص ۲-۴۸۲ وغیرہ۔ یہ واقعہ ۶۳ھ کا ہے۔

(۱۴۳) ابن اسحاق، ص ۵۹۔

(۱۴۴) ابن اسحاق، ص ۶۱۔

(۱۴۵) ابن سعد، سوم، ص ۵۲-۵۰؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۳۵۴۔

(۱۴۶) زبیری، ص ۹۷-۹۲۔

(۱۴۷) ابن اسحاق، ص ۱۱۶ وغیرہ؛ ابن سعد، سوم، ص ۵۳-۵۰؛ زبیری، ص ۹۵-۹۳۔

(۱۴۸) زبیری، ص ۵-۹۴ کے مطابق وہ غزوۂ بدر میں شہید ہوئے تو ان کی عمر ۶۳ سال تھی۔

(۱۴۹) جمہرہ، ص ۶۷-۶۶۔

(۱۵۰) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۸۸۔

(۱۵۱) زبیری، ص ۹۵' نے ان میں سے کسی کی اولاد کا ذکر نہیں کیا ہے۔

(۱۵۲) ابنِ سعد، سوم، ص ۵۳-۵۰؛ جمہرہ، ص ۷-۶۶۔

(۱۵۳) زبیری، ص ۹۵؛ ابن سعد، سوم، ص ۵۳؛ اصابہ نمبر ۵۹۳۵؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۳۵۴۔

(۱۵۴) زبیری، ص ۹۵؛ اصابہ نساء، نمبر ۱۴۹۔ زبیری کے مطابق حضرت مسطح کی والدہ ام مسطح اور حضرت ابوبکر کی والدہ ام الخیر دونوں حقیقی بہنیں تھیں۔

(۱۵۵) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۸۹۔

(۱۵۶) زبیری، ص ۹۳-۹۲؛ اصابہ نمبر ۵۲۳۵، ۷۶۰، ۱۲۵۶۔

زبیری نے اس خاندان کے کئی مردوں کا ذکر کیا ہے جو عام طور سے مسلم کمیوں میں نہیں شمار کیے جاتے ہیں۔ مردوں میں قاسم بن مخزمہ، صلت بن مخزمہ اور ان کی مذکورہ بالا اولادوں کے علاوہ حکیم بن صلت، عمرو بن صلت، کہیم بن صلت اور مخزمہ بن قاسم بن مخزمہ کا ذکر کیا ہے اور یہ سب مسلم تھے۔ ان میں سے بیشتر کو خیبر سے طعمہ ملا تھا۔ نیز ملاحظہ ہو: باب پنجم، بحث بر طعمہ نبی۔

(۱۵۷) زبیری، ص ۹۶-۹۵۔ (۱۵۸) زبیری، ص ۹۷-۹۶۔

(۱۵۹) زبیری، ص ۱۹۷؛ طبری، دوم، ص ۳۶-۳۴؛ نیز ملاحظہ ہو: مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۸-۶؛ خاکسار کا مضمون بنو ہاشم اور بنو امیہ کی رقابت پر، ص ۱۲۔

(۱۶۰) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے مضمون محولہ بالا۔

(۱۶۱) ابن اسحاق، ص ۱۱۶ پر کسی نوفلی کا ذکر نہیں ہے اور ص ۱۴۶ میں مہاجرینِ حبشہ میں اور ص ۳۲۸ فہرست مجاہدین بدر میں ان کے دو حلیفوں حضرات عتبہ بن غزوان مازنی اور حضرت جناب مولیٰ عتبہ کا ذکر کیا ہے۔

(۱۶۲) ابن سعد، سوم اور چہارم (۱۶۳) ایضاً

(۱۶۴) ملاحظہ ہو رقابت بنی امیہ اور بنی ہاشم پر مضمون مذکورہ بالا۔

(۱۶۵) ابن اسحاق، ص ۱۹۴ (یہ طبری کی اصل میں روایت ہے)؛ زبیری، ص ۲۰۰۔

(۱۶۶) زبیری، ص ۲۰۱؛ استیعاب، ص ۹۰-۸۹؛ اسد الغابہ، اول، ص ۲۷۱۔

(۱۶۷) زبیری، ص ۲۰۵-۱۹۷۔

(۱۶۸) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۸-۶ اور ۹۴-۹۳۔

(۱۶۹) ابوجہل مخزومی کہا کرتا تھا کہ ہم (بنو مخزوم) نے بنو عبد مناف سے ہر چیز میں برابری کی۔ انھوں نے کھلایا تو ہم نے کھلایا۔ انھوں نے یہ کیا تو ہم نے وہ کیا، یہاں تک کہ ہم مسابقت میں برابر ہو گئے اور شانہ بشانہ

چلنے لگے تو اُنھوں نے نبی ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ بخدا ہم اس نبی کو کبھی نہیں مانیں گے۔

(۱۷۰) انساب الاشراف، اوّل، ص ۵۶ - ۱۲۵۔

(۱۷۱) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۹۳۔

(۱۷۲) ابن اسحاق، ص ۱۹ - ۱۱۸۔

(۱۷۳) ملاحظہ کیجئے: سیرت النبی، سوم، ص ۶۳۴ وغیرہ۔

(۱۷۴) ابن اسحاق، ص ۱۱۶' نے حضرت سلمہ کو شامل نہیں کیا تھا کیونکہ وُہ کم عمر تھے اور نہ ہی حضرت ام سلمہ کا ذکر کیا ہے۔ البتہ اپنی فہرست مہاجرینِ حبشہ میں موخرالذکر کا نام شامل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ابنِ سعد، سوم، ص ۴۰ - ۲۳۹ - زبیری، ص ۸۰-۳۳۷ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمہ بن ابی سلمہ کی شادی حضرت حمزہ بن عبد المطلب کی ایک دختر سے کر دی تھی اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عہدِ نبوی میں جوان ہو چکے تھے۔ ان کے علاوہ حضرت ام سلمہ کے بطن سے حضرت ابو سلمہ کے ایک اور فرزند حضرت عمر بن ابی سلمہ اور دو دختر حضرت درّہ اور حضرت زینب تھیں۔ اور یہ غالباً سب مکی عہد کے مسلمان تھے۔ ان میں سے حضرت سلمہ اور حضرت درہ سے ان کی نسل نہیں چلی لیکن باقی دو حضرت عمر اور حضرت زینب کی اولادیں خوب ہوئیں۔ اسی خاندان میں حضرت ابو سلمہ کے دو بھائی اور تھے۔ ان میں سے ایک اسود بن عبد الاسد بدر میں کافر مقتول ہوئے تھے جبکہ دوسرے بھائی سفیان بن عبد الاسد زندہ رہے تھے اور اسلام کی دولت سے فیضیاب ہوئے تھے ان کا ذکر کچھ آگے آ رہا ہے۔

نیز ملاحظہ ہو اصابہ نمبر ۴۷۷۰، نساء نمبر ۱۳۰۲، نمبر ۲۳۷۶ وغیرہ خاندان عبد الاسد کے لیے۔

(۱۷۵) ابن اسحاق، ص ۱۱۶، ۱۴۶، ۱۶۷ وغیرہ؛ ابن سعد، چہارم، ص ۱۲۹؛ زبیری، ص ۱۸ - ۳۱۷۔

(۱۷۶) ابن اسحاق، ص ۱۱۶؛ ابن سعد، سوم، ص ۲۴۲؛ زبیری، ص ۳۳۴؛ اصابہ نمبر ۷۳۔

(۱۷۷) ابن اسحاق، ص ۱۱۶، ۱۴۶، ۱۶۷؛ ابن سعد، چہارم، ص ۳۱ - ۱۳۰؛ زبیری، ص ۳ - ۳۰۲؛ اصابہ نمبر ۳۴۰۳۔

(۱۷۸) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۹۳؛ عبد المتعال صعیدی، شباب قریش، ص ۶ - ۵۲۔

(۱۷۹) ابن اسحاق، ص ۱۱۶ وغیرہ: ابن سعد، سوم، ص ۷ - ۲۴۶؛ چہارم، ص ۱۳۶ - ابن سعد کے مطابق یہ عنسی خاندان ابو حذیفہ بن مغیرہ مخزومی کا حلیف تھا اور اس میں حضرات یاسر، سمیہؓ اور ان کے دو فرزند عمار اور عبد اللہ شامل تھے۔

(۱۸۰) ابن اسحاق، ص ۱۴۷۔

(۱۸۱) ابن اسحاق، ص ۱۴۷؛ زبیری، ص ۳۴۲' کے مطابق وہ مہاجر مدینہ تھے اور غزوۂ اُحد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں جان نچھاور کر دی تھی۔ نیز ملاحظہ ہو اصابہ نمبر ۴۳۹۱۔

(۱۸۲) ابن اسحاق، ص ۱۴۷؛ ابن سعد، چہارم، ص ۱۳۵؛ زبیری، ص ۳۳۸۔
یہ حضرت ابو سلمہ کے حقیقی چچا زاد بھائی سفیان کے فرزند تھے۔ غزوہ موتہ میں شہید ہوئے تھے۔ زبیری نے ان کے ایک اور بھائی عمر بن سفیان کو مہاجرینِ حبشہ میں شمار کیا ہے۔

(۱۸۳) ابن اسحاق، ص ۱۴۱؛ ابن سعد، چہارم، ص ۱۳۵؛ زبیری، ص ۳۲۸۔

یہ بھی حضرت ابوسلمہ مخزومی کے حقیقی بھتیجے تھے۔ زبیری نے ان کے ایک اور بھائی حضرت عبیداللہ بن سفیان کا بھی ذکر کیا ہے جو یرموک میں شہید ہوئے تھے۔ اور دوسری ماں سے ان کے مزید سات بھائیوں کا ذکر کیا ہے۔ گویا کہ کل گیارہ کم از کم افرادِ خاندان مسلمان تھے اس گھرانے سے۔

(۱۸۴) ابن اسحاق، ص ۱۴۱؛ ابن سعد، چہارم، ص ۱۳۵؛ زبیری، ص ۳۱۵؛ اصابہ نمبر ۸۹۶۲۔

(۱۸۵) ابن اسحاق، ص ۱۷۰، نے اگرچہ واضح الفاظ میں ابولہب کی ضمانت وعہد کا ذکر نہیں کیا ہے تاہم مراد وہی ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ جب ابوسلمہ مخزومی نے اپنے ہاشمی ماموں ابوطالب سے جوار مانگی تو بنو مخزوم کے کچھ سرداروں نے ابوطالب کو ایسا کرنے سے روکا۔ ابوطالب سے ان کی اس گفتگو کے موقع پر ابولہب بھی موجود تھا۔ ابوطالب کی اس دلیل پر کہ ابوسلمہ نے ان سے جوار کی درخواست کی ہے اور وہ ان کا بھانجا بھی ہے اس لیے وہ انھیں پناہ کیوں نہ دیں جب بنو مخزوم کے سرداروں نے سخت کلامی کی تو ابولہب کو غصہ آگیا اور اس نے کہا "او قریش! تم اس بزرگ کو بہت ستاتے رہے ہو۔ یا تو تم اس بات کو اب یہیں رہنے دو ورنہ میں بھی ان کا ساتھ دوں گا یہاں تک کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔" اس پر بنو مخزوم کے سردار یہ کہہ کر اُٹھ گئے کہ وہ ابولہب کی مدد و اعانت کی قدر کرتے ہیں اور اس سے محروم ہونا پسند نہیں کریں گے۔

(۱۸۶) ابن ہشام کا تبصرہ حضرت شماس کے بارے میں ملاحظہ ہو ابن اسحاق میں ابن ہشام کے تعلیقات ص ۷۲۱ (نمبر ۱۹۴)۔
نیز زبیری، ص ۳۳۲۔

(۱۸۷) ملاحظہ ہو زبیری، ص ۳۴۶-۲۹۹۔

(۱۸۸) ابن اسحاق، ص ۲۸۸؛ ابن سعد، چہارم، ص ۱۳۷- وہ ہشام بن مغیرہ مخزومی کے مولیٰ تھے۔ یعنی ابوجہل مخزومی کے والد کے مولیٰ۔

(۱۸۹) ابن سعد، چہارم، ص ۳۴-۱۳۱؛ زبیری، ص ۲۴-۳۲۳؛ اصابہ نمبر ۹۱۵۲؛ استیعاب، سوم، ص ۳۰-۶۲۸۔

(۱۹۰) زبیری، ص ۳۲۴- حضرت خالد بن ولید مخزومی کے قبول اسلام کے لیے ملاحظہ ہو: ابن سعد، چہارم، ص ۵۳-۲۵۲؛ زبیری، ص ۳۲۰؛ اصابہ نمبر ۲۱۹۷؛ استیعاب، اول، ص ۱۰-۴۰۵۔

(۱۹۱) ابن اسحاق، ص ۱۵۵؛ زبیری، ص ۱۱-۳۱۰؛ اصابہ نمبر ۵۶۳۸؛ استیعاب، سوم، ص ۱۴۸۔

(۱۹۲) اصابہ، نساء نمبر ۵۵؛ نیز ملاحظہ ہو زبیری، ص ۳۰۲۔

(۱۹۳) ابن اسحاق، ص ۵-۵۹۴؛ زبیری، ص ۲-۳۰۱ - وہ ابوجہل کے حقیقی بھائی تھے۔

(۱۹۴) ابن اسحاق، ص ۵-۵۹۴؛ زبیری، ص ۳۴۳؛ اصابہ نمبر ۳۲۸۴۔

(۱۹۵) زبیری، ص ۳۱۲، نے اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ حضرت علی نے حضرت جویریہ بنت ابی جہل کو پیغام دیا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ناپسندیدگی کی وجہ سے نکاح نہیں کیا۔ اور حضرت عتاب بن اسید نے خوشنودیِ رسولِ کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر ان سے شادی کر لی۔ ان سے حضرت عبدالرحمٰن بن عتاب پیدا ہوئے تھے جو جنگ جمل میں حضرت عائشہ کی طرف سے لڑے اور شہید ہوئے تھے۔ حضرت جویریہ کے لیے مزید دیکھئے اصابہ نساء نمبر ۲۴۹۔

زبیری، ص ۲۱۲ نے ابوجہل مخزومی کے متعدد فرزندوں اور دختروں کا ذکر کیا ہے جو سب کے سب فتح مکہ میں غالباً مسلمان ہو گئے تھے اور جنھوں نے بعد میں اسلامی ریاست کے لیے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ ان میں ابو علقمہ، زرارہ بن ابوجہل، ابوحاجب، تمیم بن ابوجہل اور علقمہ بن ابی جہل تھے۔ موخرالذکر کی ماں مختلف تھیں۔ ابوجہل کی چار صاحبزادیاں تھیں جن میں حضرت جویریہ بنت ابی جہل کے علاوہ صخرہ، حنفاء اور اسماء تھیں۔ ان میں سے حنفاء سہیل بن عمرو بن عبد شمس عامری کی اہلیہ تھیں اور اسماء ولید بن عبد شمس بن مغیرہ مخزومی کی اور تیسری دختر صخرہ ابوسعید بن حارث بن ہشام کے نکاح میں تھیں۔ ان میں سے موخرالذکر کی نسل نہیں چلی تھی اور باقی کی نسلیں خوب پھلی پھولی تھیں۔

(۱۹۶) زبیری، ص ۱۶-۲۱۵: اصابہ نمبر ۴۵۳۴؛ استیعاب، دوم، ص ۶۴-۲۶۲ اور اصابہ نمبر ۸۲۴۸ بالترتیب۔

(۱۹۷) زبیری، ص ۲۱۷: اصابہ نمبر ۵۹۶ اور ۴۶۶۲۔ ان کا اصل نام بحیر تھا جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدل کر عبداللہ رکھ دیا تھا۔ نیز ملاحظہ ہو: استیعاب، دوم، ص ۹۹-۲۹۸۔

(۱۹۸) زبیری، ص ۲۳۰: اصابہ نمبر ۹۱۴۷۔

(۱۹۹) زبیری، ص ۳۳۲: اصابہ (کنیت)، نمبر ۱۰۸؛ اسدالغابہ، پنجم، ص ۲-۲۶۱۔

(۲۰۰) زبیری، ص ۳۳۲۔

(۲۰۱) زبیری، ص ۳۳-۳۳۲: اصابہ نمبر ۱۶۷۵ اور ۵۸۰۳؛ نیز اصابہ نمبر ۳۲۴۶۔

(۲۰۲) زبیری، ص ۳۳۳ اور اصابہ نمبر ۳۲۴۶۔

(۲۰۳) زبیری، ص ۳۴-۳۳۳، ۳۴۵، اصابہ نمبر ۴۶۸۹، ۵۱۱۶، ۹۰۸۷، ۱۶۹۶۔ حضرت سہل بن وہب مخزومی کا اصل نام حزن تھا جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدل دیا تھا۔

(۲۰۴) زبیری، ص ۳۴۴ (۲۰۵) زبیری، ص ۳۴۵

(۲۰۶) ایک موٹے سے اندازے کے لیے ملاحظہ کیجئے: زبیری، ص ۳۴۶-۲۹۹۔ اس کا کچھ اندازہ بنو مخزوم کے خاندانوں کی تفصیل سے بھی ہوتا ہے جو مختصراً حسب ذیل ہے:

(الف) بنو مخزوم بن یقظہ کے بنیادی خاندان چار تھے: (۱) بنو عمر بن مخزوم (۲) بنو عامر بن مخزوم (۳) بنو عمران بن مخزوم اور (۴) بنو عمیرہ بن مخزوم۔ بنو عمر بن مخزوم کے تین فرزند تھے عبداللہ، عبیداللہ اور عبدالعزیٰ۔ عبداللہ بن عمر کے چھ فرزند تھے: مغیرہ، عثمان، عائذ، خالد، ابوجندب اسد اور قیس۔ لیکن تعداد و شرف اور عظمت کے لحاظ سے اصل گھرانا بنو مغیرہ بن عبداللہ بن مخزوم کا تھا۔

(ب) بنو المغیرہ بن عبداللہ: (۱) بنو ہاشم بن مغیرہ (۲) بنو ہشام بن مغیرہ (۳) بنو ابی حذیفہ مہشم بن مغیرہ،

(۴) بنوابی ربیعہ عمرو بن مغیرہ (۵) بنوابوامیہ حذیفہ بن مغیرہ (۶) بنو حذاش بن مغیرہ (۷) بنو زہیر بن مغیرہ (۸) بنوابی زہیر تمیم بن مغیرہ (۹) بنو فاکہ بن مغیرہ (۱۰) بنو ولید بن مغیرہ (۱۱) بنو عبد شمس بن مغیرہ (۱۲) بنو حفص بن مغیرہ (۱۳) بنو عثمان بن مغیرہ ——ان خاندانوں کے اہم ترین افراد سے ان کا تعارف ذیل میں پیش ہے۔

۱ - بنو ہاشم بن مغیرہ : حنتمہ بنت ہاشم حضرت عمر بن خطاب کی والدہ ماجدہ - اولادِ زرینہ سے نسل نہیں چلی۔

۲ - بنو ہشام " : عثمان بن ہشام اور حارث بن ہشام، ابو جہل عمرو بن ہشام، سلمہ بن ہشام وغیرہ۔
——بنو حارث بن ہشام :(۱) عبدالرحمٰن الشرید —— بہت بڑا گھرانا تھا اور متعدد دختر فرزند تھے جو بعد میں مشہور ہوئے۔
——بنوابی جہل بن ہشام :(۱) حضرت عکرمہ وغیرہ اوپر ذکر آچکا ہے۔

۳ - بنوابی حذیفہ بن مغیرہ : حضرت ہشام بن ابی حذیفہ - مہاجر حبشہ۔

۴ - بنو ابی امیہ " : عبداللہ بن ابی امیہ، ان کی بہن ام سلمہ بنت ابی امیہ زوجہ کریمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، زہیر اور مہاجر وغیرہ۔

۵ - بنو ابی ربیعہ " : عبداللہ (بحیر) بن ابی ربیعہ، عیاش بن ابی ربیعہ - موخرالذکر کا گھرانا کافی بڑا تھا۔

۶ - بنو فاکہ بن مغیرہ : ابو قیس جو بدر میں کافر مقتول ہوا۔ نسل ختم ہوگئی۔

۷ - بنو عبداللہ " : عثمان بن عبداللہ، بدر میں اسیر ہوا اور نخلہ میں بچ نکلا تھا۔ نوفل خندق میں مقتول ہوا، نسل نہیں چلی۔

۸ - بنو ولید " : حضرت خالد بن ولید مخزومی اور ان کے محترم بھائی اور ان کی اولادیں - کافی بڑا گھرانا تھا۔

۹ - بنو عبد شمس " : حضرت ولید بن عبد شمس یمامہ میں حضرت خالد بن ولید کے شریک تھے۔ شہید ہوئے۔ ان کی اولادیں تھیں۔

۱۰ - بنو حفص " : حضرت عمرو بن حفص اور ان کی اولادیں۔

(ج) بنو عثمان بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم : حضرات حریث، حویرث، سعید بن حریث، عمرو بن حریث۔

(د) بنو عائذ بن عبداللہ " " : حضرت عبداللہ بن ابوالسائب وغیرہ۔

(س) بنو اسد " " " : حضرت ارقم بن ابی الارقم کا خاندان۔

(ط) بنو خالد " " " : حضرت وابصہ بن خالد کا خاندان۔

(ع) بنو ہلال " " " : حضرات ابو سلمہ بن عبدالاسد، سفیان بن عبدالاسد وغیرہ کا خاندان۔ کافی بڑا گھرانا تھا۔

(ف) بنو عبید بن عمر بن مخزوم: حضرت مطلب بن عبداللہ بن مطلب بن حنطب کا خاندان جو بعد میں بہت وسیع و عظیم ہوا۔

(ل) بنو عامر بن مخزوم: حضرت عثمان الشماس بن عثمان اور ان چچاؤں کا خاندان جن میں حضرت سعید بن یربوع بھی شامل تھے۔

(م) بنو عمران " ": ابو ہبیرہ بن وہب زوج ام ہانی بنت ابی طالب اور حضرت سہل (حزن) ابی وہب کا گھرانا جو متعدد ذیلی خاندانوں پر مشتمل تھا۔

(ن) بنو عمیرہ " ": نسل نہیں چلی۔

یہ تفصیل صبر آزما تو ضرور ہے مگر اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے بنو مخزوم کے تقریباً ہر گھرانے میں ابتدا ہی سے اپنے ماننے والے بنا لیے تھے اور دوسرا اہم نکتہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عددی لحاظ سے عہد نبوی میں یہ گھرانا/بطن قریش اصل میں قبیلہ بن چکا تھا اور اس میں مرد و عورت اور بچوں سمیت ہزاروں افراد تھے۔

(۲۰۷) ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون بنو ہاشم اور بنو امیہ کی رقابت پر، ص ۱۸-۱۷۔

(۲۰۸) زبیری، ص ۳۶۴-۵؛ ابن سعد، سوم، ص ۳۷۹-۸۰ وغیرہ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے فرمایا کرتے تھے کہ زید بن عمرو بن نفیل خود ایک اُمت ہو کر قیامت کے دن اُٹھیں گے۔

(۲۰۹) ابن اسحاق، ص ۱۱۶، ۱۵۵-۶؛ زبیری، ص ۳۶۵؛ اصابہ نمبر ۳۲۵۴۔

(۲۱۰) زبیری، ص ۳۶۵؛ اصابہ نساء نمبر ۶۹۲؛ استیعاب، چہارم، ص ۳۶۵۔

(۲۱۱) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۹۱۔

(۲۱۲) ابن اسحاق، ص ۱۱۶ وغیرہ؛ ابن سعد، چہارم، ص ۱۳۸-۳۹؛ زبیری، ص ۳۸۰-۸۱؛ اصابہ نمبر ۸۷۷۴، ۴۰۳۴، نساء ۵۷۴، ۱۸۶۱۰ و نساء ۱۱۸، نساء ۸۶۔

(۲۱۳) زبیری، ص ۳۶۸؛ اصابہ نساء ۹۱۹ اور ۳۶۴۰۔

(۲۱۴) ابن اسحاق، ص ۱۴۶؛ ابن سعد، چہارم، ص ۱۳۹؛ زبیری، ص ۳۸۱-۸۲؛ اصابہ ۵۴۸۳ اور ۸۷۴۸۔

(۲۱۵) ابن اسحاق، ص ۱۴۶؛ ابن سعد، چہارم، ص ۱۴۰؛ زبیری، ص ۳۸۱-۸۲؛ اصابہ ۵۴۸۳ اور ۸۷۴۸۔

(۲۱۶) ابن اسحاق، ص ۱۴۶؛ ابن سعد، چہارم، ص ۱۴۱؛ زبیری، ص ۳۸۱؛ اصابہ ۵۷۵۱ اور ۵۵۰۸۔

(۲۱۷) ابن سعد، چہارم، ص ۱۴۱۔

(۲۱۸) ابن سعد، چہارم، ص ۱۴۱-۴۲؛ زبیری، ص ۳٦۷۔

(۲۱۹) ابن سعد، چہارم، ص ۱۸۸-۹۔

(۲۲۰) اصابہ نساء ۲۷۔ زبیری، ص ۳۸۱۔

(۲۲۱) زبیری، ص ۳۴۷-۸؛ اصابہ ۲۸۹۱؛ استیعاب، اول، ص ۵۴۱-۴۴۔

(۲۲۲) ابن اسحاق، ص ۱۵۵-٦۔

(۲۲۳) ابن اسحاق، ص ۱۵۹؛ زبیری، ص ۴۰۹۔

(۲۲۴) زبیری، ص ۳۴۷-٦۳۔

(۲۲۵) ابن سعد، چہارم، ص ۴۲ وغیرہ؛ زبیری، ص ۳۴۷؛ اصابہ ۴۸۲۵۔

(۲۲٦) ابن سعد، ہشتم، ص ۸۱-۵؛ زبیری، ص ۳۴۷؛ اصابہ نساء ۲۹۴۔

(۲۲۷) ملاحظہ ہو زبیری، ص ۳۴۷-٦۳؛ اصابہ ۵۱۲۵، ۲۹۵۳؛ ٦۱۴۹ اور استیعاب، سوم، ص ۱۳٦-۳۷؛ اصابہ ٦۲۳۵ اور ٦۲۲۲۔

(۲۲۸) ابن سعد، سوم، ص ۳۷۷؛ زبیری، ص ۳٦۳؛ اصابہ ٦۲۰۷؛ اسدالغابہ، سوم، ص ۲۹۵۔

(۲۲۹) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سید سلیمان ندوی، سیرت النبی، سوم، ص ٦۳۷-۸۔

(۲۳۰) واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۹۱۔

(۲۳۱) ابن اسحاق، ص ۲۱۷۔ مزید بحث کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون "کیا مہاجرین مکہ خالی ہاتھ مدینہ آئے تھے؟

(۲۳۲) ابن سعد، سوم، ص ۳۹۱؛ ابن اسحاق، ص ۳۰۰۔ وہ غزوہ بدر میں پہلے شہید تھے۔

(۲۳۳) ابن اسحاق، ص ۱۱٦ وغیرہ؛ ابن سعد، سوم، چہارم اور ہشتم وغیرہ۔

(۲۳۴) ابن اسحاق، ص ۱۱٦، ۱۲٦ وغیرہ؛ ابن سعد، ہشتم، ص ۲٦۷۔

(۲۳۵) ابن اسحاق، ص ۵۰۳ کا بیان ہے کہ مکہ میں بنو عدی بن کعب میں سے کوئی نہیں باقی رہ گیا تھا۔

(۲۳٦) ابن اسحاق، ص ۲۹٦۔

(۲۳۷) زبیری، ص ۳٦۹-۷٦؛ اصابہ (کنیت) نمبر ۲۰٦، (کنیت) ۲۵۵، ۲٦۴۰، نساء ٦۱۹۔ بنو عویج بن عدی میں مذکورہ بالا مسلمانوں کے علاوہ متعدد مسلمان عہد نبوی کے تھے۔ بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ متعدد گھرانے مسلمان تھے۔ زبیری کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم سے کم چار پانچ سو افراد کے درمیان ان کی عددی طاقت رہی ہوگی۔

(۲۳۸) ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون بنو ہاشم و بنو امیہ کی رقابت پر۔

(۲۳۹) زبیری۔ ص ۲۹۱؛ نیز ملاحظہ کیجئے: کتاب المنمق، ص ۵۴-۴۵۔

(۲۴۰) ملاحظہ کیجئے حوالہ سابقہ ۹ اور ۱۱۔

(۲۴۱) ابن اسحاق، مذکورہ بالا؛ ابن سعد، سوم ۲۰۰-۱۷۱ وغیرہ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ میں نے جس کسی کو بھی اسلام کی دعوت دی اس نے قبول کرنے میں کچھ نہ کچھ پس و پیش ضرور کیا مگر صرف ایک شخص یعنی حضرت ابو بکر صدیق ایسے تھے جنھوں نے سنتے ہی قبول کر لیا۔

(۲۴۲) ملاحظہ کیجئے حوالہ جات سابق ۲۹ تا ۵۴۔

(۲۴۳) ابن سعد، سوم، ص ۱۹۹ کے مطابق ایک صاحبزادی کا نام ام کلثوم تھا۔

(۲۴۴) حوالہ جات سابق ۴۰ و ۴۱؛ نیز ابن اسحاق، ص ۱۱۶۔

(۲۴۵) ابن اسحاق، ص ۱۱۵؛ ابن سعد، سوم، ص ۲۱۴-۶؛ زبیری، ص ۲۸۰-۲۸۱؛ اصابہ ۴۲۶۶۔ زبیری نے ان کے متعدد فرزندوں کا ذکر کیا ہے جن میں موسیٰ، عمران، محمد، یعقوب، اسماعیل، اسحاق، زکریا، عیسیٰ، یحییٰ شامل ہیں ان کے علاوہ متعدد صاحبزادیاں بھی تھیں۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے عہد نبوی میں کتنے تھے۔ بہر حال یہ یقینی ہے کہ کچھ اولادیں عہد نبوی کی مسلم تھیں۔ ان کے ایک بھائی عثمان بن عبید اللہ بھی تھے مگر ان کی نسل کچھ زیادہ نہیں چل سکی تھی۔ یہی حال ان کے ایک اور بھائی مالک بن عبید اللہ کا ہوا تھا۔

(۲۴۶) ابن اسحاق، ص ۱۴۷؛ زبیری، ص ۲۹۴ کا بیان ہے کہ ان کا حبشہ میں انتقال ہو گیا تھا۔ ابن سعد، چہارم، ص ۱۲۸ نے عمرو بن عثمان کو قادسیہ کا شہید بتایا ہے۔ البتہ زبیری نے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔

(۲۴۷) زبیری، ص ۲۷۶؛ اصابہ ۵۱۵۱۔

(۲۴۸) اسد الغابہ، پنجم، ص ۲۷۵۔

(۲۴۹) زبیری، ص ۲۹۵؛ اصابہ ۸۲۴۵، نساء ۹۷۔

بنو تیم بن مرہ کے کل تین چار خاندان تھے، بنو عمرو بن کعب بن سعد بن تیم، بنو عبد مناف بن کعب اور بنو کعب بن سعد۔ ان میں سے اصل خاندان اول الذکر تھا جس میں شرف و عظمت و نجابت تھی۔

(۲۵۰) بنو سہم کے اصل گھرانے حسب ذیل تھے:

سہم بن عمرو کے دو فرزند تھے: سعد اور سُعَید۔ بنو سعد بن سہم تھے: عدی، حذیم، حذافہ، حذیفہ، سُعَید۔ اور انھیں کی نسلیں اصل میں بنو سہم کے گھرانے بنے۔ ذیل میں یہ گھرانے اور ان کے اہم اشخاص کا تعارف پیش ہے:

۱۔ بنو عدی بن سعد بن سہم: قیس بن عدی، اپنے زمانے میں قریش کے سید تھے اور ان کے فرزند عبد المطلب اور عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف میں منافرہ ہوا تھا۔ بنو سہم مکے میں اتنے زیادہ ہو گئے تھے کہ وہ بنو عبد مناف کے

ہم پلہ ہو گئے تھے۔ لیکن بعثتِ نبوی کے وقت ان کی تعداد کم ہو گئی تھی کیونکہ ان میں بیماری پھیلی اور ایک ایک دن میں کئی کئی موتیں واقع ہوتی گئیں۔

— بنو قیس بن عدی: حارث اور حذافہ، ابو قیس بن حارث، سعید بن حارث وغیرہ۔

— بنو زِبعریٰ: عبداللہ بن الزبعریٰ، مشہور شاعر۔

— بنو حذافہ بن قیس بن عدی: خنیس بن حذافہ، حضرت حفصہ کے پہلے شوہر کا خاندان۔

۲۔ بنو حذیم بن سعد بن سہم: جلد خاندان ختم ہو گیا۔

۳۔ بنو عبد قیس بن عدی بن سعد بن سہم: حضرت عمر بن خطاب کی ماں کا خاندان۔

۴۔ بنو حذیفہ بن سعد بن سہم: نبیہ و منبہ فرزندان حجاج سہمی کا خاندان۔

۵۔ بنو حذافہ بن سعد بن سہم: قیس بن حُذافہ اور ان کے فرزند عدی، فروہ اور نعمان۔ زیادہ تر عورتیں تھیں۔

۶۔ بنو سُعید بن سعد بن سہم: متعدد فرزند تھے۔ ابو وَداعہ کا خاندان۔

۷۔ بنو سُعید بن سہم: ہاشم، مہشم اور ہشام کا خاندان۔

— بنو ہاشم بن سُعید: حضرت عمرو بن العاص کا خاندان۔

— بنو مہشم بن سُعید: حضرت عمیر بن رِئاب بن مہشم کا خاندان۔

(۲۵۱) ابن اسحاق، ص ۱۳۳؛ بلاذری، انساب الاشراف، اول، ص ۱۳۲، ۱۳۸، ۱۴۲ وغیرہ۔ (۲۵۲) ایضاً

(۲۵۳) ابن اسحاق، ص ۱۱۶، ۱۴۶-۱۴۷ وغیرہ؛ ابن سعد، چہارم، ص ۹۱-۱۸۹؛ زبیری، ص ۴۰۲؛ اصابہ ۲۲۹۰، ۶۱۳۴۔ زبیری نے قیس بن حذافہ کی جگہ ابو الاخنس بن حذافہ کا ذکر کیا ہے۔

(۲۵۴) ابن اسحاق، ص ۱۴۷؛ ابن سعد، چہارم، ص ۹۴-۱۹۱؛ زبیری، ص ۴۰۹؛ اصابہ ۸۹۶۶۔

(۲۵۵) ابن اسحاق، ص ۱۴۶-۱۴۷؛ ابن سعد، چہارم، ص ۱۹۷۔

(۲۵۶) ابن سعد، چہارم، ص ۹۷-۱۹۴؛ نیز زبیری، ص ۴۰۱-۴۰۲؛ اصابہ ۱۳۱۹ (کنیت)، ۳۲۴۴، ۸۳۶، ۴۵۹۶۔

(۲۵۷) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۱۷۷۔

(۲۵۸) ابن سعد، چہارم، ص ۲۵۴-۶۱؛ زبیری، ص ۴۰۹-۱۰؛ اصابہ ۵۸۷۷؛ استیعاب، دوم، ص ۵۰۸-۱۵۔

(۲۵۹) ابن سعد، چہارم، ص ۲۶۲؛ زبیری، ص ۴۱۱؛ اصابہ ۴۷۳۸۔

(۲۶۰) ابن ہشام (ابن اسحاق ص ۸۰۷) کے مطابق حضرت عدی بن قیس بن حذافہ ان سردارانِ قریش میں شامل تھے جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اموالِ ہوازن میں سے عطیۂ خاص عطا فرمایا تھا۔

(۲۶۱) زبیری، ص ۴۰۲؛ اصابہ ۴۶۷۰؛ استیعاب، سوم، ص ۳۰۹-۱۱۔

(۲۶۲) زبیری، ص ۴۰۶؛ اصابہ ۱۲۰۵ (کنیت)، استیعاب، چہارم، ص ۲۱۸ اور اصابہ ۸۰۲۳ اور استیعاب، سوم، ص ۱۳-۴۱۲؛ اصابہ ۵۰۱۱ نیز ۵۴۳ (کنیت)؛ اصابہ ۳۰۵۱؛ نیز استیعاب، دوم، ص ۱۰۲۔

(۲۶۳) زبیری، ص ۴۰۵؛ اصابہ نساء ۴۵۳۔

(۲۶۴) بنو زہرہ بن کلاب کے اہم خاندان اور ان کے نمائندہ افراد حسب ذیل تھے:

۱- بنو زہرہ بن کلاب: عبد مناف، حارث - تعداد کے لحاظ سے بنو حارث بن زہرہ اور شرف کے اعتبار سے بنو عبد مناف بن زہرہ اہم تھے - زہرہ بن کلاب دراصل قصی بن کلاب کے بھائی تھے۔

۲- بنو عبد مناف بن زہرہ: وہب، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نانا کا خاندان۔

— بنو وہب بن عبد مناف: اسود بن عبد یغوث بن وہب - رسول کریم کا مخالف اور مذاق اڑانے والا۔

— بنو اہیب بن عبد مناف: مخرمہ بن نوفل بن اہیب - فتح مکہ کے مسلم اور ماہر انساب، حضرت سعد بن ابی وقاص کا خاندان بھی یہی تھا۔

۳- بنو حارث بن عبد مناف: عبد، عبد اللہ، وہب، شہاب - نسل زیادہ تر عبد کے خاندان میں چلی۔

— بنو عبد بن حارث: حضرت عبد الرحمٰن بن عوف بن عبد کا خاندان - حضرت عبد الرحمٰن کے متعدد بھائی اور ان کے گھرانے تھے۔

— بنو عبد اللہ بن حارث: حضرت شہاب بن عبد اللہ کا خاندان۔

— بنو وہب بن حارث: نسل منقطع ہوگئی۔

— بنو اہیب بن حارث: نسل زیادہ نہیں چلی۔

(۲۶۵) ابن اسحاق، ص ۲۹۶۔

(۲۶۶) زبیری، ص ۴۷-۲۵۷۔ (۲۶۷) زبیری، ص ۶۶-۲۶۵۔

(۲۶۸) ایضاً - بحث کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون "کیا مہاجرین مکہ خالی ہاتھ مدینہ آئے تھے؟"

(۲۶۹) زبیری، ص ۶۶-۲۶۵ اور ۶۳-۲۶۲ بالترتیب حضرت شفا اور حضرت عاتکہ کے لیے؛ نیز ملاحظہ کیجئے حضرت مسور بن مخرمہ کے لیے اصابہ ۷۹۹۳؛ استیعاب، سوم، ص ۱۸-۴۱۶۔

(۲۷۰) زبیری، ص ۶۶-۲۶۵۔

(۲۷۱) ابن سعد، چہارم، ص ۱۲۴؛ زبیری، ص ۲۷۴؛ اصابہ ۸۰۲۴، ۴۲۸۵، ۵۰۷۸۔

(۲۷۲) ابن اسحاق، ص ۱۴۷۔

(۲۷۳) ابن سعد، سوم، ص ۴۰-۱۳۷ وغیرہ - نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۱۱۶-۱۱۵، ۱۴۷ وغیرہ؛ ابن سعد، چہارم، ص ۴-۱۲۳؛ زبیری، ص ۶۴-۲۶۳؛ اصابہ ۳۱۹۴؛ استیعاب، دوم، ص ۳۳-۱۸۔

اصابہ ۶۰۵۷، ۴۴۲۳، ۸۹۱۲ -

(۲۷۴) ابن سعد، چہارم، ۶-۱۲۵ ؛ زبیری، ص ۲۷۴ -

(۲۷۵) ابنِ سعد، چہارم، ص ۱۲۵

(۲۷۶) ابن سعد سوم ص ۵۱-۱۵۰ ؛ چہارم، ص ۲۸-۱۲۶ -

(۲۷۷) ابن سعد، چہارم، ص ۸-۱۲۷

(۲۷۸) ابن اسحاق، ص ۱۴۷ ؛ ابن سعد، سوم، ص ۱۶۱ -

(۲۷۹) ابن سعد سوم، ص ۱۶۷

(۲۸۰) ابن اسحاق، ص ۱۱۶

(۲۸۱) زبیری، ص ۲۶۲ ؛ اصابہ ۸۴۰۷ ؛ نیز ملاحظہ کیجئے ؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۷ -

(۲۸۲) بنو اسد دراصل خاندان قصی بن کلاب کی شاخ تھے کیونکہ وہ عبدالعزیٰ بن قصی کی نسل سے تھے - عبدالعزیٰ کے ایک فرزند اسد میں نسل چلی - اسد بن عبدالعزیٰ کے متعدد فرزند اور اتنے ہی گھرانے تھے جو حسب ذیل ہیں :

(۱) بنو حارث بن اسد (۲) بنو مطلب (نسل نہیں چلی) (۳) بنو عبداللہ (نسل نہیں چلی) (۴) بنو نوفل (۵) بنو حبیب (۶) بنو صیفی (نسل نہیں چلی اور اسی طرح طالب، طلیب اور خالد کی نسلیں بھی منقطع ہو گئیں (۷) بنو حویرث بن اسد (۸) بنو ہاشم (۹) بنو مہشم (۱۰) بنو عمرو (ان تینوں کی بھی نسلیں نہیں چل سکیں) (۱۱) خویلد بن اسد (اصل گھرانا تعداد کے اعتبار سے یہی تھا)

- بنو نوفل بن اسد : ورقہ بن نوفل کا خاندان مگر خود ان کی اپنی نسل نہیں چلی - صفوان بن نوفل کی بھی نسل منقطع ہو گئی - البتہ عدی بن نوفل کا گھرانا چلا -
- بنو حویرث بن اسد : عثمان بن حویرث مکہ کے ممتاز ترین سرداروں میں تھے لیکن وہ مکہ کے بادشاہ نہیں بن سکے ان کی نسل بھی نہیں چلی - مطلب بن حویرث کی نسل بھی منقطع ہو گئی -
- بنو حبیب بن اسد : کوئی قابلِ ذکر شخص نہیں ہوا -
- بنو حارث بن اسد : اصل گھرانا تھا اور نسل بھی خوب پھلی پھولی - ان کے دو بیٹے تھے : زہیر اور ہاشم - اسلامی عہد میں ان دونوں کے گھرانے خوب پھلے - ان کے اہم ذیلی گھرانے تھے :

  —— بنو امیہ بن حارث : حضرت عمرو بن امیہ، مہاجر حبشہ، سفیان بن حارث وغیرہ -

  —— بنو ہاشم بن حارث : ابو البختری عاصی، شاعرِ وقت، بدر میں مقتول - حضرت الاسود بن ابی البختری وغیرہ -

- بنو مطلب بن اسد : ابو زمعہ اسود بن مطلب، اسلام و رسول کے مذاق اڑانے والوں میں اور سردار قریش - اس کا فرزند زمعہ مقتولِ بدر - حضرت ہبار بن اسود بعد میں اسلام لائے - ان کی اولاد - اور دوسرے صحابہ مثلاً یزید بن زمعہ -

  —— بنو ابی حُبَیش بن مطلب : حضرت عبداللہ بن سائب صحابیِ رسول -

○ بنو خویلد بن اسد: عدی، حزام، عوّام، نوفل، حضرات خدیجہ و ہالہ۔
——بنو عدی: نسل نہیں چلی۔
——بنو حزام: حضرت حکیم بن حزام اوران کے فرزند ہشام، خالد وغیرہ۔
——بنو عوّام: حضرات زبیر بن عوام اوران کے بھائی عبدالرحمٰن، سائب وغیرہ کا خاندان۔

ملاحظہ ہو زبیری، ص ۲۵۶-۲۰۵۔

(۲۸۳) ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۱۲۷ اور ۱۳۳ وغیرہ؛ زبیری، مذکورہ بالا۔

(۲۸۴) ابن اسحاق، ص ۱۱۵؛ ابن سعد، سوم، ص ۲-۱۰۰؛ زبیری، ص ۲۳۵؛ اصابہ ۳۰۸۹۔

(۲۸۵) ابن سعد، ہشتم، ص ۱۱۔ (۲۸۶) ابن سعد، چہارم، ص ۱۱۹؛ زبیری، ص ۶-۲۳۵۔

(۲۸۷) زبیری، ص ۲۳۵، ان کا اصل نام عبدالکعبہ تھا جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدل دیا تھا؛ نیز اصابہ ۵۱۸۰۔ ان کی زوجہ محترمہ حُمینہ بنت عبدالعزی خزاعی مبایعات میں سے تھیں۔ ملاحظہ ہو اصابہ نساء ۲۱۱، ۲۴۸ اور ۳۰۹۔ ان کے دو فرزند عبداللہ اور عبیداللہ تھے۔ اول الذکر حضرت عثمان غنی کے ساتھ اور ثانی الذکر جنگِ صفین میں شہید ہوئے تھے۔

(۲۸۸) ابن اسحاق، ص ۱۱۱؛ ابن سعد، ہشتم، ص ۵۲؛ زبیری، ص ۳۱-۲۳۰؛ اسد الغابہ، پنجم، ص ۵-۴۴۴ وغیرہ

(۲۸۹) زبیری، ص ۲۳۴۔ نیز ملاحظہ کیجئے: ابن سعد، چہارم، ص ۱۱۹۔

(۲۹۰) زبیری، ص ۲۳۰؛ اصابہ نساء ۱۰۷۵؛ اسد الغابہ، پنجم، ص ۸-۵۵۷۔

(۲۹۱) ابن سعد، چہارم، ص ۱۲۰؛ زبیری، ص ۲۳۰؛ اصابہ ۱۷۱۔

(۲۹۲) ابن سعد، چہارم، ص ۱۲۰؛ زبیری، ص ۲۱۲؛ اصابہ ۵۷۶۶۔

(۲۹۳) ابن سعد، چہارم، ص ۱۲۱؛ زبیری، ص ۲۲۱۔

(۲۹۴) مونٹگری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۹۲ کا یہ خیال ہے۔

(۲۹۵) ابن اسحاق، ص ۱۱۶ وغیرہ؛ ابن سعد، سوم، ص ۵-۱۱۴۔

(۲۹۶) زبیری، ص ۲۱۹؛ اصابہ ۷۹۲۹؛ استیعاب، سوم، ص ۱۰-۶۰۹۔ ان کی متعدد اولادیں بھی مسلمان تھیں۔

(۲۹۷) زبیری، ص ۲۳۱؛ اصابہ ۱۸۰۰؛ ابن اسحاق، ص ۵۹۴۔ ان کے فرزند ہشام کے لیے ملاحظہ کیجئے: زبیری، ص ۲۳۱ اور اصابہ ۸۹۶۵۔

(۲۹۸) بنو اسد کے دوسرے مسلمانوں میں یہ حضرات شامل تھے، حضرات اسود بن ابو البختری، عدی بن نوفل بن اسد، عطاء بن ذؤیب بن تُویت اور حولاء بنت تُویت، اسود بن ابو البختری کی والدہ عاتکہ بنت امیہ/

بنو حارث بن اسد، عبد اللہ بن سائب بن ابی حبیش بن مطلب، عبد اللہ بن زمعہ، عبد اللہ بن زبیر بن عوام وغیرہ۔
ظاہر ہے کہ بنو اسد کے عہد نبوی کے کل مسلمان مردوں اور عورتوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔

(۲۹۹) بنو جمح کے اہم خاندان یہ تھے:

(۱) بنو خلف بن وہب: امیہ بن خلف، ابی بن خلف، دشمنانِ رسول کریم جو بالترتیب بدر اور اُحد میں مقتول ہوئے۔ — بنو وہب بن خلف، بنو امیہ بن خلف، بنو اسید بن خلف، بنو ابی بن خلف، بنو احیحہ بن خلف۔

(۲) بنو حبیب بن وہب: حضرت عثمان بن مظعون کا گھرانا۔ / بنو معمر بن حبیب بن وہب: بنو حارث بن معمر۔

(۳) بنو وہبان بن وہب: کوئی مشہور شخص نہیں گزرا۔

(۴) بنو اہیب بن حذافہ بن جمح: کئی ذیلی گھرانے تھے: بنو عمیر، بنو عمرو، بنو عبد مناف بن عمیر وغیرہ۔

(۵) بنو سعد بن جمح (۶) بنو عویج بن سعد، بنو لوذان بن سعد، بنو ربیعہ بن سعد۔ موخر الذکر کا ذیلی گھرانا تھا بنو عامر بن ہذیم، جس کے نمائندہ شخص تھے حضرت سعید بن عامر۔

ملاحظہ ہو زبیری، ص ۴۰۰ - ۳۸۶۔

(۳۰۰) ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اول، ص ۸ - ۱۳۷؛ ابن اسحاق، ص ۱۲۷ اور ۱۳۳ وغیرہ؛ زبیری، ص ۳۸۷۔

(۳۰۱) ابن اسحاق، ص ۱۱۷۔

(۳۰۲) ایضاً؛ ابن سعد، سوم، ص ۱-۲۹۳؛ زبیری، ص ۴ - ۳۹۳؛ اصابہ ۵۴۴۵؛ استیعاب، سوم، ص ۸۹ - ۸۵؛ اصابہ ۲۰۶۶، ۴۹۵۵، ۷۰۸۲۔

(۳۰۳) زبیری، ص ۳۹۴۔

(۳۰۴) ابن اسحاق، ص ۱۵ - ۲۱۴؛ نیز ملاحظہ کیجئے مضمون "کیا مہاجرین خالی ہاتھ مدینہ آئے تھے؟" ص ۲۱۔

(۳۰۵) ابن اسحاق، ص ۱۱۶؛ ابن سعد، سوم، ص ۴۰۲ وغیرہ؛ چہارم، ص ۱ - ۲۰۱؛ زبیری، ص ۳۹۵؛ اصابہ ۱۷۵۵، ۱۵۳۴، ۸۱۳۵، ۷۷۵۹، ۱۳۸۷، نساء ۱۱۷۶۔

(۳۰۶) ابن اسحاق، ص ۱۴۷؛ ابن سعد، چہارم، ص ۲۰۲؛ زبیری، ص ۵ - ۳۹۴؛ اصابہ ۱۱۹۰؛ استیعاب، اول، ص ۲۲۹؛ اصابہ ۳۳۲۲ وغیرہ۔

(۳۰۷) ابن اسحاق، ص ۱۴۷؛ ابن سعد، چہارم، ص ۲۰۳؛ زبیری، ص ۳۹۶ نے حضرت نُبَیہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔

(۳۰۸) ابن اسحاق، ص ۲۰ - ۲۱۸؛ ابن سعد، چہارم، ص ۲۰۱ - ۱۹۹؛ زبیری، ص ۳۹۱؛ اصابہ ۱۹۱؛ استیعاب، سوم، ص ۷ - ۱۲۶۔ حضرت عمیر بن وہب جمحی کے لیے ملاحظہ کیجئے: زبیری، ص ۳۹۱؛ اصابہ ۶۰۵۳؛ استیعاب، دوم، ص ۶ - ۴۸۴؛ نیز ابن اسحاق، ص ۵۵۵۔

(۳۰۹) ابن سعد، چہارم، ص ۲۷۹؛ زبیری، ص ۳۹۹؛ اصابہ ۳۲۶۳۔

(۳۱۰) ابن اسحاق، ص ۵۵۵؛ زبیری، ص ۳۸۸؛ اصابہ ۴۰۶۸۔

(۳۱۱) زبیری، ص ۳۸۹؛ اصابہ ۶۱۷۳، ۶۲۱۶ اور نساء ۱۶۱ نیز استیعاب، دوم، ص ۹-۳۳۸۔

(۳۱۲) زبیری، ص ۳۹۲؛ اصابہ ۱۷۹ اور ۵۴۔

(۳۱۳) زبیری، ص ۳۹۹؛ اصابہ ۳۵۵ اور ۱۰۰۸ (کنیت)؛ نیز ملاحظہ کیجئے: ابن سعد، پنجم، ص ۴۵۰۔

(۳۱۴) زبیری، ص ۴۰۰-۳۸۰، نے بنو جمح کے مزید مسلمانوں میں حسب ذیل حضرات وخواتین کو شمار کیا ہے:

حضرت عامر بن مسعود بن امیہ بن خلف (اور غالباً ان کا پورا خاندان)، اولاد و اخلاف امیہ بن خلف اور ابی بن خلف، حضرت عبدالرحمن بن سابط بن ابی حُمیضہ بن عمرو بن اہیب (اور ان کے بقیہ بھائی بھی)، حضرت مُرّہ بن ابو عزّہ جمحی اور ان کی اولاد ذکور و اناث، حضرت ابو محذورہ کے کل بھائی، حضرت سعید بن عامر کی بہن حضرت فاطمہ بنت عامر جو حضرت معاویہ بن مغیرہ بن ابی العاص کی زوجہ تھیں اور جن سے عبدالملک بن مروان کی ماں حضرت عائشہ پیدا ہوئی تھیں۔ حضرت عائشہ بھی عہد نبوی کی مسلم تھیں۔ ان کے لیے بالترتیب ملاحظہ ہو اصابہ ۴۴۲۰، ۳۰۲۶، ۵۰۹۷، نساء ۱۴۸ اور نساء ۷۰۹۔ یقینی طور پر یہ بھی مکمل فہرست نہیں ہے متعدد دوسرے ایسے ہوں گے جن کا ذکر دوسرے مآخذ میں ملے گا۔

(۳۱۵) ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون "بنو امیہ اور بنو ہاشم کی رقابت کا تاریخی پس منظر"، مذکورہ بالا۔

(۳۱۶) مونٹگمری واٹ، ص ۹۴، کا خیال ہے کہ وہ بعثتِ نبوی کے وقت مکہ کے معاملات میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی پرانی حیثیت نہیں باقی رہی تھی لیکن اب بھی تگی سیاست وسماج میں نمایاں مقام کے حامل تھے۔

(۳۱۷) ابن اسحاق، ص ۱۱۶؛ ابن سعد، سوم، ص ۲۲-۱۱۶؛ زبیری، ص ۲۵۴؛ اصابہ ۸۰۰۳۔

(۳۱۸) ابن اسحاق، ص ۱۱۶، ۱۴۷ وغیرہ؛ ابن سعد، چہارم، ص ۱۲۱؛ زبیری، ص ۲۵۴؛ اصابہ ۸۲۳۳۔

(۳۱۹) ابن اسحاق، ص ۱۴۷۔

(۳۲۰) ابن سعد، چہارم، ص ۲۳-۱۲۱۔

(۳۲۱) ابن اسحاق، ص ۱۶۸۔

(۳۲۲) ابن اسحاق، ص ۳۲۸؛ ابن سعد، سوم، ص ۱۱۶، ۱۲۲۔

(۳۲۳) زبیری، ص ۲۵۶؛ اصابہ نساء ۱۷۲۔

بنو عبدالدار کے مذکورہ بالا مسلموں کے لیے دیکھئے زبیری، ص ۶-۲۵۴؛ اصابہ ۱۲۴۸، ۸۲۷۰، ۳۵۹۱۔

(۳۲۴) ابن سعد، چہارم، ص ۲۵۲؛ زبیری، ص ۲۵۱؛ اصابہ ۵۴۴۰؛ استیعاب، سوم، ص ۹۳-۹۲۔

(۳۲۵) ابن اسحاق، ص ۵۹۴، ۸۰۷۔ ابن اسحاق نے حضرت حارث بن حارث بن کلدہ عبدری کا نام لیا ہے جبکہ

ابن ہشام نے شیبہ بن عثمان، ابوالسنابل بن بعکک بن حارث اور عکرمہ بن عامر بن ہاشم کو بنو عبدالدار سے شمار کیا ہے؛ نیز ملاحظہ ہو زبیری، ص ۲۵۵؛ اصابہ ۸۷۲۰۔

(۳۲۶) کتاب المنمق، ص ۲۶۹؛ زبیری، ص ۲۵۶-۷؛ ابن سعد، سوم، ص ۱۲۳؛ اصابہ ۴۲۸۸۔

(۳۲۷) بنو عامر بن لوی کے اہم گھرانے حسب ذیل تھے:

۱ - بنو حسل بن عامر: بنو مالک جس کے ذیلی گھرانے تھے بنو جذیمہ، بنو عبد وُدّ، اور موخر الذکر کا ذیلی گھرانا تھا بنو ابوقیس جو کافی بڑا گھرانا تھا۔

۲ - بنو معیص بن عامر: بنو عبد بن معیص اور بنو عمرو بن معیص، اور ان کے بھی اہم ذیلی گھرانے تھے۔

۳ - بنو عویص بن عامر۔

(۳۲۸) ابن اسحاق، ص ۵۰۴؛ ابن سعد، پنجم، ص ۴۵۳؛ زبیری، ص ۴۱۷؛ اصابہ ۲۵۶۶؛ استیعاب، دوم، ص ۱۰۸-112۔

(۳۲۹) ابن اسحاق، ص ۱۱۶، ۱۴۷؛ ابن سعد، چہارم، ص ۲۰۳-۴؛ زبیری، ص ۴۲۱-۲۔

(۳۳۰) ابن سعد، چہارم، ص ۲۰۴؛ ہشتم، ص ۵۲؛ زبیری، ص ۴۲۲۔

(۳۳۱) ابن سعد، چہارم، ص ۲۰۵-12؛ زبیری، ص ۴۳۷؛ اصابہ ۵۷۵۹ اور ۵۹۳۰۔

(۳۳۲) ابن اسحاق، ص ۱۴۷۔

(۳۳۳) ابن سعد، سوم، ص ۴۰۳؛ زبیری، ص ۴۲۸؛ اصابہ ۵۰۰ (کنیت)؛ نیز ابن اسحاق، ص ۳۲۸۔

(۳۳۴) ابن اسحاق، ص ۱۴۷؛ ابن سعد، ہشتم، ص ۲۷۲۔

(۳۳۵) زبیری، ص ۴۲۶؛ ابن سعد، سوم، ص ۴۰۴؛ اصابہ ۴۹۳۰۔

(۳۳۶) ابن سعد، سوم، ص ۴۰۶؛ زبیری، ص ۴۱۹؛ اصابہ ۴۷۲۷۔

(۳۳۷) زبیری، ص ۴۲۲؛ اصابہ ۷۶۲۸۔ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت سودہ بنت زمعہ کے ایک بھائی تھے۔

(۳۳۸) ابن اسحاق، ص ۱۴۷

(۳۳۹) ابن سعد، سوم، ص ۴۰۵

(۳۴۰) ابن اسحاق، ص ۱۴۷

(۳۴۱) ابن اسحاق، ص ۳۲۸

(۳۴۲) ابن اسحاق، ص ۱۴۷-۹؛ زبیری، ص ۴۱۹-۲۰؛ اصابہ ۲۰۲ (کنیت)؛ استیعاب، چہارم، ص ۳۳-۳۵۔

(۳۴۳) زبیری، ص ۴۱۹-۲۱ نے اس خاندان کے حسب ذیل مزید مسلمانوں کا ذکر کیا ہے: حضرت عتبہ بن سہیل بن عمرو، ہند بنت سہیل اور عمرو بن سہیل اور حاطب بن عمرو، سلیط بن سلیط۔

نیز ملاحظہ کیجئے: اصابہ ۵۳۹۵، نساء ۵۹۲، ۱۵۳۶، ۳۴۱۲۔

(۳۴۴) زبیری، ص ۴۳۳؛ اصابہ ۲۰۲؛ استیعاب، دوم، ص ۷۷-۵-۳ - زبیری کے مطابق ان کے کئی بھائی تھے جیسے اویس اکبر، اویس اصغر، ایاس اور ابو ہند۔

(۳۴۵) زبیری، ص ۴۱۸؛ کتاب المنمق، ص ۶۱-۲۶۰؛ اصابہ ۳۵۶۶؛ استیعاب، دوم، ص ۱۲-۱۰۸۔

(۳۴۶) زبیری، ص ۴۲۶؛ اصابہ ۱۸۰۸ - حضرت معاویہ کی آخر خلافت میں انتقال فرمایا جبکہ ان کی عمر ایک سو بیس سال کی تھی۔

(۳۴۷) زبیری، ص ۴۳۱؛ اصابہ ۸۹۷۲۔

(۳۴۸) زبیری، ص ۴۲۱؛ اصابہ ۵۲۶۵؛ استیعاب، دوم، ص ۴۴۲- نیز اصابہ ۶۲۰۶؛ استیعاب، دوم، ص ۴۱۰ - بالترتیب -

(۳۴۹) بنو عامر بن لوی کے دوسرے مسلمانوں میں زبیری نے حسب ذیل کا نام گنایا ہے:

۱ - بنو قدان بن عبد شمس: حضرت عبداللہ بن السعدی — اصابہ ۲۷۰۹

۲ - بنو ابو قیس بن عبدِ وُدّ: حضرت ابو قیس بن عمرو بن عبدِ وُد — اصابہ ۹۳۲ (کنیت)

حضرت مجلل بن عبد وُد ابی قیس اور ان کی صاحبزادی ام جمیل۔ — اصابہ نساء ۱۱۷۶

حضرت ابو الحکم بن حویطب — اصابہ ۶۲۰۶

حضرت عبد الرحمٰن بن حویطب اور ابو سفیان بن حویطب

۳ - بنو معیص بن عامر بن لوی: علاء بن وہب بن عبد بن وہبان — اصابہ ۵۶۴۴

مکرز بن حفص بن الاحنف — اصابہ ۸۱۸۹

ابو علی بن حارث بن رخصہ اور علی بن عبید اللہ بن حارث - یمامہ میں شہید ہوئے۔

اصابہ ۵۶۸۵

بُسر بن ارطاۃ — اصابہ ۶۳۹

یہ یقینی ہے کہ مذکورہ بالا صحابہ کرام سے کہیں زیادہ تعداد اب بھی ان گمنام مسلمانانِ عہد نبوی کی ہے جن کا تذکرہ نہیں آسکا ہے۔

(۳۵۰) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۸-۶ -

(۳۵۱) ابن اسحاق، ص ۱۱۶ -

(۳۵۲) ابن اسحاق، ص ۱۲۷؛ زبیری، ص ۴۴۵؛ اصابہ ۴۳۹۳ -

(۳۵۳) زبیری، ص ۴۴۵ نے ان کے دو فرزندوں یزید اور عمیر اور ان کی والدہ ہند بنت جابر بن وہب بن جناب کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ ان کی اور ان کے بھائیوں کی نسل منقطع ہوگئی۔

(۳۵۴) ابن اسحاق، ص ۱۱۶؛ ابن سعد، چہارم، ص ۲۱۲؛ اصابہ ۳۵۱۳ - ان کا اصل نام سہیل بن وہب تھا اور وہ زبیری ص ۴۴۶ کے مطابق بدری صحابی تھے۔

(۳۵۵) ابن اسحاق، ص ۱۴۷؛ ابن سعد، چہارم، ص ۲۱۳؛ زبیری، ص ۴۴۶؛ اصابہ ۵۸۳۳، ۹۱۶۲ نیز ابن اسحاق، ص ۳۳۰۔

(۳۵۶) ابن اسحاق، ص ۳۳۰؛ زبیری، ص ۴۴۶؛ اصابہ ۳۵۵۴ اور ۴۰۸۵۔

(۳۵۷) زبیری، ص ۴۴۶ نے حضرت عمرو بن ابی سرح بن ربیعہ بن ہلال اور ان کے بھائی وہب کو بدری صحابہ میں شمار کیا ہے۔
نیز ملاحظہ ہو اصابہ ۵۸۳۳، ۹۱۶۲۔

(۳۵۸) بنو عامر بن لوی کے دوسرے مسلمانوں کا ذکر زبیری، ص ۴۴۶ - ۴۴۵ کے مطابق حسب ذیل ہے:

۱- حضرت نافع بن عبد قیس بن لقیط بن عامر بن امیہ اصابہ ۸۶۵۳

۲- حضرت سہیل بن وہب (وہ حضرات سہل بن بیضا اور ان کے بھائی صفوان کے حقیقی بھائی تھے) اصابہ ۳۵۵۴

۳- حضرت عیاض بن غنم بن زہیر (جنھوں نے خلافتِ صدیقی اور فاروقی میں کارہائے نمایاں انجام دئے) اصابہ ۶۱۳۵

ان کے علاوہ بھی یقیناً متعدد بلکہ بہت سے عام مسلمان عہد نبوی میں تھے۔

(۳۵۹) اسد الغابہ، چہارم، ص ۷۰-۲۳۶؛ زبیری، ص ۴۴۸؛ اصابہ ۸۰۰۳۔

زبیری ۸-۴۴۷ نے متعدد فہری صحابہ میں حضرات ضحاک بن قیس فہری، حبیب بن مسلمہ فہری اور ضرار بن خطاب فہری اور رباح بن عمرو بن المغترف کو بھی بنو محارب سے شمار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو اصابہ ۴۱۶۴، ۱۵۹۵ (استیعاب، اول، ص ۳۰-۳۲۸) ۴۱۶۸ اور ۲۵۵۷۔

بلاشک وشبہ بنو محارب بن فہر یا بنو حارث بن فہر کے بہت سے مسلمانوں کا نام مآخذ میں نہیں آسکا ہے۔

(۳۶۰) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۹۴-۸۶ اور ۷۹-۱۷۱ نے بنو محارب بن فہر کو بھی شامل نہیں کیا ہے۔

(۳۶۱) یہ جائزہ بنیادی طور سے زبیری، نسب قریش، ص ۴۴۸-۴۳۰ اور ابن حزم اندلسی، جمہرہ انساب العرب، ص ۱۵۱-۱۷۷ پر مبنی ہے۔

(۳۶۲) زبیری اور جمہرہ کے علاوہ ان صحابہ کرام کے ذکر کے لیے مزید دیکھئے: اصابہ ۴۱۶۴، ۱۵۹۵، ۴۱۶۸، ۲۵۵۷۔
نیز استیعاب، اول، ص ۳۰-۳۲۸ - نیز اسد الغابہ، پنجم، ص ۲۴۵، ۳۲۸ وغیرہ؛ ابن اثیر، اسد الغابہ، پنجم، ص ۱۸۲ نے ایک صحابی حضرت ابو خلیدہ فہری کا ذکر کیا لیکن یہ معلوم نہیں کہ ان کا کس بنو فہر سے تعلق تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور فہری صحابی ہیں زیاد بن نعیم اسد الغابہ، دوم، ص ۲۱۸۔

(۳۶۳) بنیادی طور پر یہ تجزیہ ابن حزم اندلسی، جمہرہ، ص ۲۶-۳۱۳ اور ۴۷-۳۲۶ پر مبنی ہے۔

(۳۶۴) ابن اسحاق، ص ۵۴۵ اور ۵۵۰، کا بیان ہے کہ غزوہ فتح مکہ میں مسلم سپاہ کی تعداد دس ہزار تھی جس میں حسب ذیل قبائلِ عرب نے حصہ لیا تھا۔ قوسین میں ان کے سپاہ کی تعداد ہے۔

۱۔ بنو سلیم ۷۰۰ یا ۱۰۰۰

۲۔ غفار ۴۰۰

۳۔ اسلم ۴۰۰

۴۔ مُزینہ ۱۰۰۳

باقی قریش اور انصار اور ان کے حلفاء کی سپاہ تھی اور کچھ جماعتیں تمیم، قیس اور اسد کے عربوں کی بھی تھیں۔ ابن اسحاق کا مزید بیان ہے کہ اس غزوہ میں تمام قریشیوں اور انصار نے حصہ لیا تھا اور کوئی ایک شخص بھی پیچھے نہیں رہا تھا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قریشی مہاجرین کی تعداد سات سو (۷۰۰) تھی۔ اس طرح انصار کے علاوہ بقیہ مجاہدین کی تعداد تین ساڑھے تین ہزار کے درمیان آتی ہے۔

(۳۶۵) مآخذ کا بیان ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد آپ نے جزیرہ نمائے عرب کے پڑوسی ملکوں کے حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دی تھی اور سوائے خسرو پرویز کسرائے ایران کے اور دوسری تمام مملکتوں میں سفراءِ نبوی کا بہتر استقبال ہوا تھا۔ جزیرہ نمائے عرب میں بھی ردِ عمل بہتر ہوا تھا صرف بُصریٰ کے غسانی حکمراں نے نہ صرف اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ سفیرِ نبوی کو انتہائی بیدردی سے قتل کر دیا تھا۔ سُفراءِ نبوی پر بحث باب چہارم میں ملاحظہ فرمائیے۔ سلاطینِ وقت کو اسلام کی دعوت کے لیے ملاحظہ کیجئے، شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۴۷۰-۴۶۲؛ محمد حمید اللہ، محمد رسول اللہ، مذکورہ بالا، ص ۱۵-۶۰۵؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۳۴۵-۰۷، ان سفارتوں کی صحت کو بوجوہ معلوم مشتبہ سمجھتے ہیں۔

(۳۶۶) ابن اسحاق، ص ۱۵۴-۱۵۰۔ بحث کے لیے ملاحظہ کیجئے شبلی اور محمد حمید اللہ، مذکورہ در ص ۳۶۵۔

(۳۶۷) قرآن کریم: سورہ ۴۴، آیت ۲۸۔

(۳۶۸) ملاحظہ ہو جول لابوم (JULES LA BEAUME) LE KORAN ANAYSE عربی ترجمہ تفصیل آیات القرآن الحکیم، از محمد فؤاد عبدالباقی، قاہرہ ۱۹۵۵ء، ص ۳۴-۱۴ (الباب الثانی)

(۳۶۹) قرآن کریم، سورہ حجر، نمبر ۱۵۔

(۳۷۰) عام طور سے تمام مستشرقین کا یہی خیال ہے ملاحظہ ہو واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۳-۱۵۰ وغیرہ۔

(۳۷۱) ابن اسحاق، ص ۱۸-۱۱۴، ص ۸-۱۹۴ وغیرہ۔

(۳۷۲) مغربی مورخین میں گرونی بام (GRUNEBAUM)، کلاسیکل اسلام، انگریزی ترجمہ کیتھرین واٹسن، لندن ۱۹۷۰ء، ص ۲۰۷، نے قبائل عرب کی عددی طاقت کا جو تخمینہ لگایا ہے وہ کسی حد تک صحیح ہے۔ لیکن بڑے

قبیلوں کے بارے میں ان کا تخمینہ زیادہ صحیح نہیں ہے۔ ہمارا تخمینہ مآخذ کے بیانات پر مبنی ہے خاص طور سے ان کی فوجی طاقت کے بارے میں ان کے بیانات پر۔ اس کے علاوہ انساب کی کتابوں سے جو نتائج نکلتے ہیں وہ بھی بنیاد بنے ہیں۔

(۲۷۳) ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۶۱ - ۱۵۹؛ انساب الاشراف، اول، ص ۱۹۹۔ بحث کے لیے ملاحظہ ہو: باب اول۔

(۲۷۴) ابن سعد، چہارم، ص ۶ - ۲۴۵۔

(۲۷۵) ابن ہشام، سوم، ص ۳۵۹؛ ابن سعد، دوم، ص ۹۴-۹۳؛ سوم، ص ۹ - ۲۴۸؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۸۶۔

(۲۷۶) اسد الغابہ، اوّل، ص ۱۱۹۔

(۲۷۷) ابن ہشام، دوم، ص ۶۴۰؛ واقدی، ص ۴-۹۸۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۳؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۱۴۔

(۲۷۸) اسد الغابہ، پنجم، ص ۱۱۳۔

(۲۷۹) ملاحظہ ہو باب سوم، چہارم اور پنجم، نیز حوالہ جات آئندہ۔

(۲۸۰) ابنِ ہشام، دوم، ص ۶۴۰؛ واقدی، ص ۴-۹۸۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۳؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۱۴۔

(۲۸۱) ابن اسحاق، ص ۵۶۱ اور آگے۔

(۲۸۲) ابن ہشام، سوم، ص ۲۰۳؛ ابن سعد، چہارم، ص ۲۱-۲۱۹؛ بخاری اور مسلم، صحیح، اسلام ابی ذر؛ اصابہ ۴، ۳۷؛ جمہرہ، ص ۱۷۵۔

(۲۸۳) ابن سعد، چہارم، ص ۲۱۹؛ اصابہ ۲۸۹؛ جمہرہ، ص ۱۷۶۔

(۲۸۴) ترجمہ ابی ذر کے مذکورہ بالا مآخذ۔ (۲۸۵) ایضاً

(۲۸۶) ابن سعد، چہارم، ص ۲۲۱؛ نیز ملاحظہ ہو: ابنِ ہشام، سوم، ص ۲۱۳؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۲۵۰ اور پنجم، ص ۱۹۰ وغیرہ۔

(۲۸۷) ابن سعد، چہارم، ص ۴۵ - ۲۴۴؛ اصابہ، ص ۴۱۶؛ جمہرہ، ص ۱۷۶۔

(۲۸۸) اسد الغابہ، پنجم، ص ۹-۱۴۸، ۱۸۲، ۲۰۰، ۲۸۰، ۳۲۰ وغیرہ؛ نیز جمہرہ، ص ۶-۱۷۵۔

(۲۸۹) ابن اسحاق، ص ۱۸-۵۱۷۔ (۲۹۰) ایضاً، ص ۵۵۰

(۲۹۱) ابن سعد، چہارم، ص ۵-۲۴۴

(۲۹۲) ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۱۲۵ (۲۹۳) حوالہ ۲۸۶

(۳۹۴) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۸۴۔

(۳۹۵) ابن سعد، چہارم، ص ۲۴۵ (۳۹۶) ایضاً، ص ۳۸۸ وغیرہ۔

(۳۹۷) ابن ہشام، سوم، ص ۲۷۰؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۱۵۷؛ جمہرہ، ص ۱۷۴؛ اصابہ ۶۸ اور ۳۰۳۴۔

(۳۹۸) جمہرہ، ص ۵-۱۷۴؛ اصابہ ۳۰۳۴۔

(۳۹۹) واقدی، ص ۵۶۰، ۷۸۲، ۷۸۴، ۷۸۹، ۸۱۲، ۸۴۶ وغیرہ۔

(۴۰۰) ابن اسحاق، ص ۶۲-۵۶۱؛ ابن ہشام، سوم، ص ۶۳۴؛ واقدی، ص ۸۱-۸۷۵؛ ابن سعد، دوم، ص ۴۹-۱۴۷؛ طبری، سوم، ص ۶۷-۶۶؛ نیز ملاحظہ ہو بخاری، کتاب المغازی۔

(۴۰۱) ابن ہشام، دوم، ص ۶۲۲؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۱۶۸۔

(۴۰۲) ابن ہشام، دوم، ص ۲۲۸؛ اسد الغابہ، پنجم، ص ۴۲؛ واقدی، ص ۸۷۵ و ۸۶۰۔

(۴۰۳) جمہرہ، ص ۷۳-۱۷۱؛ نیز ملاحظہ ہو: اصابہ ۷۰۵۶، ۷۲۸۰، ۱۹۷، ۴۳۶۳، ۷۷۵۲، ۳۸۲۲، ۸۸۰۶، ۱۸۶۳، ۱۴۳، ۱۲۱۱، ۶۷۶، ۳۷۳، ۲۱۴۷، ۴۳۶۱، ۴۳۶۸ اور ۹۰۸۷ بالترتیب۔

(۴۰۴) واقدی، ص ۹-۱۰۲۸ (۴۰۵) طبری، سوم، ص ۲۴۴

(۴۰۶) ایضاً (۴۰۷) ایضاً

(۴۰۸) خزاعہ مکہ اور اس کے نواح کے قدیم باشندے تھے اور مدتوں وہ مکہ کی سیاست اور سماج پر چھائے رہے۔ جب قصی بن کلاب کا عروج مکی سیاست میں ہوا تو خزاعہ کو مکہ چھوڑنا پڑا تھا اور وہ اس کے نواح میں جا بسے تھے عبد المطلب بن ہاشم کے زمانے میں ان کے تعلقات پھر قریش خاص کر بنو ہاشم سے استوار ہو گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں بنو خزاعہ کا اثر ضرور موجود رہا اگرچہ قریشی قبائل کی بالادستی کے قائم ہو جانے کے بعد ان کا سابقہ مقام رسوخ برقرار نہیں رہ سکا تھا۔ خزاعہ کی قدیم تاریخ اور مکہ سے اس کے تعلقات کے لیے ملاحظہ کیجئے: ابن اسحاق، ص ۹-۴۸، ۵۲ وغیرہ؛ ابن سعد، اول، ص ۹-۶۸؛ کتاب المنمق فی اخبار قریش، مرتبہ خورشید احمد فارق، حیدرآباد دکن ۱۹۶۴ء، ص ۹۳-۸۸؛ انساب الاشراف، اول، ص ۵۰-۴۹؛ ازرقی، ص ۶۶-۶۴؛ طبری، دوم، ص ۴۳ وغیرہ۔

(۴۰۹) بخاری، باب اسلم وغفار؛ نیز ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۳۹۰۔

(۴۱۰) ابن سعد، چہارم، ص ۲۲۲۔

(۴۱۱) ابن اسحاق، ص ۲۲۸، کا بیان ہے کہ خزاعہ کے کم از کم دو آدمی مکی عہد میں مسلمان ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک حضرت ایہم تھے جو بنو مخزوم کے حلیف تھے اور دوسرے حضرت ذو الشمالین خزاعی تھے جو نہ صرف ابتدائی مسلم تھے بلکہ مہاجر مدینہ اور بدری صحابی بھی تھے۔ ایک اور ابتدائی مسلم حضرت نافع بن بدیل بن ورقاء تھے جو مہاجر اور

بئرِ معونہ کے شہید تھے۔ ایک خزاعی صحابی حضرت معتب بن عوف تھے جو مہاجر حبشہ اور بدری تھے۔ بلاذری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خالد بن سعید اموی کی اہلیہ محترمہ بھی خزاعی تھیں اور ان کا اسم گرامی خمینہ بنت خلف تھا۔ وہ ابتدائی مسلم ہونے کے علاوہ حبشہ کی مہاجر بھی تھیں۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۴۴۴؛ ابن سعد، چہارم، ص ۲۹۴؛ نیز سوم، ص ۲۶۵ اور انساب الاشراف، اوّل، ص ۱۹۹ اور ۱۲۰-۲۱۱۔

(۱۲۴) ابن سعد، چہارم، ص ۲۴۳-۲۴۱ اور ۲۹۸-۳۲۵۔

(۱۳۴) اسد الغابہ، چہارم، ص ۲۷۰؛ پنجم، ص ۲۵۰۔

(۱۴۴) ابن سعد، دوم، ص ۱۲۰-۱۲۱؛ ۱۵۰؛ ۱۶۸؛ ۱۷۳؛ طبری، دوم، ص ۷۳؛ اسد الغابہ، سوم، ص ۱۴۱-۲؛ پنجم، ص ۷۰-۱۴۹۔

(۱۵۴) ملاحظہ کیجئے اس کتاب کے ابواب سوم، چہارم، پنجم اور ششم۔

(۱۶۴) مجموعۃ الوثائق، ص ۹-۱۴۷ کا بیان ہے کہ قبیلہ کا ایک حصہ ہجرت کر کے مدینہ جا بسا تھا جبکہ دوسرا حصہ اپنے روایاتی علاقہ میں آباد رہا تھا۔

(۱۷۴) ملاحظہ ہو: محمد ایٹ مدینہ، ص ۸۵۔

(۱۸۴) ابن اسحاق، ص ۵۵۷؛ واقدی، ص ۸۰۱-۸۰۰؛ نیز اسد الغابہ، اول، ص ۱۷۵-۶؛ چہارم، ص ۲۲۵، جس کا بیان ہے کہ اس مہم عظیم وجلیل میں اسلام کے دو پرچم تھے۔ پرچم کی اہمیت پر بحث ملاحظہ کیجئے باب سوم — بحث برعلمبرداران نبوی۔

(۱۹۴) ملاحظہ کیجئے حوالہ نمبر ۱۱۴۔

(۲۰۴) مثلاً حضرت خراش بن امیہ خزاعی (بنو کعب بن عمرو) نے صلح حدیبیہ کے موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کی حیثیت سے صلح حدیبیہ میں شرکت کی تھی جبکہ حضرت بُسر / بشر بن سفیان خزاعی نے ایک جاسوس کے فرائض انجام دئے تھے۔ ملاحظہ ہو: ابن سعد، دوم، ص ۹۶-۹۵؛ طبری، دوم، ص ۶۳۱؛ اسد الغابہ، اول، ص ۲۵۱ اور دوم ص ۱۰۸۔

(۲۱۴) ابن سعد، اول، ص ۲۹۳، کا بیان اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ بنو تمیم کی ایک شاخ نے جو مدینہ کی مخالف اور بنو کعب بن عمرو / خزاعہ کی پڑوسی تھی۔ انھوں نے بنو کعب کو صدقات نہ ادا کرنے پر مجبور کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بنو کعب نے خود ہی اس کی اطلاع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی اور آپ نے ان کے خلاف فوجی کارروائی کی۔

(۲۲۴) واقدی، ص ۹۷۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۰؛ انساب الاشراف، اول، ص ۵۳۱؛ اسد الغابہ، اول، ص ۱۷۵-۶۔ تفصیل ملاحظہ کیجئے باب پنجم میں۔

(۲۳۴) حوالہ جات کے لیے ملاحظہ کیجئے سابقہ حوالہ ۱۸۴۔

(۲۴۴) واقدی، ص ۹۸۰؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۰-۶۱؛ نیز ابن اسحاق، ص ۴۹۳۔

(۴۲۵) مکمل بحث کے لیے ملاحظہ فرمایئے: محمد یٰسین مظہر صدیقی، حضرت ولید بن عقبہ اموی ـــــ شخصیت و حیات (زیر طبع)

(۴۲۶) واقدی، ص ۸۱ - ۹۸۰: ابنِ سعد، دوم، ص ۶۱ - ۱۶۰؛ انساب الاشراف، اول، ص ۵۳۰۔

(۴۲۷) واقدی، ص ۲۰۵، ۴۰ - ۲۳۸، ۵ - ۴۴۴، ۵۳۲ وغیرہ۔

(۴۲۸) واقدی، ص ۸۱، ۵۹۳، ۵ وغیرہ۔ (۴۲۹) واقدی، ص ۶۱۲۔

(۴۳۰) واقدی، ص ۹۴۷۔ (۴۳۱) واقدی، ص ۱۰۰۸ اور ۹۱ - ۹۹۰۔

(۴۳۲) ان کے اسمائے گرامی تھے: حضرات عمرو بن مُرّہ، لبسبس بن عمرو، عدی بن ابی الزغباء، جندب بن مکیث، معبد بن خالد، سوید بن صخر، زید بن خالد، عبداللہ بن بدر اور ضمرہ ـــــ ملاحظہ ہو بالترتیب اسد، پنجم، ص ۱۳۱؛ واقدی، ص ۶؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲؛ اسد، اول، ص ۳۰۶؛ ایضاً، پنجم، ص ۳۹۰؛ ایضاً، دوم، ص ۳۰۸؛ ایضاً، دوم، ص ۲۲۸؛ ایضاً، سوم، ص ۴ - ۱۲۳؛ واقدی، ص ۲۶۔

(۴۳۳) ابن سعد، سوم، ص ۷ - ۴۹۶، ۶۰ - ۵۵۹۔

(۴۳۴) ابن سعد، چہارم، ص ۵۳ - ۳۴۳۔

(۴۳۵) ابن سعد، اول، ص ۳۳۳ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مسجد کے لیے پہلی زمین عطا کی تھی وہ یہی تھی۔

(۴۳۶) ابن سعد، اول ص ۴ - ۳۳۳۔

(۴۳۷) ابن اسحاق، ص ۵۴۹، ۵۵۴، ۵۵۷؛ واقدی، ص ۸۰۰ اور ۸۲۰۔

(۴۳۸) واقدی، ص ۹۹۰۔

(۴۳۹) ان کے نام تھے: حضرات نعمان بن مقرن ـــــ اسد، پنجم، ص ۳۱ - ۳۰؛ خزاعی بن عبد نہم ـــــ اسد، دوم، ص ۱۱۳؛ عبید بن مروہ ـــــ اسد، سوم، ص ۳۵۴؛ بلال بن حارث ـــــ اسد، اول، ص ۲۰۵؛ عبداللہ بن عمرو ـــــ واقدی، ص ۸۰۰۔

(۴۴۰) ابن سعد، سوم، ص ۸ - ۲۴۷، کا بیان ہے کہ حضرت وہب بن قبوس مزنی اور ان کے بھتیجے حضرت حارث بن مُزینہ کی پہاڑیوں کی طرف سے اپنے جانوروں کے گلّے کے ساتھ آئے اور اسلام قبول کر کے مسلم فوج میں شریک ہو گئے اور لڑ کر جان خدا کی راہ میں نچھاور کر دی۔

(۴۴۱) کتاب الاشتقاق، مرتبہ وسٹنفلیڈ، گوٹنگن ۱۸۵۴ء، ص ۱۲ - ۱۱۱۔

(۴۴۲) اسد، پنجم، ص ۳۱ - ۳۰؛ ابن سعد، اول، ص ۴ - ۳۳۳۔

(۴۴۳) ابن سعد، اول، ص ۳۲۹ - نیز ملاحظہ فرمایئے مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۸۵، جنھوں نے جُہینہ کے دو نفری وفد کی آمد کا ذکر کرتے ہوئے تبصرہ کیا ہے کہ یہ دونوں اپنی قوم کے نمائندے نہیں تھے بلکہ انھوں نے ذاتی

طور سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی تھی۔ لیکن یہ حیرت کی بات ہے کہ واٹ نے مُزینہ کے اتنے اہم وفد کی آمد کا ذکر سرے سے نہیں کیا ہے۔

(۴۴۴) ملاحظہ کیجئے حوالہ سابقہ، ۴۳۔ (۴۴۵) ابن اسحاق، ص ۶۸ ۵۔ (۴۴۶) واقدی، ص ۹۹۰۔

(۴۴۷) ابن سعد، چہارم، ص ۲۴۱؛ نیز ملاحظہ ہو: ابن سعد، اول، ص ۲۲۹۔

(۴۴۸) مسلم، صحیح، باب الاوقات التی نہی عن الصلاۃ فیہا، باب تخفیف الصلاۃ والخطبات۔ نیز ابن سعد، چہارم، ص ۲۴۱۔

(۴۴۹) ابن سعد، اول، ص ۲۲۹۔ (۴۵۰) ابن سعد، چہارم، ص ۲۴۱۔

(۴۵۱) ابن سعد، چہارم، ص ۱۸-۱۱۱۔ نیز ملاحظہ ہو: اسد، چہارم، ص ۴۰۳۔

(۴۵۲) حضرت طفیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۱۶-۱۱۱؛ واقدی، ص ۸۰۰؛ ابن سعد، دوم، ص ۸-۱۵۷؛ انساب الاشراف، اول، ص ۲۳-۱۱۹؛ طبری، دوم، ص ۲۹-۳۲۲؛ بخاری، صحیح، قصہ دوس۔ نیز اسد، سوم، ص ۵۵-۵۴۔ ان کے صاحبزادہ گرامی کے لیے ملاحظہ ہو: واقدی، ص ۹۲۳ اور اسد، چہارم، ص ۱۱۵۔

(۴۵۳) ملاحظہ فرمایئے: صحیح مسلم، کتاب الایمان۔

(۴۵۴) ابن سعد، اول، ص ۳۵۳۔

(۴۵۵) ابن سعد، چہارم، ص ۴۱-۳۲۵ اور اول، ص ۳۵۳۔ نیز ابن سعد، دوم، ص ۲۷۶۔

(۴۵۶) ابن سعد، چہارم، ص ۳۴۱ اور اسد، دوم، ص ۲۷۶۔

(۴۵۷) ابن سعد، چہارم، ص ۳۴۲۔ بُحَینہ ان کی والدہ کا نام تھا اور وُہ اپنی ماں کی نسبت سے زیادہ مشہور تھے۔

(۴۵۸) ایضاً (۴۵۹) ابن سعد، چہارم، ص ۳۴۳ کا بیان ہے کہ ان کا تعلق قبیلہ ازد کے ایک گھرانے بنولہب سے تھا۔

(۴۶۰) محمد ایٹ مدینہ، ص ۸۷۔

(۴۶۱) قبائل عرب مشرقی کا یہ تجزیہ بنیادی طور سے نسب کی کتاب جمہرہ پر مبنی ہے۔

(۴۶۲) مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو باب سوم۔

(۴۶۳) محمد بن حبیب بغدادی، کتاب المحبر کا بیان ہے کہ بنو اسد کی ایک شاخ بنو غنم بن دودان مکہ میں غالباً چھٹی صدی عیسوی کے وسط کے قریب آکر بس گئی تھی اور انھوں نے بنو امیہ کے شیخ حرب اور بعد میں ان کے فرزند ابوسفیان سے حلف کے تعلقات قائم کرلیے تھے جبکہ ازدواجی تعلقات انھوں نے بنو ہاشم کے شیخ عبد المطلب سے استوار کیے تھے نیز ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۱۴۶ اور ۳۲۸؛ ابن سعد، سوم، ص ۹۷-۸۹۔ نیز خاکسار کا مضمون بنو امیہ اور بنو ہاشم کے ازدواجی تعلقات پر۔ خزیمہ کی ایک اور شاخ بنو قارہ جو ھُون بن خزیمہ کے اخلاف تھے

بنوزہرہ/قریش کے حلیف تھے۔ ملاحظہ ہو جمہرہ، ص ۸۱، ۱۷۹؛ نیز واقدی، ص ۱۶۴، جن کے مطابق بنومازن/نجار (انصارِ مدینہ) کے ایک حلیف حضرت عُصَیم تھے جو بدر میں مسلمانوں کی طرف سے شریکِ جہاد تھے۔

(۴۶۴) ابن اسحاق، ص ۱۶-۲۱۵؛ ابن سعد، سوم، ص ۹۷-۸۹؛ جمہرہ، ص ۸۱-۱۸۰

(۴۶۵) ابن اسحاق، ص ۵۶۸۔ (۴۶۶) ابن سعد، اول، ص ۹۳-۲۹۲۔

(۴۶۷) طبری، تفسیر، سورۂ حجرات، آیت ۱۷۔

(۴۶۸) ابن ہشام، دوم، ص ۶۰۰؛ ابن سعد، اول، ص ۳۲۲؛ انساب الاشراف، اول، ص ۵۳۰؛ طبری، سوم، ص ۱۴۷؛ اسد، سوم، ص ۴-۳۹۲۔

(۴۶۹) طبری، سوم، ص ۲۴۴، ۵۸-۲۵۳۔ (۴۷۰) طبری، سوم، ص ۵۸-۲۵۳۔

(۴۷۱) جمہرہ، ص ۱۸۰ (۴۷۲) جمہرہ، ص ۵-۱۸۲۔

(۴۷۳) جمہرہ، ص ۱۷۹؛ نیز ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۱۱۶، ص ۳۲۸؛ واقدی، ص ۱۵۵۔

(۴۷۴) اسد، پنجم، ص ۲۵۹۔ (۴۷۵) مجموعۃ الوثائق، ص ۱۵۴۔

(۴۷۶) ابن ہشام، دوم، ص ۶۰۹؛ سوم، ص ۱۶۹؛ واقدی، ص ۳۵۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۶-۵۵؛ انساب الاشراف، اوّل، ص ۳۰۵؛ طبری، دوم، ص ۵۳۸۔

(۴۷۷) ابن سعد، چہارم، ص ۱۸-۲۱۴، کا بیان ہے کہ ان کی ملاقات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عکاظ کے میلے میں ہوئی تھی۔

(۴۷۸) ابن سعد، چہارم، ص ۲۱۹؛ نیز ملاحظہ کیجیے: ابن اسحاق، ص ۱۱۶ اور جمہرہ، ص ۲۵۲۔

(۴۷۹) ایضاً

(۴۸۰) ابن اسحاق، ص ۳۲۸؛ واقدی، ص ۱۵۴؛ ابن سعد، سوم، ص ۹۹؛ انساب الاشراف، اوّل، ص ۲۰۱۔ اگرچہ نسبی لحاظ سے ان کا تعلق بنومازن سے تھا مگر وُہ ایک اعتبار سے بنوسلیم ہی کے فرد سمجھے جاتے تھے کیونکہ بنومازن سلیم کے بھائی کی نسل میں تھے۔ ملاحظہ ہو جمہرہ، ص ۲۴۸۔

(۴۸۱) ابن اسحاق، ص ۵-۴۴۴؛ واقدی، ص ۳۵۳۔

(۴۸۲) ابن اسحاق، ص ۳۵۴؛ واقدی، ص ۳۴۹؛ ابن سعد، دوم، ص ۵۲؛ طبری، دوم، ص ۵۴۸۔

(۴۸۳) ابن اسحاق، ص ۴۹۷؛ واقدی، ص ۴۲۸ اور ص ۱۰۹۳؛ بخاری، صحیح، کتاب الشہادات؛ اسد، سوم، ص ۷-۲۶۰؛ جمہرہ، ص ۲۵۲۔

(۴۸۴) واقدی، ص ۴۴۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۶۔

(۴۸۵) واقدی، ص ۹۱-۴۸۸؛ ابن سعد، دوم، ص ۷۲-۷۱۔

(۴۸۶) ابن سعد، چہارم، ص ۲۵۵-۷۷۔

(۴۸۷) مثلاً ملاحظہ کیجئے: جمہرہ، ص ۲۴۹-۵۲۔

(۴۸۸) ابن اسحاق، ص ۵۸۱ نے اس سلسلے میں جو شعر نقل کیے ہیں ان کا آزاد ترجمہ حسب ذیل ہے:

"اور سلیم کو فخر کرنے کا حق حاصل ہے
کیونکہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے خدا کی مدد کی
اور رسول کے پیغام و دین کو اس وقت قبول کیا
جب لوگوں کے معاملات الجھے اور پراگندہ تھے۔"

(۴۸۹) ابن سعد، چہارم، ص ۲۶۹-۷۷؛ نیز ملاحظہ کیجئے: جمہرہ، ص ۲۴۹-۵۲۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بنو سلیم کے ابتدائی مسلمان اور ان کے سردار قبیلہ کی بعض دشمن اسلام شاخوں عُصَیَّۃ، رِعل اور ذکوان سے متعلق تھے جو بئرمعونہ کے المیہ کے ذمہ دار تھے۔ مثلاً حضرات عباس بن مرداس اور ان کے فرزند جہیمہ اور صفوان بن معطل کا تعلق بنو ذکوان سے تھا جبکہ خُفاف بن عُمیر، ہوذہ بن حارث اور سب سے اہم ترین شخصیت حضرت خنساء جو عہد نبوی کی عظیم ترین شعراء میں شمار ہوتی ہیں کا تعلق بنو عُصَیَّہ سے تھا۔

(۴۹۰) ابن اسحاق، ص ۷۹۹-۸۰۰؛ واقدی، ص ۷۹۹، ۸۱۲-۱۳، ۸۱۹؛ نیز ملاحظہ کیجئے: ابن سعد، دوم ص ۱۴۴-۵۔ موخرالذکر نے بنو سلیم کے دستے کی موجودگی اور شرکت کا حوالہ تو دیا ہے مگر اس کی تعداد نہیں بیان کی ہے۔

(۴۹۱) واقدی، ص ۸۱۹، ۸۹۷؛ نیز ملاحظہ کیجئے: ابن اسحاق، ص ۵۸۳۔

(۴۹۲) واقدی، ص ۹۵۲ کا بیان ہے کہ شروع میں ان کے سردار حضرت عباس بن مرداس اپنے قبیلہ کے حصے میں آنے والے قیدیوں کو رہا کرنے کے حق میں نہیں تھے لیکن بعد میں وہ بھی فیصلۂ نبوی سے متفق ہو گئے تھے۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کی رہائی کے سرکاری یا نبوی احکام جاری نہیں کئے تھے بلکہ انسانیت کے ناطے ان کے رہا کرنے کی درخواست کی تھی جو قانوناً یا مذہباً ضروری نہیں تھی۔ ان کے رہا کرنے یا نہ کرنے کا اختیار در اصل ان کے گرفتار کرنے والوں کو حاصل تھا۔

(۴۹۳) ابن اسحاق، ص ۵۶۱-۶۴؛ واقدی، ص ۸۷۵۔

(۴۹۴) واقدی، ص ۹۹۰۔ (۴۹۵) ابن سعد، اوّل، ص ۳۰۷-۹۔

(۴۹۶) ابن سعد، اوّل، ص ۲۷۳-۴؛ اسد، چہارم، ص ۲۳۱ وغیرہ؛ مجموعۃ الوثائق، ص ۱۸۰-۸۴۔

(۴۹۷) واقدی، ص ۹۷۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۰؛ انساب الاشراف، اوّل، ص ۵۳۰۔

(۴۹۸) اسد، دوم، ص ۷۵۔

(۴۹۹) ردہ کے زمانے میں بنو سلیم کے لوگوں نے اسلام نہیں ترک کیا تھا۔ جن لوگوں نے بغاوت میں حصّہ لیا تھا وہ زکوٰۃ کو ادا کرنے سے انکار کر رہے تھے۔

(۵۰۰) ابن حزم، جمہرہ، ص ۵۴ - ۲۳۷۔

(۵۰۱)— بنو اشجع —— ریث بن غطفان کی اولاد۔

— بنو فزارہ —— ذبیان بن بغیض بن ریث بن غطفان کی نسل میں۔

— بنو مرہ —— عوف بن سعد بن ذبیان بن بغیض بن ریث بن غطفان کے خاندان میں۔

— بنو ثعلبہ —— سعد بن ذبیان بن بغیض بن ریث بن غطفان کا گھرانا۔

— بنو محارب —— خَصفہ بن قیس عیلان کے اخلاف۔

— بنو عبس —— بغیض بن ریث بن غطفان کا قبیلہ۔

— بنو ذبیان —— بغیض بن ریث بن غطفان کا بطن۔

ان کے علاوہ بعض ذیلی گھرانے تھے جیسے بنو عبدالعزّٰی بن غطفان، اور بنو انمار بن بغیض بن ریث بن غطفان وغیرہ۔

(۵۰۲) ابن سعد، چہارم، ص ۲۸۱؛ جمہرہ، ص ۲۳۸۔ ان کے نام میں اختلاف ہے۔ بعض حارث بن جمیل کہتے ہیں اور بعض جاریہ۔

(۵۰۳) ابن سعد، چہارم، ص ۴۸ - ۲۷۷۔

(۵۰۴) ابن سعد، چہارم، ص ۷۹ - ۲۷۷؛ نیز ابن اسحاق، ص ۶۰ - ۵۸۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۹؛ واقدی، ص ۸۰ - ۴۸۰؛ طبری، دوم، ص ۹ - ۵۰۸؛ اسد، سوم، ص ۲۶۸۔

(۵۰۵) ابن سعد، چہارم، ص ۲۸۰؛ اسد، سوم، ص ۲۶۸۔

(۵۰۶) ابن سعد، چہارم، ص ۸۱ - ۲۸۰؛ اسد، چہارم، ص ۱۵۶۔

(۵۰۷) ابن سعد، چہارم، ص ۲۸۰، کا بیان ہے کہ ان کے والد کا نام نُوَیرہ تھا جبکہ طبری، سوم، ص ۲۳ اور اسد، دوم، ص ۱۶ کا خیال ہے کہ ان کا نام خارجہ تھا۔

(۵۰۸) ابن سعد، چہارم، ص ۸۲ - ۲۸۲۔ فتح مکہ کی مہم کے دوران وُہ اپنے قبیلہ کے علمبردار تھے۔

(۵۰۹) ابن سعد، چہارم، ص ۲۸۰؛ نیز ملاحظہ ہو جمہرہ، ص ۲۳۸، جو ان کا نام مسعود بن عائذ بتاتی ہے۔

(۵۱۰) ابن اسحاق، ص ۵۸۴؛ نیز ملاحظہ ہو واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۹۲ کا خیال ہے کہ پُورے قبیلہ نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا لیکن واقعات اس کے خیال کے برعکس ہیں۔ نیز ملاحظہ ہو: جمہرہ، ص ۲۳۸، جو اشجع کے ایک اور مسلمان حضرت نبیت بن شُرَیت کا ذکر کرتی ہے۔

(۵۱۱) ابن سعد، اول، ص ۳۰۶۔

(۵۱۲) ابن سعد، اول، ص ۲۰۶ - نیز ملاحظہ کیجئے: مجموعۃ الوثائق، ص ۵۴۱، جس کا خیال ہے کہ یہ معاہدہ حضرت نعیم بن مسعود سے ہوا تھا۔

(۵۱۳) واقدی، ص ۸۰۰ - ۹۹۷، کا بیان ہے کہ حضرات معقل بن سنان اور نعیم بن مسعود کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قبیلے سے فوجی دستے فراہم کرنے کے لیے مدینہ سے بھیجا تھا۔ نیز ملاحظہ ہو: ابن سعد، چہارم، ص ۲۷۸۔

(۵۱۴) واقدی، ص ۹۹۰۔

(۵۱۵) ابن اسحاق، ص ۵۹۳؛ واقدی، ص ۵۲ - ۹۵۱؛ ابن سعد، دوم، ص ۵۴ - ۱۵۳؛ طبری، سوم، ص ۸۶۔

(۵۱۶) واقدی، ص ۶۵۲، ۷۲۹، اور ۷۳۱، وغیرہ۔

(۵۱۷) ابن اسحاق، ص ۵۶۸؛ نیز ملاحظہ ہو: جمہرہ، ص ۴۳ - ۲۳۹ - مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۹۴، کا خیال ہے کہ ان مواقع پر حضرت عُیینہ بن حصن فزاری کے ساتھ ان کے قبیلہ کا ایک معمولی سا بھی دستہ نہیں تھا۔ لیکن یہ خیال مآخذ کی صریح شہادتوں سے متصادم ہے کیونکہ ان سے بنو فزارہ کے دستوں کی موجودگی کا حتمی علم ہوتا ہے۔

(۵۱۸) ابن اسحاق، ص ۵۹۳؛ واقدی ص ۶ - ۹۴۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۵۳؛ طبری، سوم، ص ۹۰۔ ان مورخین کے مطابق مختلف قبائل کے بارہ سرداروں کو سو اونٹوں کا حصہ ملا تھا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ان کی اکثریت یعنی ۳/۴ کا تعلق قریشِ مکہ کے مختلف بطون سے تھا جبکہ صرف ۱/۴ کا تعلق بدوی قبائل سے تھا۔

(۵۱۹) ابن اسحاق، ص ۶۶۰؛ ابن ہشام، سوم، ص ۶۲۱؛ واقدی، ص ۵ - ۹۷۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۱ - ۱۶۰۔ یہ دستہ پچاس شہسواروں پر مشتمل تھا جو سب کے سب بدوی اور غالباً فزاری تھے۔

(۵۲۰) ابن سعد، دوم، ص ۱۶۰؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۷ - ۱۶۶۔

(۵۲۱) انساب الاشراف، اوّل، ص ۵۳۰ - نیز ملاحظہ ہو، واقدی، ص ۹۷۳، جن کا خیال ہے کہ حضرت عمرو بن العاص کو فزارہ کا مصدق / عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا۔

(۵۲۲) ابن سعد، اول، ص ۲۹۷؛ نیز ملاحظہ ہو: طبری، سوم، ص ۱۲۲، جن کا خیال ہے کہ حضرت عُیینہ بن حصن فزاری کے بھائی حضرت خارجہ ان میں شامل تھے۔

(۵۲۳) جمہرہ، ص ۵ - ۲۴۳ - حضرت سمرہ بن جندب کے لیے مزید ملاحظہ کیجئے، اصابہ ۳۴۷۵۔

(۵۲۴) طبری، سوم، ص ۲۵۶؛ نیز ملاحظہ ہو: ص ۲۶۰ - طبری کا بیان ہے کہ جب حضرت عُیینہ بن حصن فزاری کو پابہ زنجیر مدینہ لایا گیا اور مدینہ کے لڑکوں نے ان پر طنز و طعن کیا تو ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کہا تھا "خدا کی قسم، میرا خدا پر کبھی ایمان نہ تھا"۔ لیون کیتانی اور مونٹگمری واٹ کا خیال ہے کہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ ملاحظہ ہو، محمد ایٹ مدینہ، ص ۹۵ - ۹۴۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ محض اس خبر واحد کی بنیاد پر حضرت عُیینہ کے اسلام سے انکار کر دیا گیا اور متعدد

دوسری روایات کو جو ان کے قبولِ اسلام کی شہادت دیتی ہیں نظرانداز یا مسترد کر دیا گیا۔ پھر اس خبرِ واحد میں اسلام اور ایمان کے نازک فرق کی جانب اشارہ ہے جسے مورخین نے عام طور سے نہیں سمجھا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت عُیینہ اور ان کے سات سو پیروؤں کے مُرتد ہو جانے یا طلیحہ اسدی کا ساتھ دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا ہے کہ پورا قبیلہ فزارہ اسلام سے پھر گیا تھا۔ اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ عبس اور ذبیان کے اس وفد میں جو حضرت ابوبکر صدیق کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور جو صرف زکوٰۃ سے استثنا چاہتا تھا حضرت عُیینہ کے بھائی حضرت خارجہ بھی بنو فزارہ کے ساتھ شامل تھے۔ اس کے علاوہ بنو فزارہ کے درمیان معتد بہ مسلمان —— پکے اور ثابت قدم مسلمانوں —— کی موجودگی کا ناقابلِ تردید ثبوت طبری کے ایک صریح بیان سے ملتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے جب ذو القصہ میں جمع ہونے والے مانعینِ زکوٰۃ اور مرتدوں کو شکست دے دی تو بنو عبس اور ذبیان کے لوگ اور دوسرے شکست خوردہ بھی اپنے اپنے قبیلے کے مسلمانوں پر جا پڑے اور ان میں خُوب بے رحمی سے خُوں ریزی کی۔" ملاحظہ ہو، طبری، سوم، ص ۲۴۴ اور ۲۴۶ وغیرہ۔

(۵۲۵) واقدی، ص ۲۹، (۵۲۶) واقدی، ص ۴۰-۸۰ (۵۲۷) واقدی، ص ۲۹،

(۵۲۸) واقدی، ص ۳۱، (۵۲۹) اسد الغابہ، دوم، ص ۲۴۴ (۵۳۰) بنو فزارہ کے ضمن میں مذکور حوالے ملاحظہ کیجئے

(۵۳۱) انساب الاشراف، اول، ص ۵۳۰۔ (۵۳۲) ابن سعد، اول، ص ۸-۲۹۷،

(۵۳۳) طبری، سوم، ص ۲۴۴، ۲۴۶۔

(۵۳۴) طبری، سوم، ص ۲۵۰، کا بیان ہے کہ وفاتِ نبوی کے بعد غطفان کے قبیلہ بنو فزارہ اور اسد/خزیمہ نے اپنے جاہلی زمانے کے معاہدۂ حلف کی تجدید کی تھی۔ اس زمانے میں اس معاہدہ کے تین فریق تھے، غطفان، اسد اور طے۔ لیکن بعثتِ نبوی کے متصل زمانے میں اسد اور غطفان نے طے کے دو قبیلوں غوث اور جدیلہ کو نکال باہر کیا تھا اور اس طرح معاہدہ کی خلاف ورزی کی تھی۔ بنو مرہ نے اس معاہدہ شکنی کو پسند نہیں کیا اور طے کے ان دونوں قبیلوں سے اپنے اتحاد کی تجدید کر لی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ان دونوں قبیلوں کو اپنے علاقوں میں پھر سے آبسنے میں ہر طرح کی اخلاقی اور مادی امداد دی تھی۔ وفاتِ نبوی کے بعد بھی بنو مرہ نے اسد اور غطفان کے اس جاہلی زمانے کی یادگار معاہدے میں شرکت نہیں کی تھی۔

(۵۳۵) ملاحظہ کیجئے واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۹۱، حاشیہ ۲، جنھوں نے اس خاندان کے کل ایک مسلمان کا ذکر کیا ہے۔

(۵۳۶) ابن حزم، جمہرہ، ص ۲۴۰۔ (۵۳۷) ابن اسحاق، ص ۵۶۸۔

(۵۳۸) ابن سعد، اول، ص ۶-۲۹۵؛ طبری، سوم، ص ۱۳۹۔

(۵۳۹) انساب الاشراف، اول، ص ۵۳۰۔

(۵۴۰) طبری، سوم، ص ۲۴۴، ۸-۲۴۶، ۵۸-۲۵۳۔

(۵۴۱) واقدی، ص ۱۹۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۳۵۔

(۵۴۲) واقدی، ص ۹۶-۱۹۳، ۴۰۲-۳۹۵، ۵۵۲، ۵۵۵ اور ۷۲۶؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۳۵-۳۴، ۶۲-۶۱، ۷-۸۶ اور ۱۱۹۔

(۵۴۳) ابنِ سعد، اوّل، ص ۲۹۸۔

(۵۴۴) ملاحظہ ہو جمہرہ، ص ۱۶۸، ۸-۲۴۷ اور ۲۸۰، جس کا بیان ہے کہ اس نام کے تین قبیلے/بطون تھے۔ محارب بن خُصفہ کے علاوہ دو اور بنو محارب بن فہر (قریش الظواہر کا ایک خاندان) اور بنو محارب بن عمرو (ربیعہ کی ایک شاخ) تھے۔

(۵۴۵) واقدی، ص ۶-۱۹۵؛ ابن سعد، دوم، ص ۳۵' کے مطابق اس مہم کے دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے سایے میں آرام فرما تھے اور آپ نے تلوار درخت سے لٹکا دی تھی کہ اچانک حضرت دعثور نمودار ہوئے اور تلوار ہاتھ میں سونت کر آپ سے پُوچھا: "اب آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟" آپ نے بڑے سکون اور اطمینان سے جواب دیا: "اللہ۔" حضرت دعثور اسم اعظم اور آپ کے اطمینان و سکون سے اس قدر متاثر، مبہوت اور ششدر رہ گئے کہ تلوار ان کے ہاتھ سے گر گئی اور وہ ایک عالم حیرانی اور لمحہ جاودانی میں کھڑے سوچتے رہ گئے۔ ان کو ہوش تب آیا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی اور ان سے وہی سوال پُوچھا "تم کو میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے؟" وہ حیران تھے اور جواب وہی دے سکے جو متوقع تھا "کوئی نہیں۔" رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جاؤ تم آزاد ہو۔" مگر اب وہ آزادی کے خواہاں نہیں تھے۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام بے دام بن چکے تھے۔

(۵۴۶) ابن سعد، اوّل، ص ۲۹۹؛ طبری، سوم، ص ۱۳۹۔

(۵۴۷) ان کے نسب کے لیے ملاحظہ ہو: جمہرہ، ص ۲۵۲۔

(۵۴۸) واقدی، ص ۷-۸۸۵۔

(۵۴۹) جمہرہ، ص ۷۵-۲۶۱ اور ۴-۲۵۳، ۵۹-۲۵۷ اور ۵۷-۲۵۴ بالترتیب۔

(۵۵۰) ابن اسحاق، ص ۵۶۶؛ نیز ملاحظہ کیجئے: واقدی، ص ۸۲۶؛ ابن سعد، دوم، ص ۵۰-۱۴۹؛ طبری، سوم، ص ۷۱-۷۰ وغیرہ۔

(۵۵۱) ابن اسحاق، ص ۵۶۶؛ واقدی، ص ۸۸۶۔ (۵۵۲) ایضاً (۵۵۳) ابن اسحاق، ص ۵۶۶

(۵۵۴) ملاحظہ ہو، مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۰۰۔

(۵۵۵) جمہرہ، ص ۲۶۲؛ اصابہ نساء ۱۰۲۶۔

(۵۵۶) جمہرہ، ص ۲۶۲؛ اصابہ نساء ۹۴۲ اور ۹۴۳۔

(۵۵۷) جمہرہ، ص ۲۶۲؛ اصابہ ۷۰۶۱، ۸۶۹۴ اور ۱۰۳۴۴ بالترتیب۔

(۵۵۸) جمہرہ، ص ۲۶۲؛ اصابہ ۹۱۶۶ اور ۱۰۱۸ بالترتیب۔

(۵۵۹) ملاحظہ ہو جمہرہ، ص ۶۵-۲۶۳؛ اصابہ ۷۱۰۳، ۶۷۹، ۶۹۵۸، ۵۸۸، ۷۔ ابن حزم کا بیان ہے کہ حضرات خالد اور حرملہ فرزندان ہوذہ خدمتِ نبوی میں وفد میں حاضر ہوئے تھے جبکہ حضرت خالد کے فرزند العداء کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چشمہ کی زمین عطا فرمائی تھی۔ چوتھے مسلمان حضرت ثوران بن فروارہ بھی اپنے قبیلہ کے وفد میں حاضر ہوئے تھے۔ ملاحظہ کیجئے: اصابہ ۹۲۳، ۱۶۶۳ اور ۵۴۶۷۔

(۵۶۰) اصابہ ۱۶۶۱۴؛ نیز جمہرہ، ص ۶۷-۲۶۶ کا بیان ہے کہ اس گھرانے کے دو اور بھی مسلمان تھے: ایک حضرت نواس بن سمعان اور دوسرے عاصی بن عامر۔ موخر الذکر کا نام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ رکھ دیا تھا۔ ملاحظہ ہو اصابہ ۸۸۲۲ اور ۸۰۳۳۔

(۵۶۱) واقدی، ص ۹۰۳؛ ابن سعد، اول، ص ۳۰۰؛ دوم، ص ۱۶۰؛ اسد، سوم، ص ۳۶۔

(۵۶۲) ابن ہشام، سوم، ص ۹۰۳؛ ابن سعد، اول، ص ۳۰۰؛ اسد، سوم، ص ۳۶؛ نیز ملاحظہ کیجئے: جمہرہ، ص ۲۶۷ اور اصابہ ۱۶۶۱۴۔

(۵۶۳) ملاحظہ کیجئے باب سوم، بحث بر امرار سرایا۔

(۵۶۴) جمہرہ، ص ۷۱-۲۷۰؛ اصابہ ۵۹۵۰، ۸۲۷۳ اور ۸۴۰۷۔ مولہ بن کنیف کے بارے میں روایت ہے کہ نبی کریم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتے وقت ان کی عمر بیس سال تھی اور اس کے بعد وہ مزید سو سال زندہ رہے۔ وہ مشہور صحابیِ رسول حضرت ابوہریرہ کے شاگرد اور ساتھی (صاحب) تھے۔

(۵۶۵) جمہرہ، ص ۷۴-۲۷۱؛ اصابہ ۳۴۳۷۴، ۸۶۳۹، ۷۱۰۵، ۴۱۸۹۴، ۵۵۴-۵ اور ۱۰۷۱۔
حضرت مطرف کا شمار صحابہ کرام کے طبقہ علماء میں ہوتا ہے۔ جبکہ بنو عقیل کے تین مسلمانوں کے نام تھے؛ جرد بن منتفق، ابو رازن لقیط بن عامر اور معاویہ بن عبادہ۔

(۵۶۶) انساب الاشراف، اوّل، ص ۳۱-۵۳۰ کا بیان ہے کہ حضرت عامر بن مالک بن جعفر پورے قبیلہ عامر بن صعصعہ کے عامل صدقات تھے جبکہ حضرت ضحاک بن سفیان کلابی بنو کلاب کے؛ حضرت قرہ بن ہبیرہ بنو قشیر کے اور حضرت جعدہ بنو عامر کے ایک اور گھرانے کے عامل صدقات تھے؛ نیز ملاحظہ کیجئے، ابن سعد، اول، ص ۳۰۰ اور جمہرہ، ص ۷۳-۲۷۲۔

(۵۶۷) ملاحظہ فرمائیے: مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۹۹۔

(۵۶۸) ابن سعد، اول، ص ۳۰۵-۳۰۰ (۵۶۹) طبری، سوم، ص ۱۴۴ (۵۷۰) ایضاً

(۵۷۱) ملاحظہ کیجئے، اسد، سوم، ص ۲۳۹؛ نیز واقدی، ص ۹۸۳؛ مجموعۃ الوثائق، ص ۱۹۶۔

(۵۷۲) واقدی، ص ۸۰۶ نے ہوازن کے ایک گمنام مسلمان کا حوالہ دیا ہے۔

(۵۷۳) واقدی، ص ۵۴۷   (۵۷۴) اسد، سوم، ص ۲۳۹   (۵۷۵) اسد، چہارم، ص ۹۲۔

(۵۷۶) ابن ہشام، سوم، ص ۶۸-۵۶۶؛ واقدی، ص ۸۷-۸۸۵؛ ابن سعد، دوم، ص ۵۰-۱۴۹؛ انساب الاشراف، اول، ص ۶۵-۳۶۴ اور طبری، سوم، ص ۷۱-۷۰۔

(۵۷۷) واقدی، ص ۸-۸۸۷؛ طبری، سوم، ص ۷۲-۷۱۔

(۵۷۸) ابن اسحاق، ص ۵۹۲؛ واقدی، ص ۹۵۰؛ ابن سعد، دوم، ص ۴-۱۵۳؛ طبری، سوم، ص ۸۶۔

(۵۷۹) ابن اسحاق، ص ۹۴-۵۹۳؛ واقدی، ص ۵۵-۹۵۴؛ طبری، سوم، ص ۹-۸۸۔

(۵۸۰) ابن اسحاق، ص ۶۳۵۔   (۵۸۱) ابن سعد، اول، ص ۵۴-۳۵۳۔

(۵۸۲) انساب الاشراف، اول، ص ۵۳۰؛ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص ۹۵۵؛ طبری، سوم، ص ۸۹۔

(۵۸۳) اسد، چہارم، ص ۶-۴   (۵۸۴) جمہرہ، ص ۲۵۵

(۵۸۵) جمہرہ، ص ۲۵۵؛ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص ۹۶۲۔

(۵۸۶) ابن سعد، چہارم؛ جمہرہ، ص ۳۵۵؛ اصابہ ۸۱۷۹۔

(۵۸۷) ان حضرات کے لیے ملاحظہ کیجئے: جمہرہ، ص ۷-۲۵۵؛ اصابہ ۶۹۲۴، ۴۴۱۴، ۵۷۶۷، ۱۷۸۵، ۴۳۷ (کنیت)، ۳۲۰۳؛ نیز واقدی، ص ۹۶۲۔ حضرت عروہ بن مسعود ثقفی کے لیے ملاحظہ کیجئے: واقدی، ص ۶۲-۹۶۰؛ ابن سعد، اول، ص ۳۱۲؛ طبری، سوم، ص ۷-۹۶۔

(۵۸۸) ابن سعد، اول، ص ۱۴-۳۱۲۔

(۵۸۹) طبری، سوم، ص ۹۹-۹۸؛ نیز ملاحظہ ہو: واقدی، ص ۶۴-۹۶۳۔

(۵۹۰) انساب الاشراف، اوّل، ص ۵۳۱؛ نیز ملاحظہ کیجئے: مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۴-۱۰۱۔

(۵۹۱) ابن اسحاق، ص ۳۲۸؛ واقدی، ص ۱۵۳؛ ابن سعد، سوم؛ چہارم، ص ۴۸-۴۷ کا بیان ہے کہ وہ بدری صحابی تھے؛ نیز ملاحظہ ہو: ابن ہشام، دوم، ص ۶۰۹؛ سوم، ص ۱۶۹؛ واقدی، ص ۶۳-۳۵۴؛ ابن سعد، اول، ص ۶-۵۵؛ طبری، دوم، ص ۵۳۸؛ اسد، چہارم، ص ۵-۲۵۴؛ پنجم، ص ۲۹۶؛ نیز دیکھئے: ابن سعد، دوم، ص ۶؛ طبری، دوم، ص ۴۰۲؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۵ اور جمہرہ، ص ۲۲۶۔

(۵۹۲) جمہرہ، ص ۲۲۳ کے مطابق بنو باہلہ مالک بن اعصر بن سعد بن قیس عیلان کی نسل میں تھے جبکہ بنو غنی کا تعلق مالک بن اعصر کے بھائی عمرو کے خاندان سے تھا۔

(۵۹۳) جمہرہ، ص ۲۳۴۔

(۵۹۴) جمہرہ، ص ۲۳۵؛ اصابہ ۴۰۵۹، ۸۹۴۴۔ حضرت ابوامامہ باہلی حدیث نبوی کے ایک اہم عالم اور راوی تھے۔ ملاحظہ کیجئے: بخاری، صحیح، کتاب الحرس، کتاب الجہاد، کتاب الاطعمہ۔

(۵۹۵) ابن سعد، اول، ص ۳۰۷؛ نیز ملاحظہ ہو: مجموعۃ الوثائق، ص ۶۶-۱۶۵۔

(۵۹۶) جمہرہ، ص ۱۸۷، کا بیان ہے کہ وہ مکہ کے پڑوس میں رہتے تھے اس لیے قریش سے ان کے بہت قریبی تعلقات تھے۔ ابن اسحاق (ص ۲۵) کا بڑا دلچسپ بیان ہے کہ مکہ مکرمہ پر حبشی سردار ابرہہ کے حملہ کے دوران مکہ کے شیخ عبدالمطلب جب گفتگو کے لیے گئے تھے تو ان کے ساتھ اس وقت کے سردار ہذیل خویلد بن واثلہ تھے۔ نیز ملاحظہ ہو: ابن سعد، چہارم، ص ۱۵۰، جس کے مطابق مشہور صحابیِ رسول حضرت عبداللہ بن مسعود کے والد مسعود بن غافل ہذلی نے بنو زہرہ/قریش سے زمانہ جاہلیت میں حلف کے تعلقات استوار کئے تھے۔

(۵۹۷) ابن سعد، چہارم، ص ۵۱-۱۵۰ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود قریشِ مکہ کے ایک سردار عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں اُجرت پر چراتے تھے۔ نیز ملاحظہ ہو: جمہرہ، ص ۱۸۶؛ ابن اسحاق، ص ۴۲-۱۴۱۔

(۵۹۸) جمہرہ، ص ۱۸۶ (۵۹۹) جمہرہ، ص ۱۸۵؛ اصابہ ۹۲۔

(۶۰۰) واقدی، ص ۵۸۹۔ ہذیل کے دو اور مسلمانوں کے لیے ملاحظہ کیجئے: واقدی، ص ۶۹-۸۶۲، ۸۷۳ وغیرہ ان کے نام تھے: ابو حصین ہذلی اور سعید بن عمرو ہذلی۔

(۶۰۱) واقدی، ص ۲۶-۸۲۳، کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے موقعہ پر شہر میں حضرت خالد بن ولید کے زیر کمان دستے کو داخل ہونے سے جس گروہ نے روکا تھا اس میں ہذیل کے چار شخص تھے جو معرکہ میں مارے گئے تھے نیز ملاحظہ ہو: واقدی، ص ۸۷۰، جن کے مطابق ہم کو ہذیل کے قومی بُت سُواع کی بربادی اور اس کا پجاری و متولی (سادن) کے قبول اسلام کا علم ہوتا ہے۔

(۶۰۲) واقدی، ص ۹۲۴۔ (۶۰۳) جمہرہ، ص ۳۷۵۔

(۶۰۴) مجموعۃ الوثائق، ص ۶-۱۹۳ (۶۰۵) واقدی، ص ۹۰۶۔

(۶۰۶) واقدی، ص ۱۵۱، کا بیان ہے کہ عمرو بن سفیان اور اس کا بھائی جبار جو بنو ظفر کے حلیف تھے جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ نیز ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اوّل، ص ۳۰۰؛ ابن اسحاق، ص ۳۳۸۔

(۶۰۷) واقدی، ص ۳۵۱ وغیرہ۔

(۶۰۸) واقدی، ص ۴۴-۱۴۱، ۳۴۳؛ نیز ابن سعد، چہارم، ص ۲۴-۱۲۳۔

(۶۰۹) ابن اسحاق، ص ۳۶۵، کا بیان ہے کہ کعب بن اشرف بنو طے کے خاندان بنو نبہان کا فرد تھا جبکہ اس کی ماں مدینہ کے یہودی قبیلے بنو نضیر کی فرد تھی۔

(۶۱۰) ابن سعد، چہارم، ص ۵۳۹۔ (۶۱۱) واقدی، ص ۷۲-۷۷۱۔

(۶۱۲) ابن ہشام، سوم، ص ۱۲-۶۱۱؛ واقدی، ص ۹-۹۸۴؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۱۶۴؛ طبری، سوم، ص ۱۲-۱۱۱۔

(۶۱۳) ابن اسحاق، ص ۳۹-۶۳۷؛ واقدی، ص ۹-۹۸۷؛ نیز ملاحظہ کیجئے: اسد، سوم، ص ۴-۲۹۲؛ اصابہ، ۵۴۷۵۔

(۶۱۴) جمہرہ، ص ۴۰۸-۳۰۶ نے دو مسلمان بنو قرہ سے: حضرات جریر بن اوس اور ان کے پوتے عروہ، بنو سلامان سے: حضرت مالک بن عبداللہ، ایک بنو عدی بن اخزم سے: حضرت عدی بن حاتم طائی، ایک بنو جرم سے: حضرت قبیصہ بن اسود، ایک بنو نبہان سے: حضرت زید الخیل بن مہلہل کا ذکر کیا ہے۔ نیز ملاحظہ کیجئے: اصابہ ۱۱۳۵، ۵۵۲۷، ۵۰۵۴، ۷۰۵۷، اور ۲۹۴۱ بالترتیب۔

(۶۱۵) ابن اسحاق، ص ۶۳۷؛ ابن سعد، اول، ص ۳۲۳-۳۲۱؛ طبری، سوم، ص ۱۴۶-۱۴۵۔ حضرت زید کا نام الخیل سے بدل کر زید الخیر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا تھا۔

(۶۱۶) مجموعۃ الوثائق، ص ۱۶۹-۱۷۰۔

(۶۱۷) ابن ہشام، سوم، ص ۶۰۰؛ ابن سعد، اول، ص ۳۲۲؛ انساب الاشراف، اول، ص ۵۳۰؛ طبری، سوم ص ۱۴۱؛ اسد، سوم، ص ۳۹۳-۳۹۲؛ اصابہ ۵۴۷۵؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۶۳۷-۶۳۹؛ نیز دیکھئے ابن سعد، اول، ۳۲۲-۳۲۱ جس کے مطابق بنو طے کے متعدد لوگوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد قطائع عطا فرمائے تھے۔

(۶۱۸) طبری، سوم، ص ۲۴۴، ۲۵۵-۲۵۳، کا بیان ہے کہ طے کے صرف دو قبیلے جدیلہ اور غوث کچھ متزلزل ہوئے تھے، لیکن پھر وہ اسلام پر ثابت قدم رہے تھے۔ اس کا مزید بیان ہے کہ "بنو طے کے کسی فرد نے اسلام سے روگردانی نہیں کی تھی۔" اس سلسلہ میں بنو طے کے کسی اور گھرانے کا ذکر نہیں کیا ہے تاہم ابن حزم، ص ۳۷۸ اور ۳۷۷ کا بیان ہے، کہ جدیلہ کا تعلق اسد بن ربیعہ بن نزار سے تھا جبکہ غوث کا تعلق بنو طے سے تھا۔

(۶۱۹) ملاحظہ فرمائیے: مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۹۰-۸۹، جن کا خیال ہے کہ بہت سے بلکہ اکثر بنو طے کے عیسائی تھے اگرچہ وہ اسلامی ریاست کے وفادار رہے تھے۔ لیکن ان کا یہ خیال مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے ان کا یہ خیال کہ بنو طے کے بارے میں معلومات ناقص ہیں بھی صحیح نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ معلومات بہت زیادہ بھی نہیں ہیں تاہم اتنی ضرور ہیں جن سے ان کے قبول اسلام کا پختہ ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

(۶۲۰) ملاحظہ کیجئے جمہرہ، ص ۴۱۱-۴۱۳۔

(۶۲۱) جمہرہ، ص ۴۱۱-۴۱۳۔

(۶۲۲) ملاحظہ کیجئے واقدی، ص ۲۸، جن کا بیان ہے کہ غزوہ بدر سے پہلے شام جانے والے قریشی کارواں کے سالار ابوسفیان بن حرب کو شام کی حدود ہی میں قبیلہ جذام کے ایک شخص نے مطلع کیا تھا کہ مدینہ کے مسلمان ان کے کارواں کی واپسی پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

(۶۲۳) مثلاً حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی ایک زوجہ مکرمہ کا نام سہلہ بنت عاصم تھا اور ان کا تعلق بلی سے تھا، جب کہ

حضرت عمرو بن العاص سہمی کی والدہ اسی قبیلہ سے تھیں۔ ملاحظہ ہو ابن سعد، سوم ؛ واقدی، ص ۷۷۰۔

(۶۲۴) واقدی، ص ۶۸ - ۱۵۸ کے مطابق ان کے نام یہ تھے :

(۱) ابو بردہ بن نیار حلیف بنی سلمہ، (۲) ابو الہیثم بن التیہان اور (۳) ان کے بھائی عبید حلیف بنی عبد الاشہل (۴) عبد اللہ بن طارق اور (۵) ان کے سوتیلے بھائی معتب بن عبید حلیف بنی ظفر (۶ - ۱۲) معن بن عدی، ربیع بن رافع، ثابت بن اقرم، عبد اللہ بن سلمہ، زید بن اسلم، ابو عقیل بن عبد اللہ اور عاصم بن عدی حلفاء بنی عمرو بن عوف، (۱۳) نعمان بن اعصر حلیف بنی معاویہ، (۱۴) سواد بن غزیہ، حلیف بنی عدی بن نجار، (۱۵-۱۸) مجزر بن زیاد، عبدہ بن حسحاس، بعاث بن ثعلبہ اور ان کے بھائی عبد اللہ، حلفاء بنی لوذان بن غنم۔ نیز ملاحظہ ہو :

ابن اسحاق، ص ۳۳۰ - ۳۳۷ ؛ ابن سعد، سوم، ص ۶۲۷ - ۴۱۹ ؛ جمہرہ، ص ۴۱۴ - ۴۱۳۔

(۶۲۵) واقدی، ص ۳۸۵۔

(۶۲۶) جمہرہ، ص ۱۵-۴۱۳ ؛ اصابہ ۴۵۳۰، ۳۵۲۹، ۴۲۵۸، ۷۷۲۰، ۵۲۸۶، ۳۸۹۸، اور ۵۱۶۳۔

(۶۲۷) واقدی، ص ۶۰ ۷۔

(۶۲۸) واقدی، ص ۷۱ - ۷۷۰

(۶۲۹) واقدی، ص ۱۰۴۱

(۶۳۰) واقدی، ص ۹۹۰

(۶۳۱) طبقات، چہارم، ص ۵ - ۳۵۴

(۶۳۲) ابن سعد، اوّل، ص ۳۳۰

(۶۳۳) انساب الاشراف، اول، ص ۵۳۰

(۶۳۴) مجموعۃ الوثائق، ص ۴۹

(۶۳۵) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۱۱، کا خیال کہ بنو جبیل کو بعض گھرانوں کے صدقات اس لیے عطا کیے گئے تھے کہ وہ اسلام قبول کر لیں، نہ صرف یہ کہ اس کا کوئی حوالہ متن میں نہیں ملتا بلکہ وہ گمراہ کن بھی ہے کیونکہ وہ صحیح تعبیر کے خلاف ہے۔

(۶۳۶) ابن سعد، سوم، ص ۱۳۷-۸، کے مطابق حضرت سعد بن ابی وقاص کی دو شمالی عرب کی بیویاں تھیں، ایک کا تعلق بہراء سے تھا اور دوسری کا کلب سے۔

(۶۳۷) ملاحظہ کیجئے بالترتیب واقدی، ص ۱۵۵ اور ۱۶۸ اور ابن سعد، سوم، ص ۱۶۱ اور ۴۵۵ ؛ نیز ملاحظہ کیجئے : انساب الاشراف، اول، ص ۲۰۴۔ ابن سعد اور بلاذری دونوں حضرت مقداد کو مہاجرین حبشہ میں شمار کرتے ہیں۔

(۶۳۸) ابن اسحاق، ص ۳۲۸ اور ص ۳۳۳ ؛ ابن سعد، سوم، ص ۱۶۱، ص ۴۵۵ ؛ جمہرہ، ص ۴۱۳-۴۱۲۔

(۶۳۹) واقدی، ص ۶۰ - ۵۵۷

(۶۴۰) ابن سعد، اول، ص ۳۳۱ ؛ طبری، سوم، ص ۱۲۲۔

(۶۴۱) جمہرہ، ص ۲۱-۴۱۸۔

(۶۴۲) ابن سعد، چہارم، ص ۵۵۶، کے مطابق بنو عذرہ جناب اور اس کے نواحی علاقوں میں آباد تھے۔ ابن سعد اس علاقہ کو عذرہ اور بلی کا علاقہ کہتے ہیں کیونکہ دونوں قبیلے پڑوسی تھے۔ جناب کا علاقہ خیبر اور وادی القریٰ کے پار تھا۔ ملاحظہ ہو ابن سعد، دوم، ص ۱۲۰۔

(۶۴۳) بنو عذرہ کا سب سے اہم گھرانا بنو رزاح کا تھا جس کے بانی اوّل مکہ کے قریشی شیخ قصی بن کلاب کے سوتیلے بھائی تھے۔ انہیں کی مدد سے قصی مکہ میں بنو بکر بن عبد مناۃ کے سیاسی و سماجی تفوق ختم کر کے اپنی بالادستی قائم کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس طرح قریش سے بنو عذرہ کے ازدواجی اور حلف کے تعلقات مدت مدید سے قائم تھے۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۱۵-۱۴، ۹-۴۸، ۵۲: ابن سعد، اول، ص ۹-۶۸؛ کتاب المنمق، ص ۱۷، ۴-۸۳: انساب الاشراف، اوّل، ص ۵۰-۴۹؛ طبری، دوم، ص ۲۵۶؛ ازرقی، ص ۶۳-۶۲ اور جمہرہ، ص ۴۲۰۔

(۶۴۴) حضرت ثابت بن ثعلبہ انصاری ایک عذری عورت کے فرزند تھے جبکہ حضرت خالد بن عرفطہ عذری بنو زہرہ/قریش کے حلیف تھے۔ ملاحظہ ہو، بالترتیب: ابن سعد، سوم، ص ۵۶۹ اور چہارم ص ۳۵۵۔

(۶۴۵) ابن سعد، چہارم، ص ۳۵۶؛ جمہرہ، ص ۴۲۰؛ اصابہ ۲۱۸۲، ۲۱۱۰ وغیرہ۔

(۶۴۶) جمہرہ، ص ۴۲۰؛ اصابہ ۱۶۲۸، ۲۷۴۲، ۹۴۲ اور ۵۰۶۴۔ حضرت زمیل بن عمرو کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پرچم (لواء) عطا فرمایا جس کے ساتھ بعد میں وہ جنگ صفین میں حضرت معاویہ کی طرف سے شریک ہوئے تھے۔

(۶۴۷) ابن سعد، اول، ص ۲۷۰؛ طبری، سوم، ص ۱۰۸ اور اسد، پنجم، ص ۲۰۵۔ نیز مجموعۃ الوثائق، ص ۷۷-۱۷۶

(۶۴۸) اسد، چہارم، ص ۳۰۶

(۶۴۹) واقدی، ص ۴۰۳

(۶۵۰) واقدی، ص ۵۵۰، ۱۱۲۲ اور ۱۱۲۴۔

(۶۵۱) واقدی، ص ۱۰۱۷

(۶۵۲) مجموعۃ الوثائق، ص ۱۵۸

(۶۵۳) ایضاً، ص ۱۵۷

(۶۵۴) انساب الاشراف، اول، ص ۵۳۰؛ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص ۹۰۳، جن کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد ہذیم ہی کے ایک شخص کو ان کے صدقات وصول کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

(۶۵۵) ابن سعد، چہارم، ص ۳۵۶؛ نیز جمہرہ، ص ۴۲۰؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۰۸، کو اس روایت کی صحت پر شبہ ہے اور وہ اس کے آخری حصے کو "پراسرار و عجیب" سمجھتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت حمزہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ان کی یہ دلیل ضرور عجیب ہے۔ بنو عذرہ حجاز کے بالائی علاقے میں رہتے تھے، جیسے کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ گھرانے شامی حدود میں بھی آباد ہوں۔ اس لئے محض اپنے جغرافیائی تخمینے اور گمان کے سبب روایت کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

(۶۵۶) واقدی، ۴۴-۱۰۳۳، کا یہ بیان بہت اہم ہے کہ غزوۂ تبوک سے پہلے اسلام سعد ہذیم کے ایک خاص حصے تک محدود تھا

مگر غزوہ کے بعد وہ ان کے تمام گھرانوں اور بطون میں سرعت کے ساتھ پھیلا تھا اور اس نے پورے قبیلہ کو اپنی آغوشِ رحمت میں سمیٹ لیا تھا۔

(۶۵۷) ابن سعد، اول، ص ۳۲ - ۳۲۹ ؛ طبری، سوم، ص ۱۳۰۔

(۶۵۸) واقدی، ص ۷۱ - ۲۷۰۔

(۶۵۹) جمہرہ، ص ۴۴۴ ؛ نیز ملاحظہ ہو: ابن سعد، سوم، ص ۵۳۳۔

(۶۶۰) ملاحظہ ہو: جمہرہ، ص ۲۲ - ۴۲۱ ؛ اصابہ 9.15، ۱۳۸ اور ۵۸۵۷۔

(۶۶۱) جمہرہ، ص ۴۲۳ : اصابہ ۴۵۵۰۔

(۶۶۲) جمہرہ، ص ۴۲۵ ؛ اصابہ ۱۲۳۷ ؛ نیز ملاحظہ کیجئے واقدی، ص ۶۶۴ جن کا بیان ہے کہ عمرو بن جرہم غزوۂ خیبر میں موجود تھے۔ جبکہ ابن حزم کا بیان ہے کہ وہ صلح حدیبیہ میں بھی شریک تھے۔

(۶۶۳) ابن سعد، اول، ص ۳۲۹ (۶۶۴) ایضاً، ص ۶ - ۳۳۵

(۶۶۵) اسد، اول، ص ۲۷۶ (۶۶۶) ابن سعد، سوم، ص ۴۲ - ۴۱

(۶۶۷) قریش مکہ اور بنو کلب کے حلف و دوستی کے تعلقات کے لیے ملاحظہ ہو واقدی، ص ۱۵۲ - بدر کی جنگ میں بنو عامر بن لوی کا ایک کلبی حلیف معبد بن وہب مکی فوج میں موجود تھا۔

(۶۶۸) ابن سعد، چہارم، ص ۵۰ - ۲۴۹ ؛ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص ۸۷ ؛ جمہرہ، ص ۲۸۴ ؛ اصابہ ۲۳۹۰۔

(۶۶۹) واقدی، ص ۶۹۵ (۶۷۰) جمہرہ، ص ۲۶۴ - ۲۵۴

(۶۷۱) انساب الاشراف، اول، ص ۵۳۰ ؛ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص ۲-۵۶۱، ۵۰۷ اور 1.25 ؛ ابن سعد، دوم، ص ۸۹۔ (۶۷۲) ایضاً (۶۷۳) ابن سعد، اول، ص ۵ - ۳۳۴۔

(۶۷۴) انساب الاشراف، اول، ص ۳۱ - ۵۳۰۔

(۶۷۵) مجموعۃ الوثائق، ص ۷۰ - ۱۶۶۔

(۶۷۶) مونٹگری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۵ - 114

(۶۷۷) واقدی، ص ۷۰ - ۵۵۵ (۶۷۸) ابن سعد، دوم، ص ۸۸۔

(۶۷۹) جمہرہ، ص ۳۹۶ (۶۸۰) واقدی، ص ۵۸، ۵۵۶ ؛ ابن سعد، دوم، ص ۸۸۔

(۶۸۱) مجموعۃ الوثائق، ص ۱۵۶ (۶۸۲) ابن سعد، اول، ص ۵ - ۳۵۴۔

(۶۸۳) مجموعۃ الوثائق، ص ۷ - ۱۵۶ (۶۸۴) ایضاً

(۶۸۵) واقدی، ص ۱۰۳۲

(۶۸۶) مجموعۃ الوثائق، ص ۱۵۵ ؛ نیز ملاحظہ کیجئے: مونٹگری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۰۹ - واٹ کا خیال ہے کہ حسمیٰ کے قریب

آباد جذام کا قبیلہ مسلمان نہیں ہوا کیونکہ غزوۂ تبوک کے دوران ہم کو بنو وائل اور سعد ہذیم کے محض دو افراد کے قبولِ اسلام کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی یہ دلیل بڑی عجیب و غریب ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ ان کا خیال ہے کہ جذام کا وہ حصہ جو حضرت رفاعہ بن زید کی سرکردگی و قیادت میں تھا مسلمان نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے اسلامی حکومت سے اسلام قبول کیے بغیر صرف سیاسی اتحاد کر لیا تھا۔ ان کا یہ تبصرہ و نتیجہ مآخذ کے صریح بیانات کے خلاف ہے اس لیے قابل قبول نہیں ہے۔

(۶۸۷) جمہرہ، ص ۳۹۶ -

(۶۸۸) واقدی، ص ۶۰، ۷ ، ۹۹۰ ؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲۹ اور ۱۶۵ : نیز جمہرہ، ص ۳۹۸ -

(۶۸۹) ابن سعد، سوم، ص ۱۵ - ۱۱۴ ؛ جمہرہ، ص ۲۹۷ : اصابہ ۱۵۳۸ -

(۶۹۰) ابن سعد، اول، ص ۴۴ - ۳۴۳ ؛ واقدی، ص ۶۹۵ کے مطابق ان کا تعلق بنو الدار بن ہانی سے تھا اور ان کے اسمائے گرامی تھے :

(۱) ہانی بن حبیب، (۲) فاکہ بن نعم، (۳) جبلہ بن مالک، (۴) ابو ہند بن بر، (۵) ان کے بھائی طیب / عبداللہ، (۶) تمیم بن اوس، (۷) ان کے بھائی نُعیم بن اوس، (۸) یزید بن قیس، (۹) عزیز / عبد بن رحمٰن بن مالک اور (۱۰) ان کے بھائی مُرّہ۔ مزید ملاحظہ کیجئے : جمہرہ، ص ۳۹۶ : اصابہ ۸۳۷، ۸۶۷۶، ۹۱۷۴، ۶۳۸ -

(۶۹۱) مجموعۃ الوثائق، ص ۴۳ - ۴۲

(۶۹۲) غسان کے مخالفانہ رویے کے لیے ملاحظہ ہو واقدی، ص ۶۰ - ۷۵۵ وغیرہ ؛ ابن سعد، دوم، ص ۳۰ - ۱۲۸ وغیرہ۔

(۶۹۳) مجموعۃ الوثائق، ص ۴۲ - ۴۱

(۶۹۴) ایضاً

(۶۹۵) محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۱۳

(۶۹۶) ابن سعد، اول، ص ۹ - ۳۳۸

(۶۹۷) ابن اسحاق، ص ۶۴۸

(۶۹۸) قرآن کریم، سورہ ۱۷، آیت ۵۴ -

(۶۹۹) خطبہ حجۃ الوداع کا جملہ - ملاحظہ فرمایئے

(۷۰۰) قرآن کریم، سورہ آل عمران، آیت ۱۱۰

(۷۰۱) ابن سعد، چہارم، ص ۱۰۵

(۷۰۲) جمہرہ، ص ۴۱۰ - ۳۱۰

(۷۰۳) محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۱۷

(۷۰۴) ابن سعد، چہارم، ص ۶ - ۱۰۵ اور ۹ - ۳۵۷ -

(۷۰۵) ابن سعد، اول، ص ۹ - ۳۴۸ ؛ چہارم، ص ۱۶ - ۱۰۵ ؛ ۵۹ - ۳۵۷

(۷۰۶) ابن سعد، چہارم، ص ۱۰۶ ؛ بخاری، قدوم الاشعریین۔

(۷۰۷) ابن سعد، چہارم، ص ۱۰۸ ؛ فتوح البلدان، ص ۸۰ ؛ اسد، پنجم، ص ۳۰۸ ؛ نیز ملاحظہ ہو : بخاری، کتاب وجوب الحج -

(۷۰۸) بخاری، قدوم الاشعریین و اہل الیمن۔

(۷۰۹) جمہرہ، ص ۳۶۵

(۷۱۰) ایضاً، ص ۳۶۶

(۷، ۱۱) ابن سعد، اول، ص ۳۴۷-۸؛ جمہرہ، ص ۳۶۶۔ موخر الذکر کا بیان ہے کہ قبیلہ میں متعدد ابتدائی مسلمان موجود تھے۔

(۷، ۱۲) ابن سعد، دوم، ص ۲۶۶، ۳۴۷؛ طبری، سوم، ص ۱۵۸؛ بخاری، فضل الجہاد؛ اسد، دوم، ص ۲۷۹-۸۰؛ اصابہ ۱۱۳۶؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۴۵۔

نیز ملاحظہ فرمائیے: مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۲۱، جنھوں نے تبالہ اور ذوالخلصہ کی مہموں کو خلط ملط کر دیا ہے۔ پہلی مہم حضرت قطبہ بن عامر کی کمان میں صفر ۹ھ / مئی جون ۶۳۰ء میں گئی تھی (واقدی، ص ۹۸۱) دوسری مہم حضرت جریر بن عبداللہ بجلی کی قیادت میں رمضان ۱۰ھ / دسمبر ۶۳۱ء میں بھیجی گئی تھی۔ مونٹگمری واٹ کا یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ "رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علاقے کے لوگوں کو اپنے پڑوسیوں کے خلاف طاقت کا استعمال کرنے پر ابھارا تھا" غلط ہے۔ ان کے قومی بُت کو توڑنے کا معاملہ دراصل ان کے قبول اسلام کا نتیجہ تھا نہ کہ باعث و محرک۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ان کے پختہ ایمان اور عزم بالجزم کا بھی ایک ثبوت تھا۔

(۷، ۱۳) جمہرہ، ص ۳۶۵-۶

(۷، ۱۴) ابن سعد، اول، ص ۳۲۶؛ طبری، سوم، ص ۱۷۸؛ اسد، اوّل، ص ۲۷۹-۸۰؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۴۵۔

(۷، ۱۵) ابن سعد، اول، ص ۳۴۷-۸۔

(۷، ۱۶) واقدی، ص ۷۲۲

(۷، ۱۷) ابن سعد، اول، ص ۳۴۸؛ نیز ملاحظہ فرمائیے: جمہرہ، ص ۳۶۸، جس کا بیان ہے کہ ارکانِ وفد کا تعلق بنو معاویہ سے تھا لیکن جب وُہ مدینہ پہنچے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بنو رشد کا خطاب ان کے بلا پس و پیش کے اسلام قبول کر لینے کے سبب عطا فرمایا تھا۔

(۷، ۱۸) جمہرہ، ص ۳۶۹-۷۳

(۷، ۱۹) ابن سعد، اول، ص ۳۴۰-۴۱؛ اسد، پنجم، ص ۲۳۴-۳۵۔

(۷، ۲۰) جمہرہ، ص ۳۷۲؛ اصابہ ۴۱۷۹؛ نیز ملاحظہ کیجئے: مجموعۃ الوثائق، ص ۱۱۷۔

(۷، ۲۱) اسد، پنجم، ص ۲۹۴، ۲۳۴-۵؛ ابن سعد، اول، ص ۳۴۰-۴۱؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۴۳؛ نیز دیکھیے اسد، سوم، ص ۸۲؛ مجموعۃ الوثائق، ص ۱۱۵-۱۶، کے مطابق اس کے کم از کم پندرہ خاندانوں میں معتدبہ مسلم آبادی ہو گئی تھی۔

(۷، ۲۲) جمہرہ، ص ۳۷۳؛ اصابہ ۲۹۱۷

(۷، ۲۳) حوالہ سابقہ ۷، ۲۱

(۷، ۲۴) مجموعۃ الوثائق، ص ۱۱۷

(۷، ۲۵) ایضاً، ص ۱۱۰-۱۱

(۷، ۲۶) طبری، سوم، ص ۱۳۲، کا بیان ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے قبولِ اسلام کی اطلاع ملی تھی تو

آپ نے خداوند قدوس کا شکر ادا کیا تھا اور ہمدان کے مسلمانوں کے ایمان ویقین کی تعریف وتحسین فرمائی تھی اور ان کے لیے برکاتِ الٰہی کی دعا مانگی تھی۔

(۲۷) ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۱۵-۱۰۹، جس سے ہر سردار قبیلہ اور اس کے لوگوں کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں۔ ان سے وہ فرائض اور احکام بھی معلوم ہوتے ہیں جو آپ نے حمیری مسلمانوں کے لیے ضروری قرار دئے تھے۔ ان پر نمازوں کو قائم کرنا، زکوٰۃ خمس اور صفی رسول ادا کرنا عائد کیا گیا تھا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمانوں پر عائد ہونے والے محاصل جیسے زکوٰۃ اور صدقہ کی شرح واضح طور سے بیان کی گئی ہے اس طرح غیر مسلموں کے لیے جزیہ کی شرح کا بھی غیر مبہم ذکر موجود ہے۔

(۲۸) واقدی، ص ۱۰۸۵

(۲۹) ابن سعد، اول، ص ۲۸۲؛ طبری، سوم، ص ۱۰۸؛ اسد، چہارم، ص ۱۶۱؛ اول ۱۱۰ بالترتیب۔

(۳۰) ایضاً

(۳۱) جمہرہ، ص ۸۷-۳۸۱

(۳۲) ابن سعد، سوم، ص ۵۰-۲۴۶؛ اسد، چہارم، ص ۴۷-۴۳

(۳۳) واقدی، ص ۱۰۴۱؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۴؛ اسد، چہارم، ص ۲۲۴؛ جمہرہ، ص ۸۷-۳۸۰۔ موخر الذکر کا بیان ہے کہ ان کے ایک بھائی حضرت حارث بن جزء زبیدی اور ایک فرزند حضرت عبداللہ بن محمیہ زبیدی مکی عہد کے مسلمان تھے۔ نیز ملاحظہ ہو: اصابہ ۲۳، ۸۲۷ اور ۸ ۴۵۹۔

(۳۴) ابن سعد، اول، ص ۳۴۲۔

(۳۵) واقدی، ص ۱۰۸۰، کا بیان ہے کہ مذحج کے متعدد سردار اور شیوخ حضرت علی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے نہ صرف اپنے قبول اسلام کا اعتراف واقرار کیا بلکہ اپنے پورے قبیلہ کے مسلمان ہونے کی ضمانت دی۔ اور اس کے پہلے عملی ثبوت کے طور پر انھوں نے اپنے پورے قبیلہ والوں کی جانب سے صدقات بھی ادا کر دئے۔

(۳۶) ابن سعد، اول، ص ۴۲-۳۴۱۔

(۳۷) ابن ہشام، سوم، ص ۶۰۰؛ طبری، سوم، ص ۱۴۷؛ فتوح البلدان، ص ۸۰۔

(۳۸) ملاحظہ ہو مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۰-۱۱۹۔

(۳۹) اسود عنسی کی بغاوت اور اس کے متعلقہ امور کے لیے ملاحظہ فرمائیے: فتوح البلدان، ص ۱۵-۱۱۳؛ طبری، سوم، ص ۴۰-۲۲۷ اور جمہرہ، ص ۳۸۳۔

(۴۰) طبری، سوم، ص ۱۳۲۔

(۴۱) طبری، سوم، ص ۳۶-۱۳۴؛ نیز ملاحظہ کیجئے ابن اسحاق، ص ۴۰-۶۳۹

(۴۲) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۱۹؛ نیز ملاحظہ کیجئے اس کے برعکس ثبوت کے لیے ابن اسحاق، ص ۴۰-۶۳۹

(۴۳) ملاحظہ فرمائیے ابن ہشام، سوم، ص ۵۸۳؛ ابن سعد، اول، ص ۳۲۷؛ ابن خلدون، ص ۸۲۳؛ اسد،

پنجم، ص ۱۸۰؛ جمہرہ، ص ۳۸۲؛ اصابہ ۱۶۹۸۔

(۴۴) ایضاً (۴۵) ایضاً (۴۶) جمہرہ، ص ۴-۳۸۳

(۴۷) ابن سعد، اول، ص ۶-۳۲۴؛ جمہرہ، ص ۵-۳۸۴؛ اصابہ ۱۸۳۷۔

(۴۸) جمہرہ، ص ۳۸۵؛ ابن سعد، اول، ص ۳۲۵؛ اسد، پنجم، ص ۲۱۷؛ اصابہ ۱۸۳۷۔

(۴۹) واقدی، ص ۱۰۸۲ (۵۰) ایضاً (۵۱) ابن سعد، اول، ص ۳۲۸؛ طبری، سوم، ص ۳۳-۱۳۲

(۵۲) طبری، سوم، ص ۳۲-۱۳۲ (۵۳) ایضاً، ص ۳۵-۱۳۳

(۵۴) ابن سعد، اول، ص ۵-۳۴۴؛ طبری، سوم، ص ۱۳۹۔

(۵۵) واقدی، ص ۶۹۵؛ نیز ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۱۱۷۔ جس کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں ہر ایک کو ایک "کتاب" (تحریر) عطا فرمائی تھی۔ اگرچہ ماخذ سے ان "کتب نبوی" کے متون و مواد کا علم نہیں ہوتا لیکن اندازہ یہ ہے کہ ان کو اسلام کی ہدایات و احکام دی گئی ہوں۔ بہرحال ان راویوں نے اپنے اپنے حصے حضرت معاویہ کے ہاتھ گراں قیمت پر فروخت کر دیے تھے۔

(۵۶) جمہرہ، ص ۸-۳۸۷؛ ابن سعد، اول، ص ۶-۳۲۵

(۵۷) اسد، دوم، ص ۶۸۔

(۵۸) ابن سعد، اول، ص ۳۴۶؛ طبری، سوم، ص ۲۲۰؛ نیز ملاحظہ ہو: جمہرہ، ص ۳۸۹۔

(۵۹) جمہرہ، ص ۳۸۹؛ نیز اصابہ ۲۷۹۵۔

(۶۰) جمہرہ، ص ۳۹۰؛ مجموعۃ الوثائق، ص ۶-۱۲۵

(۶۱) جمہرہ، ص ۹۲-۳۹۱۔

(۶۲) ابن ہشام، سوم، ص ۵۹۲؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۹؛ طبری، سوم، ص ۷-۱۲۶؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۲۸؛ اسد، دوم، ص ۹۲-۹۳؛ بخاری، کتاب المغازی؛ مجموعۃ الوثائق، ص ۷۲-۱۔

(۶۳) طبری، سوم، ص ۲-۱۳۱۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ طبری نے خود اس روایت کی تردید پہلے ایک اور روایت میں کی ہے جس میں حضرت خالد کی کامیابی کا واضح ذکر ہے ملاحظہ ہو: ایضاً، ص ۷-۱۲۶۔

(۶۴) ایضاً (۶۵) مجموعۃ الوثائق، ص ۷۷-۳

(۶۶) ابن سعد، اول، ص ۳۲۴ (۶۷) طبری، سوم، ص ۲۶-۳۲۴

(۶۸) مجموعۃ الوثائق، ص ۱۱۹ (۶۹) جمہرہ، ص ۴۱۸

(۷۰) مجموعۃ الوثائق، ص ۹-۷۷ (۷۱) جمہرہ، ص ۳۱۲ (۷۲) ایضاً

(۷۳) واقدی، ص ۹۲۳، کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے فوراً بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت طفیل بن عمرو کو

ازد ذی الخلصہ کی مہم پر بھیجا۔ واپسی پر حضرت طفیل کے ساتھ ازد کے چار سو مسلمان تھے، جنھوں نے طائف کے غزوہ میں حصہ لیا۔

(۷۷۴) ابن ہشام، سوم، ص ۶۴۲؛ ابن سعد، اوّل، ص ۲۳۷-۸؛ طبری، سوم، ص ۲۴۵۔

(۷۷۵) ابن سعد، اول، ص ۳۴۵، ۳۵۲؛ مجموعۃ الوثائق، ص ۱۱۹-۲۱

(۷۷۶) واقدی، ص ۱۰۸۳؛ نیز ملاحظہ کیجئے: ابن قتیبہ دینوری، کتاب المعارف، ص ۱۸۹-۹۰؛ ابن سعد، دوم، ص ۲۶۲-۶۳؛ نثار احمد فاروقی، مذکورہ بالا، ص ۸۹-۹۱

(۷۷۷) جمہرہ، ص ۳۹۹-۴۰۵۔

(۷۷۸) جمہرہ، ص ۴۰۳۔ بانی خاندان اشرس کی والدہ کا نام تُجیب تھا اور اسی کے نام سے قبیلہ موسوم ہوا۔ اس کے متعدد بطون ہو گئے تھے۔

(۷۷۹) ابن سعد، اول، ص ۳۲۳ کے مطابق وفد کے ارکان کی تعداد صرف تیرہ تھی جبکہ ابن اسحاق ص ۶۴۱ اور طبری، سوم، ص ۱۳۸-۳۹ کے مطابق وہ ساٹھ تھے۔ ابن قتیبہ دینوری، کتاب المعارف، ص ۳۳۳ اور محمد بن حبیب بغدادی، کتاب المحبر، ص ۲۹۱ کے مطابق ستر تھی۔ بہرحال اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ سب مسلمان تھے۔

(۷۸۰) کتاب المحبر، ص ۱۲۵-۶

(۷۸۱) جمہرہ، ص ۳۹۹-۴۰۴؛ اصابہ ۲۰۵، ۳۸۷۰، ۱۶۲۹، ۳۸۸۷، ۹۲۳۰، ۱۶۳۴، ۳۰۷۷، ۲۵۰، ۸۰۶۲ بالترتیب۔

(۷۸۲) ابن خلدون، اوّل، ص ۸۴۳؛ اسد، پنجم، ص ۲۔

(۷۸۳) جمہرہ، ص ۴۲۹۔

(۷۸۴) ابن سعد، چہارم، ص ۳۵۹-۶۳؛ جمہرہ، ص ۴۳۰؛ اصابہ ۵۶۴۲۔

(۷۸۵) ابن سعد، چہارم، ص ۳۶۳۔

(۷۸۶) جمہرہ، ص ۴۲۹-۳۰؛ اصابہ ۹۱۰۰؛ مجموعۃ الوثائق، ص ۱۲۷-۳۰۔ (۷۸۷) ایضاً

(۷۸۸) ابن سعد، اول، ص ۳۴۹-۵۱؛ نیز ملاحظہ ہو: ص ۳۲۹؛ جمہرہ، ص ۴۳۱۔

(۷۸۹) طبری، سوم، ص ۲۲۷-۸ وغیرہ؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۴۳؛ اسد، اول، ص ۱۶۳؛ سوم، ص ۶۔ (۷۹۰) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۲۹۔

(۷۹۱) طبری، سوم، ص ۲۳۱-۴۰؛ ان کے قبول اسلام کے لیے مزید دیکھئے: ص ۱۵۸۔

(۷۹۲) جمہرہ، ص ۲۷۵-۳۰۸۔

(۷۹۳) ابن سعد، پنجم، ص ۵۶۴ ؛ کتاب المعارف، ص ۳۳۸ ؛ بخاری، کتاب الجمعہ۔

(۷۹۴) ابن ہشام، سوم، ص ۶۰۷ ؛ ابن سعد، اول، ص ۲۶۳ ؛ فتوح البلدان، ص ۸۹ ؛ کتاب المحبر، ص ۷۷ ؛ طبری، دوم، ص ۶۴۵ اور سوم، ص ۲۹ ؛ اسد، پنجم، ص ۸-۷ ؛ مجموعۃ الوثائق، ص ۵۷-۵۵ ؛ نیز ملاحظہ فرمایئے : واقدی، ص ۴۰-۳۳۹ اور ۶-۴۰۵ ، عبدالقیس کے دو شخصوں کے غزوہ مریسیع کے دوران قبولِ اسلام کے لیے۔

(۷۹۵) کتاب المحبر، ص ۷۷، میں اس کی صراحت نہیں ہے کہ یہ رقم دیناروں میں تھی یا درہموں میں۔ وہ اس کے لیے لفظ مال (خطیر دولت) استعمال کرتی ہے۔ قیاس یہی ہے کہ یہ رقم دراہم میں تھی۔

(۷۹۶) مجموعۃ الوثائق، ص ۶۲-۶۱ کے مطابق ان دونوں افسرانِ صدقات کے نام تھے : حضرت قدامہ اور حضرت ابوہریرہ۔

(۷۹۷) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۳۲، کا عجیب وغریب خیال یہ ہے کہ حضرت منذر بن ساوی اور ان کی رعایا کا قبول اسلام دراصل ایک سیاسی سمجھوتہ تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ ایرانی سلطنت کے زوال سے ان کو خطرات لاحق ہو گئے تھے اور مملکتِ بحرین کو کسی سیاسی اور فوجی امداد یا معاہدہ کی ضرورت تھی حالانکہ مدینہ کی اسلامی ریاست اس وقت کوئی فوجی مدد دینے کے لائق نہیں تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی ریاست فوجی اور سیاسی مدد دینے کے اہل نہیں تھی تو شاہِ بحرین نے اس سے سمجھوتہ کیا ہی کیوں تھا؟ اور پھر اس کے اسلام قبول کرنے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ ان کے بقول قبولِ اسلام کے بغیر بھی سیاسی سمجھوتہ ہو سکتا تھا۔ واٹ کا نظریہ اور اس کی تائید میں ان کی دلیلیں تضادات سے بھرپور ہیں۔

(۷۹۸) ابن سعد، اوّل، ص ۳۱۴-۱۵، کا بیان ہے کہ ۸ھ / ۶۳۰ء میں ان کا بیس افراد پر مشتمل وفد پہنچا تھا جبکہ طبری، سوم، ص ۱۳۶-۷، کا خیال ہے کہ ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں وہ وفد آیا تھا۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ حضرت جارود دوبار وفود لے کر پہنچے ہوں۔ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۶-۶۳۵ ؛ کتاب المعارف، ص ۴۰-۳۳۹

(۷۹۹) ایضاً۔ نیز ملاحظہ ہو : مجموعۃ الوثائق، ص ۹-۶۸

(۸۰۰) ایضاً۔ نیز ملاحظہ کیجئے : جمہرہ، ص ۸۰-۲۷۹ ؛ اصابہ ۱۰۴۲ ، ۲۰۱ ، ۸۲۱۸ اور ۳۳۰۹ : طبری، سوم، ص ۳۰۲ وغیرہ۔

(۸۰۱) مجموعۃ الوثائق، ص ۶۴ - ۶۲

(۸۰۲) محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۳۱

(۸۰۳) ابن اسحاق، ص ۹۲-۷۹۱ (ابن ہشام کا تبصرہ واضافہ) نیز ملاحظہ ہو: ص ۷۷-۶۷۶ ؛ بخاری، وفد بنی حنیفہ، حدیث ثمامہ بن اثال۔

(۸۰۴) نجد کے علاقے میں انھیں دو زمانوں میں ہماری معلومات کے مطابق نہیں بھیجی گئی تھیں۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ اول-۱۔

(۸۰۵) ابن سعد، اول، ص ۲۶۲، نے ان کو یمامہ کے بادشاہ کہا ہے۔

(۸۰۶) فتوح البلدان، ص ۹۰؛ طبری، دوم، ص ۴۵-۶۴۴؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۸؛ کتاب المحبر، ص ۷۷۔ (۸۰۷) طبری، سوم، ص ۱۳۷۔

(۸۰۸) ابن اسحاق، ص ۶۳۶؛ ابن سعد، اول، ص ۱۷-۳۱۶؛ کتاب المحبر، ص ۷۷، اور فتوح البلدان، ص ۹۰؛ نیز ملاحظہ ہو طبری، سوم، ص ۸-۱۳۷۔

(۸۰۹) مغربی مورخین نے مسیلمہ کذاب کے مذہبی خلوص اور عقیدہ میں تجربات پر بہت کچھ لکھا ہے اور اس کو ایک سچا متلاشی حق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اسلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کے اثرات کو ثابت کرنے کا فرض انجام دیا ہے۔ اگرچہ مسیلمہ کذاب پر بحث سردست ہمارے موضوع سے تعلق نہیں رکھتی لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اس ضمن میں جو کچھ لکھا ہے وہ بہر حال ایک علمی اور سنجیدہ بحث کے معیار سے کہیں فروتر ہے۔ ملاحظہ کیجئے ڈی، ایس، مارگولیتھ کا مضمون "مسلم اور حنیف کے ناموں کا ماخذ اور اہمیت پر" جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن ۱۹۰۳ء؛ جے، لیل (J. LYALL) کے مضامین مسلم اور حنیف پر۔ مذکورہ بالا۔ ایف، بہل (F. BUHL) کا مضمون "مسیلمہ پر" انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۷-۱۳۴۔

(۸۱۰) جمہرہ، ص ۲۹۲ (۸۱۱) جمہرہ، ص ۲۹۳؛ اصابہ ۴۲۸۳

(۸۱۲) جمہرہ، ص ۹۲-۲۹۱ (۸۱۳) ایضاً، ص ۹۳-۲۹۱؛ اصابہ ۹۶۱۔

(۸۱۴) طبری، سوم، ص ۱۸۷؛ نیز ملاحظہ ہو اسد، چہارم، ص ۱۷۵

(۸۱۵) فتوح البلدان، ص ۸۷؛ جمہرہ، ص ۳۲۳، ص ۳۳۲، ص ۳۵۰، ص ۳۵۸ اور ص ۳۶۲۔

(۸۱۶) ابن سعد، اول، ص ۲۶۲؛ کتاب المحبر، ص ۷۷؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۸؛ جمہرہ، ص ۳۶۲۔

(۸۱۷) مذکورہ بالا؛ نیز مجموعۃ الوثائق، ص ۷۱-۶۹۔

(۸۱۸) فتوح البلدان، ص ۸۷؛ نیز ملاحظہ ہو، مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۳۱، جن کا خیال ہے کہ عمان کے ان دونوں حکمرانوں نے خود سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلقات قائم کرنے کے لیے سلسلہ جنبانی کی تھی۔

(۸۱۹) فتوح البلدان، ص ۸۸-۸۷ (۸۲۰) جمہرہ، ص ۴۱۲

(۸۲۱) فتوح البلدان، ص ۸۸۔

(۸۲۲) ابن سعد، اول، ص ۶-۳۵۵؛ نیز ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۱۳۱۔

(۸۲۳) فتوح البلدان، ص ۸۸؛ طبری، سوم، ص ۱۸-۳۱۳۔

(۸۲۴) جمہرہ، ص ۱۹۶ وغیرہ (۸۲۵) جمہرہ، ص ۱۹۶، ۲۰۰، ۲۰۳ اور ۲۲۱۔

(۸۲۶) ابن سعد، سوم، ص ۱۶۴-۶۷۔ (۸۲۷) ابن سعد، سوم، ص ۱۹۰

(۸۲۸) ابن سعد، چہارم، ص ۱۹۷

(۸۲۹) جمہرہ، ص ۱۹۹-۲۰۰؛ اصابہ ۹۰۰۷، ۹۰۰۸، ۱۵۰۱، ۴۰۷۶ (نیز اسد، سوم، ص ۲۷-۲۸)، ۴۰۸۶، ۱۸۵۹؛ نیز ملاحظہ ہو: طبری، سوم، ص ۲۶۸-۹۔

(۸۳۰) واقدی، ص ۸۰۳-۴۔ ملاحظہ کیجیے ابن اسحاق، ص ۶۲۸؛ طبری، سوم، ص ۶۵، جن کا خیال ہے کہ اس مہم میں تمیم کا ایک بڑا دستہ شریک تھا۔

(۸۳۱) ابن اسحاق، ص ۵۹۳-۹۵؛ واقدی، ص ۹۱۹-۲۰۔

(۸۳۲) واقدی، ص ۹۴۶ (۸۳۳) ابن اسحاق، ص ۶۸۶

(۸۳۴) ابن سعد، اول، ص ۲۹۴-۵؛ نیز ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۶۲۸-۳۱؛ مجموعۃ الوثائق، ص ۱۳۳-۲۷۔

(۸۳۵) ابن اسحاق، ص ۶۳۱ (۸۳۶) واقدی، ص ۹۷۹-۸۰

(۸۳۷) طبری، سوم، ص ۱۱۵-۲۰؛ نیز ملاحظہ ہو: مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۳۸، جن کو ان کے اسلام سے انکار ہے صرف اِس بنا پر کہ حضرت مالک بن نویرہ بھی اس میں شامل تھے۔ ان کا بیان عجیب وغریب تاویلات اور دُوراز کار دلائل کا مجموعہ ہے۔

(۸۳۸) ابن ہشام، دوم، ص ۱۹۷-۸؛ انساب الاشراف، اول، ص ۵۳۰؛ طبری، سوم، ص ۱۴۷؛ ابن خلدون، اول، ص ۳۴۸؛ اسد، دوم، ص ۲۷-۸، ۱۹۴-۵، ۳۶۹-۷۰؛ چہارم ص ۲۱۹-۲۱ اور ص ۲۹۵۔

(۸۳۹) جمہرہ، ص ۱۹۷-۹، ۲۰۰-۲۰۷؛ اصابہ ۶۹۰، ۳۴۷۸، ۹۱۲۴، ۱۸۹۳، ۱۷۳۲، ۷۲۱۹، ۷۱۵۸، ۵۳۳۴، ۹۰۰۷-۸، ۱۵۰۱، ۴۰۷۶، ۴۰۸۶، ۱۸۵۹، ۱۱۴۹، ۱۶۱، ۵۶۳۷، ۱۵۷۷، نساء ۴۳، نساء ۵۵، ۶۱۲۸، ۵۵۶۶، ۱۰۱۷، ۸۳۰۱، ۹۳۵۸، ۷۱۹۴، ۳۴۱۳، ۸۴۸۵۔

(۸۴۰) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۳۹-۴۰۔ (۸۴۱) اسد، دوم، ص ۱۹۴-۵

(۸۴۲) جمہرہ، ص ۲۸۰-۳۰۸؛ نیز واقدی، ص ۷۶۰، ۱۰۳۲۔

(۸۴۳) جمہرہ، ص ۲۸۵-۶؛ مجموعۃ الوثائق، ص ۱۹۵؛ اصابہ ۴۳۸۱؛ نیز ملاحظہ کیجیے ابن ہشام، ص ۵۹۰؛ ابن سعد، اول، ص ۲۶۴-۵؛ انساب الاشراف، اول، ص ۵۲۹؛ فتوح البلدان، ص ۸۰-۸۳؛ طبری، سوم، ص ۱۲۱؛ بخاری، باب وجوب الزکاۃ؛ اسد، چہارم، ص ۳۷۶-۸۔

(۸۴۴) واقدی، ص ۴۴، ۱۹۸، ۵۵۴؛ جمہرہ، ص ۲۹۵؛ اصابہ ۲۲۵۔ مؤخر الذکر دونوں مآخذ دو اور غزی

مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(۸۴۵) مجموعۃ الوثائق، ص ۳۳ - ۱۳۲؛ جمہرہ، ص ۲۹۷؛ اصابہ ۱۷۰۹۔

(۸۴۶) ابن سعد، اول، ص ۳۱۵ (۸۴۷) ایضاً، ص ۱۷ - ۳۱۶

(۸۴۸) طبری، سوم، ص ۳۱۰؛ نیز ملاحظہ ہو: جمہرہ، ص ۳۰۸ - ۲۹۰۔

(۸۴۹) جمہرہ، ص ۹۹ - ۲۹۸؛ اصابہ ۷۰۴، اور ۲۲۲۱، سدوس/شیبان کے دو مسلمانوں بشیر بن معبد اور خالد بن مُعمّر کے لیے۔

(۸۵۰) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۴۱، کا نظریہ ہے کہ عیسائی طبقات نے عہد نبوی میں اسلام قبول نہیں کیا تھا۔

باب سوم

(۱) ملاحظہ ہو باب اوّل۔

(۲) ابن اسحاق، ص ۲۳۲؛ باب اوّل ــــ بحث بر دستورِ مدینہ

(۳) مہماتِ نبوی پر بحث کے لیے ملاحظہ ہو باب اول۔

(۴) ملاحظہ ہو ضمیمہ اوّل - ۱۔

(۵) ایضاً - ابن سعد، سوم، ص ۴۵ اور انساب الاشراف، اول، ص ۳۷ - ۴۷۲ کی ایک روایت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ کو نو مہموں میں کم از کم امیر مقرر فرمایا تھا (یُؤمِّرُہٗ) مگر بعض دوسرے مآخذ کا بیان ہے کہ انھوں نے کم از کم تیرہ مہموں میں قیادت کی تھی۔ ملاحظہ ہو اسد الغابہ، دوم، ص ۲۷-۲۲۴ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید بن حارثہ کی اتنی کثیر تقرریوں کے پیچھے دوسرے اسباب وعوامل کے علاوہ سیاسی اسباب بھی کافی کارفرما تھے۔ صحابی موصوف کی فوجی صلاحیتوں اور قائدانہ لیاقتوں سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کیونکہ انھوں نے اپنی تمام مہموں میں سوائے غزوہ موتہ کے کامیابی حاصل کی تھی اور اسلامی ریاست کو بے انتہا فوائد پہنچائے تھے۔ تاہم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کو مقرر کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام عربوں پر عام طور سے اور مسلمانوں پر خاص طور پر یہ تاثر قائم کرنا چاہتے تھے کہ اسلامی سیاسیات ونظم ونسق میں مناصب اور عہدوں کی اصل بنیاد صلاحیت ولیاقت ہے نہ کہ اعلیٰ خاندان میں پیدائش کا اتفاقی حادثہ یا حسب ونسب پر مبنی سماجی مرتبہ۔ عرب دوسرے اقوام عہد وسطیٰ کی مانند سماجی اونچ نیچ اور خاندانی وقبائلی شرافت ونجابت کے قائل تھے۔ اور ظاہر ہے کہ ان کو ایک مولیٰ کی قیادت میں لڑنا ناگوار ہوتا تھا۔ اس کا اظہار حضرت اسامہ بن زید کی تقرری کے ضمن میں ہوتا ہے۔ حیات طیبہ کے اواخر میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ کو امیرِ لشکر مقرر کیا اور ان کی ماتحتی میں تمام بڑے بڑے صحابہ دے دئے گئے تو بعض نجیب وشریف واعلیٰ خاندان کے عربوں نے ایک مولیٰ زادہ کے اس منصبِ جلیل پر تقرر پر اعتراض کیا۔ رسول کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کو جب اس کی خبر ہوئی تو آپ نے اپنی شدید بیماری اور نقاہت کے باوجود خطبہ دیا جس میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ "مجھے معلوم ہے کہ تم کو اسامہ کے مقرر کیے جانے پر اعتراض ہے اور اس سے قبل تم نے ان کے والد زید کی تقرری پر بھی اعتراضات کئے تھے لیکن خدا کی قسم دونوں امارہ (منصب امیر) کے پورے اہل تھے۔" بہرحال بعد میں معترضین کو ندامت ہوئی اور لشکرِ اسامہ کو عہد صدیقی میں روانہ کیا گیا۔ ملاحظہ ہو واقدی، ص ۱۹-۱۱۱۸ اور آئندہ؛ انساب الاشراف، اول، ص ۴۷۴۔

(۶) ملاحظہ ہو ابن سعد، سوم، ص ۴۶-۴۵ اور اسد الغابہ، دوم، ص ۲۲۴-۲۲۴۔

(۷) ملاحظہ ہو ضمیمہ اول -۱- (۸) ایضاً

(۹) بنو امیہ کے اسلام اور اسلامی ریاست کے ساتھ تعلقات کے بارے میں بہت اہم غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو اس بحث کے لیے میرے مضامین بنو امیہ اور بنو ہاشم کے درمیان رقابت اور ازدواجی تعلقات پر، برہان دہلی، جنوری ۱۹۸۰ء اور مئی - اگست ۱۹۸۰ء۔

(۱۰) ازرقی، کتاب اخبار مکہ، مرتبہ فرڈیننڈ وستنفلڈ، بیروت ۱۹۶۴ء، ص ۶۶-۶۴؛ نیز میرا مضمون، برہان دہلی، جنوری ۱۹۸۰ء۔

(۱۱) مکی اشرافیہ کے مناصب کے لیے ملاحظہ ہو: ابن عبدربہ، العقد الفرید، قاہرہ ایڈیشن، سوم، ص ۳۱۵؛ فاکہی، کتاب المنتقیٰ فی اخبار ام القریٰ، بیروت ۱۹۶۴ء، دوم ص ۱۴۳۔ نیز ملاحظہ ہو: گرونی بام، کلاسیکل اسلام، انگریزی ترجمہ کیتھرین واٹسن، لندن ۱۹۷۰ء، ص ۳۰؛ شبلی نعمانی، اوّل، ص ۱۵۶-۱۵۷؛ خاکسار کا مضمون مذکورہ بالا۔

(۱۲) قبہ کے منصب میں شہسوار دستوں کی سالاری کے علاوہ مکی فوج کے لیے فرودگاہ وغیرہ کے انتظامات کی ذمہ داری بھی شامل تھی۔ ملاحظہ ہو العقد الفرید، سوم، ص ۳۱۵؛ شبلی نعمانی، اوّل، ۱۵۶-۱۵۷۔

(۱۳) اسلام کے اس عظیم سالار پر کئی عالمانہ کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں محمود شیت خطاب کی تازہ تصنیف خالد بن ولید المخزومی اور قادۃ فتح العراق والشام جدید تحقیقات سے بھرپور ہیں۔

(۱۴) ملاحظہ ہو ابن سعد، سوم، ص ۲۱۳-۱۹۹؛ اسد، سوم، ص ۲۳-۲۰۲؛ بخاری اور مسلم، فضائل اصحاب النبی۔

(۱۵) ابن سعد، سوم، ص ۲۷۵-۲۶۵؛ اسد، چہارم، ص ۵۲-۵۲؛ بخاری و مسلم، ایضاً۔

(۱۶) ابن سعد، سوم، ص ۴۰۹-۱۵؛ اسد، پنجم، ص ۲۴۹؛ بخاری اور مسلم، ایضاً۔

(۱۷) ملاحظہ ہو: جمہرہ انساب العرب، ص ۲۶-۳۱۲ اور ۴۷-۳۲۶ بالترتیب اوس اور خزرج کے لیے۔

(۱۸) حوالوں کے لیے ملاحظہ کیجئے ضمیمہ اوّل -۱-

(۱۹) ایضاً (۲۰) ایضاً (۲۱) ایضاً (۲۲) ایضاً (۲۳) ایضاً

(۲۴) ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اوّل، ص ۴۰۹، ۴۲۲، ۴۳۸؛ طبری، سوم، ص ۶۵-۱۶۱۔

(۲۵) ملاحظہ ہو: ابن سعد، سوم، ص ۹۳-۳۹۲؛ اسد، سوم، ص ۴۴-۱۴۲۔

(۲۶) ملاحظہ ہو ضمیمہ اول-۱۔

(۲۷) ایضاً (۲۸) ایضاً (۲۹) ایضاً (۳۰) ایضاً

(۳۱) ایضاً (۳۲) ایضاً (۳۳) ایضاً (۳۴) ایضاً (۳۵) ایضاً

(۳۶) حضرت خالد بن ولید مخزومی کے فوجی کارناموں کے لیے ملاحظہ کیجئے محمود شیت خطاب کی مذکورہ بالا دونوں کتابیں۔

(۳۷) ملاحظہ ہو ضمیمہ اول-۱۔

(۳۸) ایضاً (۳۹) ایضاً (۴۰) ایضاً (۴۱) ایضاً

(۴۲) ایضاً (۴۳) ایضاً (۴۴) ایضاً (۴۵) ایضاً

(۴۶) ایضاً (۴۷) ایضاً (۴۸) ایضاً

(۴۹) ملاحظہ ہو ابنِ اسحاق، ص ۵۰۰؛ نیز باب دوم بحث بر اسلامِ قریش و قبائلِ عرب بعد صلح حدیبیہ۔

(۵۰) ابن سعد، چہارم، ص ۲۵۲، ۶۱-۲۵۴

(۵۱) ان میں خالد بن ولید مخزومی، عمرو بن عاص، ابو سفیان بن حرب وغیرہ شامل تھے۔

(۵۲) سید ابو الاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت، دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۱۰۹ وغیرہ۔

(۵۳) انساب الاشراف، اول، ص ۳۱-۵۳۰۔

(۵۴) اس کے لیے ملاحظہ کیجئے: شمالی اور جنوبی قبائل میں اسلام کی اشاعت باب دوم میں۔

(۵۵) ملاحظہ ہو ضمیمہ اول-۱۔

(۵۶) مہماتِ نخلہ، قطن، سفیان ہذلی کے خلاف حضرت عبد اللہ بن انیس کے سریہ، دومۃ الجندل کے سریہ عبد الرحمٰن بن عوف، حضرت عمر کے سریہ تربہ، غزوہ موتہ، حضرت ابو قتادہ اور حضرت قطبہ کے سرایا، سریہ خالد بن ولید طرف دومۃ الجندل، حضرت علی کے سریہ یمن اور حضرت اسامہ کے سریہ کے دوران ہدایات و احکامِ نبوی کے لیے ملاحظہ ہو واقدی، ص ۱۳، ۳۴۱، ۳۲-۴۳۱، ۵۶۱، ۷۲۲، ۸۰-۷۵۷، ۷۸۷، ۹۸۱، ۱۰۲۶، ۱۰۷۹ اور ۱۸-۱۱۱۷۔

آپ اپنے تمام سالاروں کو ہمیشہ تاکید فرماتے تھے کہ وہ تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ سے ڈریں اور اس کا تقویٰ اختیار کریں، اپنے ساتھی و ماتحت مجاہدین کے ساتھ محبت و شفقت کا سلوک کریں، صرف ان لوگوں کے خلاف لڑیں جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے۔ جنگ کا آغاز ہمیشہ خدا کے نام سے کریں اور جنگ سے پہلے دشمن کو اسلام کی

دعوت دیں۔ اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو وہ بھی جنگ سے ہاتھ روک لیں اور ان نومسلموں کو مدینہ ہجرت کرنے کی تاکید کریں۔ اگر وہ اسے بھی قبول کرلیں تو ان کو مہاجرین کے حقوق سے مطلع کریں، اور اگر وہ اپنے گھروں کو چھوڑکر جانے سے انکار کریں تو ان کو امت اسلامی میں اعراب (بدوؤں) کے مقام و مرتبہ سے آگاہ کریں اور ان کو بتائیں کہ اس صورت میں وہ فے اور غنیمت میں کسی حصہ کے حقدار نہیں ہوں گے سوائے ان مہموں کے جن میں کہ وہ شرکت کریں۔ لیکن اگر وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کردیں تو ان کو جزیہ ادا کرنے کا حکم دیں۔ اور اگر وہ جزیہ بھی ادا کرنے سے انکار کریں تب ان سے جنگ کریں۔

سالاروں کو یہ بھی ہدایت دی جاتی تھی کہ محاصرہ کی صورت میں دشمنوں سے وہ حکم خداوندی پر ہتھیار ڈالنے کو نہ کہیں بلکہ اپنے حکم پر ان سے گفتگو کریں کیونکہ وہ حکم خداوندی کو خود بھی نہیں جانتے کہ وہ کیا ہوگا۔ غالباً یہ ہدایت نبوی اس مقصد سے دی گئی تھی کہ اگر کسی مخصوص معاملہ میں مسلمانوں کے فیصلے سے فیصلۂ خداوندی مختلف ہو تو معاہدہ کی شرائط میں اسی کے مطابق تبدیلی کی جاسکے۔ اسی طرح اگر کسی شہر یا قلعہ کے لوگ ذمہ (عہد) طلب کریں تو سالاروں کو حکم تھا کہ وہ اپنا ذمہ دیں نہ کہ اللہ یا اس کے رسول کا ذمہ دیں۔ جنگ میں پہل کرنے سے بھی سالاروں کو روکا گیا تھا۔ اور حکم دیا گیا تھا کہ دشمن کو صلح، گفتگو اور ترغیب و ترہیب ہر طریقے سے جنگ کرنے سے روکیں اور صلح کرنے پر آمادہ کریں۔

ان کے علاوہ کچھ ہدایات اخلاقی نوعیت کی تھیں جن میں احترام انسانیت کو ملحوظ رکھا گیا تھا مثلاً عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور کمزوروں کو قتل نہ کریں۔ بلاوجہ دشمن کو نقصان نہ پہنچائیں اور نہ ان کا مثلہ کریں یا ان کے ناک کان کاٹیں۔ کھجور کے درختوں کو خاص کر اور عام سایہ دار درختوں کو عام طور سے نہ کاٹیں۔ گھروں کو مسمار نہ کریں شکست خوردہ دشمنوں یا ان کے گھروں اور علاقوں کو آگ نہ لگائیں۔ سالاروں اور ان کے ماتحت مجاہدین کو حکم تھا کہ وہ اموال غنیمت میں کسی طرح کی خیانت نہ کریں۔

کچھ عمومی ہدایات فوجی نوعیت کی بھی دی جاتی تھیں۔ مثلاً راتوں کو سفر کریں اور دن کے وقت چھپ جائیں۔ راہبروں کی خدمات ضرور حاصل کریں۔ تیز رفتاری سے اور کوچ در کوچ روانہ ہوں، دشمن کے سر پر اچانک جا پہنچیں (تاکہ وہ مرعوب ہوکر ہتھیار ڈال دے اور اس طرح مسلمان خوں ریزی سے بچ جائیں)، گشتی دستوں (طلائع) اور جاسوسوں (عیون) کی خدمات حاصل کریں۔ دشمن کی حربی تیاریوں کے بارے میں ممکنہ حد تک مکمل معلومات حاصل کریں۔ اپنی مہموں کے متعلقہ علاقوں کی جغرافیائی معلومات سے پوری طرح لیس رہیں۔ دشمن سے محفوظ فاصلے پر خیمہ زن ہوں۔ دشمن کو چاروں طرف سے گھیر لیں اور اس کی ناکہ بندی کرلیں۔ صبح کے وقت حملہ کریں اور کامیاب مہم کے بعد میدان جنگ یا دشمنوں کے علاقے کو جلد سے جلد چھوڑ دیں۔

ان ہدایات نبوی کے لیے ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۷-۳۸۶، ۶۷۲ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم،

ص ۱۰، ۳۲، ۵۱، ۸۹، ۱۲۸، ۲-۱۳۱، ۱۶۹، اور ۱۹۰؛ طبری، دوم، ص ۴۱۰، ۴۶۲؛ سوم، ص ۲۲، ۳۷-۳۶، ۲-۱۳۱ اور ۵-۱۸۴۔

(۵۷) ملاحظہ ہو باب اول، بحث بر سریہ نخلہ؛ نیز دیکھیے خادم کا مضمون "عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں — محرکات، مسائل اور مقاصد، بحث بر سریہ نخلہ۔

(۵۸) واقدی، ص ۶۴، ۶۷؛ نیز ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۵۲۵؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲۹؛ طبری، سوم، ص ۴۰۔

(۵۹) واقدی، ص ۸۱-۸۰؛ ابن سعد، دوم، ص ۹-۱۴۸؛ طبری، سوم، ص ۶۷۔

(۶۰) ابن خلدون، المقدمۃ، مطبعہ مصطفیٰ محمد، قاہرہ غیر مورخہ، فصل ۳۷، ص ۷۳-۲۷۲؛ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص ۸۸ اور ۲۳۰ وغیرہ برائے اصطلاح تعبیہ؛ محمود شیت خطاب، محمد القائد، ص ۹-۷۸، برائے بحث بر طریق جنگ الکر والفر اور تعبیہ۔

(۶۱) ملاحظہ ہو ریوبن لیوی، دی سوشل اسٹرکچر آف اسلام (THE SOCIAL STRUCTURE OF ISLAM) کیمبرج ۱۹۶۲ء، ص ۴۲۸، جن کا خیال ہے کہ "خمیس نظام عہد نبوی میں ابتدا ہی سے یعنی جنگ بدر سے موجود تھا اور اس کی مثالیں بدر اور موتہ میں ملتی ہیں۔ اس نظام جنگ کی بدولت ہی کہا جاتا ہے کہ آپ کو اپنی مہموں میں کامیابی ملی تھی کیونکہ ابھی تک آپ کے دشمن حملہ کا غیر منظم طریقہ اپنائے ہوئے تھے"۔ جہاں تک شواہد کا تعلق ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خمیس نظام غیر مسلم عربوں میں بھی موجود تھا۔ اور عہد نبوی سے قبل عہد جاہلیت کی جنگوں میں ہم کو اس کے متعدد حوالے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر طبری کا بیان ہے کہ ایرانیوں کے خلاف عربوں نے جو جنگ ذی قار کے مقام پر لڑی تھی اس میں خمیس نظام عرب فوج میں موجود تھا۔ ملاحظہ ہو طبری، دوم، ص ۱۰-۲۰۹۔

(۶۲) ابن خلدون، ص ۲۷۲؛ نیز ملاحظہ ہو لیوی، مذکورہ بالا، ص ۲۷۴، جنھوں نے ابن خلدون کے متعلقہ اقتباس کا ترجمہ یوں کیا ہے: "قلب امیر سریہ/غزوہ کا مقام ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اس کے خدام اور سپاہی ہوتے ہیں اور دونوں پہلوں میں دو بازو ہوتے ہیں جن کے اپنے سالار ہوتے ہیں وہ امیر کے ماتحت ہوتے ہیں۔ ان سے الگ اور قلب سے کچھ دوری پر مقدمہ ہوتا ہے جو اپنے سالار کی ماتحتی میں ہوتا ہے۔ اس کے پاس اپنا پرچم بھی ہوتا ہے۔ ساقہ عقب پر نظر رکھتا ہے اور اسباب اور سامان رسد، ہتھیاروں اور بھاری محاصرہ کے مشینوں کا ذمہ دار ہوتا ہے"۔ لیوی کا یہ بھی خیال ہے کہ "یہ فوجی نظام یا طریقہ ہر حال میں اختیار کیا جاتا ہے چاہے اسلامی فوج پیش قدمی کر رہی ہو یا پریڈ کر رہی ہو یا جنگ میں ہو اور اسی کو تعبیہ کہتے ہیں"۔

(۶۳) ابن خلدون، ص ۲۷۱؛ نیز ملاحظہ کیجئے قرآن کریم، سورہ انفال، آیت ۱۵ جس میں لفظ زحف استعمال ہوا ہے۔ آیت کریمہ کا لفظی ترجمہ ہے: "اے مومنو! جب تمہارا مقابلہ دشمن سے ہو تو تم ہرگز پیٹھ نہ دکھانا"۔

(۶۴) قرآن حکیم، سورہ التوبہ، آیات ۱۲-۱۱۱۔

(۶۵) ملاحظہ کیجئے محمد حمید اللہ، عہد نبوی کے میدانِ جنگ (انگریزی)، ص ۵۸۔

(۶۶) واقدی، ص ۵۸، ۷۱-۷۰ وغیرہ۔

(۶۷) ملاحظہ کیجئے ابن اسحاق، ص ۳۰۰-۲۹۹؛ واقدی، ص ۶-۵۵ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۵؛ طبری، دوم، ص ۱۴۴۴، ۹-۴۴۶۔

(۶۸) واقدی، ص ۵۸۔ لشکر نبوی میں مختلف بازوؤں کی موجودگی ہی میں ان کے سالاروں کی تقرری بھی مضمر ہے۔

(۶۹) ایضاً۔ اس روایت کے مطابق مکی فوج میں شہسوار دستوں کا افسر حارث بن ہشام مخزومی تھا جبکہ میمنہ اور میسرہ بالترتیب ہبیرہ بن وہب مخزومی اور زمعہ بن اسود اسدی کی کمان میں تھے۔ اس روایت کی صحت کی تصدیق اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ یہ روایت مغیرہ بن عبدالرحمٰن مخزومی کی سند پر بیان ہوئی ہے جس کے پردادا حارث بن ہشام تھے۔ یہ واضح رہے کہ حارث بن ہشام ابوجہل مخزومی کا حقیقی بھائی تھا اور خود اس جنگ میں موجود و شریک تھا۔ بعدہٗ وہ ایک اچھے مسلمان بن گئے تھے۔ اس کے علاوہ باقی دونوں مکی سالار قریش کے دو سربرآوردہ خاندانوں کے افراد ہونے کے علاوہ بجائے خود سردارانِ قریش اور "عظیم دھرتی کے لال تھے" (اَفلاذُ کَبِدِھَا) ان کے لیے ملاحظہ ہو واقدی، ص ۳۲، ۳۴، ۴۲، ۴۶، ۹-۵۸، ۱۴۴ اور ۹۴، ۲۰۱، ۲۰۳ وغیرہ بالترتیب؛ طبری، دوم، ص ۴۳۷ وغیرہ۔ اس کے علاوہ ایک تیسری روایت بھی ہے جس کے مطابق ان دونوں بازوؤں کے سالاروں کے نام تھے حارث بن عامر اور عمرو بن عبد بالترتیب۔ یہ دونوں بھی مکی خاندانوں کے ممتاز افراد تھے۔ لیکن اس روایت کو خود ماخذ نے ضعیف و مردود قرار دیا ہے۔ سالاروں کے ناموں پر اختلاف کے باوجود یہ یقینی امر ہے کہ مکی فوج میں خمیس نظام موجود تھا اور ان دونوں بازوؤں کے دوسرے بازوؤں کے علاوہ سالار بھی تھے۔

(۷۰) واقدی، ص ۷۱

(۷۱) واقدی، ص ۲۲۰، ۲۲۵، ۳۰-۲۲۹؛ ابن سعد، دوم، ص ۴۰-۳۹۔

(۷۲) اسد الغابہ، چہارم، ص ۴۱۹۔

(۷۳) طبری، دوم، ص ۵۰۸؛ نیز ملاحظہ کیجئے: اسد، دوم، ص ۵۰-۴۶

(۷۴) واقدی، ص ۲۱، ۲۱۶ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم، ص ۳۹-۳۸ وغیرہ؛ طبری، دوم، ص ۵۰۰ وغیرہ۔

(۷۵) واقدی، ص ۴۹۹؛ طبری، دوم، ص ۵۸۲۔

(۷۶) واقدی، ص ۶۴۲؛ نیز ملاحظہ کیجئے ابن سعد، دوم، ص ۱۰۶

(۷۷) واقدی، ص ۷۳۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲۱۔

(۷۸) اسد، چہارم، ص ۳۰۶۔

(۷۹) واقدی، ص ۶۴۰، نے اس موقعہ پر چار بازوؤں مقدمہ، ساقہ اور میمنہ اور میسرہ کا ذکر کیا ہے۔

(۸۰) واقدی، ص ۸۰۱، ۸۱۵، ۲۵-۸۱۹۔

(۸۱) واقدی، ص ۸۰، ۸۹۷، ۹۱۲ اور ۹۲۳۔

(۸۲) ملاحظہ کیجئے واقدی، ص ۹۹۶، جن کے یہاں اسلامی فوج کے کوچ کرنے کا بیان بڑا دلچسپ اور اہم ہے۔ تیس ہزار سپاہ پر مشتمل عظیم اسلامی فوج اپنے اقدام کے سفر پر شام کے وقت روانہ ہوتی تھی اور رات بھر اس کے مختلف دستے کوچ کرتے رہتے یہاں تک کہ اس کا آخری دستہ صبح سویرے روانہ ہوتا تھا اور جب اصل فوج کا آخری سپاہی تک روانہ ہو چکتا تھا تو ساقہ اپنا کوچ شروع کرتا تھا جو اسلامی خیمہ گاہ میں دوسرے دن ہی پہنچ پاتا تھا۔

(۸۳) ملاحظہ کیجئے ضمیمہ اول - ۲۔

(۸۴) ایضاً (۸۵) ایضاً (۸۶) ایضاً (۸۷) ایضاً (۸۸) ایضاً

(۸۹) ایضاً (۹۰) ایضاً (۹۱) ایضاً (۹۲) ایضاً

(۹۳) ۵ھ/۶۲۷ء میں بنو قریظہ کی طاقت کی شکست ہونے تک اسلامی امت کو یہودیوں کی جانب سے ایک خطرۂ مسلسل لاحق تھا غزوۂ احزاب کے دوران اس خطرہ کی شدت میں بے انتہا اضافہ ہو گیا تھا، کیونکہ یہودیوں نے ایک انتہائی نازک موقعہ پر اسلامی ریاست کے استیصال کی سازش کی تھی۔

(۹۴) اسد، دوم، ص ۲۹۶-۲۹۷؛ نیز ملاحظہ کیجئے ضمیمہ اول - ۲۔

(۹۵) واقدی، ص ۴۶۰، ۵۴۷؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۷، ۸۰ وغیرہ؛ نیز ملاحظہ کیجئے ضمیمہ اول - ۲۔

(۹۶) واقدی، ص ۵۴۵؛ ابن سعد، دوم، ص ۸۰؛ نیز ملاحظہ کیجئے ضمیمہ اول - ۲۔

(۹۷) ملاحظہ ہو ریوبن لیوی، مذکورہ بالا، ص ۴۳۶ - انھوں نے شہنشاہ لیو چہارم کا وہ بیان نقل کیا ہے جو TACTICA (میگنے، پٹرولوجیا گریشیا لے ٹینا (MIGNE, PATROLOGIA GRACEA - LATINA) جلد ۱۰۷ میں بیان ہوا ہے۔ اس کے مطابق "عرب ہمیشہ شب خون کے خدشہ کی پیش بندی کرتے تھے خاص کر غیر ملکی یا اجنبی علاقوں میں۔ وہ اس کے بھرپور انتظامات کرتے تھے۔ شب بیدار محافظ رات بھر پہرہ دیتے تھے یا خیمہ گاہ کی اس طور پشتوں اور خندقوں سے حفاظت کی جاتی تھی کہ اس پر اچانک چھاپہ مار کر قبضہ نہ کیا جا سکے۔"

(۹۸) ملاحظہ ہو ضمیمہ اول - ۲۔

(۹۹) ایضاً (۱۰۰) ایضاً (۱۰۱) ایضاً (۱۰۲) ایضاً (۱۰۳) ایضاً

(۱۰۴) ایضاً؛ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص ۴۶۳-۴۶۴۔

(۱۰۵) واقدی، ص ۳۷۱، کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کے یہودیوں کا محاصرہ کر لیا تو پہلی شب محاصرہ

میں آپ اپنے دولتکدہ پر واپس آگئے اور حضرت علی کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے حضرت علی کی بجائے حضرت ابو بکر صدیق کو اپنا جانشین بنایا تھا۔

(۱۰۶) واقدی، ص ۶۴۵۔

(۱۰۷) واقدی، ص ۲۱ کا بیان ہے کہ لشکر اسلامی کا پہلا معائنہ اَلبُقُعَۃ نامی مقام پر ہوا تھا جو مدینہ کے بالکل نواح میں تھا۔ یہ عرض ۱۲ رمضان ۲ھ / ۱۰ مارچ ۶۲۴ء کو ہوا تھا۔ اس عرض کے بعد ان نوجوانوں کو مسترد کر دیا گیا تھا جو فوجی عمر کو نہیں پہنچے تھے۔ ان میں شامل تھے حضرات عبد اللہ بن عمر، رافع بن خدیج، اسامہ بن زید، البراء بن عازب، اسید بن زہیر، زید بن ارقم اور زید بن ثابت۔ جبکہ حضرت سعد بن ابی وقاص زہری کے خورد سال بھائی حضرت عُمَیر زہری کو ان کی تیر اندازی میں مہارت اور فوجی عمر کو پہنچ جانے کی بنا پر اجازت دے دی گئی تھی۔

(۱۰۸) واقدی، ص ۲۶۔

(۱۰۹) ابن سعد، دوم، ص ۱۲؛ نیز ملاحظہ کیجئے طبری، دوم، ص ۵۰۵۔

(۱۱۰) واقدی، ص ۲۱۶۔ اس موقعہ پر جن نوجوانوں کو مسترد کیا گیا تھا ان کے نام تھے، حضرات عبد اللہ بن عمر، زید بن ثابت، اسامہ بن زید، نعمان بن بشیر، زید بن ارقم، البراء بن عازب، اسید بن زہیر، عرابہ بن اوس اور ابو سعید خدری۔ یہ سب مشہور صحابۂ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے جنھوں نے بعد کے زمانے میں اسلام کے لیے عظیم کارنامے انجام دئے۔ نیز ملاحظہ کیجئے ابن سعد، دوم، ص ۳۹؛ طبری، دوم، ص ۵۰۵-۵۰۶۔

(۱۱۱) واقدی، ص ۴۵۳۔

(۱۱۲) واقدی، ص ۶۸۹؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۰۷۔

(۱۱۳) نیز ملاحظہ کیجئے اسد، دوم، ص ۲۲-۲۲۱، جس کا بیان ہے کہ حضرت زید بن ثابت فرائض (ترکہ کے حصوں یا مال غنیمت کے حصوں سے متعلق فن) کے ایک بڑے ماہر تھے۔ درحقیقت وہ ریاضی اور علم ہندسہ سے متعلق تمام مروجہ علوم کے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔

(۱۱۴) واقدی، ص ۲۶

(۱۱۵) ابن سعد، سوم، ص ۵۱۰

(۱۱۶) ابن اسحاق، ص ۲۹۲

(۱۱۷) طبری، دوم، ص ۴۳۴

(۱۱۸) طبری، دوم، ص ۵۰۸

(۱۱۹) ایضاً

(۱۲۰) ابن سعد، دوم، ص ۱۲۳

(۱۲۱) اسد، سوم، ص ۵-۲۰۳

(۱۲۲) واقدی، ص ۲۶، ۹۲؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲؛ طبری، دوم، ص ۴۳۴ وغیرہ۔

(۱۲۳) ایضاً

(۱۲۴) واقدی، ص ۱۰۳؛ انساب الاشراف، اول، ص ۲۹۰ کے مطابق مسلمانوں کو تیس گھوڑے ملے تھے۔

(۱۲۵) واقدی، ص ۱۹۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۳۴۔

(۱۲۶) واقدی، ص ۲۱۵ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم، ص ۲۷۔

(۱۲۷) واقدی، ص ۲۱۹؛ ابن سعد، دوم، ص ۴۰؛ طبری، دوم، ص ۵۰۷؛ نیز ملاحظہ ہو ابن خلدون، تاریخ، اول، ص ۷۹۲؛ اسد، سوم، ص ۱۳۰-۱۳۱؛ بخاری، فضل الجہاد۔

(۱۲۸) ابن سعد، دوم، ص ۶۳۔ (۱۲۹) واقدی، ص ۴۵۰؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۷۔

(۱۳۰) ابن سعد، دوم، ص ۷۹۔ (۱۳۱) ابن سعد، دوم، ص ۸۱۔

(۱۳۲) واقدی، ص ۵۷۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۹۵۔

(۱۳۳) ابن سعد، دوم، ص ۱۰۷، کا بیان ہے کہ اس غزوہ میں مسلم فوج میں دو سو شہسوار تھے۔

(۱۳۴) ابن سعد، دوم، ص ۱۲۰، کے مطابق اس موقعہ پر شہسواروں کی تعداد صرف سو تھی۔

(۱۳۵) واقدی، ص ۸۸۹؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۳۵۔ عام خیال یہ ہے کہ فتح مکہ میں مسلم فوج میں شہسوار دستے صرف بنو سلیم کے تھے جن کی تعداد نو سو تھی۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ دوسرے مسلم طبقات نے بھی شہسوار دستے فراہم کیے تھے۔ ذیل میں ایک مختصر سی فہرست دی جا رہی ہے جو تمام مسلم طبقات کے شہسواروں کی تعداد کو ظاہر کرتی ہے۔

(۱)	انصار (اوس و خزرج) کے متعدد بطون	۵۰۰ شہسوار
(۲)	مہاجرین (قریش)	۳۰۰ 〃
(۳)	مُزینہ	۱۰۰ 〃
(۴)	جُہینہ	۵۰ 〃
(۵)	اسلم	۳۰۰ 〃
(۶)	بنو سلیم	۹۰۰ 〃
	میزان	۲۱۵۰ 〃

ماخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ فہرست شہسواران اسلامی مکمل نہیں ہے۔ اس میں بعض مسلم طبقات جیسے خزاعہ اور اسد وغیرہ کے شہسواروں کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ اس موقعہ پر شہسواروں کی تعداد ڈھائی ہزار سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ بلکہ امکان یہ ہے کہ وہ اس سے متجاوز رہی ہو۔ شہسواروں کی اس تفصیل کا ذکر عموماً علمبرداروں کے ذیل کے ماخذ میں ملتا ہے اس لیے وہ مورخین اور سیرت نگاروں کی نگاہ سے اوجھل رہ جاتا ہے۔

(۱۳۶) واقدی، ص ۱۰۰۲؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۶۔

(۱۳۷) قرآن کریم، سورہ انفال، آیت ۶۰ واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم وآخرين من دونهم لا تعلمونهم، الله يعلمهم ..... (اور ان کافروں کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو اور اس کے ذریعہ سے تم (اپنا) رعب جمائے رکھو ان پر

جو کہ (کفر کی وجہ سے) اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی جن کو تم (بالیقین) نہیں جانتے ان کو اللہ ہی جانتا ہے) — ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی۔

(۱۳۸) شہسواروں کے حصۂ مالِ غنیمت پر مختلف روایتوں کے لیے ملاحظہ کیجئے: ابن اسحاق، ص ۵۲۲، ۹۰ - ۶۸۹ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۴، ۱۱۴؛ طبری، سوم، ص ۱۹؛ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص ۳-۱۰۱، جنھوں نے مشہور صحابی رسول حضرت مقداد بن عمرو کی سند پر ایک روایت یہ بیان کی ہے کہ صحابی موصوف غزوہ خیبر میں بحیثیت ایک شہ سوار کے شریک ہوئے اور ان کو دو حصے ملے: ایک ان کا اپنا اور دوسرا ان کے گھوڑے کا۔ لیکن بعض روایات جن کا تعلق مریسیع اور بنو قریظہ کے غزوات سے ہے یہ بتاتی ہیں کہ شہسواروں کو ان مواقع پہ پیادہ سپاہی کے مقابلے میں تین گنا حصہ ملا تھا: ایک ان کی ذات کا اور دو حصے ان کے گھوڑے کے لیے۔ اگرچہ واقدی کا یہ بیان کہ شہسوار کو دو ہی حصے پورے عہدِ نبوی میں ملتے رہے تقریباً تمام مورخین کے نزدیک مسلّم اور واقعی ہے تاہم اس امکان سے قطعی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابتداءً میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدین کو گھوڑے حاصل کرنے کی ترغیب دینے کے لیے تین حصے بھی مرحمت فرمائے ہوں۔

(۱۳۹) واقدی، ۲-۱-۵۹۱۔ وہ تمام افسران حکومت نبوی جن کو قیدیوں اور اسیرانِ جنگ کو بازاروں میں بطور غلام فروخت کرنے کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اپنی واپسی پہ ہتھیار اور گھوڑے خرید کر لاتے تھے۔ اسی طرح بعض خمس کے افسروں کو بھی اسی مقصد سے عرب اور شام وغیرہ کے بازاروں میں بھیجا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ اول۔ ۷۔

(۱۴۰) مثال کے طور پر حضرت ضحاک بن سفیان کلابی / بنو سلیم فتح مکہ کے غزوہ میں متعدد قبائلی سالاروں میں سے ایک سالار تھے ملاحظہ ہو اسد، سوم، ص ۳۶؛ نیز ملاحظہ ہو ضمیمہ اوّل - ۳ - اس نکتہ پر مفصل بحث ہم عہد نبوی کی فوجی تنظیم میں قبائلی علمبرداروں کے مقام و مرتبہ اور کردار کے مطالعہ میں کریں گے۔

(۱۴۱) اسد الغابہ، سوم، ص ۱۵۵۔

(۱۴۲) واقدی، ص ۶-۹۹۵۔

(۱۴۳) مآخذ اس ضمن میں دو الفاظ یا دو مترادفات لواء اور رایۃ استعمال کرتے ہیں۔ ان دونوں ہی کے معنی جھنڈے اور پرچم کے ہیں اور ان دونوں کو ایک دوسرے کی جگہ بخوبی استعمال کیا جا سکتا ہے کیونکہ لغوی اعتبار سے ان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اور عموماً مآخذ اسی طرح ان کو درحقیقت استعمال بھی کرتے ہیں۔ لیکن بعض مورخین نے لواء اور رایۃ میں عام و خاص کا فرق بھی پیدا کیا ہے۔ چنانچہ اس نظریہ / خیال کے مطابق عام مفہوم میں لواء (جمع الویۃ) دئے جاتے تھے لیکن رایۃ (جمع رایات) کا استعمال پہلی بار واقدی کے مطابق غزوہ خیبر میں ہوا تھا۔ ہمارے جدید مورخین نے عام طور سے اس بیان کو بلا تنقید و جرح قبول کر لیا ہے۔ واقدی کے اس بیان کے مطابق اس مہم میں تین رایات بنائے گئے تھے جو حضرات علی بن ابی طالب، حباب بن منذر اور سعد بن عبادہ کو دئے گئے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کا پرچم مبارک (رایۃ) سیاہ تھا جو حضرت عائشہ کی چادر (بُرد) سے بنایا گیا تھا۔ اس کو عقاب (شاہین) کہا جاتا تھا جبکہ آپ کا لواء سفید تھا۔ ملاحظہ کیجئے واقدی، ص ۶۴۹۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ لواء اور رایہ کا یہ فرق بتانے اور یہ بیان دینے کے باوجود کہ رایہ کا پہلا استعمال غزوہ خیبر میں ہوا تھا۔ یہی مورخ دوسرے دو مقامات (ص ۵۶ اور ۲۲۶) پر بیان کرتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر میں اپنا رایہ حضرت مصعب بن عمیر عبدری کو عطا فرمایا تھا۔ جبکہ ابن قتیبہ دینوری، کتاب المعارف، ص ۱۵۳، کا بیان یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سیاہ رایہ حضرت علی کو اور سفید لواء حضرت مصعب بن عمیر عبدری کو عطا کیا تھا۔ سرفراز ہونے والے صحابی کے نام میں اختلاف کے باوجود موخر الذکر کے بیان سے یہ البتہ ثابت ہوتا ہے کہ لواء اور رایۃ کا فرق پہلی اہم مہم سے اسلامی عسکری تنظیم میں موجود رہا تھا۔ خود واقدی کا دو مقامات پر بیان بھی مضمراً اسی کی تائید کرتا ہے۔ بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لواء عام پرچم ہوتا تھا جو سالارانِ سرایا یا قبائلی سرداروں کو دیا جاتا تھا جبکہ رایہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص پرچم ہوتا تھا جو اسلامی ریاست یا مرکزی حکومت کی نمائندگی کرتا تھا۔ اور یہ تفریق ابتداء ہی سے موجود تھی اور پہلی بار اس کا اظہار غزوۂ بدر میں ہوا تھا نہ کہ غزوۂ خیبر میں، جیسا کہ عام طور سے جدید و قدیم مورخین کا خیال معلوم ہوتا ہے۔

(۱۴۴) ازرقی، ص ۱۷۰-۷۰۔

(۱۴۵) ریوبن لیوی، مذکورہ بالا، ص ۵-۴۴۴؛ نیز ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۳۷۹؛ واقدی، ص ۵۶۔

(۱۴۶) زبیری، ص ۵۴-۲۵۱؛ بلاذری، انساب الاشراف، اوّل، ص ۵۵-۵۳؛ ازرقی، ص ۱۷-۷۰؛ جمہرہ، ص ۱۱۸؛ نیز ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص ۳۷۴، جن کا بیان بڑا دلچسپ ہے۔ روایت ہے کہ غزوۂ اُحد کے موقعہ پر مکی سالار فوج ابو سفیان بن حرب اموی نے عبد الدار کے علمبرداروں سے طنزاً کہا تھا کہ "اے بنو عبد الدار! بدر کے موقعہ پر تم ہی ہمارے علمبردار تھے۔ تم جانتے ہی ہو کہ اس روز کیا ہوا تھا۔ سپاہی بڑی حد تک اپنے پرچموں سے اپنی قسمت وابستہ کر لیتے ہیں۔ تو یا تم ہمارے پرچم کی پوری جاں نثاری اور ثابت قدمی سے حفاظت کرو یا اس اعزاز سے دستبردار ہو جاؤ تاکہ ہم اس کو کسی اور کے سپرد کر دیں اور تم کو اس زحمت سے بچا لیں۔" انھوں نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد جواب دیا "کیا ہم اپنا پرچم اٹھانے کا اعزاز تمہارے حوالے کر دیں؟ کل جب جنگ کا بازار گرم ہوگا تو تم خود دیکھ لوگے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔" بنو عبد الدار اپنے قول کے پکے نکلے اور انھوں نے اپنے قومی پرچم کی حفاظت میں جانیں نچھاور کر دیں اور اس سلسلہ میں بڑی عدیم المثال مردانگی اور شجاعت بلکہ تہور کا ثبوت دیا۔ زبیری کے بقول اس دن بنو عبد الدار کے نو سرفروشوں نے اپنے قومی پرچم کی حفاظت میں اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔ نیز ملاحظہ کیجئے: واقدی، ص ۲۱-۲۲۰، ۲۸-۲۲۵، ۸-۳۰۷۔

(۱۴۷) ابن سعد، دوم، ص ۶؛ طبری، دوم، ص ۴۰۲؛ اسد، پنجم، ص ۲۹۶؛ نیز ملاحظہ ہو لیوی، مذکورہ بالا۔

ص ۵۳۴ ۔ موخرالذکر کا یہ بیان صحیح ہے کہ نشان / علم کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام علمبرداروں کے ناموں کو نمایاں طور سے بیان کیا جاتا ہے اور اسی طرح انصار کے بعض لوگوں کا غزوۂ بدر میں امتیاز کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح بعد کے غزوات و سرایا میں بھی علمبرداروں کے ناموں کو خوب نمایاں جگہ دی ہے۔ کسی مہم کو بھیجنے کے لیے ایک فقرہ عقد لواء استعمال کیا جاتا ہے اور علم کا عطا کیا جانا دراصل کمان سے سرفراز کیا جانا تھا۔"

(۱۴۸) واقدی، ص ۹۹۶، کا بیان ہے کہ غزوۂ تبوک میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا مخصوص رایہ حضرت ابوبکر صدیق کو عطا فرمایا تھا۔

(۱۴۹) ملاحظہ کیجیے: عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ (انگریزی)، حیدر آباد دکن ۱۹۴۲ء، ص ۷۰-۵۳ (بابِ ہشتم)۔

(۱۵۰) واقدی، ص ۱۵ ؛ نیز ملاحظہ ہو طبری، دوم، ص ۴۲۲، ۴۲۶، جن کا خیال ہے کہ یہ طلیعہ کافی بڑا تھا کیونکہ اس میں متعدد دوسرے صحابی بھی شامل تھے۔

(۱۵۱) واقدی، ص ۵۱ ؛ طبری، دوم، ص ۴۲۲، ۴۳۶۔

(۱۵۲) طبری، دوم، ص ۴۲۲۔

(۱۵۳) واقدی، ص ۵۲، نے ان کی تعداد تین بتائی ہے اور ان کے نام یسار، اسلم اور ابورافع بتائے ہیں جو بالترتیب عبید بن سعید بن عاص اموی، منبہ بن حجاج سہمی اور امیہ بن خلف جمحی کے غلام (عَبِید) تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکی فوج پانی وغیرہ کی فراہمی جیسی ضروریات کے لیے اپنے غلاموں پر منحصر تھی۔ یہ غلام عموماً جنگجو سپاہی کی حیثیت سے نہیں بھرتی کیے جاتے تھے۔ بعض سپاہی بھی ہوتے تھے مگر اکثر کی حیثیت خدام اور گھریلو کاموں کے ملازموں کی سی ہوتی تھی۔ غالباً اسی غلط فہمی کے سبب بعض غیر ملکی مورخین نے احابیش کو سیاہ غلاموں کی قریشی فوج سمجھ لیا ہے جو قطعی غلط ہے۔ بحث کے لیے ملاحظہ ہو مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۱۵۴-۷۔

(۱۵۴) واقدی، ص ۵۳-۴ ؛ نیز ملاحظہ ہو باب چہارم، بحث بر مشیرانِ نبوی۔

(۱۵۵) اسد الغابہ، چہارم، ص ۲۷۸۔

(۱۵۶) واقدی، ص ۳۳-۷، کا بیان ہے کہ یہ طلیعہ سفیان بن خالد سہمی کے دو فرزندوں حضرات سلیط اور نعمان پر مشتمل تھا اور ایک بنو عُوَیر کے گمنام صحابی بھی شامل تھے۔ موخرالذکر صحابی اپنی سست روی کے سبب پیچھے رہ گئے جبکہ ان کے دونوں ساتھی تیز رفتاری سے مکی فوج کے قریب جا پہنچے۔ مکیوں نے ان دونوں کا پتا لگا لیا اور ان کو فوراً مار ڈالا۔ جب مسلم فوج وہاں پہنچی تو انھوں نے وہاں ان کی لاشیں پائیں اور ان کو دفن کر دیا۔

(۱۵۷) واقدی، ص ۵۳۶ ؛ ابن سعد، دوم، ص ۹۷۔

(۱۵۸) واقدی، ص ۵۷۴ ؛ ابن سعد، دوم، ص ۹۵۔

(۱۵۹) واقدی، ص ۱۴۱ - ۶۴۰۔ (۱۶۰) ایضاً، ص ۶۴۴۔

(۱۶۱) واقدی، ص ۸۰ - ۹۰؛ نیز ملاحظہ ہو: یعقوبی، تاریخ، دوم، ص ۵۸، جس کے مطابق اس عورت کا نام سارہ تھا اور وہ ابو لہب بن عبد المطلب ہاشمی کی کنیز تھی۔

(۱۶۲) واقدی، ص ۱۴۱۰۱۔ (۱۶۳) کتاب المحبر، ص ۲۸۰۔

(۱۶۴) واقدی، ص ۱۴۱؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۳؛ طبری، دوم، ص ۴۵۸۔ اس خوشخبری پر مدینہ والوں کا ردِ عمل بڑا دلچسپ تھا۔ خبر اتنی خوش آیند اور اتنی اچانک تھی کہ پہلے ان کو یقین نہیں آیا اور انھوں نے دونوں منادیوں کو جھوٹا سمجھا اور میدانِ جنگ سے معزور قرار دیا۔ لیکن ان کے بار بار اور بہ اصرار یقین دلانے پر خبر کا جب یقین آیا تو وہ حیرت زدہ رہ گئے کہ اتنی سی چھوٹی اسلامی فوج نے جو پوری طرح مسلح بھی نہ تھی کیونکر اتنی بڑی قریشی اور مسلح و منظم فوج کو ہرا دیا؛ اور آخر آخر میں ان کو جب حیرت سے چھٹکارا ملا تو ان کی خوشی اور مسرت کی انتہا نہ رہی۔ نیز ملاحظہ کیجئے: کتاب المحبر، ص ۲۸۰ جو مختلف منادیوں کے نام گناتی ہے اور ان کے بارے میں تفصیلات سے گریز کرتی ہے۔

(۱۶۵) ابن سعد، دوم، ص ۶۱؛ کتاب المحبر، ص ۲۸۰۔

(۱۶۶) کتاب المحبر، ص ۲۸۰۔

(۱۶۷) اسد الغابہ، پنجم، ص ۴۴؛ نیز ملاحظہ ہو کتاب المحبر، ص ۲۸۰۔

(۱۶۸) قرآن کریم، سورہ حشر، آیت ۵۔ (۱۶۹) واقدی، ص ۳۷۲۔

(۱۷۰) ان افسروں اور فوجی کارکنوں کے لیے ملاحظہ کیجئے ضمیمہ اول - ۳، جس میں ان میں سے ایک کے بارے میں حوالے مذکور ہیں۔

(۱۷۱) جاسوسوں اور ان کی کارگزاری کی اہمیت کے لیے ملاحظہ ہو محمد حمید اللہ، عہد نبوی کے میدانِ جنگ، ص ۵۰ - ۵۳۔

(۱۷۲) واقدی، ص ۲۲؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، دوم، ص ۱۲۔

(۱۷۳) واقدی، ص ۵۴۰ کا بیان اس سلسلے میں کافی دلچسپ اور اہم ہے جو اس زمانے کے لوگوں کی بصیرت اور مہارت پر روشنی ڈالتا ہے۔ روایت ہے کہ مکہ کا مشہور سردار منبہ بن حجاج سہمی لوگوں کے نشان قدم پہچان لینے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ ان دونوں مسلم جاسوسوں کے نرم مٹی پر نشانِ قدم کو دیکھ کر اس نے مدینہ کے جاسوسوں کی موجودگی اپنی فوج کے افسروں کو بتا دی تھی۔ اسی ذیل میں وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جو ابو سفیان بن حرب اموی کے ساتھ پیش آیا تھا۔ بدر کے کنوؤں کے قریب ابو سفیان نے شام سے لوٹتے وقت مسلم جاسوسوں کے اونٹوں کی لید میں سے مدینہ کی کھجوروں کی گٹھلیوں کو دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ مدینہ کے لوگ گرد و نواح میں موجود ہیں اور اسی بصیرت کے سبب انھوں نے اپنے زیر کمان مالا مال قریشی کارواں کا راستہ بدل دیا تھا۔

(۱۷۴) واقدی، ص ۲۰۷ - ۲۰۶؛ ابن سعد، دوم، ص ۳۷۔

(۱۷۵) واقدی، ص ۸ - ۲۰۷

(۱۷۶) واقدی، ص ۸ - ۲۰۷ کا بیان ہے کہ حضرت حباب بن منذر نے اپنی واپسی پر مکی فوج کی عددی طاقت ایک ہزار کے لگ بھگ بتائی تھی جس میں سے شہسوار دو سو تھے اور سات سو سپاہی، زرہ بکتر پوش تھے۔ ان کی یہ خبر بالکل صحیح ثابت ہوئی تھی۔

(۱۷۷) طبری، دوم، ص ۸ - ۵۲۷، کے اس بیان سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فوجی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ نے حضرت علی سے فرمایا تھا کہ "اگر تم دیکھو کہ مکہ والے گھوڑوں کو چھوڑ کر اونٹوں پر سوار ہوگئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کا رُخ مکہ کی طرف ہے دوسری صورت میں وہ مدینہ کی طرف روانہ ہوں گے۔" حضرت علی کو بھی یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے مشاہدہ کا اعلان سب کے سامنے نہ کریں لیکن وہ قریشی فوج کے مکہ واپس ہونے کی خبر سے اتنے خوش ہوئے کہ واپسی میں سب کے سامنے قریشیوں کے مکہ واپس ہونے کا اعلان کر گئے۔

(۱۷۸) واقدی، ص ۴۰۴ ؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۳ - (۱۷۹) ایضاً (۱۸۰) واقدی، ص ۶۱ - ۲۶۰

(۱۸۱) واقدی، ص ۴۰۵، کے مطابق اُنھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی تھی کہ بنو قریظہ کے یہودیوں نے اپنے قلعوں (آطام) کی مرمت کرلی ہے، اپنے سپاہیوں کو جمع اور منظم کرلیا ہے اور اپنے مویشیوں کو گڑھیوں میں اکٹھا کرلیا ہے۔ یہ دراصل ان کی فوجی تیاریوں کی جانب اشارہ تھا: نیز ملاحظہ کیجئے: بخاری، فضل الجہاد۔

(۱۸۲) ایضاً (۱۸۳) واقدی، ص ۹۰ - ۴۸۹ ؛ نیز ملاحظہ کیجئے مسلم، باب الجہاد۔

(۱۸۴) واقدی، ص ۳ - ۵۰۲ ؛ ابن سعد، دوم، ص ۹۵۔

(۱۸۵) واقدی، ص ۵۹۳ ؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۵۰ ؛ طبری، سوم، ص ۳، ۷ ؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۱۲۔

(۱۸۶) واقدی، ص ۴۴ - ۳۴۱ - (۱۸۷) ایضاً، ص ۳۴۶۔

(۱۸۸) ابن سعد، سوم، ص ۲، ۱۷۱، کے مطابق حضرت عبداللہ بن اریقط دئلی اس وقت تک کافر تھے اور ان کی خدمات اُجرت پر حاصل کی گئی تھیں۔

(۱۸۹) اسد الغابہ، دوم، ص ۷ - ۲۸۶ کے مطابق حضرت سعد العرجی ہجرت نبوی کے اسی سفر کے دوران اسلام لائے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہی انھوں نے حضرت عبداللہ بن اریقط دئلی کی جگہ سنبھالی تھی۔

(۱۹۰) واقدی، ص ۱۸ - ۲۱۷، کا بیان ہے کہ اس موقعہ پر دو اور روایتیں بیان کی جاتی ہیں جو مختلف راہ بروں کا ذکر کرتی ہیں لیکن مذکورہ بالا روایت زیادہ صحیح ہے۔ نیز ملاحظہ کیجئے ابن سعد، دوم، ص ۳۹ ؛ طبری، دوم، ص ۵۰۶ ؛ اسد الغابہ، پنجم، ص ۱۶۹۔

(۱۹۱) اسد الغابہ، اول، ص ۶ - ۲۲۵۔

(۱۹۲) واقدی، ص ۳۴۳، کے مطابق وہ ایک ماہر راہ بر (دلیل خریت) تھے۔

(۱۹۳) واقدی، ص ۳۴۶ - اس مہم میں شریک ایک صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص زہری کا بیان ہے کہ "جب ہم نے راہ گم کر دی تو بدوی قبائل میں سے ایک شخص کی خدمات بطور ایک راہبر ہم نے حاصل کیں۔ اس نے پوچھا: "اگر میں آپ لوگوں کو ایسی جگہ کی نشان دہی کروں جہاں آپ کو کافی مال غنیمت ملے تو میرا کیا حصہ ہوگا؟ لوگوں نے کہا: "خمس (۱/۵) ملے گا۔" چنانچہ وہ بدو قبیلوں کے مویشیوں کی طرف لے گیا اور اس نے اپنا حصہ وصول کر لیا۔

(۱۹۴) ایضاً، ص ۴۰۳

(۱۹۵) اسد الغابہ، چہارم، ص ۳۶۰

(۱۹۶) ایضاً، پنجم، ص ۱۶۹-۷۰

(۱۹۷) واقدی، ص ۷۵۵، نے اس کا نام نہیں بتایا ہے۔

(۱۹۸) واقدی، ص ۴۸۵

(۱۹۹) واقدی، ص ۶۴۱، ۶۴۷-۸

(۲۰۰) طبری، سوم، ص ۲۳؛ اسد، دوم، ص ۱۶؛ نیز ملاحظہ کیجئے واقدی، ص ۶۴۱۔

(۲۰۱) اسد الغابہ، سوم، ص ۲۶۸۔

(۲۰۲) واقدی، ص ۲۷۰؛ اسد الغابہ، دوم، ص ۱۶۲۔

(۲۰۳) اسد الغابہ، چہارم، ص ۱۶۸۔

(۲۰۴) واقدی، ص ۹۹۹؛ نیز ملاحظہ ہو اسد الغابہ، ص ۱۳-۱۴۔

(۲۰۵) واقدی، ص ۱۱۲۲۔

(۲۰۶) ملاحظہ کیجئے ضمیمہ اول - ۶۔

(۲۰۷) واقدی، ص ۱۰۰؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، دوم، ص ۱۸؛ طبری، دوم، ص ۴۵۸؛ ابن خلدون، اول، ص ۷۵۵؛ اسد الغابہ، سوم، ص ۲۴۸-۹۔

(۲۰۸) واقدی، ص ۱۰۵؛ نیز ملاحظہ ہو اسد الغابہ، سوم، ص ۳-۴۔

(۲۰۹) واقدی، ص ۱۰۴-۵، کا بیان ہے کہ بدر میں شریکِ جہاد ہونے والے تمام غلاموں کو مالِ غنیمت میں حصہ کی بجائے انعام و اکرام سے نوازا گیا تھا۔

(۲۱۰) اسد، سوم، ص ۲۴۸-۹۔

(۲۱۱) واقدی، ص ۱۰۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۴۔

(۲۱۲) واقدی، ص ۱۰۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۴، کا بیان ہے کہ وہ خمس کے بھی نگراں مقرر کیے گئے تھے۔

(۲۱۳) اسد الغابہ، چہارم، ص ۳۶۰، کا خیال ہے کہ اس افسر کا نام مسعود بن ہنیدہ تھا جنھوں نے خمس کے نگراں افسر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔

(۲۱۴) واقدی، ص ۱۰۸؛ ابن سعد، دوم، ص ۳۰ اور ۵۸۔

(۲۱۵) واقدی، ص ۱۰۷؛ ابن سعد، دوم، ص ۲۹؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۴۱۹۔

(۲۱۶) ابن سعد، دوم، ص ۲۹؛ طبری، دوم، ص ۴۸۱؛ ابن خلدون، اول، ص ۷۵۹؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۱۰۶-۷۔

(۲۱۷) واقدی، ص ۳۷۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۵۷؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۳۳۱۔

(۲۱۸) واقدی، ص ۳۷۹ ؛ اسد الغابہ، پنجم، ص ۱۹۱۔

(۲۱۹) واقدی، ص ۵۰۹ ؛ ابن سعد، دوم، ص ۷۵ ؛ اسد الغابہ، سوم، ص ۷ - ۱۷۶۔

(۲۲۰) ابن سعد، دوم، ص ۷۵ ؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۳۳۴۔

(۲۲۱) واقدی، ص ۵۰۹ (۲۲۲) واقدی، ص ۵۱۳

(۲۲۳) اسد الغابہ، چہارم، ص ۳۶۰ (۲۲۴) واقدی، ص ۵۲۳ ؛ اسد الغابہ، دوم، ص ۵ - ۲۸۴۔

(۲۲۵) طبری، دوم، ص ۲ - ۵۹۱ ؛ نیز ملاحظہ ہو اسد الغابہ، دوم، ص ۸۰ - ۲۷۹

(۲۲۶) واقدی، ص ۶۰۸ ؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۰۷ ؛ اسد، چہارم، ص ۹ - ۱۷۸

(۲۲۷) اسد الغابہ، چہارم، ص ۸ - ۳۴۷

(۲۲۸) ایضاً، پنجم، ص ۱۶۵ (۲۲۹) ایضاً، دوم، ص ۱۱۳

(۲۳۰) طبری، سوم، ص ۸۱ ؛ ابن خلدون، اول، ص ۵۱۸۔

(۲۳۱) اسد الغابہ، چہارم، ص ۱۲۶۔ (۲۳۲) واقدی، ص ۹۲۳۔

(۲۳۳) واقدی، ص ۹۴۳۔ (۲۳۴) ایضاً، ص ۹۴۹۔

(۲۳۵) ایضاً، ص ۹۵۲۔ (۲۳۶) ابن سعد، دوم، ص ۱۶۴۔

(۲۳۷) ملاحظہ کیجئے ضمیمہ اول ۔ ۷۔

(۲۳۸) ان افسران کے علاوہ جو اسلحہ اور گھوڑوں کے آزاد و خود مختار افسر تھے صاحب المغانم (اموال غنیمت کا عام افسر) بھی اسلحوں کا نگراں افسر ہوتا تھا جیسا کہ واقدی کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ غزوہ خیبر کے ضمن میں بیان کرتے ہیں کہ ہر قسم کا مال غنیمت صاحب المغانم کی نگرانی و حفاظت میں تھا جس میں اسلحہ بھی شامل تھے اور جس کسی کو دوران غزوہ جنگ کے لیے ہتھیاروں کی ضرورت ہوتی تھی وہ صاحب المغانم سے مستعار لیتا تھا اور فتح یا جنگ کے خاتمے کے بعد ان کو لوٹا دیتا تھا۔

(۲۳۹) اسد الغابہ، دوم، ص ۲۶۸ (۲۴۰) اسد، سوم، ص ۲۷۹

(۲۴۱) ملاحظہ ہو واقدی، ص ۸۴، ۸۶، ۱۰۰ - ۹۹

(۲۴۲) واقدی، ص ۱۶ - ۱۵ ؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۱۔

(۲۴۳) واقدی، ص ۸۲، ۹۲، ۱۰۱ - ۱۰۰۔

(۲۴۴) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوہ میں مکی سردار منبہ بن حجاج سہمی کی ذوالفقار نامی تلوار صفی میں لے لی تھی (تَنَفَّل) اور دو اور مقتول مکی سرداروں ابنِ عائذ مخزومی اور عاص بن منبہ سہمی کی تلواریں اپنے دو ساتھیوں کو عطا کر دی تھی۔ ملاحظہ ہو واقدی، ص ۱۰۳ ؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۹ - ۱۸۔

(۲۴۵) واقدی، ص ۱۰۴-۸۴ ۔ واقدی اور ان کے کاتب دونوں کا بیان ہے کہ بیضہ (لوہے کا خود)، مغفر (کپڑے یا چمڑے وغیرہ کا خود) کے اوپر پہنا جاتا تھا؛ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص ۲۱۹ اور ابن سعد، دوم، ص ۳۹ جن کا بیان ہے کہ اس موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو زرہ بکتر تلے اوپر پہنے تھے اور ایک مغفر اور اس کے اوپر ایک بیضہ پہنا تھا۔

(۲۴۶) واقدی، ص ۱۰۴-۸۴ (۲۴۷) ایضاً، ص ۱۰۳

(۲۴۸) واقدی، ص ۲۱۹؛ ابن سعد، دوم، ص ۳۹۔

(۲۴۹) واقدی، ص ۲۳۰ (۲۵۰) واقدی، ص ۱۷۷

(۲۵۱) ہتھیار اس شرط پر ڈالے گئے تھے کہ بنو قینقاع مدینہ چھوڑ کر چلے جائیں گے اور اپنے تمام ہتھیار (حلقہ) مویشی (کُرَاع) اور زرگری کے اوزار (آلة الصیاغة) چھوڑ جائیں گے؛ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص ۹-۱۷۸۔

(۲۵۲) واقدی، ص ۱۷۹۔ (۲۵۳) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۰۹۔

(۲۵۴) واقدی، ص ۳۷۷۔ (۲۵۵) ایضاً ص ۵۱۰ (۲۵۶) ایضاً، ص ۵۲۳۔

(۲۵۷) واقدی، ص ۶۴۷-۸۰۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک یہودی جس کا نام سماک تھا رجیع میں واقع مسلم خیمہ گاہ کے ارد گرد گھومتا پایا گیا تھا اور اس کو خیمہ گاہ کے افسر حضرت عمر بن خطاب عدوی اور ان کے سپاہیوں نے پکڑا تھا۔ پوچھ گچھ کے دوران اس نے اس جگہ کی نشان دہی کی جہاں یہ آلاتِ حرب یہودیوں نے مسلمانوں کے قبضے میں جانے کے ڈر سے زمین میں دفن کر دئے تھے۔ اس پر قبضہ کے بعد مسلمانوں نے مذکورہ بالا یہودی قیدی کی رہنمائی میں کھود کر نکال لئے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے بعد وہ یہودی قیدی مسلمان ہو گیا تھا۔

(۲۵۸) دبابہ اور منجنیق دونوں محاصرہ شکن آلاتِ حرب ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ قلعہ یا گڑھی کی دیواروں کو توڑا جاتا ہے تاکہ محصورین کو ہتھیار ڈالنے یا کھلے میدانِ جنگ میں لڑنے پر مجبور کیا جائے۔ منجنیق در اصل پتھر پھینکنے والا ایک بڑا سا آلہ ہوتا ہے جو اسپرنگ کے اصول پر کام کرتا ہے۔ اس کے ایک سرے پر وزنی اور بھاری پتھر رکھ دیا جاتا ہے اور دوسرے سرے پر دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ دباؤ پڑتے ہی پتھر تیزی سے اچھل کر سامنے والی چیز سے ٹکراتا ہے اور اس طرح کے بار بار عمل سے دیوار میں شگاف پڑ جاتا ہے۔ جبکہ دبابہ ایک رواں اور چلتا پھرتا منارہ ہوتا ہے جس کی کئی منزلیں ہوتی ہیں۔ ہر منزل میں کافی سپاہیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ ہوتی ہے اور یہ سپاہی نقب زنی کے آلات سے لیس ہوتے ہیں۔ اوپری منزل کے سپاہی تیر کمانوں سے مسلح ہوتے ہیں تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کی حفاظت کر سکیں اور قلعہ کے دشمن کے تیروں کا جواب بھی دے سکیں۔ ان کی مزید حفاظت کے لیے ان تمام منزلوں کو کھالوں سے ڈھانک دیا جاتا تھا۔ پھر اس منارہ کو دھکیل کر قلعہ کی دیوار سے لگا دیا جاتا تھا اور تمام منزلوں کے سپاہی اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اس آلہ میں قلعہ کی دیواروں پر چڑھنے کے لئے بھی ساز و سامان ہوتا تھا اور مجاہدین اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر اوپر پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔

نیز ملاحظہ کیجئے واقدی، ص ۹۲۷ ؛ ریوبن لیوی، مذکورہ بالا، ص ۴۴۰۔

(۲۵۹) واقدی، ص ۴۴۸ اور ص ۶۷۰ کا بیان ہے کہ مرمت کے بعد جوں ہی منجنیق کو دبابہ کے ساتھ استعمال کے لیے رکھا گیا توں ہی قلعہ شق کے لوگوں نے ہتھیار ڈال دئے۔ نزار اور قموص کے یہودیوں نے منجنیق کو استعمال کے لیے تیار دیکھ کر دہشت کے مارے گھٹنے ٹیک دیے جبکہ اس آلہ محاصرہ شکن سے ایک بھی پتھر نہیں پھینکا گیا تھا۔

(۲۶۰) واقدی، ص ۶۶۴ کا بیان ہے کہ قلعہ صعب بن معاذ کے زوال کے بعد مسلمانوں کو اس سے ایک منجنیق اور متعدد دبابوں کے علاوہ کافی تعداد میں مختلف النوع ہتھیار اور آلاتِ حرب ملے تھے۔ یہودیوں نے اس قلعہ میں کافی تعداد میں اسلحہ کا ذخیرہ کر رکھا تھا۔

(۲۶۱) واقدی، ص ۶۷۱-۶۷۰۔ مورخ موصوف یہ نہیں بیان کرتے کہ باقی دو قلعوں میں بھی مالِ غنیمت ملا تھا یا نہیں۔

(۲۶۲) واقدی، ص ۶۸۰۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ خمس کا ۴/۵ حصہ فروخت کر دیا گیا تھا اور غالباً اس سے حاصل شدہ رقم کو معمول کے مطابق آلاتِ حرب و ہتھیاروں کی خرید پر صرف کیا گیا تھا۔

(۲۶۳) اموالِ غنیمت کی مالیت کے لیے ملاحظہ کیجئے خاکسار کا مضمون "عہد نبوی کی مسلم معیشت میں اموال غنیمت کا تناسب" تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ، شمارہ ۴، اکتوبر-دسمبر ۱۹۸۲ء۔

(۲۶۴) واقدی، ص ۵-۴۴۶۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب بنو قریظہ کے یہودی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست اور حلیف تھے (سلمٌ للنبی) اور انھوں نے معاہدہ شکنی نہیں کی تھی۔

(۲۶۵) ایضاً

(۲۶۶) واقدی، ص ۷۳۳ ؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲۱۔ یہاں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دُور اندیشی، حربی عاقبت بینی اور عملی ہونے کا ایک اہم ثبوت ملتا ہے۔ مآخذ کے مطابق رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی مسلمان نے پوچھا تھا "آپ اتنے سارے ہتھیار اور اسلحہ لے کر کیوں آئے ہیں جبکہ قریش نے ہم پر یہ پابندی عائد کر دی ہے کہ ہم مکہ میں صرف تلواروں کے ساتھ داخل ہوں اور کوئی دُوسرا ہتھیار ہمارے پاس نہ ہو؟" آپ نے جواب میں فرمایا تھا کہ "ہم ان کو اپنے ساتھ حرم میں لے کر داخل نہیں ہوں گے لیکن وہ ہمارے قریب ہوں گے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم ان کو آسانی سے استعمال کر سکیں گے۔" یہ فراستِ نبوی تھی جو محض غلط قسم کے توکل پر بھروسا نہیں کرتی تھی بلکہ ہر ممکن تدبیر اختیار کرتی تھی اور اسی فراست اور عملیت کا نتیجہ تھا کہ آپ کی ہر جنگی تدبیر کامیاب ہوتی تھی۔

(۲۶۷) ایضاً (۲۶۸) واقدی، ص ۷۳۵ ؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲۱۔

(۲۶۹) واقدی، ص ۸۱۳۔ (۲۷۰) ایضاً

(۲۷۱) واقدی، ص ۸۱۴-۸۱۳ کے مطابق بنو فزارہ نے اپنی کثرتِ تعداد، آلاتِ حرب، اسلحوں اور ساز و سامان سے لیس گھوڑوں (الفرس الخیل) پر فخر کا اظہار کیا تھا۔ اس پر بنو سلیم نے بہتر شہسوار، بہتر تیر انداز اور

بہتر تیغ زن (جو مشرفی تلواریں استعمال کرتے تھے) ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ مشرف شام کا علاقہ تھا جہاں کی تلواریں بہت عمدہ ہوتی تھیں۔

(۲۷۲) واقدی، ص ۸۲۱ (۲۷۳) ایضاً (۲۷۴) واقدی، ص ۳-۸۲۲

(۲۷۵) واقدی، ص ۸۵۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۵۰؛ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص ۹۰-۸۸۹۔

(۲۷۶) اسد الغابہ، سوم، ص ۲۷۹۔

(۲۷۷) واقدی، ص ۹۲۳، کا دعویٰ ہے کہ جنوبی عرب سے آنے والی اس منجنیق سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائش پر حضرت سلمان فارسی نے ایرانی طرز کی ایک منجنیق اسی محاصرہ کے دوران بنائی تھی۔

(۲۷۸) واقدی، ص ۹۲۷، کے مطابق حسب ذیل تین صحابیوں میں سے کوئی ایک یہ منجنیق اور دبابہ لایا تھا؛ حضرات یزید بن زمعہ، طفیل بن عمرو ازدی، خالد بن سعید اموی۔ موخر الذکر کے بارے میں روایت یہ ہے کہ وہ اسے صنعاء سے لائے تھے۔ روایات کی تنقیح سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت طفیل بن عمرو ازدی کے بارے میں روایت زیادہ صحیح ہے۔

(۲۷۹) ایضاً (۲۸۰) ایضاً (۲۸۱) واقدی، ص ۱۰۲۷۔

(۲۸۲) ملاحظہ کیجئے خاکسار کا مضمون "عہد نبوی کی مسلم معیشت میں اموالِ غنیمت کا تناسب۔

(۲۸۳) واقدی، ص ۹۹۱؛ نیز ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اوّل، ص ۳۶۸، جس کے مطابق حضرت عثمان غنی نے تنہا ستر ہزار درہم یا اس سے زیادہ کی خطیر رقم صرف کی تھی۔ ان کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیق نے اپنی تمام دولت عطا کر دی تھی جو ایک اندازے کے مطابق چار ہزار درہم تھی۔ دُوسروں نے بھی فیاضی کے ساتھ حصّہ لیا تھا اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جنگی فنڈ میں دل کھول کر عطیات دیے تھے۔ ان میں سے حضرت عمر بن خطاب نے اپنی آدھی دولت دے دی تھی۔ ان کے علاوہ دوسرے مالدار اور مخیر مسلمان جنھوں نے مال (زرِ کثیر) دیا تھا' یہ تھے: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری، عباس بن عبدالمطلب ہاشمی، طلحہ بن عبیداللہ تیمی، سعد بن عبادہ خزرجی، محمد بن مسلمہ اوسی اور عاصم بن عدی خزرجی۔ متعدد بلکہ کثیر مسلمان وُہ تھے جن کے ناموں کو محفوظ رکھنے کی سعادت ماخذ کو نہیں حاصل ہوئی۔

(۲۸۴) واقدی، ص ۵۵؛ طبری، دوم، ص ۳۴۹؛ نیز ملاحظہ کیجئے اسد، دوم، ص ۹-۲۹۶۔

(۲۸۵) واقدی، ص ۲۰۸؛ ابن سعد، دوم، ص ۳۷۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر انصار کے دونوں قبیلوں کے تین محافظ دستے تھے جو اپنے کمانداروں کی ماتحتی میں باری باری سے پہرہ دیتے رہے تھے۔

(۲۸۶) واقدی، ص ۳۳۴ اور ۳۳۶۔

(۲۸۷) صحابی موصوف نے حمراء الاسد کی مہم کے دوران اپنی ذمہ داری بے مثال محبت وجذبے کے ساتھ

انجام دی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ذات الرقاع، حدیبیہ وغیرہ متعدد دوسری مہموں میں بھی یہ سعادت حاصل کی تھی۔ ملاحظہ ہو واقدی، ص ۳۳۶، ۳۹۷، ۶۰۶ وغیرہ؛ نیز ملاحظہ کیجئے اسد، سوم، ص ۱۰۰-۱۰۱۔

(۲۸۸) طبری، سوم، ص ۱۷؛ اسد الغابہ، اوّل، ص ۲۰۶۔

باب چہارم

(۱) ابن ہشام، دوم، ص ۵۹، ۵۹۸ وغیرہ؛ واقدی، ص ۱۰۰ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم، ص ۸ وغیرہ؛ طبری، دوم، ص ۴۰۳-۷ وغیرہ؛ ابن خلدون، اول، ص ۴۴، وغیرہ؛ انساب الاشراف، اول، ص ۲۸ اور ۲۸۷-۸ وغیرہ؛ کتانی، اول، ص ۱۶-۳۱۴۔

(۲) مذکورہ بالا۔

(۳) ابن ہشام، دوم، ص ۶۱-۵۹؛ ابن سعد، دوم، ص ۸؛ انساب الاشراف، اول، ص ۲۸۷؛ طبری، دوم، ص ۴۰۴-۷؛ ابن خلدون، اول، ص ۴۴۷، اور اسد، دوم، ص ۵-۲۸۳۔

(۴) ابن سعد، دوم، ص ۸؛ انساب الاشراف، اول، ص ۲۸۷؛ طبری، دوم، ص ۴۰۷؛ اسد، دوم، ص ۷-۲۹۶۔

(۵) ابن سعد، دوم، ص ۹؛ انساب الاشراف، اول، ص ۲۸۷؛ طبری، دوم، ص ۴۰۷؛ اسد، دوم، ص ۷-۲۳۴۔

(۶) اس کے لیے ملاحظہ کیجئے ابن اسحاق، ص ۶۷۹؛ واقدی، ص ۱۹-۱۱۱۷؛ طبری، سوم، ص ۱۸۶؛ انساب الاشراف، اول، ص ۴۷۴، بخاری، بعث اسامہ اور مناقب زید بن حارثہ۔

(۷) ابن ہشام، دوم، ص ۵۹۸؛ ابن سعد، دوم، ص ۹، انساب الاشراف، اول، ص ۲۸۷؛ طبری، سوم، ص ۴۰۸؛ اسد، پنجم، ص ۲۱۸۔

(۸) ابن ہشام، دوم، ص ۶۱۲؛ ابن خلدون، اول، ص ۹-۴۸۷؛ انساب الاشراف، اول، ص ۲۸۹

(۹) واقدی، ص ۱۰۰۸؛ طبری، دوم، ص ۴۰۸؛ انساب الاشراف، اول، ص ۲۸۹۔ موخر الذکر نے حارث بن حاطب کی جگہ حضرت عاصم بن عدی کا نام لیا ہے۔

(۱۰) ابنِ سعد، دوم، ص ۱۲۔

(۱۱) ابنِ ہشام، دوم، ص ۵۴؛ واقدی، ص ۸۱-۱۸۰؛ ابن سعد، دوم، ص ۳۰-۲۹؛ طبری، دوم، ص ۴۸۱ اور ۴۸۵؛ نیز ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اول، ص ۱۰-۳۰۹؛ اسد، پنجم، ص ۵-۲۸۴۔

(۱۲) ملاحظہ ہو اسد، چہارم، ص ۱۲۷۔

(۱۳) ابن ہشام، دوم، ص ۶۴؛ واقدی، ص ۱۹۶؛ ابن سعد، دوم، ص ۳۵؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۱۱؛ اسد، سوم، ص ۳۴۶-۳۴۸۔

(۱۴) واقدی، ص ۳۸۳-۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۵۹؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۰؛ نیز ملاحظہ ہو ابن ہشام، دوم، ص ۲۰۹، جن کے مطابق اس موقعہ پر نائبِ رسول حضرت عبداللہ بن رواحہ کی جگہ حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن ابی بن سلول تھے۔ مزید دیکھئے اسد، سوم، ص ۱۵۶-۹۔

(۱۵) ابن ہشام، دوم، ص ۲۰۳؛ واقدی، ص ۴۰۲؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۱؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۰ اور طبری، دوم، ص ۵۵۶۔

(۱۶) ابن ہشام، دوم، ص ۲۱۳؛ واقدی، ص ۴۰۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۲؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۱ اور طبری، دوم، ص ۵۶۴۔

(۱۷) ابن سعد، دوم، ص ۶۳؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۲؛ نیز ملاحظہ ہو اسد، دوم، ص ۲۴۴-۷۔

(۱۸) حضرت ابن ام مکتوم کی تیرہ تقرریوں کے لیے ملاحظہ کیجئے ابن ہشام، دوم، ص ۶۱۲؛ سوم، ص ۴۳، ۴۶، ۱۰۲، ۲۲۰، ۲۳۴، ۲۷۹، ۲۸۴ اور ۳۹۹؛ واقدی، ص ۱۸۴، ۱۹۷، ۱۹۹، ۳۷۱، ۴۴۱، ۴۹۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۴۷، ۵۷۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۳۱، ۳۵-۶، ۳۹، ۴۹، ۵۸، ۶۶، ۷۴، ۷۹، ۸۰، ۹۵، ۱۳۵؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۲۸، ۳۳۹، ۳۴۷-۵۰، ۳۶۴، ۳۶۶-۶۸؛ طبری، دوم، ص ۴۸۳، ۵۳۶، ۵۵۵؛ نیز ملاحظہ کیجئے اسد، چہارم، ص ۱۲۷ اور ابن خلدون، اول، ص ۴۸۷-۹۔

(۱۹) ملاحظہ کیجئے، ضمیمہ دوم-۱۔

(۲۰) ایضاً (۲۱) ایضاً (۲۲) ایضاً (۲۳) ایضاً

(۲۴) قرآن کریم، سورہ آل عمران، آیت ۱۵۹۔

(۲۵) واقدی، ص ۴۴۴-۴۵۔

(۲۶) ابن اسحاق، ص ۲۹۳-۹۴؛ واقدی، ص ۱۰۷-۸؛ بخاری، باب فضائل اصحاب النبی؛ طبری، دوم، ص ۴۷۴-۷۷؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، دوم، ص ۶-۷؛ مسلم، غزوۂ بدر؛ انساب الاشراف، اول، ص ۲۹۳-۴۔

(۲۷) ملاحظہ ہو ضمیمہ دوم-۲۔

(۲۸) واقدی، ص ۱۰۷-۸؛ طبری، دوم، ص ۴۷۴-۷؛ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص ۳۸۶-۷، جن کا بیان ہے کہ غزوہ بدر الموعد کے موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات ابوبکر و عمر کا مشورہ قبول کرلیا تھا کہ دشمنوں سے

جنگ کے لیے نکلا جائے۔

(۲۹) واقدی، ص ۲۰۹-۱۳؛ نیز ملاحظہ کیجئے ابن اسحاق، ص ۳۷۱-۷۲؛ طبری، دوم، ص ۵۰۲-۳ اور انساب الاشراف، اول، ص ۳۱۴-۵۔

(۳۰) واقدی، ص ۱۸۷، کا بیان ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی شاعر سے پہنچنے والی تکالیف کا ذکر کیا تو حضرت محمد بن مسلمہ اوسی نے آپ کو اس کی شرارتوں کا مکمل سدِباب کر دینے کا یقین دلایا مگر وہ کئی دنوں تک اس کے بارے میں کوئی طریقہ نہ سوچ سکے۔ انھوں نے آپ سے رجوع کیا اور آپ نے ان کو حضرت سعد بن معاذ سے مشورہ کرنے کی ہدایت کی۔ انجام کار قبیلہ اوس کے تمام بڑے بڑے سرداروں نے کئی دن کے مباحثے کے بعد اس دشمنِ اسلام کے قتل کا فیصلہ کر دیا۔

(۳۱) ابن اسحاق، ص ۴۵۰ وغیرہ؛ واقدی، ص ۴۴۴-۵؛ طبری، دوم، ص ۵۶۶۔

(۳۲) ابن اسحاق، ص ۴۵۴؛ واقدی، ص ۴۷۷-۹؛ طبری، دوم، ص ۵۷۳۔

(۳۳) ابن ہشام، دوم، ص ۳۱۵؛ واقدی، ص ۶۰۰؛ ابن سعد، دوم، ص ۹۷؛ طبری، دوم، ص ۶۳۰-۳۱؛ ابن خلدون، اول، ص ۷۸۵۔

(۳۴) واقدی، ص ۶۴۳-۴۴

(۳۵) قرآن کریم، سورہ الحشر، آیت ۵۔

(۳۶) ملاحظہ ہو ضمیمہ دوم-۲۔

(۳۷) واقدی، ص ۶۵۱

(۳۸) واقدی، ص ۷۲۸

(۳۹) واقدی، ص ۸۹۳؛ طبری، سوم، ص ۷۳۔

(۴۰) واقدی، ص ۹۲۷

(۴۱) ایضاً، ص ۹۳۷

(۴۲) ایضاً، ص ۱۰۱۹

(۴۳) ابن اسحاق، ص ۲۳۵-۶؛ بخاری، باب الاذان؛ ابوداؤد، باب بدء الاذان؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۲۳۵-۶؛ انساب الاشراف، اول، ص ۲۷۳۔ اذان کی تجویز رکھنے والے صحابی کے بارے میں دو روایتیں ملتی ہیں: ایک کے مطابق حضرت عبداللہ بن زید نے مشورہ دیا تھا اور دوسری کے مطابق تجویز حضرت عمر بن خطاب کی تھی۔

(۴۴) بخاری، باب المساجد، باب الهجرہ، باب الحج، کتاب البیوع۔

(۴۵) ملاحظہ کیجئے باب اول بحث بر مواخاۃ؛ نیز ابن اسحاق، ص ۲۳۴ وغیرہ۔

(۴۶) فتوح البلدان، ص ۲۲۰؛ زرقانی، شرح مواہب اللدنیہ، طبع اول، قاہرہ ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷-۸ء، دوم، ص ۸۷۔

(۴۷) بخاری، فضائل الانصار؛ یحییٰ بن آدم، کتاب الخراج، لیڈن ۱۸۹۶ء، ص ۱۹۔

(۴۸) ابن سعد، دوم، ص ۲۲۔
(۴۹) ابن اسحاق، ص ۳۱۴؛ واقدی، ص ۳۱-۱۰۳۔
(۵۰) ابن اسحاق، ص ۱۰-۳۱۶۔
(۵۱) ابن اسحاق، ص ۹۹-۴۹۵؛ واقدی، ص ۴۲۸، ۲۲-۴۳۰ وغیرہ؛ بخاری، باب الحدیث الافک؛ مسلم، مذکورہ، متعلقہ؛ نیز ملاحظہ کیجئے قرآن کریم، سورہ نور، آیات ۲۰-۱۱۔
(۵۲) بخاری، باب فضائل اصحاب النبی، فضائل عمر۔
(۵۳) اسد الغابہ، چہارم، ص ۶۷-۶۳۔
(۵۴) بخاری، غزوۃ الحدیبیہ اور کتاب الشروط۔
(۵۵) ابوداؤد، سنن، باب فی المرء والعبد یحذمان من الغنیمۃ۔
(۵۶) انساب الاشراف، اول، ص ۵۵۵، کا بیان ہے کہ یہ مشورہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبد المطلب ہاشمی نے دیا تھا جو حضرت ابوسفیان بن حرب اموی کے ندیم (دوست اور تجارت کے شریک) تھے۔
(۵۷) بخاری، کتاب النکاح، باب موعظۃ الرجل؛ کتاب اللباس، باب ماکان یتجوز رسول اللہ من اللباس۔
(۵۸) طبری، دوم، ص ۶۳۰؛ نیز ملاحظہ ہو مسلم، باب صلح الحدیبیۃ فی الحدیبیۃ۔
(۵۹) ملاحظہ ہو ضمیمہ دوم - ۲۔
(۶۰) عبد الحفیظ بلیاوی، مصباح اللغات، لفظ متعلق۔
(۶۱) زبیری، ص ۱۷۴، حضرت عبداللہ (سابق حکم) بن سعید اموی کو ہمیشہ عبداللہ الکاتب کہتا ہے۔ فن کتابت میں ان کی اتنی شہرت ہوئی تھی کہ الکاتب ان کے نام کا جزو بن گیا تھا۔
(۶۲) ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۱۱۸۔
(۶۳) مجموعۃ الوثائق، دستاویز ۴۳، ص ۴۴-۴۳۔
(۶۴) ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۱۱۸، جو صبح الاعشیٰ (اول باب) جلد چہارم، ص ۸۹ کو نقل کرتے ہیں۔
(۶۵) ملاحظہ ہو ضمیمہ دوم - ۳۔
(۶۶) ایضاً (۶۷) ایضاً (۶۸) ایضاً
(۶۹) بحوالہ کتانی، اول، ص ۱۷-۱۱۵
(۷۰) ضمیمہ دوم - ۳۔ (۷۱) ایضاً
(۷۲) بحوالہ کتانی، اول، ۱۷-۱۱۵۔
(۷۳) بحوالہ کتانی، اول، ص ۱۱۸۔

(۷۴) انساب الاشراف، اول، ص ۵۳۲، حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ ایک بار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس ہاشمی کو حضرت معاویہ کو بلانے کے لیے بھیجا کیونکہ کوئی اہم دستاویز لکھوانا چاہتے تھے۔ حضرت عبداللہ جب ان کے پاس پہنچے تو وہ کھانا کھا رہے تھے۔ انھوں نے حکم نبوی سننے کے بعد کہا کہ وہ کھانا ختم کرکے فوراً پہنچ رہے ہیں۔ ان کے پہنچنے میں تاخیر ہوئی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر حضرت عبداللہ کو حضرت معاویہ کے پاس بھیجا مگر وہ اس وقت بھی کھا رہے تھے۔ حضرت عبداللہ نے واپس آکر سارا ماجرا کہہ سنایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر کہا کہ "خدا کرے ان کا پیٹ کبھی نہ بھرے!" بعد کے زمانے حضرت معاویہ کہا کرتے تھے کہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا لگ گئی کیونکہ وہ سارے دن کئی بار اور بہت سا کھاتے تھے۔ بہرحال اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر ان پر اعتماد کرتے تھے اور دستاویزات مخصوص صرف انھیں سے لکھواتے تھے؛ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۱۱۸۔

(۷۵) اسد، اول، ص ۹۴؛ انساب الاشراف، اول، ص ۵۳۱؛ المعارف، ص ۲۶۱؛ بخاری، باب فضائل الجہاد والسیر؛ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۱۱۸۔

(۷۶) اسد، دوم، ص ۲۲۱-۲؛ انساب الاشراف، اول، ص ۵۳۱؛ بخاری، مذکورہ بالا باب؛ طبری، سوم، ص ۱۷۳؛ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۱۱۷۔

(۷۷) بحوالہ کتانی، اول، ص ۱۱۷۔

(۷۸) مجموعۃ الوثائق، ص ۲۴۶-۱

(۷۹) اس کے لیے ملاحظہ کیجئے واقدی، ص ۶۸۹، ۷۰۰، ۱۸-۱۹، ۷۲۰-۲۱، ۹۲۹، ۹۳۲، ۹۹۶؛ بخاری، کتاب الاحکام، باب مایستحب للکاتب ان یکون امیناً عاقلا؛ نیز باب فضل الجہاد والسیر۔

(۸۰) بحوالہ کتانی، اول، ص ۱۲۳۔ (۸۱) مجموعۃ الوثائق، ص ۱۴-۱۳۔

(۸۲) ایضاً، ص ۳۶ (۸۳) ایضاً، ص ۷۵ (۸۴) ایضاً، ص ۱۱۵ (۸۵) ایضاً، ص ۱۳۳۔

(۸۶) ایضاً، ص ۱۴۵؛ اس کے انگریزی ترجمہ کے لیے ملاحظہ ہو مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۳۵۷۔

(۸۷) کتانی، اول، ص ۱۲۳؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۲۲۶، جن کا بیان ہے کہ اس کو تحریر کرنے والے حضرت ابوبکر تھے، ان کے مولیٰ نہیں۔

(۸۸) کتانی، اول، ص ۱۲۱-۱۲۰؛ نیز ملاحظہ ہو جہشیاری، ص ۱۲۔

(۸۹) کتانی، اول، ص ۱۲۱، نے اس روایت کو شرح المواہب اللدنیہ اور جہشیاری ص ۱۲ سے لیا ہے۔

(۹۰) ان معاہدات وخطوط کے لیے ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق ص ۷۷، ۹۶ وغیرہ اور ص ۳۰-۱۲۷۔

(۹۱) ان کے لیے ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۹-۶۵، ص ۷۷-۷۳، ۱۳۳، ۱۳۷، ۴۲-۱۴۰، ۱۴۶-۷، ۹۰-۱۸۰، ۷-۱۹۳۔

(۹۲) کتانی، اول، ص ۴-۱۲۳؛ نیز ملاحظہ ہو العقد الفرید، دوم، ص ۱۴۲، جس کا بیان ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان حجاز کی پیداوار کا تخمینہ (خرص) تحریر کیا کرتے تھے۔

(۹۳) کتانی، اول، ص ۳-۱۲۲؛ نیز ملاحظہ ہو ص ۲۷-۱۲۵، جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کاتب کو ان ہدایات کے بارے میں ذکر ہے جن کے مطابق وہ اپنا قلم کہاں رکھا کرے اور کس طرح لکھا کرے؟

(۹۴) بسملہ دراصل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا اختصار ہے۔ اس کے لیے ملاحظہ کیجئے جہشیاری، ص ۱۴۔

(۹۵) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کے بعد عموماً فقرہ رسول اللہ یا اسی کا ہم معنی فقرہ ثانی آتا تھا جبکہ مکتوب الیہ کے نام کے بعد اس کا دنیاوی خطاب یا قبائلی القاب لکھا جاتا تھا جس سے اس کی شخصیت کے بارے میں پوری طرح سے وضاحت کر دی جاتی تھی۔

(۹۶) ملاحظہ کیجئے مجموعۃ الوثائق، ص ۲۰۰-۱۔

(۹۷) بخاری اور شمائل ترمذی، بحوالہ کتانی، اول، ص ۸-۱۷۷۔

(۹۸) مجموعۃ الوثائق، ص ۵۰ اور ۵۶ کے سامنے والے صفحات پر اس کا نقش ملاحظہ فرمائیے۔

(۹۹) ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۱۷۸۔

(۱۰۰) اسد الغابہ، چہارم، ص ۴۰۳۔

(۱۰۱) العقد الفرید، دوم، ص ۱۲۲ اور ۱۷۴۔

(۱۰۲) ابوداؤد، سنن، باب قبول ہدایا المشرکین۔

(۱۰۳) واقدی، ص ۲۴۸، ۳۲۶، ۶-۹۷۵؛ انساب الاشراف، اول، ص ۱۸۷، ۸-۵۵۷۔

(۱۰۴) انساب الاشراف، اول، ص ۱۹۰، ۵۲۴ وغیرہ۔

(۱۰۵) اس کے لیے حدیث و فقہ کی کتابوں میں باب السترۃ ملاحظہ فرمائیے۔

(۱۰۶) اسد الغابہ، اول، ص ۲۰۶۔ (۱۰۷) واقدی، ص ۹۴۸۔

(۱۰۸) ابن اسحاق، ص ۶۴۴، کا بیان ہے کہ حضرت بلال نے ایک اونس سونا دیا تھا جبکہ واقدی، ص ۱۰۰-۴۰۰، کا بیان ہے کہ ایک اوقیہ چاندی جو چالیس درہم کے مساوی تھی دو مزید قیراط کے ساتھ ادا کی گئی تھی۔ نیز ملاحظہ کیجئے بخاری، صحیح، کتاب الوکالۃ۔

(۱۰۹) واقدی، ص ۵-۹۴۴۔ (۱۱۰) ایضاً، ص ۹۴۸۔

(۱۱۱) واقدی، ص ۹۸۰، کے مطابق ہر رکن وفد کو ½۱۲ اوقیہ (اثنی عشر اوقیۃ والنش) چاندی عطا کی گئی تھی جبکہ

ایک بچّے یا غلام (غلام) کو صرف ۵ اوقیہ ملے تھے۔

(۱۱۲) بخاری، باب القسمۃ، ابو داؤد، مذکورہ بالا۔

(۱۱۳) واقدی، ص ۷-۳۲۶، ۳۷۱، ۴۹۷۔

(۱۱۴) واقدی، ص ۶۴۵ (۱۱۵) ایضاً، ص ۹۱۷۔

(۱۱۶) مسند احمد بن حنبل، دوم، ص ۳۵۸۔ (۱۱۷) واقدی، ص ۱۹۴۔

(۱۱۸) واقدی، ص ۹۶۸، ۹۸۰؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، اول، ص ۳۲۳، ۳۳۰، ۳۵۶ وغیرہ بقیہ دوسرے وفود کے لیے۔

(۱۱۹) ابن اسحاق، ص ۵۱۵: واقدی، ص ۶۷۳ (۱۲۰) ابن اسحاق، ص ۶۷۲۔

(۱۲۱) واقدی، ص ۳۳۸؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۴۷۷ (ابن ہشام کا یہ دراصل تبصرہ ہے)

(۱۲۲) ازرقی، ص ۱۷؛ العقد الفرید، سوم، ص ۳۱۴۔

(۱۲۳) ایضاً؛ نیز ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون بنو ہاشم اور بنو امیہ کی رقابت کے پس منظر پر۔

(۱۲۴) کتانی، اول، ص ۹۰-۱۸۳۔

(۱۲۵) ابن اسحاق، ص ۶۵۳؛ ابن سعد، سوم، ص ۵۸۵؛ مسلم، کتاب الایمان؛ طبری، دوم، ص ۶۴۶۔

(۱۲۶) کتانی، اول، ص ۲۰۱-۱۹۴۔

(۱۲۷) واقدی، ص ۳۶۶؛ ابن سعد، دوم، ص ۵۷۔

(۱۲۸) ابن اسحاق، ص ۴۵۳ اور طبری، دوم، ص ۵۷ نے بنو عمرو بن عوف کے ایک انصاری صحابی حضرت خَوّات بن جُبیر کا بھی اس فہرست میں اضافہ کیا ہے۔ لیکن واقدی نے اس روایت کو مسترد کر دیا ہے کہ اول الذکر روایت زیادہ صحیح ہے۔

(۱۲۹) ابن اسحاق، ص ۴۵۳؛ واقدی، ص ۹-۴۵۸؛ طبری، دوم، ص ۵۱۷۔

(۱۳۰) ابن اسحاق، ص ۵۰۳؛ واقدی، ص ۶۰۰؛ ابن سعد، دوم، ص ۹۶؛ طبری، دوم، ص ۵۳-۵۵۲
نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۱۹۵، جنھوں نے ان کو صلح کے سفیروں کے طبقہ میں شمار کیا ہے۔

(۱۳۱) ابن اسحاق، ص ۵۰۳؛ واقدی، ص ۶۰۰؛ ابن سعد، دوم، ص ۹۶؛ طبری، دوم، ص ۶۳۱؛ اسد الغابہ، سوم، ص ۸۴-۳۷۶؛ ابن خلدون، اول، ص ۷۸۵؛ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۱۹۵، نے ان کو بھی صلح کا سفیر قرار دے کر ان کا ذکر حضرت خراش بن امیہ خزاعی کے ساتھ کیا ہے۔

(۱۳۲) واقدی، ص ۶۰۳۔ (۱۳۳) طبری، دوم، ص ۶۳۰۔

(۱۳۴) ابن ہشام، سوم، ص ۶۰۷؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۵۵-۶۵۲۔

(۱۳۵) ابن سعد، اول، ص ۵۹ - ۲۵۸ ؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۵۵ - ۶۵۲ ؛ ابن ہشام، سوم، ص ۶۰۰ ؛ بلاذری، انساب الاشراف، اول، ص ۵۳۱ ؛ طبری، دوم، ص ۵ - ۶۴۴ ؛ کتاب المحبر، ص ۷۷ - ۵ ؛ کتانی، اول، ص ۹۵ - ۱۹۴ - موخر الذکر نے ان چھ سفارتوں کے ساتھ شاہانِ بحرین و یمن کے نام حضرات علاء بن حضرمی اور مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کی سفارتوں کو "اسلام کی تبلیغ کے لیے مقرر کیے جانے والے سفیروں کے زمرہ" میں شمار کیا ہے۔ مزید ملاحظہ کیجئے ابن خلدون، اول، ص ۹۰ - ۸۸ ۔

(۱۳۶) ان گرامی ناموں کے متون کے لیے ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۶۵۳ وغیرہ اور مجموعۃ الوثائق، ص ۶۵ - ۱۲۱ وغیرہ

(۱۳۷) ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۶۵۳ ؛ ابن سعد، اول، ص ۲۵۸ ؛ طبری، دوم، ص ۵ - ۶۴۴ ؛ کتانی اول، ص ۱۹۴ -

(۱۳۸) ایضاً

(۱۳۹) ابن ہشام، سوم، ص ۶۰۷ ؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۶۵۴ -

(۱۴۰) ابن سعد، اول، ص ۶۳ - ۲۶۲

(۱۴۱) ابن سعد، اول، ص ۲۷۶، ۲۸۲، ۲۸۵ ؛ دوم، ص ۱۲۸ -

(۱۴۲) اسد الغابہ، چہارم، ص ۱۳-۱۴، ۱۲۶ -

(۱۴۳) الاستیعاب، ترجمہ عمرو بن امیہ ضمری بحوالہ کتانی، اول، ص ۱۹۸ - موخر الذکر نے ان کو تحائف لے جانے والے سفیروں کے طبقہ میں شمار کیا ہے۔

(۱۴۴) ابن سعد، اول، ص ۲۷۳ ؛ دوم، ص ۲۶۶ بالترتیب ؛ نیز ملاحظہ ہو آخری سفارت کے لیے کتاب المحبر، ص ۷۵ -

(۱۴۵) طبری، سوم، ص ۱۷۸ -

(۱۴۶) ملاحظہ ہو ضمیمہ دوم - ۳ -

(۱۴۷) ابن سعد، اول، ص ۲۷۳ ؛ نیز ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۶ - ۲۰۵ -

(۱۴۸) فتوح البلدان، ص ۱۰۲ -

(۱۴۹) ایضاً

(۱۵۰) ایضاً

(۱۵۱) طبری، سوم، ص ۱۸۷ -

(۱۵۲) ایضاً ؛ نیز ملاحظہ ہو باب دوم، بحث بر اسلام بنو حنیفہ -

(۱۵۳) طبری، سوم، ص ۱۷۸ ؛ نیز ملاحظہ ہو ابن خلدون، اول، ص ۸۴۵ ۔

(۱۵۴) کتانی، اول، ص ۶ - ۱۹۵ -

(۱۵۵) ایضاً، ص ۲۰۱ - ۱۹۹

(۱۵۶) ایضاً

(۱۵۷) اس کے لیے باب اول میں بنی قریظہ پر بحث ملاحظہ کیجئے۔

(۱۵۸) تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ابن ہشام، دوم، ص ۴۳۰ ؛ واقدی، ص ۸۰۲ ؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۱۰، ۸۳۸ ؛ نیز اسد الغابہ، چہارم، ص ۴۰ - ۱۶ -

(۱۵۹) واقدی، ص ۵۵۹۔

(۱۶۰) ابن خلدون، اوّل، ص ۸۱۹؛ نیز ملاحظہ ہو اسد، سوم، ص ۶۰-۵۹۔

(۱۶۱) واقدی، ص ۱۰۴۶؛ طبری، سوم، ص ۱۱۰؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۲۲؛ ملاحظہ ہو اسد الغابہ، چہارم، ص ۹-۲۰۸، ۴۰۱۔

(۱۶۲) قرآن کریم، سورہ توبہ، آیت ۱۰۷۔ (۱۶۳) اسد الغابہ، اول، ص ۱۳۳۔

(۱۶۴) ایضاً، چہارم، ص ۲،۷-۵۲ (۱۶۵) ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۲۸۰۔

(۱۶۶) ایضاً، ص ۸۱-۲۸۰ (۱۶۷) اصابہ، جلد سوم، ص ۲۴۰ (۱۶۸) واقدی، ص ۱۰۷۶۔

(۱۶۹) اسد الغابہ، چہارم، ص ۲۴۸؛ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اوّل، ص ۲۱۰ اور زرقانی، سوم، ص ۳۷۲ وغیرہ۔

(۱۷۰) سیرت ابن اسحاق میں شامل حضرت حسان وغیرہ کی شاعری کی صحت پر مختصر بحث کے لیے ملاحظہ فرمائیے ابنِ اسحاق کے انگریزی مترجم الفریڈ گلیوم کا مقدمہ اور مکمل بحث کے لیے ملاحظہ ہو ایم اے عزام اور ڈبلو عرفات کے پی ایچ ڈی کے مقالے جو انھوں نے لندن یونیورسٹی میں جمع کیے اور ابھی تک شرمندۂ طباعت نہیں ہو سکے۔

(۱۷۱) ابن اسحاق، ص ۵-۱۷۴ (۱۷۲) ایضاً، ص ۷-۲۰۶ (۱۷۳) ایضاً، ص ۲۴۵

(۱۷۴) ایضاً، ص ۷-۳۰۶؛ نیز ص ۳۲۰ ملاحظہ ہو بدر میں سراقہ کے مکیوں کو چھوڑ بھاگنے پر۔ ص ۹-۳۴۵ پر حضرت حسان نے مکیوں کی اس نکتہ چینی کا جواب دیا تھا جو انھوں نے بدر کے بعد مسلمانوں کے خلاف شروع کی تھی۔

(۱۷۵) ابن اسحاق، ص ۶۰-۳۶۵؛ نیز ملاحظہ ہو ص ۳۶۹ جو یہودی سازشی سرداروں کے قتل کے بارے میں ان کی شاعری سے پُر ہے؛ نیز ملاحظہ کیجیے واقدی، ص ۲۳-۱۲۲، ۸۰-۱۸۴؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۵۷؛ طبری، دوم، ص ۹۱-۴۸۹؛ بخاری اور مسلم، کتاب المغازی، متعلقہ ابواب۔

(۱۷۶) ایضاً، ص ۸۰-۳۷۹، مکیوں کے اس غزوہ میں اپنے قومی پرچم کی حفاظت نہ کر سکنے پر حضرت حسان کی تنقید کے لیے؛ ص ۳۸۲ ابی بن خلف کے قتل کے لیے؛ ص ۳۸۶ ہند زوجہ ابوسفیان بن حرب اموی کے حضرت حمزہ بن عبد المطلب کی لاش کا مثلہ کرنے اور دوسرے بے رحمانہ کاموں کے لیے؛ ص ۴۰۵، ۴۰۸، ۴۱۲ اور ۴۱۷ اہلِ مکہ کی شاعرانہ تنقید و نکتہ چینی کے جواب کے لیے۔

(۱۷۷) ابن اسحاق، ص ۳۳-۴۳۰۔ (۱۷۸) ایضاً، ص ۶-۴۳۵

(۱۷۹) حضرت حسان کی شاعری کے اور نمونوں کے لیے ملاحظہ کیجیے ابن اسحاق، ص ۴۴۸، ۸-۴۵۷، ۷۶-۴۷۲، ۸۰-۴۷۸، ۴۸۳، ۹۱-۴۸۸، ۹۹-۴۹۷، ۲۱-۵۲۰، ۹-۵۳۷، ۵-۵۴۴، ۵۵۶، ۵۵۸، ۶-۶۲۴، ۳۱-۶۲۹، ۶۷۶، ۹۰-۶۸۹؛ نیز ملاحظہ کیجیے ابن ہشام کے تبصرے ایضاً، ص ۹۹-۷۲۲۔ مزید ملاحظہ کیجیے دیوان حسان بن ثابت، مرتبہ ڈبلو عرفات۔

(۱۸۰) حضرت عبداللہ بن رواحہ کی شاعری کے لیے ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۳۱۵، ۴۲۲، ۴۳۶، ۴۴۸ وغیرہ اور حضرت کعب بن مالک کی شاعری کے لیے ایضاً، ص ۳۶، ۹ - ۲۷۸، ۳۴۴، ۳۵۰، ۳۶۲، ۳۸۱، ۴۰۵، ۴۰۹ وغیرہ۔ مزید ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۱۱ - ۲۱۰۔

(۱۸۱) کتانی، اول، ص ۱۲ - ۲۱۱ وغیرہ۔ نیز ملاحظہ ہو ان کے نمونوں کے لیے ابن اسحاق کے مختلف صفحات اور زرقانی، سوم، ص ۶ - ۳۷۲۔

(۱۸۲) ابن اسحاق، ص ۳۱ - ۴۲۸؛ واقدی، ص ۹۷۶؛ ابن سعد، اول، ص ۲۹۴؛ طبری، سوم، ص ۱۱۶؛ اسد الغابہ، اول، ص ۳۰ - ۲۲۹؛ نیز ملاحظہ ہو زرقانی، سوم، ص ۳۷۶۔

(۱۸۳) بخاری، لم یکن لہ بواب: نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۲۶ - ۲۴، اس حدیث اور اس کی مختلف تعبیرات وتشریحات پر محدثین کی بحث کے لیے۔

(۱۸۴) واقدی، ص ۸۷۱۔

(۱۸۵) اس واقعہ کے لیے ملاحظہ ہو بخاری، کتاب النکاح، کتاب الطلاق، کتاب العلم وغیرہ: مسلم، باب النکاح؛ ابوداؤد، سنن، باب الامام یصلی من قعود۔

(۱۸۶) ابوداؤد، سنن، مذکورہ بالا باب، کا بیان ہے کہ وہ حضرت عائشہ کی چھت پر واقع ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ باقی مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ماریہ قبطیہ کے باغ میں کوئی باہری کمرہ تھا۔

(۱۸۷) ایضاً: نیز کتانی، اوّل، ص ۲۵ - ۲۴۔

(۱۸۸) انساب الاشراف، اول، ص ۴۸۴ اور طبری، سوم، ص ۱۷۱۔

(۱۸۹) انساب الاشراف، اول، ص ۴۸۴؛ طبری، سوم، ص ۱۷۱؛ کتاب المحبر، ص ۲۵۸؛ نیز ملاحظہ ہو العقد الفرید، سوم، ص ۳۱۶، جو ان کو حاجب قرار دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۲۱۔

(۱۹۰) بخاری، باب الادب ....؛ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۲۳ - ۲۱۔

(۱۹۱) بحوالہ کتانی، اول، ص ۲۱۔ (۱۹۲) اسد الغابہ، سوم، ص ۵ - ۱۶۴۔

(۱۹۳) بحوالہ کتانی، اول، ص ۲۴ - ۲۳ (۱۹۴) ایضاً، ص ۶ - ۲۵۔

(۱۹۵) واقدی، ص ۸ - ۱۹۷، ۲۰۰؛ نیز ملاحظہ ہو باب اول اور باب دوم کے متعلقہ مباحث۔

(۱۹۶) طبری، سوم، ص ۹ - ۲۲۸۔

(۱۹۷) واقدی، ص ۱۱۷۰، کا خیال ہے کہ وادی القریٰ کا علاقہ حجاز میں تھا اور اس کے شمال کا علاقہ حدود شام میں شمار ہوتا تھا۔

(۱۹۸) ملاحظہ ہو زبیری، ص ۸۴ - ۱۷۶؛ جمہرہ، ص ۵ - ۷۳؛ فتوح البلدان، ص ۴۸۔

(۱۹۹) کتاب المحبر، ص ۱۲۶؛ کتانی، اول، ص ۲۲۳-۴ اور ۲۴۶۔

(۲۰۰) کتاب المحبر، ص ۱۲۶۔

(۲۰۱) کتانی، اول، ص ۲۴۶ میں قُرٰی عُرَیْنَہ ہے جو کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال یحییٰ بن آدم، کتاب الخراج، مرتبہ چارلس شیفر (CHARLES SCHEFER)، لیڈن ۱۸۹۶ء، ص ۱۲۲ کا بیان ہے کہ قرٰی عربیہ ایک خاص علاقے (ارض) کا اسم معرفہ تھا۔ اس روایت کے مطابق ایک بار حضرت معاذ بن جبل خزرجی کو "قرٰی عربیہ" سے اس کے صدقات وصول کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ نیز ملاحظہ کیجئے بلاذری، انساب الاشراف، چہارم، حصہ دوم، ص ۱۲۸، جن کا بیان ہے کہ تبوک، خیبر اور فدک کے علاقے "قرٰی عربیہ" کے علاقے تھے جن کے گورنر/والی حضرت عمرو بن سعید اموی تھے۔ بلاذری کی اس روایت میں دو غلطیاں ہیں: اول یہ کہ حضرت عمرو بن سعید اموی مآخذ کے متفقہ بیانات کے مطابق وادی القرٰی کے والی تھے نہ کہ قرٰی عربیہ کے۔ اس میں قرٰی عربیہ کو وادی القرٰی سے خلط ملط کر دیا گیا ہے اور اس کو اسم نکرہ سمجھا گیا ہے جس میں کئی مذکورہ بالا علاقے شامل تھے۔ حالانکہ حقیقت وہ ہے جو یحییٰ بن آدم نے بیان کی ہے۔ دوم یہ کہ خیبر اور فدک کی تبوک سے سیکڑوں میل کی مسافت ہے اور عملی طور سے یہ ممکن نہیں کہ اتنی بڑی ایک ولایت ہوتی۔ بہرحال قرٰی عربیہ کے جغرافیائی محلِ وقوع پر اب تک کسی مآخذ سے کوئی روشنی نہیں پڑ سکی ہے۔ قیاس ہے کہ وادی القرٰی اور تبوک کے بیچ کا خطہ "قرٰی عربیہ" کے اسم خاص سے موسوم تھا۔

(۲۰۲) ابنِ حزم اندلسی کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن سعید اموی کی شہادت بدر میں ہوئی تھی مگر یہ صریحاً غلط ہے کہ دوسرے مآخذ سے ان کے بعد میں زندہ ہونے کا قطعی ثبوت ملتا ہے اور دوسرے تمام مآخذ ان کا نام بدری شہید صحابہ میں نہیں گناتے۔ زبیری کا بیان ہے کہ وہ موتہ میں شہید ہوئے تھے لیکن دوسرے مآخذ سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ اگر زبیری کا بیان صحیح ہے تو ان کی گورنری کی کل مدت محض سال بھر رہی تھی۔ ملاحظہ ہو زبیری، ص ۱۷۴؛ جمہرہ، ص ۷۳؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۳۲۶-۷، ۵۳۴؛ واقدی، ص ۱۴۵-۷، ۷۲-۱۵۲، ۶۹۷؛ انساب الاشراف، اول، ص ۲۹۵-۶؛ اصابہ ۱۷۸۱۔

(۲۰۳) فتوح البلدانؒ، ص ۸۴؛ زبیری، ص ۱۲۴۔ ان دونوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یزید بن سفیان اموی عمرۃ القضیہ کے سال یعنی ۷ھ/۶۲۹ء میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور اسی سال تیماء فتح ہوا تھا جس کی فتح کے برس ہی ان کو اس کا والی مقرر کیا گیا تھا؛ نیز ملاحظہ ہو کتاب المحبر، ص ۱۲۶۔

(۲۰۴) اسد الغابہ، دوم، ص ۳۷۴؛ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۲۴۴-۴۵ اور ۲۹۳، جو ابن قدامہ کی الاُستبصار کی شہادت پر بیان کرتے ہیں کہ ایک بار وہ خیبر کی کھجوروں کی پیداوار کا نصف لے کر مدینہ حاضر ہوئے تھے۔ وہ ان کے عمالہ (گورنری) کا علاقہ تھا۔

(۲۰۵) ملاحظہ ہو مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۱۷-۱۰۵ خاص کر آخری دو صفحات جن کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شمالی پالیسی بڑی پُراسرار بلکہ راز سربستہ تھی۔

(۲۰۶) اسلامی ریاست کی شمالی پالیسی کے لیے ملاحظہ ہو باب دوم بحث بر اسلام قبائل شمالی۔

(۲۰۷) ابن سعد، دوم، ص ۱۴۵، کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا (یستخلفہ) جب آپ طائف کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ مگر طائف سے آپ جب مکہ واپس آئے اور مدینہ کے لیے روانہ ہونے والے تھے تو آپ نے حضرت عتاب بن اسید اموی کو مکہ اور حج کا امیر مقرر کیا تھا (استعملہ)۔ واقدی کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حنین کے لیے ۶ شوال ۸ھ / ۲۷ جنوری ۶۳۰ء کو روانہ ہوئے تھے اور مدینہ کے لیے آپ کی روانگی مکہ یا جعرانہ سے ۱۸ ذیقعدہ ۸ھ / ۸ مارچ ۶۳۰ء کو ہوئی تھی۔ توقیتی اعتبار سے حضرت ہبیرہ بن شبل ثقفی کی گورنری مکہ کی کل مدت ایک ماہ بارہ دن رہی تھی۔ نیز ملاحظہ ہو اسد، چہارم، ص ۵۵۔ دوسری طرف واقدی، ص ۸۸۹ اور ۹۵۹ کا بیان ہے کہ حنین کے غزوہ کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی سے قبل حضرت عتاب بن اسید کی بطور والی مکہ تقرری ہوئی تھی۔ لیکن واقدی کے اس بیان کی خود اس کے دوسرے بیان سے تردید ہوتی ہے جس کے مطابق وہ حضرت عتاب کی تقرری کا زمانہ مدینہ کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کو قرار دیتا ہے۔ اس سے بالواسطہ سہی مگر ابن سعد اور اسد کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔ کتانی نے بھی حضرت ہبیرہ بن شبل کی تقرری کا حوالہ نہیں دیا ہے ملاحظہ ہو اس بحث پر اس کی چوتھی فصل، ص ۲۴۰-۲۴۶؛ نیز ملاحظہ ہو ازرقی، ص ۱۲۷-۱۲۸، جن کا خیال ہے کہ حضرت عتاب کی تقرری جنگِ حنین سے قبل ہوئی تھی؛ نیز دیکھئے ابن قتیبہ دینوری، المعارف، ص ۱۶۳؛ ابن سعد، پنجم، ص ۴۴۶۔

(۲۰۸) ابنِ ہشام، سوم، ص ۵۰۰؛ طبری، سوم، ص ۷۳، ۹۴؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۱۸ اور ابن سعد، دوم، ص ۱۳۷-

(۲۰۹) ابن ہشام، سوم، ص ۴۴۰، ۵۰۰؛ واقدی، ص ۸۸۹، ۹۵۹؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۴۵؛ انساب الاشراف، اول، ص ۵۲۸؛ فتوح البلدان، ص ۵۳؛ زبیری، ص ۱۸۷؛ ازرقی، ص ۱۲۷-۱۲۸؛ جمہرہ، ص ۱۰۴؛ فاکہی، ص ۳۶، ۴۰؛ نیز ملاحظہ ہو کتاب المحبر، ص ۱۲۶۔

(۲۱۰) جمہرہ، ص ۱۰۴؛ اسد، سوم، ص ۳۵۸-۳۵۹۔ نیز ملاحظہ ہو زبیری، ص ۱۸۷؛ انساب الاشراف، اول، ص ۵۲۹۔ اور فاکہی، ص ۳۵۔ نیز ملاحظہ ہو ابن قتیبہ، مذکورہ بالا، ص ۲۸۳۔

(۲۱۱) فاکہی، ص ۴۰۔ لیکن اسد الغابہ، سوم، ص ۳۵۸-۳۵۹ کا بیان ہے کہ ان کو روزانہ تنخواہ صرف دو درہم ملتی تھی۔ جس کا مطلب ہوا کہ ان کی ماہانہ تنخواہ ۶۰ درہم اور سالانہ آمدنی ۷۲۰ درہم تھی۔ لیکن اگر ایک اوقیہ چاندی میں چالیس درہم ہوتے تھے جیسا کہ کتانی کا خیال ہے تو ان کی تنخواہ سولہ سو درہم سالانہ تھی یعنی ۱۳۳ ۲/۳ درہم ماہانہ یا ۴ ۴/۹ درہم روزانہ۔ ایک اور روایت کا اصرار ہے کہ ان کی تنخواہ صرف ایک درہم روزانہ تھی۔ جبکہ ایک اور روایت کا مدعا یہ ہے کہ ان کو کچھ بھی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۲۴۴۔ سکوں اور اوزان کے لیے ملاحظہ ہو

مقریزی، النقود الاسلامیۃ، مرتبہ محمد السید علی، نجف ۱۹۶۷ء؛ اور شذور العقود، مرتبہ ایل اے میئر، اسکندریہ ۱۹۳۳ء؛ اے، ایم، کرملی، النقود العربیۃ، قاہرہ ۱۹۳۹ء؛ نیز جہشیاری، کتاب الوزراء والکتاب، قاہرہ ۱۹۳۸ء؛ ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ، لیڈن، ص ۱۰۵۱-۶۷؛ نیز ملاحظہ ہو بلاذری، فتوح البلدان، ص ۴۵۱-۶۔

(۲۱۲) ابن ہشام، سوم، ص ۵۴۰؛ واقدی، ص ۹۶۸؛ ابن سعد، اول، ص ۳۱۳؛ چہارم، ص ۵۰۸-۹؛ فتوح البلدان، ص ۷۰؛ انساب الاشراف، اول، ص ۵۲۹؛ کتاب المحبر، ص ۱۲۷؛ طبری، سوم، ص ۹۹؛ نیز ملاحظہ کیجیے اسد، سوم، ص ۲۷۲-۴؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۱۲؛ کتانی، اول، ص ۲۴۳ اور دیکھیے ابن قتیبہ، مذکورہ بالا، ص ۲۶۸-۹۔

(۲۱۳) ابن اسحاق، ص ۶۱۶، ابن ہشام، سوم، ص ۵۴۰۔ اس زمانے میں اسلامی یا مذہبی تعلیم و تفقہ کا مطلب تھا قوانین و دستور کی سمجھ۔ پھر ثقیف کے وفد میں ان کی شمولیت ان کی فراست اور ذہانت کی دلیل تھی۔ اس کے علاوہ واقعاتی شہادت ان کی قائدانہ صلاحیتوں اور لیاقتوں کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ جس کے مطابق وہ خلافتِ صدیقی اور خلافت فاروقی میں بحرین اور عمان کی حیثیت سے اور اس سے قبل آٹھ برس تک مکہ کے گورنر کی حیثیت سے کام کر چکے تھے۔ گورنری پر اتنے طویل زمانے پر فائز رہنا بجائے خود ایک بڑا کارنامہ تھا۔

(۲۱۴) ابن سعد، پنجم، ص ۵۲۷۔

(۲۱۵) اسد الغابہ، سوم، ص ۳۵۰؛ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۲۴۱۔

(۲۱۶) ابن سعد، چہارم، ص ۵۶-۷۰، کا خیال ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارث بن نوفل ہاشمی کو مکہ کے بعض ماتحت علاقوں (اعمال) پر مقرر کیا تھا اور حضرات ابوبکر، عمر اور عثمان کی خلافت کے زمانے میں اس عہدے پر بحال رہے تھے تا آنکہ وہ انتقالِ وطن کر کے بصرہ جا بسے تھے۔ ان کی ترکِ سکونت کا زمانہ حضرت عثمان غنی کی خلافت کا آخری زمانہ معلوم ہوتا ہے؛ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۲۴۱-۴۲۔

(۲۱۷) ابن ہشام، دوم، ص ۶۰۷؛ واقدی، ص ۷۸۸؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۱؛ انساب الاشراف، اول، ص ۵۲۹-۳۰؛ فتوح البلدان، ص ۸۰، اور طبری، سوم، ص ۹۵۔

(۲۱۸) کتاب المحبر، ص ۱۲۶۔ حضرت علاء بن حضرمی کی تقرری اور مدتِ گورنری کے بارے میں خاصا اختلاف بلکہ ابہام ہے ملاحظہ ہو فتوح البلدان، ص ۹۲ اور آیندہ بحث بھی۔

(۲۱۹) فتوح البلدان، ص ۹۲؛ نیز ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اول، ص ۵۲۹؛ اسد، اول، ص ۳۵-۷۰؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۳۳-۳۴، ۸۴۴؛ کتانی، اول، ص ۲۴۶۔ موخر الذکر نے حافظ زین الدین عراقی کے حوالے سے یہ روایت بیان کی ہے کہ حضرت ابان بن سعید اموی کو الخط علاقہ کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ کتانی نے اس ضمن میں حضرت علاء بن حضرمی کا نام بالکل نہیں لیا ہے۔

(۲۲۰) ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۲۹ - ۳۲ اور باب پنجم بحث بر صدقات و جزیہ۔

(۲۲۱) ابن سعد، چہارم، ص ۱۲۷ (۲۲۲) اسد، اول، ص ۴۰۰

(۲۲۳) اسد، اول، ص ۲۹۷۔ (۲۲۴) ایضاً، ص ۲۹۸

(۲۲۵) ایضاً، ص ۱۲ - ۳۱۱ ؛ نیز ملاحظہ ہو زبیری، ص ۹۳ ؛ جمہرہ، ص ۶۶ ؛ اصابہ ۱۲۵۶۔

(۲۲۶) ابن سعد، اول، ص ۹ - ۲۷۸ ؛ نیز ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۳۴ - ۳۳ ؛ اسد، اول، ص ۹۴، ۱۲-۳۱۱، ۸ - ۲۹۷۔

(۲۲۷) نجران کے معاہدۂ صلح کے لیے ملاحظہ ہو فتوح البلدان، ص ۷۹ - ۷۵، مجموعۃ الوثائق، ص ۹۶ - ۸۰ اور باب پنجم، بحث بر جزیہ۔

(۲۲۸) ابن ہشام، دوم، ص ۱۶ - ۲۱۵ ؛ نیز ملاحظہ کیجئے بخاری، کتاب المغازی ؛ فتح الباری، ہفتم، ص ۷۴ ؛ ابن ماجہ، سنن، اول، ص ۳۲۔

(۲۲۹) ابن اسحاق، ص ۲۷۷ ؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، سوم، ص ۱۲ - ۴۱۱۔

(۲۳۰) ابن اسحاق، ص ۲۷۷ ؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۳۷۔

(۲۳۱) ابن سعد، سوم، ص ۴۱۲ ؛ نیز دیکھئے اسد، پنجم، ص ۲۴۹ ؛ اصابہ ۴۲۹۳۔

(۲۳۲) ابن ہشام، سوم، ص ۵ - ۵۹۴ ؛ فتوح البلدان، ص ۸۰ ؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۰ - ۵۲۹ ؛ طبری، سوم، ص ۱۲۸ ؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۴۳ ؛ نیز دیکھیے اسد، چہارم، ص ۹ - ۶۸ جس کا بیان ہے کہ تقرری کے وقت صحابی موصوف کی عمر صرف سترہ سال کی تھی۔ مزید ملاحظہ کیجئے حضرت خالد بن ولید مخزومی کے کام کے لیے مجموعۃ الوثائق، ص ۷۳ - ۷۱ ؛ نئے گورنر کو ہدایات نبوی کے لیے ایضاً، ص ۹ - ۱۰۴۔

(۲۳۳) فتوح البلدان، ص ۸۰ ؛ نیز ملاحظہ ہو اسد، دوم، ص ۱۳ - ۱۲ جس کا بیان ہے کہ حضرت ابو سفیان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک جرش کی گورنری پر فائز رہے اور آپ کی وفات کے بعد ہی مدینہ واپس آئے تھے مگر انساب الاشراف، اول، ص ۵۲۹ کے مطابق واقدی کی رائے ہے کہ حضرت ابو سفیان وفاتِ نبوی کے وقت مدینہ میں موجود تھے جبکہ کلبی کی رائے ہے کہ وہ اس وقت جرش میں تھے ؛ نیز ملاحظہ ہو اسد، چہارم، ص ۹ - ۶۸۔

(۲۳۴) فتوح البلدان، ص ۷۰ ؛ نیز ملاحظہ کیجئے انساب الاشراف، اول، ص ۳۰ - ۵۲۹ کا بیان ہے کہ ایک روایت کے مطابق حضرت یزید بن ابی سفیان اموی کو اور ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت عوف بن مالک کو نجران بھیجا گیا تھا۔

(۲۳۵) اسد الغابہ، دوم، ص ۳۱۵۔

(۲۳۶) ان کے قبولِ اسلام کے لیے ملاحظہ کیجئے ابن اسحاق، ص ۹ - ۶۵۸ ؛ طبری، سوم، ص ۸ - ۲۲۷ ؛ اسد، اول، ص ۱۶۳ ؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۴۳ ؛ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۴۱ - ۲۴۰۔ ایک روایت سے معلوم

ہوتا ہے کہ انھوں نے خسرو پرویز کے قتل کے فوراً بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔ یعنی ۶۲۸ء کے بعد۔

(۲۳۷) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۲-۱۲۱، کا خیال ہے کہ وہ مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کا اسلام دراصل سیاسی وفاداری اور سیاسی اتحاد تھا۔ مستشرق موصوف دراصل سرحدی علاقوں کے تمام سرداروں کے اسلام کو مذہبی تبدیلی کے بجائے سیاسی تبدیلی سمجھتے ہیں۔

(۲۳۸) طبری، سوم، ص ۸ - ۲۲، کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن اور اس کے تمام ماتحت علاقوں (مخالیف) پر حضرت باذان کے اقتدار کو تسلیم کر لیا تھا اور ان کے ساتھ حکومت میں کسی اور کو شریک نہیں کیا تھا؛ نیز ملاحظہ فرمائیے ابن خلدون اول، ص ۸۴۳؛ اسد الغابہ، اول، ص ۱۶۳۔

(۲۳۹) اسد الغابہ، سوم، ص ۶؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۴۳؛ نیز ملاحظہ کیجئے ابن اسحاق، ص ۶۵۹؛ طبری، سوم، ص ۲۲۸؛ کتانی، اول، ص ۲۴۱۔

(۲۴۰) طبری، سوم، ص ۹ - ۲۲۸، کا بیان ہے کہ ان میں ہر ایک کو ایک مخصوص علاقے (حیز) پر مقرر کیا گیا تھا۔

(۲۴۱) مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے شبلی نعمانی، سیرت النبی، دوم، ص ۲۴؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۳۰-۲۲۷۔ موخر الذکر کا بیان ہے کہ "معاذ بن جبل کو پورے یمن اور حضرموت کے ان علاقوں میں جو دوسرے نمائندوں (AGENTS) کو سپرد کیے گئے تھے بعض فرائض سونپے گئے تھے۔ ان فرائض میں مذہب اسلام کی تعلیم دینا اور کم از کم کچھ علاقوں میں صدقات وصول کرنا شامل تھا۔ لیکن مقامی نمائندوں کی نگرانی کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔" مستشرق موصوف کا یہ بیان تاریخی شواہد کے خلاف اور غلط ہے۔ اوپر کی بحث سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت معاذ کو ان تمام علاقوں میں مذہبی، سیاسی اور انتظامی اختیارات حاصل تھے اور مقامی منتظمین اور دوسرے گورنروں کے کاموں کی نگہداشت بھی ان کے فرائض میں سے تھی کہ وہ گورنر جنرل تھے۔

(۲۴۲) ابن اسحاق، ص ۶۴۳؛ نیز ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۱۱۱؛ فتوح البلدان، ص ۸۱ نے حضرت معاذ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادوں کا "امیر" کہا ہے۔

(۲۴۳) فتوح البلدان، ص ۸۰، دوسرے صفحہ پر ایک روایت ہے کہ ان کو یمن کے صدقات پر مامور کیا گیا تھا، ص ۸۳-۸۲ پر ان کے عدلیاتی / عدالتی اور انتظامی فرائض و اختیارات بتائے گئے ہیں۔

(۲۴۴) انساب الاشراف، اول ص ۵۲۹۔

(۲۴۵) ابن ہشام، سوم، ص ۵۹۰۔

(۲۴۶) ابن سعد، اول، ص ۵ - ۲۶۴۔

(۲۴۷) بخاری، صحیح، باب وجوب الزکاۃ۔

(۲۴۸) اسد، چہارم، ص ۸ - ۳۷۶؛ نیز ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۱۱۹ جس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے حضرت معاذ کو ایک گرامی نامہ بھیجا تھا جس میں حضرت ابو مکنف عبد الرضا خولانی کے معاملہ میں کوئی ہدایت دی گئی تھی۔

(۲۴۹) ابن خلدون، اول، ص ۸۲۵-۲۶۔

(۲۵۰) طبری، سوم، ص ۲۲۸۔

(۲۵۱) معلم کے معانی کے لیے ملاحظہ ہو لسان العرب، متعلقہ لفظ؛ "ہنس وہر" عربک - انگلش ڈکشنری، اور عبد الحفیظ بلیاوی، مصباح اللغات۔

(۲۵۲) طبری، سوم، ص ۲۳۵، کی روایت کے مطابق جنوبی عرب کے تمام والی اسود عنسی کی بغاوت کے خاتمے کے فوراً بعد یعنی حیاتِ نبوی میں ایک مقام پر جمع ہوئے تھے اور ان کی (امارۃ) پر اتفاق کر لیا تھا - اور پھر وہ سب اپنے اپنے علاقوں کو واپس چلے گئے تھے۔

(۲۵۳) ابن سعد، سوم، ص ۵۸۴۔

(۲۵۴) ملاحظہ فرمائیے کتانی، اول، ص ۲۴۱۔

(۲۵۵) طبری، سوم، ص ۲۲۹-۳۰ وغیرہ؛ نیز ملاحظہ ہو مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۲۸۔

(۲۵۶) طبری، سوم، ص ۱۴۷ کی ایک روایت کہ جنوبی عرب کے "امیروں" اور "عاملوں" کی روانگی سنہ ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں ہوئی تھی ناقابلِ قبول معلوم ہوتی ہے۔

(۲۵۷) طبری، سوم، ص ۲۲۸-۹۔

(۲۵۸) طبری، سوم، ص ۲۲۸-۹؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۴۳؛ نیز ملاحظہ ہو اسد، سوم، ص ۸۳۔

(۲۵۹) فتوح البلدان، ص ۸۰؛ نیز ملاحظہ ہو اسد، پنجم، ص ۲۰۸؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۴۳؛ بخاری، کتاب وجوب الحج وفضائلہ؛ ابن سعد، چہارم، ص ۱۰۵-۱۲۔

(۲۶۰) طبری، سوم، ص ۲۲۸؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، چہارم، ص ۹۶؛ اسد، دوم، ص ۶۲-۶۴؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۴۳۔ مزید دیکھیے فتوح البلدان، ص ۸۰ اور انساب الاشراف، اول، ص ۵۲۹ جن کے مطابق حضرت خالد بن سعید اموی کو صنعاء اور اس کے ماتحت علاقے سونپے گئے تھے۔ ممکن ہے کہ حضرت شہر کے انتقال کے بعد یہ انتظام ہوا ہو۔

(۲۶۱) طبری، سوم، ص ۲۲۸؛ اسد، سوم، ص ۵۰؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۴۳۔

(۲۶۲) طبری، سوم، ص ۲۲۸؛ اسد، پنجم، ص ۱۲۸-۹؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۴۳۔

(۲۶۳) ابن ہشام، سوم، ص ۶۰۰؛ فتوح البلدان، ص ۸۰؛ انساب الاشراف، اول، ص ۵۲۹؛ طبری، سوم، ص ۲۲۸؛ اسد، دوم، ص ۲۱۷؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۴۳؛ نیز ملاحظہ ہو کتاب المحبر، ص ۱۸۶؛ کتانی، اول، ص ۲۴۵۔

(۲۶۴) طبری، سوم، ص ۹ - ۲۲۸ ؛ اسد، چہارم، ص ۲۳ - ۲۲ ۴ ؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۴۳ ؛ کتانی، اول، ص ۲۴۵ -

(۲۶۵) طبری، سوم، ص ۹ - ۲۲۸ ؛ اسد، پنجم، ص ۲ ؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۴۳ ؛ نیز کتانی، اول، ص ۲۴۳ -

(۲۶۶) طبری، سوم، ص ۲۲۸، کا مزید بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن اور حضرموت کے علاقوں کی وضاحت کی تھی اور ان میں سے ہر ایک مخصوص علاقے کو ان امیروں کے سپرد کیا تھا۔

(۲۶۷) ابن اسحاق، ص ۶۴۳ ؛ طبری، سوم، ص ۱۲۱ ؛ فتوح البلدان، ص ۸۱ ؛ نیز ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۱۱۱ -

(۲۶۸) اسد، سوم، ص ۳۵۱ -

(۲۶۹) اسد، سوم، ص ۱۵۵ ؛ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۲۴۵، جنھوں نے نووی کی تہذیب کی بنیاد پر کہا ہے کہ حضرت عبداللہ مخزومی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے الجند اور اس کے ماتحت علاقوں پر (امیر) مقرر کیا تھا اور وہ حضرت عثمان کی خلافت تک وہاں تعینات رہے۔ یقیناً وہ امیر (گورنر / والی) نہیں تھے جیسا کہ نووی اور کتانی ہم کو یقین دلانا چاہتے ہیں۔ ان کی حیثیت ایک صوبائی سالار فوج کی تھی جو علاقہ کے گورنر جنرل کا ماتحت تھا۔ مزید دیکھئے زبیری، ص ۳۱۷ ؛ اصابہ ص ۵۹۶، ۴۶۶۲ ؛ الاستیعاب، دوم، ص ۹۹ - ۲۹۸ ؛ جمہرہ، ص ۱۳۷ -

(۲۷۰) انساب الاشراف، اول، ص ۵۲۹ ؛ نیز فتوح البلدان، ص ۸۰ -

(۲۷۱) ابن سعد، سوم، ص ۵۸۴ ؛ ترمذی، سنن -

(۲۷۲) ابن اسحاق، ص ۶۴۴ ؛ ابن سعد، سوم، ص ۵۸۴ وغیرہ -

(۲۷۳) ابن اسحاق، ص ۶۴۴ ؛ مسلم، کتاب الایمان -

(۲۷۴) ابن سعد، سوم، ص ۵۸۴ وغیرہ -

(۲۷۵) ملاحظہ ہو واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۲۸، کا خیال ہے کہ امکان یہ ہے کہ نقل کے دوران ان ہدایات میں کافی تغیر و تبدل اور اضافہ ہوا ہے۔ اور وہ عہد نبوی کے زمانے میں رائج طریقوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ واٹ کا یہ شبہ بے بنیاد ہے۔

(۲۷۶) ابن اسحاق، ص ۸ - ۶۴۷ ؛ ابویوسف، کتاب الخراج، ص ۲۱ - ۲۰ ؛ مجموعۃ الوثائق، ص ۸ - ۱۰۴ ؛ نیز ملاحظہ ہو واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۲۸ -

(۲۷۷) کتانی، اول، ص ۲۴۵ -

(۲۷۸) انساب الاشراف، اول، ص ۳۰۴ -

(۲۷۹) ازرقی، ص ۸ - ۱۲۷ -

(۲۸۰) ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق ۔ ص ۸-۵۶ ، ۶۲-۶۱ ، حضرت منذر بن ساویٰ کے نام ہدایاتِ نبوی کے لیے ؛ ص ۶۹ جیفر بن عبد کے نام ہدایات کے لیے ۔ خطِ نبوی ، ۵۵ میں ہے کہ "میرے فرستادوں (رسل) کی اطاعت میری اطاعت کے مترادف ہے ۔" خط ۵۸ میں جو حضرت منذر بن ساویٰ نے بارگاہِ نبوی میں بھیجا تھا انھوں نے اپنے غیر مسلم باشندوں کے اسلامی ریاست میں مقام و مرتبے کے بارے میں سوالات پوچھے تھے اور آپ کا فیصلہ چاہا تھا ۔ اسی طرح خط ۵۹ اور ۶۰ ہجر کے لوگوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ آپ کے امیروں کی اطاعت کریں ۔ خط ۶۳ حضرت منذر بن ساویٰ سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ صدقات و جزیہ کی رقم جو انھوں نے اپنے علاقہ میں جمع کی ہے مدینہ کے دو مرکزی نمائندوں حضرات ابوہریرہ اور قدامہ کے حوالے کر دیں ۔ یہی خط ۶۴ حضرت علاء ابن حضرمی گورنر بحرین سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ صدقات ، جزیہ اور عشور کی تمام رقوم حضرت منذر بن ساویٰ سے وصول کر کے مذکورہ بالا دونوں مرکزی نمائندوں کے حوالے کر دیں ۔

(۲۸۱) ایضاً ، ص ۶۲ (۲۸۲) ایضاً ، ص ۸-۶۷ ۔

(۲۸۳) ایضاً ، ص ۸۲-۸۰ ۔ خط ۹۴ اہل نجران کے لیے ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ "میرے رسل (فرستادوں) کی طاعت اور مدد کریں ۔" نیز ملاحظہ ہو ص ۸۴-۸۳ ۔

(۲۸۴) ایضاً ، ص ۲-۱۱۱ (۲۸۵) ایضاً ، ص ۱۵-۱۱۴

(۲۸۶) ایضاً ، ص ۲۸-۱۲۶ ، ۳۰-۱۲۹ ۔ (۲۸۷) ایضاً ، ص ۱۳۱ ۔

(۲۸۸) ایضاً ، ص ۱۵۷ ۔ یہ گرامی نامہ قضاعہ کے لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ دو مرکزی منتظموں حضرات ابی اور عنبسہ کو صدقات ادا کریں ۔

(۲۸۹) ایضاً ، ص ۸-۱۶۶ (۲۹۰) ایضاً ، ص ۹-۱۶۷

(۲۹۱) ایضاً ، ص ۷-۱۷۶ ۔ اس گرامی نامے نے بنو اسد کے لوگوں کو تمام معاملات میں مرکزی منتظم حضرت قضاعی بن عمرو کے فیصلوں کو بخوشی قبول کرنے کا حکم دیا تھا ۔

(۲۹۲) واقدی ، ص ۱۵۶ ؛ نیز اسد ، اول ، ص ۱۱۵ ۔

(۲۹۳) اسد ، دوم ، ص ۱۳۴ ؛ سوم ، ص ۱۰۴ بالترتیب ۔

(۲۹۴) ابن ہشام ، دوم ص ۴۹۱ ؛ واقدی ، ص ۹۵۵ ؛ ابن سعد ، اول ، ص ۳۱۲ ؛ طبری ، سوم ، ص ۹-۸۸ ؛ نیز اسد ، چہارم ، ص ۲۹۰ ؛ ابن خلدون ، اول ، ص ۸۱۸ ۔

(۲۹۵) ابن ہشام ، دوم ، ص ۶۰۰ ؛ ابن سعد ، اول ، ص ۳۲۲ ؛ طبری ، سوم ، ص ۱۴۷ ؛ نیز ملاحظہ ہو اسد ، سوم ، ص ۴-۳۹۲ ؛ ابنِ خلدون ، اول ، ص ۸۴۳ ۔

(۲۹۶) ملاحظہ ہو ضمیمہ دوم - ۸

(۲۹۷) ایضاً، ضمیمہ دوم - ۹ ؛ نیز دیکھئے طبری، سوم، ص ۷ - ۱۳۶، اور ص ۱۹ - ۱۱۵ بالترتیب۔

(۲۹۸) قرآن کریم، سورہ الاعراف، آیت ۱۶۰ ؛ نیز ملاحظہ کیجئے ترجمہ مولانا اشرف علی ؛ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن رچرڈ بیل، دی قرآن، ایڈنبرا، ۱۹۳۷ء، اول، ص ۱۵۲۔

(۲۹۹) قرآن کریم، سورہ مائدہ، آیت ۱۵ ؛ طبری، تفسیر، جلد دہم، ص ۱۸ - ۱۰۹ ؛ نیز رچرڈ بیل، اول، ص ۹۵۔

(۳۰۰) دی بائبل (انجیل مقدس) اعداد (NUMBERS)، باب اول، آیات ۲ اور ۴ - آیات ۱۵ - ۵ بارہ یہودی نقیبوں کے نام بیان کرتی ہیں ؛ نیز ملاحظہ کیجئے کتاب المحبر، ص ۴۶۴ ؛ طبری، تاریخ، اول، ص ۳۰ - ۴۲۹ ان کے مسلم مآخذ میں ناموں کے لیے۔

(۳۰۱) ایضاً، آیت ۱۶ (۳۰۲) ایضاً

(۳۰۳) رچرڈ بیل، مذکورہ بالا، اول، ص ۹۵، حاشیہ ۴۔

(۳۰۴) سینٹ میتھیوز، دہم، آیات ۱ تا ۴ - ان کے ناموں کے لیے مسلم مآخذ دیکھیے کتاب المحبر، ص ۵ - ۴۶۴۔

(۳۰۵) ایضاً، آیات ۷ - ۵ - حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنے شاگردوں کو مکمل ہدایات کے لیے ملاحظہ کیجئے باب دہم، آیات ۸ تا ۴۲۔

(۳۰۶) ابن اسحاق، ص ۲۰۴

(۳۰۷) ابن سعد، سوم ص ۳ - ۶۰۲۔

(۳۰۸) انساب الاشراف، اول، ص ۲۵۴۔

(۳۰۹) کتاب المحبر، ص ۷ - ۴۶۴۔

(۳۱۰) طبری، دوم، ص ۳۶۳

(۳۱۱) انساب الاشراف، اول، ص ۲۵۴۔

(۳۱۲) ابن اسحاق، ص ۲۰۴۔

(۳۱۳) ابن اسحاق، ص ۲۰۴ ؛ ابن سعد، سوم، ص ۶۰۲ ؛ طبری، دوم ص ۳۶۳ ؛ نیز ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اول ص ۲۵۴، کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مقرر کیا تھا یا ان کے نام لیے تھے صحیح نہیں ہے۔

(۳۱۴) ایضاً۔

(۳۱۵) ابن سعد، سوم، ص ۳ - ۶۰۲ ؛ انساب الاشراف، اول، ص ۲۵۴ ؛ فتوح البلدان، ص ۲۰۔

(۳۱۶) انساب الاشراف، اول، ص ۲۵۴۔

(۳۱۷) ملاحظہ ہو ضمیمہ دوم - ۱۰ ؛ نیز ابن سعد، سوم، ص ۶۶ - ۶۰۳۔

(۳۱۸) ابن اسحاق، ص ۱۲ - ۲۰۹ ؛ انساب الاشراف، اول، ص ۴۸ - ۲۴۰۔

(۳۱۹) مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۴۸۔ (۳۲۰) ایضاً۔

(۳۲۱) ابن سعد، سوم، ص ۶۱۱ ؛ انساب الاشراف، اول، ص ۲۴۳۔

(۳۲۲) انساب الاشراف، اول، ص ۲۴۶ ؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، سوم، ص ۶۱۹۔

(٣٢٣) اسد الغابہ، اول، ص ٤، ١٨٣۔

(٣٢٤) اسد الغابہ، چہارم، ص ٩٥-٩٣۔

(٣٢٥) اسد الغابہ، دوم، ص ٢-١٥١۔

(٣٢٦) اسد الغابہ، چہارم، ص ٣٦٧۔

(٣٢٧) عباسی نقیبوں کے لیے ملاحظہ کیجئے خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، تہران اڈیشن غیر مورخہ، دوم، ص ١٦٤؛ ہفتم ص ٣٦٠، ٣٧٩؛ نہم، ص ٣٠٧؛ دوازدہم، ص ٢٢٧؛ طبری، چہارم، ص ٥٦٢ وغیرہ؛ ابن اثیر، الکامل، پنجم، ص ٥٣، ٦-٢٥٥ اور ٣٠٨۔

علوی نقیبوں کے لیے ملاحظہ کیجئے؛ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، یازدہم، ص ٤٠٢؛ الکامل، ہشتم، ص ٦-٥٦٥، ١٠، ٧؛ نہم، ص ٢٥، ٧٧، ١٠٥، ٢١٩، ٢٤٢، ٢٦٣، ٤٤٥، ٥١٣، ٥٢٦، ٥٩٦؛ ابن طولون، قضاۃ دمشق، دمشق ١٩٦٤ء، ص ٤١-٤٠۔

(٣٢٨) عباسی انقلاب کے داعیوں کے لیے ملاحظہ کیجئے؛ فاروق عمر، طبیعۃ الدعوۃ العباسیۃ، بیروت ١٩٧٠ء؛ نیز دلہاوزن مذکورہ بالا، آخری دو باب۔

(٣٢٩) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عدالتی فیصلوں پر مبسوط کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کتانی، اول، ص ٣-٢٥١ نے اس موضوع پر ایک خاص فصل باندھی اور ان میں سے بیشتر کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ذیل میں ان میں سے کچھ کتابوں کے نام درج ہیں:

(الف) ابن الطلاع، "کتاب اقضیۃ رسول اللہ"۔ یہ کتاب مندرجہ ذیل کتاب (ب) پر مبنی ہے۔

(ب) ابوبکر ابن ابی شیبہ، "کتاب اقضیۃ رسول اللہ"۔

(ج) ظہیر الدین علی بن عبد العزیز المرغینانی الحنفی (متوفی ٥٠٦ھ / ١١١٢-١٣ء) "کتاب اقضیۃ الرسول"۔ اس کتاب پر متعدد حواشی اور شروح لکھی گئیں۔

(د) ابن ابی مروان اشبیلی (متوفی ٥٤٩ھ / ١١٥٤ء) "المنتخب المنتقی"۔ مندرجہ ذیل کتاب (س) اس پر مبنی ہے۔

(س) ابو محمد عبد الحق اشبیلی کی تصنیف۔

(ص) ابو علی حسین بن المبارک الموصلی (متوفی ٧٤٢ھ / ١٣٤١ء)، "الفتاوی النبویۃ فی المسائل الدینیہ و الدنیویۃ"۔

(ط) ابن قیم الدمشقی (شمس الدین محمد بن ابی بکر) (متوفی ٧٥١ھ / ١٣٥٠ء)، "اعلام الموقعین عن رب العالمین"۔

(ع) سید صدیق حسن خاں بھوپالی (متوفی ١٣٠٧ھ / ١٨٨٩ء) "بلوغ الصول فی اقضیۃ الرسول"۔

اس موضوع پر قدیم و جدید مورخین اور محققین نے جن میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں، متعدد کتابیں لکھی ہیں۔

اتنی بڑی تعداد میں اس موضوع پر کتابوں کا لکھا جانا بلا ریب ثابت کرتا ہے کہ عہدِ نبوی میں عدالتی ارتقاء ہو چکا تھا چاہے اس کی شکل بالکل ابتدائی رہی ہو۔

(۳۳۰) مذکورہ بالا (۳۳۱) ایضاً، ص ۵۶-۲۵۳۔

(۳۳۲) ایضاً، ص ۶۴-۲۵۶ (۳۳۳) ایضاً، ص ۲۵۸۔

(۳۳۴) کتاب المحبر، ص ۸-۱۲۵، ان کے لیے لفظ "امراء" استعمال کرتی ہے جبکہ فتوح البلدان، ص ۸۰ کا بیان ہے کہ حضرت معاذ کو "قضا" کا عہدہ سونپا گیا تھا۔ انساب الاشراف، اول، ص ۵۲۹، نے ایسے عدالتی کارکنوں کا ذکر "عمال" میں کیا ہے اور حضرت معاذ کا نام ان میں شامل ہے۔ نیز ملاحظہ کیجئے ابن اسحاق، ص ۶۴۴؛ ابن ہشام ص ۵۹۰؛ ابن سعد، اول، ص ۵-۲۶۴؛ طبری، سوم، ص ۱۲۱، ۹-۲۲۸؛ بخاری، باب وجوب الزکاۃ؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۸-۳۷۶؛ نیز کتانی، اول، ص ۲۴۰ وغیرہ۔

(۳۳۵) کتانی، اول، ص ۲۵۸۔ (۳۳۶) ایضاً، ص ۲۵۹۔ (۳۳۷) ایضاً

(۳۳۸) ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، مرتبہ سید احمد خاں، کلکتہ ۱۸۶۲ء، ص ۷-۳۱۶۔

(۳۳۹) کتانی، اول، ص ۵-۲۸۴۔ (۳۴۰) ایضاً

(۳۴۱) ایضاً۔ کسی شے کا بغیر تولے، ناپے اور شمار کیے یوں ہی ڈھیری کی شکل میں خریدنا یا بیچنا مجازفہ کہلاتا ہے۔

(۳۴۲) ایضاً (۳۴۳) ایضاً

(۳۴۴) طبقات، دوم، ص ۱۴۵۔ نیز ملاحظہ کیجئے محمد بن حبیب بغدادی، کتاب المنمق، ص ۵۲، جس کا بیان ہے کہ مکہ میں روزانہ بازار لگتا تھا۔

(۳۴۵) ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۲۸۷۔

(۳۴۶) ملاحظہ ہو باب پنجم بحث اقتصادی دولت مہاجرین و انصار۔

(۳۴۷) واقدی، ص ۹۰-۹۸۹۔

باب پنجم

(۱) ملاحظہ کیجئے محمد تقی امینی، اسلام کا زرعی نظام، علی گڑھ ۱۹۸۰ء؛ سید ابو الاعلیٰ مودودی، معاشیات اسلام، مرتبہ خورشید احمد، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۱۹۸۱ء۔

(۲) مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۸-۲۰۵؛ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، ص ۹۶-۸۶۔

(۳) سید جلال الدین عمری، "کمزور کے مسائل اسلام نے حل کئے ہیں"، تحقیقات اسلامی، جنوری ۱۹۸۲ء، ص ۸۹-۹۳۔

(۴) مذکورہ بالا صحابہ کرام کی مکی عہد میں دولتمندی کے لیے ملاحظہ کیجئے: بلاذری، انساب الاشراف، اول، ص ۲، ۲۶۱، ۲۷۰ وغیرہ؛ ابن سعد، سوم، ص ۶۰، ۲۶-۱۲۵، ۳-۱۶۲، ۲۱۵، ۲۲۸، ۲۷۲؛ ابن اسحاق، انگریزی ترجمہ ص ۱۷-۲۱۹، ۲۲۳؛ نیز ملاحظہ کیجئے مارگولیتھ MUHAMMAD AND THE RISE OF ISLAM، لندن ۱۹۰۵ء، ص ۹۶، ۱۰۰-۹۹، ۱۰۱؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، دوم، ص ۱۹۱ وغیرہ؛ نیز خاکسار کا مضمون "کیا مہاجرین مکہ خالی ہاتھ مدینہ آئے تھے؟" تحقیقاتِ اسلامی، اپریل۔ جون ۱۹۸۳ء، ص ۲۳-۱۴۔

(۵) خاکسار کا مضمون "کیا مہاجرینِ مکہ خالی ہاتھ مدینہ آئے تھے؟" (۶) ایضاً

(۷) انساب الاشراف، اول، ص ۲۶۱۔ (۸) ایضاً

(۹) اس بحث کے لیے ملاحظہ ہو مہاجرین پر خاکسار کا مضمون مذکورہ بالا۔ نیز "عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں: محرکات، مسائل اور مقاصد" برہان دہلی، دسمبر ۱۹۸۲ء۔ اگست ۱۹۸۳ء۔

(۱۰) ان مباحث کے لیے ملاحظہ ہوں خاکسار کے دو مضمون، تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ، جلد ۱، شمارہ ۴ اور جلد ۲، شمارہ ۲۔

(۱۱) تحقیقاتِ اسلامی، جلد ۲، شمارہ ۲۔

(۱۲) ابن اسحاق، ص ۴-۳۶۳؛ واقدی، ص ۱۷۹؛ نیز ملاحظہ کیجئے برکات احمد، محمد اینڈ دی جیوز، مذکورہ بالا۔

(۱۳) ابن اسحاق، ص ۸-۴۳۷؛ واقدی، ص ۳۷۰، ۳۷۲، ۵-۳۷۴، ۸-۳۷۷؛ بلاذری، فتوح البلدان، ص ۲۴-۲۱؛ نیز برکات احمد، مذکورہ بالا۔

(۱۴) واقدی، ص ۵۰۱، ۵۲۱ وغیرہ؛ فتوح البلدان، ص ۳۶-۳۴؛ نیز برکات احمد، مذکورہ بالا۔

(۱۵) واقدی، ص ۶۳۴، کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی نے مدینہ کے ایک یہودی مہاجن ابوالشحم سے پانچ درہم قرض لیا تھا جو غزوۂ خیبر کے ذرا پہلے ادا کیا تھا۔ اس روایت میں سودی رقم کا ذکر نہیں ہے۔ دوسرے قرض کی رقم بہت معمولی ہے۔ خیال ہے کہ کاتب کی غلطی سے پانچ کے بعد کوئی تعداد تحریر میں آنے سے رہ گئی ہے۔ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص ۱۷۹، اور ص ۳۷۴، جس کے مطابق بنو قینقاع اور بنو نضیر کے یہودیوں نے انصار کو کافی بڑی رقمیں سود پر ادھار دی تھیں جو انھوں نے اپنی جلاوطنی سے پہلے وصول کی تھیں۔ واقدی، ص ۳۷۴ ہی کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسید بن حضیر نے جو اوس کے ایک بڑے سردار تھے بنو نضیر کے ایک مالدار یہودی مہاجن ابو رافع سلام بن ابی الحقیق سے اسی دینار ایک سال کے عرصہ کے لیے لیے تھے اور اس پر ان کو پچاس فیصد سود کے مطابق سال کے بعد ایک سو بیس دینار ادا کرنے تھے۔ بہرحال اس سے پہلے ہی یہودی مہاجن کو جلاوطن ہونا پڑا اور معاہدہ کے مطابق اسے صرف اصل مال یعنی اسی دینار ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔ واقدی، ص ۹-۱۸۸، کا مزید بیان ہے کہ بنو نضیر سے متعلق ایک اور یہودی مہاجن کعب بن اشرف رہن کی ضمانت پر سودی ادھار دیتے تھے۔ متعدد مآخذ

سے معلوم ہوتا ہے کہ رہن میں زمین، باغ، کھیت، ہتھیاروں، سونے چاندی کے زیورات کے علاوہ بیوی بچوں کو بھی رکھنے کا رواج تھا۔ شبلی نعمانی، سیرت النبی، دوم، ص ۳۰۱ کے مطابق رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودی کے مقروض اپنے آخری وقت میں بھی تھے۔ ان کے علاوہ متعدد اور مثالیں بھی مسلمانانِ مدینہ کے یہودیوں کے مقروض ہونے کی ماخذ میں بکھری ہوئی ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودی مہاجن مسلمانوں کے ساتھ لین دین کا کاروبار کر کے ہی مالدار بنے تھے۔

(۱۶) بلاذری، انساب الاشراف، اول، ص ۳۱۳ وغیرہ۔

(۱۷) اراضی مدینہ کی تقسیم کے لیے ملاحظہ کیجئے اس باب میں بحث پر "نظام قطائع"۔

(۱۸) ملاحظہ ہو شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۲۸۶-۷؛ مارگولیتھ، مذکورہ بالا، ص ۹۶، ۱۰۱-۹۹۔

(۱۹) ابن سعد، سوم، ص ۶۱۵ وغیرہ۔ بخاری، باب فضل المنیحہ؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۲۷۰؛ زرقانی کے مطابق وُہ ایک دن میں اسی مہمانوں کو کھانا کھلاتے اور ان کی بھرپور خاطر تواضع کرتے تھے؛ نیز ملاحظہ کیجئے ان کے عطیات کے لیے اگلی بحث۔

(۲۰) ابنِ سعد، سوم، ص ۳۶-۴۲۰۔

(۲۱) انساب الاشراف، اول، ص ۲۶۷۔

(۲۲) واقدی، ص ۳۱-۳۲۹۔

(۲۳) مسلم، صحیح، باب الصدقات۔

(۲۴) بخاری، باب الرطب والتمر؛ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص ۴۰۲-۴۰۰۔

(۲۵) بخاری، کلام الرب مع اہل الجنۃ؛ واقدی، ص ۲۰۷، ۴۰۱-۲، ۲۰۵۔

(۲۶) واقدی، ص ۲۰۷، ۳۷۵، ۴۰۱-۲، ۵۳۵-۹ وغیرہ۔

(۲۷) اسد الغابہ، سوم، ص ۳۱۶۔ ان کا مالِ تجارت عہدِ نبوی ہی میں سات سو اونٹوں پر لد کر آنے لگا تھا۔ ملاحظہ ہو ابن سعد، سوم، ص ۳۳-۱۲۴؛ بخاری، کتاب البیوع۔

(۲۸) ابن سعد، سوم، ص ۶۰ وغیرہ؛ بخاری، کتاب البیوع، کتاب الشرب؛ مسند احمد بن حنبل، اول، ص ۶۲؛ چہارم، ص ۴۰۰ بحوالہ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۲۶۶؛ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص ۵۲۲۔

(۲۹) بحوالہ مارگولیتھ، ص ۱۴، ۶۸، ۶۹؛ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص ۳۱۲ اور ۳۰۴ جو سوق الظہر اور سوق المدینہ کا حوالہ دیتے ہیں۔ اول الذکر بقیع کے پاس واقع تھا۔ یہ دونوں سوق بنی قینقاع کے علاوہ تھے۔

(۳۰) کتاب المحبر، ص ۲۶۳-۸؛ نیز ملاحظہ ہو ازرقی، مذکورہ بالا، ص ۳۲-۱۳۱۔

(۳۱) ازرقی، مذکورہ بالا، ص ۱۳۱-۲؛ واقدی، ص ۳۹۵۔

(۳۲) واقدی، ص ۳۸۰-۸ ؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۰۔

(۳۳) ایضاً

(۳۴) واقدی، ص ۱۰۲ وغیرہ۔

(۳۵) واقدی، ص ۶۸۰-۸۲ وغیرہ۔

(۳۶) واقدی، ص ۵۶۴۔

(۳۷) مثال کے طور پر ملاحظہ ہو ابن سعد، سوم، چہارم، پنجم، اور اسد الغابہ اور اصابہ، استیعاب وغیرہ میں ان صحابہ کرام کے سوانحی خاکے۔

(۳۸) بخاری، فضائل الانصار؛ نیز ملاحظہ ہو قرآن کریم، سورہ الدہر، آیت ۷، ۶؛ طبری، تفسیر، آیت مذکورہ بالا۔

(۳۹) بخاری اور مسلم، کتاب المغازی، کتاب الصدقات؛ ترمذی، باب معیشۃ النبی؛ زرقانی، اصحاب الصفہ؛ ابوداؤد، کتاب الادب، کتاب الاطعمہ، کتاب الصدقات؛ نیز ترمذی، کتاب الصدقات۔

(۴۰) مسلم، باب الصدقات۔

(۴۱) ابن اسحاق، ص ۳۰۹ وغیرہ؛ واقدی، ص ۱۱۹؛ بخاری، غزوۂ بدر؛ بخاری ہی کا بیان ہے کہ اس موقع پر حضرت عباس بن عبد المطلب کو جو اس وقت تک کافر تھے عبد اللہ بن ابی بن سلول نے اپنا کرتا دیا تھا کہ اور کسی کا کرتا ان کے آتا ہی نہ تھا۔ اس احسان کے بدلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کرتا عبد اللہ بن ابی کے کفن کے لیے عطا کیا تھا۔

(۴۲) واقدی، ص ۹۵۴، کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بسر بن سفیان کو کپڑے خریدنے کا حکم دیا تھا جو وہ مکہ سے خرید کر لائے تھے۔

(۴۳) واقدی، ص ۵۲۴ وغیرہ۔

(۴۴) واقدی، ص ۵۰۰۔

(۴۵) واقدی، ص ۵۴۷۔

(۴۶) واقدی، ص ۷۷۵-۶۔

(۴۷) سنن، باب فی المرأۃ والعبد یحذیان من الغنیمۃ۔

(۴۸) واقدی، ص ۹۹۱۔

(۴۹) انساب الاشراف، اوّل، ص ۳۶۸؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۶۰۳؛ طبری، سوم، ص ۱۰۲۔

(۵۰) مذکورہ بالا، سوم، ص ۲۱۶-۳۲ وغیرہ۔

(۵۱) ابن سعد، سوم، ص ۶۲۳۔

(۵۲) بخاری، باب بناء المسجد، باب الہجرۃ؛ نیز ابوداؤد، باب بناء الہجرۃ۔

(۵۳) بخاری، باب فضل المنیحہ۔

(۵۴) ابن سعد، سوم، ص ۴۸۸۔

(۵۵) طبری، اول، ص ۱۵۲۸ بحوالہ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۵۲۔

(۵۶) ابن اسحاق، ص ۲۴۲؛ واقدی، ص ۲۶۲-۳۔ واقدی نے ان کے نام اس طرح گنائے ہیں: المیثاب،

الصفیہ، الدلال، حُسنیٰ، برقہ، الاعوف ' اور مشربہ ام ابراہیم۔

(۵۷) انساب الاشراف، اول، ص ۵۳۶، کا بیان ہے کہ انھوں نے اس کو چار ہزار دینار میں خریدا تھا مدینہ کے کنوؤں کے لیے جن سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی پیا تھا ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اول، ص ۲۸-۵۲۵۔

(۵۸) واقدی، ص ۷۱۔

(۵۹) ابن اسحاق، ص ۲۸۷؛ واقدی، ص ۷۱؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۰۲۔

(۶۰) انساب الاشراف، اول، ص ۳-۳۰۲' کا بیان ہے کہ دو قیدیوں میں سے ایک حضرت حکم بن کیسان مسلمان ہوگئے تھے جبکہ عثمان بن عبداللہ بن ابی امیہ نے زرِ فدیہ ادا کر کے رہائی پائی تھی۔ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق' ص ۲۸۸؛ واقدی' ص ۱۵؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۱ اور طبری، دوم، ص ۴۱۳۔

(۶۱) واقدی، ص ۳-۱۰۰؛ اونٹوں کے لیے تین الفاظ — بعیر، جمل اور ظہر — استعمال کیے گئے ہیں۔

(۶۲) واقدی، ص ۹۹۔

(۶۳) واقدی، ص ۱۰۳' کے مطابق آپ کی صفی میں مشہور تلوار ذوالفقار شامل تھی جو دراصل منبہ بن حجاج سہمی کی تھی۔ آپ کو ابوجہل مخزومی کا قیمتی اونٹ اور حصہ مالِ غنیمت ملا تھا جس کی قیمت کچھ برسوں بعد سو عام اونٹوں کے برابر آنکی گئی تھی۔ واضح رہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ غنیمت ایک عام مجاہد کے حصہ کی مانند تھا۔ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، دوم، ص ۱۹-۱۸؛ انساب الاشراف، اول، ص ۲۹۴۔

(۶۴) واقدی، ص ۱۰۱-۱۰۰۔ (۶۵) واقدی، ص ۹۸۔

(۶۶) ملاحظہ فرمائیے واقدی ص ۱۴۰، جن کا بیان ہے کہ ابوعزیز عبدری کی والدہ قریشِ مکہ میں بڑی متمول تھیں۔ انھوں نے پہلے یہ معلوم کیا تھا کہ فدیہ کی گراں ترین شرح کیا ہے اور پھر اس کے مطابق اپنے فرزند کا زرِ فدیہ ادا کیا تھا کیونکہ وہ اپنے لیے افتخار یہاں بھی برقرار رکھنا چاہتی تھیں۔

(۶۷) مکمل بحث کے لیے ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۱۰-۳۱۱؛ واقدی، ص ۴۴-۱۳۸؛ انساب الاشراف، اول، ص ۵-۳۰۱؛ نیز ملاحظہ ہو یعقوبی، 'تاریخ'، دوم، ص ۴۶ جس کے مطابق ۶۸ قیدیوں نے فدیہ ادا کیا تھا۔ لیکن یہ روایت بوجوہ معلوم غلط ہے۔

(۶۸) واقدی، ص ۳-۱۴۲؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳-۳۰۲؛ نیز ابن اسحاق' ص ۳۱۲۔

(۶۹) واقدی، ص ۹-۱۰۸؛ ابن سعد' دوم، ص ۳۰-۲۹؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۰۹۔

(۷۰) مذکورہ بالا مورخین کے مطابق صفی رسول تین کمانوں، اتنی ہی تلواروں اور نیزوں اور دو زرہ بکتروں پر مشتمل تھی۔

(۷۱) برکات احمد، مذکورہ بالا۔

(۷۲) ابن اسحاق، ص ۳۶۱؛ واقدی، ص ۸۲-۱۸۱؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۳۱-۳۰؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۱۰۔

(۷۳) واقدی، ص ۱۸۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۲۱؛ نیز ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اول، ص ۳۱۰، جس کا بیان ہے (ایک روایت کے مطابق) کہ مالِ غنیمت "نعم اور شاۃ" پر مشتمل تھا۔

(۷۴) واقدی، ص ۱۹۸؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۳۶؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۲؛ نیز ملاحظہ کیجئے ابن اسحاق ص ۳۶۴۔ بیان یہ کیا جاتا ہے کہ قریش نے اس کاروانِ تجارت میں خاصی خطیر رقم لگا دی تھی۔ ان کے دو اہم تاجروں ابوزمعہ اور صفوان بن امیہ نے تقریباً تین سو مثقال چاندی اور سونے کے علاوہ تین ہزار درہم کی مالیت کی چاندی کی سلاخیں (خام چاندی) بھی تجارت کے لیے بھیجی تھی۔ اس سے یہ حقیقت اُجاگر ہوتی ہے کہ مکی تاجر خام چاندی کے علاوہ چاندی اور سونے کی بنی ہوئی اشیاء کی بھی تجارت کرتے تھے۔ مگر یہ تجارت جو شام سے ہوتی تھی بدر کے معرکۂ عظیم کے بعد بند ہوگئی تھی جیسا کہ واقدی، ص ۱۹۷، کا بیان ہے کیونکہ "باشندگانِ سواحل نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدۂ اتحاد کر لیا تھا"۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بدر کی جنگ نے سیاسی اور اقتصادی معاہدوں کی نوعیت بدل دی تھی اور جزیرہ نمائے عرب کی سیاست میں توازن کا پلہ مدینہ کے حق میں جھکا دیا تھا؛ نیز ملاحظہ کیجئے واقدی، ص ۲۵-۶، جہاں اُنھوں نے بدر سے قبل شام جانے والے مکی کاروان کی مالیت پچاس ہزار دینار بیان کی ہے۔ اس موقعہ پر بھی ان کا خاص مال تجارت چاندی ہی تھی۔

(۷۵) واقدی، ص ۳۴۵؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، دوم، ص ۵۰؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۴-۵۔

(۷۶) واقدی، ص ۳۷۴، ۳۷۷ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم، ص ۵۸؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۲۹؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۴۳۷-۳۹۔

(۷۷) واقدی، ص ۴۰۳-۴؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۶۲؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۰۔

(۷۸) ابن اسحاق، ص ۴۹۳؛ واقدی، ص ۴۱۱ اور ابن سعد، دوم، ص ۶۴ کا بیان ہے کہ مسلمانوں نے بنو مصطلق کے سو خاندانوں کو اپنی طرف سے آزادی دے دی تھی لیکن انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۱ نے اپنی دو روایات میں سے ایک میں یہ بیان کیا ہے کہ قیدیوں کی رہائی حضرت جویریہ کی شادی کی شرط تھی۔ یہ دوسری روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ حضرت جویریہ کی شادی کی اگر کوئی شرط کہی جا سکتی ہے تو وہ مکاتبت کی رقم تھی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دو "حصہ داروں" کو ادا فرمائی تھی۔

(۷۹) واقدی، ص ۴۱۲-۱۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۴؛ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان قیدیوں نے زرِ فدیہ دے کر رہائی حاصل کرنے کا کام حضرت جویریہ کی شادی سے قبل انجام دے لیا تھا ورنہ وہ بھی بلا فدیہ آزاد ہو جاتے۔

(۸۰) واقدی، ص ۴۱۲۔

(۸۱) واقدی، ص ۴۱۱۔

(۸۲) واقدی، ص ۴۱۰ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۴؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۲۔

(۸۳) واقدی، ص ۵۱۰، ۵۱۳، ۲۲-۵۲۱ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم، ص ۷۵؛ نیز ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۷۔

(۸۴) واقدی، ص ۲۳-۵۲۲۔

(۸۵) روایت ہے کہ حضرت ثابت کی سفارش پر زبیر بن باطا کے خاندان کو جن سے صحابی موصوف کے پرانے خاندانی تعلقات تھے ان کی تمام جائداد غیر منقولہ (اموال) اور منقولہ سمیت آزاد کر دیا گیا تھا اور ان کو مدینہ منورہ میں سکونت پذیر رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ ان کے ہتھیار البتہ لے لئے گئے تھے۔ بعد میں یہ یہودی خاندان مدتوں تک انصاری ثابت کے خاندان کے ساتھ مل کر رہا تھا اور مدینہ کی آبادی کا ایک اٹوٹ حصہ بن گیا تھا۔ ملاحظہ ہو واقدی، ص ۵۲۰۔

(۸۶) حضرت ام منذر کی سفارش پر ایک اور یہودی رفاعہ بن سموال کو رہا کر دیا گیا تھا۔ روایت میں اگرچہ اس کے خاندان اور اموال کا ذکر نہیں ہے تاہم اندازہ یہی ہوتا ہے کہ ان کا معاملہ بھی زبیر بن باطا کے خاندان کے معاملے سے مختلف نہیں تھا ملاحظہ ہو واقدی ص ۱۵-۵۱۴۔

(۸۷) واقدی، ص ۵۲۳۔

(۸۸) واقدی، ص ۵۲۴؛ نیز ملاحظہ ہو مذکورہ بالا، ص ۳-۵۲۲، جس کے مطابق ابوالشحم یہودی نے جو مدینہ منورہ کا ایک مالدار مہاجن اور تاجر تھا دو یہودی قیدی عورتوں کو ان کے چھ چھوٹے چھوٹے بچوں سمیت صرف ایک سو پچاس دینار میں خریدا تھا۔ درہم میں یہ رقم ۱۸۰۰ کے قریب آتی ہے۔

(۸۹) واقدی، ص ۵-۵۲۴، کے بیان کے مطابق ایک جزور (عام اونٹ) دس بھیڑ بکریوں کے برابر مانا جاتا تھا؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، دوم، ص ۸۷؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۶۔

(۹۰) واقدی، ص ۵۵۰؛ ابن سعد، دوم، ص ۸۵؛ نیز ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۷۔

(۹۱) واقدی، ص ۲-۵۵۱؛ ابن سعد، دوم، ص ۸۵؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۷۔

(۹۲) واقدی، ص ۴-۵۵۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۸۷؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۷۔

(۹۳) واقدی، ص ۵۵۵؛ ابن سعد، دوم، ص ۸۷؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۷۔ بھیڑ بکریوں کی تعداد میرے حساب پر مبنی ہے۔ واقدی کا بیان صرف اتنا ہے کہ بیس اونٹ اس سریہ کے پندرہ مجاہدین میں تقسیم کیے گئے تھے اور اس سے قبل مالِ غنیمت کا خمس نکال لیا گیا تھا۔ چنانچہ ہر مجاہد کو دو اونٹ یا اس کے مساوی بھیڑ بکریاں حصہ میں ملی تھیں، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ایک اونٹ کی شرح تبادلہ دس بھیڑ بکریاں تھیں۔

(۹۴) واقدی، ص ۵۵۹؛ نیز ملاحظہ کیجئے انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۷۔

(۹۵) واقدی، ص ۵۶۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۹۰۔

(۹۶) روایت یہ ہے کہ وہ باندی بطور تحفہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی گئی مگر آپ نے اس کی

شادی حضرت حزن بن وہب سے کردی ۔ ملاحظہ ہو واقدی، ص ۵۶۵ ۔

(۹۷) واقدی، ص ۶۶۴، ۶۶۸، ۶۷۲، ۶۸۰ وغیرہ ۔ اشیائے خوردنی اور رسد جو، کھجور، گھی (سمن)، شہد، تیل (زیت) اور مکھن (ودک) پر مشتمل تھی ۔ برتنوں میں سونے، چاندی، تانبے کے علاوہ کافی تعداد میں مٹی کے (فخار) بھی تھے ۔ صعب بن معاذ کے قلعہ میں جو مالِ غنیمت ملا تھا وہ کشیدہ کاری کے کام کے یمنی کپڑے کے بیس تھانوں (عِکَم) اور پندرہ سو چادروں (قطیفہ/ قطائف) پر مشتمل تھا ۔ ابی الحقیق کے خزانے میں ملنے والے زیورات میں کڑے (اسورہ)، بازو بند (دمالج)، پازیب (خلاخل)، چھوٹی انگوٹھیاں (خواتم)، بڑی انگوٹھیاں (فتخ)، بُندے بالیاں (قراط)، سونے کے اور ہیروں کے ہار (نُظم) چاندی سونے کے برتنوں کے علاوہ تھے ۔ ان کے علاوہ بہت سے قیدی بھی گرفتار ہوئے تھے ۔ لیکن وہ صرف نزار اور کتیبہ کے قلعہ میں ملے تھے ۔ کتیبہ کے قیدیوں کی تعداد دو ہزار سے اوپر تھی مگر وہ سب رہا کر دئے گئے تھے اور ان کے اموال ان کے تصرف میں دے دیئے گئے تھے جبکہ ان سے صلح کا معاہدہ ہوا تھا ۔

(۹۸) واقدی، ص ۶۸۸ ۔ (۹۹) ایضاً، ص ۷۰۰ ۔

(۱۰۰) ایضاً، ص ۷۱۱ ۔ (۱۰۱) ایضاً

(۱۰۲) انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۹ ۔

(۱۰۳) واقدی، ص ۷۲۷، ۷۲۸؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۱۹-۲۰ ۔

(۱۰۴) واقدی، ص ۷۵۱؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲۵؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۷۹ ۔

(۱۰۵) واقدی، ص ۷۵۳-۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲۷؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۸۰ ۔

(۱۰۶) واقدی، ص ۷۶۹، کا بیان ہے کہ اس طرح جو مالِ غنیمت ملا تھا وہ مجاہدین میں تقسیم کر دیا گیا تھا ۔ گویا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خمس نہیں نکالا گیا تھا ۔

(۱۰۷) واقدی، ص ۷۷۱ ۔

(۱۰۸) واقدی، ص ۷۸۰؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۱۳۲؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۸۱ ۔

(۱۰۹) واقدی، ص ۹۴۳-۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲۴-۵ ۔

(۱۱۰) ابن اسحاق، ص ۵۹۲ وغیرہ؛ واقدی، ص ۹۴۹-۵۰ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۵۴ ۔

(۱۱۱) ابن اسحاق، ص ۶۶۷؛ نیز ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اول، ص ۳۸۲ جس کا بیان ہے کہ ان پر حملہ اس لئے کیا گیا تھا کہ انھوں نے صدقات (محاصل) روک لیے تھے ۔

(۱۱۲) واقدی، ص ۷۵۵؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۲ ۔

(۱۱۳) واقدی، ص ۹۸۴، ۹۸۸؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۴ ۔ انساب الاشراف، اول ص ۳۸۲ ۔

(۱۱۴) واقدی، ص ۱۰۲۷، ۱۰۲۹؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۶۔

(۱۱۵) واقدی، ص ۱۰۸۱-۱۰۸۰؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۷۰؛ نیز ملاحظہ کیجئے انساب الاشراف، اول، ص ۳۸۴، جس کا بیان ہے کہ حضرت علی نے اس مہم میں کسی سے کوئی جنگ نہیں کی تھی اور وہ صرف وہاں سے "صدقہ" لے کر آئے تھے۔ طبری، سوم، ص ۱۳۲-۱۳۱، کا یہ بیان قطعی غلط ہے کہ جب حضرت خالد بن ولید مخزومی یمن کی اپنی مہم میں ناکام ہوگئے تھے تو ان کی جگہ حضرت علی کو بھیجا گیا تھا اور انھوں نے کامیابی کے ساتھ ہمدان کے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کر لیا تھا۔ حالانکہ معاصر تاریخی دستاویزات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خالد بن ولید اپنے مشن میں پورے کامیاب رہے تھے۔

(۱۱۶) کتاب المحبر، ص ۱۱۲۔

(۱۱۷) واقدی، ص ۱۸۱-۱۷۶؛ برکات احمد، مذکورہ بالا؛ حمید اللہ، مذکورہ بالا۔

(۱۱۸) ابن اسحاق، ص ۳۶۴-۳۶۳؛ واقدی، ص ۱۷۶، ۱۰۲۹، کا بیان ہے کہ سوق بنی قینقاع مدتوں تک موجود اور تجارتی مرکز رہا تھا؛ نیز ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اول، ص ۳۰۹۔

(۱۱۹) وہ لوگ ماخذ کے الفاظ میں "قلعوں والے" تھے کیونکہ قلعوں (حصون) کے مالک تھے اور ان کے اندر ہی بستے تھے ملاحظہ ہو واقدی، ص ۱۸۱، ۵۶۳، ۶۳۴، ۷۲۹۔

(۱۲۰) واقدی، ص ۱۸۱؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۰۹۔

(۱۲۱) واقدی، ص ۱۸۲؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۰۹۔

(۱۲۲) ابن اسحاق، ص ۳۶۳؛ واقدی، ص ۱۷۷۔

(۱۲۳) ابن اسحاق، ص ۳۷۴-۳۶۹؛ واقدی، ص ۳۶۹، ۳۷۲ وغیرہ۔

(۱۲۴) واقدی، ص ۳۷۸۔

(۱۲۵) واقدی، ص ۳۷۸-۳۷۷؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، دوم، ص ۵۸، جس کا بیان ہے کہ وہ اراضی بطور تحفہ/انعام تقسیم کی گئی تھی نہ کہ بطور مال غنیمت کے حصہ کے۔

(۱۲۶) یحیی بن آدم، کتاب الخراج، ص ۲۱؛ نیز ابو یوسف، کتاب الخراج، بلاق طبع، قاہرہ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء، ص ۳۹۔

(۱۲۷) واقدی، ص ۳۷۸۔

(۱۲۸) واقدی، ص ۳۷۹-۳۷۸۔ (۱۲۹) ایضاً۔

(۱۳۰) مذکورہ بالا، ص ۲۳؛ نیز ملاحظہ کیجئے ص ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۴۔

(۱۳۱) واقدی، ص ۳۸۰-۳۷۹؛ نیز ملاحظہ ہو ابو یوسف، مذکورہ بالا، ص ۳۹، جن کا خیال ہے کہ بنو نضیر اور

بنو قریظہ کی اراضی میں سے کوئی بھی تقسیم نہیں کی گئی تھی؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، دوم، ص ۵۸ جو واقدی سے مکمل اتفاق کرتے ہیں۔

(۱۳۲) ابن سعد، سوم، ص ۳ - ۱۳۲۔

(۱۳۳) واقدی، ص ۴۹۹، ۲-۵۰۱ اور ۵۲۱ وغیرہ۔

(۱۳۴) کتاب الخراج، ص ۷۰ اور ۷۴۔

(۱۳۵) واقدی، ص ۵۲۱ وغیرہ؛ کتاب الخراج، مذکورہ بالا۔

(۱۳۶) واقدی، ص ۲-۵۲۱۔

(۱۳۷) یحییٰ بن آدم، کتاب الخراج، ص ۷۰، ۷۴، حضرت زبیر بن عوام اور ان کے ایک پڑوسی انصاری کاشتکار کے درمیان آبپاشی کے لیے پانی کے بٹوارے کے ضمن میں وادی مہروز کا حوالہ دیتے ہیں۔ روایت کے مطابق چشمہ کا پانی پہلے حضرت زبیر کی زمین سے ہو کر گمنام انصاری کے کھیتوں میں جاتا تھا۔ انصاری نے دعویٰ کیا کہ پانی پہلے انھیں ملنا چاہیے حضرت زبیر نے انکار کیا۔ مقدمہ دربارِ رسالت میں پہنچا۔ آپ نے حضرت زبیر کے حق میں فیصلہ دیا اور ہدایت کی کہ ضرورت بھر کا پانی لینے کے بعد پھر پانی انصاری کے کھیتوں میں جانے دیں کیونکہ ان کے کھیت پانی کے زیادہ قریب تھے انصاری کو نہ صرف یہ کہ فیصلہ سے اختلاف تھا بلکہ اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر روایت کے مطابق اقرباپروری کا الزام لگایا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا کہ پہلے میں نے فیصلہ انسان دوستی اور صلۂ رحمی کی بنیاد پر کیا تھا مگر اب حق و انصاف کی بنا پر فیصلہ کرتا ہوں کہ زبیر اپنے کھیتوں کو سیراب کر لینے کے بعد بھی بقیہ پانی روکے رکھیں اور انصاری کے کھیت میں نہ جانے دیں کہ اس پانی پر مؤخر الذکر کا کوئی حق نہیں۔

(۱۳۸) ابن اسحاق، ص ۵۲۱ کا بیان ہے کہ "اس کی دو وادیاں السُریر اور خاص در اصل خیبر کا علاقہ تھیں اور پورا علاقہ انھیں دونوں کی اراضی پر مشتمل تھا جبکہ اس کے دو قلعے نطاۃ اور الشق میں اٹھارہ حصے (سہمان) تھے: النطاۃ میں صرف ۵ اور الشق میں ۱۳۔ ان دونوں علاقوں کو اٹھارہ حصوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر حصہ مسلمانوں کے سو حصوں کا نمائندہ تھا گویا ان دونوں علاقوں میں مسلمانوں کے کل ۱۸۰۰ حصے واقع تھے۔

(۱۳۹) واقدی، ص ۶۹۰۔

(۱۴۰) ابن اسحاق، ص ۵۲۵؛ واقدی، ص ۸-۶۷۷، ۹۲-۶۸۹ وغیرہ؛ نیز ملاحظہ ہو یحییٰ بن آدم، مذکورہ بالا، ص ۲-۲۱؛ طبری، سوم، ص ۱۹۔

(۱۴۱) واقدی، ص ۶۹۰ کا خیال ہے کہ اس کی پیداوار کی پچاس فیصد تقسیم کھجوروں اور تمام دوسری فصلوں کو حاوی تھی۔

(۱۴۲) کتاب الخراج، ص ۳۹۔

(۱۴۳) ابن اسحاق، ص ۵۲۲ کے مطابق کتیبہ کا دوسرا نام "وادی خاص" تھا۔

(۱۴۴) واقدی، ص ۶۹۳؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۵۲۱۔

(۱۴۵) واقدی، ص ۶۹۳ میں شعیر (جَو) ہے جبکہ مجموعۃ الوثائق، ص ۲۲ میں قمح (گیہوں) ہے۔ لیکن یہ اس کے کئی دستاویزات میں سے ایک میں ہے۔ یعنی بہ اختلافِ روایات جَو اور گیہوں دونوں کا ذکر آیا ہے۔

اوزان وسق اور صاع وغیرہ کے لیے ملاحظہ ہو یحییٰ بن آدم، مذکورہ بالا، ص ۱۰۰-۹۶ جن کے مطابق ان کا باہمی تناسب یہ تھا:

۱ وسق = ۶۰ صاع

یا ۱ وسق = ۶۰ قفیز (حجاجی، یعنی حجاج بن یوسف ثقفی گورنر عراق در خلافت اموی)

۱ صاع/قفیز = ۸ رطل

حجاجی قفیز در اصل حضرت عمر بن خطاب کے صاع پر مبنی تھی۔ ملاحظہ ہو، ص ۱۰۱-۱۰۰۔

ہندوستانی اوزان میں صاع اور وسق کی تبدیلی اس بنیاد پر کی گئی ہے کہ علماء ہندوستان کے مطابق ایک صاع پونے دو کلو سے کچھ کم ہوتا ہے اس طرح ایک وسق میں ۹۵ کلو کے قریب پڑتے ہیں۔ آسانی کے لیے اس کو ایک کوئنٹل کر دیا گیا ہے۔ اس سے مراد حسابی کوئنٹل نہیں ہے۔

(۱۴۶) واقدی، ص ۶۹۱۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل پیداوار خیبر اس طرح تھی:

کھجور = ۸۰,۰۰۰ وسق

جَو = ۳۰,۰۰۰ صاع

نوی = ۱۰,۰۰۰ صاع

(۱۴۷) مذکورہ بالا، ص ۵۱۔

(۱۴۸) ابن اسحاق، ص ۴-۵۲۳؛ واقدی، ص ۶۹۱؛ طبری، سوم، ص ۲۱-۲۰۔

(۱۴۹) ابن اسحاق، ص ۵-۵۲۳ اور واقدی، ص ۶۹۱ کا بیان ہے کہ "تخمینہ و تقسیم نصفین کے بعد حضرت عبد اللہ بن رواحہ یہودیوں سے کہا کرتے تھے: "اگر تمہیں یہ پسند ہے یہ تمہارا (ڈھیر) ہے اور تم کو میرے تخمینہ اور تقسیم کے نصف کی ضمانت دینی ہوگی۔ اگر تم چاہو تو یہ ہم لے لیں اور ہم تم کو اپنی تقسیم کے نصف ہونے کی ضمانت دوں گا۔" نیز ملاحظہ کیجیے ابو یوسف، مذکورہ بالا، ص ۲۹۔ واقدی کا بیان ہے کہ ایک بار حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے کھجوروں (نخل) کی پیداوار کو چالیس ہزار وسق کے دو حصوں میں تقسیم کیا۔ یہودیوں نے اپنی عورتوں کے زیورات جمع کیے اور حضرت عبد اللہ کو بطور رشوت پیش کیے اور کہا کہ "یہ سب آپ کے لیے ہے اگر آپ تقسیم میں کچھ ہمارے لئے چھوڑ دیں۔" حضرت عبد اللہ نے سخت لہجہ میں جواب دیا" او یہودیو! میں خدا کی مخلوق میں تم سے سب سے زیادہ نفرت کرتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی نہیں کر سکتا۔" نیز دیکھیے

ابو یوسف، ص ۵۱۔

(۱۵۰) مذکورہ بالا، ص ۵۱۔

(۱۵۱) ابن اسحاق، ص ۵۲۱، ۵۲۲۔

(۱۵۲) ابن اسحاق، ص ۵۲۲؛ واقدی، ص ۶۸۹-۹۰۔

(۱۵۳) واقدی، ص ۶۸۹-۹۰، ۷۱۸-۹۔

(۱۵۴) ایضاً

(۱۵۵) ایضاً، ص ۵۲۲ اور حاشیہ ۱۔

(۱۵۶) واقدی، ص ۶۹۱

(۱۵۷) واقدی، ص ۶۹۶ وغیرہ۔

(۱۵۸) ابن اسحاق، ص ۵۲۲-۳، واقدی، ص ۶۹۳-۹۶؛ نیز ملاحظہ کیجیے مجموعۃ الوثائق، ص ۲۰-۲۲۔

(۱۵۹) ایضاً، ص ۵۲۳۔

(۱۶۰) ملاحظہ کیجیے مجموعۃ الوثائق، ص ۲۲۔

(۱۶۱) اس روایت کا تعلق ذی قعدہ ۷ھ/ مارچ ۶۲۹ء سے ہے جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضیہ کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ ملاحظہ ہو واقدی، ص ۷۱۴۔

(۱۶۲) واقدی، ص ۷۱۳-۱۴۔

(۱۶۳) ابن اسحاق، ص ۵۲۳؛ نیز ملاحظہ ہو یحییٰ بن آدم، مذکورہ بالا، ص ۲۸؛ ابو یوسف، مذکورہ بالا، ص ۲۹۔

(۱۶۴) واقدی، ص ۷۰۶-۷؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۵۲۳؛ انساب الاشراف، اول، ص ۵۳۲؛ طبری، سوم، ص ۱۵ وغیرہ۔

(۱۶۵) واقدی، ص ۷۱۳۔

(۱۶۶) ایضاً، ص ۷۰۰۔

(۱۶۷) واقدی، ص ۳۷۸؛ انساب الاشراف، اول، ص ۵۱۹-۲۰۔

(۱۶۸) طبری، سوم، ص ۱۵۔

(۱۶۹) ابن اسحاق، ص ۵۱۵ اور ۵۲۵؛ طبری، سوم، ص ۱۵۔

(۱۷۰) ایضاً، ص ۷۱۱، کا بیان ہے کہ تیماء اور وادی القریٰ کو شامی حدود میں شمار کیا جاتا تھا؛ نیز ملاحظہ کیجیے مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۴۲۔

(۱۷۱) واقدی، ص ۷۱۱؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۵۲۔

(۱۷۲) ایضاً

(۱۷۳) جزیہ اور خراج یعنی جزیہ علی الرقاب اور جزیہ علی الارض کی بحث کے لیے ملاحظہ ہو ڈینیل۔ سی۔ ڈینیٹ DANIAL C. DENNETT کی معرکۃ الآرا کتاب CONVERSION AND THE POLL TAX IN EARLY ISLAM کیمبرج ۱۹۵۰ء۔

(۱۷۴) ملاحظہ ہو باب چہارم، بحث بر والی۔

(۱۷۵) کتاب الوزراء والکُتّاب، ص ۱۲۔

(۱۷۶) واقدی، ص ۱۰۴۱؛ ۴-۵۲۳، ۶۹۷، ۸۰۰؛ ابن سعد، دوم، ص ۵۷، وغیرہ؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۲۳۴۔

(۱۷۷) ملاحظہ کیجئے ڈینیٹ کی مذکورہ بالا کتاب اور اس کا اردو ترجمہ از غلام رسول مہر بعنوان جزیہ اور اسلام۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۲ء۔ مزید بحث کے لیے دیکھیے یحییٰ بن آدم، کتاب الخراج، ص ۴-۵۳ اور ابویوسف، مذکورہ بالا، ص ۳۳، ۳۸ وغیرہ جزیہ کی تعریف کے لیے۔

(۱۷۸) مجموعۃ الوثائق (مکتوبات ۵۷، ۵۸، ۵۹)، ص ۵۶-۸؛ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۳۹۲۔

(۱۷۹) ایضاً، ص ۶۰-۶۱۔

(۱۸۰) ایضاً، ص ۶۱-۶۲ (مکتوب ۶۳، ۶۴) (۱۸۱) ایضاً

(۱۸۲) مجموعۃ الوثائق، ص ۸۱-۸۲؛ نیز انگریزی ترجمہ کے لیے ملاحظہ ہو مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۶۰-۳۵۹۔ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۳۹۲۔

(۱۸۳) ایضاً (۱۸۴) ایضاً، ص ۱۰۶-۷ (۱۸۵) ایضاً، ص ۱۱۰-۱۱

(۱۸۶) ایضاً، ص ۱۱۱-۱۲ (۱۸۷) واقدی، ص ۱۰۳۰۔

(۱۸۸) واقدی، ص ۱۰۳۱؛ نیز ملاحظہ ہو یحییٰ بن آدم، مذکورہ بالا، ص ۵۴، جن کا بیان ہے کہ جزیہ صرف بالغ مردوں پر عائد کیا جاتا تھا۔ عورتیں اور بچے ہمارے فقہا کی متفقہ رائے کے مطابق اس سے مستثنیٰ تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہ استثنا حضرت عمرو بن حزم کے نام مکتوب نبوی میں بیان شدہ تصریحات سے متصادم ہے۔

(۱۸۹) واقدی، ص ۱۰۳۲۔

(۱۹۰) واقدی، ص ۱۰۳۲؛ مجموعۃ الوثائق، ص ۳۶۔

(۱۹۱) مجموعۃ الوثائق، ص ۳۶۔ یہاں خاندان سے مراد بنو عبد مناف ہے یا قریش کا قبیلہ، نہ کہ بنی ہاشم۔

(۱۹۲) کتاب الخراج، ص ۵۴۔

(۱۹۳) ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۳۹۲ جنھوں نے اپنے بیان کی بنیاد بخاری اور ابوداؤد کی دو حدیثوں پر رکھی ہے۔

(۱۹۴) زکوٰۃ کے بارے میں آیاتِ قرآنی کے لیے ملاحظہ ہو محمد فواد عبد الباقی، المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، قاہرہ ۱۹۵۳ء، لفظ زکوٰۃ، ص ۳۳۱-۳۲۔

(۱۹۵) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دستاویزات میں اس اصطلاح کے استعمال کے لیے ملاحظہ کیجئے مجموعۃ الوثائق، ص ۴۲-۴۳، ۸-۹، ۱۱۰-۱۲ وغیرہ۔ مزید صفحات کے حوالے آیندہ بھی آئیں گے۔

(۱۹۶) واقدی، ص ۱۰۸۴-۵؛ نیز ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۱۰۶ مویشیوں اور زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ کے لیے۔
عام طور سے اس ضمن میں فقہی کتب کے حوالوں کو کم دیا گیا ہے کیونکہ ان کے بارے میں عام دلیل یہ ہے کہ ان کے بیانات نظریاتی زیادہ عملی یا تاریخی کم ہیں۔ بہرحال فقہ کے نقطۂ نظر کے لیے ملاحظہ ہو ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۴۳-۵؛ ہدایہ، کتاب الزکوٰۃ۔

(۱۹۷) واقدی، ص ۱۰۸۵۔ یہی بیان کم و بیش الفاظ میں مجموعۃ الوثائق کے خط بنام حضرت عمرو بن حزم والیٔ نجران کے پایا جاتا ہے ملاحظہ ہو ص ۱۰۶؛ نیز ملاحظہ ہو ص ۱۱۰-۱۲ اور ۱۶۷-۷۰؛ یحییٰ بن آدم، مذکورہ بالا، ص ۷۸-۸۱۔

(۱۹۸) یحییٰ بن آدم، ص ۹۶۔ اوزان/نصاب کے لیے ملاحظہ ہو ص ۹۸-۱۰۰۔

(۱۹۹) مذکورہ بالا، ص ۱۰۵، ۱۰۹ حضرت ابو موسیٰ اشعری کے نام انھیں ہدایات کے لیے ملاحظہ کیجئے۔

(۲۰۰) یحییٰ بن آدم، مذکورہ بالا، ص ۱۲۲۔ اس روایت کا بیان ہے کہ حضرت سفیان ثوری کے مطابق یہ زکوٰۃ پیداوار کا ثلث ($\frac{1}{3}$) یا ربع ($\frac{1}{4}$) تھی۔

(۲۰۱) انساب الاشراف، چہارم، ص ۱۵۰؛ ابو داؤد، سنن، بحوالہ کتانی، اول، ص ۴۰۰۔

(۲۰۲) انساب الاشراف، اول، ص ۵۲۰۔

(۲۰۳) ملاحظہ کیجئے مجموعۃ الوثائق، ص ۴۰، ۴۲-۳، ۶۲-۴، ۶۷-۸، ۷۰-۷۱، ۷۹، ۷۷-۸ وغیرہ۔

(۲۰۴) مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۲۵۳-۴، جن کا بیان ہے کہ "یہ مسئلہ کہ زکوٰۃ نے کیونکر قانونی مذہبی محصول (LEGAL ALMS) کے معنی حاصل کیے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت کے دائرہ سے باہر ہے۔ کیونکہ یہ تبدیلی بعد کے زمانے میں آئی تھی ..... بہرحال محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات کے دوران ایک متعینہ تناسب تمام مسلمانوں کے لیے لازمی کر دیا گیا تھا، ایسا سوچنے کے لیے کوئی بنیاد نہیں ہے۔"
مستشرق موصوف اور ان کے ہمنوا جدید مورخوں کا یہ خیال کہ زکوٰۃ تمام مسلمانوں کے لیے ایک فریضہ حیات نبوی کے بعد بنی تھی انتہائی غلط اور گمراہ ہونے کے علاوہ کثیر تاریخی شہادتوں کے خلاف بھی ہے، اس لیے مردود ہے۔

(۲۰۵) مجموعۃ الوثائق، ص ۴۰، ۴۲، ۷۸-۹، ۱۱۰-۱۱، ۱۲۰ وغیرہ، ۱۴۷-۸، ۱۶۶، ۱۷۰-۲ اور ۱۹۵ وغیرہ۔

(۲۰۶) ایضاً، ص ۱۱۱-۱۲ (۲۰۷) ایضاً، ص ۱۶۴

(۲۰۸) ایضاً، ص ۷۰-۷۱ - ص ۷۰ پر عمان کے ایک گاؤں دما کے لوگوں سے زکوٰۃ ادا کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

(۲۰۹) ایضاً، ص ۶۳-۴۔

(۲۱۰) ایضاً، ص ۶۷-۸؛ نیز ملاحظہ ہو کتاب المحبر، ص ۷۷، جس کا بیان ہے کہ بحرین کے لوگوں نے اپنا خراج حضرت علاء بن حضرمی کے ہمراہ مدینہ بھیجا جو ستر ہزار (درہم) تھا۔ اس کا مزید دعویٰ ہے کہ یہ پہلا "مال" تھا جو مدینہ

پہنچا تھا۔

(۲۱۱) مجموعۃ الوثائق، ص ۳۰-۱۲۸۔

(۲۱۲) ایضاً، ص ۱۴۹

(۲۱۳) ایضاً، ص ۱۶۵

(۲۱۴) ایضاً، ص ۷۰-۱۶۷۔

(۲۱۵) ایضاً، ص ۷-۱۰۴

(۲۱۶) ایضاً

(۲۱۷) قرآن حکیم، سورہ توبہ، آیت ۱۰۳: نیز ملاحظہ ہو واحدی، اسباب النزول، قاہرہ، ص ۹۰-۱۸۹۔

(۲۱۸) طبری، سوم، ص ۴-۱۲۳۔

(۲۱۹) طبری، سوم، ص ۹۵۔

(۲۲۰) ان اصطلاحات کے لیے ملاحظہ کیجئے ابن ہشام، ص ۶۵۰ وغیرہ؛ واقدی، ص ۹۷۲ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۰؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۱-۵۲۹؛ طبری، سوم، ص ۱۴۷؛ اسد الغابہ، پنجم، ص ۹۲-۹۰؛ نیز ملاحظہ ہو ابن خلدون، تاریخ، اول، ص ۴-۸۳۷؛ زرقانی، سوم، ص ۳۶۸؛ کتانی، اول، ص ۲۸۳۔ سعایہ کے لیے خاص کر ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۴۱۰۔

(۲۲۱) ابن سعد، اول، ص ۲۷۰؛ نیز ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۱۵۷؛ کتانی، اول، ص ۳۹۲۔ موخر الذکر کا بیان ہے کہ محدث ابوداؤد کی روایت کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر ثقفی کو اس کی تعلیم بنفس نفیس دی تھی کہ وہ اپنی قوم کے صدقات کیسے وصول کریں۔

(۲۲۲) ابن اسحاق، ص ۶۴۴؛ واقدی، ص ۹۷۴؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۰۔

(۲۲۳) ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۱۶۵۔

(۲۲۴) نسائی، سنن، ص ۲۹۰ بحوالہ شبلی نعمانی، سیرت النبی، دوم، ص ۵۰۔

(۲۲۵) ایضاً۔

(۲۲۶) طبری، سوم، ص ۹۰-۳۸۹؛ ابن عساکر، تاریخ مدینہ دمشق، مرتبہ صلاح الدین المنجد، دمشق، اول، ص ۴۵۳؛ ابن خلدون، اول، ص ۹-۸۹۸۔

(۲۲۷) ملاحظہ کیجئے ضمیمہ سوم۔ (الف)

(۲۲۸) ایضاً

(۲۲۹) بخاری اور مسلم، کتاب الصدقات؛ طبری، سوم، ص ۱۲۲؛ نیز ملاحظہ کیجئے حوالہ آئندہ ص ۲۳۷۔

(۲۳۰) ضمیمہ سوم (الف)

(۲۳۱) مسلم، صحیح، کتاب الصدقات۔

(۲۳۲) واقدی، ص ۷-۶۹۶؛ نیز ملاحظہ کیجئے صحیحین، کتاب الصدقات، جہاں یہی واقعہ دہرایا گیا ہے۔

(۲۳۳) واقدی، ص ۹۷۳؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۰؛ نیز طبری، سوم، ص ۱۴۷، اگرچہ ان کی روانگی کی

تاریخ نہیں بیان کرتے تاہم ان کی روانگی کو سنہ ۱۰ھ / ۶۳۱-۲ء کے سال کے واقعات میں شمار کرتے ہیں۔ انساب الاشراف، اوّل، ص ۵۲۹-۳۱، قطعی کسی تاریخ یا زمانہ کا حوالہ نہیں دیتی۔ نیز ملاحظہ ہو زرقانی، سوم، ص ۳۶۸۔

(۲۳۴) مذکورہ بالا، سوم، ص ۱۴۷۔

(۲۳۵) واقدی، ص ۹۷۳-۴۔ حضرت عیینہ بن حصن فزاری کے بارے میں واقدی کا بیان زیادہ واضح نہیں ہے۔ نیز ملاحظہ ہو زرقانی، سوم، ص ۳۶۸-۹۔

(۲۳۶) ابن سعد، دوم، ص ۱۶۰۔

(۲۳۷) طبری، سوم، ص ۱۴۷، کا بیان ہے کہ مذکورہ بالا افسروں حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کو نجران کے لوگوں سے صدقہ اور جزیہ وصول کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اوپر گزر چکا ہے کہ ایک ہاشمی کو کیونکر عامل صدقات مقرر کیا جا سکتا تھا جبکہ اس کی ممانعت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت کے ساتھ کی تھی۔ کتانی نے اس موضوع پر جو بحث کی ہے وہ دلچسپ بھی اور اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو پیش بھی کرتی ہے۔ مآخذ کا یہ دعویٰ کہ حضرت علی کو نجران کے علاقے کا "ساعی" (عامل صدقات) مقرر کیا گیا تھا ناقابلِ قبول اور غلط ہے۔ کیونکہ حضرت موصوف کا تعلق بنو ہاشم سے تھا اور اس بنا پر وہ اس منصب پر مقرر نہیں کیے جا سکتے تھے۔ لیکن نسائی کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو گورنر مقرر کیا تھا (امرہ) نہ کہ عامل (استعملہ)۔ قاضی عیاض کا خیال ہے کہ ممکن ہے کہ حضرت علی کو صدقات کا عامل مقرر کیا گیا ہو لیکن ان کو تنخواہ نہ دی گئی ہو یا ان کو گورنری (عمالہ) ملی ہو لیکن صدقات کی وصولیابی ان کے فرائض میں شامل نہ ہو۔ لیکن بعد کا خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ مآخذ کا واضح بیان ہے کہ وہ وہاں سے صدقات وصول کر کے لائے تھے۔ کتانی کا اپنا خیال ہے کہ حضرت علی کو بطور "مستوفی" بھیجا گیا تھا یعنی وہ آفیسر جو امام کی جانب سے صدقات و محاصل (مال) عمال صدقات سے وصول کر کے موخر الذکر کو ان کے فرائض سے عہدہ برآ کر دیتا ہے اور پھر مال کو امام کے پاس لاتا ہے۔ بظاہر اس نظریہ یا خیال میں کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ ان کی حیثیت حضرات قدامہ اور ابو ہریرہ کے مانند معلوم ہوتی ہے جن کو منذر بن ساویٰ اور حضرت علاء بن حضرمی سے صدقات و جزیہ کی رقوم وصول کرنے کے لیے بحرین بھیجا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۴۰۱۔

لیکن کتانی کے اس نظریہ میں ایک جھول ہے وہ یہ کہ حضرت علی کو براہِ راست عاملِ صدقات مقرر کیا گیا ہو یا بعد میں صدقات کی وصولیابی کے لیے بھیجا گیا ہو بات کم و بیش ایک ہی ہے اور اعتراض بدستور باقی رہتا ہے۔ بہرحال مآخذ سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہی صحیح ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ بطور معلّم اور مبلّغ یمن بھیجے گئے تھے اور یہی کام وہاں انھوں نے انجام بھی دیا تھا اور واپسی پر اپنے مسلمان کیے ہوئے لوگوں کے صدقات بھی ساتھ لے کر آئے تھے۔ عین ممکن ہے کہ مصدق کوئی دوسرا رہا ہو جو ان کے ساتھ آیا ہو یا انھوں نے خود کسی اور کو صدقات کا نگراں بنا دیا ہو۔

(۲۳۸) ملاحظہ کیجئے خاکسار کا مضمون "تاریخ اسلام میں فنِ شانِ نزول کی اہمیت ___ ایک تنقیدی نظر" مجلہ تحقیقات اسلامی سہ ماہی، علی گڑھ جلد ۲-۱ شمارہ ۲-۱ (جنوری تا جون ۱۹۸۲ء)۔ نیز صحابی موصوف کے کردار و شخصیت کے لیے ملاحظہ کیجئے خاکسار کی زیرِ طبع کتاب "حضرت ولید بن عقبہ اموی ___ حیات و شخصیت"

(۲۳۹) ابنِ اسحاق، ص ۴۹۳؛ واقدی، ص ۹۸۰-۸۱؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۱۶۱؛ نیز ملاحظہ ہو اسد، پنجم، ص ۹۰-۹۱؛ ابنِ خلدون، اوّل، ص ۴۳-۴۷؛ نیز ملاحظہ ہو میری اس موضوع پر کتاب۔

(۲۴۰) مضمون "تاریخ اسلام میں فنِ شانِ نزول کی اہمیت"!

(۲۴۱) ملاحظہ ہو طبری، دوم، ص ۵۸۸ اور سوم، ص ۱۵۴، ۱۶۸؛ فتوح البلدان، ص ۱۸۵-۶؛ ابن اثیر، کامل، دوم، ص ۲۰۵؛ نیز میری زیرِ طبع کتاب۔

(۲۴۲) انساب الاشراف، اوّل، ص ۵۳۰-۳۱۔

(۲۴۳) ایضاً، اول، ص ۲۷۰، ۲۷۲-۳؛ نیز ملاحظہ ہو طبری، سوم، ص ۱۷۸۔

(۲۴۴) طبری، سوم، ص ۹۵، ۱۷۸۔ (۲۴۵) ایضاً

(۲۴۶) اسد الغابہ، چہارم، ص ۲۵۰۔

(۲۴۷) اسد الغابہ، چہارم، ص ۴-۶؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، ہفتم، ص ۴۰۴؛ اسد، چہارم، ص ۵؛ اصابہ، چہارم، ص ۲۵۸؛ ابنِ سعد، پنجم، ص ۴۴-۴۵، کا بیان ہے کہ ان کا صدر مقام تبالہ تھا۔

(۲۴۸) الکامل، اول، ص ۵۹-۶۱۔

(۲۴۹) اسد الغابہ، چہارم، ص ۳۸۵-۷؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۳۵۔ اقیال حضرموت کے حضرت وائل بن حجر سے تعلقات کے لیے ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۱۷۸۔

(۲۵۰) اسد، سوم، ص ۱۰۶-۷ اور دوم، ص ۲۱۳ بالترتیب۔

(۲۵۱) واقدی، ص ۳۵۹-۶۰؛ طبری، سوم، ص ۵۹؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۰۷۔

(۲۵۲) بحوالہ کتانی، اول، ص ۳۹۶۔

(۲۵۳) بحوالہ کتانی، اول، ص ۳۹۶ اور ۲۶۵ بالترتیب ان کی تقرری اور تنخواہ کے لیے۔

(۲۵۴) بحوالہ کتانی، اول، ص ۲۳۷۔

(۲۵۵) ابنِ قیم، الطرق الحکمیۃ فی السیاستہ الشرعیۃ، بحوالہ کتانی، اول، ص ۲۳۷۔

(۲۵۶) ابوداؤد، ارزاق العمال۔ نیز ملاحظہ ہو بخاری، باب رزق الحکام والعاملین علیہا؛ مصنف عبد الرزاق؛ کتانی، اول، ص ۲۶۴-۶۶۔

(۲۵۷) سورۃ توبہ، آیت ۶۰۔

(۲۵۸) طبقات، پنجم، ص ۵۲۸۔ (۲۵۹) ایضاً، ص ۵۲۹ (۲۶۰) ایضاً، ص ۵۲۴-۵۔

(۲۶۱) واقدی، ص ۹۸۱-۲ (۲۶۲) ایضاً، اول، ص ۳۲۴-۵۔

(۲۶۳) اسد الغابہ، سوم، ص ۴۸۳ کا بیان ہے کہ حضرت عثمان بن عمرو دئلی اپنی قوم کے عامل تھے اور مقامی منتظم بھی۔

(۲۶۴) اسد الغابہ، اول، ص ۳۰۶ کا بیان ہے کہ وہ دونوں جہینہ کے صدقات کے عامل مقرر کیے گئے تھے۔ نیز ملاحظہ کیجیے: مجموعۃ الوثائق، ص ۱۴۸-۹ اور ۱۴۲ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مختلف بطون اور گھرانوں سے الگ الگ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنے مویشیوں پر صدقہ اور خمس اور عشر ادا کریں۔ (۲۶۵) اسد، دوم، ص ۲۷۶۔

(۲۶۶) ابن ہشام، دوم، ص ۶۰۰؛ ابن سعد، اول، ص ۳۲۲؛ طبری، سوم، ص ۱۴۷؛ اسد الغابہ، سوم، ص ۲۹۲-۳؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۴۳۔

(۲۶۷) ابن سعد، اول، ص ۲۷۰؛ اسد الغابہ، پنجم، ص ۲۰۵۔

(۲۶۸) ایضاً، اول، ص ۲۹۶۔ (۲۶۹) مجموعۃ الوثائق، ص ۴۹۔

(۲۷۰) کتانی، اول، ص ۳۹۷۔

(۲۷۱) ایضاً، اول، ص ۳۹۷-۰۔ حضرت خزیمہ کے لیے "ساعی" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

(۲۷۲) ایضاً، پنجم، ص ۷۵۔

(۲۷۳) ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۱۵۸۔ اس کا مزید بیان ہے کہ حضرت زمیل بن عمرو کو قبیلہ عذرہ کے مسلم اور غیر مسلم دونوں طبقات کے پاس بھیجا گیا تھا اور ان سے مکمل فرمانبرداری کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں صدقات اور جزیہ کی ادائیگی بھی شامل ہے۔

(۲۷۴) واقدی، ص ۵۶۱؛ اسد الغابہ، پنجم، ص ۹۹؛ نیز ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۱۶۸-۷۰، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس گرامی نامہ کے لیے جس میں کلب کے لوگوں سے صدقات کی ادائیگی کے مطالبہ کا ذکر ہے۔

(۲۷۵) ایضاً (۲۷۶) ایضاً (۲۷۷) مجموعۃ الوثائق، ص ۴۲-۳ (۲۷۸) ایضاً، ص ۴۲

(۲۷۹) ایضاً، ص ۱۶۵ (۲۸۰) ایضاً، ص ۱۶۶ (۲۸۱) ایضاً، ص ۷۸

(۲۸۲) ایضاً، ص ۷۹ (۲۸۳) ایضاً، ص ۱۶۴ (۲۸۴) ایضاً، ص ۱۲۸-۳۰

(۲۸۵) اسد الغابہ، پنجم، ص ۱۸؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۳۶۔

(۲۸۶) ابن ہشام، دوم، ص ۶۰۰؛ طبری، سوم، ص ۱۴۷؛ اسد الغابہ، دوم، ص ۱۹۴-۵، ۳۶۹-۷۰؛ سوم، ص ۲۷-۸؛ چہارم، ص ۲۱۹-۲۱، ۲۹۵؛ پنجم، ص ۱۶۰؛ ابن خلدون، اول، ص ۸۴۳؛ نیز ملاحظہ ہو: کتانی، اول، ص ۳۹۷-۸۔

(۲۸۷) اسد، دوم، ص ۱۱۶۔

(۲۸۸) مجموعۃ الوثائق، ص ۶۷-۸؛ ابن سعد، اول، ص ۱۶۲-۳ بالترتیب۔

(۲۸۹) مجموعۃ الوثائق، ص ۱۳۱۔

(۲۹۰) کتاب المحبر، ص ۷۷۔

(۲۹۱) کتاب المعارف، ص ۳۰۲۔

(۲۹۲) جوامع السیرہ اور قضاعی، بحوالہ کتانی، اول، ص ۳۹۸-۹۔

(۲۹۳) کتانی، اول، ص ۳۹۹۔ (۲۹۴) ایضاً

(۲۹۵) صحیح مسلم، باب غزوۂ تبوک؛ نیز واقدی، ص ۹۸۹-۹۰ وغیرہ۔

(۲۹۶) واقدی، ص ۶۹۱۔

(۲۹۷) ابن ہشام، دوم، ص ۳۶۴؛ طبری، سوم، ص ۲۰؛ ابن خلدون، اول، ص ۷۹۶؛ اسد، اول، ص ۲۶۵۔

(۲۹۸) ابن خلدون، اول، ص ۷۹۶؛ نیز ملاحظہ ہو اسد الغابہ، دوم، ص ۲۳۲۔

(۲۹۹) اسد الغابہ، چہارم، ص ۱۰۷-۸۔

(۳۰۰) اسد الغابہ، پنجم، ص ۱۶۹؛ نیز کتانی، اول، ص ۴۰۰-۴۰۱۔

(۳۰۱) اسد الغابہ، چہارم، ص ۱۷۸-۹؛ کتانی، اول، ص ۴۰۰۔

(۳۰۲) کتانی، اول، ص ۴۰۰۔ (۳۰۳) ایضاً

(۳۰۴) انساب الاشراف، چہارم، ص ۱۵۰۔

(۳۰۵) اسد الغابہ، پنجم، ص ۲۰۵؛ کتانی، اول، ص ۴۰۰۔

(۳۰۶) ابن اسحاق، ص ۲۸۶؛ واقدی، ص ۱۲؛ ابن سعد، دوم، ص ۹؛ انساب الاشراف، اول، ص ۲۸۷۔

(۳۰۷) واقدی، ص ۵۶۸؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۷۔

(۳۰۸) واقدی، ص ۵۶۹-۷۰؛ ابن سعد، دوم، ص ۶۷؛ نیز ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اول، ص ۲۸۰، ۲۸۲، جس کا بیان ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے مویشی چرانے کے لیے مقرر کیا تھا۔

(۳۰۹) ابنِ اسحاق، ص ۴۸۶، حاشیہ ۱۔

(۳۱۰) واقدی، ص ۵۳۸-۹؛ ابنِ سعد، دوم، ص ۸۰-۸۱؛ انساب الاشراف، اول، ص ۳۴۸؛ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۳۳۹۔

(۳۱۱) واقدی، ص ۲۵-۶۔ اس روایت کا بیان ہے کہ اس حمیٰ میں چرنے والے جنگی گھوڑوں کی تعداد خلافتِ فاروقی میں بہت بڑھ گئی تھی۔

(۳۱۲) اسد الغابہ، سوم، ص ۳۵۲۔

(۳۱۳) واقدی، ص ۴۰۲-۳؛ نیز ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۱۵۹۔

(۳۱۴) معجم البلدان، پنجم، ص ۳۶۱ (ب)

(۳۱۵) ملاحظہ ہو محمد ایٹ مدینہ، ص ۸۴۔

(۳۱۶) ابن سعد، سوم، ص ۱۰۵۔ ان کا قطیعہ حضرت زبیر بن عوام کی بقیع نامی اراضی/ باغ اور بنو مازن کے قطعات کے درمیان واقع تھا۔

(۳۱۷) ایضاً، سوم، ص ۵۶۔ روایت کے مطابق حضرت عثمان کے ورثہ نے ان کا قطیعہ ترکہ میں پایا تھا اور ابن سعد کے زمانے میں انھیں کے قبضہ و تصرف میں تھا۔ (۳۱۸) ایضاً، ص ۳-۱۰۲۔

(۳۱۹) ایضاً، ص ۱۲۶ اور ۱۵۲۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے بھائی عتبہ کے قطائع مسجد نبوی کی پشت پر واقع تھے۔

(۳۲۰) ایضاً، ص ۱۳۹۔

(۳۲۱) ایضاً، ص ۱۶۱۔ صحابی موصوف کو ان کا قطیعہ بنو جدیلہ/ خزرج کے علاقے اور اراضی میں ملا تھا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اس جگہ ان کو بسنے کی دعوت اس قبیلہ کے مشہور صحابی حضرت ابی بن کعب نے دی تھی۔

(۳۲۲) ایضاً، ص ۱۷۵۔ جیسا کہ معروف ہے کہ آپ کا گھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے متصل تھا اور مسجد نبوی میں اس کا ایک دروازہ کھلتا تھا؛ نیز ملاحظہ ہو ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۳۴۔

(۳۲۳) ایضاً، ص ۲۱۶ (۳۲۴) ایضاً، ص ۲۴۰۔

(۳۲۵) ایضاً، ص ۲۴۴۔ صحابی موصوف کو بنو زریق کے محلہ میں قطیعہ ملا تھا۔ (۳۲۶) ایضاً، ص ۲۵۰۔

(۳۲۷) ایضاً، ص ۲۷۲؛ نیز ملاحظہ ہو ابو یوسف، مذکورہ بالا، ص ۴۴۔

(۳۲۸) ایضاً، ص ۳۹۶۔

(۳۲۹) ابن سعد، چہارم، ص ۲۵۳۔

(۳۳۰) ابن سعد، چہارم، ص ۲۰-۹

(۳۳۱) ابن سعد، چہارم، ص ۲۳

(۳۳۲) واقدی، ص ۲۰

(۳۳۳) ابن سعد، سوم، ص ۱۰۴؛ چہارم، ص ۲۵۳؛ نیز ملاحظہ ہو یحییٰ بن آدم، کتاب الخراج، ص ۴۷، جن کا بیان ہے کہ حضرت زبیر کا قطیعہ حرہ کے شرج یعنی لاوا کے میدان کے کونے میں واقع تھا اور یہ مدینہ کے زرخیز ترین علاقوں میں سے تھا۔

(۳۳۴) ابن سعد، چہارم، ص ۳۱۳۔

(۳۳۵) اسد الغابہ، چہارم، ص ۳۲۳۔

(۲۳۶) اسد، پنجم، ص ۵۷۔

(۲۳۷) ابو یوسف، مذکورہ بالا، ص ۳۴؛ یحییٰ بن آدم، مذکورہ بالا، ص ۶۵۔

(۲۳۸) مجموعۃ الوثائق، ص ۷-۱۴۶؛ نیز ملاحظہ ہو ابو یوسف، ص ۳۵؛ ماوردی، الاحکام السلطانیۃ، قاہرہ، طبع (غیر مورخہ)، ص ۲۴۳؛ ابو داؤد، دوم، ص ۳۲۔

(۲۳۹) کتاب الخراج، ص ۶۷۔

(۲۴۰) اسد الغابہ، چہارم، ص ۳۹۸۔

(۲۴۱) مجموعۃ الوثائق، ص ۱۴۲۔ مویشی پالنے والے قبائل پر زکوٰۃ ان کے جانوروں پر عائد کی گئی تھی۔

(۲۴۲) ایضاً، ص ۱۴۲۔

(۲۴۳) ایضاً، ص ۱۴۰؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، چہارم، ص ۲۵۳، جنہوں نے ہشام بن محمد کلبی کی روایت پر بیان کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ذی مرکا علاقہ قطیعہ میں دیا تھا لیکن ابن سعد نے اس روایت کو شاذ بتا کر کہ انھوں نے اس کو کسی اور سے نہیں سنا اس کی کمزوری (ضعف) یا عدم صحت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

(۲۴۴) اسد الغابہ، پنجم، ص ۳۰؛ سوم، ص ۳۱۰ بالترتیب۔

(۲۴۵) مجموعۃ الوثائق، ص ۱۴۹۔ (۲۴۶) مجموعہ، ص ۱۸۵۔

(۲۴۷) ایضاً، ص ۱۸۲۔ (۲۴۸) ایضاً، ص ۱۹۳۔

(۲۴۹) ایضاً، ص ۱۸۰، ۲-۱۸۱، ۱۸۴؛ نیز ملاحظہ ہو اسد الغابہ، مذکورہ بالا صحابہ کے تراجم اور سوانحی خاکے۔

(۲۵۰) ایضاً (۲۵۱) مجموعۃ الوثائق، ص ۱۴۴ (۲۵۲) ایضاً

(۲۵۳) ایضاً، ص ۱۹۰ (۲۵۴) ایضاً، ص ۱۹۷ (۲۵۵) ایضاً، ص ۸-۱۷۷

(۲۵۶) ایضاً، ص ۹-۱۸۸ (۲۵۷) ایضاً

(۲۵۸) ابن سعد، چہارم، ص ۳۵۶؛ نیز ملاحظہ ہو اسد، دوم، ص ۵۲۔

(۲۵۹) مجموعۃ الوثائق، ص ۱۹۳۔

(۲۶۰) مجموعۃ الوثائق، ص ۱۵۷۔

(۲۶۱) مجموعۃ الوثائق، ص ۳۵-۳۴؛ نیز ملاحظہ ہو مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۱۱۲؛ نیز ملاحظہ ہو اسد، چہارم، ص ۲۷۴ وغیرہ جن کے مطابق حضرات میمون شامی اور ذوالجوشن الضبابی الکلابی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو شام اور حیرہ میں بالترتیب ان کی فتوحات سے قبل اقطاعات دئے گئے تھے۔

(۲۶۲) مجموعۃ الوثائق، ص ۷۷-۷۳۔ کم از کم وہ ایسے ۸ قطائع کا ذکر کرتا ہے۔

(۲۶۳) مجموعۃ الوثائق، ص ۷۷۔

(۳۶۴) اسد الغابہ، پنجم، ص ۶۸۔

(۳۶۵) مجموعۃ الوثائق، ص ۷۷۔

(۳۶۶) مجموعۃ الوثائق، ص ۶-۶۵؛ نیز ملاحظہ ہو اسد الغابہ، چہارم، ص ۳۰۰۔

(۳۶۷) مجموعۃ الوثائق، ص ۱۳۷۔

(۳۶۸) ایضاً، ص ۹-۶۸ (۳۶۹) ایضاً

(۳۷۰) ایضاً؛ نیز ملاحظہ ہو اصابہ ترجمہ صحابی موصوف۔

(۳۷۱) ایضاً، ص ۱۶۵۔

(۳۷۲) یحییٰ بن آدم، کتاب الخراج، ص ۶۷۔ (۳۷۳) ایضاً، ص ۶۵۔

(۳۷۴) واقدی، ص ۳۷۹، ۶۹۳ وغیرہ؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۵۲۲ وغیرہ۔

(۳۷۵) واقدی، ص ۴-۶۹۳، کا مزید بیان ہے کہ ان دونوں صحابہ کو مشترکہ طور سے تین سو وسق ملے تھے جن میں سے دو سو وسق حضرت فاطمہ کے لیے تھے۔ نیز ملاحظہ کیجئے ابن اسحاق ص ۵۲۲ جو واقدی سے اتفاق کرتے ہیں۔

(۳۷۶) واقدی، ص ۶۹۴، کا بیان ہے کہ حضرت اسامہ کو ایک سو پچاس وسق میں سے چالیس وسق شعیر کے ملے تھے اور پچاس وسق نوی کے۔ جبکہ ابن اسحاق، ص ۵۲۲ کا بیان ہے حضرت اسامہ کو دو سو وسق ملے تھے جن میں سے پچاس وسق کھجوریں تھیں۔

(۳۷۷) واقدی، ص ۶۹۴ کا بیان ہے کہ ان کے ورثہ نے حضرت معاویہ کے ہاتھ ان کی خلافت کے زمانے میں کسی وقت اپنا طعمہ بیچ دیا تھا۔

(۳۷۸) واقدی، ص ۶۹۵، کے مطابق چالیس وسق ان کے دو بیٹوں کے لیے تھے۔ ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۳-۵۲۲، جن کا خیال ہے کہ حضرت عبد اللہ اور ان کی دو دختروں کو نوّے وسق ملے تھے جن میں سے چالیس وسق ان کے دو بیٹوں کے لیے تھے۔

(۳۷۹) واقدی، ص ۶۹۵، نے ان کے نام بھی گنائے ہیں۔

(۳۸۰) مجموعۃ الوثائق، ص ۱۶-۱۱۵۔

(۳۸۱) ایضاً، ص ۲۳۔ (۳۸۲) واقدی، ص ۱۰۰۶

(۳۸۳) ملاحظہ ہو ماوردی، الاحکام السلطانیہ۔

(۳۸۴) واقدی، ص ۶۹۷، ۶۹۸ اور ۶۹۹ نے طعمہ کے وراثت میں منتقل ہونے کے کئی واقعات کا ذکر کیا ہے۔

(۳۸۵) ایضاً، ص ۸-۶۹۷

باب ششم

(۱) ابن سعد، اول، ص ۲۲۰؛ زبیری، نسب قریش، ص ۲۵۴؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۳۶۸-۹؛ نیز باب اول۔

(۲) ابن سعد، اول، ص ۲۲۰؛ فتوح البلدان، ص ۲۰۔

(۳) ابن اسحاق، ص ۲۰۸؛ واقدی، ص ۱۵؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۱؛ طبری، دوم، ص ۴۱۳؛ نیز ملاحظہ کیجئے باب اول اور پنجم۔

(۴) باب پنجم بحث بر زر فدیہ اسیران بدر۔

(۵) ملاحظہ کیجئے باب دوم بحث بر اسلام قبائل عرب۔ یہاں اس قسم کی دعوت کی چند مثالیں کافی ہوں گی۔ حضرت دعثور بن حارث، ذات بن حیان عجلی، بنو کلب دومۃ الجندل، بنو مصطلق وغیرہ نے مہمات ذوامر، قردہ، دومۃ الجندل اور مریسیع کے دوران اسلام قبول کیا تھا۔ ان کے علاوہ بہت سے دوسرے تھے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ملاحظہ کیجئے ابن سعد، دوم، ص ۳۵-۶، ۶۲، ۶۴-۵۔

(۶) ابن اسحاق، ص ۷۴۵ وغیرہ؛ واقدی، ص ۸۵۰ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲۴ وغیرہ اور طبری، سوم، ص ۵۳ وغیرہ۔

(۷) باب دوم۔ باب اول بھی ملاحظہ کیجئے۔

(۸) ابن اسحاق، ص ۶۵۱-۲؛ واقدی، ص ۱۱۰۳-۸؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۰۳ وغیرہ؛ طبری، سوم، ص ۱۵۰-۲۔

(۹) ملاحظہ کیجئے ابن سعد، دوم، ص ۸۹، ۱۲۳، ۱۴۷، ۱۶۹-۷۰؛ نیز ملاحظہ ہو باب دوم۔

(۱۰) ملاحظہ ہو فتوح البلدان، ص ۴۲، جس کے مطابق خیبر کی مہم کے بعد حضرت محیصہ بن مسعود نے فدک کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تھی؛ نیز ملاحظہ ہو اسد، چہارم، ص ۳۳۴۔

(۱۱) ابن اسحاق، ص ۶۷۲ وغیرہ؛ ابن سعد، ص ۸۹، ۱۴۷، ۱۷۸ وغیرہ۔

(۱۲) ملاحظہ ہو باب دوم متعلقہ مباحث۔

(۱۳) ابن اسحاق، ص ۴۳۳-۴؛ واقدی، ص ۴۴۵-۵۱؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۰۵-۴؛ طبری، دوم، ص ۵۴۵-۵۵؛ نیز باب دوم۔

(۱۴) ابن اسحاق، ص ۴۲۶-۳۳؛ واقدی، ص ۳۵۴-۶۲؛ ابن سعد، دوم، ص ۵۵-۶؛ طبری، دوم، ص ۵۲۸-۴۲۔

(۱۵) ملاحظہ ہو ضمیمہ چہارم (الف) جس کے مطابق حضرت خالد بن ولید نے عزیٰ کو، حضرت عمرو بن عاص نے سواع کو،

حضرت سعد بن زید نے مناۃ کو اور حضرت ابوسفیان بن حرب اور مغیرہ بن شعبہ نے لات کو تباہ کیا تھا۔ کچھ مدت کے بعد حضرت طفیل بن عمرو نے اپنے قومی بت ذوالکفین کو اور حضرت علی بن ابی طالب نے طے کے صنم کدہ الفلس کو برباد کیا تھا۔

(۱۶) فتوح البلدان، ص ۸۹؛ ابن سعد، اول، ص ۶۳-۲۶۲ بالترتیب۔

(۱۷) ابن ہشام، سوم، ص ۴۲۹، ۵۹۲؛ طبری، سوم، ص ۸-۱۲۶؛ اسد، چہارم، ص ۹-۶۸؛ نیز ملاحظہ ہو بخاری، صحیح، کتاب المغازی؛ نیز باب دوم۔

(۱۸) ابن ہشام، سوم، ص ۶۴۱؛ واقدی، ص ۸۳-۱۰۷۹؛ ابن سعد، دوم، ص ۷۰-۱۶۹؛ طبری، سوم، ص ۲-۱۳۱؛ نیز بخاری، مذکورہ بالا۔

(۱۹) طبری، سوم، ص ۱۸۷؛ نیز ملاحظہ ہو ضمیمہ چہارم - الف۔

(۲۰) باب چہارم ملاحظہ کیجئے۔

(۲۱) ملاحظہ ہو مجموعۃ الوثائق، ص ۲۳، ۲۹، ۴۱، ۴۹، ۴-۵۳، ۶-۵۵، ۶۹، ۱۰۸ وغیرہ؛ نیز باب چہارم بحث بر سفراء نبوی۔

(۲۲) ایضاً

(۲۳) اسد الغابہ، اول، ص ۲۷۹، دوم، ص ۴۴۲ اور چہارم، ص ۱۳۱؛ نیز باب دوم و سوم۔

(۲۴) باب چہارم

(۲۵) ایضاً

(۲۶) ایضاً

(۲۷) طبری، سوم، ص ۱۸۷۔

(۲۸) قرآن کریم، سورہ توبہ، آیت ۲۴ - ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی رح

(۲۹) قرآن کریم، سورہ حجرات، آیت ۱۴۔

(۳۰) ابن سعد، اول، ص ۲۲۰؛ زبیری، ص ۲۵۴؛ فتوح البلدان، ص ۲۰؛ اسد، اول، ص ۲-۱۷۱؛ چہارم، ص ۹-۳۶۸؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، سوم، ص ۲۰-۱۱۶، ۱۲-۶۰۸؛ انساب الاشراف، اول، ص ۲۵۲؛ نیز دیکھئے ابن اسحاق، ص ۲۰۱-۱۹۹۔

(۳۱) بخاری، صحیح، باب الہجرۃ۔

(۳۲) ابوداؤد، سنن، ص ۱۲۹، بحوالہ شبلی نعمانی، سیرت النبی، دوم، ص ۹۰ - نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۴۰۔

(۳۳) احمد بن حنبل، مسند، سوم، ص ۱۳۷ بحوالہ شبلی نعمانی، دوم، ص ۹۰۔

(۳۴) واقدی، ص ۳۴۴ کا بیان ہے کہ انصار میں ستر نوجوان اتنے پڑھے لکھے تھے کہ وہ القراء (جمع قاری) کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ اس کے لفظی معنی تو پڑھنے والے کے ہیں لیکن اصطلاح میں وہ عالم اور معلم کے معنی میں مستعمل تھے۔ نیز ملاحظہ کیجئے ابن سعد، دوم، ص ۵۲، ۵۶؛ طبری، دوم، ص ۵۳۸، ۶- ۵۴۵؛ نیز دیکھیے بخاری، غزوۂ بئر معونہ۔ اس کے علاوہ شہداء بئر معونہ و رجیع کے سوانحی خاکے ملاحظہ کیجئے ابن سعد، جلد سوم میں۔

(۳۵) ملاحظہ کیجئے ابن سعد، چہارم، ص ۳۲۱ - ۳۲۵۔

(۳۶) بخاری، فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۳۷) بحوالہ کتانی، اول، ص ۴۱ - ۴۰۔ (۳۸) ایضاً

(۳۹) زبیری، نسب قریش، ص ۱۷۴ ؛ جمہرۃ انساب العرب، ص ۷۳۔

(۴۰) کتاب المحبر، ص ۲۸۶۔ (۴۱) ابن سعد، سوم، ص ۵۱۳۔

(۴۲) بحوالہ کتانی، اول، ص ۷ - ۴۴۔ یہاں عہد صدیقی کے آغاز ہی میں جنگ یمامہ میں بڑی تعداد میں قراء کی شہادت پر حضرت عمر بن خطاب کے خدشہ کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس روایت سے بالواسطہ سہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم ازکم سات سو حافظ قرآن صحابہ اس جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے علاوہ بہت سے حافظ و عالم مسلمان اس وقت بھی زندہ تھے۔ اور یہ سب کے سب عہد نبوی کے ساختہ و پرداختہ اور تعلیم و تربیت یافتہ تھے۔ ملاحظہ ہو طبری، سوم، ص ۲۸۵ وغیرہ۔

(۴۳) بحوالہ شبلی نعمانی، دوم، ص ۸۸۔

(۴۴) بخاری، صحیح، باب رحمۃ البہائم۔

(۴۵) ابن سعد، پنجم، ص ۵۶۴ ؛ المعارف، ص ۳۳۸۔

(۴۶) ابن سعد، چہارم، ص ۴ - ۳۴۳ کا بیان ہے کہ جہینہ کے ایک نو مسلم حضرت عقبہ بن عامر سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ وہ بیعت ہجرت کریں گے یا بیعت عربیت۔ انھوں نے بیعت ہجرت کو پسند کیا اور مدینہ میں آکر بس گئے۔ دُوسری کئی مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ بہت سے بدوی عربوں نے بیعت عربیت کی تھی۔ چنانچہ ان کو کچھ دنوں تک مدینہ میں تعلیم دے کر رخصت کر دیا گیا تھا؛ نیز ملاحظہ ہو مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، ص ۶ - ۸۵ اور ۳ - ۲۴۲۔

(۴۷) مونٹگمری واٹ، مذکورہ بالا۔

(۴۸) بخاری، صحیح، غزوۂ فتح مکہ ؛ نیز ملاحظہ ہو ابوداؤد اور نسائی، کتاب الصلوٰۃ۔

(۴۹) طبری، سوم، ص ۲۸۲۔

(۵۰) ابن ہشام، سوم، ص ۵۰۰ ؛ واقدی، ص ۸۸۹ اور ۹۵۹ ؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲۷ ؛ طبری، سوم، ص ۹۴ ؛ نیز ملاحظہ ہو ابن خلدون، اول، ص ۸۱ ؛ اسد الغابہ، چہارم، ص ۸ - ۳۷۶ ؛ پنجم ص ۹ - ۳۰۸ ؛ کتانی، اول، ص ۴۳۔

(۵۱) واقدی، ص ۲ - ۹۳۱۔

(۵۲) ملاحظہ کیجئے باب چہارم بحث بر ولاۃ رسول۔

(۵۳) مجموعۃ الوثائق، ص ۳-۱۰۱، نے حضرت خالد کے مکتوب بنام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نقل کئے ہیں کہ "میں ان کے (بنو الحارث) کے درمیان مقیم ہوں اور ان کو اس چیز کا حکم دیتا ہوں جو اللہ نے ان کے لیے فرض قرار دی ہے اور اس سے منع کرتا ہوں جو اس نے حرام بتائی ہے۔ اور ان کو اسلام کی بنیادی تعلیمات (معالم الاسلام) اور سنتِ نبوی سکھاتا ہوں۔"

(۵۴) ملاحظہ ہو باب پنجم، بحث بر صدقات۔

(۵۵) ایضاً (۵۶) ایضاً

(۵۷) ملاحظہ ہو باب پنجم بحث بر اموال غنیمت/خمس۔

(۵۸) اسد الغابہ، دوم، ص ۲۲۲؛ طبری، دوم، ص ۱۶۵ کے مطابق یہ واقعہ ۴ھ/ ۶۲۵-۶۲۶ء کا ہے۔

(۵۹) حضرت ابوہریرہ کی سند پر موطا میں ایک روایت یہ بیان کی گئی ہے کہ دو آدمیوں نے اپنے ایک مقدمے کے بارے میں مدینہ کے بعض اہلِ علم کی رائے جاننے کے بعد معاملہ دربارِ رسالت میں پیش کیا۔ غالباً ان دونوں فریقین کو یا ان میں سے کسی ایک کو "مفتی اہل علم" سے اتفاق یا اس پر اطمینان نہ تھا اسی لیے اس نے مقدمہ عدالتِ نبوی میں پیش کیا تھا۔ بہرحال اس سے "مدینہ میں ایسے اہلِ علم کی موجودگی عہدِ نبوی میں ثابت ہوتی ہے جو مذہبی امور پر اپنی رائے دے سکتے تھے یا قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر کر سکتے تھے"؛ ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۵۶۔

(۶۰) ملاحظہ ہو باب چہارم، بحث بر والیانِ رسول۔

(۶۱) ابن سعد، دوم، ص ۳۳۵، ۳۴۰، ۳۴۸، ۳۵۰۔ اگرچہ ابنِ سعد نے مفتیانِ عہدِ نبوی کی تعداد صرف چھ بیان کی ہے لیکن دوسری روایت میں دو نئے ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں روایتیں مفتیوں کی "زیادہ سے زیادہ حد" کو متعین نہیں کرتی ہیں بلکہ ان کے مختلف طبقات کی نشان دہی کرتی ہیں۔ نیز ملاحظہ کیجئے اسد الغابہ، چہارم، ص ۳۷۷، صرف چھ اشخاص کا ذکر کرتی ہے اور حضرات ابوبکر اور عبدالرحمٰن بن عوف کا کوئی حوالہ نہیں دیتی ہے۔

(۶۲) الطائفہ، بحوالہ کتانی، اول، ص ۵۶۔

(۶۳) کتانی، اول، ص ۵۷۔ (۶۴) ایضاً، ص ۵۸۔ (۶۵) ایضاً۔

(۶۶) ابن سعد، سوم، ص ۶۰۹، کا بیان ہے کہ انھوں نے حضرات سہل اور سہیل فرزندان رافع بخاری (بنو غنم بن مالک) کے مربد (باڑے) میں ایک مسجد بنائی تھی جہاں وہ پنجوقتہ نمازوں کی امامت کرتے تھے۔ بعد میں اسی جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی باقاعدہ مسجد تعمیر کی تھی؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۲۰۰-۱۹۹۔

(۶۷) ایضاً (۶۸) ایضاً (۶۹) اسد الغابہ، دوم، ص ۵۶۔

(۷۰) ابن اسحاق، ص ۱۹۹؛ بخاری اور ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ۔

(۷۱) بخاری، صحیح، کتاب الصلوٰۃ۔ ان مساجد کا حوالہ اس فصل میں ملتا ہے جس میں امام بخاری نے اس مسئلہ پر بحث

کی ہے کہ آیا مساجد کو انسانوں کے نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

(۷۲) ایضاً - اس مسجد کے سلسلہ میں دلچسپ روایت آتی ہے جو حضرت انس بن مالک کی سند پر بیان ہوتی ہے۔ اس کے مطابق ایک بار بنو عمرو بن عوف نے اپنی مسجد میں عصر کی نماز اس وقت پڑھی تھی جبکہ وہ مسجد نبوی میں ہو چکی تھی۔

(۷۳) واقدی، ص ۱۰۴۶، ۱۰۴۸ اور ۱۰۷۳؛ بخاری، کتاب الصلوٰۃ۔ (۷۴) ایضاً

(۷۵) اسد الغابہ، سوم، ص ۶۰-۳۵۹؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، سوم، ص ۵۵۰؛ ابو داؤد اور نسائی کتاب الصلوٰۃ؛ واقدی، ص ۱۰۴۶، جن کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبا میں واقع تھی۔

(۷۶) اسد، سوم، ص ۲۲۷۔

(۷۷) بخاری، صحیح، کتاب الصلوٰۃ۔ (۷۸) ایضاً

(۷۹) ایضاً - بحوالہ شبلی نعمانی، سیرت النبی، دوم، ص ۹۲؛ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۷۷، کا بیان ہے کہ ان تمام نو مسجدوں میں نماز پنجگانہ حضرت بلال کی اذان پر ہوتی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف حضرت بلال ہی موذن مدینہ نہیں تھے اور نہ ہی ان کی آواز پورے مدینہ میں سنی جا سکتی تھی بلکہ ان کی اذان دوسری مساجد کے لیے علامت تھی کہ نماز کا وقت ہو چکا اور ان کے اپنے موذن اذان دیتے اور ان کے اپنے امام نماز پڑھاتے تھے۔

(۸۰) ابن سعد، چہارم، ص ۳۴۵۔

(۸۱) ایضاً بحوالہ شبلی نعمانی، سیرت النبی، دوم، ص ۹۲۔ ان تمام مساجد میں سے واقدی نے صرف مسجد الفضیخ کا حوالہ دیا ہے جو بنو خطمہ کے محلہ (فضاء) یا میدان میں واقع ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ ملاحظہ ہو کتاب المغازی، ص ۳۷۱۔

(۸۲) نسائی، سنن، کتاب المساجد؛ نیز ملاحظہ ہو شبلی نعمانی، دوم، ص ۹۳۔

(۸۳) ملاحظہ ہو باب دوم بحث بر اسلام عبد القیس۔

(۸۴) ابن سعد، پنجم، ص ۴۴۶؛ نسائی، کتاب الصلوٰۃ، شبلی نعمانی، دوم، ص ۹۸۔

(۸۵) ابن سعد، پنجم، ص ۹-۵۰۸؛ نیز ملاحظہ ہو باب چہارم بحث بر والیانِ رسول۔

(۸۶) فتوح البلدان، ص ۸-۸۷؛ اسد الغابہ، پنجم، ص ۲۰۳۔

(۸۷) ملاحظہ ہو باب چہارم بحث بر ولاۃ نبوی۔

(۸۸) اسد الغابہ، دوم، ص ۳۸۸۔

(۸۹) ایضاً، باب الامامۃ۔

(۹۰) واقدی، ص ۷-۸۷۵، ۸۸۲۔ (۹۱) ایضاً، ص ۹۸۰۔

(۹۲) واقدی، ص ۹۹۵؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۵۔

(۹۳) واقدی، ص ۷۷۱، کا بیان ہے کہ ذات السلاسل کی مہم کے دوران جب حضرت ابوعبیدہ بن جراح کمک لے کر پہنچے تو حضرت عمرو بن العاص امیر لشکر ہی نے اپنے عہدہ کے سبب نمازوں کی امامت کی تھی۔

(۹۴) واقدی، ص ۱۰۱۲؛ زبیری، ص ۲۶۵؛ اصابہ ۵۱۷۹۔

(۹۵) طبری، سوم، ص ۷-۱۹۶؛ بخاری، باب بدء الاذان۔

(۹۶) بخاری، باب، بدء الاذان؛ مسلم، نسائی اور ترمذی، باب الاذان۔ روایات میں اس پر اختلاف ہے کہ اذان کی تجویز کس نے دربار رسالت میں پیش کی تھی۔ بخاری کے مطابق حضرت عمرؓ نے اور دوسروں کے مطابق حضرت عبداللہ بن زید نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۶-۲۳۵ جو بعد کے صحابی کا نام بیان کرتے ہیں؛ نیز ملاحظہ ہو کتاب المعارف، ص ۳۶۹۔

(۹۷) ایضاً؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص ۲۳۶؛ المعارف، ص ۳۶۹ اور ابن سعد، سوم، ص ۲۳۴۔

(۹۸) ابن سعد، اول، ص ۲۴۸؛ سوم، ص ۲۳۴؛ اسد، اول، ص ۹-۲۰۶۔

(۹۹) بخاری، باب مواقیت الصلوٰۃ۔

(۱۰۰) ماخذ مذکورہ بالا در باب حضرت بلال۔

(۱۰۱) ابن سعد، سوم، ص ۲۳۴؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، اول، ص ۲۴۸؛ المعارف، ص ۱-۲۷۰؛ اسد الغابہ، سوم، ص ۲۔

(۱۰۲) بخاری، باب مواقیت الصلوٰۃ۔

(۱۰۳) زبیری، ص ۳۹۹؛ المعارف، ص ۳۰۶؛ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، پنجم، ص ۴۵۰، جن کی بیان کردہ ایک اور روایت کے مطابق حضرت ابو محذورہ حضرت بلال حبشی کے ساتھ مکہ کی فتح کے بعد مسجد حرام میں اذان دیا کرتے تھے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی کے بعد بھی وہ وہاں اذان دیتے رہے تھے۔

(۱۰۴) ابن سعد، پنجم، ص ۵۰۴، کا بیان ہے کہ ان کے اپنے زمانے میں (تیسری صدی ہجری کے وسط میں) حضرت ابو محذورہ جمحی کے ورثہ ہی مسجد حرام میں اذان کے ذمہ دار تھے۔ ملاحظہ ہو زبیری، ص ۳۹۹؛ المعارف، ص ۳۰۶؛ الفاکہی، مذکورہ بالا، ص ۱۲؛ اسد، پنجم، ص ۲۹۲۔ فاکہی اور زبیری دونوں کا بیان یہ ہے کہ ان کے ورثہ کے ختم ہو جانے کے بعد اذان کی خدمت ربیعہ بن سعد جمحی کے خاندان اور ورثہ میں منتقل ہو گئی تھی۔

(۱۰۵) اسد الغابہ، دوم، ص ۳-۲۸۲۔

(۱۰۶) المعارف، ص ۲۵۸ اور ۱-۲۷۰؛ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۷۷، جن کا بیان ہے کہ ان کے وارثین نے امام شافعی (۷۶۸ تا ۸۲۰ء) کے زمانے تک یہ خدمت انجام دی تھی۔

(۱۰۷) اسد الغابہ، سوم، ص ۲۲۸؛ نیز ملاحظہ کیجئے کتانی، اول، ص ۷۶، جو ان کو "برموی" کہتے ہیں۔

(۱۰۸) ایضاً، ص ۷۴۔

(۱۰۹) ایضاً۔ صحابی موصوف نے حضرت بلال حبشی کی عدم موجودگی میں ایک بار فجر کی اذان کہی تھی اور نمازِ فجر کی اقامت بھی۔

(۱۱۰) ایضاً، ص ۷۶۔ (۱۱۱) ایضاً (۱۱۲) اسد الغابہ، دوم، ص ۳۲۱۔

(۱۱۳) ازرقی، کتاب اخبار مکہ، ص ۸ - ۱۲۷۔ ازرقی کا یہ بیان بڑا دلچسپ ہے کہ ۸ھ / ۶۳۰ء میں فتح مکہ کے سال حج فرض نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس برس حج جاہلی روایات و تقویم کے مطابق ذی قعدہ میں منعقد ہوا تھا اور مسلمانوں نے ان روایات کے مطابق حضرت عتاب کی امارت میں قدیم غیر مسلم عربوں کے ساتھ ادا کر لیا تھا۔

(۱۱۴) ابن سعد، پنجم، ص ۴۴۶؛ کتاب المحبر، ص ۱۱؛ نیز ملاحظہ ہو ابن ہشام، سوم، ص ۵۰۰؛ واقدی، ص ۹۵۹؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۳۷؛ طبری، سوم، ص ۳۷؛ فتوح البلدان، ص ۵۳؛ اسد الغابہ، سوم ص ۹-۳۵۸؛ کتانی، اول، ص ۱۰۹۔

(۱۱۵) ابن ہشام، سوم، ص ۵۴۵؛ واقدی، ص ۸ - ۱۰۷۷؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۶۸؛ طبری، سوم، ص ۳-۱۲۲؛ نیز ملاحظہ ہو بخاری، کتاب الحج۔

(۱۱۶) ایضاً۔ بخاری کا بیان ہے کہ اعلان حضرت ابوبکر صدیق نے کیا تھا۔

(۱۱۷) سورۃ التوبہ، آیت ۲۸۔

(۱۱۸) بخاری، حجۃ الوداع؛ ابن اسحاق، ص ۵۲ - ۶۴۹؛ واقدی، ص ۱۰۸۸ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۷۲ وغیرہ؛ طبری، سوم، ص ۱۴۸ وغیرہ۔

(۱۱۹) مسلم اور ابوداؤد، حجۃ الوداع؛ کتانی، اول، ص ۱۰۹۔

(۱۲۰) بخاری، مذکورہ بالا؛ واقدی، ص ۸۴۵۔

(۱۲۱) ابن اسحاق، ص ۶۵۲؛ طبری، سوم، ص ۱۵۱۔ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ جملہ در جملہ دہراتے تھے۔ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۷۰۔

(۱۲۲) ایضاً۔ حجۃ الوداع؛ نیز کتانی، اول، ص ۷۱۔

(۱۲۳) اسد الغابہ، اول، ص ۲-۱۴۱۔

(۱۲۴) طبری، دوم، ص ۶۲۴ کے مطابق ان کے والد کا نام عمیر تھا۔

(۱۲۵) واقدی، ص ۵۲۲، ۵۳۲، ۱۰۷۷، ۱۰۹۰؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲۱، ۱۶۳، ۱۶۸؛ نیز ملاحظہ کیجئے طبری، دوم، ص ۶۲۴ اور اسد الغابہ، پنجم، ص ۴۔ صاحب البدن کے کام اور اس کی نوعیت کے سلسلہ میں کتانی، اول، ص ۱۱۰، نے موطا امام مالک اور نسائی کی روایات بیان کی ہیں۔

(۱۲۶) بخاری، صحیح، کتاب الحج۔

(۱۲۷) اسد الغابہ، دوم، ص ۴۷۸ اور چہارم، ص ۹۲۔

(۱۲۸) جمہرہ، ص ۱۷۶؛ اصابہ ۲۱۷۰۔

(۱۲۹) واقدی، ص ۸۳۸؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۳۷؛ نیز دیکھئے ابن سعد، چہارم، ص ۲۵؛ بخاری، کتاب الحج؛ اسد الغابہ، سوم، ص ۱۲- ۱۰۹۔

(۱۳۰) ملاحظہ ہو میرا مضمون مذکورہ بالا، برہان، دہلی، جنوری ۱۹۸۰ء۔

(۱۳۱) واقدی، ص ۸۳۷-۸؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۳۷؛ بخاری، کتاب الصلوٰۃ؛ اسد، سوم، ص ۳۷۲؛ زبیری، ص ۲-۱۵۱؛ موخر الذکر کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ کی کلید حضرات طلحہ بن عثمان اور شیبہ بن عثمان کو عطا فرمائی تھیں اور باقی بنو عبدالدار کو اس سے محروم رکھا تھا؛ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول، ص ۱۲-۱۱۰۔

(۱۳۲) ایضاً۔

(۱۳۳) واقدی، ص ۸۴۲؛ ابن سعد، دوم، ص ۱۲۱؛ اسد، اول، ص ۲۱۴۔

(۱۳۴) ایضاً؛ نیز خاکسار کا مضمون محولہ بالا در حاشیہ ۱۳۰۔

تعلیقات و حواشی

۱- محمد بن اسحاق (متولد ۸۵ھ - مدینہ / متوفی ۱۵۱ھ - بغداد)

۲- محمد بن عمر واقدی (متولد ۱۳۰ھ متوفی ۲۰۷ھ بغداد)

۳- اسلامی تاریخ نویسی کے لئے ملاحظہ کیجئے: اے گلیوم (A. Guillaume) کا مقدمہ "سیرت رسول اللہ" از ابن اسحاق، انگریزی ترجمہ، لندن ۱۹۵۵ء، xli تا xxiii، Historians of the Middle East مرتبہ برنارڈ لوئس اور پی ایم ہولٹ (Bernard Leuis & P. M. Holt) . لندن ۱۹۶۲ء، خاص کر مضامین منٹگمری واٹ، عبدالعزیز دوری، روزنتھال، وغیرہ، مارگولیتھ (D. S. Margolioth) Lectures on Arabic Historians کلکتہ ۱۹۳۰ء، روزنتھال (F. Rosenthal) History of Muslim Historiography، لندن ۱۹۵۲ء، خاص کر شروع کے صفحات ۱-۱۷، نثار احمد فاروقی Early Muslim Historiography دہلی ۱۹۷۹ء، "The Earliest Biographies of the Prophet and their Biographers" جوزف ہوروونس (Joseph Horovits) ، اسلامک کلچر، حیدرآباد دکن ۱۹۲۷-۲۸ء اور اس کا اردو ترجمہ سیرت نبوی کی ابتدائی کتابیں اور ان کے مؤلفین، ادارہ ادبیات دلی، ۱۹۷۰ء، خاص کر شروع کے صفحات، اول ص ۵۹-۵۳۵، دوم ص ۵-۲۲ وغیرہ - جواد علی "موارد التاریخ الطبری"، مجلہ مجمع العلمی العراقی، بغداد عراق ۱۹۵۳ء - اور اس کا اردو ترجمہ از نثار احمد فاروقی، دہلی ۱۹۶۰ء، جگدیش نرائن سرکار History of History writing in Medilval India، کلکتہ ۱۹۷۷ء، باب دوم، نیز شبلی نعمانی، سیرت النبی، اعظم گڈھ ۱۹۷۰ء، اول ص ۸۵-۱۱ -

۴- عبدالرحمٰن بن محمد ابن خلدون (متولد ۷۳۲ھ / ۱۳۳۲ء - تیونس / متوفی ۸۰۸ھ / ۱۴۰۶ء مصر)

۵- ابن خلدون، مقدمہ، انگریزی ترجمہ فرانز روزنتھال (Franz Rosenthal)، جلد اول ص ۴ -

۶- ابن اسحاق، مذکورہ بالا ص ۲۲۱، کا ہجرت مدینہ کے بارے میں ابتدائی بیان یہاں ذکر کرنے کے قابل ہے:

> "جب قریش نے یہ دیکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک جماعت اور اصحاب جمع ہوگئے جو صرف قریش اور مکہ سے تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ دوسرے علاقوں کے بھی تھے اور آپ کے اصحاب نے ہجرت کرکے ان سے جاملنا شروع کر دیا تھا اور ان کو علم ہوگیا تھا کہ وہ اپنے نئے گھر میں نہ صرف بس گئے تھے بلکہ وہاں ان کے حامی و ناصر بھی تھے تو ان کو خوف محسوس ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جلد ہی ان سے جاملیں گے کیونکہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ آپ نے ان سے جنگ کرنے کا عزم مصمم کر رکھا تھا۔"

آخری جملہ کس طرح ثابت کرتا ہے کہ ابن اسحاق یا ان کے راوی کس طرح عداوتِ قریش برائے رسولؐ سے متاثر و مغلوب تھے - ہجرتِ مدینہ کے وقت کی مسلمانوں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ نئے وطن میں پہونچ کر قریش کے خلاف محاذِ جنگ کھولیں گے - اس وقت اگر کوئی محرک تھا تو وہ قریش کے چنگل سے نکلنا اور کسی مرکز اسلام میں امت مسلمہ کی تنظیم کرنا - ظاہر ہے کہ ہجرت کے مقاصد و محرکات کی یہ تشریح و تعبیر ابن اسحاق نے حیاتِ نبوی کے اس دور

کے پس منظر میں کی ہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قریش سے پیچ مچ برسرِ پیکار تھے اور یہی سبب ہے کہ ابن اسحاق نے ابتدائی جھڑپوں کو اسی عداوتِ قریش کے پس منظر میں دیکھا ہے۔ اسی طرح سیرت نگار مذکور نے بیعت عقبۂ ثانیہ کے بعد قریش اور جماعت انصار کے درمیان ایک گفتگو کے ضمن میں ذکر کیا ہے کہ قریشیوں کو شبہ تھا کہ اس بیعت کی منجملہ شرائط میں سے ایک یہ بھی کہ وہ قریش کے خلاف جنگ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کریں گے۔ ظاہر ہے کہ قریش تو یہ شبہ کرنے میں حق بجانب ہو سکتے تھے، یا ان کے الزام کو بے بنیاد قرار دیا جا سکتا تھا جیسا کہ جماعتِ اوس و خزرج کے غیر مسلموں نے کیا بھی تھا، لیکن ابنِ اسحاق نے اس سے جو تاثر دیا ہے وہ یہ ہے کہ قریش سے جنگ کرنے کا مصمم ارادہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے قبل کر رکھا تھا۔ یہ تو صحیح ہے کہ اس بیعت یا معاہدے میں جنگ کی شرط شامل تھی لیکن کیا واضح طور سے قریش مراد تھے؟ یہ کہنا تاریخی حقیقت کے خلاف ہوگا۔

۷۔ اس نقطۂ نظر کے لئے ملاحظہ ہو: لیون کیتانی (Leone Caetani) 'Annalide'll Islam' ملان ۱۹۰۵ء، جلد اول، ص ۳۸۰-۳۴۵، کارل بروکلمن (Carl Brockelmann) 'History of the Islamic People' انگریزی ترجمہ از جوئل کارمیخائیل (Joel Carmichael) اور موشے پرلمن (Moshe Perlmann) لندن ۱۹۷۹ء، ص ۲۳-۲۴، فلپ، کے ہٹی (Phillip K. Hitti) 'Islam, A way of life' لندن ۱۹۷۰ء، ص ۱۵، History of the Arabs لندن ۱۹۴۹ء، ص ۱۶، ۱۱۶، مونٹگمری واٹ (Montgomery Watt) 'Muhammad at Medina' لندن ۱۹۶۸ء، ص ۲-۹، فرانسسکو جبریئلی (FRANCESCO GABRIELI) Muhammad and the conguest of Islam، انگریزی ترجمہ از ورجینا لوئنگ (Virgina Luling) اور روزامنڈ لنل (Rosamand Linell)' لندن ۱۹۶۸ء، ص ۶۸، ڈبلو، سی ٹیلر (W. C. Taylor) 'The History of Mohammadanism' لندن ۱۸۴۴ء، ص ۱۰۸-۱۰۹، جی، ای وان گرونی بام (G. E. Von Grunebowm)، کلاسیکل اسلام، انگریزی ترجمہ کیتھرین واٹسن (Katherine Watson)، لندن ۱۹۷۰ء، ص ۳۵-۳۶، اور مونٹگمری واٹ (Muhammad: Prophet and statesman)، لندن ۱۹۶۱ء ص ۱۰۲-۱۰۹، نے یہ اچھوتا خیال پیش کیا ہے کہ ہجرت سے قبل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غالباً "رزیہ" کے بارے میں منصوبہ بنا لیا تھا۔ مزید یہ کہ "رزیہ" سے "جہاد" تک پہونچنا محض نام کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ فوجی کارروائی کی نوعیت اور ماہیت میں تبدیلی آ گئی تھی"۔ رزیہ محض ایک قبیلہ کی دوسرے قبیلہ پر تاخت کا نام تھا جبکہ جہاد میں مسلمان غیر مسلموں سے بطور جماعت یا امت نبرد آزما ہوتے تھے۔

۸۔ یہ نقطۂ نظر زیادہ وضاحت سے مونٹگمری واٹ نے پیش کیا ہے۔ مختصراً فرانسسکو جبریئلی کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔

۹۔ فلپ ہٹی نے اپنی تازہ ترین تصنیف "اسلام۔ ایک طریقِ حیات" میں یہی فرض انجام دیا ہے۔

۱۰۔ ان جدید مسلم مورخین میں ممتاز حسب ذیل ہیں: محمد حمید اللہ "عہد نبوی کے میدان جنگ"، انگریزی، حیدرآباد دکن ۱۹۷۳ء،

ص۱۲۔ محمد حسین ہیکل "حیاۃ محمد" انگریزی ترجمہ از اسمٰعیل رازی فاروقی، علی گڑھ طبع، غیر مورخہ ص۲۰۶۔۲۰۰ شبلی نعمانی، سیرت النبی، دار المصنفین اعظم گڈھ، طبع چہارم (غیر مورخہ)، اول ص۳۱۰۔۳۰۹، فرماتے ہیں کہ: "کیونکہ اس جرم میں کہ انصار نے مسلمانوں کو پناہ دی ہے، قریش نے مدینہ کی بربادی کا فیصلہ کر لیا، اور اپنے قبائل متحدہ میں یہ آگ بھڑکا دی تھی، اس بنا پر آپ نے دو تدبیریں اختیار کیں، اوّل یہ کہ قریش کی شامی تجارت جو ان کا مایۂ غرور تھی بند کر دی تاکہ وہ صلح پر مجبور ہو جائیں۔ دوسرے یہ کہ مدینہ کے قرب و جوار کے جو قبائل ہیں ان سے امن و امان کا معاہدہ ہو جائے۔"

۱۱۔ سید سلیمان ندوی، سیرت النبی، دار المصنفین اعظم گڈھ، اول ص۳۱۲ حوالہ ۲؛ شاہ محمد سلیمان منصور پوری، رحمۃ للعالمین، لاہور ۱۹۲۱ء، دوم، ص۴۵-۲۴۳ اور ص۶۴-۱۶۳، نیز خاکسار کی کتاب Organisation of Government Under the Prophet ادارہ ادبیات دلی، ۱۹۸۲ء، ص۲۳-۱۵ تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجئے جس میں پہلی بار یہ نقطۂ نظر مفصل و مدلل پیش کیا گیا ہے۔ مکمل بحث اس مضمون میں پیش کی جا رہی ہے۔

۱۲۔ واقدی، کتاب المغازی، مرتبہ مارسدن جونز (Marsden Jonos) آکسفورڈ ۱۹۶۶ء، ص۲ اور ص۱۳-۹

۱۲ ب۔ کتاب المحبر ص۱۱۱ کے مطابق یہ دونوں غزوات بالترتیب جمعرات ۲ شعبان ۲ھ کو ینبوع اور منگل ۴ شعبان ۲ھ کو سفوان گئے تھے۔ موخر الذکر میں آپ نے قبیلۂ غفار اور قبیلۂ اسلم سے ایک معاہدۂ دوستی (کتاب مدا محۃ) کیا تھا۔

۱۳۔ ابن اسحاق، انگریزی مذکورہ بالا، ص۲۸۱۔

۱۴۔ ابن ہشام، سیرۃ النبی، مرتبہ محمد محی الدین عبد الحمید، قاہرہ غیر مورخہ، دوم ص۲۲۴ اور ص۳۰-۲۲۹۔ نیز ملاحظہ کیجیے: محمد بن حبیب بغدادی (متوفی ۲۴۵ھ/۸۵۹ء) کتاب المحبر، مرتبہ ایلزہ لیختن شٹیتر، حیدرآباد، حیدرآباد دکن ۱۹۴۲ء۔ ص۱۱۶۔

۱۵۔ محمد بن سعد (متولد ۱۶۸ھ بصرہ / متوفی ۲۳۰ھ۔ بغداد)۔

۱۶۔ احمد بن یحییٰ بن جابر بلاذری (متوفی ۲۰۹ھ/۸۹۲ء۔ بغداد)۔

۱۷۔ واقدی، ص۲ اور ص۱۳؛ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، بیروت ۱۹۵۷ء، دوم ص۶۔ بلاذری، انساب الاشراف، مرتبہ محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء، اول ص۲۸۷، یعقوبی، تاریخ یعقوبی، بیروت ۱۹۶۰ء، دوم ص۶۹۔ طبری، تاریخ الطبری، مرتبہ محمد ابو الفضل ابراہیم، قاہرہ ۱۹۶۱ء، دوم ص۱۵-۴۰۲، ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، بیروت ۱۹۶۵ء جلد دوم ص۱۱۱۔

۱۸۔ جے، ایم، بی، جونس "The chronology of the Maghazi — A textual Survey," Bulletin of the School of Oriental and African studies، یونیورسٹی آف لندن، جلد ۱۹، حصہ دوم ۱۹۵۷ء، ص۸۰-۲۴۵ خصوصاً ص۲۴۵ اور ص۲۶ اس خیال کا اظہار بعض اور مستشرقین نے بھی کیا ہے۔ لیکن بعض مہموں کے سلسلے میں واقدی کی روایت پر ابن اسحاق کی روایت کو ترجیح دی جانی چاہیے جیسا کہ غزوۂ ذو العشیرہ سے واضح ہوتا ہے ایک کم معروف مورخ محمد بن حبیب بغدادی (متوفی ۲۴۵ھ) نے ان مہموں کی تعیین اگرچہ مختلف تاریخیں دی ہیں، ملاحظہ ہو کتاب المحبر ص۲۵-۱۱۰۔

۱۹۔ واقدی ص۲ اور ص۹۔

٢٠- واقدی نے مہاجرین میں حضرت ابو عبیدہ بن جراح، ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ، سالم مولیٰ ابی حذیفہ، عامر بن ربیعہ، عمرو بن سراقہ، زید بن حارثہ، کنّاز بن حصین اور ان کے فرزند مرثد اور غلام رسولِ کریم انیثہ کے نام گنائے ہیں۔ اور انصار میں حضرات ابی بن کعب، عمارہ بن حزم، عبادہ بن صامت، عبید بن اوس، اوس بن خولی، ابو دجانہ، منذر بن عمرو، رافع بن مالک، عبداللہ بن عمرو بن حرام اور قطبہ بن عامر بن حدیدہ کے۔ یہ کل انیس آدمیوں کے نام ہیں جن میں سے ۹ مہاجر ہیں اور ۱۰ انصار۔ باقی ۱۱ کے نام غیر مذکور ہیں۔ اگرچہ واقدی نے واضح کر دیا ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے اور بدر سے پہلے کسی مہم میں کوئی انصاری شریک نہ تھا اور اسی کو اکثر جدید و قدیم مورخین تسلیم کرتے ہیں، لیکن یہ خیال یا روایت صحیح نہیں ہے۔ نہ صرف قرائن بلکہ مسلمہ تاریخی حقائق سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ ان ابتدائی مہموں میں مہاجرین کے شانہ بشانہ انصار برابر کے شریک و سہیم تھے البتہ یہ ممکن ہے کہ بعض بہت ہی مختصر سرایا میں جیسے سریہ نخلہ اور سریہ خرار میں وہ شریک نہ رہے ہوں۔ بعض مستشرقین نے بھی یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ابتدائی مہموں میں انصار مہاجرین کے برابر کے شریک و سہیم تھے ملاحظہ ہو: واٹ، محمد مدینہ میں ص ۳-۲ لیکن ابھی تک اس موضوع پر کوئی خاص تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔

٢١- واقدی، ص ۹- مجدی بن عمرو جہنی کے لیے ملاحظہ کیجئے: مذکورہ بالا۔ نیز دیکھئے کتاب المحبر، ص ۱۱۶ جس کے مطابق روانگی نصف ربیع الاول کو اور واپسی آخر ماہ میں ہوئی تھی۔

٢٢- ابن سعد، دوم ص ۶ العیص، ابن اسحاق ص ۵۰۰ کے مطابق، ساحلی علاقے میں ذوالمروہ کے خطے میں قریشی شاہراہ تجارت پر واقع تھا جس پر شام کو کارواں جایا کرتے تھے۔

٢٣- ابنِ اسحاق۔ ص ۲۸۱۔

٢٤- ابن ہشام، جلد دوم ص ۲۳۰۔

٢٥- بلاذری، جلد اول ص ۳۷۱۔

٢٦- یعقوبی، جلد دوم ص ۶۹ (احمد بن ابی یعقوب بن جعفر بن وہب بن واضح یعقوبی۔ متوفی بعد ۳۰۰ھ۔ بغداد)

٢٧- ابن اثیر، اسد الغابہ، طہران ۱۳۷۷ھ، پنجم ص ۸۰-۷۹۔ (عزالدین ابوالحسن علی بن محمد بن عبدالکریم جزری (متوفی ۶۳۰ھ۔ بغداد)

٢٨- طبری، تاریخ، دوم ص ۴۰۲ (ابو جعفر محمد بن جریر طبری، (متولد ۲۲۴ھ رمتوفی ۳۱۰ھ۔ بغداد)

٢٩- واقدی کا جملہ ہے: اول لواء عقدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد ان قدم المدینۃ لحمزۃ بن عبد المطلب، بعثہ ثلاثین راکبا شطرین..... فبلغوا سیف البحر، یعترض لعیر قریش ...... طبری کا جملہ ملاحظہ کیجئے: وزعم الواقدی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عقد...... لحمزۃ بن عبد المطلب لواء ابیض فی ثلاثین رجلا من المہاجرین یعترض لعیرات القریش... ... طبری کی روایت میں نہ صرف اضافہ ہے بلکہ اِس کے اضافے نے ایک اتفاقی واقعہ کو محرک و مقصد بنا دیا ہے۔

٣٠- طبری، تاریخ، جلد دوم ص ۴۰۴، ابنِ اثیر، اسد الغابہ جلد دوم ص ۵۰-۴۶۔ العیص کے لئے ملاحظہ کیجئے: یاقوت حموی،

معجم البلدان، بیروت ۱۹۵۷ء، جلد چہارم ص ۱۴۳ ۔ یاقوت نے ابن اسحاق کے بیان پر کوئی خاص اضافہ نہیں کیا ہے بس اتنا
کہا ہے کہ وہ ذی المروہ کے نواح میں ساحل بحر (سیف البحر) پر واقع تھا جس پر قریش شام کا سفر کیا کرتے تھے ۔

۳۱۔ پڑوسی بدوی قبائل جہینہ و مزینہ وغیرہ سے انصارِ مدینہ کے رشتۂ حلف کے لئے ملاحظہ کیجیے: خاکسار کی مذکورہ بالا کتاب باب دوم
بحث بر قبائل جہینہ و مزینہ و دیگر مغربی بدوی قبیلے، محمد مدینہ میں ص ۸۲-۸۷ ۔ اے پی کیسن ڈی پرسیول Essai Sural'
Histoire ('A.P. Caussin de Perceval) des Arabs avant l' Islamis me، پیرس ۱۸۴۷ء
جلد دوم ص ۶۹۸ وغیرہ ۔ محمد احمد جاد المولی بک، علی محمد بجاوی اور محمد ابوالفضل ابراہیم، ایام العرب فی
الجاہلیۃ، مصر ۱۹۴۲ء، ص ۶۲-۸۴ ۔

۳۲۔ واٹ، محمد مدینہ میں (انگریزی) ص ۶۲-۸۴ ۔

۳۳۔ طبری، جلد دوم ص ۴۰۴ ۔

۳۴۔ ابن اثیر، اسد الغابہ، جلد دوم ص ۴۶-۵۰

۳۵۔ واٹ، محمد مدینہ میں (انگریزی) ص ۲-۳ ۔

۳۶۔ رابغ ایک وادی کا نام تھا جسے حجاج بزواء اور جحفہ غرور سے پرے طے کرتے تھے۔ ابن السکیت کا خیال ہے کہ رابغ جحفہ اور ودان
کے درمیان ہے جبکہ واقدی کا بیان ہے کہ ابواء اور جحفہ کے درمیان واقع شاہراہ پر جحفہ سے دس میل کے فاصلہ پر ہے۔ ملاحظہ ہو
معجم البلدان، سوم ص ۱۱ ۔ قدید مکہ کے قریب ایک مقام تھا۔ ملاحظہ ہو معجم البلدان جلد چہارم ص ۳۱۳ ۔ معجم البلدان، جلد دوم ص ۱۱۱
جحفہ کے لئے۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان کے راستے پر اول الذکر سے چار مرحلوں پر وہ ایک بڑا گاؤں تھا۔ شامی و مصری حجاج
کے لیے وہ میقات تھا اگر وہ مدینہ سے نہ گذریں، لیکن مدینہ ہو کر آنے والوں کے لیے ذوالحلیفہ میقات تھا۔ ساحل سے جحفہ کا فاصلہ
محض تین مراحل کا ہے۔ جبکہ ساحل سمندر پر واقع مقام اقرن سے چھ میل اور مدینہ سے چھ مراحل پر واقع ہے اور غدیر خم سے
محض دو میل پر۔ جحفہ مدینہ کی جانب سے مکہ کی پہلی سرحد ہے۔

۳۷۔ واقدی، ص ۱۰-۱۱ ۔

۳۸۔ ابن اسحاق ص ۲۸۱ ۔ ابن ہشام جلد دوم ص ۲۴-۲۵ ۔ نیز ملاحظہ کیجیے: کتاب المحبر، ص ۱۱۶ میں مہم کی منزل ثنیۃ المرۃ اور
قائدِ کاروانِ قریش کا نام عکرمہ بن ابی جہل بتایا گیا ہے۔ روانگی کی تاریخ پہلی ربیع الاول اور واپسی آخر ماہ میں بتائی گئی ہے۔

۳۹۔ ابن سعد، جلد دوم ص ۷ ۔ ۴۰۔ انساب الاشراف، جلد اول ص ۳۷۱ ۔

۴۱۔ یعقوبی، دوم ص ۶۹ ۔ ۴۲۔ طبری، دوم، ص ۴۰۲ ۔

۴۳۔ معجم البلدان، جلد اول ص ۷۹ ابواء اور ودان مدینہ کے فرع کے نواح میں تھا اور مدینہ سے اس کا فاصلہ تیئیس ۲۳ میل تھا۔
اور وہ غزوہ سے پرے بزواء اور جحفہ کے درمیان واقع تھا۔ مؤخر الذکر مقام مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع شاہراہ پر ایک گاؤں
تھا۔ ساحل سے وہ تین مراحل پر اور مدینہ سے چھ مراحل پر واقع تھا۔ نیز ملاحظہ کیجیے معجم البلدان جلد دوم ص ۸۵ اور ص ۱۱۱ جلد سوم ص ۱۱

یاقوت نے ثنیۃ المُرّہ کی کوئی تشریح یا وضاحت نہیں کی ہے ۔

۴۴- خزاعہ سے قریش کے قومی تعلقات کے لیے ملاحظہ کیجیے : ابن اسحاق ص ۴۸-۹ ، ص۵۲ ، ابن سعد جلد اول ص۶۸-۹ ، جلد چہارم ص۲۲۲ ، محمد بن حبیب بغدادی ، کتاب المنمق فی اخبار قریش ، مرتبہ خورشید احمد فارق ، حیدر آباد دکن ۱۹۶۴ء ص۸ ، انساب الاشراف جلد اول ص۴۹-۵ ، ازرقی ، کتاب اخبار مکہ ، مرتبہ فرڈیننڈ وسٹنفلڈ (Ferdinand Wiistenfeld) بیروت ۱۹۶۴ء ص۶۴-۶۶ اور طبری ، جلد دوم ص۴۳ ، نیز خاکسار کی کتاب مذکورہ بالا باب دوم - خاندانِ رسولؐ سے معاہدۂ خزاعہ کے لیے عموماً اور قریش سے تعلقات کے لیے خصوصاً ملاحظہ کیجیے : واٹ ، محمدؐ مدینہ میں ص۸۲-۸۴ ۔

۴۵- یاقوت ، معجم البلدان ، جلد دوم ص۳۵ ، نے خرار کے بارے میں کوئی نئی بات نہیں کہی ہے ۔ وہ حجاز میں جُحفہ کے قریب ایک مقام تھا - مدینہ کی وادیوں میں سے ایک تھا اور ایک روایت کے مطابق وہ مدینہ کی وادیوں میں سے ایک چشمہ تھا اور ایک اور روایت کے مطابق وہ خیبر میں ایک مقام تھا - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نام کے کئی مواضع تھے جیسا کہ ابنِ اسحاق کے اضافی فقرے " من ارض الحجاز " سے معلوم ہوتا ہے - لیکن یہ خرار ارضِ حجاز میں اس عام شاہراہِ تجارت سے ہٹ کر تھا جس پر مکی کارواں شام کو جایا کرتے تھے - ابنِ اسحاق ص۲۸۶ کے ہی بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے سفر کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام سے قُدید سے پہلے گذرے تھے ۔

۴۶- واقدی ص۱۱ ، نیز ملاحظہ ہو کتاب المحبر ص۱۱۹ جس کا خیال ہے کہ یہ مہم رجب کے نئے چاند کو دیکھ کر روانہ ہوئی تھی ۔

۴۷- ابن سعد ، جلد دوم ص۷

۴۸- ابنِ اسحاق ، ص۲۸۶ ، ابن ہشام ، جلد دوم ص۲۳۸ ۔

۴۹- انساب الاشراف ، جلد اول ص۲۸۷ ۔

۵۰- یعقوبی ، جلد دوم ص۶۹ ۔

۵۱- طبری ، تاریخ ، جلد دوم ص۴۰۳ ۔

۵۲- واقدی ، ص۱۱-۱۲ ۔ نیز دیکھئے کتاب المحبر ، ص۱۱ ، جس کے مطابق صفر کی چند راتوں کے بعد آپ روانہ ہوئے تھے اور بنوضمرہ سے معاہدہ کیا تھا ۔ اور ماہ ربیع الاول کی پہلی تاریخ کو واپس آئے تھے ۔ بغدادی نے کسی کاروانِ قریش کا حوالہ تک نہیں دیا ہے ۔

۵۳- ابن سعد ، جلد دوم ص۸

۵۴- ابن اسحاق ص۲۸۱ ، ابن ہشام ، جلد دوم ص۲۲۳-۲۴

۵۵- انساب الاشراف ، جلد اول ص۲۸۷ ۔

۵۶- تاریخ یعقوبی ، جلد دوم ص۶۶ ۔

۵۷- تاریخ طبری ، دوم ص۴۰۳ اور ص۴۰۷ ۔

۵۸- واقدی ، ص۱۲ ۔ محمد بن حبیب بغدادی ، کتاب المحبر ، ص۱۱ ، کا خیال ہے کہ بُواط مدینہ سے صرف تین مراحل پر شام کے راستے میں واقع تھا ۔ ۳ ربیع الآخر ۲ھ کو روانگی اور اسی سال ۲۰ ربیع الآخر کو واپسی ہوئی تھی ۔

۵۹- ابن سعد ، جلد دوم ص۸-۹ ۔

۶۰- انساب الاشراف جلد اول ص۲۸۷ ۔

۶۱ - تاریخ یعقوبی، جلد دوم ص ۶۶ ۔

۶۲ - تاریخ طبری، جلد دوم ص ۴۰۷ ۔

۶۳ - ابن اسحاق، ص ۲۸۵ ، ابن ہشام، جلد دوم ص ۲۳۸ ۔

۶۴ - ابن سعد کے بیان کی تائید یاقوت سے بھی ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو معجم البلدان جلد اول ص ۵۰۳

۶۵ - معجم البلدان جلد دوم ص ۹-۱۵۸ ، کی ایک روایت کے مطابق مکہ کو جانے والے راستہ پر مدینہ کے نواح میں واقع تھا۔

۶۶ - واقدی ص ۱۲ ۔

۶۷ - ابن سعد، جلد دوم ص ۹ ، نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق ص ۲۸۶ ، بغدادی، کتاب المحبر، ص ۱۱۱ ، اس کو محض غزوۂ بدر اولیٰ کہتا ہے اور سفوان کا ذکر نہیں کرتا۔

۶۸ - انساب الاشراف جلد اول ص ۲۸۷ ۔

۶۹ - تاریخ یعقوبی، جلد دوم ص ۶۶

۷۰ - تاریخ طبری، جلد دوم ص ۴۰۷ ۔

۷۱ - ابن اسحاق، ص ۲۸۶ ۔ ابن ہشام، جلد دوم ص ۲۳۸ ۔ نیز دیکھئے کتاب المحبر، ص ۱۱۱ ، جس کے مطابق دوشنبہ ۱۲ جمادی الاخریٰ سنہ ۲ھ کو غزوہ کی روانگی ہوئی اور اس ماہ کی چند راتیں باقی بچی تھیں کہ واپسی ہوئی۔

۷۲ - واٹ، محمد مدینہ میں، ص ۴ ۔ تعجب ہے کہ واٹ نے کرز فہری کو پڑوسی علاقے کا ایک لٹیرا ثابت کرنے کی کوشش ہے جبکہ ان کا تعلق قریش کے خاندان بنی فہر سے تھا۔ گویا کہ جارحیت کا آغاز قریش کی طرف سے ہوا تھا۔ ملاحظہ ہو اصابہ، سوم ص ۲۰۱ ۔ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، اول، ۳۱۲ ، رحمۃ للعالمین، جلد دوم ص ۱۵-۱۱۴ ۔

۷۳ - واقدی، ص ۱۳-۱۲ ۔ نیز ملاحظہ ہو کتاب المحبر ص ۱۱۱ ، جس کا بیان ہے کہ یکم جمادی الاولیٰ کو روانگی اور ۲۲ جمادی الآخرہ کو واپسی ہوئی۔ اس میں بنو مدلج اور اس کے ضمری حلیفوں سے معاہدہ ہوا۔ بغدادی نے اس میں بھی کسی کاروانِ قریش کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

۷۴ - ابن سعد، جلد دوم ص ۱۰-۹ ۔

۷۵ - انساب الاشراف، جلد اول ص ۲۸۷ ۔

۷۶ - ابن اسحاق ص ۶-۲۸۵ ۔

۷۷ - ابن ہشام، جلد دوم ص ۳۷-۲۳۴ ۔

۷۸ - تاریخ یعقوبی، دوم ص ۶۶ ۔

۷۹ - تاریخ طبری، جلد دوم ص ۱۰-۴۰۹ ۔

۸۰ - واقدی ص ۲۰-۱۹ اور ص ۲۸ ۔

۸۱ - تاریخ طبری، جلد دوم ص ۴۲۱

۸۲ - واقدی ص ۲۰-۱۹ ، ابن سعد، جلد دوم ص ۱۳-۱۲ ۔

۸۳ - ابن اسحاق ص ۲۸۹ ۔ ابن ہشام، جلد دوم ص ۲۴۴ ۔ موخر الذکر نے اول الذکر کی روایت کو یوں شروع کیا ہے:

"لما سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بأبی سفیان مُقبِلاً من الشام ندب المسلمین الیھم...."

۸۴ - واقدی ص ۲۸ ۔

۸۵- رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی اور سعید بن زید عدوی کو کاروانِ قریش کی خبر لانے بھیجا تھا۔ واقدی ص۵ اور ابن سعد جلد دوم ص۱۱ کے مطابق ۱۲ رمضان ۲ھ بروز ہفتہ بدر کے لئے روانہ ہونے سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں جاسوسوں کو دس دن پہلے یعنی ۲ رمضان کو بھیجا تھا۔ ان دونوں نے قبیلۂ جہینہ کے ایک سردار کے گھر قیام کیا تھا اور چھپ کر معلومات فراہم کی تھیں۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ جہنی سردار نے کارواں والوں کو ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ ملاحظہ ہو: واقدی ص۲۰-۱۹، ابن سعد، جلد دوم ص۱۲-۱۱، طبری، جلد دوم ص۴۲۸، اسد الغابہ جلد دوم ص۳۰۶ اور سوم ص۵۹ - ابن ہشام اور محمد بن حبیب بغدادی کا خیال ہے کہ آپ بدر کے لئے ۸ رمضان کو روانہ ہوئے تھے۔ ملاحظہ ہو ابن اسحاق ص۲۳۸ اور کتاب المحبر ص۱۱۱ - اول الذکر کے مطابق دن دوشنبہ تھا اور موخر الذکر کے مطابق بدھ

۸۵- ماخذ نے اس سلسلہ میں جو تفصیلات فراہم کی ہیں وہ فوجی حکمت عملی کے اعتبار سے بہت اہم ہیں اور ان سے فریقین کی دوراندیشی، منصوبہ بندی اور دقتِ نظر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ بدر کے قریب پہونچنے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ایک ساتھی کے ساتھ قریش کی خبر لانے کے لئے روانہ ہوئے اور راہ میں ایک بوڑھے بدو سے دریافت حال کیا۔ اس نے فریقین کی اپنے اپنے مقام سے روانگی کی خبروں کی بنیاد پر ان کے موجودہ جائے قیام کی بالکل صحیح تعیین کی تھی۔ مگر اس سے زیادہ اہم اور دلچسپ آپ کے دو جاسوسوں کا واقعہ ہے جن کو آپ نے بدر جا کر خبر لانے کو کہا تھا۔ یہ دونوں جاسوس حضرات بسبسؓ اور عدیؓ (جو دونوں قبیلہ جہینہ کے تھے) بدر پہونچے اور وہاں دو بدوی باندیوں کی کاروان قریش کے بدر پہونچنے کی تاریخ کے بارے میں گفتگو سن کر اس نتیجے پر پہونچے کہ اسی دن یا دوسرے دن کاروانِ قریش وہاں پہونچنے والا ہے۔ ان دونوں نے یہ خبر واپس آکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ اس کے کچھ دیر بعد ابوسفیان بن حرب، کاروان قریش کے سربراہ، اسی جگہ پہونچے اور وہاں کے کنوئیں پر موجود مجدی بن عمرو جہنی سے پوچھا کہ کیا اس نے کوئی غیر معمولی بات دیکھی ہے۔ ابوسفیان اپنے کارواں سے آگے نکل آئے تھے، تاکہ مدینہ کے مسلمانوں کے بارے میں سنی ہوئی خبروں کی تصدیق کر سکیں اور مجدی بن عمرو جہنی اس وقت بھی کنوئیں پر موجود تھے جب دونوں مسلمان جاسوسوں نے وہاں سے پانی لیا تھا۔ بہرحال جیسے ہی جہنی سردار نے ابوسفیان کو بتایا کہ صرف دو سوار آئے تھے اور انہوں نے مشک میں پانی بھرا تھا ابوسفیان کے کان کھڑے ہوئے اور فوراً اس جگہ پہونچا جہاں دونوں جاسوس رکے تھے۔ وہاں آکر انہوں نے ان کے اونٹوں کے فضلہ کو چیر کر دیکھا اور اس میں مدینہ کی کھجوروں کی گٹھلیاں پائیں اور سمجھ گئے کہ دشمن جاسوس تھے۔ وہ فوراً اپنے کارواں کی طرف واپس ہوئے اور اس کا راستہ بدل دیا۔ معمول کی شاہراہ سے ہٹ کر انہوں نے ساحلی پٹی کا رخ کیا اور بدر سے بائیں طرف کترا کر نکل کر برق رفتاری سے نکل گئے۔ ملاحظہ کیجیے: ابن اسحاق ص۲۹۵-۲۹۴، واقدی ص۲۲، ابن سعد، جلد دوم ص۱۲، طبری جلد دوم ص۴۳۳ اور ص۴۳۷، ابن خلدون، تاریخ جلد اول ص۴۴۹، اسد الغابہ، جلد اول ص۱۰۸-۹ -

۸۷- ایضاً-

۸۸- کتاب المحبر، ص۱۱۰، نے روانگی اور واپسی دونوں کی قطعی تاریخیں دی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس غزوہ میں تقریباً

ایک ماہ اکیس دن لگے تھے۔ یہ بالواسطہ ابن اسحاق کی تائید کرتی ہے۔

۸۹- ابن اسحاق ص ۲۸۹، طبری، تاریخ جلد دوم ص ۴۲۱، نیز بحوالہ ابن اسحاق ص ۴۲۷۔

۹۰- واقدی ص ۲۸۔

۹۱- واٹ، محمدؐ مدینہ میں (انگریزی) ص ۲۔ مستشرق موصوف نے ایک دلچسپ تحقیق کاروان قریش کے بارے میں یہ فرمائی ہے کہ غالباً متعدد کاروانوں نے جن میں سے بعض اپنے شمالی سفر کے دوران مسلمانوں کی توجہات کا مرکز بن چکے تھے عظیم تر تحفظ و حفاظت کی خاطر مل کر ایک کارواں بنا لیا تھا۔ (ص ۱) موصوف نے یہ نتیجہ ایسا لگتا ہے کہ واقدی کی ایک روایت سے اخذ کیا ہے۔ مغازی نگار کا کہنا ہے کہ اس عظیم کاروان قریش میں قریش کے متعدد خاندانوں کے کاروان شامل تھے (واقدی ص ۲۱) اس کی تصدیق دوسرے ماخذ سے ہوتی ہے جو مختلف خاندان ہائے قریش کی شمولیت اور ان کے سرمایے کا ذکر کرتے ہیں۔ اس سے دو اہم نکتے ابھرتے ہیں اول یہ کہ قریشِ مکہ کے مختلف خاندان اپنے اپنے کارواں الگ بھیجتے تھے۔ اور یہ طرزِ عمل بنیادی طور پر اقتصادی روایت کی وجہ سے تھا جو ایک تاجرانہ معیشت کا لازمی جزو ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ شام کو جانے والا یہ عظیم قریشی قومی کارواں مخصوص حالات و اسباب کی بنا پر بھیجا گیا تھا اور اس میں متعدد خاندانوں کے کارواں مکہ سے اپنے سفر کے آغاز ہی میں شامل تھے۔ اور انہوں نے شام میں تحفظ کی خاطر یہ اتحاد نہیں کیا تھا۔ بلکہ یہ اتحاد اقتصادی اور اس کے محرکات سیاسی تھے جن کا ذکر کہیں اور آتا ہے۔ اس لیے مستشرق موصوف کا یہ خیال کہ قریشی کاروانوں نے یہ اتحاد شام میں مسلمانوں کے خطرے کے پیشِ نظر اور ان کے بارے میں اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں کیا تھا گمراہ کن ہے۔

۹۲- نخلہ مکہ اور طائف کے درمیان مشرقی مقامی راہِ تجارت پر واقع تھا۔ وہ بنو سُلیم کے علاقے کا ایک مذہبی مرکز تھا جہاں واقدی کے بقول عُزّیٰ کا بت اور مندر تھا اور جس کی تولیت بنو سُلیم کے خاندان بنو شیبان کے ہاتھوں میں تھی۔ نیز ملاحظہ ہو: یاقوت، معجم البلدان جلد پنجم ص ۲۷۷-۸۔

۹۳- بحران فرع کے نواح میں تھا اور فرع کا مدینہ سے فاصلہ آٹھ بُرد تھا یعنی تقریباً اسی میل۔ ملاحظہ ہو: معجم البلدان، جلد اول ص ۳۴۱۔

۹۴- ابن اسحاق ص ۲۸۹-۲۹۱ اور ص ۴۲۸-۷، ابن ہشام، جلد دوم ص ۲۳۷-۲۳۴۔ نیز ملاحظہ ہو، کتاب المحبر، ص ۱۱۶-۱۱۷، جس کے مطابق یہ مہم رجب کے آخری عشرہ میں روانہ اور یکم شعبان کو واپس مدینہ ہوئی تھی۔

۹۵- یاقوت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عامر کا باغ (البستان)، وادی نخلہ کے زیریں علاقہ میں تھا اور شہر نخلہ سے اس کا فاصلہ ایک رات کے سفر کا تھا جبکہ نخلہ اور مکہ کے درمیان دو راتوں کی مسافت تھی۔ گویا یہ باغ طائف اور مکہ کے بالکل بیچ میں اور اس لیے کاروانوں کے قیام کا بالکل یقینی مقام تھا۔ معجم البلدان، اول ص ۴۱۴ اور پنجم ص ۲۷۷-۸۔

۹۶- واقدی کے مرتب نے "رُکَیَّۃ" کے معنی بئر (کنوئیں) کے دیے ہیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کوئی عام کنواں نہ تھا بلکہ ایک مخصوص مقام کا نام تھا جہاں کنواں بھی تھا جیسے بئر ابن ضمیرہ، بئر معونہ، بئر ابن المرتفع اور بئر ابی عنبسہ وغیرہ تھے۔ ملاحظہ ہو صفحات ۱۳، ۲۶، ۱۶۳، ۴۰، ۴۴ وغیرہ۔

۹۷- ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ امیر سریہ نے خمس محفوظ رکھا تھا اور باقی مالِ غنیمت مجاہدینِ نخلہ میں تقسیم کر دیا تھا جبکہ اس روایت کے مطابق پورا کاروان معطل رکھا گیا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے بعد مجاہدین نے بھی اپنا حصہ موقوف کر دیا ہو اور کل مالِ غنیمت کی تقسیم بعد میں ہوئی ہو جیسا کہ دوسرے مآخذ سے معلوم ہوتا ہے۔

۹۸- عروہ کی اس روایت کی دوسری تمام روایات سے تردید ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے مقتول نخلہ کی دیت نہیں ادا کی تھی۔ اس سلسلہ میں مآخذ کی وہ متفقہ روایت بہت دلچسپ ہے جس کے مطابق عتبہ بن ربیعہ نے جو عمرو بن حضرمی کے حلیف تھے صلح جویانِ قریش کے مشورے پر اپنے مقتول حلیف کی دیت ادا کر کے مسلمانوں سے بدر میں تصادم ٹالنا چاہا تھا مگر ابوجہل مخزومی کے بھڑکانے پر مقتول ابن حضرمی کے بھائی نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے تھے اور قصاص کے علاوہ اور کچھ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا جس کے نتیجہ میں جنگِ بدر ہو کر رہی تھی۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق صـ۹۸-۲۹۷، واقدی صـ۶۵، ۶۳۔

۹۹- واقدی صـ۱۹-۱۳۔

۱۰۰- ابن سعد، جلد دوم صـ۱۱-۱۰۔

۱۰۱- انساب الاشراف، جلد اول صـ۷۲-۳۷۱۔

۱۰۲- تاریخ یعقوبی، جلد دوم۔ صـ۷۰-۶۹۔

۱۰۳- تاریخ طبری جلد دوم صـ۱۵-۴۱۰۔ سدی کی روایت کی تائید احادیث و آثار سے ہوتی ہے۔

۱۰۴- وادی ملل، مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع شاہراہ پر مدینہ سے ۲۸ میل کی مسافت پر واقع تھی۔ ملاحظہ ہو معجم البلدان، پنجم صـ۱۹۴۔ گویا مسلم جہم نے دو دن کا سفر روزانہ ۱۴ میل کے حساب سے کیا تھا۔

۱۰۵- مذکورہ بالا صـ۲۳۔

۱۰۶- مذکورہ بالا صـ۶۸۔

۱۰۷- مذکورہ بالا صـ۹-۵۔

۱۰۸- مذکورہ بالا صـ۷۔

۱۰۹- مذکورہ بالا صـ۷

۱۱- ابن منظور، لسان العرب، لفظ متعلق۔ لوئس معلوف نے المنجد (موضوع) میں اس کے معنی یوں بیان کئے ہیں: ارتصدہ و ترصدہ: ترقبہ ایف، اسٹینگاس (F. Steingass) نے A Comprehensive Arabic English Dictionary میں حسب ذیل معانی بیان کئے ہیں: (۱) Observing steadly (۲) expleting (۳) waiting for (۴) expletation (۵) hope

۱۱۱- لوئس معلوف اور اشٹینگاس وغیرہ کی لغات ملاحظہ کیجئے۔

۱۱۲- مذکورہ بالا صـ۵۔

۱۱۳- مذکورہ بالا صـ۶

۱۱۴- واٹ نے یہ نتیجہ طبری میں مذکورہ سدی کی روایت سے نکالا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

۱۱۵- واٹ اس نکتہ کی طرف اشارہ کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں واضح نہیں ہے۔ اگر مقصد یہ دکھانا ہے کہ عتبہ بن غزوان مازنی نے اپنے وطن، مالوف یا جائے پیدائش میں وقت گذاری کی تھی اور بنو سلیم سے اپنے دیرینہ تعلقات سے فائدہ اٹھایا تھا تو یہ

حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ بنو سُلیم کے قریش سے خاص کر بنو عبد شمس (یعنی بنو امیہ) اور بنو ہاشم سے بہت پرانے اور قوی تعلقات تھے۔ یہ تعلقات تجارتی، اقتصادی اور ازدواجی تھے۔ ان کا اعتراف خود واٹ نے (ص ۹۵-۹۴) کیا ہے۔ اس ذیل میں یہ حقیقت زیادہ اہم ہے کہ ایک مسلم جہاد سے تعلقات کے مقابلہ میں بہر حال قریش کے تعلقات اہم تھے اور یہ پورا علاقہ دراصل مکہ کے دائرہ اثر و اقتدار میں تھا۔

۱۱۶- واٹ، مذکورہ بالا، ص ۷-۹۶۔

۱۱۷- ابن اسحاق ص ۲۸۷۔

۱۱۸- دو دن کے سفر کے بعد کا مقام، بئر ابن ضمیرہ یا بطن ملل جس جگہ نامہ نبوی پڑھا گیا تھا اور نجران کا مقام جہاں یہ دونوں صحابی قافلے سے بچھڑے تھے پانچ چھ دن کی مسافت پر واقع تھے۔ ایک دلچسپ حقیقت اس سلسلے میں یہ ہے کہ تقریباً ایک سال بعد (جمادی الاولیٰ ۳ھ / اکتوبر۔ نومبر ۶۲۴ء میں) رسول کریم کی سربراہی میں ایک مسلم مہم جو تین سو مجاہدین پر مشتمل تھی اسی علاقے میں آئی تھی۔ مآخذ اور ان کی بنیاد پر جدید مورخین کا دعویٰ ہے کہ یہ فوجی نوعیت کی مہم تھی اور بنو سُلیم کے بعض سرکش اور مسلم مخالف خاندانوں کے باغیانہ و مدینہ دشمن ارادوں وعزائم کو کچلنے کے لئے گئی تھی۔ لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ابن اسحاق اور طبری کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علاقے میں تقریباً دو ماہ تک اور واقدی اور ان کے متبعین کے مطابق دس دن قیام کیا تھا۔ یہ قیام جنگ جوئی کے لیے نہ تھا جیسا کہ مآخذ نے تصریح کی ہے کہ اس غزوہ میں کوئی جنگ و جدال نہیں واقع ہوا تھا۔ یہ طویل مدت قیام کس مقصد سے تھی یہ ظاہر ہے۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق ص ۳۶۲۔ واقدی ص ۷-۱۹۶: ابن سعد جلد دوم ص ۳۶-۳۵۔ انساب الاشراف، جلد اول ص ۳۱۱۔ طبری جلد دوم ص ۴۸۷۔

۱۱۹- ابن کثیر، تفسیر، مطبع عیسیٰ البابی الحلبی، قاہرہ، (غیر مورخہ)، اول ص ۲۵۲۔

۱۲۰- طبری، تفسیر، مرتبہ محمود محمد شاکر اور احمد محمد شاکر، قاہرہ، چہارم ص ۷-۳۰۶

۱۲۱- ابتدائی مہموں میں سے سریہ رابغ اور سریہ خرار اور سریہ نخلہ میں ان کی شمولیت کا ذکر صراحتاً ملتا ہے اور چار ابتدائی غزوات میں بھی ان کی شمولیت تقریباً یقینی معلوم ہوتی ہے کیونکہ مآخذ کا اصرار ہے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام مشاہد (مہموں) میں شریک رہے تھے۔ بعد کے تمام اہم غزوات میں بدر سے تبوک تک۔ ان کی شمولیت کا ذکر بوضاحت ملتا ہے۔ مآخذ کے اصرار اور ان واقعاتی شہادتوں کے بعد یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ تقریباً تمام اہم غزوات و سرایا میں شامل رہے تھے۔ ملاحظہ ہو ابن سعد، جلد سوم ص ۴۱-۱۴۰۔ اسد الغابہ، جلد دوم ص ۱-۱۹۰۔

۱۲۲- ابن سعد، جلد سوم ص ۱۴۱، اسد الغابہ جلد دوم ص ۲۹۱۔ نیز ملاحظہ کیجیے ابن اسحاق ص ۳۷۷، ص ۳۸۱ وغیرہ۔

۱۲۳- ابن اسحاق ص ۳۸۶، ابن ہشام، جلد سوم ص ۳۰۔ واقدی ص ۲-۲۴۰۔ ابن سعد، جلد سوم ص ۴۱-۱۴۰۔ ان مستند مورخین کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع میں جن صحابہ کرام نے غزوۂ احد میں بے مثال قربانی و جاں نثاری کا ثبوت دیا تھا ان میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص زہری سرفہرست تھے۔ ابن اسحاق نے محمد بن عمرو کی سند پر روایت میں کہا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعدؓ

کو تیر دے کر کہتے رہتے تھے ارم سعد، فداک ابی وامی —— سعد تیر چلاتے رہو تم پر میرے ماں باپ قربان)۔ (ابن سعد نے بھی ایک روایت غزوۂ احد میں ان کی ماہرانہ تیر اندازی کے بارے میں دی ہے۔ اور ایک ایک روایت سریہ خرار اور غزوۂ بدر میں ان کی شجاعت کے بارے میں دی ہے۔ جبکہ چار روایتیں سریہ عبیدہ میں ان کی اسلام کے لیے پہلی تیر اندازی کی فضیلت میں بیان ہوئی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے حوالہ جات مذکورہ بالا۔

۱۲۴۔ ملاحظہ کیجیے: ابن سعد، جلد سوم، صہ ۱۴۱-۲۔ اسد الغابہ، جلد دوم صہ ۲۹۲ وغیرہ۔ اصابہ، جلد سوم صہ ۸۴، استیعاب جلد دوم صہ ۶۰۷ وغیرہ۔ ابن قتیبہ، المعارف، صہ ۵۰۵ کا بیان ہے کہ حضرت سعد تیر و کمان سازی کی صنعت میں عہد جاہلیت سے امتیاز رکھتے تھے اور یہ فن جنگ کے علاوہ سیر و شکار کے لیے بھی اہم تھا چنانچہ ان کو اس سے بہت دولت ملی تھی۔

۱۲۵۔ غزوۂ احد میں ثابت قدم رہنے والے مسلمانوں کے نام جن میں حضرت سعد سر فہرست ہیں حضرت مقدادؓ کی روایت پر مروی ہیں اسی طرح میدان جنگ میں داد شجاعت دینے کی روایت بہت سے راویوں سے بیان ہوئی ہے جس کے لئے واقدی نے قالوا کا لفظ استعمال کیا ہے واقدی صہ ۲۴۰-۴۱۔ اسی طرح جہاں حضرت سعد کے اسلام میں پہلے تیر چلانے والے واقعہ کے بارے میں کچھ روایتیں خود حضرت سعد سے مروی ہیں وہیں تین روایتیں، حضرت قاسم بن عبد الرحمٰن، عبد اللہ اور داؤد بن حصین سے مروی ہیں۔ ملاحظہ ہو ابن سعد، جلد سوم صہ ۱۴۰-۴۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد سے کہا تھا کہ "تیر چلاؤ میرے ماں باپ تم پر قربان"۔ اس حدیث کو حضرت علیؓ اور قیس بن ابی حازم نے بھی بیان کیا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ ان کی فضیلت میں تمام یا اکثر روایات خود حضرت سعد یا ان کے اہل خاندان سے مروی ہیں صحیح نہیں ہے۔

۱۲۶۔ ابن اسحاق صہ ۳۰۷، ابن ہشام جلد دوم صہ ۲۳۸۔

۱۲۷۔ واٹ، مذکورہ بالا صہ ۶

۱۲۸۔ مذکورہ بالا صہ ۷۔

۱۲۹۔ مذکورہ بالا صہ ۷-۸

۱۳۰۔ مضمون ہذا کا صہ ۲۸۔

۱۳۱۔ ایضاً صہ ۲۹

۱۳۲۔ ایضاً صہ ۳۲۔

۱۳۳۔ ایضاً صہ ۳۳

۱۳۴۔ ایضاً صہ ۳۵۔

۱۳۵۔ تفسیر طبری، جلد چہارم صہ ۲۰۳-۴۔

۱۳۶۔ اس ذیل میں مجاہد کی روایت، مقسم مولیٰ بن عباس کی روایت۔ محمد بن عباس کے واسطے سے ابن عباس کی ایک اور روایت، ابو مالک غفاری کی روایت بیان کی جا سکتی ہیں۔ ملاحظہ ہو مذکورہ بالا صہ ۲۰۷-۱۲۔

۱۳۷۔ مثلاً زہری کی سند پر عروہ کی روایت، مجاہد کی روایت وغیرہ، مذکورہ بالا صہ ۳۰۲۔ اور صہ ۳۰۷۔

۱۳۸۔ تفسیر ابن کثیر، اول صہ ۵۵-۲۵۲۔

۱۳۹۔ موسیٰ بن عقبہ کی ثقاہت کے لیے ملاحظہ کیجیے: ابن اسحاق کے انگریزی مترجم کا مقدمہ بر سیرت ابن اسحاق، صہ xlii-xliii نثار احمد فاروقی، سیرت نبوی کی ابتدائی کتابیں اور ان کے مؤلفین صہ ۱۰۴-۵: Early Muslim Historiography صہ ۲۶۱-۷۔

١٤٠- ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر، جلد اول ص۲۵۲-۲۵۵۔

١٤١- ابن اسحاق ص۲۸۶ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر اولیٰ سے اپنی واپسی پہ سریہ نخلہ بھیجا تھا۔ اور ایک سطر پہلے مورخ نے بیان کیا ہے کہ بدر اولیٰ سے آپ جمادی الآخرہ میں واپس مدینہ آئے اور باقی جمادی، رجب، شعبان کے مہینے آپ نے مدینہ میں گذارے۔ بدر اولیٰ سے واپسی پہ رجب میں مہم کا بھیجا جانا کچھ عجیب سا لگتا ہے جب کہ واپسی کا مہینہ جمادی تھا۔ پھر تفسیر طبری میں جب یہ روایت نقل ہوتی ہے تو اس میں مہینہ جمادی ہی مذکور رہے۔ ان شہادتوں کی بنا پر یہ یقین ہوتا ہے کہ مہم نخلہ کی روانگی کا مہینہ جمادی تھا۔ اور بغدادی نے قطعیت کے ساتھ جو آخری عشرے کی بات کہی ہے اس میں بھی ماہ کا اشتباہ معلوم ہوتا ہے۔

١٤٢- مذکورہ بالا ص۸-۹

١٤٣- ایضاً ص۸۔

١٤٤- مدنی انصاری مسلمانوں کی بُت شکنی کے واقعات کے لیے ملاحظہ کیجئے ابن اسحاق ص۲۰۷-۲۰۸، ص۲۲۷-۲۲۸۔ وغیرہ۔

١٤٥- اسلام سے پہلے اوس و خزرج کے باہمی نزاع اور جنگ جوئی کے لئے ملاحظہ ہو محمد احمد جاد المولیٰ بک، علی محمد البجاوی اور محمد ابوالفضل ابراہیم کی مرتب کردہ کتاب ایام العرب فی الجاہلیۃ، مصر ۱۹۴۲ء باب ششم (احرب الاوس والخزرج) ص۶۲-۱۴۴۔ مرتبین نے صرف چار بڑی جنگوں کا ذکر کیا ہے اور آخر میں اپنے تبصرہ میں کہا ہے کہ مدینہ کے ان دونوں قبیلوں کے درمیان بہت سی جنگیں (حروب کثیرۃ) برپا ہوتی تھیں جن میں سے ہم نے چند پر اکتفا کی ہے۔

١٤٦- مذکورہ بالا کتاب کا ص۴۳-۷۵ اور خاص کر ص۷۶۔ نیز واٹ، مذکورہ بالا ص۸۳-۸۴ وغیرہ۔

١٤٧- ملاحظہ ہو واٹ، مذکورہ بالا ص۱۰۷-۱۱۱۔

١٤٨- مال غنیمت کے سلسلے میں حکم خداوندی اور قوانین کے لئے ملاحظہ ہو ابن اسحاق ص۳۲۱-۳۲۷ خاص کر صفحہ ۳۲۴۔

١٤٩- فرانسسکو جبرئیلی، مذکورہ بالا، ص۷۔

١٥٠- واٹ، مذکورہ بالا ص۱۲ اور ص۲۵۵۔

١٥١- تفسیر طبری، جلد چہارم ص۲۹۹-۳۱۵، خاص کر ص۳۰۷-۳۱۱، تفسیر ابن کثیر، جلد اول ص۲۵۲-۲۵۵، خاص کر ص۲۵۲-۲۵۳
طبری کی بیان کردہ تمام روایات میں صرف ابو جعفر کی روایت میں مسلمانوں کو سوال کرنے والا بتایا گیا ہے۔ باقی تمام روایات میں مشرکین مکہ کو۔ اسی طرح ابن کثیر کی بیان کردہ تمام روایات میں یسئلونک سے مراد مشرکین مکہ لیے گیے ہیں۔

١٥٢- مذکورہ بالا۔

١٥٣- تفسیر طبری، جلد چہارم ص۳۰۱-۳۰۲ میں تین الفاظ قتال، کبیر اور صد کے مختلف معانی پر بحث دیکھئے۔

١٥٤- تفسیر طبری، جلد چہارم ص۳۰۲ میں حضرت جابر کی سند پر روایت مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہر حرام میں اس وقت تک غزو/جہاد نہیں کرتے تھے جب تک کہ آپ پر حملہ نہ کر دیا جائے (یُغزیٰ)

۱۵۵- زہری کا خیال ہے کہ پہلے شہر حرام میں قتال ناجائز تھا لیکن اس آیت کے نزول کے بعد جائز کر دیا گیا۔ لیکن دوسرے علماء کا خیال ہے کہ اس آیت سے شہر حرام میں قتال کسی کے لئے جائز ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں قتال کو ایک بڑا معاملہ بتایا ہے اور اس نقطہ نظر کے حامی علماء میں عطاء شامل ہیں جبکہ ابو جعفر کا خیال زہری سے متفق ہے۔ خود مفسر طبری کا خیال ہے کہ یہ آیت ناسخ ہے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن (حنین) طائف اور اوطاس کے غزوات لڑے تھے اور ان میں سے بعض کا زمانہ شہر حرام میں تھا۔ اسی طرح بیعت رضوان ماہ ذوالقعدہ میں کی گئی تھی۔ ملاحظہ ہو طبری، تفسیر، جلد چہارم ص ۲۱۳-۲۱۵۔

لیکن بنیادی طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ "اشہر حرم" میں جنگ وجدال ناجائز ہے اور مقدس مہینوں کی حرمت بدستور قائم ہے اور آیت مذکورہ بالا ان میں قتال کی حرمت کو ختم یا منسوخ نہیں کرتی ہے۔ اپنی طرف سے اقدام کرنا ہر حال میں ناجائز ہے البتہ اس آیت کریمہ نے دفاعی جنگ کرنے کی اجازت دے دی ہے جس طرح کہ ایک اور حکم خداوندی نے "حرم مکہ" میں دفاع کے لئے قتال کی اجازت دی ہے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت نمبر ۱۹۱۔

چنانچہ اس سے یہ فرق ظاہر ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت مذکورہ بالا کے نزول کے بعد جو غزوات وسرایا مقدس مہینوں میں بھیجے وہ اقدامی نہ تھے بلکہ دفاعی تھے جن کا مقصد فتنہ کا سر کچلنا تھا۔

۱۵۶- غزوات وسرایا جو مقدس مہینوں میں سے کسی میں بھیجے گئے تھے حسب ذیل نقشے سے معلوم ہوتے ہیں:-

نمبر شمار	نام سریہ/غزوہ	مہینہ وسال	قائد
۱	سریہ خرارہ	ذی قعدہ سنہ ۱ھ	حضرت سعد بن ابی وقاص
۲	سریہ نخلہ	رجب سنہ ۲ھ	حضرت عبداللہ بن جحش
۳	غزوہ سویق	محرم/صفر سنہ ۲ھ	رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
۴	غزوہ کدر	محرم سنہ ۳ھ	"
۵	سریہ قطن	محرم سنہ ۴ھ	حضرت ابو سلمہ
۶	سریہ سفیان لحیانی	"	حضرت عبداللہ بن انیس
۷	غزوہ بدر الموعد	ذوالقعدہ سنہ ۴ھ	رسول کریم ؐ
۸	غزوہ ابو رافع یہودی	ذوالحجہ سنہ ۴ھ	حضرت عبداللہ بن انیس
۹	غزوہ ذات الرقاع	محرم سنہ ۵ھ	رسول کریمؐ
۱۰	غزوہ خندق	ذوالقعدہ سنہ ۵ھ	"
۱۱	غزوہ بنی قریظہ	ذوالقعدہ/ذوالحجہ سنہ ۵ھ	"
۱۲	غزوہ قرطاء	محرم سنہ ۶ھ	"

قائد	مہینہ و سال	نام سریہ / غزوہ	نمبر شمار
حضرت زید بن حارثہؓ	رجب ۶ھ	سریہ وادی القریٰ	۱۳-
رسول کریمؐ	ذوالقعدہ ۶ھ	غزوۂ حدیبیہ	۱۴-
〃	محرم ۷ھ	غزوہ خیبر	۱۵-
حضرت ابان بن سعیدؓ	〃	سریۂ نجد	۱۶-
رسول کریمؐ	ذوالقعدہ ۷ھ	عمرۃ القضیہ	۱۷-
حضرت ابن ابی العوجار سُلمیؓ	ذوالحجہ ۷ھ	سریہ بنی سُلیم	۱۸-
حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ	رجب ۸ھ	سریہ خبط / سیف البحر	۱۹-
رسول کریمؐ	شوال - ذوالقعدہ ۸ھ	غزوۂ طائف	۲۰-
حضرت عیینہ بن حصن فزاری	محرم ۹ھ	سریہ العرج	۲۱-
رسول کریمؐ	رجب - رمضان ۹ھ	غزوۂ تبوک	۲۲-
حضرت خالد بن ولیدؓ	رجب ۹ھ	سریہ دومۃ الجندل	۲۳-
حضرت ابوبکر صدیقؓ	ذوالقعدہ / ذی الحجہ ۹ھ	حج ابی بکر	۲۴-
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم	ذوالحجہ ۱۰ھ	حجۃ الوداع	۲۵-

مذکورہ بالا مہموں میں سے تین یقینی طور پر مذہبی مقاصد رکھتی تھیں - باقی بائیس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ فوجی نوعیت کی تھیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر سیاسی تھیں -

۱۵۷- مذکورہ بالا ص ۹-۸ -

۱۵۸- سورہ توبہ آیت ۳۶ " ان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھرا فی کتاب اللہ یوم خلق السموات والارض منھا اربعۃ حرم ......" مذکورہ بالا آیت کا اردو ترجمہ از شاہ عبدالقادر دہلویؒ -

۱۵۹- تفسیر طبری، مرتبہ محمود محمد شاکر، مصر ۱۹۵۸ء، ص ۱۵-۲۴۴، نے چھ احادیث اور اتنے ہی آثار کا ذکر کیا ہے جس کے مطابق مذکورہ بالا چار مہینے ایام جاہلیت سے حرام چلے آرہے تھے اور اسلام میں بھی برقرار رہے - حضرت ابن عمر وغیرہ متعدد صحابہ کرام کی سند پر مروی روایات کے مطابق ان مہینوں کی حرمت کا واضح ذکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے اپنے آخری خطبہ میں منیٰ میں کیا تھا - اس روایت کی تصدیق کتب سیر و تاریخ سے بخوبی ہوتی ہے ملاحظہ ہو ابن اسحاق ص ۶۵۱ - خاص کر مترجم گلیوم کا حاشیہ ۲ جس میں انہوں نے ایک مستشرق کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ رجب مضر کو مضر اس لیے کہا جاتا تھا کہ مضر تو اس ماہ کو محترم و حرام سمجھتے تھے جبکہ دوسرے عرب اس کی حلت کے قائل تھے - مترجم کا خیال ہے کہ برونل (BRONNLE) کے ایڈیشن میں ص ۴۴۹ پر لفظ کو تحرمہ پڑھا گیا ہے جبکہ وہ اصلاً تحرمہ ہے - اگر یہ دلیل مان لی جائے تو واٹ اور دوسرے مستشرق مورخین کے

ماہ رجب میں مسلمانانِ مدینہ کے حملہ پر اعتراض غلط ثابت ہوتا ہے اور اس سے خود ان کی اپنی دلیلوں کی کمزوری نمایاں ہوتی ہے۔

۱۶۰۔ مثلاً سورۂ بقرہ آیات ۱۹۴-۱۹۰، سورۂ بقرہ آیات ۲۱۷ اور ۲۲۴، سورہ مائدہ آیت ۲ اور ۹۸-۹۷۔ ملاحظہ کیجئے تفسیر طبری، اول ص ۵۶۹-۵۶۲۔ تفسیر ابن کثیر، جلد اول ص ۲۲۵ وغیرہ۔

۱۶۱۔ یہ خیال ایم پلیسنر (M. Plessner) نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں اپنے دو مضامین جو بالترتیب محرم اور رجب کے مقدس مہینوں کے بارے میں ہیں ظاہر کیا ہے ملاحظہ ہو EI یعنی طبع اول۔ مونٹگمری واٹ نے اس خیال سے اتفاق کیا ہے۔ ملاحظہ ہو مذکورہ بالا ص ۹۔ نیز اے ڈی ایچ (A. Dh) نے بھی یہی خیال پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ابن اسحاق کا بروئل ایڈیشن ص ۴۴۹ اور ابن اسحاق انگریزی ترجمہ ص ۶۵۱، حاشیہ ۲۔

۱۶۲۔ قرآن مجید کی آیت کریمہ (سورہ توبہ ۳۷) میں "نسی" کا ذکر ہے تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجئے تفسیر طبری جلد ۱۴ ص ۲۴۴-۲۳۴۔ طبری نے پہلے نسی کی لغوی تحقیق کی ہے اور اس کی مختلف قرأت بیان کی ہیں پھر آیت قرآنی کے ایک حصہ کہ "وہ اس کو ایک سال حلال کر لیتے ہیں اور ایک سال حرام رکھتے ہیں" کے معنی بیان کئے ہیں۔ اہل تاویل و تفسیر کے نزدیک اس کی جو تشریح و تعبیر تھی وہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ محرم کو صفر بنا کر حلال کر لیتے تھے اور اس میں حملے کرتے، مال لوٹتے اور غارت گری کرتے تھے اور پھر دوسرے سال محرم کو حرام قرار دیتے تھے۔ مہینوں کی ترتیب میں وہ ایک برس محرم کو خارج کر دیتے تھے اس طرح حج ماہ ذوالقعدہ میں پڑتا تھا۔ طبری کا خیال ہے کہ حضرت ابوبکر نے سنہ ۹ھ میں اپنی امارت میں جو حج کیا تھا وہ ذوالقعدہ میں ہوا تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۱۰ھ کے اپنے آخری حج میں اسلامی تقویم کی قدیم ترتیب بحال کر دی تھی اور حج اپنے زمانے یعنی ماہ ذوالحجہ میں انجام دیا گیا تھا اور آپ نے فرمایا تھا کہ ان الزمان قد استدار کہیئۃ یوم خلق اللہ السموٰت والارض بلا ریب زمانہ۔ وقت۔ اپنی اسی حالت پر لوٹ آیا ہے جس پر وہ اس دن تھا جب اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا)۔ طبری نے متعدد احادیث و آثار بیان کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نسی عام طور سے ہوازن، غطفان، بنو سلیم اور کنانہ کے بعض خاندانوں میں رائج تھی۔ مآخذ و مصادر اور کتب جدیدہ میں اس موضوع پر بحث کے لیے ملاحظہ کیجئے:

لیون کیتانی، مذکورہ بالا، جلد اول ص ۳۵۶ وغیرہ، بہل، محمد ص ۳۵ وغیرہ، پلیسنر کا مضمون محرم پر مذکورہ بالا، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، طبع اول۔

محمد حمید اللہ، عہد نبوی کے میدان جنگ (انگریزی) ص ۹ حوالہ ۲۔ نیز ان کا مضمون، جرنل آف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی، اکتوبر ۱۹۶۸ء، جلد ۱۶ ص ۲۱۳-۲۱۹۔ واٹ، محمد مدینہ میں، مذکورہ بالا، ص ۳۰۰-۲۹۹۔

۱۶۳۔ لیون کیتانی، پلیسنر، مونٹگمری واٹ اور تمام دوسرے مستشرقین کے مطابق جو مقدس مہینوں کے بارے میں اس خیال کے قائل ہیں کہ مختلف علاقے مختلف مہینوں کی حرمت کے قائل تھے یہ عین ممکن تھا کہ مدینہ کے انصار رجب کی حرمت کے قائل نہ رہے ہوں پھر ان کو تقدیس ماہ حرام کی خلاف ورزی کا مطعون یا مورد الزام کیوں بنایا جا سکتا ہے؟

۱۶۴ - مضمون ہذا کا صـ ۳۰ ۱۶۵ - ایضاً -

۱۶۶ - صـ ۳۳ مذکورہ بالا - ۱۶۷ - صـ ۲۹ اور صـ ۳۳ بالا -

۱۶۸ - حضرت عبداللہ بن جحش قبیلہ اسد بن خزیمہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے اسدی کہلاتے تھے۔ وہ مکہ کے دو عظیم خاندانوں بنو ہاشم اور بنو امیہ سے یکساں قریبی تعلقات بیک وقت رکھتے تھے۔ اول الذکر سے ان کا ننہالی رشتہ تھا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کے فرزند اور آپ کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور بنو امیہ کے حلیف تھے خاص کر ابوسفیان بن حرب اموی سے اُن کے بہت قریبی حلف کے تعلقات تھے۔ مکہ کے ان دونوں خاندانوں سے یہ تعلقات ان کے والد جحش بن رئاب اسدی نے قائم کئے تھے۔ حضرت عبداللہ ابتدائی مسلمان تھے اور دارارقم میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام سے قبل اسلام لائے تھے۔ وہ مہاجرین حبشہ میں شامل تھے اور مکہ والوں کے اسلام کی خبر سن کر لوٹ آئے تھے اور پھر وہاں اپنی ہجرت مدینہ تک مقیم رہے تھے۔ وہ ابتدائی مہاجرین مدینہ میں بھی شامل تھے۔ ملاحظہ ہو ابن اسحاق صـ ۱۱۶، صـ ۱۴۶، صـ ۱۶۸ وغیرہ - ابن سعد سوم، صـ ۴۶ -

۱۶۹ - حضرت ابو حذیفہ رضـ مکہ کے ایک عظیم ترین سردار عتبہ بن ربیعہ کے فرزند اور خاندان بنو عبد شمس بن عبد مناف کے ایک بڑے رکن تھے۔ یہ خاندان بنو امیہ سے بہت قریب تھا اور حقیقتاً اس کو بھی اموی ہی سمجھا جاتا ہے۔ حضرت ابو حذیفہ اپنی کنیت سے زیادہ معروف ہیں ورنہ ان کا اصل نام ابن ہشام کے مطابق مہشم تھا۔ وہ بھی ابتدائی مسلمانوں میں سے ہیں۔ ابن اسحاق نے ان کو پہلے چالیس مسلمانوں میں شمار کیا ہے۔ انہوں نے بھی حبشہ کو ہجرت کی تھی اور پھر مکہ والوں کے اسلام لانے کی خبر سن کر واپس آ گئے تھے اور مکہ میں مقیم رہے تا آنکہ اجازتِ نبوی ملنے کے بعد مدینہ کو ہجرت کی اور پہلے مہاجرین میں شمار ہوئے ملاحظہ کیجئے: ابن اسحاق صـ ۱۱۷، صـ ۱۴۷، صـ ۱۶۸ وغیرہ ابن سعد جلد سوم صـ ۸۴ -

۱۷۰ - بنو مخزوم اور بنو امیہ کے درمیان تعلقات کے لئے ملاحظہ ہو واٹ، 'محمد مکہ میں' صـ ۸-۵ -

۱۷۱ - قریش کی مدینہ سے مخاصمت و دشمنی کے پس منظر اور اس پر بحث کے لئے ملاحظہ کیجئے شبلی نعمانی، سیرت النبی، جلد اول صـ ۳۰۹ - ۳۰۵ -

۱۷۲ - ملاحظہ کیجئے حوالہ مذکورہ بالا

۱۷۳ - مکی سماج کے جس معتدل طبقہ نے جنگ بدر کو براہِ راست یا بالواسطہ روکنے کی کوشش کی تھی اس میں عتبہ بن ربیعہ اموی اور اس کا بھائی شیبہ، عمیر بن وہب جمحی، حکیم بن حزام اسدی وغیرہ شامل تھے جبکہ جنگ بھڑکانے والے بیشتر بنو مخزوم سے تھے خاص کر ابوجہل مخزومی، اسود بن عبدالاسد مخزومی وغیرہ، ملاحظہ ہو ..... ابن اسحاق صـ ۲۹۵ - ۲۹۷ - جہاں تک قریش مکہ کے معتدل و نرم رو طبقہ کا تعلق ہے تو اس میں مختلف بطون (خاندانوں / شاخوں) کے لوگ شامل تھے۔ ان میں ہشام بن عمرو، زہیر بن ابو امیہ بن مغیرہ، مطعم بن عدی، ابو البختری بن ہشام، زمعہ بن اسود کے علاوہ عتبہ بن ربیعہ اموی، شیبہ بن ربیعہ اموی، ابوسفیان بن حرب اموی، سعید بن العاص اموی وغیرہ شامل تھے۔ یہ لوگ اسلام کے مخالف ضرور تھے

لیکن مسلمانوں کی بیخ کنی یا مسلح کشمکش کے قائل نہ تھے جیسا کہ مکہ میں مسلمانوں کے قریشی مقاطعہ کے مسئلہ یا جنگ بدر کے معاملہ پر ان کے طرز عمل سے واضح ہوتا ہے۔ اسی طرح شدید مخاصمت اور جنگ و جدال کا حامی اور اسلام کی یکسر و مکمل بیخ کنی کا قائل طبقہ بھی قریش کے مختلف طبقات کے افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں ابوجہل مخزومی، امیہ بن خلف جمحی اور اس کا بھائی عمرو، نُبیہ بن حجاج سہمی اور اس کا بھائی مُنبّہ، عاص بن وائل سہمی، عقبہ بن ابی معیط اموی، ابولہب ہاشمی اور سفیان بن حارث ہاشمی وغیرہ کافی ممتاز تھے۔ ملاحظہ کیجئے:۔ ابن اسحاق ص۱۱۹-۱۲۰، ص۱۳۳-۱۳۵، ص۱۴۳-۱۴۵، ص۱۵۹-۱۶۲، ص۱۷۰-۱۷۳ وغیرہ۔

۱۷۴- کتاب المحبر، ص۱۱۱۔

۱۷۵- مثلاً ابن اسحاق۔ ص۲۸۶۔

۱۷۶- ابن ہشام، جلد چہارم ص۶۰۸-۶۱۲، میں ۲۷ غزوات اور ۳۸ سرایا یعنی کل مہموں کی تعداد ۶۵ بتائی گئی ہے۔ واقدی، مذکورہ بالا اول تا آخر نے کل مہموں کی تعداد ۷۴ بیان کی ہے۔ ابن سعد دوم ص۱-۶۶، اور بلاذری، انساب الاشراف جلد اول ص۲۸۷-۲۹۰ نے واقدی کا اتباع مکمل طور سے کیا ہے۔ طبری، دوم ص۴۰۳، نے ابن اسحاق اور واقدی کی پیروی تو کی ہے مگر بعض مہموں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جیسے قتل کعب بن اشرف کے لیے سریہ محمد بن مسلمہ انصاری۔ بعد کے دوسرے سیرت نگاروں نے عام طور سے واقدی یا ابن اسحاق کی متابعت کی ہے۔ جدید مورخین نے اصلاً ان دونوں ماخذ پر انحصار کر کے تمام غزوات و سرایا کی تاریخ وار فہرست تیار کی ہے لیکن انہوں نے اس میں بعض دوسرے مسلمہ ماخذ سے استفادہ کر کے تعداد میں اضافہ کیا ہے۔ لیون کیتانی، مذکورہ بالا، کی تیار کردہ فہرست غزوات و سرایا اب تک مکمل جامع اور صحیح سمجھی جاتی رہی ہے اور اسی پر انحصار کر کے مونٹگمری واٹ محمد مدینہ میں، ص۳۳۹-۳۴۳، اپنی تازہ ترین فہرست تیار کی ہے جو غالباً مکمل ترین کہی جا سکتی ہے۔ لیکن محمد بن حبیب بغدادی کے ذکر کردہ غزوات و سرایا میں سے بعض اور خاص طور سے یہ دو ابتدائی مہمیں اس میں بھی بار نہیں پا سکی ہیں۔ غالباً ان مورخین کو اس ماخذ کا علم نہیں تھا۔ بہرحال بغدادی کے مطابق کل مہموں کی تعداد چوراسی تھی جن میں سے ۳۲ غزوات تھے اور ۵۲ سرایا۔ واٹ کے مطابق ان کی تعداد ۸۹ تھی۔ گویا کہ کل تعداد ان دو غزوات کو شمار کر کے ۹۱ ہوگی۔ واٹ اور ان کے پیشرو کیتانی نے بتوں کو توڑنے کی متعدد مہموں کو ایک ہی شمار کیا ہے۔ اگر ان کی تعداد بھی شمار کر لی جائے تو کل میزان کہیں زیادہ ہوگا۔

۱۷۷- مثلاً ابن اسحاق اور واقدی کے یہاں غزوات و سرایا کی تاریخوں میں کافی زمانی اختلاف ہے اور ظاہر ہے کہ اول الذکر کے معاملے میں اگر اختلاف ہوگا تو آپ کے قیام مدینہ کی مدت از خود مختلف ہوگی۔ ملاحظہ ہو جے ایم بی جونس کا مضمون مذکورہ بالا بر ترتیب و تاریخ غزوات و سرایائے نبوی۔

۱۷۸- حوالہ ص۱۹۶ سابق۔

۱۷۹- ملاحظہ کیجئے مجموعۃ الوثائق السیاسۃ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدہ، مرتبہ محمد حمید اللہ قاہرہ ۱۹۴۱ء، ص۱۴۵ اور ص۱۹۵ وغیرہ۔

۱۸۰- محمد بن حبیب بغدادی کی اب تک معروف و معلوم دونوں کتابوں کتاب المحبر اور کتاب المنمق مرتبہ خورشید احمد فارق حیدرآباد

دکن ۱۹۴۲ء میں بیانیہ انداز کے بجائے اشاراتی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

۱۸۱- تفصیلات ملاحظہ ہوں خاکسار کی انگریزی کتاب مذکورہ بالا کا باب اول خاص کر ص ۲۳-۵۔

۱۸۲- ایضاً۔ نیز واٹ، مذکورہ بالا، ص ۱۹۲-۲۲۱۔ برکات احمد، محمد اور یہود (Muhammad and the Jews) دہلی ۱۹۸۰ء، ص ۵۰-۳۷، ولہاسن (Arab Kingdom and its Fall, (Wellhasan) - لندن ۱۹۷۳ء ص ۱۴-۱۱

۱۸۳- قریش کو یہ بالادستی کئی وجوہ سے حاصل تھی۔ بنیادی طور سے ان کا مذہبی تشخص کعبہ کی تولیت و پاسداری کے سبب تھا اور حج کے مذہبی فریضہ حجاج کے لیے سقایہ اور رفادہ کے فرائض انجام دینے کے سبب ان کو پورے عرب میں مذہبی فضیلت حاصل تھی اور حج کے موقعہ پر میلوں ٹھیلوں کی وجہ سے ان کی معیشت کو تجارتی استحکام کی بدولت فوقیت حاصل ہوگئی تھی جس کو انہوں نے پڑوسی ممالک (شام، یمن، ایران اور حبشہ) سے تجارتی تعلقات قائم کرکے باعث رشک بنا دیا تھا۔ مذہبی اور اقتصادی تفوق نے ان کو سماجی مرتبہ بھی بخش دیا تھا۔ اور اسی کے نتیجہ میں انہوں نے مختلف بدوی قبائل سے بزرگانہ تعلقات قائم کیے تھے۔ اپنے تجارتی اور قبائلی حریفوں سے کامیابی سے نمٹنے کے لئے انھوں نے ایک عظیم فوجی طاقت بھی جمع کر لی تھی۔ قریش کی بالادستی کے لئے مزید تفصیلات پر ملاحظہ کیجئے: واٹ، محمد مکہ میں (Muhammad at Mecca) لندن ۱۹۵۳ء، ص ۲۲-۱۔ نیز شبلی نعمانی، سیرت النبی، جلد اول ص ۲۰۷۔

۱۸۴- ہوازن (قیس عیلان) اور بنو بکر بن عبد مناۃ اور خزاعہ، قریش مکہ کے روایتی حریف تھے اور ان کے درمیان کئی جنگیں بھی ہوئی تھیں جن میں جنگ فجار کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان منازعات کے لیے ملاحظہ ہو: ایام العرب فی الجاہلیہ ص ۳۲۲-۳۲۷ وغیرہ۔

۱۸۵- قریش سے مدینہ والوں کو خطرہ کوئی تصوراتی نہ تھا بلکہ حقیقی تھا۔ شیوخ قریش مہاجرین مکہ کو کسی قیمت پر اپنے چنگل سے نکلنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ان کو روکنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ لیکن جب وہ بچ بچا کر مکہ سے نکل کر مدینہ لینے میں کامیاب ہو گئے تو قریش نے ان کو مدینہ سے نکالنے یا واپس لانے کے جتن کئے بالکل اسی طرح جیسے انہوں نے کچھ برس قبل مہاجرین حبشہ کو واپس مکہ لانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ محدث ابوداؤد کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کے بعد قریش نے مدینہ کے سب سے بااثر سردار عبداللہ بن ابی بن سلول خزرجی کو خط لکھا تھا جس میں مسلمانوں کو قتل کرنے یا جلاوطن کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور بصورت عدم تعمیل جنگ و جارحیت کی دھمکی دی گئی تھی۔ قریش کی اس جارحانہ پالیسی کے سبب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین مسلسل متفکر و متردد رہے یہاں تک کہ امام نسائی کے مطابق آپ اور آپ کے ساتھی راتیں جاگ کر گزارتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ اکثر گشت لگایا کرتے تھے۔ ماخذ کے دوسرے متعدد بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش سے مسلمانان مدینہ کو شدید خطرہ لاحق تھا۔ ملاحظہ کیجیے: سنن ابی داؤد، باب خبر النضیر، سنن نسائی، باب اجلاء النضیر، بخاری الجامع الصحیح، باب الجراد (حضرت سعد بن ابی وقاص نے فرمائش رسول پر رات بھر پہرہ دیا تھا)۔ سیوطی، لباب فی اسباب النزول، تفسیر سورۂ نور آیت ۵۵۔

۱۸۶- ابتدائی مہموں کے بارے میں اہم ماخذ کے افتتاحی کلمات مضمون ہذا میں ہر مہم کے آغاز سے صاف معلوم ہوتے ہیں۔

۱۸۷ - ان مقامات کے مدینہ سے فاصلوں کے لیے ملاحظہ کیجئے: خاکسار کی مذکورہ بالا کتاب (انگریزی) ص ۱۶-۱۵

۱۸۸ - ابن اسحاق ص ۲۲۶ - تمام مآخذ کا اتفاق ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفر ہجرت میں معمول کا راستہ یعنی شاہراہِ تجارتِ قریش چھوڑ کر ایک دوسرے پیچیدہ راستے سے سفر کیا تھا تاکہ تعاقب اور دشمن کی تاخت سے محفوظ رہ سکیں۔

۱۸۹ - صلح حدیبیہ کی ایک شرط یہ بھی کہ مکہ سے مدینہ آنے والے مسلمانوں یا غیر مسلموں کو واپس کرنا ہوگا جبکہ مدینہ سے مکہ بھاگ جانے والوں پر ایسی کوئی پابندی نہ تھی۔ مکی مسلمانوں کے لیے یہ شرط بڑی تکلیف دہ تھی کہ وہ قریش کے آہنی پنجے اور ظلم وستم سے کسی طور فرار نہ حاصل کر سکتے تھے لیکن حضرت ابوبصیرؓ نے ان غریب دبے کس مسلمانوں کے لیے ایک نیا دروازہ کھول دیا۔ وہ مکہ سے بھاگ کر مدینہ پہنچے تو ان کی واپسی کا مطالبہ کرنے کے لیے ازہر بن عبد عوف زہری اور اخنس بن شریق ثقفی نے ایک عامری کو ایک مولیٰ کے ساتھ بھیجا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبصیر عتبہ بن اسید ثقفی کے احتجاج کے باوجود ان کو واپس مکہ بھیج دیا۔ ذوالحلیفہ میں جب ان لوگوں نے قیام کیا تو حضرت ابوبصیر نے اپنے عامری محافظ کی تلوار کی تیزی کی تعریف کی اور بہانے سے اس پر قبضہ کر لیا۔ اور پھر ایک وار میں عامری کو مار ڈالا۔ مولیٰ بھاگ کر مدینہ پہنچا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ پیچھے پیچھے حضرت ابوبصیر بھی بارگاہ نبویؐ میں پہنچے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ نے اپنا عہد پورا کر دیا اب آپ پر میری واپسی کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ لیکن آپ نے صحابی موصوف کو جنگ کا بھڑکانے والا بتایا۔ غالباً ابوبصیر نے سمجھ لیا کہ آپ ان کو واپس کر کے ہی رہیں گے۔ چنانچہ وہ از خود ذوالمروہ کے ساحلی مقام العیص میں آکر بس گئے۔ ان کی مثال کی تقلید کرتے ہوئے مکہ کے مسلم گرفتارانِ بلا ایک ایک کر کے ابوبصیر ثقفی سے العیص میں آکر ملتے گئے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد ستر ہو گئی اور انہوں نے قریشی کاروانوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود قریش مکہ نے معاہدۂ حدیبیہ کی اس شرط کی منسوخی کی درخواست کی جو منظور ہوئی اور مکی مسلمانوں کو بلا خوف وخطر مدینہ آکر رہنا نصیب ہوا تو قریش کو شاہراہ تجارت پر پھر سے بلا روک ٹوک آنے جانے کا موقع ملا۔ ملاحظہ ہو ابن اسحاق ص ۵۰۷-۸۔

۱۹۰ - واٹ، مذکورہ بالا ص ۶۲-۶۱

۱۹۱ - مختلف مہمات کے دوران مسلم جماعتوں کے اپنے علاقوں میں قیام کے لیے ملاحظہ فرمائیے۔ حوالہ جات سابقہ۔ عام حالات میں ایک دن کے اونٹ کے سفر میں تقریباً پندرہ میل طے کیے جاتے تھے۔ ملاحظہ ہو: محمد حمید اللہ، عہد نبویؐ کے میدانِ جنگ (انگریزی) ص ۴۲۔ لیکن سریہ نخلہ میں مسلم جماعت طلیعہ کے سفر اور مدت سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر معمولی حالات میں جبکہ تاخت کرنی ہو یا کسی اور سبب سے جلدی ہو تو اس سے کئی گنا زیادہ سفر کیا جاسکتا ہے۔ وادی ملل مدینہ سے ۲۸ میل کے فاصلہ پر تھی اور مسلم جماعت نے وہ مسافت صرف دو دن میں طے کی تھی۔

۱۹۲ - عہد نبویؐ کے جاسوسی نظام کے لیے ملاحظہ ہو، محمد حمید اللہ، عہد نبویؐ کے میدان جنگ (انگریزی) ص ۶۰-۵۸۔ فوجی جاسوسی نظام پر تاریخی واقعاتی بحث کے لئے ملاحظہ ہو خاکسار کی انگریزی کتاب، باب سوم، بحث بر "عیون" اور "طلیعہ"۔

۱۹۳- واٹ، محمد مدینہ میں (انگریزی) ص

۱۹۴- ملاحظہ ہو مضمون ہذا کا ص۲۶ اور حوالے ۸۶ اور ۸۷۔

۱۹۵- یہ غزوہ قردہ تھا۔ قریش مکہ نے ایک بڑا کارواں شام کے لیے روانہ کیا۔ اس میں زیادہ تر سامانِ تجارت چاندی پر مشتمل تھا۔ ابن اسحاق کے بقول اس کارواں کی کمان اور کسی کے ہاتھ میں نہیں خود ابوسفیان بن حرب کے ہاتھ میں تھی اور اس کا رہنما و رہبر فرات بن حیان عجلی جیسا ماہر شخص تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر حضرت زید بن حارثہؓ نے اس پر قردہ نامی چشمہ پر چھاپہ مارا۔ لوگ تو بچ نکلے مگر سارا سامانِ تجارت مسلمانوں کے ہاتھ لگ گیا۔ ملاحظہ ہو ابن اسحاق ص۳۶۴، ابن ہشام دوم ص۶۰۹ ۔ واقدی ص۱۹۷-۱۹۸ ۔ ابن سعد جلد دوم ص۳۶ ۔ طبری جلد دوم ص۴۹۲-۴۹۳ ۔ نیز ملاحظہ ہو: واٹ، محمد مدینہ میں، ص۱۰ ۔ ابن اسحاق وغیرہ کے علاوہ دوسرے مآخذ میں کاروان قریش کی امارت صفوان بن امیہ جمحی کے ہاتھ میں تھی۔ واٹ کا اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مکہ میں ابوسفیان کا ایک مخالف فریق ابھر رہا تھا صحیح نہیں ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قریشی کارواں مختلف سردارانِ قریش کی قیادت میں شام جاتے رہے تھے۔ اور عموماً یہ کارواں قریش کے انفرادی خاندانوں کے ہوتے تھے۔ عام طور سے پورے قبیلہ کا ایک قافلہ نہیں جاتا تھا۔ صرف بدر سے پہلے جانے والا کارواں قومی یا قبائلی سطح کا تھا جس کے خاص اسباب تھے۔

۱۹۶- حضرت زید بن حارثہؓ کا یہ سریہ العیص گیا تھا۔ ایک مکی کارواں ابوالعاص بن ربیعؓ، داماد رسول کریمؐ کی زیر قیادت شام سے مکہ واپس ہو رہا تھا۔ اس میں حضرت ابوالعاصؓ کی اپنی تجارت کے علاوہ بعض دوسرے قریشی تاجروں کی دولت بھی لگی تھی۔ بہرحال العیص میں اس پر حضرت زیدؓ نے چھاپہ مارا اور اس بار کارواں کے ساتھ ساتھ بعض لوگوں کو بھی پکڑ لیا اگرچہ امیر کارواں بچ نکلے تھے۔ لیکن وہ بعد میں خود مدینہ آئے تھے اور اپنی مسلم بیوی حضرت زینبؓ کے یہاں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ اس سریہ میں دو اہم نکات توجہ کے طالب ہیں۔ اول یہ کہ یہ چھاپہ العیص میں مارا گیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مقام سے قریشی کاروانوں کا گزرنا ناگزیر تھا جیسا کہ کہیں اور کہا جا چکا ہے۔ دوسرے غالباً مکہ والوں نے اپنی گرتی ہوئی تجارت کو آخری سنبھالا دینے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد کا سہارا لیا تھا شاید اس خیال سے کہ مسلمان ایسے کسی قریشی کارواں پر حملہ نہ کریں گے۔ ملاحظہ ہو ابن اسحاق ص۳۱۶ ۔ واقدی ص۵۵۳-۵۵۵ ۔ ابن سعد جلد دوم ص۸۷ ، طبری جلد دوم ص۶۴۱ ، نیز واٹ محمد مدینہ میں، ص۴۵ ۔ موصوف کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوالعاص بن ربیعؓ کو حضرت زینبؓ کی مداخلت پر پناہ اور بعد میں ان کا مالِ تجارت واپس دے کر ایک نئی پالیسی اختیار کی تھی اور جس کا مقصد مکہ والوں کو جیتنا تھا! درحقیقت میں اس کا یہی اثر ہوا تھا۔ اس سریہ کے سلسلے میں یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ مکہ والوں نے یہ کارواں عراقی شاہراہ سے بھیجا تھا لیکن اس پر بھی وہ شامی شاہراہ پر جانے والے کاروانوں کی طرح مسلمانوں سے بچ نہ سکا۔

۱۹۷- متعدد جدید مورخوں نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے مثلاً واٹ، محمد مکہ میں ص۲-۳ ۔

۱۹۸- ابن اسحاق ص۲۹۵ کا بیان ہے کہ گاؤں کی ان دو باندیوں کے درمیان مصالحت اس علاقے کے ایک جہنی سردار مجدی

بن عمرو جہنی نے کرائی تھی - اور قرض دار سے قرض خواہ کو اس کی رقم واپس دلانے کا وعدہ کیا تھا -

۱۹۹ - بخاری ، الجامع الصحیح ، اسلام ابی ذر ، ابن سعد جلد چہارم ص ۲۲۵ -

۲۰۰ - واقدی ص ۳۵ - بخاری ، کتاب المغازی ، روایت حضرت سعد بن معاذ -

۲۰۱ - غزوہ قردہ کے بارے میں ابن اسحاق کا ایک جملہ مدینہ سے مخاصمت اور اس کی خطرناکی کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے - اس کا بیان ہے کہ بدر میں جو کچھ ہو چکا تھا اس کی وجہ سے قریش اپنے شامی راستے پر کارواں بھیجنے سے خوفزدہ تھے - گویا کہ بدر سے پہلے ان کے کارواں اس راستے پر جو گذرتے تھے وہ اس حقیقت کا اعلان تھے کہ اب تک ان کی تجارت کو کوئی خاص خطرہ نہیں محسوس ہوا تھا - ملاحظہ ہو ، مذکورہ بالا ص ۳۶۴

۲۰۲ - ابن اسحاق ص ۲۹۱ -

۲۰۳ - ابن اسحاق ص ۲۹۱ -

۲۰۴ - ابن اسحاق ص ۲۹۶ کا بیان ہے کہ ابوسفیان نے قریش کو جو پیغام بھیجا تھا اس کا مفہوم یہ تھا کہ "چوں کہ تم لوگ اپنے کارواں اپنے آدمیوں اور اپنے مال کو بچانے نکلے تھے اور خدا نے اس کو بچا بھی دیا ہے اس لیے اب واپس آجاؤ "-

۲۰۵ - ابن اسحاق ، ص ۲۹۸ وغیرہ -

۲۰۶ - اخنس بن شریق ثقفی نے جو بنو زہرہ کے حلیف تھے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا جس کے نتیجہ میں تمام زہری مکہ واپس چلے گئے تھے اور مآخذ کے مطابق ایک زہری نے بھی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا - اسی طرح بنو عدی بن کعب بھی جنگ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے - بنو ہاشم میں حضرت علی کے بڑے بھائی طالب کچھ اور قریشیوں کے ساتھ مکہ لوٹ گئے تھے جب کہ عقیل بن ابی طالب اور عباس بن عبدالمطلب شامل ہوئے تھے - ملاحظہ ہو ابن اسحاق ص ۲۹۶ ، اور ص ۳۱۲ -

۲۰۷ - ابن اسحاق ص ۲۹۶ کے مطابق ابوجہل نے کہا تھا -

"خدا کی قسم ہم واپس نہ جائیں گے جب تک بدر تک نہ ہو آئیں وہاں ہم تین دن گذاریں گے اونٹ قربان کریں گے ، دعوتیں اڑائیں گے اور شرابیں پئیں گے اور باندیاں ہمارے لیے ناچیں گائیں گی اور تمام عرب سن لیں گے کہ ہم یہاں آئے اور جمع ہوئے چنانچہ مستقبل میں وہ ہمارا احترام کریں گے "

۲۰۸ - ابن اسحاق ص ۲۹۷-۹ -

۲۰۹ - ایضاً -

۲۱۰ - واقدی ص ۲۸ -

۲۱۱ - واقدی ص ۲۰

۲۱۲ - حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (متوفی ۳۲ھ) دولت مند ترین صحابہ میں سے تھے - انہوں نے اپنی وفات کے

وقت راہ خدا میں پچاس ہزار دینار کی رقم وقف کی تھی جبکہ ان کی کل دولت کا اندازہ مشکل تھا۔ ملاحظہ ہو ابن سعد، جلد سوم ص ۱۳۶۔
حضرت سعد بن وقاص زہری (متوفی ۵۵ھ) نے اپنی وفات کے وقت دو لاکھ پچاس ہزار درہم ترکہ چھوڑا تھا۔ ایضاً ص ۱۴۹۔
حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی کو عراق سے چار پانچ لاکھ سالانہ اور صرف سراۃ سے دس ہزار دینار سالانہ کی آمدنی بشکل غلہ ہوتی تھی، ابن سعد جلد سوم ص ۲۲۱۔ جبکہ ان کا ترکہ بائیس لاکھ درہم اور دو لاکھ دینار پر مشتمل تھا۔ ایضاً ص ۲۲۲۔

۲۱۳- ابن اسحاق ص ۳۳۶۔

۲۱۴- ابن اسحاق ص ۳۷۳۔

۲۱۵- ابن سعد، جلد دوم ص ۶۶

۲۱۶- ایضاً ص ۱۳۵۔

۲۱۷- واقدی ص ۸۲۱ اور ص ۸۲۳۔

۲۱۸- ابن سعد، جلد دوم ص ۱۶۶۔

